نقوش

لاہور

جلد دوم

افسانہ نمبر

ادارۂ فروغِ اُردو ○ لاہور

جلد دوم

نقوش

افسانہ نمبر

فہرست میں انگارے کے نمائندہ افسانوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔
مگر انھیں اپنے تُند و تیز مزاج کی وجہ سے خارج کرنا پڑا۔ لہٰذا
صفحہ ۴۶۲ کے بعد صفحہ ۴۷۸ کو مربوط ہی جانیں!

[ادارہ]

ترتیب

جلد دوم

تیسرا دور

(انگارے کے افسانے)

۱- نیند نہیں آتی — سجاد ظہیر، ۴۶۲
۲- جہازوں کی ایک رات — احمد علی، ۴۶۷
۳- دلی کی سیر — رشید جہاں، ۴۷۱
۴- جوانمردی — محمود الظفر، ۴۷۳

چوتھا دور

۵- زندگی کے موڑ پر — کرشن چندر، ۴۷۸
۶- نیا قانون — سعادت حسن منٹو، ۵۰۱
۷- گرہن — راجندر سنگھ بیدی، ۵۰۸
۸- چوتھی کا جوڑا — عصمت چغتائی، ۵۱۴
۹- ہماری گلی — احمد علی، ۵۲۳
۱۰- آخندی — غلام عباس، ۵۳۲
۱۱- پرمیشر سنگھ — احمد ندیم قاسمی، ۵۴۱
۱۲- آپا — ممتاز مفتی، ۶۵۳
۱۳- زعفران کے پھول — خواجہ احمد عباس، ۵۶۱
۱۴- مجھے جانے دو — اختر حسین رائے پوری، ۵۶۹
۱۵- چمگادڑوں کی دنیا — ملک راج آنند، ۵۷۴
۱۶- نئی مصیبتیں — رشید جہاں، ۵۸۱
۱۷- حرا مجادی — حسن عسکری، ۵۸۵
۱۸- زریں تاج — عزیز احمد، ۵۹۶
۱۹- آخری کوشش — حیات اللہ انصاری، ۶۰۹
۲۰- بینگن کا پودا — اوپندر ناتھ اشک، ۶۲۶
۲۱- لال دھرتی — دیوندر ستیارتھی، ۶۳۰
۲۲- کلیاں اور کانٹے — اختر اورینوی،
۲۳- جگا — بلونت سنگھ، ۶۵۸
۲۴- بجار — ہاجرہ مسرور، ۶۷۲
۲۵- خون — انور، ۶۷۸
۲۶- جلاوطن — قرۃ العین حیدر، ۶۸۷

۲۷ - بیٹوں سے چلّے بابا لے چلّے دے — خدیجہ مستور، ۷۱۴
۲۸ - بیمنی — شفیق الرحمٰن، ۷۱۸
۲۹ - آئینہ — ممتاز شیریں، ۷۴۵
۳۰ - زرد چہرے — ابراہیم جلیس، ۷۵۹
۳۱ - سردار جسونت سنگھ — قدرت اللہ شہاب، ۷۶۵
۳۲ - ٹوٹ گیا اک تارا — تسنیم سلیم چھتاری، ۷۷۲
۳۳ - سمندر اور تین کمرے — مسعود دین، ۷۹۲
۳۴ - کلوا — سید وسیم حسین، ۸۰۸
۳۵ - سرگذشت — ابو الفضل صدیقی، ۸۱۵
۳۶ - جہاں میں رہتا ہوں — مہندر ناتھ، ۸۳۰
۳۷ - آبِ حیات — راما نند ساگر، ۸۴۲
۳۸ - باجی ولایت — آغا بابر، ۸۵۰
۳۹ - آنکھ مچولی — شکیلہ اختر، ۸۵۹
۴۰ - اب اور تب — ہنس راج رہبر، ۸۶۴
۴۱ - روپ چند — صدیقہ بیگم سیوہاروی، ۸۷۰
۴۲ - تجاوز — عبدالرحمٰن چغتائی، ۸۷۶

پانچواں دور

۴۳ - گڈریا — اشفاق احمد، ۸۸۴
۴۴ - راون کے دیس میں — اے حمید، ۹۰۹
۴۵ - میسرا آدمی — شوکت صدیقی، ۹۲۲
۴۶ - اجودھیا — انتظار حسین، ۹۳۸
۴۷ - سمجھوتہ — پرکاش پنڈت، ۹۴۵
۴۸ - چاند بجھ گیا — سراد یوی، ۹۵۳
۴۹ - موم کی مریم — جیلانی بانو، ۹۵۷
۵۰ - لڑھکتی چٹان — انور عظیم، ۹۶۶

مقالات

۵۱ - داستان سے افسانے تک — سید وقار عظیم، ۹۸۰
۵۲ - مختصر افسانے کا فن — عبادت بریلوی، ۹۹۳
۵۳ - معنوی افسانہ کا اثر اردو افسانہ پر — ممتاز شیریں،
۵۴ - اردو افسانے کا مستقبل — محمد حسن عسکری
۵۵ - اردو افسانے میں روایت اور تجربے — (مذاکرہ)

کرشن چندر

راجندر سنگھ بیدی

سعادت حسن منٹو

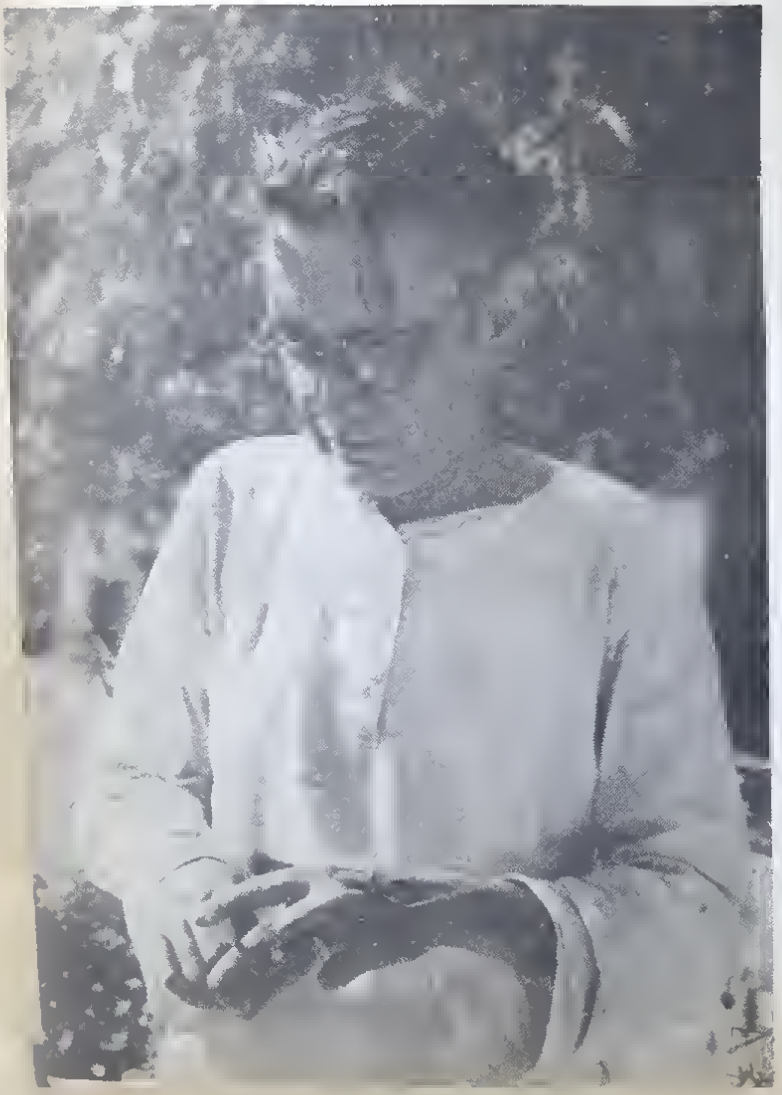

قرة العين

عصمت چغتائی

احمد ندیم قاسمی

غلام عباس

ممتاز مفتی

(۸)

اُردو افسانہ

چوتھا دور

کرشن چندر

زندگی کے موڑ پر

مسافر

پرکاش وتی کا بیاہ تھا اور سوشیلا اور لیلا بیاہ دیکھنے کی خوشی میں نئے نئے کپڑے سلوا رہی تھیں۔ جارجٹ کی سبز ساڑھی اور زری کا فیتہ" فینزی کا بادامی دوپٹہ اور اس کا جھلملاتا ہوا نقرئی کنارہ۔ آنکھ کے نئے کی قمیص اور امرت دھارا کی شلوار، حبیب عجیب سے بلاؤز جو دور سے دیکھنے میں ایسے معلوم ہوں گویا صرف چاٹے والی کو ڈھانپنے کے کام آسکتے ہیں۔ لیکن جب سوشیلا اور لیلا انہیں پہن لیں تو گول گول قطع کئے ہوئے کناروں سے بازو ایسے نکل آئیں جیسے سیب کی شاخیں پھولوں کے بار سے جھک رہی ہوں۔ بچارا پرکاش چند سوشیلا اور لیلا کی طرف دیکھ دیکھ کر سوچتا کہ عورتیں بھی عجیب مصیبت ہیں۔ یہ پیدا ہوں تو مصیبت اور نہ پیدا ہوں تب بھی مصیبت، لیلا نے نئے طلائی آویزے خریدے تھے اور سوشیلا نے بلّی کے پنجوں کی طرح اپنے ناخن بڑھا لئے تھے اور ہر روز انہیں پالش کیا کرتی اور سوچتی کہ جب سردی پڑ جائیں گے تو لیلا کے طلائی آویزوں کو کون پوچھے گا' ہاں' اس چھوٹے سے قصبے کی سب لڑکیاں اس کے سپید سپید لمبے ناخنوں کو دیکھ کر ضرور حیران ہوں گی' اری یہ کیا ہے؟ دیکھو تو بہن یہ ہے ہمارا نیا فیشن ہے' کیا تجھے خبر نہیں سوشیلا اب کالج میں پڑھتی ہے' ہاں کالج میں' اور پھر کیسی کیسی عجیب باتیں ہوں گی' خوب لطف آئے گا ان کی باتیں سن کر' اور لیلا نے تو جب سے "پریم کی پکار" میں ہیروئن کے کانوں میں نئی وضع کے آویزے دیکھے تھے اس کا دل للچا رہا تھا' اب پرکاش وتی کے بیاہ پر یہ موقع ملا تھا کہ وہ ان طلائی آویزوں کا تقاضا کرتی' اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ آویزے جتنے لیلا کے کانوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور کسی کے کانوں میں نہیں ہوتے اور پھر یہ آویزے بھی تو بہت اچھے تھے۔ لمبے لمبے سے' ایک چھوٹے سے طلائی گنبد کے نیچے ایک اس سے ذرا بڑا طلائی گنبد جس کا یہ طلائی گنبد ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اس کی سپید موتیوں میں گردن تک پہنچ جاتے تھے' یہ آویزے بالکل ایسے تھے جیسے مدورا کے مندر رکھے ہوئے لہرا رہے ہوں اور جب آئینے کے سامنے وہ گردن ایک طرف جھکا کر مسکرا دیتی تو اس کا ہنسنا' اور طلائی گنبدوں کا جھومنا' اور اس کے گالوں کا شہابی ہو جانا' یہ سب باتیں مل کر اس پر ایک نشہ سا طاری کر دیتیں اور وہ سوچتی کیا سوشیلا اور اس کے ناخن' اونہہ یہ اور بات تھی کہ سوشیلا اس کی بہن تھی' بڑی بہن۔ لیکن جب پرکاش چند نے معصوم سے لہجے میں نئے آویزوں کی تعریف کی تو لیلا نے جواب دیا میں کیا کرتی

ن امیرے پاس کوئی اچھے آویزے ہی نہیں تھے۔ وہ پہلے تین جوڑے تو بالکل ہی بھدے سے ہیں، کیا میں وہی پہن کر پرکاش کے بیاہ پر جاؤں؟"
اور سوشیلا نے ناخنوں پر پالش کرتے ہوئے نہایت بھولپن سے کہا۔ "بھائی جان! آپ ہادی اسٹانی مس سہگل کے ناخن دیکھیں تو بالکل حیران رہ جائیں۔ بالکل سپید، بے داغ، سچے موتیوں کی طرح، میرے ناخنوں پر تو ویسی چمک آتی ہی نہیں، اور۔ بھاپا[1] جی! پرکاش کے بیاہ میں ہم یہاں سے بس پر جائیں گے یا ریل پر؟"

پرکاش دتی کے بیاہ سے دو دن پہلے پرکاش چندر، لیلا اور سوشیلا لاہور سے روانہ ہوئے۔ پرکاش کی ماں نے اپنے بیٹے کو خرچ کے لئے پچیس روپے دیئے۔ پرکاش دتی کے لئے پیلے رنگ کی جارجٹ کی ایک ساڑھی اور دو روپے شگن کے، پھر بولی۔ "دیکھنا جب پرکاش ڈولی میں سوار ہو تو اسے اپنے پاس سے دو روپے شگن کے اور دے دینا" اور ہاں دو روپے لڑکے کو بھی، دولہا کو، اور ——— بس کافی ہے۔"

جب پرکاش اور لیلا اور سوشیلا گھر سے تانگے پر سوار ہوئے تو پرکاش کی ماں نے کہا۔ "دیکھنا بیٹا، ڈولی کے وقت میرا خیال ہے کہ میں دولہا دلہن دونوں کو ایک ایک روپیہ شگن دے دینا، آخر جب تمہارے بھائی کا بیاہ ہوا تھا تو پرکاش دتی کی ماں نے کون سے خزانے لٹا دیئے تھے، یہی ایک ایک روپیہ اس نے دونوں کو دیا تھا" اور کہا "بس کافی ہے، اچھا بیٹا جاؤ اب دیر نہ کرو۔"

لیکن جب تانگہ بالکل ہی چلنے لگا تو پرکاش کی ماں نے پھر اشارے سے اسے ٹھہرایا اور پرکاش کے قریب جا کر سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ "سوشیلا کو ننگے سر نہ پھرنے دینا، سری پور پرانی وضع کا شہر ہے، کوئی لاہور نہیں اور یہ عادت تو مجھے بہت ہی بری معلوم ہوتی ہے اور پھر انہیں نینوں کے دوپٹے بھی نہ اوڑھنے دینا، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے، کنواری لڑکیوں کو بہت ہنسنے بولنے بھی نہیں دینا چاہئے، وہاں تو ہر وقت ڈھولک بجتی ہوگی، اسی لئے کہتی ہوں، بیٹا یہ دوآبے کے لوگ بڑے شکی مزاج ہوتے ہیں، ذرا کسی لڑکی کو ننگے سر دیکھ لیا اور وہیں انگلی اٹھا دی، اور سر اٹھا کر چلنا بھی شریف زادیوں کا دستور نہیں، کم از کم دوآبے کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے، نظر نیچی، شرم اپنی اور....."

پرکاش نے گھبرا کر کہا۔ "بہت اچھا ماں، بہت اچھا۔"

ریل جا چکی تھی اس لئے پرکاش، سوشیلا اور لیلا کو مجبوراً آخر بس کا آسرا لینا پڑا، دوپہر کے وقت خضر بس سروس کی لاری نے انہیں بٹالہ پہنچا دیا، بٹالہ پہنچ کر انہوں نے سری پور جانے والی لاریوں کے اڈے کی تلاش کی اور آخر انہوں نے اسے ماربرٹس پارک کے قریب پا لیا۔ یہ ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ پرکاش چند سو فی صدی خالص شہری تھا جس کی ساری زندگی لاہور کی گلیوں، سڑکوں اور پارکوں میں چکر کاٹتے اور سینما بھانتے گذری تھی، یہاں پہنچ کر اس نے کچھ اور ہی نقشہ دیکھا، ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا اور اس کے نیچے تین برسیدہ لاریاں، داہنی طرف ماربرٹس پارک اور اس کے قریب ایک بڑا سا تالاب، تالاب میں پانی نام کو نہ تھا۔ ماربرٹس پارک کے درختوں پر پتوں کا نشان نہ تھا۔ سامنے ایک ٹن ووٹی پیٹرول مرلان تھا۔ کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، اور آک پر اُودے اُودے پھول آئے ہوئے تھے۔ مٹیالے رنگ کی کچی سڑک پر لاٹھی ٹیک کر چلتا ہوا ایک بوڑھا کسان نظر آ رہا تھا اور کہیں کہیں کھیتوں میں ہل چلے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اپنے لب کھولے آسمان کی طرف تک رہے ہیں کہ شاید کہیں سے پانی کی ایک بوند گر پڑے، واقعی ایک عجیب دنیا تھی۔ پرکاش نے اپنے بیٹ کو داہنی طرف اور ترچھا کر لیا اور پھر ہمت سے کام لے کر اس نے ایک لاری میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا۔ "سری پور کو لاری یہاں سے جاتی ہے؟"

ڈرائیور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ——— "ہاں جناب، کیا کہا آپ نے؟"

---

[1] وسطی پنجاب میں بڑے بھائی کو "بھاپا جی" کہتے ہیں۔ مقامی رنگ قائم رکھنے کے لئے اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

"میں نے کہا سری پور ———"

ڈرائیور نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا: "ہاں جناب! یہیں سے۔" پھر فرنٹ سیٹ کو جھاڑتے ہوئے بولا: "تشریف رکھئے، ایک روپیہ کرایہ۔"

"کس وقت چلنا ہوگا؟"

"چار بجے، اب کیا وقت ہوگا جناب؟"

"اڑھائی!"

"بہت اچھا، بہت اچھا جناب۔ ابھی تو بہت وقت باقی ہے۔"

درمیانہ خانہ کھول کر پرکاش نے ٹیلا اور سوشیلا کو بٹھا دیا اور پھر ہیٹ اتار کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دیہاتی ڈرائیور کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"آپ سری پور جا رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"کس کے ہاں؟"

"لالہ خوری رام کے ہاں!"

"لالہ خوری رام؟ وہ جن کا بڑی ڈھاب کے پاس مکان ہے، ڈپٹی محمد حسین کے ساتھ، وہ جن کا لڑکا ابھی چند دن ہوئے یہیں سے واپس آیا ہے، سنا ہے وہاں روئی کے کسی کارخانے میں کام کرتا ہے۔ اس کی ہمشیرہ کی شادی آج کل ہونے والی ہے جو....."

"ہاں، ہاں، وہی!"

"میرے خیال میں آپ پہلے کبھی سری پور نہیں گئے؟"

"نہیں۔"

"جی ہاں، مجھے بھی ایسا معلوم ہتا ہے میں نے آپ کو پہلے وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ سری پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور ہم کس کو نہیں جانتے! لالہ خوری رام سے تو میں بہت اچھی طرح واقف ہوں، بڑے نیک آدمی ہیں۔ ان کا گھر ڈپٹی محمد حسین کے گھر کے ساتھ ہے۔ ڈپٹی صاحب بھی بڑے نیک آدمی ہیں، کیا بتاؤں جی، ڈپٹی صاحب کا بڑا لڑکا کیسا خوش شکل اور نیک طینت تھا، طبیعت میں کھوٹ نام کو نہ تھا، پہلوان تھا جی پہلوان، ہمارے سری پور میں کشتی ہوئی، ڈپٹی کمشنر صاحب بھی میلے پر آئے ہوئے تھے، وہاں اس نے کشتی کی اور اللہ بخش کو ہرا دیا۔ اللہ بخش بھی بڑا تگڑا پہلوان ہے مگر ہار گیا جی، کیا بتاؤں جی بڑا اچھا آدمی تھا، ضلعداری کا امیدوار تھا، لیکن دو ہفتے ہوئے ہمارے کوسی نے راتوں رات قتل کر دیا۔ ہمارے ضلعے میں بہت قتل ہوتے ہیں، قتل اور چالان، ابھی پچھلے مہینے میں ڈیڑھ درجن مرتبہ چالان ہو چکا ہے۔ کیا کریں بارشیں، سڑکیں بالکل کچی ہیں، گاڑیوں کا سیتاناس ہو جاتا ہے، پرلی میں نے دو سال ہوئے نئی لی تھی، آج آپ اس کی حالت دیکھیں۔ پائدان، پہیے، بریکیں، مڈگارڈ سب خراب ہو گئے ہیں۔ فضلے کی گاڑی اس سے بھی بری حالت میں ہے ——— او فضل، او فضل، ابے حرامی، اٹھ ادھر کیا ہے، چل اسٹیشن پر چلیں، سواریاں لے آئیں، دیر ہو رہی ہے سورج چھپا چاہتا ہے۔ آج رات کو میری شادی کے گھر دعوت ہے۔ سواری ملے نہ ملے دعوت پر تو پہنچنا ہی ہے۔"

اتنا کہہ کر رجب علی ڈرائیور فضل دین ڈرائیور کو ساتھ لے کر ریلوے سٹیشن کی طرف سواریاں لینے چلا گیا اور پرکاش چند کو چند لمحوں کے لئے بھروسا سا ہو گیا۔

ساڑھے چار بجے کے قریب جب لالی چلنے کو ہی تھی تو لالہ گھسیٹا رام سڑک پر ہانپتے ہوئے آتے دکھائی دیئے اور رجب علی کو انجن بند کرنا پڑا۔

پرکاش چند کی طرف دیکھ کر رجب علی نے معذرت کرتے ہوئے کہا: "لالہ جی سری پور کے بڑے ساہوکار ہیں، اور لیلا بھی مجھ سے یہ تو نہیں پوچھ سکتا کہ اپنے قصبے کے کسی آدمی کو یہاں رات بتانے میں دھکے کھانے کے لئے چھوڑ جاؤں، مجبوری ہے، اگر چہ لاری تو اب بھر چکی ہے۔"

لاری واقعی بھر چکی تھی۔ درمیانے درجے میں جو عورتوں کے لئے تھا، سوشیلا اور لیلا کے علاوہ آٹھ دیہاتنیں بیٹھی ہوئی تھیں اور سوشیلا اور لیلا کے خوبصورت کپڑوں کی طرف دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں، یہ حیرانی دبی دبی سی تھی، ان سے پرے تیسرے درجے میں اور لاری کی چھت کے اوپر بھی جاٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب لالہ گھسیٹا رام لاری کے قریب پہنچے تو رجب علی نے کہا:

"آؤ شاہ جی۔"

"کہاں بیٹھوں؟" لالہ گھسیٹا رام نے کہا۔

رجب علی نے ایک نظر پیچھے کی طرف دوڑائی، پھر آہستہ سے بولا: "یہیں میرے پاس بیٹھ جائیے۔" لالہ گھسیٹا رام رجب علی کے قریب بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ سُرخ تھا اور چیچک کے داغ اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے راستے کی مٹی پر بارش کے چند قطرے، دونوں ہاتھوں کی چھنگلیوں پر سونے کی انگوٹھیاں تھیں اور گلے میں دانتوں کو صاف کرنے والا سونے کا خلال، کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں تھیں۔

"بھائی رجب!" لالہ گھسیٹا رام نے آرام کا ایک لمبا سانس لے کر کہا: "میں تو کچہری سے بھاگتا ہوا آیا، امید نہ تھی کہ لاری مل جائے گی۔"

رجب علی نے پھر اُنجن کھولا۔ ایک پولیس کا سپاہی جس کو سری پور جانا تھا ڈرائیور کی کھڑکی کے قریب مڈگارڈ پر کھڑا ہو گیا۔ لاری آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

سوشیلا اور لیلا بولیں: "بھابی جی!"

"کیوں؟" پرکاش نے پوچھا۔

"دم گھٹا جا رہا ہے۔"

رجب علی بولا: "بی بی جی! ابھی لاری زور سے چلے گی تو خوب ہوا آئے گی۔"

لالہ گھسیٹا رام نے ایک نظر پرکاش چند پٹوالی اور ایک سوشیلا اور لیلا پر، پھر بولا: "آپ لالہ خوردی رام کے ہاں جا رہے ہوں گے، پرکاش دتی کی شادی ہے نا؟"

"جی!" پرکاش بولا۔

تیسرے درجے میں دو تین جاٹ زور زور سے باتیں کرنے لگے، ایک بولا: "میں نے مُوجے سے کہا تھا کہ گواہی نہ دینا، وہ بنیا بڑا بدمعاش ہے۔"

دوسرا بولا: "مُوجا خود کہاں کا شریف ٹھہرا؟"

تیسرا کہنے لگا: "موجے پر جاٹ بھائی ہے، لیکن وہ مہاجن ہے، کھتری بھی نہیں۔"

لالہ گھسیٹا رام نے رجب علی سے کہا: "زمانے کو تو جیسے آگ لگ گئی ہے، بھائی بھائی کا دشمن، اب قریشی بیوپار کا زمانہ نہیں رہا، ابھی میں لمبے سیٹھ رنگ مل کے لڑکے کو سمجھا رہا تھا کہ جاٹوں کو روپیہ قرض نہ دو، سرکار سب قرضے معاف کرنے پر تلی ہوئی ہے اور اگر دوسرے بیوپاریوں کو ادھار دو تو ساتھ ساتھ وصولی بھی کرتے رہو۔ اِدھر اُدھار دیا اُدھر وصولی کے لئے اپنا آدمی بھی دوڑا دیا۔ یہ آج کل کے بیوپار کا قاعدہ ہے۔"

رجب علی آہستہ سے بولا: "کم بخت پسٹن کام نہیں کرتا۔"

درمیانے درجے میں کالے رنگ کے لہنگے پہنے ہوئے ادھیڑ عمر کی دو لالائنیں باتیں کر رہی تھیں: "اس کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ تیرہ سال کی عمر میں دوہوا، ساری عمر مرنے والے کو روئے گی اب چاری کے بھاگ۔ میں نے کریا پر دو ململ کے دوپٹے اور تین روپے نقد بھیج دئے تھے

لیکن کرموں کی ماں تو بڑی کمینی اور بے مروت نکلی۔۔۔۔۔"

ایک جاٹ عورت جس کے کانوں میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں پڑی ہوئی تھیں، بار بار اپنے بچے کو بہلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، اس کے ساتھ کی عورت نے اگر بولی "بہن اسے چھاتی کیوں نہیں دیتیں؟"

"میں تو چھاتی دیتی ہوں مگر یہ پیتا ہی نہیں۔ شاید اس کے پیٹ میں درد ہے 'اُرر۔ آ۔ آ۔ آ۔ اُس۔ اُی۔ ای۔ سورجا میرے لال۔ سورجا۔ بلائے مرجانو، سبحان کھائے جاتا ہے۔"

رجب علی گھسیٹا مل کی طرف اٹھ کر بولا "پسٹن کام نہیں کرتا شاید" لیکن گھسیٹا مل پرکاش چندکی سیٹ پر جھکا ہوا اونگھ رہا تھا۔

پچھلے درجے میں تحصیل کا ایک چپڑاسی ایک جاٹ سے جھگڑ رہا تھا "مالیہ پچاس فی صدی کم ہو، آبیانہ ہٹا دیا جائے، چوکیدار بند ہو جائے تو سرکار کا کام کیسے چلے؟"

جاٹ بولا "پہلے کیسے چلتا تھا جب حاکم کی تنخواہ پانچ روپے ہوتی تھی۔"

"تم کیسا سُکھ شانتی چاہتے ہو؟"

"یہیں جتنا شانتی۔" ایک اور جاٹ نے جواب دیا۔

ایک کسان عورت دوسری سے کہنے لگی "بچن کی ماں دلدار سنگھ کے ساتھ بھاگ گئی ہے، تم نے سُنا؟"

"اب بچن کا باپ ٹکرا لئے ان کی تلاش میں پھرتا ہے۔"

پرکاش چند کے ذہن میں چوتھی جماعت کی اُردو کی کتاب کا ایک سبق گھومنے لگا۔ دیہاتی اور شہری زندگی کا موازنہ، دیہات کی زندگی کتنی دلکش اور پُرلطف ہوتی ہے، سادہ اور معصوم! پرکاش نے سوچا کاش مجھے اُردو کی چوتھی کتاب کا مصنف کہیں مل جائے تو ٹکڑے سے اس کا سر گردن سے الگ کر دوں۔

سوشیلا اور لیلا نے پکارا "بھائی جان! پانی، دم گھٹا جا رہا ہے۔"

رجب علی بولا "آگے نہر آئے گی، اس کے قریب ہی ایک کنواں ہے، اس کا پانی بہت میٹھا اور ٹھنڈا ہے، کیوں لالہ جی؟"

گھسیٹا رام چونک پڑا "ہاں، جی، کچی پیشی، کیا کہتے ہو، اوہ رجبے کیا میں سو گیا تھا؟"

"ہم کہاں آ پہنچے ہیں؟"

پرکاش نے چند سنگترے پھلوں کی ٹوکری سے نکال کر سوشیلا اور لیلا کو دیئے۔

رجب علی بولا "نہر کے قریب لالہ جی۔"

گھسیٹا رام لبوں پر زبان پھیر کر بولا "اوہ بہت پیاس لگی ہے، کنوئیں پر پانی پئیں گے۔"

رجب علی کہنے لگا "میں بابو جی سے کہہ رہا تھا کہ نہر کے کنوئیں کا پانی بہت ہی میٹھا اور ٹھنڈا ہے۔"

پرکاش چند کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، حدِ نظر تک خشک سے کھیت، کہیں کہیں کیکر کے جھنڈ، لاری آہستہ آہستہ نیم ریتلے میدان میں چل رہی تھی، کچی سڑک پر گرد کا طوفان اٹھ رہا تھا، دھوپ بے حد تیز تھی اور آگ کے شراروں کی طرح زمین پر گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، آک کے پھول دھوپ میں، کلِ مصنوعی معلوم ہوتے تھے، پیپل کے ایک بڑے درخت کے نیچے گائیں اور بھینسیں آرام کر رہی تھیں لیکن ان کا رکھوالا وہاں نہ تھا.....

یہ ایک گاؤں تھا، سڑک کے اس طرف لاری ایک گندے جوہڑ کے قریب سے گذر رہی تھی، ایک بھینس پانی میں گھس رہی تھی، ایک عورت خاکی رنگ کی قمیص اور کالے رنگ کا لنگا پہنے پانی بھر رہی تھی، ایک لڑکی، سڈول اور سانولی بانہوں والی نوجوان لڑکی، ٹہنے سے چند لپکے ہوئے

کھڑے کوٹ رہی تھی، سڑک کی دوسری طرف ایک بڑا سا بڑ نظر آرہا تھا جس پر ڈاک کے لئے مُرغ ڈبہ لٹکا ہوا تھا، درخت کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا چھکڑا پڑا تھا، اس پر چار سکھ جاٹ ایک بے حد سیلی تاش سے کھیل رہے تھے، پھر وہی میدان تھا، وہی ریتلی سڑک، وہی تیز دھوپ اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت۔

پرکاش چند نے سوچا، زندگی نہ دیہاتی ہوتی ہے نہ شہری، بلکہ محض "زندگی" کوئی اس کا کوٹ پکڑ کر کھینچ رہا تھا، پرکاش چند نے مڑ کر دیکھا ایک چھوٹا سا خوبصورت بچہ، اپنی ماں کے کندھے سے لگا ہوا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا کوٹ پکڑ رہا تھا، اس کی ماں سیٹ سے سر لگائے سو گئی تھی، وہ اس کا ایک مُرخ دیکھ سکتا تھا، ایک جوان جاٹ عورت، گندمی سا رنگ، کان میں سونے کی بالیاں، تیکھے نقش، لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی۔

بچہ پرکاش چند کو اپنی طرف مڑتے ہوئے دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے حیران ہو گیا۔ پھر خود بخود ہنس پڑا، اور اس کا کوٹ کھینچتے ہوئے بولا "او تو ——— تو ——— لی۔"

پرکاش چند نے اسے ایک سنگترہ دیا، اور بچے نے اس کا کوٹ چھوڑ دیا اور گنگنایا "او تو ——— تو ——— لی ——— او"

جاٹ عورت بیدار ہو گئی، اس کی آنکھیں کھلتے ہی پرکاش چند کو محسوس ہوا گویا کہیں آسمان پر یکایک دو ستارے روشن ہو گئے ہیں جب ماں نے اپنے بچے کے ہاتھ میں سنگترہ دیکھا تو اس کے خواب آلود چہرے پر اس کے نیم تبسم لب پرکاش چند کو بہت دلفریب معلوم ہوئے، اس کے شباب میں اس نے ایک آسودگی اور دوشیزگی سی محسوس کی اور اسے خیال آیا کہ دیہاتی زندگی شہری زندگی سے کہیں بہتر ہے۔

لاری چلتے چلتے تھم گئی، ایک بوڑھی عورت ایک چھوٹی سی لڑکی کو ساتھ لئے راستے کے بیچ میں کھڑی تھی، بولی "ہمیں سری پور جانا ہے۔"

رحب علی بولا "اماں، جگہ تو بالکل نہیں۔"

بوڑھی عورت بولی "بیٹا! میں سہارا لے کر کہیں کھڑی ہو جاؤں گی، ہاں، مگر تو اس بیری لڑکی کو کسی کونے میں بٹھا دے۔" رحب علی نے ایک کسان سے کہا کہ وہ لاری کی چھت پر چلا جائے اور بوڑھی عورت کے لئے جگہ خالی کر دے۔ کسان لاری کی چھت پر چلا گیا جہاں پہلے بھی چار پانچ دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے اور جب لاری چلی تو انھوں نے گانا شروع کر دیا۔

او بنتو ———
بنتو دا سہ بن درگا
بنتو دا منہ جن درگا
بنتو دا لک چندرا
او بنتو ———

پرکاش نے دل ہی دل میں جاٹ کی شاعری کی تعریف کی۔ بنتو ایک جاٹ کی محبوبہ ہے، لیکن اس کے سر کے بال ایسے ہیں جیسے ایک وسیع جنگل اس کا چہرہ چاند اور اس کی کمر چیتے کی سی، جاٹ کی شاعری میں اس کے دیہات کے کھلے کھیتوں کی سی وسعت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ پرکاش نے چور نگاہوں سے پھر نوجوان عورت کی طرف دیکھا۔ بچے نے اس کا کوٹ پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھا دئے اور نوجوان عورت کی نگاہیں پرکاش کی نگاہوں سے مل گئیں۔

لاری نہر کے پُل پر سے گذر گئی، آگے جا کر ایک کنواں آیا، وہاں لاری ٹھہر گئی اور مسافر پانی پینے لگے، پرکاش نے چاندی کا سفری گلاس نکالا اور سیلا کو پانی پلانے لگا، جب وہ پانی پی چکیں تو نوجوان عورت نے بھی آہستہ سے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی، پانی واقعی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔

پرکاش نے دیہاتی عورت کو پانی پلاتے ہوئے محسوس کیا کہ ان میں ایک فطری شائستگی ہوتی ہے' دیہاتی عورتوں میں' لیکن بچہ بڑا شریر تھا۔ اس نے پانی پیتے ہوئے گلاس کے پانی میں اپنے سانس سے بلبلے پیدا کرنے شروع کر دیئے اور اس کی ماں نے آہستہ سے گلاس اس کے ہاتھ سے چھین کر پانی نیچے گرا دیا اور پھر معجب نگاہوں سے پرکاش کی طرف دیکھ کر گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

چند میل آگے جا کر نوجوان عورت لاری سے اتر گئی' اسے سامنے کے ایک گاؤں میں جانا تھا۔ لاری سے اترتے ہی اس نے سروں کے ساگ کی سبز سبز کرنپلوں کا گٹھا اپنے سر پر رکھ لیا اور بچے کو کمر کے خم میں' اس نے ایک نگاہ پرکاش پر ڈالی' گویا کہہ رہی تھی مجھے اچھی طرح دیکھ لو' ہم تم پھر کبھی نہیں ملیں گے' میں اب اپنے گھر جا رہی ہوں' جہاں میرا خاوند اپنی بہتر کا انتظار کر رہا ہے' میں کماد کی فصل کاٹوں گی' گیہوں کی بالیاں الگ کروں گی' اور باجرے کی روٹیاں اور چھاچھ کی ٹھلیا لے کر اپنے گھر والے کے پاس کھیتوں میں جاؤں گی' یہی وہ پگڈنڈی ہے جہاں سے میرا اور تمہارا راستہ ہمیشہ کے لئے الگ ہوتا ہے۔

اور پرکاش جو باغیانہ خیالات رکھتا تھا۔ اپنے دل میں کہنے لگا' ٹھیک ہے بہتر' اس میں میرا یا تمہارا کوئی قصور نہیں' یہ سماج کا قصور ہے' اس زندگی میں اب کوئی خالص مرد یا عورت نہیں' بھائی' بہن' خاوند' بیوی' بھانجا' بھتیجی' ماموں' پھوپھی اور خالہ ہیں لیکن ایسا کوئی نہیں جو اپنے آپ کو مرد یا عورت کہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔

نوجوان عورت آہستہ سے پگڈنڈی پر مڑ گئی' اس کی ہلکے سبز رنگ کی قمیص پر روپہلی کناری دھوپ میں چمک رہی تھی۔

پرکاش نے دل میں کہا خدا حافظ' خدا حافظ اس لئے کہ ہم انسان ہیں۔ لیکن اگر ہم انسان نہ ہوتے بلکہ کبوتر یا چڑیا..... تو..... اور پرکاش کے شاعرانہ تخیل نے دیکھا کہ وہ دونوں کبوتر بن گئے اور اپنے سفید پر پھیلائے ہوئے اڑے جا رہے ہیں۔ نڈر' بے باک' خوش' نہیں وہ چڑیوں کا ایک جوڑا تھے اور ایک دوسرے سے بھاگتے ہوئے' ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے' ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے اڑے جا رہے تھے' سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا اور کبوتروں کے پیلے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ مغربی آسمان پر شفق کی سرخی تھی اور سطح زمین پر ایک سنہری دھند' ککیر کی پتلی' گھنی اور خاردار ٹہنیوں کے بیچ میں سورج کی کرنوں نے ایک نقرئیں گھونسلا بُن دیا تھا۔

بلند اڑ کر گھونسلے میں جا بیٹھی' پر پھیلائے ہوئے پرکاش کی طرف دیکھنے لگی اور چہکنے لگی "چ۔ چ۔ چوں چوں" پرکاش نے اپنی چونچ اس کی چونچ سے ملا دی اور ککیر کے بہت سے پیلے پیلے پھول ان کے پروں پر گر پڑے۔ یکایک رہب علی بولا۔ "یہ پینٹنگ کام نہیں کرتا۔"

محور

سری پور کا قصبہ دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے' یہ قصبہ کسی زمانے میں ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ اسے سکھوں کے ایک مقدس گورو نے چند اونچے ٹیلوں پر بسایا تھا لیکن اونچے ٹیلوں پر آہستہ آہستہ ریگ اڑ اڑ کر جمع ہو گئی اور اونچی اونچی حویلیاں کھنڈر بن کر رہ گئیں' وقت' مذہب کا بھی پاس نہیں کرتا۔ چنانچہ سری پور کا مقدس شہر امتدادِ زمانہ سے ایک معمولی سا قصبہ بن کر رہ گیا۔ ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں اکثر دکانوں پر حقہ گڑگڑایا جا رہا تھا یا تاش کھیلی جا رہی تھی۔ نحیف اور رُوکھے مریل سے کتے بازار کی نالیوں میں لیٹے ہوئے تھے اور دو تین آوارہ گدھے اپنے لمبے لمبے کان ہلاتے بازار کی رونق دیکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ کیونکہ آج بازار میں دو دیہ رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ جھنڈیاں بازار کے پہلے دروازے سے شروع ہو کر جہاں لاری کا اڈہ تھا' لالہ خوری رام کے گھر تک لگی ہوئی تھیں جو ایک چھوٹی سی حویلی کے قریب واقع تھا' یہ حویلی اس زمانے میں ایک اونچا تیلہ تھی۔ اب دریائے بیاس کے پانی سے بھری ہوئی تھی۔ پرکاش چند نے سوچا اس قصبے میں کتنا امن ہے۔ اچھا تو یہ دیہات ہے۔ یہاں تو لوگوں کو

کوئی کام نہیں۔ زندگی کی رفتار کتنی مدھم اور سکون آمیز ہے۔ دریائے بیاس کے پانی کی طرح، یہاں آدمی چاہے دن بھر تاش کھیلے، چاہے چرخہ چلائے، بہرحال چرخہ تاش سے بہتر ہے۔ اس نے دل ہی دل میں گاندھی جی کی فراست طبع کی داد دی۔ چند ایک لوگوں نے اسے گھور کر دیکھا، سوشیلا اور لیلا اس کے ساتھ ساتھ لگی چلی آرہی تھیں۔ ان کے بٹر کیلے لباس جو بازار میں لگی ہوئی جھنڈیوں کی طرح رنگین اور جاذب نظر تھے کتنوں ہی کی نظروں کو خیرہ کرتے رہے۔ ایک دکان پہ ایک گاڑی بان چمکتے پرسے بنولے کی بوریاں اتار کر رکھ رہا تھا، وہ انہیں دیکھ کہ بنولے کی بوریاں اتارنا بھول گیا، پھر اس کے لبوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اسے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی اور اس کا چہرہ جیسے کسی الجھن سے فوراً صاف ہوگیا۔ جب سوشیلا، لیلا اور پرکاش چند اس کے قریب سے گذرے تو گاڑیبان بڑے مزے سے گنگنایا۔

اک بنگلہ بنے نیارا .....

اور پھر بنولے کی بوریاں دکان پر پھینکنے لگا، سوشیلا اور لیلا کے چہرے شرم سے گلابی ہوگئے اور پرکاش چند نے سوچا کہ ہندوستانی غریب طبقوں میں بھی شخصی جائداد کی حس کتنی تیز اور شدید ہے۔ اس بنگلے کی ہوس نے انہیں بزدل، غلام اور خوشامدی بنا دیا ہے۔ ایک ہندوستانی کی جنت تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ بیوی، بچہ اور بنگلہ۔ لالہ خوری رام کے مکان کے دروازے پر بینڈ بج رہا تھا۔ پرکاش چند نے لالہ خوری رام کے پاؤں چھوئے اور سوشیلا اور لیلا نے ایک کونے میں سمٹ کر ہاتھ جوڑے۔ لالہ خوری رام کا لڑکا ہیر بھاگتا اندر سے آیا اور پرکاش چند کے گلے سے لگ گیا۔ وہ دونوں چار سال کے بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ ہیر اب پہلے سے لمبا، مضبوط اور جوان ہوگیا تھا، چین کے دور دراز ملک میں رہ کر اس نے دنیا کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ لئے تھے۔ اس کے لہجے میں خودداری تھی اور بلند حوصلگی اور خود اعتمادی، جب وہ سری پور سے گیا تھا تو بالکل ایک لڑکا سا تھا، چہرے پر خط بھی نہ آیا تھا اور بالکل کالج کے لڑکوں کی طرح باتیں کیا کرتا تھا اور اب..... اب پرکاش چند کو افسوس ہوا کہ وہ خود کیوں اتنے عرصے تک لاہور کے کونجیں کا ویڈنگ بنا رہا، ماحول کا اثر تو ان آسانی یا ایک جیتی کرتوری، لالہ خوری رام کے گھر کے اندر پرکاش چند کی خالاؤں، پھپھیوں، بھانجیوں، بھتیجیوں اور رشتے کی بہنوں کا شمار نہ تھا، انہوں نے سوشیلا اور لیلا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پانچ منٹ میں ان کے پاؤں سے سٹریم لائن STREAM LINE سینڈلوں سے لے کر کان کے آویزوں تک کو پرکھ کر رکھ دیا۔ باتفاق رائے پاس ہوا کہ سوشیلا اور لیلا دونوں لاہور کی مسیں ہیں۔ سوشیلا کے لمبے لمبے ناخن دیکھ کر کئی لڑکیوں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ناخنوں پر سرخ رنگ کا پالش کیا گیا تھا جس کی یاقوتی چمک کے آگے حنا کی رنگت ماند پڑ گئی تھی۔ اری..... یہ کیا چیز ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ پتہ، پتہ، پتہ، مگھ دو پتہ، لیلا کا چہرہ خفت سے بیر بہوٹی ہوا جا رہا تھا۔ اس کے طلائی آویزوں کی طرف اب کسی کی توجہ نہیں رہی تھی۔ یہ چڑیلیں چلا چلا کر سوشیلا کے ناخنوں کو سراہ رہی تھیں۔ لیلا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مردار بتیاں کہیں کی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا..... آنگن میں ہار پائی پر پرکاش اور ہیر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہیر کی ماں مسکراتی ہوئی ان کی طرف بڑھی اس نے ریشمیں اور پھولدار شلوار پہن رکھی تھی۔ زعفرانی قمیص اندر سر پر سنہری کناسے والا سرخ دوپٹہ تھا۔ دونوں ہاتھوں میں دو انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ ہیر کی ماں نے مسکراتے ہوئے پرکاش دتی کی شادی پر نہ آنے کا شکوہ کیا۔ ہیر نے بھی جھوٹ موٹ غصے کا اظہار کیا اور پرکاش نے بھی کچھ اس طرح سر جھکا کر شرمساری اور ندامت دکھائی کہ ہر ایک کی عزت رہ گئی اور کسی کی بات بگڑنے نہ پائی۔ کیونکہ اس بات کا تو ہر ایک کو پتہ تھا کہ اگر شادی پر خاندان کے تمام قرابت دار اپنے گھر کے تمام لوگوں کو لے کر چلے آئیں تو جہاں جنگل میں منگل ہو سکتا ہے وہاں منگل ہونے والے منگل میں آگ بھی لگ سکتی ہے یعنی ایک پوری بارات گھر کے دروازے کے اندر ہوگی اور ایک باہر، اور اگرچہ بعض پرانے خیالات کے لوگوں کے نزدیک لطف کی بات یہی ہے کہ دونوں طرف ہر آگ برابر لگی ہوئی، لیکن ہیر کی ماں ان لوگوں میں سے نہیں تھی، اس لئے جب پرکاش نے معذرت پیش کی کہ آج گھر میں کسی کا ہر سانہ زدی تھا تو وہ سن کر اور اس کے سر کی بلائیں لے کر وہاں سے چلی گئی۔ پرکاش نے ہیر سے پوچھا کہ چین کیسا ملک ہے اور ہیر جواب دینے ہی کو تھا کہ رک گیا، کیونکہ ایک حسین شرمیلی لڑکی جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کنوارپنے کی ناز ک پاکیزگی کانپ رہی تھی، ان کی طرف

جگمگاتے ہوئے ستاروں سے بڑھتی چلی آرہی تھی اور جب وہ بالکل ہی قریب آگئی تو بیرے کے لب کانپنے لگے اور لڑکی کے رخسار گلاب کے پھول بن گئے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو پلکوں کے پردوں میں چھپا لیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لسی کے دو گلاس تھام رکھے تھے وہ ان کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور نرمی سے کچھ بولی۔ بیرے نے آہستہ سے جیسے وہ گلاب کی کسی پتی کو چھو رہا رہا ہو اس کے ہاتھوں سے گلاس لے لئے اور ایک گلاس پرکاش کے ہاتھ میں دے کر دوسرا اپنے منہ تک لے گیا۔ لڑکی اب بھی خاموش تھی۔ لیکن پرکاش نے ایک لمحے کے لئے اس کی پلکیں اٹھتی ہوئی دیکھیں۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اس لڑکی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پرکاش کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ آہ، یہ دل کی دھڑکن۔ اس نے سوچا "کبھی کبھی کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگتا ہے، ڈوبے ہوئے خون میں طوفانی ریلے آجاتے ہیں۔ شاید ابھی حسن کا احساس پوری طرح مرا نہیں" وقت کی میز نے ابھی اس کی روح کو کچل نہیں دیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد پرکاش نے پوچھا "یہ کون تھی؟"

بیرے نے کہا "چین بہت اچھا ملک ہے۔"

پرکاش نے کہا "میرا اشارہ اس لڑکی کی طرف تھا جو لسی کے دو گلاس ہمارے لئے لائی تھی۔"

بیرے نے کہا "چین کے لوگ افیم کھانے اور چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی ....."

پرکاش چارپائی سے اٹھ بیٹھا، کہنے لگا "بھاڑ میں جائے ان کی زندگی۔ ہماری زندگی کب ان سے بہتر ہے اور تم یہاں چینیوں کے داؤں ہم پر آزمانا چاہتے ہو۔ ذرا سنبھل کر چلنا یہ شہر گلگتا نہیں۔ سری پور ہے چینیوں کا خدا ہمارا خدا نہیں، ہماری زندگیاں چینی کے برتنوں کی طرح خوبصورت نہیں بلکہ مٹی کے برتنوں کی طرح میلی اور ناصاف ہیں لیکن میں کس گدھے سے بات کر رہا ہوں۔ اچھا میں کرسٹے پر چلتا ہوں۔ ذرا پرکاش وتی سے دو میٹھی میٹھی گالیاں سن آؤں۔"

بیرے نے کہا "پرکاش وتی سے مل کر باہر بیٹھک میں آجانا۔ تمہیں اپنے چند نئے دوستوں سے ملاؤں گا۔"

پرکاش وتی دوسری منزل پر ایک کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ پرکاش کا خیال تھا کہ وہ بہت سی لڑکیوں میں گھری ہو گی اور اسے دو چار میٹھی میٹھی گالیاں سننے کا موقع بھی نہیں ملے گا لیکن حسن اتفاق سے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پرکاش بہت خوش ہوا، اس نے پرکاش وتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی حنائی انگلیوں کو زور زور سے مسلنے لگا۔ لیکن پرکاش وتی بولی نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے پرکاش وتی کی ٹھوڑی کو اونچا کیا اور کہنے لگا "خفتی بہن! تمہارا بھائی تمہیں بدھائی دینے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی ہو۔"

اور پرکاش وتی سچ مچ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی تھی۔ یہ بات سنتے ہی وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ پرکاش بولا "تو تو کہتی تھی کہ میں بی۔ اے پاس کر کے نوکری کروں گی یا کہانیاں لکھوں گی اور شاعری کروں گی اب بتا، یہاں تو مجھے کسی نے گیارھویں جماعت سے آگے نہیں پڑھایا اور تو تو شاید فلم ایکٹرس بننا چاہتی تھی، اب وہ اداکاری کے ولولے کہاں گئے؟ تیرے وہ سونے کے تمغے جو تو نے ہاوڑہ یا الہ آباد میں ناچ ناچ کر حاصل کئے تھے اب کہاں ہیں؟"

پرکاش وتی نے رو کر کہا "اسی لئے تم مجھے جلانے آئے ہو۔ کیا میں اب تم سے بھی ہمدردی کی امید نہ رکھوں؟"

پرکاش چپ رہا اور چند لمحوں تک آنسوؤں کی ان دو ندیوں کی طرف تکتا رہا جو اپنی روانی میں زندگی کے پورے نہ ہونے والے سپنوں کو بہائے لئے جا رہی تھیں۔ اسے پرکاش وتی سے بہت محبت تھی۔ پرکاش وتی اسے بہنوں کی طرح عزیز تھی، شاید بہنوں سے بھی زیادہ۔ کیونکہ سارے خاندان میں وہی ایک لڑکی تھی جو اس کی طرح ادبی مذاق رکھتی تھی۔ اسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بہت اچھا گاتی تھی اور تیتری کی طرح ناچ سکتی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ پرکاش وتی کی شادی کسی اچھے آدمی سے ہو، اس کی مراد ایسے آدمی سے تھی جسے عام لوگ برا کہتے ہیں۔ مثلاً ایک خوبصورت طرح دار نوجوان جسے اچھے لباس کا شوق ہو، جو گانے اور ناچنے کا شوقین ہو، جو حسن کی قدر کر سکے، پڑھا لکھا ہو اور کبھی کبھی کوئی شعر گنگنا سکے۔ غرض کہ ایک ایسا آدمی

جو ہندوؤں کے متوسط طبقے کی مستورات میں بہ نظرِ حقارت دیکھا جاتا ہو اور اسے یہ بھی پتہ تھا کہ پرکاش وتی کی بھی یہی مرضی تھی۔ لیکن نہ تو پرکاش وتی میں اپنی مرضی بہتنے کی ہمت تھی اور نہ اس کے ماں باپ کا تخیل اس قدر بلند تھا۔ وہ "بے حیا" نہ تھے۔ انہوں نے کبھی سینما تک نہیں دیکھا تھا اور زندگی بھر اپنے بالوں میں آملے کا تیل درجہ اوّل نہیں لگایا تھا، نہ کبھی ٹیڑھی مانگ نکالی تھی۔ ان کے وقت میں سکولوں میں ناچ اور گانے نہیں سکھائے جاتے تھے بلکہ لوگ باشسٹ اور ستتی پاچن پڑھائے جاتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے اپنی لڑکی کو گیارھویں تک پڑھایا تھا۔ اسے سری پور کے گاؤں سے دور ایک دوسرے شہر کے مہاودیالہ میں داخل کرایا تھا۔ لیکن شادی کے معاملہ میں وہ بے حیائی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے سوچ بچار کر کے اور اچھی طرح دیکھ بھال کر ایک امیر گھرانے کا لڑکا پسند کیا تھا۔ لڑکے کے ماں باپ امرت سر کے مشہور ساہوکار تھے اور تھوک ہلدی بیچتے تھے۔ ہلدی بیچ بیچ کر انہوں نے امرت سر میں لاکھوں کی جائداد بنا لی تھی۔ انہوں نے لڑکی کے لئے نہایت اچھا بر ڈھونڈا تھا۔ کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی کی اصلی مسرت چند شعروں پر نہیں بلکہ ہلدی کی بے شمار گانٹھوں پر قائم ہے۔ عورتوں کا کام پڑھنا لکھنا اور ناچنا نہیں بچے جننا اور برتن مانجھنا ہے۔ زندگی کا اصلی لطف برتن جمات کرنے میں ہے، شعر کہنے میں نہیں۔ خیالی دنیا عملی دنیا سے بہت الگ ہے۔ بے وقوف پرکاش وتی کے آنسوؤں کو دیکھ کر پرکاش کو بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا "لاکھوں کی جائداد کی مالک بن رہی ہو اور اب یوں آنسو بہا رہی ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

پرکاش وتی روتے روتے ہنس پڑی۔ کہنے لگی "مجھے اس طرح ننگ کرنے میں تمہیں کیا فائدہ ہے؟ جاؤ ہٹو۔"

پرکاش نے کہا "ہم نہیں ہٹیں گے۔ کوئی بات ہے بھلا یہ بھی؟ یوں آنسو بہا کر ہم پر رعب جمایا جا رہا ہے۔ اے ہلدی بیچنے والے کی ہونے والی بیوی! ہم تم سے ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں۔ جواب دو گی؟"

پرکاش وتی نے کہا "تم لاکھ بار پوچھو۔ ہم تب بھی نہیں بتائیں گے۔"

پرکاش نے سنجیدہ ہو کر کہا "دیکھو جب تک تم خود نہ اڑو، اپنے پر نہ پھڑپھڑاؤ یہ زمین تمہیں اڑنے نہ دے گی۔"

پرکاش وتی نے کہا "کوئی پر پھڑپھڑائے بھی تو اڑ کر کہاں جائے؟ یہ بھی تم نے کبھی سوچا ہے!"

اس کی آواز پھر بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

اور پرکاش چپ ہو گیا۔ لاجواب ہو گیا۔ ہنسی ہنسی میں اس نے پرکاش وتی کے دل کے درد کو پا لیا تھا۔ اسے ہمدردی بھی تھی لیکن یہ بھی خیال تھا کہ اگر پرکاش وتی چاہتی تو اپنی مرضی کا بر ڈھونڈھ سکتی تھی، یا اپنے ماں باپ کو مجبور کر سکتی تھی۔ لیکن پرکاش وتی کے دو بے ساختہ فقروں نے اسے احساس دلا دیا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا اور عملی طور پر کس قدر ناممکن! اندھی سماج کے قفس میں پر پھڑپھڑانا بے سود ہے۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ مرہلدی بیچنے والے کی وفادار بیوی بن کر برتن صاف کرے۔ اس نے پرکاش وتی کے آنسو پونچھ ڈالے اور پرکاش وتی نے اس سے کہا کہ اگر تم شادی میں نہ آتے تو شاید میں مر ہی جاتی۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ اس خوفناک شادی کے تمام مراحل سے ایک انجان اور شرمیلی دلہن کی طرح گذر جاؤں۔ اب تمہارے ہوتے ہوئے میرے ہمت بندھ جائے گی۔

پرکاش نے کہا "تم تو جھوٹ بھی اس طرح بولتی ہو کہ بالکل سچ معلوم ہوتا ہے۔" پھر ہنس کر کہنے لگا "آخر ایک دکاندار کی بیوی ہو نا؟"

پرکاش وتی نے بھویں اوپر چڑھائیں اور کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا اندر کمرے میں داخل ہوا، کہنے لگا "پرکاش جی کو سائیں جی کے پتا جی بلاتے ہیں۔"

پرکاش نے پوچھا "سائیں جی کون ہیں؟"

پرکاش وتی بولی "یہ لڑکا اپنے آپ کو سائیں جی کہتا ہے، پاگل ہے، اس کا باپ پٹواری ہے۔"

پرکاش نے پوچھا "سائیں جی کے پتا جی کہاں ہیں؟"

لڑکے نے کہا: "باہر بیٹھک میں بیرے کے پاس بیٹھے ہیں۔"
پرکاش نے کہا: "اچھا تو میں چلتا ہوں۔ اب تم بھی سہیلیوں میں بیٹھو، ہنسو، کھیلو، آخر یہ شادی ہے تمہاری۔"
پرکاش دبتی پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگی۔

باہر بیٹھک میں بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور بیرے نے پرکاش کا تعارف سب سے کرایا۔ چونی لال قصبے بھر میں ہاکی کا زبردست کھلاڑی اور بیرے کا بچپن کا دوست، لالہ سیتا رام پٹواری، لمبا، دبلا، پتلا، ناک پر عینک اور عینک کے پیچھے دو اداس سی آنکھیں، ایسی آنکھیں جو اکثر پڑھا لکھوں کے پاس نہیں ہوتیں۔ خوش رو تین برجیندر، بیرے کا بھتیجا جو ڈاک خانے میں ایک ممتاز عہدے پر ملازم تھا۔ ہر وقت ہنسنے والا بوڑھا سنگھ قصبے کے سیٹھ کالو رام، دھن سیال جس کا باپ بمبئی کے ایک زبردست تاجر کا منیم تھا اور رام لال، منگت رائے، بھیرو، رامو، ڈھیرو اور گاؤں کے وہ تمام معزز آدمی جن کے بغیر کوئی شادی کامیاب نہیں ہو سکتی، جن کی صورتیں منحوس ہوتی ہیں، کپڑے غلیظ اور داڑھیاں الجھی ہوئی، لیکن جن کا دل سونے کا ہوتا ہے اور ہاتھ لوہے کی طرح مضبوط، یہ وہ نیک دل فرشتے ہوتے ہیں جو تین چار سو آدمیوں کی بارات کو پکیوں میں بھگتا دیتے ہیں اور جب گھی میں پوریاں تلنے بیٹھتے ہیں تو گھنٹوں بغیر تھکے کی مدد کے تلتے ہی رہتے ہیں اور جب کٹاؤ بیان بھجنے پر آ جاتیں تو بڑے بڑے جغادری جھیوروں کو مات کر دیتے ہیں۔ یہ آدمی غریب ہوتے ہیں لیکن شادی کے دنوں میں ان کی سماجی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے ان دنوں وہ چاچا، ماموں، تایا کے معزز القاب سے بلائے جاتے ہیں۔ شادی کے رسم و رواج سے یہ لوگ بہت واقف ہوتے ہیں اور جب عورتیں گھنٹوں جھگڑنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ جب دولہا آئے تو دروازے کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل ڈالنا چاہئے یا زعفرانی گھی تو چاچا پھیرو ایک دم پانی کے گلاس میں چند چاول اور زعفران کے تنکے ڈال کر اسے لنڈھا دیں گے۔ یہ لو۔ نہ تیل کا نقصان ہوا اور نہ گھی خراب ہوا، اور رسم بھی پوری ہو گئی۔ انہی باتوں سے تو یہ لوگ شادی بیاہ کے دنوں میں پوجے جاتے ہیں۔

برجیندر نے جس سے بیرے کی بڑی بہن بیاہی ہوئی تھی، پرکاش سے پوچھا: "آپ بھابھا جی، لاہور میں کیا کام کرتے ہیں؟"
بھابھا جی؟ پرکاش نے سوچا۔ یہ صاحب مجھ سے کئی سال بڑے ہوں گے۔ لیکن پھر بھی مجھے بڑا بھائی کہہ کر پکارنے پر مصر ہیں اور ایک انجی پہچی کیا معروف ہے..... اور پھر پرکاش کو وہ تمام واقعات اور وہ تمام شادیاں اور دیگر تقاریب یاد آئیں جہاں بہت سے نئے ملنے والوں نے اسے جھٹ بڑا بھائی بنا لیا تھا۔ شاید یہ اس کی گنجی چندیا کا اثر تھا یا اس کے چہرے کی کیفیت کا جس سے ادھیڑ پن ٹپکتا تھا۔ لیکن اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ پرانے خیالات کی یاد بہت تلخ تھی جس نے اسے قبل از وقت معمر کر دیا تھا۔ لیکن موجودہ زندگی بھی چنداں شرمسگار نہ تھی، کنبے کا پیٹ بھرنے اور روزی کمانے کے کھکھیڑوں نے اس کی رو رح کو کچل دیا تھا اور اس کے ضمیر اور اس کے اخلاق کو نیم مردہ کر دیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی وہ سوئی ہوئی عمنش بیدار ہو جاتی تھی اور پھر اس کی ٹیس سے متاثر ہو کر اس کا جی چاہتا کہ وہ کپڑے پھاڑ کر نکل بھاگے اور چیخ چیخ کر قدرت اور سماج کے وحشیانہ مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے۔ لیکن یہ طوفان ہمیشہ دل کی چار دیواری تک ہی محدود رہتا۔ اس کا اثر صرف اس کی اپنی ذات پر ہی تھا اور جس طرح طوفان ساحل کی دیوار کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس کی اندرونی زندگی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی، اس کی جوانی راکھ کا ایک ڈھیر اور روح ایک لغزیدی ہوئی لاش۔ اس لئے اب جب کوئی اسے بھابھا جی کہہ دیتا تو اسے حیران حیرت نہ ہوتی اور وہ اپنے دل کی اداسی کو اپنے لبوں کی مسکراہٹ میں چھپا لیتا اور اپنے مخاطب کی شوخ کلامی کی داد دیتا جس نے ایک لمحے میں اسے بڑا بھائی کہہ کر اپنے آپ کو جوان بنا لیا تھا۔

پرکاش نے کہا: "میں کراپٹ بنک میں کلرک ہوں۔"
"کیا تنخواہ ملتی ہے؟"

"پچھتر روپے!"

"پچھتر روپے!" پٹواری نے کہا۔ "تب تو مزے میں ہیں آپ بھائی صاحب!"

"جی! آپ کی عنایت ہے۔"

بڑا سنگھ ہنسنے لگا۔ گاؤں کے سیٹھ کا لڑکا ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ پرکاش کو اس کا ہنسنا بہت برا لگا لیکن اس ہنسنے میں کوئی بھائی نہ تھی۔ یہ زندگی اور بے فکری کا ایک مسلسل قہقہہ تھا جس میں پرکاش کی پرتانی لگا ہوں کو طنز کے تیر و نشتر چبھے ہوئے نظر آئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بڑا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پٹواری جی! کوئی گیت سنائیے۔"

پرکاش نے پٹواری کی اداس آنکھوں سے پوچھا۔ "کیا انہیں گیت بھی یاد ہیں؟"

پٹواری نے بڑا سنگھ سے کہا۔ "بھئی، اس وقت جی نہیں چاہتا۔"

پرکاش نے پٹواری کی اداس آنکھوں کی اداسی کو دیکھ کر کہا۔ "بیشک تمہیں گانا آتا ہے۔ تمہیں کئی گیت یاد ہوں گے، کئی گیت، جو تمہاری اداسی نے خود بنائے، جو تمہارے دل کے تاروں سے نکلے اور جو کئی جنموں تک تمہاری روح کے ویرانے میں گونجتے رہیں گے، لیکن کیا ہرا تمہیں یہ اداسی تم نے کہاں سے پائی؟"

پٹواری نے جیسے پرکاش کے دل کی بات سن لی، کہنے لگا۔ "بھئی آج تو جی نہیں چاہتا۔ سائیں کی حالت ہر روز بگڑ جاتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

چاچا پھیرو نے حقہ آگے کر کے کہا۔ "حقہ پیجئے لالہ جی۔ ذرا دیکھئے اس وقت تو خوب چل رہا ہے۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "لالہ جی! سائیں آپ کا لڑکا ہے؟ بڑا عجیب سا لڑکا ہے۔"

"عجیب؟" پٹواری نے آہستہ سے کہا۔ "وہ تو پاگل ہے جی۔ کیا بتاؤں! اس پر اکثر جنون کی کیفیت طاری رہتی ہے اور اول جلول بکنے لگتا ہے۔ ہمارے ہاں مسلمان فقیر اسے فقیر سمجھتے ہیں اور اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو پتھر کی لکیر۔ اور قصبے کی سب عورتیں سمجھتی ہیں کہ وہ کوئی بڑا عامل ہے اور ہر مرض کا علاج جانتا ہے اور یہ شیطان بھی جسے چٹکی اٹھا کر دے دیتا ہے انیشر کی مرضی سے وہ بالکل بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔"

"کمال ہے؟"

چونی لال نے کہا۔ "ہاں میرا چھوٹا بھائی دس روز بخار میں مبتلا رہا۔ حکیم صاحب نے بہتیری کوشش کی، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ یہ سائیں گلی میں کھیل رہا تھا میں اسے بلا لایا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا۔ "بھائی اچھا ہو جائے گا۔ بھائی اچھا ہو جائے گا۔ بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی فکر نہیں۔ کوئی فکر نہیں ——— اور دوسرے دن میرے چھوٹے بھائی کا بخار اتر گیا۔"

"کمال ہے۔" پرکاش نے حیرانی سے کہا۔

پٹواری نے کہا۔ "یہ مسلمانوں کے گھروں میں جا کر سب کچھ کھا پی آتا ہے۔ اسے ان باتوں کی بالکل تمیز نہیں۔ ڈپٹی صاحب اس سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ جب ڈپٹی صاحب کا لڑکا فوت ہونے کو تھا اس نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔"

"بڑے تعجب کی بات ہے۔" پرکاش نے کہا۔

پٹواری لالہ اس سے پہلے میرے تین لڑکے تھے، وہ سب مر گئے۔ اب یہی پگلا میری آنکھوں کا نور ہے۔ اب میں کسی سے رشوت بھی نہیں لیتا کسی کو بے جا تنگ نہیں کرتا۔ لیکن بھگوان کرنہ جانے کیا منظور ہے۔ پچھلے سال اس کا ایک چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بھائی آئے گا۔ پھر اس لڑکے کی پیدائش کے چند ماہ بعد اس نے ایک دن اپنی ماں سے کہا کہ آج میرے بھائی کی اچھی طرح حفاظت کرنا۔ اسے

باہر لے کر نہ پھرنا اور نہ اسے کوٹھے پر لے جانا' اس کی ماں نے ایسا ہی کیا۔"

رحمن کسیاں نے بات پوری کرتے ہوئے کہا: "ہاں' اسی دن دو چھوٹے چھوٹے لڑکے کوٹھوں پر گر کر مر گئے۔"

چوہدری نے کہا: "اور وہ چھوٹا بچہ یا میرا توہم نے سائیں سے کئی بار پوچھا لیکن اس کم بخت نے زبان تک نہ کھولی۔ آخری رات' وہ رات مجھے اچھی طرح یاد ہے' سائیں کی ماں سو گئی تھی۔ چھوٹا بچہ بھی اس کی گود میں لیٹا سو رہا تھا اور سائیں بھی اپنی چھوٹی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ اس رات مجھے نہ جانے کیوں نیند نہ آئی اور میں بستر پر پڑا بہت دیر تک گنگناتا رہا۔

بزار وکھیندا لاجا
مٹی نہ پھرول جوگیا
مٹی نہ ٹول جوگیا
تیرا بھانئیں لال گواچا
مٹی نہ پھرول جوگیا

یکایک سائیں نے چیخ ماری اور اٹھ کر کہنے لگا: لے گئے لے گئے میرے بھائی کو لے گئے۔" میں گھبرا کر بستر کی طرف گیا جہاں بچہ سویا پڑا تھا۔ ہاتھ لگا کر دیکھا۔ ہائے میرا بچہ مُردہ اور بے جان اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ بے خبر سوئی پڑی تھی اور اس کے لال کو رات کے اندھیارے میں یم راج کے دوت اٹھا کر لے گئے تھے ....."

شام کے وقت ہیر کا بھنوئی جوہندر اور پرکاش بیاس کے کنارے سیر کرنے کو گئے۔ ریتلے ٹیلوں پر کہیں کہیں کیکر کے درخت اُگے ہوئے تھے اور ان سے نیچے اگر کہ کمیت تھے لیکن فصل کاٹی جا چکی تھی' اس لئے بالکل روکھے سوکھے دکھائی دے رہے تھے۔ دریا کے کنارے کہیں کہیں سرکنڈے اُگ رہے تھے اور کہیں کہیں کروندے کسیلے بیروں کی جھاڑیاں' مرغابیوں کا ایک جھنڈ مغرب کی طرف پر پھیلائے جا رہا تھا۔ کنارے پر دو تین مچھیرے بندھے ہوئے تھے۔ ہوا رکی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور فضا میں سناٹا تھا۔ کہیں کہیں کوئی پرند چیخ اٹھتا اور دریا کی سطح پر دور ایک کشتی چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پرکاش نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور حدِ نظر پر اس کی نگاہیں جمتے ہوئے اندھیرے میں مل گئیں۔ اس منظر میں کہیں بھی کوئی ایسا نقطہ نہ تھا۔ جسے وہ دلکش یا جاذبِ نظر کہہ سکتا۔ ایک عجیب سی غنائی ایک عجیب سی ویرانی تھی جسے محسوس کر کے اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ پرکاش نے جوہندر کی طرف دیکھا لیکن وہ خوش نصیب آدمی اپنے گرد و اطراف کے ماحول سے بے خبر اور بے نیاز مزے سے دانتن کرتے کرتے کہنے لگا: "بھائی صاحب آپ ذرا پیر کر سمجھائیں نا۔"

"کیوں' کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ لڑکا بیوں تو سمجھدار ہے' کماؤ بھی ہے لیکن روپے کی قدر نہیں کرتا۔"

"وہ کس طرح' میرے خیال میں تو....."

جوہندر نے بات کاٹ کر کہا: "آپ نہیں جانتے۔ اول تو وہ دوستوں کو بہت کھلاتا پلاتا ہے اور پھر اس شادی میں تو میں نے دیکھا ہے وہ اندھا دھند روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ جہاں دو روپے میں کام ہو سکتا ہے وہاں پر دس روپے خرچ کر دیتا ہے۔ بھلا اس طرح بھی کبھی گھر کے کام چلتے ہیں اور پھر جیب سے یہ جیسے سے واپس آیا ہے ہر وقت گھر والوں کو جھڑکیاں دیتا رہتا ہے اور کسی بزرگ کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ یہ بات ابھی نہیں۔ کیا ہوا اگر وہ پچاس سو روپیہ مہینہ کما لیتا ہے۔ آخر اس کے ماں باپ ہی نے تو اسے پڑھایا ہے۔ اگر انہیں کما کہ نہ مانے تو اس سے

بڑھ کر احسان فراموش اور کون ہوگا۔"

"بے شک، بے شک!" پرکاش نے اپنی ناک کھجاتے ہوئے کہا۔

"اب شادی کے معاملے ہی کو لیجئے۔ پرکاش وتی کی شادی نہیں بلکہ اس کی اپنی۔ اس کی ماں چاہتی ہے کہ وہ اب اس کی منگنی کر دے اور اس سال بیاہ بھی دے لیکن اسے دیکھیے یہ مانتا ہی نہیں۔ لالہ بسا کھا مل کے ہاں سے ناطہ ملتا ہے۔ لڑکی سیانی ہے، گھر کے کام کاج سے واقف، سوشیل، سمجھ دار، سینا پرونا جانتی ہے، خط پڑھ لیتی ہے، ماں باپ، بھائی بہن کسی میں کوئی نقص نہیں شریف گھرانا ہے۔ کھتری گھر ہے۔ پرانا خاندان ہے۔ امیر آدمی ہیں۔"

"تو یہ مانتا کیوں نہیں؟"

"کہتا ہے لڑکی منگنی ہے۔ سانولا رنگ ہے، آواز بھاری ہے اور اپنی طرف نگاہ ہی نہیں۔ بڑے یوسف ثانی بنے پھرتے ہیں۔ کہتا ہے میں شہر کی لڑکی لاؤں گا جو دسویں پاس ہو اور شعر و شاعری سے شُد بُد رکھتی ہو۔ سینما کی تصویروں پر بات چیت کر سکے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ بڑا شریف لڑکا تھا۔ اسے شبہ نہیں کہ آج کل زمانہ کیسا ہے۔ شریف گھرانے برائی شکل سے ملتے ہیں۔ اب پرکاش وتی کو دیکھو۔ گیارھویں پاس کر کے بھی کیا بنا۔ تعلیم عورتوں کے کس کام کی۔ لڑکی تو وہی ہے جو گھر کا کام کاج اچھی طرح جانے۔ اب ہم اسے کسی بے کار گریجویٹ کے پلّے باندھ دیتے تو بے چاری کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ اس وقت تو اسے ان باتوں کی سمجھ نہیں لیکن بعد میں ہمیں دعائیں دے گی۔ پرکاش وتی تو خیر ایک لڑکی ہے، وہ ہمارے کہنے سے باہر نہیں جا سکتی لیکن اب ہیر کو کون سمجھائے۔ میں نے سوچا ہیر آپ کا کہا مانتا ہے آپ سے کہوں گا۔ آپ اسے سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لے آئیں تاکہ گھر برباد نہ ہو۔"

اور پرکاش نے کہا وہ اسے ضرور سمجھانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن یہ ایک زبردست مشکل کی بات ہو گی۔ کیونکہ شادی زندگی کا محور ہے، اور پھر ہیر تو منگنیوں کے کانچے COBRET بھی دیکھ چکا ہے اور شاید اسے قرونِ وسطیٰ کی قسم کی شادی پسند نہ آئے۔ لیکن برجندر نے کہا، "نہیں۔ آپ ضرور کوشش کریں، میری خاطر سے۔" اور پرکاش نے کہا۔ "اچھا میں آپ کی خاطر سے ضرور کوشش کروں گا۔ لیکن مجھے امید بہت کم ہے۔" برجندر نے کہا، "نہیں، یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ اگر چاہیں تو اسے سمجھا سکتے ہیں۔" بہت دیر تک اسی طرح کی بے معنی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ صرف برجندر وقفہ کرتے کرتے کبھی کبھی زور سے کھانس دیتا۔ دریا کی سطح پر چلتی ہوئی کشتی اب بالکل کنارے کے قریب آ گئی تھی۔ اس میں چند کسان بیٹھے تھے جو پورب کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بچے اور بیویاں اور لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔ وہ نہایت خاموشی سے بیٹھے تھے۔ بچے سہمے بیٹھے تھے، عورتوں کے چہرے پژمردہ تھے اور کسانوں کی آنکھوں میں تھکن تھی اور ان کی نگاہوں کی اوٹ میں ناامیدی جھانک رہی تھی۔ پرکاش نے سوچا یہ میرا خیال ہی ہے، میں ہر جگہ اور ہر مقام پر یوں ہی غم کی تلاش کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ دراصل یہ معمولی سے چہرے ہیں، عام کسانوں کے۔ ان کے دلوں میں طمانیت ہے، صبر ہے، یقین ہے، شاید یہ بات کچھ بڑھتے ہوئے اندھیرے کا دھوکا ہے کہ مجھے ان کی صورتوں میں یاس کی جھلک نظر آتی ہے۔ شاید یہ میرے ہی دل کا عکس ہے، روح کا پرتو ہے، شام کے سناٹے، پھیکی فضا اور سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا کا اثر ہے۔

کشتی سے اتر کر کسانوں اور ملاحوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ ملاح اونچی اونچی آوازیں گالیاں دینے لگے۔ پرکاش اور برجندر اٹھ کر اس گروہ کے قریب جا پہنچے۔ برجندر نے پوچھا، "کیوں جھگڑتے ہو بھئی؟ کیا بات ہے؟"

ایک ملاح نے کہا، "شاہ جی! بات یہ ہے کہ ہم ان پردیسیوں کو یہاں پار لائے ہیں۔ یہ دوسرے کنارے پر صبح سے بیٹھے تھے اور کوئی انہیں پار نہیں اتارتا تھا۔ کیونکہ یہ پیسے پورے نہیں دیتے تھے۔ کہنے لگے ہم حصار کے قحط کے مارے ہوئے غریب کسان ہیں۔ ہمارے ڈھور ڈنگر مر گئے ہیں۔ ہم پر دیا کرو۔ ہمیں یہاں پار کرا دو۔ ہم نے کہا اچھا تو سب آدمی ایک ایک پیسہ دے دو۔ ہم تمہیں یہاں پار لے چلتے ہیں۔ اب یہاں آ کر یہ

کل پندرہ پیسے دیتے ہیں اور یہ آدمی ہیں پچیس ——— آپ خود گن لیجئے۔"

کسانوں نے کہا۔ "ہم غریب ہیں، ہم قحط کے مارے ہوئے ہیں، ہم پر دیا کرو۔"

بچے رونے لگے۔ عورتوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

ایک ملاح نے کہا۔ "اور ہم کہاں سے کھائیں؟ سارے دن میں بمشکل پار کتنے آدمی اترتے ہیں؟ ان چند پیسوں میں مشکل سے گذارا ہوتا ہے۔ ہم نے تمہیں دو دو پیسے فی آدمی پھر ڈوئے۔ اب تم ایک ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

پرکاش نے دس پیسے ملاح کی ہتھیلی پر رکھ دئے۔

ایک بوڑھے کسان نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ یہ میرا کنبہ ہے۔ میں بھی کبھی مال مویشی والا تھا۔ میرا گھر پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ابھی کل تک میری کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ میرے دوارے پر بھکاری بھیک مانگتے تھے۔ میری بہوئیں اور بیٹیاں آنگن میں گیت گاتی تھیں، آج وہ یہ دن دیکھ رہی ہیں۔ بھگوان! میں نے ایسی بپتا کبھی نہ دیکھی تھی۔ اب دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔ پیٹ بھر کھانے کو روٹی نہیں ——— ایسا قحط میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ بھگوان! یہ کن کھوٹے کرموں کی سزا ہے؟"

برجو رنے کہا۔ "تم ایک دو آدمی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں آٹا دال نون سب کچھ دیں گے۔"

بوڑھا کسان بولا۔ "پرماتما تمہارا بھلا کرے۔"

ایک بوڑھی عورت بولی۔ "اری لڑیا! جا سرکنڈے، گھاس پھوس اور لکڑیاں اکٹھی کر لے۔ اری بنو! لحاف اور چٹائیاں مچھوے سے اتار کر دھر لے آ۔ ارے سارا کام بخت کر ہر بھاگ گیا تو....."

لڑیا اٹھی اور سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف چلی۔ وہ ایک سانولے رنگ کی جوان عورت تھی۔ پرکاش نے دیکھا اس کی چولی اور لہنگا جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا اور وہ چلتے چلتے اپنی جوانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ لیکن غریبی میں نہ تو غریبی ہی چھپتی ہے اور نہ جوانی.....

دریا سے واپس آکر پتہ چلا کہ بارات دوسرے دن شام کو سری پور پہنچ جائے گی۔ لڑکے والوں کا نائی آیا تھا اور اب وہ ایک بڑی سی گلابی پگ کی پگڑی باندھے آنگن میں لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اس خبر نے گھر والوں کو چونکا سا دیا، 'برات آئے گی' یہ بھی سب جانتے تھے لیکن یہ جانتے ہوئے بھی دل میں ایک واہمہ سا تھا۔ لیکن اب یہ واہمہ دور ہو گیا اور اب اس کی جگہ ایک اضطراب، ایک عجیب قسم کی بے چینی اور عجلت نے لے لی۔ چاچا پھیرو حقے میں حلوائی کی دکان کرتے تھے اور پینتالیس برس گذر جانے پر بھی مجرد تھے۔ روٹھتے ہوئے لاڈلوں کے اڈے پر گئے تاکہ گل کے لئے بتاشے سے برف منگوانے کا انتظام کریں۔ منگت راشے اور برجند کو برات گھر میں صفائی کروانے، برات گھر سجانے اور براتیوں کے لئے چارپائیاں بچھوانے کا کام سپرد ہوا۔ گھر میں آئی ہوئی عورتوں کے رلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور ساڑھیوں اور قمیصوں کے رنگ شوخ تر ہوتے گئے۔ تیرا اپنے باپ کی چاندی کے دستے والی چھڑی لے کر ادھر اُدھر گھومنے اور چھوٹوں کو چستی سے کام کرنے کی ہدایت کرنے لگا، بیشک میں اب صرف پرکاش، چرنی لال اور بڑا سنگھ رہ گئے۔ پرکاش کھڑکی سے ان عورتوں کی طرف دیکھنے لگا جو گھر کے بڑے دروازے سے اندر آ رہی تھیں یا باہر جا رہی تھیں۔ نئیں لباس، سرسراتی ہوئی قمیصیں جن پر سنہری پھول بوٹے بنے گئے تھے۔ چنریاں جن پر منقش کے لہریئے تھے، پھر کبھی کبھی ان میں کوئی خوبصورت چہرہ بھی نظر آ جاتا۔ یوں ہی قسمت آزمائی ساعتوں میں جس میں دھندلائی اور موہنی کی بجائے جوانی اور آفرین کی آمیزش زیادہ ہوتی۔ یکایک چرنی لال اور بڑا سنگھ نے ایک ساتھ دہی سی چیخ ماری۔ سامنے دو لڑکیاں جا رہی تھیں۔ نیلون کے بارامی دوپٹوں میں ان کی چوٹیاں کالی ناگنوں کی طرح بل کھاتی ہوئی تھیں اور ایک کی گردن کے خم میں مدورا کے مندر لکھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پرکاش کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ کوئی اس کی ہنسنا

کر دیکھ کر خوشی سے چیخیں مار سکتا ہے۔ سرشیلا اور لیلا گلی میں چلتے چلتے ٹھٹک کر رہ گئیں۔ اب مخالف سمت سے دو اور نوجوان اور حسین لڑکیاں آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر بوٹا سنگھ کے منہ سے بہرے اختیار ایک دبی سی چیخ نکل گئی۔ ان دونوں نوجوان لڑکیوں میں سے ایک لودی دوشیزہ تھی جس نے بیر کو اور پرکاش کو قتل کی پلاننگ تھی۔ پرکاش نے پوچھا: "وہ کون ہے؟"

"وہ کون؟" چونی لال نے پوچھا۔

"وہ جو آسمانی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے شرما سی رہی ہے اور مسکرا بھی رہی ہے اور ...."

چونی لال نے کہا: "وہ ا..... وہ مس اوبرائے ہے۔" اور یہ کہہ کر چونی لال اور بوٹا سنگھ دونوں ہنسنے لگے۔

"مس اوبرائے؟"

"ہاں، ہاں!" بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا: "اس کا باپ نہر کے محکمے میں اوورسیئر ہے نا۔"

چونی لال نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہا: "میں نے سنا ہے کہ اوورسیئر کی تبدیلی جالندھر ہو گئی ہے اور اب وہ دو تین دن میں یہاں سے چلے جائیں گے....."

"سچ؟"

"ہاں! مجھے آج ہی پتہ لگا ہے، ایک بڑے معتبر آدمی سے۔ لیکن یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔ اگر اس نے سن لیا تو بس بے چارے پر قیامت گزر جائے گی۔"

"نہیں، نہیں ..... اوہ بے چارہ!" اتنا کہہ کر بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ چونی لال بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ پرکاش نے سوچا، یہ لڑکے کیسے بدمذاق اور بے تربیت ہیں، بالکل دیہاتی۔ وہ جھٹک سے اٹھ کر گھر کے آنگن میں چلا گیا۔ آنگن میں دری بچھ گئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ گیس لیمپ لگ گیا تھا اور کم سن لڑکیوں نے ابھی سے ڈھولک بجانی شروع کر رکھی تھی .....

کتھے گیوں! پردیسیا وے!

ٹک، ٹک، ٹک، ٹک بجتی ہوئی ڈھولک پر ایک لڑکی پتھر کے ایک ٹکڑے سے تال دے رہی تھی، پرکاش نے سوچا ان نادانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ پردیسی سے پیار کیوں؟ اس نے دیس ریس کے گیت سنے تھے۔ بلوریں چشموں کے کنارے نیلی آنکھوں والی چرواہنوں کے گیت، اور ڈرائنگ روم میں ارغنول پر گیت، جہاں گلدان میں لمبی لمبی ڈنڈیوں پر نرگس کے پھول جھکے ہوئے تھے۔ گیت جو دوپہر کی تپتی ہوئی اداسی میں گائے گئے، جب فضا میں پیپل کے پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ گیت ... ... لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ عورت کے ہر نغمے میں پردیسی کے لئے پیار موجود تھا۔ یہ پیار کبھی تو مدھم سُروں میں لرزنے لگتا، اور کبھی اس کی گہرائی کی جس انتہا شدید ہو جاتی کہ وہ نغمے کے الجھاؤ میں ایک زخمی پرندے کی طرح چیخ اٹھتا۔ لیکن پردیسی کے لئے اس قدر تڑپ کیوں؟ پرکاش نے پوچھا اور اسے خیال آیا کہ یہ نغمہ انسان کی فطرت کا نغمہ تھا۔ وہی نغمہ جس نے دور کی ہر شے کو پیارا بنا دیا تھا، جس نے بچپن میں اسے چاند کی طرف ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا تھا اور طرح طرح پر اسے بے قرار کر دیا تھا کہ وہ جنگلوں، پہاڑوں اور صحراؤں کی خاک چھانے اور قدرت کو اپنا راز دار بنائے۔ یہ وہی انسانی فطرت کا نغمہ تھا جو ابھی تک عورت کی مقدس روح میں بے قرار تھا، یہ اچھا ہے، پرکاش نے سوچا کہ غلام ہوتے ہوئے بھی عورت کے دل میں پردیسی کی چاہ موجود ہے کیونکہ عورت زمین کی طرح ہے وہ زندگی کی تخلیق کرتی ہے اور جس دن اس کے دل سے پردیسی کی چاہ اٹھ گئی، انسانیت بھی فنا ہو جائے گی.....

جھما جھک جھک جھک لڑکیوں نے ایک نیا گیت شروع کر دیا تھا۔

اونہوں لکھنا!

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

پرکاش نے سوچا ان معصوم لڑکیوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ کسی پردیسی کو یاد رکھنے کے لئے ایک حساس اور دردمند دل چاہئے۔ جوانی کی بے قرار روح نسائیت اور شباب، اور اس کی نگاہوں میں پگڈنڈی پر چلتی ہوئی عورت کی تصویر کھنچ گئی، جس کے سر پر سرسوں کی سبز کونپلوں کا گٹھا تھا اور جس کی سبز قمیص پر نقرئی غبیہ چمک رہا تھا۔

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

ٹیک، ٹیک، ٹیک، پرکاش کو ایسا معلوم ہوا گویا کوئی اس کے بجتے ہوئے دل پر اسی پتھر کے ٹکڑے سے ضربیں لگا رہا تھا۔ ٹیک ٹیک، ٹیک، ٹیک، اور وہ سیڑھیوں کی طرف دوسری منزل پر جانے کے لئے مڑا۔ سیڑھیوں کے درمیان اس نے بیرا اور مس اور سیٹر کو دیکھا جو ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔ بیرا کا چہرہ سفید تھا اور مس اور سیٹر کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پرکاش جلد جلد زینے پر چڑھ گیا۔ بیرا نے آہستہ سے کہا۔ بھائی جان! میں بھی اوپر آ رہا ہوں۔ ابھی۔۔۔ دوسری منزل میں ایک بڑے کمرے میں بہت سی لڑکیاں پرکاش وتی کو گھیرے ہوئے تھیں۔ وہ دبے دبے قہقہوں اور میٹھی میٹھی سرگوشیوں کے ساتھ پرکاش وتی کو دولہا بھائی کی آمد کے قصے سنا کر چھیڑ رہی تھیں اور اپنی دبی ہوئی جنسی خواہشوں کی ناکام تکمیل کر رہی تھیں۔ پرکاش چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر ساری مجلس درہم برہم ہو گئی۔ کئی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اور ہنسنے کے باوجود بھی شرماتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اوروں نے جرأت سے کام لے کر اسے اپنے نسوانی مزاح کا نشانہ بنانا چاہا۔ اتنے میں بیرا آ گیا اور آ کر ایک کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا، اس کا چہرہ پسینہ اور گرد سے اٹا ہوا تھا اور اس کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید اسے ابھی غش آنے کو ہے۔ بہت سی لڑکیوں نے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے اور وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ پرکاش اور پرکاش وتی دونوں جلد جلد بیرا کے پاس گئے۔ پرکاش وتی نے اپنا ہاتھ بیرا کے ماتھے پر رکھا۔ کہنے لگی "ماتھا گرم ہے۔"

پرکاش نے پوچھا "کیا بات ہے بیرا؟"

بیرا نے رکتے رکتے کہا "اُف۔۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ بس دم گھٹا جا رہا ہے۔"

پرکاش نے کہا "پانی، پانی۔"

پرکاش وتی نے گھبرا کر کہا "پانی، پانی۔"

باہر کئی لڑکیوں نے چیخ کر کہا "پانی، پانی۔"

سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ پانی، پانی۔ بیرا کی ماں دوڑتی ہوئی اوپر آئی اور ایک چھوٹے سے گلاس میں پانی اور گلاب ملا کر لائی۔ بیرا نے تھوڑا سا پانی پیا اور کہا میں اب اچھا ہوں۔ کوئی بات نہیں، لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ کوئی ماتھا دبانے لگا۔ کسی نے ہاتھ پکڑ لئے، کسی نے پاؤں، کسی نے کہا کھڑکی بند کر دو، ہوا لگ جائے گی، کسی نے کہا کھڑکی کھول دو، ہوا لگنے دو۔ ایک بھیرچی حکیم بولیں اسے دودھ میں گرم گھی ملا کر پلاؤ، پلایا گیا۔ دوسری بھیرچی حکیم بولیں "اسے ہے، کہاں ہے بیرا کی ماں!" بیرا کی ماں!"

بیرا کی ماں بولیں "میں تمہارے پاس ہی تو کھڑی ہوں۔"

"اچھا۔ اچھا۔ جا بھاگ کر نیچے سے بادام روغن لا۔"

بیرا کی ماں نچلی منزل سے بادام روغن لانے گئی تو خالہ بھاگونتی اس کے پیچھے دوڑیں "ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ میں کہتی ہوں بیرا کی ماں، اس کے تو ماتھا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ بازو سے کانسی کا پھل منگواؤ۔ تاکہ بیروں پر اچھی طرح مالش کریں اور گرمی چھٹے۔ اسے گرمی ہے اور کچھ نہیں۔" بیرا نے لاکھ انکار کیا کہ اب اس کا جی بالکل ٹھیک ہے، محض دم گھٹا جا رہا تھا اور اب وہ بھی نہیں گھٹتا تھا۔ اب اسے آرام تھا، لیکن کسی نے اس کی ایک نہ مانی اور اسے تمام سے لیٹے رہنے

کو کہا۔ ناچار بیرے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ شور و غل کرنے، بیرے کا سر سہلانے اور اس کے پاؤں اور ہاتھوں پر کانشی پیل کی مالش کرنے کے بعد گھر کی عورتوں کی جان میں جان آئی اور وہ اسے چارپائی پر آرام سے سویا ہوا چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد ذرا بیرے نے آنکھیں کھول کر کہا:

"ہائے بھابھی!"

پرکاش چندنے مسکرا کر پوچھا "چین کیسا ملک ہے؟"

بیرے نے کہا "ہائے میں مر جاؤں گا، اب کیا ہوگا، ان کی تبدیلی ہو گئی ہے۔"

پرکاش چندنے کہا: "سنا ہے شنگھائی میں بہت دل پسند کا رہے ہیں اور اینگلو چینی عورتیں۔۔۔۔"

بیرے نے کہا "میں اس کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

پرکاش نے کہا "اور چین کے لوگ چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

بیرے نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا: ہائے بھابھی۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا۔۔۔۔۔"

پرکاش نے کہا: "مجھے سب پتہ ہے" اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے باہر برآمدوں کے قریب کونے میں اس نے ایک لڑکی دیکھی۔ اس نے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کی ناک سُرخ تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی۔ پرکاش نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس لڑکی نے اپنا چہرہ ساڑھی کے پلو میں چھپا لیا اور دیوار سے لگی لگی سسکیاں لینے لگی۔

یکایک پرکاش نے سوچا۔ کل پرکاش وتی کی شادی ہے۔

شادی کی رات پرکاش پل بھر کے لئے بھی نہ سو سکا۔ اس نے بیرے کی ماں سے کہہ سُن کر چارپائی دوسری منزل میں رکھوالی تھی تاکہ آرام سے سو سکے۔ بیرے کی ماں نے نہایت چاؤ سے پوچھا تھا "بیٹا شادی نہیں دیکھو گے؟" اور پرکاش نے بیرے کی ماں سے کہا کہ وہ دو تین بجے کے قریب جب بیاہ کی رسمیں ادا کی جائیں گی، چارپائی سے اٹھ کر نیچے آنگن میں چلا آئے گا۔ لیکن اسے تو دو تین بجے تک بھی کسی نے سونے نہ دیا، کوئی آٹھ بجے کے قریب چونی لال، دھن سیال، بڑا سنگھ ہنستے ہوئے اور آنگن میں پھرتی ہوئی عورتوں کو تاکتے ہوئے اوپر کی منزل میں آ گئے۔

چونی لال نے آتے ہی پرکاش سے کہا "بھائی صاحب آپ نے بہت اچھا کیا کہ آج رات کے لئے چارپائی یہاں رکھوالی۔ اب یہاں ساری رات بیٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے آنگن کا تماشا دیکھئے۔"

پرکاش نے بُرا سا منہ بنا کر کہا "میں سونا چاہتا ہوں۔"

بڑا سنگھ ہنستے لگا "تو۔۔۔ سونے کے لئے آپ نے اچھی جگہ تلاش نہیں کی۔"

دھن سیال نے کہا "آج ہمارے قصبے میں دو شادیاں ہوئیں۔ آج کا دن بہت مبارک ہے۔"

پرکاش نے پوچھا "دوسری شادی کس کے ہاں ہوئی؟"

دھن سیال نے مسکرا کر کہا "اوہ! آپ کو پتہ ہی نہیں؟۔۔۔۔۔ ہاں بہت سے لوگوں کو ابھی پتہ نہیں اور آپ تو فوجدار دکھتے ہیں۔ کل جب پرکاش وتی ڈولی جائے گی تو آپ بھی شاید ڈولی جانے کے ایک دو دن بعد چلے جائیں گے۔ آپ کو ہمارے قصبے کی شادیوں سے کیا دلچسپی؟۔۔۔۔ لیکن میرے خیال میں آپ کو بتا دینا چاہئے۔ چاچا پھیرو کی شادی ہوئی ہے۔ چاچا پھیرو کو جانتے ہیں نا؟ دُبلے پتلے لمبے قد کے آدمی:

وہ اس دن بینک میں حقہ پی رہے تھے۔ بلی سی مونچھیں، کھچڑی سی داڑھی، رخساروں پر پرچھائیاں۔"

"وہ جو بازار میں حلوائی کی دکان کرتے ہیں؟" پرکاش نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، وہی جو مٹھائی بنانے کے علاوہ سوڈا واٹر بھی تیار کرتے ہیں اور تمباکو بھی بیچتے ہیں۔ بچارے مجرد تھے ابھی تک۔ عمر چالیس برس سے اوپر ہو گئی اور غریبی کی وجہ سے ہماری برادری میں کوئی انہیں رشتہ نہیں دیتا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ چاچا پھیرو کی شادی، آج کا دن واقعی بہت مبارک ہے۔"

چونی لال، دھن سیال اور بوٹا سنگھ ایک ساتھ ہنس پڑے۔ "ہم ابھی چاچا پھیرو کو مبارک دے کر آ رہے ہیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے داڑھی منڈوا دی ہے۔ اگرچہ کچھیں بدستور میلی ہیں اور ہونٹوں کے کونوں میں گرتی ہیں۔ انہوں نے ہمیں تازہ مٹھائی کھلائی اور کہنے لگے۔ ابھی اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ اور ہمیں بھی تو اچانک ہی پتہ چل گیا۔"

پرکاش نے پوچھا: "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

چونی لال بولا: "ہم دریا پر گئے تھے جہاں حصار کے قحط زدہ لوگ ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ وہاں بہت شور و غل تھا۔ بچے بلک رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں رو رہی تھیں اور ایک بوڑھی عورت اپنے خاوند کو دھتکاریں سنا رہی تھی۔ ہائے ری میری لڑیا، میری جوان اور سندر لڑیا، پتہ چلا کہ بوڑھے کسان نے دو سو روپے کے عوض لڑیا کو چاچا پھیرو کے حوالے کر دیا تھا۔ پیٹ بُری بلا ہے اور اب وہ بے وقوف بوڑھی عورت اپنے خاوند کو کوس رہی ہے۔ گویا حصار کے قحط کا ذمہ دار اس کا خاوند ہے۔"

بوٹا سنگھ بولا: "چاچا پھیرو بہت خوش نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنی دکان میں مٹھائی کے تھالوں کے پیچھے ایک میلی سی چادر لٹکا دی ہے تاکہ پردہ رہے اور آنے جانے والوں کی نظر نہ پڑے۔"

دھن سیال نے کہا: "دیکھئے بھائی صاحب! اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے۔ چاچا پھیرو نے کہا ہے، اور اگر انہیں پتہ لگ گیا کہ ہم نے کسی آدمی کو یہ بات بتا دی ہے تو پھر وہ ہم سے سامانِ عربات نہیں کریں گے اور نہ اپنی دکان سے ہمیں مٹھائی کھلائیں گے اور قصبے میں ان کے سوا یہاں کوئی دوسرا حلوائی بھی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ پھر چونی لال اور بوٹا سنگھ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چونی لال نے کہا: "آؤ بھائیو ذرا باراتیوں کے درشن کر لیں اور ان کے قیام و طعام کے متعلق انتظامات کی بھی دیکھ بھال کر لیں۔ بچارے کل یہاں سے رخصت ہو جائیں گے ..... کہیں انہیں یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ سری پور گئے تھے اور وہاں ان کی اچھی طرح خاطر مدارات نہیں ہوئی۔"

باراتیوں کو کھانا کھلا کر کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پرکاش فارغ ہوا اور آتے ہی چارپائی پر دراز ہو گیا۔ لیکن نیند کہاں، آج شادی کی رات تھی ابھی ابھی ان لوگوں نے دولہا کا منہ دیکھا تھا اور میر کی ماں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بلائیں لی تھیں، "سروارنا" گیا تھا اور چاندی کی چوٹیاں نچھاور کی تھیں۔ عورتوں نے سہاگ کے گیت گائے تھے اور کنواری لڑکیوں کی جماعتیں زور زور سے دھڑکنے لگی تھیں۔ دولہا کا چہرہ پرکاش نے بھی دیکھا تھا، بالکل ہلدی کی گانٹھ کی طرح تھا، وہی زردی، وہی گلٹی، وہی سختی اور سہرے کے زرّیں تار اور چمپا کی ٹہنیاں بھی اس کے رنگ روپ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی تھیں۔ اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی بھی آیا تھا۔ اس کی ناک چپٹی تھی، ہونٹ موٹے اور رخساروں کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں روپوں سے بھری ہوئی لال کپڑے کی ایک تھیلی تھی جسے کہ وہ اِدھر اُدھر اس طرح گھوم رہا تھا جیسے وہ اس سارے قصبے کا مالک ہو۔ اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی چالاکی اور ہوشیاری تھی جس کی بدولت وہ ہلدی بیچتے بیچتے لکھ پتی بن گیا تھا۔ ان کے سارے ہی کے بہت سے رشتہ دار تھے جن کے جیلے ایک دوسرے سے بہت ملتے تھے۔ کیونکہ ہلدی کی جڑ تو آخر ایک ہی ہوتی ہے، گانٹھیں چاہے کتنی ہی گنتھی ہوئی جائیں ..... "منی" کی رسم کے وقت لڑکی والے اور لڑکے والے آپس میں بھینٹ بھیج کر گلے ملے تھے۔ چاندی کے گلاب دانوں میں

پٹا ہوا معطر پانی ایک دوسرے پر چھڑکا گیا تھا۔ جیجیوں، بھائیوں اور برادریوں نے بدھائی کے ترانے گائے تھے اور گاگروں کے جتم غفیر نے تمی کے دونوں طرف ناکہ بندی کر لی تھی تاکہ جب فریقین کی طرف سے تانبے کے پیسے پھینکے اور کئے جائیں تو گلی کی سرخ اینٹیں پر پیٹ گڑگڑ کر دھکمی دریدل میں ہاتھ ڈال ڈال کر انہیں لوٹا جا سکے۔ پیسوں کے بچاور ہوتے ہی چھوٹے بڑے گدا گر سب ایک دوسرے پر پل پڑے تھے اور وہ فقیرنی جس کی چھاتی سے ایک سوکھا ہوا بچہ لٹک رہا تھا اور وہ بوڑھی بھکارن جس کے بال بڑ کی شاخوں کی طرح تھے۔ ایک پیسے کے لئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئی تھیں۔ لڑکا چلانے لگا تھا اور میراسی بدھائی کے گیت گا رہے تھے۔ کیا یہ شادی کی بدھائی تھی؟ یا سماج کے جنازے کا نوحہ یا کسی نے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی اور اب بھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر خوشی سے ناچ رہا تھا۔ .... کوئی پرکاش کے فریب بستر پر بیٹھ گیا۔ پرکاش چونک پڑا۔ یہ پرکاش وتی تھی۔ وہ چپ چاپ آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور وہ دونوں نیچے آنگن میں کام کرتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ آنگن کے بیچ میں کاٹھ کی بیدی کھڑی کی گئی تھی۔ درمیان میں ہون کنڈ تھا۔ کالے کی بیدی منہ کی طرح بنائی گئی۔ ایک چھوٹی سی عمارت جو اوپر اٹھ کر ایک تکون کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اسے پھولوں، کیلے کے پتوں اور زرین تاروں سے سجایا گیا تھا۔ بیدی کی چوٹی پر مکڑی کے سبز رنگ کے طوطے سے لگائے گئے تھے اور آنگن کی دیواروں پر ریشم سے کاڑھی ہوئی سرخ پھلکاریاں لٹکائی گئی تھیں۔ ان پر آدم کے قطبے اور گاتیری اور دیگر متبرک منتر کاڑھے ہوئے تھے۔ آنگن کے آر پار جھنڈیاں لگائی گئی تھیں اور فرش پر کھیروں والی دریاں بچھائی گئی تھیں۔ پرکاش وتی سے کہا۔ "آج تمہارا بیاہ ہے، دیکھو بیدی کتنی خوبصورت بنائی گئی ہے۔ بالکل سندر سے ملتی جلتی ہے، لیکن بچاری ابھی نہیں آئے اور جب بچاری آجائیں گے تو تمہیں نئے کپڑے پہن کر ایک دولہا سی کی طرح اپنے سدر کے دیوتا کو رجھانے کے لئے ناچنا ہوگا۔ اور تم تو بہت اچھا ناچ سکتی ہو، کیوں؟"

پرکاش وتی نے نمناک لہجے میں کہا۔ "نہیں۔ میں آج نرتک کی جاؤں گی .... خبر نہیں، پڑھا کر سکھا کر ہر طرح کے عیش و آرام دے کر یہاں بلا کر کیوں ذبح کر ڈالتے ہیں۔ شاید یہ بھی ایک رسم ہوگی۔ لیکن میں سوچتی ہوں کہ مجھے اسی لئے مہادیالہ میں داخل کرایا تھا۔ ... میرا جی بھر آیا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ چیخیں مار مار کر روؤں۔ ... مجھے تم سے ہمدردی کی امید تھی اور تم ہو کہ جب سے آئے ہو ہر وقت جی جلاتے رہتے ہو۔"

پرکاش نے کہا۔ "بہن پرکاش وتی جی! ابھی سارے کو تو ساری عمر پڑی ہے۔ اب اگر ہنس کر بھی تم نے اپنے غم کو چھپایا تو تمہاری شاعری کس کام کی؟"

"بھاڑ میں جائے شاعری۔" پرکاش وتی نے جھلا کر کہا۔

"وہ تو اب خود بخود چلی جائے گی۔"

پرکاش نے پرکاش وتی کا داہنا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور پھر اس کی ہتھیلی پر انگلی رکھ کر بولا۔ "تمہاری قسمت یہاں لکھی ہے۔ دیکھو یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تم بہت لمبے عرصے تک جیو گی۔ تمہارے دس بچے ہوں گے، اور ایک مرد کار۔ یہ لکیر تمہاری شاعری کی ہے لیکن یہاں آ کر شاعری کا آبگینہ ہلدی کی ایک گانٹھ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تمہارے خاوند کو تم سے بہت محبت ہوگی۔ یوں بھی تو یہ محبت دس برسوں سے صاف ظاہر ہے لیکن ان کے علاوہ وہ تمہیں ہر سال سونے بھتے زیور اور ریشمیں کپڑوں کے بھاری بھرکم جوڑے سلوا دیا کرے گا۔ شادی کے پانچ سال بعد تم اتنی موٹی ہو جاؤ گی کہ خود تمہاری ماں بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گی اور ....."

پرکاش وتی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "ہٹو بھی۔ ہر وقت بے ہودہ مذاق۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

پرکاش نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ میں جانتا تھا کہ عورت ایک ہلدی پیچھے والے سے شادی کر کے خوش رہ سکتی ہے لیکن اپنے موٹاپے کا ذکر سن کر خائف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

یہ آخری رتجگا تھا۔ بیاہ کی رسمیں دو بجے کے بعد ادا کی جاتی تھیں اس لئے قصبے کی سب عورتیں اپنے بہترین لباس اور زیور پہن کر آئی تھیں۔ ڈھولک پر اتنے زور سے ہاتھ پڑتا تھا کہ پرکاش کو اس کی دھب دھب سمع خراش معلوم ہونے لگی۔ ہر ایک عورت اپنے گلے کی پوری قوت سے گا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بیچ میں زور سے چلا اٹھتے تھے، نائنیں شربت پلاتی جاتی تھیں اور دوسری منزل پر پرکاش کے پاس قصبے کے بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکی والوں کے رشتہ دار اکٹھے ہو گئے تھے اور کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر رتجگے کا نظارہ کر رہے تھے۔ کئی لمبی لمبی داڑھیوں والے بزرگ بھی آ گئے تھے جو حقہ پیتے، بار بار کھانستے اور نوجوانوں کو شرافت کی تلقین کرتے ہوئے اپنی آنکھیں سینکتے جاتے تھے۔ پرکاش نے ان کی آنکھوں میں ولی ہوئی حسرتیں دیکھیں جو اب اپنی قبروں سے باہر جھانک رہی تھیں جنہوں نے آج تک زندگی کو گناہ سمجھا تھا اور اسے ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنی پوری قوت سے دبانے کی کوشش کی تھی۔ ان سے آج زندگی انتقام لے رہی تھی۔ کیونکہ میں مر چکی تھی لیکن عرض تیز ہو گئی تھی اور حقہ پینے والے بزرگ اب اس راکھ کے ڈھیر کو کرید رہے تھے جہاں زندگی کی ایک چنگاری بھی باقی نہ رہی تھی ——— شاید اگر بات یہیں تک رہ جاتی تو پرکاش کو چنداں افسوس نہ ہوتا لیکن اسے تو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا ان سفید داڑھیوں والے بزرگوں پر جن کی جوانیاں مدت سے راکھ ہو چکی تھیں اور جو اب دوسروں کی جوانیاں راکھ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے اپنی جنسی آوارگیوں پر شرافت کا پردہ ڈال لیا تھا، اور اب سب اس جھوٹی شرافت کے بل بوتے پر اپنے جوان لڑکوں اور پوتوں سے کھوئے ہوئے لمحوں کا انتقام لے رہے تھے، پرکاش نے سوچا کیسی بے انصافی ہے! ہم لوگ بچپن ہی میں بوڑھے کر دئے جاتے ہیں۔ ساری زندگی رونے گذرتی ہے اور پھر وہی بسورتے ہوئے چہرے لے کر مرگھٹ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت آنگن میں تو لڑکیاں خوب زور زور سے گا رہی تھیں اور قہقہے لگا رہی تھیں۔ پرکاش کو یہ ڈر تھا کہ ابھی کوئی بزرگ صورت آدمی کھڑکی میں سے جھانک کر کہہ دے گا "لڑکیو! اتنا غل کیوں مچا رکھا ہے؟" اور رتجگے کی سب رونق ماند پڑ جائے گی اور چلاتے ہوئے گلے اس طرح خاموش ہو کر رہ جائیں گے جیسے سرت کے سرد اور برفیلے ہاتھ نے انہیں زور سے گھونٹ دیا ہو۔ بے چاری عورتوں کو آج ہی مدت کے بعد اپنے دبے ہوئے ارمانوں کو ذرا ڈھیل دینے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس وقت مخمل، کمخواب اور باز اری گیت گا کر بہت مسرور ہو رہی تھیں۔ گیت کیا تھے سیدھی سادی جنسی گالیاں تھیں جن میں ماں باپ، سہیلی بھائیوں، بہنوں اور آشناؤں کے جائز اور ناجائز تعلقات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ وہ عورتیں جنہیں پرکاش شرم و حیا کی پتلیاں سمجھتا تھا اب سب سے اونچی آواز میں سب سے گندے گیت گا رہی تھیں اور ان کے ننگے سر اور لہراتی ہوئی چوٹیاں دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں لیکن ایسے موقعے تو بہت کم آتے ہیں۔ کبھی کبھی ہی تو کوئی شادی ہوتی ہے ورنہ کئی سال گذر جاتے ہیں اور ان عورتوں پر شرم و حیا کا جھٹا طبع چڑھا رہتا ہے اور پھر جب وہ بوڑھی ماتیں اور ساسیں بن جاتی ہیں تو اپنا سارا غصہ اپنی لڑکیوں اور بہوؤں پر اتارتی ہیں۔ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ وہ کرو، یہ نہ کرو۔ اور اس طرح اندھی سماج کا چکر زندگی کی منزل پر سے گذر جاتا ہے۔ برجندر بڑے انہماک سے کھڑکی سے نیچے دیکھ رہا تھا کہ ایک شوخ لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر گایا:

ہائے برجندر دے تیری ماسی
اوہنوں لے گیا اک سنیاسی
ہائے وے اک سنیاسی
ہائے وے اک سنیاسی

دھب، دھب، دھب، دھب

اور بہت سی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگانے لگیں اور برجندر شرما کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک بوڑھے بزرگ نے اسے ڈانٹ پلائی، تم کھڑکی میں کیوں کھڑے تھے۔ اگر گیت سننے کا اتنا ہی شوق ہے تو ادھر چارپائی پر بیٹھ کر آرام سے سنو۔ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے۔ اور پرکاش نے سوچا

کہ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے کہ برجندر کی ماسی کو لے جائے اک سنیاسی آخر ایک سنیاسی کیوں؟ ایک مسلمان یا چمار کیوں نہیں؟ اور پھر اسے خیال آیا کہ ہندوستانی سماج میں سنیاسی اور فقیر لوگ خاص عزت کے مالک ہیں۔ خدا کے یہ لاکھوں بندے کھاتے پیتے لوگوں سے بھیک مانگ کر ان کے ضمیر کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ عمل اور جوتش سے ان کے مستقبل کو روشن اور درخشاں بناتے ہیں، کالا بکلپ کرتے ہیں، مکتی دلاتے ہیں اور اولاد سے محروم بیویوں کو بچے عطا کرتے ہیں۔ مبارک ہیں ان کی زندگیاں اور محبت سے لبریز ہیں ان کی روحیں۔ اس لئے ماسی کا "سنیاسی" کے ساتھ بھاگ جانا چنداں تعجب خیز نہ تھا۔ ان غسل خانوں میں اور عورتوں کی مسرور نگاہوں میں پرکاش کو اپنے تمدن کی ننگی روح جھلکتی ہوئی نظر آئی۔ جس چیز کو ہر شے اور چہرے نے فرسٹے گناہ کہہ کر دل کے نہاں خانے میں چھپا دیا تھا آج وہی گناہ اُبل کر گانے والیوں کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا اور ڈھولک کی تال اور باریک آوازوں کی لرزتی ہوئی لے میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اور دوسری منزل پر یہ چیزیں ایسے ایسے بزرگ بھی سن رہے تھے جن کی طویل زندگی کا شاہکار یہ تھا کہ انہوں نے ہر بھرپور بیوی اور ماں کے علاوہ اور کسی عورت سے ہنس کر بات بھی نہیں کی تھی۔ اسی لئے تو ایک معصوم شاعرہ ہندی کی ایک گاتھا کے عوض بیچ دی گئی تھی اور کھیتوں کی کھلی فضاؤں میں پلی ہوئی سندر لڑکیاں، باسی پکوڑوں اور مٹھائیوں کی دکان پر ایک سرسراتے ہوئے میلے پردے کے پیچھے قید کر دی گئی تھی۔ زندگی خیر محدود تھی، عشق تازہ اور شباب زندہ تھا لیکن تمدن بوڑھا اور عقل فرسودہ ہو چکی تھی اور سماج کے نیلام گھر میں اب بھی عورتوں کو کھلے بندوں بیچا جاتا تھا۔ البتہ قانوناً غلامی ممنوع تھی۔ پرکاش نے دل میں کہا کہ وہ ایسی باتیں سوچتا سوچتا پاگل ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ سو جانے کی کوشش کرے، آنکھیں موند لے، اپنے پپوٹوں کو خیندے پر مخمل بنا لے اور سرہانے پر سر ٹیک کر سو جائے۔ اب گیت ہلکے ہو رہے تھے ..... دولہا اٹھائی سہرا باندھے ہوئے تشریف لے آئے تھے ..... پرکاش دلی اور دولہا ہون کنڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت نقدس منتر پڑھ رہے تھے۔ شعلے گھی کا مزا چکھ کر بلند ہوتے جاتے تھے ..... پنڈت زور زور سے منتر پڑھ رہا تھا ..... پرکاش دلی اور دولہا خوشنما اور شوخ ہیدی کے ارد گرد گھوم رہے تھے۔ ایک ... دو ..... تین ..... چار ..... پانچ ..... چھ ..... سات ..

منزل

جب پرکاش چندنے آنکھ کھولی تو ابھی اندھیرا تھا۔ اگرچہ مشرقی افق پر روشنی کی ایک دھندلی سی لکیر آ گئی تھی لیکن آسمان پر ستاروں کے الجھے ٹانک بکھرے ہوئے تھے۔ نیچے آنگن کے فرش پر بیدی کے ارد گرد بہت سی عورتیں سوتی ہوئی تھیں۔ ہون کنڈ میں آگ بجھ گئی تھی اور بیدی پر بکھرے ہوئے کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے۔ پرکاش نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے ارد گرد چارپائیوں پر گھر کے بہت سے لوگ سوئے ہوئے تھے۔ برشٹلا اور لیلا ڈھولک بجاتے بجاتے تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ بیرا کا چہرہ افسردہ تھا اور لب کھلے اور اس سے پرے پرکاش دلی ایک پچرنگی ساڑھی پہنے سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا اور اسی بازو میں ہاتھی دانت کا سیندوری چوڑا چڑھا ہوا تھا۔ ماتھے پر سرخ بندی۔ اسے اس کے لب مسکرانے ہوئے معلوم ہوئے۔ پرکاش نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ ہاں وہ اب تک مسکرا رہی تھی۔ نئی سہاگن جو لکشمی کی بیدی پر اپنا کنوارپن ٹاپ چکی تھی اب بھی خواب میں مسکرا رہی تھی۔ پرکاش اس مسکراہٹ کی طہر کی تاب نہ لا سکا۔

وہ آہستہ سے بستر پر سے اٹھ بیٹھا۔ وہ کسی کو جگانا نہ چاہتا تھا۔ وہ ہولے ہولے سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ آنگن کے فرش پر وہ نہایت احتیاط سے گذرا۔ اس کے چاروں طرف لڑکے، لڑکیوں اور عورتوں کے جسم پڑے تھے۔ کسی کے بازو ننگے، کسی کی چھاتیاں، کسی کے بالوں کی لٹیں کھلے ہوئے ہونٹوں کے کناروں پر۔ کسی کی ٹانگیں مسکتی ہوئیں، کسی کی ہیلی ہوئیں، کسی کی سانس میں خراٹے تھے ..... کسی کی آنکھیں نیم وا ..... ان کے درمیان میں بیدی تھی۔ لیکن سنہری تارا دھر ادھر بکھرے پڑے تھے، کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے اور ہون کنڈ کی آگ بجھ گئی تھی۔ شعلوں نے قربانی لے

لی تھی اور اب خاموش تھے۔ زندہ انسان کھانے والوں نے ایک زندہ روح کو نگل لیا تھا اور اب مدہوش تھے۔ پرکاش نے آہستہ سے دروازے کے کواڑ کھولے اور باہر چلا گیا۔

وہ قصبے سے باہر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے اور فرش زمین پر شبنم کے لاکھوں قطرے بیدار ہو رہے تھے۔ گم ہوتے ہوئے اندھیرے کی خنکی میں ایک عجیب سی تازگی تھی اور جاگتی ہوئی سحر کے نور میں ایک نیا حسن۔ کیکر اور شیشم کے تنوں پر نہ دکھائی دینے والے ابھی تک یہیں پیچھے جاتے تھے اور کوئی نامعلوم پرندہ گنگنا رہا تھا۔ بیر کی جھاڑیوں پر گھاس کے ڈنڈے ابھی تک سوئے پڑے تھے اور پتوں کے درمیان گول گول پیروں سے شبنم کے موتی اس طرح لگے ہوئے تھے گویا مدراکے سندر لٹکے ہوئے ہوں۔ زمین جیسے لمبے لمبے سانس لے کر بیدار ہو رہی تھی کھیتوں کے کناروں پر اگی ہوئی گھاس میں ہزاروں ننھے ننھے پھول اپنی آنکھیں کھولنے لگے۔ پھر دور کہیں اس نے رہٹ کے چلنے کی دھن دھن اور پورب میں حدِ افق پر روشنی کی لکیر بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ کھیتوں میں دوڑتا ہوا چلا گیا۔ اس کے پائنچے اور پاؤں میں پہنے ہوئے چپل شبنم میں بھیگ گئے۔ لیکن وہ دوڑتا ہی گیا۔ تاریکی کم ہوتی گئی اور اس نے اپنے نتھنوں میں وہ عجیب سی خوشبو محسوس کی جس سے مشرق کی ہر اداسی جل اٹھتی تھی۔ آج اس نے پہلی مرتبہ صبح کو جاگتے دیکھا تھا ورنہ شہر میں رہتے ہوئے تو اس کی آنکھ اس وقت کھلتی تھی جب دھوپ کا پیلا پرتو کھڑکی کے شیشے سے نکل کر اس کے چہرے پر آ جاتا تھا لیکن آج وہ ایک غیر مرئی ہستی سے تعارف حاصل کر رہا تھا اور جب پورب کی ہوا اس کے چہرے پر گدگدانے لگی تو اس نے اپنی آنکھوں اور اپنے رخساروں پر صبح کی رانی کی نازک انگلیوں کے لمس کو محسوس کیا۔ اس کے عطر بیز بالوں کی خوشبو کو سونگھا اور اپنے ہونٹوں پر اس کے شبنمی لبوں کی حلاوت کا مزا چکھا اور خوشی سے بھرپور دوڑتا چلا گیا۔

زمین اسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر مٹی کی سوندھی، لطیف اور پاکیزہ خوشبو ایک ہلکے کہرے کی طرح چھائی تھی۔ آہستہ آہستہ درختوں کے تنوں پر شاخوں اور گھروندوں کی دیواروں پر کھیت کے کناروں کی اوٹ میں چھپتے ہوئے سرگوشیاں بھاگنے لگے، دور ایک اونچی ٹیلہ پر ایک مورنی کھڑی تھی اور مور اپنے دل کش پروں کے چھتر کو پھیلائے اس کے سامنے ناچ رہا تھا۔ ساری کائنات نغمہ ریز تھی اور زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی ناچ رہی تھی! اس دلکش، دلفریب اور ابدی رقص کے سامنے انسانی زندگیاں، اس کی مسرتیں اور غم کس قدر ہیچ تھے۔ ان کا منبع نامعلوم اور ان کی منزل ناپید..... سحر کے چھتر مختلف رنگوں کی نازک جھلکیاں بدلتی جاتی تھیں۔ ارغوانی..... آسمانی..... دھانی، خوش باش..... غم..... زندگیاں..... پرکاش نے سوچا زمین ناچتی چلے گی، یہاں تک کہ انسانی زندگی، اس کی تہذیب، تمدن، اس کے عادی باطل رکھ کا ڈھیر ہو جائیں گے۔ زمین چاند کی طرح خاموش اور مفرور ہو جائے گی لیکن پھر بھی یہ زمین ناچتی جائے گی..... ہم کس قدر حقیر ہیں۔ پرکاش نے سوچا، بیر کی پتیوں پر سوئے ہوئے مٹروں کی طرح..... یکایک ٹیلے کے ایک درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہوا کوا چیخ اٹھا اور ساری کائنات میں اجالا ہی اجالا ہو گیا۔ زمین کا نقص رک گیا۔ بینے کی بیں میں بند مرگئیں۔ مور اور مورنی مغرب میں آموں کے جھنڈ کی طرف پرواز کر گئے اور پرکاش کھیتوں میں دوڑتا دوڑتا رک گیا اور کہنے لگا۔ ہائے وہ صبح کی رانی کہاں گئی؟..... وہ رانی جو گم ہوتے ہوئے اندھیرے کے نازک سایوں میں شبنم کے موتی چھڑکتی ہوئی آئی تھی اور بڑھتے ہوئے نور سے شرما کر پھر اسی تاریکی میں گم ہو گئی..... ہائے وہ صبح کی رانی! وہ بہت دیر تک ایک رہٹ پر بیٹھا رہا۔ اس کی روح ہلکی ہو گئی تھی اور دل و دماغ ہر قسم کے خیالات سے گریزاں۔ آم کے درختوں پر چھوٹی چھوٹی سبز کیریاں لٹک رہی تھیں اور ہرے بھرے طوطے میں ٹیں کر رہے تھے۔ بیلوں کے پیچھے بیٹھا ہوا کسان ایک کھلونا معلوم ہو رہا تھا اور بیل رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے..... ڈوں، ڈوں..... ڈوں، ڈوں، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کے ہر رونگٹے سے آواز نکل رہی ہے..... ڈوں.. ڈوں.. ڈوں..... بے مطلب اور بے معنی صدا میں اسے ایک نامعلوم سی مسرت محسوس ہونے لگی اور وہ آنکھیں بند کر کے سنتا گیا اور اسے سنتا گیا..... ڈوں..... ڈوں..... بے مطلب بے معنی..... شبنم نامعلوم..... منزل ناپید..... اب وہ آنکھیں بند کئے ہوئے بھی بیلوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اس کسان کو دیکھ رہا تھا جو کھلونے کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور بیل جو رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے..... ڈوں..... ڈوں.....

سعادت حسن منٹو

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دُنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب اُستاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اُس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی"۔

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو اُستاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا "ولایت میں اور کہاں"۔

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنانے حقہ پی رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے۔ اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چکنی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا ــــ

"یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو چھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی، جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے ــــ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں"۔ یہ کہہ کر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی "یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹختے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی ٹلی والا آجائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سُنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا علام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے"۔

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا بکّہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔ گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال بھبھوکا چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈّے میں آکر مل مار کہ سگریٹ پیتا یا حقّے کے کش لگاتے ہوئے اُس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

"..... " یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا "آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔ . . . "

اس پر بھی اس کا غصّہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا۔

"مشکل دیکھنے ہو تو تم اُس کی . . . . . جیسے کوڑھ ہو رہا ہے ——— بالکل مردار! ایک دھپّے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم۔ پہلے پہل جی میں آئی کہ طاعون کی گھوپڑی کے پُرزے اڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے"۔ . . . یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا ———

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون دانوں بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے"۔

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

وہ مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے ———

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا ——— کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی"۔

"کیا پیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے"۔

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو "گابیاں" دیتا تھا اور چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اُونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا "چل بیٹا۔ چل ——— ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے"۔

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اُس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسّی پی کر ایک بڑی ڈکار لی، اور مونچھوں کو

مُنہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "بہت تیزی ایسی کی تیسی"

شام کو جب وہ اڈّے کو لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سُنانے والا تھا ——— بہت بڑی خبر اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک نبل میں دبائے اسٹیشن کے اڈّے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام قینچیاں برتن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مار واڑی کا یہ اندیشہ کیا بیاہ کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا، بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑ رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مارواڑیوں کو گالی دی "... مغربیوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ——— نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہو گا"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی۔ جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ——— سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گجا پگڑی بغل میں دبائے، اڈّے میں داخل ہوا تو استاد منگو ڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا "لا ہاتھ ادھر ... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ——— تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے ... مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا "تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے، یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا"

استاد منگو موجودہ سوویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لئے اُس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں پیدا ہونے والی تھیں۔ وہ "انہیں" روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا ———

"بھئی آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی۔ چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس سے استاد منگو صرف اُوپر کے بغلے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اور یہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا "ٹوڈی بچے!"

جب کبھی وہ کسی کو دلی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور

یہ کہ وہ شریف آدمی اور ٹوڈی بچے میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سُنا۔

"سنئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں، اگر . . . صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔"

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"وہ بے کار گریجوایٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہو گی۔"

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی۔ اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون ... ..!" اور وہ دن میں کئی بار سوچتا "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آ جاتا جو اس نے دو برس ہوئے چوہدری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں، اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سُنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو غرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی ——— آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر بینا تھیں دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر سجی ہوئی تھی، اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چوہدری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی . . . ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؛ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں۔ لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔" اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا "باٹی کورٹ میں نو بجے کے قریب ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں۔ اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ مہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لئے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا ——

"تو ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

استاد منگو خلینا بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا دئی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی

"ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو"

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہوتو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چکنی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا ———

"چلو یہ بھی اچھا ہوا ——— شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے"

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا ——— جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اُسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ ہفتے کا دن تھا۔ موجودگی میں موسم کچھ سے تانگوں کے فیصلے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابل غور بات کو آئین جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں مشغول تھا۔ اُسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے ملایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس پار دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اُس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اُس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اُسے خیال آیا۔ ان کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پر جو محنت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر بیٹھے ہیں۔ ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ علو جلنے ہیں۔

حالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا ——

صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک نمایاں شکل اختیار کر گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے سفید گلابی ربڑ میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے انداز اس نے اس "گورے" کو جسے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب گورے نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگرٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا "جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے" اُس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا اقتدار ہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی اُسے موقعا کر بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا تھا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیئے تھے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا فیصلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پچھلے اپریل کے بنے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

استاد منگو کے لہجے میں جابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا "ہیرا منڈی"

"کرایہ مانگ۔ وہی ہوگا۔ استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سُن کر کوا حیران ہو گیا۔ وہ چلایا "پانچ روپے۔ کیا ظلم ——— !"

"ہاں ہاں پانچ روپے۔" یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا قد بھینی کرایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو یا بے کار باتیں بناؤ گے؟"

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر، استاد منگو سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیرِ اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی ہڈی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی رانوں کے ساتھ دو تین بار چھو کر گھڑے گھڑے اوپر سے نیچے تک گورے کو دیکھا۔ گورا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور اس رُخ میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اُتر کر سے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے خمار بس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلّانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی باؤلے کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا ———

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ۔ پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ——— اب ہمارا راج ہے بچو!"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ———

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے ——— اب بنا قانون ہے میاں ——— بنا قانون!"

اور بے چارا گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ ہتھوڑوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی مجرم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "بنا قانون، بنا قانون" چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

"بنا قانون، بنا قانون کیا بک رہے ہو ——— قانون وہی ہے پرانا!"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

راجندر سنگھ بیدی

گرہن

رُوپ، رَسْپ، کَتھُو اور متا ——— ہولی نے اساڑھی کے کاشتکاروں کو چار بچے دیئے تھے اور پانچواں چند ہی مہینوں میں جننے والی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑنے لگے، گالوں کی ہڈیاں اُبھر آئیں اور گوشت ان میں پھپک گیا۔ وہ ہولی جسے پہلے پہل متیا پیار سے چاند رانی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور جس کی صحت اور سندرتا کا حسد کیا کرتی تھا، گرے ہوئے پتے کی طرح زرد اور پژمردہ ہو چکی تھی۔

آج رات چاند گرہن تھا۔ سرِ شام چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہولی کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی کپڑا پھاڑ سکے ——— پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں گے، وہ سی نہ سکتی تھی ——— منہ سلا بچہ پیدا ہوگا۔ اپنے میکے خط نہ لکھ سکتی تھی ——— اس کے بڑھے ہوئے حروف بچے کے چہرے پر لکھے جائیں گے، اور اپنے میکے خط لکھنے کا اسے بڑا چاؤ تھا۔

میکے کا نام آتے ہی اس کا تمام جسم ایک نامعلوم جذبہ سے کانپ اٹھتا۔ وہ میکے تھی تو اسے سسرال کا کتنا چاؤ تھا لیکن اب وہ سسرال سے اتنی سیر ہو چکی تھی کہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس بات کا اس نے کئی مرتبہ تہیہ بھی کیا لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔ اس کے میکے اساڑھی گاؤں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھے۔ سمندر کے کنارے ہر پھل بندر پر شام کے وقت سٹیمر لانچ مل جاتا تھا اور ساحل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد اس کے میکے گاؤں کے بڑے سمندر کے رنگ خوردھکس دکھائی دینے لگتے۔

آج شام ہونے سے پہلے روٹی پکا، برتن کے کام سے فارغ ہونا تھا۔ متیا کہتی تھی گرہن سے پہلے روٹی وغیرہ کھا لینی چاہیئے ورنہ ہر حرکت پیٹ میں بچے کے جسم و تقدیر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا وہ بدنصیب، فراخ خفتنوں والی ہیٹل متیا اپنی ہونہار بانکے پیٹ سے کسی اکبرِ اعظم کی متوقع ہے۔ چار بچوں، تین مردوں، دو عورتوں، چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور اکیلی ہولی ——— وہ دوپہر تک، تو ہولی برتنوں کا انبار صاف کرتی رہی، پھر جانوروں کے لئے جوار کھلی اور چنے بھگونے چلی۔ ستے کہ اس کے کولہے درد سے پھٹنے لگے اور نہایت پسند یہ پیٹ میں اپنی بے اضاعت گرہوں کو توڑ پھوڑ دینے والی حرکتوں سے احتجاج کرنے لگا۔ ہولی شکست کے احساس سے چور کی پر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ بہت دیر تک چوکی جا فرش پر بیٹھنے کے قابل نہ تھی اور پھر متیا کے خیال کے مطابق چوڑی ہلکی چوکی پر بہت دیر بیٹھنے سے بچے کا سر چپٹا ہو جاتا ہے۔ بوڑھا ہر

تو اچھا ہے۔ کبھی کبھی ہولی بیا اور کاشتکاروں کی آنکھ بچا کر کھاٹ پر سیدھی پڑ جاتی اور ایک پرشکم کتیا کی طرح "انگوں" کو اچھی طرح سے پھیلا کر جمائی لیتی اور پھر اسی وقت کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنے ننھے سے وزرخ کو سہلانے لگتی۔

یہ خیال کرنے سے کہ وہ سیتل کی بیٹی ہے، وہ اپنے آپ کو روک نہ سکتی تھی۔ سیتل سارنگ ولیگرام کا ایک متمول ساہوکار تھا اور سارنگ ولیگرام کے فوج کے بیس گاؤں کے کسان اس سے بیاج پر روپیہ لیتے تھے۔ اس کے باوجود اسے کاشتکاروں کے ہاں ذلیل کیا جاتا تھا۔ ہولی کے ساتھ کتوں سے بھی بُرا سلوک ہوتا تھا۔ کاشتکاروں کو تو بچے چاہئیں، ہولی جہنم میں جائے۔ گویا سارے گجرات میں یہ کاشتکار ہی کُل وہ ہوا گُل کو بڑھانے والی ——— ہوا کا صحیح مطلب سمجھتے تھے۔

ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ ایک نیا کیڑا گھر میں رینگتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اور بچے کی وجہ سے کھایا پیا ہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ شاید اسے روٹی بھی اسی لئے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں بچہ مانگتا ہے اور اسی لئے اسے حمل کے شروع میں چاٹ اور اب پھل آزادانہ دیئے جاتے تھے۔

"دیور ہے تو وہ الگ پیٹ لیتا ہے" ہولی سوچتی تھی" اور ساس کے کوسنے مار پیٹ سے کہیں بڑے ہیں اور بڑے کاشتکار جب ڈانٹنے لگتے ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ ان سب کو بھلا میری جان لینے کا کیا حق ہے؟ ..... رسیلا کی تو بات ہی دوسری ہے شاستروں نے اسے پرماتما کا درجہ دیا ہے۔ وہ جس چھری سے مارے اس چھری کا بھلا! ..... لیکن کیا شاستر کسی عورت نے بنائے ہیں؟ اور بیا کی تو بات ہی علیحدہ ہے ——— شاستر کسی عورت نے لکھے ہوتے تو وہ اپنی ہم جنس پر اس سے بھی زیادہ پابندیاں عائد کرتی۔ ....."

..... راہو اپنے ننھے بھیس میں نہایت اطمینان سے امرت پی رہا تھا۔ چاند اور سورج نے وشنو مہاراج کو اس کی اطلاع دی اور بھگوان نے سدرشن سے راہو کے دو ٹکڑے کر دئے۔ اس کا سر اور دھڑ دونوں آسمان پر جا کر راہو اور کیتو بن گئے۔ سورج اور چاند دونوں ان کے مقروض ہیں۔ اب وہ ہر سال دو مرتبہ چاند اور سورج سے بدلہ لیتے ہیں اور ہولی سوچتی تھی۔ بھگوان کے کھیل بھی نیارے ہیں ..... اور راہو کی شکل کیسی عجیب ہے۔ ایک کالا سا رکشس، شیر پر چڑھا ہوا دیکھ کر کتنا ڈر لگتا ہے۔ رسیلا بھی تو شکل سے راہو ہی دکھائی دیتا ہے۔ برتا کی پیدائش پر بھی چالیسواں بھی نہ نہائی تھی تو آ موجود ہوا ——— کیا ہیں نے بھی اس کا قرضہ دینا ہے؟

اس وقت ہولی کے کانوں میں ماں بیٹے کے آنے کی بھنک پڑی۔ ہولی نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جلدی سے توے کو دھیمی آنچ پر رکھ دیا۔ اب اس میں جھکنے کی تاب نہ تھی کہ پھونکیں مار کر آگ جلا سکے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر آنے لگیں۔

رسیلا ایک نیا مرمت کیا ہوا چارپائی ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور زمین کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس کے پیچھے بیا آئی اور آتے ہی بولی:

"بہو ..... اناج رکھا ہے کیا؟"

ہولی ڈرتے ڈرتے بولی "ہاں ہاں ..... رکھا ہے ——— نہیں رکھا، یاد آیا، بھول گئی تھی بیا ....."

"تو بیٹھی کر کیا رہی ہے خانہ جادی؟"

ہولی نے رحم جویانہ نگاہوں سے ساس کی طرف دیکھا اور بولی "جی! مجھ سے اناج کی بوری بلائی جاتی ہے کہیں؟"

بیا لاجواب ہو گئی مادریں بھی اسے ہولی کی نسبت اس کے پیٹ میں بچے کی زیادہ پروا تھی۔ شاید اسی لئے ہولی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی:

"تو نے سُرمہ کیوں لگایا ہے ری؟ ——— رانڈ، جاتی بھی ہے آج گھن سے جو کہیں اندھا ہو جائے تو تیرے ایسی بہو کا اسے ماننے چلے گی؟"

ہولی چپ ہو گئی اور نظریں زمین پر گاڑے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑاتی گئی۔ اور سب ہر جائے لیکن رانڈ کی گالی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اسے بڑبڑاتے دیکھ کر میا اور بھی بکتی جھکتی چابیوں کا گچھا تلاش کرنے لگا۔ ایک سیلے شیخ دان کے قریب سرسوں پیسنے کا کھرل رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر وہ بھنڈارے کی طرف چلی گئی۔ رسیلے نے ایک پرہوس نگاہ سے ہولی کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہولی اکیلی تھی۔ رسیلے نے آہستہ سے آنچل کو چھوا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے دامن جھٹک دیا اور اپنے دیور کو آوازیں دینے لگی۔ گویا دوسرے آدمی کی موجودگی چاہتی ہے۔ اس کیفیت میں مرد کو ٹھکرا دینا معمولی بات نہیں ہوتی۔ رسیلا آواز کو چباتے ہوئے بولا:

"میں پوچھتا ہوں بھاوج اتنی جلدی کاہے کی تھی؟"

"جلدی کیسی؟"

رسیلا پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہی... تم بھی تو گبھ ہو گئیا؟"

ہولی سمجھ کر بولی "تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

ہولی نے نادانستگی میں رسیلے کو وحشی، بدچلن، ہوس ران سبھی کچھ کہہ دیا۔ چوٹ سیدھی پڑی، رسیلا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ لاجواب آدمی کا جواب چپت ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں انگلیوں کے نشان ہولی کے گالوں پر دکھائی دینے لگے۔

اس وقت میا ماش کی ایک فکی اٹھائے ہوئے بھنڈارے کی طرف سے آئی اور بھوسے پر سوکن کی وجہ سے بیٹھ کر جھڑکنے لگی۔ ہولی کو رسیلے پر تو غصہ نہ آیا۔ البتہ میا کی اس عادت سے جل بھن گئی ——— "رانڈ، آپ مارے تو اس سے بھی زیادہ اور جو بیٹا کچھ کہے تو ہمدردی جتاتی ہے، بُری آتی ہے....."

ہولی سوچتی تھی کل رسیلے نے مجھے اس لئے مارا تھا کہ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اور آج اس لئے مارا ہے کہ میں نے بات کا جواب دے دیا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے کیوں ناراض ہے، کیوں گالیاں دیتا ہے، میرے کھانے پکانے، اٹھنے بیٹھنے میں اسے کیوں سلیقہ دکھائی نہیں دیتا..... اور میری یہ حالت ہے کہ ناک میں دم آ چکا ہے اور مرد عورت کو مصیبت میں مبتلا کر کے آپ الگ ہو جاتے ہیں، یہ مرد.....!

میا نے کچھ ہلدی اور نمک وغیرہ رسوئی میں بکھیر دیا اور پھر ایک بھیگی ہوئی ترازو میں اسے تولنے لگی۔ ترازو گیلا تھا یہ میا بھی دیکھ رہی تھی اور جب بالکس مٹی چاول پیندے میں چپٹ گئے تو بھوسرتی کرتی پھر بڑبڑ ہو گئی اور آپ اتنی سگھڑ کہ نئے دوپٹے سے پیندا صاف کرنے لگی۔ جب بہت میلا ہو گیا تو دوپٹے کو سر سے اتار کر ہولی کی طرف پھینک دیا اور بولی:

"لے، دھو ڈال"

اب ہولی نہیں جانتی بھاوج کہ وہ روٹیاں پکائے یا دوپٹہ دھوئے۔ بولے یا نہ بولے، ہلے یا نہ ہلے، وہ کتیا ہے یا ناباب جاوی۔ اس نے دوپٹہ دھونے ہی میں مصلحت سمجھی۔ اس وقت چاند گرہن کے زیر میں داخل ہونے والا ہی ہو گا۔ بچہ جنے ہوئے کپڑے کی طرح چرمرسا پیدا ہو گا اور اگر ماہ دو ماہ بعد بچے کا بڑا سا چہرہ دیکھ کر اسے کوسا جائے تو اس میں ہولی کا کیا قصور ہے؟ ..... لیکن قصور اور بے قصوری کی تفصیلات ہی نظیرہ سے کیونکہ یہ کوئی سننے کے لئے تیار نہیں کہ اس میں ہولی کا گناہ کیا ہے ——— سب گناہ ہولی کا ہے۔

اسی وقت ہولی کو سارنگ دیو کا رام یاد آ گیا۔ کس طرح وہ اسوج کے شروع میں دوسری عورتوں کے ساتھ گرہانا چاکرتی تھی، اور جاڑی سے سرپر رکھے ہوئے گھڑے کے سوراخوں میں سے دھنی پھوٹ پھوٹ کر ماتھوں کے چاروں کونوں کو منور کر دیا کرتی تھی۔ اس وقت سب عورتیں اپنے خامایدہ ہاتھوں سے تالیاں بجایا کرتی تھیں اور گایا کرتی تھیں ———

ماہندی[1] تو اوی مالوے ایزو رنگ گیو گجرات مے

ماہندی رنگ لاگیو رے

اس وقت وہ ایک اُچھلنے کودنے والی الھڑ چھوکری تھی' ایک بحر و قافیہ سے آزاد نظم' جو چاہتی تھی پڑھا جاتا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ شباب جاوداں تو نہ تھی اور اس کی سہیلیاں ——— وہ بھی اپنے اپنے قرض خواہوں کے پاس جا چکی ہوں گی۔

.... سارنگ دیو گرام میں گرہن کے موقع پر جی کھول کر دان پن کیا جاتا ہے۔ عورتیں اکٹھی ہو کر تروید ی گھاٹ پر اشنان کے لئے چلی جاتی ہیں۔ پھول، ناریل، بتاشے سمندر میں بہاتی ہیں۔ پانی کی ایک اچھال نہ کھولے ہوئے آتی ہے اور سب پھول پتوں کو قبول کر لیتی ہے۔ اس وقت اشنان سے سب مرد و عورتوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گذشتہ سالی کرتے رہے ہیں۔ اشنان سے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہو جاتی ہے۔ سمندر کی لہر لوگوں کے سب گناہوں کو بہا کر دور، بہت دور ایک نامعلوم، ناقابل عبور، ناقابل پیمائش سمندر میں لے جاتی ہے..... ایک سال بعد پھر لوگوں کے بدن گناہوں سے آلودہ ہو جاتے ہیں، پھر گنا جاتے ہیں، پھر دیا کی ایک لہر آتی ہے اور پھر اک اوصاف۔

جب گرہن شروع ہوتا ہے اور چاند کی نورانی صحت پر داغ لگ جاتا ہے تو چند لمحات کے لئے چاروں طرف خاموشی اور پھر رام نام کا جاپ شروع ہوتا ہے۔ پھر گھنٹے، تاقوس، سنکھ ایک دم بجنے لگتے ہیں۔ اس شور و غوغا میں اشنان کے بعد سب مرد و عورتیں جگمگے ٹی صورت میں گاتے بجاتے گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔

گرہن کے دوران میں غریب لوگ بازاروں اور گلی کوچوں میں دوڑتے ہیں۔ لنگڑے جیسا کھیاں گھماتے ہوئے اپنی اپنی جھولیاں اور کشکول تھامے پلیگ کے چوہوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے چلے جاتے ہیں کیونکہ راہو اور کیتو نے خوبصورت چاند کو اپنی گرفت میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے۔ رزم دل ہمند دان دیتا ہے تاکہ غریب چاند کو چھوڑ دیا جائے اور دان لینے کے لئے بھاگنے والے بھکاری 'چھوڑ دو' 'چھوڑ دو' دان کا وقت ہے ——— چھوڑ دو کا شور مچاتے ہوئے میلوں کی مسافت طے کر لیتے ہیں۔

چاند گرہن کے نزدیک آنے والا ہی تھا۔ ہولی نے بچوں کو بڑے کاشتکار کے پاس چھوڑا۔ ایک سیلی کیلی دھوتی باندھی اور عورتوں کے ساتھ ہر پھول بندر کی طرف اشنان کے لئے چلی۔

اب رسیلا، بسیلا، جڑاؤ کا شبنم اور ہولی سب سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پھول تھے، گجرے تھے اور آم کے پتے تھے اور بڑی مالا کے ہاتھ میں رودراکش کی مالا کے علاوہ مشک کافور تھا جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں پر بہا دینا چاہتی تھی تاکہ مرنے کے بعد سفر میں اس کا راستہ روشن ہو جائے اور ہولی ڈرتی تھی ——— کیا اس کے گناہ سمندر کے پانی سے دھل جائیں گے؟

سمندر کے کنارے، گھاٹ سے پون میل کے قریب۔ ایک لائٹ ہاؤس تھا۔ وہ جگہ ہر پھول بندر کا ایک حصہ تھی۔ بندر کے چھوٹے سے ناہموار ساحل اور ایک مختصر سے ڈاک پر کچھ ٹینڈل غروب آفتاب میں روشنی اور اندھیرے کی کشمکش کے خلاف ننھے ننھے بے بضاعت ہاتھ کھاکے بنا رہے تھے اور لائٹ ہاؤس کے کسی کیبن سے ایک ہلکی سی گھٹتی ہوئی روشنی سیماب دار پانی کی لہروں پر ناچ رہی تھی۔ اس کے بعد ایک بیچ کی گہرائی دکھائی دی۔ چند ایک دھندلے سے سائے ایک اژدہا غائب کو کھینچنے لگے۔ آٹھ بجے سٹیمر لانچ کی آخری سیٹی تھی ——— پھر وہ سارنگ دیو گرام کی طرف روانہ ہو گا۔ اگر ہولی اس پر سوار ہو جائے تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہ چاندنی میں نہاتے ہوئے گویا صدیوں سے آشنا

---

[1] ماہندی رچنا! ترا لاوہ ——— وسط ہند میں پیدا ہوتی۔ اس کی گجرات رنگا ہوا ہے۔ گجرات سے حنا کا رنگ چڑھ گیا ہے۔

کلس دکھائی دینے لگیں ..... اور پھر وہی اماں ..... کنواریں اور گربا ناچ!

ہولی نے ایک نظر سے شیو کی طرف دیکھا۔ شیو حیران تھا کہ اس کی ماں نے اتنی بھیڑ میں جھک کر اس کا منہ کیوں چوما اور ایک گرم گرم قطرہ کہاں سے اس کے گالوں پر آ پڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر رسیلے کی انگلی پکڑ لی۔ اب گھاٹ آ چکا تھا جہاں سے مرد اور عورتیں علیحدہ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ کے لئے نہیں، فقط چند گھنٹوں کے لئے ..... اسی پانی کی گواہی میں وہ اپنے مردوں سے باندھ دی گئی تھیں۔ پانی میں بھی کیا پُراسرار، بعید الفہم طاقت ہے ——— اور دور سے لائچ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ہولی تک پہنچ رہی تھی۔

ہولی نے بھاگنا چاہا مگر وہ بھاگ بھی تو نہ سکتی تھی۔ اس نے اپنی ہلکی سی دھوتی کو کس کر باندھا ——— دھوتی نیچے کی طرف ڈھلک جاتی تھی ..... آدھ گھنٹے میں وہ لائچ کے سامنے کھڑی تھی۔ لائچ کے سامنے نہیں ——— سارنگ دیو گرام کے سامنے ..... وہ کلس مندر کے گھنٹے، لائچ کی سیٹی، اور ہولی کو یاد آیا کہ اس کے پاس تو ٹکٹ کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔

وہ کچھ عرصہ تک لائچ کے ایک کونے میں بدحواس ہو کر بیٹھی رہی۔ پونے آٹھ بجے کے قریب ایک ٹیڈیل آیا اور ہولی سے ٹکٹ مانگنے لگا۔ ٹکٹ نہ پانے پر وہ خاموشی سے وہاں سے ٹل گیا۔ کچھ دیر بعد ملاحوں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں ..... پھر اندھیرے میں خفیف سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کوئی لفظ ہولی کے کان میں بھی پڑ جاتا ——— مرغی ..... روپے ..... چاہیاں میرے پاس ہیں ..... پانی زیادہ ہوگا .....

اس کے بعد چند بحشیار قہقہے بلند ہوئے اور کچھ دیر بعد تین چار آدمی ہولی کو لائچ کے ایک تاریک کونے کی طرف دھکیلنے لگے۔ اسی وقت آبکاری کا ایک سپاہی لائچ میں وارد ہوا۔ عین جبکہ دنیا ہولی کی آنکھوں میں تاریک ہو رہی تھی ہولی کو امید کی ایک شعاع دکھائی دی۔ وہ سپاہی سارنگ دیو گرام کا ہی ایک چھوکرا تھا اور میکے کے رشتے سے بھائی تھا۔ چھ سال ہوئے وہ بڑی امنگوں کے ساتھ گاؤں سے باہر نکلا تھا اور سارا متی پھاند کر کسی نامعلوم دیس کو چلا گیا تھا۔ کبھی کبھی مصیبت کے وقت انسان کے حواس بجا ہو جاتے ہیں۔ ہولی نے سپاہی کو آواز سے ہی پہچان لیا اور کچھ دلیری سے بولی:

"کنھورام!"

کنھورام نے بھی مہتیل کی چھوکری کی آواز پہچان لی۔ بچپن میں وہ اس کے ساتھ کھیلا تھا ———

کنھورام بولا:

"ہولے!"

ہولی یقین سے معمور گھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "کنھر بھیا ..... مجھے سارنگ دیو گرام پہنچا دو ....."

کنھورام قریب آیا اور ایک ٹیڈیل کو گھورتے ہوئے بولا:

"سارنگ دیو جاؤ گی ہولے؟" اور پھر سامنے کھڑے ہوئے آدمی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا: "تم لے اسے یہاں کیوں رکھا ہے بھائی؟"

ٹیڈیل جو سب سے قریب تھا بولا:

"بچاری کوئی دکھیا ہے۔ اس کے پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ ہم سوچ رہے تھے ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

کنھورام نے ہولی کو ساتھ لیا اور لائچ سے نیچے اتر آیا۔ ٹاک پر قدم رکھتے ہوئے بولا:

"ہولے ..... کیا تم اساڑھی سے بھاگ آئی ہو؟"

"ہاں!"

"یہ سر پھر جاریوں کا کام ہے؟ ..... اور جو میں کانسٹیبلوں کو خبر کر دوں تو؟"

ہولی ڈر سے کانپنے لگی۔ وہ نہ تو بااب جاری تھی اور نہ سر پھر جاری۔ اس جگہ اور ایسی حالت میں وہ کنھوراام کو کچھ کہہ بھی تو نہ سکتی تھی۔ وہ اپنی کمزوری کو محسوس کرتی ہوئی خاموشی سے سمندر کی لہروں کے تلاطم کی آوازیں سننے لگی۔ پھر اس کے سامنے لانچ کے سب ٹمٹمانے لگے۔ ایک ہلکی سی وسل ہوئی اور پہلے ہولے سارنگ دیو گرام ہولی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ پیچھے کی جانب دیکھا۔ لانچ کی ہلکی سی روشنی میں اسے جھاگ کی ایک لمبی سی لکیر لانچ کا پیچھا کرتی ہوئی دکھائی دی۔

کنھوراام بولا "ڈرو نہیں ہولے ..... میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ یہاں سے کچھ دور ناؤ پڑتی ہے۔ پو پھٹتے چلوں گا۔ یوں گھبراؤ نہیں۔ رات کی رات سرائے میں آرام کر لو۔"

کنھوراام ہولی کو سرائے میں لے گیا۔ سرائے کا مالک بڑی حیرت سے کنھوراام اور اس کی ساتھی کو دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ نہ رہ سکا تو اس نے کنھوراام سے نہایت آہستہ آواز میں پوچھا: "یہ کون ہیں؟"

کنھوراام نے آہستہ سے جواب دیا: "میری پتنی ہے۔"

ہولی کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ ایک دفعہ اس نے اپنے پیٹ کو سہارا دیا اور دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ کنھوراام نے سرائے میں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں قدم رکھا۔ کچھ دیر بعد کنھوراام آیا تو اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی .....

سمندر کی ایک بڑی بھاری اچھال آئی۔ سب پھول، بتاشے، آم کی ٹہنیاں، گجرے اور جتنا ہما شک کافور بہا کر لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے مہیب ترین گناہ بھی لپیٹ گئی ——— دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابل عبور، ناقابل پیمائش سمندر کی طرف ..... جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی ..... پھر سنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی۔ سرپٹ، بگٹٹ ..... وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی، پٹ پٹ کر مر جاتی، ہانپتی اور دوڑتی لگتی ..... اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا۔ ..... وہ دھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لئے سراسیمہ ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے ..... چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور دور اساڑھی سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں ———

دان کا وقت ہے .....

چھوڑ دو ..... چھوڑ دو ..... چھوڑ دو .....

ہر پھول بندرسے آواز آئی ———

پکڑ لو ..... پکڑ لو ..... پکڑ لو .....

.....

چھوڑ دو ..... دان کا وقت ہے ..... پکڑ لو ..... چھوڑ دو!!

عصمت چغتائی

چوتھی کا جوڑا

سردی کے چونکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ڈبوں پھوٹی کپڑوں کی چھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ ملے ڈلے کی عورتیں خارش اور جھی ہوئی کھیتی ہوئی تھیں جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لئے تھے۔ کہیں کہیں کوئی ننھی سا چوہیا بچہ رضد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اٹھتا۔

"تائیں تائیں میرے لال!" کوئی ہتھلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر ٹکا کر یوں بلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو، اور بچہ پھٹک کر خارش ہو جاتا۔

آج کتنی اُنس بھری نگاہیں کبڑی کی ماں کے تنکے چہرے کو تک رہی تھیں، چھوٹے عرض کی ٹوٹی کے دو پاٹ تو جوڑ لئے گئے تھے، مگر ابھی سفید گڑی کا نشان ہیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ کانٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبڑی کی ماں کا رتبہ بہت اونچا تھا، ان کے سو کے سو کیے باتوں نے زمانے کتنے چیر سنوار دیے تھے، کتنے چھٹی چھپر چھک تیار کیے تھے اور کتنے ہی کفن پہنتے تھے۔ جہاں کہیں محلہ میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی پیونت نہ بیٹھتی، کبڑی کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبڑی کی ماں کپڑے کی کاٹ بانٹ تیں، کلف توڑتیں، کبھی ٹکڑوں ٹکڑوں بناتیں، کبھی چوکھنا کرتیں، باتوں ہی باتوں میں تیلی پھلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھیر تو کل آئے گا، گریبان کے لئے کترن میری بچی سے لے لو۔" اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کردہ کترنوں کی پٹی بنا کر پکڑ لیتیں۔

یہ آج تو سفید گڑی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبڑی کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی، جب ہی تو سب دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں۔ کبڑی کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکن نہ تھی، چار گز گڑی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت کر رہی تھیں، تول تول

کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اُداس اُداس گہری جمہریاں اذیت بھری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اُمڈ آگئیں۔ ہر گوشہ جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو، اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھالی۔

محلہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس اُبھری۔ گود کے بچے بھی ٹھٹک دبے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لیے دیے سوئی کے ناکوں میں ڈورے پرو لئے، نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے، کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا ٹھاکر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سُرخ چھپلی سی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پیلے پیلے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا۔ گہری صندوقوں جیسی تہوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام پلٹتا اور مشعلیں لپک اٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس کے تنہی دوپہ بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑی کے بھاری قہر جیسے صندوق کی تہوں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طوطی کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی بات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سنبھال دیا جاتا، اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چہان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری جازم بچھتی۔ محلہ کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جا جا کر انہیں بجاتی آن پہنچتیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گرنٹ ذرا اتر آئے گی، بچوں کا کپڑا نہ نکلے گا؟"

"لو بوا۔ لاؤ تو سہی۔ تو کیا نگوڑی ماری قول کی چولیں پڑیں گی؟" اور پھر سب کے چہرے مگن مند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کھیا گر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں اور ہیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہہ لگاتیں۔ ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی محمد حسنوں کی گل بیاں سنانے لگتی، بیوہ گانے سے مذاق اور چھیلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے برقعوں پر کنواری بالیوں کو منہ سی سے دور ہٹا کر ہانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا اور جب کوئی نیا قصہ سہ دری سے اُبھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں اللہ یہ قصے انہیں خود کب نصیب ہوں گے۔

اس چہل پہل سے دور کبریٰ غرہم کی ماری مچھروں والی کوٹھڑی میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلہ پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی اُلٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی۔ کوئی جوٹا اللہ مارا پہیں سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی اُلٹی کٹ جائے تو جان نہ نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا یا تو دور کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں مٹھی کوڑیوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آ جائے تو سمجھ لو یا تو پہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پالنے سے پلنگ پر جھگڑا ہو گا۔ چولی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑ پنا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے زور سے سگھڑیاں نے جیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کتر بھی بچتی تو تیلے والی یا شیشی کا غلاف سی کر دھنک، گوکرو دے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو برات آ گئی تو بچی سینہ کا کام آئے گی۔

اور جب سے اباگذرے سلیقہ کا بھی دم بھلی گیا۔ حمیدہ کو ایک دم پنے آیا یا وا آ گئے۔ ابا کتنے دبلے پتلے تھے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اُٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے پر پوچھتے تھے نیم کی مسواک کا کوئی پھوننڈا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں

بل بل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے مکھڑے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی سہمی ہیں بے طرح اُلجھتی جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر بی اماں آکر انہیں سہارا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی؟"

آنچل کے دباؤ سے سُرخ آنکھیں اُوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکراتے۔ کھانسی تو رُک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے؟ کتنی بار کہا تم سے؟"

"بڑے شفاخانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سرنجاں لگواؤ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن۔"

"اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی ہے اُوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی کو۔"

"دکھاؤں گا" ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اچھو لگتا۔

"آگ لگے اس موئے حقے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر۔"

اور اب ابا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی، کون کہتا تھا جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سنسناہٹ سن کر ٹھٹک کے رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کہیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہو تیں، نہ اس کے سینے پر طوفان اٹھے اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے چل چل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ بیٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انہیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آ سکا۔

اور عمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوڑ دی۔

اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی صاف کے بھرن کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا معمول نہ ٹوٹا۔ وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جاڑ کر کے شبرات کے مہینے میں کریپ کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں آ رہا ہے۔ بی اماں کو تو بس جیسے ایک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی اور انہوں نے ابھی دُلہن کی مانگ بھی نہیں کتری۔ چل سے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندہ کی ماں کو بلا بھیجا کہ

"بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔"

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو خوب سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گھنگھرو چھ ماشہ سلمہ ستارا اور ہاؤ گز پٹے کے لئے قول لاویں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چمچما گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آ رہے تھے۔

"اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبڑی پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھڑی میں جا چھپی تھی۔ جب سویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبڑی کوٹھڑی سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لے گئی۔

"لاؤ میں دھو دوں بی آپا۔" حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

"نہیں!" وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے میں لپٹا ٹاکتی رہیں۔

جس راستہ کان کی نوکیں گئی تھیں اسی راستے پھول، پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو سنبھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آتے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے، کھنتے، بھنتا پلاؤ پکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ بہنے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی۔" وہ حمیدہ کو منہ لپٹاتے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی "ہم بجو کے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جاروکی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اوٹتی ہے تاکہ موٹی سی ملائی پڑے اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے، اور کیوں نہ بھرے، آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا، پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہنی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ ان کے کپڑوں کو پیار سے تہ کرتیں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار جرابوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں، لہسانی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ ان کے تیل میں چپچپاتے ہوئے تکیے کے خلاف پر سوئٹ ڈریم کاڈھتیں، پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے پراٹھے ٹوٹ کر کھاتا اور شام کو آ کر کوفتے کھا کر سو جاتا اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں گھس پھس کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بے چارہ۔" بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔ "ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔"

"اے فوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے۔ اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے۔" بی اماں فخر سے کہتیں۔

"اے تو پردہ توڑ دانے کو کون کہے ہے۔" بی آپا کے پکے جاموں کو دیکھ کر انہیں بی اماں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑتی۔

"اے بہن تم تو سچ مچ بہت بھولی ہو۔ یہ ہیں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی کبیدو کو کام آئے گی؟" وہ میری طرف دیکھ کر ہنستیں۔

"اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونہہ، اری چل دیوانی۔"

"اے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟"

"بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے۔"

"اسے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا۔" بی اماں چڑ کر کہتیں۔

"نہیں تو۔ مگر..... ." میں لاجواب ہو گئی اور پھر نسکوٹ ہوتی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار

مسکرا پڑیں، چپکے سے ہر لیں؛

"رکیو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"نہیں ہنسوں گی۔" میں نے وعدہ کیا۔

"کھانا کھا لیجئے۔" میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر چوکی کے نیچے رکھے ہوئے بستے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خاص آنکھیں ہیں۔

"جانو ذرا ماری اوی دیکھیو تو سہی، وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اسے ہے سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

آپا جی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی، ڈوبتی ہوئی امراتوں کا غبار تھا اور چوتھی کے چاند کے پچھلے جزیروں کی مانند اداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھیسے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے، میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہئے تھا کہ مذاق اڑاؤں، قہقہہ لگاؤں کہ "واہ جی واہ دولھا بھائی! کھلی کے کباب کھا رہے ہو؟" مگر جانو کسی نے میرا مزہ خراب کر دیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بھیجا اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے کم بخت۔

"راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟" بی اماں کے کھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد

"بتائیے نا؟"

"اری بخشیک سے جا کر پوچھ۔" بی اماں نے ٹھوکا دیا۔

"آپ نے لاکر دئے اور ہم نے کھائے، مزیدار ہی ہوں گے۔"

"ارے واہ رے جنگلی۔" بی اماں سے نہ رہا گیا۔

"تمہیں پتہ بھی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔"

"کھلی کے؟ ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں؟ میں تو حاضری ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسہ کھانے کا۔"

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں، دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دگنی سیلائی کی اور پھر جب شام کو میں گئی تو بولے:

"کہئے آج کیا لائی ہیں؟ آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے؟"

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے دلی کی خوراک دیں، گھی چپڑے پراٹھے خصائص، میری بی آپا کو جو خانہ زاد نصیب نہیں اور اسے روزہ مارنی ہنگوائیں۔ میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آگیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چوٹے ہیں بھی بیتیں، بی اماں چلتی سے بوڑھے ہیں کر لیں اور راحت کی خانہ آنکھیں تیر کتا کر میرے دل میں بھما کریں۔ بات بے بات چھیڑنا، کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک۔ کے

بہانے سے اور ساتھ ساتھ بھلبازی بھی کھیلا کرے بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمہارا یہ میل نہ کھایا جائے گا۔ مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں پر چمٹے کی اٹھتی ہوئی راکھ..... نہیں..... میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ میں نے ان کے سفید بال الٹ کر سلجھے چھوڑ دیئے۔ ناس جائے اس کم بخت نزلہ کا بچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانہ سے مجھے پکارا۔

"اونہہ!" میں جل گئی۔ پرلی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟" راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑلی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو اتنا جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے:" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

"کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ! جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں، پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں..... اور نہیں..... کھا نہیں لوں بلکہ چوم لوں۔" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردرا ہلدی رنگیا کی بساند میں سڑا ہوا ہاتھ منہ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے "یہ ہاتھ" میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں، جوتے صاف کرتے ہیں، یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بیگار کب ختم ہوگی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انہیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی صندلی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو..... مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

"اور کہہ رہے تھے اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جو شانہ وہ پیا کریں۔"

"چل جھوٹی۔"

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ....."

"اری چپ مُردار!" انہوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

"دیکھ تو موٹر بن گیا ہے انہیں رے آ۔ پر دیکھ مجھے میری قسم میرا نام نہ لیجو۔"

"نہیں بی آپا۔ انہیں نہ دو وہ موٹر۔ تمہاری ان مٹی بھر ہڈیوں کو موٹر کی کتنی ضرورت ہے؟" میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی! تم خود کیا پہنو گی؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے؟ چولھے کے پاس تو ویسے ہی بھلس رہتی ہے۔"

موٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا:

"کیا یہ موٹر آپ نے بنایا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے، مٹی کے تھوبے۔ یہ موٹر ان ہاتھوں نے بنایا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پہندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گرہیں پھنسی ہوئی ہیں، یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو ننھے پنگورے جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدگدا کر کہیں کے اور دو ہتڑ بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمہاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے

منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرانہ رکھ سکیں گے، انہیں بیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا، انہیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمہارے جسم پر چربی چڑھ جانے کے لئے صبح سے شام تک مالش کرتے ہیں۔ صابن اور سرسوں کے ٹکیاں لگاتے ہیں، چولہے کی آنچ سہتے ہیں، تمہاری خلاصیں دھوتے ہیں تاکہ تم اجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو، محنت نے ان میں زخم ڈالی دئے ہیں، ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ انہیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں، بھتوک اور کال کی باتیں، دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجئے۔ دیکھئے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے!"

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

"وہ بولے؟" ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"بی آپا! یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں" میں نے سوچا میں آج سب کچھ بتا دوں گی۔

"کیوں؟" وہ مسکرائیں۔

"مجھے اچھے نہیں لگتے..... دیکھئے میری ساری چوڑیاں چورہ ہو گئیں" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بڑے شریر ہیں" انہوں نے رومانٹک آواز میں شرما کے کہا۔

"بی آپا..... سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں" میں نے مچل کر کہا "آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی"

"کیا ہوا؟" بی اماں نے جانماز بچھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میری چوڑیاں بی اماں"

"راحت نے توڑ ڈالیں؟" بی اماں مسرت سے چمک کر بولیں۔

"ہاں!"

"خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اسے ہے تو دم کا ہے کو نکل گیا۔ بڑی مرم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں" پھر پکار کر بولیں "خیر تو بھی چوتھی میں بدلے لیجو، وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی" یہ کہہ کر انہوں نے نیت باندھ لی۔

منجھلی بہن سے چھوٹا فنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر اسرار خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

"اسے ہے تو بڑی ہی لٹس ہے۔ اسے ہم تو اپنے ہونٹوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے"

اور وہ مجھے ہونٹوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انہوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو میری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بیچارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں، شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے جہاں سنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتی تھیں کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو وہ تو رو دھو کے آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا

کہ ان کے ہاں شادی کرادو۔ پوچھا کہ "بھئی کس سے؟" تو کہا یہ کسی سے بھی کرادو۔ اور ضامجھ سے نہ بنا۔ تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو نہیں سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔"

"ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اسے لڑکا مانگنے کیا دیر لگتی ہے؟" بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بینگن ہوتا ہے۔ بدھر جھکا دو اُدھر ہی لڑھک جائے گا۔"

مگر راحت تو بینگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکا تو دینے پر کہیں میں ہی نہ پس جائیں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دھیمے پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سُنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کو چھاتی پر ٹوکر اپنے کنوارپنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

"کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے بہت ہی کم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک اُلجھن بن کر نہیں اُبھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر اُبھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو دیکھنا ہی ہوگا۔"

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ان کے گھر کی سے یہ پیام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کی تلوے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی، دوپہر بھر محلہ ٹولے کی لڑکیاں حنا دیں اور دھم مچاتی رہیں۔ بی آپا سلائی لجائی مچھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں نچوڑنے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چرکی پر بیٹھی چولھے کے چوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر جھرّیوں کے نشان تھے آج مشکل کشائی ہوگی، بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی نکمی جائیں گی، آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی ہتھیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو ناخنوں میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کو بخار نہیں اترا تھا۔ تھکے ہارے دنے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل بچا کر نماز کے طبلے کی طشتری مجھے تھمادی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔" ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس طبلہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا طبلہ مزار برسائے گا میرے خون میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے پر برات دیکھنے جا رہی ہوں، دولھا کے منہ پر لمبا سا سہرہ پڑا ہے جو گھوڑے کی ایالوں کو چوم رہا ہے.....

چوتھی کا شہانی جوڑا پہنے پہلوں سے لدی، شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آ رہی ہیں..... سہاگی کا زنار جڑاؤ جھمجھل جھمجھل کر رہا ہے بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے..... بی آپا کی حیا سے بوجھل پلکیں ایک بار اوپر اٹھتی ہیں شکریے کا ایک مسنون مسکراہٹ کے خزاں میں قہقہے کی طرح اُلجھ جاتا ہے۔

"یہ سب میری ہی محنت کا پھل ہے۔" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے..... بھیدہ کا گلا بھر آیا.....

"جاؤ نہ میری بہنو" بی آپا نے لست جگا دیا اور وہ ہچکچا کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ..... یہ طبلہ" اس نے اچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا..... اس کے پیر لرز رہے تھے جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو اور پھر پھاٹ کیسکا..... اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ نکالی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس طبلہ کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا..... نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں، اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے طبلے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر آنگن میں مشک

بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے، پراٹھے نہ پکے اور سوئیٹر نہ بُنے گئے۔ وقت نے جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی ایک ہی جست میں انہیں دبوچ لیا اور انہوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اسی سردی میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلّے کی بہو بیٹیاں جڑیں، کفن کا سفید سفید لٹھا، موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیلا گیا۔ تخت کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا، باہیں ابرو پیٹ رہی تھی، گاؤں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں جیسے ان میں لاکھوں اژدہے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انہوں نے چوپڑ کیا، اور ان کے دل میں اَن گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور بھرا بھرا اطمینان تھا جیسے انہیں یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چولھی کا یہ جوڑا سینا نہ جائے۔

ایک دم سردی میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں مینڈکوں کی طرح چیخنے لگیں۔ عمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے سامنے جا ملی۔ لال لال پر..... سفید گدی کا نشان! اس کی سُرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دُلہنوں کا سہاگ رچا ہے، اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کے ڈورہ توڑا دیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں جیسے آج انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبڑی کا ہوا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہے اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

احمد علی

ہماری گلی

(احمد علی کا ایک افسانہ "مہاوٹوں کی ایک رات" اس سے پہلے بھی پیش کیا گیا ہے لیکن وہ افسانہ ان کے فن کی نمائندگی نہیں کرتا۔ پہلے افسانے کی شمولیت سے محض ایک وقتی رجحان کی نشان دہی مقصود ہے۔
(مرتب)

میرا مکان پنڈت کے کوچہ میں تھا۔ میرے کمرے کے دروازے میں دو پٹ تھے نیچے کا حصّہ بند کر دینے سے صرف اوپر کا حصّہ ایک کھڑکی کی طرح کھلا رہ جاتا تھا۔ یہ کھڑکی پتلی سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے مرزا دودھ والے کی دکان تھی اور میرے دروازہ کے برابر صدیق بنئے کی اور اس کے برابر عزیز خواری کی اور اس پاس کہاروں کی دکانیں، عطار کی دکان، پان والے کی اور دو چار اور دکانیں تھیں۔ مثلاً قصائی کی، بساطی کی، حلوائی کی دکان۔

ہمارے محلّہ میں سے ہو کر لوگ دوسرے محلّوں میں جا سکتے تھے۔ اس لئے سڑک برابر چالو رہتی تھی اور اس طرح کے لوگ راستہ پہچانے کے لئے میری کھڑکی کے سامنے سے گذرتے۔ کبھی کوئی سفید پوش گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں چھتری لگائے ہوئے چلا جاتا۔ کبھی شام کو کوئی دلایتی منڈا پینے "اگریٹیں" ٹوپی لگائے چھڑکاؤ کے پانی سے بچتا ہوا اپنے کپڑوں کو چھینٹوں سے بچاتا، بچوں اور لڑکوں سے کتراتا ہوا ان کے گھورنے پر غراتا اور آنکھیں نکالتا ہوا گذر جاتا۔ کبھی کبھی راہگیر عاجز آ کر لڑکوں کو مارنے کے لئے لکڑی یا چھڑی اٹھاتا۔ اور بھاگ کر لڑکے چلاتے "لُو دیے بے، لُو دیے بے" پھر مرزا دودھ والے کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دیتی۔

"ابے لڑکو! کیا کرتے ہو۔ تم کو گھروں میں کچھ کام نہیں؟" اور اگر کوئی پاس بیٹھا ہوتا تو مرزا اس سے کہنے لگتا۔ "ان کی ماؤں کو تو دیکھو انڈوں کو چھوڑ رکھا ہے کہ سانڈ بیلوں کی طرح گلیوں میں گھوما کریں۔ حرامزادوں کو گالی گلوچ اور دھینگا مشتی کے علاوہ اور کچھ کام ہی نہیں ہے"

اور مرزا کی چھوٹی چھوٹی سُرخ آنکھیں چمکنے لگتیں اور دو اپنی سفید بکری داڑھی پر ایک ہاتھ پھیرتا اور کسی خریدار کی طرف مخاطب ہو جاتا اور کونڈے میں سے دہی یا کڑھاؤ میں سے دودھ نکال کر ملائی کا ٹکڑا اٹھاتا اور خریدار کی طرف بڑھا دیتا۔

لوگ کہتے تھے کہ مرزا کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا ہے، لڑکپن میں سبق نہ یاد کرنے پر اس کے باپ نے اس کو گھر سے نکال دیا اور کچھ روز مارے مارے پھرنے کے بعد اس نے دکان کر لی۔ اس کے بعد اکثر اس کے باپ نے اس سے معافی بھی مانگی اور خوشامد بھی کی لیکن مرزا نے شادی بھی کر لی اور اس کا کام چل نکلا۔ اس کی دکان کے چھوٹے چھوٹے ملائی کے پیڑے شہر بھر میں مشہور تھے اور اس کا دودھ بہت لذیذ ہوتا تھا۔ رات کو جب کوئی دودھ لینے آتا تو وہ اس کو آنچ دے اور لٹیا میں خوب اچھالتا۔ یہاں تک کہ اس میں سے جھاگ نکلنے لگتا۔ پھر پیچھے سے ملائی کا ٹکڑا اس صفائی سے توڑتا کہ دودھ بننے

بک نہ پاتا تھا۔ اکثر اس کی بیری دکان پر بیٹھتی تھی۔ وہ بوڑھی ہو گئی تھی ——— اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں، اس کی کمر جھک گئی تھی اور منہ میں ایک دانت باقی نہ تھا۔ اس کی اونچی پیشانی اور اس کے گورے رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے کی عورت ہے۔

لیکن اب ان کا کاروبار کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ ضعیفی کی وجہ سے وہ زیادہ محنت نہ کر سکتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا مر چکا تھا اور اب ان کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا۔ نزکِ موالات کے زمانے میں جب آزادی کا خیال ملک میں اِدھر سے اُدھر تک پھیل چکا تھا، مرزا کا لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ جلوس میں شریک ہوا۔ گاندھی جی کی جے اور بندے ماترم کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی گھنٹہ گھر پر گوروں کی فوجیں مسلح کھڑی تھیں۔ کپتان پولیس، ڈپٹی کمشنر اور چند اور انگریز کھڑے تھے اور لوگوں کے ہجوم اور قومی جھنڈے کو پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ لوگ آگے جانا چاہتے تھے لیکن فوجیں ان کو آگے جانے سے روک رہی تھیں۔ لوگوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور ڈپٹی کمشنر نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں بہت لوگ کام آئے اور مرزا کا بیٹا بھی مرنے والوں میں تھا۔ بڑی دیر کے بعد جب لاش لے جانے کی اجازت ملی تو لوگ مرزا کے لڑکے کی لاش کو اس کے گھر لائے۔

ساری دکانیں بند تھیں اور محلہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جاڑوں کی دوپہر مردہ اور سرد معلوم ہوتی تھی۔ نالیوں میں صفائی نہ ہوئی تھی اور ان میں سے متعفن پھوٹ رہی تھی۔ جب لاش گھر میں آئی تو مرزا اور عاص کی بیوی سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ ان کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ان کا بیٹا ابھی زندہ تھا، ہنس بول رہا تھا، جس نے صبح ہی پڑھے لکھے تھے، کڑھاؤ مانگا تھا۔ جو کپڑے بدل کر اپنے کسی دوست سے ملنے گیا تھا اب زندہ نہیں ہے بلکہ مر چکا ہے۔ وہ بار بار خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو دیکھتے تھے اور مرزا کی بیوی لاش سے لپٹ کر بپھٹ بپھٹ کر رو رہی تھی۔ لوگوں نے اس کو الگ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک منٹ کے لئے لاش سے علیحدہ نہ ہوتی تھی وہ "ہے ہے میرا لال" کہہ کہہ کر روتی تھی اور کبھی کبھی اس کے مرثیے چیخ نکلتی اور وہ چلاتی:

"ان فرنگیوں کو خدا غارت کرے، میرے لال کو مجھ سے چھین لیا۔ خدا کرے کہ یہ غارت ہوں۔"

مرزا پاگلوں کی طرح کبھی گھر کے اندر کبھی باہر بولایا ہوا پھرتا تھا۔ صدیق ہنسنے نے اپنی دکان کھولی تھی اور مرزا جو بال بکھیرے ہوئے اِدھر سے گذرا تو کسی نے آواز دی اور پوچھا "بھائی بڑا افسوس ہوا، حادثہ کیا پیش آیا؟"

مرزا کی آنکھوں میں ایک آنسو باقی نہ تھا لیکن اس کے سارے چہرے پر کرب کی حالت تھی۔

"تقدیر پھوٹ گئی۔ میرا بھولا بھالا لڑکا جا تا رہا۔" یہ کہہ کر مرزا پھر گھر کی طرف چلا گیا۔

گاہک جو کھڑے ہوئے تھے پوچھنے لگے کیا ہوا۔ صدیق نے جھک کر دیکھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سڑک پر گرد و غبار اڑنے لگا۔ ایک کاغذ ٹکڑا ہوا میں اٹھا اور کچھ دور اوپر جا کر الٹتا پلٹتا نیچے کی طرف گرنے لگا۔ مرزا کے پٹھے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ گلی میں غائب ہو گیا۔

"ہوا کیا۔" نزکِ موالات کرنے گیا تھا، گولی لگی اور مر گیا۔ نہ جانے اپنے کام میں دل کیوں نہیں لگاتے۔ سرکار کے خلاف جانے کا یہی نتیجہ ہے۔ بیٹا جوان تھا۔ ان دونوں کے چیرٹوں اور کھلے ریشوں کا شکار ہو گیا۔"

یہ کہتے کہتے صدیق نے ایک جھٹکے میں کنگھی نکالا۔ بہت سے جھٹکے دیدا میں گھڑے ہوئے تھے اور گاہک کی طرح معلوم ہوتے تھے کنگھی میں بال نکال کر صدیق نے گاہک کی طرف بڑھائی۔ گاہک جو بے غوری سے صدیق کی باتیں سن رہا تھا۔ بال کو اپنے کپڑے میں باندھنے لگا۔ یکایک اس کی نگاہ بال پر پڑی اور وہ بولا "یہ واہیات ہاشا، یہ کونسی دال ہے رہے ہو۔ میں نے تو ارہر کی مانگی تھی۔ ارہر کی پھری کہو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بیوی بگڑے گی۔"

گھر میں مرزا کی بیوی اپنا سر دے مار رہی تھی اور بین کر کر کے رو رہی تھی اور انگریز دل اور گاندھی کو کوس رہی تھی۔ یاسین کی ماں کو جب اس حادثے کی خبر ملی

تو وہ پرسے کے لئے آئی۔ اس کا جوان لڑکا بھی ہیضا کے نیچے دب کر مر گیا تھا اور وہ اس کے ننھے بچوں کو سنبھالتی کہ کے پالتی تھی۔ دونوں گلے مل کر خوب روئیں اور مرنا کی بیری کو ذرا قسمتی ہوئی..... آخر کار لڑکے کو دفن کرنے لے گئے۔ رات اندھیری تھی اور بے بسی تاریکی کی طرح سارے محلہ میں پھیلی ہوئی تھی ہوا سرد تھی اور محلہ میں سیل کی وجہ سے جاڑا زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ لیمپوں کی دھیمی روشنی میں محلہ بھیانک اور ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا اور سڑک پر کوئی جاندار چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ صرف مرزا کی دکان کے اندر کئی بتیوں کے مڑانے اور کھڑبڑ کی آواز آ رہی تھی۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد تک اکثر مرزا کی بیوی کے گانے کی آواز آیا کرتی تھی،

؎ گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے

لیکن پھر وہ خاموش رہنے لگی اور کام کاج میں مشغول رہتی۔

میرے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک پرانا کبوتر کا درخت تھا۔ ایک زمانہ میں اس میں پھل لگا کرتے تھے اور شہد کی مکھیاں غذا کی تلاش میں نیچے اترا کرتی تھیں۔ اس کی بڑی ڈالیوں پر اکثر جانور آ کر بیٹھتے درجنوں بھینگے کبوتر راتوں کو بسیرا کیا کرتے تھے لیکن اب اس کے پتے جھڑ گئے تھے ڈالیاں گر چکی تھیں اور ساں کا سا سیاہ اور ہیئت رات کی تاریکی میں اس ہانس کی طرح کھڑا رہتا جو کھیتوں میں جانوروں کو ڈرانے کے لئے گاڑ دیا جاتا ہے اب نہ اس پر جانور منڈلاتے تھے نہ شہد کی مکھیاں اس طرف آتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کوا اس کے ٹھنٹھ پر بیٹھ کر کائیں کائیں کتا اور اپنا گلا پھاڑتا یا کوئی چیل اس پر ذرا دیر کو چلاتی اور پھر اڑ جاتی۔ صبح کی بڑھتی ہوئی روشنی میں تنا آسمان پر چمک اٹھتا تھا۔ لیکن شام کو فضا کی بڑھتی تاریکی میں آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور رات میں مل جاتا۔ رات کو اکثر گھر میں داخل ہوتے وقت میری نگاہ اس مرتے اور بھیانک تنے پر پڑتی۔ پھر اس کے ساتھ ہی اٹھتی ہوئی آسمان پر جاتی۔ تارے چمکتے ہوتے ستے اور ٹھیک اس کے سرے پر بنات النعش کا آخری ستارہ مجھ کو دکھائی دیتا تھا لیکن وہ نہ میری نگاہ اور آسمان کے درمیان حائل ہو جاتا اور میں تاروں کے پھیلاؤ کو نہ دیکھ سکتا۔

محلہ میں اکثر ایک پاگل عورت آیا کرتی تھی۔ کسی نے اس کے بال کاٹ دیئے تھے اور اس کا سر اس کے ڈانا اور بھدا جسم پر ایک افروٹ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ خدا ترس لوگ کبھی کبھی اسے کپڑے پہنا دیا کرتے تھے لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد وہ پھر ننگی ہو جاتی تھی۔ یا تو کوئی کپڑوں کی گٹھڑی کھول آزمایا وہ خود ان کو پھاڑ کر پھینک دیتی تھی۔ اس کے منہ سے ہمیشہ رال بہا کرتی اور اس کے ہاتھ ہمیشہ اکڑے ہوئے رہتے۔ وہ اکثر سڑک سڑک کر سڑک پر ناچتی اور تھرکتی اور گوگلوں کی طرح گن گن کرتی۔ جیسے ہی وہ محلہ میں داخل ہوتی لڑکوں کا ایک غول اس کے پیچھے پیچھے تالیاں بجاتا اور "پگلی" کہہ کہہ کر پتھر پھینکتا اور منہ چڑاتا۔ عورت "ایں، ایں" کرتی اور کوٹوں میں چھپتی۔ جب کبھی مرزا کی دکان کے سامنے یہ واقعہ ہوتا تو مرزا لڑکوں پر چیختا "ابے سسروں تمہیں مزا نہیں ہے! بھاگو یہاں سے دور ہو!"

لیکن ذرا دیر کے بعد لڑکے پھر جمع ہو جاتے۔

اکثر بڑے آدمی بھی اس سے مذاق کرتے۔ وہ بدصورت مزدور تھی لیکن اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اکثر متوجہ کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا لیکن اب بدمعاشوں میں مل گیا تھا۔ اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہتا "کیوں تیرے بچہ کب ہوگا؟"

اور پگلی ایک دردانگیز وحشیانہ آواز نکالتی اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا کے جوڑ سیلے اور لجلجے رہتے کسی راہ گیر یا دوکاندار سے مخاطب ہو کر منہ کی طرف اشارہ کرتی۔ اس کی کریہہ آواز میں ایک منت ہوتی تھی، ایک بے کس و بے بس شخص کی وہ التجا جو وہ اپنے حاکم یا اپنے سے زیادہ طاقتور انسان سے کرتا ہے کہ مجھے بخش دو اور بچا لو۔ مگر اور لوگ بھی مذاق کرنے میں شریک ہو جاتے اور زور زور سے قہقہہ لگاتے.....

ہندوستان میں ہزارہا لوگ ایسے ہیں جن کو سوائے کھانے پینے اور مرجانے کے کسی بات کا احساس نہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں، کمانے لگتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور مرجاتے ہیں، اس کے علاوہ انہیں دنیا کی کسی بات سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسانیت کی زبان میں نہیں ہوتی۔ زندگی کی عظمت کا ان کو کوئی احساس نہیں جیسے غلام جو کام کرنے اور مرجانے کے علاوہ کوئی دوسری حقیقت ہی نہیں جانتے۔ زندگی کا طلوع اور موت کا غروب ان کے لئے دونوں یکساں ہیں۔ ان کے لئے دن کام کرنے اور راتیں سو رہنے کو بنی ہیں۔ بس یہی ان کی زندگی کی حقیقت ہے ——— اور صرف موت ان کو زندگی سے نجات دلا سکتی ہے۔

ایک اور چیز جو ہمارے محلے میں کثرت سے دکھائی دیتی تھی، وہ کتے تھے۔ سرے ہوئے اور فاقہ زدہ۔ اکثر کو کھجلی تھی اور ان کی کھال میں گنجے نظر آتا تھا۔ اپنے بڑے بڑے دانتوں کو نکوس کر وہ اپنے پٹھے کھجاتے تھے۔ یا قصائی کی دکان کے سامنے ایک ہڈی کے پیچھے ایک دوسرے کو نوچتے اور لہولہان کر دیتے۔ وہ اپنی دُمیں ٹانگوں کے بیچ میں دبائے نالیوں میں سونگھتے وہ بے آتے تھے اور قصائی کی دکان کے سامنے جھپٹوں پر جھپٹتے۔ لیکن اکثر جیسے ہی ان کو کوئی گوشت کا ٹکڑا یا ہڈی دکھائی دیتی تو چھلیں اور پر سے جھپٹا مارتیں، دوران کے سامنے سے گوشت کو اٹھالے جاتیں۔ پھر وہ ایک لمبے آدمی کی طرح جو خفیف ہوگیا ہو، اپنی دم دبائے ہوئے سڑک کو سونگھا کرتے یا اپنی کھینپ آپس میں لڑائی لڑکے اور ایک دوسرے کا خون بہا کر رہتے۔

صبح کو بہت سویرے نیرا چننے والے کی آواز آتی تھی۔ وہ اپنی ٹوکری میں گرم گرم تازہ بنے ہوئے موٹے چنے گلی گلی اور کوچہ کوچہ بیچتا پھرتا تھا۔ اس کی عمر کوئی چالیس سال کے قریب تھی لیکن وہ دبلا اور سوکھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں ابھی سے نمایاں ہوگئی تھیں اور اس کی خشخشی داڑھی میں سفید بال آگئے تھے۔ اس کی آنکھیں ایک بیمار کی آنکھوں کی طرح تھیں جن کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور جن میں بھوک اور غربت و رنج اور مصیبت صاف جھلکتے تھے۔ ان کے ڈھیلوں میں باریک باریک سرخ رگیں دور سے دکھائی دیتی تھیں جیسے یا تو نشے میں یا کئی دنوں کے فاقے اور بخار کے بعد پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے سر پر ایک کپڑے کی جیلی ٹوپی رکھی رہتی تھی۔ گلے میں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کی ابلتی دھوتی میں سے پتلی پتلی ٹانگیں دکھائی دیتی تھیں۔ عرصہ ہوا وہ ہمارے شہر میں کسی نزدیک کے ضلع سے کام کی تلاش میں آگیا تھا۔ وہ رات کو ایک مسجد میں پڑ رہتا اور دن بھر شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا لیکن شہروں کی حالت روزگار کے معاملہ میں گاؤں اور قصبوں سے کسی طرح بہتر نہیں اور شیرا کو کوئی کام نہ ملا۔ مسجد میں میر امان اللہ نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ شیرا نے ان کو اپنا قصہ سنایا۔ میر صاحب کو اس کی حالت پر ترس آیا اور وہ اسے اپنے گھر لے گئے۔ شیرا نیک اور دیانتدار آدمی تھا۔ کچھ عرصے کے بعد میر صاحب نے اسے پانچ روپے دیئے اور کہا:

"ان سے کوئی کام شروع کر دو۔ اس لئے میں یہ روپے دیتا ہوں۔ جب تمہارے پاس پیسے ہوں تو یہ رقم واپس کر دینا ورنہ کوئی فکر کی بات نہیں۔"

شیرا نے دال اور کابلی چنوں کا خوانچہ لگایا۔ کچھ عرصے میں شیرا کو بہت سے محلے والے جان گئے اور اس کا سودا خوب بکنے لگا۔ سال بھر کے اندر ہی اس نے میر صاحب کے روپے واپس کر دیئے۔ اپنے بیوی بچوں کو بلالیا اور ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگا اور بہت خوش تھا۔

اسی دوران میں عبدالرشید کو سوامی شردھانند کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا کا حکم ہو گیا۔ سارے شہر کے مسلمانوں میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا پھانسی والے روز جیل کے باہر ہزارہا آدمیوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب دروازہ توڑ کر اندر گھس جانا چاہتے تھے لیکن جب پولیس نے عبدالرشید کی لاش کو دینے سے انکار کر دیا تو لوگوں کے جوش اور غصے کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح جیل کو مسمار کر دیں اور اس مردِ غازی کی لاش کو ایک شہید کی طرح دفن کریں۔

اس دن شیرا کسی کام سے جامع مسجد کی طرف گیا ہوا تھا۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا اور سڑکیں ایک شہرِ خموشاں کی طرح اجاڑ اور سنسان معلوم ہوتی تھیں۔ اس کو کئی ایک بھوکے کتے پڑے ہوئے رونے چلاتے دکھائی دیئے۔ ایک نالی میں ایک مرا ہوا کبوتر پڑا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی تھی اس کی ٹانگیں سخت اور نیلی اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے پر پانی میں بھیگ گئے تھے اور اس کی ایک آنکھ کریہہ معلوم ہو رہی تھی۔ شیرا کھڑا ہو کر اس کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں سامنے سڑک کے موڑ سے کلمہ کی آواز زور زور سے آنے لگی۔ لوگ ایک جنازہ لئے چلے آ رہے تھے۔ جوں جوں جنازہ شیرا کی طرف آتا گیا پیچھے بھیڑ اور زیادہ نظر آتی گئی۔ یہاں تک کہ دو رویہ آدمیوں کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ خلقت عبدالرشید کے جنازے کو کسی طرح لے بھاگی تھی۔ شیرا بھی جنازے کی طرف بڑھا اور کندھا دینے میں شریک ہو گیا۔ اتنے میں سامنے سے پولیس نمودار ہوئی اور انہوں نے جنازہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور کئی ایک آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں میں شیرا بھی تھا۔ اور اس کو اس جلوسے میں شرکت کرنے کی بدولت دو سال کی سزا ہو گئی۔

اب وہ قید بھگت چکا تھا۔ لیکن اس کے گاہک اب اس کی آواز سے نامانوس ہو چکے تھے اور اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ دوبارہ دکان لگا سکے۔ کچھ لوگوں نے چندہ کر کے اسے دو روپے دے دیئے اور ان سے شیرا نے پھر کام شروع کیا اور اب چنے بیچتا پھرتا تھا۔ لیکن اب اس کی آواز میں پچھلا کرارا پن باقی نہ رہا تھا اور مصیبت اور تکلیف اس کی ہر پکار میں سنائی دیتی تھی۔ تاہم بچے اس کی آواز سن کر چنے لینے کو دوڑتے تھے اور وہ مٹھی سے نکال نکال کر چنے تولتا اور ان کو دیتا تھا۔

ایک اور شخص جو ہمارے محلے میں ہر روز رات کو آیا کرتا تھا وہ ایک اندھا فقیر تھا۔ اس کا قد بہت چھوٹا تھا اور اس کی نچلی داڑھی پر چیچک پڑی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لوٹا ہوا بانس کا ٹھونٹا رہتا تھا جسے ٹیک ٹیک کر وہ آگے بڑھتا تھا۔ وہ بالکل ہیجڑا اور ناچیز معلوم ہوتا تھا جیسے کوڑے کے ڈھیر پر مکھیوں کا غول یا کسی مری ہوئی بلی کا ڈھانچہ لیکن اس کی آواز میں وہ مایوسی اور درد تھا جو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ دیتا تھا۔ جاڑوں میں اس کی آواز جیسے سارے محلے میں بے بسی پھیلاتی ہوئی کہیں دور سے آتی۔ میں نے آج تک اس سے زیادہ اثر کرنے والی آواز نہیں سنی اور ابھی تک وہ میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ بہادر شاہ کی غزل اس کے منہ سے پھر پرانے زمانے کی یاد تازہ کر دیتی تھی۔ جب ہندوستان اپنی نئی پندشوں میں نہیں جکڑا گیا تھا۔ اس کی آواز سے صرف بہادر شاہ کے رنگ کا ہی اندازہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ہندوستان کی غلامی کا زخم سننے میں آتا تھا دور سے اس کی آواز آتی تھی ؎

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے وہ میں ایک مشتِ غبار ہوں

لیکن محلہ کے شرفا اس کو پیسے دینے سے گھبراتے تھے کیونکہ وہ چرس پیتا تھا.....

ایک روز رات کو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ گرمیوں کی رات تھی اور کوئی دس بجے کا وقت۔ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں لیکن کوئلہ اور مرغ کی دکانیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ تو سو گئے تھے اور کچھ ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ ہوا میں خنکی اور گرمی تھی اور نالیوں میں سے سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ مرزا کی دکان کے تختے کے نیچے ایک سیاہ بلی گھات لگائے بیٹھی تھی جیسے کسی شکار کی تاک میں بیٹھی ہو۔ ایک شخص نے ایک آنہ کا دودھ لے کر پیا اور آنجوری کو زمین پر ڈال دیا۔ بلی دبے پاؤں تختے کے نیچے سے نکلی اور آنجوری کو چاٹنے لگی۔ اسی وقت میری کھڑکی کے سامنے سے کوئی گذری۔ اس کا رنگ سیاہ تھا لیکن شباب نے اس کے چہرے پر ایک رونق اور خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ اس کی چال میں ایک بے باکی اور الھڑپن تھا اور جسم زندگی کے ابھار سے توانا اور سبک تھا۔ وہ مصنف صاحب کے یہاں ملازم تھی جن کی

بیوی نے اس کو بچپن ہی سے پالا تھا۔ اب وہ بیوہ ہو گئی تھی اور اسے بیوہ ہوئے بھی تین سال گذر گئے تھے لیکن محلہ کے نوجوانوں کی نگاہیں اس کی طرف لگی رہتی تھیں۔

جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچی تو منو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کلو جھنجھلا کر بولی:

"ہوش مشتنڈا کہیں کا۔ تجھ پر خدا کی مار۔ ایک عورت کو اکیلا دیکھ کر ہاتھ مارتا ہے۔"

منو بولا:

"تیری جوانی پھر کس دن کام آئے گی؟"

"ہٹ دور ہو، موئے میرا ہاتھ چھوڑ۔"

برابر ایک مکان کی چھت پر دو بلیوں کے لڑنے کی آواز آئی۔ اسی وقت کلو نے زور سے جھٹکا دیا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"جھاڑو پٹے، جو نامرد سمجھتا ہے مجھ میں دم نہیں۔ اتنا چٹاؤں گی کہ عمر بھر یاد کرے گا۔"

مرزا جو ایک خریدار کو دودھ دینے کے بعد ذرا دیر کے لئے گھر میں چلا گیا تھا اسی وقت واپس آیا اور کلو کا آخری جملہ اسے سنائی دیا اور وہ بولا:

"کیا بات ہے کلو! کیا ہوا؟"

لیکن کلو بغیر پیچھے مڑے تیزی سے گلی کے اندر داخل ہو گئی۔ عزیز غیراتی جو اپنی دکان کے سامنے سو رہا تھا، شور سے اٹھ گیا۔ منو کو کھڑا دیکھ کر پوچھنے لگا:

"ابے منو کیا بات ہے؟"

منو بدستور اداس و غصہ سے بھرا کھڑا تھا۔ اس کا منہ خشک ہو کر رستا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک سانپ کی آنکھوں کی طرح زہریلی اور تیز ہو گئی تھیں۔ کوڑے کے ڈھیر پر ایک بلی کی آنکھیں ذرا دیر چمکتی ہوئی دکھائی دیں لیکن پھر غائب ہو گئیں۔ منو نے چھپی ہوئی ناامیدی کی آواز میں جواب دیا:

"کچھ نہیں یار، کلو تھی۔"

"ابے کچھ سودا بھی پٹا؟"

"نہیں میاں ہتھے نہیں چڑھی۔ ہاتھ جھٹک کے بھاگ گئی، لیکن سستی جائے گی کہاں؟"

اور پر بلیاں ابھی تک لڑ رہی تھیں۔ وہ ایک بھیانک طریقے سے غرانے کے بعد زور زور سے چیختی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسری کو کھا جائیں گی پھر پیاؤں میاؤں کر کے ایک بھاگ نکلی اور بلا غراتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

عزیز خیراتی نے منو کو اپنے پلنگ پر بٹھا لیا اور سرہانے سے بیڑی نکال کر اس کی طرف بڑھائی لیکن منو نے اپنی قمیص کی جیب میں سے ایک چاندی کا سگرٹ کیس نکالا اور عزیز سے کہا:

"نہ میاں تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں تمہیں مزے دار سگرٹ پلاتا ہوں۔"

اور ایک سگرٹ نکال کر عزیز کو دیا۔

"ارے یار میں نے کہا اب کے کس کا مار لایا؟"

"میاں یاروں کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس کو نہ دے مولا، اس کو دے آصف الدولہ۔ اگر اللہ میاں کے بھروسے پر بیٹھتے تو کام چل لیا ہوتا۔"

"میاں ہوش کی لو، دس سے ڈرو، دوزخ میں جلو گے، توبہ کرو۔"

"جا یار یہ بھی کیا گدھوں کی باتیں کرتا ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کھاؤ پیو اور مزے کرو۔ اس سے زیادہ استاد نے سکھایا ہی نہیں۔ میں تو مچھروں کو تاؤ دیتا ہوں اور پڑے پڑے سیدھا ہو جاتا ہوں۔ کہاں کی دوزخ لگا دی۔ آئے ہوں گی بھی تو بھگت لیں گے۔ اب کہاں کا رونا پالا۔"

"بس یار بس۔ کیوں خراب باتیں منہ سے نکال رہا ہے۔ سب کچھ آگے آجاتا ہے۔ ساری اکڑ دھری رہ جائے گی۔"

"اچھا یار تو تو اس طرح کی باتیں کرنے لگا، میں اب چل دیا۔"

"توری سُن تو یار۔ ایک بات مجھے دنوں سے حیران کر رہی ہے۔ قسم کھا بتا دے گا؟"

"اچھا جا کیا یاد رکھے گا۔ اللہ قسم بتا دوں گا۔"

"یہ بتا تو آخر چوری کیوں کرتا ہے؟"

"بھئی اس کی نہیں بدی تھی۔"

"دیکھ قول دے چکا ہے۔"

"اچھا جا تو بھیتا میں ہا۔ سچ پچھے تو بات یہ ہے کہ میں کبھی چوری نہ کرتا۔ تو جانتا ہے میرے رشتہ دار کافی امیر لوگ ہیں۔"

"جبھی تو میں اور بھی حیران ہو رہا ہوں۔"

"میرا ایک بھائی لگتا تھا۔ لونڈا نمکین تھا۔ یہ کوئی دس برس کی بات ہے۔ تو میری کچھا اس سے چل گئی تھی۔ ہم دونوں مدرسے میں حاتھ پڑھتے تھے۔ اس نے ماسٹر سے میری شکایت کر دی اور بیتیں لگوائیں۔ میرے اوپر بھوت سوار ہو گیا۔ میں نے کہا سالے بدلہ نہ لیا ہر تو بیتاب سے نہ نکلیں تو دل۔ ایک مرتبہ کی میں نے سالے کا بستہ چرا لیا۔ اس کے اندر بڑی بڑی چیزیں تھیں۔ اس سے شروعات ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ مجھے ایک ماموں کا سگرٹ کیس پسند آگیا۔ میں ان سے مانگ تو سکتا تھا لیکن میں نے پار کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ ان حرامزادوں کے پاس روپے بھی ہیں اور اچھی اچھی چیزیں بھی۔ کیوں نہ اڑایا کروں اور پھر تو میرا ہاتھ خوب صاف ہو گیا۔ یار سچ پچھے تو یہ لوگ کبھی غریب کو مر کر بھی کوئی چیز نہ دیں۔ ان سے تو بس اسی طرح چیزیں وصول ہو سکتی ہیں۔"

"لیکن اگر کہیں پکڑے گئے تو؟"

"پھر تو نے وہی فضول کی باتیں شروع کر دیں۔ اچھا اب میں چلا نہیں تو گھر میں تو تو میں میں ہو گی۔" یہ کہہ وہ اٹھا اور عزیز کی کمر پر زور سے تھپڑ مار کر روانہ ہو گیا.....

ہمارے محلہ کی مسجد میں نثار احمد اذان دیا کرتے تھے۔ یہ قوی ہیکل اور مضبوط تھے۔ ان کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور ان کی داڑھی مہندی سے سُرخ رہتی تھی۔ ان کا سر اکڑا ہوا تھا لیکن پہیوڑیں اور گدی پر ان کے پٹھے بال پڑے رہتے تھے۔ ان کے ماتھے پر ٹھیک بیچ میں ایک بڑا سا گٹا پڑ گیا تھا جو کالا رنگ رکھتا تھا اور الگ دور سے چمکتا تھا۔ اکثر وہ میری کھڑکی کے سائے سے کھنکارتے ہوئے گذرتے تھے۔ وہ گاڑھے کا دھیلی موریوں کا پاجامہ اور گاڑھے کا کُرتا پہنے رہتے تھے اور ان کے کندھے پر ایک بڑا سُرخ رنگ کا چھپا ہوا رومال پڑا رہتا تھا۔ ان کی آواز میں ایک ایسا کھرا پن، گمبھیرتا کے ساتھ ساتھ نرمی تھی جو انسان کو کم عطا ہوتی ہے۔ ان کی اذان دور دور مشہور تھی اور اس کی آواز بہت دور سے سُنائی دیتی تھی۔ شروع شروع میں ان کی آواز سے اس پکار کی شان ٹپکتی تھی جو مسلمانوں کو نماز کے لئے بُلاتی ہے۔ پھر اختتام کے قریب آواز کی بلندیوں میں کبھی ہوتی اذان کے جملے بل کھاتے ہوئے ایک سناٹا اور خاموشی پیدا کرتے ہوئے فضا میں کھو جاتے تھے۔ لوگ نثار احمد کو حضرت بلال حبشی کہتے تھے اور اس مقابلہ میں بہت سی باتیں وہ دونوں میں مشترک تھیں۔ ان کی شاندار آواز اور ان کا سیاہ رنگ۔

ایک مرتبہ میں اپنے مکان کی چھت پر اکیلا بیٹھا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل بچھے ہوئے تھے اور سورج کی روشنی ان کے پیچھے سے پڑ رہی تھی اور ان میں سے ہلکی سی پھیکی روشنی نمایاں تھی۔ کیونکہ مطلع صاف نہ تھا اور شہر کا گرد و غبار اور دور دور تک کی چمنیوں کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے شور و شغب کی جھنکار مکھیوں کے بھنبھنانے کی طرح آرہی تھی۔ ساری فضا میں ایک دل شکن مایوسی تھی، وہ تکلیف دہ کیفیت جو ہمارے شہروں کی خاص پہچان ہوتی ہے

جس میں غربت اور فلاکت، زندگی کی حقارت اور بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ گرد و غبار سے میلے اور پھٹے بادلوں میں ایک جنگلی کبوتر اڑتا ہوا گذرا اور ان کے ہلکے رنگوں میں غائب ہو گیا۔ دور سے ملوں کی سیٹیوں اور ریل کے انجنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شہر کی اونچی عمارتوں اور میناروں سے کبوتر اڑتے یا منڈلاتے دکھائی پڑ جاتے تھے۔ دور دور جدھر نگاہ دوڑتی تھی گندی اور بدنما میلی کچیلی عمارتیں اور مکان کی چھتیں دکھائی دیتی تھیں۔ دور دور جدھر انسان دیکھ سکتا تھا زندگی کی سرد مہری اور بے کاری کا احساس ہوتا تھا۔ کہیں کہیں کوئی دو منزلہ مکان بن رہا تھا اور اس کی پاڑیں آسمان اور رنگا رنگ بیرنگ سدِ راہ ہوتی تھیں۔ لیکن بانسوں اور بلیوں کے رنگ نگاہ کو تکلیف نہ پہنچاتے تھے اور بادلوں کے رنگوں میں مل کر ہلکے اور مدھم دکھائی دیتے تھے۔ اسی وقت منار احمد کے کھنکارنے کی آواز آئی اور پھر ان کی اونچی سنہری آواز فضا میں پھیل گئی۔ یہ آواز کچھ ایسی مایوس کن لیکن تسکین بخش تھی کہ میری کوفت ایک خاموش رنج سے بدل گئی۔ اس آواز میں کوئی عظمت اور بڑائی نہ تھی بلکہ اس سے زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہوتا تھا۔ اس بات کا کہ دنیا مُردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے، اس بات کا کہ زندگی حقیر اور ناچیز ہے۔ اسی طرح جیسے بادلوں کے چہرے پر گرد اور دھواں اور غبار۔۔ اپنے مریم خیالات کا شکار میں اذان کو سُنتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اختتام کے قریب گئی اور حی علی الصلوٰۃ کی خراشی ہیبت پیدا کرنے والی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ پھر حی علی الفلاح، حی علی الفلاح کی آواز سنائی جانے لگی، دنیا کی بے ثباتی کا یقین دلاتی باریک لمبی تان کے دھیمے سُروں میں ہوتی اس آہستگی اور دل بستگی سے ختم ہوئی کہ یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ آواز رُک گئی ہے یا ساری دنیا پر خاموشی طاری ہے، ایک گہری خاموشی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا سے پرے بہت دور ایک اور دنیا ہے جس میں ازل اور ابد دونوں ایک ہیں اور یہ دنیا ہیچ اور بے معنی ہے۔ آواز اس طرح فضا میں کھو گئی جس طرح افق پر زمین ختم ہوتی ہے اور آسمان شروع ہو جاتا ہے اور تمیز نہیں ہو سکتی کہ زمین ختم ہو گئی یا ہر جگہ آسمان ہی آسمان ہے۔ اسی طرح آواز اس آہستگی سے رُک گئی کہ آواز اور خاموشی میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔ آواز کانوں میں گونج رہی تھی لیکن یہی شبہ ہوتا تھا کہ صرف خاموشی کانوں میں ہیجان بپا کئے ہوئے ہے۔

اور میں سوچتا رہا کہ یہ اذان ہماری زندگی کی حقیقت کو کس خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔ وہی بے بسی اور مایوسی جو ہماری رگ رگ میں پیوست ہو گئی ہے وہی نامعیدی اور خارجی حقیقت کا خوف جو ہم کو ایک داخلی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، اس اذان میں موجود تھے۔ ہم دنیا کو چھوڑ کر ازل اور ابد کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ آدمی کو بھلا کر خدا کی تلاش میں مشغول رہتے ہیں اور ہماری زندگی کی ہر چیز ہم کو اسی بات کی ترغیب دلاتی ہے، ہمارا ہر گیت یہی لوریاں سناتا ہے۔ ہمارے پیروں میں بیڑیاں ہیں لیکن ہم ان کی رگڑ کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ وہ ہم کو ایک خارجی حقیقت نہیں معلوم ہوتیں۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہیں، ہمارے گلوں میں طوق ہیں، ہماری زبانوں پر قفل ڈالے گئے ہیں لیکن ہم کو کسی بات کا احساس نہیں، ہمارا جسم مُن ہو چکا ہے، ہماری روح سو گئی ہے اور ہم اپنی بے بسی پر مگن ہیں اور لاپروائی اور بے حسی کی نیند گہری آنے لگتی ہے حتیٰ کہ موت اپنے پنجے بڑھاتی ہے اور اپنی تاریک آغوش میں کھینچ لیتی ہے۔ ہماری نیک نامی اور بدنامی دونوں برابر ہیں۔ ہماری زندگی اور موت دونوں یکساں ہیں اور اذان کی آواز کی طرح ہم اس طرح زندگی سے موت میں بدل جاتے ہیں کہ کوئی تمیز نہیں کر سکتا ہم کبھی زندہ بھی تھے یا یہ سب وہم و گمان تھا اور ہم موت کے دلاسے! ہمیشہ سے اس کی لوریاں سے مخمور غفلت کی نیند سویا کرتے تھے۔

ایک رات کو مرزا کی دکان پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو عزیز تھا، ایک کوئی اور ایک نئے آدمی اور جمع ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے حقہ رکھا تھا اور وہ باری باری کش کھینچ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا،

"میں تو یارو ہر ایک چیز میں وہ اس کی شان دیکھ رہا ہوں۔"

اس پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں غور سے سننے لگا۔

اتنے میں ایک گاہک آیا اور اس نے مرزا سے پانچ پیسے کا دودھ مانگا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مرزا نے ایک آبخورہ اٹھایا اور دودھ نکالنے کے لئے ٹٹیا دودھ کی طرف بڑھائی۔ اس آدمی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "پرسوں رات میں چاندنی چوک میں سے جا رہا تھا کہ سامنے سے

ایک بچھیا آ رہی تھی۔ وہی جگہ ایک بچہ پڑا ہوا تھا۔ گائے بچے کے پاس آن کے رُک گئی۔ میں نے سوچا کہ دیکھیں اب کیا کرتی ہے۔ دیکھتے میں صاحب دِس بچھیا نے اپنے پاؤں پر پرزکر ایک قلانچ ماری اور بچے کو صاف لانگ گئی۔ مجھ کو تو دِس جانور کی عقل میں دِس کی شان نظر آگئی۔"

مرزا کا ایک ہاتھ کٹہاؤ کے پاس تھا، دوسرے میں آبخورہ تھا اور وہ بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ عزیز بولا:

"واہ واہ کیا دِس کی شان ہے!"

مرزا نے لٹیا میں دودھ لیا اور اس کو اچھالنے لگا۔ اتنے میں ایک دوسرا شخص بولا:

"ہاں میاں دِس کی شان کا کیا پوچھ رہے ہو۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمانؑ کو حکم ملا کہ محل بناؤ، تو بس صاحب دِنہوں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ جناتوں نے آناً فاناً میں بڑے بڑے فتر اور سلیں لا لا کے جمع کر دیں اور مدت لگ گئی۔ تم جانتے ہو جناتوں کا کام کتنی فرفری کا ہوتا ہے۔ آج اتنا کل اتنا تھوڑے ہی دنوں میں محل آسمان سے باتیں کرنے لگ گیا۔ حضرت سلیمانؑ روز دِس جنگل جا کے دیکھا کرتے تھے کہ کوئی کام میں سستی تو نہیں کر رہا ہے تو بس صاحب ایک دن محل کھڑا ہو گیا۔ اب صرف دِس کے اندر کی قتلیں اور فتر صاف کرنے رہ گئے۔ دوسرے روز پھر حضرت سلیمانؑ اپنی لکڑی ٹیک کے کھڑے ہو گئے اور ملبہ باہر پھینکنے کا حکم دے دیا۔ لیکن دِتنے میں وہاں سے کچھ اور ہی حکم آچکا تھا۔ اب دیکھئے محل کی شان کہ یہاں تو دِس کی صفائی ہو رہی ہے اور وہاں دِس لکڑی میں گھن لگنا شروع ہو گیا لیکن وہ ڈٹے کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ گھن لگتے لگتے برنٹھ تک پہنچ گیا۔ لیکن دِن کو ذرا بھی خبر نہیں ہوئی اور لکڑی راکھ کی طرح جھڑ گئی اور دِن کا خود کا دم نکل گیا۔ اِدھر تو دِن کا کام تمام ہوا، اِدھر جب جناتوں نے دیکھا کہ جن کا رُعب شباب تھا وہ ہی نہیں رہے تو چمپت بنے۔ لیکن میں تو اس بات پر حیران ہو رہا ہوں کہ اب دِن قتلوں اور فتروں کو کون صاف کرے گا؟"

عزیز کے ہاتھ میں حقہ کی نَے اس کے منہ کے برابر رکھی ہوئی تھی اور وہ بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ مرزا کا ایک ہاتھ جس میں لٹیا تھی اوپر تھا اور آبخورہ والا نیچے اور وہ قصہ میں محو تھا۔

میں نے زور سے قہقہہ لگایا لیکن پھر سہم میں پڑ گیا کہ واقعی ان "قتلوں" اور "فتروں" کو کون صاف کرے گا۔

ہوا کا ایک جھونکا زور سے آیا اور مٹی کے تیل کا لیمپ گل ہو گیا اور سڑک پر اندھیرا تھا۔ اس وقت لوگ مرزا کی دکان سے اٹھ کر دروازہ بند ہونے لگے اور میں بھی گھر کے اندر چلا گیا۔

غلام عباس

آنندی

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلافِ معمول ایک مہمل بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما دھبا ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رکن جو ملک و قوم کے بڑے خیر خواہ سمجھے جاتے تھے نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے:

"..... اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گذرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ عنیم جریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے فازوں، لونڈروں، ازرق بزق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُر مسرت گھر ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

"... ... اور صاحبان پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ نونہالانِ قوم جو درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا انہی کے سر بندھے گا، انہیں بھی صبح و شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ البھن سو سنگھار کئے ہر راہ رو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر نیم کش برساتی اور اسے دعوتِ حسن پرستی دیتی ہیں کیا انہیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے، ناتجربہ کار، جوانی کے نشے میں سرشار نوجوانیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر، ان کے دل میں گناہ کی پُر اسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا.....؟"

اس موقع پر ایک رکن بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرس رہ چکے تھے اور اعداد و شمار سے خاص شغف رکھتے تھے بول اٹھے:

"صاحبان! واضح رہے کہ مقابلوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رکن نے چشمہ لگائے ہوئے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیر اعزازی تھے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "حضرات! ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مروانگی، نکوکاری و پیرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جا رہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنان بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جائز انسانیت سے باہر ہو جاتے اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جان عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکش حیات سے تھک کر باقیماندہ عمر بسر کرنے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سائے میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے، تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی اور لہجہ فریاد کا انداز لئے ہوئے تھا۔ بولے:

"صاحبان! رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ، ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی رسیلی گائیکی، گانے کی گلوری، طوائف کی ہو ہو، سن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفاء کے کان پک گئے ہیں، نیند میں جان آگئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو برا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحب اولاد خود کر سکتا ہے۔۔۔۔۔"

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اہالیان بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ قصبہ میں ان کا قدیمی مکان اس بازار حسن کے بیچوں بیچ واقع تھا

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثار قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں جب وہ اس بازار سے گذرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب عمدہ بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ مجھ میں حد درجہ حماقت تھی۔ بولے "حضرات! میرا اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لئے باعث صد عار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟"

ایک صاحب بول اٹھے۔ "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہال کی مائع فضا میں یکبارگی گدگدی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب بولے "حضرات! یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی عزت و ناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے، اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لئے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے، یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے "بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔"

صدر نے کہا "صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے خاتی مکانات ہیں۔"

یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا اور بالآخر تمام امکانی کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہئے اور انہیں رہنے کے لئے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہئے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے جاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کئے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ اس عرصے میں وہ نئے علاقہ میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس سے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی بستی ہو گی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا جن میں سانپوں اور بچھو گھڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے الو بولتے تھے۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ مگر کسی کا فاصلہ بھی وہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے، یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روز روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف پورہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ بسنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چہیتے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادل ناخواستہ اس علاقہ میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ دو نباتی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بغلہ ہر پار سائی کا جا مہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی۔ یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اپنی خانہ ساز امداد رکھتیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انہیں اچھے وصول ہو گئے تھے اور اس علاقہ میں زمین کی قیمت برائے نام تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لئے تیار تھے چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جا کر کھل کر بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابکدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، پتھر، گارا، اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انہیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ معمار عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے، مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا

کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی گھنٹ گھنٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر سستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گذاری کے خیال سے سب سے پہلے اسی کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا اس لئے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کے بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دوڑ دھائی سورج مزدور، میر عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور رہتے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خورد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گذرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک حقہ اٹھا لایا اور کنویں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر لے خربوزے، شہد سے میٹھے خربوزے، کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا، گھر سے سری پائے پکا دیگچی میں رکھ خوانچہ میں لایا، تھوڑی سی روٹیاں مٹی کے دو تین پیالے اور تین کا ایک گلاس لے کر آ موجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں منگل کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں کے ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنجسورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آ موجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

پہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آ جاتا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چوکا بنا کباب، کلیجی، دل اور گردے سیخوں پر چڑھا بستی والوں کے انتظار میں بیٹھتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو سامان لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لئے پھونس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نرجان دیہاتی مانی پتی پرانی کسبنہ گلے میں ڈالے ہوئی کٹھور دل سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا ادھر اُدھر گشت کرتا دیکھنے میں آ جاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے۔ کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں، اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انہیں بات بات کے فقیرنیں کہنے سے بھی شہر کے سنگدل اور اہل حرفہ کاریگر کے متعدد شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آ جاتے اور اگر اس دن یہ اتفاق بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے ذرا ہٹ کر ان کے گرد گرد چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے اور تکے قہقہے لگاتے، عجیب عجیب تکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقہ کی ویرانی سے ان بیسواؤں کو یہاں مکر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر قسم خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک چھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے ایک دن بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چارابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے ارد گرد پھر رہا اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنویں پر آیا، اور پانی بھر بھر کے مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنویں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے وہ فقیر دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا "جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا! میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے۔" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کے پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامات بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیئے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیئے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے "اللہ ہو" کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

کچھ مہینے گذرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے سات ایک طرف اور سات دوسری طرف بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ بیچ برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لئے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی جس کے دونوں سروں پر باتو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور باجل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لئے تھا اس میں سنگ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش سبز پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید بوتی پر دل والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بہبودیوں نے مل کر بہت بھاری میلہ و لوائی بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کر کے شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو ہر سمت پھیل گئی۔ سب فقیروں اور کاتوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے یہ کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا، اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ سمائے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کر دھلایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گانے والے گانے لگے۔ پاندان، پیک دان، بھیچان اور گلاب پاش رکھ دیئے گئے اور رنگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیساؤں کو بلوایا گیا جو ان کی مہمیلیاں یا برادری کی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لئے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ پتیلیں ٹال دی گئیں۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعۂ نور بن گئی تھی۔ ان بیساؤں کے تو تول سیاہ فام سازندے زمزمہ اور کھواب کی شیروانیاں پہنے عطر میں بسے ہوئے پھولے کانوں پر رکھے ادھر ادھر جھونکوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور نوشادروں میں بسی ہوئی نازنینیں اٹھکیلیوں سے جاتیں، رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا۔ صبح تک یہ محفل برخاست ہو گئی۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو بیساؤں سازندوں کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہوئیں۔ بھاڑ،

فانوس، ظروفِ بلوری، قدِ آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعاتِ سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کہیں کھلنے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں جن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، سُر چڑھنے، گلا کھلنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گرہ موقوں سُلجھنے، استادوں سے ناچ اور کرم گھسیٹنے، صلح جگت، ٹوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گذارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں جہاں ان کے ملازموں نے سبق پڑھا سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگِ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے، اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے ان کی قوسِ قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں بہت سے عجیب جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ جیسوائیں بناؤ سنگار کئے برآمدوں میں ٹہلتیں، آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستیں کھلکھلاتیں ——— جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھایا کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے بگڑوں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لئے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سُر، رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگروؤں کی آواز، محفل میناہیں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان جیسوائوں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکاندار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پُر کرنے کے لئے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور انہیں نمبر کے حلقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ ڈبوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگرٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر اس سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگرٹ کے تین تین چار چار پیکٹ، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی مہینے کے تباکو کی تین چار چکیوں اور حقہ پینے کے تمباکو کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیرفروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا اس بستی کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ ٹوکرے سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھولوں کا بھی رکھ لیتا چونکہ دکان خاصی کھلی تھی، ایک پھل والا بھی اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انہیں چنگیر میں ڈال کر ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک آدھ گھڑی بیٹھ کے سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا اور ٹھٹکے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور لگاتار بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ساتھ بھول چڑھانے کے باوجود گھنٹوں ٹھٹکے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گذر جاتی اور کوئی بازیچہ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک جیسوا کا باپ اور جاتی موجود زیوں کا نام جانتے تھے اپنے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ بہتے بہتے ایک جوا بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر لگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے کپڑے دیکھ کر بہت سے

ہنگموں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گذرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجئے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی، بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیرباد کہہ کر اس بستی کا رُخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم کے پاؤڈر، صابن، انگنیاں، بش، سوئی دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار کوئی بزاز، کوئی چپڑاسی، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی، مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھے ہوئے کرایہ سے گھبرا کر اس بستی میں آ بسا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے بوجھ گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربّے، چٹنی، اچار کے بیاموں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہتے۔ ایک طاق میں طب اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی وہاں انہوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفعتیں پر چپکا کر آویزاں کر دئے۔ ہر روز صبح کو میسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آ موجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی اور نزہت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان اور نقویت پہنچانے والے مربّے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں خالی رہیں ان میں میسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھستے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی رٹ لگواتے اور گھٹرا بجا بجا کر گاتے۔

ایک میسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بناتا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دئے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آ جاتے اور دیر تک مست بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رُخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملّا جی تک یہ بستی نزدیک ہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جبکہ انہیں دونوں وقت مرغن کھانا باقاعدہ پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض میسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے جس سے ملّا جی کو دو پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹر کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرائے اور اپنی بے مانگی تنخواہ سے عاجز ہو کر یہیں جگہ مفت ملی تو اس نے اسی بستی کا رُخ کیا اور ان میسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دئے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس بھی پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ فاقے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھاتے تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدور پیشہ لوگ

کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت و مشقت کی کسر شور و غل، خرمستیوں اور ادنیٰ حیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کستے، گاتے گنگناتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور گلے ہاتھوں بازارِ حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ "نفیر" کے باہر ایک اسٹیج پر کھڑا کبھی کولھا ہلاتا، کبھی منہ پھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا، عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنہیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے "آؤ کھلی نئی بستی کو" شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہیے کرتا تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے، منہ سے ہارن بجاتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا برا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم داموں پر سواریاں بٹھا، طرارے بھرتے اور گھنگھرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق در جوق اس چراغاں بازار کی سیر کو آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انہیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوتی تھیں، اب اس کی یہ دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عمر۔ توں نے تو جھٹ زمین خرید کر ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں پوشش نہیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لئے درخواست بھیجی گئی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے سویمیاں ڈاک خانے کے باہر ایک، صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ، بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیئے۔

تھیٹر نکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی اس پر شہر کے ایک بنیا کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سنیما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا چند ہی مہینوں میں سنیما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشائی اگر بائیسکوپ شروع ہونے سے پہلے آ جائیں تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ بستی کے لوگ بھی سستانے یا میرد دیکھنے کی غرض سے آ آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیر گاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچہ میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں سلکٹ کی بیلوں میں ٹھونسے کاندھے پر سیلا کپڑا، تولیہ ڈالے دل پسند دل پسند مالش کی صدا لگاتے، دوسرے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سنیما کے مالک نے سنیما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا جس میں ران کو قیام کرنے کے لئے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، ایک فوٹو گرافر، ایک سائیکل کی مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک برف، شاپ والا اور ایک ڈاکٹر یہ اپنے دواخانہ کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں گلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹو گرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں سلطان دیہاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے مختلف جگہ جگہ پیمائیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لئے کر پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔

اس واقعہ کو بیس برس گذر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پرا شہر بن گئی ہے جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی۔ کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لئے، ایک لڑکیوں کے لئے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سنیما ہیں اور چار بنک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔ شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس پانچ زرعی و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دو مرحم خانے، پانچ امانتاً شرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں ایک صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "حسن آباد" کے نام سے مرسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے "حسن آباد" کے "حسن آباد" کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حسن اور حسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اُجڑنے سے پہلے مرسوم تھی۔ اور وہ نام ہے "آنندی"!

یوں تو سارا شہر بھرا پرا، صاف ستھرا اور خوش نما ہے۔ مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنان بازار واقع ہیں۔

آنندی کے بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں۔ "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیر اثر اس ناپاک طبقہ کو جائز قرار دے کر اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ بسنے کی اجازت دے دی گئی!....."

اس مرتبہ ان عورتوں کے بسنے کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

احمد ندیم قاسمی

پرمیشر سنگھ

اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے۔ ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ننگا مرصابن کے جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ "کہیں آہی رہا ہوگا۔" کسی نے کہہ دیا۔ "ہزاروں کا تو قافلہ ہے۔" اور اختر کی ماں اس تسلی کی لاٹھی تھامے پاکستان کی طرف چلی آئی تھی۔ "آہی رہا ہوگا۔" وہ سوچتی۔ "کوئی تنکی کپڑنے نکل گیا ہوگا اور پھر ماں کو نہ پاکر رویا ہوگا اور پھر ——— پھر اب کہیں آہی رہا ہوگا۔ سمجھدار ہے، پانچ سال سے تو کچھ اوپر ہو چلا ہے۔ آجائے گا۔ وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی ———"

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل اُدھر ہی تھا، بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تنکی کا تعاقب کیا یا کسی کمبخت میں سے گنا توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہرحال جب وہ روتا چلاتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آکر کہا تھا۔ "میں نعرہ تکبیر مار دوں گا ——— اور یہ کہہ کر سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے، سوائے ایک سکھ کے جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ وہ لمبی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے اُلجھے ہوئے بکھیں بھانک رہے تھے اور جو ڈاتو بالکل ننگا تھا وہ بولا۔ "ہنسو نہیں یارو۔ اس بچے کو بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا۔"

ایک نوجوان سکھ جس نے اب تک کرپان نکال لی تھی، بولا۔ "ذرا ٹھہر پرمیشرے! کرپان اپنا دھرم پورا کر لے۔ پھر ہم اپنے دھرم کی بات کریں گے۔"

"مارو نہیں یارو۔" پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی۔ "اسے مارو نہیں، اتنا ذرا سا تو ہے اور اسے بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے ——"

"پوچھ لیتے ہیں اسی سے۔" ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا۔ "بولو۔ تمہیں کس نے پیدا کیا ——؟ خدا نے کہ واہگورو جی نے؟"

اختر نے اس ساری شنگی کر نکلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی۔ آنکھیں جھپک کر اس نے ان آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے۔ اس نے پریشر سنگھ کی یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے مرمریں گئے ہوئے ایک آنسو کو تھوک ٹالا اور بولا "پتہ نہیں!"

"او اور جنو!" کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ بولا "اماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔"

سب سکھ ہنسنے لگے۔ مگر پریشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر کچھ یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے، اور پریشر سنگھ رونی آواز میں جیسے بین کرنے لگا "یہ سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو۔ میرا کرتار بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔"

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پریشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا۔ ہچکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑے وہ چپ چاپ روتے ہوئے پریشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا "لے پریشرے! سنبھال اسے۔ کہیں بھٹکا کر اسے اپنا کرتار بنا نہ لے پکڑ۔"

پریشر سنگھ نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں کی لٹیں لٹکنے لگیں۔ اس نے اختر کو بانکوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جنہوں نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اختر کو نیچے اتار کر سکھوں کی طرف لپکا۔ گھمان کے پاس سے گذر کر دور تک بھاگتا چلا گیا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور چیختا رہا اور اس کے کیس اس کی ایک چھپٹ کا ساتھ دیتے رہے، دوسرے سکھ حیران کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے بھاگتا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور تر آنکھوں میں چمک تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آکر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا "تم کیا ہے تمہارا؟"

"اختر!" اب کے اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

"اختر بیٹے!" پریشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا "ذرا میری انگلیوں میں سے جھانکو تو۔"

اختر ذرا سا جھک گیا۔ پریشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کر لی۔ وہ آیا: "اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پریشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا "تتلی!"

"لے گے؟" پریشر سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں!" اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملا۔

"لو" پریشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا۔ اختر نے تتلی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اڑ گئی اور اختر کی انگلیوں کی پوروں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرے چھوڑ گئی۔ اختر اداس ہو گیا اور پریشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا: "سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو؟ کرتار کے تتلی بھی اڑ جاتی تھی تو یہی منہ لٹکا لیتا تھا۔"

"پریشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے" نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا۔

پریشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھایا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھر پھڑک پھڑک رونے لگا "ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس جائیں گے۔" پریشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر جب پریشر سنگھ نے یہ کہا کہ "ہاں بیٹے، تمہیں تمہاری اماں پاس ہی لے چلتا ہوں" تو اختر چپ ہو گیا۔ صرف کبھی کبھی سسک لیتا تھا اور پریشر سنگھ کی پگڑی کی پٹکیوں کو پکڑی ناگواری سے

ہمراہ شت کرتا جا رہا تھا۔

پریمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا۔ لٹا پٹا پریمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرتسر میں آیا تھا تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چار دیواری میں داخل ہوا تھا تو ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی تھیں اور وہ بڑی دیر امرتسر گوشی میں بولا تھا "یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

گرنتھی جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے۔ پریمیشر سنگھ کی بیوی نے انہیں بہتے سے بتا دیا تھا کہ کرتار سنگھ کے چھڑتے ہی اسے کچھ ہو گیا ہے "جانے کیا ہو گیا ہے اسے۔" اس نے کہا تھا۔ "واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو وہاں دن میں کوئی دس بار تو یہ کرتار سنگھ کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا اور جب کرتار سنگھ سے پٹ پٹا رہے تو میں تو چیر رودھولی پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوتا۔ وہاں مجال ہے جو بیٹی امرکور کی بھی زبان غصے سے کبھی لال ہوئی ہو۔ بھر جاتا تھا، کہتا تھا "بیٹی کو برا مت کہو۔ بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسافر ہے بے چاری، ہمارے گھر وندے میں سستانے بیٹھ گئی ہے، وقت آئے گا تو چلی جائے گی ——— اور اب امرکور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہ تک کہہ دیتا ہے کہ بیٹیاں بیریاں اغوا ہوتی سنی تھیں یار و۔ یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اٹھ جاتے ہیں۔"

وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا۔ مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشہ کروٹیں بدلتا۔ پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر اٹھ بیٹھتا بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی سے کہتا۔ "سنتی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!" ——— بیوی اسے محض "اوندا" سے ٹال کر سو جاتی تھی۔ مگر امرکور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف بیٹھی قرآن پڑھتی نظر آتیں اور جب ذرا سی پو پھٹتی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا اور جب صبح اذان ہوتی تھی تو کیسا مزا آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورب سے پھوٹتا ہوا اُجالا گانے لگا ہے۔ پھر جب اس کی پڑوسن پریتم کور کو چند نوجوانوں نے خراب کر کے چھترے کی طرح گھورے پر پھینک دیا تھا تو جانے کیا ہوا کہ مؤذن کی آواز میں بھی اسے پریتم کور کی چیخ سنائی دے جاتی تھی۔ اذان کا تقدس تک اسے خوفزدہ کر دیتا تھا اور وہ یہ بھول جاتی تھی کہ اب ان کے پڑوس میں مسجد نہیں ہے۔ یونہی کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے وہ سر جھکاتی اور رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے دن چڑھے تک سوئی رہتی۔ اور پریمیشر سنگھ اس بات پر بگڑ جاتا۔ "ٹھیک ہے، سوئے نہیں تو اور کیا کرے۔ نیکی تو ہوتی ہی ہیں یہ چونچلے کہیاں۔ لڑکا ہوتا تو اب تک جانے کتنے کام کر چکا ہوتا یار و۔"

پریمیشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلاف معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے کھلے کیس سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر کو تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے اور وہ حیرت سے پریمیشر سنگھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پرے کو دیتی ہوئی آئی اور بولی "یہ کون ہے؟"

پریمیشر سنگھ پر سرور مسکراتے ہوئے بولا "ڈرو نہیں بے وقوف اس کی عادتیں بالکل کرتار سے کی ہیں۔ یہ بھی اپنی ماں کی بھوسے کی کوٹھڑی میں پیدا ہوا تھا۔ یہ بھی تھیلوں کا عاشق ہے، اس کا نام اختر ہے ——"

"اخترا" بیوی کے تیور بدل گئے۔

"تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا۔" پریمیشر سنگھ نے وضاحت کی "اور پھر کیسوں کا کیا ہے، دنوں میں بڑھ آتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا، نادر اور کنگھا کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گا۔"

"یہ ہے کس کا؟" بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

"کس کا ہے!" پریمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اتار کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "واہگورو جی کا ہے، ہمارا اپنا۔"

اور پھر ہار دو۔ یہ عورت اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی کہ اختر کے ماتھے پر جو یہ ذرا سا تل ہے، یہ کرتار سے ہی کا تل ہے۔ کرتار کے بھی تو ایک تل تھا اور یہیں تھا۔ ذرا بڑا تھا پر ہم اسے یہیں تل ہی تو چھوتے تھے اور یہ اختر کے گالوں کی دھریں گلاب کے پھولوں کی طرح گلابی ہیں تو یار دو۔ یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتار کے گالوں کی نویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں۔ یہ ذرا پتلی ہیں اور ——"

اختر اب تک مارے حیرت کے ضبط کئے بیٹھا تھا۔ بلبلا اٹھا "ہم یہاں نہیں رہیں گے ہم اماں پاس جائیں گے، اماں پاس۔"

پریشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ کھینچ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا "لے لو۔ یہ اماں پاس جانا چاہتا ہے۔"

"تو جائے۔" بیوی کی آنکھوں میں اور چہرے پر وہی آسیب آ گیا۔ تھا جسے کرتار سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا۔ ڈاکر ڈالنے گیا تھا سو رہا، اور اٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اٹھا لاتا تو ہزار میں نہ سہی ایک دو سو میں تو بک جاتی۔ اس اجڑے گھر کا کھاٹ کھڑا ہو جاتا۔ اور پھر —— بچے —— تجھے تو کچھ ہو گیا ہے۔ دیکھتے نہیں یہ لڑکا مسلا ہے؟ جہاں سے اٹھا لائے ہو وہیں ڈال آؤ اور خبردار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا۔"

پریشر سنگھ نے التجا کی "کرتارے اور اختر کو ایک ہی دائیگر دیجی نے پیدا کیا ہے کبیں؟"

"نہیں" اب کے بیوی چیخ اٹھی "میں نہیں سمجھی۔ نہ کچھ سمجھنا چاہتی ہوں۔ میں وارث ہی رات جھٹکا کر ڈالوں گی اس کا۔ کاٹ کے پھینک دوں گی۔ اٹھا لایا ہے وہاں سے۔ لے جاسے پھینک دے باہر۔"

"تمہیں نہ پھینک دوں باہر؟" اب کے پریشر سنگھ بگڑ گیا "تمہارا نہ کر ڈالوں جھٹکا؟" وہ بیوی کی طرف بڑھا اور بیوی اپنے سینے کو دونوں ہتھیلیوں سے پیٹتی چیختی، چلاتی بھاگی۔ پڑوس سے امر کور دوڑی آئی۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آ گئیں۔ "ہائے" جمع ہو گئے اور پریشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی۔ پھر سب نے اسے سمجھایا کہ ٹیک کا مہ ہے۔ ایک مسلمان کو مسلمہ بنانا کوئی معمولی کا مہ تو نہیں۔ پرانا زمانہ ہوتا تو اب تک پریشر سنگھ گورو مشہور ہو چکا ہوتا۔ بیوی کو ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دئے روتی رہی۔ اچانک پریشر سنگھ کی گرج نے سارے ہجوم کو ہلا دیا "اختر کدھر گیا؟" وہ چیخا "ارے وہ کدھر گیا ہمارا اختر۔ ارے دیکھو تم میں سے کسی قصائی کے بچے نے تو نہیں پڑھ لیا یار دو۔ اختر! اختر!"

وہ چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر بھاگ گیا۔ بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں لگے۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئیں اور پریشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا تھا "ارے میں تو اسے اماں پاس لے چلتا یار دو۔ ارے وہ گیا کہاں۔ اختر! اے اختر!"

"میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا" پگڈنڈی کے ایک موڑ پر بھگوان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ سے روتے ہوئے اختر نے پریشر سنگھ کو ڈانٹ دیا "تم تو سکھ ہو۔"

"ہاں بیٹے۔ سکھ تو ہوں" پریشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعتراف جرم کر لیا۔

"تو پھر ہم نہیں آئیں گے" اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کر نئے آنسوؤں کے لئے راستہ صاف کیا۔

"نہیں آؤ گے؟" پریشر سنگھ کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

"نہیں!"

"نہیں آؤ گے؟"

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔"

"کیسے نہیں آؤ گے؟" پریشر سنگھ نے اختر کو گان سے پکڑا اور پھر پچھلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چانچ سے ایک تھپڑ مار دیا۔

"چپ!" وہ کڑکا۔

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہے' پھر ایکا ایکی وہ زمین پر گر کر پاؤں پٹخنے اور خاک اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ "نہیں چلتا۔ بس نہیں چلتا۔ تم سکھ ہو۔ میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی اماں پاس جاؤں گا۔ میں تمہیں مار دوں گا۔"

اور جیسے اب پریمیشر سنگھ کے سہنے کی باری تھی۔ اس کا بھی سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دانتوں میں دبا لیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر اس زور سے رو دیا کہ کھیت کی پرلی مینڈھ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچے بھی سہم کر رہ گئے اور ٹھٹک گئے۔ پریمیشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک آیا اور پھر بچوں کی سی۔ ملی آواز میں بولا۔ "مجھے معاف کر دے اختر۔ مجھے تمہارے خدا کی قسم! میں تمہارا دوست ہوں۔ تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمہیں کوئی مار دے گا پھر تمہاری ماں پاکستان سے آ کر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمہیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سُنا؟ سُن رہے ہو نا؟ پھر وہاں سے اگر تمہیں ایک دفعہ مل جائے نا کرتار نام کا، تو تم اسے یہ، ادھر اس گاؤں میں چھوڑ جانا، اچھا؟"

"اچھا!" اختر نے اُلٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پریمیشر سنگھ سے سودا کر لیا۔

پریمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور چلا مگر ایک ہی قدم اٹھا کر رک گیا۔ سامنے بہت سے بچے اور چند پڑوسی کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا۔ "رونے کیوں ہو پریمیشرے کل ایک مہینے کی تو بات ہے۔ ایک مہینے میں اس کے کہیں جڑھ آئیں اُگے تو بتا نکل کرتا را نگے گا۔"

کچھ کہے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رُک کر اس نے پٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا۔ "تم کتنے ظالم لوگ ہو یارو۔ اختر کو تارا بتاتے ہو۔ اور اگر اُدھر کوئی تارے کو اختر بنا لے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا؟" پھر اس کی آواز میں گرج آ گئی۔ "یہ بچہ مسلمان ہی رہے گا۔ ورنہ ار صاحب کی سوں۔ میں کل ہی امرتسر جا کر اس کے انگریزی بال بنوا لاؤں گا۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ خالصہ ہوں، سینے میں شیر کا دل ہے، امرغی کا نہیں۔"

پریمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر، اپنی بیوی اور بیٹی کو اختر کی مدارات کے سلسلے میں احکام ہی دے رہا تھا کہ گاؤں کا گرنتھی سردار مختر کور سنگھ آیا اور بولا۔ "پریمیشر سنگھ!"

"جی!" پریمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنتھی جی کے پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔

"دیکھو!" گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سے کہا۔ "کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا۔ اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی۔ چھوٹی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو۔ سمجھے؟"

"جی!" پریمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں!" گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی۔

"ایسا ہی ہوگا گرنتھی جی!" پریمیشر سنگھ کی بیوی بولی۔ "پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے۔ لگتا ہے پہلے جنم میں یہ مسلمان رہ چکا ہے۔ امرکور بیٹی نے تو جب سے یہ سُنا ہے کہ ہمارے گھر میں مُسلا چھوکرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے، کہتی ہے گھر پر کوئی اور آفت آئے گی۔ پریمیشر نے آپ کا کہا نہ مانا تو میں بھی دھرم شالہ میں چلی جاؤں گی اور امرکور بھی۔ پھر یہ پڑا اس چھوکرے کو چاٹے۔ ہُنہ! ماگھو روجی کا بھی لحاظ نہیں۔"

"ماگھو روجی کا کون لحاظ نہیں کرتا گدھی۔" پریمیشر سنگھ نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا۔ پھر وہ دیر تک زیر لب گالیاں دیتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر گرنتھی جی کے سامنے آ گیا ——— "اچھا جی! اچھا۔" اس نے کہا، اور کچھ یوں کہا کہ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً منتشر ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے پہچاننا مشکل ہو گیا۔ وہی کانوں کی لوؤں تک کس کر بندھی ہوئی پگڑی، وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر میں آ کر پگڑی اتارتا تھا تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔ لیکن اس کے بال دھڑا دھڑ بڑھ رہے تھے۔ پریشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ "ذرا اِدھر آ امر کور ے! یہ دیکھ، کیسے بن رہے ہیں۔ پھر ایک دن جوڑا بنے گا۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا کرتار سنگھ۔"

"نہیں ماں!" امر کور وہیں سے جواب دیتی۔ "جیسے واہگورو جی ایک ہیں اور گرنتھ صاحب ایک ہیں اور جاند ایک ہے۔ اسی طرح کرتار بھی ایک ہی ہے۔ میرا ننھا منا بھائی!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی۔ "میں اس کھیلنے سے نہیں بہلوں گی ماں۔ میں جانتی ہوں یہ مسئلا ہے اور جو کرتا رہتا ہے وہ مسئلا نہیں ہوتا۔"

"میں کب کہتی ہوں کہ یہ سچ مچ کا کرتا رہا ہے۔ میرا چاند سا لاڈلا بچہ!" پریشر سنگھ کی بیوی بھی رو دیتی۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتیں۔ خوب خوب روتیں، ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں۔ وہ اپنے کرتارے کے لئے روتیں۔ اختر چند روز اپنی ماں کے لئے روتا رہا، اب کسی اور بات پر روتا۔ جب پریشر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچایت سے کچھ غلہ یا پڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا۔ اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا۔ "میرے سر پر پگڑی باندھو پریں۔ میرے کیس بڑھا دو۔ مجھے کنگھا خرید دو۔"

پریشر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا۔ "یہ سب ہو جائے گا بچے، سب کچھ ہو جائے گا۔ پر ایک بات نہیں ہو گی۔ وہ بات کبھی نہیں ہو گی۔ وہ نہیں ہو گا مجھے، سمجھے؟ یہ کیس ویس سب بڑھ آئیں گے۔"

اختر اپنی اماں کو اب بہت کم یاد کرتا تھا۔ جب تک پریشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چپٹا رہتا اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے ان سے صرف ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہو۔ پریشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی، اس کے کپڑے دھوتی اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی۔ البتہ امر کور نے اختر کی طرف جب بھی دیکھا ناک اچھال دی۔ شروع شروع میں تو اس نے اختر کو ایک دھموکا بھی جڑ دیا تھا۔ مگر جب اختر نے پریشر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پریشر سنگھ پھر گیا اور امر کور کو بڑی تنگی تنگی گالیاں دیتا اس کی طرف یوں بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اٹھا کر دیوار پر دے مارتا۔ "تو کی پچھی!" اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا۔ "سنا تو نہیں تھا کہ لڑکیاں اٹھ دی ہیں پر یہاں یہ سٹنڈی ہمارے سامنے ہی چلی آئی اور اٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا۔ بھیجو اس کو۔" امر کور نے بھوں چمکیر کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جٹ گئی۔ اب کے اختر چلایا۔ "پانی دیتی ہے کہ نہیں۔ پانی دے ورنہ ماروں گا۔" امر کور نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ بولی۔ "مار تو سہی۔ تو کرتا راتو نہیں کہ میں تیری مار سہہ لوں گی۔ میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں۔" اختر بلک بلک کر رو دیا اور آج مدت کے بعد اس نے اپنی ماں کو یاد کیا پھر جب پریشر سنگھ دوانے کیا اور اس کی بیوی بھی پسینہ پسینہ سوئف لے کر آ گئی تو اختر نے روتے روتے بڑی حالت بنا لی تھی اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا۔ "ہم تو اب اماں پاس چلیں گے۔ یہ امر کور سنگھ کی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں پاس جائیں گے۔" پریشر سنگھ نے امر کور کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی اور اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔ "میں پانی پلاؤں؟ کرتا راتو بھی تو اسی طرح پانی مانگ رہا ہو گا کسی سے کیسی کر

اُس پر ترس نہ آئے تو تمہیں کیوں ترس آئے اِس پر؟ ہاں!"

پریشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ بھی تو تمہاری اماں ہے بیٹے۔"

"نہیں۔" اختر بڑے غصے میں بولا۔ "یہ تو سکھ ہے۔ میری اماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے۔"

پریشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے پیالے کو دیوار پر دے مارا اور چلایا "تمہارے ہاتھ سے نہیں پئیں گے۔ تم تو امرکور سنگھ کی بچی کی اماں ہو۔ ہم تو پرموں کے ہاتھ سے پئیں گے۔"

"یہ بھی تو بھنگی سوئر کی بچی کا باپ ہے۔" امرکور نے جل کر کہا۔

"تو ہوا کرے!" اختر بولا۔ "تمہیں اس سے کیا؟"

پریشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے سر کے بے پر سکرایا بھی اور روہنسا بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے ہولے کھجاتا رہا اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کا بخار اتر چکا تھا اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

آج بہت عرصے کے بعد رات کو پریشر سنگھ بستر سے اٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا "ابھی سنتی ہو؟ سن رہی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

بیوی نے پہلے تو پریشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹالنا چاہا۔ پھر ایک دم بڑبڑا کر اٹھی اور امرکور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے سے ہلا کر آہستہ سے بولی "بیٹی!"

"کیا ہے ماں؟" امرکور چونک اٹھی۔

اور اس نے سرگوشی کی "سنو تو۔ سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

یہ ایک ٹانٹے کا سناٹا بڑا خوفناک تھا۔ امرکور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی اور پھر اختر کی چیخ خوفناک تر تھی۔

"کیا ہوا بیٹا؟" پریشر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا۔ "ڈر گئے بیٹا؟"

"ہاں!" اختر لحاف میں سے سر نکال کر بولا۔ "کوئی چیز چیخی تھی۔"

"امرکور چیخی تھی۔" پریشر سنگھ نے کہا۔ "ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن پڑھ رہی ہے۔"

"میں پڑھ رہا تھا۔" اختر بولا۔

اب کے بھی امرکور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا اور امرکور کی کھاٹ پر بیٹھ کر وہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے کی جھری میں سے باہر اڑ جائے گا اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی۔ "میں جن ہوں۔ میں کل رات پھر آ کر قرآن پڑھوں گا۔"

"کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟" پریشر سنگھ نے پوچھا۔

"پڑھوں؟" اختر نے پوچھا۔

"ہاں ہاں!" پریشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔

اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفر آمد پر پہنچ کر اس نے اپنے گریبان میں چھوکی اور پھر پریشر سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا "تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں؟"

"ہاں ہاں!" پریشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھو کر دی۔

اب کے امر کور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابو پایا۔
پریشر سنگھ بولا "کیا نیند نہیں آتی تجھے؟"
"ہاں!" اختر بولا "اماں یاد آ گئی۔ اماں کہتی ہے نیند نہ آئے تو تین بار قل ہو اللہ پڑھو، نیند آ جائے گی۔ اب آ رہی تھی پر امر کور نے ڈرا دیا۔"
"پھر سے پڑھ کے سو جاؤ۔" پریشر سنگھ نے کہا۔ "روز پڑھا کرو، اوئچے اوئچے پڑھا کرو، اسے بھولنا نہیں ورنہ تمہاری اماں تمہیں مارے گی۔ اب سو جاؤ۔" اس نے اختر کو لٹا کر اسے لحاف اوڑھا دیا۔ پھر چراغ بجھانے کے لئے بڑھا تو امر کور پکاری۔ "نہیں نہیں بابا۔ بجھاؤ نہیں۔ ڈر لگتا ہے۔"
"ڈر لگتا ہے؟" پریشر سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا "کس سے ڈر لگتا ہے؟"
"جاگتا رہے۔ کیا ہے؟" بیوی بولی۔
اور پریشر سنگھ دیا بجھا کر ہنس دیا۔ "پگلیاں۔" وہ بولا "گدھیاں۔"
رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ہو اللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ذرا ذرا سے خراٹے لینے لگا۔ پریشر سنگھ بھی سو گیا اور اس کی بیوی بھی۔ مگر امر کور رات بھر بھی نہیں سوئی۔ "پڑوس" کی مسجد کی اذان گونجتی رہی اور ڈوبتی رہی۔
اب اختر کے اچھے خاصے کپڑے بوسیدہ ہو آئے تھے۔ نچلے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پریشر سنگھ کی بیوی بھی اسے کرتارا کہنے لگی تھی اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی۔ مگر امر کور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے اور ابھی گدڑی اور کپڑے اتار کر پھینک دے گا اور قل ہو اللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔
ایک دن پریشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا "وہ کہاں ہے؟"
"کون؟ امر کور؟"
"نہیں۔"
"کرتارا؟"
"نہیں۔" پھر کچھ سوچ کر بولا "ہاں ہاں وہی کرتارا۔"
"باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہو گا۔"
پریشر سنگھ واپس لپکا۔ گلی میں جا کر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جا کر اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ پھر اسے دور گیان سنگھ کے گئے کی فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے نظر آئے۔ کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنوں تلے دبے رکھا ہے۔ لڑکے کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا ہے مگر کبڈی کبڈی کی رٹ جاری ہے۔ پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی اور جب اختر کی گرفت سے چھوٹا تو بولا "کیوں بے کرتارا تم نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا؟"
"اچھا کیا جو مارا۔" اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔
"تمہارے رسول نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟" لڑکے نے طنز سے پوچھا۔
اختر ایک لمحے کے لئے ہکلا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا "اور کیا تمہارے گرو نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟"
"حرامزادہ۔" لڑکے نے اسے گالی دی۔
"بیکھڑا۔" اختر نے اسے گالی دی۔

سب لڑکے اختر پر ٹوٹ پڑے۔ مگر پریشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا "شنو بیٹے۔ میرے پاس رہو گے کہ اماں کے پاس جاؤ گے؟"

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کچھ دیر تک پریشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر مسکرانے لگا اور بولا "اماں پاس جاؤں گا۔"

"اور میرے پاس نہیں رہو گے؟" پریشر سنگھ کا رنگ یوں متغیر ہو گیا جیسے وہ رو دے گا۔

"تمہارے پاس بھی رہوں گا" اختر نے گتھے کا حل پیش کر دیا۔ پریشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کیے تھے خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا "دیکھو بیٹے۔ اختر بیٹے۔ اختر بیٹے! آج یہاں فوج آ رہی ہے۔ یہ فوجی تمہیں مجھ سے چھینے آ رہے ہیں۔ سمجھے؟ کہیں چھپ جاؤ۔ پھر سب وہ چلے جائیں گے تو میں تمہیں لے آؤں گا۔"

پریشر سنگھ کو اس وقت دور غبار کا ایک بگولا دکھائی دیا۔ مینڈھ پر چڑھ کر اس نے لمبے ہوتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا "فوجیوں کی لاری آ گئی"۔۔۔۔ وہ مینڈھ پر سے کود پڑا اور گنے کے کھیت کا پرا پھلانگ گیا۔ "گیانے! او گیان سنگھا" وہ چلایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل کر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے میں تھوڑی سی گھاس تھی۔ پریشر سنگھ اسے الگ لے گیا۔ اسے کوئی بات سمجھائی۔ پھر دونوں اختر کی طرف آئے۔ گیان سنگھ نے فصل میں سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اسے اختر کے حوالے کر کے بولا "آؤ بھئی کنارے۔ تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو۔ جب تک یہ فوجی چلے جائیں۔ اچھا خاصا بنا بنایا خالصہ مہتیانے آئے ہیں۔ او ہو!" پریشر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی "جاؤں؟"

اور اختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سا چھلکا پکڑے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اجازت پا کر پریشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ بگولا گاؤں کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

گھر جا کر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا۔ پھر بھاگ بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا۔ ان سے بات کر کے اِدھر اُدھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا۔ اور جب فوجیوں کی لاری دھرمسالہ سے اِدھر کھیت میں مڑ گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ علاقے کا ذمہ دار بھی تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی۔۔۔۔۔ گرنتھی جی نے گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں۔ "لڑکے کی بات دوسری ہے۔" کسی نے پریشر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی اور آس پاس کے سکھ پریشر سنگھ سمیت زیر لب مسکرانے لگے۔ پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اس نے اس ماتا پر بڑا زور دیا جو ان ماؤں کے دلوں میں ان دونوں بیٹیوں بن کر رہ گئی تھی، جن کی بیٹیاں چھن گئی تھیں اور ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں ان سے ہتھیا لی گئی تھیں "اور مذہب کا کیا ہے دوستو!" اس نے کہا تھا "دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بنانا سکھاتا ہے اور تم مذہب کا نام لے کر انسان کو انسان سے چرا لیتے ہو، ان کی آبرو پر ہاتھ ڈالتے ہو۔ ہم سکھ ہیں، ہم مسلمان ہیں۔ ہم واہگورو جی کے چیلے ہیں۔ ہم رسول کے غلام ہیں۔"

تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنتھی جی کا شکریہ ادا کیا اور ان سے ہاتھ ملایا اور لاری چل پڑی۔

سب سے پہلے گرنتھی جی نے پریشر سنگھ کو مبارکباد دی۔ پھر دوسرے لوگوں نے پریشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارکبادیں دینے لگے لیکن پریشر سنگھ لاری کے آنے سے پہلے حواس باختہ ہو رہا تھا تو اب لاری کے جانے کے بعد شاید سا لگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں میں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر میں لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اسے نیند آ گئی۔ پریشر سنگھ دیر تک اختر کی کھاٹ پر بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی داڑھی کھجاتا اور ادھر اُدھر دیکھ کر پھر سے سوچ میں ڈوب جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ اچانک اڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا۔ "ہائے، اتنا بڑا کانٹا اُتر گیا پاؤں کا پورا!" وہ چلایا اور پھر اس کی ماں ننگے سر اوپر بھاگی۔ اسے اٹھا کر گود میں بٹھایا

پھر نیچے کو پکار کر سُوئی سنگھ کا نام لینے کے بعد اسے بے تحاشا پڑا اور پھر نیچے جھک کر پکارا "ارے میرا روپہ تو اوپر پھینک دینا۔ کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی"۔

پریشر سنگھ نے کچھ دیر کے بعد چونک کر اپنی بیوی سے پوچھا۔ "سُنو! کیا تمہیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے؟"

"نواور سُنو" بیوی بولی اور پھر ایک دم چھاتیوں رو دی۔ "کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پریشرے"۔

کرتارے کا نام سُن کر ادھر سے امر کور اٹھ کر آئی اور ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پریشر یوں بدک کر جلدی سے اٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا شلف اچانک زمین پر دے مارا ہے۔

شام کے کھانے کے بعد وہ اختر کو اُنگلی سے پکڑے باہر دالان میں آیا اور بولا "آج تو دن بھر خوب سوئے ہو بیٹا۔ چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے"۔

اختر فوراً مان گیا۔ پریشر سنگھ نے اسے ایک کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھا لیا۔ کھیتوں میں آکر وہ بولا "یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے نا بیٹے۔ یہ جب ہمارے سر پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی"۔

اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ چاند جو یہاں چمک رہا ہے نا یہ وہاں بھی چمک رہا ہوگا، تمہاری اماں کے دیس میں"۔

اب کے اختر نے جھک کر پریشر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہ چاند جب ہمارے سر پر آئے گا تو وہاں تمہاری اماں کے سر پر بھی ہوگا"۔

اب کے اختر بولا "ہم چاند دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند کو دیکھ رہی ہوگی؟"

"ہاں!" پریشر سنگھ کی آواز میں گونج تھی۔ "جاؤ گے اماں کے پاس؟"

"ہاں!" اختر بولا۔ "پر تم لے تو جاتے نہیں، تم بہت بُرے ہو۔ تم سکھ ہو"۔

پریشر سنگھ بولا "نہیں بیٹے! آج تو تمہیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمہاری اماں کی چٹھی آئی ہے۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لئے اُداس ہوں"۔

"میں بھی تو اُداس ہوں" اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔

"میں تمہیں تمہاری اماں ہی کے پاس لئے جا رہا ہوں"۔

"سچ؟" اختر پریشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا "ہم اماں پاس جا رہے ہیں۔ پرسوں ہمیں اماں پاس لے جائیگا ہم وہاں سے پرسوں کو چٹھی لکھیں گے"۔

پریشر سنگھ چپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے پوچھا "گانا سُنو گے؟"

"ہاں!"

"پہلے تو قرآن سُناؤ"۔

"اچھا!" اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفر اخد پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے پر تھپکی اور بولا "لاؤ تمہارے سینے پر بھی تھپکی کر دوں"۔

جھک کر پریشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا۔ اختر نے جھک کر اس کے سینے پر تھپکی دی اور بولا:

"اب تم سُناؤ"۔

پریشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھا لیا۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا۔ اس لئے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کئے۔

اور گاتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

بنتو رام رہن درگا جے
بنتو رام سیتا درگا جے
بنتو مالک چترا جے
لوکو
بنتو مالک چترا

"بنتو کون ہے؟" اختر نے پریمیشر سنگھ کو ٹوکا۔

پریمیشر سنگھ ہنسا۔ پھر ذرا سے وقفے کے بعد بولا "میری بیوی ہے نا۔ امر کور کی ماں۔ اس کا نام بھی تو بنتو ہے۔ تمہاری اماں کا نام بھی بنتو ہی ہوگا۔"

"کیوں؟" اختر خفا ہو گیا۔ "وہ کوئی سکھ ہے؟"

پریمیشر سنگھ خاموش ہو گیا۔

چاند بہت بلند ہو گیا تھا۔ رات خاموش تھی۔ کبھی کبھی گنے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیدڑوں کی آواز سے ڈرا مگر پریمیشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور ایک بار خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پریمیشر سنگھ سے پوچھا "اب کیوں نہیں روتے گیدڑ؟" پریمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آ گئی۔ یہ گرو گوبند کی کہانی تھی لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر "پھر؟ پھر؟" کی رٹ لگاتا رہا اور کہانی ابھی جاری تھی جب اختر ایک دم بولا "ارے چاند تو سر پر آ گیا۔"

پریمیشر سنگھ نے بھی رک کر اوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا اور بولا "تمہاری اماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا؟" وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا جب اچانک کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے ہوں کود اٹھا۔ پریمیشر سنگھ اسے بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا "جا بیٹے تجھے تمہاری اماں نے پکارا ہے۔ بس تم اس آواز کی سیدھ میں ——"

"نہیں!" اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور سرگوشی میں بولا "اذان کے وقت نہیں بولتے!"

"پر میں تو سکھ ہوں بیٹے!" پریمیشر سنگھ بولا۔

"نہیں" اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا۔

اور پریمیشر سنگھ نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا اور اذان ختم ہونے کے بعد آنکھوں کو رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "میں یہاں سے آگے نہیں جاؤں گا۔ بس تم ——"

"کیوں؟ کیوں نہیں جاؤ گے؟" اختر نے پوچھا۔

"تمہاری اماں نے جو چٹھی میں لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے۔" پریمیشر سنگھ نے اختر کو پھسلایا "بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا وہاں جا کر اپنا نام بتانا۔ کسی سے نہیں، اختر۔ پھر اپنی اماں کا نام بتانا، اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا۔"

"لکھوں گا۔" اختر نے وعدہ کیا۔

"اور ہاں تمہیں کتا رانام کا کوئی لڑکا ملے نا تو اسے اِدھر بھیج دینا۔ اچھا؟"

"اچھا!"

پریمیشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چوما اور جیسے کچھ مُشکل کر بولا "جاؤ۔"

اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا "تم بھی آجاؤ نا۔"

"نہیں بھئی" پریمیشر سنگھ نے اسے سمجھایا "تمہاری اماں نے چٹھی میں یہ نہیں لکھا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" اختر بولا۔

"قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟" پریمیشر سنگھ نے مشورہ دیا۔

"اچھا۔" بات اختر کی سمجھ میں آگئی اور وہ قل ہواللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

نرم نرم کہرا فق کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دور دھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پریمیشر سنگھ اس پر نظریں گاڑے ٹیلے پر بیٹھا رہا اور جب اختر کا نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہ وہاں سے اتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے "یہ کون ہو تم؟"

"اختر!" وہ یوں بولا جیسے ساری دنیا اس کا نام جانتی ہے۔

"اختر!" دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے تھے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی جھٹکے سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

اختر نے بستا کر پگڑی چھین لی اور پھر سر کو ایک ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر بیٹھ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا "میرا کنگھا دو! تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔ دے دو ورنہ میں تمہیں مار دوں گا۔"

ایک دم دونوں سپاہی زمین پر دھب سے گرے اور رائفلوں کو کندھے سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔ "ہالٹ!" ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر رٹتے ہوئے اُجالے میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا . . . . . .

.....اور ایک نے فائر کر دیا۔ اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی رونا چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ جا کر رُکے تو پریمیشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پگڑی باندھ چکا تھا۔ مگر خون اس کی پگڑی کی سینکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا تھا اور وہ کہہ رہا تھا "مجھے کیوں مارا تم نے؟ میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یار۔"

دور اختر بھاگا آ رہا تھا اور اس کے کیس ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

ممتاز مفتی

آپا

جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا بلوری دیا آ جاتا ہے جو رم رم برسے جل رہا ہو۔ مجھے یاد ہے ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے تھے میں، آپا اور امی جان کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ ان دنوں بدو چھ سات سال کا ہوگا۔ کہنے لگا "امی جان! میں بھی باہ کروں گا۔"

"اوہو ابھی سے؟" اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں "اچھا بدو تمہارا بیاہ آپا سے کر دیں؟"

"اونہوں!" بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں کہنے لگیں "کیوں آپا کو کیا ہے؟"

"ہم تو چھوٹا جو باجی سے باہ کریں گے۔" بدو نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں "کیوں دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں؟"

"میں بتاؤں کیسی ہے؟" وہ چلایا۔

"ہاں بتاؤ تو بھلا۔" اماں نے پوچھا۔ بدو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چولہے پر آگ کو چونے میں اپلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدو نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا "ایسی!" پھر بجھو کے روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا "اور چھا جو باجی ایسی!" اس بات پر ہم سب دیر تک ہنستے رہے اتنے میں تصدق بھائی آ گئے۔ اماں کہنے لگیں "تصدق بدو سے پوچھنا تو کہ آپا کیسی ہیں؟" آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

"ہاں تو کیسی ہے آپا بدو؟" وہ بولے۔ "بتاؤں؟" بدو چلایا اور اس نے اپلے کا ٹکڑا اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ خالباً وہ اسے ہاتھ میں لے کر دکھانا چاہتا تھا مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی "اونہہ!" بدو رونے لگا تو اماں کہنے لگیں "بچے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے، اس میں چنگاری ہے ـــــــ" وہ تو جلا ہوا ہے اماں!" بدو نے بسورتے ہوئے کہا۔ اماں بولیں "میرے لال

نہیں معلوم نہیں اس کے اندر تو آگ ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔" بدو نے بھولے پن سے پوچھا "کیوں آپا اس میں آگ ہے؟" اس وقت آپا کے سر پر بجلی سی کڑکی دور گری "میں کیا جانوں؟" وہ بھڑکتی ہوئی آواز میں بولی اور پھونکنی اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں بے تحاشہ پھونکیں مارنے لگی۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات ابھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسے پتے کی بات کہی تھی مگر میں کہا کرتی تھی "آپا تم تو بس بیٹھ رہتی ہو۔" اور وہ مسکرا کر کہتی "پگلی!" اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کو کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے۔ اِدھر بدو چیختا "آپا میرا دیا" اُدھر ابا گھورتے "سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی؟" بیچ میں اماں بول اٹھتیں "بیٹا دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے؟" اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نپٹ لیتی یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود جانے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اسے اِدھر سے اُدھر گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں سنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس۔ البتہ وہ مسکرایا اکثر کرتی۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ہاں تو میں سمجھتی تھی کہ آپا چکی بیٹھی ہی رہتی ہے۔ زرا نہیں ہلتی اور جن چلے ٹھمک کہ یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو اور اپنی خالہ زاد بہن صاحبہ باجی کو چلتے دیکھ کر تو میں کبھی نہ اکتاتی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی چلتی اسی طرح گردن موڑ کر چم آواز میں کہے "ہیں جی! کیوں جی؟" اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگیں۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری لگتی۔

ساحرہ اور صبیحہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ دن بھر ان کا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک بیڈھب سہنے والی آپا "ایک" یہ کرو۔ وہ کرو" والی اماں اور دن بھر جھنجھلا کر گڑگڑ کرنے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے ہوئے سنا۔ سچ تو یہ ہے مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے "سجادہ کی ماں! معلوم ہوتا ہے ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔"

"کیوں؟" اماں پوچھنے لگیں۔

کہنے لگے "بس تمام دن برتن ہی بجتے رہتے ہیں اور یا قہقہے لگتے رہتے ہیں جیسے میلہ لگا ہو۔"

اماں تنک کر بولیں "مجھے کیا معلوم۔ آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔"

ابا کہنے لگے "ارے! میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی برتن بجنے لگے۔ بازار کے اس موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات نہیں۔" میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل تھونے لگا۔ بڑی آئی ہے سجادہ جی ہاں اپنی بیٹی جو ہوئی۔ اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ جا کر باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اسی بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ ابا جانتے ہی کیا ہیں۔ بس حقہ لیا اور گڑگڑ کر دیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گٹ مٹ گٹ مٹ کرنے لگے جیسے کوئی بھٹیاری مکی کے دانے بھون رہی ہو۔ سارے گھر میں لے دے کے صرف تصدق بھائی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور جب ابا گھر پر ہوتے تو وہ مجاری آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔ جانے وہ کون سا شعر تھا ——— ہاں ؎

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

آپا انہیں گاتے ہوئے سُن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بدو کو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی "بدو ردنا" اور پھر آپ ہی ہنس مسکراتی رہتی۔

تصدق بھائی میرے پھپھا کے بیٹے بھائی تھے۔ انہیں ہمارے گھر آئے یہی دو ماہ ہوئے ہوں گے۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے پھر ایک دن جب پھپھی آئی ہوئی تھی تو باتوں باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھپھی کہنے لگی بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں۔ کہنے لگیں اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب؟ پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی پچھلی تمام باتیں لے بیٹھتی ہیں۔ غرضیکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ اکتاتے البتہ آپا سے وہ زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے بھی کیسے، جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو آپا کے دوپٹے کا پلّو آپ ہی آپ سر کر کے نیم گھونگھٹ سا بن جاتا اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا ان کی باتیں غور سے سُن نا سکتی تھی گو کہتی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے لیکن صرف اسی وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے، پوچھتے "بدو تمہاری آپا کیا کر رہی ہے؟"

"آپا؟" بدو لاپروائی سے دہراتا "بیٹھی ہے ——— بلاؤں؟"

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے "نہیں نہیں۔ اچھا بدو، آج تمہیں یہ دیکھو اس طرف تمہیں دکھائیں۔"

اور جب بدو کا دھیان ادھر اُدھر ہو جاتا تو وہ مدھم آواز میں کہتے "ارے یار تم تو مفت کا ڈھنڈورا ہو۔"

بدو چیخ اٹھتا "یہ کیا ہوں میں؟" اس پر وہ میز بجانے لگتے "ڈگ ڈگ ڈگ ڈھنڈورا یعنی یہ ڈھنڈورا ہے، دیکھا؟ جسے ڈھول بھی کہتے ہیں ڈگ ڈگ، ڈگ ڈگ سمجھے؟" اور آپا اکثر چلتے چلتے ان کے دروازے پر ٹھہر جاتی اور ان کی باتیں سنتی رہتی اور پھر چولہے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی۔ اس وقت اس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا، بالوں کی لٹ پھسل کر گال پر آ گرتی اور۔ وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولہے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح چمکتیں۔ آپا کے ہونٹ یوں ہلتے گویا گا رہی ہو مگر الفاظ سنائی نہ دیتے۔ ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آ جاتے تو وہ ٹھٹک کر یوں اپنا دوپٹہ، بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آ گھسا ہو۔

ایک دن میں، آپا اور اماں باہر صحن میں بیٹھی تھیں۔ اس وقت بھائی صاحب اندر اپنے کمرے میں بدو سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے بھائی صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سُن رہے ہیں۔ بھائی صاحب بدو سے کہہ رہے تھے "میرے یا ہم تو اس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے، کتابیں پڑھ سکے، شطرنج، کیرم اور چڑیا کھیل سکے۔ چڑیا جانتے ہو؟ وہ گول گول پرزوں والا گیند بلے سے یوں ڈز، ٹن، ڈز اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزے دار کھانے پکا کر کھلا سکے، سمجھے؟"

بدو بولا "ہم تو چچا جو باجی سے بیاہ کریں گے۔"

"اونہہ" بھائی صاحب نے کہا۔

بدو چیخنے لگا "میں جانتا ہوں تم آپا سے بیاہ کرو گے۔ ہاں!" اس وقت اماں نے مسکرا کر آپا کی طرف دیکھا مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے "واہ! تمہاری آپا فرنی پکاتی ہے تو اس میں پڑی طرح شکر بھی نہیں ڈالتی۔ بالکل پھیکی۔ آخ تھو!"

بدو نے کہا، "ابا جو کہتے ہیں فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہئے۔"

"تو وہ اپنے ابا کے لئے پکائی ہے نا۔ ہمارے لئے تو نہیں!"

"میں کہاں آپا سے؟" بدو چیخا۔

بھائی چلائے: "ادھ بلّا۔ ڈھنڈورا۔ لو تمہیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں۔ یہ دیکھو اس طرف ڈگ ڈگ، بدو پھر چلانے لگا: "میں جانتا ہوں تم یہ بجا رہے ہو: تا تا ہو" ——— "ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پٹتا ہے نا۔" بھائی صاحب کہہ رہے تھے: "کشتیوں میں، اچھا بدو تم سے کبھی کشتی لڑی ہے؟ آؤ ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہوں گا ماما اور تم بدو پہلوان۔ لو آؤ۔ ٹھہرو۔ جب میں تین کہوں" اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مدھم آواز میں کہا: "اے یار تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے۔"

میرا خیال ہے آپا ہنسی نہ روک سکی اس لئے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا اور اماں نے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا کہ آواز نہ نکلے۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آ گئے۔ کہنے لگے "کیا پڑھ رہی ہو ہیبنا؟" ان کے منہ سے ہیبنا سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نورجہاں کیسا پرانا نام ہے۔ بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزا آنے لگتا ہے میں تو نورجہاں سن کر یوں محسوس کیا کرتی تھی جیسے کسی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سونٹا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہوں ——— مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوارنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے منہ سے ہیبنا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور میں محسوس کرتی گویا ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجاتے سے سجاتے کہا کرتے تھے مگر وہ تو پرانی بات تھی، جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی جان اسے سجاتے نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لینے سے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دے دیا: "سکول کا کام کر رہی ہوں۔"

پوچھنے لگے "تم نے کوئی برٹرینڈ سن کی کتاب پڑھی ہے کیا؟"

میں نے کہا: "نہیں!"

انہوں نے میرے اور آپا کے درمیان دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "تمہاری آپا نے تو ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہوگی؟" وہ کنکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آپا نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا اور مدھم آواز میں کہا "نہیں!" اور سر جھکنے میں لگی رہی۔

بھائی جان بولے: "اوہ کیا بتاؤں ہیبنا کہ وہ کیا چیز ہے، نشہ ہے نشہ، خالص شہد! تم اسے ضرور پڑھو بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے۔"

میں نے کہا: "ضرور پڑھوں گی۔"

پھر پوچھنے لگے "میں کہتا ہوں تمہاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ کیوں دیا؟"

میں نے چڑ کر کہا: "مجھے کیا معلوم آپ خود ہی پوچھ لیجئے۔" حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آپا نے کالج میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔ گنتی تھی میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی نمائش گاہ ہو۔ درسگاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی جیسے سجانے کے بہانے سجنا لگا ہو۔ مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھ رہنے کے لئے کالج جانا نہیں چاہتی۔ بڑی آئی تھی نکتہ چین۔ اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چڑ جاتی۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی اور یہ آپا آ کر رہے ہیں اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟ میں کہا ٹیلیفون تھی؟ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا بیٹھی ہوئی گم سم آپا۔ بھینگی بلی۔

شام کو آپا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلا اٹھے "آج فیرنی میں اتنی شکر کیوں ہے؟ قند سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔ ہوا کیا؟ بڑھاپے میں آپ کی حس بھی مستی ہو گئی ہے ایک نقمہ نگلنا بھی مشکل ہے۔"

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں مجھ پر رہی تھیں۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ مگر اس وقت اس کے گال تمتما رہے تھے، کہنے لگیں "شاید زیادہ پڑ گئی ہو۔" یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت پیس رہی تھی۔ شاید کیا خوب۔ ضرور۔

اُدھر ابا بستر پر بڑبڑا رہے تھے "چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ فیرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے۔" جس سے اماں دوڑی دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں بیچارے۔ ان کی عادت ہے "آپ تو ناحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں؟ اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے اس کا تو خیال کرنا چاہئے۔" ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی کہنے لگے "اور یہ بات ہے مجھے بتا دیا ہوتا میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں ——" اور وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپا ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپا اس سے ملنا تو کجا بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کے نام پر بھی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا ضرور کوئی بھید ہے۔ اس بات میں، کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اس پر چڑھ کر ہماری طرف جھانکتی اور کسی دکسی بہانے سلسلۂ گفتگو دراز کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتوں سے اسے ٹال دیتی۔ آپ ہی آپ ابل اٹھتی "ابھی تو امّاں کم پڑھا ہے اور میں بھلا کھڑی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ جس اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر جب آپا لوٹ چکی تو کچھ دیر کے بعد چپکے سے میں ہی ساحرہ کے گھر جا پہنچی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے ذکر چھیڑ دیا "آج آپا آئی تھی؟"

ساحرہ نے ناخن پر پالش لگاتے ہوئے کہا "ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے۔ نہ جانے کیا نام ہے اس کا۔ ہاں ہارٹ بریک ہاؤس۔"

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی الماری کی طرف دیکھتی۔ میں اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک جھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں پڑ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا "آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے۔ دل توڑنے والا گھر؟ اس کے کیا معنے ہوئے؟" آپا پہلے تو ٹھٹک گئی، پھر ذرا سنبھل کر اٹھی اور بیٹھ گئی۔ مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کو خاموش سے جل کر کہا۔

"اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے۔"

کہنے لگی "میں کیا جانوں؟"

میں نے اسے جلانے کو کہا "ہاں ہماری آپا بھلا کیا جانے؟" میرا خیال ہے یہ بات ضرور اسے بری لگی۔ کیونکہ اس نے منہ پھیر لیا اور بتی بجھا کر سو گئی۔

ایک دن یوں ہی پھرتے پھرتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی۔ پہلے تو بھائی جان ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر جب میں "جھٹ پٹ" اچھا یہ تو بتاؤ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے؟" میں نے کہا "میں کیا جانوں؟ جا کر آپا سے پوچھ لیجئے۔" ہنس کر کہنے لگے "آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟"

"کیوں میں لڑاکا ہوں؟" میں نے کہا۔

برسے "نہیں ابھی تو لڑکی ہو شاید کسی دن لڑکا ہو جائے" اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے "دیکھو جیمنا مجھے لڑکا بے حد پسند ہے۔ میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک لڑ سکے، ذرا نہ اکتائے" جانے کیوں میں شرما گئی اور بات بدلنے کی خاطر پوچھا "فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان؟"

ہنسے "وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید، لال لال، کالا کالا، نیلا نیلا سا" میں ان کی بات سن کر بہت ہنسی، پھر کہنے لگے "وہ مجھے بے حد پسند ہے یہاں تو جیمنا ہم فیرنی کھا کر اکتا گئے۔" میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہوگی۔ کیونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی "فیمت خانہ" پڑھ رہی تھی۔ اس دن سے بعد روز بلاناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس چلا جاتا تو مجھ فروٹ سلاد کی کشتی چھپا دیتی۔ ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدو سے کہا "بدو بھلا بھر کر وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے اس میں کیا ہے؟"

بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدو کو اور بھی چمکا دیا۔ میں نے کہا "بدو جاؤ ذرا بھائی جان سے پوچھو اس کھانے کا کیا نام ہے ——"

بدو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر وہ کشتی اس سے چھین لی اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے مجھے کیوں گھورا تھا؟

اس رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی۔ مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی بات پہ بہت افسوس ہوا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

انہی دنوں میری خالہ زاد بہن ممتاز جسے ہم سب ممتاز باجی کہا کرتے تھے، میٹرک کا امتحان دینے کے لئے ہمارے گھر آ ٹھہری۔ ممتاز باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا آنگن خوشیوں سے گونج اٹھا۔ ساتھ والی چارپائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں۔ بدو چھاجو باجی، چھاجو باجی چیختا پھرتا اور کہتا "ہم تو چھاجو باجی سے باہ کریں گے"

باجی کہتی "شکل تو دیکھو اپنی پہلے منہ دھو آؤ" پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گھوم جاتی کہ کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگتے اور وہ نچلا ہونٹ میں پوچھتی "ہے، بھئی جاآن کیوں جی؟"

باجی کے منہ سے "بھئی جاآن" کچھ ایسا بھلا سنائی دیتا کہ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا "بھائی صاحب" کہتی تو کیسا بھدا سا معلوم ہوتا۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر "صاحب" جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو مگر باجی "صاحب" کی جگہ "جاآن" کہہ کر اس سارے سے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ "جاآن" کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ "بھئی جاآن" کہہ کر وہ اپنی کالی کالی چمکیلی آنکھوں سے دیکھتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتی تو سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا نے "بھائی صاحب" اور باجی کے "بھئی جاآن" میں کتنا فرق تھا۔

باجی کے آنے پر آپا بالکل بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہی رہ گیا۔ بدو نے بھائی جان سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے گرد طواف کرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج کبھی کیرم کھیلتی۔

باجی کہتی "بھئی جاآن ایک بور ڈنگے گا" یا بھائی جان باجی کی مرمت کی میز سے کہتے "کیوں یہاں بدو کا کوئی ہے، ہم سے شطرنج میں ہارنا چاہتا ہو؟" باجی بول اٹھتی "آپا سے پوچھئے" بھائی جان کہتے "یہ اور تم؟" باجی جھوٹ مرٹ کی سوچ میں پڑ جاتی، چہرے پر سنجیدگی پیدا کر لیتی، بھویں

سمٹا لیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی رہتی پھر کہتی "اونہہ مجھ سے تو آپ پٹ جائیں گے۔" بھائی جان کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے "کل جو چیزیں لفیں کھول گئیں کیا؟" وہ جواب دیتی "میں نے کہا چلو بھئی جان کا لحاظ کر دو۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ مجھ سے ہار گئے۔" اور پھر یوں سنتی جیسے گنگنا رہی ہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے میں ہی کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولھے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو بچا جو باجی بچا جو باجی کہتا ہوا باجی کے دوپٹے کا پلو پکڑے اس کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ کہتی تھی "بھئی جان تو صرف ساتھ سے پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فیرنی کی پلیٹ مل جائے تو قصی مضائقہ نہیں۔ کمبخت بھی کیا۔ نہ کھائیں تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا، ہے نا بھئی جان؟" ہم سب اس بات پر خوب ہنسے۔ پھر باجی ادھر اُدھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی کو اٹھا لیا۔ پلیٹر اس سے کہ آپا کچھ کہہ سکے باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی۔ "لیجئے بھئی جان" اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ بھی کیا کہیں گے کہ سا جو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں۔"

بھائی جان نے دو تین چمچے مزے میں لطف لے کر کھائے۔ "خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے، کس نے بنایا ہے؟" سا جو باجی نے آپا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔ "سا جو باجی نے اور کس نے بھئی جان آن کے لئے۔" بدو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا "میں بتاؤں بھائی جان؟" ——— آپا نے جھپٹ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ باجی کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا اور بدو کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا۔ پھر جانے انہیں کیا ہوا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں باجی کے چہرے پر گڑ گئیں، جانے کیوں میں نے محسوس کیا جیسے کوئی زبردستی مجھے کمرے سے باہر گھسیٹ رہا ہو۔ میں باہر چلی آئی۔ باہر آپا لگنی کے قریب کھڑی تھی۔ اندر بھائی صاحب نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی "چھوڑئیے چھوڑئیے" اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صبح میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ بدو بھی کہیں اُدھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی، کہنے لگی "آج ایک دھندا تابور ڈکر دکھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟" بھائی جان بولے "وہ وہاں سے ایک لگاؤں تو جانے کہاں جا پڑو۔" غالباً انہوں نے باجی کی طرف زور سے تیر چلایا ہوگا۔ وہ بناوٹی غصے میں چلائی "واہ آپ تو ہمیشہ پیری سے چھیڑتے ہیں!" بھائی جان معاً بول اٹھے "تو کیا ماتھے سے" ——— "چپ ——— خاموش" باجی چیخی۔ اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ تک تو کپڑے سکڑ سکڑ سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آپا کہنے لگا "آپا! اندر بھائی جان باجی سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ چلو دکھاؤں تمہیں۔ چلو بھی" وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ بُت بنی کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا۔ کہنے لگا "اماں کہاں ہے؟" اور وہ اماں کے پاس جانے کے لئے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا "آؤ تمہیں مٹھائی دوں" بدو بسورنے لگا۔ "آپا بولیں نا، آؤ دیکھو تو کیسی اچھی مٹھائی ہے میرے پاس" اور اسے باورچی خانے میں لے گئی۔

اسی شام میں نے اپنی کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس پڑی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ بات کیا ہے مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی خالی پڑی تھی۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

بھائی نصیر اور باجی کی شادی کے دو سال بعد میں پہلی بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ تھی۔ اس کے وہ قہقہے ہی

نہ تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور ماتھے پہ شکن پڑی تھی۔ بھائی صاحب بھی چپ چاپ رہتے تھے۔ ایک شام اماں کے علاوہ ہم سب باہر چبوترے میں بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے "بدو ماجو باجی سے بیاہ کرو گے؟"

"او نہہ!" بدو نے کہا۔ "ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں۔"

میں نے پوچھا: "بھائی جان یاد ہے جب بدّو کہا کرتا تھا "ہم تو چھا جو باجی سے بیاہ کریں گے" اماں نے پوچھا "آپا سے کیوں نہیں؟" تو کہنے لگا "بتاؤں آپا کیسی ہے؟" پھر چولہے میں جلے ہوئے اُپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "ایسی!" اور چھا جو باجی؟" میں نے بدو کی طرح بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی سے اشارہ کیا "ایسی!" یعنی اسی وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا۔ "ہاں یاد ہے۔" بھائی جان نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کے لئے باہر چلی گئیں تو بھائی کہنے لگے "نہ جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا۔ جلتی بجھتی ہی رہتی ہے۔" آپا چپ چاپ بیٹھی چولہے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم سی آواز میں کہا "اُف کتنی سردی ہے؟" پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولہے کے سامنے جا بیٹھے اور ان سگتے ہوئے اُپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے "عجائی سچ کہتی تھیں کہ ان جلے ہوئے اُپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔ کیوں سمجھے؟" آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سی آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پہ پانی کی بوند پڑی ہو۔ بھائی جان سنجیدہ آواز میں کہنے لگے "اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ سمجھے دیکھو تو کتنی سلگتی ہے۔"

خواجہ احمد عباس

زعفران کے پھول

آؤ مسافرو یہاں! اس چنار کے سائے میں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی پانی پلاتی ہوں ..... وہ نیلی نیلی لمبی سی موٹر ہے نا تمہاری؟ ..... پنکچر ہو گیا ہے؟ ..... کوئی بات نہیں اندھیرا ہونے سے پہلے سری نگر پہنچ جاؤ گے ..... اب یہیں کوس کی تو بات ہی ہے ..... نہیں بیٹا مجھے پانی کی قیمت نہیں چاہئے۔ اور پھر پیسے لے کر دوں گی بھی کیا۔ میرا ہے ہی کون؟ ... اکیلی جان ہوں، ذیلدار کے کھیت میں کام کرتی ہوں، چشمے سے پانی بھر لاتی ہوں، دھان کوٹ دیتی ہوں، اللہ کا شکر ہے مٹھی بھر چاول تو مل ہی جاتا ہے، پانچ اور پر ساٹھ عمر ہونے کو آئی۔ اور چاہئے ہی کیا ایک بڑھیا کو۔ آج مری کل دوسرا دن ... تم بھی کہتے ہو گے کس بکواس سے پالا پڑ گیا ہے ... ...

کیا کہا تم نے بیٹا؟ ... ... نہیں نہیں گل لالہ کا نہیں یہ زعفران کا کھیت ہے ... ... ٹھیک کہتے ہو زعفران کے پھول سچ مچ کاسنی ہی ہوتے ہیں۔ ابھی آگے جاؤ گے تو دوسرے کھیتوں میں کاسنی پھول ہی پاؤ گے۔ پر یہاں اس سال زعفران کے سرخ پھول ہی کھلے ہیں ... ... اس کی وجہ کیا ہے؟ ... ... یہ خدا کی قدرت ہے بیٹا۔ پر تم میدانوں کے رہنے والے آج کل کے نوجوان، خدا اور اس کے کرشموں کو کب مانتے ہو۔ ہم کشمیریوں کو دہی اور بیوقوف سمجھتے ہو کہ ہم ایسی باتوں میں اعتقاد رکھتے ہیں ... .

اب ان پھولوں کی پوری کہانی سن کر کیا کرو گے؟ ... ... ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم چلے جاؤ گے اور کہانی ادھوری رہ جائے گی ... ... موٹریں تو اس سڑک پر سے گذرتی ہی رہتی ہیں، بیٹا! پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی، یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے سرخ کنول سکھا کر دساور کو بھیج دئے جائیں گے (اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوانوں پر مہکے گی۔ اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے۔ اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح سرخ کیوں ہے؟ ... ... پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

تم مجھے پاگل سمجھتے ہو نا؟ ... ... دیوانی بڑھیا جو نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے ... ... ہے نا؟ ... ... پھر بھی اس گل زعفران کا بھید جاننا چاہتے ہو؟ ... ... یا ابھی تمہاری موٹر کے ٹھیک ہونے میں دیر ہے اور تم اس وقت کو ایک پگلی کی بڑ سن کر ہی کاٹنا چاہتے ہو؟

... ... خیر جو بھی ہو۔ سننا چاہتے ہو تو سنو... ...

ہاں تو اس کھیت میں لال زعفران کے پھول تو اسی سال لگے ہیں پہلے یہاں بھی کاسنی پھول ہی لگا کرتے تھے۔ ساری وادی پہ بہار آ جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی مٹی نوبلی دلھن زعفرانی دوشالہ اوڑھے لیٹی ہے۔ اور خوشبو سے یہ سارا علاقہ مہک اٹھتا۔ سڑک پر موٹریں جو گزرتیں ان کی دھول کے بادلوں میں بھی خوشبو پھیل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمین سے آسمان تک ہر چیز زعفران میں بسی ہوئی ہے... ...

تمہاری ہی طرح ایک اور مسافر بھی ایک بار اس کھیت کے پھولوں کو دیکھنے ٹھہر گیا تھا... ... کئی برس کی بات ہے۔ کوئی بہت ہی سیدھا آدمی معلوم ہوتا تھا، بے چارہ کھیت میں جا کر پھولوں کے بچوں بیچ میں کھڑا ہو گیا، اور لگا نتھنے پھلا پھلا کر ناک سے سانس لینے، جیسے پھولوں کو سونگھ رہا ہو بلکہ ان کی خوشبو کو پی رہا ہو۔ پھر آپ سے آپ ہی کہنے لگا۔

"عجیب بات ہے۔ کوئی بھی نہیں آئی؟"

میں نے پوچھا۔

"کون؟ آخر کس کو کھوجتے ہو"

تو جواب ملا

"ہنسی۔ ہنسی نہیں آئی۔ عجیب بات ہے حالانکہ کتابوں میں تو....."

تو بیٹا تب پتہ چلا کہ وہ بے چارہ کتابوں میں یہ پڑھ کر آیا تھا کہ اگر زعفران کے کھیت میں کھڑے ہو کر اس کی خوشبو سونگھو تو آپ سے آپ ہنسی آنے لگتی ہے۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے زعفرانی آ گئی۔ میں نے جو اسے یہ بات بتائی تو وہ لگی کھلکھلا کر ہنسنے، اور وہ اجنبی پہلے تو کھسیانا ہو گیا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ زعفرانی کے قہقہے ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تو لگا وہ بھی ہنسنے۔ ان دونوں کو ہنستے دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ اور بعد میں اجنبی کہنے لگا کہ دیکھو کتابوں کا لکھا پورا ہوا کیونکہ زعفران کے کھیت میں ہم تین ہی کھڑے تھے اور تینوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔

... ... میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی... ... بیٹا بڑھاپے میں دماغ قابو میں نہیں رہتا۔ بات کرتے کرتے بہک جاتی ہوں.....

ہاں تو زعفرانی... ... کیا کہا... ... زعفرانی کون؟ ... ... ابھی تو بتا چکی ہوں کہ زعفرانی میری بیٹی تھی... ... نہیں بتایا تھا؟ ... ... بھولی گئی ہوں گی... ... لو دیکھ لو یاد کا یہ حال ہے بیٹا... ... ہاں تو اس کا نام تو اصل میں نوراں تھا، مگر گاؤں میں سب اسے زعفرانی کہہ کر پکارتے تھے۔ بات یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کی رنگت کچھ پیلی پیلی سی تھی، اسکول میں بچوں بچیوں کے ساتھ کبڈی مچایا کرتی تھی۔ وہ اسے زعفرانی کہہ کر چھیڑا کرتے اور جب وہ چڑتی اتنا ہی وہ اور شور مچاتے زعفرانی! زعفرانی!! ... ... تم جانو بچے کسی کی مانتے تھوڑا ہی ہیں... ... ہاں تو جب وہ جوان ہو گئی تو گاؤں کے لڑکے کہنے لگے کہ نوراں جیسی خوبصورت لڑکی تو ہمارے ہاں ایک بھی نہیں ہے۔ اس کی رنگت تو زعفران کے پھول کی طرح ہے۔ اسکی آنکھیں تو کھلے ہوئے کنول ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا اوندھی سیدھی باتیں، مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایک تو دبلی تھی۔ جیسے چشمے کے کنارے اُگے ہوئے بید۔ بید مجنوں۔ میں کہتی بھلا ایسی لڑکی بچے کیسے جنے گی؟ اور پھر رنگت بالکل پیلی جیسے بیمار ہو۔ دیدے پھٹے ہوئے۔ اوپر سے یہ کہ تمیز نام کو نہیں، نہ چھوٹے کا خیال نہ بڑے کا۔ بس ہر وقت دھما چوکڑی سے مطلب، میں تو ذرا منہ نہیں لگاتی تھی۔ پر تین بھائیوں پہ ایک بہن تھی۔ وہ بھی دو سے چھوٹی۔ باپ اور دونوں بڑے بھائیوں نے لاڈ پیار میں بگاڑ رکھا تھا۔ میں سوچتی، ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ پر وہاں تو جس کو دیکھو وہ زعفرانی ہی سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا تھا... ... تم لڑکوں کی پسند کا بھی کچھ ٹھیک نہیں بیٹا... ...

ہاں تو پیغام چاروں طرف سے آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ زمیندار نے اپنے لڑکے کا پیغام بھی دے دیا جو شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا بھلا

ایک معمولی کسان کی بیٹی کماس سے اچھا کون سا بر مل سکتا تھا؟ ... ... میں نے سوچا، زعفرانی کی قسمت کھل گئی ... ... پر خدا کرتو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس سال جاڑے کے موسم میں نمونیہ کا بخار ایسا چلا کہ گھر والا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ خدا اسے جنت نصیب کرے، اس کا مرنا تھا کہ ہمارے گھر میں تو آفتوں پر آفتیں آنی شروع ہو گئیں۔ مرنے والے نے مہاجن سے قرضہ لے رکھا تھا۔ اس میں پر بھی میری ہمت نہ ٹوٹی۔ تین بیٹے تھے نا۔ میں نے سوچا دو پے زمین سے کیا ہوتا ہے میری اصل پونجی تو میری اولاد ہے۔ ہاں ایک زعفرانی کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ غریب اور یتیم بچی کو کون بیاہے گا؟

... ... سینکڑوں برسوں سے ہم اس گاؤں میں رہتے چلے آ رہے ہیں۔ کبھی فصل اچھی ہوتی ہے کبھی بُری کبھی بارش ہوتی ہے کبھی نہیں۔ کبھی آنا پانی برستا ہے کہ کھیتیاں بہہ جاتی ہیں کبھی دھوپ میں جل جاتی ہیں۔ کبھی برف میں تباہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی ہم اپنی زمین بوتے ہیں کبھی دوسرے کی۔ قسمت کی اونچ نیچ تو ہر ایک کے ساتھ لگی ہی رہتی ہے۔ اور بیٹا کبھی کبھی راجہ کے افسر ظلم بھی کرتے ہیں۔ پر راجہ پرجا کا کیا مقابلہ۔ صبر شکر سے زندگی کسی نہ کسی طرح بسر ہو ہی جاتی ہے۔ مگر ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ کلجگ ہے کلجگ۔ اس میں جو نہ ہو تھوڑا ہے ... ... کتنی برس کی بات ہے ابھی گھر والا زندہ ہی تھا کہ ایک دن میں دھان کوٹ رہی تھی کہ میرا بیٹا لونڈو چلاتا ہوا آیا۔

"ماں۔ ماں! شیر کشمیر آئے ہیں، شیر کشمیر"

بس اتنا کہہ یہ جا وہ جا۔ میں چلاتی ہی رہ گئی کہ ارے اگر شیر آیا ہے تو ذیلدار صاحب کو بول جا کے بندوق لے کے آویں ... ... تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ سارے ہی گاؤں والے تو ——— کیا مرد اور کیا عورت اور کیا بچے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا شیر کو پکڑ لیا ہو گا، تبھی تو عورتیں بچے بھی نڈر ہو کر جا رہے ہیں۔ چلو میں بھی تماشہ دیکھوں ... ...

وہ نقشہ آج تک یاد ہے مجھے۔ گاؤں کے اس سرے پر ... ارے وہ دیکھو ان درختوں کے پیچھے ——— ایک اسکول ہے ——— اب تو مڈل کا ہو گیا ہے۔ پر جب چار جماعتوں ہی کی پڑھائی ہوتی تھی ——— ہاں تو کیا دیکھتی ہوں کہ اسی اسکول کے سامنے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ اور سامنے نہ شیر نہ چیتا، ایک لمبا سا گورا سا آدمی چبوترے پر کھڑا زور زور سے کچھ کہہ رہا ہے۔ لوجی یہ تھا وہ شیر کشمیر ... ... میں نے کہا "لو خواہ مخواہ ہی ڈرا دیا۔ شیر تو شیر یہ تو کوئی معمولی درجے کا سرکاری افسر ہی نہیں ہے۔ بھلا افسر کہیں گاڑھے کھدر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ جس طرح سے وہ زور زور سے تقریر کر رہا تھا، اس سے میں سمجھی کہ چائے بیچنے والا ہو گا۔ اب تھوڑی دیر میں کالا توا رکھ کے بھرپور والا باجا بجائے گا۔ پھر مفت چائے سب کو بانٹے گا، اسی انتظار میں میں بھی وہاں جا کر کھڑی ہو گئی۔ پر وہ تو کشمیری میں بول رہا تھا۔ اور اگر یہ چائے والا تھا تو اس کی چائے تو بہت ہی گرما گرم اور خطرناک تھی۔ میں نے دو چار بول ہی سنے تھے کہ ڈر گئی۔ یا اللہ اب ہمارے گاؤں پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔ وہ باتیں ہی ایسی کر رہا تھا کہ دل دہل جائے۔ ریاست کے اصل مالک راجہ اور اس کے افسر نہیں بلکہ ہم کسان ہیں۔ ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ سب کو مل کر اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے۔ آپس میں ایک ہو جانا چاہئے۔ لڑکیوں کو پڑھانا چاہئے۔ پڑھ لکھ کر یہ کشمیری قوم کے لیڈر بنیں گے۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ میں نے تو پوری بات سنی بھی نہیں۔ زعفرانی منہ بسورے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی چلی کہ گھر جا کے اس کے باپ سے ایسا پٹواؤں گی کہ پھر کبھی جنت نہ پڑے ایسی خطرناک جگہ قدم دھرنے کی۔ پر جیٹھ کے آگے جہاں بڑے بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تو خود ہی وہاں بیٹھا بڑے غور سے سن رہا ہے۔ جل ہی تو گئی میں۔

تم تو جانتے ہی ہو تلاؤ کے بیچ میں ایک پتھر پھینک دو، سارے پانی میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ تو بیٹا، یہ شیر کشمیر بھی ایسا ہی ایک پتھر تھا جس نے ہمارے گاؤں کے ٹھہرے ہوئے پانی کو ہلا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن آرام اور چین، صلح، شانتی کا نام نہیں رہا۔ جس کو دیکھو بے چین۔ جس کو دیکھو اس کی زبان پر شکایت۔ ہر ایک اپنی زندگی سے نالاں، اس کو بدلنے پر تلا ہوا۔ میں کہتی ارے تمہارے باپ دادا نے بھی تو اپنی عمریں انہیں راجوں

مہاراجوں کے افسروں کے ظلم سہتے سہتے رُوکھی سُوکھی کھا کر صبر شکر سے کاٹ دیں، تم میں کون سُرخاب کے پَر لگے ہیں کہ ساری دنیا کو بدلنے پر تلے ہوئے ہو ... ... یہ میری کون سنتا ہے، بیٹا ... ... وہ تو اس شیر کشمیر نے جادو ہی ایسا کیا تھا ... ... تم میری باتوں سے اکتا گئے نا؟ ... ... وہ زعفران کے لال پھولوں کا بھید؟ ہاں۔ ہاں۔ بیٹا۔ اس کی بات تو کر رہی ہوں۔ تم بھی کہتے ہو گے۔ یہ کہاں کا جھگڑا لے بیٹھی۔ یہ بات یہ ہے کہ نہ تو گاؤں کے ٹھیرے، شانت تلاؤ میں اس شیر کشمیر کی تقریر کا وہ پتھر گرتا اور نہ یہ زعفران کے پھول لال ہوتے ... ... یہ کیسے؟ یہی تو بتا رہی ہوں پر تم بیچ میں ٹوکتے ہی جاتے ہو۔

ہمارے گاؤں میں اس کو آئے ہوئے دو چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ خبر آئی کہ شیر کشمیر کو راجہ نے پکڑ لیا اور جیل میں بند کر دیا۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا۔ اب سب اس کی سکھائی پڑھائی باتیں بھول جائیں گے۔ اور وادی میں صبر شکر کے دن پھر لوٹ آئیں گے۔ پر جی اس کی گرفتاری پہ تو اور بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ جس کو دیکھو غصّے میں بھرا ہوا ہے کہ ہمارے شیر کشمیر کو پکڑ لیا۔ اب اس سرکار کی خیر نہیں۔ اور ایسی باتیں کرنے والوں میں سب سے آگے آگے میرے لڑکے۔ تھوڑے دنوں میں سنا کہ چھوٹ گیا۔ میں نے سوچا یہ بھی اچھا ہوا۔ نہیں تو یہ لڑکے سرکار کو برا بھلا کہتے رہتے اور ذیلدار یا کوئی سرکاری افسر سُن لیتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے ... ...

... ... جب تک باپ زندہ رہا تب تک بیٹے کچھ قابو میں رہے اس کا مرنا تھا کہ جس کا جدھر منہ اُٹھا اُدھر چل دیا۔ زمین تو جاتی ہی رہی تھی بڑا غلام نبی کہنے لگا، میں دوسرے کی زمین پر مزدوری نہیں کروں گا۔ اس سے تو جتنا ہے سری نگر یا گلمرگ میں مسافروں کا سامان اُٹھا کر لے جانے کا کام کروں۔ دو تین روپے روز کما سکتا ہوں۔ میں نے لاکھ سر پٹخا پر وہ ایک نہ مانا۔ جب گیا ہے تو سارے گاؤں کے لڑکوں میں سب سے زیادہ چوڑا چکلا سینہ تھا اس کا۔ چھ مہینے بعد دو چار دن کو جو آیا تو پہچانا مشکل ہو گیا۔ رنگت زعفرانی سے بھی زیادہ پیلی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ماتھے پہ گھاؤ جیسا گہرا گڈھا جہاں بوجھ سنبھالنے کے لئے مزدور پٹا باندھتے ہیں۔ اور رات بھر کھانسنا۔ کبھی کبھی تو آتا کہ ہوش نہ رہتا۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہو گئی تیری۔ کیا بیمار ہے۔ بولا نہیں ماں۔ بوجھ اُٹھانے والوں کے ماتھوں پر ایسے گڈھا تو پڑا ہی رہتا ہے۔ وہی کھانسی قودہ اس دن تنگ مرگ سے ایک صاحب کا سامان گلمرگ لے جا رہا تھا، بیچ میں بارش آ گئی۔ بھیگنے سے زکام کھانسی ہو گئی ہے ... ... چار دن کے بعد جب وہ تنگ مرگ گیا تو منجھلا فوت بھی ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا ماں باپ کا لحاظ ہی نہیں رہا تو یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ فوت کو گئے تین چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ ذیلدار نے شہر سے آ کر کہا۔ غلام نبی کی ماں اب تمہاری خیر نہیں ہے۔ تمہارا منجھلا بیٹا فوت و شیخ عبداللہ کی پارٹی میں مل گیا ہے۔ دن میں کشتی چلاتا ہے۔ رات کو مزدوروں کے جلسوں میں جا جا کے تقریریں کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ بی میڈم کی کوئی زکام ہوا وہ شیر کشمیر تو سنا ماسٹر تھا پہلے۔ اس کسان کے چھوکرے کو دیکھ یہ بھی چلا ہے لیڈری کرنے۔ پر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج سے میرے سامنے اس کا نام نہ لینا۔ نہ وہ میرا بیٹا۔ نہ میں اُس کی ماں ... ...

... ... زعفرانی و فوت اس کا ذکر کرنا ہی بھول گئی۔ تو بیٹا اب ہمارے گھر میں رہ ہی گیا تھا کون۔ بس میں۔ زعفرانی اور سب سے چھوٹا لڑکا غفورا۔ زعفرانی اب بیس برس کی بن بیاہی بیٹھی تھی۔ گھر میں پیسے ہوں تو اس کی شادی کی بات چیت کروں۔ اور یہاں اوّل تو آمدنی ہی صفر تھی۔ ادھر سُنا۔ سمندر پار ولایت میں لڑائی شروع ہو گئی، تو مہنگائی کا یہ عالم ہوا کہ بس کچھ مت پوچھو۔ میں اور زعفرانی دونوں کام کرتے تھے۔ کبھی کسی کے کھیت پہ، کبھی جنگل سے لکڑیاں چن لاتے، کبھی پانی بھرتے۔ کبھی اُون کاتتے۔ تب جا کے دو وقت چولھا جلتا۔ میں نے کہا۔ غفورا دس برس کا ہو گیا۔ لاؤ اس کو بھی کام پہ لگا دیں۔ پر زعفرانی بولی نہیں ماں ہم تو غفورا کو مدرسے پڑھنے بھیجیں گے۔ میں نے کہا پاگل ہو گئی ہے۔ پر وہ ایک نہ مانی۔ مجھ سے کہے سنے بغیر اگلے دن سویرے خود اسے لے جا کر مدرسے میں داخل کرا آئی۔ جوان برابر کی لڑکی۔ اب میں اسے کہوں نہیں تو کیا کہوں پھر اس کے بیاہ نہ ہونے کا بھی دُکھ تھا۔ اس واسطے میں چپ ہی ہو گئی ... ... مگر میرا ماتھا ضرور ٹھنکا کہ آج اس گھر کا پہلا لڑکا مدرسے گیا ہے

اب نہ جانے کون سی مصیبت آئے گی... ... پر بیٹا اس لونڈیا پہ تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا دن رات بھائی کے پیچھے پڑی رہتی... ... مدرسے سے آتا تو کہتی گھر پہ بیٹھ کر پڑھ۔ حساب کے سوال پوچھنے ماسٹر کے ہاں جا۔ یہ کر وہ کر۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کتابیں گھول کر غرارا کر پلا دے ... ... جس گھر میں میری کا پیڑ ہوتا ہے بیٹا، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں... ... بیس اکیس برس کی لڑکی۔ پھر شکل صورت میں حور کا بچہ نہیں تھی تو کافی بھینگی چیچک داغ بھی نہیں تھی۔ اور تم جانو آج کل کے لونڈے۔ شہر جا کے سینما، بائسکوپ، ناچ رنگ نہ جانے کیا کیا دیکھ کے کتنے آوارہ ہو گئے ہیں ایک دن زعفرانی لکڑیاں چننے گئی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں خالی ہاتھ واپس چلی آ رہی ہے۔ نزار و نظار روتے ہوئے۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا، تو کچھ جواب نہیں دیا روئے چلی جا رہی ہے۔ ارے کم بخت کچھ کہے گی بھی کیا ہوا۔ کسی نے مارا، گالی دی۔ چوٹ لگ گئی۔ آخر ہوا کیا۔ اس کا جواب سن کر میں تو دنگ رہ گئی، بیٹا بات ہی اس نے ایسی کہی جو کسی ماں نے اپنی بیٹی کی زبان سے کبھی نہیں سنی ہوگی۔ کہنے لگی۔

"ماں! میرا بیاہ کر دو"۔ اور پھر لگی رونے۔ دس دفعہ پوچھا تب یہ بات کھلی کہ لکڑیاں چن رہی تھی کہ ذیلدار کا لڑکا، جو شہر سے آیا ہوا ہے ادھر آن نکلا اور لڑکی کو اکیلا دیکھ کر لگا اول فول بکنے۔ جب زعفرانی نے جھڑکا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر بدلا دے سے اپنی طرف گھسیٹنے لگا بڑی مصیبت سے ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی آئی تھی بے چاری۔ مگر اس بدمعاش کی ہوا دل میں تھی — میں ابھی تک پتے کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور رو رہی تھی۔ اور جب ذرا ہچکیاں رکتیں تو یہی کہتی۔

"ماں میرا بیاہ کر دو۔ نہیں تو ایک دن میری عزت مٹی میں مل جائے گی... ..."

... ... اب تم ہی بولو بیٹا، غریب عورت کرے تو کیا کرے۔ جب دھڑی پاس نہ ہو تو کس برتے پر لڑکی کا بیاہ رچائے۔ ... پھر بھی میں نے ادھر اُدھر نگاہ ڈالی کہ کوئی غریب مگر طبیعت کا شریف آدمی مل جائے جو زعفرانی کو بیاہ لے، تو یہ فکر تو دور ہو جائے۔ مگر پچاس ساٹھ روپے تو تب بھی چاہئیں۔ زمین زیور یہاں تک کہ میرے اور زعفرانی کے کانوں کے بالے بھی بک چکے تھے۔ اب تو کچھ بھی نہیں تھا جس کے سہارے قرضہ بھی مل جاتا۔ اسی ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ ایک دن ایک آدمی آیا۔ شکل صورت سے بے چارہ قابل معلوم ہوتا تھا۔ منہ میں ماتھے پہ پیٹے کا نشان۔ عمر پتہ نہیں کیا تھی۔ پر پچاس کا معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔

"غلام نبی نے یہ بھیجا ہے۔ میں اس کا دوست ہوں محمدو"۔ یہ کہہ کر ایک میلے سے کپڑے کی پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔ کھول کر دیکھا تو نوٹ اور روپے اور کچھ ریزگاری۔ گنے تو پانچ اور پر ساٹھ روپے اور دس آنے ہوئے۔ وہ بولا۔

"غلام نبی نے کہا تھا کہ ماں سے کہنا۔ اس روپے سے زعفرانی کا بیاہ کر دیں"

میں نے خدا کا شکر کیا کہ بیٹے کے دل میں ماں بہن کا خیال تو آیا۔ پھر محمدو کے منہ پر کچھ عجیب سی حالت دیکھ کر میں نے پوچھا۔

"غلام نبی کا کیا حال ہے؟ وہ نہیں آیا؟"

محمدو کے گلے میں آواز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ٹھیر ٹھیر کر بولا جیسے بولنا نہ چاہتا ہو۔

"ماں جی! غلام نبی تو چل بسا۔ اُسے دق ہو گئی تھی"۔ اور بس چپ ہو گیا

... ... بیٹا! تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ بیٹے کی موت کا ماں پر کیا اثر ہوتا ہے ... ... ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کلیجے کا ٹکڑا کسی نے کاٹ کر نکال لیا ہو۔ ماں نو مہینے بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے نا۔ دو سال دودھ پلاتی ہے۔ بچہ اس کے خون، اس کے گوشت پوست سے بنتا ہے۔ اور پھر وہ بڑا ہو کر غلام نبی کی طرح چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہو جاتا ہے۔ اور پھر گدھے کی طرح صاحب لوگوں کا سامان ڈھوتے ڈھوتے خون کی کھانسی کھ نستا ہوا مر جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ماں بھی مر جاتی ہے ... ... اور سب سے بڑی موت یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر بھی زندہ رہتی ہے ... ...

میرا تو جو حال ہوا سو ہوا، زعفرانی پہ بھائی کی موت کا کچھ عجیب ہی اثر ہوا۔ چھوٹے بھائی کی پڑھائی کی فکر اور بھی پڑ گئی۔ بہر وقت اس کی جان پہ رہتا۔ رہتی کہ پڑھ۔ تختی لکھ۔ مدرسے کا کام کر۔ گھڑی بھر کھیلنے کی بھی چھٹی نہ دیتی۔ جیسے اُسے کوئی خاص جلدی ہو کہ سال بھر کی مدرسے کی پڑھائی دو چار دن ہی میں پوری ہو جائے۔ نہ جانے کیوں اتنی جلدی تھی اُسے۔ نہ جانے کیوں؟ ... ...

ہاں اور محمدو کے پاس بیٹھ کر زعفرانی نے بھائی کے آخری ایام کا سب حال کرید کرید کر پوچھا۔

"کب اور کیسے بیمار پڑا، علاج ہوا یا نہیں؟ کیا سب سامان ڈھونے والے مزدوروں کو اسی طرح دق ہو جاتی ہے؟"

اور جب محمدو نے کہا۔

"ہاں بہت سوں کو"۔ تو نہ جانے کیوں زعفرانی نے اس سے پوچھا۔

"تو کیا تم واپس جا کر پھر یہی کام کرنے لگو گے؟ یہاں کیوں نہیں رہ جاتے؟ ... ... نہ جانے کیوں ... ..

... ... میرے کہنے سے محمدو ہمارے ہاں تین دن اور ٹھیرا۔ جس روز وہ جا رہا تھا میں نے اس سے پوچھا

"کیوں محمدو! جب یہ کام اتنا خطرناک ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟"

وہ بولا

"چھوڑ کر کیا کروں گا ماں جی؟ اور کوئی کام آتا نہیں ہے۔ اور پھر کوئی آگے ہے نہ پیچھے نہ ماں نہ باپ ... ..."

میں نے جلدی سے پوچھا

"اور بیوی؟"

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کب کی مر گئی"

پتہ نہیں وہ میرا مطلب سمجھا یا نہیں، پر میں نے کہا۔

"دوسری کیوں نہیں کر لیتے؟"

اس کو تین دن میں میں نے ہنستے تو کیا مسکراتے بھی نہ دیکھا تھا۔ پر اس بات پر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہوئی اس کے سوکھے چمڑے جیسے چہرے پہ ہنسی کی لکیریاں پڑ گئیں۔

"مجھ سے کون بیاہ کرے ہے، ماں جی؟"

... ... تو بیٹیاں زعفرانی کا بیاہ محمدو سے نہ پایا۔

... ... کیا کہا! زعفرانی کی ماں نے؟ بیٹا بھلا شادی بیاہ کیا لڑکیوں کی صلاح سے ہوتے ہیں۔ پر میں نے زعفرانی سے ذکر کیا کہ اگلے چاند کی بیسویں کو محمدو ہمارے ہاں بیاہنے آئے گا۔ تو یہ تو میں نہیں کہوں گی کہ وہ سُن کر خوش ہو گئی۔ بھلا شریف لڑکیاں کیا شادی کے ذکر پہ خوش ہوا کرتی ہیں.... پر اس کے چہرے سے اطمینان ضرور ٹپکتا تھا۔ جیسے اب اس کی کوئی چنتا دُور ہو گئی ہے۔

شادی کی چھوٹی موٹی تیاریوں میں دن لگ گئے۔ ہاں بیٹا آج تم غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے ایک ہی جوڑا اور دو چاندی کے بالے ہوں۔ سویرے دن محمدو آنے والا تھا اسی دن میں نے سویرے ہی سے زعفرانی کو اُٹھا کر نہلا دھلا کر شادی کا جوڑا پہنا دیا۔ گلابی رنگ کا پیراہن اور اس کے نیچے سبز بھرل دار گھیدٹ کی شلوار۔ ہم پرانے زمانے کے کشمیری عورتیں تو بس لمبے لمبے پیراہن ہی پہنا کرتی تھیں۔ مگر اسی شیر کشمیر کے کہنے سے آج کل لڑکیاں نے شلواریں بھی پہننی شروع کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ زعفرانی تو مجھے بھی مجبور کرتی تھی کہ ماں شلوار پہنو نہیں تو شیر کشمیر خفا ہو جائیں گے۔ شیر دریہ سے ذرے

میری بلا، پراوہ عورتیں بھی اب شلوار پہننے لگی تھیں۔ سوچا میں نے بھی یہی کیوں نہ کروں۔ سو میں نے بھی سلوالی۔۔۔

اتفاقہ آیا ہے مجھے اس شیر کشمیر پر کہ کمبخت کو اگر پڑا جانا تھا تو کیا اسے وہی دن جڑا تھا جب میری بیٹی کا بیاہ طے پایا تھا۔ یکایک سارے گاؤں میں شور مچ گیا، شیر کشمیر پکڑے گئے۔ شیر کشمیر پکڑے گئے۔ مجھے کیا پتہ کیوں سرکار نے اسے پکڑا تھا۔۔۔ میری طرف سے اگر سال کے بارہ مہینے قید رکھا جاتا تو اور بھی اچھا تھا۔۔۔

۔۔۔ پر یہ ضرور سنا کہ اب کے اس نے خود راجہ ہی کو ریاست سے باہر نکالنے کی بات چلائی تھی۔ میں نے کہا اب اس شیر نے شہر بہر کے بھٹ میں پنجہ ٹالا ہے۔ اب یہ زندہ نہیں بچے گا۔ باہر شور کی آواز ہوئی تو میں نے آئی یہ سوچ کر کہ شاید محمد دین اور اس کے ساتھی برات لائے ہوں مگر وہاں تو پہلے دھینگا مشتی مچا رہے تھے۔ دو چار لال جھنڈے جن پر ہل بنا ہوا تھا لئے "شیر کشمیر زندہ باد" "ڈوگرا راج مردہ باد" کہتے پھر رہے تھے۔ اور جا اور دو چار ایمٹوں کا چبوترہ بنائے سفید کھدر پہنے دیوار پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اور زور زور سے نیچے پڑھتا جاتا تھا۔۔۔۔

"کشمیر می رچھ وڈ دو"۔۔۔۔ ۔۔۔۔ اور زعفرانی دھندلے میں کھڑی خفرا کو دیکھ رہی تھی اور اب اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی جیسے اس نے ایک بڑا کام پورا کر لیا ہو۔

۔۔۔ ۔۔۔ ہاں تو ابھی میں اندھا کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر سے رونے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ میں نے جو دیکھا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک خاکی رنگ کی موٹر لاری کھڑی تھی، اور اس میں سے سپاہی کود کر، بچوں کو لاٹھیوں سے مار رہے تھے، میں دیوار کی طرف دوڑی، جہاں پل بھر ہوئے خفرا کھڑا ہوا گھر پا مٹی سے لکھ رہا تھا۔ خفرا اب نہیں تھا۔ ہاں خون کی ایک لکیر زمین پر کھنچی ہوئی تھی اور اس لکیر کی سیدھ میں جو میں نے دیکھا تو خفرا کو زمین پر بے ہوش پڑا پایا۔ اس کے سر میں ایک گہرا گھاؤ تھا جس میں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک کھرپا کا ٹکڑا تھا۔۔۔ میں اپنے خفرا کو اٹھا کر اندر لے آئی اور وہاں اپنی جھن کی گود میں اس نے جان دے دی۔ اور بے ہوشی میں بھی آخر وقت تک اس کے ہونٹ انہی حرفوں کو دہراتے رہے۔ جنہیں وہ باہر دیوار پر لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کشمیر می اور ابھی رخ نہیں کمہ پایا تھا کہ گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک بجلی آئی۔ اور اس مہینے میں دوسری بار مجھے موت آتی پر نہ آئی۔۔۔

۔۔۔ ۔۔۔ اور اس کے بعد کیا ہوا۔ بیٹا، یہ مجھے ایسا یاد ہے، جیسے کوئی ڈراؤنا خواب ہو جس میں ایک خوفناک بات کا دوسری خوفناک بات سے کوئی تعلق نہ ہو، مگر پھر بھی خوف اور دہشت کا پہاڑ اٹھتا چلا جائے۔۔۔

۔۔۔ ۔۔۔ زعفرانی کی آنکھیں ہو کبھی کنول سے ہلتی جلتی ہرا کرتی تھیں اس وقت دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں۔۔۔ ۔۔۔ آنسوؤں کا نام نہیں تھا۔ نہیں تو وہ آگ بجھ جاتی جو اس وقت ان میں سلگ رہی تھی۔۔۔ ۔۔۔ اور پھر سارے گاؤں والوں کا ایک جلوس۔ مردوں سے آگے عورتیں۔ اور عورتوں میں سب سے آگے زعفرانی۔ وہی اپنی شادی کا جوڑا پہنے ہوئے۔ اور اس کی آنکھوں میں وہی دہکتی ہوئی آگ۔ اور یہ سارا مجمع گاتے ہوئے کھیتوں میں سے ہو کر سڑک کی طرف جاتا ہوا۔ جہاں بالکل اسی جگہ جہاں تمہاری موٹر کھڑی ہے، سپاہیوں کی خاکی لاری کھڑی تھی۔

۔۔۔ ۔۔۔ بڑی بڑی مونچھوں اور کالی رنگت والے سپاہی اور ان کی بندوقیں جو ٹکلی باندھے اس جلوس کی طرف ان عورتوں کی طرف زعفرانی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔۔۔ ۔۔۔

۔۔۔ ۔۔۔ ایک تڑاخہ۔ دس بارہ تڑاخے۔ سب بھنبھنا کر بھاگے۔ اور اس کھیت کے بیچوں بیچ اپنی بھاگتی ہوئی زعفرانی مزدم مٹی میں اس طرح گری جیسے ماں کی گود میں بچہ آن کر گر پڑے میں ادھر بھاگا۔ پہ جب تک میں پہنچوں۔ زعفرانی کی چھاتی میں سے خون کی ایک دھار بہتی ہوئی کھیت کی سوکھی مٹی کو سیراب کر رہی تھی۔۔۔ ۔۔۔ جھنت کی چھاتی اور اس میں سے دودھ کی بجائے خون۔۔۔ ۔۔۔ خون مٹی میں مل رہا تھا۔۔۔ ۔۔۔

اور میری بیٹی میری گود میں جان دے رہی تھی۔ پر مرتے دم تک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اور نہ جانے کیوں آخری ہچکی سے پہلے اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

"میرا بیاہ ہو گیا ماں"

... ... یہیں اسی کھیت میں جہاں تم اب گل لالہ کی طرح سُرخ زعفران کے پھول دیکھتے ہو۔

... ... سُنتی بیٹا، تم نے میری کہانی! ... ... پر تم کہاں ہو! ... ... چلے گئے نا تم! ... ... میں نہ کہتی تھی کہ ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم لوگ چلے جاؤ گے اور کہانی نہ سُن پاؤ گے۔

... ... موٹریں تو اس سڑک پہ سے گزرتی ہی رہتی ہیں، بیٹا، پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا۔ اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیئے جائیں گے۔ اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوانوں پر سے مہکے گی۔ اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے کہ "اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح لال کیوں ہے!"... ... پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں... ... ..."

اختر حسین رائے پوری

مجھے جانے دو

مجھے جانے دو" اس نے کہا۔ اور جب تک میں اسے روکوں وہ پھاٹک چھڑا کر جا چکی تھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کی ایک جھپک اور وہ بلیز پر پاؤں کے بچھوے کی ایک جھنک سنائی دی۔ وہ چلی گئی اور میں کوٹھڑی میں اکیلا رہ گیا۔

میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ میں اکثر اس مکان کے آگے سے گزرتا تھا اور شام کے وقت کچھ جوان لڑکیوں کو اس کے پھاٹک کے آگے کھڑا پاتا تھا۔ جاڑے کی راتوں میں نیم آستیں جمپر پہنے ہوئے یہ چھوکریاں راہ چلتوں کو لبھانے کی تدبیر کیا کرتی تھیں۔ کوئی بھی آنکھوں والا غازے سُرخی میں عصمت کے خون کی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ ان کے جسم کا ہر واں تھرتھرا کر کہہ رہا تھا ــــ ہمیں لے لو ــــ ایک روپیہ کے بدلے۔

ان میں سے بعض سگریٹ کا دھواں نہایت نزاکت سے کسی رنگیلے کے منہ پر پھینک دیتی تھیں۔ اور کوئی منچلی کسی بدنما مارواڑی کے جوتے پر پان کی پیک تھوک دیتی تھی۔ جب وہ پلٹ کر دیکھتا تو لڑکیاں آنکھ مار کر کھل کھلا پڑتی تھیں۔ ان کی ہر ادا زبانِ حال سے کہتی تھی ــــ ہمیں لے لو ــــ ایک روپیہ کے بدلے۔

ٹرام، شریف زادیوں اور موٹروں پر امیر زادیوں کے کھیپ کے کھیپ گزرا کرتے تھے۔ ان سستی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ تو بڑا استغفار کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں، یہ بدبخت، نسوانیت کی ننگ، خدا غارت کرے، چند ٹکوں کے لئے شراب کی بوتل یا سگریٹ کی ایک ڈبیہ کے لئے یہ اپنا تن ہر ایرے غیرے کے سپرد کر دیتی ہیں ــــ اوہ، ہم؟ ــــ پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کرنے لگتی تھیں جنہوں نے انہیں اونچی حویلیاں، ریشمی ساریاں اور چھپ چھپے عطا کئے تھے۔

اس مکان سے لگ کر کالی دیوی کا ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ یہ کالی کلوٹی اور ننگ دھڑنگ دیوی اپنی پھیلائی ہوئی آنکھوں سے لیلیٰ، ننھا کا تماشا دیکھا کرتی تھی۔ شام جب آرتی شروع ہوتی اور کم سن لڑکیاں اس کے سامنے ناچنے لگتیں تو تخت کے چراغوں کی دھندلی جوت میں اس کی شکل زیادہ پُراسرار ہو جاتی۔ معلوم ہوتا کہ عورت کی روح ایک سیاہ کفن اوڑھے ہوئے اپنی قبر سے اٹھی ہے۔ اور ایک آن میں مرد کو فنا کر دے گی۔ جو لوگ روشن کے لئے آتے وہ ہاتھ باندھے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے ان رقاصاؤں کو تاکا کرتے تھے۔ اور جب وہ التفات نہ کرتیں تو یہ زیادہ بے باکی سے طوائفوں کو گھورنے لگتے جو بجاری کے ڈر کے مارے سیڑھی کے نیچے سر جھکائے کھڑی رہتی تھیں۔

ان میں سے ایک کا انداز سب سے نرالا تھا۔ اس کے دل میں پوجا کی عظمت کا احساس مطلق نہ تھا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے اطمینان سے آرتی کا تماشا دیکھتی اور وقتاً فوقتاً کیرتن کے لئے پیروں سے ٹیک دینے لگتی۔ جب کوئی بوڑھا اپنی پھٹی ہوئی آواز سے تال کو بے تال کر دیتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتی اور پجاڑی کو پکار کر کہتی ——— "ارے ذرا سی مُرکی تو بجانا"

اور کیرتن کا نغمہ کسی مجروح پرندے کی طرح دیر تک تڑپتا رہتا۔

جب میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو میرا دل آپ ہی آپ مبہوت ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں وہاں سے بھاگتے بھاگتے بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

لیکن اس نے بے پروائی سے مجھے دیکھا اور اپنی ایک سہیلی سے پوچھنے لگی ——— "ارے اس حرام زادے سے کتنے اینٹھے؟"

اب میں ہر شام کو اس فٹ پاتھ پر سے گزرنے لگا۔ جب وہ اس مقام پر ہوتی تو ذرا حیرانی سے میری طرف دیکھتی اور پھر کچھ مسکرا کر اپنی ہم چشموں سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ کبھی وہ وہاں نہیں بھی ہوتی تھی۔ اور میں سمجھ جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ میرے دل پر چوٹ سی لگتی۔ خون کی روانی تیز ہو جاتی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں آجاتیں۔ دور بجلی کے کھمبے کا سہارا لئے میں گھنٹوں کھڑا رہتا حتیٰ کہ پرشل ہو جاتے تھے۔ میں یونہی ٹکٹکی باندھے اس بھاٹک کو تاکتا رہتا تھا۔ بیسیوں شریف اس کے اندر سے نکلتے اور واپس جاتیں دیکھ کر لپکتے ہوئے بھیڑ میں گم ہو جاتے تھے۔ لمبی لمبی چوٹیوں اور گھنیری داڑھیوں والے بیسیوں بدمعاش اس چکلے گھر سے برآمد ہو کر بھیگی بلیوں کی طرح پیچھے دبائے بھاگتے نظر آتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سے کیونکر ہم کلام ہونے کی جرأت کی تھی۔

اس روز میں اپنے سب سے پیارے دوست کو قبر میں ڈاکر لوٹا تھا۔ اب دنیا میں کوئی اپنا نہ تھا۔ وہ وقت ہی گھل گھل کر مر گیا اور میں اس کے علاج کا کوئی انتظام نہ کر سکا۔ جب وہ مر گیا تو ہم نے اسے مٹی کے تودوں کے نیچے دبا دیا۔ جب وہ قبر میں سُلا دیا گیا تو میں نے کلیجہ تھام کر آخری مرتبہ اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس پر اب بھی وہی بھولا پن تھا۔ گویا انسانی سماج کی نجس جاندی کے ڈھیلوں کے نیچے دب گیا۔ اور اس نے مرتے مرتے کہا "میری جب تمہارے جسم کو مٹائے گی، میرا خون تمہارے بدن کو چاٹے گا میرے آنسو تمہارے گوشت کو گلائیں گے"

میں قبرستان سے لٹا تو میرے جسم کے اندر کچھ نہ تھا۔ ضمیر کی جگہ کوئی چیز بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ایک خلا جس میں کاہش کے سوا کچھ نہ تھا۔ شام کے وقت بلا ارادہ میں اسی مکان کے آگے موجود تھا۔ میں نے بنا کچھ کہے ہاتھ پکڑ کر اسے اندر گھسیٹ لیا۔

اس نے مجھے ایک روپیہ دے کر کہا "اس نکڑ کے پیچھے کی گلی میں ایک کلال کی دکان ہے، وہاں سے ایک ادھا خرید لاؤ"

میں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہو گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ہر وہ کام اچھا ہے جسے دنیا بُرا کہتی ہے۔ بھر میں اس کلال کی دکان میں گھس گیا۔

مٹی کے بڑے بڑے مٹکے جن پر جھاگ کے بادل سمٹ آئے تھے۔ جیسے بھینس کے تھن سے دودھ چھلک رہا ہو۔ ان میں مکھیاں اور مکوڑے تیرتے ہوئے، اندر متوالے مل کر گا رہے تھے۔

"ایکشا غیروں کا آآآ۔ ہا آآ۔ رے نالا۔ ۔ ۔"

میں نے جلدی سے ایک ادھا خریدا، اور وہ فی کی چاٹ چٹپٹی مسالے دار۔

اس نے منہ لگا کر دیکھتے دیکھتے آدھی بوتل ختم کر دی۔ پھر چپ چاپ ایک سگریٹ سلگایا اور میری گود میں اپنے پاؤں پھیلا کر

ٹوٹی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہوگئی۔

یک بیک وہ زور سے ہنسی اور مجھے غور سے دیکھ کر پوچھا "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

ہوا بند تھی۔ کھڑکی سے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آرہا تھا جس میں دو تین ستارے چنبیلی کے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔

"بولتے نہیں۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ تم یہاں کس غرض سے آئے ہو۔ مجھے اس مرد سے نفرت ہوتی ہے جو عورت کے پاس بیٹھ کر اپنا تعارف زبان سے نہیں بلکہ نگاہ سے ظاہر کیا کرتا ہے، اور اس گھڑی کا منتظر رہتا ہے، جب عورت خود اس سے پوچھے کہ "کیا چاہتے ہو؟"

اس نے بوتل کی بچی ہوئی شراب اپنے گلے کے نیچے اتار لی۔ سگریٹ کا ایک کش لے کر باہر دیکھنے لگی میں بدستور چپ تھا۔ خود مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کیوں آیا ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔

پھر وہ اٹھ کر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اس میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔ وہ دوبارہ ہنسی تو مجھے ایسا لگا کہ کوئی مردہ ہنس رہا ہے۔

"یہ میری ہی صورت ہے۔ اگر میں کاجل، غازہ اور لالکھے کو دھو ڈالوں تو کیا رہ جائے ——— دھندلی آنکھیں۔ پچکے ہوئے گال، سوکھے ہوئے ہونٹ۔ تین سال کے اندر کیا سے کیا ہو گیا۔ میرے جسم کو گھن لگ چکا ہے، میں اندر سے کھوکھلی ہو گئی ہوں مجھے ایسی ایسی بیماریاں لگ گئی ہیں جن کے تصور سے تمہیں وحشت ہوگی اور تم یہاں سے بھاگ جاؤ گے!"

دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ اس کا منہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ مجھ پر آنکھیں گاڑ کر وہ کہنے لگی "اور یہ بیماریاں مجھے کہاں سے لگیں، یہ تم جیسے چاہنے والوں کا ہی عطیہ ہے۔ مرد ——— سوداگر اور آتشک کے جراثیم کا باپ!

تم ابھی اس کوچے سے ناواقف ہو۔ تم نہیں جانتے کہ عورت کیا ہے۔ اگر تمہیں اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح معلوم ہوتا کہ وہ مٹی کا ایک کھلونا ہے اور بس۔ تو تم آتے ہی اسے توڑ دیتے۔ یوں حیرت اور ہیبت سے مجھے نہ تاکا کرتے۔ مگر تم ان لوگوں سے اچھے ہو جو مردوں کی طرح دیکھتے ہی ہمارے سینوں پر آتے ہیں۔ ہمیں کتوں کی طرح بھنبھوڑتے ہیں۔ اور جب ہڈیوں میں گودا نہیں رہتا تو ہمارے بالوں میں دو چار ٹکلیاں باندھ کر چلے جاتے ہیں۔

پھر گھر والی آتی ہے۔ ہماری گرہ سے ایک ایک چھدام نکال کر لے جاتی ہے۔ اور اس کے بدلے ہمیں کھانے کے لئے دو روٹیاں اور سنگار کے لئے کاجل کی سلائی دے جاتی ہے۔

دن کے اجالے میں جب تم لوگ ادھر آتے جاتے ہو تو حقارت سے منہ پھیر کر اپنے ساتھیوں سے کہتے ہو یہاں چھنالا ہے۔ ان مکتی طوائفوں کو عصمت یا عزت کا ذرا پاس نہیں انہیں شہر سے نکال دینا چاہئے۔

مگر رات کے اندھیرے میں تم کشاں کشاں آتے ہو۔ اور ان خرابوں کو آباد کرتے ہو۔ تم اپنا منہ کالا کر کے اپنی حرام کمائی کے چند درم ہمیں دیتے ہو۔ اور پھر اس تجسس میں اپنی حرم سرا کو بھاگتے ہو کہ بیوی تو خیریت سے ہے؟

وہ ہانپنے اور کھانسنے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا اور وہ چارپائی پر گر پڑی۔ اس نے وہ دیوار کو دیکھا اور آپ ہی آپ کہنے لگی "زیادہ دن نہیں۔ یہ مصائب بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔ اب سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔

جب میں مر جاؤں اور میری لاش لاوارثوں کے قبرستان میں پھینک دی جائے تو تم علی گڑھ کے مولانا نور الاسلام سے ملنا۔ اس وقت ان کے پاس جانا جب وہ منبر پر بیٹھے جمعہ کا خطبہ سنا رہے ہوں، اور تمہیں شرافت کی قسم کر وہ اخلاق کی تفسیر بیان کرنے لگیں تو اپنی صف سے

نکل کر کہنا۔ مولانا! میں ایک پردیسی ہوں اور آپ کو یہ پیغام سنانے کلکتہ سے آیا ہوں کہ بداخلاقی اس دنیا سے چل بسی۔ اب آپ ناحق نہ ریسورچ۔ اور جب سب بڈھے اپنی عینکیں کھسکا کر تمہیں گھوریں اور پوچھیں کہ یہ کیا بکتا ہے تو کہنا میں آپ کی بیٹی کے جنازہ کا تماشا دیکھ کر آرہا ہوں وہ جسے ایک حرامی بچہ پیدا کرنے کے جرم میں آپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اسے ایک مرد و عورت نے کچھ دنوں کے لئے اپنے گھر ڈال لیا۔ اور اسی طرح ہاتھوں ہاتھ وہ کلکتہ پہنچ کر طوائف کا پیشہ کرنے لگی۔ آپ کے ہم جنسوں نے تحفہ میں اسے گھناؤنی بیماریاں دیں۔ اور جب وہ مرگئی تو ایک حافظ نے اس کی تبر پر فاتحہ خوانی کی جب تم یہ کہہ چکو گے تو لوگ تمہیں بہت پیٹیں گے۔ لیکن اپنی عبث کے صدقے میں اتنی تکلیف اٹھا لینا۔"

میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں مگر پیروں میں جیسے زنجیر پڑ گئی۔

وہ پھر کھانسنے لگی۔ جب اس کا جی کچھ سنبھلا تو میں نے دیکھا کہ وہ چپکے چپکے رو رہی ہے۔ "تم لوگ جانوروں پر رحم کھاتے ہو۔ ان پر کوئی تشدد کرتا ہے تو سزائیں دیتے ہو۔ میں نے سیٹھوں کو دیکھا ہے کہ چیونٹیوں کو شکر اور سانڈوں کو پوریاں کھلاتے ہیں ——— مگر عورت! آہ عورت پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو؟

مگر عورتیں بیویاں بن کر طوائفوں سے مردوں کی بہ نسبت زیادہ نفرت کرتی ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ ہمارا وجود ان کے حق میں کتنی بڑی نعمت ہے ہم انہیں زنا بالجبر، اغوا اور علانیہ عصمت دری سے بچاتی ہیں۔

اور خدا! ——— وہ ہماری کیوں نہیں سنتا۔ اگر اس کی جنت میں حوروں کے لئے جگہ ہے تو دنیا کا ایک کونہ ہمیں کیوں نہیں مل سکتا؟"

اب ہوا چل رہی تھی۔ اور تاڑ کے پتے غم ناک آوازیں کراہ رہے تھے۔ سڑک پر ٹریموں اور موٹروں کا شور بہت کم ہو گیا تھا۔ البتہ اکے دکے رکشا کی گھنٹی بج اٹھتی تھی۔ بادلوں نے آسمان کے اس ٹکڑے کو گھیر لیا تھا۔ اور ان میں کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی۔

وہ پھر بولنے لگی۔ "میں نے صرف ایک مرتبہ محبت کی ہے۔ اور اب بھی اس فریب میں مبتلا ہوں کہ وہ سچی محبت تھی۔ یہ فریب کبھی نہ ٹوٹے گا۔ کیونکہ قبل اس کے کہ میں اس کا امتحان لوں وہ مر چکا تھا۔

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر کس التجا سے مجھے دیکھتا تھا۔ وہی تصور مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے اپنا مایۂ حیات اسے سونپ دیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اس امانت کو لوٹائے وہ بیلگ میں مر گیا۔

اس نے مجھے جو بچہ دیا وہ حرامی تھا۔ کاش ہماری محبت کو اخلاق کی حمایت مل جاتی اور یہ بچہ مل جاتا۔"

ان بھولی ہوئی باتوں کی یاد سے اس کا دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس طرح حوصلا دوں۔ جس ماں کے آگے اس کے بچے کی لاش پڑی ہوئی ہو اور جس عورت کے آگے اس کے محبوب کا جنازہ، اسے تسلی دینے کا اسلوب کوئی زبان پیدا نہیں کر سکتی۔

جیسے وہ عدالت کے آگے بیان دے رہی ہو۔ "میری سوتیلی ماں نے اندھیری رات میں اس بچے کی لاش آنگن میں گاڑ دی۔ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے بجلی کی دو تتی میں میں نے وہ نظارہ دیکھا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

دو تین روز بعد میرے سوتیلے ماموں نے مجھے گاڑی میں بٹھا کر الہ آباد کا ٹکٹ ہاتھ میں تھما دیا۔ یہیں سے میری مصیبت کا آغاز ہے۔

الہ آباد ——— میرے نسبتی خانوادہ کا مکان . . . . . میری مرضی کے خلاف عصمت دری ..... بدنامی کا ڈر . . . کلکتہ ..... یہ چکلہ گھر ...

دیر تک وہ ٹوٹے پھوٹے جملے دہراتی رہی۔ اور چند لمحوں کے لئے اس کی آنکھ لگ گئی۔

میں دبے پاؤں اٹھا۔ اور نکل بھاگنے کی نیت سے جوتے پہننے لگا۔ اتنے میں وہ چونک کر اٹھ بیٹھی "کیا تم جا رہے ہو؟" اس نے اداسی

سے پوچھا۔ اب اس کی آواز نرم و نحیف ہو گئی تھی۔

میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اب بھی کچھ نہ کہہ سکا۔

"اچھا تو جاؤ خدا حافظ! اب نہ آنا۔ میں تم سے انتقام نہیں چاہتی۔ اور کوئی ہوتا تو میں بصد شکر سوزاک اور آتشک کے چند جراثیم نذر کرتی۔ وہ کسی اور کو دیتا، اور یہ اس کے بچوں کو ورثہ میں ملتے۔ غرض ساری انسانیت ان امراض میں مبتلا ہو جاتی۔ تب شاید سماج کے ٹھیکے داروں کو ہوش آتا کہ اس بلا کی جڑ کہاں ہے۔

مگر کبھی کبھی آ کر پوچھ لینا کہ میرے مرنے میں کتنی دیر ہے۔ کوئی کانوں میں کہہ رہا ہے کہ زیادہ دیر نہیں۔

کوئی بھری جوانی میں مرتا ہے تو لوگ افسوس کرتے ہیں کہ کیسا نامراد چلا۔ لیکن مجھے دیکھو کہ زندگی سے موت کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ تم نہیں جانتے کہ ہم آپ اپنی نظر میں کتنی ذلیل ہیں۔ ہمارا ہر لمحہ دوسروں کی خوشنودی میں بسر ہوتا ہے۔ ہم ایسی لونڈیاں ہیں جن کے آقا ہر روز بدلتے ہیں کیوں کس خیال میں گم ہو گئے۔ جاؤ خدا کے لئے چلے جاؤ۔"

لیکن میں نہ جا سکا۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا تھا۔ پھر میں گرتا ہوا نظر پرندے کی طرح اپنی جگہ سے ٹل نہ سکا۔

"میں تمہیں جاؤں گا" یہ کہہ کر میں نے اپنا سر اس کے آغوش میں رکھ دیا۔ وہ ایک بے جان لاش کی طرح یونہی پڑی رہی۔ اس کے دل کی دھڑکن کو میں صاف سن سکتا تھا۔ اس کی روح کا نوحہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

"تو پھر مجھے جانے دو" اس نے کہا ——— اور وہ چلی گئی۔

ملک راج آنند

حجاموں کی یونین

جدید ہندوستان کی تعمیر میں ہمارے گاؤں کے چند دجاہم کا بھی بڑا حصّہ تھا۔ ضرورت ہے کہ میں اُس کی تاریخی خدمات کی طرف توجہ دلاؤں، ورنہ ممکن ہے دنیا اُسے فراموش ہی کر دے۔ اس نے ایک عظیم الشان کارنامہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ دنیا کو حق شناسی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ یہ عجیب وغریب کارنامہ کچھ اس قسم کا ہے کہ مشروع میں خود چند بھی اُس کی پوری پوری اہمیت سے واقف نہ تھا۔ اس وقت وہ ہندوستان کے دوسرے بڑے آدمیوں کی طرح اپنی اہمیت کو بہت زیادہ نہیں خیال کرتا تھا۔ لیکن قدرتاً جو خود پسندی بڑے آدمیوں میں ہوتی ہے۔ وہ اُس میں بھی آگئی ہے۔ یہ خود پسندی اُسے بُری بھی لگتی تھی، اور اسے زیب بھی دیتی تھی۔

میں چند کو ان دنوں سے جانتا ہوں جب وہ ایک پچھتا ہوا کرتا تھا۔ یہ کرتا پھٹا ہوا بھی کچھ اس طور سے تھا کہ بمشکل اس کا ننگا اور پچھ لا ہوا پیٹ ڈھکتا تھا۔ ہم اکٹھے گاؤں کی گلیوں کی کیچڑ میں کھیلا کرتے تھے۔ کبھی سپاہی بنتے تھے۔ کبھی دو کماندار اور کبھی کلرک ان کے علاوہ اور بھی کئی کھیل تھے۔ جو ہم نے اپنی تفریح کے لئے ایجاد کئے تھے۔ اس تفریح میں اور کوئی شریک نہیں ہوتا تھا۔ ہاں البتہ ہماری ماتائیں کبھی کبھی آکر دیکھ جاتی تھیں۔

چند مجھ سے کوئی چھ ماہ بڑا ہوگا۔ ساری باتوں میں وہی پیش پیش رہتا تھا۔ میں بھی بخوشی اُس کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ چونکہ اُسے بھڑ پکڑنے کا خاص ملکہ تھا۔ وہ بھڑ کی دم کو دبا کر بڑی ہوشیاری سے ڈنک نکال لیتا اور پھر اس کی ننھی ٹانگوں سے تاگا باندھ کر اڑاتا تھا۔ لیکن میں جب کبھی کوئیں کی منڈیر کے چھرلے چھرلے گڑھوں پر سے بھڑ پکڑنے کی کوشش کرتا، تو مجھے ضرور سزا بھگتنا پڑتی۔ بھڑ اکثر میرے گالوں پہ کاٹ لیتی تھی۔

ہم کچھ بڑے ہوئے تو پھر بھی ویسے ہی چند مجھے دنیا بھر کی خوبیوں کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا۔ اب تو وہ قسم قسم کے کنکوے بھی اڑا لیتا تھا ان کنکوؤں کا توازن کچھ اس ڈھب کا ہوتا تھا کہ انہیں قابو میں رکھنا میرے بس کی بات نہ تھی۔

اسکول کے کام کاج میں وہ مجھ سے پیچھے تھا۔ وہ میری طرح سوال نہیں نکال سکتا تھا وجہ یہ تھی کہ اس کے پتا نے اسے شروع ہی سے آبائی پیشہ سکھا دیا تھا۔ اور لوگوں کی حجامت بنانے کے لئے اُس کو گھر گھر جانا پڑتا تھا۔ اسکول کا کام کرنے کے لئے اس غریب کو وقت ہی کہاں ملتا تھا لیکن اُسے گیت بہت یاد تھے۔ اس فن میں وہ مجھ سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ اُسے نہ صرف یہ کہ کتاب کے سارے گیت ازبر یاد تھے۔ بلکہ وہ نثر کے صفحے اس شان سے زبانی سنا دیتا تھا کہ وہ سب گیت ہی معلوم ہوتے تھے۔

امتحان ہوا۔ چندو نے وظیفہ حاصل کیا۔ فاتحی کو بدیات ناگوار معلوم ہوئی، کہ اس کو تو اسکول سے کچھ نقد بھی ملے اور میں فیس پاس سے دیکر تعلیم حاصل کروں۔ اب وہ مجھے چندو کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتی تھیں۔ کہتی تھیں چندو ایک حجام کا بیٹا ہے اور کہاں ذات کا ہے اور یہ بھی کہتی تھیں کہ مجھے اپنی ذات اور مرتبے کو پہچاننا چاہئے۔ میں نے اپنے والدین سے اور کوئی باطنی اوصاف تو حاصل کئے ہوں گے۔ لیکن برتری کا کوئی احساس یقیناً وراثت میں نہیں پایا تھا۔ مجھے تو اس سُرخ نشان سے بھی شرم آتی تھی۔ جو ماتا جی صبح کو میرے ماتھے پر لگایا کرتی تھیں۔ چمپت اچکن، سفید لٹھے کا پاجامہ، سنہری طلا، جوتا، ہلکے کی پگڑی غرض کہ مجھے ایسی کوئی چیز نہ بھاتی تھی۔ چندو جو کپڑے پہنتا تھا۔ کچھ عجیب سے ہوتے تھے ان میں شکن بھی ہوتے تھے اور چمکیلے بھی۔ ہتے تھے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ مجھے بھی جی ہونا چاہئے کہ چندو کی طرح کپڑے پہنوں ——— ایسے کپڑے جو دضع داری سے بے نیاز ہوں۔

چندو نکر چہا کرتا تھا جو اُسے ایک پنشن یافتہ صوبیدار نے دی تھی۔ اُس کی قمیص کے اوپر ایک مخمل کی واسکٹ بھی ہوتی تھی۔ جو سیپ کے بٹنوں سے سجی ہوئی تھی۔ وہ ایک گول ناندے کی بنی ہوئی ٹوپی پہنتا تھا۔ یہ ٹوپی بھی ہمارے گاؤں کے وکیل لالہ حکم چندجی کے سر کی زینت ہوا کرتی تھی۔

چندو کے پتا پلیگ کی بیماری سے اس دنیا سے سدھار گئے۔ ان کے بعد چندو بالکل آزاد ہو گیا۔ جو جی میں آتا تھا کرتا تھا۔ اسکی آزادی قابل رشک تھی۔ صبح ہی صبح وہ اُونچی ذات کے شرفا کے گھروں میں جا کر ان کے سر اور خط بنایا کرتا تھا۔ پھر خود نہا دھو کر اپنے کپڑے پہن لیتا تھا اتنے میں لالہ حکم چندجی کی گاڑی تیار ہو جاتی تھی۔ اور وہ بھی وکیل صاحب کے ساتھ پائیدان پر بیٹھ کر شہر کو چل دیتا تھا۔ یہ شہر گاؤں سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔

چندو مجھ پر بڑی نوازش کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ مجھے شہر جانے کے بہت کم موقعے ملتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ تین میل تک جو تیاں چٹخاتے خوف خدا دل میں لئے مرتے جو دھیالہ کے مڈل اسکول میں پہنچ جاؤں اور کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔ اُس نے پتا کی وفات کے فوراً بعد ہی اسکول کو خیرباد کہہ دیا اور بے رحم اُستادوں کی زدوکوب سے بچ گیا تھا۔ وہ میرے لئے شہر سے رنگ بھرنے والا برش، سنہری روشنائی سفید چاک، پنسل تراش، جس میں دو طرفوں والا پھل لگا ہوتا ہے۔ اور اس قسم کے اور بھی کئی تحفے لایا کرتا تھا۔ وہ مجھے مختلف دنیک بانڈاروں کی مختلف النوع چیزوں کی تفصیل سنایا کرتا تھا۔ اس سے مجھے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ واپسی پر اُسے پھر وکیل صاحب کی گاڑی کے پائیدان پر آنا ہوتا تھا۔ اس لئے اُسے کچہری میں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہاں پہ اکثر وہ صاحب لوگوں، وکیلوں، چپراسیوں اور پولیس کے سپاہیوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اور اُن کی انگریزی وضع قطع کی پوشاک پر دل کھول کر تبصرہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے بدو ایک مرتبہ مجھ پر یہ خواہش ظاہر کی تھی۔ کہ وہ اپنے گھر کے ملکے سے کچھ رقم اڑالے۔ یہ ملکا گویا ان کا دولت خانہ تھا۔ جہاں چندو کی ماں اس کی پیشہ وارانہ چابکدستی سے حاصل کی ہوئی مزدوری کو جمع رکھتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس رقم سے غلام خان کا سادہ و سامان خریدے یہ کلام خان شہر کے دندان ساز تھے۔ چندو کہا کرتا تھا۔ یہ خانصاحب لوگوں کے منہ میں دانتوں کی قطاریں لگا کر اور مصنوعی آنکھیں جما کر معجزہ ہی تو کر دیتے ہیں۔ کلام خان کا حلیہ اُس نے اس طرح بیان کیا تھا۔ وہ ایک آدمی ہے، بالوں میں ایک طرف کو چیر لگاتا ہے۔ ماوے سے سخت کی بُرتی قمیص پہنتا ہے۔ اس کے اوپر گلے میں ایک ہاتھی دانت کا کالر

ہوتا ہے اور اس میں ایک بٹنوں والی لمبی ہوتی ہے۔ ایک سفید رنگ کا کوٹ ہوتا ہے۔ نیچے ایک پٹی دار پتلون اور سیاہ رنگ کا پمپ شو، اور پوری پوشاک جو وہ کام کرنے کے وقت پہنتا ہے۔ ربڑ کی بنی ہوتی ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہ جادوگر بڑی مہارت کے ساتھ اپنے چہرے کے بیگ کو کھولتا ہے اور اپنے چمکدار لوہے کے اوزاروں کو بڑے طمطراق کے ساتھ باہر نکالتا ہے۔ پھر چندو نے اس مسئلے پر میری رائے دریافت کی کہ کیا وہ حجام جس کے پاس پرائمری کی سند بھی موجود ہو۔ اگر غلام خاں کا سا لباس پہن لے تو زیادہ معزز نہیں بن جائے گا؟ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا۔ اگرچہ میں نے کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن انسان کے جسم کے اوپر جو کیل، پھنسی پھوڑے وغیرہ نکل آتے ہیں ان کا علاج تو میں بھی جانتا ہوں۔ میں نے اپنے پتاجی سے سیکھا تھا۔ اور انھوں نے اپنے پتاجی سے یہ تعلیم لی تھی۔

میں نے اُس کے اس مفروضے کی تائید کی۔ اور پرجوش انداز میں اُس کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ ایک دن وہ صبح ہی صبح ہمارے ہاں آیا۔ اسے دیکھ کر میرے رگ و پے میں جذبات کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اُس نے ایک سفید پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ ایک ربڑ کا کوٹ زیب بدن تھا اگرچہ یہ کچھ بڑا تھا۔ لیکن تھا بڑے ٹھاٹھ والا۔ پاؤں میں سیاہ رنگ کا ایک پمپ شو تھا۔ اتنا چمکدار کہ اُس میں مجھے اپنا چہرہ صاف صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا بیگ تھا۔ وہ اپنے روزمرہ کے چکر پر نکلا تھا اور مجھے دکھانے آیا تھا کہ وہ اپنے اس نئے ساز و سامان سے کتنا بارعب ہو گیا ہے۔

اُسے دیکھتے ہی بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "عجیب! عجیب!"

وہ زمیندار کے گھر کی طرف جس کا خود وہ ہر روز بنایا کرتا تھا، تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا چل دیا۔ میں بھی اس کی داد دیتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس وقت گلی میں کوئی بھی نہ تھا۔ تنہائی میں ہی اس کی شان و شوکت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے لباس میں ملبوس تھا۔ خود شناسی میں محو، گاؤں کی دیواروں کے اوپلوں سے اپنی پوشاک کو بچاتا ہوا۔ اور غلیظ پانی سے ہٹتا ہوا، جو گاؤں کی گلیوں میں اکثر بہتا رہتا ہے۔ چلا جا رہا تھا۔ جیسے ہی کہ ہم زمیندار کے گھر میں داخل ہوئے ہمیں دیوی ملا۔ یہ زمیندار کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر تالیاں بجائیں اور کہا چندو آیا! چندو آیا! کبھی مشن اسکول کے پادری صاحب کی طرح خوبصورت اور شاندار کپڑے پہنے ہوئے۔

موٹی توند والے زمیندار بیٹھے چندو نے اپنا ہاتھ پوتر جنیو پر پھیرتے ہوئے کہا۔ "رام! رام! رام! یہ جنیو اس کے گلے میں لٹک رہا تھا۔ چونکہ وہ ابھی ابھی نہا کر آیا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی کہنے لگا "سؤر کہیں کا! ہمارے گھر میں گئو ماتا کے چمڑے کا بیگ لئے اور کسی جانور کے، نہ جانے کس جانور کے گودے کا بنا ہوا کوٹ اور منحوس کالا انگریزی جوتا پہنے چلا آ رہا ہے۔ نکل! دُور ہو! شیطان کے بچے۔ تم ہمارے دھرم کو بھرشٹ کرو گے۔ پتا نے آنکھیں بند کیں تو ایسا ہو گیا گویا دنیا میں کسی کا بھی ڈر نہیں؟

چندو کہنے لگا "لیکن جاگیردار صاحب! میں نے تو ایک ڈاکٹر کا لباس پہنا ہوا ہے۔"

"سؤر کہیں کا! نکل یہاں سے! جا اور وہ کپڑے پہن جو ایک نیچ ذات حجام کو زیب دیں۔ اپنے ان نئے نرالے خیالات سے ہاتھ اُٹھا ورنہ ڈنڈوں سے تمہاری تواضع کی جائے گی۔"

چندو نے عرض کی "لیکن لالہ جی چندجی ....."

"چلے جاؤ اچھے جاؤ! تمہیں کہیں کے قریب مت آنا ورنہ ہمیں گھر بھر کو گئو کے گوبر سے پوتر کرنا ہو گا۔"

چندو کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وہاں سے واپس ہو لیا۔ کچھ بدحواس بھی ہو رہا تھا۔ میری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ اس کی توہین ایک ایسے شخص کے سامنے ہو رہی تھی جو اسے ایک برگزیدہ ہستی خیال کرتا تھا۔ پھر وہ بڑھتا ہی گیا تھا فوراً رام کی دوکان کی طرف چلا گیا۔ یہ صاحب گاؤں کے ساہوکار تھے اور گلی کے موڑ پر بنیا رام کی دوکان کرتے ہیں۔

زمیندار کا لڑکا دیوی اپنے پتا کے اس سخت سلوک کو برداشت نہ کر سکا۔ اور شورو شغب کرنے لگا۔ میں اس کو خاموش کرانے کے لئے ٹھہر گیا اس کے بعد جب میں گلی کے مرے پر آیا تو دیکھا کہ وہ ساہوکار صاحب چنے تولنے کے لئے ہاتھ میں ترازو لئے ہوئے ہیں اور چند غریب کو بے نقط سُنا رہے ہیں "سوم تمہیں، چاہئے تھا کہ پتا کے مرنے کے بعد اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے اور اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کرتے نہ یہ کہ کسی بھانڈ یا مسخرے کی طرح رنگ رنگ کے سوانگ بھرتے پھرتے۔ ہسپتال کے لوگوں کے سے ناپاک کپڑے پہن کر پھر رہے ہو۔ جاؤ اپنے کپڑے پہن کر آؤ۔ ورنہ میں تم سے خط نہیں بنواؤں گا" ساہوکار صاحب جوش میں یہ لعن طعن کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے چوٹی کی مقدس گانٹھ پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے چندو بہت دل برداشتہ ہو گیا۔ غصے میں آکر میرے پاس سے بھاگ کھڑا ہوا۔ گویا کہ اس سارے افسوسناک حادثے کا میں ہی ذمہ دار تھا۔ مجھے بے حد تشویش تھی۔ میں اس سوچ میں تھا کہ چندو مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی اونچی ذات سے تعلق رکھتا ہوں۔

میں نے پیچھے سے بلند آواز میں کہا "پنڈت پرمانند جی کے پاس جاؤ اور کہو جو کپڑے تم نے پہن رکھے ہیں غلیظ نہیں ہیں"۔

پرمانند جی کو زمیندار نے بھلا بھیجا تھا کہ فوراً اس ناپاک مسئلے پر بات چیت کر لی جائے میں نے یہی کہا تھا کہ پرمانند جی زمیندار کے گھر سے نکلتے ہی کہنے لگے "اچھا تو تم بھی اس کے ساتھ شامل ہو۔ اسکول کی تعلیم نے آج کل کے لڑکوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ تم یہ لباس پہن لو تو مناسب بھی ہے۔ چونکہ تم بڑے وِدوان بننے والے ہو۔ لیکن اس نیچ ذات کے لڑکے کا اس لباس سے کیا واسطہ تھا۔ وہ ہماری ڈاڑھیوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ سروں کو چھوتا ہے اور ہمارے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتا ہے۔ پرماتما نے پہلے ہی سے اسے ناپاک بنایا ہے اب وہ اور زیادہ ناپاک کیوں بنتا ہے۔ تم اونچی ذات کے ہو نہ مانا ہوا اور وہ نیچ ذات ملیچھ ہے"۔

چندو نے بھی یہ باتیں سُن لی تھیں۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔ غصے میں بھاگتا ہوا چلا گیا۔ ایسے کہ اُسے کوئی اشد ضروری کام آن پڑا ہو۔ میری ماتا مجھے کہہ رہی تھیں۔ بیٹا! اب تمہارے اسکول جانے کا وقت ہے۔ کھانا کھا لو اور اسکول جاؤ۔ ورنہ تمہیں دیر ہو جائے گی موقع تو وہاں ہی گیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی مجھے اس حمام لڑکے سے میل ملاپ نہ رکھنے پر لیکچر پلانے لگیں۔

چندو کی شامتِ اعمال نے سارا دن مجھے بے چین رکھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ جب میں اسکول سے واپس آیا تو اُسے وہاں سے بلانا چاہا۔ اس کی ماں معمر زنانہ عورت تھی۔ چونکہ وہ اونچی ذات کی ہو بیٹیوں سے جا ملتی تھی اور بے تکلفی کے ساتھ کہ وہ شاید آپس میں بھی اس طرح سے نہ ملتی ہوں گی۔ اس سے اُس کو کافی جرأت ہو گئی تھی۔ لیکن مجھ پر وہ ہمیشہ سے مہربان تھی۔ اب کچھ طنز آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ کیوں نہ ہو پورے ساٹھ سال کی ذلت اور رسوائی کوئی برداشت کرے تو اُس کے لب و لہجہ میں طنز آ ہی جاتی ہے۔

"ہاں تو تم آ گئے۔ تم یہاں اپنے دوست سے ملنے کے لئے آئے ہو گے۔ اگر تمہاری ماں تمہیں یہاں دیکھ پائیں تو میری آنکھیں پھوڑ دیں۔ کہ میری نگاہیں تمہارے خوبصورت چہرے پر کیوں پڑیں۔ تم ایسے ہی بھولے بھالے ہو جیسے کہ نظر آتے ہو۔ یا کہ تم بھی اپنے بھائی بندوں کی طرح چھپے رستم لگے بھگت ہو"۔

میں نے اس سے دریافت کیا "اماں چندو کہاں ہے؟"

اب اُس نے قدرے مخلصانہ لہجے میں کہا۔ بیٹے! میں نہیں جانتی ہوں کہ وہ کدھر نکل گیا ہے۔ شہر ہی کی طرف کہیں گیا ہو گا۔ کہتا تھا سڑک پر کچھ آدمیوں نے حجامت بنوائی تھی، اور اُن سے کافی پیسے مل گئے تھے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس خیال میں ہے۔ کچھ ہی ہو اسے اپنے پتا کے گاہکوں کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ وہ ابھی بچہ ہی ہے۔ اس کے دل میں عجیب و غریب خیال آتے ہیں۔ ان لوگوں کو چندو پر شفا نہیں ہونا چاہئے۔ بچہ ہی تو ہے۔ میرا خیال ہے تم اس کے ساتھ کھیلنے کے لئے آئے ہو سا اچھا تو جب وہ آئیگا میں اس سے کہہ دوں گی۔ وہ کہیں سڑک ہی کی طرف گیا ہو گا۔

میں نے کہا "بہت اچھا اماں" اور گھر کو چلا آیا۔

اسی دن شام کو چندو میرے یہاں آیا اور معمول کے مطابق سیلوٹ بجائی۔ سیلوٹ ہی ہمارا ایک اشارہ تھا۔ جس کو ہم خوب سمجھ لیتے تھے اور بڑے بوڑھوں کی لعن طعن سے بچے رہتے تھے چونکہ انہیں ہمارا میل جول ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ چندو نے دیکھتے ہی مجھ سے کہا۔ بازار کی طرف چلے آؤ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

میں اُس کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اُس نے کہنا شروع کیا۔ "تمہیں خبر ہے آج صبح میں نے کچہری کے قریب لوگوں کے سر منڈ کر اور خط بنا کر ایک روپیہ کما لیا ہے۔ اگر مجھے پچھلے پہر جلدی ہی فالہ گھی کی گاڑی پر واپس نہ آنا ہوتا تو میں اور بھی بہت کچھ کما لیتا۔ اب دیکھو تو میں ان رسم و رواج کے دیوانوں کو کس طرح سبق سکھاتا ہوں۔ میں ستیہ گرہ کرنے والا ہوں۔ میں اب ان کی خدمت گزاری کے لئے ان کے گھروں میں نہیں جاؤں گا۔ فالہ گھی چندی کے بیٹے سے جو کبھی کبھی جوتے گانٹھنا ہے۔ جاپانی بائیسکل پانچ روپے کو خرید کر چلانا سیکھ لوں گا۔ اور اس پر سوار ہو کر شہر جایا کروں گا۔ میں جب اپنی سفید پگڑی باندھ کر اور دوسرے کپڑے پہن کر بائیسکل پر سوار ہوں گا ——— اور خاص طور سے جب کہ اس دو پہیہ گاڑی کے سامنے بیگ لٹکانے کی ایک کھونٹی بھی ہے ——— تو کہو دوست! بارعب معلوم ہوں گا کہ نہیں؟"

مجھے اس کی رائے سے اتفاق تھا۔ میں نے کہا۔ "ہاں!" میرے جسم میں جذبات کی چرپری سی اٹھی۔ اس لئے نہیں کہ سائیکل سوار چندو کی عظمت و شوکت کو خیال میں لا رہا تھا، بلکہ اس لئے کہ اب میری خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ مجھے خیال تھا کہ اگر چندو نے بائیسکل خرید لیا تو مجھے بھی کبھی کبھار چڑھنے کے لئے دے دیا کرے گا۔ اور اگر یوں نہ ہوا تو سائیکل کی پچھلی کھونٹی پر بیٹھ کر اُس کے ساتھ آگے بیٹھ کر شہر تو چلا ہی جایا کروں گا۔

چندو نے بائیسکل کا معاملہ کچھ اس خوبی سے طے کیا کہ مجھے اس تبسم کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ پیسہ پیسہ رہ بے دریغ خرچ کر دیا کرتا تھا لیکن اس معاملہ کو دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ واقعہ چندو کی تجارتی قابلیت کا اتنا بڑا اظہار ہے جس کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے رازداری کے طریقے سے مجھ سے کہا۔ "تم دو ایک روز اور انتظار کرو میں تمہیں کچھ بتاؤں گا۔ تم اتنا ہنسو گے کہ کبھی عمر بھر میں اتنا نہیں ہنسے۔"

"مجھے ابھی بتا دو۔" میں نے بے صبری سے اُسے کہا۔ اس وقت میرے جسم کا ذرہ ذرہ اس کے کارنامیوں کے جوہر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اُس نے کہا۔ "نہیں! ابھی انتظار کرو۔ میں ہرگز تمہیں صرف اشارۃً ہی بتا سکتا ہوں ——— یہ ایک راز ہے۔ جو صرف ایک حجام ہی جان سکتا ہے۔ اب مجھے یہ مشین سیکھنے دو۔ تم اُسے پکڑ لو۔ میں اس پر بیٹھتا ہوں۔ خیال ہے کہ اسے چلا ہی لوں گا۔"

میں نے کہا۔ "لیکن سائیکل سیکھنے کا تو یہ طریقہ نہیں۔ میرے چاچی نے پچھلے پہیے کی کھونٹی سے پڑھنا سیکھا تھا اور بھائی نے پہیے کو شش کی تھی کہ پیڈل پر کھڑا ہو کر اپنے بوجھ کا توازن قائم رکھے۔"

"تمہارے چاچی تو ایک بھاری ستون ہیں۔ اور تمہارا بھائی لمبی ٹانگوں والا کیکڑا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بہتر۔" اور اس کے سوار ہونے کے لئے بائیسکل تھام لیا۔ میری نگاہیں ابھی بائیسکل کے پالش کی چمک دمک کی داد دے رہی تھیں کہ ہینڈل میرے ہاتھوں سے نکل گیا اور چندو سائیکل سمیت دھپ سے دوسری طرف جا گرا۔ صابو کمار کی دکان سے، جہاں کئی کسان زمیندار کے ارد گرد اکٹھے ہوئے تھے، ایک ساتھ فضا میں قہقہے بلند ہوئے۔ صابو کمار نے بھی چیخ کر کہا۔ "کل یگ کے شیطان! خوب سزا پائی۔ پچھتر سے کہیں کے بڑی پہیلی توڑ دار مرد۔ یوں تو تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں آئیں گے۔"

چندو کا سر ندامت سے جھک گیا اور نگاہ مجھے سخت سُست کہنے۔ میرا تو خیال تھا کہ اُسے یہ پریشانی میری وجہ سے جوئی ہے۔ اس لئے وہ مجھے گردن سے پکڑ کر نیچے گرا لیگا۔ لیکن اُس نے صرف اسی قدر کہا۔ "احمق! تم بڑے ہی نکمے ہو۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر کھسیانی ہنسی ہنسا اور کہا۔ "دیکھ لیں گے! دنیا کس پر ہنستی ہے۔ مجھ پر یا ان پر۔"

میں نے مستعدی سے کہا۔ "اب کے میں مضبوطی سے پکڑوں گا۔" پھر میں نے گرے ہوئے سائیکل کو اٹھا لیا۔

زمیندار نے کہا۔ "ہاں! تو ڑو ہڈی پسلی۔ موٹر کہیں کے۔"

چندو نے مجھ سے کہا۔ "پرواہ نہ کرو۔ میں انہیں بتا دوں گا۔" میں نے پورے زور سے سائیکل کو پکڑ لیا۔ اور وہ ہمت کر کے گدی پر بیٹھ گیا اور مجھ سے کہا۔ "چھوڑ دو۔"

میں نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اُس نے دائیں پاؤں کے زور سے پیڈل کو دبایا۔ پہیے گھومے ہی تھے کہ چندو کا بوجھ ایک طرف کو جا پڑا۔ گرا ہی چاہتا تھا کہ اس کا پاؤں دوسرے پیڈل پر آ گیا۔ توازن کچھ قائم ہو گیا۔ لیکن جھکاؤ اب کچھ دائیں طرف کو تھا۔ چندو کچھ اس طور سے گدی پہ بیٹھا کہ خوف و ہراس سے دل کانپ اُٹھا۔ لمحے بھر کے لئے وہ ایک طرف کو خطرناک طور سے لڑھک بھی گیا۔ اس کا ہینڈل ڈانواں ڈول ہو گیا۔ اور وہ اب گرا اب گرا۔ اس موقع پہ ہنسی اور ٹھٹھے کی ملی جلی ہوئی آوازیں دکان سے آتی ہوئی سنائی دیں۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ اب کے اپنے اناڑی پن کی وجہ سے ذلیل نہ بھی ہوا تو یہ شور و غل اسے لے ڈوبے گا۔ لیکن کچھ معجزہ ہی ہوا۔ چندو کے پاؤں ٹھیک پیڈلوں پر چلنے لگے۔ ہینڈل کو بھی اُس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اور اس کو بھی کوئی جنبش نہ ہوئی اور آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ میرا گلا "شاباش شاباش" کی پرجوش آواز سے پھٹا جاتا تھا۔

ایک میل تک وہ اسی طرح چلا گیا۔ اور واپسی پر بھی اُس نے ایسا ہی کیا۔

یہ چندو کا ایک نیا کمال تھا۔ اُسے بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ میں چونکہ اُس کی خوشی میں شریک ہونے کا مشتاق تھا۔ لیکن میں دوسرے دن اس سے نہ مل سکا۔ کیونکہ مجھے سیدھے اسکول سے ہی اپنی بچی سے ملنے کے لئے دیر کے بعد جانا پڑا تھا۔

تیسرے دن وہ میرے ہاں آیا اور اُس نے کہا۔ "کل جس مذاق کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ ابھی ابھی تم پہ ظاہر ہو جائے گا۔ میں فوراً ہی اسکے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس سے پوچھتا جاتا تھا۔ "بتاؤ وہ ہے کیا؟"

وہ خود گاؤں کے کمہار کے تنور میں چھپ گیا اور کہنے لگا دیکھو! ساہوکار کی دکان میں جمگھٹا لگا ہوا ہے۔ اسے تم دیکھتے ہو؟ پہچانو تو کون کون ہے؟

میں نے مختلف مورتوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ لمحے بھر کے لئے دماغ کو چکر سا آ گیا۔ میں نے کہا۔ "مجھے تو صرف کسان نظر آتے ہیں۔ جو زمیندار کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اُس نے کہا۔ پھر دیکھو! تم تو احمق ہو۔ زمیندار وہیں ہے۔ وہ دیکھو لمبے لمبے جیڑوں والا۔ اُس کے منہ پہ سفید سفید جھاگ لگا ہوا ہے۔ یہ جھاگ نہیں سفید بال ہیں جو بڑھاپے کی وجہ سے بڑھ آئے ہیں۔ زمیندار اپنی گھنی مونچھوں پہ مہندی لگایا کرتا تھا۔ میں جوں جوں زمیندار مونچھوں اور گردن کے سفید جھاڑی دار بالوں کو دیکھتا تھا۔ حیرانی سی حیرانی ہوتی تھی۔ دفعتہً میرے منہ سے نکل گیا۔ "اہا ہا! بیمار شیر کتنا زیادہ بیمار نظر آتا ہے۔"

چندو نے تنبیہ کے طور سے کہا۔ چپ رہو۔ شور نہ کرو۔ ساہوکار کو تو دیکھو۔ کوڑھی نظر آتا ہے۔ اس کی مونچھیں دیکھو۔ تمباکو کے دھوئیں سے زرد ہو رہی ہیں۔ انہیں کبھی ہیں تراشا کرتا تھا۔ اب تم دوکان کے پاس جاؤ۔ اور وہاں پہنچ کر کہو۔ او دبلاؤ۔ او دبلاؤ۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

میں تحریر چندو کا ایک پرجوش چیلا تھا۔ ذرا بھی تو دیر نہ کی۔ میں نے دکان کے پاس پہنچ کر او دبلاؤ! او دبلاؤ کہا۔ کسان جو زمیندار کے دگر و کھڑے تھے۔ ان کے دل گدگدا رہے تھے۔ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ لیکن پاس ادب کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے۔

ساہوکار نے چلا کر کہا۔ پکڑو اس چھوٹے شیطان کو۔ یہ اُس حجام لڑکے چندو کا ساتھی ہے۔

لیکن میرا تانگہ بڑکے درخت پر چڑھ چکا تھا اور وہاں سے مندر کی دیوار پر کود گیا تھا۔ وہاں میں نے پجاری پر بھی فقرے کسے۔

اس حجام لڑکے کی ستیہ گرہ کی افواہ سارے گاؤں میں پھیل گئی اور گھر گھر بڑے بوڑھوں کی بڑھی ہوئی داڑھیوں کا مذاق اڑنے لگا۔ اونچی ذات کے لوگ یہاں تک کہ خود ان بزرگوں کے گھر کے افراد بھی اس اجنبیت پر ہنس ہنس پڑتے تھے۔ اور ان کی شکل و صورت پر عجیب و غریب خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ جب تک داڑھی موچھ کٹتی رہی نہ مینڈلر کی جوان بیوی خاموش رہی۔ لیکن اب تو اسے کراہت سی ہو گئی تھی۔ اس کراہت کے دُور ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ اب اُس نے کسی جوانمرد کے ساتھ ہم سفر ہونے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ کیوں نہ ہو آخر وہ اپنے میاں سے بیس برس چھوٹی بھی تو تھی۔

چندو ان دنوں بدستور شہر جاتا رہا اور وہاں خوب خوب ہاتھ رنگے۔ ان دنوں چندو کا کام کالج شہر میں خوب چلا اور اُس نے کافی رقم بچالی۔ اپنے لئے نئے نئے کپڑے اور نئے نئے اوزار بھی خرید لئے اور مجھے بھی کئی تحفے لاکر دئے۔

گاؤں والے یہ دھمکی دیتے تھے۔ کہ اُسے بدعنوانیوں کی وجہ سے جیل بھجوا دیں گے اُس کی ماں کو بھی حکم ہلا تھا کہ وہ اُسے ٹھیک راستے پر چلائے ورنہ نقص امن کی پاداش میں اُسے پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔

لیکن چندو کی ماں نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ خوش حالی کا منہ دیکھا تھا۔ وہ اُن کے متعلق جو کچھ خیال رکھتی تھی۔ صاف صاف اُن کے مُنہ پر کہدیا اور اتنا صاف کہ اُس سے پہلے کبھی نہیں کہا تھا۔ گاؤں والوں نے سوچا کہ یوں کام نہ چلے گا۔ ویرکا کے حجام کو بُلا لو۔

چندو کو وہ عام طور سے حجامت کے دو پیسے دیا کرتے تھے۔ ویرکا کے حجام کو دو پیسے کے بجائے ایک آنہ پیش کرنا منظور کیا۔

چندو کے ذہن میں نئے نئے تصورات تھے۔ اتنے نئے کہ پہلے اُسے کبھی سمجھائی نہ دیتے تھے۔ شہر کے حجام نرنجن داس کی دکان کو دیکھ کر اُسے بھی تجویز ہو گئی کہ شروع بازار میں عین شاہراہ پر اپنے چچیرے بھائی اڈھونڈو اور حجاموں کو ساتھ ملا کر دکان کھول لے۔

اس کا چچیرا بھائی وہی "ویرکے" کا حجام تھا۔ اور یہ لوگ گاؤں کے اردگرد کام کیا کرتے تھے۔ ان کے کام کا حلقہ، دائرہ سات میل تک تھا۔ اُس نے اپنی تجویز اپنے چچیرے بھائی ڈھونڈو اور دُوسرے حجاموں کو ذات برادری کا عام جلسہ کر کے بتائی دل اور دماغ کی خوبیوں کے ساتھ قدرت نے اُسے فصاحت کا ملکہ بھی ودیعت کیا تھا۔ اس نے اپنی لسانی سے حاضرین کو یقین دلا دیا۔ کہ اب وقت آگیا ہے۔ کہ یہ امیر و کبیر حجامت بنوانے کے لئے ہمارے ہاں خود چل کر آئیں۔ نہ یہ کہ ہم اپنا ساز و سامان لئے لئے ان کے گھروں کو دھاوا کریں۔

"چندو برادرس ہیئر کٹنگ اینڈ شیونگ سیلون" نے حقیقت میں دنیا کے لئے ایک راستہ تیار کر دیا۔ اور آج تک ہمارے ملک کے مزدوروں کی کئی سرگرم انجمنیں اسی سیلون کا اتباع کرتی ہیں۔

رشید جہاں

نئی مصیبتیں

"لو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ یہ اون کیا بھاؤ ملا تھا؟" اماں نے بھابی صغرا سے پوچھا۔ جو میری چچازاد بھاوج تھیں اور دو سال ہوئے بیوہ ہوگئیں تھیں۔

"شاید بارہ روپئے پاؤنڈ۔ تھا۔ کیوں نہ اماں جان؟ وہ ساس کے لئے اون کھول کر گولے بنا رہی تھیں۔

"اُف اون اس سال کتنے مہنگے ہوگئے ہیں۔ اصغرا کی جٹھانی عطیہ بولیں۔ بچوں کے سب جمپر اُدنچے ہوگئے۔ اب سنڑا برٹ کو اون لاکر دیا ہے کہ ان کے سوئٹر بن دے۔ بڑی مشکل ہے۔"

"آپ کو کیا مشکل بننے گی تو بلے چاری نوس ——" مجھ میں اور بھابی عطیہ میں بالکل نند بھاوجوں کے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں اور برائیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اور موقع پر بغیر چوٹ کئے نہ رہتے تھے۔ بھابی عطیہ کی زندگی میں علاوہ تین بچے پیدا کرنے کے ایک کام اور بھی تھا کہ وہ سال میں دو تین جمپر بافتیں اور بُن لیں۔ اور پھر اس کا چرچا کریں۔

"کیوں کیا میں نہیں بُنتی؟" بھابی عطیہ نے چڑ کر کہا۔ میں جواب دینے کو تھی ہی کہ اماں نے میری طرف گھورا اور زور زور سے باتیں کرنے لگیں تاکہ مجھ کو جواب کا موقع ہی نہ ملے۔ اور بقول اصغرا کے میری اور بھابی عطیہ کی شائستہ لڑائی نہ ہو۔ اماں کو اصغرا نے بھی مدد دی اور کہنے لگیں "سچ تو ہے اون بہت مہنگا ہوگیا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ اور مہنگا ہو میں بھی پہنے کے ایک جمپر کا لے آؤں گی۔"

میری چچی اماں یعنی اصغرا کی ساس آنفش دان کے سامنے اپنی سفید بلی کو گود میں لئے بیٹھی تھیں اور بلی اونگھ رہی تھی۔ ادھر چچی اماں، لیکن نہ معلوم کس طرح اصغرا کی بات سن کر اسی طرح آنکھیں بند کئے کئے بولیں۔ "لاؤ گی کہاں سے؟ آج کل لڑائی کے زمانہ میں اون رانی ہی کہاں ہے جو لے آؤ گی۔"

"ابھی ابھی صبح ہی تو آپ دکان سے لے کر آئی ہیں۔ اور اب کیا دن بھر میں ساری دکانیں خالی ہوگئیں۔" چچا جان بیوی کی بات کو بغیر ٹوکے نہ جانے دیتے تھے۔

(رشید جہاں کا اس سے پہلا افسانہ "روتی" ہے۔ یہ ایک رجحان کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کا فن آپ کو اس افسانے میں شگفتہ ملے گا۔ مرتب)

چچی اماں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

"میں نے کب کہا تھا کہ دکانیں خالی ہو گئیں۔"

"تو پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟" چچا جان نے کافی بگڑ کر کہا یہ کوئی نیا قصہ نہ تھا۔

جب صغرا سہاگن تھیں تب بھی ساس کی فکر تھیں۔ اور اب تو اور بھی زیادہ۔ ان کے اوپر روپے کا خرچ ہونا چچی اماں کو ہمیشہ سے ناگوار رہا تھا۔ اور صغرا چچا جان کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ بیٹے کی موت کے بعد تو وہ ان کو بالکل ہاتھوں پر رکھتے تھے۔

"تو کیا میں جھوٹ کہتی ہوں۔ اون کیا اب کوئی خریدنے کی چیز رہ گئی ہے؟"

"تو پھر آپ نے کیوں خریدا؟ ..... صغرا کل چلنا میرے ساتھ اور جو پسند آئے لے آنا ....."

"اسے ہے ابا جان رہنے بھی دیجئے۔ میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا۔ اماں جان ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ لڑائی کا زمانہ ہے۔ ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے۔"

چچا جان بڑبڑاتے ہوئے کمانے کے لئے تیار ہونے چلے گئے۔ بس اتنا سمجھ میں آیا "خیر رقم مت لینا۔ مجھ کو تو اون چاہئے ..... میں ضرور خریدوں گا ....."

"میری تو ہر بات کو اب یہ الٹ دیتے ہیں ....." لو میں نے کیا غلط کہا تھا کہ اون اب ناپید ہو گیا ہے۔" چچی اماں نے شکایت بھرے لہجہ میں کہا کہ سننے والے کو ترس آ جائے۔ آج ہی صبح میں، بھابی عطیہ، اماں جان، چچی اماں سب مل کر سو روپے سے زیادہ کا اون لے کر آئے تھے۔

"اون ہی پر کیا ہے۔ ہر چیز اسی طرح اجڑ گئی ہے۔" میری اماں نے بات کو رفع دفع کرنے کو کہا۔

"جی ہاں، چچی جان ٹھیک ہے اب جاڑے کے دام ہی دیکھ لیجئے۔ پچھلے سال میں نے ساڑھے تین روپئے گز بہت اچھی بہار جیٹ لی تھی۔ وہ اب پانچ روپے گز بھی نصیب نہیں۔ اب اس دفعہ میں نے اتنے تھوڑے کپڑے مسوری میں بنائے، اب پہننے تک کو بھی نہیں ہیں۔"

"کم از کم آٹھ ساڑیاں تھیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو ملاحظہ فرماؤ۔"

"نوکروں کی وردیاں ہر سال سوا سو اسو میں بن جاتی تھیں۔ ان کو تو عادت ہے اندھا دھند اٹھانے کی۔ نوکروں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سال رہنے دو۔ ابھی تو اچھی خاصی ہیں تو بگڑ گئے۔ کہ میں نوکروں کو گندا نہیں رکھ سکتا۔ کبھی جو کوئی بات سن لیں۔"

چچی اماں نے پھر شکایت کی۔

"اسے ہے یہ تو ان سب بھائیوں میں عجیب ہے کہ صفائی کے نام پر ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔" اماں نے کہا۔

"ہاں بھلا بی بی آج کل یہ خرچ کہاں چل سکتے ہیں۔ اب گھر میں ایک آدمی ایسا تو ہو سب کیوں ایسے ہو جائیں۔" یہ چوٹ بچاری صغرا پر ساس نے کی ..... ہماری چچی بس اپنے اوپر روپیہ خرچ کرنا فضول خرچی نہ سمجھتی تھیں۔ ساٹھ برس کی عمر ہونے پر بھی بہت مشاقین تھیں اور باوجود بے شمار ساڑھیاں ہونے کے صبح ہی دو نئی ساڑھیاں خریدی تھیں۔ مجھ سے چھیڑے بغیر نہ رہا گیا میں نے کہا۔

"چچی اماں آپ جو نئی ساڑھیاں لائی ہیں وہ کتنے کی ہیں؟"

چچی اماں جن کو ابھی تک چچا جان پر غصہ آ رہا تھا۔ کچھ نہ سمجھیں اور بہت سنجیدگی سے کہنے لگیں۔ "کیا بتاؤں بیٹی کریپ ڈیشین کی قیمت تو روپے گز زیادہ ہو گئی۔ ۲۷ روپئے میں وہ ساڑھی ملی۔ لو بھلا اب کوئی کپڑا پہن سکتا ہے۔ اور دوسری تو خیر سو دیشی سلک تھا۔ ۱۷ روپئے میں سستی ہی مل گئی۔ میں کہتی ہوں کہ آج کل تو وہ بازار آ گیا ہے۔ کہ نہ کھانے کا ٹھیک رہا ہے اور نہ پہننے کا۔ بڑی مصیبت کے دن ہیں ..... اور ابھی تو دیکھو کیا کیا ہونے والا ہے ....."

"آپ سچ کہتی ہیں اماں جان!" بجائی عطیہ نے ٹھنڈا سانس لے کر دل دکھا دینے والی آواز میں کہا۔ "یہ موئی لڑائی نہ معلوم کیسی ہے۔ کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی۔ میرا تو سارا آرام و چین اس کمبخت کی نذر ہو گیا ہے.....!"

صغرا میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور پھر منہ دوسری طرف کر لیا۔

"کسی چیز کا ٹھیک ہو ..... پٹرول کے دام ہیں کہ بڑھ کے مول اور پھر بھی ناپید، وہ تو کہو کہ تمہارے بھائی جان کے پاس ٹوٹی ہوئی پرانی شکارکی موٹر پڑی تھی۔ اس جھکیڑے کو پچاس روپے دے کر رجسٹر کروایا تو جا کر دو موٹروں کا تیل چوبیس گیلن نصیب ہوا۔ سچ مچ اس لڑائی میں تو بچھلی سے بھی زیادہ تکلیف اور مصیبت ہے۔" چچی اماں قریب قریب رو دیں۔

ہم نے تو اپنی موٹر بند ہی کر دی ہے۔ مجھ کو تو روز صبح سویرے سیر کرنے کی عادت برسوں سے ہے۔ میری صحت تو جب سے پٹرول کی قلت ہوئی ہے ناس ہی ہو گئی۔" میری اماں نے صاد کی۔

"ہاں یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ یہ پٹرول پر پابندی ہر کار نے کیوں لگا دی۔ اب دام دو روپئے چار آنہ گیلن تھے چلو تین روپے کر دیتی۔ لیکن یہ بارہ اور چودہ گیلن کی قید نہ لگتی جس کے پاس دام ہوتے وہ خرید تا۔ جس کے پاس نہ ہوتے وہ نہ خریدتا۔" بجائی عطیہ نے اس طرح جلی کر کہا۔ جیسے گورنمنٹ کو خاص ان سے دشمنی ہے۔

"پٹرول پر ہی کیا ہے اس لڑائی کی وجہ سے تو ہر چیز پر آفت آئی ہوئی ہے تو بھلا صیب پونے دو روپے سیر ہیں۔ کیا سیب بھی یہ نگوڑے سپاہی لے جاتے ہیں؟" میری اماں نے بہت ہی جلی بھنی آواز میں پوچھا۔

"اور انڈے؟" چچی اماں نے کہا۔ "بارہ آنہ درجن تو ہو گئے۔ اور مرغی وہ بھی اب دو دو روپے تک ہو گئی۔ کوئی کھائے تو کیا کھائے۔ اور تو اور آج تمہارے سامنے ساری دکانیں دیکھ لیں۔ پرونس (PRUNES) کہیں ملے ہی نہیں۔ بلا سے، پچھلے مہینے میں بیس روپیہ میں سات سیر کا ٹین مل تو گیا تھا۔ اب وہ بھی نہیں..... فروٹ سلیٹ بغیر پرونس کے بچے تو چکھنے بھی نہیں....."

"جی ہاں گھر والوں کی بڑی مصیبت ہے۔" عطیہ نے ساس کے ساتھ ہمدردی کی۔ "واللہ تو بر بر بھی کہتا آتا ہے کہ دادی اماں کا خانساماں ہی اچھے چیز اسٹیکس (CHEES STAKES) بناتا ہے۔ ہمارے خانساماں سے بھی اچھے....."

"لے لو تم میں کیا کروں دو لعنت کو گنگ چیز (COOKING CHEES) تو ایسا غائب ہوا ہے کہ اب دکھ کی بھی نہیں دیتا۔ ہر اسم کی دکان پر گئی، اور کہا کہ بھئی سونے کے مول ہی دے دو۔ ہمارے بچے کا دل بہت چاہ رہا ہے لیکن وہ کہیں ہو تو ملے۔"

"ایک تکلیف ہو تو ذکر کیا جائے۔" اماں نے ہاں میں ہاں ملا دی۔

"لے ہے یہ ساری آگ ایک دم کہاں غائب ہو گئی۔" بجائی عطیہ نے سٹپٹا کر کے ایک دم سے کہا۔

"لے سچ تو ہے۔ اس کمبخت واجد نے تو ٹکڑی پوری ڈالی اور نہ ہیرا اب تک لگایا۔ ارجمند زدا اس گھنٹی کا بٹن دبانا..... چار تو ہیرا ہیں اور پھر بھی بیٹھے سردی میں سکڑا کر دے۔ بوا آج کل تو کوئلہ بھی دو آنے سے دو روپے ہو گیا۔ بجلی کی سستی رہتی ہے۔ سالے وہ تو کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔"

پھر مجھ سے کہا۔ "ذرا صغرا تم جا کر دیکھو تو یہ سب لوگ کہاں غائب ہو گئے۔ تمہاری جھٹائی کو سردی لگ رہی ہے۔" ..... صغرا دوڑ کر چھوٹے صاحب اور بہو بیگم کو بھی لے آئیں۔ "بجائی عطیہ۔ میں بھی آتی ہوں۔" کہہ کر ان کے پیچھے بھاگی۔

"دیکھو گرم کپڑے میں ..... جانا۔ ٹھنڈ میں نہ جانا۔" اماں کی آواز میرے کان میں آتی ہی رہی کہ میں اور بجائی برآمدے سے ہو کر باہر آنگن میں باہر ہوا اتنی تیز اور ٹھنڈی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم کے آر پار ہو رہی ہے۔ بجائی نے باہر نکل کر "واجد! واجد!" کہہ کر آواز دی۔ اور کوئی جواب نہ آیا تو بولیں

"چارا سروی کے مارے پلنگ میں گھس گیا ہوگا۔ جانتا ہے کہ کھانے میں ابھی آدھا گھنٹہ ہے۔" وہ شاگرد پیشہ کی طرف بڑھیں۔ تھوڑی دور چل کر نیم کے درخت کے نیچے ایک الاؤ نظر آیا۔ اور ہم شاگرد پیشہ میں جب داخل ہوئے تو وہاں پنچایت جڑی ہوئی تھی۔ مالن مع اپنے تین چار بچوں کے بیٹھی تھی۔ دھوبن بھی مع اپنی فوج کے جمی ہوئی تھی۔ واجد اور دوسرے خدمت گار بھی وہاں موجود تھے۔ مہتر بھی ایک کونہ میں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی دھوبن چیخی: "لے چھوٹی دولھن ذرا ادھر آنا۔"

چھوٹی دولھن ذرا جھک کر آگ تاپنے لگیں۔ سب مرد فوکر کھڑے ہو گئے۔

"کیوں کیا ہے؟" صغرا نے پوچھا۔

"لے دولھن! یہ لڑائی کب تک چلے گی؟"

"بہت دن..... کیوں؟"

"ہے رام!..... سچی؟"

ہاں ہاں سچ ہے۔ ابھی بہت دن چلے گی۔" صغرا نے لاپروائی سے کہا۔

"ہم لوگ کیسے جئیں گے؟"

"پرسوں تک تو آٹا چھ سیر کا تھا آج تین سیر کا ہے۔"

"تین سیر کا تو گیہوں ہے۔" ایک مزدور فوکر نے اطلاع دی۔

"لے بیٹا سچ بتاؤ۔ یہ بتا کب ختم ہوگی؟ ہمارا اور ہمرے بچن کا پیٹ کیسے بھرے گا؟" مالن میری طرف مخاطب ہوئی۔

"سچا بھی تو آٹھ سیر کا ہے!"

"دولھن تم تو ہر بات میں مذاق کرتی ہو سچی بتاؤ اخبار میں کیا لکھا ہے؟" دھوبن نے بھابی کی طرف بہت سنجیدگی سے دیکھا۔

"ارے بھئی کہہ تو رہی ہوں۔ میرا یقین نہیں تو ان سے پوچھ لو۔" سب نے اُمید بھری نظر میری طرف پھیری۔ جب میں چپ رہی تو دھوبن بولی۔

"دولھن! تمیا جا کہت رہیں کہ فوکروں کی چھٹنی ہوگی؟ کا یہ ٹھیک ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔"

واجد ہیٹر لگانے چلا گیا۔ میں اور بھابی وہیں الاؤ پر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ جب کھانے کی گھنٹی بجی تو ہم گھر کی طرف چلے۔

راستے میں بھابی نے دیکھا کہ میں کچھ گرم کپڑے انہیں پہنے تھی ——————— بولیں "اوئی! ارجمند تم بھی خدا کی قسم ایک چلتی پھرتی آفت ہو۔ بیمار پڑ گئیں تو ایک اور نئی مصیبت آ جائے گی....."

میں ابھی تک نوکروں کے پریشان چہروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے "اوہ" کہہ دوسرے کر بولی: "یہ اوہ کیا آپ نے خوب کہی۔"

بھابی ہنسیں: "اور نہیں تو کیا۔ بھابی حقیقی کی بجائے جیٹھ مہنگی پڑ گئی۔ یہ کم مصیبت ہے۔ تمہاری اماں کی ہوا خوری کم ہو گئی۔ یہ کچھ کم مصیبت ہے۔ اور ہماری ساس بے چاری کی مصیبتوں کا شمار ہی نہیں۔ نہ کہ کنگ چیز ہی جاتا ہے اور نہ پروسنی ..... اور اگر اس پر تمہیں نمونیا ہو گیا؟"

محمد حسن عسکری

حرام جادی

دروازہ کی دھڑ دھڑاہٹ اور کواڑ کھولو کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں اس طرح گونجیں جیسے گہرے تاریک کنوئیں میں ڈول کے گرنے کی طویل، کراہتی ہوئی آواز۔ اس کی پرخواب اور نیم رضامند آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں لیکن دوسرے لمحہ ہی سناٹے اندھیرے کے ہلکے ہلکے اجالے میں ملی ہوئی مرمر جیسی سیاہی اس کے پپوٹوں میں بھرنے لگی اور وہ پھر بند ہو گئیں۔ آنکھوں کے پردے پر بیل کمبلوں کی طرح نیچے لٹک گئے اور ڈولوں کو دبا دبا کر ملانے لگے۔ لیکن کان آنکھوں کی ہم آہنگی چھوڑ کر بھنبھنا رہے تھے۔ وہ اس سحر خیز حملہ آور کی تازہ یورش کے خلاف اپنے روزن بند کر لینا چاہتے تھے ——— اور پھر بھی وہ بھنبھنا رہے تھے۔

امید و بیم کی یہ کشمکش جسے نیند شاید جلد ہی اپنے دھارے میں غرق کر لیتی زیادہ دیر جاری نہ رہی۔ اب کے تو دروازہ کی چولیں تک ہلی جا رہی تھیں اور آوازیں زیادہ بے صبر، بے تاب، کرخت اور بھرائے ہوئے گلے سے نکل رہی تھیں "کھولو ——— کھولو" یہ آوازیں پتلی، لوک دار نیلیوں کی طرح دماغ میں گھس کر نیند کے پردوں کو تار تار کئے دے رہی تھیں۔ وہ یہ بھی سن رہی تھی کہ پکارنے والا کھولو۔ کھولو کے وقفے کے درمیان آہستہ سے ناخوشگوار ارادوں کا اٹھا دبھی کر دیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کوئی شخص اسے سٹرک کے ڈھیلوں کو استعمال کرنے کی ترغیب دے رہا تھا..... آخر اس نے آنکھیں پوری کھول ہی دیں اور ہاتھوں کو چارپائی پر جھٹکتے ہوئے کہا "نصیبن دیکھو تو کون ہے؟"

یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی جب سے وہ اس قصبہ میں مدوائف ہو کر آئی تھی یہ سب کچھ روز ہوتا تھا ——— یہی چیخیں، یہی دھڑ دھڑاہٹ فرض اور آرام کی یہی تلخ کشمکش یہی جھلاہٹ اور پسپائی ——— سب اسی طرح، اسے صبح ہی اٹھ کر جانا پڑتا تھا اور پھر اس کا سارا دن زچاؤں کو اسپتال جانہ پہنچتے چلاتے، ہاتھ پاؤں پھینکتے دنیا میں آتے ہوئے دیکھنے میں کچھ دن آئے ہڑوں کی رفتار ترقی کے معائنہ میں اور آدھ وقت کے اندراج کے لئے ٹاؤن ہال کے دفتر تک بار بار دوڑنے میں گزرتا تھا۔ اسے دوپہر کو کھانا کھانے اور آرام کرنے کا وقت بھی ہزار کھینچ تان کے بعد ملتا تھا، اور وہ بھی یقینی نہ تھا کیونکہ بچے پیدا ہونے میں موقع و محل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ صبح چار بجے، دوپہر کے بارہ بجے، رات کے دو بجے ——— ہر گھنٹہ ہر گھڑی اسے کورنداکی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا اور بچے تھے کہ ایسی تیزی سے چلے آرہے تھے

جیسے پہاڑی ندی میں لڑھکتے ہوئے پتھر، ضبطِ تولید کے چرچے دولت نگر کو شہر سے ملانے والی کچی اور گڑھوں والی سڑک کو ملے نہ کر سکے تھے اور اگر بفرضِ محال وہ رینگتے ہوئے وہاں تک پہنچ بھی جاتے تو یہ یقینی بات تھی کہ قصبے والے انہیں ذرا بھی قابلِ اعتنا نہ سمجھتے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں انسان کا کیا دخل۔ ۱۸ سالہ لڑکے ۵۶ سالہ بڈھے، الھڑ لڑکیاں، ادھیڑ عورتیں، سب کے سب حیرت انگیز تن دہی اور یک جہتی کے ساتھ سڑکوں کی نالیوں میں کھیلنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ کئے چلے جا رہے تھے۔ گویا وہ قومی دفاع کی خاطر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ہیں اور پھر وہ بچارے کرتے بھی کیا۔ وہ تو خدا کے حکم سے بے بس تھے۔ غرضیکہ بچے پلے آ رہے تھے۔ کالے بچے، پیلے بچے، پرچھوئے مرغ کی طرح سُرخ بچے اور کبھی کبھی گورے بچے، دُبلے پتلے، ہڈیوں کا ڈھانچہ یا بعض موٹے تازے بچے، مڑے ہوئے بالوں والے چپٹی ناک والے، چمچہ زدہ کی طرح لگلگے، لکڑی جیسے سخت، ہر رنگ اور ہر قسم کے بچے۔

اجیلی نے اپنی دادی سے سُنا تھا کہ ان کے بچپن میں ایک مرتبہ پاؤ پاؤ بھر کے ہیضہ برسے تھے۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی ——— اور اس وقت اسے بے ساختہ ہنسی بھی آ جاتی تھی ——— کہ یہ بچے وہی برسنے والے ہیضہ ہیں۔ پاؤ پاؤ بھر کے زرد زرد ہیضہ۔

اور اسے انہی زرد ہیضوں کی بارش کے ہر قطرہ کو برستے ہوئے دیکھنے کے لئے قصبے کی ٹوٹی پھوٹی روڑوں کی سڑکوں، تنگ و تاریک، سیلی ہوئی گلیوں، گرد و غبار، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں، بھونکتے ہوئے لال پیلے کتوں اور کسانوں کی گاڑیوں اور گھاس والیوں سے ٹھنسے ہوئے بازاروں میں مارا مارا دن گھومنا پڑتا تھا۔ پتلی پتلی سڑکوں پر دونوں طرف ریت کا حاشیہ ضرور بنا ہوتا تھا اور پھر نالیاں تو بیشک سڑکوں کے بیچوں بیچ بہتی تھیں جن کی سیاہی کسی گنوار کے بہے ہوئے کاجل کی طرح سڑک کا کافی حصہ غصب کئے رہتی تھی۔ صفائی کے بھنگی نالیوں کی گندگی سمیٹ سمیٹ کر سڑک پر پھیلا دیتے تھے جس سے اپنی ساڑھی کو محفوظ رکھنے کے لئے اجیلی کو ہلکے ہلکے فیروزی سینڈل کے بجائے اونچی ایڑی والا جوتا پہننا پڑتا تھا۔ گو اس صورت میں سڑک کے اُبھرے ہوئے تعداد کنکر اس کے پیروں کو کڑکڑا دیتے تھے۔ راستہ میں ننگی ٹانگوں اور کبڈی کھیلنے والے لونڈوں کا لاابالی پن اس کے کپڑوں پر ہر دفعہ اپنا نشان چھوڑ جاتا تھا۔ مگر خیر شکر تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی آنکھیں اور دانت سلامت لے آتی تھی اور یہاں کی گرمی! اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یقیناً پسینوں میں نہا کر ختم ہو جائے گی۔ ان تنگ سڑکوں پر بھی سورج اس تیزی سے جگتا تھا کہ اس کے بدن پر چنگاریاں ناچنے لگتیں اور اس کی نیلے پھولوں والی چھتری محض ایک بوجھ بن جاتی۔ جب وہ اپنی اونچی ایڑیوں پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی، دھوپ میں جلتی جھلستی سڑکوں پر سے گزرتی تو اسے دور آ لحاف گانے کی آواز، ڈھول کی کھٹ کھٹ اور درخت کے نیچے تاش کی بازیوں کے بلند اور کرخت قہقہے دوپہر کی نیند حرام کر دینے والی بوجھل مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح بیزار کن اور پراسرار معلوم ہوتے اور وہ چار مہینے پہلے چھوڑے ہوئے شہر کا خیال کرنے لگتی۔ مگر شہر اس وقت خوابوں کی وہ سرزمین بن جاتا ہے جسے صبح اٹھ کر ہزار کوششوں کے باوجود یاد نہیں کیا جا سکتا اور جس کی لطافت کا یقین دن بھر دل کو بے چین کئے رکھتا ہے۔ اسے کچھ روشنی سی معلوم ہوتی ——— ایک چمک، ایک کشادگی، ایک پہنائی ——— کچھ فریالی اس کے سامنے تیرتی..... اور وہ پھر اسی تپتی ہوئی کنکروں، نالیوں اور ریت والی سڑک پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی چل رہی ہوتی۔ بجلی کے پنکھے والے کمرے کا تصور تک اس تپش اور سوزش کو کم کرنے میں اس کی مدد نہ کرتا تھا۔ لیکن ہاں! جب کبھی وہ خوش قسمتی سے رات کو فارغ ہوتی اور اسے اپنے بستر پر کچھ دیر جاگنے کا موقع مل جاتا تو اس وقت شہر کی زندگی کی تصویریں، سنیما کے پردے کی طرح پوری طرح روشنی اور صفائی کے ساتھ اس کی نظروں کے سامنے گذرنے لگتیں اور وہ جس تصویر کو جتنا دیر چاہتی ٹھہرا لیتی۔ لیکن جب وہ ان تصویروں سے لطف اٹھانے کے درمیان ان مناظر کو یاد کرنے جس سے اسے ہر وقت دوچار رہنا پڑتا تھا تو اس کی خستگی اور بیزاری آہستہ آہستہ عود کر آتی۔ گھر کی دیواریں صبح رات کی تابجیوں کے اس پر جھک پڑتیں۔ دل بیٹھنے لگتا، سانس گرم اور دشوار ہو جاتا اور اس کا سر گھنی کھا کھا کر نیند کی بے ہوشی میں غرق ہو جاتا اور وہ خواب میں دیکھتی کہ وہ پھر اسی شہر کے اسپتال میں پہنچ گئی ہے، مگر ان در و دیوار سے بجائے رفاقت کے کچھ بیگانگی سی ٹپکتی ہے اور خود اس کے اعضاء منجمد اور ناقابلِ حرکت ہو گئے ہیں اور کوئی نامعلوم خوف اس کے دل پر مسلط۔ وہ صبح تک یہی خواب تین چار مرتبہ دیکھتی،

اور دراصل اس کے لئے ان زندگیوں کا تقابل ہونا بھی چاہئے تھا۔ ایسے ہی اثرات پیدا کرنے والا، مانا کہ شہر میں بھی ایسی ہی ملی جلی گلیاں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، گرد و غبار، شریر لڑکے موجود تھے اور وہ ان کے وجود سے بے خبر نہ تھی لیکن وہ تو ہوا کی چڑیلوں کی طرح ان سب سے بے پروا، مطمئن تانگے کے گدّوں پر جھولتی ہوئی ان اطراف سے کبھی دسویں پندرھویں نکل جایا کرتی تھی۔ اس کی دنیا تو ان علاقوں سے دور ضلع کے صدر ہسپتال میں تھی۔ کتنی کھلی ہوئی جگہ تھی وہ، اور وہاں کی ہوا کا لطف تو ساری عمر نہ بھول سکے گی۔ اسپتال کی سامنے تارکول کی چوڑی سڑک تھی جس پر دن میں دو مرتبہ جھاڑو دی جاتی تھی اور جو ہمیشہ شیشے کی طرح چمکا کرتی تھی۔ جب وہ اپنی ہیلی ڈینک کے ساتھ اس پر ٹہلنے کے لئے نکلتی تھی تو دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور میدانوں پر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چہرے اور آنکھوں پر لگ کر دماغ کو ہلکا کر دیتے تھے۔ اس کی ساڑھی پھڑ پھڑانے لگتی، ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ بار بار تیرتی اور اس کی رفتار سبک اور تیز ہو جاتی۔ ایسے وقت باتیں کرنا کتنا خوشگوار اور پُرلطف ہوتا تھا۔ گرد و غبار کا تو یہاں نام بھی نہ تھا۔ ممی جون کے جھگڑے بھی اسپتال کی سفید اور شیشوں والی عمارتوں پر سے سنسناتے ہوئے شہر کی طرف گذرتے چلے جاتے تھے اور بجلی کے پنکھے سے سرد رہنے والے کمرہ میں دوپہر کی سختی اور اداسی اپنا سایہ تک نہ ڈال سکتی تھی۔ جب وہ پُروقار انداز سے ساڑھی کا پلّہ سنبھالے گذرتی تھی تو اسپتال کے نوکر چاروں طرف سے اسے "میم صاحب کہہ کر سلام کرنے لگتے تھے۔ گو یہاں بھی اسے سب لوگ میم صاحب ہی کہتے تھے۔ سڑکوں پر بھاڑ جھینے والے بھنگی اسے آتے دیکھ کر تھم جاتے تھے۔ بلکہ قصبہ کے زمیندار تک اسے "آپ" سے مخاطب کرتے تھے۔ مگر پھر بھی یہاں وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ رعب، وہ دبدبہ، وہ مالکانہ احساس۔ وہاں تو اس کی شخصیت اسپتال کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اس سفید، سرد اور متین عمارت اور اس کے غیر مرئی مگر اٹل قانونوں اور اصولوں کا ایک زندہ مجسمہ۔ اسپتال کے نشتر کے سامنے آنے کے بعد کوئی شخص احتجاجانہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح اس کی حدود میں داخل ہونے والی ہر چیز کو اس کی مرضی کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ جب اس کا مریضوں کے معائنہ کا وقت آتا تھا تو وارڈ میں پہلے ہی سے تیاریاں ہونے لگتی تھیں۔ وہ دور دور سے روزانہ کرایہ دینے والیوں تک کو جھڑک دیتی تھی کیونکہ اسے اپنے صاف کمروں میں پان کی پیک تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔ وہ بڑی بڑی نازک مزاجوں کو ذرا سی بے احتیاطی اور ہدایات کی خلاف ورزی پر بے طرح ڈانٹتی تھی اور ہمیشہ سب سے تم کہہ کر بولتی تھی۔ مگر یہاں کی عورتیں تو بہت ہی منہ پھٹ تھیں۔ وہ اس سے ہراساں اور خوف زدہ نہ ضرور تھیں مگر اسے دو بدو جواب دینے سے نہ چوکتی تھیں۔ تھوڑے دن تک ان پر اپنا اختیار جمانے کی کوشش کرنے کے بعد اب وہ تھک چکی تھی اور ان کی باتوں میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی اور صفائی اور سلیقہ کی نوان عورتوں کو ہر اتک نہ لگی تھی۔ زچہ کو گرمی میں بھی فوراً ایک کمرہ میں بند کر دیا جاتا تھا جس میں جاڑوں کے لحاف بچھونے، چادروں اور دوسری جنسوں کے ملکے، ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، برتن، کپڑوں کا گٹھڑ، سوت اور روئی کی گٹھڑیاں، سب اٹم غلم بھرے ہوتے تھے اور ایک انگیٹھی پر گھٹی چڑھا دی جاتی تھی۔ بعض بعض جگہ تو جلدی جلدی کمرہ میں گوبری ہونے لگتی تھی جو پیروں سے اکھڑا اکھڑا کر فرش کو چلنے کے قابل بھی نہ رہنے دیتی تھی اور جس کی سیلن انگیٹھی کی گرمی سے مل کر سانس لینا دشوار کر دیتی تھی۔ گھر کی سب عورتیں ——— اور وہ کم سے کم چار ہوتی تھیں، اپنے بدبودار کپڑوں سمیت کمرے میں گھس آتی تھیں اور گھبراہٹ میں سارے سامان کو ایسا الٹ پلٹ کر دیتی تھیں کہ ذرا سی گنجائش نہ ملتی تھی۔ اندر کی کھسر پھسر، کھڑ بڑ، کراہوں "یا اللہ یا اللہ" اور عورتوں کے بار بار کواڑ کھول کر اندر باہر آنے جانے سے گھر کے بچے جاگ جاتے تھے، اور اپنے آپ کو اماں کے قریب نہ پا کر چیخنا شروع کر دیتے تھے اور ان کی بڑی بہنیں چمکار چمکار کر اور تھپک تھپک کر انہیں بہلانے کی کوشش کرتی تھیں "اوے چپ چپ ..... دیکھ بھیا آیا ہے ..... صبح کو دیکھیو ..... تمّا سا بھیا" مگر صبح کو تمّا سا بھیا دیکھ سکنے کی امید انہیں اس وقت تک کوئی تسکین نہ دے سکتی اور ان کی رونی رونی دھاڑوں کی شکل میں تبدیل ہو کر کمرہ کے خلفشار میں اور اضافہ کر دیتی۔ یہ تو غیر جو کچھ تھا سو تھا، کثیف بستروں پر لیپ پڑے ہوئے تکیوں، پسینے میں سڑے ہوئے کپڑوں اور مدتوں سے نہ دھلے ہوئے بالوں کی بدبو سے جسے گرمی اور بھی دو آتشہ کر دیتی تھی، اس کا جی الٹنے لگتا تھا۔ وہ تمام وقت ہر چیز سے دامن بچاتی ہوئی کھڑی کھڑی پھرتی تھی۔ اس کمرہ میں ایک گھنٹہ گذارنا گویا جہنم کے

عذابوں کے لئے تیاری کرنا تھا یہ مانا کہ خود اسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ قصبہ کی عورتیں اپنے آپ کو نئے نئے انگریزی تجربوں کے لئے پیش کرنے اور اپنے آپ کو ایک اجنبی اور عیسائی مڈوائف کے، جو ان دیکھے اور مشتبہ آلات سے مسلح تھی" ہاتھوں میں دے دینے کے لئے قطعاً تیار نہ تھیں انہیں تو قصبہ کی پرانی دائی اور پھیلے ہوئے گھڑے کے بیشکروں پر ہی اعتماد تھا تاہم ان کے مردوں نے ٹاؤن ایریا سے ڈر کر انہیں اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ نئی عیسائی مڈوائف کی کمرے میں موجودگی برداشت کر لیں۔ اس طرح عملی حیثیت سے تو اس کا کام بہت کم ہو گیا تھا لیکن آخر زچہ ماری تو اس کی ہی تھی اور وہی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے سامنے ہر بھائی بھلائی کے لئے جواب دہ تھی اور اس زچہ ماری سے عہدہ برآ ہونا ہواؤں سے لڑنا تھا۔ اکثر زچہ نار لڑکیاں اتنا چیختی چلاتیں اور ہاتھ پیر پھینکتی تھیں کہ انہیں قابو میں کرنا دوبھر ہو جاتا تھا یا پھر ایسی سہم جاتی تھیں کہ وہ ڈر کے مارے زرا سی حرکت نہ کرتی تھیں۔ تین تین چار چار بچوں کی مائیں تو اور بھی آفت تھیں۔ وہ اپنے تجربوں کے سامنے اس ساڑھی پہن کر باہر گھومنے والی عیسائی عورت کی ذرا سی ہدایتوں کو کوئی وقعت دینے پر تیار نہ تھیں۔ وہ اپنی آنکھوں کے درمیان بھی رُک کر دائی کو مشورہ دینے لگتی تھیں اور ایملی کو دانتوں سے ہونٹ چبا چبا کر خاموش رہ جانا پڑتا تھا اور دائی تو بھلا اس کی کہاں سننے والی تھی۔ اسے اپنی برتری اور مڈوائف کی نااہلیت کا یقین تو خیر تھا ہی مگر اس کی موجودگی سے اپنی آمدنی پر اثر پڑتا دیکھ کر اس نے ایملی کی ہر بات کی تردید کرنا اپنا فرض بنا لیا تھا۔ گو ایملی نے اس کے طنزیہ جملوں کو پینے کی عادت ڈال لی تھی لیکن اس کا دل کوئی پتھر کا تھوڑے ہی تھا۔ دائی کے طرزِ عمل کو دیکھ دیکھ کر دوسری عورتیں بھی دلیر ہو گئی تھیں۔ اس کی طرف توجہ کئے بغیر ہی وہ پلنگ کو گھیر لیتی تھیں اور وہ سب سے پیچھے چھوڑ دی جاتی تھی۔ اب اس کے سوا کیا رہ جاتا تھا کہ وہ جھنجلا جھنجلا کر پیر پٹخے اور انہیں پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

ان سب آزمائشوں سے گزرنے کے بعد اسے ہر بار اندراج کے لئے ٹاؤن ایریا کے دفتر جانا پڑتا تھا۔ اسے دیکھ کر بخشی جی کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور ان کے پان میں سنے ہوئے کالے دانت تیز مسخرانہ انداز میں ان کی چھوٹی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں سے باہر نکل آتے اور وہ اس کی طرف کرسی کھسکاتے ہوئے کہتے "کہو میم صاحب! لڑکا کہ لڑکی؟" مونچھوں کے ان گھنے کالے بالوں کی قربت اسے ہراساں کر دیتی اور اسے ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے ان بالوں میں یکایک بجلی کی لہر دوڑ جائے گی اور وہ سیدھے ہو کر اس کے چہرہ سے آ ٹکریں گے۔ وہ نفرت اور خوف سے پیچھے ہٹ جاتی اور بخشی جی سے نظریں بچاتی ہوئی جلد سے جلد اپنا کام ختم کرنے کی کوشش کرتی۔

یہ سارے مرحلے طے کرتی ہوئی وہ عموماً آٹھ نو بجے رات کو کھلی ہوا میں اپنے گھر پہنچتی تھی۔ جب پیر کہیں سے کہیں پڑ رہے ہوں، سر پھٹا یا ہوا ہو، جب جسم کا کوئی بھی عضو ایک دوسرے کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہو، تو بھلا بھوک کیا خاک لگ سکتی ہے۔ وہ جوتا کھول کر پیر سے کرنے میں اچھال دیتی اور کپڑے اس طرح جھنجلا جھنجلا کر اتارتی کہ دوسرے دن نصیبن کو انہیں دھوبی کے یہاں استری کرانے لے جانا پڑتا۔ الٹا سیدھا کھانا حلق کے نیچے اتار کر وہ بستر پر گر پڑتی۔ تکیے پر سر رکھتے ہی دیواریں، پیڑ، ساری دنیا اس کے گرد تیزی سے گھومنے لگتے۔ بھیجا دھڑ دھڑا دھڑ دھڑا کر کھوپڑی میں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا۔ سر تکیے میں گھسا جاتا مگر کیا اسے اوپر اچھالا معلوم ہوتا۔ بازو شل ہو جاتے، ہتھیلیوں میں سیسہ سا بھر جاتا اور ہاتھ اوپر نہ اٹھ سکتے۔ اسی طرح ٹانگیں بھی حرکت سے انکار کر دیتیں اور کمر تو بالکل پتھر بن جاتی۔ وہ اپنے پرانے اسپتال کو یاد کرنا چاہتی، مگر وہ کسی چیز کو بھی پوری طرح یاد نہ کر سکتی ——— کھڑکی کا کواڑ، مریضوں کی آہنی چارپائی کا پایہ، موڑ کے پیپے، نیم کے پیڑ کی چوٹی، پان میں سنے ہوئے کالے دانت اور گھنی سخت مونچھیں، یہ سب باری باری بجلی کے کوندے کی طرح سامنے آتے اور آنکھ جھپکتے میں غائب ہو جاتے وہ کھڑکی کے کواڑ میں ایک کمرہ جوڑنا چاہتی۔ مگر اس میں زیادہ سے زیادہ ایک چٹخنی کا اضافہ کر سکتی بلکہ بعض اوقات آہنی چارپائی کا ایک پایہ تو ایک کھونٹی کی طرح اس کے دماغ میں گڑ جاتا اور کوشش کے باوجود بھی اس سے مس نہ ہوتا، نیم کی چوٹی کو کبھی تنا حاصل نہ ہو سکتا..... پھر نیم کی ہری ہری چوٹی پر ایک ریت کے حاشیہ والی نالی بہنے لگتی اور کھڑکی کے شیشے پر پان میں سنے ہوئے کالے دانت مسکراتے اور گھنے سخت بالوں والی مونچھیں بیتابی سے

ہلتیں ..... مختلف شکلیں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جاتیں اور دماغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لڑتی جھگڑتی، ٹکراتی، روندتی، روندتی ..... سیاہ آسمان پر روشن اَن گنت تاروں کے گچھے کے گچھے بھنگوں کی طرح آنکھوں میں گھس گھس کر ناچنے لگتے اور جلتی ہوئی آنکھیں کنپٹیوں کی خواب آور بھنبھناہٹ سے آہستہ آہستہ بند ہو جاتیں ..... سونے کے بعد ان شکلوں کے اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے جو باری باری آتے اور اس کے دماغ پر مسلط ہو جانا چاہتے۔ اتنے ہی میں ایک دوسرا آ پہنچتا اور پہلے والے کو دھکے دے کر باہر نکال دیتا۔ ابھی یہ کشمکش ختم بھی نہ ہوتی کہ ایک تیسرا آ دھمکتا۔ ان سب کی مرغیانہ زور آزمائیاں اسے بار بار چونکا دیتیں اور وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھیں کھول دیتی ..... پھر آنکھوں میں تاروں کے گچھے بھرنے لگتے ..... کہیں صبح کے قریب جا کر یہ شکلیں تھکتیں اور اپنی رزم گاہ سے رخصت ہوتیں تو ہلکی ہلکی ہوا بھی چلنی شروع ہو جاتی اور اعلیٰ نیند میں بالکل بیہوش ہو جاتی مگر اس کی نیند پوری ہونے سے پہلے "کواز کھولو" کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں گونجتیں ——— وہی چیخیں، وہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی وہی تلخ کشمکش، وہی جھلاہٹ اور پسپائی۔

نصیبن باہر سے لوٹ آئی تھی۔ اسے شیخ صفدر علی کے ہاں بلایا گیا تھا اور پکانے والے نے بار بار کہا تھا "جلدی ——— بلایا ہے ——— جلدی ——— " ہر ایک یہی کہتا ہوا آتا ہے جلدی ——— آخر وہ کیوں جلدی کرے؟ کیا وہ ان کی نوکر ہے یا وہ اسے دولت بخش دیتے ہیں۔ ہونہہ ——— جلدی! وہ نہ پہنچے گی تو کیا سب مر جائیں گے؟ اور پھر وہ کریں گے ہی کیا اسے بلا کر؟ ——— کہتی ہیں چڑیلیں! اسے کیا خاک آتا ہے ——— " کیا خاک آتا ہے ——— کچھ نہیں آتا ——— اچھا پھر؟ بیٹھیں اپنے گھر، کون ان کی خوشامد کرنے جاتا ہے ——— کچھ نہیں آتا! جیسے جیسے آلے اس نے دیکھے ہیں ان لوگوں کے تو خواب و خیال میں بھی نہ گذرے ہوں گے ——— چمکدار، تیز، ہاتھی دانت کے دستے والے ——— اور وہ ڈاکٹر کارٹ فیلڈ کے لیکچر، وہ نقشے دکھا دکھا کر جسم کے حصوں کو سمجھاتی تھیں ——— کچھ نہیں آتا ——— ہونہہ!

اعلیٰ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ کہلا دے وہ جلدی نہیں آ سکتی۔ وہ بالکل نہیں آئے گی۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ یہ لوگ محض جاہل ہی تو ہیں۔ ان کے کہنے سے اس کا بگڑنا کیا ہے اور آخر ذمہ داری تو خود اس کی ہی ہے۔ چنانچہ اس نے نصیبن سے کہا "کہہ دو کہ چلو میں آ رہی ہوں" مطمئن ہو کر اس نے کروٹ لے لی۔ سر کو تکیے پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آنکھیں بند کر لیں، ایک بازو بستر کی ٹھنڈی چادر پر پھیلا دیا، اور ہاتھ چہرے پر رکھ لیا۔ اس نے چاہا کہ دماغ کو بالکل خالی کر لے اور ساکت ہو جائے مگر اس کے دل کی کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کانوں میں بج رہی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد یکایک ایک پتھر سا دماغ میں آ کر لگتا تھا "جلدی ——— " جس سے اس کے ماتھے اور کنپٹیوں کی نسیں تن جاتی تھیں اور ٹوٹتی ہوئی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ اسے جلدی جانا تھا ——— جلدی ..... اور اسی بات کے تو وہ ٹاؤن ایریا کمیٹی سے تیس روپے ماہوار پاتی تھی۔ جلدی جانا تھا ..... لیکن آخر وہ فرض پر صحت کو تو نہیں قربان کر سکتی تھی۔ کل رات ہی اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ انسان ہی تو تھی نہ کہ مشین ——— اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے، کمر بیٹھی جا رہی ہے، کندھے اور ٹانگیں بے جان ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اتنی جلدی اٹھ جانا بہت مضر ہوگا، اور خصوصاً اس قصبہ جیسی آب و ہوا میں جہاں اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ابھی آخر چار مہینے میں اسے چار دن بخار آ چکا تھا ——— اور پھر وہ وہاں جا کر بنا ہی کیا لے گی، ان لوگوں کو ایسی کیا خاص ضرورت ہے اس کی ——— تھوڑا سا اور سو لینا ہی بہتر ہوگا۔

وہ سو جاتی مگر انگلیوں کے بیچ میں ہو کر صبح کی روشنی آ رہی تھی اور اس کی آنکھوں کو بند نہ ہونے دیتی تھی۔ اس نے ہاتھ آنکھوں پر کس کا لیا اور آنکھیں خوب بھینچ کر بند کر لیں۔ اب اسے جھپکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ مگر ہر دفعہ "دودھ لو، دودھ" "ابے او کلو کے بیٹے" "اُٹھ! ہٹ! ابے پڑھنے نہیں جانے کا؟" کی صداؤں اور نصیبن کے لکڑیاں توڑنے اور دیگچیاں اٹھانے کی آوازوں سے وہ چونک پڑتی تھی۔ سونے کی کوشش کرتے کرتے

اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ سر میں درد ہونے لگا اور ماتھا جلنے لگا۔ وہ مایوس ہو کر سیدھی لیٹ گئی اور آنکھوں پر دونوں بازو رکھ لئے۔ اب اس کے اعضاء اور بھی بوجھل اور ناقابلِ حرکت ہو گئے اور وہ ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں ——— "جلدی بلایا ہے۔" اس صبح کے چاند نے اس قصبہ پر دانت پیسنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسی چادر اوڑھ لے جو اس کو ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں "جلدی بلایا ہے۔" اس صبح کے چاند نے، اس قصبے، سب سے چھپا لے، جس کے نیچے ان میں سے کسی کی بھی پہنچ نہ ہو، جہاں وہ ان سب سے ——— اپنے آپ سے غافل ہو جائے ——— اپنے کو کھو دے ..... اسے محسوس ہوا کہ وہ مضبوط اور مدت کے آشنا بازو اس کے جسم کا حلقہ کئے بھینچ رہے ہیں ..... سر کے درد کو گویا یکایک کسی نے پکڑ لیا ..... وہ آنکھیں بھی ذرا کچھ دور ہو گئیں، مسکراتی ہوئی معلوم ہوئیں اور اس نے اپنے آپ کو ان بازوؤں کی گرفت میں چھوڑ دیا ..... جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا تھا۔ سر ہلکے ہلکے جھولے کھاتا موجوں پر بہا چلا جا رہا تھا۔ سکون تھا، خاموشی تھی اور صرف دل کے مسرت سے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی ..... وہ بازو اس کے جسم کو بھینچ رہے تھے۔ وہ مضبوط اور مدت کے آشنا بازو .....

اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ صبح کے چاند نے میں چمک آ گئی تھی۔ نصیمن نے چولہے پر دیگچی رکھی۔ بکری والا محلہ سے جانے کے لئے بکریاں جمع کر رہا تھا اور کنویں کی گراری زور زور سے چل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اوپر اٹھیں اور ہر اس کسی چیز کو تلاش کرنے لگیں ..... وہ باداہی سائے اترنے لگے۔ آنکھوں کے پردے پھڑکے اور پلکیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے مل گئیں ——— گویا وہ ان سایوں کو پھنسا لینا چاہتی ہیں ..... سائے کچھ دور پر رک گئے، وہ ڈگمگائے اور دھندلے ہوتے ہوتے ہوا میں تحلیل ہو گئے ..... آنکھیں صبح بے رنگ آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی گردن ڈھلک گئی اور بازو دونوں طرف گر پڑے ..... وہ مدت کے آشنا بازو ..... مگر وہ یہاں کہاں!

چند لمحے بے حس پڑے رہنے کے بعد وہ نصیمن کو یاد کرنے لگی۔ لمبے لمبے پیچھے اٹکے ہوئے بال، چوڑا سینہ، سرخ ڈوروں والی جلد جلد پلٹتی ہوئی آنکھیں، موٹا سا نچلا ہونٹ، کان کی لو نک کٹی ہوئی قلمیں، سانولے رنگ پر منڈی ہوئی داڑھی کا گہرا نشان، آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیاں اور مضبوط بازو ..... دن میں کتنی کتنی مرتبہ اس کے بازو اسے بھینچتے تھے اور ان کے درمیان وہ بالکل بے بس ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ تو گھبرا بھی پڑتی تھی مگر اس کے جواب میں اس کا پیار اور بڑھ جاتا تھا ..... اور اس کے دونوں گالوں پر وہ گرم اور نم آلود بوسے ..... اور دن میں کتنی کتنی مرتبہ اس کے منہ سے شراب کی تیز بدبو تو ضرور آتی تھی۔ مگر وہ کیسے جوش سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتا تھا، اور پاگلوں کی طرح اس کے چہرے ہاتھوں، گردن، سینے سب پر بوسے رے ڈالتا تھا اور پھر قہقہے مار مار کر ہنستا تھا: ..... میری جان ..... ہا ہا ہا ..... اے مئی لی .... ڈی یر ..... پیاری پیاری ..... ہا ہا ہا ——— " اور وہ اس کی کیسی نگہداشت کرتا تھا۔ وہ اس سے اپنے بازوؤں میں پوچھتا: "اس مہینے میں کیسی ساڑھی لاؤ گی، میری جان؟ ..... ہیں؟ ..... اس مہینے پر تو شرخ کھلے گی! کہو، کیسی رہی؟ ہا ہا ہا ——— " اور وہ اسے دوپہر میں کو کبھی نہ نکلنے دیتا تھا۔ اگر اسے ایسے وقت اسپتال سے بلا بھیجا جاتا تو وہ کہلوا دیتا کہ مسز وسمین سو رہی ہیں اور وہ اس کے اٹھنے سے پہلے چائے تیار کرا کے اپنے آپ اس کے قریب میز پر لا رکھتا تھا اور وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا مگر وہ یہاں کہاں! ——— اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا۔ وہ یہاں ہوتا تو وہ خود کہیں نہ جاتی۔ وہ تو ایسے کو اڑ پیٹ کر جگانے والے کا سر توڑ دیتا ——— لیکن وہ یہاں ہوتا ——— وہ اس کے پاس ہوتا تو وہ خود یہاں کیوں ہوتی۔

لیکن ——— کچھ دوسری شکلیں ابھریں ——— اچھا ہی ہے کہ وہ اس کے پاس نہیں ہے ——— اس کے بال الجھے ہوئے اور پریشان تھے، اور وہ اس طرح دانتوں سے ہونٹ چبا رہا تھا گویا ان کا قیمہ کر کے رکھ دے گا اور اس نے اسے کیسی بے رحمی سے بید سے پیٹا تھا ..... اور لے گی ..... بڑی بہن کے آئی ہے وہاں سے وہ ..... " اگر میم صاحب شور سن کر نہ آ جاتیں تو نہ معلوم وہ ابھی اور کتنا مارتا ——— ایملی اپنے بازوؤں پر نشان ڈھونڈنے لگی ——— ایسے ظالم سے تو پٹنا راہی اچھا ——— کیسی خونی آنکھیں، اور آخر میں وہ شراب کتنی

پینے لگا تھا ——— مگر وہ ہوتا تو اسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا ——— مانگ کر روزا کے ساتھ رات کو بڑی دیر ٹہلتا رہتا تھا۔ لیکن ظاہر تو اس کے ساتھ اس کا برتاؤ ویسا ہی رہا تھا ——— اگر وہ خود اتنا نہ بگڑتی اور اسے اٹھتے بیٹھتے طعنے نہ دیتی تو شاید بات یہاں تک نہ پہنچتی ——— وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا ——— لیکن وہ بے مزہ پڑیاں لگی ہوئی، سوکھی جیسے لکڑی ہو ——— اور فراک پہننے کا بڑا شوق تھا آپ کو، بڑی میم صاحب بنتی تھیں۔ چار حرف انگریزی کے آگئے تھے تو زمین پر قدم نہ رکھتی تھی مارے شیخی کے ——— نہ معلوم ایسی کیا چیز لگی ہوئی تھی۔ اس میں جو وہ ایسا لٹو ہو گیا تھا ——— اس نے خواہ مخواہ فکر کی۔ وہ خود اسے تھک کر چھوڑ دیتا ——— وہ اسے تھوڑے دن یونہی چلنے دیتی تو کیا تھا ——— مگر اس نے کیسی بے رحمی سے اسے مارا تھا ——— ہاں ——— ایک دفعہ مار ہی لیا تو کیا ہو گیا۔ وہ خود بھی شرمندہ معلوم ہوتا تھا اور اس کے سامنے نہ آتا تھا ——— اور اگر ڈینا اسے اتنا نہ بہکاتی تو وہ شاید طلاق بھی نہ لیتی۔ بس وہ اپنا ذرا مزاج لینے کو اسے اکساتی رہی ——— یہ اچھی دوستی ہے ——— اب وہ ڈینا سے نہیں بولے گی، اور اگر وہ ملے گی بھی تو وہ منہ پھیر کر دوسری طرف چل دے گی اور جو ڈینا اس سے بولی تو وہ صاف کہہ دے گی کہ وہ دھوکا دینے والوں سے نہیں بولنا چاہتی ——— ڈینا بگڑ جائے گی تو بگڑا کرے۔ اب وہ شہر کے اسپتال سے چلی ہی آئی، اب کوئی روز کا کام کاج تو ہے نہیں کہ بولنا ہی پڑے.....

وہ اسی طرح ڈینا کی مکاری پر پیچ و تاب کھاتی رہتی، اگر نصیبن اسے نہ پکارتی "ابھی میم صاحب اٹھو، سورج نکل آیا" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور چاروں طرف دیکھا اب تو واقعی اسے چلنا چاہئے تھا مگر پھر بھی پلنگ سے نیچے اترنے سے پہلے اس نے کئی مرتبہ انگڑائیاں لیں اور نکیہ پر سر رگڑا۔ وہ منہ دھو کر جانے کے انتظار میں پھر پلنگ پر آ بیٹھی۔ نصیبن لکڑیوں کو چولھے میں ٹھیک کرتی ہوئی بولی "وہ مُنیا ین کہہ رہی تھیں کہ تمہاری میم صاحب تو عید کا چاند ہو گئیں۔ کبھی آ کے بھی نہیں جھانکتی..... ابھی ہو ہی آؤ ان کی طرف میم صاحب کسی دن، بڑا یاد کریں ہیں تمہیں ا"

ہو ہی آئے ان کی طرف ——— کیا کرے وہ جا کر میلے کچیلے پلنگوں پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ ٹوٹے ٹاٹ ——— یہاں کی عورتوں سے وہ کیا باتیں کرے؟ بس انہیں تو قصے سناتے جاؤ کہ اس کے بچہ مرا ہوا پیدا ہوا۔ اس کو اتنی تکلیف ہوئی۔ اس کو ایسی بیماری تھی۔ وہ کہاں تک لائے ایسے قصے سنانے کو، اور کوئی بات تو جیسے آتی ہی نہیں انہیں..... اور پھر یہ لوگ کتنی بدتمیز ہیں۔ سڑے ہوئے کپڑے لے کر سر پر چڑھی جاتی ہیں..... اسے ان لوگوں کے ہاتھ کا پان کھاتے ہوئے کتنی گھن آتی ہے مگر مجبوراً کھانا ہی پڑتا ہے..... جب وہ اس سے باتیں کرتی ہیں تو ہلکے ہلکے مسکراتی جاتی ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہوں..... کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اور سارے گھر کو دیکھتی جاتی ہیں گویا وہ چور ہے اور ان کی آنکھ بچتے ہی کوئی چیز اڑا دے گی ——— یہ اس سے سب عورتیں جھجکتی کیوں ہیں؟ کیا وہ ان کی طرح عورت نہیں ہے؟ یا وہ کوئی ہوا ہے ——— عجب بے وقوف ہیں یہ عورتیں ——— اور ہاں جب وہ ان کے ہاں جاتی ہے تو ان کے اشارے سے جوان لڑکیاں جلدی جلدی بھاگ کر کمرے میں چھپ جاتی ہیں۔ وہ اندر سے جھانک جھانک کر اسے دیکھتی ہیں اور اگر کہیں اس کی نظر پڑ جائے تو وہ فوراً ہٹ جاتی ہیں اور اندر سے ہنسنے کی آواز آتی ہے اور اگر انہیں اس کے سامنے آنا ہی پڑ جائے تو وہ بدن چرائی ہوئی اوپر سے نیچے تک خوب دوپٹہ تانے ہوئے آتی ہیں جیسے اس کی نظر ان میں سے کچھ چھٹا لے گی یا اس کی نگاہ پڑ جانے سے ان میں کوئی گندگی لگ جائے گی ——— ان کی یہ حرکت اسے بالکل ناپسند ہے۔ کیا انہیں اس پر اعتماد نہیں، اور وہ اس پر شک کرتی ہیں ——— ؟ اس سے تو ان کے ہاں نہ جانا ہی اچھا ——— بیٹھیں اپنی لڑکیوں کو لے کے اپنے گھر میں ——— اور وہ گندے بچے، مٹی میں سنے، ناک بہتی، آدھے ننگے، پیٹ نکلا ہوا، وہ سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسے ایسے غور سے دیکھتے رہتے ہیں، جیسے وہ دنیا کا کوئی عجیب و غریب جانور ہے ——— اور جب وہ ان سے بولتی ہے تو وہ سیدھے باہر بھاگ جاتے ہیں ——— وحشی ہیں بالکل، جانور..... بالکل ——— اور یہ خوب ہے کہ اس کے پہنچتے ہی وہاں جھاڑو شروع ہو جاتی ہے۔ مارے گرد کے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذرا خیال نہیں تندرستی کا انہیں، اور کوئی کیوں ان کے ہاں جا کر

بیماری مول لے اور ان کے مرد کتنی شرم آتی ہے اسے ان حرکتوں سے۔ وہ ہمیشہ ڈیوڑھی میں راستہ گھیرے بیٹھے رہتے ہیں اور جب تک وہ بالکل قریب نہ پہنچ جائے نہیں ہٹتے ——— "ارے حقہ ہٹاؤ، حقہ ہٹاؤ" اٹھتے اٹھتے ہی اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہے ——— جان کے کرتے ہوں گے یہ ایسی باتیں ——— تاکہ کھڑی رہے وہ تھوڑی دیر وہاں ——— اور جب وہ اندر پہنچ جاتی ہے تو اسے قہقہوں کی آواز آتی ہے۔ عجب بدتمیز ہیں ——— انگریزوں کے ہاں کتنی عزت ہوتی ہے عورتوں کی۔ وہ بڈھے پادری صاحب جو آیا کرتے تھے۔ بہت اچھے آدمی تھے بیچارے، ہر ایک سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے تھے، بلکہ اسے تو وہ پہچان گئے تھے ——— سب مل کر بیا کرتے تھے اتوار کو گرجا۔ وہ خود، ڈینا، کٹی، میری، شیلا اور ہاں مرتی ——— مسز جیمس کا کتنا مذاق اڑاتے تھے سب مل کر۔ سب سے پیچھے چلتی تھیں، چھتری ہاتھ میں لئے ہانپتی ہوئی اور ان میں تھا ہی کیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچ تھیں بس ——— اور گرجا سے لوٹتے ہوئے تو اور بھی مزا آتا تھا سب چلتے تھے، آپس میں ہنستے، مذاق کرتے ——— افوہ، شیلا کس قدر ہنسوڑ تھی، کیسے کیسے منہ بناتی تھی۔ جب ہنسنے پر آتی تھی تو رکنے کا نام نہ لیتی تھی ——— مگر یہاں وہ سب باتیں کہاں ——— اب تو جیسے وہ آدمیوں میں رہتی ہی نہیں ——— اور واقعی کیا آدمی ہیں یہاں والے؟ اول تو اسے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ ہر وقت پاؤں میں چکر رہتا ہے، اور پھر ایسوں سے کوئی کیا ملے؟ ——— جیسے جانور ——— نہ کوئی بات کرنے کو، نہ کوئی ذرا ہنسنے بولنے کو، بس آؤ اور پڑ رہو ——— لے دے کے رہ گئی نصیبن، تو اسے اس کے سوا کوئی بات ہی نہیں آتی کہ اس کا بیٹا بھاگ گیا، اس کی اپنے میاں سے لڑائی ہو گئی۔ اس کے یہاں برات بڑی دھوم دھام سے آئی ——— اسے کیا ان باتوں سے ہوا کرے، اس سے مطلب؟ ——— یا بہت ہوا تو اسے خواہ مخواہ ڈراتی رہے گی چوروں کے قصے سنا سنا کر ——— ایک دفعہ اس نے سنایا تھا کہ ایک دوسرے قصبے کی مڈوائف کو کچھ لوگ کیسے بہکا کر لے گئے تھے اور اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا ——— بکتی ہے بھلا کہیں یوں بھی ہوا ہے۔ لیکن اگر کہیں اس کے ساتھ ——— مگر نہیں، بیکار کا ڈر ہے۔ جو یوں ہوا کرے تو لوگ گھر سے نکلنا چھوڑ دیں ——— بھلا نیا کا کام کیسے چلے ——— پاگل ہے بڑھیا، بہکا دیا ہے کسی نے اسے ——— مگر ایسی جگہ کا کیا اعتبار، نہ معلوم کیا ہو گیا نہ ہو۔ کوئی ساتھ بھی تو نہیں ——— اگر وہ مڈوائف نہ بنتی تو اچھا تھا اور وہ تو خود ٹیچر بننا چاہتی تھی بلکہ پاپا بھی یہی چاہتے تھے مگر ماما ہی کسی طرح راضی نہ ہوئیں ——— کتنے دن ہو گئے پاپا کو بھی مرے ہوئے ——— بارہ سال، کتنا زمانہ گزر گیا اور معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو ——— کتنا پیار کرتے تھے وہ اسے ——— روز اسکول پہنچانے جاتے تھے ساتھ ——— کلاس میں اس کی سیٹ بیز کے پاس تھی ——— اور وہ انگریزی کے ماسٹر صاحب بہت اچھے آدمی تھے ——— بچارے، چاہے وہ کام کر کے نہ لے جائے، مگر کبھی کچھ نہیں کہتے تھے ——— اور لڑکے تو نہ جانے اسے کیا سمجھتے تھے۔ سارے اسکول میں وہ اکیلی ہی لڑکی تھی نا، سب کے سب ماسٹر صاحب کی نظریں بچا بچا کر اس کی طرف دیکھتے رہتے تھے ——— ارے وہ موٹا کرم چند، بھلا وہ بھی تو اس کی طرف دیکھتا تھا جیسے وہ بڑا خوبصورت سمجھتی تھی اسے ——— اور ہاں وہ عظیم! بڑا بھولا تھا بچارا، سوکھا سا زرد، مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اس کی۔ دیکھتا تو وہ بھی رہتا تھا اس کی طرف، مگر جب کبھی وہ اسے دیکھ لیتی تھی تو وہ فوراً شرما کر نظریں نیچی کر لیتا تھا اور رومال نکال کر منہ پونچھنے لگتا تھا ——— اور اس دن وہ دل میں کتنا ہنسی تھی۔ اس دن وہ اتفاق سے جلدی آ گئی تھی۔ برآمدے میں دوسری طرف وہ آ رہا تھا، جب وہ قریب آیا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور کچھ کہنے لگا، ڈرتے ڈرتے عظیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر جلدی سے چھوڑ دیا، اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر وہ خود کتنا پریشان ہو گیا تھا، اور اس نے بہت گڑگڑا کر کہا تھا "کہئے گا نہیں" وہ کتنے دن اس بات کو یاد کر کے ہنستی رہی تھی ——— کتنا سیدھا تھا واقعی وہ ——— وہ ابھی اسکول ہی میں رہتی تو کتنا مزا رہتا ——— مگر ——— وہ زمانہ تو اب گیا ——— اب تو وہ یہاں دنیا سے الگ پڑی ہے۔ کوئی بات تک کرنے کو نہیں ——— کسی کا

خط بھی تو نہیں آتا۔ وہ روزنامہ ڈاکیئے سے پوچھتی ہے کہ اس کا کوئی خط تو نہیں مگر ——— روز جواب وہی "نہیں" ——— اور جو آیا بھی تو بس وہی لمبے بادامی لفافے ——— آن ہز میجسٹیز سروس ——— ڈسٹرکٹ ایجنٹ آفیسر کی ہدایتیں، یوں کرو اور دوں کرو۔ کوئی اس کی مانے بھی جو وہ یوں کرے ——— خواہ مخواہ کی آفت ——— اور پھر خط آئے بھی کہاں سے؟ ——— اگر آنٹی ہی دلی سے خط بھیج دیا کریں تو کیا ہے ——— مگر وہ تو برسوں بھی خبر نہیں لیتیں ——— ایک دفعہ جانا چاہئے اسے دلی ——— اچھا شہر ہے ——— کیا چوڑی سڑکیں ہیں ——— اور سنیما کس کثرت سے ہیں ——— اور وہ ——— وہ خبر ہے ہی ——— مگر وہ ———

کائیں، کائیں، کائیں نے اسے چونکا دیا۔ دھوپ آدھی دیوار تک اتر آئی تھی، کوا زور زور سے چیخ رہا تھا اور وہ بستر پر پیر نیچے لٹکائے بیٹھی تھی۔ اسے جلدی جانا تھا اور اس نے بیکار بیٹھے بیٹھے اتنی دیر لگا دی تھی۔ وہ نصیبن پر اپنا غصہ اتارنے لگی کہ اس نے چائے کیتلی نہیں لاکر رکھی مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ میم صاحب سو رہی ہیں اور واقعی، اس نے خیال کیا۔ اس سے تو وہ اتنی دیر سو ہی لیتی، تو اچھا تھا۔ بہرحال اس نے نصیبن سے جلدی چائے لانے کو کہا۔

اس نے دوبارہ منہ دھویا اور الٹی سیدھی چائے پینے کے بعد وہ کپڑے بدلنے چلی۔ ٹرنک کھول کر وہ سوچنے لگی کہ کونسی ساڑھی پہنے ——— سفید، سرخ کناروں والی۔ مگر کیا روز روز ایک ہی رنگ ——— اور پھر سفید ساڑھی میلی کتنی جلدی ہوتی ہے اس کی بہار تو بس ایک دن ہے۔ اگلے دن کام کی نہیں رہتی ——— نیلی ساڑھی نیچے سے چمک رہی تھی ——— اسے ہی کیوں نہ پہنے؟ ——— مگر اسے نیلی ساڑھی پہنے دیکھ کر تو لوگ اور بھی باؤلے ہو جائیں گے ——— وہ جدھر سے نکلتی ہے سب کے سب اسے گھورنے لگتے ہیں۔ اسے بڑی بری معلوم ہوتی ہے ان کی یہ عادت ——— اور ان زمینداروں کو دیکھو، بڑے شریف بنتے ہیں؟ ——— خیر یہ تو جو کچھ ہے سو ہے، جب وہ آگے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہنستے ہیں ——— اور طرح طرح کے آوازے کستے ہیں ——— "کہو یار!" ——— "لے مجید ذرا لیجو!" ——— کوئی کھانسنے لگتا ہے کیا وہ سمجھتی نہیں ——— ذرا شہر میں کہہ کے دیکھتے ایسی باتیں ——— وہ مزا چکھا دیتی انہیں ——— مگر یہاں وہ کیا کرے، مجبور ہو جاتی ہے ——— ان کی ہی وجہ سے تو اس نے رنگدار ساڑھیاں چھوڑ دیں اور سفید پہننے لگی، مگر پھر بھی نہیں مانتے ——— اب اگر آج وہ نیلی ساڑھی پہن کر جائے گی تو نہ معلوم کیا کیا کریں گے ——— تو پھر سفید ہی پہن لے ——— مگر روز روز سفید اور کیا، وہ کوئی ان سے ڈرتی ہے۔ ہنستے ہیں تو ہنسا کریں، کوئی اسے کھا تھوڑی لیں گے، بھلا کیا بگاڑ سکتے ہیں وہ اس کا؟ ——— اب وہ پھر رنگدار ساڑھیاں پہنا کرے گی ——— دیکھیں وہ اس کا کیا بناتے ہیں ——— ہنسیں گے تو ضرور ——— مگر اس سے ہرتا ہی کیا ہے ——— آج وہ ضرور نیلی ساڑھی پہنے گی!

نیلی ساڑھی پہن کر اس نے بال بنانے کے لئے آئینہ سامنے رکھا۔ کہ خرابی سے اس کی آنکھیں لال اور کچھ سوجی ہوئی سی تھیں۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اٹھا کر آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی ——— مگر یہ اس کا رنگ کیوں خراب ہوتا چلا جا رہا تھا اور کھال بھی کھردری ہو چلی تھی۔ جب وہ لڑکی تھی تو اس کے چہرے پر کتنی چمک تھی ——— رنگ سانولا تھا تو کیا، چمکدار تو تھا ——— اس کی آنٹی ہمیشہ ماما سے کہا کرتی تھیں "نہیں بیٹی اچھی ملی ہے ——— مگر اب ———

اس نے آئینہ رکھ دیا اور اپنے جسم کو اوپر سے نیچے تک ایسی حسرت سے دیکھنے لگی جیسے مورا اپنے پیروں کو ——— اس کے بازوؤں کا گوشت لٹک آیا ہے اور ٹھوڑی بھی موٹی ہو گئی ہے اور ہاتھ اب کتنے سخت ہیں۔ بال بھی سوکھے سوکھے اور ہلکے رہ گئے ہیں، اور تیزی تو اس میں بالکل نہیں رہی ہے۔ پہلے وہ کتنا کتنا دوڑتی بھاگتی تھی اور پھر بھی نہ تھکتی تھی۔ مگر اب تو تھوڑی ہی دیر میں اس کی کمر ٹوٹنے لگتی ہے۔

اس نے ایک لمبی سی انگڑائی اور پھر ایک گہرا سانس لیا۔ بے رونق چہرے اور پتلے بازوؤں نے نیلی ساڑھی کا رنگ اڑا دیا تھا۔ اس نے

بال ایسی بے دلی سے بنائے کہ بہت سے تو ادھر اُدھر اڑتے رہ گئے۔ بال بن چکے تھے مگر وہ برابر آئینے کو تک جا رہی تھی اور اس کا دماغ سمٹ کر آنکھوں کے پپوٹوں میں آگیا تھا جن میں ایک ہی جگہ ٹھہرے ٹھہرے مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔

جب اس نے آئینہ رکھا تو اسے میز کے کونے پر ریوالور کے قریب بائیبل رکھی نظر آئی۔ یہ بچپن میں سالگرہ کے موقع پر اس کے پاپا نے اسے دی تھی۔ مدتوں سے اس نے اسے کھولا تک نہ تھا اور وہ گرد سے اٹی پڑی تھی۔ اس کتاب نے اسے پھر پاپا کی یاد دلادی اور وہ اسے اٹھانے پر مجبور ہوگئی پہلے ہی صفحہ پر اس کا نام لکھا تھا۔ لیکن اب اس کی روشنائی بہت پھیکی پڑ چکی تھی۔ یہ اس نے پانچویں کلاس میں لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے ہنسی آئی کہ وہ اس وقت کیسے ٹیڑھے میڑھے حرف بنایا کرتی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس زمانہ میں اس کے پاس ہرا قلم تھا۔ اس کا ارادہ ہوا کہ اب کے جب وہ شہر جائے گی تو ایک ہرا قلم ضرور خریدے گی مگر اسے خیال آیا کہ آخر وہ قلم لے کر کرے گی ہی کیا۔ اب اسے کون سا بڑا لکھنا پڑھنا رہتا ہے۔

اس کے پاپا اسے بائیبل پڑھنے کی کتنی ہدایت کیا کرتے تھے۔ اسے اپنی بے پروائی پر شرم سی محسوس ہوئی اور وہ بائیبل کے ورق الٹنے لگی

——— پیدائش ——— خروج ——— ورق تیزی سے الٹے جانے لگے ——— استثنا ——— روت ——— یرمیاہ ——— جنوری ———

متی ——— لوقا ——— رسولوں کے اعمال ——— کہاں سے پڑھے ——— آدم ——— نوح ——— طوفان ——— ابراہیم ——— کشتی ——— صلیب

——— مسیح ——— یسوع را جا آمد ——— گرجا کا گھنٹہ ——— سب مل کر گرجا جاتے تھے، ہنستے، مذاق کرتے ———

آخر وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سی جگہ سے پڑھے اور اسے جلدی جانا تھا، اتنا وقت بھی نہیں تھا لیکن اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اب روز مسیح کو بائیبل پڑھا کرے گی ورنہ کم سے کم اتوار کو ضرور ——— لیکن دعا تو مانگ ہی لینی چاہئے ——— بہت ہی بری بات ہے ماما کبھی بغیر دعا مانگے نہیں سونے دیتی تھیں ——— اور پھر اس میں وقت بھی کچھ نہیں لگتا، اور لگے بھی تو کیا ہے دنیا کے دھندے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اس نے دماغ کو ساکن بنانا چاہا اور آنکھیں بند کر لیں مگر باوجود اس کے آنکھیں پٹ پٹانے سے پہلے تو اس کی ماما اس کی آنکھوں میں گھس آئیں اور پھر پاپا اور ان کے پیچھے پیچھے گرجا کی سڑک، گھنٹہ اور سب مل کر گرجا جایا کرتے تھے۔ ہنستے، مذاق کرتے۔ اس نے آنکھیں کھول کر سر کو اس طرح جھٹک دیئے گویا ان سب کو اپنی آنکھوں میں سے جھاڑ رہی ہے ——— آخر دماغ بالکل خالی ہوگیا، اور خاموش۔ صرف کانوں اور سر میں مل کے دھڑکنے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور دعا کو دہرانی چلی گئی۔ "اے میرے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قصوروں کو معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قصوروں کو معاف کرتے ہیں۔ کیونکہ قدرت جلال ابد تک تیرا ہی ہو۔ آمین!"

آنکھیں کھولنے پر اس نے کچھ اطمینان سا محسوس کیا اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگی اس نے پھر آئینہ میں جھانکا اور چاہا کہ کسی خاص چیز کے لئے دعا مانگے۔ لیکن کیا چیز؟ کوئی ——— اس کا تبادلہ شہر میں ہو جائے ——— مگر وہاں اسے پھر وہی کام کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے تو یہ قصبہ ہی بہتر ہے ——— پھر اور کیا؟ ——— وہ ایک کہانی تھی کہ ایک بڑھی نے ایک آدمی سے تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا ——— پھر آخر کیا؟ ———

اس نے بہت باندھے۔ مگر کوئی بات یاد نہ آئی۔ اسے دیر ہو رہی تھی اس لئے اس نے اپنی دعاؤں اور خواہشوں کو چھوڑ دیا اور چھتری اٹھا کر چل پڑی۔

سڑک پر پہنچ کر اس پر محض ایک جلدی پہنچنے کا خیال غالب تھا۔ صبح کی اس تمام کاہلی اور سستی کے بعد اسے اعضا کو حرکت دینے میں فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ سورج کی ہلکی سی گرمی اور چلنے سے اس کے خون کی حرکت تیز ہوگئی تھی اور وہ سڑک کی نالی، ریت کنکروں سب سے بے پروا اپنا راستہ طے کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اگر اسے اپنی رفتار میں کبھی کچھ سستی معلوم ہوتی تو وہ اور قدم بڑھانے کی کوشش کرتی۔ سڑک پر کھیلنے والے لڑکے ابھی تک

نہ نکلے تھے اس لئے اسے اپنی آنکھ ناک کی حفاظت کی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ دیواروں کے سایہ میں سے گذرتی تو اس کے پیر اور بھی تیز اٹھنے لگتے تھے۔

وہ جلدی ہی بازار میں پہنچ گئی۔ شیخ صفدر علی کا مکان اب تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا اور اطمینان سا ہو گیا تھا کہ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ اس کی نظر ایک دکان دار پر پڑی۔ وہ اپنے سامنے والے کو آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ کیا یہ اسے دیکھ رہا تھا؟ ممکن ہے وہ پہلے سے کسی بات پر ہنس رہے ہوں، اور اسے دیر بھی ہو گئی تھی ——— وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ آواز آئی۔ "آج تو آسمان نیلا ہے بھئی ..... بڑے دن میں ایسا ہوا ہے آج" ——— اس نے چاہا پلٹ کر چھتری رسید کرے اس بدتمیز کے ..... چاہے کچھ ہو آج وہ کھڑی ہو جائے اور صاف صاف کہہ دے کہ وہ ان لوگوں کی باتیں اچھی طرح سمجھتی ہے، اور اب وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتی ——— آخر کہاں تک؟ ——— پیر من من بھر کے ہو گئے تھے اور ٹانگیں تھرتھرا رہی تھیں جس سے وہ کئی دفعہ چلتے چلتے ڈگمگا گئی ——— مگر ان آنکھوں نے جو اب ہر طرف سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اسے رکنے نہ دیا۔ وہ اپنی ساڑھی میں کچھ سکڑ سی گئی۔ اس نے پلّو اچھی طرح سینے پر کھینچ لیا اور سر جھکا کر قدموں کو سڑک پر سے اکھاڑنے لگی .....

جب وہ شیخ صفدر علی کے مکان پر پہنچی تو وہ ڈیوڑھی میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے، اور ایسے شکایت آمیز لہجے میں جیسے اس نے کوئی نایاب موقع ہاتھ سے نکل جانے دیا تھا جس پر شیخ جی کو اس سے ہمدردی تھی، بولے:

"اخاہ میم صاحب! بڑی ہی دیر کر دی تم نے تو!"

"جی ..... ہاں ..... وہ ذرا دیر ہو گئی" کہتی ہوئی وہ زنانہ کی طرف بڑھی۔ جب وہ دروازہ پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ قصبہ کی پرانی دائی بائیں ہاتھ پر کپڑے اٹھائے اور داہنے ہاتھ میں لوٹا ہلاتی صحن سے گذر رہی ہے۔ یہ کہتی ہوئی "جرا دیکھو تو ..... ابھی تک نہ نکلی گھر سے حرام جادی!"

عزیز احمد

زرّیں تاج

جیپ بہر حال دغا دینے پر تُلی ہوئی تھی۔ ہر دس دس گز پر رُک رُک جاتی۔ بچارا موٹا ڈرائیور محنت کرتے کرتے ہانپتے ہانپتے عاجز آچکا تھا۔ ارشد نے حسین چاندنی رات کی طرف دیکھا۔ یہ خوبصورت سڑک، اس پر بکھری ہوئی چاندنی، کناروں پر یہ اونچے اونچے درخت۔ کتنی محنت سے یہ سڑک تیار ہوئی تھی۔ اور آج جنگ کا پہلا دن تھا۔ بھلا جنگ کو اور جیپ کی اس مسلسل سکرات کو چاندنی رات اور ان حسین درختوں اور اس دوشیزہ سڑک سے کیا واسطہ تھا؟

موٹا ڈرائیور شیخ احمد بڑے کمالات کا آئینہ تھا۔ ایک چھوٹی سی گلی ڈریفیج کے سلسلے میں کئی فٹ کھدی ہوئی تھی۔ اور کنارے سے موٹر تو کیا آدمی بھی بڑی مشکل سے جا سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے ارشد سے پوچھا تھا "سر کار گلی بالکل کھدی ہوئی ہے۔ پھر کیا حکم ہوتا ہے۔ گاڑی کو لے چلوں۔" آج انجن کے پیچھے اس کے ہانپ ہانپ جانے پر ارشد کو ترس آرہا تھا اور غصہ بھی۔ دور پر کوئی ریل گاڑی کھڑ کھڑ کرتی گذر جاتی لیکن ہر طرف سناٹا تھا۔ دور دور کسی آدمی کا سراغ نہیں، کوئی گھر نہیں۔ مذاق تو نہیں تھا۔ آج جنگ کا پہلا دن تھا۔ سب جگہ بلیک آؤٹ تھی۔ لیکن چاند نے اپنا ٹھنڈا سا چراغ آسمان پر جلا رکھا تھا۔ اور سوئی ہوئی زمین پر انسان یا سنہرے خواب دیکھ رہے تھے یا ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں اسی روشنی سے مدد لے رہے تھے۔ یہ عجیب طرح کی ٹھنڈی روشنی ہے، چاند کی روشنی جس سے دو طرح کے جنوں کی قندیلیں جلتی ہیں جنگ کے جنون کی اور عشق کے جنون کی۔

اتنے میں اوپر سے خُرخُراہٹ کی آواز آئی۔ ارشد نے اپنے دل میں کہا ——— امجد بھائی نے آج دعوت کے لئے گیا چھاون چُنا تھا۔ . . . چاندنی میں سڑک کے کنارے کے حسین درخت جیپ کو چھپا نہیں سکتے تھے۔ اور اگر کہیں یہ بدشکل سا کپڑا اوپر سے ہوا باز کو نظر آگیا تو . . . موت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اس نے شیخ احمد کو جلدی سے چھپ جانے کے لئے کہا۔ وہیں کہیں جھاڑیوں میں، اور خود تیزی سے سڑک کے کنارے کنارے چاندنی سے بچتا ہوا قد آور درختوں کے سائے میں پناہ لیتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ اب دور پر . . . . . چشمِ زدن میں نزدیک ایک تیز نیلا سا ستارا دکھائی دیا، اور پھر سڑک کے بالکل

قریب قریباً پانچ سو فٹ اوپر اس تیزی سے ہوائی جہاز اڑتا چلا گیا کہ اس کی ٹوپی کو گراتا ہوا گذر گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک منٹ کے لئے رک گئی۔ جسم نے تھرتھری سی لی۔ جیپ کے قریب ہی ایک شعلہ بلند ہوا۔ ایک سُرخ سا گولہ زمین پر پھٹا اور شعلہ بلند ہوا، سرخ شعلہ۔ "سرخ پیاز" اس نے اپنے دل میں کہا۔ ہوائی جہاز نے جیپ کو مشین گن نہیں کیا تھا۔ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ ہوائی بیڑے کو شہر یا اس کے اطراف کسی طرح کی بمباری وغیرہ کی سخت مخالفت تھی۔ اب ہوائی جہاز بہت دُور جا چکا تھا۔ شہر کی طرف۔ اس نے پلٹ کر شیخ احمد کو پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اگلے پاؤں وہ جیپ کی طرف واپس ہوا۔ شیخ احمد جھاڑیوں سے نکل کے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے پھر انجن کا رُخ کیا۔ اور اس خوف کے باوجود اس کی ہمت پر رشک کو تعجب ہوا۔

"میں پیدل چلتا ہوں۔ تم گاڑی کو یہیں چھوڑ دو۔ چلے چلو۔"

"آپ جائیے سرکار۔ میں تو اس گاڑی کا نوکر ہوں اس کو لے کر ہی آؤں گا۔"

اسے پھر تعجب ہوا۔ ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ پھر معلوم ہوئی۔ دیکھا بھالی کی اڑان کے بعد اب وہ دوسری طرف سے واپس جا رہا تھا بہت دُور پر۔ اور اب بہت اُوپر۔ نیلا ستارہ گھڑگھڑاہٹ کی طرح مدھم ہوا پھر غائب ہو گیا۔ دونوں نے پھر بیہا رجیپ کی طرف دیکھا اور ارشد نے گیبرڈین کے پتلون کی جیبوں میں ہاتھوں کو گرم رکھنے کے ارادے سے گھسیڑ کے سیٹی بجانے کی کوشش کی۔ مگر فارسی اشعار تھے کہ بادلوں کی طرح اُمڈتے یاد آتے چلے جاتے تھے۔ اس نے حسین رات کی طرف دیکھا۔ معشوقوں کی طرح، عجمی شاعروں کے معشوقوں کی طرح دل ربا اور خونریز۔ معشوقوں کے رخ زیبا جیسا چاند، ان کی آنکھوں کی طرح چمکتے ستارے۔ ان کی زلفوں کی طرح سیاہ درختوں اور چٹانوں کے سائے۔ ان کی پلکوں کی طرح سڑک کے کنارے کے صف بستہ درخت ان کی حنائی انگلیوں اور سُرخ ہونٹوں کی طرح سرخ سرخ ——— اور اسے جنگ پھر یاد آگئی اور وہ ہوائی جہاز جو ابھی ابھی گزرا تھا ——— دُور پر ایک موڑ گذری۔ اس وقت، اور اس رات اس کے سوا کسی اور ہیوقوف کی شامت آئی تھی۔ جہاں سے موڑ گزری وہاں چوراہہ ضرور ہوگا۔ چوراہہ ضرور تھا۔

اس رات کو معشوق کی حنا آلودہ ہتھیلی اور سرخ ہونٹوں کی طرح سُرخ خونریز کوئی مرئی چیز نہیں تھی۔ ٹینکوں اور توپ خانے کی گھن گرج ابھی سینکڑوں میل دور تھی، تیزی سے ہوا پر صرف موت کے آہنی فرشتے آسمگتے تھے اور ان کو دیکھ کر سائرن کی وہ تیز، خون کو منجمد کر دینے والی آواز۔ ایک مسلسل فریاد، ایک مسلسل کراہ۔ وہ جو لنگرے گھماتے ہیں، وہ جو دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں، وہ جو دوسروں کی رہنمائی میں چلتے ہیں۔ ذرا دیکھ بھی لیں کہ جنگ کیسی ہوتی ہے۔

کیا ہوگا؟ آج صبح سے اس کے ذہن نے تصفیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کا جواب نہ ڈھونڈے گا۔ ایک اور چوراہہ پر آج دوپہر کو ایک طرف سے تیز بہت تیز ایک فوجی لاری آ رہی تھی، ایک آدمی آ پار جانے والی سڑک سے تیزی سے سائیکل پر چلا آ رہا تھا۔ ارشد نے بڑی حماقت سے اپنے حق میں پیشین گوئی کی "اگر اس فوجی لاری سے یہ سائیکل ٹکرائی تو میں بھی اس جنگ میں ختم ہو جاؤں گا" لیکن سائیکل نہیں ٹکرائی۔ ——— سائیکل سوار فوجی لاری کو چل دے کر نکل گیا۔ آنکھ مچولی میں تھوڑی دیر کے لئے زندگی موت سے جیت گئی۔

آدمی نہ آدم زاد۔ اور ابھی رات کے دس ہی بجے تھے۔ شہر سے صرف سات میل دُور۔ جیسے طلسم ہوشربا کا کوئی شہزادہ کسی طلسمی جنگل میں چلا جا رہا ہے ——— حشرات الارض کی ذی حیات آوازیں آ رہی تھیں۔ جھینگروں کی اصاجنوں کی، اور دور دور کتوں کی۔ ابھی بہت دُور تک کوئی مکان نہیں تھا۔ ایک فیکٹری کے چراغ بہت فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ لیکن باہر سے چاندنی کفن کی طرح اسے لپیٹے ہوئی تھی۔

اور دفعتہً چاندنی اسے بڑی ہی دلکش معلوم ہوئی، خواب کی طرح، عشق حقیقی کی طرح، وہ اور اسے سمجھے ہوئے جنوں یعنی جنون ذی فنون کی طرح۔ اور اسے سڑک پر اپنے جوتوں کی چاپ کچھ عجیب معلوم ہوئی جیسے کوئی اس زندگی میں نہیں کسی اور زندگی میں چل رہا ہے، جیسے وقت کی

ہنا ہیں گر گئی ہیں۔ جیسے وہ ماضی میں یا مستقبل میں پل رہا ہے اور حال معدوم ہے۔ جیسے وہ مردہ ہے ۔۔۔۔

اور اگر کہیں یہ سچ ہو۔ وہ ہوائی جہاز جو اس قدر نیچے سے گذرا تھا۔ فرض کرو کہ اس نے "سرخ پیاز" نہیں گرایا تھا۔ وہ ایک بم تھا۔ جیپ، شیخ احمد اور وہ خود سب مر چکے ہیں، فنا ہو چکے ہیں۔ وہ اس سڑک پر چلا جا رہا ہے۔ کہ اس زندگی اور اس زندگی میں تسلسل ہے یا یہ محض اسی کی یاد، اسی کا سلسلہ ہے .....

اور معلوم نہیں یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ برفانی قطب جنوبی کے سیاحوں کا زائد ساتھی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، والا "یہ تیسرا کون ہے" یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا جا رہا ہے وجود سے عدم، عدم سے وجود کی طرف۔ جیسے ماضی، حال اور مستقبل کی سرحدیں مٹ گئی ہوں جیسے۔

یہ قدموں کی چاپ، یہ جوتوں کی چاپ۔ یہ اس کی اپنی رفتار کی نشانی ہے۔ وہ اپنے گھر جا رہا ہے، پیدل، کیونکہ جیپ خراب ہو گئی ہے اور بچا یا شیخ احمد اب بھی اس کے انجن سے گتھا ہوا ہے۔ مگر یہ چاندنی رات اس قدر دلکش! اور حسین اور یہ سڑک، یہ چاندنی رات میں نہائی ہوئی دوشیزہ۔ یہ درختوں کے سائے، یہ کالی کالی زلفیں.....

اور وہ جس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی، وہ دوسرا ساتھی، چاندنی رات میں اس ویران حسین سڑک پر اس کا ہم سفر اس کی ہم سفر ..... اس نے چاند کی طرف دیکھا اور پھر اپنی حسین ساتھی کی طرف۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں زرّیں تاج ہوں"

اس نے بیسیوں زندہ عورتوں سے عشق کیا تھا۔ ہوس آرائی کی تھی، تفریح کی تھی، کشش محسوس کی تھی۔ کبھی ہوس کا خاتمہ عشق پر ہوتا۔ کبھی عشق کا ہوس پر۔ اور ہمیشہ اس کا باعث یہ ہوتا کہ دونوں لاکھ کوشش کرتے یہ دوئی فنا نہ ہوتی۔ دونوں ایک معاشی عمرانی نظام کی پیداوار ہوتے، اور یہ نظام ان کے راستے میں سنگلاخ مزاحمتیں، کانٹوں کی جھاڑیاں، دیو ہیکل چٹانیں حائل کرتا جاتا۔ جن سے ہوس عشق بن جاتی اور کبھی یہ مزاحمتیں غالب ہو جاتیں تو عشق ہوس ہو جاتا اور پھر ہوس کے بعد تھکن اور پھر غدر و اماندگی لے حسرتِ دل ..... اور پھر یہی سلسلہ۔

ایک دن اس نے کہا تھا اب میں کسی ایسی عورت سے محبت کروں گا۔ جسے مرے صدیاں ہو چکی ہوں گی۔ ایک دن انسان ماضی میں سفر کر سکے گا۔ اس دن اس کے ساتھ بھی یہی مسائل پیدا ہوں گے۔ لیکن ابھی تو یہ ممکن نہیں۔

زرّیں تاج کو مرے سو سال کے قریب ہونے کو آئے ہیں۔ اور اس شاعرہ کا کلام پڑھ کے جس نے باب کو دیکھنے سے پہلے اس کی تعریف اور اشتیاق میں دنیا کی دو حسین ترین نظمیں لکھی ہیں۔ اس نے زرّیں تاج کو مخاطب کر کے کہا "ان تمام عورتوں میں جو مر چکی ہیں مجھے سب سے زیادہ تم سے محبت ہوئی ہے۔ اگر کبھی حال ماضی کی طرف جا سکا یا میری روح تمہاری روح کے جمال کا دیدار کر سکی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تب بھی دورانِ محض میں، مردہ خالص میں تم سے مخاطب ہوں گا اور تم سے اپنی اس محبت کا اظہار کروں گا جو عشق سے، ہوس سے، خواہش سے اور اک سے جواب سے ماورا ہے۔

آج اس چاندنی میں لٹی ہوئی حسین ویران تنہا سڑک پر ایک اجنبی شاعرہ کی طرح وہ اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس پل صراط پر۔ زندگی سے موت کی طرف۔ ۔۔۔ صدیوں کے آر پار۔ اور پھر اس نے زرّیں تاج کی طرف دیکھا۔ اس نے نقاب الٹ دیا تھا۔ یوں اس کا لباس سیاہ تھا۔ غم کی عورتوں کی طرح۔ ایسا لباس جیسا کہ شاید اس نے محمد علی بارہ دوش کے ساتھ کھاوے میں پہنا ہوگا۔ اور اس کا چہرہ چاندنی میں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ یہ موت کی، کافوری چمک تھی۔ ایک حسین آسیب الفت کے پہرے کی چمک۔ جیسے مکڑی کا جالا پر لگی ہوئی لاش کا مار کو پولو کے نام یہ پیغام۔

"یہ کہہ دینا کہ میں نے محبت کی اور مر گئی۔ اب میں محبت ہوں اور زندہ ہوں۔ اور چونکہ زندہ ہوں بھول گئی۔ اور چونکہ [illegible] معاف کر دوں گی۔"

تب ارشد نے اس طرح جیسے کوئی سلسلۂ خیال سے چونک پڑتا ہے۔ جیسے کوئی خواب میں خواب سے بیدار ہوتا ہے، جیسے کسی نے ابھی ابھی آنکھ کھولی ہو۔ کہا: "تم ملکۂ کوکا چین ہو۔ تم زرّین تاج ہو۔"

اور اس کی ہم راہ حسینہ ہنسی۔ کوکا چین نہیں وہ چینی تھی۔ وہ تو صرف عجم بیاہ کر آئی تھی۔ میں زرّین تاج ہوں۔ میں عجم کی نسوانیت ہوں جو صدیوں میں ایک آدھ مرتبہ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے، اور مردوں کو ششدر کر دیتی ہے۔ وہ پہلے مجھے دیکھ کر عشق کرتے ہیں۔ پھر محبت کرتے ہیں، جس کے معنی زیادہ تر یہ ہوتے ہیں کہ بڑی سے بڑی قیمت دے کر وہ میرا جسم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شہنشاہ مجھے موتیوں میں تولنا چاہتا ہے۔ فن کار خونِ جگر میں اور مزدور مجھے دیکھے بغیر چپکے سے گذر جاتا ہے اور اگر وہ محبت میں کامیاب نہیں ہوتے تو پھر مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں، اپنی رقیب سمجھ کر۔ اور جب میں مرجاتی ہوں تو سینکڑوں برس میری پرستش کرتے ہیں۔ اب تم نے مجھے پہچانا۔

پھر سائرن کی خوفناک ہسٹریائی چیخ نے فضا میں لرزا شروع کیا۔ رات نے ایک جھرجھری لی، چاندنی کانپ گئی، سب درختوں اور ان کے سایوں کو فالج مار گیا۔ دور پھر ایک ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پھر کتے بھینکے جھینگروں کے گانے میں خلل نہیں آیا۔ اور ارشد نے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ زرّین تاج برابر اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ موت اور حیات کی درمیانی شاہراہ پر پل صراط پر چاندنی کے برزخ میں۔

دور پر ہوائی جہاز نے پھر سرخ پیاز پھینکے، زمین سے ٹکرا کے پھر سرخ شعلے اٹھے۔ پھر ہوائی جہاز نے تہر کے اطراف ایک چکر لگایا۔ اور وہ چاندنی سے زیادہ خوبصورت تھی، چاندنی سے زیادہ حسین۔ ایرانی شاعری کی دیوی کی طرح جمیل! اس کے لب لعلین چاندنی رات میں چمک رہے تھے۔ سینکڑوں میل دور ٹینکوں سے سچ مچ کا خون بہہ رہا ہوگا، اور سچ مچ کے بناگذیں خندقوں کے ہاتھ لٹ رہے ہوں گے اور سچ مچ کی عورتیں اپنی عزت ——— نامۂ اعمال کا فقور ——— بچانے کے لئے کنوؤں اور باولیوں میں گر رہی ہوں گی۔ مگر یہاں تو ابھی تک صرف ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ پل صراط کے اس بانک، جس پر سے گزرتے ہوئے زرّین تاج نے پوچھا: "اپنی کہانی سناؤں؟"

اب ہوائی جہاز جا چکا تھا۔ اب پھر رات کے پرانے محرم راز کتے، سانپ اور جھینگر باقی رہ گئے تھے۔ اور انسان کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ لگائے حشرات الارض کی طرح چھپے ہوئے تھے۔

اور چاندنی رات میں زرّین تاج حد سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے آپ سے ارشد نے اس طرح کہا گویا اسے زرّین تاج کے ساتھ ہونے کا یقین نہیں آیا۔ "میں نے دیکھے بغیر تجھ سے محبت کی۔ کاش مرنے سے پہلے ایک بار تجھے دیکھ لیتا۔"

مگر وہ تو اس کے ساتھ پل صراط پر چل رہی تھی۔ چاندنی رات میں۔ اور وہ مسکرائی۔ چاندنی رات میں چاند چمکا اور موتی بکھر گئے۔

اور ارشد نے اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا۔ گویا وہ اپنی مرتبہ چاند کو دیکھ رہا تھا۔ اسے نہیں دیکھا۔ مگر کتنی بار دیکھا ہے۔

تب زرّین تاج کا، کالا، طلسمی جوروں کا سا لباس چاندنی رات میں یکلخت چمکا۔ جیسے سڑک پر پڑا ہوا شیشے کا ایک ٹکڑا ——— اور اس نے اپنا قصہ سنانا شروع کیا۔

میرا نام سیرا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ میں یونان سے ایران آئی۔ لیکن میرے خون کے ایک ایک قطرے میں محبت ہے۔ مجھے ایرانیوں نے شیریں کہا اور مجھ میں ایرانی نسوانیت کی مٹھاس بھر دی۔

میں روسی نژاد تھی، عیسائی تھی، مجھے کسی افسانہ نگار نے ماریہ شہنشاہ کی بیٹی قرار دیا۔ کسی نے مہین بانو کی، لیکن میں ایرانیت میں اس قدر کھو گئی کہ نہ مجھے اور نہ کسی اور کو میرے اجنبی ہونے کا احساس تھا۔ مجھے ایران نے شیریں بنایا اور میں نے ایران کو اس کا سب سے پیارا افسانہ عشق دیا۔

خسرو نے رومیوں سے ہزار کوریں چھینیں، ہزاروں کو بیوہ کیا۔ اس کے سپاہیوں نے ہزاروں کو بے آبرو کیا۔ یہ اس زمانے کا دستور تھا۔ تمام عہد عتیق میں اب تک یہی ہوتا ہے۔ میں تاریخ سے گھبراتی ہوں جو اپنے آپ کو نہیں دہراتی۔ مگر اپنی سیہ کاریوں کو ضرور دہراتی ہے۔ اس لئے نظامی گنجوی کے ساتھ ساتھ چلو۔

میں مہین بانو کی تربیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوں۔ مجھے شہسواری آتی ہے، شکار کھیلنا آتا ہے، راویوں سے کہانیاں اور نظمیں سننا آتا ہے میں مکالماتِ عشق میں ماہر ہوں، اور اپنی سہیلیوں میں اس طرح دمکتی ہوں جیسے تاروں میں چاند۔ خسرو، جس کو اس کے مروانہ حسن کی وجہ سے سب پرویز کہتے ہیں، میرے حسن و جمال کی تعریف سنتا ہے مجھ پر نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے۔ اور مجھے ڈھونڈھنے شیرویہ کو بھیجتا ہے۔ گویا شہزادہ "دل" ہے جو "نظر" کو میری تلاش میں روانہ کرتا ہے۔

اور میں شکار کھیل رہی ہوں اپنے تیر مژگاں سے ہرنوں کا شکار، اور اپنی ہرنوں جیسی آنکھوں سے دلوں کا شکار۔ میری سہیلیاں میرے ساتھ ہیں جنہیں مہین بانو نے میری دلجوئی، میرا دل بہلانے اور میری نگرانی کے لئے مقرر کیا ہے۔ شیرویہ آتا ہے۔ دل کا چالاک وزیر، خسرو کا چالاک وزیر، اور پتھر پر اس کی تصویر بنا دیتا ہے، میں مبہوت رہ جاتی ہوں۔ سہیلیاں کہتی ہیں "شیریں! شیریں! تو خواب دیکھ رہی ہے، یہ طلسمات کا جنگل ہے" اور ہم سب وہاں سے آگے چلتے ہیں کسی اور جنگل میں جو زلفوں کی طرح تاریک ہے، جس میں صبا تک اچھی طرح شانہ نہیں کرتی" اور یہاں مژگاں کو پھر ہرنوں کی نئی ڈار، نئے بسملوں، نئے مقتولوں کی تلاش ہوتی ہے۔ مگر وہ چالاک وزیر شیرویہ، بزرگ مہر کا خسر پھر آتا ہے، پھر پتھر پر ایک تصویر بناتا ہے۔ میں پھر محو ہو جاتی ہوں۔ گویا میں خواب میں چل پھر رہی ہوں۔ سہیلیاں پھر تاڑ جاتی ہیں کہ اس نقش کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مجھے پھر وہاں سے لے چلتی ہیں۔ ایک اور صحرا اور زلفیں اور ہرنوں جیسی آنکھیں، مژگاں کے اور سوفار، ابروؤں کی اور کمانیں۔ لیکن شیرویہ پھر آ پہنچتا ہے، اور ایک چٹان پر پھر خسرو کی تصویر بناتا ہے۔ اب میرا دل اپنے قابو میں نہیں رہتا۔ مجھے فارسی شاعری کی ایک روایت کو جنم دینا ہے۔

عشقِ اوّل در دلِ معشوق پیدا میشود

مجھے اس شہر یار سے دل و جان سے محبت ہو جاتی ہے۔ جس کی یہ تصویر تھی۔ اس مرتبہ مہین بانو کی سکھائی ہوئی سہیلیاں مجھے بہلا نہیں سکتیں۔ جل نہیں دے سکتیں۔ وہ پتھر کا نقش میرے دل پر قسم ہو چکا ہے۔ میں چپکے سے ان کو چھوڑ کے نکل پڑتی ہوں۔ میں شہسوار ہوں۔ یہ صفت میں نے تاتاری معشوقوں سے لی اور ایرانی نازنینوں کو عطا کر دی۔ راستے میں چشمہ ملتا ہے۔ چشمۂ آبِ حیواں، چشمۂ نرگس، چشمۂ آبِ حیات، چشمۂ تسلسبیل حیات۔ یہاں میں گھوڑے پر سے اُتر پڑتی ہوں۔ میں کپڑے اتارتی ہوں۔ میں شاعروں کا سراپا بن جاتی ہوں۔ میری سیاہ زلفوں میں راتوں کی تاریکی اور سانپوں کا رنگ ہے، اور یہ زلف جبل البتین بھی ہے۔ میری آنکھیں نرگس ہیں، میری پیشانی چاند، میرے ہونٹ عقیق، دانے لعل، میرے دانت موتی، میرے شانے آئینے اور پھر نازِ پستاں، مرمرِ کمر، ساقِ سیمیں میں جب ٹھہر جاتی ہوں سرو ہوں اور جب چلتی ہوں قیامت، یہ کیا غضب ہے۔ کہ تمہارے شاعروں نے میرا سراپا تو یاد رکھا مگر مجھے بھول گئے۔

اور داستانوں کے شہزادوں کی طرح خسرو پرویز بھی اس چشمے پر آ نکلتا ہے۔ بہرام کو شکست دینے کے بعد ہمارے افسانے میں کوئی مقام نہیں، کوئی موسم نہیں، کوئی دیار نہیں، زمین زمین ہے اور آسمان آسمان ہے۔ خسرو چشمے میں پہلے میرا عکس دیکھتا ہے، پھر میری جانسوز عریانی دیکھتا ہے۔

لیکن جب اس کے کہ وہ مجھ تک پہنچ سکے۔ میں اپنا تن ڈھانک کے، اپنے بادپا رہوا پر سوار ہو کے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہوں جگر اسے اپنی نظروں سے گھائل کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے .....

اور وہ شیریں کو مہین بانو کے پاس بھیجتا ہے۔ اس کی دال نہیں گلتی۔ مہین بانو مجھے سمجھاتی ہے کہ جو آسانی سے حاصل اور آسانی سے فنا ہو گیا وہ ہوس ہے۔ اور وہ جو مشکل سے حاصل ہوا اور کبھی فنا ہوا کبھی فنا نہیں ہوا، عشق ہے اور وہ جو بڑی مشکل سے حاصل ہوا کبھی فنا نہیں ہوگا عرفان ہے اور وہ مجھے سمجھاتی ہے کہ ایرانی خواتین میں سے وہ تین کا صدیوں میں ایک آدھ بار بروز ہوتا ہے آسانی سے اپنے آپ کو اپنے عاشق کے حوالے نہیں کرتیں۔ عشق کی بجلی ٹھوکروں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے "جفا" کی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر "وفا" پیدا نہیں ہوتی۔ میں یہ سب سنتی ہوں، یہ سب مان لیتی ہوں کیونکہ مجھے تمہاری عجمی شاعری کی روایتوں کی تخلیق کرنی ہے۔ خسرو مجھ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اور میں اسے پہنچنے نہیں دیتی۔ شیریں یہ آتا ہے۔ اور ناکام واپس جاتا ہے۔ اب مہین بانو مر چکی ہے۔ اس کی جگہ میں اپنی اقلیم کی ملکہ ہوں۔ خسرو پرویز دیارِ عشق کا شہریار ہے۔ میں دیارِ حسن کی ملکہ ہوں۔ زاری، زار، زور کوئی طاقت مجھے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتی۔

اور جب وہ مجھے پا نہیں سکتا تو لشکر سے دل بہلانے لگتا ہے۔ تم جانتے ہو یہ لشکر کون ہے۔ یہ عورت کا جسم ہے۔ اور میں جو شیریں ہوں عورت کی روح ہوں۔ ایرانی عورت کی۔ لشکر حرم میں داخل ہو سکتی ہے۔ میں یا ملکہ عالم ہو کے رہ سکتی ہوں یا پھر بجا دی جاتی ہوں۔ خسرو لشکر سے دل بہلاتا ہے۔ مگر لشکر بھی اسے آسانی سے نہیں ملتی۔ وہ خسرو پرویز کو شراب کے نشے میں بدمست کر دیتی ہے اور ایک بدہیئت کنیز کو اپنی جگہ اس کے پاس بھیج دیتی ہے۔ جسم جسم سب برابر ہیں۔ یہاں تک کہ جب نشہ اترتا ہے تو خسرو پرویز کو غصہ آتا ہے۔ جسم جسم کا فرق اس پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہی سراپا والی بات۔ اور بالآخر لشکر اسے مل جاتی ہے۔ لیکن میں جو شیریں ہوں۔ عجمی نسوانیت کی روح، اس سے اب بھی دور ہوں۔ بہت دور۔ وہ اگر اپنے ملک کا بادشاہ ہے تو میں اپنے دیار کی ملکہ، اور ناری، نار، زور کسی کی مجھ تک پہنچ نہیں۔ ناری البتہ کبھی کبھی میرے کنگرۂ بام سے ٹکرا جاتی ہے۔ مگر میرے سکون و اطمینان میں فرق نہیں آتا۔ میں شیریں ہوں۔ عجمیت کی روح کوئی خرید نہیں سکتا۔

نظامی نے بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں۔ دیار کی ملی ہوئی شاعری سے اور توقع ہی کیا ہے۔ فرہاد کا قصہ بیچ کا نہیں بعد کا ہے، میں اسے بعد میں بیان کروں گی۔ اب خسرو پرویز میرے دیار میں آنا چاہتا ہے، دیارِ جمال میں۔ اس کی سپاہ، میرے دارالسلطنت میرے قلعے کے اطراف حیران کھڑی ہے۔ وہ خندق کے پاس کھڑا ہے، منت و زاری کر رہا ہے۔ میں ایک جھروکے میں نمودار ہوتی ہوں۔ وہ اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے۔ اور یہ اجازت اسے نہیں ملتی۔ وہ محبت کرتا ہے اور میں اس کی ہر محبت کا جواب دیتی ہوں۔ وہ وفا جانتا ہے۔ میں اسے شکر کے عشق کا طعنہ دیتی ہوں۔ وہ مجھے جفا پر ملامت کرتا ہے۔ میں اسے جفا کے معنی سمجھاتی ہوں اور اسی طرح سوال و جواب ہوتے رہتے ہیں۔ آنکھوں کے جھروکوں سے حواسِ خمسہ سے شخصیتوں کی بجلی سے۔ اور بالآخر میں اسے اندر آنے کی اجازت دیتی ہوں تو وہ مجھے مسخر کرنے کے لئے اپنی دو ارواحِ دل بارید کی زبانی سنواتا ہے، میں نکیسا کی زبانی اس کا جواب سنواتی ہوں۔ روح کی فصیل میں جگہ جگہ شگاف ہیں، جن میں اس کا اٹھتا ہوا لشکر داخل ہو چکا ہے۔ مگر قلب میں کوئی چیز محفوظ ہے۔ ایک زہریہ ہے جسے کوئی گرما نہیں سکتا پگھلا نہیں سکتا۔ کیونکہ میرا جوہر ایسا تھا کہ اسے کوئی خرید نہیں سکتا۔ خسرو پرویز نے مجھے خرید لیا۔ میری جنس خرید لی، میرا حسن خرید لیا، میری ہوس خرید لی۔ میری نسوانیت خرید لی۔ مگر اب بھی قلب میں ایک مقام ایسا تھا جہاں وہ پہنچ نہ سکتا تھا "ہزار افسانہ" کے چالیس دروازوں والے قصر کی طرح میں نے ان میں سے اناچالیس دروازوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں اور چالیسویں دروازے کی کنجی اس کے حوالے کرنا میرے بس کی بات نہ تھی، حالانکہ اس کی محبت، اس کا جسم، اس کی وجاہت جس نے اسے پرویز کا خطاب دلوایا مجھے بہت عزیز تھی۔

یہ چالیسویں کنجی کسی اور کے قبضے میں چلی گئی۔ میں نے نہیں دی۔ خود بخود چلی گئی۔ کیونکہ ان معاملات پر کسی کا اختیار نہیں۔ اور جس شخص

کے پاس یہ کہنے گئی۔ اس کا نام فرہاد تھا۔ وہ ایک مہندس تھا ——— اس کا ترجمہ اپنے زمانے کی زبان میں چیف انجینیر نہ کرنا ——— اس زمانے میں وہ ہی بلتے تھے۔ ایک امیر اور دوسرا غریب۔ اور مہندس مزدور تھا۔ میں تم سے کیا کہوں۔ میرا فرہاد نظامی کا فرہاد نہیں تھا وہ شیرویہ کی ضد تھا۔ وہ مزدک کا مظہر جمال تھا۔ اس کے اعصاب پتھر توڑتے توڑتے فولاد کی طرح مضبوط ہو گئے تھے۔ اور اس کے چہرے پر عشق کے درد کے ساتھ بھوک کا جلال تھا۔ لیکن پرویز سونے سے اس کی بھوک نہ بجھا سکا۔ وہ اس کے عشق ہی کا ایک حصہ تھی۔

بقیہ قصہ تو تم کو معلوم ہے۔ میری زبانی میرے رنج و درد کی کہانی سن کر تم کیا کرو گے۔ جب دیکھو کہ میں اپنا دل ہار چکی ہوں، تو وہ شہنشاہ جس کے لشکریوں نے لاکھوں کا خون بہایا تھا۔ اپنے آپ میں اتنی جرأت نہ پا سکا کہ اس مزدور کو قتل کر سکتا۔ شیرویہ کا بھی یہی مشورہ تھا شیر کے ساتھ ایک روباہ جڑا کرتی ہے۔ جس کا مشورہ ہمیشہ بھی جڑا کرتا ہے کہ جو گندم مرسکتا ہے اسے زہر دینے کی ضرورت نہیں۔

اور اس طرح جیسے دن سینا نے اپنے عاشق سے وعدہ کیا تھا، خسرو نے میری طرف سے وعدہ کر لیا کہ اگر اس نے بے ستون کو کھود دیا تاکہ جوئے شیر پہاڑ کے اس طرف آ سکے تو میں اس کے حوالے کر دی جاؤں گی۔ وہ شہنشاہ جس کے حرم میں سینکڑوں حوریں تھیں اور صینکڑوں حوریں آ سکتی تھیں۔ اس قسم کے بین دین کو عار نہ سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کام تو ممکن بھی تو نہ تھا۔

اور فرہاد وہ "گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب" اپنے تیشے سے پہاڑ کاٹتا رہا۔ وہ پتھر پر میرا نقش بناتا۔ جیسے شیرویہ نے رجھانے کے لئے میری دلنوازی کے زمانے میں تین بار چٹانوں پر پرویز کا نقش بنایا تھا۔ فرہاد ہر بار میرا نقش بنا کے مایوس ہو جاتا۔ میرے حسن میں ایک بات تھی۔ جو وہ بار بار اس نقوش میں پیدا کرنا چاہتا اور بار بار ہو جاتا وہ پھر سے اس مجسمے کے ٹکڑے کر دیتا اور پھر نئی تصویر کھودتا۔ اور اس طرح پھر اپنا دل توڑ گیا۔

اور تب میرا شہر یار شہر محبت پر پشیمان ہوا۔ اس نے پھر شیرویہ کو بلایا، شطرنج کے موجد کے نانا جان کو۔ اور روباہ نے پھر روباہی کی چال چلی میرے مرنے کی افواہ فرہاد کو پہنچائی ——— اور اس کم ہمت مزدور، کم ہمت مہندس نے اس تیشے سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا، جس سے اس نے میرے مجسمے بنائے تھے، بے ستون کو کھودا تھا۔ مجھے پا لیا تھا۔ تمہارے اس ہندوستانی شاعر نے بہت خوب لکھا تھا۔ میری روح سن کر پھڑک اٹھی۔ وہ مزدور، اپنی بے بسی کی رسوم و قیود کا کس قدر پابند تھا۔ مرجانے کے لئے اسے اسی تیشہ کی ضرورت ہوئی۔ وہ اپنے دل کی حرکت روک کے مر سکتا تھا یا بے موت کے اس طرح مر سکتا تھا کہ اس کی زندگی کے ہر ہر لمحے میں موت کا مزہ ہوتا۔ وہ سقراط کی طرح تعلاب کا جام گھونٹ تک مزے لے لے کر پی سکتا تھا۔ یہ رومیر کی سی موت کتنی بے معنی تھی۔

اور اب زریں تاج یعنی شیرویہ یعنی مجھی نسوانیت کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوئی اور اس نے کہا۔ کبھی کبھی مجھے اس کا بھی خیال آتا ہے کہ وہ اسی تیشے سے خسرو پرویز کی سلطنت کاٹ سکتا تھا۔ مگر افسوس اس کا تیشہ درفش کاویانی نہ بن سکا۔

سائرن کی دلدوز چیخ پھر ہوا میں فریاد بن کے گونج کے خاموش ہو گئی۔

اور پھر زریں تاج نے کہا۔

میرا نام میرا فسانہ تھا۔ میں ایرانی تھی اور میرا ریشہ ریشہ ایرانی تھا۔ ماں باپ نے ساتھ ہی ہندوستان آئی۔ منعموں کے درمیان میرے خاندان کو جگہ ملی اور وہ فسانہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ پائیں باغ میں شہزادہ سلیم دو کبوتر میرے دونوں ہاتھوں میں تھما کے کسی کام سے گیا ایک کبوتر پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔ اس نے واپس آ کے مجھ سے ناراض ہو کے پوچھا۔ کیسے اڑ گیا تو میں نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا۔ اور کہا: ایسے اڑ گیا۔" کہتے ہی بھری بزم اور شہزادے کے دل میں کھب گئی اور مجھ پر دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ جیسے وہ اس سے پہلے دل و جان سے انارکلی پر عاشق

ہو گیا تھا۔ اور اس سے پہلے.....

لیکن مجھے معلوم نہ تھا عشق و محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ ابھی میں دوشیزہ تھی۔ میری ایرانیت ابھی خوابیدہ تھی۔ شہنشاہ اکبر ابھی جانتا تھا کہ محبت ذہانت ناک سی چیز ہوتی ہے۔ اب اس کے لئے دو صورتیں تھیں کہ یا تو وہ مجھے نادرہ کی کی طرح دیوار میں چنوا دے یا کسی اور سے میری شادی کر لے۔

میں ایسی حسین اور ایسی معصوم تھی کہ شہنشاہ نے مجھے قتل نہیں کیا۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ کسی نہ کسی شہنشاہ نے کسی نہ کسی تاج کو قتل کرا دیا ہو۔ لیکن میں خوش قسمت تھی۔ میری شادی ایک بڑے ہی حسین مرد بڑے ہی بہادر آدمی سے کرا دی گئی۔ اس کی شجاعت کی وجہ سے اسے شیر افگن خاں کا خطاب دیا گیا۔ اور اپنے شوہر کے آغوش میں میں نے پہلی بار محبت کرنا سیکھا۔

وہ بہادر تھا اجڑی تھا، اس کے قویٰ مضبوط تھے، اس کا سینہ چوڑا چکلا تھا۔ اور میں اس کے ساتھ خوش تھی۔ مجھے اس سے ایسی محبت ہوئی جو کسی اور سے کبھی نہیں ہوئی، نہ ہو سکتی تھی۔

مگر بادشاہ مرتے ہیں اور ان کی جگہ ان کے بیٹے بادشاہ ہوتے ہیں۔ اور اپنا انتقام لیتے ہیں۔ مگر میرے جری اور بہادر شوہر نے تو جہانگیر کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ کبھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ وہ اس کے باپ کا وفادار تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا وفادار رہا۔

اس پر بغاوت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ سرکشی کا الزام نہ لگ سکتا تھا۔ اس لئے اسے ایک دن جب کہ وہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ دھوکے سے قتل کرا دیا گیا۔ وہی فریاد والی بات۔ وہ جو شیر افگن تھا۔ شیروں کا شکار کھیلتا تھا شاہانہ وہ بھی کا شکار ہو گیا۔

اور میں حرم میں لائی گئی۔ مہینوں اور برسوں میں حرم میں داخل ہونے سے انکار کرتی رہی۔ مگر شہنشاہ کو تو بچپن سے ہر انسان کا دوسرے جانور کا اڑانا دنیا یاد تھا۔ اس لئے جوں جوں انکار بڑھتا گیا۔ میری قیمت بڑھتی گئی۔

عورت کے خون میں قدرت نے کچھ عجیب کمزوری دی ہے جو جتنا زیادہ تقاضا کرتا ہے اپنے صیاد سے دور بھاگنے میں اس کی قوتِ ارادی اتنی ہی کمزور ہوتی جاتی ہے۔ جتنے عرصے تک یہ تقاضا جاری رہتا ہے اسی کی مناسبت سے اس کی مزاحمت گھٹتی جاتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقتول محبوب کے قاتل کو پہلے برداشت اور پھر پیار کرنے لگتی ہے۔ اس وجہ سے بھی بہت سی عورتیں جو قلعے اس پر حملہ میں آ جکل، خواہ کی جاتی ہیں، اپنے ظالم عاشقوں کے چنگل سے چھوٹ کے آنا نہیں چاہتیں۔ کچھ اسی طرح کی کمزوری مجھ پر بھی حاوی ہوتی گئی اور بالآخر میں نے "ہاں" کہہ دیا۔ اور میں کئی میں سے ایک۔ کئی بیگموں میں سے ایک جو کے وہ گئی۔ اور مجھے "نور محل" کے نام سے سرفراز کیا گیا۔ ایسی محلات کئی تھیں۔

محبت، یعنی اس قسم کی محبت جیسی اپنے شیر افگن سے تھی، اب میرے دل میں مر چکی تھی۔ بالکل مٹ چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک عجیب طنزیہ محبت تھی۔ عقیدہ طائر کی محبت صیاد کے ساتھ۔ گھوڑے کی محبت اپنے آقا کے ساتھ۔ اور اس طنزیہ محبت میں میں نے گردوپیش کا جائزہ لینا چاہا تو اپنے آقا اور شہنشاہ اور نئے شوہر کو حرم کا بنا ہوا پایا جس کے ہاتھ میں آہنی گرفت دے دیا گیا ہو اور جس نے ہزارہا شیر افگنوں اور ابوالفضلوں کے قتل کی تلافی مافات کے طور پر ایک حد تک مجھے کھونے کی خرچ آویزاں کر رکھی تھی اور اسے نہ مجھے عدل کا خوش نما نام دیا تھا۔

سلطنت اس نے خراج ایک عام کے عوض میرے حوالے کر دی تھی۔ میں نے بہت سے امرا کو اپنے ساتھ ملایا۔ میں نے ابھی کوشش کی کہ جہانگیر کے بعد میرا نام چلے۔

ادھر حسن و جمال کے محاذ پر میں نے بہت سی نفاستیں ایجاد کیں۔ عرق گلاب سے غسل کرنے کے اصول دریافت کئے، خوشبوؤں، پیشوازوں، زیوروں

میں نئی نئی بجادیں کہیں۔ میرے تاج میں ہیرے جگمگاتے تھے۔ انھیں میں سے ایک ہیرا جہانگیر بھی تھا۔

اور عین اس زمانے میں جو میرے عروج کا زمانہ تھا ایک درویش نے میرے شہنشاہ مشہر کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ شیخ احمد سرہندی کے متعلق میں نے جہانگیر کو بہت بھڑکایا۔ ان لوگوں میں ایک بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ بادشاہوں سے اونچے سمجھے جائیں۔ میں نے شہنشاہ سے کہا اسی تیری سلطنت میں برہمن کھتریوں سے افضل سمجھے جاتے ہیں۔ درویشوں کا عجیب عالم ہوتا ہے۔ اگر تو انھیں قتل کرائے تو دنیا قیامت تک تجھ پر لعنتیں بھیجتی رہے گی۔ اور ان کو شہید تصور کر کے ان کے مزار کی زیارت کو آیا کریگی۔ اس کو اپنے حال پر چھوڑ تجھے ہندوستان کی شہنشاہی میسر ہے۔ اسے دل کی شہنشاہی کرنے دے۔ وہ تیرا کیا بگاڑ رہا ہے؟

لیکن ایک پیالے کے حوض سلطنت میرے ہاتھ بیچ چکنے پر بھی جہانگیر کو طاقت کا گھمنڈ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور سر ہندوستان میں اس کا اتنا بلند ہو یا اس کے آگے نہ جھکے۔ آخر وہی جہانگیر تو تھا جس نے ابوالفضل کو اور میرے شیر افگن خاں کو قتل کرا دیا تھا۔ اس نے دربار کیا اور کھڑکی اتنی نیچی بنائی کہ سر جھکا کے آنا پڑتا۔ شیخ احمد سرہندی بیٹھے کے اس طرح آئے کہ پہلے ان کے پیر دربار میں داخل ہوں۔ اور جو سر خدا کے آگے جھکا ہے کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔

شیخ احمد سرہندی کے بہت سے مرید تھے۔ ان میں مہابت خاں بھی تھا۔ اور ہم لوگ کشمیر میں تھے کہ اس نے ہمارے لئے جال تیار کیا۔

وہاں ڈل جھیل کے کنارے فواروں کے نیچے چراغاں تھا۔ جہاں پناہ کو میں جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی۔ کھلی ہوئی فضا میں، آسمان کے نیچے راجپوت رقاصہ مارواڑی ناچ ناچ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دور پر ہماؤ برف کے تاج پہنے کھڑے تھے جو چتا رجہاں پناہ نے نصب کئے تھے۔ ابھی چھوٹے چھوٹے تھے، لیکن بید مجنوں جھنڈ جھیل کے کنارے کنارے بہت حسین معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوتا تھا کہ پورا ہندوستان ہمارے قدموں پر لوٹ رہا تھا۔ اور پیر پنجال کے برف پوش پہاڑوں کے اس پار مہابت خاں ہمارا راستہ روکنے کی تیاری کر رہا تھا۔

اور اس ناہنجار نے اس طرح جہاں پناہ کا اور میرا راستہ روکا جیسے کوئی شطرنج میں شہ دیتا ہے۔ لیکن ادب سے شاہ شطرنج کو پیٹھ نہیں۔ شیخ احمد سرہندی کی درویشی آخر رنگ لائی۔ میں نے بھی اس ناہنجار مہابت خاں کو بہت سمجھایا۔ مگر یہاں پناہ اس کے چہیتے تھے، سارا ہندوستان انھیں بچانا چاہتا تھا اور نہیں بچا سکتا تھا۔ اور مہابت خاں اگرچہ صیاد تھا اس کی مجال نہیں تھی کہ اپنے آقا پہ ہاتھ اٹھا سکے۔ میں اب وہ مہرالنسا نہیں تھی جس نے دونوں ہاتھوں سے کبوتر اڑا دیئے تھے۔ میں نے ہندوستان کی سیاسی شطرنج کے سب مہرے چلے کے بالآخر بادشاہ کو بچا لیا۔

اور اسی طرح کشمیر سے واپسی میں جہاں پناہ شکار کے لئے ایک پہاڑ کے دامن میں ٹھہرے۔ میں ابھی تک اسی طرح ان کے دل پر ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی۔ اب بھی میں شراب کا جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی۔ کہ ایک شکاری پہاڑ سے نیچے گرا۔ اور بڑی پسلی چور چور ہو گئی۔ جہاں پناہ کی طبیعت اسی وقت سے خراب ہو گئی۔ میرے ہاتھ سے انھوں نے شراب کا جام بھر لیا مگر اب یہ نشاط کا جام نہیں تھا علاج کا جام تھا۔ مجھے حیرت تھی یہ وہی آدمی ہے جس نے ابوالفضل کو قتل کرایا، شیر افگن کو شکار کرا دیا جس نے زندہ عورتوں کی کھالیں کھچوا دیں، جس نے مردوں کو دیواروں میں زندہ چنوا دیا۔ اس وقت ایک معمولی سے قدرتی واقعہ سے اتنا متاثر تھا۔

اور پھر کوئی طاقت جہانگیر کو سنبھال نہ سکی۔ اس کی نبض ڈوبتی ہی گئی، اس کے ساتھ میرے اقبال کا سورج ڈوبتا گیا۔ سلطنت سوتیلے بیٹے کے ہاتھ آئی۔ مہرالنسا تو کبھی کی مر چکی تھی۔ اب نور جہاں بیوہ ہو کر جیتے جی مر گئی۔ وہ ہر لگا بجے عرق میں غسل کیا کرتی تھی، جس نے مہابت خاں کا کفر توڑا تھا۔ یہاں تک کہ راوی کے کنارے لاہور کے قریب آرام کرنے کا وقت آ گیا۔

چاند نی اسی طرح دختوں کے سبز رنگوں کو گہرا کر کے فضا میں ٹھنڈی ٹھنڈی آگ بکھیر رہی تھی۔

زریں تاج خاموش ہو گئی۔

پھر زریں تاج نے کہا۔

میرا نام زریں تاج تھا۔ میں قزوین میں پیدا ہوئی۔ میں اتنی ذہین تھی کہ اس مرد سے جو میرے باپ میں تھا عورت سے صدہا سال کی رقابت سلب ہو گئی۔ اور اس نے مجھے بہت اعلیٰ تعلیم دلائی۔ جیسی ہونہار لڑکوں کو دلائی جاتی ہے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، الٰہیات، میں نے مردوں کی طرح سیکھا اور مردوں سے زیادہ بہتر میں مناظرہ کر سکتی تھی۔

جب میں پڑھ لکھ چکی تو میری شادی میرے چچا زاد بھائی ملا محمد سے کر دی گئی۔ حوالیوں میں ابن علم سے عشق مشہور ہے۔ مجھے اپنے ابن علم سے ہمیشہ چڑ تھی۔ ملا محمد کو بھی علم و فضل کا بڑا دعویٰ تھا۔ مگر میں سے چنگیوں میں اڑاتی تھی۔ میں خود علوم میں اس قدر کامل تھی کہ مجھے کامل تر مرد کی تلاش تھی۔ ایسے مرد کی جو میرے ذہن کی گردن مروڑ سکے۔

پھر جب میں نے محمد علی باب کے حالات سنے تو اسے ایک خفیہ خط لکھا۔ وہ بہت سن رسیدہ تھا اور میں جوان سال تھی۔ لیکن میں اس کے جمال سے بن دیکھے اس کی طرف کھنچی جاتی تھی۔ ایک طاقت تھی جو اندر ہی اندر مجھ سے کہہ رہی تھی۔ تیری منزل وہی ہے۔ جب باب کا جواب ملا تو میں بے دیکھے اس پر ایمان لے آئی۔ کچھ روز میں نے اپنی بابیت کو پوشیدہ رکھا اور پوشیدہ طور پر اسے خط لکھتی رہی۔ جب اس کا جواب آتا تو بصیرت کی آنکھ کھل سی جاتی اور جو عورت مجھ میں تھی وہ کہتی تجھے تیرا مقام مل گیا۔

یہاں تک کہ جب اپنے دیکھا کہ علم مناظرہ اور جوش بحث میں بڑے بڑے فاضل میرے مقابل ٹھیر نہ سکیں گے تو اس نے مجھے کھلا تبلیغ کا حکم دے دیا۔ وہ جو آفتاب بصیرت تھا اس نے مجھے قرۃ العین (آنکھ کی تپلی) کا خطاب دیا۔ دوسرے بابی بھی مجھ سے بحث کرتے کرتے عاجز آ جاتے۔ انھوں نے باب سے میری شکایت لکھ کر بھیجی۔ اس پر باب نے طاہرہ کا لقب دیا۔ اس لقب کو میں نے اپنا تخلص بنا لیا۔

میں نے اپنے شوہر کو بابیت کے نور سے منور کرنا چاہا۔ وہ میرے خیالات کیا بدل سکتا۔ لیکن میں بھی اس کے دل میں چراغ نور نہ جلا سکی۔ دراصل یہ مرد کے ذہن اور عورت کے ذہن کی کشمکش تھی۔ ایک عورت جو صدیوں کے بعد پھر ابھری تھی، ایک ایسے مرد سے بیاہی گئی تھی جس کی ذہانت صدیوں کے استعمال سے فرسودہ ہو گئی تھی۔ پھر میرا شوہر شیر افگن نہیں تھا جسے میں ہمیشہ کے لئے دل سے چاہتی وہ خسرو پرویز تھا۔ وہی فاتحانہ ملکیت کا دعویٰ۔ اس لئے کہ نکاح کے چند کلمے پڑھا کے میں اسے سونپ دی گئی۔ میری نس نس میں بغاوت جاگ اٹھی۔ میرے لہو کی بوند بوند میں محمد علی باب کا جگایا ہوا جادو تھا۔ میری آنکھوں نے کبھی باب کو نہیں دیکھا۔ میں کبھی اس سے نہیں ملی۔ لیکن وہ ہر وقت حاضر اور موجود تھا۔ اور اس کی موجودگی سے اس دائمی حضور سے میرے شوہر ملا محمد کی ہستی میری نظروں میں صفر سے کم رہ گئی۔

آخر میرے شوہر نے اپنے والد اور میرے والد سے شکایت کی۔ انھوں نے مجھ پر بہت دباؤ ڈالنا چاہا میں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اپنے باپ سے میں نے کہا کہ میں طاہرہ ہوں۔ باب نے مجھے طاہرہ کا لقب دیا ہے۔ میرا شوہر حق سے منہ چھپاتا ہے۔ اور اس لئے وہ خبیث و مردود ہو گیا ہے۔ طاہرہ کا کسی خبیث سے جنسی تعلق باقی نہیں رہتا اور جنسی تعلق باقی نہ رہنا طلاق کے برابر ہے۔ پھر اپنے والد کو قائل کرنے کے لئے میں نے بحث شروع کر دی کہ کیا مکہ کی جو عورتیں ایمان لے آئی تھیں۔ مگر ان کے شوہر بدستور کافر رہے تھے، انھیں رسول اللہ نے بلا طلاق دوسروں کے نکاح میں نہیں دے دیا تھا؟

اس درمیان میں میں باب سے دور تھی۔ میری آنکھیں کبھی روبرو اس کے جمال کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔ میری روح اسے ڈھونڈتی تھی کہ اسے اپنا حال سنائے اور جب میری روح اس مرد کامل کے لئے تڑپ رہی تھی۔ عقل نسوانی، مردانہ وجدان کی برق کی تلاشی تھی۔ میں نے اپنے

ذہن پر فکرِ سخن کے دروازے کھلتے دیکھے۔ وہ مجھ سے دُور تھا اور میری روح اس کے لئے بے تاب تھی۔ وہ کہیں مجھے مل جاتا تو میں کس کس طرح سے اسے حالِ دل سُناتی۔

گر بہ تو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غمے ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

تمہارے اقبال نے اس شعر کو پسند نہیں کیا۔ غالب کی عیاشی کو بھی اس نے اپنے جاوید نامے سے نکال باہر کیا۔ لیکن باب کا تصور میری نظروں میں معشوق کا تھا۔ معشوقِ حقیقی کے مظہر کا اور ساتھ ہی ساتھ مکمل مرد کا جس کی روح کائنات کو آغوش میں لئے ہوئی تھی۔

دور دہانِ تنگِ تو، عارضِ عنبریں خطت
غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

یہ زمانہ میرے لئے عجیب و غریب جذب و احساس کا زمانہ تھا۔ یہ عشق کا زمانہ تھا۔ نشاط و فنا کی لہریں یکے بعد دیگرے پیدا ہوتیں، کبھی مجھے بقائے دوام بخشتیں، کبھی لمحہ لمحہ نئی موت نئی لذتِ مرگ عطا کرتیں۔

اس نے مجھے طاہرہ کا خطاب دیا تھا۔ یہی میرا تخلص تھا۔ اور میں نے آبشار گرتے دیکھے۔ الفاظ کے آبشار۔ اور پھر جو میں نے آنکھ کھولی تو ان آبشاروں کی لگام میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے قرآن مجید سے شوکت لی اور متنبّی کے ترنم کو قاآنی کے ترنم میں حل کر دیا۔ ایران کی خاک سے ایک ہزار شاعر اُٹھے تھے۔ میں پہلی شاعرہ تھی جو ان ایک ہزار شاعروں سے الگ کھڑی تھی اور میرے انگیزوں کے درمیان سے یہ عظیم الشان آبشار گر رہا تھا۔

چو شود کہ آتشِ حیرتے بزنی بہ قلزمِ دل
فحسکتہ، و دگفتہ، اندکدکا، متزلزلا

یہ آبشار الفاظ ہی کا نہیں تھا، ایک جہانِ سوزِ عشق کی آگ تھی، سیال آگ جو اس آبشار سے گرتی چلی جا رہی تھی، جس کی تہہ میں نیستی کے نہنگ مُنہ پھاڑے ہوئے تیار تھے کہ مجھے اور دوسروں کو نگل جائیں۔ میں نے اپنی طرح دوسروں کو ان نہنگوں کے خروشِ لاسُننے کی دعوت دی۔

اب آبشار کے گرتے ہوئے تخت پر وہ جلوہ افروز تھا۔ محمد علی باب۔ اس کے چہرے کا تبسم، ظہورِ حق کی بشارت دیتا تھا۔ جس کسی نے اس کا راستہ اختیار کیا وہ تو سمجھ اور ابتلا سے بچ گیا۔ لیکن جس نے اس سے سرتابی کی تو گویا وہ داورِ محشر کی طرح تختِ قیامت پر متمکن تھا! قہار اور جبار۔ کامل مرد، مجھ کو اور میرے ساتھ ساری کائنات کو سرتابی کے جرم میں فنا کرنے والا۔ قہار اور جبار ہی نہیں تھا۔ اس میں رحم و لطف شہنشاہی کی تمام صفتیں بھی تھیں۔

کسے ارنہ کرد اطاعتم نہ گرفت جبل و لا یتم
کششِ بعید زساعتم و خمش بہ قہر بہادلا
منم آں ظہورِ مہیمنی، منم آں بسیطِ بے منی
منم آں سفینۂ امنِ و دلتہ فطرت محملا
شہدائے غلتِ نار من، پدیدِ بوئے دیار من
سرو جاں کنید نثارِ من کہ منم شہنشہِ کربلا

اور باشوکت، باعظمت، گرجدار آبشار تھا کہ بلندیوں سے گرتا ہی جاتا تھا۔ عرش سے فرش تک۔ جلال سے جمال تک۔ اس کی ہمہ گیر ہستی

سے میرے حساس ذہن تک۔

طیر العمار تکفکفت، ورق البہار تصفصفت
وبکت لبعلہا وقت محجلا متبللا

اس سیلاب، اس آبشار میں میرا شوہر ملا محمد قزوینی خس و خاشاک کی طرح بہ گیا۔ میں اب بڑے انہماک سے بابیت کی تبلیغ کرنے لگی تھی جب قزوین میں مرا حلقہ بہت بڑھ گیا تو میں کربلا چلی گئی۔ تقریروں میں جوش اور شدت کے عالم میں میں اکثر چہرے سے نقاب الٹ دیتی۔ اور وہ جو مجھ سے بڑی بڑی عالمانہ بحثیں کرتے ہوئے میرے ذہن کے تمام حربوں کے بعد حسن کے اس حربے سے اتنے مسحور ہو جاتے کہ بحث کرنا بھول جاتے۔ یہ وہی زلیخا اور زنان مصر والی ترکیب تھی۔ آخر میں عورت تھی۔ عورت کا آخری حربہ کیوں نہ استعمال کرتی۔

بدر الفسا کی مصیبت کے مصنف نے، اتنا غلط نہیں لکھا کہ میں آہستہ آہستہ پردہ توڑ رہی تھی۔ برادن سے صبح ازل نے محض میری عزت میں کہہ دیا ہوگا کہ میں پردے کی پابند تھی۔ لیکن میرا کام تو تمام پابندیاں توڑنا تھا۔ مذہبی پابندیاں، شیریں کی پابندیاں یعنی تخلیق جمال کی پابندیاں، اور موضوع جمال کی پابندیاں۔ میں نے باب کی روحانیت کے ساتھ مزدک کی تعلیم کو حل کر دیا۔ میں اپنے ہی محاذ پر لڑتی رہی۔ باغی عورت کے محاذ پر۔ ابھی تک تو وہ جماعت نہیں بنی تھی اور قوام السلطنت نے نہ وزارت کی تھی۔ نہ نکالے گئے تھے۔ لوگ جمال الدین افغانی کا نام فخر سے لیتے تھے۔ میری طرح وہ بھی ایک متعصب کافر باغی تھا۔ دونوں نے ناصر الدین شاہ قاچار کو قتل کیا تھا۔ اور دونوں کا کام بادشاہوں پرویزوں، جہانگیروں نے تمام کیا۔ وہ مردوں کی جمہوریت کے محاذ پر لڑا، میں روحانی جمہوریت اور عورت کی آزادی کے محاذ پر لڑتی رہی۔ میں مزدک کی ہم خیال تھی کہ کیوں عورت ایک ہی مرد کی پابند بنا دی جائے ممکن ہے کہ اس کا مرد ملا محمد قزوینی جیسا خشک نوجوان ہو۔ نقاب کے شگاف کر میں نے اور زیادہ چاک کر دیا تاکہ عورت کی صورت..... اور اس کے دماغ اچھی طرح پہچانے جا سکیں۔

جب میں کربلا سے نکالی گئی تو بغداد پہنچی۔ وہاں سے نکالی گئی تو کرمان شاہ اور ہمدان ہوتی ہوئی پھر قزوین واپس آ گئی۔ اب باب کا جمال میری ہستی میں اس قدر بس چکا تھا اور اپنے شوہر سے میری نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں نے بابیوں کو فتوے دے دیا کہ وہ میرے شوہر ملا محمد اور اس کے باپ ملا تقی کو قتل کر دیں۔

اور اس طرح جیسے تمہارے ملک میں ہوتا ہے ذرا سا اشارہ پاتے ہی انھوں نے میرے خسر کو نہ صرف قتل کیا بلکہ ناک کان کاٹ کے اس کی لاش کو مسخ کر دیا۔ اب سارا قزوین میرا اور تمام بابیوں کا جانی دشمن تھا۔ لوگ مجھے قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے میں نے بھیس چھپا کے خراسان کا رخ کیا۔ جہاں شاہ ایران کے خلاف بغاوت عروج پر تھی۔

راستے میں مجھے محمد علی بارفروشی ملا محمد علی باب میرے لئے مرد کی روح اور وجدان تھا۔ محمد علی بارفروشی مرد کا ذہن اور جسم۔ اور تم نے بہت سے قصے تو سنے ہوں گے۔ کیونکہ آوارگی کے قصے عورت کی زندگی ہی شروع ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے۔

سبزہ خرتوں کے گرے سائے میں زریں تاج قدم سے قدم ملائے ارشد کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اپنی دانستان سناتی ہوئی نقاب الٹی ہوئی تھی، اس کا چہرہ چاند کی روشنی میں چاند سے زیادہ بے جان اور ٹھنڈا معلوم ہو رہا تھا۔ ارشد نے اس سے پوچھا "تمہارے اور محمد علی بارفروشی کے درمیان کیا واقعہ پیش آیا۔ کیا سچ مچ اس کے جسم سے تمہارے جسم کو محبت تھی۔ تم جو فنا نہ طور پر تمام عمر محمد علی باب کی روح کی شیدا رہیں۔

وہ مسکرائی۔ چاند کی سی ٹھنڈی مسکراہٹ جس سے پتہ نہیں چلتا کہ اس کرے پر زندگی کے آثار ہیں یا نہیں۔ اور کہنے لگی "خدا جانے جب تم نے کسی عورت کے متعلق ایسا کوئی الزام سنا ہے تو کبھی یقین سے کہہ سکتے ہو کہ یہ الزام صحیح ہے یا غلط۔ صرف ملزم عورت اور ملزم مرد

جانتے ہیں کہ یہ کتنا صحیح ہے اور کتنا غلط۔ اور کبھی کبھی جو واقعہ پیش آچکا ہے غلط معلوم ہوتا ہے اور جو پیش نہیں آیا ہے صحیح معلوم ہوتا ہے"۔

قصہ مختصر یہ کہ میں اس سے بار بار ملی۔ خلوت کی ملاقاتیں۔ باب میرے قصے محض روح تھا۔ ملا محمد محض جسم، محض ہوس۔ محمد علی بارفروشی ان دونوں کے درمیان تھا، ذی روح جسم، جسم کے اندر جان۔ میں اس سے بے حجاب ملتی رہی۔ اگر کوئی ان ملاقاتوں کو زنا جائز کہتا ہے، فاسقانہ قرار دیتا ہے، قرار دے لے۔ مجھے ایسے مرد کے جسم کی ضرورت تھی جو میری ٹکر کا ہو۔ جس سے مل کے میں اپنے آپ کو اس سے بدتر نہ سمجھوں۔ اس کے علاوہ میں عورت تھی، عورت کے جسم میں مجھے مرد کے جسم کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔

یہاں تک کہ قزاقوں نے قافلہ لوٹا اور ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ میں گرفتار ہو کر طہران آئی۔ یہاں میں افواہ اور افسانہ بن گئی۔ شیریں کی طرح، نور جہاں کی طرح۔ لوگوں نے مجھ اسیر زندان کو طہران کی گلیوں میں دیکھا۔ ہارون الرشید کی طرح۔ میری شہرت سن کے ناصر الدین شاہ قاچار جہانگیر بن گیا۔ گویا میں نے روحانیت کا دوسرا کنجر تیسری نور جہاں کی طرح بڑے بھولے پن سے اڑا دیا تھا۔ لیکن میں جو کبھی نور جہاں تھی نور جہاں کی زندگی سے سبق لے چکی تھی۔ میرا شیر افگن محمد علی بارفروشی مجھ سے چھن چکا تھا۔ مگر میں شراب کے ایک پیالے کے عوض کسی شہنشاہ کی سلطنت خریدنا نہ چاہتی تھی۔ جمال الدین افغانی کی طرح اپنے سوتیلے رفیق کی طرح میری زندگی کا مقصد بھی شہنشاہوں کے تختے الٹنا تھا۔ فرہاد کے تیشے کو زمین کی گہرائی میں دفن کرنا تھا۔ ناصر الدین شاہ نے جب مجھے اپنی خاص الخاص ملکہ اپنی نور جہاں بنانا چاہا تو میں ہنسی۔ ایک شعر جو میں نے بڑی عقیدت سے انکسار و عجز کے عالم میں باب کے لئے لکھا تھا، اب استغنا و طنز کے عالم میں شہنشاہ کو لکھ بھیجا۔

تو ملک و جاہ سکندری، من و رسم و راہ قلندری
اگر آں خوش است تو در خوری وگر ایں بدست ہر اسٹر

اور ظاہر ہے کہ اس جرأت انکار کی سزا مجھے کیسے نہ ملتی۔ میں بڑی بے دردی سے قتل کی گئی۔ اپنی موت کا مزا اور اس کی تفصیل مجھے یاد نہیں۔ باغ میں گانت سے میرا گلا گھونٹ دیا گیا۔ یا مجھے کنویں میں دھکیل دیا گیا اور کنویں کو پتھروں سے پاٹ دیا گیا یا میری زلفیں چاروں طرف سے کاٹ ڈالی گئیں اور باقی بالوں کو کھینچ کر دم میں باندھ کے گھسیٹتے ہوئے مجھے دار الفضا لے گئے۔ غرض ہم ایرانی بھی تم ہندوستانیوں سے کم وحشی نہیں۔

پھر زور سے سائرن بجا۔ اور دفعتہً رک گیا۔ یہ وہ ہوائی جہاز تھا جو چوری سے لڑائی کا سامان لایا کرتا تھا۔ چند منٹ بعد پھر سائرن کی دلدوز چیخ سنائی دی، اور سکرات کی طرح اکھڑے ہوئے سانس کی طرح سنائی دیتی رہی۔ وہ ہوائی جہاز دیکھ بھال کی اڑان کرنے کے لئے دور پر دو سبز اور سرخ نقطوں کی طرح پرواز کر رہے تھے۔ قریب ہی گھڑ گھڑاہٹ کی آواز آئی۔ سڑک پر یہ اس کی اپنی جیپ تھی۔ بالآخر شیخ احمد اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

زرّیں تاج مسکرائی۔ چاند کی پھیکی موہوم مسکراہٹ۔ چاند میں پانی نہیں ہوتا۔ اس لئے زندگی نہیں ہوتی۔ زرّیں تاج ایک خاص تمدن کی پیداوار تھی۔ اگرچہ وہ اس سے آگے آگے رہی۔ اب اس جیپوں کی دنیا میں اس کا کیا کام تھا۔ وہ جو اعلیٰ ترین فارسی شعر لکھتی تھی۔ اب گویا ایک کاہستانی شتر الاپ رہی تھی۔ نذر اوغلی سڑک پر جاؤ۔ میں نیچی سڑک سے جاؤں گی۔ وہ راہ آچکا تھا۔

وہ تو اضحیٰ کی طرف چلی گئی۔ چاند فنا میں غائب ہو گئی۔ اور ارشد نے جیپ میں بیٹھ کے محسوس کیا کہ اس کے لئے مستقبل ابھی بہت بہت دور تھا۔

حیات اللہ انصاری

آخری کوشش

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا:
"ٹکٹ!"

گھسیٹے نے گھگھیا کر بابو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ماں کی گالی دے کر اسے پھاٹک کے باہر دھکیل دیا۔ ایسے بھک منگوں کے ساتھ جب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟

گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستہ بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سنیں، ٹھوکریں کھائیں، بیسیوں بار ریل سے اتارا گیا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے تک پیدل بھی چلنا پڑا، ایک، دن کے سفر میں بائیس دن لگے مگر ان باتوں سے کیا؟ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے ——— وطن! پچیس برس کے بعد وطن۔ ہاں پچیس ہی برس تو ہوئے۔ جب میں کلکتہ پہنچا ہوں تو کالی مل کھلی تھی اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آ گئے وطن۔ ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے۔ اگر یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو دو کوس کا کچا راستہ اور ——— دو گھنٹہ کی بات۔

اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جن کا پچیس سال سے مزا نہیں چکھا۔ کلکتہ میں گھر کے نام کو سڑک تلی یا دکانوں کے تختے، یا پھر شہر سے میلوں دور ریتیکیار کی جھونپڑیا۔ جس کی زمین پر اتنے آدمی ہوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر کی جگہ نہ ملتی تھی۔ رہے اپنے لوگ سو وہاں اپنا کون تھا سب غرض کے بندے بے ایمان، حرامزادے، ایک وہ سالا تھا بھندو، اور وہ دوسرا تھا بھورا، اور وہ ڈائن بھنگوی جو خوبچے کی ساری آمدنی کھا گئی۔ وہ طوں کے مزدور ——— بھائی ہیں مگر مزدوری کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔ جہاں جاؤ کوئی دو سا مزدور سفارش لئے موجود۔ یہاں سفارش کرنے والا کون تھا؟ ——— جب جمیلہ نے آ کر مجھے سکم سنایا ہے کہ "تیری میعاد ختم" تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے۔ بس اک دم سے گھر کی یاد آئی۔ گھر! کیا چیز ہے!

گھسیٹے کے دل کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی شکھ مل جائے گا، اور گھر اب قریب تھا۔

اسٹیشن سے کچھ دور آکر گھسیٹے بھر چکا سارہ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکستہ حال کھڑی دھواں اڑا رہی تھی جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں، کچی سڑک کی جگہ اب پکی سڑک تھی اور اس کے برابر برابر مل تک ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں سڑک خوب آباد تھی، مزدوروں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے غول آجا رہے تھے۔ اتنی دیر میں کئی موٹریں فراٹے بھرتی نکل گئی تھیں۔ ایک مال گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی تھی۔ غرضیکہ جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اتر کر، اپنے ہی قصبہ کا راستہ پوچھوں۔ یہ آپ ہی آپ ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور آکر جب شکستہ مل کی حدیں ختم ہونے لگیں اور اونکھ کے کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ آگیا۔ تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا میرا راستہ ٹھیک ہے۔

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد اپنے قصبے کے تاڑ دکھائی دینے لگے۔ ذرا اور چل کر شاہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جس کا ایک مینار تو ناچتی ہوئی بیلوں سے منڈھا اور جنگلی کبوتروں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلم زمین پر لیٹا گائی کی مخملیں چادر اوڑھے تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی گھسیٹے کے بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چکی تھیں، بچھیں، برسوں کے بھاری بوجھ کے نیچے سے اکدم پھڑپھڑا کر، تڑپ کر نکل آئیں، اور کمسن دیہاتی بچوں کی طرح سامنے ناچنے کودنے لگیں۔ وہ زمانے آنکھوں کے سامنے پھر گئے جب اس مسجد کے گرد برساتی پانی بھر جاتا اور گاؤں بھر کے لونڈے ننگے اس میں نہاتے تھے۔ اس وقت بھی یہ کھڑا مینار یونہی اکڑا تھا اور لیٹا مینار یونہی لوٹا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بیرا، بقاتی، بلاقی، چنو، نیولا، سورج، بلّی اور وہ کنوا سالا کیا نام تھا اس کا، اور کون کون، ساری کی ساری ٹولی جمع ہوتی تھی اور دن بھر سیار مار ڈنڈا اڑا کرتا تھا۔ وہ گڑھیا کے اس پار امرود کا باغ تھا۔ اس پر کبھی کبھی لونڈوں کا، پڑا کرتا تھا۔ لونڈے گھس گئے اور چپکے چپکے کچے پکے امرود نوچ نوچ کر جیبوں میں بھرنے لگے اور کھوالا مان بہن کی سناتا دوڑا اور ادھر آتا نا تا میں سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے امرود کھسوٹ رہے تھے کہ ادھر سے ایک فقیرنی اُنکلی جو منمنا منما کر گا رہی تھی۔ کچھ لونڈوں کو سوجھی شرارت۔ وہ جو پل چڑھ پل چلا کر بھاگے، پھر کیا تھا سب سر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بلاقی رہ گیا۔ ارے ڈر کے مارے اس کی جو گھگھی بندھی ہے اور وہ جو لگا ہے فقیرنی کے سامنے ہاتھ جوڑنے.....

گھسیٹے یہ یاد کر کے بے اختیار ہنس پڑا۔

سورج دن بھر کا سفر طے کر کے افق کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دھوپ میں ملائمت آگئی تھی اور ہوا میں خوش گوار خنکی۔ راستے کے ایک طرف پتاور کے ہرے بھرے جھاڑ تھے، جن کے بیچ بیچ سے بڑی بڑی سرکنڈیاں سروں کو نکالے جانوں کی طرح کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ لمبیرا لینے والی مینا ؤں اور کوّوں کا شور، کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں، ہلواہوں کی ہٹ ہٹ، باغوں کے رکھوالوں کی ہو ہو، ان سب سے ہوا اسی طرح بسی ہوئی تھی جیسے پتاوروں کی بھینی بھینی میٹھی میٹھی خوشبو سے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے یعنی کھیت، درخت، ہوا، آنے والی صدائیں اور خوشبو سب قریبی رشتہ دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں۔

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آتا ہوا ملا۔ آگے آگے ایک لڑکی پھٹی اوڑھنی سر سے لپیٹے گاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہلوں کو کندھے پر رکھے، بیلوں کو ہنکاتے چھ سات مرد تھے۔ ان لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ نہ کی مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص سے نگاہ ملی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا جیسے کوئی دور دراز سفر سے آنے والا اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

ادھر سورج افق کے دامن میں چھپا ادھر قصبہ آگیا۔ اس کا نشان ایک اکل کھرا تاڑ تھا جس سے کچھ دور ہٹ کر آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھندلکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام سے ایک بہت رومان بھری یاد انگڑائی لے کر اٹھی اور گھسیٹے کے

پاؤں تھام لئے۔ وہ بلا ارادہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سائے کی جھاڑی اور گڑھیا' یہیں دلاری سے چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ وہ بھرے جسم کی جھانپی دلاری جس کے نہ رونے کا ٹھیک پتہ چلتا تھا اور نہ ہنسنے کا۔ جب وہاں بیٹھ کر وہ دلاری کا انتظار کرتا تھا تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے شہر جاؤں گا' نوکری کر دوں گا۔ دونوں وقت چنے چبھاؤں گا مگر روپیہ جوڑ جوڑ رکھوں گا۔ پھر جب ڈھائی سو روپیہ ہو جائے گا تو واپس آؤں گا اور ہیر الال کی طرح اکدم سے ایک گوئی بیل لے کر کھیتی شروع کر دوں گا۔ اس وقت دلاری میری کتنی تعریف کرے گی۔ میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹہلتے آجایا کروں گا۔ وہ آئے گی ضرور اور وہاں درخت کی جڑ پر بیٹھ کر گڑھیا میں ڈھیلے پھینکے گی' گنگنائے گی' میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنسے گی ——— بڑی چڑیل تھی۔ نہ جانے اب کہاں ہے؟

گھسیٹے درختوں کے اندر گھس کر دیکھنے لگا کہ پرانی گڑھیا اب تک ہے؟ ہاں ہے تو ——— اور وہ سامنے بھی کا درخت بھی ہے جس کی جڑ پر وہ بیٹھتی تھی۔ کیا زمانہ تھا!

گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور قصبے کے اندر چلا۔ مگر اب اس کی چال دھیمی تھی۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سننا بھول گئے تھے۔ ایکا ایکی ایک موڑ پر نک پٹا جیسے کوئی بری بات اک دم یاد آ گئی ہو۔ یہی جگہ تھی جہاں پہلے اس نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شبن میاں کی تعویذ کا بٹن نوچ لیا تھا۔ ادھر شبن میاں گھر کے اندر آئے اور اُدھر ڈانٹ لگائی "گھسیٹے! ——— کدھر مر گیا؟" ٹانگیں پھیلا کر دونوں بورٹ میرے منہ کی طرف بڑھا دئے۔ ان کو اتارو' پھر جرابیں اتارو' پھر انگیوں کو تولئے سے پونچھو' پھر جوتی لا کر پاؤں کے نیچے دھرو ——— شبن میاں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ ان میں سے دو ایک ہمارے پاس بھی ہوتیں! ہمارے پاس کیا تھا؟ ایک پھٹا کرتہ پاجامہ پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑے ہو جاتا تو خاں صاحب پھر کسی کا پرانا دھرانا جوڑا دے دیتیں۔ "پھر پھاڑ لایا؟" ——— "اس کے بدن پر تو کانٹے ہیں" ——— "یہ کہاں سے کھسوٹ لایا؟" ——— "کھیتے کو کبھی تمیز نہ آئے گی۔" ایک بار شبن میاں کے کرتے میں جو گیا تو دیکھا کیا ہوں کہ قمیص کے کف کے دو بٹن پلنگ پر پڑے چم چم کر رہے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ایک مٹھی میں دبا لیا۔ تھوڑی دیر میں شبن میاں چلانے لگے "ایک بٹن کیا ہوا؟ کون لے گیا؟" میں نے جی میں کہا۔ میں نے لایا ہوں۔ کہو کیا کہتے ہو؟ بٹن تو دو دن گا چاہے کچھ کرو۔ بلکہ اب تو تمہارے گھر کام بھی نہ کروں گا۔ سب کی آنکھ بچا کر باہر چلا آیا۔ میری قمیص میں آستین کہاں تھی؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگایا کہ بٹن اور بٹنبر دونوں چھپ گئیں اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتوں کھیتوں گھومتا رہا۔ جب رات آ گئی تب مجھے ہوئی کہ اب کہاں جاؤں گا؟ گاؤں میں ادھر اُدھر بھٹکتا پھرتا تھا کہ اپنے جیبری کھیت میں لگے ہوئے دیکھا۔ تو شبن میاں کا سونے کا بٹن لے آیا ——— سونے کا بٹن" وہ تھپڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا۔ سونے کا بٹن! کلکتہ میں چار پیسے بکتا ہے۔ جتنے چاہو اتنے لے لو۔

پچھیروں اور نچی نچی کچی دیواروں پر شام کی سانولی رنگت چھا گئی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی جس سے دل کو عجیب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چولھے جل گئے تھے جن کا دھواں اور سرخی چھپروں سے نکل نکل کر بلا کسی گھبراہٹ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کیسے بھاگی جا رہی تھیں۔ دوارے پر لڑکے لڑکیاں اودھم مچا مچا کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے جیسے امیر ابلیتے وقت جنگلی مینائیں ——— ایک گھوڑا دن بھر دوڑ دھوپ کر کے ابھی ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے منہ مار رہا تھا۔

آخر مسجد آ گئی۔ اسی کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔ پہلی تاریخوں کا ہلال مسجد کے ایک مینارے سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بارات یاد آ گئی جو باجے گاجے لئے' مشعلیں جلائے' ایک کمزور سی ناؤ پر چڑھی گنگا کی خونی لہروں کو پار کر کے کنارے

آ اتری تھی۔

بنیا بھی آ گئی۔ اس کے پار آبادی سے ذرا ٹکل کر گھر تھا۔ گھسیٹے کا دل امید و بیم سے زور زور سے دھڑکنے لگا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ آنکھوں کے سامنے گھر کی تصویر پھر گئی۔ بڑا سا صاف ستھرا لیپا پوتا چھپر۔ دو بڑی بڑی انائج کی کھٹیاں۔ رات کو نہ معلوم کب سے اٹھ کر اماں کا گھر گھڑ گھڑ چکی پیسنا اور اس پر گانا "موری چھاگل نہ بولے" دن کو کام کاج کر کے گھر آؤ اور لاکھ چلاؤ "اماں روٹی دے۔ اماں روٹی دے۔" اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ، رو دھو کر سو، اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی ہیں۔ جب اس کا جی چاہتا تب اٹھ کر چولھا جلاتی۔ جیا اور شبراتن! اُفوہ! دونوں کو اماں کتنا پیار کرتی تھی، اور نہیں وہ بھی دونوں بڑی ہی حرامزادی۔ کبھی جو کام کرتیں ——— ادھر ابا کلہاڑی کندھے پر رکھے بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلانے لگتا۔ ادھر اماں پر غصہ آیا اور جھونٹے پکڑ کر دھوئیں دھوئیں ——— واہ ری اماں! جہاں کسی کا جی خراب ہوا، اس کے جی کو لگ گئی۔ پھر تو یہ ہے کہ "ارے آ تیرا سر داب دوں" ——— "اِدھر آ تجھ گجر اتار دوں" ——— "چاندنی میں بیٹھ کر نہ کھا" ——— "دونوں وقت ملتے نہ چلا" ہر وقت ٹنگا تار رہی ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ دوا پلا رہی ہے ——— کھانے کی کتنی شوقین تھی۔ کچے پکے، گلے سڑے، کھٹے میٹھے جیسے بھی آم مل جائیں بڑے مزے سے بیٹھ کر سب کھا جاتی تھی۔ کچے پکے امرود، جھبر بیریاں کتھے اور کیا کیا سب بہت شوق سے کھاتی تھی مگر بچوں کا کھانا اسے بُرا نہیں لگتا تھا۔ وہ قصہ جو ہوا تھا کہ اماں کو کہیں سے گڑ کی بھیلی مل گئی۔ اس نے طاق پر رکھ دی، میں ادھر سے آؤں چوہے کے ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ ادھر سے آؤں چوہا کے ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ شام کو اماں نے جو دیکھا تو دماسا گڑ تھا وہ لگے ڈکارنے۔ "کون کھا گیا؟" اماں سمجھ گئیں۔ سہولیت سے بولیں "چوہا کھا گیا ہوگا ——— تو کھا گئی ہے تو۔ کیا چوہے بھی گڑ کھاتے ہیں؟" اماں نے کہا "کیوں؟ کیا ان میں جان نہیں ہے؟" میں نے جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لوٹوں گا تو گڑ کی ایک پاری بھی لاؤں گا۔ تب تو یہی ابا چٹخارے مار دیں گے "واہ کیا مجا ہے" جیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا کر تکیں گی۔ منہ سے پانی چھوٹے گا۔

گھر میں اب کون کون ہوگا؟ ابا، اماں بھلا کیا زندہ ہوں گے۔ ستر اسی برس کون جیتا ہے؟ جیا اور شبراتن کہیں بیاہ دی گئی ہوں گی۔ ہاں فقیر تو جوان ہوگا۔ بھرے کے تو بیوی بچے ہوں گے اور بکریاں؟ اُفوہ گلو کے ناتنوں کی نہیں ناتنیں ہوں گی۔ گلو زندہ ہو تو پہچانے گی؟ جب بھوکی ہوتی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کر کیسا میں میں کرتی۔

(۲)

سامنے گھر ہے کہ نہیں؟ بنیا سے باہر آتے ہی گھسیٹے کے دل نے دھڑک کر بڑی بے تابی سے پوچھا ——— وہ جگہ تھی وہ ——— ہاں ——— وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اوس کی ماری بیمار چاندنی میں دور سے اجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصہ تو ٹیلے کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ آدھا جو کھڑا تھا اس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر تھا جس کا پھونس دھوؤں کھانے بوسیدہ مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔ چھپر کے سامنے کی طرف چوحدی کی جگہ جھانکڑوں، تاڑ کے پتوں اور کسی سوکھی بیل کا ملا جلا ایک اڈم تھا جن کے پتلے پتلے ٹیڑھے بیڑھے سلاخ کیچوڑوں اور کنکھجوروں کی طرح زمین پر بچھ رہے تھے۔ گھر اپنے سناٹے میں تیر سنسان تھا۔ اندر نہ چولھا جل رہا تھا نہ چراغ۔ گھر کی ایک ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم خود مکڑے مکڑے کو محتاج ہیں ——— تم کو کیا کھلائیں گے؟

یہ گھر تھا جہاں مسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔ گھسیٹے کی امیدوں کا چمن جسے وہ بائیس روز سے، پچیس برسوں کے پچھلے زمانوں کے

خون سے سینچ رہا تھا، اکبارگی مرجھا گیا۔ اس کا دل بار بار شک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہوگا، وہ لوگ کہیں اور اُٹھ گئے ہوں گے، اور بار بار بکریوں کے مُحوت کی کھراند اور نابدان کی سڑاند جو بوجھل ہوا سے دبی ہوئی گھر کے گرد مقید تھیں، ان بالوں کے گھونسوں کو ڈھا دیتیں۔ گھسیٹے آدھ گھنٹے تک جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دور کہیں پر ایک پلّا رو رہا تھا، رفتہ رفتہ اس کی آواز سے ایک طرح کی ڈھارس بندھی اور یہ کھکھارا، جواب نہ ملنے پر پھر کھکھارا بار بار کھکھارنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا:

"اندر چلی آؤنا۔"

اس دھوکے سے گھسیٹے کی ہمت اور بڑھ گئی۔ اب کی وہ سہارا لینے کو سچ مچ کھکھارا، پھر کہنے لگا:

"کون فقیرا؟"

"ہاں!"

فقیرا ذرا پیچھے ہٹ کر بولا:

"تم کون ہو؟"

"ذرا ادھر آؤ۔"

فقیرا نکل کر قریب آیا اور بولا:

"تم ہو کون؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ذرا سنو تو بھائی، تم فقیرا ہو نا؟"

"ہاں ——— کہہ تو دیا۔"

"تم یہیں رہتے ہو؟"

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصہ تو غائب ہو گیا، مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہچنوائے۔ اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ کام بھی کرنا ہوگا۔ آخر دل کڑا کر کے بولا:

"میں بائیس روز کا سفر کر کے آ رہا ہوں ——— تمہارے پاس۔"

اب بھی فقیرا کچھ نہیں سمجھا مگر بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا:

"تو اندر آؤ۔"

اندر آ کر گھسیٹے کی ہمت بندھی اور ساتھ ہی راحت پانے کی امید بھی بلاوجہ ہری ہونے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچ کر چراغ جلایا۔ چھپر کے نیچے سات بکریاں اور بکریوں کے بچے بندھے تھے۔ انہیں سے شاید گھبرانے کی روئی پھٹتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ کر زمین پر ایک چھدا ٹاٹ بچھا تھا جس پر ایک میلی سی چیز ہو شاید کبھی رضائی ہو مگر اب چیتھڑا ہو کر گمنام ہو گئی تھی، اوڑھنے کے لئے پڑی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے ہوئے چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھا۔ دُبلا پتلا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کھردری اور اس پر دونوں طرف دو ٹیڑھی لمبی جھریاں، جیسے کچی دیوار پر برسات کے پانی کی لکیریں۔ بال کھچڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا! مصیبت زدہ گھسیٹے دیکھنے میں اس سے زیادہ جوان تھا۔

گھسیٹے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا: "بھیا تم تو جوانی ہی میں بڑھاپے گئے؟"

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:

"جوانی تو کھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے۔"

"سچ ہے بھیا ——— بھورا، جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

اب فقیرا ٹھٹکا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو ——— گھسیٹے تو نہیں ہو؟"

"ہاں گھسیٹے ہوں، اور کون بائیس دن لگاتار کھا کر آ رہا ہے؟"

بھیا کہہ کر فقیرا اس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچ کر لپٹا لیا اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے، اس کے آنسو دھل دھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رو دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے کو ڈھارس دلائی کہ "اب نہ رو بیہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آ گئے ——— اماں کو دیکھو گے؟"

گھسیٹے کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اماں! ——— ہے کیا؟"

"ہاں!"

چھپر کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فقیرا اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا:

"وہ پڑی ہے۔"

گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جوش میں اُدھر بھاگا۔

یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن ایک انسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔ سر کے بال بیمار بکری کی دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑ کر گدے کی طرح جم گئے تھے۔ آنکھیں دھول میں سونٹھی کوڑیوں کی طرح بے رنگ، اپنے ویران حلقوں میں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں ان کے کونے پیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت تھے۔ گال کی جگہ ایک پتلی سی کھال رہ گئی تھی جو دانتوں کے غائب ہونے سے کئی تہوں میں ہو کر ہڈیوں کے نیچے آ گئی تھی۔ گال کے اوپر کی ہڈیوں پر کچھ پھلاپن سا تھا، بدگوشت ہو یا ورم! جیسے روتے روتے ورم آ گیا ہو۔ گردن اتنی سوکھ چکی تھی کہ ایک ایک رگ نظر آ رہی تھی۔ ننگے سینے پر چھاتیاں تھیں۔ رہی تھیں جیسے پھینکی ہوئی اُلٹی بنڈی کی خالی جیبیں پیچھے کی ایک ایک بھری محنت گھناؤنی مصیبتوں کی مہر تھی جسے دیکھ کر بے اختیار ڈھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔

فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے جھوٹ موٹ کا نوالہ بنا کر اپنے منہ کی طرف بار بار لے جانے لگی جیسے کچھ کھانا مانگتی ہے۔ بڑھیا نہ معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آتا تھا "باب ..... باب ..... باب ..... باب ..... باب ..... باب ....."

اس کی آواز ایسے ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھی، جہاں کے رہنے والے آگ سے جل مرے تھے اور اب اس کے کھنڈروں میں دن کو ہُو چیختے اور رات کو سیار روتے ہیں۔

فقیرا نے گھسیٹے کی طرف دیکھ کر کہا:

"جب اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔ چاہے جتنا کھلاؤ اس کا جی نہیں بھرتا۔ منہ سے نکل نکل پڑتا ہے، پھر بھی مانگے جاتی ہے۔"

آخر گھسیٹے بڑی کوشش سے بولا:

"اماں!"

آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کراہ رہا تھا۔

فقیرا نے کہا: "نہ وہ سنتی ہے نہ سمجھتی۔ بس کھانے کی بات سمجھتی ہے۔"

بڑھیا کا پوپلا منہ رہ رہ کر مکنی کی طرح چل رہا تھا، بات کی آواز نکل رہی تھی اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منہ کی طرف جا رہا تھا مگر ان حرکتوں پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ پنجر زندہ ہے۔

یہ وہی چوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منہ اندھیرے سے دوپہر تک مسلسل چکی پیسا کرتی تھی! جسے دن رات یہی دھن سوار رہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے، اس نے کیسا کیسا اپا جی یا رانا ذرا ذرا سی چیز کے لئے کیسا کیسا ترستی رہی!

گھسیٹے کے دل میں ماں کے لئے ترس بھرا پیار امنڈ پڑا جو ہاتھ پھیلا پھیلا کہ یہ دعا مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر اور اب تو اسے ناپاک دنیا سے اٹھا لے۔ اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اسے سکون مل جاتا مگر افسوس آنسوؤں جیسی نعمت کو سوں دور تھی۔

فقیرا کے لئے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے کہا:

"بھیا تم ذرا ہاتھ منہ دھو لو۔ میں کھانے پینے کا کچھ بندوبست کروں۔"

فقیرا بھاگتا ہوا بنیا کے اس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا اور مانگ لایا اور پھر چولھا جلا کر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی چولھے کے پاس آ بیٹھا اور بولا:

"اتنا آٹا؟ کیا تم نے ابھی نہیں کھایا؟"

"نہیں، آج اپواس ختم ہو گیا تھا تو میں نے کہا کہ ایک رات یوں ہی سہی۔"

"اب کھیتی نہیں ہوتی؟"

"وہ کب کی بند ہو گئی۔ ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہو گئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ دو برس تک نکاریاں ورکاریاں بڑیں مگر دکھیں بکائیں نہیں۔ لگان تک نہیں ادا ہوا۔"

"بھورے کا بیٹا گیا؟"

"سوتی چنکی ایک بچی لے گئی۔ پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اس کی بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہو گیا مگر اس کی طرف سے کوئی گواہ کھڑا ہوتا؟ دو جینے سب کو گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا: 'فقیرا مجھ سے تو اب نیزی طرح نہ بھوکوں مرا جائے گا اور نہ اس گاؤں میں رہا جائے گا۔ بلاسے جیل ہو جائے چار دن 'عیس' تو کر لیں گے ——— دوسرے دن منہ اندھیرے کہیں نکل گیا ——— اتنے کہنا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔"

"بھیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

"بھیا تو مزدوری کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شبراتن کا دس کوس پرے کے والوں میں بیاہ ہو گیا ہے۔ ایک امرود کا باغ ہے، کسی طرح گذر بسر ہو جاتی ہے مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی۔"

ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر فقیرا روٹی کے کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا:

"تمہارے جانے کے بعد بھیا وہ وہ فقیس آئیں۔ سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا 'جانا' تھا ابا کہا کرتے تھے کہ "یہ سب پتے پیٹ بھرے

ہیں پیٹ بھرے" سچ کہتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گذری جب چولھا نہ جلا ہو۔"

گھسیٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا اور لپکتے کوئلوں کی طرف اس طرح تکنے لگا جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈھ رہا ہو۔

فقیر نے اس سناٹے کو توڑا:

"کہاں کہاں رہے گھسیٹے؟"

"ہم کلکتہ جا کر ایسے پھنسے کہ خط پتر کو بھی چار پیسے نہ بچے۔ گھر یاد کر کر کے کتنی بار رونا آیا۔ بڑی کٹھن گذری وہاں، ملوں کی خاک چھانی، امیدواری میں کام کیا، بھوت گھر میں روئی ڈھوئی، ہفتوں قبض رہتا تھا، چار سال یکسا چلائی، پھر خونچہ لگایا، ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس پینے دینے کو ذرا پیسہ ہو اس کے لئے تو وہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ایسے ویسوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو روٹے رلائی نہیں آتی تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

فقیر نے لال لال روٹی کپڑے پر رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

فقیر بولا:

"بھیا ذرا چپکے چپکے کھاؤ۔ اماں سن لے گی تو چلا چلا کر رات بھر نہ سونے دے گی؟"

گھسیٹے نے تنک اور حیرت سے فقیر کی طرف دیکھا:

"تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی؟"

"ہاں، مگر بھائی کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سن لیتی ہے اور کھانے کی بُو بھی پا لیتی ہے اور پھر باپ، باپ کہنے لگتی ہے۔"

گھسیٹے بجھتے انگاروں کی طرف تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ منہ کا نوالا بلا پانی کے گھونٹ کے نہ اتار سکا۔

(۳)

گھسیٹے گھر کے دوارے ہونٹوں پر بکری کا مسکالے، دھوپ میں ننگے بدن بیٹھا، اپنے میلے کرتے کے چیتھڑے چن رہا تھا۔ کئی روز سے ہاتھوں پیروں اور ہونٹوں کو چٹخا دینے والی سرد ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے جن میں سینکڑوں میل کا گرد و غبار بھرا تھا جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پورے اور درخت ہوا کی چوٹ کھا کھا کر جھک جاتے تھے اور بے کسی سے اپنے پتے پھڑپھڑاتے تھے جیسے ہوا سے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو للہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی چادروں کو بدن پر لپیٹے، ہاتھ پاؤں سکیڑے کندھوں کو آگے جھکائے شوشو کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اجاڑ اجاڑ تھی اور ہر چیز اتنی دکھ بھری کہ بے اختیار جی گھبرا گھبرا کر کہتا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں۔

گھسیٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے دوسرے ہی دن سے وہ ٹوٹے پھوٹے ویران پھیرا، بکریوں کے موت کی کھرا بندا اور اپنی ماں کی باب، باب سے گھبرا گیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلانا اور بکریاں چرانا اور رات کو بوسے کی روکھی سوکھی روٹی اور کبھی کبھی تو رات کو بھی فاقہ! بدن ہے کہ کٹا جاتا ہے۔ اوڑھنے کو کمبل یا پہننے کو دو آدمیوں کے بیچ میں ایک سب سے بڑی کوفت یہ کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گنوانے کے بعد گھسیٹے کو یہاں کی کسی چیز سے اب لطف نہ آتا تھا۔ چوپال کی باتیں روکھی پھیکی۔ گاؤں کی عورتوں میں شرم اور کپاؤ۔ پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانیدار کی طرح اکڑ دکھاتا ہے اور فقیرا؟ وہ تو بات بات میں باپ بنتا ہے۔ سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ کہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں دمڑی دمڑی کے لئے فقیر کا محتاج۔ ہر بات میں اس کا دست نگر رہنا۔

گھسیٹے چلے مار رہا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ دکانوں کے تختوں پر رات کاٹتا، وہ سڑکوں پر جو جاڑوں میں برف کی سل اور گرمیوں میں دہکتا ہوا توا ہوتی تھیں فجر کی طرح رکشا لے کر دوڑتا۔ وہ کبھی کبھی تین تین چار چار فاقے کر لیتا اپنے گھر کی اس زندگی سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک پیسہ والی سگریٹ چار، وہ دھیلے "پان کا بیڑا! وہ پیسے کی ۲۵ بیڑیاں! یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے لئے یہاں وہ ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور تک پھیلے ہوئے سڑک کے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی رہی ہے۔ پندرہ سولہ برس کے سن تک باپ کی اور بھاوجوں کی مار کھائی! کھانے پینے کو ترستے رہے، پھر ہمت کر کے کمانے کھانے کے لئے شہر بھاگے، وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائیں، کہا چلو کلکتہ چلو، وہاں پہنچتے ہی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور سب پاپ کٹ جائے گا، کلکتہ کے پچیس برس! اُفوہ! کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، رکشا تک چلائی، سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لینا ہے تو دھمانی، لاؤ۔ میں کہاں لاتا؟ جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے گھرانے کے گھرانے رہتے تھے۔ جمانتی لے آتے تھے لچھمن بولا دو آنے روز دو تو کھوٹا مہاجن جمانتی ہو جائے گا۔ دو آنے روز اسے دیئے، پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ اسے دو ہی سے دیکھ کر لوگ ہٹ جاتے تھے جب سیٹھ سے خوشامد کر کے ایک اچھی سی گاڑی دے دو تو وہ اکڑ کر کہتا تھا کچھ روپیہ جمع کراؤ نا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کھوٹا کھا جاتا تھا۔ چار سال دوڑتے دوڑتے وہی مرچی کے مرچی۔ بخار جو آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔ اسپتال میں پڑے پڑے مہینوں بیت گئے، اچھے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا اب جہاز رکشا نہ چلانا اور نہ زیادہ محنت کا کام کرنا۔ پھر دو روپیہ قرض ادھار کر کے پان سگریٹ، دیا سلائی کا خونچہ لگایا۔ اب جو آتا کہتا سیٹھ بیڑی لاؤ، بیڑی لاؤ، وہ لاؤ۔ یہاں کیا تھا، کہتے "نہیں ہے صاحب" نہیں ہے، بجور" وہ بھی تماشا کچھ دنوں تک رہا۔ نہ بیٹھنے کو اچھی جگہ ملتی نہ اچھا سامان تھا۔ اس پر جو کچھ بھی آیا حرامزادی بھنگوی کھا گئی۔ نہ جانے مجھ سالے کو عورت رکھنے کی کیا پڑی تھی..... لنگوٹی میں پھاگ.....

گھسیٹے کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں فقیر اسامنے سے آیا اور آتے ہی کڑے پن سے بولا:

"بھر تم نے چرُا کر دودھ بیچ لیا۔ اب ہمارا تمہارا گذارا نہیں ہو سکتا۔ جہاں جانا ہو چلے جاؤ۔"

گھسیٹے نے جواب دیا "کیسی چوری؟ کچھ پاگل ہو گیا ہے تو؟ روز کا یہی قصہ، روز کا یہی قصہ۔ بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا۔ جیسے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں اور بکریوں میں میرا حصہ ہی نہیں؟"

"گھر میں حصہ؟ بکریوں میں حصہ، تو حصہ بٹانے گا؟ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا، پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے، گیا تھا روپیہ کمانے!"

گھسیٹے گرم ہو کر بولا:

"کلکتہ میں کمانا کچھ آسان ہے؟ تو خود تو زندگی بھر قصبہ سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے جس کے دس جاننے والے ہوں جو اس کے لئے ٹکٹم لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس روپیہ ہو کہ کچھ لکھ کر بیٹھے۔ کام کچھ دنوں کے بعد بتاتا ہے کہ آپ ہی آپ؟"

فقیر نے طعن سے کہا:

"ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں روپے کے ڈھیر تو لے کر جاتے ہی ہیں۔ بلّی جو اتنا روپیہ لایا ہے کیسے لایا ہے؟"

اب تو گھسیٹے تلملا گیا۔ وہ سب کچھ سن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں وہ کر کچھ نہیں کیا بالکل ہی نہیں سن سکتا تھا۔ وہ چلا کر بولا:

"اور تو نے کیا کر لیا ہے؟ چوٹا کہیں کا۔ ان بکریوں میں اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا؟ سب کا سب بیچ کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے میں آج ہی اس منحوس گاؤں سے جاتا ہوں۔ بے ایمان کہیں کا....."

گھسیٹے سے بن نہیں پڑتا تھا کہ اپنا سر پھوڑ ڈالے یا جان نکال کر رکھ دے۔ کیا کرے جو فقیر اکہ یقین دلا دے کہ کلکتے میں ہی نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔

کچھ دیر یہی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر فقیر بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ اندر سے اور یہ باہر سے بڑبڑاتے رہے۔

یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا بلکہ پورے چار مہینے سے یہی ہو رہا تھا۔ روز یہی جھگڑا اٹھتا، روز یہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا بڑبڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا تو پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کلکتہ کی یاد آئی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید اب میں ہمیشہ کے لئے اس اجاڑ گاؤں میں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بتانا ہے۔ کاش ایک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ پیسہ آ جاتا تو میں کچھ دنوں اپنی تھکی ماندی آتما کو سکھ دے لیتا۔ چالیس برس کی تھکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو، دروازے پہ سینس بندی ہو، کھٹیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھر والی ہر جوسا ری کے پلو سے نقالی صاف کرے، اس میں دال بھات لا کر سامنے رکھ دے، اس کے پاؤں میں موٹے موٹے کڑے پڑے ہوں جو بڑھی کی طرح آگے آگے ایک طرف جھکے ہوں، جیسے ٹھرائی سالی کا سر۔ بس مجھے تو بس اتنا مل جائے کہ اپنا ایک الگ چھپر ہو، دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی ہو۔ بس ارے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔ اب کہاں، گھر والی کی خواہش اور کہاں بچوں کا ارمان چالیس کا سن ہونے کو آیا.....

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اٹھی کہ اب دو چار برس جوانی اور ہے پھر اندھیرا پاکھ۔ نہ جانے کب موت آ جائے.....

ایک زبردست انگڑائی لی کہ جیسے بنے ایک مار دوں ہاتھ پاؤں مار دوں۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے فقیر کو پکارا:

"بھیا فقیرا!"

فقیر نے پیار کی پکار سن کر فوراً پاس آ گیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حقہ کا ایک دم لے چکا تو گھسیٹے بولا:

"بھیا یہ کب تک کھاتا ہوں کہ میں تجھ کو روں گا جی نہیں۔ مگر کوئی کام بھی تو ایسا ہو جس سے کچھ ملے۔ ارے بھیا تم کہتے ہو تو لکھ کہتے ہیں میں نے پچیس برس بھار ڈھویا، مگر میں کہتا ہوں کہ میں کم سے کم اتنا تو سیکھ ہی گیا ہوں کہ کون کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو پھیری لگاؤں، کیا کروں؟ میں یہ کہتا ہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار جما سکتا ہے؟"

گھسیٹے یہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے اب اور بات نہیں ہوتی، پھر فقیر کی طرف دیکھ کر بولا:

"اگر کچھ ہو سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر یہ ہم کہتے ہیں ..... وہ تو تم مانتے ہی نہیں ——— اس میں تمہارا بھی بھلا ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان بھی گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسے ہوں گے تو سب، ہماری بڑائی کو بھی اچھائی کہیں گے جوگیوں کو دیکھو! ان کے گھر مٹن بھس رہا ہے ہمن بکتے کہ ہم شریف اور وہ رذیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو آگے دم ہلاتے جاتے ہیں کہ اچھے منگو میر بھر آٹا ادھار دے دو، دو کنکڑیاں نمک دے دو، ذرا سی تمباکو دے دو۔ وہ ٹال مٹول بھی کرتے ہیں، دھتکار بھی دیتے ہیں، مگر ہم پھر جاتے ہیں اسے جانے دو، تو کریں کیا؟"

فقیر بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا، گھسیٹے دم لے کر پھر کہنے لگا:

"اور دم کہتے ہیں کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا؟ کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں جیون سے الگ ہی رہ لیں گے۔"

گھسیٹے نے اک دم سے کچھ یاد کر کے فقیر کی طرف تیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا:

"ہاں تمہارا صادی یاد کرنا ہے، روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری میں نہ سہی کسی اور میں سہی۔

ارے ہاں اماں طرح تو کہیں بھی نہیں کرتے اور پھر یہ اماں کے لئے بھی پوچھا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھانے کو ملے گا۔"

فقیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھسیٹے کئی بار یہ باتیں کر چکا تھا مگر تب انہیں سن کر فقیرا کو غصہ آ گیا تھا۔ روپیہ کے لئے کہیں شرافت بھی جاتی ہے؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج آیا تو کل گیا اور شرافت وہ دھن ہے جو پیڑھی در پیڑھی چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا۔ شریف پھول کا برتن ہے جتنا بھی کچرے میں سوند جائے جب بھی مانجو چم چم کرنے لگتا ہے اور جہاں شرافت گئی پھر آدمی مٹی ہو جاتا ہے مٹی۔ مانا جوگیوں کے پاس روپیہ ہے پیسہ ہے، گھر گرہستی ہے، ہم ہی ان کی خوشامد کرتے ہیں وہ نہیں کرتے، ہم ہی ان سے روٹی اور صدا مانگتے ہیں وہ نہیں۔ مگر اس سے کیا؟ ہانڈی لاکھ کٹ جائے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے گا۔ ابھی ہم اور وہ کھیا کے گھر جائیں تو ہم تو چپ تڑے پر بیٹھیں گے اور وہ دور زمین پر۔

فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا، تب سے اس کے دل میں بھی کمانے کی تمنا پیدا ہو گئی تھی لیکن جیسے جیسے دن بیتتے گئے اور گھسیٹے روپیہ کا گھمنڈ لے کر نہیں لوٹا، اس کی خواہش مرتی گئی۔ غریبوں کو کہاں پیسہ ملتا ہے۔ پیسہ آ جاتا تو کوئی غریب ہی کیوں رہتا؟ اس جیون میں بس یہی ہے کہ اپنا دورخ پاٹ لو اور موج مزے سے تو کسی سے بنسی دل مگی کر لو اور کیا دھرا ہے؟ بھوسے کا شہتیر بنا کر تو رہی سہی آس بھی گہری نیند سو گئی۔ لیکن اب جو گھسیٹے روزانہ شام کو، جب یہ دونوں کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھتے، اس جھگڑنے کا یہ منتر سی موہنی سے پڑھتا رہا تو رفتہ رفتہ فقیرا کی سوئی ہوئی آس چونکی، انگڑائی لے کر اٹھی اور پر پرزے نکالنے لگی۔ وہی فقیر جسے کل تک کل کی کوئی فکر نہ تھی، آج جو مایا کے سمندر کی راہ سوجھائی دی تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے، ذرا یہ چھپر بدل جاتا، تھوڑی سی بکریاں اور ہو جاتیں اور دو چار پانچ روپے اکٹھے ہو جاتے پھر ہمارا گھر بس جاتا۔ ارے ہاں اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا؟ وہ رمضانی کی بیوہ، آنکھ ملاؤ تو کیسا ہنستی ہے۔ اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے، کیسا گدرایا بدن ہے! جیسے پکا آم۔ کیسا ٹھمک ٹھمک چلتی ہے! اور کتنی محنتی ہے وہ۔ دو دو بچے، اوپلے وہ تھاپے، وہی وہ منتے، اکیلی جھونپڑی، بانس اٹھا اٹھا کھیتوں میں ڈالے، کیا عورت ہے! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھا لے گا اور پھر میں منہ تکتا رہ جاؤں گا۔

جس دن سے فقیرا کے دل میں یہ خیالات گونجنے لگے، وہ رمضان کی بیوہ سے کتراتی کترانے لگا۔ ادھر وہ سامنے دکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کر نکل جاتا۔ پندرہ بیس روز یوں ہی کٹ گئے۔ ایک دن یہ لکڑی چیرنا تھا کہ وہ اکھاڑ گی پیچھے سے آ گئی، اسے بھاگتے نہ بنی، کچھ باتیں ہوئیں، کچھ ہنسی دل لگی ہوئی۔ پھر وہی ہوا جس کا فقیرا کو دھڑکا تھا یعنی اسی دن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی۔

(۴)

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے فقیرا کو جگایا۔ دونوں تاروں کی مدھم روشنی میں اٹھے اور ایک، ٹوکرہ بے کر بانس سے لٹکا کر ایک ڈونگی سی بنالی اور اس میں خوب سا پیال بھر دیا اور پھر بڑھیا کے پاس گئے۔ گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو چھکلی کی طرح اٹھا لیا۔ آنگن کا کھلنا تھا کہ وہ لگی باب، باب، باب کر کے اشارے سے کھانا مانگنے۔ گھسیٹے نے چلی بار اسے چھوا تھا۔ اسے ایک عجیب اذیت ہوئی جس سے اس کا چہرہ عجب ہوتق ہو گیا۔ ایک۔ طرف تو آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے اور دوسری طرف بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

گھسیٹے نے اسے لے جا کر آہستہ سے جیسے کوئی شیشہ کا برتن ہو، ٹوکرے میں رکھ دیا اور پھر اسے پتوں سے چھپا دیا۔

ایک طرف کا بانس فقیر نے تھاما اور دوسری طرف کا گھسیٹے نے اور دونوں گھر سے باہر چلے۔ کبھی کبھار ان لوگوں کو اس عمر جاتے دیکھ کر

بے کسی سے ہیں ہیں کرنے لگیں جیسے یہ لوگ ان کو ہمیشہ کے لئے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے پردوں کی اوٹ میں منہ چھپائے ہوئے گاؤں کے نکڑ پر آگئے تو پوپھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کے چلنے لگی۔ یہ خوش تھے کہ چلو ہم نظروں سے بچ کر نکل آئے کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے لگا:

"کہاں چلے فقیرا؟"

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا فقیرا کے کلیجے کو برما تا نکل گیا۔ اس کے کندھے کا بانس کانپا۔ کسی وجہ سے گھبیٹے گھبرا کر فقیرا کی جگہ خود بول اٹھا:

"شبراتن کا حال خراب ہے۔ اماں کو لئے وہاں جا رہے ہیں۔"

"اماں کو لئے؟" کسان اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اٹھا:

"شاباش تم لوگوں کو ——— اپنی ہمتاری کی اتنی سیوا کرتے ہو!"

شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہو چکا تھا، اس وقت فقیرا اور گھبیٹے نے مسجد سے ذرا ہٹ کر ایک گلی میں آکر ڈولی رکھی۔ گھبیٹے نے بڑھیا کو جو کنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی، اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پھر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو ٹوکرے میں رسیوں سے باندھ کر اس پر رکھ دیا۔ یہ احتیاط تھی اس بات کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باب باب کہتے وقت ہاتھ بجائے منہ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے۔ مگر یہ احتیاط فضول تھی۔ کیونکہ دس برس سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منہ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگا کرے۔ اب سوائے ادھر کے اور کسی طرف جانے کی ہاتھ میں سکت ہی نہ تھی۔

بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ ہمکنے کھلانے کھاتے اور رات رہے سے اس وقت تک باب باب کرتے کرتے اتنی تھک گئی تھی کہ بلا چلائے اور کھانا مانگے، جیسے بٹھائی گئی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ یہ تو جمی رہی، ساری کی کرائی پر پانی پھر جاتا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، فوراً گھبیٹے نے لپک کر سامنے کی حلوائی کی دکان سے ایک پیسہ کا جلیبیوں کا شیرا مانگا۔ اس نے تھال پر چپٹی ہوئی بھڑوں اور بھنکتی ہوئی مکھیوں کو اڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا اور جتنا شیرا بہہ آیا اسے انگلی سے اپنچھ پانچھ کر ایک پتہ پر ٹپکا کر گھبیٹے کو تھما دیا۔ اس نے لاکر شیرے کو ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔ اس کا چٹانا تھا کہ وہ فوراً باب باب کر کے اور مانگنے لگی۔

چلو عمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آگئی۔ گھبیٹے نے پتہ فقیرے کو پکڑا کر ہدایت کی کہ موقع پر بڑھیا کو ایک انگلی چٹا دینا۔ فقیرا ننگی ہی تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی، بھیڑ بھاڑ اور بڑی بڑی دوکانوں سے وہ بھونچکا ہو گیا تھا، عقل چندھیا گئی تھی۔ اس کے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھبیٹے کی ہر بات میں خود اعتمادی آگئی تھی۔ گھبیٹے مشتاق پیراک کی طرح تھا جو دریا میں اترتے ہی چھلیں کرنے لگتا ہے اور فقیرا نو سکھئے کی طرح حیران دیکھ دیکھ سہما جاتا ہے، گھبیٹے فقیرا کو حکم دے رہا تھا اور وہ کل کی طرح اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آگئے۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کٹی انگلیاں اور بیٹھی ناک والے بدھنی، منمنا کر ڈراؤنی آواز میں بولنے والی آتشک کی بڑھیاں، چندھے چیڑے بچے جن کے ہاتھ پاؤں سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے تھے، جو نہ جانے کیوں مسلسل رو رہے تھے، پھپھے، بے حیا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوؤں کا جنگل اور بدن پر میل کی کہگل، چیتھڑے، ٹھیکرے، سیپی، کوڑ، ملغم، ناک، پیپ، مکھیاں، جراثیم، فریب، جھوٹ اور ان سب کو ڈھانک دینے والی، دنیا بھر کی تہمت لپیٹ کر سلا دینے والی دنیا پاپن بے حسی!

——— اس سمندر میں گھبیٹے اور فقیرا نے بھی ماں کی ڈولی لے کر غوطہ مارا۔ سیپی کچلی ہو، چاہے زلت ہو، حیرانیت ہو، چاہے انسانیت ہو،

مایا کے مندر کو یہی راستہ جاتا ہے۔ اس وقت جبکہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اکیلا یہ کھلا ہوا ہے۔ صاف اور سیدھا راستہ، تنہا راستہ ——— پھوٹی آنکھ کا دیوتا۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دے کر کہا:

"ابے اِدھر کہاں آیا؟ بھاگ یہاں سے۔"

پھر تو اُس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غل مچانے لگے۔ کیونکہ ان کی ڈولی دیکھ کہ ہر ایک کو اپنی روزی کی پڑ گئی۔ فقیرا کی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس نے جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھ کر وہاں سے ٹلنا چاہا مگر گھسیٹے نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اس نے دو چار ماں بہن کی سُنا کر کہا:

"تمہارے باپ کی زمین ہے۔ چپ رہو ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔"

ڈانٹ سنتے ہی فقیر تو ذرا اور بڑبڑا کہ چپ ہو گئے مگر بڑھیاں اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نانی نے جو جماعت کے لیڈر میں دوڑا جا رہا تھا، ان کو ڈانٹا:

"چپ رہو بدنصیبو نماز ہو رہی ہے۔"

نماز کے خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے کسی نہ کسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ اگر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا بوتا ان لوگوں میں تھا ہی نہیں اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا قبضہ پا چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے۔ لیکن وہاں کی فضا سے فقیرا ایسا متاثر ہوا کہ اس نے بے سمجھے بوجھے بڑھیا کو ایک انگلی شیرا چٹا دیا۔ شیرا لگتے ہی گھامو ڑوں کے ریکارڈ کی طرح دو بجنے لگی اور مشین کی طرح اس کے ہونٹ اور ہاتھ چلنے لگے۔ اسے دیکھ کر ایک دو برس کے بچے نے جسے ایک شخص پھونک ڈلوانے کو لایا تھا، بُری میں سہم کر زور سے چیخ ماری اور بسورنے لگا۔ ایک جوان انگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں بڑا سا لئے اِدھر سے گزر رہی تھی۔ اس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار سر سے پاؤں تک کانپ گئی جیسے ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے بے تحاشا روپیہ نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیئے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کتے کے سامنے ترنوالہ پھینک دیتا ہے کہ وہ ہمیں بھول کر اس میں جُٹ جائے۔ پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اس کے ہاتھ میں تھوڑی دے گا، دے گا بڑھیا کو۔ اس کے سامنے کوئی چادر بچھائے جس پر آکر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنا پھٹا انگوچھا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی حول کے غول باہر نکلنے لگے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بھوکا ہوں بابا، بھوکا ہوں بابا، ایک فقیر کی گھگھیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک تگڑا فقیر ملی پھاڑ پھاڑ آوازیں لگانے لگا "جب دے گا اللہ ہی دے گا"۔ فقیر بھیڑ بھاڑ دھکم دھکا اور شور ہنگامے سے ایسا بھر چکا ہوا کہ منہ پھیلا کر ایک طرف تکنے لگا اور شیرا چٹانا بھول گیا۔ گھسیٹے نے چلا چلا کر اسے کئی بار حکم دیا مگر جب دیکھا کہ اس کے حواس بالکل غائب ہیں تو جلدی سے بڑھیا کی پیٹھ پر خود ہی چٹا دیا۔ شیرے کا لگنا تھا کہ مشین پھر تیزی سے چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ گھسیٹے نے فوراً محسوس کیا کہ کیا کمی ہے۔ پہلے سے اس نے کوئی صدا تو سوچی نہیں تھی۔ جلدی میں اس کے منہ سے نکلا "اللہ ہر آفت سے بچائے" اس صدا کو اس طرح دینے لگا جیسے کوئی والنٹیر "انقلاب زندہ باد" کے کیونکہ دوسری نے اسے یاد ہی نہ آئی۔ اس کی صدا میں اگر تاثیر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ ادھر دیکھ لیتے تھے، دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی۔ یہ دردانگیز نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔

اس پاس کے فقیر یا تو خالی ہاتھ یا ایک ایک دو دو پیسے لئے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے اور دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا چیز کیوں نہیں ہے گھسیٹے اپنی آج کی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے متوالا ہو گیا اور خوب کڑک کڑک کر صدا لگانے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشے میں وہ گھسا تھا اس میں چوٹی پر جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہوتا کہ جس پیشے میں گھسوں اس کا اچھا سامان ہو، اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو مگر آخر آج دونوں نعمتیں میسر آ ہی گئیں۔ میرے پاس جو سامان ہے وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا۔ دیکھو پیسے کیسے برس رہے ہیں! تو ہی داتا ہے اور تو ہی جیون کا کھیون ہار ہے مالک۔ اماں زندگی بھر کوشش کریں کہ کچھ پیسہ جوڑ کر گھر کی حالت سُدھاریں۔ ایک ایک بات کے لیے جان دے مریں، مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں۔ حیلے روزی بہانے موت۔

(۵)

سہ پہر کی سنہری دھوپ میں گھسیٹے اور فقیر ڈوبی نئے شہر کے باہر ایک شاہی کمنڈر کے پاس آئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے لادے پھیری لگاتے رہے تھے، تھکان سے چُور چُور تھے مگر پھر بھی آنکھوں میں اطمینان اور خوشی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے، گا رہے تھے اور زور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ایک کھنڈر کے سایہ میں ڈولی اتار دی گئی۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اس میں پانچ چھ آدمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے، دال بھات اور ترکاریاں ملی جلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈال کر ماں کی گالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں تھیں بہت سی تیل کی پوریاں، کئی قسم کی ترکاریاں، سیر بھر ٹھگ میل مٹھائی، چٹ پٹے کباب، مرلیاں اور بیڑی کا بنڈل۔ آج کے پھیرے میں پرسنے دو روپے ملے تھے جس میں سے ڈیڑھ کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے ابھی گھسیٹے کی جیب میں اچھل رہے تھے۔ گھسیٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں تک چُن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں بھر کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا ڈھیر تھا جو تھا اپنا تھا۔ جس طرح چاہے کھاؤ اور جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی کی ایک ایک ڈلی منہ میں ڈالی اور بدحواسی سے ان کو نگل گئے پھر مرجھکوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹ پڑے گویا زندگی بھر کی بھوک اسی ایک آن میں بجھا دیں گے۔ پوریوں کی باری آئی، ایک ایک پوری کا ایک ایک نوالہ۔ کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر غپ سے دو نوالے میں اتار لیتے۔ اس شور سے بڑھیا جو سو رہی تھی جاگ پڑی اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی۔ اب ان دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ گھسیٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اسے اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔

"لو آج تو بھی مزے دار چیزیں کھا لو۔ کبھی کا ہے کو کھائی ہوں گی؟"

گھسیٹے نے کچھ نکتیاں اس کے منہ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلتے ہی بدحواسی سے باب باب کرنے لگی۔ حیرت کی بات یہ کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہاتھوں پیروں کو ہلا جُلا کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک ہی دفعہ اپنے منہ میں بھر لے۔ فقیر اور گھسیٹے کے لئے دشواری یہ تھی کہ خود کھائیں یا اسے کھلائیں۔ ادھر اس کے منہ میں کچھ دیتے اور ادھر وہ نگل کر اور مانگنے لگتی ——— گھسیٹے جھلا کر بولا،

"تو تم بھی کیا یاد کرو گی؟"

رانت سے کاٹ کر مولی کا ایک ٹکڑا بڑھیا کے منہ میں دے دیا۔ بڑھیا فوراً خوش خوش اسے چبانے لگی۔ مگر جیسا کیا وہ بابا رمنہ سے نکل آتا اور یہ پھر کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے اسے اندر ٹھیل دیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پالنے میں جٹ گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور ناک پچھے جوم جوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اور تب دم نکلا۔ گھسیٹے اسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ نکلتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اس کا خزانہ لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ کر پھر اسے پھر لگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلا پکڑا دیا۔ بڑھیا نے اسے اپنی مٹھی میں زور سے دبا لیا اور منہ کی طرف لے چلی۔ مگر ایک قوی ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے رس گلے کی چاشنی سے تگی تھی، وہ کسی طرح منہ کے اندر نہ جا سکا۔ رس گلا دب رہا تھا اس کا شیرا انگلیوں کی پوروں سے ہوتا ہوا گلے پر اور گلے سے چھاتیوں پر بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری میٹھی ہو گئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی تھی اور نہ وہ۔ فربہ رفتہ بیٹوں کا ہاتھ تو سست ہوتا گیا مگر ماں کا باب باب تیز ہوتا گیا آخر جب گھسیٹے اور فقیر میں گتھنے کی بالکل سکت نہیں رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سے سرکا دیا اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاتی رہی، چلاتی رہی۔ آخر چلاتے چلاتے تھک کر وہ بھی ٹوکرے میں گر پڑی۔

فقیر بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہو گا؟ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی جس میں چھپر بنا ہو گیا تھا۔ اس میں ایک طرف لپا پتا چولھا تھا جسے رمضانی کی بیوہ بھکی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چوغ جلے بکریوں کا ایک بڑا سا گلہ لئے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی کی بیوہ جلدی جلدی گرما گرم سرخ سرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ تھالی میں ذرا گھر میں ایک پھول کی تھالی بھی آ گئی ہے، ایک طرف بکری کا مسکا بھی ہے..... فقیر اخوش تھا۔ بہت، خوش۔

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی سی کامیابی! پورے دو روپے! اور صرف ایک دن میں! پچاس روپے مہینہ! اوہ! اگر کہیں ہم کلکتہ میں ہوتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہو تو کلکتہ کی زندگی! سنگل چارٹ، بیڑیاں، "تاڑی خانہ" بھنا گوشت، وہ سانولی نخریلی رنڈیاں! وہ ان کا مٹک مٹک چلنا، گودیں بل کھا کھا جانا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ کچھ دیر تک انہی خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ فقیر نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے، سب بکریاں اپنی کر لی ہیں جو حصہ مانگا تو سر اکھاڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب اماں میں بھی حصہ بٹائے گا..... نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں گھر سے دوں گا، بکریاں دے دوں گا مگر اماں کو نہیں دے سکتا۔ آخر میں بھی تو اس کا لڑکا ہوں اور اب فقیر کا حق ہی کیا ہے؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اسی کی رہی، آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ اماں کو میں نہیں دے سکتا۔ اگر وہ تکرار کرے گا تو مار دوں گا، سر پھوڑ دوں گا۔ حرامی سالا فقیرا!"

گھسیٹے سوچ سوچ کر کھولنے لگا۔ فقیر اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اس کو جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا:

"فقیرا ستا بعد کو پہلے حصہ بانٹ لو۔ آج یہ جھگڑا چکا جانا چاہئے۔"

"کاہے کا حصہ بانٹ؟"

"ہاں اب تو کہے گا ہے کا حصہ بانٹ۔ ارے گھر کا، بکریوں کا اور جو کمایا ہے اس کا۔"

فقیر اٹھلا کر اٹھ بیٹھا۔

"پھر وہی گھر، پھر وہی بکریاں۔ ہزار بار کہہ دیا کہ ابّا کا بنایا ہوا چھپر پندرہ برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ میں نے بنایا ہے۔ اور وہ بکریاں بھی مر کھپ گئیں۔ یہ سب میری پالی ہوئی ہیں۔ چلا ہے حصّہ بانٹ کرنے اور اتنے دنوں تو جو ہماری روٹی توڑتا رہا ہے؟"

فقیرا اب شہر والا فقیرا نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصّہ میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا:

"اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی لے جاؤ۔ مگر لاؤ ہماری اماں کو ہمیں دے دو۔ اتنے دنوں ان کو اگر تم نے کھلایا ہے تو اب ہم کھلائیں گے۔"

"ہاں اب تو تو کھلائے ہی گا؟ پندرہ برس میں پالتا رہا۔ گو مُرت صاف کرتا رہا تب اماں کی یاد نہ آئی، اب جو کمائی کے قابل ہو گئی تو اماں تیری ہے، مجھے دے دوں؟ مجال ہے تیری کہ تو لے جائے؟"

گھسیٹے پر بھوت سوار ہو گیا اور وہ غصّہ میں ماں کی طرف لپکا جیسے اس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا مگر فقیرا فوراً گودکر سامنے آ گیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارا سدا سے اونچا ہو گیا اس نے بڑھ کر فقیرا کو زور سے دھکّا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح ہاتھوں میں دبوچ لیا، گویا وہ کوئی گٹھڑی ہے۔ جس طرح بلّی چوہے پر جھپٹتی ہے فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اس کے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلّی کی طرح جس کا بچہ مر گیا ہو غوغو کر کے ملّی چھاڑ چھاڑ رونے لگی۔ مگر ان دونوں کی گالیوں اور غل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوئی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ نہ جانے فقیرا نے زور کر کے چھین لیا یا گھسیٹے نے بڑھ کے مرجانے کے ڈر سے اسے خود ہی چھوڑ دیا۔ مگر فقیرا جیسے ہی اس کو گالیاں دیتا پیچھے ہٹا ہے گھسیٹے لہو کے بھیڑیے کی طرح اس پر چھاند پڑا۔ وہ تڑسے کھڑے قد نیچے گر پڑا اور بڑھیا چغنی قلابازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ گھسیٹے فقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ نیچے سے اس کے سینے اور منہ پر گھونسے جمانے لگا۔ گھسیٹے جیسے جیسے گھونسے کھاتا ویسے ہی ویسے زور سے گلا دباتا۔ آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے، گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے اور دیئے۔ فقیرا کی آنکھوں کے ڈیلے غلوں کی طرح باہر نکل آئے، منہ بھیانک ہو گیا اور ہاتھ پاؤں بر گئے۔ اب گھسیٹے کا غصّہ اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کانپ کر کھڑا ہو گیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا کو گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ رام لیلا کے بھالو کی طرح ہو گیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لئے۔ کلکتہ میں ایسے ایسے کئی قصّے یہ دیکھ چکا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھیوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ ڈر کس بات کا؟ فقیروں کے مرنے جینے کی کس کو پروا ہوتی ہے؟ مر گیا ——— ہا ——— فقیرا ——— ناحق مرا ——— مان لیتا میری بات۔ میں نے کیا بُرا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک اماں تم نے رکھی ہے اب مجھے دے دو۔ ارے ہاں میں بھی تو کچھ دن زندگی کی بہار دیکھ لوں۔ میرے بھی تو جان ہے۔ مجھے اینٹ پتھر سمجھا تھا، جیسا کیا ویسا بھگتا۔

ہاں اب جلدی سے اماں کو لو اور بھاگو ——— پیاری اماں ——— کلکتہ، وہاں کی بیک کا کیا کہنا! اب مزا ملے گا کلکتہ کا۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مڑا، دیکھا تو وہ آدھی چت آدھی پٹ، مٹی کے چونتھ کی طرح ڈھیر ہے۔ آنکھیں چڑھ گئی ہیں۔ منہ کلیا کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور لہو کے ملغوبہ میں لتھڑی آدھی چبی آدھی پوری غذا نکل رہی ہے۔ نکتیاں، گلاب جامن پوری کے لمبلے ہوئے ٹکڑے ——— لوندے کے لوندے ——— زرد زرد بھیس۔

گھسیٹے نے بڑھ کر ہاتھ لگایا ——— بڑھیا میں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ کھنڈر کا ہر کونہ کالی بلاؤں کا بھٹ معلوم ہوتا تھا، پت جھاڑ ہوا کے جھکڑ سینکڑوں میل سے کروڑوں درختوں کو تاراج کرتے، مردہ پتوں کو اٹھا اٹھا کر پٹکتے، وحشت ناک سروں میں سائیں سائیں کرتے ایک طرف سے آرہے تھے اور دوسری طرف بھاگے جا رہے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کو اڑا لے جائیں گے۔ گھسیٹے ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری طرف ماں کی۔ دونوں کے بہلانے میں اس کی آخری کوشش کی بھی لاش تھی۔ جب تک ماں زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مرکر وہ اس کے دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔ یہ وہی ماں تھی جو اس کے ہر دکھ پر بیتاب ہو جاتی تھی۔ اس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتی تھی۔ فقیر ابھی آخر بھائی ہی تھا۔ زندگی کا سہارا۔ اس کی یاد کلکتہ کی بے کسی میں بھٹکے مسافر کا دیا تھی۔ ان دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دنیا سے رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ سمجھتا تھا کہ اب زندگی کنارے لگ چکی ہے۔ پیشہ مل گیا ہے اور اس کا بہتر سے بہتر سامان ہاتھ آگیا ہے۔ سب کچھ مل گیا تھا مگر ابھی خود اس کے قابل نہیں بنا تھا ——— امید کی آخری کرن ڈوب گئی۔ اب زندگی کی اتھاہ مصیبتیں، طوفانی سمندر کی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر طرف تھیں۔ اس کے نہایت بھیانک بھنور منہ پھاڑے بڑھ رہے تھے اور پاس تنکے تک کا سہارا نہ تھا۔

گھسیٹے سر جھکائے افق کی طرف چل کھڑا ہوا۔

———

اوپندر ناتھ اشک

بینگن کا پودا

اگرچہ ماہی رام نے وہ بینگن کا پودا اکھاڑ دیا ہے۔ پھر بھی جب میں ترکاری کے کھیت کی مینڈھ پر سے ہوتا ہوا اپنی کوٹھی کو جاتا ہوں تو میری آنکھوں میں بینگن کا وہ سوکھا ہوا پودا، اور اس پر لٹکتا ہوا مرجھایا پکا سا زرد بینگن پھر جاتا ہے۔

سردیوں کے مختصر سے دن کو گذرے ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب میں ایک لمبا سا سگرٹ لگا کر نیچے کھادی کی موٹی سی بنیان، اس پر سچو خاگرم انڈر ویر، اس پر موٹے کھدر کی قمیص، اس پر اچکن اور گلوبند اور ان سب کے اوپر اوور کوٹ پہنے، ہاتھ میں چھڑی لئے اپنے لوہے کی ایڑی والے نئے بوٹوں کی ٹک ٹک میں مست، دسمبر کی سنسناتی ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لئے کانوں کو اوور کوٹ کے کالروں میں چھپاتا ہوا اپنی کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہوا تو وہاں میلی سی چارپائی پر ایک نحیف و ناتواں بڑھے کو خستہ اور بوسیدہ، اندھیری کالی رات کی طرح کالا لحاف لپیٹے دیکھ کر کچھ ٹھٹک سا گیا۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے؟" میں نے اوور کوٹ کی جیبوں میں پڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لا کر کہا۔

"کچھ نہیں بابو جی! میں ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

"ماہی رام کے ہی سہی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اتنی سخت سردی میں تم اس کھلے برآمدے میں کیوں پڑے ہو؟"

"میرے پاس کپڑا ہے بابو جی!"

میں نے چپ چاپ اپنا کمرہ کھولا۔ ٹیبل لیمپ جلتا چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ اوپر کے دونوں روشن دان کھلے تھے پھر بھی کمرہ گرم ہو گیا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی مٹی کے تیل کا گرم تیز بھبکا آیا۔ بارہا میرے دوستوں نے اس طرح لیمپ جلا کر چھوڑ جانے سے منع کیا ہے۔ "شہر کی گندی فضا کو چھوڑ کر اس کھلے ماحول میں رہنے کا فائدہ ہی کیا؟ وہ کہا کرتے ہیں۔" اگر شہر کی مضر عادتوں کو نہ چھوڑا جائے۔" اور بتایا کرتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق کمرے کو بند کر کے اندر لیمپ جلانے رکھنا نہایت مضر ہے۔ سانس کے راستے گندی ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہے اور پھیپھڑوں پر اس کا دباؤ پڑتا ہے۔ میں بارہا محسوس بھی کرتا ہوں لیکن مجبور ہو جاتا ہوں۔ جب بھی کبھی دروازہ کھول کر بیٹھتا ہوں تیز ہوا کا جھونکا اندر

آتا ہے۔ میرے ہاتھ یخ ہو جاتے ہیں اور قلم چلنے سے انکار کر دیتا ہے تو میں اٹھ کر پھر کوائل ہیٹر دیتا ہوں جیسے سگریٹ پینے والوں کو اس کی کڑوی کسیلی سر چکرا دینے والی بُو اچھی لگتی ہے۔ کچھ اس طرح یہ سب کچھ بھی مجھے اچھا معلوم ہونے لگا ہے۔

ہیٹ کو کھونٹی پر لٹکا کر اور گلوبند کو سر اور کانوں کے گرد لپیٹ کر کام پر آ بیٹھا۔

بیٹھ تو گیا۔ لیکن میرا دھیان برابر برآمدے ہی کی طرف لگا رہا۔

اس بوڑھے کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ صبح ہی دیکھا تھا۔ وہ بینگن کے پودے چھانٹ رہا تھا اور "کمیونٹی کچن" سے گھر کو آتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ اس نے بتایا تھا بینگن کا پورا دو بار پھل دیتا ہے۔ ایک بار چھانٹ دیا جائے تو اور بھی پھلتا پھولتا ہے۔ میں نے ان سوکھے پتوں سے محروم بینگن کے پودوں پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ ایک پودے پر ایک مرجھایا ہوا سوکھا سکڑا پچکا زرد بینگن لٹک رہا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر میری نظر اس بوڑھے پر جا پڑی تھی۔ اس کی عمر نہ جانے کتنی تھی لیکن وہ بے حد ضعیف دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ سردی سے بچنے کے لئے اس نے کھیس اوڑھ رکھا تھا۔ پھر بھی اس کے لکڑی کے سے پتلے ہاتھ، بانس کی سی ٹانگیں، سوکھا چہرہ اور آنکھوں کے حلقے صاف نظر آتے تھے۔ اس وقت ایک عجیب سا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا ——— بینگن کا پورا جب سوکھ جاتا ہے تب چھانٹ دینے پر پھر سے پھل لے آتا ہے۔ سہاگنا بھی چھانٹنے پر بڑھتا ہے۔ دنیا میں ایسے درختوں اور پودوں کی کمی نہیں جو چھانٹنے پر پہلے سے زیادہ پھلتے پھولتے ہیں تو پھر انسان کو اس خدائے برتر نے ایسا کیوں نہیں بنایا۔ لیکن وہیں کھڑے کھڑے جیسے مجھ سے کسی نے کہا۔ انسان کی بیل بھی تو امر ہے۔ موت اس کی قینچی ہے۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے اس کے پھل، پھول اور شاخیں ——— جب یہ سوکھ جاتے ہیں یا گل سڑ جاتے ہیں یہ قینچی انہیں کاٹ دیتی ہے اور ان کی جگہ نت نئے ہرے بھرے زندگی سے بھرپور اچھلتے، کودتے، ناچتے گاتے پھول اور پتے لگتے ہیں اور زندگی کی امر بیل بڑھتی ہوئی پھولتی پھلتی ہوتی چلی جاتی ہے۔

لیکن یہ بوڑھا یہاں سردی میں آ پڑا ہے۔ کیا اس کا کوئی گھر گھاٹ نہیں؟ اور اپنی اس محویت سے ذرا چونک کر میں نے پوچھا "ارے بھئی تم ہو کون ———؟"

"میں جی، ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

بوڑھا کچھ جواب دینے والا ہی تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ کئی لمحے لگاتار کھانسنے کے بعد اپنے سانس کو مشکل سے درست کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ رشتہ میں ماہی رام کا کچھ نہیں لگتا۔ وہ اس کا ہم وطن ہے۔ اس کا کنبہ بہت بڑا ہے۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بیوی ہے۔ دو لڑکیاں ہیں ——— بیاہنے کے قابل ——— اور وہ روزگار کے لئے ماہی رام کے ساتھ آ گیا ہے۔

اس کی آواز میں کچھ ایسا سرد تھا کہ کام کرنا میرے لئے ناممکن ہو گیا۔ میں اتنے کپڑے پہننے کے باوجود بستر پر کمبل ڈال کر بیٹھا ہوں اور وہ عرب باہر سردی میں پڑا ہے۔ بستر کے نام پر شاید ایک سیلی پچی دلائی اس کے پاس ہے۔ اور وہ میلا کالا لحاف بھی برسوں کا پرانا ہے ——— قریب قریب پگھل کر میں نے کہا "تو بھائی اندر لیٹ جاؤ۔ باہر تو بڑی سردی ہے۔ برآمدہ دونوں طرف سے کھلا ہے۔ باہر تم کیوں بیٹھے ہو؟"

لیکن اس وقت سیمنٹ کے فرش پر بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور دوسرے لمحے ماہی رام ——— وہ ٹھیکیدار گرپال داس کا چوفٹ تین انچ لمبا آدمی دروازہ پر آ کھڑا ہوا۔ بڑی سی پگڑی۔ اس کے نیچے کالا موٹا کمبل، گھٹنوں تک دھوتی اور پاؤں میں میرسوا سیر کا جوتا۔ ایک دو چوہدریوں کے لئے دو ایک میل تک ایک آدمی کے پیچھے دوڑتا گیا تھا اور اسے پکڑ کر اس نے وہ وہ پٹخنیاں دی تھیں کہ پھر اس نے کبھی ادھر کا رُخ نہ کیا تھا۔

"ہم نے اسے خود یہاں سُلایا ہے بابو جی۔" ماہی رام نے کہا۔ "نہ جانے کون سا لالات کو کھیتوں میں ڈاکہ ڈالتا ہے۔ دو دن دیکھتے ہو گئے ہیں ——— ایک رات گوبھی کے دس پھول غائب تھے۔ سارے کھیت میں ایسے پھول نہ ملیں گے۔ پرسوں کوئی تمام پکے ہوئے ٹماٹر تار کر لے گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں کچن کو بھی سپلائی کرنی پڑتی ہے اور پھر دو سو روپیہ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ وہ سب بھی تو اسی میں سے پورا کرنا ہے اور پھر مزدوروں کی مزدوری....."

"لیکن ترکاری پر کون ٹاکہ ڈال جاتا ہے؟" میں نے کہا۔ "یہاں تو کبھی چوری ہوتے سنی نہیں۔ میری کوٹھی سنسان جگہ میں ہے۔ پاس کوئی کوٹھی بھی نہیں۔ لیکن میں تو روزانے کھلے چھوڑ کر گھنٹوں غائب رہتا ہوں۔"

"نہیں بابوجی باہر کا آدمی اتنی سردی میں صرف دس گوبھی کے پھول لینے نہیں آسکتا۔"

"لیکن اس دن مرزیاں....."

"وہ اور بات تھی بابوجی۔ وہ تو کوئی راہ چلتا آدمی تھا۔ جاتے جاتے اکھاڑ کر لے گیا۔ کوئی یہیں کا ہے۔ میں سالے کو ایسا سبق دوں گا کہ عمر بھر کو کان بہرے ہو جائیں۔" اور اس کے موٹے موٹے ہونٹ پھیل گئے اور چیچک کا مارا ہوا چہرہ تن گیا۔

"لیکن بھائی اگر چاہو تو اسے اندر بلا لو۔"

"نہیں بابوجی سردی تو اسے بھی لگتی ہے، اسے تو یونہی محض دکھاوے کے لئے یہاں بٹھلا دیا ہے۔ ورنہ رکھوالی تو میں کروں گا ——— ان مٹرگوں کے پیچھے بیٹھ کر۔ جونہی یہ سمجھ کر کہ بڈھا سو گیا ہے کوئی آیا کہ میں نے اسے دبوچا۔" اور وہ ہنسا۔

"لیکن اس کے پاس کپڑے....."

"کافی ہیں بابوجی۔"

اور یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ بڈھے کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔

میں پھر کام میں منہمک ہو گیا۔ لیکن کام مجھ سے ہو نہ سکا۔ میرے سامنے ان دونوں کے مالک کی تصویر کھنچ گئی۔ ٹھیکیدار گوپال داس ——— دھن، دولت، اولاد اور بے لگی کی وجہ سے اس کے گال اس پچاس برس کی عمر میں بھی گلاب کی طرح سُرخ تھے ——— اس ہڈیوں میں پیوست ہونے والی سردی میں جب یہ بڈھا باہر پڑا ہے وہ اپنے گرم لحاف میں لیٹا۔ دہکتی ہوئی انگیٹھی سے گرم اپنے کمرے میں مزے سے گپیں ہانک رہا ہو گا، تاش اور شطرنج میں مشغول ہو گا۔

اور یونہی سوچتے سوچتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کچھ غنودگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ کھانا زیادہ کھا گیا تھا۔ کپڑوں کا بوجھ میں نے لاد رکھا تھا۔ اور کمرہ خوب گرم تھا ——— میں اٹھا کچھ ضروری کاغذ اور قلم دوات لے کر سونے کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا کل سویرے ذرا جلدی اٹھ کر کام کروں گا۔ دفتر کے کمرے میں تالا لگاتے ہوئے میں نے ایک بار پوچھا کہ اگر وہ چاہے تو دفتر کو کھلا چھوڑ دوں لیکن "نہیں نہیں بابوجی میرے پاس کافی کپڑے ہیں۔" اس کا یہ جواب سُن کر قفل بند کر کے میں اپنے چھوٹے سے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ بستر بچھا ہوا تھا صرف لحاف پر میں نے کمبل ڈال لیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔

بستر برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے پاؤں سکیڑ لئے اور پھر انہیں آہستہ آہستہ پھیلایا۔ کئی طرح کے خیالات دماغ میں گھومنے لگے ——— بے ربط ——— بے ترتیب لیکن لحاف کی گرمی سے آنکھیں بوجھل ہو گئیں اور پھر بند۔

سوتے سوتے کبھی مایا رام، کبھی اس بڈھے اور کبھی اس کے مالک ٹھیکیدار کی صورتیں میرے سامنے آنے لگیں۔

میں نے دیکھا۔ مایا رام نے چور پکڑ لیا ہے اور وہ اسے مارتا مارتا پاس کے گاؤں تک لے گیا ہے۔ سب گاؤں والوں کو جمع کر کے اس نے اعلان کیا ہے کہ جو ہماری سبزی چرائے گا اسے ایسی ہی سزا دی جائے گی۔ اتنا کہہ کر وہ پھر چور کو زدوکوب کرنے لگتا ہے۔ چور نہایت دردبھری نگاہوں سے اس کی طرف تکتا ہے اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ وہ چور ٹھیکیدار گوپال داس کے سوا کوئی نہیں۔ وہی گٹھا ہوا سر، وہی پھولے ہوئے گال اور چپٹی ناک۔

میری آنکھ لگ گئی۔ دیکھا پاؤں سے رضائی اتر گئی۔ زیادہ کھا جانے کی وجہ سے سینہ کچھ بھاری ہے اور گلا سوکھا جا رہا ہے۔

میں نے سرہانے رکھے ہوئے لوٹے سے پانی پیا اور پھر لحاف کو اچھی طرح سے اوڑھ کر دونوں طرف سے اسے پاؤں کے نیچے کر کے لیٹ گیا۔ باہر ہوا مکانوں سے ٹکریں مار رہی تھی۔ درخت حتی الامکان اس کا مقابلہ کرتے ہوئے جوش کی شدت سے چنگھاڑ رہے تھے۔ شاں شاں ——— شاں شاں ——— اور دور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن گرم ہو کر جسم ڈھیلا پڑ گیا اور میں پھر سو گیا۔

اس بار کیا دیکھتا ہوں کہ زور کی بارش ہو رہی ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے، پانی بھر بھر کے اولے پڑتے ہیں، کیاریوں میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ ساری کی ساری سبزی تباہ ہو جاتی ہے۔ صرف اسی مرجھائے ہوئے سکڑے سمٹے پیلے زرد بینگن کا پودا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ بینگن میرے سامنے بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کی شکل اس بوڑھے کی سی ہو گئی۔ گھٹنوں کو پاؤں میں لے کر سینے سے لگائے وہ سکڑا سمٹا اپنی لمبی چوٹی کے سہارے لٹک رہا ہے۔ اولے اس کے سر پر گرتے ہیں اور وہ اس بینگن کے پودے کے ساتھ لٹکا ہوا جھولتا ہے۔

پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ بینگن کا پودا ایک بڑا اونچا جامن کا، نہ جانے آم کا درخت بن جاتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ کھڑی شور مچا رہی ہے "بوڑھا مر گیا ——— بوڑھا پھانسی لگا کر مر گیا۔"

پھر میرے کانوں میں صرف "مر گیا، مر گیا" کی آواز آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاخ ٹوٹ رہی ہے..... کڑکڑ..... کڑکڑ.....

میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کوئی زور سے دروازہ کھٹ کھٹا رہا ہے۔

جلدی سے گرم جرابیں پہن، سر پر ٹوپی پہن اور کمبل کو اچھی طرح لپیٹ کر میں اٹھا۔ دروازہ کھولا۔ دیکھا تو سیکرٹری صاحب دوسرے کئی اصحاب کے ساتھ کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رات آپ کے برآمدہ میں بوڑھا مر گیا۔"

میں نے دیکھا۔ اس میلی سی کالی چارپائی پر اپنے ارد گرد وہی میلا کچیلا لحاف لپیٹے بوڑھا جھکا ہوا پڑا ہے۔ اس کا جسم اکڑ گیا ہے اور آنکھیں اوپر چڑھی ہیں۔ اس کا لحاف بھیگ گیا ہے۔ زور زور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے اور برآمدے کا سارا فرش گیلا ہے۔

"میں نے تو رات ہی اس سے کہا تھا کہ دروازہ کھلا.....؟" میں نے کہنا شروع کیا۔

لیکن سیکرٹری صاحب نے میری بات کو کاٹ دیا "میں چائے کے لئے کچن سے دودھ لینے جا رہا تھا۔" وہ بولے "کہ اسے بارش میں بھیگتے پایا۔ آواز دی لیکن یہ ہلا تک نہیں۔ آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات سموی میں اکڑ گیا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے بھنگی بیلدار کے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے اٹھا لے گا انتظام کیا جائے۔

اس کے دو دن بعد کچن کو جاتے ہوئے اچانک ٹوک کر میں نے ماہی رام سے کہا "خدا کے لئے اس پیلے سے بینگن کے پودے کو اکھاڑ دو۔" میری آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ ماہی رام حیران میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اس نے کہا:

"بہت اچھا سرکار!"

دیوندر ستیارتھی

لال دھرتی

کوئی رنگ مغلوم نگاہوں کی طرح خاموش اور فریادی ہوتا ہے۔ کوئی رنگ خوابِ صورتی کی طرح کچھ کہتا ہوا اور مدعا طلب دکھائی دیتا ہے۔ کوئی رنگ چبھتا ہوا ہمیں کسی ضدی بچے کی یاد دلا جاتا ہے اور کسی کو دیکھ کر خنودگی سی چھا جاتی ہے ..... لاری کے ڈرائیور نے دو یا تین بار کہتے ہوئے کہا "اب ہم آندھرا دیش میں داخل ہو رہے ہیں بابوجی!" میں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی سُرخ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آندھرا دیش کی سُرخ زمین کیا کہہ رہی ہے؟"

آنکھیں موند کر میں نے اپنے دل میں جھانکا۔ وہاں سبز رنگ لہلہا رہا تھا۔ اپنے دماغ سے اس رنگ کا مطلب سمجھنے کی میں نے چنداں ضرورت نہ سمجھی اور آنکھیں کھول کر سُرخ زمین کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے میں نے محسوس کیا کہ یہ رنگ بہت بلوان ہے اور میرا نیا رنگ اس کے سامنے ٹک نہ سکے گا۔

ڈرائیور نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ اس نے سُرخ زمین کے بھید خود اس کی زبانی سُن لئے ہیں اور اب اس کیلئے یہ مشکل ہو رہا ہے کہ انھیں چھپا کر رکھ سکے۔

لاری بھاگی جا رہی تھی۔ سُرخ دھول اُڑ اُڑ کر ڈرائیور کے گالوں پر اپنا رنگ چڑھا چکی تھی۔ میں نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ یہ دھول وہاں بھی آ چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ میرے چہرے کی سبز خودی زمین پر سُرخ رنگ چڑھ گیا ہوگا اور بہت بُرا تو نہ لگتا ہوگا۔

"پہلے یہ سارا ضلع ہمارا ٹریبیو میں تھا، بابوجی!"

"اور اب؟"

"اب نقشہ بدل گیا ہے، بابوجی!"

"نقشہ بدل گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ جب سے ٹریبیو الگ صوبہ بن گیا ہے، اس ضلعے کے تیلگو بولنے والے حصے آندھرا دیش کو مل گئے ہیں۔"

"بہت خوب۔"

"لیکن ہم خوش ہیں، بابو جی! گورنمنٹ نے ابھی تک آندھرا دیش کو الگ صوبہ بنانا منظور نہیں کیا۔"

"مگر کانگریس تو کبھی کی یہ قرار داد پاس کر چکی ہے کہ زبان کی اہمیت کو قبول کیا جائے۔ ہر بڑی زبان کا اپنا صوبہ ہو تاکہ ہر زبان کے ادب کی پوری پوری پرورش کی جا سکے، ہر نمدن اپنے اپنے ماحول میں آزاد ہو کر نشو و نما پا سکے۔"

"جی ہاں۔ کانگریس نے یہی کہا ہے کہ آندھرا دیش کا الگ صوبہ بنا دیا جائے مگر گورنمنٹ نہیں مانتی۔"

"گورنمنٹ کیوں نہیں مانتی؟ مدراس میں قواب کانگرس منسٹری قائم ہو چکی ہے اور اس کے پردھان شری راج گوپال آچاریہ بڑے زبردست آدمی ہیں۔ وہ یہ کام ضرور کر سکتے ہیں۔"

"مگر اس کا حکم تو نمدن سے آنا چاہیئے، بابو جی!"

"نمدن سے؟"

"جی ہاں..... اور اگر یہ حکم نہ آیا تو ہم بڑی سے بڑی قربانی دیں گے اپنا لہو بہانے سے بھی گریز نہ کریں گے۔"

"لہو بہا دو گے اپنا؟ پہلے ہی یہ زمین کیا کم سرخ ہے؟"

ڈرائیور نے ایک بار پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نیا رنگ جھانک رہا تھا۔ وہ نیا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

زمین سرخ تھی۔ کبھی گہرا بادامی رنگ زور پکڑ لیتا۔ پھر یہ سبز و سبز دری بن جاتا..... سبز و سبز دری رنگ گلناری میں تبدیل ہو جاتا..... سرخ رنگ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میرے لہو کی روانی تیز ہو چکی تھی۔ کئی بڑے چھوٹے پلوں اور ننھی ننھی پلیوں کو پھاندتے ہوئے لاری وجے نگرم کے قریب جا پہنچی۔ مندروں کے بڑے بڑے کلس دکھائی دینے لگے۔ اس بھاگم دوڑ میں ہمیں وجے نگرم اپنی طرف بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گویا ہماری لاری ساکن تھی۔

قصبے میں داخل ہوتے ہی سڑک ترنجی کی طرح تین طرف دوڑی جاتی تھی۔ دو سڑکوں کے سنگم پر بھیم راؤ کا مکان تھا۔ ڈرائیور انہیں پہچانتا تھا۔ ان کے گھر کے سامنے مجھے اتارتے ہوئے اس نے دوستانہ انداز آنکھوں سے میری طرف دیکھا: "آندھرا دیش کی سرخ زمین کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے کہا۔ وہ مسکرایا۔ لاری آگے بڑھ گئی۔

میں نے آواز دی۔ بھیم راؤ باہر نکلے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ چہرے پر سیتلا مائی کا آٹوگراف نظر آ رہا تھا ——— چیچک کے بڑے بڑے داغ؛ قوند کی طرف دھیان گیا تو میں بڑی مشکل سے ہنسی کو روک سکا۔ ہمارے اسکول میں ایسا ہیڈ ماسٹر کبھی رعب قائم نہ رکھ سکتا۔

تعارفی چٹھی کو پڑھتے ہی وہ مجھے اندر لے گئے۔ بولے: "آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس غریب کے ہاں چلے آئے۔ اس چٹھی کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی۔"

"آندھرا دیش کی بہت تعریف سنی تھی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "بہت دنوں سے ادھر آنا چاہتا تھا۔"

"آپ شوق سے رہیئے۔"

مجھے ایک الگ کمرہ مل گیا۔ فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ ننگے پاؤں چلنے سے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ آندھرا دیش کی سرخ زمین میرے پیروں سے چھو رہی ہے۔ اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر کے کبھی میں قالین پر لیٹ جاتا اور دھیان سے اپنے دل کی دھڑکنیں سننے لگتا۔ کچھ مشغل تھا۔ سرخ رنگ کیا کہہ رہا ہے؟ ——— بار بار یہ سوال زبان تک آیا مگر ہونٹ بند رہے۔

بھیم راؤ کے مکان پر کانگرس کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا..... سبز اور سفید اور سرخ..... اس ترنگے جھنڈے کا مفہوم میرے ذہن

میں اجاگر ہوا تھا۔ دل ہی دل میں یہ کہنے لگتا کہ اس جھنڈے کا سُرخ رنگ آندھرا دیش کی ترجمانی کر رہا ہے اور یہ خیال آتے ہی مجھے ایک ناقابلِ بیان مسرت حاصل ہوتی۔ جہاں سفید رنگ ختم ہوکر سُرخ رنگ شروع ہوتا تھا۔ وہیں میری نگاہ جم جاتی اور اس نوجوان لاری ڈرائیور کے الفاظ میرے کانوں میں گونج اٹھتے "اب ہم آندھرا دیش میں داخل ہو رہے ہیں، بابو جی"۔

میرے کمرے میں بڑا مختصر سا فرنیچر تھا۔ ایک طرف ایک ٹائلٹ میز پڑا ہوا تھا۔ ووکر سیاں، ایک تپائی اور ایک طرف ایک تخت جس پر بچھے سوتا ہوتا تھا، بستر پر دن کے وقت کھادی کی دودھیا سفید چادر بچھا دی جاتی تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ اس ٹائلٹ میز کا گول آئینہ وہاں نہ ہوتا تو وہ چند ہفتے اتنے دلچسپ نہ ہو جاتے۔ میرے جذبات کا رنگ پکی ہوئی اینٹوں کی طرح سُرخ ہو چلا تھا۔ یہ رنگ میرے چہرے پر بھی تھرک اٹھتا۔ اس کے لئے میں آئینے کا ممنون ہوتا۔

میرے کمرے کی دائیں کھڑکی میدان کی طرف کھلتی تھی۔ وہاں سبز گھاس اُگتی ہوئی نظر آتی۔ پانی نہ ملنے پر یہ گھاس پیلی ہو سکتی تھی سُرخ نہیں۔

دن چڑھتا اور پتہ ہی نہ چلتا کہ کیسے بیت گیا۔ مہ و شب میرے لئے نیا تھا، ہر آنکھ میں کوئی نہ کوئی صدیوں کا جمع شدہ رنگ تھرک اٹھتا۔ اس سے پہلے کہیں ماضی اور حال کو یوں بغلگیر ہوتے نہ دیکھا تھا۔ رات ختم ہوتی تو جمع سورج کانتماتا ہوا تانک جھانک کے آحاضر ہوتا اسے دیکھ کر مجھے کرشنا دیوی کی پیشانی کا "بوٹو" یاد آجاتا۔

پیچھے سے آکر کرشنا دیوی میری آنکھیں بند کر لیتی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور جوں ہی پرے ہٹتی۔ میری آنکھیں اس کی پیشانی کی طرف لپکتیں کم کم کا سرخ، بوٹو" کینڈل کی بجائے پچاس کینڈل کا برقی قمقمہ بن کر اس کی پیشانی کو روشن کرتا دکھائی دیتا۔ کوشش کرنے پر بھی میں کبھی اسے ایسی حالت میں نہ دیکھ سکا جبکہ غسل کے بعد یہ "بوٹو" ڈھل کر اتر چکا ہو۔ پھر میں نے یہ کوشش چھوڑ دی۔ بس ٹھیک ہے یہ قمقمہ ہمیشہ روشن رہے، دن ہو چاہے رات ——— کم کم کا سُرخ بوٹو!

اُما پورنا اور کرشنا دیوی دونوں بہنیں تھیں۔ دیبی پورنا سے دو سال چھوٹی تھی۔ دونوں گھر پر پڑھتی تھیں۔ بڑی بہن سنگیت کی ابتدائی منزلیں کر لے کر اس کی گہرائیوں میں پہنچ گئی تھی۔ چھوٹی بہن صرف بہن کی دیکھا دیکھی چھوڑتی تھی۔ اس کا گانا سنا نہیں جاتا تھا اور اگر اس فقرے سے اس کی نفاست کا کوئی سودا ہوا رنگ جگا دیا تو اس نے تھوڑی بہت بندی کر لی۔ نہیں تو کس کی دینا، کون ان پورنا، وہ اپنی کتابوں میں اُلجھی رہتی۔

بھیم راؤ اپنی بیٹیوں کی تعریف میرے سامنے بھی لے بیٹھتے۔ دونوں کے سُرخ "بوٹو" میرے ذہن میں تیرنے لگتے اور مجھے محسوس ہوتا کہ میرے منہ میں پان کی پیک اور بھی سُرخ ہو گئی ہے۔ میرے جذبات چھالیا کے ننھے باریک ریزے بن جاتے جو پان چباتے وقت پپوٹوں سے دانتوں کی دراڑوں میں سے گذر جاتے ہیں۔

"یہ تو اپنے آدمی ہیں، بیٹیو!" بھیم راؤ کہتے، ان سے خوب باتیں کرو، ان کو کہانیاں سنو۔ ولیس ویس کا پانی پی رکھا ہے انھوں نے ——— ہاں ویس ویس کا"، اپنی یہ تعریف سن کر میرے ہر سام کے کان لگ جاتے، پٹھوں میں ایک عجیب سا تناؤ پیدا ہو جاتا، ذہن میں ایک گدگدی سی ہونے لگتی، یہ آندھرا دیش کی سُرخ زمین کا خلوص تھا، ایک ترقی پسند خلوص!

"یہ کرشنا دیوی تو نری گلہری ہے، مسٹر راؤ" ایک دن میں نے دونوں بہنوں کی موجودگی میں کہا۔ "اور یہ اچھا ہی ہے"

منوہر۔ خوب! اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر، نکلتی تو بیٹھ ہی نہیں سکتی گلہری ہی تو ہے"

کرشنا دیوی ہنسی نہیں۔ آخر اس میں گلہری کی کیا بات ہے؟ شاید ہمارے معزز مہمان کے دیش میں گلہریاں نہیں ہوتیں۔ وہ جیسے سہمی رہتی

ہوں گی۔ لیکن ولیس ولیس میں کی دھرتی دھرتی میں فرق ہوتا ہے نا۔

بھیم راؤ بولے: "یہ آندھرا دیس ہے۔"

اتن پورنا نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اور یہاں کی کنیائیں آزاد نظمیں بن گئی ہیں ——۔"

کرشنا دینی کی آنکھوں میں ایک بجلی سی چمک گئی۔ بولی "جی ہاں، آزاد نظمیں۔"

اور میں نے محسوس کیا کہ کم از کم کرشنا دینی ضرور ایک آزاد نظم ہے، نہ بحر کی جکڑ بند، نہ قافیے کی پابند۔

اتن پورنا نے اپنے بازو کرشنا دینی کے بازوؤں پر ڈال دیئے اور بولی "دینی! چلو آج وشیشری کے ہاں چلیں۔ کل تو آئی تھی اور آج اس نے شکل ہی نہیں دکھائی۔"

کرشنا دینی نے اپنا چھوٹا سا خوبصورت سر ہلا دیا۔ اور پنکھے کی ڈنڈی کو قالین پر پھیرتے ہوئے بولی "اتن پورنا میں باہر نہیں جا سکتی۔"

"کیوں نہیں جا سکتی باہر؟" اتن پورنا نے حیران ہو کر پوچھا۔

دینی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے اتن پورنا کے گلے میں بازو ڈال دیئے۔ بولی "دی دی ——" اور اس کے بعد اس کے کان میں کچھ کہہ گئی۔

اتن پورنا اچھل پڑی۔ بولی۔

"سچ؟"

دینی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میرا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑایا۔ دینی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور غسل خانے کی طرف چل دی۔ اتن پورنا نے تالی بجائی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ وہ بھی اپنی کھڑاؤں پر گھوم گئی اور سامنے رسوئی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی جہاں اماں بیٹھی ہوئی زمین قند چھیل رہی تھی۔

اتن پورنا نے کہا "اماں ——"

اماں نے سر ہلا دیا۔ اتن پورنا اس کے قریب پہنچ کر جھک گئی اور اس کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ اماں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کے گالوں پر ایک قہقہاتی ہوئی سرخی نمودار ہوئی۔ پھر ایک مسکراہٹ ناچتی ہوئی اس کے چوڑے چکلے چہرے پر چوگان کھیلنے لگی، اماں نے چاقو اور زمین قند کو ایک طرف رکھ دیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی۔

"پنڈو گاروو (پنڈت جی!)"

میرے لئے یہ سب ایک پہیلی سے بڑھ کر تھا۔ میرا خیال تھا کہ بھیم راؤ اس سے کوسے ہیں۔ وہ اٹھ کر اپنی بیوی کے پاس چلے گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ریل گاڑی میں بیٹھا ہوں جو دندناتی ہوئی ایک سرنگ میں سے گذر رہی ہے۔ گھپ اندھیرا چھا گیا ہے۔۔۔ کوئی خوفناک بات ہو گی۔ یہ سوچتے ہی سرنگ ختم ہو گئی۔

کرشنا دینی نے پہلے کبھی وہ سبز رنگ کی پکی گھنگھری نہ پہنی تھی۔ گھنگھری کا رنگ گہرا سبز تھا اور انگیا کا پیکا سبز۔ اس کی آنکھوں کی جھیلوں میں بھی سبز رنگ کا عکس پڑ رہا تھا۔ یہ رنگ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ وال مجھے اس سے ضرور کرنا چاہیئے تھا۔ اس کے لہو میں کسی نے سونا گھلا کر ڈال دیا تھا؟ یہ سونا ہی تو تھا جو اس کے گالوں پر دمک رہا تھا۔ یہ سونا کیا کہہ رہا تھا؟ مانگ کہہ رہا تھا۔ پوری پوری گیند ڈنڈی تھی۔ کیا مجال کوئی لٹ پھنس جائے۔ کوئی بال مڑ جائے۔ کنگھی چوٹی کافی جوانی کے ساتھ ساتھ اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ ناک کی سیدھ رکھ کر سر کے بیچوں بیچ مانگ کاڑھنا اتن پورنا کو سرے سے ناپسند تھا۔ مگر نہیں کرشنا دینی کی سیدھی مانگ اتن پورنا کی ٹیڑھی مانگ سے کہیں سندر لگتی تھی۔ اس وقت دونوں بہنیں میرے قریب بیٹھی ہوتیں تو میں اپنا ووٹ چھوٹی بہن کے حق میں دیتا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد پورے گیارہ بجے اندر سے دیا کے سُر سُنائی دیئے صرف اتّ پورنا ہی کی دیا تو یہ رنگ نہیں جما سکتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ محلے بھر کی دیا بجانے والی سہیلیاں سُر میں سُر ملا کر کوئی راگ سا دھ رہی ہیں۔ ایسی بھی کیا خوشی تھی ؟

جتنی عورتیں اور لڑکیاں جن کا ٹھٹھا اور ہنسی مذاق ہوا کو چیرے ڈالتا تھا آخر کس تقریب پہ بلائی گئی تھیں ؟ مجھ سے نہ رہا گیا۔ باہر کھڑکی کا پردہ ذرا سرکا کر میں نے آنگن کی طرف نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ کرشنا دیبی سامنے والے کمرے میں پیلی دھوتی پہنے بیٹھی ہے اور آرتی اتاری جا رہی ہے۔ تھال میں کم کم نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس میں کوئی چڑھاوا نہیں چڑھایا گیا تھا۔ کرشنا دیبی نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ اتنی بھی کیا لاج تھی ؟ یہ کیا کوئی دیوی بننے کا اپالے تھا۔

کرشنا دیبی کی ماں کو بدھائیاں مل رہی تھیں۔ اتّ پورنا کی دیا سب سے زیادہ چمک رہی تھی۔ رنگا رنگ کی ساڑھیاں میرے ذہن میں خلط ملط ہو رہی تھیں۔ ابھی ایک بچی رونے لگی۔ اسے ایک کیلا مل گیا۔ ادھر ایک لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کے منہ میں گڑ اور نقلوں کا لڈو ٹھونسنے لگی کہ ایک لڑکا جھپٹ کر اسے چھین لے گیا۔ کچھ پروا نہیں لڈوؤں کی کیا کمی ہے ؟ بھائی خوش ہے، جیتا رہے ..... میری فطرت کے ایک پُراسرار کونے میں کوئی ماں سچین جاگ اٹھا جسے اتّ پورنا نے اپنے گیت کی لہروں پر اٹھا لیا۔ یہ کیسا گیت تھا ؟ شاید یہ دودھ اور شہد کا گیت تھا۔ دودھ دوہتے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے کچھ ایسی ہی آواز اتّ پورنا کی دیا پر پیدا ہوتی تھی۔

"اب تم گاؤ شیشری"

"تم سے اچھا تو نہ گا سکوں گی۔ اتّ پورنا! اچھا بتاؤ کونسا گیت گاؤں ؟"

وہی جو تم نے اس روز گایا تھا۔ جب دیبی کی طرح میں نے سلی دھوتی پہنی تھی اور اسی طرح اسی آنگن میں ——— برکت والے آنگن میں، عورتیں اور لڑکیاں جمع ہوئی تھیں ——— وہی شہد کی مکھیوں والا گیت"

شیشری نے گانا شروع کیا۔ اندھیری کی شہد کی مکھیاں کیا کہہ رہی ہیں۔ یہ سوال میرے ذہن کی چار دیواری میں بند ہا۔ دیا کے سُر آگے بڑھتے گئے۔ یہ کوئی معمولی گیت نہ تھا۔ صدیوں کی نسوانیت کا حزن بھرتی تھا۔ ابھی تو در پہر تھی۔ لیکن ہر عورت اور لڑکی کی پیشانی پر ایک ایک چاند نظر آ رہا تھا۔ کم کم کے سُرخ بوٹ !

کرشنا دیبی کی آنکھیں اور پرنم ہو گئیں۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی۔ جو اب تک کبھی اپنی چوکڑی نہ بھولی تھی۔ اس کے آویزے ساکن تھے۔ اس کے نگینے چپ تھے، لاج اور وہ سنہرا گاہے ٹکھی یوں تو ام بہنوں کے روپ میں نظر نہ آئی تھیں۔ مگر وہ کوئی کبھی تری تو نہ تھی جسے پہلی بار انڈے بیچنے سے سابقہ پڑا ہو۔

ٹھٹھا اور ہنسی مذاق خاموشی میں بدلتے گئے۔ گیت بھی کافی ہو چکے تھے۔ دیاؤں کے تار ٹھنک گئے تھے۔ کرشنا دیبی کی ماں اور بہن نے کم کم کی تھالیاں اٹھا کر ہر کسی کی پیشانی پر پھر سے نئے بوٹے لگا دیئے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ پہلے لگے ہوئے بوٹے ہی جل کر دیئے گئے۔ ایسا دن تو بہت مبارک تھا۔ ہر کسی کو پان پیش کیا گیا۔ ناریل اور کیلے تقسیم کئے گئے۔ اور یوں سب کو وداع کیا گیا۔ صدیوں سے یوں ہی ہوتا آیا تھا۔ کم کم کے سُرخ بوٹے اُن عفت نسلوں سے قائم رہے تھے۔ ان کا رنگ کبھی پھیکا پڑنے نہیں دیا جائے گا۔

دوسرے روز پھر محفل شام کے قریب جمی۔ پھر تیسرے روز بھی شام ہی کو چوتھے دن شام کی بجائے صبح ہی کو یہ رونق شروع ہو گئی۔ اس اثنا میں مجھے پتہ چل چکا تھا کہ کرشنا دیبی رجسولا (حائضہ) ہو گئی ہے۔ مجھے حیرت ضرور ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہندوستان میں کوئی ایسی رسم میرے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

بھیم راؤ کی باتوں میں بیناکاری کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ بولے "مجھ دھرم میں آندھ پردیش کوئی دشواش نہیں رکھتا۔ سچ کہتا ہوں مجھے تو

حیرانی ہے یہ سن کر کہ آپ کے ہاں ایسی کوئی رسم منائی نہیں جاتی۔"

"ہاں ہاں حیرانی تو ہونی ہی چاہیئے" میں نے بڑھاوا دیا۔

"کتنا فرق ہے دھرتی دھرتی کا۔"

"یہ تو ظاہر ہے۔"

"رجسولا ہونے پر گویا کنیا کو قدرت کا آشیرباد ملتا ہے۔"

"آپ کا ملحوظ نظر بالکل ٹھیک ہے مسٹر راؤ اور ایسے موقع پر خوشی منانے سے ہرگز نہ چوکنا چاہیئے۔"

"ہمارے یہ گیت آپ کو کیسے لگتے ہیں۔"

"یہ سب گیت، دیکھا کہ یہ سُر آندھرا دیش کے ابدی بول معلوم ہوتے ہیں۔"

آندھرا دیش کے ابدی بول! ہماری یہ رسم بہت پرانی ہے۔"

"ضرور پرانی ہوگی۔"

پہلے روز جب کنیا کو اپنے رجسولا ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح فوراً ماں تک یہ خبر پہنچا دیتی ہے۔ تین دن تک اسے ہلدی کے پانی میں رنگی ہوئی دھوتی پہن کر الگ کمرے میں بیٹھنا ہوتا ہے۔ کوئی اسے چھوئے گا نہیں۔ اس کی آرتی بھی دور ہی سے اُتاری جاتی ہے۔

"آرتی میں ہمارے یہاں جتا ہوا دیا، چوکھا دیا نہ بھی ہو تو پروا نہیں۔ ضروری سمجھا جاتا ہے مگر آپ کے ہاں ——"

فرق تو ہوتا ہی۔ دھرتی دھرتی کا۔ ہمارے ہاں بس کم کم ہی سب سے ضروری مان لیا گیا ہے آرتی کے لئے؟"

"سُرخ کم کم؟"

"کم کم ہمیشہ سُرخ ہی ہوتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر آنکھیں جھکا لیں۔ بھیم راؤ نے اپنی بات جاری رکھی۔ کھانے میں بھی رجسولا کو کافی پرہیز کرنا ہوتا ہے۔

سُرخ مرچ اور گرم مسالے اس کے لئے ممنوع ہیں۔ میٹھے بٹھائے اسے کھچڑی دودھ اور کچھ پھل مل جاتے ہیں۔ کھائے اور پورا آرام کرے۔ یہ ضروری ہے۔"

"تین دن کے بعد کیا ہوتا ہے؟" میں نے پھر بڑھاوا دیا۔

"کنیا اشنان کر کے پوتر ہو جایا کرتی ہے اس کی وہ پہلی دھوتی دھوبن کو بطور تحفے کے دے دی جاتی ہے۔ اب وہ ماتا پتا کی حیثیت کے مطابق نئے دستر پہن کر بیٹھتی ہے اور یہ چوتھی یعنی آخری آرتی اُتارتے وقت اس کی پیشانی پر بوٹو لگایا جاتا ہے۔"

"بوٹو کے لئے کم کم نہ ہو تو آندھرا دیش کا کام ہی نہ چل سکے مسٹر راؤ!"

"کم کم؟ یہ تو ضروری ہے۔"

"بلکہ یہ کہیئے کہ آندھرا دیش اور کم کم دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔"

"بس اب آپ نے ٹھیک سمجھا ہے بات۔"

"میرا رجحان شروع سے سبز رنگ کی طرف رہا ہے مسٹر راؤ!"

"سبز رنگ کی طرف؟ لیکن سُرخ رنگ تو زبان پر ہوتا ہے ..... کم کم کا پیغام آندھرا دیش صدیوں سے سنتا آیا ہے۔"

رنگوں کا مطالعہ میں نے بھی کر رکھا ہے مسٹر راؤ! سبز رنگ، اپنی جگہ ہے یہ شانتی کا رنگ ہے۔ ہر سبز چیز امن و سکون کا اشارہ کرتی

ہے۔ قدرت کو شاید یہی رنگ سب سے زیادہ پسند ہے۔ جب تک دھرتی بنجر نہیں ہو جاتی۔ اس کی کوکھ سے اس رنگ کے کارنامے ہمیشہ ہمارا دھیان کھینچتے رہیں گے۔ کانگریس نے بہت اچھا کیا کہ اپنے جھنڈے پر اس رنگ کو اس کی جگہ دینے کی بات فراموش نہ کی۔ سفید رنگ میرے خیال میں پوتر تا (پاکیزگی) کا رنگ ہے۔ ہمارے جھنڈے پر بھی یہ رنگ بھی موجود ہے اور سُرخ رنگ ؟ میں سمجھتا ہوں یہ خون کا رنگ ہے۔ اچھے تندرست خون کا رنگ ——— تازہ مضبوط زندگی کا رنگ ..... سبز۔ سفید۔ سُرخ۔ خوب رنگ چُنے ہیں کانگریس نے یہ جھنڈا بنانے کا کام آندھرا دیش کے سپرد کیا جاتا تو سارے جھنڈے پر کم کم ہی کم کم پھیل جاتا۔"

"لیکن یاد رہے کہ سُرخ رنگ کا مفہوم سمجھنے میں آندھرا دیش نے خوب قدم بڑھایا ہے ..... کانگریس کے بائیں ہاتھ نے ادھر جو زور پکڑا ہے۔ وہ بھی ظاہر ہے۔ پچھلے دنوں جب شری شمناس چندر بوس کانگریس پردھان کے انتخاب میں دوبارہ کھڑے ہوئے تو آندھرا دیش کے ووٹ بہت بھاری تعداد میں انھیں کو ملے تھے۔ حالانکہ ان کے مقابلے پر کھڑے ہونے والے ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا آندھرا دیش کے اپنے آدمی ہیں مگر آپ جانتے ہیں ان باتوں میں لحاظ داری تو ٹھیک نہیں ہوتی۔ سوشلزم اور ہندوستان کی آزادی ہمارے دو بڑے آدرش ہیں اور آندھرا دیش کو الگ صوبے کا وقار حاصل ہو جائے۔ اس کے لئے ہم اپنی جانیں لڑانے پر آمادہ ہیں۔"

"پنتلو گارو (پنڈت جی!) باہر سے کسی نے آواز دی۔

بھیم راؤ باہر چلے گئے۔ میں کھڑکی میں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوا کہ کسی کے غیر مرئی ہاتھ میری پیشانی پر کم کم کا بڑا ٹیکا لگا رہے ہیں۔ میں جھٹ رہاں سے ہٹ گیا اور کمرے کو اندر سے بند کر کے میں نے بائیں کھڑکی کا پردہ ہوئے ہوئے ایک کونے سے سرکایا۔ سامنے بڑی خوشنما جلس نظر آ رہی تھی۔ کرشنا دیبی نے ہلکی نیلی انگیا کے ساتھ گہری نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ آویزوں کے نگینے سبز دئی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ذہن کے بچے کھچے سبزہ رنگ نے ان رنگینیوں میں پناہ پا لی ہے۔

اتن پورنا نے دیپا پہار کا راگ شروع کیا۔ اس کی انگلیاں بہت ہمک ہمک کر چل رہی تھیں مگر اس راگ سے بھی کرشنا دیبی کی آنکھیں اوپر نہ اٹھیں، اتن پورنا آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی اور کرشنا دیبی دھرتی کی طرف۔ آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی۔ کس نے چھو دیا تھا اپنے غیر مرئی ہاتھ سے اس کنیا کو؟ ..... ہر رجسولا تو یوں چھوئی موئی بن کر نہ رہ جاتی ہوگی ... ہلکی نیلی انگیا، گہری نیلی ساڑھی اور آویزوں کے سردئی نگینے: ... باہر سے تازہ ہوا کا جھونکا آ رہا تھا۔

بہت بوجھی یہ لاج دیبی "اتن پورنا بولی" میں بھی ہوئی تھی۔ رجسولا تیری طرح۔ میں نے تو پہلے ہی روز کے بعد مسئلہ شروع کر دیا تھا، اور پوچھا بیٹھ۔ سامنے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔"

"میں تو کبھی نہیں سمجھا تی کسی کو۔"

کرشنا دیبی کے چہرے پر جو لے ہوئے وہی پرانی شوخی آ گئی۔ اماں نے آگے بڑھ کر کم کم اٹھایا اور اس کے بوٹو کو جلی کر دیا۔

کرشنا دیبی اب کوئی چھوئی موئی نہ تھی۔ ہر چہرے کی طرف اس کی آنکھیں اٹھ جاتی تھیں۔ کالی جھیلوں میں نہ جانے کتنی لہریں تھرک رہی تھیں... ... کرشنا دیبی کے صندلی بازو، جنھیں دیکھ کر تازہ تازہ مذبوحہ کئے جانے کا گماں ہوتا تھا۔ اوپر اٹھتے ... اس نے سب کو نمسکار کیا۔

سب عورتیں اور لڑکیاں مسکرائیں۔ سب کے سُرخ بوٹو تازے کم کم سے جگ اٹھے۔ جلنے کیا کہہ رہی تھیں۔ کاجل کی لکیریں ہر آنکھ میں؟ ..... پان بیٹے ——— سبز پان، جو اپنے سینوں میں سُرخ چُگ چھپائے پڑے تھے، کیلے بیٹے۔ ناریل بیٹے۔ سب اٹھ کھڑی ہو گئیں ..... کیا لے کر رگھیں تھیں یہ ساڑھیاں؟ کیا لے کر سرخی تھی یہ زمین؟ ——— اس کے خط، اس کی قوسیں۔ چونٹ، گال، آنکھیں، سینے! کون فنکار ان کی تخلیق کرتا تھا؟ کون تھا جو زمین کی ہر بیٹی کو ٹھیک وقت پر رجسولا بنا دیتا تھا؟ ... یہ تو بہت ضروری تھا۔ ان گنت صدیوں

سے، سبز، سفید اور سُرخ صدیوں سے یہی ہوتا آیا تھا۔

سب عورتیں چلی گئیں۔ سب لڑکیاں بھی تتر بتر ہو کر اپنے اپنے گھر بھاگ گئیں اب صرف کرشنا دیبی اور اتن پورنا دیوی گئیں، اماں رسوئی میں جا چکی تھی۔

"اچھا پورنا ایک بات بتاؤ گی؟"

"پوچھو پوچھو۔"

رحجو لاہو کر بھی میں اتنی کمزور نہیں ہوتی۔ بھلا کیسے؟

"کیسے؟ یہی ہوتا آیا ہے جب سے دنیا ہے۔ میں کون سی کمزور ہو گئی تھی؟ بلکہ رنگ نکھر جاتا ہے، اس سے..... پھر.....

ہر مہینے!

ہر مہینے؟

"چپ دیبی کوئی سُن لے گا۔"

پھر دونوں ہنس اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔ میں اپنے سُرخ قالین پر لیٹ گیا۔ میری روح کی گہرائیوں سے ایک خیال اُٹھا، اور باہر سے آنے والی ہوا کے جھونکے سے ٹکرا گیا۔

میرے ذہن میں کانگریس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سبز، سفید اور سُرخ ——— اس جھنڈے کی عمر بہت زیادہ تو نہ تھی۔ مگر یہ رنگ تو پرانے تھے۔ ہمالہ کے ہم عمر رنگ، گنگا، برہم پتر اور گوداوری کے ہم عمر رنگ! ہوگا ان رنگوں کا اپنا اپنا مفہوم۔ مگر میں تو اس مفہوم پر ڈٹا تھا جو ہندوستان نے ان رنگوں کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا..... اور میری آنکھوں میں وہی لاری پھرنے لگی، جس پر سوار ہو کر میں بھیم راؤ کے مکان تک پہنچا تھا۔

دائیں بائیں آمنے سامنے۔ جہاں تک میرے ذہن کی پہنچ تھی۔ سُرخ زمین لپٹی ہوئی تھی۔ ایک رحجو لاکنیا کی طرح وہ آرام کر رہی تھی۔ وہ وقت مجھے بہت قریب آتا دکھائی دیا جب اس کی کوکھ ہری ہوگی اور کوئی ایسا آدمی پیدا ہوگا جو یہ آواز بلند پکارے اُٹھے گا۔ بلوں کی جے۔ اب ان کھیتوں میں غلام نہیں اُگیں گے۔ یہ لالی دھرتی ہے۔

اختر اورینوی

کلیاں اور کانٹے

وہ تعداد میں زیادہ تھیں۔ گوری، سانولی، گیہواں اور تانبار، بعض ان میں دلکش کہی جا سکتی تھیں مگر خوبصورت کوئی نہیں۔ سورج اسی طرف سے طلوع ہوتا تھا جس طرف سے وہ اپنی مفید ساریوں میں ملبوس صبح کے جھٹپٹے میں ڈور ینڈا کی جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلتی دکھائی دیتی تھیں۔ ہر صبح اکٹھا دھرا آتی تھیں اور ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح مشرقی افق کی طرف سفر کر جاتی تھی۔ درجۂ اول کے کوارٹر، صحت گاہ کے عام وارڈوں سے قریباً تین فرلانگ پورب کی جانب تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی ڈیوٹی اسی طرف ہوتی تھی اور ڈیوٹیاں بدلتی رہتی تھیں۔ ہر پندرھویں روز۔ عام وارڈ کے بھی دو درجے تھے۔ دوم و سوم۔ درجۂ اول کے کوارٹر تو خاصے بنگلے تھے۔ ان کی اپنی شخصیت تھی۔ وہ اسپتال نہیں گھر معلوم ہوتے تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار ان کا کرایہ تھا۔ درجہ دوم کے چالیس روپے ماہانہ تھے۔ ایک مریض کو دو کوٹھڑیاں مل جاتی تھیں۔ ایک اپنے لئے ایک تیمارداری کے لئے۔ تیسرے درجے کے معنی تھے ایک وسیع سا لانبا چوڑا کمرہ۔ ایک کمرے میں آٹھ پلنگ ہوتے تھے اور حب حیات کے لعب والموت کی رفتار میں زیادہ تیزی ہو جاتی تو مسلسل دو دو تین تین کے جرثیم کے چنداور شکار آ جاتے تھے اور کمرے کی آبادی بارہ تیرہ تک پہنچ جاتی تھی۔ درجہ سوم کا کرایہ پچیس روپے ماہوار تھا۔ زندگی۔ موت اور زندگی، موت کے درمیان بھی انسانیت درجوں میں بٹی ہوئی ہے۔ گھر، اسپتال اور قبرستان، ہر جگہ نمبر ایک، نمبر دو اور نمبر تین کی تفریق ہوتی ہے۔ کالوں کا قبرستان، گوروں کا قبرستان، شرفاء کے مدفن اور غریبوں کے گورستان ہر شہر، ہر قصبے اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ صحت گاہ، اسی کرہ پر قائم تھا اور اسی کے بھلے برے قانون کا پابند۔

ہم ان دنوں دس تھے۔ صحت گاہ کے انتہائی جنوبی طرف تیسرے درجے کے وارڈ میں۔ یہاں سے نرس کوارٹر سامنے نظر آتا تھا۔ لمبے کے پلنگ پر پڑے ہوئے مریض درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان نرسوں کی آمد و رفت کا دور اس طرح دیکھتے تھے جیسے فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی مزدوروں کے ترسے ہوئے بچے پرستانی دوکانوں میں شیشے کی الماریوں کے اندر کھلونے دیکھتے ہیں۔ وہ نو نرسیں ہم سے شناسا تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ڈیوٹی ہم لوگوں کے وارڈ میں کبھی نہ کبھی رہ چکی تھی۔ اس کے علاوہ گاہے گاہے کی پارٹیوں اور پک نکوں میں ہم لوگوں کا ساتھ

رہتا تھا۔ ہم سب نرسوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ہمیں۔ ہماری گفتگو کا اکثر حصہ انہی سے متعلق ہوتا تھا۔ ان کی تعریف، ان کی برائیاں، ان کے ناز، ان کی سائیکیں، ان کی محبت و نفرت۔ ہم رومان سے تنگ کر بیٹھے حقیقت طرازی پر اتر آئے تھے۔ ہمارے گرسنہ جذبات رومانی بیانات کے شربت کو برداشت کرتے کرتے تنگ گئے تھے۔ ہمیں مصالحہ دار چٹپٹی چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہم میں سے اکثر افراد اس وارڈ میں ایک سال گذار چکے تھے اور چند ایسے بھی تھے، جن کے تین سال ختم ہو گئے تھے۔ امید و ناامیدی کے تین سال، ارمانوں اور محرومیوں کے تین طویل سال۔ ایک دو فوداور تھے، یہ لوگ دنا رہے سہے، سنجیدہ، اہل، متردد، بے بس اور بلغمی سے نظر آتے تھے چند ہفتوں میں یہ بھڑک عموماً دور ہو جاتی تھی اور نئے بہت جلد پرانے بن جاتے تھے۔ لیکن ایک دو پرانے بھی ایسے تھے جن کی مستقل مایوسی و گھبراہٹ کبھی دور نہ ہوتی۔ بہر کیف موت اور بیماری کے درمیان بھی وارڈ کی مجموعی فضا خوشگوار تھی۔ استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ وقتوں میں ہم لوگ کھیلتے تھے، ہنستے تھے، جملہ بازیاں ہوتی تھیں، قہقہے گونجتے تھے، نرسوں سے لگاوٹ ہوتی تھی، اصلی اور نقلی آپس کھینچی جاتی تھیں، سرگوشیاں ہوتی تھیں اور رازداریاں بھی۔ ہم دسوں کا ایک خاندان تھا، ایک مذہب۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ رنجیدہ۔ وارڈ میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی، پر سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے کہ ازکم ایسا نظر آتا تھا۔ ہاں استراحت کے گھنٹوں میں ہماری اجتماعیت ٹوٹ کر بکھر جاتی تھی اور ہم میں سے ہر ایک اپنی دنیا بسا تا تھا اور ویران کرتا رہتا تھا۔ رات کے آرام کے علاوہ دن بھر میں تین استراحت کے وقفے ہوتے تھے۔ باضابطہ طور پر نرسیں گھنٹی بجا کر مریضوں کو بار بستر ہو جانے پر مجبور کرتی تھیں۔ یہ بھی ایک علاج تھا۔ نیند اور گفتگو ممنوع، زندہ لاش کی طرح پڑے رہئے۔ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم کروٹ لیجئے اور کچھ مت سوچئے۔ فکر و تردد ایسے مریض کے لئے مہلک ہے۔

"سوچا مت کیجئے۔ اچھے ہاں ..... ں!"

نرسیں بڑے پیار سے کہتیں۔ مگر بھلا کوئی کیسے نہ سوچے؟ ہم اکیلے پلنگ پر پڑے پڑے سوچتے رہتے تھے۔ زندگی کا سوچ، موت کا سوچ، مستقبل کا سوچ، وقت کا سوچ، آرزوؤں کی لاش، ماضی کا ماتم، مستقبل کا روگ اور سب سے بڑھ کر روح کی وہ مہیب کپکپی جو مادہ کے سہارے سے علیحدگی کے محض تصور سے ہی طاری ہو جاتی ہے۔ جسم، محسوس، ٹھوس، تپاں، متحرک، خود نگر، خوبصورت اور حقیقت کا اچانک سرد اور بے حس ہو جانا! احساس و ادراک جھٹپٹانے لگتے ہیں۔ فرد کے وجود کا لامعلوم، تاریک، بے پایاں، لامکاں بے زماں وسعتوں میں تحلیل ہو کے فنا ہو جانا، سوچنے والے دماغ، دھڑکتے ہوئے دل، تیرتے ہوئے خون کا تعطل اور لاعلمی کا لرزہ خیز ناقابل تصور پھیلاؤ۔ یہ کائنات کا سب سے المناک سانحہ ہے۔ ہم رصعت گاہ کی خاموشیوں میں پھیلتے ہوئے لمحات کو سرکتی، گھٹتی، ڈوبتی ہوئی زندگی کے انجام کو سوچ کر لرز اٹھتے تھے۔ ہم خیالات کے بوجھ کو فضا میں پھینک کر اپنی قمیصوں کے بٹن یا پلنگ کی پٹی کو پکڑ لیتے تھے تاکہ معلوم اور شناسا چیزوں کی ہستی کا ٹیک مل جائے۔ ہم گاہ ٹمٹر کے دام اور پیٹ کوٹ کے حاشیے کو تخیل سے چھو کر دردِ زندگی کی اذیتوں سے پناہ لیتے تھے اور کبھی بے خواب راتوں کی نیند کا کاجل گھول کر احساس کو افیون دینے کی کوشش کرتے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کی طرح پپڑے نڈھال بہنے لگتے تو ——

"اوہ ..... رے ..... رے! بڑے صاحب سے کہہ دوں گی، یہ تو سونے لگے ہیں!"

کی آواز ستائی دیتی اور گاہے گاہے گال یا پیشانی پر ایک آشنا سی چپت۔ یہ نجات دہندہ آواز سر سے بوجھ اتار دیتی تھی۔ ہماری آنکھیں مسکراتی ہوئی کھل جاتیں۔

"میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا مس صاحب، سوتا کون ہے؟" "آیئے آپ بھی سو جایئے؟" یہ جواب ملتا۔ پھر کبھی تسکین دہ ردِ عمل۔

وہ روز طلوعِ آفتاب کے بعد کرنوں کی طرح وارڈ میں آتی دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے نسائی آوازوں کے گنگنانے کی سی بولنے لگتے تھے۔ ہر پرندا ہر سمت اس طرف دیکھتے۔ 'صحت گاہ' کی ویرانیوں میں یہ روزانہ کا واقعہ بھی کافی اہمیت رکھتا تھا۔ سفید سایاں سبز جھاڑیوں سے نکلتیں جیسے پیلے کے پھول کو ٹہنی کے اخضر پردے سے نکلتے ہیں۔ بگلوں کا پرا قریب تر ہوتا جاتا اور آوازیں زیادہ واضح۔

پھلجھڑی چھوٹتی اور دو پھول ہم لوگوں کے وارڈ میں آگرتے۔ ہم دسوں مریض انہیں اپنے دامن نظارہ میں لے لیتے۔

جب کسی نرس کی ڈیوٹی درجۂ اوّل کے کوارٹر سے اس وارڈ میں بدلتی تو عموماً وہی ہوتا کہ بجائے بے جا شور پر کردہ و ناکردہ غلطیوں پر ہم لوگوں کی سرزنش یوں کی جاتی:

"ہیں اے وارڈ میں پھل پھی کیسے اچھے مریض ہیں اے وارڈ کے اچھی اسی وارڈ کے مریض تو جان کھا جاتے ہیں"۔

"کیسے اچھے ہیں اے وارڈ والے! اپنے نوکروں سے کام کرا لیتے ہیں بے چارے اور یہ لوگ تو جوتے سیدھے کروانے میں جیسے میں ان کی نوکرانی ہوں....." اور کبھی زیادہ دلدوز:

"گھر میں کہتے ہوں یہ بھٹا بھڑ شان دکھلانے آئے ہیں۔ اے وارڈ میں نواب صاحب اپنا منہ تک میلا نہیں کرتے تھے"۔

ہم دسوں مریض مختلف زاویوں سے درجۂ اوّل کے کوارٹر کو معاندانہ دیکھنے لگتے اور کوارٹر کی سرخ اینٹیں طنزیہ ہنسی ہنسی نظر آتیں۔ میجر نواب صاحب کی موٹر، ان کا جوان لڑکا، منصف عباس صاحب وصنی راج جی کے بھائی کی تند اور ٹھوتی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، عجیبے کے صدر ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا گورا چٹا چالاک و فتنہ کار فرد نظر، بیرا، وتیار دار، غرض درجۂ اوّل کی ساری مخلوق سیل کے کنکروں کی طرح محسوس ہوتی۔ جو ہمارے پھیپھڑوں کو چھلنی کر رہی ہے۔ ہم ان سب کو اپنے اندر سے نکال کر تھوک دینا چاہتے تھے۔ تھوک دانی کے لئے ہر بالک ایسٹڈ میں فنا ہونے کے لئے۔

اس روز سینے کے گھاؤ زیادہ خلش پیدا کرتے اور ہم میں سے کوئی نرس ستمگار کے جسم کا جغرافیہ بیان کر کے دل کی بھڑاس اور پیچھے ہٹے جنسی ارمان نکالتے تھے۔

ہمارے دلوں میں بھی چور تھا اور ان کے دلوں میں بھی۔ ہمارے اندر کوئی ٹیڑھی سیدھی رگ ضرور ایسی تھی جو نرسوں کو ذلیل سمجھنے پر اکساتی رہتی تھی اور نرسیں بھی ہر وقت اپنی شخصیت اور پندار کے تحفظ کے لئے تیار رہتی تھیں۔ ان کے تجربے رنگ رنگ کے تھے۔ ماضی کے نہاں خانے میں میٹرنٹی مریض، بیسیوں ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر چھپے ہوئے تھے۔ نرسوں کے دلوں سے ہو کر ایک تار گذرتا تھا جو ان مریضوں اور ڈاکٹروں کو گزرے جیتے ہیں بھی پروتا چلا جاتا تھا۔

تیسرے درجے میں خلوت کا سکون اور مواقع نہ تھے لیکن اجتماع کا تنوع، بیرونی اور رونق تھی۔ اسے وارڈ کے علاوہ آپریشن وارڈ اور انفیکشن وارڈ کے درمیان بھی رقابتیں تھیں مگر یہ دوسری رقابت ولولہ انگیز اور عمل پرور تھی۔ یہ اپر اور لوئر مڈل زمین کے نشیب و فراز کا فرق تھا۔ پہاڑی علاقوں میں زمین کا اونچ نیچ بہت ہی نظر نواز ہوتا ہے۔ دونوں سی وارڈ تیسرے درجے کے وارڈ تھے۔ دونوں کا اعتبار اور امکانات برابر تھے لیکن ہمارے وارڈ کا ایک سارنگ 'صحت گاہ' میں مشہور تھا۔ ہماری لاگ اور لگاؤ بس سمجھئے متحد ہی تھی۔

وارڈ کے انتہائی داہنی طرف اٹھارہ سال کے ایک گورے ناؤک سے لڑکے کا بڈ تھا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں T.B. پائی جاتی تھی۔ یہ اس صحت گاہ کا معجزہ تھا اور مثالی نمونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مدراسی ڈاکٹر نے اسے حیرت انگیز طور پر سیل کے پنجوں سے چھینا تھا اسے بہت زیادہ آرام کر لے کی ہدایت تھی۔ پھر بھی وہ وارڈ کی ڈیوٹیوں میں کافی حصہ لیتا تھا۔ وہ نرسوں کا کھلونا تھا۔ "ننھا گوپال" گوپال پندرھویں سال میں سینی ٹوریم آیا تھا۔ اس کے ایک جانب ایک مارواڑی تھا بہت ہی مرتا تازہ۔ تین من اس کا وزن تھا۔ پر یہ غریب ساڑھے تین سال

"صحت گاہ" میں رہ کر بغیر شفایاب ہوئے ہی چلا گیا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں بڑے بڑے غار تھے۔ اس کے بڈ پر ایک مارواڑی ہی آیا۔ یہ اتنا دبلا تھا کہ ہم لوگ اسے سنگتی رام کا نبھرت کہتے تھے۔ تیسری ہستی ایک سیاہ رنگ کے مریض کی تھی جو حبشیوں کے جنون میں صرف ایک سیر ٹماٹر دن بھر میں کھا جایا کرتا تھا۔ وہ کم سخن مگر زندہ دل تھا۔ یہ حضرت مرمر کے بچے تھے۔ شاید ان کی صورت دیکھ کر ملک الموت بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ چوتھا خود میں تھا۔ "صحت گاہ" میں اپنی شادی کے سوٹ پہن پہن کر حسرتیں نکالنے والا میرا دوسرا ہمسایہ نقی تھا۔ ایک طرف بھائی حافظ کی سیاہ فامی اور دوسری جانب نقی کا کافوری رنگ ہم تینوں مل کر اس اشتہار کی تصویر بن جاتے تھے جس کے نیچے لکھا ہوتا ہے "اب کالا کوئی نہیں رہے گا"۔ نقی حسین تھا اور بے حد جوان معلوم ہوتا تھا۔ شوخ، چونچال، بیباک اور ہنس مکھ۔ اس کی آمد سے نرسی وارڈ کا پلہ گراں ہو گیا تھا۔ پہلے اپر سی وارڈ میں گھنٹی نرسوں کا مرکز ثقل تھا۔ مگر اب ڈیوٹی ختم ہوتے ہی ساری نرسیں اپنے کوارٹر جاتے ہوئے "نرسی" میں چلی آتی تھیں۔ گھڑی دو گھڑی کے لئے کھانے کی میز کے گرد بڑی دل نواز فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ چہل سالہ وکیل صاحب کے چست فقرے نرسوں کو بہت لبھاتے تھے۔ وارڈ میں دو وکیل صاحبان تھے۔ ایک واڈھی رکھتے اور نقلیں کرتے تھے، دوسرے پیشانی پر چندن کا ٹیکا لگاتے اور نرسوں سے فحش مذاق کرتے تھے۔ جونیئر وکیل صاحب کی تابناک پیشانی پر عبیر کی سرخ بندیا نرسوں کے لئے سرمایۂ تفریح تھی۔ ان دونوں بزرگوں کی تکنیک ایک سی تھی۔ یہ پہلے بے وقوف بن کر اور جملے سہہ کر اپنا حق جما لیتے تھے اور پھر معصومانہ انداز میں مذاق کا جواب دیتے تھے۔ ان دونوں کا نشانہ بے خطا تھا مگر ایک کی فطرت میں ایجابی طنز زیادہ تھا اور دوسرے میں واقعیت نمایاں۔

نقی کے بائیں پہلو میں ایک نوجوان مصری تھے۔ گورا رنگ جس پر سرخی کی چھوٹ تھی۔ مصری بہت جذباتی اور رقیق القلب تھے۔ جسمانی طور پر یہ جو بھی رہے ہوں مگر ذہنی طور پر بالکل کنوارے تھے۔ اچھوت کنیا کی طرح۔ مجھے نقی اور مصری کو ایک پھیپھڑے میں "لے پی" دی جاتی تھی۔ مصری کم مریض تھے۔ "لے پی" کا کورس ختم ہو چکا تھا۔ ان کے مریض پھیپھڑے کو "فرینک نزد" کی جراحت کے ذریعہ معطل کر دیا گیا تھا۔ میں اور مصری میڈیکل کالج کے طالب علم رہ چکے تھے۔

نوبں صاحب ایک اڑتالیس سال کے دبلے پتلے سائی تھے۔ یہ نہایت ہی سعادت مند قسم کے مریض تھے۔ استراحت کے گھنٹوں کے اندر اور اس کے بعد بھی وہ قطعی طور پر لکڑی کے تختے کی طرح چست لیٹے یسوع مسیح سے لو لگائے رہتے تھے۔ کوئی جنبش نہیں، کسی قسم کے آثارِ حیات نہیں۔ وہ جب ضرورتاً چلنے پھرنے پر مجبور ہو جاتے تھے تو یوں چلتے تھے کہ "زیر قدمت ہزار جان است"۔ اصولاً وہ اپنے "مسل زدہ" پھیپھڑوں کو کم سے کم حرکت اور زیادہ سے زیادہ آرام دینا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک گفتگو بھی زیانِ حیات تھی۔ ہر وقت، ہر روز، ہر سال یونہی زندگی گذارتے تھے جیسے سسرال میں نئی دلہن۔ "صحت گاہ" میں انہیں ڈھائی سال ہو چکے تھے۔

دسویں ہستی ایک بنگالی مسلمان لڑکے کی تھی۔ سولہ سترہ سال اس کی عمر ہوگی۔ موٹا گول مٹول سا، گردن ندارد۔ یہ لڑکا غلام ربانی بھی بڑا بھولا کا مریض تھا۔ کم سخن و کم آمیز مگر بسیار خوار و بسیار خواب۔ اسے ہم لوگ "مرغ" کہتے تھے اور پر تجربا کر "پطرس دلی"۔ "مرغ" و "فوک" کے علاوہ غسل بھی "سیتا" تھا۔

یہ دسوں مختلف طبائع کے لوگ ایک انوکھی ہمدردی کے ذریعہ ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ تھے۔ نرسوں سے مذاق کے وقت "پطرس دلی" بھی ایک دو مسکراہٹیں ضرور ارزاں کر دیا کرتے تھے۔ ویسے بھی وہ ہمارے رومانوں سے کافی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ کیتھرین اور ایلسٹری کی آواز سنتے ہی "مرغ" بھی بانگ دینے لگتا تھا۔

یہ دو نرسیں جانِ سیتا و مریم تھیں۔ ایلسٹری بیس سال کی صندلی رنگ، دراز قد، چھوٹی مگر مسکراتی ہوئی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ جیتی تھی جیسے اسپ تازی "قدم" چلتا ہے۔ وہ اس کی گردن اور سینے کا "کون" ہتا ہے حریف مئے مرد افگنِ عشق "قسم کا نم! ایلسٹری ملنسار و لنواز

اور مجسم بہرگی تھی۔ وہ نسیم خوش خرام کی مثال آزاد و بہر گیر تھی۔ ایشری کیتھرن کو کتنا بڑا کہتی تھی۔ کیتھرن پچیس سالہ بھرپور جوان عورت تھی۔ سانولا رنگ، جراحات جہاں پر نمک ریز اس کے پھیلے اور گداز کولہے، اس کی گول کمر، اس کی مثالی ہندی چال، مست ہاتھی کی طرح۔ وہ دل الفت نظر میں داخل ہوتی تھی جیسے سمندری سفر کے بعد جہاز ہچکولے کھاتا ہوا ساحل کی طرف آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بھاری کولہوں کے محور پر بالائی جسم چلتے وقت جھوم سا جاتا تھا جیسے پھلدار شاخ مرسٹے تنے پر لچک سی جائے۔ پھر اس کے کولہے پیش و پس ڈگمگا کے متانت سے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ وہ داہنے ہاتھ سے ہلکا سا اشارہ کر کے ساری کے پلوؤں میں تناؤ پیدا کرتی اور چھوڑ دیتی تھی۔ آنچل کی پلٹن میں اس کے سینے ابھر آتے تھے اور پیٹ لہرانے لگتا تھا۔ کیتھرن عموماً متین سی دیتی تھی۔ مگر اچانک طور پر وہ شوخ و سحر کار بن جاتی تھی اور پھر پیچیدہ بجلی کا چنچل پن اور امنڈتے ہوئے کالے موج در موج بادل کی گھبیرتا۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کو نمایاں کر کے قاتل تر بناتی تھیں۔ اس کی نظر میں بحر الکاہل کی گہرائی تھی۔

ان دو کے علاوہ سات اور تھیں۔ ایک جوڑا تھا مارتھا اور فیبی۔ مارتھا مردانہ اور لاغر چھوٹی سی عورت تھی بنسوڑا اور بے جھجک فیبی اس کے زیر حکومت تھی۔ نرس کوارٹر کے ایک ہی کمرے میں دونوں رہتی تھیں۔ وہاں دو پلنگ کے کمرے تھے۔ "فیبی تو فلاں مریض سے گھل مل کر کیوں ملی؟ فلاں نے تجھ سے جھیڑ جھاڑ کیوں کی؟" اس جوڑے کے نصف بہتر حصے پر ہر وقت پہرہ تھا۔ مارتھا ہاں مصری سے خوش تھی۔ شرمیلے، اچھوت کنیا سے مصری۔

ایک جوڑا تھا دو چچا زاد بہنوں کا سلوچنی اور فلورنس۔ دونوں گوری گوری، گداز گداز، مائل بہ فربہی عورتیں تھیں۔ مگر لڑکیاں کہے جانے پر مُصر۔ سلوچنی اخلاقاً یا ضرورتاً لڑکی کہی اور سمجھی جا سکتی تھی لیکن فلورنس تو بہت ہی بلند اخلاقی اور اشد ضرورت کے باوجود عورت سے لڑکی نہیں بن سکتی تھی۔

میگی اور دلآرامی گوالی کالی چپٹی ناکوں والی نرسیں تھیں۔ خوش اخلاق، کرم فرما، ہر دل عزیز، ایثار پسند۔ میگی ادھیڑ عمر کی تھی اور دلآرامی جوان۔ اس کے چھوٹا بگھوری، سینوں کی سنگینی، ناک کے چپٹے پن کا اس حد تک کفارہ ضرور ادا کر دیتی تھی کہ اس کی پیشانی کے محاذ سے نظریں پھسل کر صدر میں ٹھوس سہارے کے بل پر تھم جاتی تھیں۔

نویں تھی ڈوڈی۔ وہ سراپا ڈولی تھی۔ چھوٹا سا کھدنا، شریر نکھیں مٹکانے اور ہیں ہیں کرنے والی گڑیا۔ گہرا سانولا رنگ، بڑا سا قد، پاپی آنکھیں، کھلنڈری، بے باک، لڑ پڑنے والی اور لڑکر ہنس دینے والی۔ یہ سب سے کم عمر تھی۔ اٹھارہ انیس سال کی ہوگی۔ کبھی تو یہ بدعورت دکھتی تھی اور کبھی گوارا حد تک بھولی۔

'صحت گاہ' ایک ویرانے میں تھا۔ سب سے نزدیک کا گاؤں ڈیڑھ میل پر تھا اور سب سے نزدیک کا شہر اٹھارہ میل پر۔ 'صحت گاہ' کی بس اپنی ایک چھوٹی سی دنیا تھی۔ الگ تھلگ وہ ڈاکٹر، ایک کمپاؤنڈر، ایک ڈریسر، ایک، اکیس بے بابو، دو کلرک، نو نرسیں ایک میٹرن اور سپرنٹنڈنٹ، آٹھ دار ڈبوائے، چند مہترانیاں اور پچاس کے لگ بھگ سبل و یرق کے مریض مع اپنے باورچیوں اور چند تیمارداروں کے، وارڈوں کے چاروں طرف باغ، جنگل اور سرخ سرخ مرم کے بڑے بڑے ٹیلے تھے۔ کچھ دور پر چھوٹی چھوٹی مگر پُرشور پہاڑی ندیاں تھیں۔ جاڑوں اور گرمیوں میں یہ ندیاں مریضوں کے آنسوؤں کی طرح خشک ہو جاتی تھیں۔

ایک روز میں اور نقی اکیس بے کے نئے نرس ڈولی کے ساتھ جا رہے تھے۔ ڈولی بیچ سے غلیظ اور چڑچڑی تھی۔ بڑے صاحب نے اسے ٹھاٹا تھا۔ راستے میں اس نے دور سے بڑے صاحب کو دیکھا۔ کہنے لگی:

"بڑا بنتا ہے۔ اکیس بے۔ کہنے کے بہانے ڈارک روم میں خود ہو جاتا ہے کہ گرد سے اور دوسروں سے بچتا ہے۔"

ڈولی نے حسبِ عادت بے خیالی میں یہ جملے ادا کئے۔ ہم لوگوں کی موجودگی کے احساس نے اسے چونکا دیا۔ پردہ داری کے بغیر نہ رومان رہتا ہے نہ کشش۔ وہ کہہ چلی۔

"نرسیں اگر ایسی ہوتیں تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ خدا باپ ہم لوگوں کو بچا لیتا ہے؟"

بات یہ تھی کہ بڑے صاحب کے جذبۂ ایثار داری کے باوجود نرسوں کی انفرادیت ہمیشہ سرکشی پر تلی رہتی تھی۔ مہینے میں ایک روز نرسوں کو "ڈے آف" ملتا تھا۔ وہ تنہا یا دو تین کی ٹولی بنا کر شہر چلی جاتی تھیں۔ مگر اجنبی شہر میں دل کی پیاس کا بجھنا بلاؤز یا پیٹی کوٹ کی لیس خرید نا تو ہے نہیں۔ نرسیں عموماً وہاں سے دل کا بوجھ اٹھائے ہوئے واپس آتیں بلکہ سینما دیکھنے کے بعد آرزوؤں کی خاکستر کے اندر چنگاریاں اور سلگ اٹھتیں۔

کوارٹر میں دو دو نرسوں کی ٹولیاں تھیں۔ یہ ٹولیاں زیادہ تر زندگی کی بھیانک حقیقتوں اور مطالبوں پر جانبدارانہ تبصرہ کیا کرتی تھیں۔ فاش صداقتوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تھیں۔ جب سب مل بیٹھتیں تو پھر مریضوں، ڈاکٹروں اور ڈے آف کی باتیں، ملمعہ وطنز، چھیڑ چھاڑ اور کبھی ہجوم کے گیت ؎

آگے آگے میں چلی اور پیچھے پیچھے سیّاں
سرتا کاہے بھولی آئے پیارے سندویا

اور غزلیں ؎

اے عشق عطا کر دے وہ کیف کا پیمانہ

سیّاں تو خیر دور کی بات تھی مگر کیف کے پیمانے کی تلاش جاری رہتی۔ ہر نرس کی کئی کئی داستانیں تھیں مگر ان سے ان کی طبیعت کبھی سیر نہ ہوئی جوانی، عورت، بیوی اور ماں ہمیشہ ان میں جاگتی رہتی تھیں اور نہ جانے کتنے جانے اور ان جانے روپ بدل بدل کر ان کے جذبوں پر چھا جاتی تھیں۔ سطح کے نیچے ناآسودگی اور بیزاری پوشیدہ رہتی تھی۔ ارادی اور غیر ارادی قوتوں نے انہیں زندگی کی اس منزل میں لا ڈالا تھا۔ لطافت مٹی نہ تھی، روپوش ہو گئی تھی۔

کچھ عجیب بات معلوم ہوگی مگر ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی نرس نے مریض کے جسم میں سیل کے کیڑوں کے پائے جانے کے باوجود اس کے لئے اپنے لب و رخسار ارزاں کر دئے اور بسا اوقات سیل کے کیڑوں کو مکمل طور پر اپنے دل و دماغ میں ہضم کر جاتے تھے۔ "ثبت" مریض گمنا سانپ سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں مگر یہ ویرانیاں بس گھول کر پی جاتی تھیں۔ کون جانے محبت کے امرت میں ملا کے یا آتش بداماں ہوس کی آگ میں بجھا کر۔ مریض تو جراثیم کو تمنائے حیات کی رو میں بہا دیتے تھے۔ وہ اتنی بار ٹی۔ بی۔ ٹی۔ بی کا ورد کرتے تھے کہ ٹی۔ بی بے حقیقت ہو جاتی تھی۔ جیسے ملا کی تسبیح پر گھومتے گھومتے خدا بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ ایک بار بھائی حاذق نے "پیلیم فلاسک" میں سخت کھانسی کے بعد بلغم پھینکتے ہوئے مصرعی سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"بھائی تم ٹی۔ بی اور میں (ٹی وقتیہ) دونوں سے لطف اٹھاتے ہو۔ میں صرف ٹی۔ بی سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔"

میں نے کہا تھا "میگی بھی تو ہم قافیہ ہے۔ اپنی غزل کے لئے آپ اسے استعمال کیجئے۔" بھائی حاذق ہنسنے لگے اور انہیں زور سے تکلیف دہ کھانسی آگئی۔

ہم لوگ کرسمس، عید اور ہولی سب تہوار منایا کرتے تھے اور یوں مریضوں کے علاوہ ذی فراش مریض بھی اپنے دکھ درد کو بھلا کر غم غلط کر لیا کرتے تھے۔ لفٹی کر صحت گاہ میں آئے ہوئے ساتواں مہینہ تھا اور مجھے پانچواں کہ کرسمس آگیا۔ اس عرصے کے اندر میں اور لفٹی بہت

قریب ہو چکے تھے۔ عورتوں کے وارڈ والیاں نہیں' سارس کا جوڑا" کہتی تھیں۔ زنانہ وارڈ ہم لوگوں کے وارڈ کے پہلو میں تھا۔ معصوم سے مدھر سی گاہے گاہے وہاں برج یا کیرم کھیلنے کے لئے بلا لئے جاتے تھے۔ مسز شنکر اور مسز اکرام نے ایک دو دفعہ سارس کے جوڑے کو بلا بھی بھیجا مگر ہم لوگوں نے تاب مخاطبہ نہ پا کر بلاوے کو ٹال دیا۔ مگر جب ہم لوگ ڈرامے کھیلتے تھے تو پھر زیلہ اور کپڑے مانگنے کی تقریب سے عنبر لطیف سے ملاقاتیں ہو ہی جایا کرتی تھیں۔ کرسمس کے موقعہ پر ہم لوگوں نے ڈرامہ کھیلا۔ نرسوں نے بھی شرکت کی مگر یہ کرسمس نرسوں کے جذبات میں طوفان بپا کرتا ہوا آیا۔

نقی لڑکی وارڈ میں سب سے زیادہ خوبصورت اور زندہ دل نوجوان تھا۔ اس کی شوخ حسین آنکھیں چشمۂ نیلوفر کی طرح تھیں صنف نازک کے لئے دل کی پیاس بجھانے کا نہایت ہی شاداب ذریعہ۔ ہر نرس نے اس کی لانبی اور گھنی پلکوں کے نخلستان میں پناہ لینی چاہی مگر العشری کی جرأتوں کے سامنے بقیہ سب عقبی زمین کی آماجگاہ بن کر رہ گئیں۔ ہاں ننھی ڈولی اس طرح وابستہ رہی جیسے ہندوستان کے سالانہ لنگا۔ ڈولی گھریلو لنگی ہر درخت پر چڑھ کر پھل کترنے والی۔ مگر چوری چوری لے لے اور وہ بھاگ۔

العشری بے حد جذباتی تھی۔ اس کے جذبات کی رو میں ماضی' حال اور مستقبل سب بہہ جاتے تھے۔ اس پر محبت کے دورے پڑتے تھے۔ دو تین ماہ سے زیادہ وہ شدت کے ساتھ کسی کو نہیں چاہتی تھی مگر نقی نے اسے رام کر لیا تھا۔ محبت کے دورے کے وقت بھی وہ کسی کے جذباتی مطالبے کو رد نہیں کر سکتی تھی۔ اسے وارڈ کے مصنف صاحب اس پر مرنے لگے تھے۔ العشری نے ان کا دل بھی نہیں توڑا' اور دل دہی کے لئے وہ انتہائی کوششوں سے کام بھی لیا کرتی تھی۔" مجھ سے کسی کا کڑھنا دیکھا نہیں جاتا نقی اور ایک تم ہو؟

العشری نے میرے سامنے ایک بار محبت کے مسائے میں کہا تھا۔

وہ اپنے سارے قصے ہم لوگوں سے کہہ دیتی تھی۔ اس کا کوئی راز نہ تھا۔

کیتھرن العشری کی ضد تھی۔ وہ مجسم راز رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی خوبیات پس پردہ ہوا کرتی تھیں۔ اپنے کو وہ نہایت ہی پارسا ثابت کرنا چاہتی تھی مگر نقاب و حجاب کا اتنا گوشہ وہ پگھلیوں سے ارادتاً ضرور اٹھا دیتی تھی کہ اس کی محجوبیت اور گمراں مائلی ارمان انگیز طور پر ظاہر ہو جائیں۔ کیتھرن نے بھی نقی کو اپنا شکار بنانا چاہا مگر نقی اس کی آہستہ خرامی اور رازدارانہ انداز کی فطرتاً تاب لا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ محبت میں جری تھا۔ بیباک العشری کی ذات میں اس کو وہ ٹائپ مل گیا جو جذبات کے کھیل میں ہر رکاوٹ کو گناہ سمجھتا ہے۔

یہ سب کچھ ہو چکا تھا جب میں سیسا ڈریم آیا۔ ایک مہینے کے اندر ہی میں اور نقی گھل مل گئے تھے۔ العشری میرے سامنے بھی نقی سے بے تکلف باتیں کرتی تھی مگر کیتھرن نے جب ایک روز میرا بستر درست کرتے ہوئے چپ چاپ اوڑھنے والی چادر کے اندر میرے ہاتھوں میں گلاب کا پھول دے کر آہستہ سے کہا۔" ڈارلنگ!" اور میں نے اس سانحہ کا تذکرہ نقی سے کر دیا تو کیتھرن نے مجھ سے شکوے کئے" آپ تو بڑے ناسمجھ ہیں۔ دیکھئے نقی مجھے بھائی کہنے لگا ہے۔ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتی۔ میری بھی تو عزت ہے۔ وہ تو آپ سے" کیتھرن نے اپنی سنہیلی' شیریں' لوچدار آواز میں شکایت کی اور بات کو مکمل کرنے کرتے دانستہ رک کر ہنسنے لگی۔

کرسمس کی تیاریاں خوب ہوئیں۔ ہم مریضوں نے رنگ برنگ کاغذوں کے زنجیرے اور جھنڈیاں بنائیں۔ ساری صحت گاہ کی آرائش کی گئی۔ جوبلیس دسمبر کو ہر جگہ خوشی تھم تھم کر اٹھلنے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ نرسیں نوخیز سرتیوں کی طرح کلیلیں کرتی پھرتی تھیں۔ اسی روز بڑے صاحب نے بھی رعایت اور فرش کی آرائشیں ڈھیلی کر دی تھیں۔ شام کو نرسیں وارڈ میں جھرمٹ بنا کر صرف یہ پیام دینے آئیں کہ وہ لوگ کرسمس کا" نغمۂ شب" گاتی ہوئی صبح کاذب کے وقت ہی وارڈ میں آئیں گی۔ سب لوگ ان کی پذیرائی کے لئے تیار رہیں۔ وہ سب کی سب وردی پر سرخ کپڑے حسین ڈاروں نوخیز سارسیوں میں لپٹی' جذبات کے بوجھ سے لڑکھڑاتی فضا میں رقص مستانہ کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ العشری طوفان و سیلاب تھی۔

کیتھرین نے اپنی فطرت کا نقاب اُلٹ دیا تھا۔ وہ بھی "کرسمس ایو" میں بے محابا تھی اور کون اس شام کو متحرک پیرڈی نہ تھا۔ وارڈ میں کھڑکیاں لمبردوڑ گئی۔ معمر وکیل صاحب آنکھیں ہم لوگ "پیر مغاں" کہتے تھے؛ سے لے کر غلام بابا تک لوگ تلاطم محسومات میں ڈوبے ڈوبے سب رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ اُٹھے نہ تھے لیکن ہمارے جذبات آغوش وا کئے ہوئے تھے۔ اُف! اسی وارڈ کے امکانات اور مراتع کتنے محدود تھے! ہائے دل! اپنی جلیبیں اور "اسے وارڈ" کی نعوتیں، فنا فی الشان میں آسودہ کھٹک رہی تھیں۔

"نرسیں بچے صاحب کے یہاں "کرسمس ٹری" بنانے جا رہی ہیں۔ جاگتے رہنا ——— ہاں!" ایک لوچدار آواز فضا میں بھر کر دلوں میں اتر گئی۔

"اوہ ..... رسے ..... ے انہیں سو کیسے جائیں گے۔ ہُوا تم بھی تو جان کے فتی ہو۔ بھلا آج رات نیند ہی کب آئے گی انہیں؟ ذرا مسز جی کو تو دیکھیے ....."

ایک رہزن تمکین ہوش نے دُکھتی ہوئی رگ چھولی۔ پھر جلوۂ برقِ فنا فہم کا قہقہہ ترنم بار ہوا اور فضا کو چیرتی ہوئی سب دیواریں ہل گئیں، جیسے آتشبازی چھوٹ کے رہ گئی ہو۔

وہ رات قیامت خیز تھی۔ نرسوں کے چلے جانے کے بعد ہم سب لوگ یک بیک محزون ہو گئے۔ یہیں دھر کر گیا وحوال مریض ہم لوگوں کے وارڈ میں داخل ہوا۔ پائیس کہ وہ بہت ہی درد و کرب کے عالم میں جاں بحق ہو گیا۔ اس کا پھیپھڑا پھٹ گیا تھا۔ ہم وحوش کی فارمِ خانی باڑے پہ جا کر جاگزیں ہو گئے، خاموش ماتم کی حالت میں۔ پر بیتی آپ بیتی بنی جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک ہم سب بند مدعانہ انداز میں چپ چاپ سے رہے۔ ہم اس اندوہ بلا سے پتہ چار رہے تھے اور انتقاماً ہم سارے یہاں کی خوشیاں چھین کر اپنے دل میں جمع کر لینے کی تمنا کر رہے تھے۔ "پیر مغاں" مغرب کی نماز پڑھنے چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے کچھ سکون مستعار لیا اور سلام پھیرتے ہی آخر شب کی امیدوں کے تذکرے چھیڑ دیئے۔ ہم سب لوگ ٹوٹ کر ان تصورات سے لطف لینے لگے۔ فیر گیارہ کے ۔ کو پھر سے جلا کر ہم نے ذرات فضا میں بکھیر دیئے اور اس کی روح خیالات کی انتہائی گہرائیوں میں دفن کر دی۔ اس شام کو ہم نے استراحت کے گھنٹے بھی بجا دیئے۔ آواز سے گھنٹوں کی بے ہنسی کی ہنسی جنسے اور نرسوں کا تنے یہ ملو اور زاویوں سے تجزیہ کیا کہ ان کے جسم تحلیل ہو کر ہم میں سما گئے اور ہم ان میں۔

نصف شب ہی سے رس کراڑ بیدار ہو گیا تھا۔ گیتوں اور ہنسیوں کی آوازیں ہمارا منتظر تھیں۔ دل کو اور بے چین کر رہی تھیں۔ ابھی رات ہی تھی کہ کرسمس کا حسین "نغمۂ شب" اچانک طور پر لوسی وارڈ کے بہت قریب صاعد نواز ہوا۔ ہم خود بھی اور نیند کے درمیان سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ ہم میں سے اکثر نے سلد جلد اپنے اُلجھے ہوئے بال درست کر لئے۔ نرسیں ہیرو فیم پر کرسمس کرول گا رہی تھیں، جیسے کانوں میں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ وہ آگئیں، چیت کی سنگلتی ہوئی ہواؤں کی طرح، شباب کی سنگوں کی مثال۔ کچھ دیر کے لئے نغمے رُک گئے، خندہ بداب تھم گئے اور فضا سکر و مستی سے لبریز ہو کر چھلکنے لگی۔ ولولہ بداماں خاموشی کا ترنم، زندہ سکوت کی ابدیت لئے آغوشِ وجود میں اتر رہی تھی۔ ہم کے قبل کہ بڑھ کر کوئی بچی کا بچن دہائے بہت سی حسرتیں پوری ہو گئیں، بہت سی آرزوئیں بر آن ہو گئیں، کئی ارمان پیدا ہوئے اور ان گنت نادیدہ گناہ حسرت کی داد لینے کے لئے دردناک مضمحل کا سامان بن گئے۔ آج انفصال خو جو اتنا سہانا پتہ تھا۔ باہر صبح مرقع پہ چھنڈ رانی تیز ہوائیں سرد، بوڑھے خاموش، گہرے نیلے آسمان کے سامنے میں الجھ رہ نیزاؤں کی طرح لرزیدہ تھیں۔ پورب کے دروازے کھلے ہوئے تھے میں نے تاروں کی جند آواز شعاعوں کی دھم روشنی میں ماؤ الخلاط فلورنس کو اپنے بہت قریب پایا اور جب کسی نے بٹک سے روشنی جلا دی تو میں نے دیکھا کہ ڈولی اور نقی کے درمیان ایک بستر میں تھوڑی سی دوری پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی کئی تغیر بنے اور بگڑے نقشے پھر بنا ہو گئے۔ ہارمونیم ایشری بجا رہی تھی اور سالومی نے "فادر کرسمس" کا سوانگ بھرا تھا۔ سُرخ پاجامہ، سُرخ عبا، نیلی ہاتھ کی خرطومی ٹوپی اور سفید داڑھی

ہم سب لوگ اسے دیکھ کر بے تحاشا قہقہے لگانے لگے۔ پیر مہماں نے بڑھ کر نادر کرسمس سے معانقہ کیا۔ اس پر ایک اور گونجتا ہوا قہقہہ لگا۔ دالان کے کھلے ہوئے حصے میں ایک حلقہ ڈال دیا گیا۔ رقص و نغمے شروع ہوئے۔ ہم نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیے ہوئے مور کی طرح ناچ رہی تھیں۔ باری باری اور گاہ جھوم جھوم کر ڈال کر گا رہی تھیں۔ ان کی بے پناہ سپردگی ہم لوگوں کو مدہوش کر رہی تھی۔ گاتے گاتے ان کے حشر خیز اشارے، ناچتے ناچتے ان کا شانوں پر سر رکھ کر ذرا آسودگی حاصل کر لینا، موت اور حیات کی سرحدیں ملا رہا تھا۔ "پیر مہماں" نے ایشری کے گلے سے بندھا ہوا مونیم اتار کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ میں نے اور نقی نے ہارمونیم کو سہارا دیا۔ ہمیں اس گھڑی بھی مجروح پیشوا پر وزن پڑ جانے کی مضرت بھول نہ سکتی۔ مترو کیل صاحب نے جھوم جھوم کر خوب ولولہ خیز مت بجائے اور رات کی پریاں مسجم غزل الغزلات بنی ہوئی غذائے محبت کے جلووں کے خیر مقدم میں عرض نغمہ اور گذارش رقص پیش کرتی رہیں۔

کرسمس کے بعد تجابات اٹھ گئے تھے۔ صبح کی شرمیلی سرخی بڑے دن کے بعد روز روشن کی تنویر بن گئی۔ ہم مریضوں کے جذبات کی جڑیں "صحت گاہ" کی زمین سے زیادہ پیوست ہو گئیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بڑھے کرسمس نے سینا ٹوریم کی بالائی سطح کھرچ کر معجزانہ طور پر ایک نئی دنیا بنا دی ہے جس میں اسپتال کی تلخ حقیقتوں کے ساتھ گھریلو فضا کی لطافت اور بھرپور بھی ہے۔ ہم لوگوں نے "پیر مہماں" کی شادی تقریباً "نادر کرسمس" سے کر دی جو صبح ہوتے ہی چولا بدل کر "مدر کرسمس" بنتی۔ "پیر مہماں" اسے "گھر میں" کے اصول سے بیری وارڈ میں گھسنے لگے۔ ایشری باضابطہ طور پر بیری سالی بن گئی اور کیتھرین نقی کی بھابی بنتی۔ اسی نوع کی اور بھی کئی رشتہ داریاں قائم ہو گئی تھیں۔ ہم لوگ ان رشتہ داریوں کو یوں استعمال کرتے تھے جیسے لنگڑے جیسا کہ یاں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے یہ ذہنی سہارے فریب کی بنا پر قائم تھے مگر زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فریب حقیقت سے زیادہ حقیقی بن جاتا ہے۔ ہم لوگ کشتی شکستہ مسندباد جہازی یا رابن سن کروسو کی طرح "صحت گاہ" کے صحرائی جزیرے میں بیٹھے "نسار سے الگ تھلگ" انتظار کی دبی ہوئی آگ سینوں میں لئے بڑی بھلی اپنی ایک چھوٹی سی دنیا بنا رہے تھے۔ انسانیت کے دل میں کتنی لامتناہی "حسرت تعمیر" بھری ہوئی ہے۔

یوں تو پہلے بھی نہیں ہم لوگوں کے لئے "وزٹنگ آورز" میں شہر سے پھل اور میوے لے آتی تھیں مگر کرسمس کے تحفوں کی رنگینی و دلآویزی سے ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی۔ پہلے پھل اور میووں نے رومانی لطافتوں کی شکل اختیار کی۔ جذبے کی حدت نے انہیں عریضوں اور عطر و سینٹ میں تبدیل کر دیا۔ حقیقت کی ایک سیال صورت رومان ہے۔ جیسے برف سے پانی اور پانی سے بھاپ بن جاتا ہے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد رومال اور سینٹ تاسخ کے چکر میں پڑ کر سینیٹوریم اور پڑوسنگ بن گئے۔ ستمرا یہ حیات کے لئے روزمرہ کی واقعیت کا وسیلہ لازمی ہے۔

گوپال بہت خوش تھا۔ اکثر کہتا "نقی بھائی! وارڈ میں بہت جی لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری بیماری اچھی ہو گئی..... جب بھائی اور بہن جا کر بچے سکول میں نام لکھا سکیں گے نا؟" اس کی آنکھوں میں زندگی کی آرزوئیں جھلکنے لگتیں۔ وہ ذرا نڈھال ہو کر کہہ چلتا۔ "مگر پوڑنگ اور ایشری روتی اور کٹو بوا کے گیت طبیعت بہت گھبرائے گی یہاں سے جا کے ہے نا؟ پھر ہم سہل کے بریضوں سے کون گھل مل کھیلے گا؟ صاف پہ سے کون کھیلے گا۔ ایشری بھابی اور کٹو بوا کا پریم کہاں ملے گا؟" نادان اور پیارا مان گوپال پر رقت سی طاری ہو گئی۔

لوئر وارڈ کے تعلقات میں اجتماعیت کا رنگ چڑھا تھا۔ پرجو بوا اپنی خوشیت اور گوپال اپنے کومل ارمانوں کے باوجود دوسرے اپر وارڈ والوں سے ہم سب لوگوں سے زیادہ رقابت کرتے تھے۔ وہ مہل و دوق کے مقابل میں فسانی لطافتوں کا امرت انڈیل کر محبت کو گوارا بنانے کے لئے بے چین تھے۔ پرجو بوا کو اپنے بڑے سے کنبے کی ذمہ داریاں یاد آتی تھیں۔ یسوع مسیح کی محبت، بدھ اور کبیر کے کھیل یا رسمل کا لوچ بھی زخم پر مرہم کا پھاہا رکھ دے جس سے بھی غلط ہو جائے۔ ایک روز گوپال پر ہم سا تھی کر واپس آیا۔ اب اسے چند فرلانگ پہلے پہیے

کی اجازت مل گئی تھی اور سیر کے بعد اس کی حرارت کا درجہ بڑھتا نہ تھا۔ ان دنوں وہ بہت مسرور تھا۔ اسے امید تھی کہ رفتہ رفتہ اسے بھائی حامد کی طرح ایک میل سیر کی اجازت مل جائے گی۔ گوپال کو بیزار اور برہم دیکھ کر مجھے اور نفی کو سخت تعجب ہوا۔ ہم لوگ بھی دو میل کی سیر کے بعد پلنگ پر لیٹ کر تھرمامیٹر لگا رہے تھے۔ اس کے بعد فوراً شام کی استراحت کا گھنٹہ شروع ہو گیا۔ ڈھکی کی ڈیوٹی نفی۔ اس بک بک کرنے والی لڑکی نے ہم لوگوں کو باتیں کرنے نہیں دیں۔ گوپال کا نازک سا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لئے بے چین تھا اور ہم لوگ سننے کے لئے۔ مگر قہر مریض بہ جان مریض۔ ایک گھنٹہ ہم لوگوں نے عجب الجھن میں گذارا۔ ٹن ٹن ٹن! گھنٹی بجی اور گوپال جھٹ اٹھ کر میرے اور نفی کے پلنگ کے درمیان آ کھڑا ہوا۔ ہم بھی اٹھ بیٹھے۔ "کٹو بڑا آبزرویشن وارڈ میں تھا بابو سے....." گوپال رک گیا۔ اس کا چہرہ اور سرخ ہو گیا۔ "ہمرا بابو نے کٹو کے گال میں....." ۔ سب کے اس نے نام نہیں کہا..... "اور بھائی کیتھرن سے مت بولنے۔" گوپال بہت خفا تھا اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈیوٹی سے فراغت ہو گئی تو کیتھرن ہم لوگوں کے وارڈ میں آئی، کچھ شرمائی ہوئی اور خفیف۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی۔

"اور بابو! مجھے ٹائی باندھنی نہیں آتی۔ ڈرامے میں میرا مردانہ پارٹ ہے۔ میں آپ سے ہی ٹرائی کا ناٹ بندھوا لوں گی۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی چمکی اور دزدیدہ نگاہوں سے اس نے گوپال کو دیکھا۔ کیتھرن نے بھی کاریخیر کہتے وقت غالباً گوپال کو دیکھتے دیکھ لیا تھا۔ یہ بچے آزمائشی تجربے جن کے اندر احساس تفوق نے مشقب پیدائی کی امید افزا بنانے کے لئے نواز ش اور شیرینی کی آمیزش کر دی تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کچھ اور چھیڑا تو میں ایک کتاب اٹھا کے پڑھنے لگا۔ کیتھرن چلی گئی۔ اس کے اندر نسائی پندار کافی تھا اور پھر از کودہ شرمندۂ عریانی کرنا کب گوارا کر سکتی۔

ہم لوگوں میں بات چیت بند ہو گئی۔ ایک روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ایشری دوسرے وارڈ جاتے ہوئے میرے پاس آئی اور چپ چاپ سے صرف یہ کہہ گئی:

"کٹو بڑا کا آج ڈے آف ہے۔ وہ شہر نہیں گیلیں۔ اپنے کمرے میں چادر سے منہ لپیٹے رو رہی ہیں۔"

ان دنوں ایشری بھی اسے وارڈ کے مصنف صاحب سے خوب چنگیں بڑھا رہی تھی۔ میں نے اور نفی نے یہ مشورہ دیا کہ کیتھرن اور ایشری ان دونوں لات اور مات کو کشیدگی کا مزا چکھایا جائے۔ اپنے فیصلے سے ہم نے اہل وارڈ کو بھی مطلع کر دیا۔ پر بھو بابو اور پیر بخاں نے صاد کیا۔ طے یہ ہوا کہ میں صرف کیتھرن سے مراسم ترک کر دوں اور نفی صرف ایشری سے۔ دوسرے مریض حسب سابق میل جول جاری رکھیں ورچودہ تین وارڈ ہی سے گزر کر جائیں گی۔

یہ چپ چپ ایک ہفتے تک جاری رہی۔ ایک روز شام کی سیر سے پہلے اسٹور روم سے نفی محجوب ہی ہنسی ہنستا ہوا نکلا اور مجھے علیحدہ لے جا کر کہنے لگا "سیلاب کو مضبوط دیوار روک سکتی ہے۔ مگر سیلاب کو سیلاب بھی کہیں روک پاتا ہے۔ چلو کشیدگی ہو چکی۔"

ایشری کی شخصیت کی طوفان وشی نفی کی شعلہ مزاجی کو پگھلا گئی۔ میں نے اسے بہت برا بھلا کہا۔ وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بس اتنا بولا "منصف بھی کیا یاد کرے گا!"

میں نے جواب دیا ——— "مگر تم ایشری کو اپنا تو نہ سکے۔"

"تو کیا تم نے چپ رہ کر کیتھرن کو اپنا لیا؟" وہ تنک کر بولا اور پھر کامیاب ہنسی ہنسنے لگا۔ میں نے واقعیت کا تھوس پن اور جذبات پر ذہنی کی نامرادی کا زہر محسوس کیا۔ بات یہ ہے کہ گوپال کی رپورٹ میرے احساس کی بالائی سطح سے کافی نیچے اتر گئی تھی۔ کہ میں نے ہم لوگوں کی تو قعات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا اور تو قعات کا قیام خلش نامرادی میں پس پھر دیتا ہے۔ فرق یہ تھا کہ نفی حقیقت پسند تھا اور میں ذہنی خیالی بلندیوں پر اڑ کر

غیر معمولی لذت حاصل کرنے کا عادی ہو۔

دو تین روز کے بعد میں اور نقی رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وارڈ کے صحن کے ایک گوشے میں یوکلپٹس کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ چاندنی رات تھی مگر ابر کے سفید سفید ٹکڑے چاند کو پیار کرتے ہوئے نیلے آسمان میں تیر جاتے تھے۔ باد شمال یوں چل رہی تھی جیسے آسودگی کے بعد خیالات ماضی کی رنگین وادیوں میں طمطنہ پرواز حاصل کرتے ہیں۔ ہم لوگ ذرا سنجیدہ حالات میں ایک دوسرے کے مستقبل کے متعلق مبہم دعائیہ سوچ بچار کر رہے تھے۔ کبھی کبھار ماحول میں کبھی طبیعت بڑی سنجیدہ اور گداز ہو جاتی ہے۔

اچانک خوشگوار زنانہ ہنسی کا نغمہ ہوا کے فرش پر رقص کر گیا۔

"پاگلوں کو دیکھو۔" کیتھرن کی لرزتی آواز عین عقب سے آئی۔

"پاگلوں سے بھی بڑے پاگل۔ بالکل باؤلے۔ اچھا یہ سارس کا جوڑا کیا کر رہا ہے؟ چاند سے پریم ہو رہا ہے۔" یہ الیشری کی شوخ بولی تھی۔

میں نے کہا۔ "آؤ الیشری ہم سے پریم کریں!"

"واہ میں کیوں آؤں؟ اوہ..... ہے..... ہے! دیکھو نا کوئی انہیں منانے آئی ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ کیتھرن میرے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو! آج بڑے صاحب نے میرے بازو میں کوکوسیلیم کا انجکشن دیا ہے۔ جبھی اکتنا پھول گیا ہے۔ بہت بے درد ہے انور بابو....."

اس نے متورم نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا۔..... میں بیگانہ سا بنا رہا۔ وہ کہہ چلی:

"ارے ہم نرسوں کی زندگی کیا۔ غیروں کے لئے سب کچھ کرو۔ مگر کبھی کوئی اپنا نہ ہوا۔ اپنے، ہمارا اپنا کون بیٹھا ہوا ہے۔ ننھی تو یتیم ہے نا اور میں..... میرا ایک بوڑھا باپ اور ایک موتیلا بھائی ہے۔ ہو بھی جائے تو بھی مر جائیں گے تو کون دو آنسو بہانے والا آئے گا۔ بڑے صاحب کہتے تھے کہ کیتھرن کے لئے بہت کمزور ہیں..... اسی لئے تو یہ نگوڑی سوئیاں چبھوتے ہیں۔ چل ننھی کو اٹھا ذرا ڈرامینک دے دے....."

وہ الیشری سے مخاطب ہو کر اٹھنے لگی۔ نقی نے بڑھ کر کیتھرن کا بازو عیاذاً مس کیا۔ اس نے ناز سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا:

"جس ڈالی پر میں گھائل پرندے کی طرح گھونسلا بنانے آئی تھی وہ اکڑی ہوئی ہے تو پھر دوسری شاخ کہاں میری پرچھ کرے؟"

اب پرگانگی جرم تھی۔ تیر دوں پر لگا۔ پرسش نے سکوت کی صہر توڑ دی۔ اس روز ہم لوگ کچھ دیر تک اپنی اور نرسوں کی زندگیوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں نے گرپال والی اطلاع سے گریز ہی کرنا چاہا۔ لیکن چلتے چلتے کیتھرن نے الیشری سے کہا:

"سنتی ہے ننھی؟ ہیں مہندر کے متعلق ہیں "سنڈلس پیشنٹ" لگا رہی تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کیا اور بابو سے کہہ دیا۔ بڑا غراب ہے۔ میں تو اسی وقت ڈر رہی تھی۔ یہ مریض بھی عجیب ہوتے ہیں۔ نرسوں کی عزت ان کے نزدیک کوڑی کی بھی نہیں۔ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔"

الیشری نے ہنستے ہوئے کہا:

"اتنا جلتے ہیں تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" دونوں ہنستی ہوئی چل دیں۔ باد شمال ان کے جانے کے بعد دیر تک ان کی ہنسی کی لہریں ہم تک پہنچاتی رہی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز پیر نہاں "صحت گاہ" سے چل دیے۔ وہ صحت یاب ہو چکے تھے۔ ایک سال کے بعد بڑے صاحب نے انہیں پریکٹس کی اجازت بھی دے دی تھی۔ رخصت کے وقت نرس سلومی نے مذاقیہ طور پر رونے کی نقل کی۔ "پیر نہاں" بھی ہنستے ہوئے اپنی "وارڈ مین" سے رخصت ہوئے مگر جب وہ ہم لوگوں سے رخصت ہونے لگے تو ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ کتنے دردآگیں

اور کتنے تفریحی دن ہم لوگوں نے ساتھ گذارے تھے۔ بڑے وکیل صاحب بڑے زندہ دل شخص تھے اور غمگسار، ہفتوں وارڈ سونا سونا رہا۔

ہم لوگوں نے چھوٹے وکیل صاحب کو 'پیر مغاں' منتخب کیا اور 'صحت گاہ' اپنے رقص و مرہم کے ساتھ اسی طرح چلتا رہا۔ ایک مہینے کے بعد پربھو بابو کو بھی جانے کا پروانہ مل گیا۔ وہ احتیاطاً ابھی سینا ٹوریم سے جانا نہیں چاہتے تھے مگر مریضوں کی کثرت ہو رہی تھی اور جگہ محدود۔ ان کو جانا ہی پڑا۔ جائے اس گرفتار کا آزاد ہونا جس کے بازو ٹوٹے ہوئے ہوں، پربھو بابو ساڑھے تین سال کے بعد گھر جاتے ہوئے جھجک محسوس کر رہے تھے۔ جانے پھر وہاں پھپھڑے کیسے رہیں۔ وہ رخصت کے روز بہت دیر تک بائیسکل پر گھومتے رہے اور روتے رہے پھر کی انہیں اجازت تو تھی لیکن اسٹیشن جاتے ہوئے ان کے پائوں ڈگمگانے لگتے۔ 'صحت گاہ' میں صرف ایک بن رکھشا تھا۔ وہ صرف ذی فرش مریضوں کو وارڈ سے ایکسرے روم لے جایا کرتا تھا۔ پربھو بابو کی پریشانی دیکھ کر نرس کو رکشا منگوانا پڑا۔ ان کو صحت گاہ سے اچھے ہو کر جانے کی مسرت تھی مگر اس مسرت کے آنسو کے ساتھ ان جان مستقبل کا خوف بھی انہیں رلا رہا تھا۔ ایک دفعہ مجروح ہو کر گرفتار ہونے کے بعد وہ فضا میں پرواز کرنے سے ڈرتے تھے۔ ہم لوگ اسٹیشن تک انہیں پہنچانے گئے اور سہارا دے کر گاڑی پر چڑھایا۔ ہم سب لوگوں پر رقت طاری تھی۔ واپس آکر ہم لوگوں نے دیکھا کہ نرس دلاری رو رہ کر روئے دیتی ہے۔ وہ پربھو بابو کو باپ کی طرح چاہتی تھی۔

ہم لوگوں کے وارڈ کے سبھی پرانے مریض اچھے ہو گئے تھے مگر سینا ٹوریم کا اچھا ہونا بہت ہی لچکدار حالت ہے کبھی غم دل کو کھاتا ہے اور کبھی دل غم کو۔ نئے سیل کے کیڑے ہمارے پھیپھڑوں کو کھا رہے تھے اور اب ہمارے پھیپھڑے ان کیڑوں کو کھا رہے تھے۔ محاذ کا رخ کب پلٹ جائے یہ کا بوس ہم لوگوں کے خیالات پر سوار تھا۔ ہم لوگوں نے اس غلش سے نجات پانے کے لئے نواتہ کے ساتھ تمثیل و اداکاری کا سلسلہ جاری کیا۔ نرسوں نے اس کھیل میں بھی ہماری بہت مدد کی۔ کیتھرن اور الیشری نے ان دنوں ہم لوگوں پر الطاف و کرم کی بارش کر دی اور ان دونوں کی سیرت کا ایک خاص پہلو اجاگر ہو کر ہمارے سامنے آیا۔ اس کی ابتدا تو اس چاندنی رات ہی کو ہو گئی تھی۔ میں نے کیتھرن سے زندگی کے پیچیدہ مسئلوں کے متعلق گفتگو کی طرح ڈالی۔ وہ اپنے ماضی سے بیزار مستقبل کی طرف مسلسل متوجہ کر قدم اٹھانا چاہتی تھی۔ "انور بابو! تیرہ سال کے سن سے میں مشن اسکول میں پڑھنے لگی۔ دیہاتوں کی لڑکیاں نرس بننے کو بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ وہ آزادی کو پسند کرتی تھیں۔ میں نادان تھی۔ میں نے چمک دمک کی طرف رُخ کیا۔ بہت بڑا ہوا انور بابو!" کیتھرن نے ایک بار کہا۔

"آپ نہ ہوتیں تو یہ مریض اچھے کیسے ہوتے؟" میں بولا۔

"تو کیا ہماری اپنی زندگی کوئی نہیں۔ دوسروں کے لئے اچھی بنو! پر دوسرے ہمیں اچھا نہ سمجھیں۔ انور بابو! ہم صرف نرسیں تو نہیں، عورت بھی تو ہیں اور یہ مرد! بس جسم کے بھوکے ہیں۔ سب کچھ ان کے سامنے پیش کر دو، سب کچھ اور ادنیٰ سی عزت بھی نہ دیں۔" کیتھرن بیزاری سے کہہ اٹھی۔

"سب تو ایسے نہیں ہوتے۔"

"کون؟ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ سب عورتیں ایک جیسی۔ مگر ہماری مٹھاس ہماری زندگیوں کو تلخ کر دیتی ہے۔ وہ مٹھاس کے لالچی مرد شہد کی مکھی کی طرح ڈنک مارتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ انور بابو! جب تک صحت ہے کام کرتی ہوں اور اس کے بعد کیا ہو گا؟ شادی کر لوں گی کسی سے؟" کیتھرن ہنسنے لگی۔

"ضرور کیجئے!"

"کرا دو!"

اسے کرا دیجئے! کہنا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ آپ کہا اور میں نے بھی اسے آپ ہی سے مخاطب کیا۔ اس کرا دو نا کی بے تکلفی میں یوں ہوتا تو

کیا بتاتا، کی حسرت پر شیدہ تھی۔ "ہم بیل کے مریض آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟" میں نے یہ ٹکسا سا جواب دیا۔

"تم نرسوں کو نہیں سمجھے اور پالو" اب کے بھی 'تم' تھا۔

کیتھرن بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ زندگی اور تقدیر کی گتھیاں پر پیچ و خمدار راستوں کی طرح سامنے آگئیں۔

کیتھرن اس نوع کی دردآشنا بات چیت کی پیاسی تھی۔ لیکن ایشری ان سنجیدہ باتوں کی تاب بھی نہیں لا سکتی تھی۔ جب اس طرح کی باتیں چھڑ جاتیں تو ایشری اکتا جاتی۔ عین اسی وقت وہ ہمارا منہ چڑا دیتی یا پہلو میں چٹکی بھر لیتی۔ وہ صرف گرم جوشی کی قائل تھی۔ سال اس کے لئے سب کچھ تھا۔ اپنی شادیوں اور محرومیوں کے ساتھ نقی نے ایک بار ایشری سے کہا:

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

ایشری نے جواب دیا:

"کتنے مردوں سے شادی کروں؟ سب ہی تو ٹکنیکنے میں جکڑ کر اپنی من مانی مرادیں ہی بھر کر پوری کرنا چاہتے ہیں۔"

نرس سلوچنا کو جنس اور ادھر کی بات اُدھر کرنے کی بہت عادت تھی۔ اس نے ایک روز کیتھرن کے سارے پوست کندہ حالات مجھے سنائے اور سال کے لگاؤ سے بھی آگاہ کیا۔ کیتھرن نے آج تک کسی کو کچھ تحفہ نہ دیا تھا۔ وہ صرف لینے کی عادی تھی۔ مہندر، گھوش، وہ ہڈیلوں کی ڈبی والا ذی خراش مریض ہر نرس چند سکھوں کو باری باری اس نے اپنا پروانہ بنایا تھا۔ کلوک، کمپاؤنڈر، اکیس رے بابو یہ سبھی اس کے گھائل رہ چکے تھے۔ پر وہ رازداری کی قائل تھی اور داد و تہنیت کے بعد ایسا کٹ کر جدا ہوتی تھی کہ کسی کو بھنک تک نہ لگے۔ مہندر سے اب تک کچھ سلسلہ تھا۔ وہ ایک صاحب ثروت تاجر کا لڑکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ کیتھرن نے اپنا اصول بدل کیسے ڈالا۔ اس نے مجھے بہت سے تحفے دیئے تھے اور کبھی کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا اور ایشری کا تو یہ عالم تھا کہ نقی پر اپنا سارا متاہرہ صرف کر سکتی تھی۔ اس نے مختلف اوقات میں اونی سوئٹر، چائے کا مشت، گرم پائجامے، مفلر وغیرہ تحفے نقی کو دیئے تھے۔ ایک بار وہ نقی کا سوٹ بنوانے پر مصر تھی مگر نقی نے انکار کر دیا۔ ایشری کئی دن تک اُلجھتی رہی۔ اس نے شکایتاً کہا: "آخر نرس میگی سین گپتا کو اپنا نصف مشاہرہ کیسے دے دیتی ہے؟"

ہم لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ اڑتیس سالہ میگی اور سین گپتا۔ سین گپتا بیس سال کا ایک گورا چٹا بنگالی لڑکا تھا۔ بہت ہی غریب۔ وہ بعض دوستوں کی مدد سے اور نہ جانے کیسے سینما ڈریم کا خرچ چلا رہا تھا۔ یہ نیا انکشاف تھا کہ میگی اس کی مدد کرتی ہے۔

میگی کی الفت میں ماں اور بیوی کی محبت کا امتزاج تھا۔ وہ سین گپتا کی مرہم بننے میں اپنے مادرانہ جذبات کی تسکین چاہتی تھی۔ نیز جیسا کہ ہر نرس کے ملے کرتے ہوئے وہ کسی مرد کو اتنا قریب کر لینا چاہتی تھی کہ اسے اپنا سہارا، اپنا جذباتی ٹیک سمجھ سکے۔ ایشری نے بتایا کہ جب نرسیں اسے سین گپتا کے بارے میں چھیڑتی ہیں تو وہ خوش ہوتی ہے۔ شاید اس کی نفسیات تذکرۂ التفات ہی سے وجد کرنے لگتی ہے۔ مگر اس کی جنسیت میں محبت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اس نے سین گپتا کی حماقتوں کو ہمیشہ یوں روکیا جیسے ماں بیمار بچے کو کھانے سے روکتی ہے۔ مگر ایشری اور میگی میں آگاہش اور پاتال کا فرق تھا۔ ایشری مردوں سے اس طرح برتاؤ کرتی تھی جیسے وہ 'زندہ ساماں' اور بولتے ہوئے بلاؤ ذہیں۔ آج اس کو سینے سے لگا لیا کل اس کو اپنے گھٹنے پر بیٹھ لیا۔ اسے سب ساماں عزیز تھیں۔ نقی اس کی سب سے پیاری ساری کی طرح تھا۔ میگی گھریلو چکی کی طرح اٹل اور ایک محور کے گرد گھومنے والی تھی۔

مہینہ دو مہینہ پر سینما ڈریم کا ڈاکٹر نرسوں کا ایکس رے اسکریننگ بھی کیا کرتا تھا۔ نرس ڈولی نے مجھے رازدارانہ طور پر بتایا کہ میگی اور نرس سرشیلا کے پھیپھڑوں میں داغ پائے گئے۔ یعنی نرس سرشیلا مسلسل کھانسی کی جگہ پر بلائی گئی تھی۔ کیونکہ سلوچنا کی کھانسی سے استعفا دے کر ایک ہوٹ ڈاکٹر سے شادی کرنے والی تھی۔ نئی نرس دو سرا صحت کا پیمانہ بھی کام کر چکی تھی اور بیمار پڑ کر عرصے سے گھر پر تھی۔ لیکن مسلسل گھر پر رہنے والے گنے چنے لوگ ہی رہ

سکتے ہیں۔ اونچے خاندانوں کے لوگ، بڑے لوگ۔ خلقت تو بائیبل کی بددعا کی شکار رہتی ہے "تیرے لئے اس زمین پر لعنتیں ہیں۔ اپنی زندگی کے سارے دن تجھے غم واندوہ کے ساتھ غذا ملے گی۔ اپنے چہرے کے پسینے میں شرابور ہو کر تو روٹیاں کھائے گا۔"

سلمیٰ چلی گئی۔ اب پھر وہ لڑکی تھیں۔ سوشیلا کو بھائی عارف سے دلچسپی ہو چلی تھی۔ دونوں ہم رنگ تھے مگر بھائی عارف اس سے پناہ مانگتے تھے تاہم ہم لوگوں کی شہر پر سوشیلا کو ایسے ایسے لطیفے ہوئے کہ کیا کہنے۔ سوشیلا کے الہامات خلیس کا انداز نرالا تھا۔ وہ اپنے محبوب کو پیٹھنے کی عادت تھی بھائی عارف ٹیچرز چارٹ پر پٹا کرتے تھے، پٹ کھاتے تھے۔ کبھی سوشیلا کی چٹکیوں کی مسلسل سے بلبلا اٹھتے اور ہم لوگوں کے نام پر صبر کرتے تھے وہ تو خیریت تھی کہ عریض تھے ورنہ وہ شہید ناز ہو ہی چکے تھے۔ یہ حسن نگار ترک ستمگار سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔ بھائی عارف روز بلا کی دعائیں پڑھا کرتے تھے مگر یہ بھوت ان کے سر پر سوار ہی رہا۔ آخر کار وہ خود ہی سینا ٹوریم سے چل دیئے۔ لوئر سی وارڈ سے صرف، وہی شخص گئے جو سکتے ہوئے خصت ہوئے۔ شاید ان کی نگاہیں ہمیشہ اپنی ڈاک خانے کی کلرکی پر بھی رہتی تھیں اور جو تھوڑا بہت وارڈ سے انہیں لگاؤ تھا وہ سوشیلا کی بے پناہ دلنوازیوں نے ہرن کر دیا تھا۔

بھائی عارف کے بعد غلام ربانی بھی چلا گیا اور صغریٰ بھی۔ مگر صغریٰ یوں گئے جیسے کوئی سنتری جاتا ہو۔ وہ لوگوں سے رخصت بھی ہوئے، رسموں سے مل مل کر روئے بھی مگر ان کے انداز میں ایک ایسی بات تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فرقت کے دن زیادہ نہیں۔

سینا ٹوریم کا ڈاکٹر فسبتاً اچھے مریضوں کو لوئر سی وارڈ میں جگہ دیتا تھا۔ کچھ تو یہ وجہ تھی اور کچھ یہاں کی خوش باشانہ روایات کا اثر کہ نوی فراش مریض ایک دو ماہ میں چلنے پھرنے جنتے کھیلنے آدمی بن جاتے تھے۔ زندگی سے دلچسپی ضامن حیات ہے۔ ارادۂ زیست بقا کا سب سے زبردست نشان ہے۔ بددل، اکتائے ہوئے، فکر مند مریض اپنی قبر خود کھود تے ہیں۔ اپر سی وارڈ کے پنڈت گنیش اور فصیح کی حالت کچھ ایسی خراب نہ تھی۔ لیکن ان میں حیات کی امنگ باقی نہ تھی۔ ان کا ارادہ بقا فکر مندیوں کی آغوش میں سویا ہوا تھا اور اس حسین کدہ کے نیرنگ حیات نہ ان کی نیکیوں کو اکساتے تھے اور نہ بدیوں کو۔ ان کے لئے نہ ثواب میں لذت تھی اور نہ گناہ میں کیف۔ جب خدا اور شیطان دونوں مر جائیں تو پھر موت اور عدم بھی ایک وہمی لاشے ہو جاتا ہے۔ زندگی کا پھر تو تک کہاں!

وارڈ میں جتنے مریض بھی آئے سوائے ایک کے سب صحت کی طرف قدم اٹھا رہے تھے۔ مگر ابھی وہ ہم لوگوں سے بہت گھلے ملے نہ تھے ہم لوگ صرف پانچ پرانے مریض رہ گئے تھے۔ نقی، میں، چھوٹے وکیل صاحب، گوپال اور ماروا ڑی۔ ہم لوگوں میں اب اضطرابی کیفیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ صحت کی قربت نے زندگی کی توقعات اور مطالبوں کو بڑھا کر اپنی محرومیوں اور نامرادیوں کے احساس کو تلخ تر بنا دیا تھا۔ آپس میں تو نہیں مگر دوسرے وارڈوں سے ہم لوگوں کی رقابت بہت بڑھ گئی تھی اور نرسوں سے ہم لوگ بے جا طور پر الجھ پڑتے تھے۔ آج مار تھا سے لڑائی ہوئی، کل لیبی کو ڈانٹ بتائی گئی۔ آخر میں ان نرسوں کی باری آئی جو ہم لوگوں سے زیادہ قریب ہو گئی تھیں یا جنہیں قریب ہونے کا مغالطہ تھا۔ ان نرسوں کی آپس میں بڑی رقابتیں تھیں۔ ورنہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ پوری "صحت گاہ" میں ہم لوگوں کا ایک ہمدرد بھی نہ رہ جاتا۔ ہاں ایشوری کو سنتی سے رقابت نہ تھی۔ لیکن وہ کبھی اتنی سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اپنی یا دوسری نرسوں کی تضحیک کے بارے میں سوچنا گوارا بھی کرے۔ بس وہ ہنستی "چپ کرو" پھر چل دیتی اور سب کچھ بھول جاتی۔

سینا ٹوریم میں بھی شہنشاہ معظم کی جوبلی منائی گئی۔ مٹی، پانی، آگ، ہوا اور بعد عناصر پر بادشاہ کی حکومت ہے۔ وارڈوں کے درمیان تزئین و آرائش کا مقابلہ ہوا۔ لوئر سی وارڈ اول آیا۔ ہم لوگوں کی خوشی مت پوچھئے۔ جب خوش ہونے کو بڑی بڑی باتیں نہ ہوں تو پھر کچھ تو خوش ہونے کو چاہئے کبھی انسان غم سنا کر بھی غم غلط کرتا ہے اور یہ تو خوشی ہی تھی۔ نرسوں نے بھی خوشیاں منائیں اور نرس ڈولی تو اس روز کھلی جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں چند ہفتوں سے ڈولی بے حد ہنسوڑ اور چونچال ہو گئی تھی۔ جوبلی کے قبل وہ ایک مہینہ کی رخصت پر گھر گئی۔ وہاں سے آئی تو اس کا عجیب حال تھا۔

جنسی بھی ہیں وہ۔ گفتنی باتوں کا تذکرہ کرڈالتی تھی۔ اب کے اس نے اپنے گھر کی کرسچن کاونٹی کے قریب سویشیوں کا اختلاط دیکھا تھا۔ وہ اس بات کا تذکرہ کرتی اور ہنسی پڑتی تھی۔

مین جولی کے روز دس بجے دن کو کرن کے پھیپھڑوں سے شدت کے ساتھ خون آنے لگا۔ وہ ہمارے وارڈ کے پھیپھڑوں کے وارڈ کا مریض تھا۔ بہت بلند پیشانی۔ لانبے لانبے بال اور وحشت ناک چھوٹی آنکھیں انہ بیزارو، نفی جذبات سے تلملایا ہوا چہرہ، لانبا قد، وہ ہمارا بدن گرجاری سے ڈھیلا۔ وقفے وقفے سے اسے دن بھر خون آتا رہا۔ شام کو سامنے سینما تو ریم میں پہرا خان کیا گیا۔ پارٹی ہوئی، ریڈیو بجا، کھیل کود ہوا۔ نرسوں نے گانے گائے، غرض خوب تفریح رہی اور یہ ہوا کہ کرن کا اچانک غایت کے سبب ڈولی کی انٹ ڈوبتی ہوگئی۔ ہم لوگ شہنشاہِ عظم سے وفاداری کا ثبوت دے کر اور اپنا جی ہلکا کرکے وارڈ واپس آئے تو پہلے نئے وارڈ سے اطلاع ملی کہ کرن اب تک خون تھوک رہا ہے۔ ہم لوگ افسردہ ہوگئے، مگر ڈولی اُدھر سے ہنستی ہوئی آئی اور چہکنے چہچہانے لگی۔ آج وہ مذاق پر تلی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے بھی کرن کو بھول جانے کے خیال سے اس کی شرارتوں کی خوب داد دی اور ویسے بھی ہم لوگ ان جانفشار خوں فشانیوں کے عادی بھی ہوگئے تھے۔

ابھی اندھیرا تھا کہ صبح کے بڑے کے اندر اپنا بالائی جسم داخل کرکے کسی نے مجھے جگایا۔ میں چونک اٹھا۔ ڈولی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں کچی نیند کی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈولی کی سانس تیز اور گرم تھی۔ وہ بیقراری معلوم ہوئی۔ اس نے میرے لب شرارت سے اپنی چٹکیوں میں مسل دئے۔ میری نیند غائب ہوگئی، مجھے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے یک بیک محسوس کیا کہ کرن کے سر کی بلا میرے سر پر سوار ہو رہی ہے۔ مگر ڈولی اس رات کو جذبات کی ایک سیاہ آندھی تھی، روحِ تاریکی تھی۔ اس آندھی میں کون جانے میرا کیا حشر ہوتا مگر ہوا یہ کہ بغل کے بڑ پر شاید وکین ساحب جاگ پڑے اور انہوں نے کچھ سمجھ کر مسلسل کھانسیں یعنی شروع کیں۔ لڑکے کا اسپرنگ وارڈ روڈ بلا کے لئے علم کا بول ثابت ہوا۔

صبح کے آٹھ بجتے بجتے سینا ٹوریم بھر میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ بھوکو دے وارڈ کے چھبے جی نے ڈولی کا سارا زہر دور کر دیا۔ برہمن تھے نا۔ بس پی کر بھی آمنڈ ہی پڑے۔ کتنی حریص دلچسپی سے ہم سب لوگوں نے اس کرامت کا تذکرہ سنا۔ بات یہ ہے کہ ناگن کی دُم پکڑ کر اسے فضا میں چرخ دینے کی گدگدی تو سب کو ہوتی ہے مگر ڈسے جانے کا خوف اور نہ جانے کتنے قسم کے خیالی بھوتصور میں رینگ رینگ کر سما دیتے ہیں۔

ہم سب لوگ رسنے اپنی نیفتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے چھبے جی اور ڈولی دونوں پر لعنتیں بھیجیں۔ اس واقعہ کے بعد سے ہمارے وارڈ کے اکثر مریض ڈولی سے الجھنے لگے۔ ان کے دلوں کا بھوت انہیں انتقام کے لئے اکساتا تھا۔ آخر ایک دن میری ڈولی۔ یہ بخت طرائی ہوگئی۔ اس نے ایک نئے مریض خان صاحب کو بس اتنا کہا تھا "کہاں چلا جاتا ہے خان؟ میں حق ہی ہینیت لگانے کے لئے کہہ رہی ہوں۔" خان بگڑ گیا تھا۔ میں نے خان کی پاسداری کی۔ بات بڑھ گئی۔ اور بڑھی تو اتنی کہ میں نے ڈولی کو کیا نہیں کہہ ڈالا۔ میں غصے سے کانپ رہا تھا اور وہ ڈھٹائی سے مسکیاں لے کر رونے لگی۔ ایک دوسرے کے خلاف رپورٹیں ہوئیں اور یہ ہوا کہ مسلسل کلام قطعی بند۔ ایشوری اور کیتھرن نے بات کو سلجھانا چاہا لیکن گرہ نہ کھلی۔

مجھے گیا رہ ماہ سینا ٹوریم میں ہوگئے تھے اور نقوں کو ایک سال سے کچھ زیادہ۔ ہم دونوں اٹھا گئے مگر گھر یہاں درپیش تھیں اور اس ہوکم میں سینا ٹوریم سے جانا مناسب نہ تھا۔ کرن کے خون تھوکنے سے ہم لوگ اور گھبرا گئے تھے۔ وہ چلتا پھرتا مریض تھا کہ اچانک اس پر مرگ سانے کا حملہ کیا کرن عجیب طرح جانی زندگی میں داخل ہوگیا تھا۔ جولی کے بعد ایک ہفتے تک اسے خون آتا رہا۔ ایک ماہ ہوا تھا کہ وہ سینا ٹوریم میں آیا تھا۔ وہ ہشت زود آرائش رہنے کے بعد اسے سیر کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ کچھ پاگلوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اکثر چپ رہتا تھا اور گاہے گاہے معمولی سی بات پر بے تحاشا ہنسنے لگتا۔ وہ اپنے لباس کی طرف سے بے پروا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسی باتوں سے چڑ جاتا جو پرسش و دستانہ کے تحت آتیں۔ اس کا کوئی ماموں اسے

برما سے اسے روپے بھیجتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ماموں کو خط لکھنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کا اور کوئی دنیا میں نہ تھا۔ یہ اکیلا رہتا تھا۔ وہ اپنے ماموں کو گالیاں دیتا تھا۔ کہتا ——— "اس نے مجھے مرنے کیوں نہ دیا۔ ناحق میرا علاج کرا کے مجھ میں زندگی کا لالچ پیدا کر دیا اور اب مسلسل خوف، جینے کی مصیبت، گرسنے کا ڈر۔ سل کے مریض کا علاج اسپتال میں ہے جہاں ہم لوگ کیا کریں گے؟ آرام اور غذا! یہ تو ہنسی ہے! آرام! استراحت کے گھنٹے! اصولاً یہ پروگرام! انڈے! دودھ! مکھن! چوزے! پھل! ہوا اور مکان! اور کچھ نہیں! گدھے کے بچے ڈاکٹر! جیسے بیمار ہی سے پہلے ہمارے پیٹ بھری تو رہے تھے۔ سب نوجوانوں کو سل کے کیڑے کا انجکشن دے کر مار ڈالنا! سماج اور حکومت کا فرض ہے نہ کہ بیماروں کا علاج کرنا۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار ہونے لگتیں اور وہ پاگلوں کی طرح بکنے لگتا۔ جب میں خون تھوک رہا تھا تو اسے روکا کیوں گیا؟ میں دو گھنٹے میں مر چکا ہوتا اور اب کیسے مروں؟ خدا اور شیطان نے مل کر انسان کا جگر چھلنی کر دیا۔ یہ احمق انسان خدا اور انسان کے درمیان بٹ گیا ہے اور زندگی نہ خدا کے پاس ہے نہ شیطان کے پاس۔ یہ ہے ٹاٹا کے پاس۔ فورڈ کے پاس، برلا کے پاس، جو خدا اور شیطان دونوں سے زیادہ طاقتور اور زیادہ خطرناک ہیں۔ مگر انسان اس قابل ہے کہ اس کے ہر فرد کو ہلاک کر دیا جائے۔"

کرن کلکتہ یونیورسٹی کا ایم۔ اے تھا۔ یہ زندگی کے ماضی پر ایمان رکھتا تھا نہ مستقبل پر۔ اس میں محبت کی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ سب سے نفرت کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی غیر معمولی طور پر وہ بڑی محبت سے گفتگو کرتا۔ بچوں کی طرح اور باتیں کرتے کرتے اس پر رقت سی طاری ہو جاتی اور وہ حیات کی آغوش کے کسی کھوئے ہوئے سرچشمے کو ڈھونڈتا تھا۔

اب کے جو کرن کو خون آنا شروع ہوا تو ہم لوگ اس کی بیمار پرسی کو گئے۔ ایسی حالت میں بولنے کی سخت ممانعت ہوتی ہے۔ مگر ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ زور زور سے بولنے لگا اور پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ اصولاً زہر تھا۔ کہنے لگا:

"اب کے آسانی سے مر سکوں گا۔"

وہ دیر تک بکتا رہا۔ صبح کو نرس دلاری اور کیتھرن کی اس روز ڈیوٹی تھی۔ دلاری دوڑی ہوئی آئی کہ اسے اٹھائے۔ ہم لوگوں نے بھی بہتیرا سمجھایا مگر وہ چیختا رہا۔ اسے دو دفعہ خون کی اُبکائی بھی آئی۔ کرن نرسوں سے بہت چڑتا تھا مگر اس روز جب کیتھرن نے اسے آکر اپنے خاص انداز سے کہا "کرن بابو!" تو وہ فوراً لیٹ گیا اور کیتھرن کو حسرت سے دیکھنے لگا۔ خدا جانے ان دو گھنٹوں میں نرس نے کتنی مٹھاس، شکایت، تادیب اور خلوص گھول دیا تھا کہ کرن رام ہو گیا۔

استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ میں اور نفی اس کی تیمارداری کرتے تھے۔ اسے برف کے ٹکڑے دینا، پھل کا عرق پلوانا اور چپ چاپ اس کے پاس بیٹھے رہنا۔ جب اس خون کے دورے کے وقت وہ ہاؤلا ہو جاتا اور اس پر محرقی حالت سی طاری ہو جاتی۔ وہ اٹھ جاتا اور پلنگ چھوڑ کر دوڑنے کی کوشش کرنے لگتا۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ یا تو میری بات ایک صوفناک سفتا یا کیتھرن کی مان لیتا۔ کیتھرن نے مجھ سے دو پہر کو اگر کہا:

"انور بابو میں ہر وقت تو نہیں رہوں گی۔ پاگل ہے بالکل۔ آپ کا کچھ خیال کرتا ہے۔ رسٹ پیریڈ کے بعد کرن کو دیکھ لیا کیجئے گا۔" مجھے اسی وقت کرن سے بھوکے کوندے کی طرح کی مقابلت محسوس ہوئی۔ میں نے کیتھرن کے لہجے اور تیور میں کچھ محسوس کیا۔ بہرحال میں وہی کرتا رہا جو کیتھرن نے کہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیتھرن کا پاس تھا یا کرن کا خیال۔ کیتھرن کرن کے لئے غیر معمولی توجہ کا عملی مظاہرہ کر رہی تھی۔

تیسرے روز صحت یابی کا شدید حملہ ہوا۔ بڑے ڈاکٹر نے اسے۔ پی۔ دی۔ ہارس میرم ایکسیم، انٹرین، مرد غیا اور کونگو ڈ کے انجکشن دیئے۔ مگر خون نہ تھما۔ رات کو حالت نازک ہو گئی۔ میں اور نفی کرن کے پاس تھے۔ اس نے ایک بیک۔ جیلی کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے سوڈے تیز غذا دینے کے اور کسی چیز کی اجازت نہ تھی مگر اسی رقت اور سجاجت سے اس نے جیلی مانگی کہ ہم لوگ اسے نہ مانگی چیز دینے پر تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر میں جیلی نہ ملی۔ اسی درمیان میں پھر اس کے منہ سے خون آیا۔ میرے دل میں یہ خوفناک سفید کاغذ پر سیاہ دھبے کی طرح پھیل گئی کہ کرن کا خون نہ تھمے

اور وہ ختم ہو جائے۔ پھر یک بیک جیسے کسی نے اس روشنائی کو جادو سے اٹھا لیا ہو۔ اب بھی ایک کاغذ سادہ موجود تھا۔ میں نے اس داغ کو اپنی انسانیت کی نگاہوں سے چھپانے کے لئے فوراً اپنے پیروں سے کرن کے لئے اسٹول سے چلمن کھینچی اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھڑا کر دیا بے بیاں ممنونیت کی نظر سے مجھے دیکھ کر بس اتنا کہہ کر لیٹ گیا، اور آنکھیں بند کر لیں "تم خدا سے بہت بہتر ہو"

ایک ہفتے کے بعد کرن اچھا ہو گیا۔ بسمل کو حیرت ہوئی اور کیتھرن کو حیرت کے ساتھ تاقابل بیان مسرت بھی۔ وہ اپنے کو کرن کا فرشتہ محافظ محسوس کرنے لگی تھی۔ مجھے کرن سے پوشیدہ نفرت ہونے لگی۔ میں کیتھرن پر فقرے کسنے لگا۔ وہ نہیں کھاتی اور دن بھر ٹھنکتی "وہ تو پاگل ہے بیچارہ کرن" اس بیچارہ سے مجھے پرخاش تھی مگر اس نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کرن کو یوں چاہتی ہے جیسے کوئی ماں گھر شریر بچے کو پیار کرے۔ پھر بھی میرے دل میں عجیب سی کھوٹ تھی۔ کرن اچھا ہو کر کیتھرن سے، مجھ سے، اور ڈاکٹر سے شدید نفرت کرنے لگا۔ پہلے جیسا کیا اب بھی وہ میرا مخلصانہ شکریہ ادا کرتا تھا۔ کہتا تھا "وہ میری جان بچانے کی کوشش نہ تھی، تمہاری خالص محبت تھی۔ حیوانی بے عقل، آزاد عجیب گمبھیر اور اندھی محبت، پر میں تمہیں اس محبت کے طفیل بھی معاف نہیں کر سکتا۔ تم اور کیتھرن" اس نفرت کے باوجود کیتھرن کرن کو چاہتی تھی اور وہ اس کے لئے کڑھتی تھی۔ کہتی "ایسے پاگل مریض کہیں اچھے ہوتے ہیں"

نہ میں سمجھ سکا اور نہ کیتھرن کو اپنی اصلیت معلوم تھی کہ وہ کرن کی محبوبہ بے بسی کی وجہ سے اس کی طرف کھنچ گئی تھی۔ اس کی بے پناہ پرشور زندگی قوت کے سبب۔ وہ اب بھی میرے پاس آ آ کر زندگی، مستقبل، محبت، ملازمت کی پریشانیاں اور اپنی خیالی شادی کے متعلق گفتگو کرتی تھی۔ اسے میری اور کرن دونوں کی جذباتی احتیاج تھی پر وہ اس کا تجزیہ نہ کر پائی اور میں نفرت کے کیچڑ میں کیڑے کی طرح تلملاتا رہا۔

گرمیوں میں سیل کے مریضوں کی اور کثرت ہونے لگی۔ بہت سی درخواستیں بیڈ کی کمی کی بنا پر واپس کر دی گئیں۔ لیکن کچھ قوتیں ایسی بھی ہیں جن کی درخواستیں روکنے کی جا سکتیں۔ یہاں ڈاکٹر کی کشش دل کا مسئلہ نہیں بلکہ خالص اثر و رسوخ اور زر کا مسئلہ تھا۔ ایسے طبقے کے چند لوگوں کو جگہ کی ضرورت تھی جس کے افراد دوسرے طبقات کے سر آنکھوں پر اٹھائے جاتے ہیں۔ اے وارڈ میں جگہ نہ تھی، اور وہاں کسے ہٹایا جاتا۔ وہاں فالرز کی رگوں میں بھی تو خون تھا "تو سے یہ ہوا کہ فوری طور پر کسی وارڈ میں جگہ خالی ہی جائے اور پھر مرتے مرتے، اپنی بیش قیمت ہستیوں کو اسے وارڈ میں منتقل کر دیا جائے۔ گوپال، نقی اور جہنیز وکیل صاحب کو بریک فلم ڈسپیچ کر دیا گیا۔ میں نے کچھ ایسی گمبھیر ہمدردی محسوس کی، جس کا ارادہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ سے کہوں کہ میرا نام بھی کاٹ دے مگر جون کے مہینے میں سینا توریم چھوڑنے کے خوف سے لرز گیا اور خود حفاظتی کی حس میرے دوسرے احساسات پر غالب آ گئی۔

گوپال اضطراب میں ڈاکٹر کے جانے کے بعد ٹہلنے لگا۔ وہ پہلے بہت خوش ہوا، پھر اس پر حیرانی اور تعجب طاری ہوا۔ آخر کار وہ بولنے لگا۔ وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے لپٹ گیا "او بھائی! تم بھی چندہ۔ گھر جائیں ہم اور بھائی، ہاں اسے اپنی کون دے گا جائے رہیں گے یہاں سے، سات دے تین برس اسی وارڈ میں رہے۔ دو بھائی سالی تو اس بستر پر ہو گئے" گوپال نے اپنے خاص کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں امنڈ آئیں "پھر ہم سب لوگ نقی بھائی۔ آپ، پیر صاحب، مصرجی، بھائی حاضری، پیر بھرا بھائی، اور بھائی، ہم پانچوں آدمی چلے شہر کے کتنے کرایہ کا مکان لے کر رہیں" اس نے اس پروگرام کی دلکشی محسوس کیا اور مجبوری کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں، نقی اور وکیل صاحب سب بے چین تھے۔ میری اور نقی کی رفاقت سینا توریم میں مثال کے طور پر مشہور تھی۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ ہم سب لوگ ملے جلے، واضح اور مبہم جذبات کے نوع بہ نوع اثرات کے تصادم کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے آنسو بہا رہے تھے۔ جیسے کسی بھادوں چٹان کے نیچے سے پانی کا سوتا رس رہا ہو۔

نرسوں نے بھی اس خبر کو بے چینی سے سنا۔ الیشری قواس اچانک سادھنے سے بدحواس ہو گئی۔ یہ تینوں مراہن دو سال روز بڑھاپے سے ہم لوگ رن بھرتا تھی کرتے رہے۔ دکھ، درد، امید و ناامیدی، خوشی اور مسرت، نزاکت اور نگلساری، بیماری اور صحت کی باتیں۔ ہم لوگوں میں

وعدے وعید ہوئے کہ ایک دوسرے کو خط لکھیں گے۔ لوئسی وارڈ کے خاندان کا بقیہ بھی بکھر رہا تھا۔ مریض صحت پا کر جا رہے تھے۔ مگر اس ناقابلِ بیان مسرت کے ساتھ شکست رفاقت کا عجیب غم بھی تھا۔ سینا ٹوریم کی رفاقت بھی میدانِ جنگ کی رفاقت سے کم نہیں۔ کیسے کیسے قاتل لمحات کا ہم لوگوں نے مل جل کر مقابلہ کیا تھا! کتنی نا امیدیوں کو ہم نے شکست دی تھی! کتنے ارمان، کتنی حسرتوں کو ہم سب نے ساتھ پالا تھا! مسرت اور فریب کی گھڑیاں! بے اسرار شامیں، تاریک صبحیں، دلداریاں، غمگساریاں، ہمدردیاں، سب یاد آ رہی تھیں۔ مدت سے ہم لوگوں نے جدائی سہی تھی۔ قدتی ہی سہی، فتح کے احساس سے ہمیشگی حاصل ہوتی ہے۔ کاش اس سیاہ بھیانک غربت کے آئندہ دھندلوں کے وقت بھی ہم سب لوگ ایک ساتھ رہتے۔ آہ زمانہ ہر دانے کو علیحدہ علیحدہ کر کے اپنی چکی میں پیس لیتا ہے۔

ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ایشری نقی سے ملنے آئی۔ سبھی نرسیں آئیں۔ ایشری سب کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک ٹھہری رہی۔ وارڈ کے صحن میں ہم لوگ ساتھ بیٹھے۔ وہ نقی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے روتی جاتی اور باتیں کرتی جاتی تھی جیسے نقی کے ہاتھ کو ہر تر کا ایک چوڑا ہوں جیسے کسی بچے کے ہاتھ سے چھین لئے جانے کی دھمکی دی جا رہی ہو، وہ ہاتھوں کو اس طرح دبائے ہوئے تھی کہ انہیں کبھی نہ چھوڑے گی۔ اس نے رخصت ہوتے وقت نہایت بیباک خلوص کے ساتھ کہا:

"اگر مجھے یہ خیال ہوتا کہ تم جون ہی میں چلے جاؤ گے تو میں دعا کرتی کہ ابھی بیمار ہی رہو۔ میں تمہیں بیمار دیکھ سکتی ہوں مگر تم سے بچھڑنے کی تاب نہیں لا سکتی۔"

وہ تینوں چلے گئے۔ مارواڑی اور میں رہ گئے۔ تو مریض اور تھے۔ پھر بھی ہم لوگ سخت تنہائی محسوس کر رہے تھے۔ میرا جی تو بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ بیزار، اکتایا ہوا اور کچھ خائف۔ تنہائی میں بیماری کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور اس کا خوف دامن گیر۔ کیتھرن نے میری بڑی دل دہی کی لیکن نہ جانے کیوں ان دنوں اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں دنیا میں یکتا و تنہا ہوں۔ مجھے یہ شدید احساس ہو رہا تھا کہ ہر فرد کی زندگی ایک علیحدہ کال کوٹھری ہے جس کے اندر کوئی دوسرا نہیں آ سکتا۔ دور سے وقتی طور پر اس کے اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے۔ دو قیدیوں کا مل جانا محال ہے۔ آنی جانی دلچسپی ممکن ہے مگر اور زیادہ دردناک ہم ایک دوسرے کی روح میں جھانک کر دیکھنے۔ اس سے نفرت یا محبت کرتے گذر جاتے ہیں۔ ہماری روحیں مل نہیں سکتیں۔ ایک ہو جانا فریب ہے سراسر فریب۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کیتھرن نے دردن کے لئے میری باطنی زندگی میں جھانکا اور اب دوسری روحوں کی کھڑکیوں کے پٹ کھول رہی ہے۔ کبھی کوئی جنگلے سے لگا ہوا کوٹھری کے اندر کب تک جھانکتا رہے۔ وصالِ داخلی ناممکن ہے اور خارجی اتصال فریب احساس ہے۔ المناک طنز ہے اور مضحکہ خیز بھی۔

ایک روز میں نے کیتھرن کو صاف کہہ دیا "دھوکا دینے سے کیا فائدہ! آپ کرن کو چاہتی ہیں چاہئے"

وہ بگڑ گئی "چاہتی تو ہوں مگر..... اور آپ کتنے ننگ نظر، سنگدل، بدظن اور ناعتبار ہیں۔"

مجھے آگ ہی تو لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرا مقابلہ کرن سے کیا جا رہا ہے اور مجھے مردود قرار دے دیا گیا۔ اگر یہ مجھے کبھی اور مجھ کے جاتے تو میں صرف ہنس دیتا۔ مگر اس میں مقابلہ کا اشارہ پایا جاتا تھا۔ یہ ستم میری خودی کا دم گھونٹ رہا تھا۔ میں تلملا اٹھا۔ کیتھرن نرس روم میں چلی گئی۔ میں نے اپنا بکس کھول کر اس کی دی ہوئی بچی کھچی چیزیں نکالیں اور انہیں واپس کرنے ڈیوٹی روم میں گیا۔ میں نے انہیں کیتھرن کے ہاتھ میں تھما دینا چاہا، پر اس نے دیا نہیں اور تنک کر بصنعتی ہوئی دوسری جانب چلی گئی۔ میں نے سب چیزیں اس کے سامنے ٹیبک دیں اور لوٹ آیا۔ کیتھرن بپھر گئی اور میں نے واپس ہوتے ہوئے یہ جملے سنے:

"مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں۔ کس پہ ناز کرتے ہیں، منہ سا کر ہی! میں کسی کی پیاسی نہیں ہوں۔ بڑے آئے ہیں کہیں کے.....

نازک دھاگا ٹوٹ چکا تھا۔ میں اپنی تنہائیوں میں اور زیادہ تنہا ہو گیا تھا۔ کوئی سہارا نہیں، کوئی تسکین نہیں۔

کرن کے بعد اب میری باری تھی۔ جون کے ایک دو دن باقی تھے کہ سوتے سوتے پانچ بجے صبح کو میرے منہ سے خون آگیا۔ میں بستر سے پرے ہٹا ہوا خوف کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ یہ دنیا، یہ کرہ سارے سامانِ حیات کو لے کر میرے سامنے گولی کی طرح شن سے کائنات کی انجان وسعتوں میں دور نکل گیا اور میں خلا، تاریک و سرد خلا میں معلق ڈوب جانے کے لئے اکیلا رہ گیا۔ موت کی کالی کالی موجیں مجھے ڈھانپے جا رہی ہیں اور میں فنا کے غار میں غرق ہو رہا ہوں۔ آس اور نراس کے درمیان زندگی کے عنکبوتی تانے بانے کو ایک سال مکمل ایک سال تک بُنا تھا۔ طوفان کے بعد پھر سے تنکے اکٹھا کر کے آشنا اور مسکراہٹوں کے بندھن سے باندھا تھا اور اب ایک نئی آندھی آشیانۂ حیات کو نوچ نوچ کر بہا کر رہی تھی۔ میں نے کتنی باتوں کو بھلایا تھا۔ کتنی یادوں کو تھپک تھپک کر سُلا دیا تھا کتنے ارمانوں کو بھلا کر خاموش کر دیا تھا اور پھر زندگی کی خشک شاخ پر نازک نازک ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، کلیاں بھی پھول بننے کا سندیسہ دے رہی تھیں اور آرزوؤں کی نئی بسنت بہار بتاں کا پیغام لا رہی تھی۔ مستقبل پھر فریب بُننا دے رہا تھا اور یہ اچانک موت کے ترکش کا ایک تیر آ لگا۔ ہر طرف خزاں تھی، ویرانیاں تھیں اور بے بس سکوت! زندگی کی نیرنگی ناامیدیوں میں بھی امید کے بُت تراش لیتی ہے۔ یہ کیفیت گذر جانے کے بعد مجھے یہ خیال آیا۔ شاید کینسر لیوں واپس آ جائے شاید رجائی خون ٹوٹی ہوئی رگوں کو جوڑ دے۔ مجھے مسرت ہوئی۔ میں نے زہر سے امرت بنا لیا۔ انسان میں بھی کتنی الوہیت ہے۔ وہ ہر آن اپنے کو بجھتا چاہتا ہے اور اس کے لئے اپنا اور دوسروں کا خون بھی بہا سکتا ہے، خدا تو صرف دوسروں کا خون بہاتا ہے۔ اپنا خون بہا کر لذتِ آزار حاصل کرنے کا اسے تجربہ کہاں۔ یہ انوکھا احساس اس کے بس سے باہر ہے۔

مجھے بھی ہاسپٹل کر دیا گیا۔ وہی باتیں ہوئیں جو کرن کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر نے مجھے تسکین دی کہ پھیپھڑے کی حالت بہت اچھی ہے۔ سل کے مریضوں کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے ہی ہیں۔ جراثیم نخفتہ حالت میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی سوئے سوئے بھی پھیپھڑے کی رگوں کو چاٹتے رہتے ہیں کسی رگ کی دیوار پھٹ جاتی ہے اور خون آنے لگتا ہے۔ تمہارے پھیپھڑے غیر معمولی طور پر متاثر ہو چکے ہیں نئے ریشے نکل آئے ہیں اور مرض قبضے کے اندر آ گیا ہے۔ بچ گذر جانے والا دور ہے۔ گھبراؤ مت! نرسوں نے بھی عیادت کی، جی بہلایا اور تشفی دی۔ مگر میں عجیب حالت میں تھا۔

گذشتہ سال جو میرے منہ سے ایک ماہ تک خون آتا رہا تھا تو میں نے اپنے جذباتی سہارے کے لئے روحانی، مابعد الطبیعیاتی عالم کی طرف رُخ کیا تھا۔ اب کے میرا دل بجھ تھا، بالکل بجھ۔ مگر بجھ کر بھی سب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یہ ٹھنڈک عورت کے جسم میں نظر آئی۔ حیرت انگیز طور پر مجھے حواسِ عشرت کی طلب ہوئی مگر محرومی نے دل میں جہنم سا بھڑکا دیا۔ موت سے قربت ہو تو خدا یاد آتا ہے لیکن شاید مادہ کے بچھڑ جانے کے احساس نے مجھ میں مادہ، جسم اور دنیا کی شدید معروضانہ محبت پیدا کر دی تھی۔ جو چیزیں چھوٹ جانے والی ہوں ان سے کتنا بیتاب عشق ہوتا ہے۔ پائدار اشیا تو اکثر اکتاہٹ پیدا کرتی ہیں۔ فنا کے سبب بقا سے محبت ہوتی ہے اور غیر فانی ہستی کبھی اتنی مستحکم، وزنی اور عظیم و جلیل معلوم ہونے لگتی ہے کہ اس کے وزن اور باقی و حاضر ناظر ہونے کے تصور سے رُوح پسی جاتی ہے۔ خدا اتنی بڑی حقیقت ہے کہ دل اس کو بھول کر اپنے کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کا آنی جانی ہونا ہی کشش کا باعث ہے۔ اس مادی دنیا کی سب سے حسین ترکیب مادہ عورت ہے۔ مادہ کا نقطۂ کمال، جسم کے حسنِ تعمیر کا عروجِ جمیل۔ اس لئے مادی سہارے میں سب سے بڑا سہارا عورت ہے۔ میں بستر پر لیٹا لیٹا فنا کا خیال کر کے جب لرزنے لگتا تھا تو دل میں ایک ہوک اٹھتی تھی اور حیات کا ذرہ ذرہ جنسِ لطیف کو ڈھونڈھتا تھا۔ مجھے اٹھنے کی اجازت دے دی مگر جذبۂ دل ایسی حرکتوں پر اکساتا تھا جو سامانِ بقا ہیں۔ مجھے اپنی رومانی مثالی پسندی سے نفرت ہونے لگی۔ میں سوچتا کہ نراگا ڈوبی ہوں۔ بدن کی رومانیت، مجسم اور حقیقت بشارتی کو جھٹکر مرجذبِ کشش کی لطافتوں کے جانے میں اُلجھ رہنا کیسی بے عملی اور نامرادی کی دلیل ہے۔ مجھے فنا اور اس کی قوتِ اقدام و عمل یاد آئی اور میں انتہائی محرومی و کارناکردگی کے غم میں غلطاں ہو جاتا۔ یہ فطرت کا کتنا المناک طنز تھا کہ اس بجھی ہوئی خاکستری حالت میں مجھے جسم کے چراغ جلانے کی شدید تمنا ہو رہی تھی۔ میں نرسوں کو صرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ انہیں چھونا، سُننا، دیکھنا، سونگھنا اور چکھنا چاہتا تھا۔

عورت ہی ایک ایسا عطر مجموعہ ہے جو سارے حواس کو بہ یک وقت شاد کام کرتا ہے۔ جس گھڑی میرے منہ سے خون آتا، میں مجبوری و محرومی کے احساس میں غرق ہو کر اپنے ہی جسم کو انتہائی پیار و محبت سے چوم کے رونے لگتا۔ مجھے اپنا ہاتھ، اپنی انگلیاں بہت ہی عزیز معلوم ہوتیں۔ میں نے ان سے اتنی شدید محبت کا احساس کبھی نہیں کیا تھا۔ اتنی بار میں نے کبھی ان کو اتنے انہماک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے جو امید قائم کی تھی کہ کیتھرین اس حال میں تو ضرور مجھ سے من ہی جائے گی، ٹوٹ گئی۔ کیتھرین بس ڈیوٹی کے طور پر وارڈ میں آتی اور چلی جاتی۔ اس نے میرا حال تک دریافت نہ کیا۔ مصیبت تنہا نہیں آتی، غم کی گھٹائیں موج در موج ہوتی ہیں۔ کیتھرین کتنی خود دار و خود بیں تھی۔

مگر اس کے خلاف ڈوملی جسے میں نے کیا نہیں کہ ڈالا تھا۔ جس سے میری کوئی توقع وابستہ نہیں تھی، وہ ڈیوٹی نہ ہونے کے باوجود میری علالت کی خبر سنتے ہی بھاگی ہوئی آئی اور مضطرب مسکراہٹ کے ساتھ میری خیریت دریافت کی۔ میں چپ رہا۔ خفگی سے نہیں شرمندگی سے۔ اس وقت وہ چارٹ دیکھ کر چلی گئی۔ پھر وہ برابر آتی رہی۔ مجھے وارڈ کی بیگانگی سے وحشت ہوتی تھی لہٰذا مجھے معائنہ کے کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ ایک دوپہر کو ڈوملی مزاج پرسی کے لئے آئی۔ میں انتہائی ندامت میں گھر گیا اور ہیجانی جذبات سے مجبور ہو کر پڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ڈوملی کا ہاتھ پکڑ کر بہ رقت معافی مانگی۔ وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور صرف اتنا کہا: "اوہ صاحب! آپ نہیں جانتے"...

میں نے ان آنسوؤں میں ماضی کے کانٹوں کی چبھن محسوس کی اور زندگی کے کیا ب حسن کی پھندنوں والی کلیاں کھلتی ہوئی دکھائی دیں۔ ان کے طور پر میں نے یہ محسوس کیا کہ عورت ہی مرد کی اہمیت کا ذریعہ ہے۔ فانی انسان عورت ہی کو حوا اور ربوبیت سے چند قطروں کو تابیدا کنار سمندر بنا دیتا ہے میں نے دیکھا کہ انسانیت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر عورت کی آغوش سے نکل کر ازل اور ابد کو گھیرے ہوئے ہے۔

آخر کار میں اچھا ہو گیا۔ چند ماہ اور سینا ٹوریم میں رہ کر مجھے گھر واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ میں بہت اکتا بھی گیا تھا۔ ادھر کیتھرین نے مجھ سے رُوگردانی کر کے اپنی زندگی ہی بدل لی تھی۔ وہ سب سے تعلقات توڑ چکی تھی۔ اگر وہ مجھ سے باتیں نہیں کرتی تھی تو اور لوگوں سے بھی گریزاں ہی رہتی تھی شاید وہ اپنی زندگی کے تجربات تلخ و شیریں کے بعد شکست فریب کی تلخیاں برداشت کر رہی تھی۔ اب وہ صرف کھیلنا نہیں، زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

رخصت کا اکھڑنا کچھ آسان نہیں ہوتا۔ درد زندگی میں سے سب سے بڑا دکھ انتقال ہے۔ جڑ سے وصل زمین سے محروم کئے جاتے وقت کراہنے لگتی ہیں۔ میری حیات کو رخصت بھی صحت گاہ میں ڈیڑھ سال تک نصب رہا تھا اور اب علیحدگی کے وقت اضطراب کے سوتے دردناک ہو رہے تھے۔ میں رخصت سے پہلے نرسوں سے ملنے ان کی قیامت گاہ کو گیا۔ سب بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ سبھوں نے بڑے انس اور خلوص سے میری پذیرائی کی اور بعض نے خوشی کا اظہار کیا کہ اب میں اچھا ہو کر اپنے گھر جا رہا تھا۔ مگر کیتھرین وہاں بھی خاموش رہی۔

رخصت کی صبح کو ایشری نے مجھ سے کہا: "کنور! رات بھر روتی رہی ہیں اور ڈوملی بھی۔ آپ کو سبھی لوگ چاہتے ہیں"

میں نے کہا: "جو میری خطرناک حالت میں بھی بیگانہ نہ رہا ہو وہ بلاؤز کے پیرس بٹن ٹوٹ جانے پر تو رو سکتا ہے مگر میرے لئے اس کے آنسو کی ایک بوند بھی نہیں ہو سکتی۔ ہاں ڈوملی سے میں بے حد شرمندہ ہوں"

ایشری مجھ سے باتیں کر رہی تھی کہ کیتھرین آئی اور اس نے ایشری کو ڈیوٹی روم میں بلا لیا۔ ذرا دیر میں وہ مسکراتی ہوئی لوٹ آئی اور ہنس کر کہنے لگی:

"جائیے مل لیجئے! بڑا بلاتی ہیں"

نہ جانے کیوں میں ارادے کے خلاف اندر چلا گیا اور ایشری وارڈ میں مریضوں کا ٹمپریچر لینے چلی گئی۔

خود دار و خود بین کیتھرین کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اس نے مجھے دیکھا۔ میں اس کے قریب جا گیا۔ اس نے میرا ہاتھ زور سے جذباتی انداز میں پکڑ لیا اور اسی حال میں میز پر ٹیک لگا کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اسے اپنے آنسو دکھلانے میں بھی عار تھی۔ اچانک اس نے سر اٹھا کر کہا:

"اوہ بابا! آپ نے ہم نرسوں کو عورت نہ سمجھا۔ بس ایک گڑیا، ایک گڑیا، ایک گڑیا!"

بلونت سنگھ

جگّا

ماتھا کے علاقہ میں بھیکن ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے، زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی۔ یہاں کی ایک بات تھی۔ وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر پُر رومان ہوتی کہ سستی پنوں، سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھے کے قصے بھی مات ہو جاتے تھے ——— اور اب اسے قریہ گورنام کور کے نام پڑا تھا۔

گورنام کے حسن نے اس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ ایک گڑیا کی مانند تھی، چینی کی مورت، چلتی تو اس شگفتہ رفتاری کے ساتھ کہ نقشِ قدم معدوم، سرگیں اور پرست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آتا تھا۔ لیکن ابھی وہ معصوم تھی۔ شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے تکلف اور پُر شباب دوشیزہ کی پُر زور جس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموش اور پُر سکون سمے میں کہیں دور سے شہنائی کی اٹھتی ہوئی آواز سنائی دے جائے۔ ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کر دیتی، وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی، ابھی اس میں پندارِ حسن پیدا نہ ہوا تھا، اس لئے ہر شخص اس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گورنام اس سے محبت کرتی ہے ——— ایک مرتبہ تو شنگارا سنگھ نے دلائیہ نوجوانوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گورنام کو بھگا لے جائے گا۔

اس وقت دلیپ سنگھ اور سے گذرا تو دوستوں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گورنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے سن پایا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر لیں گے۔ اس پر شنگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بلند بانگ پکار دیا۔ اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شنگارے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا "تو نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

شنگارے نے تہمد کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلہ پر آن کھڑا ہوا۔ دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔ قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھ جاتے مگر سب نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ آخر کماں تک؟ ایک دن خونی پل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا۔ دلیپ کا خون کھول گیا اور دلیپ کی للکار کی ایک ہی ضرب سے

۱؎ کسی کی تضحیک کرنے کے لئے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر بیچ بیچ کی آواز نکالنا۔

شہنگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا، جان تو بچ گئی مگر صورت بگڑ گئی۔ اس دن سے سب کو گمان ہو گئے اور اب دلیپ کے بیٹے ہی گرنام کا دعوے دار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

رات بھیگ چکی تھی، چاند جوبن پر تھا، گاؤں پر ایک پُراسرار خاموشی طاری تھی، کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے پاس ایک جنگلی بلا بیٹھا دُم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔

یہ رہٹ اور ٹیلوں کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی پیپل کا ایک بہت بڑا اور گھنا درخت، جس پر ایک جھولا پڑا تھا۔ چور لکڑ بیلوں کو ہانکنے والا کوئی تھا نہیں، جی چاہتا چل دیتے، جی چاہتا ٹھہر جاتے، اس وقت خاموشی سے کھڑے سینگ ہلا رہے تھے۔

اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکہ مرد پیپل کے نیچے آکر رُکا، اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ سانڈنی بلبلا کر مچلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہات میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلافِ معمول بات نہیں، مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ہاتھوں اور چہرے کی رگیں اُبھری ہوئی، آنکھیں سُرخ انگارہ، ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو، جوڑے پر رنگ برنگ کی جالی، جس میں سے تین بڑے بڑے پٹھے نکل کر اس کی سیاہ ڈاڑھی کے پاس لٹک رہے تھے، کانوں میں بڑے بڑے مندرے، کلائے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر، بدن پر لانبا کرتا اور مرگیا رنگ کا ریشمی دار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا گریبان کا قسر کھلا ہوا، اور اس کے سینہ پر کے گھنے بال نمایاں، اور پاس اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور پھکدار چھوی[1]۔

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے، اس نے جوتے اتارے، تہبند کھاد پر اٹھایا اور اپنے موٹے کھُردرے پیر پیچھے بہتا پانی کی جھال کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ ہاتھ دھویا، زور سے کھانسا اور پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڈنڈی کے ٹھلے سے منہ لگا کر پینے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لئے گھڑا جھال کے نیچے کیا اس کی گوری کلائی پر کی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یک جا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار، چھینٹ کا گھنٹور تک کا کرتا، سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں، جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گھڑے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کر ٹھلے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دل نشیں خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں اوتو[2] سے باہر نکالا اور اسے جھٹک کر جوتا پہن لیا۔ پھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا۔ تب وہ اپنی چھوی ہاتھ میں لئے ہوئے اوطری پر جہاں کہ ایک مفید مرغی کے بہت سے پر پڑے تھے، کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی جس پر اُپلے رکھے تھے۔ جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اُپلا نیچے گرا دیا جو زمین کی کے پاؤں کے پاس جا گرا۔ اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر، تلووں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیوں کو روند کر چلے آرہے ہوں ——— لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا۔ مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سرنگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا۔ مرد نے بھاری بھرکم اور کرخت آواز میں پوچھا "تو کون ہے؟"

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں، یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اسے اس قدر بے مروتی کے ساتھ مخاطب کیا۔ اس کے سُرخ سُرخ نازک ہونٹ پھڑکنے لگے جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں، مگر مرد غیر معمولی طور پر بھیانک تھا۔ مرد نے اسی لہجہ میں اپنا سوال دہرایا "تو کون ہے؟"

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ اس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں۔"

---

[1] کوڑے کا ڈھیر [2] ایک تیز دھار ہتھیار، جو کہ لاٹھی کے سرے پر چڑھا لیا جاتا ہے [3] آہنی کڑا جو کہ سکہ کلائی میں پہنے رہتے ہیں [4] جہاں پانی گرتا ہے۔

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا "تیرا نام کیا ہے؟"

دوشیزہ کی آنکھیں پرآب ہو گئیں۔ بولی "گرنام!"

"تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"میری ماں ہے، بے[1] بے[2] دیر[3] چاچا[4] باپو[5] سب ہی رہتے ہیں۔"

"مجھے اپنے گھر لے چل۔" مرد نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں، اس نے اپنی بانہہ کی طرح آراستہ سانڈنی کی مہار کھینچ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجہ میں پوچھا "کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو گیا؟"

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ "لیکن مجھے تم سے خوف معلوم ہوتا ہے۔"

"کیوں؟" مرد نے اُجڈپن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لئے اس کی چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھا۔ "تم ہنستے کیوں نہیں؟"

"ارے یہ بات؟" یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا جیسے کوئی پانی سے بھرپور مٹکا زمین پر انڈیل دے۔ اس کے قہقہہ کی آواز سُن کر چکارے اپنی نکین گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

گرنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک[6] کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا۔ اس کی ٹہنی تو بہت دور سے نظر آتی تھی۔

دروازہ کے سامنے پہنچ کر اجنبی رُک گیا اور گرنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا "واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح!"

"واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح!"

اجنبی بلا کسی ہچکچاہٹ کے بولا "میں دور سے آ رہا ہوں، رات زیادہ گزر چکی ہے۔ میں آج یہیں ٹھہروں گا۔"

باپو اور بھائی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار شخص تھا مگر اجنبی کی بھیانک شکل سے شبہ میں ڈالے ہوئے تھی۔ خیر اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا "میں ہر طرح سے خدمت کے ... ..؟

پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کر سکے اجنبی سانڈنی اٹھ کے کے پسر و کر کے دروازہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کل سامان غریبانہ تھا مگر گوبر سے لپی ہوئی پکی دیواریں اس کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہ تھیں۔ گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے، سوائے چار کے۔

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہو گیا۔ ایک بوچہ سینہ سے لگی ٹٹا لگائے سو رہا تھا۔ صحن مرلیشوں کے تُرت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا۔ ایک طرف کھرلی[7] کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی۔ بھس اور کھل کی سانی[8] کی ڈھیر چار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ رسّی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف خراس[9]

---

[1] ماں [2] بہن [3] باپ [4] دادا [5] نیم کے درخت سے ملتا جلتا ایک پیڑ [6] مانڈ جس میں سانی کی جاتی ہے۔
[7] بیلوں کے ذریعے چلنے والی چکی۔

دوسری طرف تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے ٹنگا ہوا چیکڑے کا پیتہ، یہ بڑے بڑے اپلے، کونے میں کپاس کی چھڑیاں، چولھے کے پاس جھوٹے برتنوں کا انبار، ایک کمرہ میں سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ صاف ہی تاگے میں پروئے ہوئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے واسطے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کر بوڑھا باپو اجنبی کو دروازہ سے باہر چبوترے کے نیچے لے گیا تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھا دی گئی تھی۔ سوکھے ہوئے اپلے جو جلانے کے کام میں آسکتے تھے اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔ یہاں پر ایک چارپائی ڈال دی گئی۔ چارخانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اس پر رکھ دیا گیا۔

گرنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور خود اُنا گوندھنے لگی۔ جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے کھسک گئی۔ اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے۔ دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرہ پر پڑ رہی تھی ——— اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

شلغم کی ترکاری، ایک کٹورے میں شکر گھی، ٹرینوں کا اچار، دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں اور اٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گرنام اس کو دے آئی۔

جب اجنبی نے اونچے سُر میں تین چار ڈکاریں لیں اور بڑے زور شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر تلی کی تو گرنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے۔ جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کر تکیہ کے قریب رکھنے لگا تو اس کا ایک گھنگھرو نیچے گر پڑا۔ گرنام تھنک کر واپس ہٹنے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا "گرنام! بس جاہی ہو گیا؟"

گرنام حسب معمول اپنے دلفریب طفلانہ انداز سے مسکرائی اور اوڑھنی سنبھالتے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی "سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی۔"

اجنبی دور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شرینہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیووں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ لنڈ منڈ بیریوں پر جگنوؤں کے گھروندے لٹک رہے تھے۔

ایسے سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کے مسرت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

ہائے وے کیلا ای
نکل کے مل بالو!
ساڈا دھنجھ وے دلا ای
نکل کے مل بالو!

اتنے میں گرنام دبے پاؤں، شلوار کے پائنچے اٹھائے، کھلا ہوا منہ، دانتوں تلے دبائے، چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ہیں گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔

اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے۔ قریب تھا کہ گرنام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے ایک چیخ

نہ بیر کی ان نہ ایک اپلہ

نکل جاتی مگر اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گرنام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخر کار اس نے اپنی باتوں سے آپ ہی اُکتا کر ایک گہری سانس لی اور تکان زدہ آواز میں بولی۔

"کہو تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو ——؟ میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو۔ مجھے جیب کتروں، چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے۔ وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں۔" یہ کہہ کر گرنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی۔ جیسے کوئی سچ مچ کا قاتل اس کا گلا دابنے کو آ رہا ہو۔

"مت گھبراؤ۔ تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات کا خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔"

گرنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تہ دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی "تم کتنے اچھے ہو —— یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لئے لائے ہو گے نا؟"

"ہاں!"

گرنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا:

"تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"گرنام میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا تو ہونے والی بیوی کے لئے لائے ہو؟"

اجنبی نے اپنی ڈاڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی۔ بنے گی بھی یا نہیں"

گرنام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر اپنی آنکھوں کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے، ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا: "ہاں تم کالے ہو نا!"

اجنبی کے سینہ میں جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔

مگر گرنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید وہ اجنبی کے لئے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

"یہ زیور تم لے لو۔"

گرنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا: "پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟"

اجنبی کو کچھ جواب نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا: "پھر میں تم سے لے لوں گا۔"

گرنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ تالی بجا کر بولی: "میں ان کو کپڑوں میں چھپا دوں گی —— کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے ملبوسات پہن کر کمیتوں میں جایا کروں گی۔"

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا: "گرنام تم بھی تو مجھ کو کچھ دو۔"

گرنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا: "میرے پاس کیا ہے؟"

"کچھ بھی ہو۔"

گرنام چہرہ سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کوڑیوں اور خرزہ کے رنگ برنگ کے منکوں کا ہار نکال کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر جھینپ سی گئی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گرنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا "یہ میری انگلی میں پہنا دو۔ دیکھوں کیسی لگتی ہے۔"

اجنبی نے اپنے کالے کالے میلے کچیلے لمبے چوڑے ہاتھوں میں گرنام کا کنول سا ہاتھ لیا۔ گرنام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارفتگی کے عالم میں اس کے خوبصورت سیپیوں جیسے پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے اس کی چار چار انگلی چوڑی کلائیوں کی کل طاقت شدید کی بھار ہی ہو۔

گرنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اماں کھانس رہی ہے ——— اب میں جاتی ہوں۔"

اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔

گرنام نے آگے جھک کر نقرئی آواز میں پوچھا "جاؤں کیا؟"

اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے۔

اجنبی جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ گرنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن اور چھنّا[1] لسی کا دیا اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گرنام رونے لگی۔ اجنبی نے آہستہ سے کہا "روتی کیوں ہو؟"

"تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مت جاؤ۔"

اجنبی ہنس پڑا "میں پھر آؤں گا۔"

باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

باپو اجنبی کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا "کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں!" اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرہ پر گاڑ کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنی دھوپ میں چمکنے والی چھری کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتے ہوئے مزید کہا "اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے نے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔"

بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا

اجنبی سانڈنی پر سوار ہو گیا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا "آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔"

جگا ڈاکو، اصلی نام سردار جگت سنگھ ورک[2] وہ خوفناک شخص تھا کہ جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ قتل، غارت گری، ظلم، لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں ہی گزر گیا۔ بہت سی زمین کا مالک تھا۔ بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا، خوب خوش تھے۔ اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص جو صلہ نہ کر سکتا تھا۔ اب تیس برس سے اوپر سن تھا۔ موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا، اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔ محبت، حسن، شفقت، نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم متعین نہ تھا۔ دو روز تک اس کی دھوم تھی۔ علاقہ بھر اس سے تھراتا تھا، اس کا دل پتھر، بازو آہن، غصہ قیامت، وہی شعلہ ——— وہ قہر تھا۔

---

[1] چھنّا کٹورہ [2] جاٹوں کی ایک ذات

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنا لئے تھے۔ نوجوان جھوم جھوم کر ان کو گایا کرتے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا ؎

پکے پُل تے لڑائیاں ہوئیاں، پکے پُل تے
پکے پُل تے لڑائیاں ہوئیاں تے چھویاں دے کُل ٹُٹ گئے ..... جگیا

یا پھر لائل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا اور بچ کر واپس بھی آگیا تھا۔ اس کا ذکر یوں ہوتا تھا ؎

جگے ماریا لائل پور ڈاکہ، جگے ماریا
جگے ماریا لائل پور ڈاکہ تے تاراں کھڑک گیاں[1]

اس کی طویل، تاریک اور ہیبت ناک شبِ حیات میں ایک تارا طلوع ہوا جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کر دیا، اور وہ تارا تھی ——— گرنام!

گرنام بیچاری نادان چھوکری، اسے عشق و محبت کا پتہ ہی نہ تھا۔ اسے لوگ کنکھیوں سے دیکھتے، وہ ہنس دیتی، اس کے جذبۂ پندار حسن و شباب کو کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ وہ دانستہ شکار کھیلے، بسملوں کا تڑپنا دیکھے، اور اس لذت سے محظوظ ہو جو صیادوں کے لئے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی سادہ دوشیزہ کر ہی یہ جانتی ہی نہ تھی کہ وہ شاہیں جس کو زخمی کرنے کے لئے پنجاب کے شہزور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں، اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا وہ اسے چُوک کر اور کند ہو کر زمین پر گر پڑتا تھا، وہی شاہیں اس کے تیرِ غلط انداز کا شکار ہو کر نیم بسمل اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگا ان کے ہاں آتا اور سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اس نے خود کو ایک متمول زمیندار ظاہر کیا۔ باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ گرنام کی کشش اسے کھینچ لائی تھی۔ اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اس فرشتہ کو اپنانے سے پہلے خود کو کیونکر اس کے قابل بنا لے، اس نے کبھی بھی اس سے محبت جتلانے کی کوشش نہیں کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ کیونکر اس کا آغاز کرے، وہ سوچتا تھا کہ نامعلوم اس کے اظہارِ محبت کرنے پر گرنام کیا رویّہ اختیار کرے لے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی تھی اور وہ مہوت سا بیٹھا سنا کرتا۔ کبھی کبھی اس کو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ صورت تو اس کی پہلے ہی مکروہ تھی۔ مگر اس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔ گرنام تھی کہ اس نے کبھی بھی اس سے اظہارِ نفرت نہ کیا۔ وہ نہایت صبر و محبت کے ساتھ اس سے پیش آتی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لئے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی، اگرچہ اس نے آج تک، اس کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی۔ گرنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھرکا پیدا کر دیتی تھی۔ اس کا ملکوتی جمال اس کا سر نگوں کر دیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سنا کہ: جگے نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکنے میں گذر گیا۔

جگا صبح و شام پالا کرتا، غریبوں کو کھلاتا پلاتا، دان کرتا، گورودوارے میں جا کر سیوا کرتا، ہر کسی کے ساتھ نرمی اور حلیمی سے گفتگو کرتا۔

اس نے باپو کی منت کی کہ گرنام کور کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔ اس نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے، اور جو کچھ اس نے لوٹا وہ سب بڑی تونددالوں کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بہت سی زمین اور رویہ ان کو دینے کو تیار تھا اور باپو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔ لیکن گرنام کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ وہ جگا ڈاکو تھا۔ اور وہی اسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے

---

[1] پکے پُل پر کتنی سخت لڑائی ہوئی کہ بھیڑوں کے کیل ہی ٹوٹ گئے۔ [1] جب جگے نے لائل پور میں ڈاکہ ڈالا تو ہر طرف برقی تاروں کے ذریعہ سے اس بات کی خبر کر دی گئی۔

ہونے والی ہے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پریتم کو ایک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔ نیک باپ نے سب کچھ منظور کر لیا۔

جگّا نیکبختی سے چودہ برس پورے رہتا تھا۔ اس کی آمد و رفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ اوّل تو وہ آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرے وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا تھا۔ جگّے کو دنیا جانتی تھی مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔

جگّے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی اب وہ چاہتا تھا کہ گرنام کی زبان سے بھی اس عشق کا اقرار کروا لے خواہ اسے یہ نہ بتلائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔

ایک دن بعد از غروب آفتاب وہ بھیکن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرنام ساتھ والے گاؤں میں جوالا ہوں کو سوت دینے کے لئے گئی ہوئی تھی۔

جگّے نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی کو ذرا کج کیا۔ شملہ کو ذرا اور بلند کیا اور پھر اس نے سب کی نظریں بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر اُلٹ لیا اور اسے اپنی گھنی اور گھنگھرالے بالوں والی گردا گرد داڑھی پر خوب اچھی طرح مل لیا۔ پھر وہ مرغیوں کو چل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔

ہر طرف دُھندسی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی مدھم روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی دیتا تھا۔

دور سے ایک عورت دکھائی دی۔ اسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ کوئی عورت تھی اور یقیناً وہ تھی بھی گرنام۔

جگّا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

گرنام قریب آتے ہی مسکرا دی۔ لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھڑی تھی۔ "میری تو کمر ٹوٹ گئی۔"

"اس گٹھڑی میں کیا بھر لائی ہو؟" یہ کہتے ہوئے جگّے نے ایک ہاتھ سے یونہی بوجھ اس کے سر پر سے یوں اٹھا لیا جیسے کوئی دو سال کے بچے کو ٹانگ پکڑ کر اٹھا دے۔

"کپڑے ——— اور رکھا کیا؟" گرنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا۔ وہ آدھی رستہ میں اُپلے چننے لگی۔ یہاں تک کہ شام اسی میں ہو گئی۔"

دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آج جگّے نے گرنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ماتھ کی بچی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کئے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا بھید کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا۔ کیونکہ گرنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی۔ "گرنام!" یہ کہتے کہتے رہ گیا۔ اس کی ڈاڑھی پر ہاتھ پڑا۔ اس نے اسے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر بولا "گرنام، تم کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔"

گرنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے ہی شوخ اور اٹھڑ رہی تھی مگر جگّے سے کافی مانوس تھی۔ اس لئے اس سے زیادہ شرمائی بھی نہیں تھی۔

جگّے کو کچھ اُلجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا "کیوں گرنام کس سوچ میں ہو؟"

گرنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا "میں بہت پریشان ہوں ——— میں بہت دنوں سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سنا دوں

لیکن ..... ؟"

"لیکن کیا؟"

"شرم آتی تھی۔" گرنام نے جھینپ کر جواب دیا۔

جگا کچھ کچھ تاڑ گیا۔ زیر لب کچھ مسکرایا۔ "ارے مجھ سے شرم کیسی؟"

گرنام چپ رہا۔

جگا کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر گرنام نے بتایا۔ "وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔"

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ کسی ۔۔۔ پیسہ والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں اور کسی سے ....."

یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

جگے نے اپنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے شعلہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں ڈھک گیا۔ پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا۔ "نہیں گرنام نہیں۔ جس کو تم چاہو گی اسی سے تمہاری شادی ہو گی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا ..... ہاں تو ..... مگر وہ ہے کون؟"

جگے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔

گرنام نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چوڑے شانوں اور صندوق جیسے سینہ کو چھو کر کچھ تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

جگا گھبرا گیا۔ اس نے اس کو چمکارا اور دلاسا دیا اور پھر اس شخص کا نام پوچھا۔

گرنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رک گئی ..... اور زور زور سے رونے لگی۔ جگے نے تسکین دی تو وہ بولی۔ "تم ضرور میری مدد کرو گے ان سب کے ہاتھوں سے سخت بیزار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام ..... "

جگے کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"اس کا نام ہے ویر ..... ویر ..... ویر سنگھ؟"

جگے کو مانو سانپ سونگھ گیا۔

اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ بھیانک ہو گیا۔

"ویر سنگھ اس کا نام ہے۔" گرنام نے دہرایا۔

جگے کی مٹھیاں بھنچنے لگیں۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی رگیں پھول گئیں ——

گرنام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"گھر جاؤ۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

یہ کہہ کر وہ الٹ کھڑا ہوا۔

"تم فوراً واپس چلی جاؤ۔" اس نے کرخت لہجہ میں گرج کر کہا۔ گنوار چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ سنگھ اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ عقاب کی چونچ نا ناک مسلح ہو گئی، آنکھیں خون آلود ہو کر دہکتے ہوئے رچھرے سے بربریت ٹپکنے لگی ——— معاً اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا ———

"دلیپ سنگھ؟ ———"

موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا۔ نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی اور نہ چاند کی چاندنی۔ پل بڑے بڑے اور بھدے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی اور پانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے مہیب سے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو مہیب سے دیو، انسانوں کو ہڑپ کر لینے کے لئے منہ کھولے لیٹا ہو، یا جیسے کسی مُردے کی دو بڑی بڑی آنکھیں جن کی پتلیاں کوّے نوچ کر کھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا اور کچھ فاصلہ پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص اُدھر سے گذرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس پل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی "خونی پل" رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچے تو دن کے وقت بھی اکیلے اِدھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سر کٹا سید رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا سر تو پل کے نیچے دلدوز چیخیں مارا کرتا اور وہ خود بغیر سر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔

نصف رات گذر چکی تھی۔

دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ مُنّا کا کام بھی کرتا تھا اور پنساری کی دکان بھی اس کی اپنی تیار کردہ گلقند خوب بکتی تھی۔

وہ نوجوان تھا۔ خوش رو و خوش وضع، مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں، گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال، بھیگے زعفرانی، آنکھیں مشرقیت سے لبریز، کشورے، سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوئے تھا، اس کا ایک چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ خوب بجاتا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لئے جاتا ہے، اس واقعہ کو وارث شاہ کی ہیر سے بڑھتی دوروں تک گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

دلیپ طاقتور اور دلیر نوجوان تھا۔ خونی پل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ وابستہ خونی روایات اس جگہ کو اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں رات کی تاریکی میں شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سسک سسک کر بہنے والے پانی کی آواز سن کر اس کے دل کو کوفت سی ہونے لگی ——— اس نے ذرا بلند آواز میں "پچھی"[1] گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سن کر اس کو تسکین ہوئی۔

اس کا گدھا پل پر سے پار ہو چکا تھا۔ وہ عین پل کے درمیان میں تھا۔ دل میں شاداں تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ معاً پیچھے سے اسے اپنی گردن میں کسی تیز شے کی چبھن محسوس ہوئی اور جیسے کوئی اس کے کُرتے کو پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو ——— اس نے گھوم کر دیکھا۔

ایک دیو ہیکل مرد پل کی دیوار پر سے اچکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چھری پیچھے سے اس کی قمیص میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک

---

[1] پنجاب کا ایک مشہور گیت

ہی تھیں۔

"تم کون ہو؟" دلیپ نے ہمت کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

"ادھر آ" بھاری اور گمبھیر آواز آئی۔

دلیپ، اس کی طرف بڑھا ——— یکایک اس نے اجنبی کو پہچان لیا۔ بولا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے تم کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں جس نے تین سال پہلے چند اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا..... ہاں شاید وہ نشانہ مہاصب کا سیلہ تھا۔ تمہیں کافی چوٹ آئی ہے..... اور تم نے روڑ کو جان سے بھی مار ڈالا تھا۔"

جنبی ہنسا۔ "میں وہی ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ ہے۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نوعمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مدد گار بنا ——— اور قتل تو میں نے بہت کئے ہیں! اسی پل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں..... اور آج فجر کو بارھواں قتل کرنا ہے۔"

دلیپ کو اس کے اجڈ پن پر تعجب ہوا۔ بولا "میں نہیں جانتا تمہاری محمود سے کیا دشمنی ہے۔ تم تو میرے محسن ہو۔"

"تو گرو نام سے محبت کرتا ہے جو صرف میری ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے شنکر سنگھ کو اس پل پہ سخت زخمی کیا تھا ——— آج تیرا میرا فیصلہ ہوگا۔"

یہ کہہ کر اجنبی نے چھری ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا..... اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آجائے۔"

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔"

اجنبی نے گرج کر جواب دیا "تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے ہی تخم سے ہے تو میرے سامنے آ۔" یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔

دلیپ کو غیرت آگئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا۔ وہ ٹیڑھا جو گدھے کو ہلانے کے لئے ہاتھ میں لئے تھا اس نے اس کے منہ پر دے مارا لیکن اجنبی نے وار روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی۔ ٹہنا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جوش میں تھا اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مکہ اس کے منہ پر رسید کیا جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بگڑ گیا..... مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی ڈاڑھی کو تر کر رہا تھا۔ ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھارا چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی ——— مگر وہ حیرت انگیز طور پر ثابت قدم تھا۔

پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا "یہ اس طرح نہیں!" دلیپ! تم ابھی محض بچے ہو۔ لیکن جگا کوئی طفلانہ حرکت نہیں کرنا چاہتا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا اپنی اصلی جگہ پر آگیا ——— دلیپ، جگے کا نام سن کر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔

اجنبی اپنی چھوٹی بچھڑ کر بولا،

"تیرے پاس گھوڑا ہے؟"

"نہیں!"

"تلوار ہے؟"

"نہیں!"

"ہدنا جگ!"

"نہیں!"

"مگر لاٹھی تو ہے وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری بن کر لٹکی ہوئی ہے۔"

دلیپ مارے تعجب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"ہا ہا!" اجنبی نے پکار کر کہا۔ "لاٹھی نے آج ——— میں نے سنا ہے کہ تو علاقہ بھر میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ مرنے دے گی۔"

دلیپ بہادر تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالا نہ پڑا تھا۔

جگے نے چھری اتار کر علیحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھالی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

ان کی للکار کی آواز سن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑپھڑانے لگے۔ گیدڑوں نے ہُو ہُو ہُو ہُو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست چالاک نوجوان اور نوجوان ہمکرا۔ بجلی کی طرح بے چین، جوڑ جوڑ میں پارہ۔ جگا بھاری بھرکم قوی ہیکل، کہنہ مشق دیو۔ باوجود موٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سڑک ناپتا تھا تو ایسے معلوم پڑتا جیسے سطح آب پر ٹیکسی پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا "اسے خالی دے کر چلایا" "ایک!"

دلیپ نے پھر وار کیا۔ جگا "اسے بچا کر گزر جا" "دو!"

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگے نے اسے بھی روکا اور للکارا "نہیں! یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا" "سنبھل بے چھوکرے اب جگا وار کرتا ہے۔"

پسینہ کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً جھکائے کر چھپٹا۔ جگے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پل کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔

اب جگے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیئے کی مانند حلق سے ایک خوفناک آواز نکالی اور پھر دونوں بازو اٹھا کر آگے کی طرف لپکا۔ اس نے بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے جھک سنبھالا اور بھیڑیئے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا۔ مگر کہنہ مشق استاد کا وار اپنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کے سر کو توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینہ تک پہنچ جاتی مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔ سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کی مانند نہر کے کنارہ پر جا گرا۔۔۔۔۔ کچھ دیر تک تڑپتا رہا اور پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی جیسے خوشی کے قہقہے لگا رہا ہو۔

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں میں سے ہوا سسکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی۔

نہ دیو چاند بدلی میں سے نکل آیا۔ مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پگڑی کو صاف کیا۔ منہ، ہاتھ دھویا، کان پر پگڑی جما کر کس باندھی۔ اس نے دلیپ کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھری اٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لادے حویلیوں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے تیسرے دن بعد۔

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔

گرنام کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پاکر بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عورتیں چرخہ کات رہی تھیں، بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے اور بچے شرارتوں میں مصروف۔

اتنے میں جگا اندر داخل ہوا۔

شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھ میں ہتھوڑی چمک رہی تھی۔ سب نے اس کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا۔

گرنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ سلے بے نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا مگر اس نے بتایا کہ اس کی ٹانچی باہر گڑی ہے اور وہ جلد ہی واپس جائے گا۔

چند لمحوں کے لئے اس نے سکوت کیا۔ پھر نہایت مختصر اور فیصلہ کن انداز سے کہنا شروع کیا: "میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لئے آیا ہوں کہ آپ گرنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز نہیں ہو سکتی ——— بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہوگی جس سے کہ میں چاہوں گا۔"

سب لوگ حیران تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گرنام کا ہونے والا خاوند وہ خود ہی تھا۔ مگر چونکہ انہیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی اس لئے وہ خاموش رہے۔

"..... اور وہ شخص یہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا ——— اور دلیپ اندر داخل ہوا۔

ہر شخص پر حیرت زا خاموشی طاری ہو گئی۔

گرنام نامعلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔ اس کو شرما جانا چاہئے تھا مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

جگے نے دلیپ کے کان میں کہا: "اگر گرنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے۔ دلیپ! تم مرد ہو۔ میں نے اچھی طرح سے تم کو آنما کر دیکھ لیا ہے۔ میں چاہتا تو تم کو قتل کر ڈالتا۔ مگر مردوں سے مجھ کو محبت ہے۔ اب جبکہ تمہاری گرنام تمہارے سپرد کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہ کرو گے....."

دلیپ نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔

جگا بلند آواز میں بولا: "باپو! ماں! سلے بے! میں ان کی شادی کے لئے ضرورت سے بھی کہیں زیادہ روپیہ دوں گا اور ان کو بہت سی زمین دوں گا۔"

باپو اصل قصہ بھانپ گیا۔ لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیونکر بچ گیا۔ مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خوفناک پر قتل کر دیا تھا۔

دلیپ نے قصہ گھڑ کر سنا دیا کہ خونی پل پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا۔ اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار دھرم سنگھ وہاں پہنچ گئے اور وہ اس قدر بہادری سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے اور ان کو بھاگتے ہی بنی۔ پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور تیمارداری کرتے رہے۔

جگے کی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ مسحور ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے جگے کا بھدا ماتھا اپنے کومل ایسے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلے اس نے جگے کے بلند سینے اور اس کے خوبصورت

ٹ سانچی

چہرے نشانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "تم کتنے اچھے ہو..... تم یہیں ہمارے پاس ہی رہا کرو۔"
قریب تھا کہ جگا چیخیں مار مار کر رو پڑے۔ مگر جلدی سے بگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگولے کی طرح دروازہ میں سے باہر نکل گیا۔

شادی ہو گئی ———

کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گرنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کریلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ سامنے درسے غبار اٹھا، کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے، ان کی سجی سجائی سانڈنیاں، مردانہ اور دلیر سیکر عورتیں، چمکتی ہوئی چھریاں ——— عجب منظر پیش کرتی تھیں ——— ان کا سالار، تونگر مہلی گھوڑے پر بڑا چکلا شخص تھا۔ گرنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی "باپو! وہ کون لوگ ہیں؟ ——— یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ کا بیٹا ہے۔"
"نہیں بیٹی نہیں، وہ دھرم سنگھ نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی بیٹی کا سر سینے سے لگا لیا ——— اور پھر ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا "آج جگا ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے لئے جا رہا ہے۔"

ہاجرہ مسرور

بھالو

آج جمعرات تھی۔ ابھی چراغ بھی نہ جلے تھے ——— اللہ رکھی گلابی چھینٹ کا لہنگا اور مہین ململ کا کرتہ اور سر پہ اودھ پڑ مچھوں کی طرح لپیٹے آج بھی میلہ پیر گھسیٹی درگاہ میں حاضری دینے نکلی لیکن ایسی بے تابی سے کہ انوری اس کی تیزی کا ساتھ نہ دے سکی۔ مکھی بار پیٹ، اس پر دل کی بیماری کا سوٹ۔ شلوار پیٹ پر ٹکتی ہی نہ تھی، پیروں پہ وہ سوجن کہ کبھی کبھار چاؤں میں پڑنے والی گرگابی سے پیر تو جیسے گوشت کا بڑا ہو کر ابلے پڑتے گھر سے دو قدم پہ درگاہ تھی مگر معلوم ہوتا کہ کوس کی بات ہے۔ مٹھی میں ہتھائی کے چار پیسے اور دوسری ہتھیلی پہ ملیدے کی ملشتری، یوں سنوں کا بوجھ نہ معلوم ہوتی اگر اللہ رکھی کی چال پہ ایسی مردنی جوانی نہ آئی ہوتی۔

انوری نے ہانپتے ہوئے سوچا "سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ذرا خیال نہیں کرتے اب جیسے اماں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ میں بھی ساتھ ہوں۔" یہ سوچتے ہی اس کے روئیں روئیں سے کوئی شے کھول کھول کر صرف تک آئی اور پھر دو ننھے ننھے قطروں کی صورت میں آنکھوں میں پھیل گئی۔ لیکن یہ قطرے اس وقت بھاپ بن کر اڑ گئے جب اس نے دیکھا کہ اللہ رکھی مزار شریف کے پائینتی کھڑی بڑبڑا کر سے پیلی ہتھیلیاں پھیلا پھیلا کر روتے ہوئے کہہ رہی ہے ——— "میاں — اے میرے میاں — پھر یار حسن لو میری — وہ حرا مجاوی پھر بھاگ گئی۔ میں تو قسمے سے لوں گی اس حرا پھر کو، میاں اے میاں" فرطِ احترام سے اودھ چھانٹ چھانٹ کر کم سے کم "دو ٹمڑا" ہمیں اپنا دکھڑا میاں کے حضور کی درگاہ میں پیش کر رہی تھی۔

انوری کا دل بھی خوف سا کھا گیا۔ مگر کھل کر روتی کیسے۔ درگاہ تو درگاہ ہے، کئی لوگ ادھر ادھر کھڑے تھے۔ یہی لوگ بعد میں اگر چھیڑنے لگتیں نیچے گئے کئے ملیدے کی ملشتری اور چراغ کے پیسے مزار کے مجاور احسان اللہ میاں کے حوالے کئے جو انہوں نے بڑی قرتی سے مزار کے طاق میں پڑھا دیئے۔ چڑھاوے کے ساتھ ہی اللہ رکھی اور بھی بکھر گئی۔ ایسا بکھر کر روئی کہ انوری کے آنسو بھی بہہ نکلے، سویرے سے بھوکی بھی تو تھی۔ صبح محمد قصائی کے بچے کھچے چھیچھڑے اور ہڈیاں کاغذ میں لپیٹ لایا تھا جو بک کر بھی نظر میں نہ سمائے۔ پھر پہلوان سے جو بچے وہ اللہ رکھی اور بچوں کے بیک گئے۔ اسے بامشت بھر اپنے شوہر میں ایک ہڈی ڈوبتی ملی۔ وہ بھی چچڑ ڑنے کو جی نہ چاہا۔ ان دنوں گوشت تو اسے یوں بھی اچھا نہ لگتا۔ سویرے سے کیسا کیسا جی ہو رہا تھا کہ ایک کھٹی ناریل مچوس لے مگر ان دنوں اس کی فرمائش آج کل پہ ٹلتی رہتی۔ حد تو یہ ہے کہ صبح چولہے کی مٹی کھانے کو بھی مچلا۔ ایک نیلی سی

کھری تھی کہ اللہ رکھی ٹکاری "اری ناس پیٹی چولھا ٹھنڈا پڑا ہے۔ تیرے یار آکر چولہا بنائیں گے؟"

انوری نے جلدی جلدی سسکتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے اور اللہ رکھی کی باتیں پلّو کر ہوا میں اڑا دیں۔ میاں احسان اللہ ایک طویل تھکا دینے والی سانس لے کر بولے "نہ رو بھئی۔ زمانہ ہی بُرا ہے۔ اولاد ماں سے سرتابی کر کے کبھی سُرخرو نہیں ہو سکتی۔ انوری اللہ رکھی کو سمجھاؤ! رپٹ لکھوا دو تھانے میں، جہاں ہوگی پکڑی آئے گی سالی۔"

خوب تو گویا اللہ رکھی اب میاں احسان اللہ سے عقل سیکھے گی ——— وہ تو اسی دن رپورٹ لکھا چکی تھی جس دن بھالو غائب ہوئی۔ داروغہ جی نے پہلے تو اللہ رکھی کو فراشی سنائیں، مگر جب اللہ رکھی نے ہاتھوں سے چاندی کے کڑے اُتار کر ان کے قدموں پر رکھے تو کہیں جب کر کچھ دھیمے پڑے۔

داروغہ جی کا غصّہ کم ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی جو اللہ رکھی کے علاوہ اور بہتوں کو بھی معلوم تھی لیکن کس کے سر پر اتنے بال تھے جو یہ بات زور سے کہہ سکتا؟

اس وقت جبکہ وہ چھوٹے سے اُجڑے مارے قصبے کے واحد کھلے بندوں طوائف گھرانے کی طرف سے رپورٹ سُن رہے تھے اور گالیاں کھا رہے تھے تو گھر سے ملازم چھوکرا نکلا اور کہا ——— اندر بُلاتی ہیں۔

اندر پہنچے تو نازک بدن سنگار پٹار سے لدی ہوئی بیگم تماشے کی طرف کھلنے والے دروازے سے لگی غصّے سے تھرتھر کانپ رہی تھیں، سرخ سرخ آنکھوں میں آنسو! داروغہ جی کو دیکھتے ہی تڑپ کر بولیں "اللہ سے کچھ تو خوف کھاؤ۔ کیوں بے تصور ٹکوڑی بڑھیا کے پیچھے پڑے کر چڑھ گئے ——— یہ نہیں سوچتے کہ اپنے ہی دام کھرے تو پرکھنے والوں کا کیا دوش ——— کئی دن سے قدریاں جو رات رات بھر غائب رہتے ہیں۔ ایسے نشے بن گئے کہ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔" یہ کہتے کہتے آواز بھرا گئی رُکی رُکی آواز میں کہا "بھئی واہ خوب خاندان کا نام روشن ہو رہا ہے۔ بڑے بھائی ہو کر اتنے بھی نہیں کر سکتے کہ آج تک ہمارے گھرانے کے لڑکے رنڈیوں پنڈیوں کے پیچھے بھاگے ہیں بھلا؟"

اس پر داروغہ جی گھبرا گئے، ہکلا گئے، کانپتے ہوئے کہنے لگے،

"ارے بھئی کیسے کہہ سکتی ہو کہ بھالو کے معاملے میں قدریاں ——— واہ مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"اچھا ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آج ہی قدریاں کا پیچھا کر کے دیکھ لو، ارے میں تو قدریاں کی آنکھیں پہچان لیتی ہوں، ہاں نہیں تو؟" اتنا کہہ کر بیگم جھاگ جیسی سفید چاندنیوں سے لدھکے ہوئے تختوں والے کمرے میں لپک کر بائیں اور گاؤ تکیے سے ٹک کر بیٹھ رہیں۔ اس ادا سے داروغہ جی نے سمجھ لیا کہ بیگم اپنی بات سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہونے والی نہیں۔

اور وہ دل و جان سے ان کی بات تسلیم کرتے ہوئے تھانے میں پہنچ گئے۔

رپورٹ رجسٹر میں درج نہ ہوئی۔ اپنی عزت کا معاملہ تھا۔ داروغہ جی نے چپ چپاتے بھالو کو برآمد کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

لیکن بے چاری اللہ رکھی کو اس کا کیا علم ہوتا۔ اس کے کلیجے میں تو آگ بھڑک رہی تھی، پھٹکی ہوئی سارسنی کی طرح ڈول رہی تھی، ہر طرف منہ اٹھا اٹھا کر پکار رہی تھی۔ "اری بھالو تجھے موت کیوں نہ آ گئی۔ کیسے دکھوں سے پالا، خود اچھا نہ کیا تجھے کھلایا، پال پال کر سانڈ کر دیا۔ ارے ان بالشت بالشت بھر کی چھوکریوں کے سامنے کمائی کو کمائی نہیں سمجھا، آنے جانے والوں کی بغل سے اٹھا اٹھا کر دودھ چایا اور باتیں سُنیں، بھئی تو زندگی کا آسرا تھیں اور اب جبکہ پٹھا پایا آیا تو دنیا بولوں اندھیر ہو گئی۔" انوری فرمانبردار مسیحی پر کتیا کا جنم لے کر آئی تھی۔ بچوں پر نیچے، لاکھ ٹاکھ علاج کر دو بچا سوں روپے بھنیا والی گھا گئی نخمیات نہ بنی اور بچی بھالو، جو بُرے وقتوں میں کام آنے کا سہارا بنتی اس کا یہ حال کہ آئے دن کم بخت ماری لونڈوں، لاریوں کی طرح گھر سے بھاگ رہی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ رکھی کسی کے گھر بھتن مانجھ کر پیٹ پالے؟ اپنا ہی پیٹ ہتا تو خیر مگر یہاں تو کھانے والے کتنے تھے۔

اللہ رکھی، پہلوان، انوری کے تین لڑکے اور پھر انوری بھی تو ——— اب ایسے دنوں میں جبکہ الٹتے بیٹھتے میں بے چاری کی سانس پھولتی تو اسے کوئی کہاں دھکیل دیتا۔ پورے دنوں سے بیٹھی تھی۔ چہرہ ایک دم سفید کھسیا مٹی، ہونٹ نیلے، آنکھیں مارے نقاہت کے خالی خالی، اس پر سے اس کا چھوٹا بچہ ابھی تک خالی چھاتی چوسنے سے باز نہ آتا تھا۔ ساری جان کھنچنے لگتی۔ ابھی دو ایک مہینے پہلے تک وہ ہنس بول کر کسی نہ کسی سے اٹھی چوٹی تو جھٹک ہی لیتی۔ مگر اب تو اسے مارے بوجھ کے ہنسی تک نہ آتی تھی۔

اور اگر زمانے میں بھالو کچھ ہیلتی ہی۔

"ہائے سچ مچ بُرا زمانہ لگا ہے۔ نفسی نفسی ہے۔ یہ قربِ قیامت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ بھالو حرامزادی میری کمائی پر پل پل کر جوان ہوئی اور جب احسان چکانے کے لائق ہوئی تو حرافہ ہماری کٹی انگلی پر موتی بھی نہیں، ٹکڑے ٹکڑے یاروں کے پیچھے لہ گئی ہے۔ ارے کیا ہم کبھی اس کی عمر کے نہیں تھے؟ کبھی پیسے کے سوا کسی سے کوئی لالچ نہیں کی، اور ایک یہ بھالو ہے۔ ارے کیا یہ بھالو جانتی نہیں کہ انوری کسی کی کمائی کھانے والی نہیں۔ بس یہ مجبوری کے دن سدا تھوڑی رہیں گے۔ یہ وقت نکل جاتا تو اپنی جوانی کا صدقہ اسے سال بھر بٹھا کر روٹی کھلا دیتی۔ پرائے بیزخیال کہاں؟" انوری درگاہ سے واپسی پر رینگ رینگ کر چلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اُجڑے قصبے کا اُجڑا بازار اس وقت چراغوں اور لالٹینوں کی روشنی میں چمک گیا تھا۔ کئی لوگوں نے انوری کو یوں چلتے دیکھ کہ آوازے بھی کسے اور انوری شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ اس نے چپکے سے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اللہ رکھی سیلپر، گیسیٹی، گلابی چھینٹ کا لہنگا گھما کر گھر کے دروازے میں غائب ہو گئی ——— اور انوری پھر کھول اٹھی۔ "سچ ہے کسی کو کسی کا خیال نہیں۔ اب اماں کو نہیں معلوم کہ میں بھی ساتھ ہوں اور یہ دل کی پیاس کی شلوار بھی تو مصیبت ہے۔" انوری کا جی چاہا کہ بیچ بازار میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس بات پر خوب روئے۔ پر وہ رو نہ سکی۔ بس چکرا کر ایک دوکان کے پٹھے سے لگ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"اے ہے انوری یہاں کیوں رُک گئیں، گھر چلو۔" کسی نے دھیرے سے کہا۔ انوری نے پسینے میں ڈوبے ڈوبے ایک ذرا آنکھیں کھولیں یہ غالباً حفیظ تھا۔ نہیں یہ یقیناً حفیظ تھا۔ یہ نرمی حفیظ کے ہاتھ کے سوا کس کے ہاتھ میں ہو سکتی ہے؟ اس نے کمر میں درد کی لہر محسوس کر کے چھوٹے آنکھیں پوری کھول کر سیدھا اور پھر اپنا بازو حفیظ کے نرم ہاتھ میں پکڑائے اپنے گھر میں داخل ہوئی ——— اور انگنائی میں پڑی ہوئی کھاٹ پر دھم سے گر پڑی ——— گھر میں بھی ذرا دیر کو سکون نہ ملا۔

اللہ رکھی اور پہلوان گھر بھر اور باہر کی سیاست پر زور شور سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔

"اے خالہ زہرا انوری کو دیکھیو۔ اس کا جی بگڑ رہا ہے۔" حفیظ غالباً زندگی میں پہلی مرتبہ کڑی آواز میں بولا۔

"اللہ خیر کرے بو، یہاں مجرا کا صدقہ۔" اللہ رکھی جھپٹ کر انوری کے قریب آئی اور جھلنگی کھاٹ میں انوری کے ڈوبے ہوئے جسم کو ٹٹولنے لگی۔ "بھیا دائی کو بلاؤں بیٹا؟"

"ایر نہیں، بس اب ٹھیک ہے جی۔" انوری نقاہت سے بولی اور اللہ رکھی لمحہ بھر رُک کر پھر اپنے مورچے پر جا ڈٹی۔ چھپر پاتلے بنے ہوئے چولہے کے پاس اینگا پھیلا کر بدستور بیٹھ گئی۔ چلم کو ہتھیلیوں میں ایک خاص زاویے سے دبا کر ایک دو زور کے کش لئے۔

حفیظ بیڑی سُلگاتا چلا۔ "خالہ میں دوکان پر چلا، پھر آؤں گا۔"

اللہ رکھی نے جواباً ایک دو کش اور لئے۔

"اس بار تو بڑا آتی دکھائی پڑتے ہے۔ پورے دن بھر رہے ہیں۔" اللہ رکھی نے روٹھے ہوئے پہلوان کو خوشخبری سُنائی۔

"ماں لے بیٹھیگی۔ ہوتی نہ ہو تو بیٹا۔ دیکھ بھیو۔ پیسا ہے سو کر بیٹھ وادوں جو پھر لوٹ نہ جنے۔ چھاتی پر پٹھہ کر کمائی کھائیں گے کتے کے بچے۔ تین کیا کم ہیں جو چوتھا بھی گھر دیکھ رہا ہے۔ پتر یا جات شرم نہیں آتی۔ شریف جادیوں کی طرح ونڈے جنتے۔" پہلوان اپنی پنڈلیوں پر تیل کی مالش کرتے

ہوئے ٹکارا۔

"چل رہنے دے نکھٹو۔ لونڈے ہوں یا لونڈیا۔ تیری کمائی تھوڑی کھائیں گے؟" اللہ رکھی کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ "اے ہاں کہ بخت کی ناک بچو ہر وقت چڑھی رہتی ہے جیسے سچ مچ کا خاوند ہو۔ کما کھا کے ساری کمائی اٹھاوی کم بخت نے۔ ہے دو کوڑی کا نہیں لخوے لاکھ روپے کے۔"

"ہوں، بڑی کمائی ہے تیرے گھر، خود تو دو کوڑی کی نہیں۔ ایک لونڈیا کتیا کی طرح پیچھے پیچھے بیٹھ جاتی ہے۔ دوسری مستانی ہاتھی ہو رہی ہے کمائی کے نام دھیلا نہیں، بھاگ بھاگ کر تبرک کی طرح بٹتی ہے۔ تو بھی جوانی میں ایسی ہی ہوگی۔ بیٹی ماں پر جاتی ہے۔" پہلوان نے چیخ کر کہا۔

"مکے دیتی ہوں زبان روک لے۔ لو بھلا میں کیوں ایسی ہوتی، جمال نے کہا وہ کیا۔ مجال ہے جو کبھی کسی سے ماں کی مرضی کے بغیر ہاتھ بھی چھوایا ہو۔ اب تو زمانہ ہی بڑا ہے، اس میں کسی کا کیا دوس ہے؟"

"وہ دوس (دوش) کیوں نہیں؛ اری تو نے کسی میرے جیسے کے پاس ایک بار رکھا ہوتا تو ساری منہ جوری (زوری) ——— اونٹ پہاڑ تلے آئے تو بلبلانا چھوڑ دے۔ میں نے کتنی بار کہا کہ ———" پہلوان کے منہ پر ول کی بات آگئی۔

"بس بس سرم گھول کر پی گیا۔ لے بھلا کوئی دیکھ تو سہی، ہائے میری ماں!" اللہ رکھی چلم چھوڑ کے میں اوندھا کر بے بسی سے رو پڑی۔

سچ مچ رونے کی تو بات تھی۔ جب لوگ سارے قاعدے قرینے پاؤں تلے روندنے کو تیار ہو جائیں تو بھرے چاری اللہ رکھی اور کرے بھی کیا۔ دو دن سے پیسے کوڑی کی صورت نظر نہ آئی تھی۔ آج تو پنساری نے آٹا دال بھی اُدھار نہ دیا تھا۔ بھالو جو جاگی ہوئی تھی۔ اب اس میں بے چارے پنساری کا بھی کیا قصور، جب گروی رکھنے کو چیز ہی نہ ہو تو پھر اُدھار کوئی گس برتے پر دے، اِدھر تو پیٹ کی ہائے دیا پڑی اُدھر پہلوان پر پہلوانی سوار اللہ رکھی چھپر تلے بیٹھی بڈھے درد سے آنسو بہا رہی تھی۔ اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ ابھی تک گھر میں چراغ بھی نہ جلا تھا۔

پہلوان محمد پر خاموشی دیکھ کر لال لنگوٹ پر تہبند باندھتا ہوا باہر نکل گیا۔ آج یہاں روٹی کا آسرا نہ تھا پھر بیٹھ کر کیا کرے؟ اس بے زبانی پر اللہ رکھی اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ایک زمانہ وہ تھا۔ ایک زمانہ یہ ہے۔" اللہ رکھی نے روتے ہوئے سوچا۔ "اماں بوڑھی ہو چکی تھیں۔ دانت ٹوٹ رہے تھے پر خیر و کافی ناٹا تھا۔ اس کی بیاہتا کے گھر دو سال پہلے ہی بچہ ہوا تھا ——— مگر اللہ اللہ کیا وضعداری تھی۔ اس زمانے میں اللہ رکھی کی جوانی پکے پھٹ کی طرح کھل رہی تھی۔ مگر مجال ہے جو خیر و قضا کی نے کبھی اللہ رکھی کی طرف ایسی ویسی نظر ڈالی ہو۔ ہیجڑا کہہ کر پکارا اور ہیجڑا ہی سمجھا اور ایک یہ پہلوان ہے کھانے چاٹنے کو آگے آگے۔ نام کرے اللہ رکھی سے یاری کا اور نظر رکھے اس کی بیٹی جمالو پر ——— آگ لگے ایسے زمانے کو۔ نیتیں سلامت نہیں رہیں۔ جبھی تو ہر چیز سونے کے بھاؤ ہو گئی۔ جوان جوان لڑکے قصبے سے بھاگ لیتے ہیں۔ کبھی برس دو برس میں فوجی سپاہی بن کر آتے ہیں۔ یا پھر کسی مل کے مزدور تو تک بھرتی چڑھاتے پھرتے ہیں۔ جو اس اُجڑے دیار میں رہ گئے تو بھوکے ورا نہیں ہیں۔ اللہ رکھی کے گرد قدم رکھتے ہیں تو پیسے پیسے پر تکرار کرتے ہیں۔ نہ کوئی انعام نہ کوئی تحفہ۔ قصبے میں سچ پوچھو تو اب ایک اللہ رکھی کا گھر ہی مشکل کشائی اور حاجت روائی کا منبع نہ تھا۔ اب تو چوری چھپے ہاں کسبیوں کے گھر فیض جاری تھا۔ ہائے دوسروں کے پیٹ ہی بھرتے ہیں بھرتے۔ دوسروں کے پیٹ پر لات مارتے شرم نہیں آتی لوگوں کو ——— اماں نانی کے زمانے کا بنا ہوا مکان جگہ جگہ سے نمک لگ لگ کر گر رہا ہے۔ اتنا نہیں کہ دو نئی اینٹیں لگ جائیں ——— ارے جس کے دو بیٹیاں پہلے زمانے میں ہر تیں تو سمجھو کہیں کی مہارانی اور اب دو بیٹیوں کے ہوتے بھکارن سے بدتر۔ آٹا روپے کا دو سیر نہیں بکتا۔ اس پر ایک جنم جلی سہرے جلیوں والی شریف زادی کی طرح سالی پیچھے پڑ جتی ہے اور دوسری آگ لگی دوسروں کے پیچھے چھوندر کی طرح گھپیاتی پھرتی ہے ——— اور یہ پہلوان بس کم بخت روٹیاں لٹھر نسے ہیڑ جاتا ہے اس سے کیا کوئی عیش اٹھائے۔"

اللہ رکھی اپنے گھونگھٹ کے آنسو برسانے لگی۔

"اری بھالو تو مر جائے۔ کسی کو سے کہتے کی آئی تجھے آجائے" تو میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جائے۔ اری بھالو تیری چھاتی کھٹیا سے نکلے۔ اری تیا تیری، یہ اولاد تو میرے لئے سانپ بچھو ہو گئی ری میا ———"

اور اسی لمحے تین عدد اولاد گھر کے اندھیرے میں چیں چیں کر کے گھسی۔ اللہ رکھی کا رونا پیٹنا سن کر ٹھٹکی۔ کسی نے کچھ سے ٹٹ پٹ کرنے سے ناک پونچھی۔ کسی نے آنکھ اور کسی نے ناک، اولاد بڑی آسانی سے سمجھ گئی کہ اس وقت کھانا ملنے کی امید نہیں۔

اور پھر سب نے اکٹھا رونا شروع کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی پرانی اینٹوں کی گرتی ہوئی دیواریں ایک دم بھیانک سی لگنے لگیں۔ آسمان پر ایک تارہ چمک کر ٹوٹا۔ انوری ہول کر چیخی "اے ہے اماں بچوں والے گھر میں شام کو نہ رو۔" اور اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر سب سے چھوٹے بچے کو گھسیٹ لیا جیسے وہ اسے کہیں بھاگنے سے روک رہی ہو۔

اللہ رکھی اس مداخلت بے جا پر سانپ کی طرح پھنپھنا کر اٹھی "کیا کہا تو نے؟ لو یہ اور آئی حرام جادی بچوں والی۔ اری یہ پہلے تجھے نہیں سہتے۔ سرم ہوتی تو ڈوب مرتی کسی تلیا میں۔ ایک تو حرامی پلوں کی پھوج کھڑی کر دی اس پر سے ——— صدقے کر دوں اس پھوج کو۔"

انوری غریب صدا کی نازک، کم سخن اور فرمانبردار، مگر اس وقت تو وہ بھی الٹ کر بیٹھ گئی۔

"بس بس اماں کھبردار جو میرے بچوں کو کوسا، ہاں جو اکھیال نہیں، میرے بچے کسی کی روٹی نہیں توڑیں گے۔ اپنی جوانی کا صدقہ تو انہیں بہت کھلایا۔ اپنی جان گھر جان نہیں سمجھا، بیماری دکھی میں بھی کمائی سے منہ نہیں موڑا اور تو ہاتھی مٹھی گرم کی۔ کوسنا ہے تو اس حرامپنہ کو کوس۔ میرا نام لوگی تو میں اپنے بچوں کو لے کر کہیں منہ کالا کر جاؤں گی۔ اللہ کی زمین بہت پڑی ہے۔ جہاں بیٹھوں گی روکھی سوکھی کما کھاؤں گی۔ پھر دیکھیں گے کہ تم بھالو کو کیسے میری طرف دھکیلو گی۔"

انوری کی اس غیر متوقع دھمکی کے بعد خدا جانے اللہ رکھی کیا طوفان اٹھاتی۔ مگر خیر ہوئی کہ اس وقت بازار کے بہت سے لوگ ایک لال پگڑی کے پیچھے پیچھے اندر گھس آئے اور پھر کسی نے بڑھ کر چراغ روشن کر دیا۔ یہ حفیظ تھا، وہی سفید شلوار اور سرمئی ریشمی قمیص اور وہی قمیص میں پھنسے ہوئے پٹے، سرمے سے بھرپور آنکھیں اور پان سے سرخ ہونٹ، انوری کو بے تکا سا خیال بجلی کی طرح کوند کر گیا "ارے یہ تو منحوس حفیظ دوستی دوستی میں ہمارے گھر گھس کر ہمارے گاہک اپنے واسطے پھنسانے آتا ہے ———" حفیظ کو انوری کے اس خیال کا پتہ لگتا تو اس کے خلوص کو کیسی ٹھیس لگتی ——— اسے یہی کہنا ہوتا تو کم بخت پنواڑی کی دوکان سے مر کیوں مارتا؟

"اے خالہ! بھالو آ گئی۔ مبارک۔" حفیظ خوشی سے چہک کر بولا۔

اور اسی وقت مجمع میں چپ چپ شروع ہو گئی۔ بھالو کو مجمع کے بیچ میں سے دھکیل کر تماشے کا سپاہی سامنے لایا۔

ہاتھ رسی سے کس کر بندھے ہوئے۔ مل کی وہی بھاری ساری جو بھاگنے کے دن پہنے ہوئے تھی پیٹی کوٹ کے بجائے سرخ رنگ کا جانگیہ اور وہی چھوٹی سی کترتی، مگر ہر چیز پر کیچڑ میں لت پت اور بچی کھچی، جنگلوں جیسے سخت گھنگھریلے بال، جھرجھری کی کھوپڑی پر چپکائے ہوئے، جیسے اس نے جنگل سے غوطہ ڈبکی کر ہاتھی پائی ہو۔ گھماب ماں کے سامنے نظر نیچی کئے کھڑی جھوم رہی تھی ——— مارے تندرستی کے جھومتے رہنا اس کی عادت تھی جبھی تو سب اسے بھالو کہتے تھے۔

"آ گئی ———" اللہ رکھی نے اپنے اور بھالو کے درمیان ایک ایسی فطاری سی ٹہری مٹی گالیوں کی کھڑی کر دی ——— اور پھر ———

"چل اندر!" یہ کہہ کر اس نے بھالو کا ہاتھ پکڑا اور کوٹھری میں دھکیل کر کنڈی چڑھا دی۔ چلو قصہ ختم، مجمع بڑا مایوس ہوا، ذرا بھی تو گالی گلوچ نہ پھیلی۔

لیکن اللہ رکھی کی تجربہ کار نگاہیں سمجھ گئی تھیں کہ اس وقت لوگ باتیں کرنے اور سننے کے موڈ میں ہیں۔ ماں بھی کسی کا گھر چلے اور کوئی تاپے ———

چھاتا پٹے نہ دیا ہر بھلا۔ اللہ رکھی تیوری چڑھائے چولھے کے پاس گئی اور چلم بھرنے لگی۔

"جنگل میں مانک پور کی طرف بھاگتی ملی۔ میں نے پکڑ لیا۔" سپاہی مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔

اللہ رکھی چلم بھرتی رہی۔

"اب باندھ کر رکھو مار ——— کر۔ اب کہیں چلیں ہیں کر سے تو مجھے بتانا۔ ساری مستی مار مار کر نکال دوں گا۔"

پنساری ٹانگ کو کبھی کر بولا: "بھائی اللہ رکھی کم مار دیتی ہے؟ پچھلی دفعہ بھاگی تھی تو تین دن کھانا نہیں دیا۔ زنجیر میں باندھ کر رکھا۔ پہلوان نے جوتے مارے سو الگ ——— بالکل سیدھی ہو گئی تھی مگر پھر تھوڑے دن میں بھاگ لی ——— کیوں اللہ رکھی؟"

اللہ رکھی اطمینان سے مسکرا دی۔ دروازہ سے سپاہی کو پکڑا دی اور خود انوری کے بال کو لے کر مٹھی میں دبوچ کر پاؤں پٹخ پٹخ کر چیخ چلا کر رونے لگی۔

مطلب یہ کہ دربار برخاست، کھانے پکانے کا وقت ہے۔

لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ اپنا حرج کرتے، ایک ایک کر کے کھسک لئے، سپاہی نے بیٹھ کر تمباکو کے دو ایک کش لگائے۔ انوری تو اب تک مٹی کے مادھو کی طرح بیٹھی تھی کہ سپاہی کو اپنی طرف دیکھتے پا کر دوبارہ جھینگا کھاٹ میں ڈوب گئی۔ اس کا چھوٹا بچہ دودھ چوڑے جا رہا تھا۔

سپاہی نے اٹھتا کہ گویر جیسی بے مزہ تمباکو کے دو ایک کش اور لئے۔ قلعی گھریلو فضا تھی وہاں۔ وہ زیادہ دیر نہ ٹکا، چلتے چلتے سوچا "آہا بھائی ہے بڑی مزے دار۔ کل پرسوں اللہ رکھی سے بات کروں گا۔"

سپاہی کے جانے کے بعد اللہ رکھی اٹھا جھاڑو کر اٹھی اور باہر نکل گئی اور جب چند منٹ بعد واپس آئی تو دوپٹے کے پلو میں ارہر کی کھچڑی بندھی ہوئی تھی۔ چولھے کے پاس بیٹھے ہوئے بچوں کی آنکھیں آگ کی روشنی میں چمک اٹھیں۔

انوری اور اللہ رکھی میں کوئی بات نہ ہوئی۔ انوری کو انگنائی میں ٹھنڈ لگ رہی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی مگر وہ جاتے کہاں۔ پھر پاتھے اللہ رکھی اور کوٹھری میں بھالو۔ اس وقت تو اسے سبھی سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ چپ چاپ پڑی اونگھتی رہی ——— رات کافی گذر چکی تھی۔

"او انوری اٹھ یہ کھالے۔" اللہ رکھی نے مینی کی پلیٹ میں بڑے سلیقے سے کھچڑی لئے حاضر ہوئی۔

"نہیں کھانا انوری؟" انوری کی ناک میں گھی کی خوشبو آئی۔ اس نے جبر کر کے کروٹ بدل لی۔

"کھا لو انوری۔" حفیظ عطر ہو کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ "اسے ہے بے چاری نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ تم کھا لو تو ——"

مگر حفیظ کا صلح کا جھنڈا انوری نے پیروں تلے روند دیا۔

"نہیں مجھے دوسرے کی کمائی سور حرام ہے۔ اب تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔" انوری نے زور سے کہا۔ پلیٹ میں کھچڑی پر رکھی ہوئی آم کے اچار کی پھانک بھی کتنی ظالم ہوتی ہے۔ انوری نے منہ کا پانی نگل کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

"ہاری تو نہیں جائے گی۔ اب چھوڑ، تجھے کھانا ہے سو کہنے سے کھالے۔"

حفیظ اسے اٹھانے لگا اور اس وقت اسے حفیظ زہر لگا۔ آخر یہ کیوں ہمارے پھٹے میں پاؤں اڑاتا ہے، مڑا تڑا جی اپنی دکان سنبھالے جا کر۔ انوری نے بگڑ کر سوچا۔ وہ حفیظ کے اور اپنے گھر انے کے گھرنے جدوجہدانہ تعلقات کو یکسر بھلا بیٹھی تھی۔

مگر حفیظ نے جو کہا وہ سچ ہی تھا۔ اسے کہیں نہیں جانا تھا اور کھانا تو بہر حال کھانا ہی ہے انسان، پھر جبکہ آم کا اچار ہو۔ بالآخر وہ نیند کے جھونکوں میں پلیٹ صاف کر کے چھپر پاتھے بچھے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ پہلوان چھتے کے پاس اکڑوں بیٹھا کھچڑی کے بڑے بڑے نوالے نگل رہا تھا۔ انوری کو دیکھ کر اس نے بھالو کی جنسیت کے بارے میں کچھ گفتگو چھیڑی مگر انوری تو سو بھی چکی تھی۔ پہلوان سچ کہتا تھا انوری تو تھی ہی سراسر مٹی، پتہ نہیں ایسی مٹی پر کون اپنے دام پھینک جاتا ہے۔

آدھی رات کے قریب جب آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور اٹکھیلی شبنم سے بھیگا رہی تھی تو بے چارہ حفیظ اللہ رحمی کے مشورے کے مطابق کھچڑی کی پلیٹ اور چراغ لے کر بھالو کی کوٹھڑی میں پہنچا۔

بھالو زمین پر پڑی مزے سے سو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اب تک رتی میں جکڑے ہوئے تھے۔ ململ کی ساری گھٹنوں سے اوپر تھی اور سڈول جانگیہ رانوں پر بالکل فٹ تھا۔

حفیظ کو سنسنی آگئی۔ کیسی جنگلی ہے یہ بھی۔ رنڈی کو مردوں کی کیا کمی، پھر بھی مردوں کے پیچھے بھاگتی ہے، سچ کہتا ہے پہلوان، اس کے لئے تو سچ مچ بھالو ہی ہم۔ مگر بے چاری اس کی خاطر کتنی بدنام ہے کتنے جوتے کھاتی ہے، کئی بار تھانے میں بھی پٹی، ہزار بار توبہ کی۔ مگر کیا پھر وہی۔ اللہ یہ کیسی آگ کی بنی ہوئی ہے؟

حفیظ کے دل میں ہمدردی اور حیرانگی کی ایک ملی جلی سی لہر اٹھی اور اس نے چراغ طاق پر رکھ کر بھالو کو جگایا۔

بھالو نے لال لال آنکھیں کھول دیں۔

"بھالو یہ کھالے، خالہ سے چرا کر لایا ہوں۔"

بھالو مٹی کے پیتر میں سنے ہوئے ہاتھوں سے کھچڑی کھانے لگی۔

حفیظ اپنی سفید شلوار سمیٹ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ بیڑی پینے لگا اور گفتگو شروع کرنے کے لئے کوئی تمہید فقرہ تلاش کرنے لگا۔

"بھالو تو جانتی ہے میرا تجھ سے کوئی مطلب الچ نہیں۔ نہ خالہ مجھے کچھ دے دیتی ہے نہ تو ——— پر کہوں گا سچی بات۔ بھلا بتا بھی اس طرح روز روز بھاگنے سے کیا فائدہ۔ دو کوڑی کی نہیں رہے گی۔ اب تو ہی دیکھ لے یہ تو چھٹی دفعہ بھاگی ہے۔ اب کی کس کے پاس رہی تھی؟ بلا مجھے دکھا اس نے تجھے کیا دیا؟"

بھالو نے ایک لمحے کو کھچڑی پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اپنی موٹی سیاہ رونیں سے ڈھکی ہوئی پنڈلی کھجا کر دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"سچ بتا قدیر بابو کے پاس رہی تھی نا؟ تو ملا کچھ نہیں، ارے یہ بابو لوگ تو صفت کام چلاتے ہیں۔ ٹھیک کہتا ہوں نا؟"

بھالو نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کھچڑی کھاتی رہی۔

"ارے سر تو ڈھائی سیر کا یوں ہلاتی ہے جیسے مجھے پہلے ہی سب پتہ تھا۔ پھر تو گئی کیوں تھی؟ بس سمجھ نے تمانے دار ڈھٹین ہو گیا کہ تو اس کے بھائی کو پھنساتی ہے ——— اب یوں بھی اس نے تیرے مزے میں کون سا سونے کا نوالہ دیا؟"

"روٹی کا نوالہ بھی پیٹ بھر نہ دیا۔ بابو کے گھر کوٹھڑی میں بند کر کے دن بھر کو چلا جاتا تھا اور شام کو ایک روٹی دے کر جاتا تھا۔ رات بھر سونے نہ دیتا تھا۔ پھر بھی غیر کہا" بھالو روہانسی ہو کر آنکھیں ملنے لگی

"ارے دنیا والی اس طرح بھاؤ رنڈیاں پنڈیاں کرتی ہیں۔ صبر کر سب تیری جوتی۔ اس سے پہلے تو جن کے ساتھ بھاگی تھی انہوں نے بھی دو چار دن کے بعد گھر سے نکال باہر کیا۔ اچھا قدیر بابو کے پاس سے تو خود بھاگی یا ——— ؟" حفیظ کریدتا ہی گیا۔

"انہوں نے کہا اب جاؤ بھالو۔ بھائی ناگن کی طرح پھنسا رہی ہے ——— میں وہاں سے چل پڑی۔"

"اچھا یہ تو بتا تو اس کے ساتھ گئی کس لئے تھی؟" حفیظ اسے دائیں بائیں لڑھکا کر چاروں شانے چت قائل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"قدیر بابو کہتے تھے بھابی کے نخرے نہیں اٹھتے، سو کمی چھڑا لا تو بے پر کے نخرے گاڑی بھر دکھاتی ہے۔"

"یہ بات تھی بابو صاحب کو اپنے گھر بلاتی۔ ذرا بابو صاحب کی گرہ سے کچھ نکلتا۔ ارے بابا دو پیسے آنے سے کم میں نہیں ملتا ہے۔ مجھے تو تیری عقل پر غصہ آتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں اگر خالہ سے تیرا دل خوش نہیں تو الگ ہو جا۔ مکان دلانے کا میرا ذمہ، بس خالہ کا روزینہ باندھ دینا اب بیچاری خالہ

کا بھی تیرے سوا کون بیٹھا ہے؟" حفیظ نے اللہ رکھی کی پوری وکالت کی ——— بھالو خاموشی سے کھاتی رہی۔

حفیظ کو اپنا جادو اثر کرتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس لئے اس کی زبان بھی قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ قصے بھر میں اس کا کوئی سنجیدگی سے نوٹس تک نہ لیتا تھا۔ اس گھر میں اس کی بات تو سنی جاتی تھی۔ پھر وہ کیوں نہ اس کو گھر بسانے کی کوشش کرتا۔

"سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کوئی سوتنے یا پیرنے کا بنا تھوڑی ہوتا ہے" حفیظ نے ہزار باتوں کو ایک بات میں سمو دیا۔

بھالو نے کھچڑی سے ہاتھ اٹھا کر اثبات میں سر ہلایا اور بڑی دیر تک ہلاتی رہی اور سیاہ طاق میں رکھے ہوئے چراغ کو گھورتی رہی ——— حفیظ بھی بھالو کا ہمراہ پر تنگ گیا۔

"چل اٹھ بھالو خالہ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ اور وعدہ کر پھر کبھی کسی مرد کے پیچھے نہیں بھاگے گی" حفیظ نے بھالو کا سر اسا باندر پکڑ کر کھینچا۔

بھالو چپ رہی مگر وہ اٹھی بھی نہیں۔ بس چپ چاپ چراغ کو گھورتی رہی۔

"اب کس سوچ میں پڑ گئی ہو؟"

بھالو پھر بھی چپ رہی۔ حفیظ تنگ آ کر اپنے پٹے کھجانے لگا۔ یہ بھالو بھی بس سالی ———!

"حفیظ!" بھالو نے دھیرے سے پکارا۔

"ہاں بھالو!" حفیظ نے بھالو کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

بھالو کی آنکھوں میں جانے کہاں سے ایک دم آنسو اُبل پڑے۔ تولنے میں ایک بار چودوں سے بڑھ گئی۔ جب تو ایک آنسو نہ گرایا اور آج پتہ نہیں کیسی چوٹ لگی۔ حفیظ بوکھلا کر رہ گیا۔

"میں ہوں کے ساتھ بھائی، اچھا کیا بھالو۔ اس بات کو جانے دے" بھالو نے جلدی جلدی آنسو خشک کئے۔

"پھر تو جانتی کیا ہے؟" حفیظ کہتا گیا۔

"میں تو سوچتی تھی میرے بچے ہوں، میں بچی، ٹٹ کے پردے والے گھر میں ہوں، جیسے تیری ماں رہتی ہے" بھالو دھیرے سے بولی۔

"اچھا!" حفیظ کو کچھ غصہ آیا اور پھر وہ کھسیا کر ہنس پڑا۔ وہ بھالو کے منہ سے اپنی مرحومہ والدہ کا ذکر نہیں سننا چاہتا تھا۔

"بھالو!"

"ہاں!"

"تو سچ مچ مرد نہیں؟" بھالو نے بچوں پن سے منہ اٹھا کر پوچھا۔

حفیظ اس اچانک حملے سے بچ گیا۔ ایک لمحے کو اس نے سر اٹھایا اور پھر اس کی آنکھوں میں ہنسی آ گئی۔ وہ مرد نہیں تو اس میں اس کا کیا قصور۔ بقول اس کی ماں کے "اللہ دینے والا ہے، جو چاہے دے دے۔

"میں تیری دوکان کے لئے چھالیہ کتروں گی۔ تیری ماں کی خدمت کروں گی بھالو، میں بہو بن کر رہوں گی بھالو!"

اسی رات بھالو پھر بھاگ گئی۔

دوسرے دن حفیظ اکڑا اکڑا کر چلتا جو دوکان پر آیا تو لوگ وہ سارے گھسے پٹے فقرے بھول گئے جنہیں سن سن کر حفیظ کے کان پک گئے تھے۔

انور

خون

رمآجا ایک اکیلے مسافر کی مخصوص خاموشی کے ساتھ جہاز سے اُتر کر بیٹی پر کھڑا ہو گیا۔ چودہ سال کے لمبے عرصے نے اُو ڑھ گھاٹ میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دی ہونگی۔ وہ ان تبدیلیوں پر غور کرنے کی بجائے اپنے لٹھے کی نئی شلوار پر جہاز کے گندے ڈیک سے لگے ہوئے تیل کے دھبوں کو دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے اُس کے احساس کی چادر پر ملال کے بڑے بڑے دھبے آ گئے۔ ہنگلی کی ہلکی ہلکی لہروں نے جہاز کی سیاہ کھردری دیواروں سے ہولے ہولے ٹکرا کر اس کی شلوار کے سیاہ دھبوں کو مٹا دیا۔ اُس نے بغل سے اپنی عمل کی، کلف سے اکڑی ہوئی، نئی پگڑی کو نکال کر دیکھا۔ اُس کا دماغ اُس کو یہ نہ بتا سکا کہ کلف نے اس کی پگڑی میں بھی ہنگلی کی لہریں پیدا کر دی ہیں، لیکن جب اُس نے اِس پگڑی کو جمالی انداز میں اپنے سر پر باندھ لیا تو اُس کے دل نے محسوس کیا کہ وہ ہنگلی کی لہروں میں نہا رہا ہے۔ ایک دفعہ پھر اُس کی طبیعت میں دبی دبی مسرت کا خاموش جھیل ساکن جھیل طوفان برپا ہو گیا اور اُس نے لائنوں پر اِدھر اُدھر حرکت کرنے والی اونچی اونچی کرینوں کی طرف دیکھنے کی بجائے پاس سے گذرنے والے تیل سے بھیگے ہوئے چیتھڑوں میں ملبوس ایک کالے مریاڑ، مریل مُردار بنگالی قلی کو کہا:

"جوان تم کو معلوم ہے، پنجاب کو گاڑی کتنے بجے جاتی ہے۔"

قلی نے بیڑی کا ایک لمبا کش لے کر دھوئیں میں سے جواب دیا۔

"ہم کو مٹیں مالوم۔"

سامجے نے قلی کو جانے سے روکنے کے لئے گندے کے پاس سے اُس کی قمیص کا کپڑا پکڑ لیا۔

"اچھا یہ بتاؤ سٹیشن کو جانے والی سڑک کونسی ہے؟"

بوسیدہ کپڑا قلی کے معمولی جھٹکے سے سرے تک پھٹ گیا۔ قلی کے کالے منہ پر زرد آنکھوں میں سُرخ خون اُتر آیا۔

"ہمارے کو ایک دپھے بولا ہم نئیں جانتا۔ پھر کالے کو پکڑتا؟"

سامجے کو غصہ آ گیا۔ اُس نے ہوا میں ایک مُکا بلند کر کے پنجابی اردو میں کہا

"سؤر ــ کا ــ پُتر!"

قلی جلتی ہوئی بیڑی ساجے کے منہ پر مار کر رفو چکر ہو گیا۔

اگر ساجے کے پاؤں کے پاس اُس کا کالا ٹرنک نہ پڑا ہوتا تو وہ اُس قلی کے پیچھے بھاگ کر اُس کو دریا میں دھکا دے دیتا، یا پھر کم از کم کسٹم والوں میں سے تو ضرور وہ کسی ایک کو پیٹ ڈالتا اگر وہ جلدی سے اس کا چہنکارا نہ کر دیتے، اچھا ہوا، مٹرینڈ روڈ کے سرے تک اُس کو غصہ چڑھا رہا ورنہ سٹیشن تک جانے کے لئے کسی رکشا والے کو آواز دے دیتا ——— اور خواہ مخواہ روپے بارہ آنے کا نقصان ہو جاتا، وہ اپنی نسل میں ٹرنک دباتے جا رہا تھا۔

مٹرینڈ روڈ پر پہنچ کر اُس کو ایک بنگالی بابو نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں سفید کھدر کی دھوتی کا ایک کنارہ، جسم چادروں کی بادی سے لپٹا ہوا، کندھوں پر سر کی بجائے فٹ بال، ساجا اُس کے پاس چلا گیا۔

"یہ سڑک کہاں جاتی ہے بابو جی؟"

"آپ کو کہ مرجانے کو مانگتا مسٹر؟"

"سٹیشن؟"

"یہ سڑک تمہارے کو ہاوڑہ برج لے جائیگا برج کا دوسرا سائڈ ہاوڑا سٹیشن ملے گا۔"

ساجے نے سوچا کہ اگر وہ پانچ جماعتیں نہ پڑھا ہوتا تو اس بنگالی بابو کی طرح اُردو بولتا، اور فیر ۴۸ ۹ کس طرح اردو کی ٹکھنا پڑتا کرتا تھا۔ "ہم نے تمہارے کو بولیا ہاوے تان پھر کٹ کٹ کے مہتھان میں چھالے پڑ گئے نے۔ اللہ نے تیرے کو عجداری دی ہے۔ گرائیں ہو کے بھی آپ ہمارے لوگاں دا کھیال نہ رکھوں گا ناں ــــ۔"

نمبر ۴۸ ۹ بھی جملہ کے ضلع کا رہنے والا تھا۔ بے چارہ اُن پڑھ، ساجا بھی اگر اُن پڑھ ہوتا تو وہ قیدیوں کا جمعدار نہ بن سکتا۔ اور گرفتار ہونے پر اپنے آپ کو سراج الدین ولد معراج الدین نہ لکھواتا۔ بلکہ ساجا دلدار ساجا لکھواتا وہ زہریلی ہنسی والا تھا نیدار۔ ساجے کو کئی دفعہ خیال آیا کہ تھانیدار کا بھی خاتمہ کر ڈالے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ انگریزی سے ڈر کر پانچویں جماعت سے نہ بھاگ اُٹھتا جس طرح وہ قلی اس کے مُکّے سے ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ بھاگ گیا نہیں تو وہ اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ ڈالتا۔ اور پھر وہی پورس۔ پھر وہی چودہ سال یا شاید پھانسی لیکن پھانسی کیوں ہوتی اگر وہ پانچویں جماعت سے نہ بھاگا ہوتا۔ شاید وہ تھانیدار ہو جاتا۔ یا کم از کم سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے انگریزی کے ان اشتہاروں کو تو پڑھ سکتا۔ چودہ سال پہلے جب وہ قیدیوں کی بندلاری میں اس سڑک سے گذرا تھا تو اُسے یہ خیال نہ تھا کہ یہ سڑک اتنی لمبی اور وسیع ہو گی۔ اور ڈم گٹ پر وہ جہازوں اور کرینوں کو دیکھ کر یہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک طویل عرصے کے لئے اپنے عزیز وطن کو چھوڑ رہا ہے۔ جہاز، کرینیں، سمندر اور انڈمان۔

چاند پال گھاٹ کے سامنے پہنچ کر اُس نے دم لینے کے لئے اپنے ٹرنک کو فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ اپنی نئی سفید پگڑی سے اپنے منہ اور گردن سے پسینہ پونچھا۔ سامنے کی دوکان سے دو آنے کے چنے مول لئے۔ میونسپلٹی کے ایک نلکے پر پانی پینے کے لئے چلا گیا۔ جب وہ ہاتھ دھو کر پانی پینے کے لئے جھکا تو یکایک اُس کو کچھ فاصلے پر ایک رکشا جاتی دکھائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ رکشا والے کا پیچھے کی طرف سے تین چوتھائی حصہ نظر آ رہا تھا۔ ساجا پانی کو بھول کر رکشا والے کو غور سے دیکھنے کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن رکشا ریڈ روڈ کی طرف مڑ گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو کہا نہیں ــ نہیں۔

پانی پینے کے بعد اُس کو معلوم ہوا کہ اسٹیشن ابھی دور ہے۔ اس کی دبی دبی مسرت پر بوجھ کا ایک ہلکا سا چھلکا آ گیا۔ اُس نے

محسوس کیا کہ اب وہ ٹرنک کے بوجھ کو نہیں اٹھا سکے گا۔ اُس نے ایک رکشا والے کو بلایا۔ اپنا ٹرنک اُس میں رکھ دیا اور خود اُس میں بیٹھ کر بولا "ہوڑہ اسٹیشن"۔

تمام رستے اُس کو اپنے دل پر ایک غیر معلوم وزن کا احساس رہا۔

ہاوڑا برج پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ پنجاب میل روانہ ہو چکی ہے۔ ساجے نے ہگلی کی لہروں کی طرف دیکھا۔ ہگلی ساجے کی زندگی کے گھنے جنگل میں سے خاموشی کے ساتھ بہی جا رہی تھی۔

اُس نے رکشا والے کو کہا۔ "مجھے یہیں اتار دے"

رکشا والے نے ٹرنک پُل کے ایک کنارے رکھتے ہوئے پوچھا۔ "رات کو کدھر سونے گا، دادا؟" ساجے نے اُس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ رکشا والے نے رکشا کا کرایہ لیتے ہوئے رازدارانہ انداز میں پھر کہا "ہم بتائیں گا؟"

ساجے نے انڈمان میں کلکتے کے رکشا والوں کی بابت بہت کچھ سنا ہوا تھا۔ اُس نے ایک دفعہ حقارت سے رکشا والے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ٹرنک پر جا کر بیٹھ گیا۔ رکشا والا چلا گیا۔

سامنے ہگلی پر نیا پُل بن رہا تھا۔ کتنا مشکل کام ہے پُل بنانا۔ حضرت صاحب دریا کا طاس بہت چوڑا ہو۔ اُس پانی میں ستونوں کی بنیادیں کھوکھلی کرتا رہے گا۔ پُل پرانے ہو جایا کرینگے۔ اُن کی جگہ نئے پل بنا کرینگے۔ وہ سامنے ہگلی پر نیا پُل بھی پرانا ہو جائیگا ——

پھر اس کی جگہ ایک اور نیا پل بنانا پڑے گا۔ کیا اس نئے پل پر بھی ساجا بیٹھے گا؟ لیکن ساجا اپنے لئے خود ایک نیا پل کیوں نہیں بناتا۔ اُس کی زندگی کی بنجر زمین میں سے بھی تو ہگلی گذرتی ہے۔ اس ہگلی نے اس کی زندگی کی بنجر زمین کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے ان دو رافتادہ حصّوں کو ملانے کے لئے ایک نئے پُل کی ضرورت ہے اور ساجا ہگلی پر بننے والے نئے پل کی طرف دیکھتا رہا۔

آسمان پر شام کی شفق چھا گئی۔ بادلوں کی سُرخی نے ہگلی کے پانی پر سُرخی چھڑک دی۔ ساجے نے دیکھا کہ ہگلی میں خون بہا جا رہا ہے خالص انسانی خون۔ وہی خون جس نے آج سے پندرہ سال پہلے اس کے کنوئیں کی منڈیر کو رنگ دیا تھا۔ اور جس نے کنوئیں کی منڈیر سے بہہ کر کھیتوں کی طرف جانے والے پانی کو ہگلی کے پانی کی طرح سُرخ کر دیا تھا۔ گووند کا خون اور گووند کے باپ کا خون، گووند جو کلکتہ سے کبھی کبھی گاؤں میں آ کر، سوٹ بوٹ پہن کر لوگوں کو کہا کرتا تھا کہ وہ اس کو گووند کی بجائے گوبند رام وما کہا کریں۔ گووند جو گاؤں کی بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو کلکتہ کے خواب دکھا کر ان کو اکثر اپنے ساتھ بھگا لے جاتا تھا جو ساجے کے کنوئیں پر ہر روز اُس وقت نہانے کے لئے آیا کرتا تھا۔ جب ساجے کی نوجوان خوبصورت بیوی، دادو، ساجے کے لئے کھانا لے کر آتی تھی۔ ساجا اُس کی حرکت کو خوب سمجھتا تھا۔ لیکن گاؤں میں کوئی کسی کو اپنے کنوئیں پر نہانے سے منع نہیں کر سکتا۔ پھر جب ایک دن دادو کھیا اس کے کھیت کے پاس غصّے اور گھبراہٹ سے ہانپتی ہوئی دوڑی دوڑی آئی اور ساجے کو کہنے لگی۔ "گووند مجھے کہتا ہے میرے ساتھ کلکتہ چلو" تو ساجے کے آتش فشاں پہاڑ کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ اس وقت ایک کلہاڑی سے اپنے کھیت کی باڑ کے چھدرے حصّوں میں کیکر کی جھنکیں لگا رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح کنوئیں کی طرف بھاگا۔ پہلا وار گووند کے سر کے پاس سے ہو کر اُس کے کندھے میں آ لگا۔ دوسرے وار کے وقت گووند لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گر رہا تھا۔ اس لئے کلہاڑی اُس کے کولھے میں گر گئی۔ تیسرے وار کے وقت گووند کا باپ درمیان میں آ گیا۔ پہلی ہی ضرب اس پر اتنی کاری پڑی کہ اس کی گردن ایک طرف کو لٹک گئی اور وہ سیر سے گرے ہوئے گووند پر اوندھا گر پڑا۔

اس کے بعد کی دو ضربیں بھی گووند کے بجائے گووند کے باپ پر ہی پڑیں۔ اس کے بھائیوں کے لوگ، وہ زہریلی ہنسی والا تھانیدار، مقدمہ، پھر چودہ سال کی قید۔ کالے پانی کو جاتے وقت جب اس نے اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو اُس نے کہا۔

"مجھے آپ لوگوں کے آنسوؤں کا افسوس نہیں۔ اس بات کا افسوس ہے کہ جس کو میں مارنا چاہتا تھا وہ بچ گیا اور جس کو میں مارنا نہیں چاہتا تھا، وہ مر گیا۔ گورو بچ گیا۔ گورو کا باپ مر گیا" جب اُس نے داورو کی سسکیاں سنیں تو اُس نے کہا:۔

"داورو! چودہ سال کوئی بڑی بات نہیں۔ میرا انتظار کرنا" اور پھر جب اپنی دو تین سال کی بہن نوری کی طرف دیکھا جو سب کو روتا دیکھ کر چیخیں مار مار کر وہ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ میں بھی ساتھ جاؤں گی" تو اُس کے دل کے کسی کونے میں پہلی دفعہ یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید اُس نے غلطی کی ہے۔ اُس نے نوری کو اُٹھا کر گلے سے لگا لیا اور کہا "نوری — نوری — نوری" اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہمگل کی لہریں شاید اُن آنسوؤں کو نہ دیکھ سکی ہوں۔ کیونکہ شفق کی سُرخی سلیٹی ہو کر سیاہی مائل ہو گئی گورو اور گورو کے باپ کا خون بھی دیتک کنوئیں کی منڈیر پر جمع رہنے کی وجہ سے شام کے وقت سلیٹی ہو کر سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی پگڑی کے شملے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور جب اس نے شملے کے اُس حصّہ کو دیکھا، جہاں اُس نے آنسو پونچھے تھے تو اس نے دیکھا کہ اُس کا دل سلیٹی ہو کر سیاہی مائل ہو گیا ہے اور یہ سیاہی شام کی سیاہی کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وہ ڈر گیا کہ کہیں رات نہ آ جائے۔ اُس نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے سایوں کو اپنی پوری قوت سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی اور ایک دفعہ تو وہ ان بڑھتی ہوئی بھیانک تاریکیوں کو چیر کر اپنے گاؤں میں پہنچ گیا جہاں اُس نے اپنے گھر کی دہلیز پر داورو کو اپنی چودہ سال کے انتظار سے پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اُس کو چومنے کے لئے بڑھا لیکن عین بیک پل پر بجلی کے قمقموں کی قطار روشن ہو گئی۔ اُس نے ایک ہارے ہوئے سپاہی کی دلدوز مایوسی کے ساتھ اوپر کو دیکھا اور اُس کو یقین ہو گیا کہ رات آ گئی۔

رکشا والے نے اُسی رازدارانہ لہجے میں کہیں سے آ کر کہا "داورو!"

ساجا چونک گیا اور اس سے پہلے کہ اُس کا دماغ اُس کے معاملے میں دخل دے سکتا اُٹھ کے کھڑا ہو گیا "کہاں لے جاؤ گے؟"

"فرسٹ کلاس پنجابن ہے — مس فیلم — کیا پیارا نام ہے —"

کرائے کی کچھ باتیں ہوئیں اور رکشا چل پڑی۔

ہارلیسن روڈ

گرے سٹریٹ

سونا گچھی

تھوڑی دیر کے بعد رکشا والے نے آ کر کہا "ہم تمہارے کو کیا بولینگے داورو، تم بڑا فلمی ہے، وہ سالہ سنیما جانے کو دیکھتا تھا۔ آؤ۔ آؤ" اور ٹرنک اٹھا کر آگے آگے چل پڑا۔

چودہ سال کے بعد ساجا پہلی دفعہ ایک ایسی رات کے دروازے پر آیا جس کے قفل کی چابیاں اُس کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ رات اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ اُس کے پیروں پر پڑی تھی۔ وہ اس کو ٹھکرا سکتا تھا۔ اچھال سکتا تھا۔ جھنجھوڑ سکتا تھا۔ چاہتا تو قمقموں کی زرد روشنی میں رنگ دیتا۔ چاہتا تو اُس کو اندھیرے کے اتھاہ غار میں دھکیل دیتا۔ اختیار کے اس احساس نے اُس کے جذبات میں آگ لگا دی۔

گندمی رنگ کی ایک پنجابی عورت جس کا سب سے بڑا حسن اُس کی گوندھی ہوئی جوانی تھا۔ اپنے ہوش ربا سینہ کے ساتھ، اپنی بڑی بڑی معصوم آنکھوں کے ساتھ گہرے سبز دوپٹے میں آسمانی رنگ کی ریشمی قمیص میں اور ساٹن کی سفید شلوار میں، اُس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"اندر آجاؤ — کیا سوچتے ہو؟ — اداس ہو؟" —

"نہیں تو"

وہ اُس کو بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ ایک کرسی پر بٹھا دیا — کرسی کے بازو پر بیٹھ کر اُس کی پگڑی کے شملے سے کھیلنے لگی اور پھر ہنس کر اُس کی رانوں پر بیٹھ گئی۔ ساجے میں اختیار کا احساس جاگ اُٹھا۔ اختیار کے اس احساس نے اُس کے جذبات میں آگ لگا دی۔ اور جذبات کی اس آگ نے اس کو بے اختیار کر دیا۔ اُس نے نیلم کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور اپنے ہونٹوں کے انگاروں کو اُس کے گالوں پر رکھ دیا۔ ایک منٹ۔ دو منٹ۔ تین منٹ۔ وہ گھبرا گئی۔ اُس نے ایک دو دفعہ سی سی کی اور پھر یکایک اُوئی اوئی کر کے اُس کے بازوؤں میں سے نکل گئی۔ وہ اُٹھ کر اُس کے پیچھے بھاگا۔ ایک ہاتھ نیلم کی کمر میں چلا گیا، دوسرے ہاتھ نے بجلی کا قمقمہ بجھا دیا۔

کپڑوں کی سرسراہٹ — اور — اور —

پھر روشنی ہو گئی۔ ساجا اپنی گریبان کی قمیص کے بٹن لگا رہا تھا۔ نیلم آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور پریشان بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ دوبارہ میک اَپ کرتے ہوئے اُس نے کہا:

"سنو — ہم سنیما جا رہے ہیں — سیکنڈ شو"

"نہیں نیلم، میں تمہیں نہیں جانے دوں گا"

"میری سہیلی آیا ہی چاہتی ہے۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے"

وہ اُس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور اُس کی بنگالی فیشن میں گندھی ہوئی دو چوٹیوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ کچھ عرصے آئینے کے سامنے وہ اُس کے جسم کے مختلف حصّوں کو سہلاتا رہا، پھر وہ دونوں بستر پر لیٹ گئے۔ اور امریکہ کے ایک رسالہ میں سے ننگی تصویریں دیکھنے لگے۔ ساجے نے انگڑائی لے کر کروٹ بدلی۔ اُس کا بازو بے خودی میں نیم عُریاں سینہ پر چلا گیا۔ رسالہ بستر سے نیچے گر پڑا۔ بجلی کا قمقمہ بجھ گیا اور پھر ایک عرصہ تک پُراسرار خاموشی کے بعد دونوں بستر پر لیٹے لیٹے باتیں کرنے لگے۔

"مجھے اپنا نام بتا دو"

"نام پوچھ کر کیا لو گی کل شام کو جا رہا ہوں"

"کلکتہ میں کیا کرتے ہو؟"

"یہاں تو میں آج ہی آیا ہوں"

"کہاں سے؟"

"کالے پانی سے"

"تم کالے پانی سے آئے ہو؟" —

"ہاں"

"پھر تو تم ساجے کو جانتے ہو گے"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سوال ساجے کے دماغ پر پتھر کی طرح گرا، وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے ارادے پر زور دے کر اپنی حیرت کو تجسّس میں تبدیل کر لیا اور کمرے کا بلب روشن کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں میں ساجے کو جانتا ہوں۔ وہ میرا دوست ہے"

روشنی میں بھی وہ بالوں اور کپڑوں کی پریشان حالت میں اُسی طرح بے حجابانہ بستر پر لیٹی رہی۔ اُس نے اپنے جسم کے اُن حصّوں کو بھی جنہیں آدمیوں سے چھپایا جاتا ہے، چھپانے کی پروا نہیں کی اور کروٹ لے کر اپنی ہتھیلی میں اپنا سر رکھے ہوئے بے پروائی سے باتیں کرتی رہی۔

"پچھلے سال میں اپنے گاؤں میں گئی تھی۔ ساجے کی بہن نزدیک کے گاؤں سے میرے پاس آئی اور مجھے کہنے لگی۔ تم کلکتہ میں رہتی ہو۔ کلکتہ کالے پانی کے پاس ہے۔ کالے پانی میں میرا بھائی رہتا ہے۔ اُس نے پچھلے پانچ سال سے ہمیں کوئی خط نہیں لکھا۔ اگر تم کو وہ کہیں ملے تو اُس کو میرا پیغام دے دینا۔

ساجا بے چینی کے ساتھ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں، وہ بڑا لاپروا ہے۔ اُس نے ضرور ایسا کیا ہوگا اُس نے ضرور کوئی خط نہیں لکھا ہوگا۔"

"اُس نے مجھے کہا کہ اگر تم کو ساجا ملے تو اُس کو بتانا کہ ہمارے ماں باپ غم سے نڈھال ہو کر مر گئے ہیں۔ ہماری ساری زمین بک گئی ہے اُس کی بیوی دادو اُسی گودو کے ساتھ جس کو ساجے نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی، بھاگ گئی ہے ——— گودو کی بابت معلوم ہوا کہ وہ کلکتہ میں کوئی اچھا کاروبار نہیں کرتا۔ وہ وہاں دکشا چلاتا ہے اور بازاری عورتوں کا دھندا کرتا ہے۔ اُس نے دادو کو بھی بازار میں بٹھا دیا ہے ———"

ساجے پر غشی کی سی حالت طاری ہو گئی لیکن زہر کے ان گھونٹوں کو جو ساجے نے پیئے تھے اُس کے چہرے پر ظاہر نہیں ہونا چاہئے اس بازاری عورت کے سامنے اس کو یہ راز فاش نہیں کر دینا چاہئے کہ وہ بدکار عورت اُسی کی بیوی ہے۔ وہ دیوار پر ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔ لیکن اس کو اُس میں اصلی نقوش کی بجائے ریڈ روڈ کی طرف مڑنے والی دکشا دکھائی دی اور ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا ہے "ہاں۔ ہاں ——"

نیلم کی آواز مدھم ہو گئی۔ اُس کے الفاظ بھیگ گئے۔

"——— اُس نے کہا ساجے کو بتانا۔ اب میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ نمبردار کے بچے کھلاتی ہوں۔ گوبر کوڑا اٹھاتی ہوں۔ گالیاں سنتی ہوں مار کھاتی ہوں ———"

ساجا بڑبڑا اُٹھا۔

"نیلم میں جاتا ہوں۔"

"کہاں؟"

"میں ابھی ساجے کو یہ سب باتیں بتا دوں گا۔ میں اُس کو مجبور کر دونگا کہ وہ ابھی، اپنے گاؤں کو چلا جائے۔ اُسے رات ہونے سے پہلے چلا جانا چاہئے تھا وہ مرد کا ہے۔ وہ نہیں جائے گا۔ وہ نہیں جائے گا۔"

نیلم حیران ہو کر بیٹھ گئی اور اپنے کپڑے سنبھالتے ہوئے بولی:

"تو کیا ساجا کلکتہ میں ہے؟"

"ہاں۔"

"تو اُس کو فوراً جا کر کہہ دو کہ وہ اپنے گاؤں کو نہ جائے۔"

ساجے نے ایک لمحہ خاموش حیرت سے نیلم کی طرف دیکھا اور پھر اُسی تیقن کے انداز میں کہا۔

ساجا ضرور اپنے گاؤں کو جائے گا۔ کیا وہ اپنی بہن کی یہ حالت ——

"بلکہ اس کو ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہ بتانا اور اس کو گاؤں تو ہرگز نہ جانے دینا۔"

"کیوں نہ جانے دوں آخر؟"

"اس کا گاؤں کو جانا بے سود ہوگا۔ اس کی بہن اس کو وہاں نہیں ملے گی۔"

"کیوں نہیں ملے گی؟"

"میں اس کی بہن ہوں۔"

ساجے کی کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ اس کا دماغ دھواں بن کر کمرے میں پھیلنا شروع ہو گیا۔ بجلی کی روشنی چھوٹے چھوٹے دھبے بن کر اڑنے لگی۔ اس رنگ برنگ دھندلکے میں اس کو اپنے کالے ٹرنک کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ کالے ٹرنک پر اپنے ہاتھوں میں اپنی کنپٹیاں لے کر بیٹھ گیا۔

نیلم پلنگ کے پاس کھڑی ساجے کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

سیڑھیوں میں سے پیروں کی آہٹ نے ساجے کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ جذبات کے غاروں میں سے نکلنے کی کوشش میں اس کو کچھ راحت محسوس ہوئی۔

"نیلم —— جلدی —— جلدی —— فی —— لم"

اور دوسرے لمحے نیلم کی سہیلی دروازے پر آ گئی۔ ساجے کے زخمی دماغ نے ایک اور تازہ زخم کھایا۔ درد کے رکے ہوئے سیلاب میں بھیگی ہوئی آواز بکھر بکھر آئی۔

"دارو ——"

اور دارو نے دروازے کی چوکھٹ کو مضبوطی سے پکڑ کر گرنے سے بچتے ہوئے حیرت آمیز مردہ لہجے میں کہا۔

"ساجا!"

نیلم فوری بن کر ٹھٹر گئی۔ اس کے رونگٹے اس کے جسم پر دوڑنے لگے۔ اس کے جسم سے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گہرائیوں کی طرف بھاگنے لگے اور جب فوری کو یقین ہو گیا کہ وہ عنقریب کسی بھیانک چٹان سے ٹکرا کر فنا ہو جائے گی تو اس کے خشک۔ گلے اور خشک ہونٹوں سے ایک دل ہلا دینے والی چیخ نکلی۔ اور پلنگ کے بیک سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑی۔

"بھیا —— بھیا —— یہ کیا —— میرے اللہ —— میرے اللہ"

ساجا کالے ٹرنک پر پتھر بن گیا۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کے سامنے انڈمان کے قیدی انسانی دماغوں کے پتھروں کو ہتھوڑوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔ رنگ برنگے دھندلکوں اور روشنی کے چھوٹے دھبوں کے درمیان ہگلی بہہ رہی تھی۔ ہگلی کی طوفانی لہروں پر ایک رکشا والا اپنی رکشا دوڑائے جا رہا تھا۔ نئے ہاوڑا برج کے پاس ایک سمندری جہاز اس رکشا سے ٹکرا کر ڈوب گیا۔ خزاں دیدہ جنگلی کے تمام پتے جھڑ کر ہگلی میں بہہ گئے۔

قرۃ العین حیدر

جلاوطن

سندر لالہ ۔ بھجے دلالہ ۔ ناچے سری ہری کیرتن ہیں ۔

ناچے سری ہری کیرتن ہیں

ناچے

چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھی رام رکھی نہایت انہماک سے چاول صاف کر رہی تھی ۔ اس کے گانے کی آواز دیر تک نیچے گنّو والی سنسان گلی میں گونجتی رہی ۔ پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلیٰ کے چبوترے کی اور سے بڑے پھاٹک کی سمت آتے دکھلائی پڑے ۔

" بندگی بھیّن صاحب ـــــ " رام رکھی نے گھونگھٹ اور زیادہ طویل کر کے آواز لگائی ۔

" بندگی ـــــ بندگی ـــــ " ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے پر بیٹھتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا ۔

" راجی خوشی ہو بھیّن صاحب ـــــ " رام رکھی نے اخلاقاً دریافت کیا ۔

" اور کیا ـــــ مجھے کیا ہوا ہے جو راضی خوشی نہ ہونگا ۔ یہ سوپ ہٹا بیچ میں سے " انھوں نے جھنجھلا کر کہا ۔

" بھیّن صاحب ناج دیکھ رہی تھی ۔ "

" تو ناچ بھٹکنے کے لئے تجھے گاڑی بھر راسنہ چاہیئے ۔ چل ہٹا سب چیز ـــــ "

ڈاکٹر آفتاب رائے نے دنیا بھر کے ڈگریاں تو لے ڈالی تھیں ۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ذری ذری سی بات پر بچوں کی طرح خفا ہو جایا کرتے تھے ۔ رام رکھی پر برستے ہوئے وہ اوپر آئے اور منڈھے پر پیر لٹکا کر انھوں نے اپنی بہن کو آواز دی ـــــ بیجی ـــــ بی ای ای ـــــ جی ای ای ـــــ (چھوڑ اے اب تک مورا بھیّن ـــــ ہیم کرن پیار سے کہا کرتیں) دالان کے آگے کھلی چھت پر نیم کی ڈالیاں منڈیر پر جھکی پھیلا ہوا میں سرسرا رہی تھیں ۔ شام کی گہری کیفیت موسم کی اداسی کے ساتھ ساتھ سارے میں بکھری تھی ۔ دن بھر نیچے مہوا کے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنایا کرتیں ۔ اور ہر چیز پر غنودگی ایسی چھائی رہتی آم اب پیلے ہو چلے تھے ۔ ٹھکرائن کی گیا " میں صبح سے لے رات گئے تک روں

روں کرتا رہٹ چلا کرتا۔

"آؤ بھئی بھٹن صاحب ———" ہم کرن نے والان کا جیل کے نقش و نگار والا کواڑ کھولتے ہوئے غلّے کے گودام میں سے باہر آکر جواب دیا۔ اور کنجوں کا گچھا ... ی کے بلّے میں باندھ کر جن سے پشت پر پھلنگتی ہوئی مینچی میں آگئیں۔

"ہے رام جی کی بھٹن صاحب ———" رسوئے نے چرخے میں سے آواز لگائی ——— "کہئل کی ترکاری کھیئو بھٹن صاحب ———؟"

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور کھیئا بھابی ———" ڈاکٹر آفتاب رائے مونڈھے پر سے ہٹ کر ٹہلتے ہوئے تلسی کے چبوترے کے پاس آگئے۔ مینچی میں رنگ برنگی مورتیاں الگ رام سے لے کر بجرنگ بلی مہاراج تک سیندور سے لپی پتی اور گنگا جل سے نہائی دھوئی قرینے سے سجی تھیں۔ ہیم کرن تھیں تو بڑی سخت رام بھگت لیکن باقی کے سبھی دیوی دیوتاؤں سے سمجھوتہ رکھتی تھیں کہ نہ جانے کون کس سمے آڑے آجائے۔ سب سے بنائے رکھنی چاہیئے ابھی سریر رما کانت کھیل کے میدان سے لوٹیں گے۔ اٹھ بجے کھیا کھنک کے توڑے مسکہ کر بھنا مہاراج کے ہاں سے واپس آئے گی۔ پھر چوکے میں کھانا پروسا جائے گا (پیتل کے برتن ٹھنڈی چاندنی میں جھلملائیں گے۔ نیچے آنگن میں رام کلی کوئی بھجری شروع کر دے گی) یہاں پر بالآخر امن تھا۔ اور سکون۔

اب کیم نیچے کچے گلیارے میں سے چلتی ہوئی اوپر آرہی تھی۔ (ٹھکرائن کی بگیا میں سے ابھی اس نے کرندے اور کرکھیں اور مکوہ توڑ کر جلدی جلدی منہ میں ٹھونسے تھے۔ دھاکر دا دھاکر دا ——— ادے باپ رے۔ اس نے منڈیر پر سے اوپر جھانک کر دہشت سے کہا ——— ماما آئے ہیں۔ بھاگ جا ورنہ ماما مجھے ماریں گے کہ ہر سمے کھیلتی ہے ——— دیبتی بھاگ گئی)

کیم چھت پر آئی۔ لمبے سے ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس، جس پر موتیوں سے خوب تتلیاں اور پھول پتے بنے تھے خوب کھینچ کر بالوں کی مینڈھیاں گوندھے، ہاتھوں میں چنا چن چوڑیاں بجاتی کیم وتی رائے زادہ اپنے اتنے پیارے اور اتنے سندر ماما کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔

"نمستے ماما ——— ابھی کتاب لاتی ہوں بس ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں ——— "

"چل چڑیل ——— بہانے باز ——— سبق سنا پہلے ———" ڈاکٹر آفتاب رائے نے پیار سے کہا (لیکن یہ کچھ تجربہ انہیں تھا کہ اپنے سے کم عمر لوگوں سے اور کنبے برادری والوں سے یہ گھر گرہستی اور لاڈ پیار کے معاملے وہ زیادہ کامیابی سے ادا نہ کر پاتے تھے)

"تجھے تو میں انٹرمیڈیٹ میں بھی حساب دلاؤں گا۔ دیکھتی جا ———" (انھوں نے پھر ماما بننے کی سعی کی)

"ادے باپ رے ———!!" کیم نے مصنوعی خوف کا اظہار کیا۔

"اور تو نے چوڑیاں تو بڑی خوبصورت خریدی ہیں دی ———"

"ہی ہی ہی ——— ماما ———" کیم نے دلی مسرت سے اپنی چوڑیوں کو دیکھا۔

"اور تو ساری بھی تو پہنا کر، کہ فراک ہی پہنے پھرے گی ——— باؤلی سی ———" (انھوں نے اپنی بزرگی کا احساس خود اپنے اوپر طاری کرنا چاہا)

جی ماما ——— کیم کے ذہن میں وہ ساریاں جھما جھم کرتی کوند گئیں۔ جو ماں کے صندوقوں میں ٹھنسی تھیں۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھی کہ کل کی پینتی آج ہی وہ ساریاں پہن ڈالے مگر ہیم کرن ہی پر انگریزیت سوار تھی۔ ایک تو وہ یہ نہیں بھولی تھیں کہ تھیں تو وہ جونپور کے اس ٹھیٹھ دقیانوسی سریواستو گھرانے کی بیٹیا ——— پر ان کا بیاہ ہوا تھا۔ الہ آباد کے اتنے فیشن ایبل کنبے میں جس کے سارے افراد سول لائنز میں رہتے تھے۔ اور جو تے پہنے بہنے کھانا کھاتے تھے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر چاء پانی پیتے تھے۔ اور گو دھوا ہوئے ان کو اب سات

برس ہونے آئے تھے اور تب سے وہ یہیں رہتی تھیں۔ لیکن محلے پر اُن کا رعب تھا۔ کیونکہ وہ الہ آباد کے رئیس زادوں کی بہو تھیں ——— دوسرے یہ کہ یہ فراک کا فیشن ڈاکٹر سین گپتا کے ہاں سے چلا تھا۔ ڈاکٹر سین گپتا ضلع کے سول ہسپتال کے اسسٹنٹ سرجن تھے۔ اور ہسپتال سے حق ان کے پیلے رنگ کے اجاڑ سے مکان کے سامنے ان کی پانچوں بیٹیاں رنگ برنگے فراک پہنے دن بھر اودھم مچایا کرتیں۔ شام ہوتی تو آگے آگے ڈاکٹر سین گپتا دھوتی کا پلّا نہایت نفاست سے ایک انگلی میں سنبھالے، ذرا پیچھے اُن کی بی بی سُرخ کنارے والی سفید ساری پہنے، پھر پانچوں کی پانچوں لڑکیاں سیدھے سیدھے بالی کندھوں پر بکھرائے چلی جا رہی ہیں۔ ہوا خوری کرنے۔ افوہ۔ کیا ٹھکانہ تھا بھلا۔ بس سر منگالی گھرانے میں یہ لڑکیوں کی فوج دیکھ لو۔ ہیم کرن کو ڈاکٹر سین گپتا سے بڑی ہمدردی تھی۔ کیمیم کی ان سب سے بہت گھٹتی تھی خصوصاً مونیرا سے۔ اور اسکول کے ڈرامے کے دنوں میں تو بس کیمیم اور مونیرا ہی سب پر چھائی رہتیں۔ کیا کیا ڈرامے مہادیوی کنیا پاٹھ شالہ نے نہ کر ڈالے ——— نل دمینتی" ——— اور "شکنتلا ہریش چندر" اور "راج رانی میرا ——" اور اوپر سے ڈانس الگ ——— گربا بھی ہو رہا ہے کہ آتے رہے گنگا پار تیرے جمنا بیچ میں ٹھاڑے ہیں نند لال ——— اور آپ کا خدا بھلا کرے رادھا کرشنا ڈانس بھی لیجئے کہ میں تو گردھر آگے ناچوں گی ——— جی ہاں۔ اور وہ گگری والا ناچ بھی موجود ہے کہ چلو چلو سکھی سکھیاری دی چلو پنگھٹ بھروا پانی ——— اور سانولا سا مونیرا سین گپتا ہے کہ فراٹے سے ہارمونیم بجا رہی ہے۔

ایسے ہونے کو تو مسلمانوں کا بھی ایک اسکول تھا۔ انجمن اسلام گرلز اسکول ——— وہاں یہ سب ٹھاٹھ کہاں۔ بس بارہ وفات کی بارہ وفات میلاد شریف ہو جایا کرتا اور اس میں کھڑے ہو کر لڑکیوں نے خاص بے سُری آوازوں میں پڑھ دیا۔

تم ہی فخرِ انبیا ہو۔ یا نبی سلام علیکا ——— چلئے قصہ ختم۔ ایک مرتبہ ایک سر پھری ہیڈ مسٹرس تو جونئی نئی لکھنؤ سے آئی تھی۔ "دروپ متی باز بہادر" خواتین کے سالانہ جلسے میں اسٹیج کروا دیا تو جناب حالی لوگوں نے اسکول کے پھاٹک پر پکٹنگ کر ڈالی ——— اور روزنامہ صدائے حق نے پہلے صفحے پر جلی حروف میں شائع کیا:۔

ملت اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ ———

گرلز اسکول کے اسٹیج پر نکل گیا۔

مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہوگا ——— بنات اسلام کو رقص و سرود کی تعلیم ——— اسکول کو بند کرو ———

وہ سب قصے کیمیم کی مسلمان سہیلی کشوری اسے سنایا کرتی تھی جو پڑوس میں رہتی تھی۔ صدرِ اعلیٰ کے چبوترے کے آگے والے مکان میں۔ وہ اسلامیہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا بڑا بھائی اصغر عباس، مرین اور رما کانت کے ساتھ ہی کیمبرج آیا کرتا تھا۔ ویسے پڑھتے وہ لوگ بھی الگ الگ تھے۔ مرین اور رما کانت ڈی اے وی کالج میں تھے۔ اصغر عباس فیض الاسلام کنگ جارج انٹر کالج میں۔

"کیوں۔ سی ——— ایف اے کرنے کہاں جائے گی۔ جولائی آ رہی ہے۔ بنارس جائے گی یا لکھنؤ ———؟" ڈاکٹر آفتاب رائے نے چوکے میں بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

اب یہ ایک ایسا ٹیڑھا اور اچانک سوال تھا جس کا جواب دینے کے لئے کیمیم وقتی ہرگز تیار نہ تھی۔ دونوں جگہوں سے متعلق اسے کافی انفرمیشن حاصل تھی۔ لیکن دو ٹوک فیصلہ وہ فی الحال کسی ایک کے حق میں نہ کر سکتی تھی۔ بنارس میں ایک تو یہ کہ چوڑیاں بہت عمدہ ملتی تھیں۔ لیکن لکھنؤ کو بھی بہت سی باتوں میں فوقیت حاصل تھی۔ مثلاً سینما تھے۔ اور دس سینماؤں کا ایک سینما تو خود مہادیو دیالہ تھا۔ جہاں اُسے بھیجنے کا مذکرہ ماما نے کیا تھا۔ پردہ غالباً اسے بہر صورت ہر جگہ کرنا تھا۔ تانگے پر پردہ یہاں بھی ہیم کرن اپنے اور اس کے لئے بندھوا تی تھیں۔ اور ماما جو اتنا بڑا ڈنڈا لئے سر پہ موجود تھے۔

برہ ماما اس کے آج تک پتے نہ پڑے۔ ولایت سے اُن گنت ڈگریاں لے آئے تھے۔ یونیورسٹی میں پروفیسری کرتے تھے۔ تاریخ پہ کتابیں لکھتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چوں چوں کا مربّہ تھے کیمیم کے ماما۔

رہے رما کانت اور ہمرین۔ تو رما کانت تو شاعر آدمی تھا۔ سارے مقامی شاعروں میں جا کر دو غزلے سہ غزلے پڑھ ڈالتا۔ اور حضرت ناشاد جونپوری کے نام نامی سے یاد کیا جاتا۔ ہمرین اس کے برعکس بالکل انجنیئر تھا اس سال وہ بھی انٹر کر کے بنارس انجنیئرنگ کالج چلا جائے گا۔ باقی کے سارے کنبے برادری کے بہن بھائی یونہی بگڑے اس تھے۔ اس سلسلے میں اس کی گوئیاں کشوری یعنی کشور آرا بیگم کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ اس کے بشمبھر رشتے کے بھائی تھے۔ اور سب ایک سے ایک سورما۔ یہاں کسی کے سورما پنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کسی نے آج تک اس سے یہ نہ کہا کہ چل کیمیم تجھے سرکس یا نوٹنکی ہی دکھلا لاویں ——— نوٹنکی کے دنوں میں رسوّیا تک لہک لہک کر گاتا ——— اب یہی ہے میں نے ٹھانی ——— لاؤں گا نوٹن کی رانی ———) کہاں کشوری کے ماجد بھائی ہیں تو اس کے لئے لکھنؤ سے چوڑیاں لئے چلے آتے ہیں۔ اکرام بھائی ہیں تو کشوری ان کے لئے جھپا جھپ پُل اوور بُن رہی ہے۔ اشفاق بھائی ہیں تو کشوری کو بیٹھے انگریزی شاعری پڑھا رہے ہیں۔ ان بھائیوں اور کیمیم کے بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں کی چوڑیاں اور پُل اوور۔ یہاں تو جوتیوں میں دال بٹتی تھی۔

ہیم کر ن کو گھر کے کام دھندوں ہی سے فرصت نہ ملتی۔ آفتاب رائے ان کے لئے بڑا سہارا تھے۔ وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے لکھنؤ سے آکر مل جاتے۔ رہنے والے ان کے بھتیجے صاحب جونپور ہی کے تھے۔ پر یہاں اُن کی کسی سے ملاقات نہ تھی۔ ضلع کے رؤسا اور مقامی عمائدین شہر" میں ان کا شمار تھا۔ پر آپ کا خیال اگر یہ ہے کہ ڈاکٹر آفتاب رائے جون پور کے اُن معززین کے ساتھ اپنا وقت خراب کریں گے تو آپ غلطی پر ہیں حکام سے اُن کی کبھی نہ بنی۔ اسٹکچوئل آدمی تھے۔ ان سول سروس اور پولیس والوں سے کیا دماغ سوری کرتے۔ جگن ناتھ جین آئی سی ایس جب نیا نیا حاکم ضلع ہو کر آیا تو اُس نے کئی بار ان کو کلب میں بلا بھیجا۔ پر یہ ہرگز نہ گئے۔ رئیس الدین کاظمی ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج نے دعوت کی۔ اس میں بھی نہ پہنچے۔ اور تو اور ولایت واپس جاتے وقت مسٹر چارلس مارٹن نے کہ بُن دکٹر یہ گورنمنٹ انٹر کالج کی پرنسپل شپ پیش کی۔ لیکن کیمیم کے ماما نے اُسے بھی رد کر دیا۔ یوں تو خیر کانگریسی ہونا کوئی خاص بات نہیں۔ شہر اور قصبہ جات کا ہر ہندو جو سرکاری ملازم نہ تھا۔ گھر پر ترنگا لگاتا تھا۔ اور ہر مسلمان کے اپنے وسیع مشغلے تھے۔ احرار پارٹی تھی۔ شیعہ کانفرنس تھی۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی میں مسلمان بھرتی ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کا تو خیر اس وقت کسی نے نام بھی نہ سنا تھا۔ پر بہت سے مسلمان اگر انصاف کی پیچھے تو کچھ بھی نہ تھے یا تھے شاعری کرتے تھے۔ یا مجلسیں پڑھتے تھے۔

تو کہنے کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی فتنہ پسندانہ بات نہ تھی۔ پر ڈاکٹر آفتاب رائے کی زیادہ تر لوگوں سے کبھی نہ پٹی۔ اے صاحب یہاں تک سنا گیا ہے کہ تری لوہ کانگریس کے مرتع پر انھوں نے سب کو کھری کھری سنا دیں۔ گو یہ راوی کو یاد نہیں کہ انھوں نے کیا کہا تھا۔

ضلع کی سوسائٹی جن عناصر پر مشتمل تھی۔ انھیں سے ڈاکٹر آفتاب رائے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وسط شہر میں مہاجنوں، ساہوکاروں اور زمیندار وں کی اونچی حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ سرکاری فنڈوں میں ہزاروں روپیہ چندہ دیتے۔ اسکول کھلواتے، مجرے اور مشاعرے اور دنگل کرواتے۔ جلسے جلوس اور سرپرستی بھی ان ہی کی زیر سرپرستی منعقد ہوتے۔ ہندو مسلمانوں کا معاشرہ بالکل ایک تھا۔ وہی تیج تہوار۔ میلے ٹھیلے۔ محرم والے عموں کی برات۔ پھر اُس سے اونچی سطح پر وہی مقدمے بازیاں۔ موکل۔ گواہ۔ پیشکار۔ منشی۔ عدالتیں۔ صاحب لوگوں کے لئے ڈالیاں۔ شہر کے باہر ضلع کا ہسپتال تھا۔ لق و دق ہری گھاس کے میدانوں میں بکھری ہوئی اداس پیلے رنگ کی عمارتیں۔ کچے احاطے۔ نیم کے درختوں کی جھاؤں میں آؤٹ ڈور، مریضوں کے ہجوم۔ گرد آلود بگھیوں کے اڈے۔ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے دوا دارو دینے والے بہت بڑے اور شکستہ حال منشی، جو دھاگوں والی عینکیں لگائے دھندلی آنکھوں سے راہگیروں کو دیکھتے۔ پھر گلیاں تھیں جن کے

گھوں کے فرش پہ پانی بہتا تھا۔ سپاہی مائل دیواروں پر کوئلے سے اشتہار لکھتے تھے ——— حکیم مارکہ دھاگہ خریدیے۔ پری پرانڈ بیڑی پیجیے ایک پیسہ باپ سے لو ——— چار جا کر ماں کو دو ——— آگیا۔ آگیا۔ آگیا ——— سال رواں کا سنسنی خیز فلم "لری راجہ" آگیا جس میں مشن ماسٹوری کام کرتی ہے ———

پھر سایہ دار سڑکوں کے پہلے آم اور مولسری میں چھپی ہوئی حکام ضلع کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ انگریزی کلب تھا۔ جس میں بے اندازہ خنکی ہوتی۔ چپ چاپ اور سائے کی طرح چلتے ہوئے مؤدب اور شائستہ "بیرے" انگریز اور کالے صاحب لوگوں کے لئے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور برف کی بالٹیاں لا کر گھاس پر رکھتے، نیلے پردوں کی قناتوں کے پیچھے ٹینس کی گیندیں سبزے پر لڑھکتی رہتیں۔

(۲)

اور رسول لائنز کی اس دنیا میں اوپر سے آئی کنول کماری جین جگن ناتھ جین آئی سی ایس کی بارہ کٹی جیوی جس نے لکھنؤ کے مشہور انگریزی کالج از ابلا تھوبرن جین میں پڑھا تھا اور جو گیند بلا کھیلتی تھی۔ کلب میں بڑی چہل پہل ہو گئی ——— گنتی کی کل تین تو میمیں ہی تھیں کلب میں۔ کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کے انگریز پرنسپل کی میم ایک۔ زنانہ ہسپتال کی بڑی ڈاکٹرنی میم مس مک کنزی دو۔ اور اے پی مشن گرلز ہائی اسکول کی بڑی استانی مس سالفرڈ جو چن چنیا میم کہلاتی تھی کہ نوکروں پر چلاتی بہت تھی۔ ان تین کے علاوہ ڈاکٹرنی میم کی چھوٹی بہن مس اولیو مک کنزی تھی۔ جو اپنی بہن سے ملنے نینی تال سے آئی ہوئی تھی۔ اور ضلع کے غیر شادی شدہ حکام کے ساتھ ٹینس کھیلنا اس کا خاص مشغلہ تھا اور اس میں ایسا کچھ اس کا جی لگا تھا کہ اب واپس جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ کلب میں آن موجود ہوتی اور وہے مسٹر سکسینہ اور وے مسٹر فرحت علی۔ اور وے مسٹر پانڈے۔ سبھی تو اس کے چاروں طرف کھڑے دانت نکوسے ہنس رہے ہیں۔ اس ایک رسیا نے بھائی لوگوں کو تنگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ یا قیامۂ حضرات بھی کہتے تھے کہ میاں کیا مضائقہ ہے۔ جو پور ایسی ڈل جگہ پر مس مک کنزی کا دم دوی غنیمت جانو۔ اب غور کرنے کا مقام ہے کہ مس شبیرہ حمایت علی جو دوسری لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ ان کا تو نام سن کر ہی جی بیٹھ جاتا تھا۔ مگر وہ خود بچاری بڑی اسپورٹنگ آدمی تھیں۔ برابر جی داری سے ٹینس کھیلنے آیا کرتیں۔ لکھنؤ کے گنگ جارجز کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لندن جا کر ایک ڈپلومائی مار لائی تھیں لیکن کیا مجال جو کبھی بد دماغی دکھلا جاویں۔ لوگ کہتے تھے۔ صاحب بڑی شریف ڈاکٹرنی ہے۔ بالکل گائے سمجھئے گائے۔ جی ہاں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ یہ توقع کریں کہ ہر لیڈی ڈاکٹر افسانوں اور ناولوں کی روایت کے مطابق بالکل حور شمائل، مہ وش، پری پیکر ہو۔ اچھی آدمی کا بچہ تھیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ڈسٹرکٹ جج مسٹر کاظمی کی بیگم صاحب نے مسٹر فرحت علی سے تجویز بھی کی تھی۔ کہ بھیا آزادی کا زمانہ ہے مس شبیرہ ہی سے بیاہ کر لو۔ یہ جو سال کے سال چھٹیوں میں تمہاری اماں تمہیں لڑکیاں دکھانے کے لئے نینی تال مسوری بھیجا کرتی ہیں۔ اس دردِ سر سے بھی نجات ملے گی اور کیا۔

مادی کہتا ہے کہ فرحت علی نے جس آن دنوں بڑے مزے کے سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ بیگم کاظمی کے سامنے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کی تھی۔ اور تھرتھر کانپا تھا۔ اور دست بستہ یوں گویا ہوا تھا کہ آئندہ وہ مس شبیرہ حمایت سے جو گفتگو کرے گا۔ وہ صرف چار جملوں پر مشتمل ہو گی ——— آداب عرض۔ آپ اچھی طرح سے ہیں؟ جی ہاں میں بالکل اچھی طرح ہوں شکریہ۔ آداب عرض۔

مصیبت یہ تھی کہ جہاں کسی شامت کے مارے نے کسی "غیر مشکک" خاتون محترم سے معمولی گفتگو کے دوران میں ان چار جملوں سے تجاوز کیا تو بس سمجھ لیجئے کیچوٹی ہو گئی۔

تو غرضیکہ مادی دیوا کہ یوں کوزے میں بند کرتا ہے کہ کنول کماری کے میاں کا تقرر اس جگہ پر ہوا۔ انگریز حاکموں کی اصطلاح میں ضوبے

کا ضلع "اسٹیشن" کہلاتا تھا)

اور نئے حاکم ضلع کے اعزاز میں کنور رنجن داس رئیسِ اعظم چنپور نے (کہ یہ سارا کا سارا ایک نام تھا) اپنے باغ میں بڑی دھوم کی دعوت کی۔ چبوترے پر زرنار شامیانہ تانا گیا۔ رات گئے تک جلسہ رہا۔ بیبیوں کے لئے اندر علیحدہ دعوت تھی۔ مصرانیوں نے کیا کیا کھانے نہ بنائے۔ مہمانوں کے لئے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے باورچی بلوائے گئے تھے (باؤلے ڈپٹیوں کا ایک خاندان تھا۔ جس میں عرصہ ہوا ایک ڈپٹی صاحب کا دماغ چل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ پورا خاندان باؤلے ڈپٹیوں کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ کہار آواز لگاتے۔ اجی باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے سواریاں آئی ہیں اترواکر مہریوں سے کہا جاتا ارے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں نیوتہ دینا (آناری رام رکھی جھاڑو دینا)

ہیم کرن ایسے تو کہیں آتی جاتی نہ تھیں۔ پر رانی رنجن داس کی زبردستی پر وہ بھی دعوت میں آگئی تھیں۔ کلکٹر کی بیوی اسے ملنے کیلئے، محامدین شہر کی بیویوں نے کیا کیا جوڑے نہ پہنے تھے۔ لیکن جب خود کنول کماری کو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو پوری میم ہے۔ غضب خدا کا ہاتھوں میں چوڑیاں تک نہ تھیں۔ ناک کی کیل تو گئی چولھے بھاڑ میں ہلکے نیلے رنگ کی ساری سی پہنے گاؤ تکیے سے ذرا ہٹ کر بیٹھی وہ سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔

رولے رو بیٹھا تم نے تو سہاگ کی نشانی ہی کو جھاڑو پیٹے فیشن کی بھینٹ کر دیا" صدر اعلیٰ کی بیگم نے ناک پہ انگلی رکھ کر اس سے کہا۔

"ہے ہاں سچ تو ہے۔ کیا ڈنڈا ایسے ہاتھ لئے بیٹھی ہو۔ دور پار چھائیں پھوئیں دیکھے ہی سے ہول آتا ہے" بیگم کاظمی نے بھی حامی بھر دیا۔

ہیم کی تو بہر حال، آج عید تھی۔ اس نے تیز جامنی رنگ کی بنارسی ساری باندھی تھی۔ پاؤں میں رام جھول پہنے تھے۔ سونے کی کرد ھنی اور دوسرے سارے گہنے باتے علیحدہ کندن کا چھپکا اور مخمل کشمیری ہی پہن آئی تھی۔ لیکن کشمیری کی اماں (جو محلے میں بڑی بھاوج کے نام سے یاد کی جاتی تھیں) بن بیاہی لڑکیوں کے زیادہ سنگار پٹار کی قطعی قائل نہ تھیں۔ ان کے یہاں تو لڑکیاں باکیاں مانگ تک بالوں میں نہ کاڑھ سکتی تھیں۔ پر اب زمانے کی ہوا کے زیر اثر نئی پود کی لڑکیوں نے سیدھی اور آڑی مانگیں کاڑھنی شروع کر دی تھیں۔ ہیم دور سے بیٹھی کنول کماری کو دیکھتی رہیں۔ کتنی سندر ہے۔ اور پھر ایم اے پاس۔ ایم اے پاس لڑکی ہیم اور کشوری کی نظروں میں بالکل دیوی دیوتا کا درجہ رکھتی تھی۔

کنول کماری جن ساری مہمان بیبیوں سے ہنس ہنس کر سخت خوش اخلاقی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھی (اور ساری حاضرات محفل نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی کلکٹر کی بیوی اس چڑیل مسز بھارگو سے کہیں زیادہ اچھی اور ملنسار ہے رانی بٹیا ہے بالکل)

دالان کے گملوں کی اوٹ میں ہیم اور کشوری بیٹھی تھیں۔ اور منٹ منٹ پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھیں۔ اب ایک بات ہو تو بتلائی جائے۔ دسیوں تھیں۔ مثلاً موٹی مصرانی کی چال ہی دیکھ لو۔ اور اوپر سے کنور رنجن داس صاحب خانہ کی اسٹیٹ کے منیجر صاحب لالہ گنیش جی بار بار ڈیوڑھی میں آن کر للکارتے ——— "اجی پردہ کرو لوگ ادھر آرہے ہیں" تو ان کے حلق میں ایسی آواز نکلتی جیسے ہارمونیم کے پردوں کو برساتی ہوا مار گئی ہو۔

اب کے سے جب ماما مکنو سے گھر آئے تو ہیم نے دعوت کی ساری داستان ان کے گوش گزار کر دی کنول کماری ایسی۔ اور کنول کماری ویسی ماما چکے بیٹھے سنتے رہے۔

(۳)

ہیم جب رات کا کھانا کھا کر سونے چلی گئی۔ اور سارے گھر میں خاموشی چھا گئی تو ڈاکٹر آفتاب رائے چھت کی منڈیر پہ آکر کھڑے ہو گئے باغ، جب سنسان پڑے تھے۔ گرمیوں کا موسم نکلتا جا رہا تھا۔ اور گلابی جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ پروائی ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ نیچے

ٹھمکیائن کی بگیا والی گلی کے برابر سے مسلمانوں کا محلہ شروع ہوتا تھا۔ اس کے بعد بازار تھا۔ جس میں مدھم گیس اور لالٹین کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پھر پولس لائنز کے میدان تھے۔ اس کے بعد کچہری اور سول لائنز۔

سول لائنز میں حاکم ضلع کی بڑی کوٹھی تھی۔ جس پر یونین جیک جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں بڑے سکون سے لہرا رہا تھا۔ سائے میں پنکھی ہوئی خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سلطان حسین شرقی کے زمانے کے اونچے پھاٹک اور مسجدوں کے بلند مینار رات کے آسمان کے نیچے سات سو سال سے اسی طرح ساکت اور صامت کھڑے تھے۔ زندگی میں بے کیفی تھی۔ اداسی۔ اور ذلت تھی۔ اور شدید غلامی کا احساس تھا۔

عمر بھر آفتاب رائے نے یونہی سوچا تھا کہ اب وہ اور کچھ نہ کریں گے۔ لیکن دُنیا موجود تھی۔ وہ کام بھی کرتے۔ کھانا بھی کھاتے۔ سال میں چار دفعہ جون پور آکر جی جی سے دماغ سوزی بھی کرتے۔ زندگی کے بھاری پن کے باوجود گاڑی تھی کہ چلے جا رہی تھی۔

کنول کماری اس منظر کے پرے، موسری کے جھنڈ کے دوسری طرف یونین جیک کے سائے میں برجی تھی۔ بہت سے رنگ میں کہ جو راستہ سوچا اختیار کر لیا۔ آرام سے اس پر چلتے چلے گئے۔ یہاں کسی راستے کا تعین ہی نہ ہو پاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک شب اِدھر اُدھر نکل گئے تھے۔

آفتاب رائے وہیں کے وہیں تھے۔

کنول کماری ——— ؟ لاحول ولا قوۃ۔

جب وہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لئے ولایت جا رہے تھے تو کنول نے اُن سے کہا تھا: "آفتاب بہادر تم کو اپنے اوپر بڑا مان ہے۔ پردہ مان ایک روز ٹوٹ جائے گا۔ جب میں بھی کہیں چلی جاؤں گی۔"

"تم کہاں چلی جاؤ گی۔ ؟"

"فوہ ——— لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہیں ——— ؟"

"گویا تمہارا مطلب ہے کہ تم بیاہ کرو گی۔ ؟"

"میں خود تھوڑا ہی بیاہ کرتی پھروں گی۔ اے مخلصہ داس میرا بیاہ کر دیا جائے گا۔" اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

"ارے جاؤ ——— آفتاب رائے خوب ہنسے تھے ——— میں اس جھمیلے میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم لڑکیوں کی پسند بھی کیا شے ہے۔ تم جیسی موڈرن لڑکیاں آخر میں پسند اسی کو کرتی ہیں جو ان کے سماجی اور معاشی معیار پر پورا اترتا ہے باقی سب بکواس ہے۔ پسند اضافی چیز ہے تمہارے لئے ———"

"ہاں ——— بالکل اضافی چیز ہے۔ آفتاب بہادر ———" وہ غصے کے مارے بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

وہ چاند باغ میں تھی۔ آپ بادشاہ باغ میں بڑی دھوم دھام سے براجتے تھے یونین کی پریذیڈنٹی کرتے تھے۔ تقریریں گجبارتے تھے۔ ایک منٹ چین سے نہ بیٹھتے تھے۔ تاکہ کنول نوٹس نہ بھی لیتی ہو تو لے۔ وہ لے پی سین روڈ پر رہتی تھی۔ اور سائیکل پر روز چاند باغ آیا کرتی تھی۔ لکھنؤ کی بڑی نمائش ہوئی تو وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ میوزک کانفرنس میں گئی۔ وہاں یونیورسٹی والوں نے سہرگل کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا۔ جس گانے کی فرمائش ہوتی اور چاند باغ کا مجمع فرمائش کرتا۔ وہی سہرگل کو بار بار گانا پڑتا۔ بھائی آفتاب بھی شور مچانے میں پیش پیش۔ لیکن اگلی صف میں کنول کو بیٹھا دیکھ کر فوراً سٹ پٹا کر چپ ہو گئے۔ اور سنجیدگی سے دوستوں سے بولے کہ یار پیچھے ڈکیا ہلڑ مچا رکھا ہے۔ اس پر عزت نے عسکری بڑائی سے کہا تھا آج ان دونوں پیارے دوستوں کو مرے بھی تقریباً عرصہ ہو گیا تھا۔ منڈیر پر کھڑے ہوئے آفتاب رائے کو خیال آیا۔ عزت نے عسکری سے کہا۔ افسوس یہ اپنا آفتاب جو ہے یہ اس لونڈیا پر اچھا امپریشن ڈالنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اب خداوند تعالےٰ ہی اس پر رحم کرے ———

"بی اے کے بعد تم کیا کرو گی ——— ؟" ایک روز آفتاب رائے نے کنول سے سوال کیا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں ———" کنول نے کہا تھا۔ اس میں گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے تو کچھ پتہ نہیں تم ہی کوئی پروگرام بتاؤ۔
لیکن کچھ عرصے بعد وہ سیدھے سیدھے ولایت نکل لئے۔ کیونکہ غالباً اُن کی زندگی ان کے لئے۔ ان کے گھر والوں کے لئے، کنول کے وجود سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ پھر اُن کی آئیڈیالوجی تھی۔ (یار کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ عزت نے ڈپٹ کر کہا تھا)

پر ایک روز، لندن میں، جب وہ سینٹ پاؤلس کی لائبریری سے گھر کی اور جا رہے تھے تو راہ میں انہیں مَیپل نظر آیا جس نے دُور سے آواز لگائی ———" چار مہینے چلو تو ایک واقعۂ فاجعہ گوش گذار کروں۔ کنول کماری کا جگن ناتھ جین سے بیاہ ہو گیا۔ رہی جوسن بتیس کے بیچ کا ہے ———"

لڑکیوں کی عجب بے ہودہ قوم ہے۔ اس روز آفتاب رائے اس نتیجے پر پہنچے "ان کو سمجھنا چاہئے تھا ہے بس کمار دیگ نہیں۔ میاں وہ جو بڑی اٹیچمنٹ سُیل کی سماس بنی پھرتی تھی۔ ہو گئی ہو گی۔ اب گلیڈ ——— جگن ناتھ جین مائی فٹ ——— کون تھا یہ اُلّو ——— میں نے کبھی دیکھا ہے اسے۔؟"
مَیپل کے کمرے میں پہنچ کر آتشدان سلگاتے ہوئے انھوں نے سوال کیا۔
مَیپل رائے زادہ کھڑکی میں جھکا باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ٹھیلے والے کوئلے بھر بھر گلا پھاڑ کر چلاتے رہنے کے بعد اب اپنے اپنے ترکاریوں کے ٹھیلے گھسیٹتے ہوئے سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ شام کا دھندلکا سارے میں بکھر گیا تھا زندگی بڑی اداس ہے اس نے خیال کیا تھا۔ ہاں۔ اس نے آفتاب رائے سے کہا تھا میں نے اسے پٹنے میں دیکھا تھا۔ کالا سا آدمی ہے۔ عینک لگاتا ہے۔ کچھ کچھ لوہڑی سے ملتی جلتی اس کی نسکل ہے۔

"بیوقوف بھی ہے ———؟" آفتاب رائے نے پوچھا تھا۔

"خاصا بیوقوف ہے ——— مَیپل رائے زادہ نے جواب دیا تھا۔

"——— پھر کنول اس کے ساتھ خوش کیسے رہ سکے گی؟" آفتاب رائے نے مَیپل سے مطالبہ کیا۔

"میاں آفتاب بہادر ———" مَیپل نے مڑ کر ان کو مخاطب کیا ——— یہ جتنی لڑکیاں ہیں نا ——— جو اظلِ زماں بنی پھرتی ہیں۔ یہ بیوقوفوں کے ساتھ ہی خوش رہتی ہیں آیا عقل میں تمھاری ———؟"

"کیا بکواس ہے ———" آفتاب رائے نے بڑی آزردگی سے کہا۔

اب مَیپل رائے زادہ کو صریحاً غصہ آ گیا۔ اس نے جھنجلا کر کہا تھا ——— "تو میاں تم کو روکا کس نے تھا۔ اس سے بیاہ کرنے کو۔ جواب مجھے بور کر رہے ہو۔ کیا وہ تم سے خود آ کر کہتی کہ میاں آفتاب بہادر میں تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایں ——— ؟ اور فرض کرو اگر وہ خود سے ہی انکار کر دیتی تو کیا قیامت آ جاتی۔ میاں لڑکی تھی یا ہوّا۔ کیا مار دیتی وہ تم کو جھاڑ دیئے کہ ——— کیا کرتی ——— ؟ تم نے لیکن کہہ کے ہی نہیں دیکھا نیر چلو ——— خیر بیت گذ رگئی۔ اچھا ہی ہوا۔ کہاں کا جھگڑا مول لیتے بیکار میں۔ کیونکہ میرا معقولہ ہے (یہ اس نے انگلی اٹھا کر عالمانہ انداز میں کہا) کہ شادی کے چار سال بعد سب شادیاں ایک سی ہو جاتی ہیں ——— تم کو تو جگن ناتھ جین کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ کہ اس نے تم کو ایک بار عظیم سے سبکدوش کیا۔ بلکہ وہ تمھارے حق میں بالکل دافع بلیات ثابت ہوا ———"

"بہت وہ ہیں آپ انتہا سے زیادہ ———" آفتاب رائے نے جھنجلا کر کہا تھا۔

لکھنؤ لوٹ کر ایک روز آفتاب رائے اتفاقاً لے پی سین روڈ پر سے گذرے۔ سامنے کنول کے باپ کی سُرخ۔ نک کی بڑی سی کوٹھی تھی۔

جس کی برساتی پر کاسنی پھولوں کی بیل پھیلی تھی۔ یہاں ایک زمانے میں کنتا اور دھرم پتنا۔ کنول کے سارے بہن بھائیوں نے مل کر اپنا آرکیسٹرا بنا رکھا تھا۔ کوئی بانسری بجاتا۔ کوئی جل ترنگ۔ کنول طبلہ بجاتی۔ ایک بھائی وائلن کا استاد تھا۔ سب مل کر جب جے دنتی شروع کر دیتے۔ مورے مورے اب لوں نہیں آئے ——— کیسی چوک بھئی موسے آئی ——— پھر اور چنا بیزجی آجاتی۔ اور کوئل ایسی آواز میں گاتی ——— آمی تو ہوڑی جھور نا نگر ٹکر بوجوئے ——— بوجوئے ہو ——— اتوار کو دن بھر بیڈمنٹن ہوتا۔ ہر سے تو آفتاب رائے ان لوگوں کے یہاں موجود رہتے تھے۔ اور جب ایک روز خود ہی چپکے سے ولایت کھسک لئے تو ان لوگوں کا کیا قصور۔ وہ لڑکی کو بنک کے سیف ڈپازٹ میں تو ان کے خیال سے رکھنے سے رہے اور جگن ناتھ جین! بسا رشتہ تو بھائی قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔

پھر ایک روز ان آباد میں انھوں نے کنول کو دیکھا۔ وہ کار سے اُتر کر اپنی سسرال والوں کے ساتھ پارک کے مندر کی اندر جا رہی تھی اور سُرخ ساری میں ملبوس تھی۔ اور آفتاب اس کے پیروں میں تھا (آئی وی سائیں کے مندر دیا بار آؤں۔ کر آؤں سولہ شرنگار ——— وہ گرمیوں کی شام تھی۔ ان آباد جگمگا رہا تھا۔ ہوا میں موتیا اور خس کی مہک تھی۔ اور مندر کا گھنٹہ یکسانیت سے بجے جا رہا تھا)۔

اب آفتاب رائے یونیورسٹی میں تاریخ کی چیئر سنبھالے ہوئے تھے رانیوں کی محفل میں خوب اودھم مچاتے۔ ٹینس کھیلتے۔ اور صوفی ازم کی تاریخ پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ میں وہ نہیں ہوں۔ جو میں ہوں۔ میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں۔ ہر چیز باقی ساری چیزیں ہیں۔ بھگوان کرشن جب ارجن سے کہتے ہیں ——— او پنس ارجنا ——— ڈارے جا ——— "عسکری وائٹ بتاتا تھا کہ اگر تم اس چکر میں ہو کہ تم بھی پروفیسر ڈی پی مکرجی کی طرح مہاگرو بن کے بیٹھ جاؤ گے تو تم غلطی پر ہو۔ ڈاکٹر آفتاب رائے۔ تمہارا تو ہم مارتے مارتے حلیہ ٹھیک کر دیں گے ———" مینپل اضافہ کرتا۔)

جو پورا گروہ کھیم کو دیکھتے کہ تندہی سے کچا لوکھا رہی ہے۔ کھٹک سیکھ رہی ہے۔ جل بھرنے چلی ری گوئیاں آں آں گاتی پھر رہی ہے۔ یہ بھی کنول کماری کی قوم سے ہے۔

"ہ اری او باؤلی ——— بتا تو کیا کرنے والی ہے ———" وہ سوال کرتے۔

"پتہ نہیں ماما ———" وہ معصومیت سے جواب دیتی۔

پتہ نہیں کی بچی ——— وہ دل میں کہتے۔

چھت کی منڈیر پر ٹہلتے ٹہلتے آفتاب رائے نیم کی ڈالیوں کے نیچے آ گئے۔ سامنے بہت دور سول لائنز کے درختوں میں چھپی ہوئی حاکم ضلع کی کوٹھی میں گیس کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پروائی ہوا بہے جا رہی تھی۔ یہ چاندرات تھی۔ اور مسلمانوں کے محلوں کی طرف سے محرم کے اعادوں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

محرم آگیا ——— آفتاب رائے کو خیال آیا۔ شاید اب کے سے پھر سر پھٹول ہو۔ بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے سوچا۔

ویسے انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جن ضلعوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہاں ہندو افسروں کو تعینات کیا جاتا تھا۔ اور جہاں ہندو زیادہ ہوتے تھے۔ وہاں مسلمان حاکموں کو بھیجا جاتا تھا تاکہ توازن قائم رہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ صوبے کی چھ کروڑ آبادی کا صرف ۱۳ فی صدی حصّہ مسلمان تھے۔ لیکن اتنی شدید اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیبی اور سماجی طور پر مسلمان ہی سارے صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ جونپور، لکھنؤ، آگرہ، علیگڈھ، بریلی، مراد آباد، شاہجہان پور، وغیرہ جیسے ضلعوں میں تو مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہی ہوئی تھی۔ لیکن باقی کے سارے ضلعوں میں بھی

ن کا بول بالا تھا۔ صوبے کی تہذیب، اسے مراد وہ کلچر تھا جس پر مسلمانوں کا رنگ غالب تھا۔ گلی گلی محلے محلے گاؤں گاؤں سینکڑوں ہزاروں مسجدیں اور امام باڑے تھے۔ کتب خانے، درگاہیں، قلعے، حویلیاں۔ چپے چپے سے مسلمانوں کی آٹھ سو سال پرانی روایات وابستہ تھیں۔ لطف یہ کہ مسلمان اب تک نہیں مرے تھے۔ بڑے زور شور سے زندہ تھے۔

ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی واضح فرق نہ تھا۔ خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے پائنچے کا پاجامہ پہنتیں۔ اودھ کے بہت سے پرانے خاندانوں میں بیگمات اب تک لہنگے بھی پہنتیں۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان دونوں ساری کے بجائے کھڑے پائنچوں کا پاجامہ پہنتیں۔ ہندوؤں کے ہاں اسے "اجار" کہا جاتا۔ مشکلوں کی تقسیم بڑی دلچسپ تھی۔ پولس کا عملہ اسّی فی صدی مسلمان تھا۔ محکمہ تعلیم میں ان کی اتنی ہی کمی تھی۔ تجارت تو خیر کبھی مسلمان بھائی نے ڈھنگ سے کر کے نہ دی۔ چند پیشے مگر خاص مسلمانوں کے تھے۔ جن کے دم سے صوبے کی مشہور صنعتیں قائم تھیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے کچھ ایسا مضبوط نظام تھا کہ سارا منافع تو بازار تک پہنچاتے پہنچاتے مڈل مین ہی مار لے جاتا تھا اور جولاہے کے پاس بچتا تھا۔ اس میں قرضے چکانے تھے۔ بیٹا کا جہیز بنانا تھا۔ اور ہزاروں نقصے تھے آپ جانئے۔

زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لئے منہ نیلا پیلا کئے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے ——— برسو رام دھڑاکے سے بڑھیا مر گئی فاقے سے۔ گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا ——— ہاتھی گھوڑا پالکی ——— جے کنہیا لال کی۔ ذہنی اور نفسیاتی لیں منظر چونکہ یکساں تھا۔ لہٰذا غیر شعوری طور پر ——— IMAGERY بھی ایک ہی تھی۔ جس میں راوھا اور سیتا اور پنگھٹ کی گوپیوں کا عمل دخل تھا۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنھوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو ملک کہ الاپتیں ——— بھری گگری موری ڈھرکائی شام ——— کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ سب چیزیں اس تمدن کی مظہر تھیں جنھیں پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی تہذیبی ہمہ گیری اور وسعت نظر اور ایک رچے ہوئے جمالیاتی حس نے جنم دیا تھا۔ یہ گیت اور کچہریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزا پور اور جونپور سے لے کر لکھنؤ اور دلی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصور پر تھا جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقا نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب رائے نے (کہ ان کا نام ہی اس مشترکہ تمدن کی لطافت کا ایک مظہر تھا) ایک بار سوچا تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب لکھیں گے کہ کس طرح پندرھویں صدی میں بھگتی تحریک کے ذریعے ایک خوبصورت مستقبل کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ کس طرح نانک کا مذہب ہندوؤں کی فرقہ پرستی کے خلاف ایک پروگریسو ردِ عمل ثابت ہو سکتا تھا۔ کس طرح انیسویں صدی کی دہلی تحریک کو غیر ملکی راج کے مقابلے میں ایک قومی محاذ بننے کے بجائے اُس کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا گیا۔ آریہ سماجیوں اور فرقہ پرستوں کو کیسے کیسے شہ دی گئی۔ یہ اور اس طرح کی سو باتیں ان کے ذہن میں آتیں۔ لیکن ذہن ہی کو مکمل سکون کہاں میسر تھا پہلے یہ کنول کماری کو پڑی۔ پھر ان کی معاشی مجبوریاں آڑے آئیں۔ اور وہ ولایت سے لوٹ کر نائیس میں لیکچرشپ سنبھالنی پڑی۔ جہاں دن رات ہندی اخفوا ہندوستانی کے گن گائے جاتے اور مالویہ جی کی تصویر کے آگے آرتی اتاری جاتی ——— یہ میں تم سے کہتا ہوں ——— کہ شدھ ہندی اور گئو رکھشا، اور رام راجیہ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس خطرے سے بچو۔ انھوں نے کئی دفعہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے پنڈال میں چلا کر کہا تھا ——— بھائی اگر یہی بات ہے تو سیدھے سیدھے مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے ——— ان سے کہا گیا ——— ہم تو ہندو پیدا ہوئے اور ہندو ہی مریں گے۔ ہماری طرح سے تھوڑا ہی ہیں۔ ڈھلل یقین ———

آفتاب رائے کے ساتھی مذاق میں انھیں جونپور کا قاضی کہا کرتے۔ "یہ جو کتاب تم لکھنے والے ہو اس کا نام رکھنا ——— "جونپور کا قاضی" ———

عرف" میں شہر کے اندیشے ہیں دُبلا کیوں ہُوا ———!"

رات کی ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ نیم کے پتے بڑے پُراسرار طریقے سے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہاں زندگی میں بے پایاں اُداسی تھی اور ویرانہ اور تاریکی۔

محلے کے مکانوں میں مدھم روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ نیچے بڑی بھاوج کے مکان کے بڑے آنگن میں مجلس کے لئے جو گیس کا ہنڈا نصب کیا گیا تھا۔ اس کی روشنی رات کے اس ویرانے میں بڑی لرزہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ جیسے مُردے کے جنگل میں اگیا بیتال اور مسان چپکے چپکے روتے ہوں۔

مجلسوں کے گریہ و بکا کی مدھم آوازیں پروائی کے جھونکوں میں رل مل کر وقفے وقفے کے بعد یک لخت بلند ہو جاتی تھیں۔ نکڑ پر کنوز بخیہ ماس کے ہاں کی محرّم کی سبیل کے پاس رکھی ہوئی زینت یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔

(۴)

"عاشور کی شب لیلیٰ ارے مرثیے نے شمع رکھ کر ———" بُوا مدّن نے تکیہ پر کرم خوردہ کتاب رکھ کر پڑھنا شروع کیا ———

"——— اے تکتی رہیں چہرہ علی اکبرؑ کا ———" بگن نے باریک تیز آواز میں ساتھ دینا شروع کیا۔

"اے لو دونوں کی دونوں سٹھیا گئی ہیں ——— اے ہوی چاند رات کو نوحے تاریخ کے مرثیے نکال کر بیٹھ گئیں ———!" بڑی بھاوج نے باورچی خانے میں سے پکارا۔

"توبہ توبہ۔ کمبخت ایسی ساڑھ ستی پڑی ہے کہ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا ——— اے لو میں تو عینک لانا ہی بھول گئی۔ اب مجھے کچھ سجھائی تھوڑی دے رہا تھا ——— میں نے تو اٹکل سے پڑھنا شروع کر دیا ——— اے بہن ——— اے نیازی بیگم ——— ذرا اپنی عینک تو دینا ———" بُوا مدّن نے طویل سانس بھر کے کہا۔

نیازی بیگم نے اپنی عینک اُتار کے دی جو بُوا مدّن نے ناک کی پھننگ پر رکھ کر پھر سے بیاض کی ورق گردانی شروع کی۔

"اے بُوا مدّن نجم الملّت کی بیاض بھی لائی ہو کہ نہیں ——— ؟" بڑی بھاوج نے تخت کے پائے کے قریب آ کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"لڑکیوں سے پوچھئے ——— بڑی بھاوج ——— نجم الملّت کے نوحے تو یہی لوگ پڑھتے ہیں ———" بگن نے جواب دیا۔

"ہاں بٹیا ہم تو پرانے فیشن کے آدمی ہیں۔ اب تو نوحوں میں بھی نئے راگ رنگ نکلے ہیں ———" بُوا مدّن نے قدرے بے نیازی سے اضافہ کیا۔

یہ لڑکیوں پر صفا چوٹ تھی۔ بُوا مدّن نے لڑکیوں کی نوحہ خوانی کو کبھی بھی بنظرِ استحسان نہ دیکھا تھا۔

کنبے اور محلے کی ساری لڑکیاں دیوار کے سہارے بڑے اسٹائل سے سیاہ جارجٹ کے دوپٹوں سے سر ڈھانپے خاموش بیٹھی تھیں۔ بُوا مدّن کے اس طعنے کا انھوں نے ہرگز ٹَس نہیں لیا۔

"ڈولی اتروا لو ———" باہر سے رام بھروسے کی آواز آئی۔

"پردہ کر لو گو ——— کہار اندر آتے ہیں ———"

فیریں کی سیٹی دھم سے گھڑونچی پر ٹکا کر ممولہ تیز آواز میں چلائی ——— چھمّو بیگم آگئیں "

چھمّو بیگم ڈولی میں سے اُتریں۔ اور پائنچے سمیٹ کے پانی سے لبریز نالی کو لانگنے کے ارادے سے آگے بڑھیں "اللہ رکھے بڑی بھاوج کے ہاں تو ہر وقت بس بہاسی آئی رہتی ہے" انھوں نے ذرا بیزاری سے کہا۔

کہیں ممولہ نے یہ سن لیا ہو لے چھمّو بیگم ——— ذری زبان سنبھال کے بات کیا کیجئے بڑی بھاوج کے دشمنوں کے گھر بہاسا آوے شیطان کے کان بہرے ——— ایسا تو میں نے آنگن کا سارا پانی سوتا ہے۔ اپنے ہاں نہیں دیکھتیں۔ ساری گلی کو لیکے نوبت رائے کا تلاؤ بنا رکھا ہے۔ اتا اتا پانی آپکے گھر میں کھڑا رہتا ہے۔ ہاں" اس نے منہ در منہ جواب دیا۔

رہنے بی ممولہ ——— ذری آپے میں رہنا ——— میں خود سے نہیں آگئی۔ بڑی بھاوج نے سو دفعہ بلایا کہ آکر مجلس پڑھ جاؤ ———

مجلس پڑھ جاؤ ——— میں اپنے گھر سے فالتو نہیں ہوں کہ ماری ماری پھروں۔ اور ٹکے کی ڈومنیوں کی باتیں سنوں۔ ہاں۔ لو بھائی ڈولی واپس کرو" ——— "چھمّو بیگم نے بیچ آنگن کے کھڑے ہو کر رجز پڑھا۔

بڑی بھاوج جلدی سے اُٹھ کر باہر آئیں ——— "اے ہے ——— یہ کیا کرتا فوجن چھی ہے ——— امامنوں پر مصیبت کی گھڑی آن پہنچی اور تم ہو کہ کھڑی جھگڑ رہی ہو ——— چل نکل ممولہ یہاں سے ——— ڈوبی جب دیکھو تب یہی فضیحتا شروع کرتی ہے ——— آؤ چھمّو بیگم جم جم آؤ ———"

ڈوبڑی میں کہاروں نے زور سے ڈنڈا بجایا۔ اجی پیسے تو بھجوائیے بیگم صاحب ———

ارے دیا ئیے ——— ساری دیہہ دکھن لاگت ہے ——— رام بھروسے نے دیوار سے لگ کر ماتا دین کی بیڑی سلگاتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔ ویسے محرم کی وجہ سے اب پیسے خوب ملیں گے۔ چہلم تک دس دس پھیرے ایک گلی کے ہونے تھے اور ہر پھیرا تین تین پیسے۔ دور کے محلوں تک آنے جانے کے تو دو دو آنے تک ہو جاتے تھے۔ بس چاندی تھی آج کل نائی رام بھروسے اور ان کی برادری کی۔ اور بڑوے جو جل رہے تھے وہ الگ۔ وہ تو ایک طرح کا لکڑی کا کرسی نما ٹھیلہ ہوتا تھا جس میں چاروں طرف پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔ اندر دو دو تین تین سواریاں اکھڑوں بیٹھ جاتی تھیں۔ اور بچوں کی انگریزی پرام کی طرح پیچھے سے دھکیلا جاتا تھا۔ اور جو خرچ جوں کرتا بڑوہ گلیوں کے پتھریلے فرش پر بڑے ٹھاٹھ سے چلتا۔ پالکی کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ یعنی چھ آنے فی پھیرا۔ پرائیویٹ پالکی جو پہلا صدر اعلیٰ کے یہاں تھا۔

چھمّو بیگم اس معرکے کے بعد ٹھسک ٹھسک چلتی آن کر چاندنی پر بیٹھ گئیں۔ اور عینک لگا کر بڑے غصّے سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ لوامدن خود بڑی ہائی بردسوز خواں تھیں۔ انھوں نے کبھی چھمّو بیگم کی پروا نہ کی۔

سوز ختم ہو چکا تھا۔ گوٹے کے پٹھے لگاتی لوامدن طمانیت سے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ چٹاپٹی کی گرٹ کا اودا پاجامہ اور طوطے کے پروں ایسے ہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے وہ اس شان سے دیوار سے لگ کر بیٹھتی تھیں کہ دور سے معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ ہاں یہ رام پور کی میر باسن ہیں۔ مذاق نہیں ہے۔

چھمّو بیگم ایک تو یہ کہ سیدانی تھیں۔ دوسرے یہ کہ بگن تلہا کے بیاہ کے سلسلے میں ان سے جنگ ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ لوامدن کو ہر گز خاطر میں نہ لاتیں۔ لوامدن کو اگر یہ زعم تھا کہ مالکہ اور سوز بھی بھاگ میں وہ سوز ایسے پڑھتی ہیں کہ مجلس میں بیٹھ پڑ جاتی ہے۔ تو چھمّو بیگم کو بھی اپنے اوپر ناز بے جا نہ تھا کہ آٹھویں تا دسویں والا میر انیس کا مرثیہ پوری راگ داری کے ساتھ ان جیسا کوئی اور نہ پڑھ سکتا تھا۔

چھمّو بیگم نے تو رتم روشنی غلافوں میں سے چاندرات کا بیان نکالا اور مجمع کو نہایت گھور کے دیکھا۔

لڑکیوں کا گروہ اپنی جگہ پر ذرا چوکنا ہو گیا۔ ان لوگوں پر فرض تھا کہ جب چھمّو بیگم حدیث پڑھیں یاد عظ کریں تو یہ لوگ دوپٹے منہ میں ٹھونس کر

کھل کھیل ہنسیں پہ بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ زار و قطار رو رہی ہیں۔ اور چھوٹی بیگم کس قیامت کی حدیث پڑھتی تھیں کہ کہرام بپا ہو جاتا تھا۔

چھوٹی بیگم کے وعظ بہت موثر ہوتے تھے۔ کئی جناب کہن صاحب بلکہ خود قبلہ جارچوی صاحب ایسے ایسے رموز و نکات۔ انگریزی خلسے کے واقعہ شہادت میں سے نہ نکال سکتے۔ جو چھوٹی بیگم پل کی پل دریا کوزے میں بند کر کے رکھ دیتی تھیں۔

"اے صاحبانِ مجلس ——— جب باری تعالیٰ نے اپنے نور کے دو حصے کئے ——— والی تمہید سے لے کر جب وہ اس کلائمیکس تک پہنچتی تھیں کہ "اے بیبیو ——— جناب عباس نے رو کر کہا یا سکینہ اٹھو ———" تو اس وقت مجلس میں نالہ و شیون سے قیامت بپا ہو چکی ہوتی تھی۔ اندر باہر سب کہتے تھے کہ ماشاء اللہ سے چھوٹی بیگم نے سماں باندھ دیا۔ ان کے زورِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ منٹوں میں بات کہیں سے کہیں پہنچ تھی۔ ابھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بیان ہو رہا ہے۔ ابھی یزید ملعون کے خاندان کا ذکر آ گیا۔ جنگ جمل کا واقعہ سنا رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ اس کا موازنہ مجرمن اور انگریز کی لڑائی سے بھی ہوتا جاتا ہے۔ رسالتمآب کے بیان پر جب آتیں تو کہتیں ——— بیبیو ——— میں کوئی مورخ کوئی تاریخ دان کوئی فلاسفہ نہیں ہوں۔ مگر اتنا جانتی ہوں اور کہے دیتی ہوں کہ ایک طرف علیسائیوں اور رومیوں کی دس لاکھ فوج تھی۔ ایک طرف جناب رسالتمآب کے ساتھ صرف پندرہ آدمی تھے۔ مگر وہ گھمسان کا رن پڑا تھا کہ مسالے فرشتے چوتھے آسمان پر اتر آئے تھے۔ اور نور کی جھاڑو سے رسالتمآب کے لئے راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔ خداوند تعالیٰ کے مسئے پر فرمائیں ——— اے بیبیو ——— جو انگریزی داں دہریے خدا کے منکر ہیں۔ ان کا زوال مجد سے شروع۔ اور کان کھول کے سنو ——— کہ خداوند کریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے۔ جو فرنگیوں کے علم کے ذریعے ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں۔ بلکہ میں تم کو آج یہ بتانا چاہتی ہوں اے مومنو بیبیو ——— کہ قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالےٰ نے خود انگریزی میں اپنی توحید کا ثبوت دیا ہے۔ فرماتا ہے وہ رب ذوالجلال کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ——— یہ وَن کیا ہے ——— ؟ وَن انگریزی میں ایک کو کہتے ہیں ——— مسئلۂ توحید سے سلسلہ کھینچ کر پھر واقعہ کربلا اور شہادتِ علی اکبرؑ سے ملا دیا جاتا۔ یہ چھوٹی بیگم کے آرٹ کا کمال تھا۔

بڑی بھاوج کیا سارے محلے کو معلوم تھا کہ چھوٹی بیگم خاصی فراڈ ہیں۔ لیکن ان کی شمولیت کے بغیر مجلس میں جان ہی نہ پڑ سکتی تھی۔ لہٰذا ان کی بدمزاجی کو بھی برداشت کیا جاتا۔

برسوں سے، جب سے بڑی بھاوج بیوہ ہوئیں، بڑی ہوئیں، رخصت ہو کر بارہ بنکی سے جو پھر آئیں۔ زندگی کا ایک چلن قائم تھا جس میں شادی بیاہ، تیوہار، لڑائی جھگڑے، محرم، کونڈے جوگی رمپورے کی سالانہ زیارت، غرضیکہ ہر چیز کی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی۔ ڈپٹی صاحب جب سے بڑی دھوم دھام سے ان کا بیاہ رچایا گیا تھا۔ جب وہ پندرہ سال کی تھیں۔ کہا زمانے تھے۔ دو میل لمبا تو ماہی مراتب ہی تھا۔ پراتیوں کو چاندی کی طشتریوں میں سندیٹے کے لڈو بانٹے گئے تھے اور جنائیوں یعنی لڑکی کے گاؤں والوں کے یہاں ہفتوں مہینوں پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ ان کا میکہ و سسرال دونوں طرف سے ماشاء اللہ سے بھرا پرا کنبہ تھا۔ بس ایک چھوٹی اماں ہی سے ان کی نہ بنی۔ پرانی چٹھائی کا دیوار بیچ گھر تھا۔ لیکن بدقسمتی کھڑکی بن نکالا پڑا، یا قسمت کا قصہ در اصل امام باڑے والے آنگن کے باغ سے چلا تھا بعد میں رفتہ رفتہ دونوں بھائیوں کے گھرانوں میں بول چال تک بند ہو گئی۔ سچ کہا ہے کہ بوا کہ زر، زمین، زن، تین چیزیں گھر کا گھر ڈبو کر دیتی ہیں۔ سگے بھائی غیر ہو جاتے ہیں۔ پر جب چھوٹی اماں بیمار پڑیں تو بڑی بھاوج نے دھنداری پر حرف نہ آنے دیا اور مرنے سے پہلے دیورانی نے ساری اگلی پچھلی شکایتوں کو بھول کر کہا سنا معاف کرا لیا۔ اس پر بھی کہنے والوں کا بھی منہ کس نے بند کیا ہے محلے میں اڑ گئی کہ یہ چھوٹی اماں اپنے محلے کی کوٹھری میں سونے کی مہریں دفن کئے بیٹھی تھیں۔ یہ ان کو حاصل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ بوا چھوٹی بھاوج کے پاس خدا کا دیا خود کیا کچھ نہیں۔ جو وہ ایسے کمینے خیالات دل میں لاتیں۔ اور اصلیت یہ ہے کہ چھوٹی اماں کی وہ سونے کی مہروں والی جھجری جس پر وہ عمر بھر مایا کا سانپ بنی بیٹھی

رہیں۔ اُون کے مال سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ لڑکوں نے لے کر سارا پیسہ دو سال کے اندر اڑا دیا۔ بلکہ پوا مدن تو یقین محکم کے ساتھ کہتی تھیں کہ چھوٹی آماں اور بڑی بھاوج کی لڑائی کروانے میں زیادہ ہاتھ چھوٹی بیگم کا ہے۔ حرافہ اِدھر کی اُدھر لگاتی تھی۔ اور پھر سال کے سال منہ پر مولوں بن کر چڑھ بیٹھتی ہے۔ چڑیل۔

روناہر حال فرض تھا۔ خواہ چھوٹی بیگم جیسی کتنی ہی بیان کیوں نہ پڑے۔ لہٰذا بوا مدن دیوار کے سہارے بیٹھی بڑے مشہدی رومال سے منہ ڈھانپے شائستگی سے سسکیاں بھرتی رہیں۔ لڑکیاں دہلیز پر بیٹھی بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور منتظر تھیں کہ کب حدیث ختم ہو اور نوحہ خوانی کی باری آئے۔

نوے پڑھنے میں بڑی بھاوج کی لڑکی کشوری کو ملکہ حاصل تھا۔ ہاتھ آئے تھے کیا کیا گل زہرا کو فدائی ——— زماؤں نے دیکھی درخیبہ سے لڑائی ——— ارے لڑتے ہوئے گرتے ہوئے مرتے ہوئے دیکھا ——— اور جانے کون کون سے سائے جدید نوے۔ جی ہاں ایسی پاٹ دار آواز میں آخری بند اٹھاتی کہ کھیم کے گھر تک آواز پہنچ جاتی تھی۔

نوحوں کی طرزیں نکالنا لڑکیوں کا خاص مشغلہ تھا۔ جہاں کوئی چلتا چلتا لیکن غلگین سی دھن کا گیت ریکارڈ پر سنا جھٹ ذرا سی تبدیلی کر کے مجلس المیت کے کسی نوحے پر اس دھن کو چسپا کر دیا۔ ملکہ آرا اس معاملے میں بڑی رجعت پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بھئی یہ غلط بات ہے۔ یہ کیا ساتویں کی رات کو معلوم ہو کہ کانن بالا کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ توبہ توبہ بگڑی کشوری کس کی سنتی تھی۔ ویسے بھی وہ بڑی آزاد خیال روشن دماغ انسان تھی۔ ہائی اسکول تو اس نے پاس کر لیا تھا۔ وہ تو کھنڈ جا کہ گئے ہاتھوں انٹر اور بی۔ اے بھی کر لے لیکن چھوٹی آماں جب مرتے وقت بڑی بھاوج سے صلح صفائی کرنے پر تلیں تو یہاں تک طے کر گئیں، کہ ان کے بڑے لڑکے میاں اعزاز سے اس کا بیاہ بھی کر دیا جائے۔

اب یہاں سے مسلم سوشل کلچر بننا شروع ہوئی۔ کشوری کہاں ایک تیز لڑکی۔ سارے غلگ کے نمونے اس کو آویں۔ جہاں پردہ باغ میں کوئی نیا نمونہ سوئٹر کا کسی کو پہنے دیکھ پاوے گھر آکر فوراً تیار۔ افسانے پڑھنے کی وہ شوقین۔ فیاض علی کی اور وسیم سے لے کر کرشن چندر کی "نظارے" اور حجاب امتیاز علی کی "ظالم محبت" تک اُس کی الماری میں موجود۔ سینما بھی جب موقع ملتا ضرور دیکھ لیتی۔ میاں اعزاز ایک تو یہ کہ خاصے مولوی آدمی تھے۔ بی۔ سی۔ ایس میں آ گئے تھے۔ کیمنگ کالج سے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے روادار نہیں تھے کہ گھر کی لڑکیاں فلم کی ورنہ نمائش ہی میں ہو آئیں۔ خود بڑی دوڑ کی لیتے تھے۔ کہ مس سکسینہ سے یونین میں یوں بحث چلی اور مس صدیقی کے یہاں یوں چائے پر گیا۔ لیکن اپنے کنبے کی لڑکیوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں جہاں گھر سے باہر نکلیں میاں زمانہ خراب ہے۔ کسی کو بدنام ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔

بڑی بھاوج نے لطیفہ یہ تھا، کہ کشوری کے لئے بڑی منتیں مرادیں مان رکھی تھیں عاشورہ کے روز جب ذوالجناح نذر لایا جاتا تو جلیبی کھلانے کے بعد اس کے کان سے منہ لگا کر ساری بیبیاں اور ساری نوحہ خوانیاں باندیاں دعا مانگتیں کہ یا مولا کشوری بٹیا کا نصیبہ اب کے سال ہی کھلے ———

اب یہ پوچھو کہ یہ میاں اعزاز کے پلے باندھنا نصیبے کا کھلنا سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن کشوری نے بھی طے کر لیا تھا کہ عین بیاہ کے موقع پر وہ انکار کر دے گی برات میں ایک ہڑبونگ مچ جائے گی۔ وہ جیسا کہ سوشل فلموں میں ہوتا ہے کہ عین وقت پر جب پھیرے پڑنے والے ہوں تو اصل ہیرو ہسپتال یا جیل سے چھٹ کر پہنچ جاتا ہے اور گرج کر کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ یہ شادی نہیں ہو سکتی ———

(۵)

کشوری کے بابا سید جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لیکن دل کے بڑے پکے قوم پرست مسلمان تھے۔ جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ نے بھی خوب خوب خوشیاں منائیں۔ حافظ ابراہیم ضلع میں آئے تو آپ ہار لے محبت کے جامے ان سے لپٹ گئے۔ جب جنگ چھڑی اور کانگریسی وزارت نے استعفا دیا اور مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دکھ ہوا۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ اور چبوترے پر بیٹھے پیچوان لگائے سوچا کرتے کہ دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ لڑکے جن کو نوکری نہ ملتی تھی۔ اب فوج میں چلے جا رہے تھے۔ اپنا اصغر عباس ہی اب لفٹنٹ تھا۔ مہنگائی شدید تھی۔ لیڈر جیل میں تھے۔ لیکن زندگی میں یک بیک ایک نیا رنگ آ گیا تھا۔ حافظ ابراہیم کے موقع پر ضلع کے اردو اخباروں نے لکھا تھا ——— کہاں گئی موٹر سرکاری بیچا کہ سبزی ترکاری، یہ بھی دیکھا، وہ بھی دیکھا ——— کشوری کے بابا کو یہ سب پڑھ اور سنکر صدمہ ہوتا۔ وہ بڑے پکے مسلمان تھے۔ دراصل مسلمانوں کے معاشرے کا استحکام انہیں پرانے مدرسۂ فکر کے ڈپٹی کلکٹروں کے دم قدم سے قائم تھا۔ پردے کے بڑے پابند۔ کیا مجال جو لڑکیاں بغیر قناتوں چادروں کے گھر سے قدم نکالیں (صوبے کے مشرقی ضلعوں میں برقعے کا رواج نہ تھا۔ باوجود "متوسط طبقے" کی مسلمان اور ہندو عورتیں چادریں اور دلائیاں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں۔ ہندو عورتیں تو بغیر گھونگٹ کاڑھے سڑک پر سے گزر جاتی تھیں۔ لیکن مسلمان بیبیوں کا دن دہاڑے باہر نکلنا سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا)

اصغر عباس فوج میں رہ کر بالکل انگریز بنتا جا رہا تھا۔ اب کے سے جب وہ چھٹی پر گھر آیا تو چند شرائط بابا کے سامنے رکھیں:۔

(الف) وہ خود کنبے میں بیاہ نہ کرے گا۔

(ب) کشوری جب اس کے ساتھ رہنے کے لئے جبل پور جائے گی تو پردہ نہ کرے گی۔

(ج) اعزا میں سے بیاہ کا پروگرام فسوخ۔

(د) کشوری کو ایف۔ اے کے لئے مسلم گرلز کالج لکھنؤ بھیجا جائے گا۔

بڑے بحث مباحثے کے بعد بابا اور بڑی بھاوج دونوں نے ان شرائط کے بعیر نکات منظور کر لئے۔

ہندوستان کے مسلمان متوسط اور اوپری متوسط طبقے کا کوئی ہی خاندان ایسا ہوگا جس کی لڑکیوں نے کبھی نہ کبھی علیگڈھ گرلز کالج یا لکھنؤ مسلم اسکول میں نہ پڑھا ہو۔ بیشتر لڑکیوں کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ انھوں نے چاہے چند روز ہی کے لئے کیوں نہیں، لیکن پڑھا مسلم اسکول میں ہے۔

بعینہٖ یہی احوال جبلپور کا تھا۔ صوبے کے سارے ٹھوس ہندو متوسط طبقے کی سپنترپان اس دش و دیار ہی کی دین تھی۔ سرکاری اور عیسائی اداروں کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں انگریز کے اقبال کی وجہ سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

اب کی جولائی میں کشوری اور کشوری کی بھتیجی ہی جبلپور سے ٹرین میں سوار ہوئیں اور لکھنؤ آن پہنچیں۔ چار باغ پر ماما کشوری کو اتارنے کے لئے آئے تھے۔ اور کشوری کو پہنچانے کے لئے نواجد بھائی بچائے مردانہ ڈبے میں موجود ہی تھے۔ اسٹیشن کی برساتی میں پہنچکر کشوری نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور روئیں اور کبھی کبھی ملنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی راہ چل گئیں۔

(۶)

"کشوری نے اپنے تئیں بہت سے برسوں بعد منیجمنٹ ہال کی سیڑھیوں پر پایا ——— وہ چودھری سلطان کے نیکچر کے اوپر جا

رہی تھی۔ میں احتشام صاحب کی کلاس کے بعد پریشین تھیٹر سے اُتر رہی تھی ——— کشوری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ——— اور پھر وہ خاموش ہو گئی ——— اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ جہاں برف کے گالے چپکے چپکے نیچے گر رہے تھے ———

"کیا تم نے کبھی سوچا ہے؟" اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا ——— "کہ ہم جو چھ سو سال تک ایک دیوار کے سائے میں رہے، ایک مٹی سے بنا ہے اور اس کی تخلیق ہوئی تھی اس کے اور ہمارے گھر والوں کو اپنی مشترکہ کلچر پر ناز تھا۔ اور ایک قسم کا احساس برتری ——— چار سال جب اس وقت کیم نے مجھے دیکھا تو ایک لحظے کے لئے ذرا جھجکی پھر "بلکشوری" کہتی ہوئی آگے چلی گئی۔

"اور میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ میں نے اور اس نے اسی دن کے لئے ساری تیاریاں کی تھیں۔ وہ ہیلاد دیالہ کی لڑکی ہے۔ کالج لیس میں یقین رکھتی ہے۔ میرے بابا بڑے نیشنلسٹ بنتے تھے۔ لیکن میں کٹر مسلم لیگی ہوں۔ یوم پاکستان کے جلسے کے موقع پر کیم کے ساتھیوں نے ہمارے اوپر اینٹیں پھینکی تھیں۔ اگھنڈ ہندوستان ویک کے دنوں میں ہمارے رفقا نے ان کے پنڈال پر پکٹنگ کی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہی ٹھیک ہے اور بجائی زندگی نہ ہوئی شانتا رام ہو گئی۔ بنا چاہے پڑوسی کر دیا بھائی چارہ نہیں کرتے بھائی چارہ میاں زبردستی ہے تمہاری۔ یہی ایک مثال میری اور کیم کی دیکھ لو۔ جنم جنم کے پڑوسی تھے۔ اور کیا دوستی اور یگانگت کا عالم تھا۔ پر تھے ہم ان کے لئے ملیچھ۔ ان کے چوکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے۔ اور ہماری اماں کا سلسلہ تھا کہ اگر ہندو کی دکان سے کوئی چیز آئی تو اسے فوراً حوض میں غوطے دے کر پاک کیا جاتا تھا۔ ایک قوم اس طرح بنتی ہے؟ تقسیم کا مطالبہ ہندو کی ساری تاریخ کا نہایت فطری اور نہایت منطقی نتیجہ ہے ———" کشوری چپ ہو گئی۔

آتشدان میں آگ لہک رہی تھی۔ کسی نے آہستہ سے ایک انگارہ الاؤ میں سے نکال کر باہر گرا دیا۔ جہاں وہ چند لمحوں تک سلگتا رہا اور پھر بجھ گیا۔ نیچے سڑک پر کوئی بھکاری اکارڈین پر "موجوں کے اُوپر" کا دلنواز بجاتا ہوا گذر رہا تھا۔

"آج میں کنول کماری کے ہاں چاء پر گئی تھی" اروملا نے کہا "وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان سب سے میں نے کہا کہ ہمارے "مجلس میلے" کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔"

"کنول کماری ———" کشوری نے کچھ یاد کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں۔ ہمارے نئے فرسٹ سکرٹری کی بیوی۔ اور میں نے سوچا کہ قابل عورت ہے اس سے میلے کے موقع پر ہندوستانی آرٹ پر لگے ہاتھوں ایک لکچر بھی کروا لیں۔ پامسٹری وغیرہ سبھی ہوں گے۔ بچاری نے وعدہ کر لیا ———"

"سو یہ طے ہو گیا ——— سو یہ طے ہو گیا ——— دوسرے کمرے میں "میلے کے پروگرام کی ہر سال کتنے ہوئے چند لڑکیوں نے ہر بند رنا تھ ٹھٹھ یادھیا کا کو رس یک لخت زور زور سے الاپنا شروع کر دیا۔

"——— میں نے بہت کوشش کر کے سوچا کہ میں جب یونیورسٹی میں اور لوگوں سے ملتی ہوں ——— اٹلی کے لوگ ہیں۔ برازیل کے۔ عراق اور مصر کے۔ میں ان سے اس طرح کیوں نہیں باتیں کرنا چاہتی۔ پھر ہمارے پروفیسر ہیں۔ ہمعصر فنون کی انجمن کے اراکین ہیں۔ انھوں نے ہمارے مسائل پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ ہمارا بڑا دقیق مطالعہ کیا ہے۔ اخباروں میں وہ ہمارے متعلق اڈیٹوریل لکھتے ہیں۔ وار لعوام میں اور ریڈیو پر تقریریں کرتے ہیں ———" کشوری نے کہا۔

چاروں اور آگ لگی ——— دل میں بھوک پیاس جگی ——— پگ پگ ہم گاتے ——— ہم گاتے ہم گاتے ——— لڑکیاں چلا رہی تھیں۔

"میرا جی چاہتا ہے۔ میں تم سے یہ سب باتیں کہوں۔ تم کو یہ سارا قصہ یہ سارا گورکھ دھندا سمجھاؤں" ——— اس نے ساتھیوں کو اداس آواز میں مخاطب کیا ——— تاکہ تم لوگ مجھے بھی ایک اور مضحکہ خیز کردار نہ سمجھو اور اس سارے پس منظر اس ساری کہانی کو اس فاصلے سے دیکھ کر

اپنی نئی راہ کا تعین کرو۔

سڑک پر کیرل گانے والوں کی ٹولیاں گذرنی شروع ہو گئی تھیں۔

"کرسمس کا زمانہ بھی اختتام پہ ہے" روزماری نے اظہارِ خیال کیا۔

ہاں، جو نیور میں، میرے محلے میں، شاید نین یا دیچے کھچے سوگوار چہلم کے تعزیوں کے سائے میں بیٹھے اپنی قسمت کو روتے ہوں گے نہیں شاید محرم کا زمانہ گذر گیا ہوگا۔ پرانے کینٹ دہرکار ہو چکے ہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ——— کشوری نے دل میں کہا۔

"برفباری شدید ہو گئی ہے۔ پھر بہار آئے گی۔ کیا سارے زمانے، سارے موسم اتنے بے معرف ہیں ——— ؟" روزماری نے اپنے آپ سے بات کی۔

نہیں ——— کشوری نے کہا۔

چلو چلو ہم گنگناتے چلیں ——— لڑکیوں کی آواز نے تکرار کی۔

(۷)

چار باغ اسٹیشن پر کھیم کو آخری بار خدا حافظ کہنے کے بعد اب کشوری کو دم مارنے کی فرصت بھی کہاں تھی۔ پہلے مسلم اسکول۔ پھر چاند باغ پھر کیننگ کالج۔ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا تھا ہر جگہ میں کشوری موجود۔ مباحثے ہو رہے ہیں۔ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ ہیں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی معروفیات ہیں۔ ادھر ہندو اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھا۔ جہاں بھائی طالبات کے جلسے جلوس تھے۔ جن میں کبھی کبھی کھیم رائے زادہ دور سے نظر آجاتی۔ طالب علموں کی دنیا اچھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی تھی۔ گھر پہ واپس جاؤ تو وہی سیاست۔ کل کی تشویش مستقبل کی فکر۔ ملک کی تقسیم ہوگی۔ نہیں ہوگی۔ ہوگی۔ نہیں ہوگی۔

یونیورسٹی میں لیکچرز کے دوران میں پروفیسروں سے چھیڑ چھاڑ ہو جاتی۔ سطحی طور پر ابھی دوستی اور بھائی چارہ قائم تھا۔ لیکن آخری "شو ڈاؤن" کے لئے اسٹیج بالکل تیار تھا۔

ڈاکٹر آفتاب رائے ابھی تک میٹری ڈپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ ایک روز ایک لیکچر کے دوران میں ان سے بھی کچھ تکرار ہو گئی۔ ایک ہندو طالب علم نے کہا۔ آزادی کا مطلب ڈاکٹر صاحب مکمل سوراج ہے۔ ہند کی دھرتی کو پورے شدھ کرنا ہے۔ ساری ان قوموں کے اثر سے آزاد ہونا ہے جنھوں نے باہر سے آکر حملہ کیا۔ یہی تلک جی نے کہا تھا جی ہاں۔

اس پیریڈ میں شیواجی کے اوپر گفتگو ہو رہی تھی۔ لہٰذا خانہ جنگی ناگزیر تھی۔ شام تک ساری یونیورسٹی میں خبر پھیل گئی۔ کہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی کلاس میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔

اگلی صبح کشوری پورا جلوس بنا کر ڈاکٹر آفتاب رائے کے دفتر میں پہنچی۔

"ڈاکٹر صاحب ———" اس نے نہایت رعب داب سے کہنا شروع کیا ——— "کل جس طرح آپ نے حضرت اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کے متعلق اظہارِ خیال کیا۔ اس کے لئے معافی مانگئے۔ ورنہ ہم اسٹرائیک کر دیں گے۔ بلکہ کر دیا ہے اسٹرائیک ہم نے ——— آپ نے ہماری سخت دل آزاری کی ہے"

آفتاب رائے اپنے چشمے سے کشوری کو دیکھتے رہے ——— اری تو تو ڈپٹی جعفر عباس کی بیٹیا ہے! اری باؤلی سی ——— وہ بے ساختہ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن کشوری کے تیور دیکھ کر رک گئے۔ اور پھر بدل کر سنجیدگی سے کھنکارے "یہ بات یہ ہے مس عباس ———" انھوں نے کہنا

شروع کیا۔ سیاست اور حصولِ تعلیم کے درمیان جو ——"

"اجی ڈاکٹر صاحب بس اب بہنے دیجئے ——" کسی نے آگے بڑھ کر کہا —— ہم خوب اس ڈھونگ کو جانتے ہیں۔ معافی مانگئے قصہ ختم ——"

"ڈاکٹر صاحب میں نے کہا بنارس کیوں نہیں واپس چلے جاتے ——؟" دوسری آواز آئی۔

"دیکھیے میاں صاحبزادے ——" آفتاب رائے نے رسان سے کہا —— "معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے متعلق میرے چند نظریے اور اصول ہیں۔ میں اور تمہاری دل آزاری کروں گا؟ کیا باتیں کرتے ہو ——؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے ——" انھوں نے شور مچایا —— "معافی مانگئے۔ ورنہ ہم کل اورنگ زیب ڈے منائیں گے۔"

"ضرور منائیے ——" آفتاب رائے نے نیک بخت بے حد اُکتا کر کہا۔

"اور مکمل اسٹرائیک کریں گے۔"

"ضرور کریں ——۔ خدا مبارک کرے ——" انھوں نے آہستہ سے کہا۔ اور چق اٹھا کر اندر چلے گئے

"کٹر ٹھاکر بھائی نکلا یہ بھی ——" لڑکوں اور لڑکیوں نے آپس میں کہا اور برساتی سے باہر نکل آئے۔

وہ رات آفتاب رائے نے شدید بے چینی سے کاٹی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے۔ ہندو لڑکوں کو یونہی پاس کر دیا جاتا۔ ہوسٹلوں میں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن جس ہوسٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اس کے جواب میں مغرب کی نماز کے وقت ہندو اکثریت والے ہوسٹلوں میں لاؤڈ سپیکر نصب کر کے گراموفون بجایا جاتا۔

چند روز بعد آفتاب رائے کے سر میں جانے کیا سمائی کہ استعفےٰ دے دیا اور غائب ہو گئے۔ سائے میں ڈھنڈیا پڑ گئی مگر ڈاکٹر آفتاب رائے نہ اب ملنے میں نہ تب لوگوں نے کہا ایک چول ہمیشہ سے ذرا ڈھیلی تھی۔ سنیاس لے لیا ہوگا۔ پھر تقسیم کا زمانہ آیا۔ اب کسے ہوش تھا کہ آفتاب رائے کی فکر کرتا۔ اپنی ہی جانوں کے لالے پڑے تھے۔

ملک آزاد ہو گیا۔ کلیم دتی کی شادی ہو گئی۔ کشوری کے مگھر والے آدھے پاکستان چلے گئے۔ اس کے ابا اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے کم سجھائی دیتا تھا۔ ایک ٹانگ پر فالج کا اثر تھا۔ دن بھر وہ جو پور میں اپنے گھر کی بیٹھک میں پلنگڑی پر لیٹے تاریخ کا مطالعہ کیا کرتے۔ اور پولیس پر سے ان کی رنگ کرتی۔ آپ کے بیٹے کا پاکستان سے آپ کے پاس کب خط آیا تھا؟ آپ نے کراچی میں کتنی جائداد خرید لی ہے؟ آپ خود کب جا رہے ہیں؟ اصغر عباس ان کا اکلوتا لڑکا تھا اور اب پاکستانی فوج میں بھرتی تھا۔ نہ وہ ان کو خط لکھ سکتا تھا اور اگر مر جائیں تو مرتے وقت وہ اس کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ تو کشوری کے لئے مصر تھا کہ وہ اس کے پاس راولپنڈی چلی آئے۔ لیکن ڈپٹی صاحب ہی نہ راضی ہوئے کہ انت سمے بیٹیا کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیں۔ وہی کشوری، جنتی جس کی ایسے مسلم اللہ کے گنبد میں پرورش ہوئی تھی۔ اور اب وقت نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ جو پور کے گھر کی چار دیواری سے باہر مدتوں سے کھٹو کے کیلاش ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ ایم۔ اے میں پڑھتی تھی۔ اور اس فکر میں تھی کہ بس ایم اے کرتے ہی پاکستان پہنچ جائے گی۔ اور ملازمت کرے گی۔ اے صاحب آزاد قوم کی لڑکیوں کے لئے ہزاروں باعزت راہیں کھلی ہیں۔ کالج میں پڑھائیے۔ بینسٹ گارڈ میں بھرتی ہو جائیے۔ اخباروں میں مضمون لکھئے۔ ریڈیو پر بولئے۔ کوئی ایک چیز ہے جی ہاں۔ وہ دن گن رہی تھی کہ کب دو سال ختم ہوں اور کب وہ پاکستان اڑ کر پہنچ جائے —— لیکن پھر بابا کی محبت آڑے آ جاتی۔ دکھیا اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں سے سجھائی بھی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں بیٹا کچھ دن اور باپ کا ساتھ دے دو۔ جب میں مر جاؤں تو جہاں چاہنا جانا۔ چاہے پاکستان چاہے انگلینڈ اور امریکہ میں۔ میں اب تمہیں کسی بات سے روکتا تھوڑا ہی ہوں۔ بیٹیا تم بھی چلی گئیں تو میں کیا کروں گا۔ محترم میں میرے لئے سوز خوانی کون کرے گا۔ میرے لئے

دل کی کا علاج کون بتائے گا۔ پرت پڑتے ہی مجھے چھوڑ کر چل دیا پھر ان کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ اپنی سفید داڑھی کو جلدی جلدی پونچھتے ہوئے یا علی کہہ کر دیوار کی طرف رخ کر لیتے۔

بڑی بھاوج ان سے کہتیں ——— دیوانے ہوئے ہو۔ بیٹیا کو کب تک اپنے پاس بٹھلاؤ گے۔ آج نہ گئی کل گئی۔ جانا تو اسے ہے ہی ایک دن۔ یہاں اس کے لئے اب کون سے رشتے رکھے ہیں۔ سارے اچھے اچھے لڑکے ایک ایک پاکستان چلے گئے۔ اور وہاں ان کی شادیاں بھی دھما دھم ہو رہی ہیں۔ یہ اصغر عباس کے پاس پہنچ جاتی تو وہ اسے بھی کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر ٹھکانے لگا دیتا ——— بڑی بھاوج کی اس شدید حقیقت پسندی سے کشوری کو اور زیادہ کوفت ہوتی۔ اور یہ ایک واقعہ تھا کہ اس نے پاکستان کے مسئلے پر اس زاویے سے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ویسے وہ سوچتی کہ بابا ہندوستان میں ایسا کیا کھونٹا گاڑ کر بیٹھے ہیں۔ اچھے خاصے ہوائی جہاز سے چلے چلتے مگر نہیں۔ اور یہ جو بابا کی ساری قوم پرستی تھی۔ سارا جوش و خروش ہر بھر سے واقف ہے کہ بابا کتنے بڑے نیشنلسٹ تھے۔ تب بھی پولس پیچھا نہیں چھوڑتی ہمارے حکام اور پولس والے جن کے سنگ جنم بھر کا ساتھ کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہی اب جان کے لاگو ہیں۔ کل ہی عجائب سنگھ چوہان نے جو ہر بھر کے زمانہ بابا کے پاس بیٹھ کر شعر و شاعری کرتا تھا دو بار یہ دوڑ بھجا کر خانہ تلاشی لی۔ گویا ہم نے بندوقوں اور ہتھیاروں کا پورا میگزین دفن کر رکھا ہے۔ پھر اسے بابا پر ترس آ جاتا۔ بچارے بابا۔

اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت بھی ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اصغر عباس پاکستان سے روپیہ نہ بھیج سکتا تھا۔ جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان پر ہندو کاشتکار قابض ہو گئے تھے اور دیوانی کی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی شنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی اماں مرحومہ کی مقدمہ بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچا رہا تھا۔ وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کر دیا تھا۔ جو وہ پاکستان لے گئی تھی۔ باقی روپیہ ڈپٹی صاحب کی پنشن کا کشوری کی تعلیم پر خرچ ہو رہا تھا۔ ان کے علاج کے لئے ——— سے آتا اور فاخر تو بالکل ایسا روگ ہے کہ جان کے پیچھا چھوٹتا ہے۔ چنانچہ نوبت یہ پہنچی کہ چپکے چپکے بڑی بھاوج نے چھوٹی بیگم کے ذریعے چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے فروخت کروا دیئے۔ ویسے اس میں ایسی شرم کی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ مرگ انبوہ جشنے دارد، ان گنت مسلمان گھرانے ایسے تھے جن کو ملازمتوں سے نکالا جا رہا تھا۔ یا جن کو نوکریاں نہ دی جاتی تھیں۔ وہ اپنے اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ بیچ کر گذارہ کر رہے تھے لیکن بڑی بھاوج چناک والی آدمی تھیں۔ اور ابھی ان کے بھلے وقتوں کو گذرے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ کشوری کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کی زبستی گم ہو گئی۔ اس نے پاکستان جانے کا خیال بالکل ترک کر دیا۔ اور سرگرمی سے ملازمت کی تلاش میں جٹ گئی۔

اسے یقین کامل تھا کہ اب ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ اچھے سیکنڈ ڈویژن والی اکنامکس کی ایم اے کو کہیں جونیئر لیکچرشپ بھی نہ ملے گی۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ ایک جگہ تو اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ صاحب بات یہ ہے کہ جگہ تو خالی ہے۔ لیکن ہم پاکستان سے آئی ہوئی شرنارتھی لڑکیوں کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اور ویسے ایمان کی یہ بات ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ ہمارے پاس آپ کی وفاداری کا کیا ثبوت ہے ظاہر ہے کہ آپ کسی خانگی مجبوری کی وجہ سے ہندوستان میں رکی ہوئی ہیں۔ پہلا موقع ملتے ہی آپ بھی پاکستان چلی جائیے گا۔ ہم موقع پرستی، مجبوری اور وفاداری کے مدارج الگ الگ پہچانتے ہیں۔

قدم قدم پر اس کو ایسی سننے کو ملتا۔ اور وہ گھوم پھر کے جونپور لوٹ آتی۔ بڑی بھاوج نے اس سے کہا ——— وہ تمہاری گویاں کم کے ماموں آفتاب بہادر تھے۔ ان کو ہی جا کر پکڑو۔ وہ تو بڑے با اثر آدمی ہیں۔ اور بڑے شریف۔ ضرور مدد کریں گے۔ اور کشوری کو خیال آیا۔ کس طرح وہ جلوس بنا کر ان کے پاس پہنچی تھی۔ اور ان کو سخت سست سنائی تھیں۔ اس کے اگلے ہفتے ہی وہ غائب ہو گئے تھے۔

آفتاب رائے ——— اب پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گے۔ آڑتی اڑتی سنی تھی۔ کہ بمبئی میں حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں

ان کو مرآد بھی ڈیسائی نے پکڑ کر احمد آباد جیل میں بند کر دیا تھا۔ جیل سے چھٹے تو کچھ اور بگڑ بڑ ہوئی اور غالباً ان کو ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ اب شاید وہ روس میں ہیں اور سمرقند، بیڈ یسے اُردو میں خبریں سناتے ہیں۔ دوسری روایت تھی کہ نہیں صاحب ڈاکٹر آفتاب رائے تو آج کل پنڈت نہرو کی بالکل مونچھ کا بال بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کو ری پبلک لمبی ڈور ایمبیسڈر بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ بہرحال۔ ڈاکٹر صاحب نوعمری سے گویا "مستقل" زیرِ زمین تھے۔

بچارے آفتاب رائے

آج چاند رات تھی۔ محلّے میں نقارہ رکھا جا چکا تھا۔ مجلسیں اب بھی ہوتیں۔ لیکن وہ چہل پہل، رونق اور بے فکری تو کب کی خوابِ خیال ہو چکی تھی۔ ڈیوڑھی میں ڈولیاں اُترنی شروع ہوئیں اور بیبیاں آ آ کر امام باڑے کے دالان میں بیٹھنے لگیں۔ کشوری بیدلی سے دہلیز پر اپنی پرانی جگہ پہ بیٹھی رہی۔ دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی اب چھدری چھدری نظر آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین افراد تو ضرور ہی ہجرت کر گئے تھے۔ بڑی بھاوج بہت مشکل سے پاؤں گھسیٹتی اِدھر اُدھر چل پھر رہی تھیں۔ اب وہ اللے تللے کہاں۔ ساری مہریاں اور کہاریاں اور پاسنیں ایک ایک کر کے چھوڑ کر چلدیں۔ بس نگوڑی مموله رہ گئی تھی۔ بس اس کی آواز کو بھی پالہ مار گیا تھا لیکن جمو بیگم کو آتا دیکھ کر وہ پھر للکاری ——— آگئیں چھمو بیگم ——— آؤ جم جم آؤ ———

چھمو بیگم چپ چاپ آن کر منبر کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ زیارت پڑھ کے تعزیوں کو جھک کر سلام کرنے اور کنپٹیوں پہ انگلیاں چٹخا کر جناب علی اصغر کے سر بجاروٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انھوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا ——— "مولا یہ میرا آخری قدم ہے۔ ارے اب تمھاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی" ——— اور یہ کہہ کر انھوں نے زور و شور سے رونا شروع کر دیا۔

بوا مدن اپنی پرانی "دشمنانگی" فراموش کر کے سرک کر ان کے قریب آ بیٹھیں اور بولیں ——— "بولو اتم حسینؑ کو یاد کرو۔ اپنا غم ہلکا ہو جائیگا ——— مولا تو ہر جگہ ہیں۔ کیا پاکستان میں نہیں ہیں ———"

"ہاں ——— ہاں ———" باقی بیبیوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے تائید کی ——— مولا کیا پاکستان میں نہیں ——— تم وہاں مولا کی مجلسیں قائم کرنا۔

"بولو ——— ہم بھی چلے پاکستان ———" جب محض کی رقت ذرا کم ہوئی اور چھمو بیگم چاند رات کا بیان ختم کر چکیں تو بوا مدن نے اپنا اناؤنسمنٹ بھی کر ڈالا۔

"سچ کہو بوا مدن ———" بڑی بھاوج نے گھٹنا پھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بھری۔ ہم بھی چلے پاکستان ———" بوا مدن نے اعتراف کیا۔

"کیسے چل دیں ———" بڑی بھاوج کو ایک طرح سے تو رشک ہی آیا۔ اچھے خاصے لوگ نکلتے چلے جا رہے ہیں سب فضیحتوں سے الگ۔ سارے دلدّر دور ہو جاویں گے وہاں پہنچ کر ———

"بس بڑی بھاوج رکا نہیں جاتا ——— وہاں سے ہر بار خط میں لکھتا ہے کہ بس اماں آ جاؤ ——— کوئی نگوڑی جگہ سکھر ہے۔ وہاں اس نے راشن کی ڈپو کھول لی ہے۔

اچھا ——— شکر ہے۔ مولا سب کی بگڑی بنائیں ———" بڑی بھاوج نے کہا۔

"عاشور کی شب کی لیلا ———" بوا مدن نے جو حسبِ معمول بینگ گھر بھول آئی تھیں دوبارہ غلط مرثیہ شروع کیا۔ لیکن سب پر ایسی اُداسی

اور اکتاہٹ طاری تھی کہ کسی نے ان کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بگن نے آواز لگائی ——— چراغوں کی روشنی والان میں مدھم سا زرد اجالا بکھیرتی رہی۔ انگن کا گیس کا بنڈہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

اس تاریکی میں کشوری سیاہ دوپٹے سے سر ڈھانپے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھی سامنے رات کے آسمان کو دیکھتی رہی۔

۸

کنول کماری جین نے مہمانوں کے جانے کے بعد نشست کے کمرے میں واپس آکر دریچوں کے پردے گرائے اور چاء کا سامان میزوں پر سمیٹنے لگی۔ مدراسی آیا ایک ہی تھی جسے وہ ہمراہ لیتی آئی تھی اور پردیس میں ملازموں کے فقدان پر اس نے ملٹری اڈوائزر بریگیڈیر کھنہ کی بیوی سے بڑا رقت انگیز تبادلۂ خیالات کیا تھا۔ گھر کی صفائی اور بچے کی دیکھ بھال کے بعد جو اسے وقت ملتا اس میں وہ رائل اکیڈمی آف ڈرامٹک آرٹ جا کر گریگرنی سیکھتی تھی۔ سر لارنس اور لیڈی اولیویئر اپنی ہیسکر سٹیفرڈ ائی ان سب سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ سب مل کر گھنٹوں فن اداکاری، جدید آرٹ اور ہندوستانی بیلے پر گفتگو کرتے۔ جین کے پاس ان سب کھکھیڑوں کا وقت نہ تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کے تو وہ دفتر سے نپٹ کر انڈیا ہاؤس سے لوٹتا۔ اور وہ تو صاف بات کہتا تھا کہ بھائی میں انٹلکچوئل وغیرہ نہیں ہوں۔ سیدھا سیدھا آدمی ہوں اور جس ڈھرّے پر سن پینتیس سے چل رہا ہوں وہی میرے لئے ٹھیک ہے انگریز کے زمانے میں وہ ملک کے طبقاتی قطب مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ چکا تھا۔ اور اب تو وہ اتنا اونچا تھا کہ بالکل بادلوں پر براجمان تھا۔ انگریز کے زمانے میں ڈریس سوٹ پہنتا۔ اب صفید چوڑی دار پاجامے اور سیاہ شیروانی میں ملبوس سفارتی ضیافتوں میں کیا ہلکی پھلکی پنی تلی باتیں کرتا۔ خود کنول کیا کم معرکے کی "ڈپلومیٹک وائف" تھی۔ جہاں جاتی محفل جگمگا اٹھتی۔ واہ واہ۔ مثلاً آج ہی کی پارٹی میں اس نے کوریا کی کرشنا مینن والی تجویز کے سلسلے میں "نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن" کے ایڈیٹر کنگزلے مارٹن اور جدید شاعر لوئی مک نیس دونوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ سب کو فائل ہونا پڑا۔ چاند باغ کے اچھے پرانے سنہرے دنوں میں تو خیر وہ یونہی چھیڑ میں انٹلکچوئل بن گئی تھی کہ یہ یونیورسٹی کی زندگی کا ایک لازمی جزو تھا۔ پر یہ تو ان دنوں اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ ان ساری جدید ہین الاقوامی گلیمر س ہستیوں سے یوں نجائی چٹکے کے ساتھ ملا کرے گی جیسے وہ سب کا جرمولی ہیں۔

"سوریہ است ہو گیا ——— سوریہ است ہو گیا ——— اردلا گنگناتی ہوئی اندر آئی۔

کنول دیدی ——— جاتے جاتے مجھے خیال آیا کہ ایک بار آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ آپ کو مجلس میلے میں آنا ہے ———"

"ہاں ہاں بھئی ———" کنول نے جواب دیا "اور وہ میری کتاب تو دیتی جاؤ ———"

"ارے ہائے ———" اردلا نے رک کر کہا "وہ تو ڈاکٹر آفتاب رائے نے مجھ سے لے لی۔ وہ مجھے انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے چھین کر لے گئے، کہنے لگے کل دے دیں گے ———"

"ڈاکٹر ——— آفتاب ——— رائے ———" کنول نے دہرایا۔

"ہاں ——— کنول دیدی ———" اردلا نے اسی طرح لاپروائی سے بات جاری رکھی "وہ تو دن بھر یونہی لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ آج کل ایک نئی کتاب لکھ رہے ہیں آج مہینوں کے بعد اتفاقاً نظر آ گئے۔ ان کا کوئی مجموعہ تھوڑا ہی ہے۔ لیکن کل وہ براڈ کاسٹنگ ہاؤس آ رہے ہیں۔ وہاں کتاب مجھے لوٹا دیں گے۔ اچھا گڈ نائٹ کنول دیدی ———"

"گڈ نائٹ اردلا ———"

۔ ارے ہاں" اُس نے جاتے جاتے رُک کر پھر کہا "کل آپ رائل کمانڈ پرفارمنس میں جا رہی ہیں ——— ؟ آپ کو تو سر مالف رچرڈسن نے خود ہی بلایا ہوگا ———"

"ارے نہیں بھئی ———" کنول نے پیشانی پر سے بال ہٹا کر تھکی تھکی آواز میں کہا ("یہ بھی اس کا ایک پوز ہے") "ایک دل جلی مسز اچاریہ نے ہوسکنڈ سکرٹری کی بیوی تھی۔ مارے حسد کے اپنی ایک سہیلی سے کہا تھا کہ جانتی ہے کہ بکھرے ہوئے بال اس کے اوپر زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ چڑیل کہیں کی") نہیں بھئی اُرملا۔ مجھے یہ پارٹیوں اور سفارتی مصروفیتوں کا سلسلہ بعض دفعہ بالکل بور کر دیتا ہے۔ اس سے کہیں پناہ نہیں ———"

"اچھا گڈ نائٹ ———"

"اچھی طرح سوؤ ———" کنول نے کہا۔ اُرملا ہر بنس رتنا تھ چڈھا دھیا کا کورس گنگناتی ہوئی نچلی منزل میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے ——— ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے ——— ابھی ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ چھین کر لے گئے ——— کہنے لگے کل دیدیں گے ——— وہ صوفے پر بیٹھ گئی ——— دانستی ——— اس نے چلا کر آواز دی۔ کھانا گرم پہ لگا دو ——— اس نے ٹیلی ویژن کھولا۔ بکواس ہے۔ بند کر دیا۔ پھر اس نے ریڈیو لگایا۔ کچھ اس تھا۔ اسے بھی بند کر دیا۔ کیا پتہ اس سے لکھنؤ ریڈیو پر اچانک بھجن گاتی ہوئی بوڑھی پھوپھی نکل آئیں ——— نکر کر بوجھے بوجھے ہو ——— اور چاند باغ کی خاموش سڑکوں پر سے لڑکیاں نیٹرن سروس کے بعد لوٹتی ہوں گی ———

میں نے کیا کیا تھا ——— ؟ اس نے سوال کیا۔ کچھ نہیں۔ میں اب دس سال سے کنول کماری ہیں ہوں۔ یہ تو کچھ بات نہ بنی۔ بات کس طرح بنتی ہے۔ کیوں نہیں بنتی ——— سال گذرتے جا رہے ہیں۔ میں کنول کماری جس نے یہ سب دیکھا۔ ایک روز یونہی ختم ہو جاؤں گی۔ اور تب بہت اچھا ہوگا۔

ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا۔ پر ہو گیا۔

کنول ڈارلنگ ——— ثروت نے انگلی اٹھا کر سخت صوفیانہ انداز میں اس سے کہا تھا ——— جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی بیٹھ ———

——— میں برہمن ڈوبت ڈری رہی کنارے بیٹھ ——— ؟ کنول نے سوچا تھا۔

کنارا ابھی تو نہیں ہے۔

پانے کے کیا معنی ہیں ؟ کیا ملتا ہے۔ ؟

باہر اندھیرا تھا۔ اور سردی۔ اور ہیکیاں خاموشی۔ میں زندہ ہوں۔

ارے بھئی ؟ آفتاب بہادر ——— اس نے غصے سے سر ہلا کر دل میں سوال کیا ——— تم کیوں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہارا کچھ بگاڑا تھوڑا ہی تھا۔ تم اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں وہیں کہیں تمہاری زندگی کے تانے بانے میں کسی کو بنے میں آکر چپکی بیٹھ جاتی اور بس تمہارے لئے پوریاں بنایا کرتی۔ تم اسی طرح رہتے۔ اس میں تمہاری شکست نہ تھی۔ تمہاری تکمیل تھی میاں آفتاب بہادر ——— ؟

نیچے کیرل گانے والے بیٹھے کی اور نکل گئے تھے۔

آفتاب بہادر ——— اب جو میں ہوں۔ اور جو تم ہو ——— کیا یہی بہت ٹھیک ہے۔ ؟

بہت زمانہ ہوا اس نے چاند باغ میں ایک لڑکی کو دیکھ کر جو آفتاب رائے کو بہت پہلے سے جانتی تھی۔ سوچا تھا کہ جانے آفتاب کی بیوی کیسی ہوگی (ایک بار خود اس کے لئے اس کی دوست ثروت نے ایک بوڑھے آدمی کی تصویر سامنے لاکر کہا تھا۔ آنے والے وکیر کی وصفہ ہی سی اک تصویر دیکھ ——— !! اور کمال یہ کہ عین میں اسی طرح کا آدمی جین نکلا ———) آفتاب کی بیوی۔ یہ فقرہ کتنا عجیب لگتا تھا۔ کوئی ہرگز چڑیل۔ آخر وہ بیسب کو کیا کھاتے ہیں ——— ثروت نے اضافہ کیا تھا۔ خوبصورت تو ضرور ہوگی اور ٹھیٹس کھلتی ہوگی۔ جس کا آفتاب کو اتنا شوق ہے۔ لیکن نراٹے بھرنے اور ہوا میں اُڑنے والی لڑکیاں تو وہ سخت ناپسند کرتا تھا جس کو وہ پسند کرے گا وہ تو بہت ہی ملکہ ہوگی بس بالکل مجموعہ خوبی۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔ جی ہاں۔ اور مجھ میں کیا برائی تھی؟ اس نے طے کرنا چاہا۔ کہ آفتاب کا رویہ یہ تھا کہ اس پر کنول کماری پر یہ وہی اُترنی چاہیئے تھی کہ یہ مہاپرش، آسمان پر سے خاص اس کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لیکن یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس کنول کماری سے یا روزانہ آکر ملے یا کبھی نہ ملے۔ اُس سے طبلہ اور جے جے ونتی سُنے۔ پوریاں بنوا کر کھائے۔ پھر ایک روز اطمینان سے آگے چلا جائے۔ اور یہ کنول کماری بعد میں بیٹھ کر جھک مارتی رہے۔ اور کیا وہ اس کے پیچھے پیچھے ڈنڈالے کر دوڑتی کہ اے میاں آفتاب بہادر ایک بات سنتے جاؤ ——— ان دنوں ثروت نے ایک اور لطیفہ ایجاد کیا۔ چیلنج کے بعد ایک روز اس نے "گیمنگ" کی باتی افزا سے کہا۔ ——— یعنی نمبر ۲۹۔ اے پی سین روڈ پر آج کل یہ سلسلہ ہے کہ اگر بھائی آفتاب چاہ پیتے پیتے رک گئے۔ دفعتاً کنولا رانی سے کہتے ہیں۔ بھئی کنول مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے تو ہماری کنولا رانی کو فوراً یہ دھیان ہوتا ہے کہ اب شاید یہ پرپوز کرنے والا ہے۔ پر وہ بات محض اتنی ہوتی ہے کہ کبھی ذرا ٹیلیفون کر دو۔ کہ آم خریدنا لانے۔ یا اسی قسم کی کوئی اور شدید اہمیت کی بات ہوتی ہے۔ ثروت اس قدر غمگین تھی ——— وہ سارے مسخرے پن کے قصے یاد کر کے اب اس نے دل میں ہنسنا چاہا۔ لیکن ہمدردی بڑھتی گئی۔ اور یکساں تنہائی۔ اور زندگی کے ازلی اور ابدی پچھتاووں کا ویرانہ۔ آفتاب بہادر تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلا وطنی کی زندگی ہے۔ ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی دُنیا جو ہو سکتی تھی۔ اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میرے سامنے صرف رائل کمانڈ پرفارمنس ہیں۔ اور جین کے صبح کے ناشتے کی دیکھ بھال۔ اور ہیر ہر دلعزیزی جو مجھ پر ٹھونس دی گئی ہے لیکن تم بھلا کیا سوچو گے (اس نے کہا تھا۔ ارے تم لوگ اسی کو پسند کرتی ہو جو ایک مخصوص معیار پر پورا اُترتا ہے۔ کیا اٹی مطلق تھی۔ یعنی جیت بھی تمہاری پٹ بھی۔ آخر اس ساری لفاظی، اس ذہنی اور تصوراتی گورکھ دھندے سے تمہارا مطلب کیا نکلا۔ واہ وا چغد آدمی کہیں کے۔

ثروت نے اس کی شادی کے بعد ایک اور میل کے سامنے نہایت جامع و مانع اختصار کے ساتھ اس طرح تشریح کر دی تھی کہ قصہ کو یوں مختصر کرتی ہوں اے عزیزہ۔ کنول کی ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ساری عمر تو کوئی ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ سب ہیں ہیں میکھ نکالتی رہیں اور مارے بد دماغی کے کسی کو خاطر ہی میں نہ لا دیں۔ اور جن پروردگار کو آپنے نہایت صدق دل سے پسند فرمایا۔ وہ خود ہی ہری جھنڈی دکھا گئے ——— بس اب کیا ہے پیاری بہن۔ جب آنکھ کھلی تو گاڑی نکل چکی تھی۔ پٹڑی چمک رہی تھی ——— جی ہاں۔

اری ثروت ——— کردگ کہیں کی۔

مگر سوال یہ تھا کہ ہر چیز کے متعلق اس مذاق اور خوش دلی کا رویہ کہاں تک گھسیٹا جا سکتا تھا۔ (لیکن اس کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتی ہو۔ ثروت نے کہا تھا) زندگی نہ ہوئی ایسٹیفن لیکاک کا مسخرہ پن ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارا مذاق کہاں ہوتا ہے اور سنجیدگی کہاں سے شروع ہوتی ہے (یا ——— VICE VERSA)

ڈاکٹر صاحب تو دن بھر لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ اور آج کل ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں۔ اسے آرلا نے مطلع کیا ہے۔ اب وہ کیا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ڈی پی مکرجی کی طرح مہاگرو بن چکا ہے۔ غالباً اس نے شادی کر لی ہوگی۔ یہاں پہنچ کر اسے عجیب و غریب اور انتہائی شدید

تکلیف کا احساس ہوا ـــــ (وہ کون ہوگی ـــــ کیسی ہوگی ـــــ آفتاب کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کیسی نظر آتی ہوگی۔ آفتاب اس سے کہاں ملا ہوگا) یا اب تک وہ کنفرمڈ بیچلر بن چکا ہوگا (بہت سے لوگوں کے لئے اس میں بھی سخت گلیمر تھا ـــــ کیا بات ہے صاحب ـــــ اتنی ساری حماقتوں سے علیحدہ اور برگزیدہ ـــــ اپنی نہایت شخصی دنیا، اپنے شغلے، کتابیں، موسیقی، بیٹھکوں کے کونسرٹ، چند دلچسپ سے گنے چنے دوست۔ اتوار کے روز دن بھر کسی کنٹری کلب کی لاؤنج میں بیٹھے ٹائمز پڑھ رہے ہیں۔ تیسرے پہر کو ڈریسنگ کر چلے گئے۔ اور ٹینس کھیلا۔ اِدھر اُدھر خواتین سے مل لئے۔ لیکن لڑکیوں کو ہمیشہ بڑے ترحم کی نگاہوں سے دیکھا گویا ـــــ بیچاریاں ـــــ اور اپنا بے نیازی اور سرپرستی کا رویہ قائم رکھا ـــــ یہ سب ثروت نے ایک دفعہ ارشاد کیا تھا) اچھا بھئی آفتاب بہادر ـــــ تم کتابیں لکھتے رہو میں ان پر فرنٹ پیج پروگرام میں ریویو کر دوں گی۔ راستہ اسی طرح طے ہوتا رہے گا۔

صبح ہوئی شام ہوئی ـــــ زندگی تمام ہوئی ـــــ زندگی تمام ہوئی ـــــ نچلی منزل میں اماں ہر نیند رناتھ چٹوپادھیا کا وہ کمبخت کورس آہستہ آہستہ الاپے جا رہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ کمرہ اب کم ہو گیا تھا۔ اور آسمان کا رنگ قرمزی تھا جس کے مقابل میں کیتھیڈرل چرچ کے ہولناک گنبد کا سلیٹ نحوست سے اپنی جگہ پر قائم تھا۔

ادنیٰ لبادوں میں ملفوف مشرقی یورپ سے بھاگے ہوئے لوگ بھاری بھاری قدم اٹھاتے ہاتھوں میں شمعیں لئے مڈنائٹ ماس کے لئے گرجا کی سمت بڑھ رہے تھے ـــــ

صبح ہوئی شام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی

(۹)

جب مجھے ملازمت نہ ملی تو میں نے سمندر پار کے وظیفوں کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ وہاں بھی وہی نقشہ تھا۔ لیکن انگریز پھر آڑے آیا۔ اور برٹش کونسل نے مجھے یہاں آنے کا وظیفہ دے دیا۔ اور جب میں نے روانہ ہونے کی خبر بابا کو سنائی تو وہ بالکل چپ ہو گئے اور اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہ بولے۔ اور ابھی میں راستے ہی میں تھی، جب مجھے اطلاع ملی کہ بابا مر گئے ـــــ "کشمیری نے مدھم آواز میں بات ختم کی اور پچھے سے انگیٹھی میں لکڑی کے کندوں کو ٹھیک کرنے میں منہمک ہو گئی۔

آج مڈنائٹ ماس منانے جائیں گے۔ روز ماری نے اپنے برش اور کینوس سمیٹتے ہوئے کہا۔ چلو ہم بوسٹن اور ویری چلیں۔ جہاں ایک شام میں نے پیلے بالوں اور اداس چہرے والی ایک ہینگیرین پناہ گزیں لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سرپر سیاہ اسکارف باندھے تسبیح ہاتھ میں لئے گھٹنوں سے ساکت اور منجمد بیٹھی تھی۔ اس کا یہ انداز کتنا قابلِ رحم تھا۔ میں نے قربان گاہ کے ستونوں کے پیچھے چھپ کر اس کی تصویر بنائی۔ میں نے اس تصویر کا نام "آزادی سے فرار" رکھا تھا۔ لیکن جب اسے نمائش میں رکھا جانے لگا تو ہم عصر فنون کی انجمن نے اس کا نام بدل کے "آزادی کا شکرانہ" کر دیا ـــــ آج کی رات میں وہاں امید اور ناامیدی کی ان کرب ناک کیفیتوں کے چند اور اسکیچ تیار کروں گی۔

کتنی کیفیتیں ہیں جنھیں الفاظ اور رنگوں کے روپ میں ڈھالا ہی نہیں جا سکتا۔ جن کے اظہار سے ان کی بے وقعتی اور توہین ہوتی ہے ـــــ

کشوری نے سوچا (یہی بات اپنے لئے کتنی بار کنول نے محسوس کی تھی۔ لیکن کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔)

کیسی بے بسی ہے کہ سب اپنے اپنے دماغوں میں محصور ہے جانے پر مجبور ہیں۔

تم کو معلوم ہے کہ میں یکلخت اس طرح تم سب سے یہ باتیں کیوں کر رہی ہوں۔ کشوری نے کہا۔

"سنتے ہیں کہ جب مدتوں کے بچھڑے ہوئے دو جنے دوبارہ ملتے ہیں تو ساری پرانی بیگانگت یاد آجاتی ہے۔ پرانے دوستوں سے مل کر کسے کو خوشی ہوتی ہے"۔ اس نے بات آہستہ آہستہ جاری رکھی ——— "لیکن پرانے "دشمن" سے مل کر مجھے کیسی مسرت ہوئی ——— آج صبح مجھے بالکل اتفاقیہ کیمیم وتی پھر سے نظر آگئی۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ یہاں پر ہے وہ ایک دوکان سے نکل رہی تھی "ارے کیمیم ——— کیمیا" ——— میں چلا کر اس کی اور دوڑی۔ اس نے مجھے واقعی نہ پہچانا۔ وہ بہت موٹی ہو گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ غالباً اس کا شوہر تھا۔ "کیمیا رانی تم ہم کو نا ہیں چینہیں؟" میں نے بالکل بے ساختگی سے اپنی زبان میں اس سے کہا۔ جو اس کی اور میری اودی زبان تھی ——— ہلکشوری ——— اس نے مطلق کسی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا۔ نہ تو۔ اس کے شوہر نے مسکرا کر سلام کیا۔ یہ میرے پتی ہیں۔ کیمیم نے اس سرد مہری کے انداز میں بات کی۔ نمستے بھائی صاحب ——— میں نے بیحد خوش دلی سے کہا۔

"تم تو پاکستانی ہو۔ تمہیں نمستے نہ کہنا چاہیئے" کیمیم نے بڑی طنز کے ساتھ کہا۔ میرے اوپر جانو کسی نے برف ڈال دی۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسری اور دیکھا اس کے شوہر نے جو بہت سمجھدار معلوم ہوتا تھا۔ فوراً بات سنبھالی اور کہنے لگا ——— "اچھا بہن جی ——— اس سے تو ہم بہت جلدی میں ہیں۔ آپ کسی روز ہمارے یہاں آئیے۔ ہم یہیں ساؤتھ کنیزنگٹن میں رہتے ہیں ——— "اچھا۔ ضرور آؤں گی۔ بائی بائی کیمیم" ——— میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور آگے چلی گئی۔ میں نے اُسے یہ بھی نہ بتانا چاہا کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

"میں اس وقت کوئی رقت انگیز تقریر نہ کروں گی۔ میں یہ نہ کہوں گی۔ کہ رفیقہ۔ انسان نے خود کشی کر لی۔ پرانی اقدار تباہ ہو گئیں۔ اپنے پرائے ہو گئے۔ یہ سب پچھلے پانچ سال سے دہراتے دہراتے تم لوگ اُکتا نہیں گئے۔ یہ جو کچھ ہوا یہی ہونا تھا۔ اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومینٹک تصور لئے بیٹھی تھیں۔ گرانمایہ زندگی نہ ہوئی شاہنامہ رام کا ظلم ہو گئی۔ میں نے اور کیمیم نے جو کچھ کیا وہ ان سب باتوں کا نہایت منطقی نتیجہ تھا۔ اور باقی تم جو کہنا چاہتی ہو وہ جھک مارنی ہو۔ سمجھیں۔

"اس انداز سے میں نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا۔ لیکن چلو روزماری۔ اب ہم نئی تصویریں بنائیں گے" اُس نے روزماری کو مخاطب کیا "تم اگر ہمارے لیکچ تیار کر دو تو تمہاری آرٹ کونسل اور ہم عصر فنون کی انجمن ان کے لئے کون سے عنوان منتخب کریگی"

"ہم اپنے بدقسمت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی۔ اپنی خانہ جنگی کے دور نے اُس کی ذہنی تربیت کی اور اب اس ہولناک "سرد لڑائی" کے محاذ پر اسے اپنے اور دنیا کے مستقبل کا تعین کرنا ہے۔

"ہم لوگ یونیورسٹی کی اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ تہذیبی میلے اور تہوار منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ ہے مارکیٹ کے محفوظ تھیٹروں میں اپنے میلے کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ امن کانفرنسوں اور یوتھ فیسٹولز میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں سے واپس لوٹ کر کیا ہوگا۔

"تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی ——— ؟ میرا گھر اب کہاں ہے۔ ؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مشکوک چیز اور قابل رحم کردار بننے کے مستحق تھے ——— ؟؟

وہ خاموش ہو گئی۔ سب لوگ چپ چاپ بیٹھے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک مکان میں سوائٹ کرسمس" گائی جا رہی تھی۔

"شاید میں نے تمھیں بتایا تھا ——— " ارملا نے نیچی آواز میں کہا " کہ آج دفتر سے واپسی میں ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے میں نے اُن سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب۔ میں نے تو سنا تھا کہ آپ ری پبلک پلمی ڈورا میں سفیر ہیں۔ تم نے غلط سنا تھا ——— ! انھوں نے رسان سے مسکرا کر کہا۔ میں نے گھبرا کر ان کو دیکھا۔ تو کیا آپ بھی ——— میں نے سوال کرنا چاہا ہاں ——— میں بھی ——— اتنا کہہ کر وہ جلدی سے خدا حافظ کہتے ہوئے مجمع میں غائب ہو گئے۔ اور دوسرے لمحے اسٹیشن کی مہیب انڈر گراؤنڈ نے اُن کو نگل لیا۔ ان کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور وہ کسی سے بات کرنا نہ چاہتے تھے ——— نجانے وہ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ اتنا عرصہ انھوں کیسے گذارا۔ وطن واپس جانے کی اجازت انھیں کب ملے گی ——— کیا ہو گا ———؟"

دو روز کہ جاؤں کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ سب باہر سڑک پر آ گئے۔

ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے۔ اور رات ہمارے تعاقب میں ہے۔ انھوں نے سوچا ——— لیکن ہم رات کی وادی کو تیزی سے عبور کر رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم یہ لوگ جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں۔ لیکن دیکھو۔ یہ راستے۔ یہ جھیلیں۔ یہ باغات۔ ہمارے منتظر ہیں۔ سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔ اجنبی موت جو یک لخت ہمارے سامنے آ گئی۔ لیکن ہم اسے چھوڑ کر ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے۔ سنو۔ ہمارے پاس یقین ہے اور کامل اعتقاد جسے اس محبت نے تخلیق کیا ہے جو غداری کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ غداری محض یاسمین کے پھولوں کی آرزو ہے۔ وہ گرجا کی سمت بڑھتے ہے۔

سامنے راستے کی نیم تاریکی میں ایک الف منزلہ وضع کے میزبانوں میں دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ ہندوستانی سفیر کے فرسٹ سکرٹری کا مکان تھا۔ اس کے آگے پھر اندھیرا تھا۔ یہ کون دیوانی روح اپنی تنہائی سے گھبرا کر باہر نکل آئی ہے۔ انھوں نے سوال کیا۔ اس سے کہو یہاں کیوں کھڑی ہے ان لیموں کے نیچے۔ گھاس کے ان راستوں پر۔ زمین کے ان پھولوں کے درمیان اسے کچھ نہ ملے گا۔ انسان سیڑھیوں پہ یہ کون لوگ نظر آ رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ واپس جائیں اور صبح کا انتظار کریں۔

ہمارے اور ان کے خیالوں کے بھٹکنے ———؟

لیکن پھر گھنٹوں نے پکارا ——— آؤ ——— آج کی رات تمھارے وجود کے گناہ کا کفارہ ادا کیا جائے گا۔ میں تمھارے خدا کی آواز ہوں۔ اور تمھاری ہر تباہی میں شریک ہوں۔ اور ہر موت کا محافظ ہوں۔ اور اب پادریوں اور راہبوں کا جلوس آگے بڑھا۔ جو اپنے اپنے ملکوں سے جلاوطن ہو کر اس سمے خداوند خدا کی تقدیس کرتے تھے۔ اور گرجا کی مرمریں سیڑھیوں پر سیاہ اسکارف سے سر ڈھانپے عورتیں اور بوڑھے اور جوان بڑے صبر سے میلے ٹمٹماتی بھیر رہے تھے۔ اور ہولی کمیونین کے منتظر تھے۔

اب راستہ یہیں پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دیوار ہے۔ لیکن ریشمی پردوں میں سے چھن چھن کر روشنی اِدھر بھی پہنچ رہی ہے۔ گو بہت سے سیاہ پوش مریض دیوتا نے فلسفی اور ہمارا سا ستان راستہ روکے کھڑے ہیں۔

ہمیں تھا۔ ی موت عزیز ہے۔ کیونکہ تمھاری موت میں نجات ہے۔ ماس کے گھنٹوں نے کہا۔

ہماری ماں۔ چٹانوں کی بہن۔ سمندر کے روشن سناٹے ہمیں چپکا بیٹھنا سکھا۔ یہ ہمارا عہد نامہ ہے۔

یہ ہمارا پرانا عہد نامہ تھا۔ ان کے خیالات تباہ ہو چکے۔ اب ان کے پاس کیا باقی رہا ہے ——— آگ کے مدھم اور لرزہ خیز سروں کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے وہ سب آہستہ سے اپنے راستے پر واپس آئے۔

"کنولا رانی" ——— کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا۔ یہاں آ جاؤ۔

اور ہمارے ساتھ کھڑے ہو کہ اس خوب صورت روشنی کو دیکھو جو آسمان پر پھیل رہی ہے۔ اب کسی پچھتاوے کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

"پرانے عہد نامے منسوخ ہوئے" کشودی نے آہستہ سے دہرایا۔ "ہم اس طرح زندہ نہ رہیں گے۔ ہم یوں اپنے آپ کو نہ مرنے دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہوگی ——— ہمارے سامنے آج کی صبح ہے مستقبل ہے۔ ساری دنیا کی نئی تخلیق ہے۔"

لیکن کنول کماری ——— تم اب بھی رو رہی ہو ——— ؟

خدیجہ مستور

مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے

پتلی سی نالی میں پانی کی دھار بہہ رہی تھی اور صابن کا پھولا پھولا جھاگ پانی پر غلاف کی طرح چڑھا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی اندھیرے غسل خانے سے نہا کر نکلا تھا اور تولیے سے بال خشک کرتا ہوا صحن میں پڑی ہوئی آرام کرسی کو دھوپ میں گھسیٹ کر سردی سے اکڑتے ہوئے جسم کو ذرا گرم کرنے کے لئے بیٹھ گیا تھا۔ تولیے سے بالوں کو رگڑتے ہوئے اس کی نظر نالی پر پڑ گئی۔ گندی کیچڑ بھری نالی میں پانی رُک رُک کر بہہ رہا تھا۔۔۔ اسے اچانک وہ واقعہ یاد آ گیا جس نے اس کے بے حد حساس دل و دماغ پر بُری طرح اثر کیا تھا۔ کئی دن تک اس کی یہ حالت رہی تھی۔ جیسے وہ اس ایک واقعے کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہ سکتا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ سب کچھ بھولتا گیا لیکن آج بہت دن بعد صابن کے جھاگ کے ساتھ بہتی ہوئی پانی کی دھار نے اس کے ذہن میں اس واقعے کی یاد پوری شدت سے اُبھار دی۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں بے شمار آہیں گھٹنے لگیں۔ اس وقت اس کی کیفیت کچھ اس طرح عجیبی ہونے لگی جب وہ اس واقعے سے دوچار ہوا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل ایسے ایسے دردناک منظر دیکھے تھے کہ پتھر بھی پگھل کر رہ جاتا۔ لیکن کبھی وہ اس حد تک متاثر نہ ہوا تھا

شہر کی گہما گہمی کو موت نے نگل لیا تھا۔ زندگی کوئوں کھدروں میں منہ چھپائے سسک رہی تھی۔ ویرانی کہتی تھی کہ اب کبھی آباد نہ ہوں گے۔ موت کہتی تھی کہ ہمارے پنجے سے اب کوئی بھی نہ بچ سکے گا۔ گھماد ماری کمیٹی کے دردمند دل کہتے تھے کہ زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ ہم انہیں کیڑوں مکوڑوں کی طرح موت کے جال میں پھنس جانے دیں گے۔ وہ جہاں جہاں جا سکتے تھے، جہاں جہاں پہنچ سکتے تھے روتی مسکتی مایوس زندگیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر چُن چُن کر پناہ گزینوں کے کیمپ میں پہنچا رہے تھے۔ اس روز بھی وہ سامان لاری پر ویران نہر کے گوشے گوشے کا چکر لگا کر یہ پچاس فساد زدہ انسانوں کو کیمپ میں پہنچا کر محفوظ کر چکا تھا اور سارے دن کا تھکا ہارا پولیس چوکی پر لاری سے اتر کر گھر جانے کے لئے پیدل چل رہا تھا۔ شام کے پانچ بج رہے ہوں گے۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر آرام کرنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا کہ ایک دم اس کے پاؤں رُک گئے۔ سڑک کے کنارے بارہ تیرہ آدمی کھڑے جھک جھک کر نالی میں نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سب کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔۔۔ بلڈنگ کے عقبی دروازے میں بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا اور وہ سب اسے توڑنے کے متعلق سوچ رہے تھے۔

"ہم لوگوں نے آج تین دن ہوئے کہ اس گھر کے بچے بچے کو پار لگا دیا پر یہ جانے کیسے بچ رہا۔" سرخ آنکھوں اور بھیانک چہرے والا دیو چہرا پھر اسنے لگا۔

"پھر توڑ دو نا تالا جی!" دوسرے نے زمین پر لٹکتے ہوئے کمر بند سے اپنا اُلجھتا ہوا پاؤں نکال کر کہا۔ "لیکن سرخ تو ——— تالا پڑا ہے بھلا گھر میں کون ہوگا؟" اس نے لوگوں کو بھگانا چاہا۔ "کوئی نہیں ہوگا تو کیا یہ جادو کا کھیل ہو رہا ہے؟" "تیسرا سُرخ سُرخ آنکھیں نکال کر نالی کی طرف اشارہ کرنے لگا ——— چوڑی اتھلی نالی میں بلڈنگ سے آتا ہوا صابن کا جھاگ ملا پانی کچھڑ میں رینگ رہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ نحس فرمایا گیا ہے۔" چوتھا شخص اپنی قمیص سے چہرا صاف کرنے لگا اور وہ ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کرے۔ اس وقت وہ سپاہیوں کو بہت دور پولیس چوکی پر چھوڑ کر آ رہا تھا اور پولیس کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔

"تالا توڑ دو جی!" کئی آوازیں ایک ساتھ بھنبھنائیں۔

"لیکن دیکھو نا، انسانیت کا تو یہ تقاضا ہے ———" وہ انتقام کے جوش سے کھولے ہوئے دماغوں پر انسانیت کے تقاضوں کے چھینٹے دینا چاہتا تھا لیکن اس کی بات بیچ ہی سے جھپٹ لی گئی۔

"جب ہماری ماؤں، بہنوں اور ہمارے بھائیوں کو خون میں نہلایا جا رہا تھا جب انسانیت کہاں تھی اور جب آپ کہاں تھے؟" کئی آدمیوں نے ایک ساتھ سوال کر دیا۔

"اپنی انسانیت کے ساتھ سو رہے ہوں گے۔" بھیانک صورت اور سرخ آنکھوں والے نے شیطانی قہقہہ لگایا۔

"لیکن دیکھو نا ———" اس کے دونوں ہاتھ بلند ہو کر جھک گئے۔

"تالا تو ڑا جائے گا۔ آپ کیوں منع کر رہے ہیں؟" لوگ اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے وہ ان میں سے ایک نہیں۔

"میں منع نہیں کرتا تالا ضرور توڑ دو۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کی بات کوئی بھی نہ سُنے گا اور اگر زیادہ مخالفت کی تو اسے بھی چیر پھاڑ کر پھینک دیں گے۔ تالے کو تھوڑی ہی دیر میں کنڈے سے جُدا کر دیا گیا اور وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ وہ سب کے پیچھے تھا اور جیسے اس کی روح پھڑک پھڑک کر رو رہی تھی ——— وہ چھپے ہوئے انسان کی جان بچانے کے لئے تیزی سے سوچنے لگا اور اچانک اس کے ذہن نے جان بچانے کی ایک موہوم سی ترکیب سوچ ہی لی۔

"دیکھو یوں اندھا دھند آگے مت بڑھو۔ ممکن ہے کہ اس کے پاس بندوق ہو۔ میرے پاس رائفل ہے میں آگے چلتا ہوں تم سب دبے قدموں میرے پیچھے چلو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ سب اس کا کہا مان کر اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ آہستہ آہستہ مٹھیاں بھینچنے لگا ——— ایک دو تین۔ مٹھیاں جیسے ختم ہونے والی کڑی ہو گئی تھیں۔ وہ سارا دن کام کرنے کی وجہ سے بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کا جسم اور دل و دماغ سب ہی نڈھال ہو گئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ ذرا بھی تھکان نہ محسوس کر رہا تھا۔ وہ سب سے آگے تھا اور برابر سوچ رہا تھا کہ جب پہلے اس اونچی بلڈنگ میں قتل و خون کا بازار گرم کر لیا گیا تھا، ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑا تھا۔ پھر بھی وہ چھپ کر اپنی جان بچا گیا۔ اس وقت بھی وہ جیسے ہی اسے نظر آئے گا اسے چھپ جانے کا اشارہ کر دے گا۔ اسے بتا دے گا کہ عمرت تم سے چند قدم کے فاصلے پر پگلی چلی آ رہی ہے۔ یقیناً اس گھر میں ایسی جگہ ضرور ہوگی جس میں وہ پہلے کی طرح چھپ سکتا ہے۔

پہلی منزل ——— دوسری ——— تیسری ——— ہر منزل کے ایک ایک کونے کو چھان مار کر ہر کمرے میں سب سے پہلے وہ داخل ہوتا تھا۔ وہاں خاموشی اور ویرانی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ الوؤں کا راج ہے۔ لیکن جب چوتھی منزل پر جانے کے لئے قدم اٹھا رہے تھے تو نہ جانے کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کا دل پھڑک پھڑک کر دعائیں کر رہا تھا کہ وہاں بھی کوئی نہ ہو۔ کوئی نہیں۔ وہاں بھی الوؤں کا

راج ہو ——— وہ انسانی تماش خراش کے ایسے نمونے دیکھ چکا تھا کہ اب اپنے میں کوئی اور نمونہ دیکھنے کی سکت نہ پاتا تھا ——— اس کے قدم تیز ہو گئے تھے۔ اس نے پیچھے رہے رہے قدروں آنے والوں کو کئی گز پیچھے چھوڑ دیا تھا اور جب سیڑھیاں ختم ہوتے ہی سب سے پہلے سامنے پڑنے والے کمرے میں وہ داخل ہوا تو جیسے دم بخود رہ گیا۔ نیلے صاف ستھرے لباس میں ملبوس ایک بوڑھے سے قدکی خوبصورت لڑکی اس کے سامنے زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کی ناک سُرخ تھی۔ پپوٹے سرخ اور پھولے ہوئے، آنکھیں سنہری مندی اور سہم زدہ حال، اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ ہاتھ میں کنگھا تھامے سامنے لگے ہوئے آئینے میں نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی زمین پر صابن دانی، تولیہ، کلپ اور بال پنیں پڑی ہوئی تھیں ——— اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا تھا کہ اس کے سامنے کوئی جیتا جاگتا انسان ہے، وہ کوئی خوبصورت روح ہے، وہ کوئی پری ہے۔ لیکن جب لڑکی نے اپنی بوجھل آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے کنگھا چھوٹ کر زمین پر گر گیا تو اس کے جیتے جاگتے وجود کا احساس ہوا، اور پھر اسے بچانے کے لئے اس کی روح روح پھڑکی۔ اس نے اسے چھپ جانے کے لئے اشارہ کیا۔ آہستہ سے اسے بتایا کہ لوگ پیچھے آرہے ہیں۔ مگر لڑکی جیسے اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی تھی اسے ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی۔ لڑکی نے بس ایک بار اسے بے بسی سے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ سب لوگ کمرے میں گھس آئے۔ ان کے لہراتے ہوئے چہرے جھک گئے۔ وہ سب شیطانی ہنسی ہنسنے لگے۔

"پہاڑ کھودا تھا تو چوہیا نکلی۔" سرخ آنکھوں والا لڑکی کی طرف بڑھا اور اسے محسوس ہوا کہ زور سے زلزلہ آگیا ہے۔ لڑکی کا چہرہ ایک دم سفید ہو رہا تھا۔

"رحم کرو۔ اسے مت چھونا۔" وہ لڑکی اور سرخ آنکھوں والے کے درمیان آکر پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

"ارے تو کیا بدن میلا ہو جائے گا۔ محنت کریں بی فاختہ، کوّے میرے کھائیں۔ ابھی اپنی راہ لگتے۔" ایک نے کہا اور سب پھر ہنسنے لگے۔ دو آدمیوں نے دھکے دے کر اسے لڑکی کے پاس سے ہٹا دیا۔

"نہیں ——— نہیں۔" وہ پھر لڑکی کے سامنے آجانا چاہتا تھا کہ سرخ آنکھوں والے نے اپنا چھرا اس کے سینے پر رکھ دیا ——— پھر ایک نے لڑکی کو اٹھا کر بھیڑ کی طرح کاندھے پر ڈال لیا۔ لڑکی کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی، اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ لیکن جب وہ لڑکی کو لے کر جانے لگے تو اس نے اپنی لٹکتی ہوئی باہیں اس کی طرف پھیلا دیں۔ اس کا جی چاہا کہ کاش اس وقت تڑ تڑ وہ چھرا اس کے سینے کے پار ہو جاتا۔ وہ بے چین ہو کر اس کی طرف بڑھا مگر اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا گیا اور سرخ آنکھوں والے نے آگے بڑھ کر لڑکی کی پھیلی ہوئی باہیں اپنے گلے میں ڈال لیں۔ لڑکی کی آنکھیں جیسے بے انتہا کرب سے بند ہو گئیں۔

پھر آن کی آن میں کمرہ خالی تھا۔ پہلے سے زیادہ ویران اور خاموش۔ وہ سب جا چکے تھے اور وہ اسی جگہ زمین پر بیٹھا تھا جہاں لڑکی ذرا دیر پہلے کنگھی کر رہی تھی۔ وہ پھیلی ہوئی باہوں کا سہارا نہ بن سکا تھا۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے سینے میں کوئی ضدی سا جذبہ مچل مچل کر اسے رلا رہا تھا۔ اس نے جانے کتنی جوان عورتوں کو اغوا ہوتے دیکھا۔ ان کی چیخیں ان کی فریادیں سنی تھیں۔ مگر اس طرح کوئی بھی تو اس کے دل پر اثر نہ کر سکا تھا۔ مگر یہ گم سم سی لڑکی صرف باہیں پھیلا کر اسے کس قدر متاثر کر گئی تھی۔ اس کے دل جیسے نازک گوشت میں بھربھری پڑ گئی تھی۔

جب وہ جی بھر کر رو چکا تو اس نے قدموں سے روندی ہوئی بال پنوں اور کلپوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ انہیں دیکھتا رہا، انہیں چھوتا رہا۔ اور ہلکی سی نم تولیہ کو اٹھا کر سہلاتا رہا اور پھر اس بستر کو دیکھنے لگا جس پر اس قدر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں کہ جیسے اس پر مسلسل کئی دن تک کوئی پڑا کراہتا، بل بدلتا رہا ہو، پاؤں رگڑتا رہا ہو۔ وہ سوچنے لگا کہ اس خوبصورت اور عجیب لڑکی نے تین دن تین راتیں اس بستر پر تڑپ کر گذاری ہیں، اور پھر وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ بستر کی شکنیں درست کرنے لگا۔ تکیہ پر جگہ جگہ آنسوؤں کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ تین دن مسلسل تین دن تک۔ روتی رہی اور پھر اس نے

تھکن سے نڈھال ہو کر منہ دھویا تھا۔ تاکہ اس میں پھر رونے کی سکت پیدا ہو جائے ——— اور پھر وہ اپنے بال سنوارنے بیٹھ گئی تھی۔ لیکن بالوں کیوں سنوار رہی تھی؟ اس نے صابن سے منہ کیوں دھویا ——— اگر تھک گئی تھی تو منہ پر پانی کے چھینٹے بھی تو دے سکتی تھی۔ مگر اس نے تو باقاعدہ صابن سے منہ دھویا تھا اور انھاک سے سنگار کر رہی تھی ——— شہر میں سناٹا تھا، اس کی بلڈنگ میں سناٹا تھا، موت سب کو نگل گئی تھی۔ پوری بلڈنگ میں بھیانک ویرانی تھی۔ زندگی کا آس پاس کیا دور دور پتہ نہ تھا، اور وہ سنگار کر رہی تھی۔ اس تنہا خاموش کمرے میں مسلسل تین دن رونے کے بعد سنگار کر رہی تھی۔ تھکن سے نڈھال اور چور، آخر وہ کس کے لئے سنگار کر رہی تھی۔ کیوں ——— وہ کون سا جذبہ تھا۔ کتنی عجیب، کتنی حسین لڑکی ——— اور جب اسے اٹھا کر لے گئے تو وہ چپ چاپ چلی گئی ——— اور پھر اس کے دل و دماغ کو روپہلی ہوئی باہوں نے جکڑ لیا۔ کاش وہ اس تھکی تھکی نڈھال لڑکی کا سر اپنے زانو پر رکھ سکتا، اس کے سُرخ لپسے ہوئے ہونٹوں کو سہلا سکتا۔ وہ اس کے لئے وہ سب کچھ کر سکتا جو وہ چاہتی تھی اور پھر کچھ نہ کر سکنے کے جذبے نے اسے بے چین کر دیا۔ اس نے سرہانے سے تکیہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ تکیے کے نیچے ایک کاغذ پڑا تھا۔ "بہار" بوسیدہ۔ وہ اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ "میری جان!" ——— وہ پورا خط جلدی جلدی پڑھ گیا۔ لیکن آخر میں جب وہ پڑھ رہا تھا کہ "میں تم سے جلد ہی آ کر ملنے والا ہوں میں تمہیں دیکھنے کے لئے بے حد بے چین ہوں۔ اتنا بے چین کہ اگر میری راہ میں کوئی بڑے سے بڑا طوفان بھی حائل ہو جائے تو وہ مجھے تم تک پہنچنے سے نہ روک سکے گا۔ میں تمہارے پاس سیدھا تمہارے کمرے میں پہنچوں گا جہاں تم بنی سنوری بیٹھی میری راہ دیکھ رہی ہو گی اور" ——— ہاتھ کانپے۔ خط چھوٹ کر زمین پر گر گیا ———

نیچے اچانک شور ہونے لگا۔ دھما دھم کی تیز آوازیں آنے لگیں۔ شاید قریب کی کسی بلڈنگ کا سامان لوٹا جا رہا تھا۔ اس نے بال نہیں اور رکھ اٹھا کر جیب میں ڈال لئے اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں طے کر کے چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔

سوچتے سوچتے اس نے ایک بار لچھمنا کی طرف دیکھا۔ پانی بہہ چکا تھا اور صابن کا جھاگ بجھ کر ختم ہو چکا تھا۔

شفیق الرحمٰن

جلیبی

ہوائی جہاز پر سوار ہوتے وقت مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔ نیلے لباس والی لڑکی سے پوچھا تو اس نے بھی تائید میں سر ہلایا۔ جب ہم جہاز سے اترے تو مجھے یقین ہو گیا اور میں نے پائپ پیتے ہکسفورڈ لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے پائیلٹ کو دبوچ لیا۔ ہم مدتوں کے بعد ملے تھے۔ کالج میں دو برس اکٹھے رہے۔ کچھ عرصہ تک خط و کتابت بھی رہی۔ پھر ایک دوسرے کے لئے معدوم ہو گئے۔ اتنے دنوں کے بعد اور اتنی دور اچانک ملاقات بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔

طے ہوا کہ یہ شام کسی اچھی جگہ گزاری جائے اور بیتے دنوں کی یاد میں جشن منایا جائے۔ میں نے اپنا سفر ایک روز کے لئے ملتوی کر دیا۔

جب باتیں ہو رہی تھیں تو میں نے دیکھا کہ وہ کافی حد تک بدل چکا تھا۔ مٹاپے نے اس کے تیکھے خدوخال کو مبہم بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کا وہ تجسس نگاہوں کی وہ بے چینی، وہ ذہین گفتگو سب مفقود ہو چکے تھے۔ وہ عامیانہ سی گفتگو کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی اور ماحول سے اس قدر مطمئن ہے کہ اس نے سوچنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ دیر تک ہم پرانی باتیں دہراتے رہے۔

سہ پہر کو وہ مجھے ایک دوست انگلو انڈین لڑکی کے ہاں لے گیا جسے وہ شام کو مدعو کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ شام کو وقت وہ گرجے کے لئے وقف کر چکی ہے۔ ہم ایک اور لڑکی کے ہاں گئے اس نے بھی معذرت چاہی کیوں کہ اس کی طبیعت ناساز تھی۔ پھر تیسری۔ کئے گھر پہنچے اگرچہ دوسرے کمرے سے خوشبو تمیں ہی آ رہی تھیں اور کبھی کبھار آہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ وہ ایک اور شناسا لڑکی کے ہاں جانا چاہتا تھا لیکن میں نے منع کر دیا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں اور پھر اگر کوئی اور ساتھ ہو تو ہم بھی طرح باتیں نہ کر سکیں گے۔ واپس آ کر اس نے ٹیلیفون پر کوشش کی تیسری لڑکی گھر پہنچ چکی تھی لیکن شام کو اس کی ماں اسے فلمی جان کے ہاں لے جا رہی تھیں۔

شام ہوئی تو ہم وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل میں گئے۔ رقص کا پروگرام بھی تھا۔ اس نے پینا شروع کر دی میرے لئے بھی آرڈر دیا اور اصرار کرنے لگا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔

میں نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے چھوا، کچھ دیر گلاس سے کھیلتا رہا پھر ٹہلتا ٹہلتا وہ پیچھے تک گیا ایک بڑے سے گملے میں انڈیل کر واپس آ گیا۔

اس نے دوسری مرتبہ انڈیلی مجھے بھی دی میں پھر اٹھا اور باپا حصہ لکھڑکی سے باہر پھینک آیا۔

وہ اپنی سدوزانہ زندگی کی باتیں سنا رہا تھا کمپنی کی لڑکیوں کے متعلق جو نہایت خوفناک قسم تھیں۔ شراب کے فصلتی جو دن بدن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے عاشقوں کے متعلق جو اسے بے حد پریشان رکھتے تھے۔ اس کی بیوی بھی اسی شہر میں رہتی تھی لیکن وہ اس سے مہینوں نہ ملتا جب کبھی بھولے سے گھر جاتا تو وہ اتنے سوال پوچھتی کہ عاجز آجاتا اتنا نہیں سمجھتی کہ ایک ہوا باز کی زندگی کس قدر خوفناک زندگی ہے۔ اگرچہ یہ زندگی اس نے خود منتخب کی تھی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً ہم نے اس لڑکی کو رقص گاہ میں دیکھا جسے اس وقت گرجے میں ہونا چاہئے تھا وہ ایک لڑکے کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ لڑکی اکیلی جس کی طبیعت ناسازی چہر معلوم ہوا کہ قیصری لڑکی بھی ہمارے سامنے رقص کر رہی ہے اپنی اتی یا فانی جان کے ساتھ نہیں، ایک دوسرے ہوا باز کے ساتھ۔

وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگا کہ جانے یہ لڑکیاں ہمیشہ اسی کو کیوں دھوکہ دیتی ہیں۔ ہمیشہ لڑتی ہیں آج تک کسی لڑکی نے اسے دل سے نہیں چاہا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی ہے۔

وہ گلاس پر گلاس خالی کئے جا رہا تھا میرے ہتھے کی ساری شراب گلاسوں اور پیالوں کو سیراب کر رہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ مجھ جیسا لڑکا جو کالج کے دنوں میں باقاعدہ سگریٹ بھی نہ پیتا تھا اب ایسا مشاق پی گیا کہ، فی پیکنے کے بعد بھی ہوش میں ہے۔ اس کے خیال میں ایسے شخص کو پلانا قیمتی شراب کا ستیاناس کرنا تھا۔

پھر ان اجنبی چہروں میں ایک جانا پہچانا مانوس چہرہ دکھائی دیا۔ یہ جینی تھی۔ جو رقص گاہ میں پہنچے ایک ادھیڑ عمر کے شخص کے ساتھ ابھی ابھی آئی تھی ہم دونوں اُٹھے ہمیں دیکھ کر جینی کا مسکراتا ہوا چہرہ کھل گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملی تعارف ہوا ——— میرے خاوند سے ملئے ——— اور یہ دونوں میرے پرانے دوست ہیں ———

میں نے ہاتھ ملاتے وقت اس کے خاوند کو مبارکباد دی ——— اور کہا کہ وہ دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہے۔

میں نے اسے غور سے دیکھا وہ چالیس سے اوپر کا ہوگا۔ اچھا خاصا سیاہ رنگ، وضع قطع بھلی بھلی آنکھیں بے حد معمولی شکل پیشہ تھا۔ اگر وہ جینی کا خاوند نہ ہوتا تو شاید ہم اس کی طرف دوسری مرتبہ نہ دیکھتے۔ لیکن جینی کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کے سوا اور کسی کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ وہ اس کی تعریفیں کر رہی تھی کہ وہ قریب کی بندرگاہ کا سب سے بڑا بیرسٹر ہے اس علاقے میں سب سے مشہور شخص ہے۔ میں نے جینی کو رقص کے لئے کہا اس نے محسوس کیا کہ وہ بے حد مسرور ہے۔ اس قدر مسرور شاید میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے کی چمک دمک ویسی ہی ہے اس کے ہونٹوں کی وہ دلآویز مخمور مسکراہٹ جو اس کی تو ہے، مسکراہٹ جو اس قدر مشہور تھی، جسے مونا لزا کی مسکراہٹ سے تشبیہ دی جاتی تھی ——— نہایت پراسرار اور ناقابل فہم مسکراہٹ جس کی گہرائیوں کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ جو ہمیشہ رازدار رہی۔

اور یہی مسکراہٹ میں نے سالہا سال سے دیکھی تھی۔ اس مسکراہٹ سے میں، قوس سے شناسا رہا۔ جینی کے خاوند کے دوست آگئے اور تعارفی باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد میں اور میرا دوست اٹھ کر واپس اپنی جگہ چلے آئے، جہاں ٹوٹل اس کی منتظر تھی۔

میں نے اس سے جینی کے متعلق باتیں کرنا چاہیں لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ ابھی تین لڑکیوں کے لئے اور اس تھا جو اسے دھوکے کر دوسروں کے ساتھ چلی آئیں۔ آج یہ پہلا مرتبہ نہیں ہوا تھا پہلے بھی بارہا ہو چکا تھا اور یہ لڑکیاں اجنبی نہیں تھیں، پرانی دوست تھیں اس کے ساتھ ماہر جا چکی تھیں۔ اس سے بیش قیمت تحائف لے چکی تھیں۔ واصل اب ایسی ٹھوکریں اسے ہر طرف سے لگ رہی تھیں برس، برج، شاہر جگہ وہ ہار رہا تھا۔ ایک اونٹ نفع کمپنی کی ایکسٹرا لڑکی جس کے لئے اس نے سمندر کے کنارے مکان لیا اسے چھوڑ کر کسی بوڑھے سیٹھ کے ساتھ چلی گئی ——— اور میں خود دیکھ رہا تھا جاں جینی تھی، دفعتہً مسرت سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا اس کی آنکھیں روشن تھیں ——— وہی آنکھیں جو کبھی گمبھیر اور نم ناک رہا کرتیں اب مسرور تھیں۔ رخسار جن پر دنوں آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں اب تابان تھے۔ وہ کھلی ہوئی مسکراہٹ شاہد تھی کہ دل سے اس شدید الم کا احساس جا چکا ہے جو جینی کی قسمت بن چکا تھا

اس خوشی میں اب غم کی رمق تک نہیں دکھائی دیتی تھی۔

لیکن اتنی زائد مسرت کیسی تھی؟ یہ انبساط کیسا تھا؟ اور اس پراسرار مسکراہٹ کے پیچھے کیا تھا؟

میں صرف اس کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی روح بہت دور تھی۔ وہاں تک میری نگاہیں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ کیا وہاں کوئی عظیم طوفان بپا تھا؟ اذیت کا، کرب ناک شدید تلاطم۔ یا جلتے ہوئے شعلوں کی تپش نے بہت کچھ بھسم کر دیا تھا؟ یا وہاں سب کچھ ٹھنڈا ہو چکا تھا؟ برف کے تودوں کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا؟

اس کا جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا۔

وہ لگاتار اپنے خاوند کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔ کئی مرتبہ وہ بالکل قریب سے گزرے۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرائی پھر جیسے وہ مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ اس نے ماضی اور حال کی حدوں کو محیط کر لیا۔ وہ سب تصویریں سامنے آنے لگیں جو ذہن کے ناریک گوشوں میں مدفون تھیں۔

میں نے برسوں پہلے اپنے کو نیو رسٹی کے مباحثے میں دیکھا۔ میرے ساتھ ہیرا بائی دبیق اور ہم مباحثہ جمی تھا۔ وہ ان دنوں بہترین مقرر تھا۔ سٹیج پر ہمیشہ فاتح کی طرح جاتا اور فاتح کی طرح لوٹتا۔ اس کی تقریر ختم ہوئی تو ایک لڑکی سٹیج پر آئی۔ گھنگھریالے بال، کھلی ہوئی آنکھیں، لبوں پر محجوب مسکراہٹ۔ بلا جھجک انگریزی اور ہندوستانی لباس پہنے۔

ہال میں سرگوشیاں ہونے لگیں ہمیں بتایا گیا کہ یہ نئی کہیں سے آئی ہے اس کا نام کچھ اور ہے لیکن اسے للیٹے کہتے ہیں۔ شاید اس کی ملیح رنگت اور گھنگھریالی پریشان زلفوں کی وجہ سے۔

کچھ دیر وہ شرماتی رہی، بول ہی نہ سکی۔ پھر ذرا سنبھل کر اس نے جمی کی تقریر کی مخالفت شروع کی۔ ایسے ایسے نکتے لائی کہ سب حیران رہ گئے۔ جمی کی تقریر بالکل بے معنی معلوم ہونے لگی۔

جب وہ سٹیج سے اتری تو دیر تک تالیاں گونجتی رہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ پہلا انعام جمی کو اور اس لڑکی للیٹے کو ملے گا لیکن جمی نے ججوں سے درخواست کی کہ انعام کی رقم جمعدار ہے اور اسی کو ملنا چاہئے جمی کے رویے کو سراہا گیا ہجوم میں ہیجان پھیل گیا۔ مدتوں کے بعد ایک لڑکی پہلا انعام جیت رہی تھی، وہ بھی ایسی الو کی جو بالکل نو وارد تھی۔

جب للیٹے سٹیج پر چاندی کا بڑا سا ورق لینے آئی تو اس کی پریشان لٹیں اور پریشان ہو گئیں۔ نگاہیں اور جھک گئیں جب اس سے اتنا بڑا کپ نہ سنبھالا گیا، تو جمی نے پک کر کپ کا چوتھا حصہ خود اٹھا لیا۔ للیٹے نے جمی کو جھکی ہوئی نگاہوں سے ایک مرتبہ دیکھا۔

اس بھولی بھالی الھڑ لڑکی سے ہمارا تعارف یوں ہوا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا تانتا بندھ گیا۔ جمی کالج کا ہیرو تھا۔ لڑکوں اور استادوں میں ہر دلعزیز کلاس میں سب سے ذہین، چست، ہنس مکھ اور خوش پوشاک۔ بڑے امیر والدین کا اکلوتا بیٹا۔ اس کی کارپروفیسروں کی کار سے بھی بڑھیا تھی۔ جہاں کہیں ادبی تقریب ہوتی مجھے اور جمی کو ضرور کیا جاتا۔ ہمارے کہنے پر للیٹے کو بھی بلایا جاتا۔ للیٹے کے خدوخال حسین نہیں تھے۔ اگر اسے نقادانہ نظر سے دیکھا جاتا تو وہ حسین ہرگز نہیں تھی ——— لیکن اگر حسین خدوخال کے بغیر بھی کوئی خوبصورت ہو سکتا ہے تو وہ للیٹے تھی۔ اس کی لہراتی ہوئی زلفیں، جھکی ہوئی شرمیلی آنکھیں، مسکراتے ہوئے ننھے منے ہونٹ ملیح چمپئی رنگت ——— اور نہایت معصوم باتیں ——— سب مل کر زوالی جاذبیت پیدا کر دیتے۔ بعض اوقات تو وہ بے حد پیاری معلوم ہوتی۔

وہ جوشل میں رہتی تھی، سب سے الگ تھلگ۔ کبھی ہم نے اسے کسی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ اس کے والدین کے متعلق طرح طرح کی افواہیں سننے میں آتیں۔ ان کے خاندان میں انگریزی اور پرتگالی خون کی آمیزش تھی۔ اس کی والدہ جنوبی ہندوستان کی تھی۔ اس لئے ان کا کوئی خاص مذہب یا ملک یا کوئی نسل۔ للیٹے کا نام بھی عجیب سا تھا، اس کا لباس بھی بلا جھجک ہوتا وہ اپنے والدین کے ذکر سے احتراز کرتی۔ یہ مشہور تھا کہ ان کی خانگی زندگی نہایت ناخوشگوار

ہے وہ ہمیشہ جدا رہتے ہیں ایک دفعہ ان کا تنازعہ عدالت تک پہنچ چکا ہے۔

پھر کسی نے یونہی کہہ دیا کہ بیلے جی بی کی طرف دیکھتی رہتی ہے یہ افواہ بنی۔ پھر عام ہو گئی ہر جگہ اس نئے معاشقے پہ تبصرے ہونے لگے۔ سب نے دیکھا کہ بیلی کے دل کا راز حیال ہو چکا تھا وہ جی بی کو چاہتی ہے طرح طرح کے بہانوں سے وہ اسے ملنے جانے پیغام راستوں سے ایسے وقت گذرتی کہ جی بی فقرا جا جی بی کو دیکھ کر اسے دنیا بھر کی نعمتیں مل جاتیں یہ نو زائیدہ محبت اس کی زندگی میں طرح طرح کی تبدیلیاں لے آئی۔ وہ مصروف رہنے لگی۔ ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لینے لگی اس کا اپنی صحت درست ہونا کیا، اس کی گفتگو میں مٹھاس آ گئی۔

لیکن جی بی کچھ اتنا متاثر نہیں ہوا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کتنی ہی مرتبہ اسے محبت خراج کے طور پر ملی تھی۔ وہ بیلے سے ملتا، اسے ملنے کے موقعے دیتا، خوب باتیں کرتا بڑی شوخ اور چنچل قسم کی گفتگو، جس کا وہ عادی تھا۔

چاندنی رات میں دو ایک باغ میں تقریب ہوئی۔ لڑکیوں کے ساتھ بیلی بھی آئی۔ جی بی ہمارے ساتھ نہیں آیا، معلوم ہوا کہ وہ ایک انگریز لڑکی کو لے کر آئے گا۔ جس کا شہر بھر میں چرچا تھا جو نوجوانوں کی گفتگو کا محبوب ترین موضوع تھی۔ یہ اس کی نئی محبوبہ تھی۔

جی بی دیر میں آیا، کار سے وہ اکیلا اترا۔ وہ لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ مایوس اور کھویا کھویا سا تھا، اور فوراً واپس جانا چاہتا تھا میں اسے اجازت نہ دی، وہ تو ایسی محفلوں کی جان تھا۔ جب وہ اپنا سنیٹ سنا رہا تھا تو بیلے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے آئینے میں خود اپنا عکس دیکھ رہی ہو جیسے خود اپنی روح کو کسی اور روپ میں دیکھ رہی ہو۔ جی بی نے مخالف توقع غم آمیز اشعار سنائے جن میں شکوے تھے، التجائیں اور وہ اشعار کسی خاص ہستی کے لئے تھے جو وہاں نہیں تھی۔

بیلے نے کئی مرتبہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بدستور خاموش رہا میں نے اسے ٹوکا، ایک طرف لے جا کر ڈانٹا بھی لیکن جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ ہم دونوں اکیلے کھڑے تھے کہ بیلے آ گئی جی بی کچھ دیر اس کی طرف یونہی دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک اونچے سرو کے پیچھے لے گیا۔ وہ محبت بھی چپ چاپ چلی گئی۔ جی بی نے اسے بازوؤں میں لے کر چوم لیا پہلے تو وہ سے پروہ کانپ اٹھی۔ اس جانی لذت سے مغلوب ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جی بی کے سینے سے سر لگا دیا وہ اسے پھیکے ہونٹوں سے چومتا رہا ایسے الفاظ اس کے لبوں سے نکلتے رہے جو بیلے کے لئے نہیں کسی اور کے لئے تھے۔ اس کے بازوؤں میں بیلے نہیں تھی، کوئی اور بے وفا حسینہ تھی جس کے لئے وہ بے تاب تھا۔

بیلے شدت احساس سے آنکھیں بند کئے خاموش کھڑی رہی، وہ جی بی اور اس کے بوسوں کی دنیا سے دور نکل گئی۔ وہ شہر چھوڑنے کی وادیوں میں جا پہنچی جہاں اس کے بسے ہوئے خوابوں کی تعبیریں آباد تھیں جہاں فضاؤں میں اس کی معصوم امنگیں تحلیل ہو چکی تھیں، جہاں کیف و خمار چھائے ہوئے تھے۔ جہاں صرف رعنائیاں تھیں اور محبت باشیاں۔

اس کے بعد بیلے کی نئی زندگی شروع ہوئی۔ اس کی دنیا میں ہر چیز پر یا نکھار آ گیا جو پہلے محض تخیل تھا وہ تخلیق ہو گیا۔ غنچے چٹکے۔ خوش الحان طیور چہچہانے لگے۔ رنگ برنگے پھولوں کی خوشبوؤں نے ہوائیں بوجھل کر دیں۔ زمین سے آسمان تک قوس قزح کے رنگ پھیلنے لگے۔ ہر شے کا خوابیدہ حسن جاگ اٹھا۔ اس کے بعد نہ دنیا رہی اور نہ زندگی محض خواب تخیل اور حقیقت کی سرحدوں پر جا گیا۔

بہت دیر کے بعد بیلے اس خواب سے چونکی۔ فضا اس پر اس بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ جی بی کے لئے محض ایک کھلونا تھی۔ جی بی کو اس سے محبت نہیں تھی وہ جی بی کے لئے ان متعدد لڑکیوں میں سے ایک تھی جو اس کا تعاقب کرتی تھیں۔ بغیر کسی صلے کے اسے چاہتی تھیں۔

جب بات بہت مشہور ہوئی تو جی بی کے ترانے نگار اس نے تقریبوں میں آنا بند کر دیا۔ بیلے کو دیکھ کر کار تیز کر دیتا اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا۔

اپنی پہلی محبت کی شکست پر بیلے کو یقین نہ آیا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ اس صدمے کو اس نے اپنی روح کی گہرائیوں میں چھپا

دیا لیکن اس کی محبت جوں کی توں رہی۔ وہ اس سے ملنے کے بہانے تلاش کرتی اسے خط لکھتی، تحائف بھیجتی۔

وہ دوسرے کالج میں تھی۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح جی بی کو ہر روز دیکھ لیتی۔

ایک روز سب نے لیلےٰ کے خطوط کو نوٹس بورڈ پر دیکھا۔ یہ وہ محبت بھرے خطوط تھے جو اس نے جی بی کو لکھے بہت سے لڑکے یہ خطوط دیکھنے گئے ہیں بھی گیا سب نے مزے لے لے کر خطوط کو پڑھا۔ چسپ فقرے نقل کئے، خوب ہنسے بھی۔

بعد میں جب مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے جی بی کو برا بھلا کہا، اسے یہ حرکت ہرگز نہیں کرنی چاہئے تھی۔ وہ کہنے لگا کہ لیلےٰ نے اسے اس قدر بدنام کر دیا ہے کہ اب وہ اس کے نام سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس سے ملتا ضرور رہا ہے لیکن کسے علم تھا کہ معمولی سا مذاق ایسی شکل اختیار کرے گا، اور وہ مفت میں بدنام ہو جائے گا۔

محض لیلیٰ کی وجہ سے بقیہ لڑکیاں اس سے دور دور رہنے لگی ہیں۔

جی بی میرا اکلوتا دوست تھا، ہم دونوں ہم عمر تھے، ہمارے خیالات یکساں تھے ——— میں خاموش ہو گیا۔ وہ تک خطوط کا چرچا رہا، لیلےٰ کئی دن کالج نہیں آئی تنہا گوشوں میں بیٹھ کر رویا کی۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا ——— جو کچھ اسنے کہا گیا اس نے خاموشی سے برداشت کیا۔

جی بی نے لیلیٰ کی سہیلیوں کی منتیں کیں کہ اسے سمجھائیں، کسی طرح اسے دور رکھیں اس نے ان راستوں سے گزرنا چھوڑ دیا جہاں لیلےٰ کے نظر آنے کا امکان ہوتا۔ اپنے کمرے کی وہ کھڑکیاں مقفل کر دیں جو سڑک کی طرف کھلتی تھیں جن کی طرف لیلےٰ گزرتے ہوئے دیکھ لیا کرتی۔

ایک دن مجھے ترس آیا، میں جی بی سے خوب لڑا، جہاں ہم اتنی لڑکیوں سے ملتے رہتے ہیں وہاں کبھی کبھی لیلےٰ سے بھی ملنے لگے ——— وہ بولا ——— تم معصوم ہو رما! تمہیں پسند ہے مجھے نہیں۔ مجھے نہ پختہ اور الھڑ لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ مزا تو اسی بات پر آتا ہے جو خوش ہوئیں تو رو دیں، غمگیں ہوئیں تو آنسو بہنے لگے۔ دنیا کی کسی چیز کا بھی انہیں علم نہیں۔ ہر چیز خود بتانی پڑتی ہے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں مجھے تجربہ کار اور کھیلی ہوئی لڑکیاں زیادہ پسند ہیں۔

جی بی کے اس رویے کا اثر یہ ہوا کہ لیلےٰ اس سے ڈرنے لگی، وہ اسے دور دور سے دیکھتی کہیں اُنما سا منہ ہوتا تو راہ کترا جاتی۔ دوسروں سے جی بی کے متعلق پوچھتی۔ ہی۔ کئی مرتبہ میں نے خود اسے جی بی کے بارے میں باتیں بتائیں اس کی تصویریں بھی دیں جس پر وہ مجھ سے خفا ہو گیا۔

پھر جی بی کو کچھ عرصے کے لئے اپنی تعلیم چھوڑ دینی پڑی۔ اس کے کچھ رشتہ دار دوسرے ملک میں بہت بڑے تجار تھے۔ اسی سلسلے میں جی بی کے والد اسے باہر بھیجنا چاہتے تھے اور ان کے لئے تعلیم اتنی ہی اہم تھی جتنی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بچھڑنے کا بہت افسوس ہوا ایک شام کو ہم اداس بیٹھے تھے کہ میں نے اسے آخری مرتبہ ملنے کو کہا، اس نے انکار کر دیا جب میں نے پرانی دوستی کا واسطہ دلایا۔ تو وہ راضی ہو گیا میں نے لیلیٰ کو بتایا تو اسے یقین نہ آیا اس نے آنسو خشک کئے، بہترین لباس پہنا، سہیلیوں سے مانگ کر زیور پہنے، ان کے مشورے سے سنگار کیا اپنے چہرے پر مسکراہٹ اور دل میں آرزوئیں لئے اپنے محبوب سے ملنے گئی۔ اس بات جی بی پیچ و تاب کھاتے ہوئے تھا بعد میں اس نے بتایا کہ اس نے محض میری وجہ سے پی تھی تاکہ وہ لیلیٰ سے پیار بھری باتیں کر سکے۔

اس نے لیلیٰ سے بہت سی باتیں کیں، اسے ہمیشہ مسرور رہنے کو کہا، جلد لوٹنے کے وعدے کئے لیلیٰ کو ایک بار پھر اس فرد دس گمشدہ کی جھلک دکھائی دی جسے محبت کے پہلے برسے نے تخلیق کیا تھا۔ لیلےٰ نے اقرار کیا کہ وہ ہمیشہ خوش رہے گی اور اس کا انتظار کرے گی اگر اس کی وجہ سے جی بی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو وہ سزا کی طالب ہے اگر جی بی حکم دے تو وہ کہیں دور چلی جائے اگر وہ چاہے تو لیلےٰ مر جائے جدا ہوتے وقت اس نے اپنا رومال جی بی کو نشانی کے طور پر دیا۔ یہ رومال جی بی نے مجھے دے دیا کہنے لگا "شاید تمہارے پاس محفوظ رہے وہ بہن تو اسے کہیں ادھر ادھر پھینک دوں گا" رومال سے لیلیٰ جیسی خوشبو آرہی تھی ایک کونے میں سرخ دھاگے سے خفا سا دل بنا ہوا تھا جسے لیلےٰ نے خود کاڑھا تھا۔

جی بی کے چلے جانے پر لیلےٰ ذرا بھی غمگین نہ ہوئی، اس کے وعدوں کو دل سے لگائے انتظار کرتی رہی یہ انتظار طویل ہوتا گیا۔

پتے زرد ہو کر گر پڑے، پھول مرجھا گئے، ٹہنیاں لخ مخ رہ گئیں، خزاں آگئی۔ وہ نہ آیا۔ جھکڑ پتے سوکھے پتے اڑانے لگے گرد و غبار نے آسمان پر چھا کر چاندنی اداس کر دی، تاروں کو بے نور کر دیا، دھشتیں پھیل گئیں ——— وہ نہ آیا۔

کونپلیں پھوٹیں، ہریالی میں پیلی پیلی سرسوں پھولی، رنگین تتلیاں اڑنے لگیں، غنچے مسکرانے لگے پرندوں کے نغموں سے ویرانے گونج اٹھے بہار آگئی۔ لیکن وہ نہ آیا۔

دن لمبے ہوتے گئے لمبی لمبی جھڑیاں لگیں۔ سفید بگلوں کی قطاریں سیاہ گھٹاؤں کو چیرتی ہوئی گزر گئیں۔ نیلے بادل آئے اور برس کر چلے گئے۔ جھیلوں کے کنارے توس قزح سے رنگین ہو گئے ——— لیکن وہ پھر بھی نہ آیا۔

بہت دنوں تک بیلے کھوئی کھوئی سی رہی۔ بہت دیر کے بعد وہ سب کچھ سمجھ سکی۔ جب جی بی ٹوٹا تو وہ سنبھل چکی تھی۔ جی بی اکیلا نہیں آیا، اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ گوری چٹی فربہ عورت جو کسی کھاتے پیتے کی بیٹی تھی۔ جس کا گول مول چہرہ کسی قسم کے اظہار سے معرا تھا جس کے دل میں جذبات کے لئے جگہ نہ تھی۔ جو اس ٹھوس اور مادی دنیا میں پیدا ہوئی اور اسی دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔

ایسے اونچے اور امیر گھرانے میں شادی ہو جانے پر سب نے جی بی کی مبارکباد دی۔ اس کی قسمت پر رشک کیا۔

میں بیلے کو بھی جانتا تھا اور جی بی کو بھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ دونوں اس وقت رقص گاہ میں تھے۔ جی بی میرا دیرینہ دوست تھا جو میرے ساتھ بیٹھا تھا اور بیلے وہ حسینہ تھی جو میرے سامنے اپنے خاوند کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔

بیلے کو بستر چھوڑا جاتا۔ طعنے دیئے جاتے۔ سب اس کا مذاق اڑاتے۔ ایک روز ہم نے سنا کہ وہ کالج چھوڑ کر گھر چلی گئی۔ کچھ دنوں تک اس کا انتظار کیا گیا لیکن وہ واپس نہ آئی۔ آہستہ آہستہ اس کی باتیں بھولتی گئیں۔ کچھ عرصے کے بعد بیلے کا ذکر ایک پرانی بات ہو گئی۔

ایک دن وہ کہیں سے آکر کالج میں داخل ہوئی۔ اب وہ بالکل بدلی ہوئی تھی اب وہ شرماتی لجاتی سہمی ہوئی بیلے نہیں بلکہ شوخ و بے باک حسینہ تھی۔ یہ نیا نام اس نے خود اپنے عیسائی نام سے چنا تھا وہ کالج کے قریب ہی ایک عیسائی کنبے میں رہتی تھی۔ صبح صبح جب گردن اونچی کئے لڑکیاں، لڑکے سائیکل پہ آتی تو نڑکے ٹھٹھک کر رہ جاتے۔ ہر وقت اس کے لبوں پر نہایت بھیانک مسکراہٹ ہوتی۔

یونین کا جلسہ ہے تو حسینہ تقریر کر رہی ہے۔ ڈرامہ ہے تو وہ مرد حصہ لے گی۔ مباحثہ ہے تو حسینہ اپنے اچھوں کی دھجیاں اڑا دے گی۔ اس کی دلیری اور بیباکی سے لوگ ڈرتے تھے۔

حسینہ کو بے باکی کو سراہا جانے لگا۔ اور سب اسے عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

ڈے یونین کا صدر تھا، وہ دبلا پتلا سا بنگالی لڑکا تھا اس میں صرف یہ خوبی تھی کہ وہ کئی سال سے یونین کا صدر تھا میری اس کی جان پہچان تب سے ہوئی جب وہ ہوسٹل میں میرا پڑوسی بنا۔ اس کی شاعرانہ باتیں اس کے انوکھے نظریئے، اس کا حساس دل، اس کا غم ناک نغمے ——— یہ سب مجھے اچھے معلوم ہوئے لیکن مجموعی طور پر بطور انسان کے میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا ویسے اس میں کوئی خیالی عیب یا خامی نظر نہیں آتی شاید یہ اس کا ابڑا ساحلیہ، اس کی ہڈیوں کی غیر متناسب، اس کے چہرے کا فاقہ زدہ اظہار تھا جو مجھے ہمیشہ اس سے دور رکھتا۔

کبھی کبھی شام کو وہی اسے ہمراہ لے جاتا۔ اس طرح اس کی حسینہ سے ملاقات ہوئی۔

غالباً ڈے کی سب سے بڑی خوبی اس کا مکسر تھا اسے اپنی کمزوریوں کا ہمیشہ احساس رہتا بعض اوقات تو وہ اس قدر کسر نفسی سے کام لیتا کہ ترس آنے لگتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے وہ رحم کا طالب ہے۔ شروع شروع میں شاید حسینہ کو اس کی یہی ادا بھا گئی۔

وہ حسینہ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ پھر جیسے حسینہ بھی اس کی جانب مائل ہوتی گئی۔ جب وہ دائمن پہ دو بھرے مکھنے سناتا تو اس کی نگاہیں

جینی کے چہرے پر جم جاتیں ننھے کی پرواز نہایت مختصر ہوتی۔ ٹڈے کی انگلیوں سے لے کر جینی کے دل تک ۔ !

جب وہ دونوں ننھے کی کتابیں ہاتھ میں لئے بحث میں مصروف ہوتے تو اکثر بہک بہک جاتے آنکھوں آنکھوں میں کچھ اور گفتگو ہونے لگتی۔

ان دونوں کی دوستی اشاروں اور کتابوں کی حدود سے نکل کر مکمل کھلا ملاقاتوں تک پہنچ چکی تھی۔ جینی کو بنگالی موسیقی سے لگاؤ ہو چلا تھا۔ وہ بنگالی زبان سیکھ رہی تھی جب وہ بالوں میں پھول لگا کر ساڑی کو ایک خاص وضع سے پہن کر نکلتی تو بالکل بنگالی لڑکی معلوم ہوتی کالج کی کئی لڑکیاں اسے دیکھ کر بالوں میں پھول لگانے لگیں۔

ان دنوں ہم ڈراما کھیل رہے تھے، دوپہر سے ہی ہر مل شروع ہو جاتی شام پھی اکٹھے گزرتی۔ اکثر میں اسے گھر چھوڑنے جاتا، اس کے کمرے کی زیبائش خوب ہوتی، کسی روز تو یوں معلوم ہوتا جیسے کمرہ نہیں جنگل ہے۔ دیواروں پر گہرا سبز والی پیپر ہے جس پر درخت اور گھنی جھاڑیاں بنی ہوئی ہیں، گلدانوں میں لمبی لمبی گھاس اور بڑے بڑے پتے ہیں، سبز قمقمے روشن ہیں، فرش پر بچھے ہوئے قالینوں کے نقش و نگار، دیوار سے ٹنگی ہوئی تصویریں سبزی مائل پڑتے، گلوں میں رکھے ہوئے پودے ۔۔ یوں معلوم ہوتا جیسے درختوں کی یہ تصویریں ابھی متحرک ہو جائیں گی۔ پھر کسی روز سب کچھ زرد ہوتا۔ دیواریں، پردے، غلاف، قالین، قمقموں کے شیڈ۔ گلدانوں میں مرجھائی پھولوں اور خشک ٹہنیاں ہوتیں ایشٹرے کے سامنے ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے۔ خیالات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ تصور میں تپتی ریت صحرا بھرنے لگتا۔ تاروں کی چھت تلے صدیوں پرانوں کا نغمہ گونجنے لگتا۔

پھر کسی روز برف باری کے نقاہت آنکھوں کے سامنے آجاتے یہی آرائش کبھی طوفان زدہ سمندر کی یاد دلا دیتی۔ جھاگ اڑاتی ہوئی پچھاڑ تی لہریں، ہوا کے تند و تیز تھپیڑے اور آندھیوں میں پتے کی طرح کانپتا ہوا سفینہ ۔۔۔ !

اس کے کمرے میں کبھی ایسا گلدستہ میں نے دوبارہ نہیں دیکھا۔ گلدان میں رنگ رنگ کے پھول بھی ہیں، شوخ پھول بھی ہیں، لیکن صرف ننھی ننھی کلیاں ہی ہیں، باقی سب رنگ آپس میں گھل مل کر کھو گئے ہیں۔ کبھی غنچے، کلیاں، پھول سب کہیں چھپے ہیں، صرف خوشنما وضع کے پتے سامنے آگئے ہیں، اس کے ترتیب دیتے ہوئے گلدستوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی کہ ایسے حسین و جمیل پھول بھی آسمان تلے کھلتے ہیں جنہیں گلشن میں نگاہ بھی بھانتی تک نہیں۔

ایک پروفیسر کی تبدیلی پر باغ میں پارٹی ہوئی ٹے ہوا کہ وہیں شام کو بارہ دری میں چھوٹا سا ڈرامہ بھی کھیلا جائے۔ جینی کو الیہ پارٹ ملا وہ دن اس نے اکیلے گزارا کسی سے بات نہیں کی دن بھر اداس رہی لیمپوں کی روشنی میں ڈراما شروع ہوا جینی نے اپنا گانا بالکل آخر میں رکھا۔ لیمپ بجھا دیئے گئے۔ ننھے نے دیکھا کہ درختوں کے جھنڈ سے چاند طلوع ہو رہا تھا وہ ایک بنگالی نظم گا رہی تھی، جس میں چور دھوبی کے چاند کو مخاطب کیا گیا تھا۔ ڈے وائلن بجا رہا تھا۔ وہ سادا سا گیت اور وائلن کا مترنم نغمہ جو نغمہ اس کی انگلیوں کی جنبش جسم کے روح اور گھنگھرو کی تال پر چاند تارے ناچنے لگے پھر جیسے مندروں میں گھنٹیاں بجنے لگیں پجاری سنگار کئے کنول کے پھول تھامے آگئیں پجاریوں کے سر جھک گئے۔ خلاؤں میں تقدس برسنے لگا چراغوں سے دھواں اٹھا، دھند بن کر چھا گیا۔ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ صرف جینی رہ گئی اور اس کا محبوب ۔۔۔ پجاری اور دیوتا۔

یہ غنائیہ باغ کی اس چاندنی رات میں ختم نہیں ہوا۔ سادا اور اسے دیر تک ہم آہنگ رہے۔ ٹڈے نے ان پندرہ بھرے جذبات کا اظہار کر دیا جنہیں وہ دیر سے چھپائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی بے پایاں محبت کا یقین دلایا۔ یہ بھی کہا کہ مرتے دم تک وہ جینی سے اسی شدت کے ساتھ محبت کرتا رہے گا۔ اس نے اپنے والدین کو سب کچھ لکھ دیا ہے عنقریب اس کی والدہ آئیں گی اور جینی سے ملیں گی۔ پھر وہ جینی کو رسم کے مطابق سنہرا بار دے گا جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا ہوا ہوگا۔ ان دونوں کو ایک بہت بڑی قوت نے آپس میں ملا دیا ہے۔ آرٹ نے۔ وہ دونوں آرٹسٹ ہیں انسان فنا ہو جاتے ہیں آرٹ فنا نہیں ہوتا۔ آرٹ جاوداں ہے۔

میں نے اس کے کمرے میں ساز دیکھے، معلوم ہوا کہ وہ ہندوستانی موسیقی سیکھ رہی ہے مغربی موسیقی سے وہ شناسا تھی میں نے اسے جانے پہچانے نغمے

گنگناتے سنا تھا۔ پیانو پر اس کی انگلیاں خوب چلتیں کئی مرتبہ یوں ہوا کہ ریڈیو پر آرکسٹرا سمفنی بجا رہا ہے اور جینی مجھے سمجھا رہی ہے کہ سمفنی ایک نغمہ نہیں مختلف نغموں کا مرکب ہے۔ ایسے نغمے جو مختلف کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ کیفیتیں بغیر کسی تسلسل کے آتی ہیں رنج و مسرت، انبساط و حسرت، آشنائیاں، اشتیاق، وسوسے، امید و بیم، اعتراف غم۔ ہماری مسرتیں کبھی رنج کی آمیزش سے خالی نہیں ہوتیں، اسی طرح غم کی گھٹائیں بھی اکثر بجلت کی کرنوں سے جگمگا اٹھتی ہیں۔ انسان کے دل میں کوئی جذبہ مکمل اور بے پایاں نہیں ہوتا۔ یہ کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں ——— کبھی سمفنی میں اتنے انار چڑھاؤ آتے ہیں اور کئی کئی گتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

میں نے اسے ہندوستانی راگ راگنیوں کے کچھ ریکارڈ دیئے جنہیں اس نے بڑے شوق سے سنا اسے یہ نغمے نہایت دلکش معلوم ہوئے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ یہ سب راگ مختلف جذبوں اور کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

میں نے دربار ہی کی تشریح کی کہ جیسے ایک بہت بڑا ہال ہے۔ سامنے تخت پر بادشاہ بیٹھا ہے۔ قندیلیں روشن ہیں، فانوس جگمگا رہے ہیں دور دور تک امرا اور وزرا بیٹھے ہیں پر ہول خاموشی طاری ہے موسیقار کو بلایا جاتا ہے ایسے ماحول میں شوخ موسیقی بے ادبی میں شمار ہوتی نمکین موسیقی بھی موزوں نہیں ہلکی پھلکی چیزوں سے بھی موسیقار گریز کرے گا۔ وہ اپنے جوہر دکھانا چاہتا ہے ——— ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر وہ جو چیز چنے گا وہ بہادری ہے۔

جینی سنتی رہی۔ پھر ایک روز اس نے مجھے چند تصویریں دکھائیں جو اس نے خود بنائی تھیں اسے مصوری کا شوق ضرور تھا لیکن یونہی سرسری سا۔ یہ اس کی پہلی کوشش تھی ان تصویروں میں اس نے ذہنی تاثرات بروش کے ذریعے کاغذ پر منتقل کئے تھے وہ تاثرات جو مختلف راگنیاں سن کر اس نے محسوس کئے تھے اس نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے ہندوستانی موسیقی اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ جو تصویریں اس نے بنائی تھیں ان میں کہیں کہیں ننھے ننھے خودرو پھول کھلے ہوئے تھے پھولوں کے رنگ ہلکے پھلکے پھولوں میں کلیاں بھی شامل تھیں اور ادھ کھلے ہوئے غنچے بھی۔ پتیوں پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ پس منظر دور افق کے پرے برفانی چوٹیاں تھیں، اونچی اونچی برف سے لدی ہوئی چوٹیاں ——— جن سے نورانی شعاعیں منعکس تھیں۔ یہ دور کے سامنے شبنم کے چمکیلے قطرے اور جگمگاتی چوٹیاں۔ ——— سب اس امر کے شاہد تھے کہ سورج ابھی ابھی نکلا ہے اور سارے نظارے پر ایک اداس سی دھندلکا پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی فوزائیدہ دھند جس نے فضا میں دھنگ دھبوکے اس طوفان کے باوجود ایک غمگین تاثر پیدا کر دیا تھا۔

دوسری تصویر ماکھوس کی تھی، اس میں سمندر کی لہروں کو پیانو کے پردوں سے کھینچتے ہوئے دکھایا تھا سفید اور سیاہ پردوں کی لڑیاں لہروں پر تیرتی تھیں کبھی کبھی ایک اونچی سی لہر آتی تو سارے پردوں کو ایک لخت بلند لے جاتی۔ راگ کی روانی اور زیر و بم کو لہروں کے کھیل سے ظاہر کیا گیا تھا۔

چھ پائنٹ کی تصویر منظوم موسیقی کی تصویر تھی۔ جس میں مچلتے ہوئے خوش نغمے مرتعش تھے جنہیں رقاصائیں گھنگھرو باندھے ناچ۔ ہی تھیں ہر جنبش میں بلا کا لوچ تھا مخمور کر دینے والی مستی تھی۔

جینی انکار کرتی رہی لیکن میں نے ان تصویروں کو نمائش میں رکھوا دیا۔ ایک روز ہم نمائش میں تھے کسی نے یہ ہوا جینی کا نام سے دیا۔ چند لمحوں میں ہجوم اکٹھا ہو گیا یہ سب جینی سے مداح تھے جو اس کی تصویریں کرنے لگے۔ اس روز معلوم ہوا کہ جینی مشہور ہوتی جا رہی تھی۔ قریب ہی ہمت بھیڑ ہو رہی تھی ایک جینی پہلوان کی کشتی تھی۔ سانگ یا کچھ ایسا ہی نام تھا وہ دور دور سے اسے دیکھنے آئے تھے اسے ہجوم نے گھیر رکھا تھا۔ یہاں وہ اس قدر ہر دلعزیز ہو رہا تھا وہاں اس کے حریف کو جو مقامی پہلوان تھا کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ کشتی شروع ہوئی، غل مچ گیا۔ کچھ دیر برابر کا مقابلہ رہا۔ پھر وہ مقامی پہلوان نے سانگ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر سے اونچا اٹھا لیا اور زمین پر دے مارا سانگ بے ہوش ہو گیا۔ اسی ہجوم نے جوش کی تعریفیں کر رہا تھا اس پر آوازے کسنے شروع کر دیئے۔ اس پر اشتہار اور کاغذوں کے ٹکڑے پھینک کر اکھاڑے میں تماشہ چھوڑ دیا۔ رہ گئے ایک طرف اکیلا بیٹھا تھا جینی مسکراتی ہوئی گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اسے پسینہ پونچھنے کے لئے اپنا چھوٹا سا تولیہ دے دیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ لے لیا۔ جینی کی پیاری مسکراہٹ اور دلکش باتوں نے اسے موہ لیا، ان باتوں میں ایسی حلاوت تھی کہ سانگ کو اپنی زبوں حالت کا احساس نہ رہا۔ ساری شام ہم نے اکٹھے گزاری۔ جب وہ رخصت ہوا تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

ڈے کے والد بن آ گئے وہ ہوسٹل سے چلا گیا۔ اس کی والدہ نے جینی کو دیکھا۔ جینی کو ان کے گھر بلایا گیا۔ لیکن یہ آنا جانا بہت جلد ختم ہو گیا۔ ایک روز ڈے جینی سے ملا اور جی بی کے متعلق پوچھنے لگا۔ جینی نے شروع سے اخیر تک ساری کہانی سنا دی سب کچھ بتا دیا۔ ڈے اس پر بہت پڑا یہ باتیں اس سے پوشیدہ کیوں رکھی گئیں۔ اسے پہلے کیوں نہیں بتایا گیا۔ جی بی کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنے عاشق ہوں گے اب اسے کیوں کر یقین آ سکتا ہے کہ جینی کی محبت صادق ہے۔ یہ تو محض ڈھونگ تھا۔ کھیل تھا، اب اس کھیل کو فوراً ختم ہو جانا چاہئے۔

میں نے سنا تو ڈے کو سمجھایا کہ جن دنوں وہ جی بی سے ملا کرتی تھی ڈے سنگاپور سے آیا بھی نہ تھا۔ بھلا وہ ڈے پر اتنی دور کیوں کر عاشق ہو سکتی تھی اور وہ بھی بلا دیکھے یا سنے اور پھر وہ خود جینی کے علاوہ کئی لڑکیوں سے محبت جتا چکا تھا۔ جینی جانتی تھی پھر بھی اس نے باز پرس نہ کی لیکن ڈے نہیں مانا اس کے خیال میں ہر مرد کا فطری حق ہے کہ خود دنیا بھر کی لڑکیوں سے چھیڑیں کرتا پھرے، لیکن لڑکی سے یہ توقع رکھے کہ وہ زندگی بھر صرف اسی کو چاہتی رہے گی اس کی منتظر رہے گی بچپن ہی سے اسے الہام ہو جائے گا کہ فلاں مرد آج سے اتنے سال بعد اسے چاہنے آئے گا، جو خود بہر حال ہو گا اور چاہنے سے پہلے لڑکی کی گذشتہ زندگی کو اچھی طرح کرید کرید کر اپنی تسلی کرے گا۔

جینی نے اسے سارے وعدے یاد دلائے جو اس نے قسمیں کھا کھا کر کئے تھے وہ محبت بھری باتیں یاد دلائیں جو ہزاروں بار دہرائی گئی تھیں۔ وہ خواب بتائے جو دونوں نے اکٹھے دیکھے تھے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ تو جیسے کسی بہانے کی تلاش میں تھا دیکھتے دیکھتے جینی میں بے شمار نقص نکل آئے نہ اس کا کوئی خاندان تھا نہ مذہب۔ سوسائٹی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے خون میں آمیزش تھی۔ اس کی تربیت ایسے والدین کے زیر سایہ ہوئی جن کی زندگی ہمیشہ ناخوشگوار رہی جن میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ غریب بھی تھے۔ اور پھر جینی کچھ اتنی خوبصورت بھی نہیں تھی۔ اس سے کہیں حسین اور بہتر لڑکیاں ڈے کو مل سکتی تھیں ایک حسین اور دولتمند لڑکی کو تو ڈے کی والدہ نے ڈھونڈ بھی لی تھی۔ لڑکی کے والد راضی بہار تھے لڑکی کے ساتھ لاکھوں کی جائداد دے رہے تھے۔ انہوں نے ڈے کو انگلستان بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ میرے نام دعوتی رقعہ آیا۔ میں خاموش رہا جب جینی کے نام رقعہ بھیجا گیا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ طیش میں آ کر میں نے کئی منصوبے باندھے۔ سب سے پہلا منصوبہ ڈے کی ہڈی پسلی ایک کر دینے کا تھا لیکن جینی کے کہنے پر میں خاموش رہا۔

شادی پر ہم دونوں گئے جینی شادی کا تحفہ دے کر گئی، اس کے سامنے یہ تحفہ کھولا گیا۔ ڈے کی بیوی کے لئے سنہرا ہار تھا جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا ہوا تھا۔

اگلے مہینے جینی نے کالج چھوڑ دیا اور گھر چلی گئی۔

ایک پارٹی میں میرا تعارف ڈے کی بیوی سے ہوا۔ معلوم ہوا کہ اسے دنیا میں اگر کسی چیز سے نفرت تھی تو آرٹ سے۔ یہ سارے مصور، موسیقار، شاعر اسے زہر دکھائی دیتے تھے۔ اور سب سے زیادہ چڑ اسے ان امیر لوگوں سے تھی جو اتنی قسم کی ضروریات میں پڑ کر اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔ بھلا شاد یا دانش سیکھنے کی کیا ضرورت ہے جب جی سے شام تک ریڈیو پر ساز بجتے رہتے ہیں۔ مصوری سیکھنے میں کیا تک ہے، جب بازار میں ہر قسم کی تصویریں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ اگر کسی نے اغلاط کو تو ڈ مروڑ کر کچھ شعر گھڑ لئے تو اس پاگل بنانے یا بے قابو ہو جانے کی کیا ضرورت ہے۔

آخری امتحان پاس کر کے میں کالج سے چلا آیا۔ مصروفیتوں سے آنکھ دبوچا۔ ملک کے مختلف حصوں میں پھرتا رہا۔ برسوں تک میں نے جینی کے متعلق نہیں سنا۔

پھر ایک دن ایک پرانا دوست ملا۔ میں نے جینی کا ذکر کیا تو اس نے باتیں سنائیں کہ وہ پہلے سے بالکل بدل چکی ہے۔ ہر جگہ یہی مشہور ہے کہ وہ

محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ایک عاشقہ ختم ہوتا ہے تو دوسرا عنقریب شروع ہوگا۔ کالج چھوڑ کر اس نے ملازمت کر لی بالکل آزادانہ طور پر رہتی ہے ہر شام اس کے ہاں لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے قسم قسم کے لوگ آتے ہیں نہایت عجیب و غریب ہجوم ہوتا ہے۔ خوب افواہیں اڑتی ہیں، لوگ چسکیاں مارتے ہیں۔ ہم نے یہ کیا دیکھا، میرے کوٹ کے کالر سے جو بال چپکا ہے وہ جینی کا ہے۔ یہ تصویر جینی نے مجھے دی تھی۔ میرے رومال پر جو سرخی ہے وہ جینی کے ہونٹوں کی ہے۔

پچھلے سال سیلاب آیا۔ لوگ بے گھر ہو گئے، قحط پڑا۔ جینی نے کچھ لڑکوں لڑکیوں کو ساتھ لیا گاؤں گاؤں پھر کر مصیبت زدہ مخلوق کی مدد کی، امیروں سے فنڈ کر کے چندہ اکٹھا کیا۔ اپنی محنت اور آرام کا خیال نہ رکھا، رات دن محنت کی نتیجہ بیمار ہوئی کچھ اوباش قسم کے لوگ محض جینی کی وجہ سے محتاجوں کی امداد پر تیار ہو گئے۔ اسے تھیٹر، تنگ کیا۔ ایک شام کو بہانے سے اپنے ساتھ لے گئے اسے شراب پلانی چاہی جینی نے گردہ کے سر سخنے کے بال نوچ لئے اس کا منہ ناخنوں سے لال کر دیا۔ بیچارے کو اسی وقت جینی کو واپس چھوڑ گئے

پھر کسی نے جینی کی تصویر اخباروں میں نمائش کی تعریف بھی شائع تھی۔ سب نے یہی سمجھا کہ اس سستی شہرت کی غرض سے جینی نے لوگوں کی مدد کی تھی۔

پھر ایسا اتفاق ہوا کہ ایک تہوار نے مجھے جینی کے قریب پہنچا دیا محض چند گھنٹوں کی مسافت تھی۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے میں اسے ملنے جاتا۔ سچ مچ اب وہ پرانی جینی نہیں رہی تھی پہلے سے کہیں تندرست اور چست معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر تازگی تھی، نکھار تھا، ہونٹوں میں رسیلا پن اور رخساروں پر سرخی آ چکی تھی۔ اب وہ ایک شعلۂ فروزاں تھی۔ وہ طرح طرح سے بناؤ سنگار کرتی شوخ بھڑکیلے لباس پہنتی جگمگ جگمگ کرتے ہوئے زیور، قسم قسم کی خوشبوئیں۔ وہ ہر مرد سے یار باش دھڑلے کی گفتگو کر سکتی تھی۔ کلبوں اور رقص گاہوں میں اسے باقاعدگی کے ساتھ دیکھا جاتا۔ ہفتے بھر کی شامیں پیسے ہی مختلف مصروفیتوں کے لئے وقف ہو جاتیں پرانی سیدھی سادی جینی کی جگہ اس شوخ و شنگ لڑکی کو دیکھ کر میں کچھ چڑ سا گیا یہ جذبہ محض حسد و رشک کا جذبہ تھا شاید میں برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ گفتگو کرتے وقت مجھے بار بار یہ احساس ہو کہ وہ مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ ہر بحث میں وہ ہمارے تاش کھیلتے وقت میں بغلیں جھانکنے لگوں۔ رقص گاہ میں بعض دفعہ مجھے ایک لڑکی بھی نہ ملے، اور اس کے لئے بیسیوں لڑکے بے قرار ہوں۔ وہ ایسی چیزوں کا ذکر کرتی ہے جن کا مجھے شوق تو ہے لیکن ان تک پہنچ ذرا مشکل ہے۔

شام کو اس کے ہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ ان میں زیادہ تعداد عشاق کی ہوتی جو طرح طرح سے اپنی محبت کا اظہار کرتے شادی شدہ حضرات اپنی غمگین ازدواجی زندگی کا رونا رو دیا کرتے کہ کس طرح قدرت نے ان کو وفاداری اور نہایت بدمذاق اور ٹھس طبیعت کی وفیقہ پلے باندھ دی۔ اب ان کے لئے دنیا جہنم سے کم نہیں۔ اب یہ عذاب برداشت نہیں ہو سکتا۔ خودکشی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں لیکن اس سیاہ خانے میں امید کی ایک نورانی کرن نظر آتی ہے ——— وہ ہے جینی۔

پڑھے اور ذہین قسم کے لوگ اکثر سیاسیات اور ادب پر بحث کرتے۔ کارل مارکس فرائیڈ اور مولانا روم کے تذکرے چھڑتے، سیاست دانوں کی غلطیاں گنواتے، مشاہیر پر تنقیدیں کرتے، بے ٹوٹ اور سچی دوستی کا دم بھرتے لیکن موقعہ پا کر عشق بھی جتا دیتے۔

ایک طبقہ فضائت پسند اور تازک اندام لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ ہر وقت اپنی کمزوریاں گنواتے رہتے اپنی بیماریوں کا ذکر کرتے اپنے آپ کو بے حد ذلیل اور کم تر سمجھتے۔ بار بار جینی سے پوچھتے ——— اگر تمہیں برا معلوم ہوتا ہو تو میں آئندہ نہ آیا کروں۔ اگرچہ ایسا کرنے سے مجھے قلبی، جگری اور روحانی صدمہ پہنچے گا ——— مگر ہر شام کو آ دھمکتے۔

کئی ایسے نثر نگار بھی تھے جو چھپ چھپ کر خطوط لکھتے۔ جبھی پرچیوں پر نظمیں کہہ کر اسے بدنام کرتے، سامنے آتے تو شرما شرما کر برا حال ہو جاتا۔

سب سے گھٹیا وہ عاشق تھے جو اپنے آپ کو جینی کا بھائی کہتے۔ بھائیوں کی سی دلچسپی لیتے۔ اس کی حفاظت اور بہبودگی کے خواہاں رہتے

لیکن دل میں کچھ اور سوچتے رہتے۔

مجھے یہ تماشا دیکھ کر غصہ آتا۔ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے یہ سب کے سب تو اسے پسند آنے سے رہے، سارے مجرم کو برخاست کر کے ان میں سے ایک دو سے ملتی رہا کرے۔ میرا ارادہ بھی ہوا کہ اسے ٹوکوں پھر سوچا کہ بھلا میں اس کا کیا لگتا ہوں، دیکھا جائے تو میں خود اسی ہجوم میں سے ایک ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں اسے ذرا پہلے سے جانتا ہوں۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک شخص کی جانب ملتفت ہوتی جا رہی ہے یہ شخص بالکل عجیب تھا۔ پہلے پہل تو میں اسے سمجھ ہی نہ سکا یہی سوچتا کہ آخر اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اسے قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کی زندگی کا واقعی کوئی مقصد نہیں۔ اسے کسی چیز پر یقین نہیں تھا۔ محبت، نفرت، زندگی، موت، انسان، خدا — سب سے منکر تھا۔ بات بات پر بحث کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ سب اس سے کتراتے تھے، اسے کامریڈ کے نام سے پکارا جاتا۔ محض جینی کی وجہ سے میں اس سے ملتا ورنہ میرے دل میں اس کے لئے نفرت تھی۔ یہ نفرت شاید اس دن پیدا ہوئی، جب ہم نے پہلی اور آخری بحث کی کامریڈ عورتوں کو ہمیشہ برا بھلا کہتا۔ نکتہ چینیاں کرتا۔ ایک روز میں نے اختلاف کیا۔ عورت کی زندگی کی ان گنت مجبوریاں جتلائیں۔ لڑکی کی پیدائش کو نامبارک سمجھا جاتا ہے لڑکوں کے مقابلے میں اس کی پرورش میں کوتاہی برتی جاتی ہے۔ بھائی سے ڈانٹتے دھمکاتے ہیں۔ اس کا حصہ چھین لیتے ہیں۔ اس کے دل میں احساس کمتری پیدا کر دیتے ہیں۔ ذرا بڑی ہونے پر کنبے اور پڑوسیوں کی تنقید شروع ہو جاتی ہے وہ پیٹے کا ذرا سر سے اتر جانا خاندان کی ناک پر اثر انداز ہوتا ہے ذرا سی بھول اسے زندگی بھر کے لئے مجرم بنا دیتی ہے۔ کالج میں اسے فلسفہ سکھایا جاتا ہے مساوات اور آزادی کے سبق دیئے جاتے ہیں لیکن جب شادی کا سوال آتا ہے تو اس سے کوئی نہیں پوچھتا، اسے، جو کہنا پڑتا ہے جو چند شک مزاج بزرگ چاہتے ہیں لیکن لڑکوں کی زندگی بالکل مختلف ہے وہ بڑی آسانی سے جھوٹی قسمیں کھا کر لڑکیوں کو دھوکا دے سکتے ہیں محبت کا واسطہ دلا کر سب کچھ سزا لیتے ہیں —— پھر چند خاندانی مجبوریوں کی بنا پر انہیں بڑی آسانی سے دھتکار سکتے ہیں اور سلیٹ کی طرح بار بار سب کچھ دھل جاتا ہے۔ ان کا دامن کوئی معنے ہی نہیں رکھتا۔ ان کے لئے بیاہ شادی کھیل ہے۔ لیکن لڑکیوں کے لئے شادی ہی تمام عمر تک کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ بیوی بن کر بچوں کی پرورش معاشی بے بسی، ذرا ذرا سی بات کے لئے خاوند کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ معمر سیدھ ہو جانے پر اولاد بے صرف سمجھتی ہے، مذاق اڑاتی ہے۔ ——

کامریڈ کو میری باتیں بالکل فضول معلوم ہوئیں۔ وہ یہی کہتا رہا کہ ویسے عورتیں اور مرد برابر ہیں لیکن مرد کا رتبہ روحانی اور جسمانی لحاظ سے بلند ہے۔ اس نے دونوں کے دماغ کی بناوٹ اور وزن کا ذکر چھیڑ دیا۔ مرد کے لمبے قد اور مضبوط بازوؤں کا حوالہ دیا۔

اس کے بعد میری اور اس کی کبھی بحث نہیں ہوئی۔

پتہ نہیں اس کا ذریعہ معاش کیا تھا، وہ رہتا کہاں تھا۔ اس کی گزشتہ زندگی کہاں اور کیسے گزری بس یہ مشہور تھا کہ وہ جینی کا یار ہے۔

جینی ان دنوں بڑی عجوبہ قسم کی کتابیں پڑھتی۔ مشکل مضامین کی بے حد شک اور سنجیدہ لگتا۔ جب وہ دونوں باتیں کرتے تو سمجھ سکتے کہ کوئی سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے۔ ان دونوں کی دوستی کا یہ پہلو مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا جینی کی دل اور ذہین باتیں ظاہر کرتیں کہ وہ دماغی ارتقا کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہی ہے۔

ہم ایک ٹاک پر گئے۔ اس تاریخی عمارت کو ہم نے بارہا دیکھا تھا۔ لیکن جب جینی نے ایک خاص زاویے سے ہمیں دیکھنے کو کہا تو یوں معلوم ہوا جیسے اس باغ اور عمارت کو آج پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔ کامریڈ اچھل پڑا بولا صرف ایک آرٹسٹ کی آنکھ اس زاویے کو دیکھ سکتی تھی۔ جب قصے کہانیاں سنا رہی تھیں تو ایک لڑکا اپنا رومان سنانے لگا۔ اسے ایک لڑکی دور دور سے دیکھا کرتی۔ اشارے ہوتے، پتھروں سے لپٹے ہوئے خطوط آتے، عہد و پیمان

ہوتے۔ لیکن وہ حاصلہ اتنے کا اتنا تھا۔ مزدہ خود قریب آتی نہ آنے دیتی۔ تنگ آکر اس نے چھت پر جانا چھوڑ دیا۔ کئی دنوں کے بعد گیا تو لڑکی نے بڑی منت سماجت کی، اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر اب بھی قریب نہ آنے دو گی تو آئندہ کبھی چھت پر نہیں آؤں گا۔ بڑی مشکلوں کے بعد وہ راضی ہوئی بار بار یہی کہتی ——— آپ وعدہ کیجئے کہ جھوٹے نفرت تو نہیں کرنے لگیں گے۔ اس نے دعوہ کیا تو مانی۔ یہ اسے ملنے گیا لڑکی نہایت حسین تھی لیکن اس کی آنکھوں میں نقص تھا، وہ بھینگی تھی۔

اس پر بڑے قہقہے پڑے۔ ہنستے ہنستے لوگ دوہرے ہو گئے لیکن مینی خاموش رہی اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں دیر تک وہ چپ چاپ رہی مجھے بھی اس کہانی نے اداس کر دیا۔ یہ کہانی ہرگز مضحکہ انگیز نہیں تھی۔

باغ کے گوشے میں ایک کنواں تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس میں جھانک کر جو خواہش کی جائے پوری ہو جاتی ہے سب نے کچھ مانگا جب مینی کی باری آئی تو اس نے کہا کہ مجھے کسی سے کچھ نہیں چاہئے، مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، کوئی ارضی یا سماوی طاقت مجھے کچھ نہیں دے سکتی۔ میں نے ایک زندگی پائی ہے اور مجھے زندہ رہنا ہے۔

کامریڈ عش عش کر اٹھا۔ کہنے لگا مینی کا یہ نظریہ صحیح ترین نظریہ ہے: ایسی دنیا میں جہاں لوگ اب تک بارش کے لئے دعا مانگتے ہیں اس سے بہتر نظریہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ تقدیر اور قسمت فضول چیزیں ہیں۔ ہر شخص اپنے گرد بچھے ہوئے جال میں گرفتار ہے اپنے حالات سے مجبور ہے زندگی کے اٹل ارادے، شدید جذبے سب حوادث کے غلام ہیں۔ ہم اس لئے ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اتفاق نے ہمیں ملا دیا۔ اسی طرح محض اتفاق سے ہم ان لوگوں کی رفاقت سے محروم ہیں جنہیں ملتے تو شاید گہرے دوست بن جاتے۔

پھر ایک روز وہی کامریڈ بوا اخلاطونی دوستی اور خلوص کے گن گایا کرتا تھا مینی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انہوں نے اکٹھے چائے پی۔ پکچر دیکھی، چھوٹے موٹے تحفے خریدے جب ٹیکسی میں دونوں واپس آ رہے تھے تو اس نے مینی کو چومنے کی کوشش کی مینی نے ٹیکسی ٹھہرائی جتنے روپے کامریڈ نے اس شام خرچ کئے تھے اس کے منہ پر مارے اور پیدل واپس چلی آئی۔

کامریڈ کئی روز تک غائب رہا پھر معافی مانگنے آیا مینی نے کہا کہ مجھے طیش نہیں آیا مایوسی ہوئی ہے۔ میں نہیں ان سب سے مختلف سمجھتی تھی میرا خیال تھا کہ تم اس ہجوم میں سے نہیں ہو لیکن تم بھی اور ایک عام انسان میں فرق نہیں۔

کامریڈ نادم تھا، بولا ——— میرے نظریے خواہ کیسے ہوں میں انسان بھی ہوں۔ تم میں اتنی زبردست کشش ہے کہ میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ میں نے کبھی تمہارے چہرے کو غور سے نہیں دیکھا تمہاری بے چین روح کو دیکھا ہے اور یہی روح مجھے عزیز ہے۔ اگر تمہارے خدوخال بہتر ہوتے اور تم زیادہ خوبصورت ہوتیں تو تمہاری زندگی مختصر ہوتی۔ اگر تم کسی بہتر گھرانے میں پیدا ہوئی ہوتیں تو تمہاری زندگی سمجھنا آسان ہوتی۔ لیکن تم اتنی صلاحیتوں کی مالک نہ ہوتیں تمہاری روح اتنی حسین نہ ہوتی۔"

مینی عورت تھی، کامریڈ کے رنگین فقروں نے اسے مرعوب کیا اس کی آنکھیں جھک گئیں دل دھڑکنے لگا دماغ سرخ ہو گئے۔ جب کامریڈ نے بازو پھیلائے تو مینی نے مزاحمت نہ کی۔ اس کے بعد کامریڈ کی گفتگو کا انداز بدل گیا محبت ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا نام نہیں بلکہ دونوں کے ایک سمت میں دیکھتے رہنے کا نام ہے محبت میں اگر رفاقت کی آمیزش ہو تو وہ بلندیوں تک جا پہنچتی ہے ——— اسی قسم کی باتیں بار بار وہ دہراتا۔

کبھی کبھی وہ مجھے کافی دلچسپ معلوم ہوتا اس کی بہت سی چیزیں مجھے پسند تھیں اس کی صحافانہ رومانی بے جا طبیعت، سیلانی پن ——— لیکن اس کے شکست خوردہ نظریے، بلاوجہ کا حزن، تلخ خیالات برے معلوم ہوتے۔ وہ قنوطی تھا اور انانیت پسند اس نے کبھی زندگی کا مقابلہ نہیں کیا مصیبت کو آتے دیکھ کر وہ ہمیشہ راستہ کترا جاتا اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا دنیا بھر کا ستایا ہوا۔ اس کا ارادہ تھا عمر بھر اسی طرح گریزاں رہے گا، اس کی منزل کہیں نہیں ہے۔

میرا تبادلہ ہوا تو جینی مجھے چھوڑنے سٹیشن پر آئی۔ جاتے ہوتے وقت میں نے رومال مانگا پوچھنے لگی تو رومال لے کر کیا کرو گے۔ کہا تو رومال تمہاری شوخ مسکراہٹ کی یاد دلاتا رہے گا۔ بولی تم ہر تحفہ پر رومال ہی کیوں مانگتے ہو؟ بتایا کہ اس کو خود کیوں خوشبو اور نخنے سے سرخ دل کی وجہ سے۔

اگلے سال مجھے کسی نے بتایا کہ کامریڈ جینی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ بالکل ویسے کا ویسا رہا۔ جینی کی تمام کوششیں اس میں کوئی تبدیلی نہ لا سکیں۔ چلتے وقت اس نے جینی سے کہا کہ بے سروسامانی اس کی تقدیر میں ہے اور اسی کی متمنی خفقود ہے۔ وہ جینی سے محبت کرتا رہے گا اس کی تصویروں سے لگاؤ رکھے گا، دوسرے ملکوں سے اسے خط لکھا کرے گا۔ اسے ہمیشہ یاد رکھے گا —— اور بس!

جینی نے اس کا تعاقب کرنا چاہا جو کچھ اس کے پاس تھا فراہم کر دیا۔ پتہ نہیں وہ اسے ملا یا نہیں جب وہ واپس آئی تو خرچ طرح کی افواہیں پھیل ہوئی تھیں جینی کے والد نے جواب تنہا رہتا تھا اسے سخت سست کہا اور گھر سے نکال دیا۔ کچھ اوباش قسم کے لوگوں نے اس کی مدد کرنی چاہی لیکن جینی وہ شہر چھوڑ کر کہیں نکل گئی۔

کیلیری سے میں سمندر پار ملا۔ وہ ہندوستانی تھا نوگ اس کی حرکتوں کی وجہ سے اسے کیلیز نوا کہتے اس سے یہ نام پڑ گیا۔ پہلی ملاقات پہاڑوں میں ایک کیمپ میں ہوئی ہم نے تعجب سے کچھ شہریوں کو کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ جیسے میں باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ ایک روسی افسر سے لڑ پڑا۔ لڑائی کی وجہ ایک روسی لڑکی تھی کیلیری نے فوراً اسے ڈوئیل کی دعوت دی اپنے ریوالور سے چار گولیاں نکال لیں اور روسی سے بولا ہم اسے باری باری اپنے دہان سے چھوا کر چلائیں گے۔ اس میں صرف دو گولیاں ایسی ہیں جن کی قسمت میں گولی لکھی ہوگی اس کے دماغ میں سے نکل جائے گی۔ روسی پٹے ہوتے تھا فوراً راضی ہو گیا۔ پہلا فائر کیلیری نے اپنے آپ پر کیا، وہ خانہ خالی تھا۔ دوسرا فائر روسی نے کیا کچھ نہ ہوا۔ کیلیری تیسرا فائر کرنے لگا تو ہم نے بڑی مشکلوں سے انہیں علیحدہ کیا روسی کو یقین نہ آتا تھا کہ ریوالور میں گولیاں ہیں اس سے یونہی بہلی رہا تھا، دھماکا ہوا گولی نیچے کی دیوار چیر گئی۔

اس کا تبادلہ ہوا وہ ہم سے کیمپ میں آ گیا ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔

شہر کے حاکم نے ہمیں دعوت دی ہم دونوں گئے۔ مہمانیت دلچسپ پروگرام تھا۔ اتفاق سے کیلیری کا تعارف ایک نہایت خوبصورت ایرانی لڑکی سے کرایا کیلیری اس سے گھل مل کر باتیں کر رہا تھا محفل گرم ہوتی جا رہی تھی کہ یکایک گھڑی دیکھ کر کیلیری اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دور کیمپ میں اس نے کسی لڑکی سے رات کو ملنے کا وعدہ کیا تھا مسرد یوں کی اندھیری رات تھی کیمپ وہاں سے میل کے لگ بھگ تھا ہمیں سب نے منع کیا کیلیری کا وعدہ تھا۔ کیوں کر پورا نہ ہوتا۔ ہم جیپ میں روانہ ہوئے تو ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے سفید ہو چکی تھیں ہم اتنی تیزی سے جا رہے تھے کہ موڑوں پر جیپ ہوا میں اٹھ جاتی۔ راستے بھر وہ اپنی محبوبہ کے لافانی حسن کی تعریفیں کرتا رہا جب ہم وہاں پہنچے تو رعونت ختم ہو چکی تھی اضطراب کا دورہ پڑ رہا تھا۔ لڑکی منتظر تھی کیلیری نے میرا تعارف کرایا۔ ان دنوں میں بے حد اداس تھا مہینوں سے مجھے کسی دوست یا عزیز کا خط نہیں ملا تھا۔ میں نے بڑی جذباتی قسم کی گفتگو شروع کر دی اسے یہ باتیں اچھی معلوم ہوئیں ہم ایک گوشے میں جا بیٹھے کیلیری ایک دو بار ہمارے پاس آیا لیکن جلد اٹھ کر چلا گیا جب لوگ جانے لگے تو اس نے مجھے ایک طرف بلا کر کہا "میں کیمپ میں جا رہا ہوں تھوڑی دیر تک تمہارے لئے جیپ بھجوا دوں گا"

"اور یہ لڑکی" —— میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ اب تمہاری ہے —— میں یاروں کا یار ہوں۔ میں تمہارے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا ہوں میں نے تم دونوں کی آنکھوں میں اس روشنی کی چمک بھی دیکھی ہے جو ملاقات پر بلا وجہ پیدا نہیں ہوتی میں اسے چاہتا ضرور ہوں لیکن تم بھی میرے دوست ہو۔"

اس کی شخصیت عجیب تھی نہ اسے کسی خطرے کا احساس تھا نہ کسی مصیبت کا ڈر وہ ہمیشہ کام کر چکنے کے بعد یہ سوچتا کہ یہ کام اسے کس طرح کرنا چاہئے

تھا۔ اس کے مزاج میں بلا کی تندی اور گرمی تھی کیسی ہی آفت آن پڑے وہ کبھی نہ گھبراتا ذرا ذرا سی باتوں پر بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہو جاتا۔ اے سکون سے نفرت تھی اس سے لڑنا۔ اس سے جھگڑنا مجاز سے واپس آیا ہے تو ڈوئل لڑ رہا ہے، جوئے میں آن ہزاروں جیتے ونکل سب ہار دیئے۔

سب اس کے کامیاب معاشقوں پر رشک کرتے، اس کی بہادری کا بار بار چرچا کرتا یہ تو کچھ بھی نہیں، ہزاروں محبتیں ایسی بھی تھیں جو ادھوری رہ گئیں، جو کبھی نہ پنپ سکیں جنہوں نے بار بار زہر اگل تو ڈالا۔

ہمارے قریب ایک چھوٹا سا خوش نما قصبہ تھا۔ گلشن۔ آس پاس کے باشندوں میں کیتری شہنشاہ گلشن کے نام سے مشہور تھا۔

پہلے کبھی اس پر قتل کا مقدمہ بن گیا تھا، موت کی سزا یقینی تھی، لیکن عجیب سے حالات میں وہ بری ہو گیا۔ آزاد ہو کر اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بقیہ زندگی کو ایک فنی زندگی سمجھے گا جو اسے تحفتاً ملی ہے۔ اس زندگی کا گزشتہ زندگی سے کوئی واسطہ نہیں، وہ ہمیشہ مسرور رہے گا، آزاد رہے گا۔ جو چیز ناپسند ہو گی اسے ٹھکرا دے گا، جو بھا گئی اس پر چھا جائے گا۔

محض اتفاق تھا کہ ایسا شخص زندگی کی شاہراہ میں جینی سے ملا

اس کا پیار آندھی کی طرح اٹھا، آناً فاناً میں چھا گیا اور طوفان کی طرح اتر گیا۔

وہ چھٹی پر ہندوستان آیا۔ شام کو کسی شناسا لڑکی سے ملاقات کا پروگرام بنا، اسے ملنے گیا، وہ نہیں ملی مگر وہاں ایک اور لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ یہ لڑکی جینی تھی جو اپنی سہیلی سے ملنے آئی تھی۔ کیتری نے جینی کو اپنی محبوبہ کا نعم البدل سمجھا جتنے دن وہ وہاں رہا اسے نعم البدل سمجھا دیا اس نے قیمتی تحفوں کی بارش کر دی اپنی دلچسپ باتوں اور رنگین کہانیوں سے جینی پر جادو کر دیا۔ پھر کیلی کاروں میں اسے لئے لئے پھرا ایک چاندنی رات میں جب وہ سمندر میں تیرنے گئے تو ریت پر بیٹھ کر اس نے محبت کا واسطہ دے کر جینی کو شیریں بیانی عمر بھر نبھانے اور صادق رہنے کا حلف اٹھایا، ہمیشہ اکٹھے رہنے کے عہد و پیمان کئے یہ سب کچھ اس قدر پرخلوص تھا کہ جینی نے سچ مان لیا

اس آغاز کے بعد انجام وہی ہوا جس کی توقع کی جا سکتی تھی، جو ناگزیر تھا۔ جینی کی زندگی میں وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔

لیکن جینی کی یاد اس کے دل سے مکمل طور پر نہ گئی۔ جب کبھی اسے کوئی ٹھکرا دینا جیسا دینا تک تمہارا بنا پڑتا، کوئی بری خبر سننے میں آتی اداسیاں عود کر آتیں تو اسے جینی کی معصومیت، اس کا خلوص اور پیار یاد آتا۔ رات کی تنہائی میں ہم دونوں دیر تک نیچے میں بیٹھے رہتے باہر سرد ہواؤں کے جھکڑ چلتے تو وہ جینی کو یاد کرتا۔ اپنے جھوٹے وعدوں کو یاد کر کے شرمندہ ہوتا، اپنے آپ کو لگاتار کوستا بار بار کہتا کہ جینی ان سب لڑکیوں سے مختلف تھی جو اس کی زندگی میں آئیں اگر اس کی زندگی میں شادی کی کوئی گنجائش ہوتی تو وہ جینی سے ضرور شادی کرتا۔ وہ نہایت غیر معمولی لڑکی تھی، اسے کسی نے سمجھا نہیں۔ کسی کی نگاہیں اس کے خدوخال سے آگے نہیں پہنچیں۔ اس کی روح کی عظمت کو کسی نے نہیں پہچانا، اس میں کسی معصوم کی روح تھی کسی عظیم شہید اور دیوتا تراش کی روح، اس میں اتنی صلاحیتیں تھیں کہ ان کی رفاقت کسی کی بھی زندگی چمکا سکتی تھی۔ اس میں بلا کی معصومیت تھی اس میں سیتا کا تقدس تھا۔ مریم کی پاکیزگی تھی۔ اس نے کئی مردوں سے محبت نہیں کی بلکہ صرف ایک ایک مرد سے محبت کی — ایک مرد جسے اس نے کلیجے سے لگاتے رینگتے ہجوم سے بچتے اور دوسروں سے مختلف سمجھا، لیکن اس مرد نے اسے ہمیشہ دھوکہ دیا۔ اس کی مسکراہٹ کیسی تھی — بالکل مونا لزا کی مسکراہٹ معصوم، اتھاہ اور پراسرار، اس کی مسکراہٹ کے سامنے کیتری جیسا انسان بھی کانپ اٹھا تھا۔

لیکن ایسی باتیں وہ کبھی کبھی کیا کرتا اور اگلی صبح اکثر بھول جاتا۔

اس کے بعد ایک طویل وقفہ آیا۔ یہ وقفہ ایسا تھا کہ اس نے سب کچھ بھلا دیا جینی بھی یاد نہ رہی۔ میں ہزاروں میل کے فاصلے سے واپس ملک میں آیا

زیر و زبر ہو گیا۔ اس عرصے میں کبھی کوئی پرانی یاد تازہ ہو جاتی اور خیالات کے تسلسل میں جینی کا خیال آ جاتا تو میں یہی سوچتا کہ غالباً اب اس سے کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔

لگاتار تنہائی اور بہت سے گھٹن لمحوں کے بعد مجھے مختصر سی چھٹی ملی۔ میں قریب کی پہاڑیوں پر چلا گیا۔ وہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب تھا۔ دور دور تک چائے کے باغات تھے اور ماہر سوداگروں کی آبادیاں جہاں میں مقیم تھا وہاں خوب رونق تھی۔ میری طرح بہت سے اجنبی سکون کی تلاش میں آئے ہوئے تھے چند ہی دنوں کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ باوجود اتنی چہل پہل اور شور و شغب کے وہ احساس تنہائی گم نہیں ہوا جو مجھے پکڑ کر لایا تھا۔ ایک روز میں یونہی کھویا کھویا سا پھر رہا تھا کہ مجھے جینی مل گئی ایسے دور دراز خطے میں اسے یکایک دیکھ کر مجھے از حد مسرت ہوئی اس مرتبہ تو وہ پہلے سے بالکل مختلف معلوم ہوئی اس کی باتوں میں عزم کی آمیزش تھی اس کے چہرے پر پژمردگی تھی۔ لیکن ایسی پژمردگی جس میں عجیب جاذبیت تھی جو حسن و شباب کی تازگی سے کہیں دلفریب معلوم ہو رہی تھی۔ اس مسکراہٹ میں افسردگی کی رمق نے ایک عجیب وقار پیدا کر دیا تھا۔

وہ وہاں اپنے کسی عزیز کے ہاں رہتی تھی جو چائے کے سوداگر تھے وہ بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ کلب، قمص، پارٹیاں، بے حد اکتا دینے والی تھیں وہاں اس کا صرف ایک دوست تھا، اسی کمپنی کا ایک بوڑھا ملازم جو تنہا رہتا جس کی زندگی کا سب سے قیمتی خزانہ کتابیں تھیں کام سے لوٹ کر وہ بڑے اہتمام سے کتابیں نکالتا۔ دونوں پڑھتے بحث کرتے، لڑتے، اب ہم تین ساتھی ہو گئے۔ چھٹی کے بقیہ دن یوں گزرے کہ پتہ بھی نہ چلا۔ واپس آ کر میں نے تبادلہ کرا لیا اور جینی کے پاس چلا گیا ہم جنگلوں میں نکل جاتے، سیریں کرتے، کتابیں پڑھتے۔ پھول کی طرح ہنستے کھیلتے۔ میں اسے جتنا قریب سے دیکھتا اتنی ہی نئی خوبیاں پاتا وہ بہترین رفیق تھی اکثر مجھے افسوس ہوتا جیسے میں اسے پہلے کبھی نہیں ملا اس کی بے پناہ جاذبیت سے آشنا نہیں ہوا ہم رقص پر جاتے تو وہ سارا وقت مجھے دیتی، میری جانب متوجہ رہتی اس کی نگاہیں میرے چہرے پر ٹکی رہتیں، مجھے اس پر فخر ہونے لگتا۔

ہم ایک دوسرے کے قریب خاموش بیٹھے پڑھتے رہتے کئی کئی گھنٹوں تک ایک بات بھی نہ ہوتی، لیکن ہمارے خیالات ہم آہنگ ہو جاتے، دل میں طمانیت ہوتی، خاموشی اور تقریر کا فرق یوں مٹ جاتا جیسے ہم باتیں کر رہے ہوں۔ پتہ نہیں وہ کون سا رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو قریب رکھا غالباً دوستی کا جذبہ۔ یہ قرب اس قدر ضروری ہو گیا کہ ذرا سی جدائی شاق گزرنے لگتی۔

ایک روز میں نے اس کی کتابوں میں نظموں کی کاپی دیکھی، یہ نظمیں جینی نے لکھی تھیں، نظمیں کس قدر حزنیہ تھیں کتنی کرب انگیز اور دردناک۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ اس نے کب اور کن حالات میں لکھیں یہ اس کی لکھی ہوئی ہر نظم ہمیں معلوم ہوتیں جسے میں جانتا ہوں۔ ولیرا اور نڈر جینی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہی۔

ایک سہ پہر کو ہم سیر سے واپس آ رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی پہلے تو درختوں کے نیچے چھپتے رہے جب موسلا دھار مینہ برسنے لگا تو بھاگ کر ایک خشک جھونپڑی میں پناہ لی۔ میں نے اپنا کوٹ سوکھی ہوئی گھاس پر بچھا دیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی، میں نظموں کی باتیں کرنے لگا روکنے لگا کہ پہلے تو کبھی بھولے سے بھی کوئی شعر اس کی زبان پر نہ آتا تھا اب ہزاروں اشعار زبانی یاد ہیں کہیں اسے کوئی شاعر قوت پسند نہیں آ گیا تھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے معافی مانگی شاید میں نے کوئی دکھتی رگ چھیڑ دی تھی یا تلخ یادیں تازہ کرا دی تھیں میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ پارہ معافی مانگی ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔ جب وہ بہت شانے سے سر لگائے بیٹھی تھی، تو ایسی ننھی منی بچی معلوم ہو رہی تھی جو راستہ بھول گئی ہو، بالکل بے یار و مددگار۔ جو سہارے کی طالب ہو۔ میں نے اس کے آنسو خشک کئے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر اسے پیار کیا۔ ان بارہا چومے ہوئے ہونٹوں پر اب تک تازگی تھی ان آنکھوں میں اب تک معصومیت تھی ان رخساروں پر وہی جلا تھی، یہ لڑکی اب تک وہی لڑکی تھی جسے میں نے برسوں پہلے جھی ندی کے ساتھ مباحثے میں دیکھا تھا۔

اس کی زندگی کی ایک کہانی ایسی بھی وہ لکھ گئی تھی جو میں نے نہیں سنی تھی یہ کہانی اس نے خود سنائی یہ ایک شاعر کے متعلق تھی، جو شرابی تھا، جواری تھا، مفلس تھا، بیمار رہتا تھا، اپنی خودداری اور انفرادیت کو خبط کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ جس کی حرکتیں دیکھ کر افسوس کی بجائے غصہ آتا جینی ہمیشہ اس پر ترس کھاتی ——— ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتی سفارشیں کر کے اس کا کلام چھپوایا، اسے ادھر ادھر متعارف کرایا اس کی حوصلہ افزائی کی کہ شاید یہ اسی طرح سدھر جائے۔ اس کی زندگی بہتر بن سکے اور وہ پیش بہا خزانہ جو اس کے دماغ میں محفوظ ہے کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ ترس کا یہ جذبہ دن بدن بڑھتا گیا جینی غیر شعوری طور پر اس کے فریب ہوتی گئی پھر اس جذبے نے ایک اور شکل اختیار کی۔ جینی کو خود علم نہیں تھا کہ جسے وہ محض ہمدردی سمجھ رہی ہے ایک دن محبت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ جینی نے ایک آوارہ دربدر انسان کو پناہ دی، اپنی توجہ اور اپنا پیار ایسے انسان پر ضائع کیا جو بے گھر تھا۔ اس کا حق دار نہ تھا۔ وہ سدھرتا جا رہا تھا اس کی حالت پہلے سے بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ کہا کرتا کہ اے جینی کو گزشتہ زندگی سے کوئی سروکار نہیں اب تو اسے اپنی گزشتہ زندگی سے بھی تعلق نہ رہا تھا اس کی زندگی تب سے شروع ہوئی جب اس نے جینی کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا نہیں اس سے پہلے وہ کیوں کر جیتا رہا لیکن اب وہ جینی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے اپنی نظموں میں بارہا جینی کو مخاطب کیا تھا ——— تمہارے دل میں خلوص کے چشمے ابلتے ہیں۔ محبت کا قلزم رواں ہے، تمہارے دل میں وہ جذبات ہیں جن پر رات دن کا تسلسل قائم ہے، زمین و آسمان کی گردش قائم ہے۔ یہ جذبات جس دن فنا ہو گئے انسانیت فنا ہو جائے گی دنیا چاند ستاروں کی طرح اجاڑ اور سنسان ہو جائے گی یہاں کچھ بھی نہ رہے گا۔

ایک روز اس نے جینی کو بتایا کہ وہ بیمار ہے اسے دق ہے۔ کبھی کبھی یہ بیماری عود کر آتی ہے کاش کہ وہ تندرست ہوتا، تب کسی روز وہ دونوں شادی کر لیتے زندگی کتنی سہانی ہو سکتی تھی کیسی کیسی راحتیں میسر ہوتیں۔ تب وہ سب اذیتیں بھول جاتیں جو دنیا کے جہنم میں اب تک برداشت کی تھیں۔

وہ اپنی آوارگی میں مرنا چاہتا تھا لیکن بڑی مشکلوں سے جینی نے اسے سینی ٹوریم بھجوایا۔ فالتو خرچ برداشت کرنے کے لئے وہ دن بھر دفتر میں کام کرتی، رات کو ٹیوشن پر لڑکیوں کو پڑھاتی لگاتار مشقت نے اسے کمزور کر دیا۔ وہ بیمار رہنے لگی وقت گزرتا گیا ایک دن اسے معلوم ہوا کہ شاعر صرف اسی کے لئے نظمیں نہیں کہتا اس کے تخیل میں کوئی اور بھی شریک ہے ——— یہ سینی ٹوریم کی ایک نرس تھی جسے وہ جانتی تھا۔

جینی نے اس افواہ پر توجہ نہ دی، بلکہ کسی نے اڑا دی ہوگی، وہ دل رات دن ایک سے ماحول میں رہ رہ کر تنگ گیا ہوگا اسے تفریح بھی تو چاہئے کسی سے ہنسنے بولنے میں کوئی عذر نہیں۔ جب وہ اس سے ملنے جاتی تو نرس کے لئے بھی مختلف لے جاتی ان دنوں کی دوستی پر اس نے کبھی شبہ نہیں کیا لیکن یہ افواہ محض افواہ نہیں رہی۔ شاعر سینی ٹوریم سے تندرست ہو کر آیا تو اس نے شادی کر لی۔ نرس کے ساتھ۔ جینی پھر بھی اس سے ملتی رہی اسے روپے دیتی رہی۔ آخر نرس نے ان ملاقاتوں پر اعتراض کیا کہ جینی جیسی لڑکی سے ملنا بدنامی مول لینا ہے۔ شاعر نے اس اعتراض کو سر آنکھوں پر لیا اور جینی سے ملنا چھوڑ دیا۔ موقع ملنے پر وہ اسے بدنام بھی کرتا اپنے کارنامے سناتا جینی کے پرانے عاشقوں کے قصے لے بیٹھتا۔

وہ کہانی سنا چکی تو میں نے اسے بتایا کہ ہم پرانے دوست ہیں۔ دوستی عظیم ترین رشتہ ہے خلوص پر مبنی انسان ایسا ایمان ہے۔ جو انسانی کمزوریوں سے ہرگز منکر نہیں۔ شاید مجھے اچھے برے کی تمیز نہ ہو لیکن ان جذبات کی قدر کرتا ہوں جن میں خلوص کارفرما ہو خواہ ان جذبات کا انجام کیسا ہی ہو۔ زندگی میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں ذہنی کیفیتیں بھی دیرپا نہیں ہوتیں لیکن وہ جذبات جو اپنے وقت پر صادق تھے ہمیشہ صادق رہتے ہیں۔ اس لئے وہ لمحے جو تمہاری زندگی میں آئے ناگزیر تھے تم سچی تھیں تمہارے جذبات سچے تھے میں نے تمہیں بہت قریب سے دیکھا ہے تمہیں پسند کرنے کے علاوہ تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔

آہستہ آہستہ اس سلسلہ دکھوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا! ابر بہار بن کر وہ ہر وقت میری منتظر رہتی لیکن اب وہ مرحر نہیں تھی اب اسے ماضی یا

حال کا اتنا خیال نہیں رہا تھا جتنا مستقبل کا، وہ تنہا اور اداس تھی۔ کئی مرتبہ میں نے اسے قبرستان میں بیٹھے دیکھا۔ ایک روز میں بھی اس کے پاس چلا گیا۔ وہ عجیب عجیب باتیں کرنے لگی کبھی ایسے پرسکون لمحات بھی آئیں گے جب میں بھی اسی طرح سو جاؤں گی۔ وہ خاموشی کتنی لمبائی ہوگی موت کے بعد اگر یہ محض خلا ہو کا دل دہلا دینے والی تاریکی ہوگی لیکن وہ تاریکی اس کرب انگیز اجالے سے ہرگز بری نہیں ہوگی۔ اپنی نظم کا ایک بند اس نے کئی بار سنایا۔ "میں ان بدنصیبوں میں سے ہوں جنہیں ہر صبح نہایت قلیل روشنی ملتی ہے۔ امید کی اتنی سی بھلا کہ صرف دن بھر زندہ رہ سکیں۔ جس روز یہ روشنی نہ مل سکی میں خلقتوں میں کھو جاؤں گا۔"

میں نے یہ تین اور خوش خیال چیزوں کی باتیں کہہ کے موضوع بدلنا چاہا لیکن وہ بولی — "کاش تم اندازہ لگا سکتے کہ میں کہ، قدر غمگین ہوں کس قدر دل شکستہ ہوں، اگر اب مجھے ہنسانہ ملا تو میرے خواب ناتمام ہو جائیں گے اصول ختم ہو جائیں گے میں گم ہو جاؤں گی۔"

پھر ایک دن جب میں ان افواہوں کی تردید کرنا چاہتا تھا جو ہم دونوں نے بارہا اپنے متعلق سنی تھیں وہ کہنے لگی — تم مجھے جانتے ہو، سمجھتے ہو۔ میں بھی تمہارا صحیح روح سے آشنا ہوں۔ تمہارے ان گنت مشغول طرح طرح کے خیالوں کا مجھے احساس ہے، میں تم سے صرف ذرا سی توجہ مانگتی ہوں۔ بالکل ذرا سا سہارا دو اپنی زندگی کا قلیل سا حصہ مجھے دے دو، میں ہمیشہ قانع رہوں گی، میں کبھی تم پر بار نہیں ہوں گی تم میرا ساتھ نہ دینا میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔

میں اس اشارے کو سمجھ گیا، پہلے بھی کئی مرتبہ اس نے ایسی باتیں کی تھیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ عورت اور مرد کی دوستی نہایت محدود ہے اس پر کئی اخلاقی اور سماجی بندشیں عائد ہیں۔ یہ بندشیں ایک حد تک درست بھی ہیں آخر ایک مقام آتا ہے جہاں فاصلہ کرنا پڑتا ہے۔

میں اس مقام سے لوٹ آیا۔

فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو میں بزدل ثابت ہوا میں خاموش ہو گیا۔ خاموش ہو کر میں اس گروہ میں شامل ہو گیا جو جینی کی زندگی میں مجھ سے پہلے آیا وہ گروہ جو بظاہر اپنے آپ کو باغی ظاہر کرتا ہے لیکن دراصل سماجی روایات کا غلام تھا۔ جینی سو گئی، پھر اس نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں ہم دونوں میں ایک معاہدہ سا ہو گیا اگرچہ یہ معاہدہ زبان پر نہیں آیا تھا لیکن ملے بغیر ایسا کہ جب تک ایک دوسرے کے قریب ہیں پرانے دوستوں کی طرح رہیں۔

میں نے تار دے کے لئے کہا تو نیچے یہ سرخی جگمگا گئی۔ چلتے وقت جینی مجھے چھوڑنے آئی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پہلی مرتبہ میں نے اسے سب کے سامنے روتے دیکھا ان آنسوؤں کے باوجود وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی بار بار وہ آنکھیں خشک کرتی۔ میں نے رومال مانگا، اس نے بالکل بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا کہ رومال لے کر کیا کرو گے؟ میں نے کہا کہ اسے یاد کے طور پر رکھوں گا۔

"اور میرے آنسو کیوں کر خشک ہوں گے —؟" اس نے گیلا رومال دیتے ہوئے پوچھا۔

چند مہینوں کے بعد میں نے سنا کہ اس نے کسی سے شادی کر لی۔

جو جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا وہ نہیں ملا۔ پھر ایک مدت معلوم ہوا کہ بریتی ختم ہو چکی تھی، رقص ختم ہو چکا تھا، لوگ کھانے کے لئے دوسرے کمرے میں جا رہے تھے۔ میں اور جینی بھی لوٹ گئے۔ کچھ دیر کے بعد واپس آئے تو جینی جا چکی تھی۔ اس کا خاوند بھی وہاں نہیں تھا۔

مجھے یونہی خیال سا آیا کہ اس مرتبہ جینی سے بہت کم باتیں ہوئیں۔ میں اس سے درد دریافت نہ اس سے کچھ پوچھا نہ بتایا اس سے رومال بھی تو نہیں مانگا۔ نہ جانے کیوں میں اس گوشے میں چلا گیا جہاں جینی اور اس کا خاوند بیٹھے تھے وہاں میز کے نیچے ایک مسلا ہوا رومال پڑا تھا جو رقص کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں تلے آ چکا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا جھاڑا، سلوٹیں دور کیں جانی پہچانی خوشبو سے فضا معطر ہو گئی۔

یہ رومال یہاں کیسے آیا، جینی جان بوجھ کر میرے لئے چھوڑ گئی، یا یونہی اتفاق سے رہ گیا۔

دیر تک میں اس رومال کو لئے وہیں کھڑا رہا۔ اس روندے ہوئے مسلے ہوئے مرجھائے ہوئے رومال کو دیکھتا رہا جو اب تک خمار انگیز خوشبو میں بسا ہوا تھا۔

جینی کا رومال — عورت کا دل۔

سہیل عظیم آبادی

الاؤ

گاؤں سے پورب کو ایک بڑا سا میدان ہے۔ کھیت کی سطح سے کچھ اونچا اور چوڑس۔ لوگ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کسی راجہ کا یہاں پر راج محل تھا۔ اسی کی مٹی اور اینٹ سے زمین اونچی ہو گئی ہے۔ میدان کے پوربی کنارے پر پیپل اور بھگد کے پیڑ ہیں اور اس کے بعد کھیت۔ اتر کی طرف ناگ پھنی کی گھنی اور اونچی قطار ہے اس کے بیچ میں کئی نیم یا پاکڑ کے پیڑ، اور اس کے بعد کھیت۔ دکھن میں ایک کنارے پر ایک پیپل کا پیڑ ہے۔ اس کے پاس ہی ایک کنواں اور اس کے بعد ایک کھیت۔ پچھم دکھن کونے پر ایک بڑا سا گڑھا ہے جس میں برسات کا پانی جمع ہو کر کئی مہینے رہا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ راج محل کا یہ پوکھر تھا۔ اس میں رانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہایا کرتی تھی۔ نہانے سے پہلے پوکھر میں گلاب کا عرق ڈال دیا جاتا تھا جس کی مہک دور دور تک پھیل جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں راجہ اور رانی دونوں ناؤ پر اس پوکھر پر سیر کیا کرتے تھے۔ یہ پوکھر بہت بڑا تھا بھرتے بھرتے بھر گیا اور جو نشان باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی راجہ اور راج محل کی طرح مٹ جائے گا۔

گاؤں میں اب کسان ہی کسان رہتے ہیں۔ "بر جا ہی پر جا ——— راجہ کرے سو برباد ہوتے تو زمانہ بیت گیا" اس کا راج محل تو میدان ہے۔

یہ میدان گاؤں والوں کے لئے سب کچھ ہے۔ ہر روز سارے گاؤں کے ڈھور اس میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی بھینسوں کو کنوئیں پر دھوتے ہیں پھر گھر لے جاتے ہیں۔ فصل کٹنے پر کھلیان لگاتے ہیں۔ روکھ پیڑ نے کو اور بٹھانے اور کو اور سارنا تے ہیں۔ گاؤں کے لڑکے صبح سے شام تک کھیلتے اور بڑے بوڑھے کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

کارتک کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈک اچھی خاصی پڑنے لگی تھی اور میدان میں کئی دھان کا کھلیان لگایا جانے لگا تھا۔ گاؤں میں نئی زندگی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ لڑکے میدان میں کبڈی کھیل رہے تھے۔ عورتیں کنوئیں سے پانی بھر کر اپنے گھروں کو لے جا رہی تھیں۔ پچھوا پورب کی طرف آگ جلا کر اپنی لاٹھی کو سینک کر سیدھی کر رہا تھا۔ اسی دن وہ اپنی بہن کے گھر دھرم پور سے آیا تھا۔ بہنوئی نے چلتے وقت یہ لاٹھی اپنی بسواڑی میں سے کاٹ کر دی تھی۔ لاٹھی نیچے کی طرف سے ذرا ٹیڑھی تھی اس کا سیدھا کرنا ضروری تھا۔

بھگرو نے لاٹھی سیدھی کرنے کو لاؤ جلا رکھا تھا۔ پہلے لاٹھی کو سنک کو پھر پیپل کی پیڑ میں پھنسا کر اسے سیدھا کیا تھا۔ وہ اپنی بہن کے یہاں سے ایک گیت سیکھ کر آیا تھا۔ اس گیت کو ہلکے ہلکے سُروں میں گاتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دماغ میں بہت باتیں گھوم رہی تھیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ گاؤں میں ایک بہت بڑی سبھا ہونی چاہئے۔ ٹھیک دیسی ہی، یا اس سے بڑی جیسی اس کی بہن کی سسرال میں ہوئی تھی اور اس سبھا میں وہ کھڑا ہو کر کل لوگوں کو ساری باتیں سمجھائے۔ جیسے وہاں ایک آدمی نے سمجھایا تھا۔

بھگرو اپنے خیالوں میں مگن تھا کہ اکلو آ گیا۔ یہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور گاؤں کے ناطے میں بھگرو کا بچا تھا۔ اکلو نے آتے ہی کہا:

"بیٹا لاٹھی تو اچھی ہے مگر اس میں گڑبڑ سا لگے تب۔"

بھگرو نے ہلٹ کر دیکھا اور بولا

"ہاں چچا! پر گڑبڑ سا اچھا سا مل جائے تب نا۔"

شام ہو چکی تھی، دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لاٹھی سیدھی بھی ہو چکی تھی۔ اس نے خوب گھما گھما کر لاٹھی کو دیکھا۔ پھر پیپل کے پیڑ کے سہارے کھڑا کر کے دو قدم پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ اکلو بھی لاٹھی کو ایک خاص نظر سے دیکھتا رہا جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ لاٹھی اچھی ہے اور اگر مل جائے تو بہت اچھا ہو۔

ابھی لاٹھی کو یہ دونوں دیکھ ہی رہے تھے کہ سامو اور باڑھو بھی گھومتے پھرتے آ گئے۔ باڑھو نے آتے ہی کہا:

"ارے بھیا! ابھی اتنا جاڑا تو نہیں پڑا۔ ابھی سے الاؤ تاپنے لگے؟"

اکلو بولا:

"بھگرو اپنی لاٹھی سیدھی کر رہا تھا۔ الاؤ کون تاپے گا ابھی۔"

باڑھو بولا:

"مگر آگ بھلی معلوم ہوتی ہے بھائی۔"

وہ آگ کے پاس بیٹھ گیا اور آگ تاپنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی اور لوگ بھی بیٹھ گئے۔ سانول اسی طرف آ رہا تھا اور ان لوگوں کی باتیں سُن چکا تھا۔ وہ آتے ہی بولا:

"واہ! باڑھو چچا پہلے تو دوسرے کو ٹوکا اور سب سے پہلے بیٹھے بھی آگ تاپنے، واہ!"

باڑھو بولا:

"ہاں بیٹا! اب آگ بھلی معلوم ہوتی ہے، اور ہم نے ٹوکا کب تھا۔ ارے ایسے ہی بول رہا تھا۔"

سب کے سب آگ تاپنے لگے۔ آگ ابھی زیادہ تھی اس لئے کچھ دور ہی دور بیٹھے۔ باڑھو نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا:

"اسے یہ لونڈے سب اتنے بدمعاش ہوتے جا رہے ہیں کہ کیا کہا جائے۔"

سانول نے کہا:

"کیا چچا! ہم لوگوں نے تو کوئی بدمعاشی نہیں کی۔"

باڑھو بولا:

"نہیں۔ تم سب کی بات نہیں۔ یہی تو میرا کہنا ہے۔ تم سب جوان اور بال بچے والے ہوئے۔ کبھی کوئی اونچی نیچی بات دیکھنے میں نہ آئی۔ پر اب کی تو دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ دیکھو ابھی راستے میں آ رہے تھے تو دیکھا کہ بھیدو کے دونوں لڑکے ریڈ (ارنڈ) کی ڈنٹھل جلا کر پیڑی کی طرح

بھک بھک کھینچ کر دھواں اڑا رہے ہیں۔ ڈانٹا تو دونوں کھانستے ہوئے بھاگے۔ سب کا کلیجہ جل جائے گا۔"

اتنے میں چھپی آگیا اور باڑھو نے اس سے بھی یہ بات دہرادی لیکن چھپی نے کہا:

"بھیا۔ اب ادھما ہی نہ رہا۔ ہم سب بھی کبھی لڑکے تھے۔ ایک دفعہ کا قصہ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ ابھی کل کی بات ہے ہم میدان سے آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ خیال ہوا کہ بڑے کنوئیں پر لوٹا مانجھ کر پانی بھر لیں۔ جیسے ہی کنوئیں پر پہنچے تو دیکھا رتیا گھرا کی عورت کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے 'جانے دو رتیا' تو رتیا کہتا ہے ایسے نہیں بھوجی۔ ویسے کہو۔ ع

مورے راہ چھوڑ دو گوری ناری ذبر ہوئی

یاد ہے کرشن لیلا والا گانا۔ جب اس نے لاٹھی اٹھا کر کہا کہ سارا پانی آج تو اجل دوں گی تو راستے سے بھاگا۔"

"چچا! یہ بھی کوئی بات ہے۔ بھوجائی ہے وہ ہنسی ٹھٹھا کرتا ہوگا ـــــــ جانتے ہی ہو رتیا کیسا ہنسوڑ ہے۔"

لیکن چھپی نے بزرگانہ انداز میں کہا:

"ہنسی! یہ بھی کیا ٹھٹھا ہے۔ ایسے ہی لڑکے خراب ہو جاتے ہیں۔ بزرگوں نے دیکھا تھا۔ کوئی دوسرا دیکھ لیتا تو نہ جانے کتنی باتیں جوڑ کر کہتا اور بدنامی ہوتی۔ گاؤں میں ایسی بات کبھی نہیں ہوئی۔"

سانول چپ ہو گیا اور باڑھو نہ جانے کب تک بڑبڑاتا رہتا لیکن سامنے سے بیچو ہی میں روک کر کہا:

"ارے پھاگو تو نے تو کچھ کہا نہیں۔ سنا ہے دھرمپور میں بڑی بڑی سبھا ہوئی۔ بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے۔ کسانوں کے فائدہ کی بات ہوئی۔"

پھاگو نے اس انداز سے سب پر نگاہ ڈالی جیسے وہی اکیلا سب کچھ جانتا ہے۔ باقی سب کا لٹھ کے اتو ہیں۔ پھر بولا:

"ہاں بہت بڑی سبھا ہوئی تھی۔ ایک سادھو جی بھی آئے تھے۔ وہ سب کو ایک بات کہہ گئے۔ سب کسان ایک ہو جائیں۔ آپس میں مل جل کر رہیں۔ تب ہی زمیندار کے ظلم سے بچ سکتے ہیں۔"

سانول بولا:

"بھیا بات پتے کی ہے۔ ہم لوگوں پر جتنا ظلم ہوتا ہے اسے کون جانے۔ سال بھر محنت کر کے اپجاتے ہیں اور ہمارے ہی بال بچے بھوکوں مرتے ہیں۔"

آگ کچھ دھیمی ہو چلی تھی اس لئے باڑھو کچھ اور بھی آگ سے قریب ہو گیا اور بولا:

"بات تو ٹھیک ہے پر ہونا مشکل ہے نا۔"

پھاگو بولا:

"مشکل کیا ہے؟ آج سے ہم لوگ ٹھان لیں کہ آپس میں مل جل کر رہیں گے۔ زمیندار کو بیگار نہیں دیں گے۔ کوئی ناجائز دباؤ نہیں سہیں گے۔ بس! دھرمپور میں تو ایسا ہی ہوا ہے۔ اب تو وہاں چین ہی چین ہے۔"

ابھی بات آگے نہیں بڑھی تھی کہ طوفانی میاں آگئے۔ یہ بوڑھے آدمی تھے اور تیس برس سے گاؤں میں کرگہہ چلاتے تھے۔ طوفانی میاں نے آتے ہی اپنا ٹھرپا (معمولی قسم کا حقہ) ذرا الگ رکھ کر ایک دم لگایا اور اس انداز سے سب کی طرف متوجہ ہوئے جیسے ایک مجسٹریٹ وکیلوں کی بحث سننے کے لئے تیار ہو۔ لیکن طوفانی میاں کو متوجہ دیکھ کر سب چپ ہو گئے جیسے اب وہ کچھ کہنے والے تھے۔

"ارے سب چپ ہو گئے، بات کیا تھی؟"

سائل نے جواب دیا:

"بچا گو دھرمپور گیا تھا طوفانی چچا۔ وہیں کی بات تھی۔"

"کیا بات تھی؟"

طوفانی میاں نے اس انداز میں سوال کیا جیسے اگر انہیں نہ بتایا گیا تو پھر کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ سب کا سننا بے کار رہا۔ بچا گو نے پھر سے ساری بات دہرادی۔ طوفانی میاں نے حقے کا لمبا دم لگا کر بزرگانہ انداز میں کہا:

"بات تو ٹھیک ہے۔ مگر بھائی یہ کرم کی لکھی باتیں ہیں۔ آدمی کیا کر سکتا ہے۔ یہ سب خدائی کارخانہ ہے۔"

طوفانی میاں نے ایک ہی جملے میں سب کی ہمت توڑ دی۔ اب بھلا خدائی کارخانے میں بحث کرنے کا سوال کیسے پیدا ہوتا۔ چھکو تیلی نے کہا:

"طوفانی میاں نے سولہ آنے ٹھیک بات کہی ہے۔ پرماتما نے سدا کے لئے آدمی کو چھوٹا بڑا بنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنا کام ہی نہ چلتا ———"

چھٹو دھوبی نے اور آگے بڑھ کر داد دی اور کہا:

"ہونہہ اگر جمیندار نہ رہے گا تو کون رہے گا؟ سب جمیندار ہو جائیں تو پھر کھیتی کون کرے گا؟"

دلو چپ چاپ بیٹھا سن رہا تھا۔ وہ بڑا جوشیلا تھا۔ سب کی باتیں سن کر اس کا خون کھول رہا تھا لیکن اس کا چچا طوفانی بیٹھا تھا۔ بات آ آ کر اس کے ہونٹوں پر رک جاتی تھی لیکن اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے کہا:

"اپنے کئے سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

طوفانی میاں نے اور ان کے ساتھ دوسروں نے اس کو آنکھیں نکال کر دیکھا۔ وہ حال ہی میں کلکتہ سے آیا تھا۔ کلکتہ میں وہ جہاز گھاٹ پر قلی کا کام کرتا تھا۔ دن رات محنت۔ چین، جاپان اور امریکہ سے آیا ہوا مال جہاز سے اتارا کرتا تھا۔ اس کو کمپنی سے روز جھگڑنا پڑتا تھا۔ وہ کئی ہڑتالوں میں شریک ہو چکا تھا اور وہ دیہات میں زمینداروں کے ظلم سے بھی واقف تھا۔ اس نے کہا:

"ہم لوگوں کو اب تیار رہنا ہی پڑے گا۔"

سائل نے کہا:

"ٹھیک کہتے ہو دلو ———"

طوفانی میاں نے تہہ آلود نگاہوں سے دلو کو دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے اٹھے: "سچ ہے کلکتہ جانے سے آدمی کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔" اس کے ساتھ ہی چھٹو اور چھکو اور ایک دو آدمی اٹھ کر چلے گئے اور اس انداز سے جیسے اس جگہ پر کوئی آفت آنے والی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو اس کی پروانہ ہوئی۔ بلکہ سائل نے کہا:

"جگھم پر ظلم ہے، پرسوں ہی کی بات ہے، میگھو کو پٹواری ہی نے مارا ہے۔ بات یہ تھی کہ پٹواری جی چاہتے تھے میگھو کی عورت اگہن کا چوکا کرے اور اس نے انکار کر دیا۔"

"یہ سب اب نہیں چل سکتا۔ کل میگھو کو کہا جائے کہ وہ بھی کام کرنے نہ جائے۔"

دلو نے رائے پیش کی اور سب نے ہاں کہی۔ پھر آگے چل کر کیا ہوگا؟ اس پر بھی بحث رہی لیکن سب نے نتیجے سے بے پروا ہو کر یہی فیصلہ کیا

کہ پٹواری جی کو رسید نہ دیا جائے۔ دباؤ ڈال کر روزہ گنی وصول کر لیتے ہیں، وہ بھی بند اور بیگاری آخری طور پر ختم ———"

"بیگاری ختم" کہتے وقت دلو نے تھوڑا سا کوڑا کرکٹ اٹھا کر الاؤ میں ڈال دیا۔ الاؤ سے پھر ایک بار تھوڑی سی آگ بلند ہوئی اور بجھ گئی۔

سانول نے کہا:

"تب دلو ٹھیک ہے نا؟"

دلو نے کہا:

"پکا بات ہے بھائی۔ سرکار بات سے نہیں پلٹتا۔"

بھاگو نے کہا ——— "بالکل ٹھیک۔"

پھر سیتل بولا:

"لیکن دلو بھیا۔ وہ جو پنڈت جی آتے ہیں نا۔ کہتے تھے کہ تم سب چپ چاپ بیٹھے رہو۔ یہ سب کام کانگریس کر دے گی۔"

سیتل کے بولنے سے جمن کو بھی ہمت ہوئی۔ وہ بھی اپنے ماموں کے گھر گیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا تھا جس میں کانگریس کی بڑائیاں وہ سن چکا تھا اس نے کہا:

"دلو بھائی ——— کانگریس ——— مولانا صاحب تو کہتے تھے ———"

دلو نے ذرا تیکھے انداز میں کہا:

"دھت۔ یہ سب بکتے ہیں۔ غریب کا کوئی سالا نہیں ہوتا۔ اپنے کرنا ہوگا جو ہوئے۔"

یہ کہتے ہوئے دلو اٹھ کھڑا ہوا۔ رات بھی کافی جا چکی تھی۔ الاؤ بھی بجھ چکا تھا اور فضا میں ٹھنڈک کافی پیدا ہو چکی تھی۔ دلو کے اٹھتے ہی سب کے سب اٹھ گئے۔

دوسرے دن صبح سے سارے گاؤں میں ہلچل تھی۔ بوڑھے بچے اور جوان سب کے سب کچھ نہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے۔ جوان تو ہر دروازے پر کہتے پھرتے تھے "آج سبھا ہوگی۔" بچے تماشا سمجھ رہے تھے اور بوڑھے نتیجہ پر غور کر رہے تھے کہ بھس میں چنگاری پڑ گئی۔ پٹواری نے اندر رمتھوں اور طوطا رام کو بلا کر خوب ڈانٹا، گالیاں دیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس سال تم لوگوں نے لگان بے باق نہیں کر دیا تو کوئی کھلیان سے ایک دانہ بھی اٹھا کر نہ لے جا سکے گا ——— اس سے جوش اور بھی بڑھ گیا۔

شام کو دو چار نوجوان میدان میں جمع ہوئے۔ مگر زیادہ لوگ کترا کر نکل گئے۔ سبھا کرنے والوں کو سخت غصہ ہوا۔ وہ سب کے گھروں میں پھر گئے اور سب سے کہا: "سب کا حشر طوطا رام اور اندرمتھوں کا ہوگا۔ تم سب چڑیوں کی ٹولی کی طرح چیں چیں کرتے رہ جاؤ گے اور پٹواری تمہیں باز کی طرح ہر روز شکار کرے گا۔ آج وہ کل وہ۔"

صبح اٹھ کر سانول منہ دھونے بیٹھا تھا کہ پیارے نے آکر کہا:

"سانول بھائی! تمہیں پٹواری جی نے بلایا ہے۔ کوئی ضروری بات ہے۔"

سانول کا ماتھا ٹھنکا تو ضرور، لیکن وہ چور نہیں تھا جو منہ چھپاتا، منہ ہاتھ دھو کر اس نے کچھ کھایا پیا اور کچہری کی طرف چلا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ اس کی خبر دلو کو بھی کہتا جائے۔ جیسے ہی دلو کے گھر کی طرف مڑا، بھاگو اور دلو آتے دکھائی پڑے۔ بھاگو نے سانول کو دیکھتے ہی کہا:

"بھیا جانتے ہو کچہری سے بلاوا آیا تھا۔ گماشتہ جی بھی آئے ہوئے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مالک سے کوئی خاص

حکم لے کر آئے ہیں ——— کیا رائے ہے ———؟"

سانول نے جواب دیا:

"چلو تمہارے دالان میں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

تینوں گئے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پھاگو نے یہ بھی بتایا کہ ان کی ساری باتیں پٹواری کے کانوں تک چھپڑ دھوبی پہنچاتا ہے۔ اس سے سانول کو بڑا غصہ آیا اور وہ بولا:

"دو سالے کو پکڑ کر مار لاٹھی۔ ہم لوگ سے کھچڑ کھود کھود کر بات پوچھتا ہے اور اپنے باوا کو کہہ آتا ہے۔ حرامی!"

دلو نے کہا:

"غصہ کرنے کی بات نہیں سانول۔ کام کرنا ہے۔ دھیرج سے کام کرنا ہوگا۔"

سانول نے کہا:

"ایسے سالوں کو سزا ضرور ملنی چاہیئے۔"

پھاگو نے پوچھا:

"تو اب کیا ہوگا؟"

سانول نے کہا:

"ڈرنے کی بات کیا ہے۔ ٹھہرو پٹواری نے بلایا ہے وہاں سے ہو آؤں۔ دیکھوں بات کیا ہے؟"

سانول چلا گیا۔ دلو اور پھاگو کچہری سے ہو کر آئے تھے۔ ان دونوں پر ڈانٹ پڑ چکی تھی۔ لیکن ان دونوں نے سانول سے باتیں اس لئے نہیں کہیں کہ وہ اور بھی غصہ ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں اس کو غصہ آجاتا ہے اور روکنے کی کوشش اس لئے نہ کی کہ وہ ہرگز نہ رُکتا۔ بلکہ بات اور بھی بڑھنے کا ڈر تھا۔ وہ دونوں دیر تک چپ رہے لیکن پھاگو نے کہا:

"دلو بھائی سانول کو وہاں نہ جانے دینا۔ گماشتہ جی اگر ٹیڑھے ہو کر بولیں گے تو سانول بھیا نہیں سہہ سکتے۔ وہ تنکے مزاج کے آدمی ہیں۔"

دلو نے ایک لمبے سانس کے ساتھ کہا:

"یہ ٹھیک ہے۔ پر نہ جانے پر بھی تو بات بڑھتی ہے۔ اب جو بھی ہو دیکھا جائے گا۔"

پھاگو بولا:

"پھر بھی ....."

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ سانول تیزی کے ساتھ سامنے سے آرہا تھا۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور دھوتی پھٹی ہوئی تھی۔ ابھی وہ دلو سے کچھ کہہ بھی نہ سکا تھا کہ دلو آگیا اور آتے ہی بولا:

"پھاگو لاٹھی تو دے ———"

دلو اور پھاگو دونوں کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے سانول کو سمجھایا مگر وہ تنتا جا رہا تھا ——— اس نے بتایا کہ وہاں پٹواری اور گماشتہ نے ڈانٹا۔ بات بڑھی۔ اس پر گماشتہ نے پھاٹک بند کروا دیا اور چاہتا تھا کہ مار پیٹ کرے مگر وہ اس طرف کی دیوار کود کر چونچی ہے، پھاند کر بھاگ آیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ کچہری اور بھیبی حجام سارے فساد کی جڑ ہیں اور وہ ان دونوں سے بدلہ ضرور لے گا۔

دلو ہوشیار آدمی تھا اس نے سانول کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ پھاگو کچھ جوش میں تھا اور کچھ ڈر رہا تھا۔ دلو پر کوئی

خاص اثر نہ تھا۔ وہ ایسے جھگڑے کلکتہ میں بارہا دیکھ چکا تھا۔ پھاگو کے لئے بات نئی تھی۔ جوش تو ضرور تھا مگر ایک تو دل کا کچا تھا اور دوسرے سمجھ بھی زیادہ نہ تھی۔ وہ گھبرا کر دلو کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر بولا:

"اب کیا ہوگا دلو بھائی؟"

دلو بولا:

"دیکھا جائے گا۔"

اتنے میں گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھے آ گئے اور لگے دونوں کو سمجھانے۔ دلو سب کی بات کا ٹھنڈے دل سے جواب دیتا گیا۔ سب سے یہی کہہ دیا کہ اب کوئی بات نہ ہوگی۔ سانول جیلا گیا لیکن جب کچھ جوان آدمی آئے تو ان سے بولا:

"بولو اب کیا ارادہ ہے، اب عزت چاہتے ہو یا ذلت؟"

ذلت کون چاہتا ہے؟ سب نے کہا کہ کچھ بھی ہو ہم ساتھ دیں گے۔ لیکن دلو نے سب کو سمجھایا کہ کوئی اونچی نیچی بات نہ ہونے پائے۔ اب صرف کام یہ کرنا ہے کہ آس پاس کے گاؤں میں لوگوں کو تیار کیا جائے۔ ابھی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کچہری سے زمیندار کے پیادے لاٹھیاں لے کر سانول کو پوچھنے آ گئے۔ دلو نے کہہ دیا کہ وہ کہیں چلا گیا۔ لیکن بھیمی حجام نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اسی مکان میں آیا ہے اور ان دونوں نے اس کو کمرے میں بند کر دیا ہے۔ بھیمی نے پیادوں کو بتا دیا تھا اور پیادوں نے بات بات میں کہہ دیا کہ بھیمی سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اسی مکان میں ہے۔ ایک دو نے یہ بھی کہا کہ وہ اسے پکڑ کر لے جائے بغیر نہیں رہیں گے۔

اب دلو کو تاب نہ رہی۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے تن کر کہا:

"تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اگر تم زمین لال کرنا چاہتے ہو تو کنڈی کو ہاتھ لگاؤ۔"

پیادے آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر پندرہ بیس آدمیوں کو دیکھ کر ان کی ہمت نہ پڑی، ان میں سے ایک دو نے یہ بھی رائے دی کہ چل کر مالک سے سارا حال کہہ سنانا چاہئے۔ بغیر حکم کے جھگڑا مول لینا ٹھیک نہیں۔

اس وقت سے شام تک ایک ہی خبر اڑتی رہی۔ گماشتہ جی دوسری جگہوں سے آدمی بلوا رہے ہیں کہ گاؤں کو لوٹ لیا جائے، کھلیان پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب کھلم کھلا لڑائی کا اعلان تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے چپ تھے۔ اب کس کی طرف سے بولتے اور کس کو سمجھاتے ——— اور ان کی سنتا بھی کون تھا۔ ایک طرف تھا حکومت کا غرور اور دوسری طرف عزت کا احساس۔ ان دونوں میں سمجھوتے کی گنجائش کہاں ہے۔

بات بڑھی تو کام بھی بڑھ گیا۔ آس پاس کے سارے گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ ہر گاؤں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب کے ساتھ ایک ہی جیسی بات تھی۔ ہر ایک کو ایک ہی قسم کی مصیبت کا سامنا تھا۔ اب سب کے سب ایک دوسرے کی مدد کرنے پر تیار تھے۔

زمیندار کے کارندے کسانوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہی ہے کسانوں پر زمیندار کا رعب باقی رکھنا۔ ان کے لئے کام کرنا تحصیل وصولی اور حکم نہ ماننے والوں کی سزا۔ سر اٹھانے والوں کا سر کچلنا۔ اسی لئے تو زمیندار انہیں رکھتا ہے۔ یہ لوگ سب کچھ جانتے ہیں کس وقت کیا کام کرنا چاہئے۔ فیل بان جانتا ہے کہ ہاتھی کس طرح قبضے میں رکھا جاتا ہے۔

پٹواری جی کچہری سے نکلے اور تھانہ پہنچے۔ ایک رپورٹ لکھوائی کہ گاؤں کے کسان کچہری کو لوٹنا اور کھلیان سے سارا غلہ اٹھا لینا چاہتے ہیں۔ گماشتہ جی گئے اور مالک کے کان بھرے اور بکے ہوئے کسانوں کو راستے پر لانے کا سامان ہو گیا۔ یہ لوگ گاؤں میں چڑیوں کی طرح چیں چیں کرتے رہے۔

دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ سانول، دلو اور پھاگو کے ساتھ کئی آدمیوں کو دفعہ ۱۴۴ کا نوٹس مل گیا۔ وہ نہ کھلیان کی طرف جا سکتے تھے اور

نہ کچہری کی طرف ——— گاؤں میں ایک بڑی سبھا بھی ہوئی تو یہ لوگ میدان میں نہ جاسکے۔ وہاں کھلیان تھا۔
سبھا ہونے کے بعد کچھ اور لوگ بھی سامنے آگئے اور ان پر بھی نظر کڑی پڑنے لگی۔ لیکن آگ جو سلگی تھی، وہ بجھی نہیں بڑھتی ہی گئی۔
سانولی صبح سویرے اپنی ضرورت سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا تھا۔ سامنے بھیبی آتا ہوا دکھائی پڑا
سانولی ٹھہر گیا۔ بھیبی جیسے ہی پاس آیا۔ سانولی بولا:
"تم کو ہم سب سے بیر کاہے کا بھیبی بھائی۔ تم کو سوچنا چاہئے کہ تم بھی کسان ہو۔"
بھیبی بولا:
"تم لوگ تو جھوٹ موٹ بدنام کرتے ہو۔"
سانولی کو اس کا یہ کہنا دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتا تھا۔ بولا:
"دیکھو بھیبی بھائی، یہ سب کہنے سے بھرم نہ مانیں گے۔ یاد ہے تم کو۔ اسی پٹواری نے تم کو مارا تھا۔ بات ذرا سی تھی نا۔ ایک دن بدن میں تیل ملنے نہ گئے تھے ——— اپنی بے عزتی بھی بھول گئے؟"
بھیبی کترا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ بولا:
"بھیکا، باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"
سانولی نے کہا:
"یہی تو کہتا ہوں۔ ایسی بات کیوں کہتے ہو جس سے تمہارا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"
لیکن سانولی اس بات کو بھول گیا تھا کہ پھاگو کا باپ گاؤں کا برا بھلا تھا اور اسی زمانے میں بہت سا کھیت بھیبی سے لے کر زمیندار نے پھاگو کے باپ کو دے دیا تھا۔ اس سے اس کا دل اب تک صاف نہیں ہوا تھا۔ گو بات بہت پرانی ہو چکی تھی۔ بھیبی نے کہا:
"سنو سانولی! تم بیچ میں نہ پڑو۔ پھاگو کے باپ نے بڑا ظلم ڈھایا ہے ہم پر.....؟"
"یہ بات بڑی پرانی ہو چکی اسے بھول جاؤ۔ یا کہو تو پھاگو سے کہہ کر تمہارا کھیت دلوا دوں ——— لیکن یہ تو سوچو کھیت تم سے باہو چا چانے تو لیا نہیں۔ لیا تو تمام زمیندار ہی نے۔ قصور کس کا ہے؟"
مگر بھیبی پرانی باتوں کا اثر کیا ہتا۔ اس نے کہا
"سانولی میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں ———"
"سب ٹھیک۔ پر یہ تو بتاؤ اس دن تم بیادے کیوں لائے تھے۔ ان کو کیوں بتایا تھا کہ سانولی پھاگو کے گھر پر ہے۔ میرے باپ نے تو تمہارا کھیت نہیں لیا تھا۔"
بھیبی کھسیا گیا اور اس نے کہا:
"مجھے بحث کرنے کی فرصت نہیں۔"
وہ دو قدم آگے بڑھا لیکن سانولی نے اس کا راستہ روک لیا اور ذرا تیکھا ہو کر بولا:
"سنو بھیبی بھائی۔ تمہیں جواب دینا ہوگا۔ کسی کی راہ میں کانٹے بچھانا اچھا نہیں۔ یہ تمہارے حق میں بڑا برا ہوگا۔"
بھیبی جانتا تھا کہ سانولی حلیم آدمی ہے۔ اس لئے وہ کسی طرح بات کاٹ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ پھاگو کے باپ پر جو الزام رکھ رہا تھا۔ وہ بھی غلط تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاؤں میں کسی نے کچھ اس کا بگاڑا نہیں تھا اور وہ صرف اپنے فائدے کے لئے

گاؤں بھر کے آدمیوں کو نقصان پہنچا رہا تھا اور پٹواری تک خبر پہنچانے کے بعد گاؤں کے سارے لوگوں سے الگ سا ہو گیا تھا مگر اب بُرے کے پھندے پڑ گیا تھا۔ ساونل کو جواب دئے بغیر چلے جانا ممکن نہ تھا۔ اس نے کہا:

"ساونل دیر ہو رہی ہے۔ ہمیں کام ہے راستہ چھوڑ دو۔"

اگر کھلا ہوا راستہ ہوتا تو شاید بھیبی کسی دوسری طرف سے چلا جاتا مگر راستہ کے لئے ایک ہی پگڈنڈی تھی اور اس کے دونوں طرف اوکھ کے گھنے کھیت تھے جن میں آدمی سے زیادہ اونچے اوکھ لہلہا رہے تھے۔ راستہ بالکل نہ تھا۔ اس کے کہنے پر بھی ساونل نے راستہ نہ دیا تو بھیبی نے چاہا۔ اس کو ہٹا کر چلا جائے ——— لیکن ساونل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بھیبی نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور بولا:

"لڑنا چاہتے ہو کیا؟"

ساونل بولا:

"ہم لڑنا نہیں چاہتے لیکن اس کی ضرورت پڑی تو پیچھے بھی نہ آئیں گے۔ ہم تو تم سے یہی پوچھ رہے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

بھیبی کو غصہ آ چکا تھا اس نے کہا:

"کیا تو اس میں کسی کے باپ کا گیا ———"

ساونل کو ایسی باتوں کی تاب کہاں تھی۔ وہ دیر سے اپنے غصہ کو دبائے ہوئے تھا۔ گالی بھیبی کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ پانی سے بھرا ہوا لوٹا اس نے بھیبی کے سر پر دے مارا۔ بھیبی کے سر سے خون اور لوٹے سے پانی بہنے لگا اور وہ چکرا کر گر گیا۔

بات اور زیادہ بڑھ گئی۔ شکار خود ہی پھنس گیا۔ پولس آئی اور ساونل گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گواہ کہاں سے آئے؟ مقدمہ میں دوسرے لوگ کیسے پھنسیں۔ مگر روپیہ ہو تو یہ بھی مشکل نہیں۔ روپیہ خرچ کرنے والا ہونا چاہئے۔ کام کرنے والے جو نہیں ہوتا۔ روپیہ ہو تو الیشور بھی خوش ہو سکتا ہے۔ مندر اور دھرم سالے بنا کر۔ اور کسی کو پھنسا لینا کیا مشکل ہے۔ زمیندار نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے گاؤں اجڑ جائے لیکن سر اٹھانے والوں کا سر کچلا ضرور جانا چاہئے۔

ایک طرف ساونل کا مقدمہ کھلا، دوسری طرف بدلو اور بھاگو اور دوسروں کے خلاف دھڑا دھڑ رپورٹیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ جب پورا قلعہ کھلیان میں آ گیا تو ان سب پر، جن پر کسی طرح کا شک تھا دفعہ ۱۴۴ کے نوٹس کی تعمیل ہو گئی۔ سب کے سب ڈر سے کانپ رہے تھے زمینداری تھی زمیندار کی اور راج تھا پٹواری کا ———

آخر اس طرح کب تک چلتا لوگ اکتا گئے۔ غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو مقدمہ لڑیں۔ اس لئے چپ رہنا ہی بہتر لیکن چپ رہیں تو کب تک۔ بدلو نے بھاگو کو ایک دن بلا کر کہا:

"اب کچھ کرنا چاہئے۔ اگر چپ رہے تو مطلب یہ کہ پٹواری جی من مانی کرتے جائیں گے۔ اب جو بھی ہو۔"

بھاگو اور دوسرے لوگوں نے بھی رائے کا ساتھ دیا اور بات طے پائی کہ جب تک کھلیان اٹھے دوسرے گاؤں میں جلسے کئے جائیں اور اسی پر عمل بھی کیا گیا۔ جب آس پاس کے سارے گاؤں میں تحریک چل پڑی تو دوسرے لوگ بھی جن پر اس کا اثر پڑ سکتا تھا، سر جوڑ کر بیٹھے اور سر پر آنے والی آفت سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

بات بڑھتی گئی اور اس کا اثر بھی بڑھتا گیا۔ جنی رام بھی ایک کسان تھا جو ان لوگوں کے ساتھ پورے جوش سے کام کر رہا تھا جب ساونل کی ضمانت نہیں ہوئی تو وہ کچھ بول پڑا اور سب کے ساتھ بدمعاشوں کی فہرست میں اس کا نام بھی آ گیا اور نشانہ بن گیا۔

ایک دن صبح ہونے سے پہلے ہی وہ کسی کام سے دوسرے گاؤں جا رہا تھا۔ بیچ میں راستہ تھا اور دونوں طرف اوکھ کا کھیت،

ہر طرف سناٹا اور اندھیرا تھا۔ وہ بہت دور جا بھی نہ سکا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے سر پر لاٹھی ماری۔ وہ گر پڑا۔ پھر ایک دو چار پانچ دس، ——— وہ ادھ مرا ہو گیا۔ سارے گاؤں میں اس سے کھلبلی مچ گئی۔

پولس آئی۔ بہت سے لوگ گرفتار ہوئے۔ گرفتار ہونے والوں میں دلو، پھاگو، جمن، ہرکھو سبھی تھے۔ یہ سب کے سب تھانے سدھارے ان پر کھیت کاٹنے، کھلیان لوٹنے اور دھنی رام پر حملہ کرنے کا الزام تھا۔ سب کا جیل جانا یقینی۔ پٹواری خوش تھا۔ سارے بدمعاش پکڑے جا چکے تھے ——— وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا لیکن آئندہ کیا ہوگا، یہ سوال لرزہ خیز طور پر اس کے دماغ میں پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

کھلیان بھرتا جا رہا تھا لیکن اب کھلیان میں کسانوں سے زیادہ پولس کے سپاہی نظر آتے تھے۔ انہیں کھلیان کی حفاظت کرنا تھی۔ کسان سارے بے ایمان ہو چکے تھے اور اس کی سزا بھی پا چکے تھے مگر یہ بوڑھے اور بچے جو گاؤں میں بچ رہے تھے۔ وہ بھی تو آخر کسان ہی تھے۔

پوس کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ کھلیان کی حفاظت کرنے والے سپاہی اپنے گرم کوٹوں کے باوجود ٹھنڈک سے سکڑے جاتے تھے۔ سب نے مل کر بڑا سا الاؤ جلایا تھا۔ آگ تاپ رہے تھے اور کہانیاں کہی جا رہی تھیں۔ الاؤ بجھنے لگا، ایک سپاہی اٹھتے ہوئے بولا:

"ایک دن ساری چیز اسی طرح ختم ہو جائے گی۔"

دوسرا بولا:

"سالے پٹواری کا کھیڑ۔ اوہ لائن میں کیسے آرام سے رہتے ہیں اس وقت۔"

اس کے اٹھتے ہی دوسرے سپاہی بھی اٹھ کر جھونپڑے میں چلے گئے اور الاؤ بجھ گیا۔ کھلیان میں سپاہیوں کا شور گاؤں کے سناٹے میں مل گیا ———

ممتاز شیریں

آئینہ

میں ایک بڑے آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ میری توجہ بال بنانے پر نہ تھی۔ یونہی کنگھی کئے جا رہی تھی۔ دراصل میں اپنے چہرہ پر طرح طرح کے جذبات کے اظہار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اور کیا کہنے بڑا ہی مزہ آ رہا تھا ..... بال بنانے میں ضرورت سے زیادہ دیر لگ رہی تھی۔ امّی۔ کہیں گی "کچھ کام بھی کرو گی یا دن بھر آئینہ ہے اور بس جب دیکھو آئینہ کے سامنے"..... نہیں آج امّی بھی کچھ نہ کہیں گی۔ آج تو وہ مجھ سے بہت خوش ہیں۔ ابھی ابھی آج ہی میرا رزلٹ معلوم ہوا ہے نا؟ رزلٹ اور آئینہ نے خوشی کی تصویر پیش کر دی۔ سیکنڈ ڈویژن! اور میرے گال فتمتا رہے تھے ..... ہونہہ! سیکنڈ ڈویژن بھی کوئی بڑی بات ہوئی میرے لئے؟ میں تو ہمیشہ جماعت میں اوّل آیا کرتی تھی۔ مجھے تو فسٹ ڈویژن میں کامیاب ہونا چاہیے تھا۔ ایک ہلکی سی تحقیر اور ناز..... ارے میں یوں بھی بھلی معلوم ہوتی ہوں؟ ..... پھر بھی اگر کسی دوسرے امتحان کا نتیجہ ہوتا تو کچھ پروا نہ تھی۔ بی۔ اے! ان دو نقطے سے حرفوں میں کتنی شان ہے۔ لٹناوہ! اب تو میں گریجویٹ ہوں۔ آئینہ کی تصویر پر رعب اور فخر چھا گیا ..... گویا میں اپنی صورت نہیں دیکھ رہی تھی۔ بلکہ پردۂ فلم کی کسی ہیروئن کے چہرہ پر بدلتے جذبات کو۔ یا کسی مصور کی بنائی ہوئی تصویروں کو جن میں مصور نے خاص خاص جذبے کو کیا خواص پر کھینچا ہے ..... اب لڑکیاں میرا پیچھا نہ چھوڑیں گی خوب ستائیں گی۔ "مٹھائی کھلاؤ مٹھائی کھلاؤ" اور میں کہتی پھرتی تھی نا کہ اس سال ہرگز کامیاب نہ ہوں گی۔ میں نے امتحان کے لئے ذرا بھر بھی تیاری نہ کی تھی۔ اور وہ کہتی تھیں "آخر تم کامیاب نہ ہو تو کسی اور کی کامیابی کی امید بھی ہو سکتی ہے" اور مجھ سے مٹھائیوں پر شرطیں بدھا کرتی تھیں۔ بھلا مٹھائی پر راضی ہو جائیں گی۔ شاید پارٹی بھی دینی پڑے۔ ہاں کیوں نہ آج ہی اپنی چند خاص سہیلیوں کو بلا کر پارٹی دوں۔ خوب لطف آئے گا۔ گھر بیٹھے بیٹھے میرا جی اُکتا گیا ہے ..... اوہ! امی بھی ادھر آ نکلیں "آج میں سہیلیوں کو چائے پر بلاؤں امّی؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں بیٹی۔ شوق سے بلاؤ۔ آخر ایسی خوشی کے موقع بار بار نہیں آتے" آہا! آج امّی نے کتنی جلد اجازت دے دی۔ زینی کو ضرور بلاؤں گی۔ وہ تو پارٹی کی جان ہو گی پھر۔ اور رضیہ اسی کو معلوم ہے نا کہ ..... اون ..... ں! بڑی شریر ہے وہ تو سب

سے کہہ دے گی۔ پردیس کو ڈبل کنگنی جو لیشن دو۔ ایک تو اس کے گریجوٹ بننے پر اور دوسرا اس سے بڑھ کر اس کی انگیجمنٹ (Engagement) پر۔ اور سب لڑکیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں گی۔ چھیڑتی چھیڑتی میرا ناک میں دم کر دیں گی۔ اور میں بناوٹی غصہ سے یوں منہ بنالوں گی... ارے وہ غصہ بھی مجھے کہاں آتا ہے۔ منہ پھلاتے ہوئے میں بھی میں اچھی لگتی ہوں۔ یہ تو آج ہی معلوم ہوا۔

ہاں ہاں لڑکیاں کہا کرتی تھیں نا یہ غصہ کا اظہار کرتی ہوئی تم تو بالکل مادھوری کی سی دکھائی دیتی ہو" لیکن میں نے آج تک توجہ سے نہ دیکھا تھا۔ واللہ یہ آئینہ بھی بڑی الف لیلیٰ ایجاد ہے۔ اپنی تصویر کو جس پوز میں، جس پہلو میں چاہو دیکھ لو۔ جس طرح بھی چاہے دیکھ لو..... ہاں تو میں اپنے چہرے پر مصنوعی غصہ پیدا کر دوں گی۔ گو جی تو یہی چاہتا ہوگا کہ وہ یونہی چھیڑتی جائیں۔ ہاں گھنٹوں یونہی چھیڑتی رہیں کیسا لطف آئے گا ان کی اس چھیڑ چھاڑ میں۔ ایک خاص لذت... چاند کے انتقام پر زینی مجھ سے گانے کے لئے اصرار کرے گی تو کیا گاؤں؟ .....ہاں وہ فلمی گیت گاؤں گی۔ وہ گیت ——

ساجنا جنا پیچھے کھیلوں۔ کھیلوں اکیلی کب؟

اور جب میں یہ گیت گا رہی ہوں گی تو زینی ایسی معنی خیز۔ ایسی شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہوگی..... اور پھر وہ برس ہی تو پڑے گی ساتھ ہی گنگنا رہی ہوگی "اکیلی، اکیلی؟ ہم اتنی سکھیاں جو ہیں۔ ہونہہ اب ہماری حقیقت ہی کیا ہے۔ اسے تو اپنا ساجن چاہیئے۔ اپنا —— نہ ہو تو"..... اُف —— میں —— کے خیال ہی سے کیسے شرما جاتی ہوں۔ میں نے ذرا سی نظریں اٹھا کر آئینہ میں پھر دیکھا۔ یہ تصویر تو سب سے دلکش تھی میں —— کے سامنے شرما رہی ہوں بھی ایسی ہی نظر آؤں گی نا ——

"چھوٹی بی بی!" "کیا ہے خیرن بی" "ایک خبر سنانے آئی تھی" "خبر" میں نے مڑ کر پوچھا "ہاں ہاں کہو نا کیا خبر"

"ارے آج تو تم بہت خوش نظر آرہی ہو۔ بی بی! ہاں یاد آیا۔ بڑی بیگم کہہ رہی تھیں۔ تم کسی بڑے امتحان میں کامیاب ہو گئی ہو۔ ایسی خوشی کے وقت تمہیں بری خبر سنا کر رنجیدہ کروں بھی نہیں۔ توبہ توبہ" وہ جانے لگی۔

"ارے ٹھہرو خیرن بی! آخر کچھ معلوم بھی ہو"

"کچھ نہیں بی بی۔ وہ جو ہمارے محلے میں نانی بی رہتی تھیں نا۔ وہی جو چھٹپن میں تمہیں کھلایا کرتی تھیں..... ارے توبہ میرے منہ سے نکل ہی گیا نا بابا۔ بھی بھی خوشی کے وقت یہ خبر کیسے سناؤں"

"میری خوشی جائے بھاڑ میں۔ آخر کہتی کیوں نہیں ہو۔ اور یہ نانی بی کی بات ہے تو میں سنوں گی ہی۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے"

"او ئی میرے اللہ میں نے کیا کیا! بڑی بیگم مجھ پر خفا ہو جائیں تو؟ جس وقت تم چھوٹی تھیں۔ انہوں نے تاکید کی تھی کہ نانی بی کا نام تمہارے سامنے نہ لیا کروں"

"امی تمہیں کچھ نہ کہیں گی۔ اس کا ذمہ میں لیتی ہوں"

"کل رات نانی بی جاتی رہیں۔ بیٹی ہم سب محلہ کی عورتیں ان کے پاس جمع تھیں" خیرن بی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "مرتے وقت تمہارا ہی نام زبان پر تھا"

گویا تصویر کے سٹ کو مکمل کرنے میں ایک اور جذبہ کی کمی تھی —— اداسی کی جھلک —— اور میں بال گوندھتی چوٹی آئینہ کے سامنے سے چلی آئی۔

"نانی بی —— میری بوڑھی اماں ہو بہو جس نے اتنے سال مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اب اس دنیا میں نہیں ہے؟ کاش میں اپنی اماں کو مرنے

سے پہلے ایک بار دیکھ لیتی ہیں کیا کچھ نہ دے دوں گی۔ پھر اپنی انا سے صرف ایک بار ملنے کے لئے! میری اَنّا کیا تم میرے سہانے بچپن کی ان تمام یادوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہو؟ ان ننھی ننھی دلچسپیوں کی یادکو، ان خیالات کو جو تمہارے بڑھاپے اور میرے بچپن کے جوڑے پیدا ہو گئے تھے؟ آخر تم نے اس دنیا کو چھوڑا کیسے؟ تم جو اس دنیا کو اتنا عزیز رکھتی تھیں گو اس دنیا میں تمہارے لئے کوئی خوشی نہ تھی۔ ہاں میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تاہم تمہیں زندگی سے محبت تھی۔ تم زندہ رہنا چاہتی تھیں۔ ایک بے بسی۔ ایک مایوسی کے ساتھ اس دنیا سے چمٹی ہوئی نہیں۔ غم کے مارے بھی اس مصیبت بھری دنیا سے کیسے چمٹے رہتے ہیں!..... اور تم تو، نانی بی! چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کو بھی سہہ نہ سکتی تھیں۔ سنائی ہوئی تصور کرتی تھیں۔ میں نے تمہیں کبھی ہنستے نہ دیکھا تھا۔ تمہارے لئے اس دکھ بھری دنیا میں اگر ذرا سی خوشی اور دلچسپی کا کوئی ذریعہ تھا تو وہ میں ہی تھی۔ تم مجھے گود میں لے کر سب کچھ بھول جاتی تھیں ..... ہاں میری اَنّا تم مصیبت زدہ تھیں۔ مگر دنیا کو تم سے ہمدردی نہ تھی۔ امّی۔ ابّا کو بھی نہیں۔ گواں کے گھر میں تم اتنا کام کیا کرتی تھیں۔ آخر کیوں؟ اگر تمہارے چہرہ پر تمہارے دلی دکھ کا ذرا بھی اظہار ہوتا تو شاید لوگوں کو تم سے کچھ ہمدردی ہوتی۔ مگر تم یوں دکھائی دیتی تھیں۔ گویا تم میں جذبات ہی نہیں۔ ایک پتھر کی مورت سی..... اور میری غریب اَنّا! تمہارے چہرہ میں کچھ ایسی چیز بھی نہ تھی جو ذرا سی بھی کشش رکھتی جو لوگوں کے دلوں میں رحم کے جذبہ کو ابھار سکتی۔ سیاہ رنگ۔ پچکے ہوئے گال۔ رد کھے سفید بال، پوپلا منہ، ٹلتے ہوئے ہونٹ، بے نور، اندر کو دھنسی ہوئی، چھوٹی چھوٹی منکوں کی سی آنکھیں ــــ انسانی زندگی کی بوسیدگی کی مکمل تصویر! تمہاری یہ ہیئت اور اس پر ظاہری بے حسی دلوں میں رحم کی بجائے ایک ہلکی سی نفرت ایک خوف سا پیدا کر دیتی تھی۔ گویا تم پرانے قصّوں کی کوئی جادوگرنی ہو۔ اور امّی تو تمہیں جادوگرنی ہی سمجھتی تھیں۔ جب کبھی وہ تمہیں ڈانٹ بتاتیں تو تم کچھ جواب دینے کی بجائے خاموش نگاہوں سے گھورنے لگتیں۔ شاید تمہارے یوں دیکھنے سے تمہارا مدعا طلب رحم ہوتا۔ مگر تمہاری پھیکی بے نور آنکھیں اس کو ظاہر نہ کر سکتی تھیں۔ اور امّی کسی خوف سے سہم جاتیں۔ گویا تم ان پر آنکھوں کے ذریعہ جادو اتار رہی ہو۔ ابّا بھی تم سے دور دور رہتے تھے۔ جب کبھی انہیں تم سے بات کرنے کی ضرورت ہوتی تو دوسری طرف منہ پھیر کر نہایت بے پروائی سے جواب دیتے ..... وہی خوف ملی ہوئی نفرت کا جذبہ ..... گھر میں کوئی بھی تمہیں چاہتا نہ تھا۔ مگر میری بوڑھی بے بس اَنّا، میں تمہیں چاہتی تھی، ننھے دل سے۔ اس محبت نے مجھے ایک چھوٹی سی فلاسفر بنا دیا تھا۔ گو میں ہی تمہیں سمجھ سکتی تھی۔ ابّا کا علم، ان کی عمر، امّی کا تجربہ تمہیں سمجھنے میں مدد نہ دے سکے تھے۔ گھر میں گونگی سی تھی۔ تمہیں اچھی طرح سمجھتی تھی۔ کیوں کہ مجھے تم سے محبت تھی۔ ہمدردی تھی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ تم میں کوئی جادو کی طاقت نہیں تھی۔ تم بے بس تھیں، کمزور تھیں۔

دس بارہ سال پہلے کی زندگی میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ بہت سی تصویریں میرے دماغ کے پردہ پر ابھرنے لگیں۔ اس وقت کی تصویریں جب میں ننھی سی تھی۔ ہر وقت نانی بی کے دامن سے چمٹی پھرتی تھی۔ نانی بی رسوئی میں کھانا پکا رہی ہوتیں (وہ مجھے کھلانے کے علاوہ گھر کا سب کام بھی کر لیتی تھیں) میں بھی دوڑی ہوئی وہاں جا پہنچتی۔ امّی روکنے کی کتنی ہی کوشش کرتیں۔ طرح طرح کے کھلونے میرے سامنے لا رکھتیں۔ مٹھائیاں نگاہوں کے گرد میں چھپانے لگتی۔

"اوں یہ مٹھائیاں نہیں کھاؤں گی۔ مجھے تو کھوپرے کی مٹھائی پسند ہے۔" نانی بی سے دیں گی۔" امّی بڑبڑانے لگتیں۔ "کمبخت باہر کی سستی مٹھائیاں دلا دلا کر بچی کی صحت خراب کرتی ہے۔" میں پھر بھی اپنی ہٹ سے باز نہ آتی تو ٹرکے کو دوڑا کر وہی سستی مٹھائی منگاتیں مٹھائی ملتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلتی۔ "میں تو نانی بی کے ہاتھ سے مٹھائی کھاؤں گی۔" امّی جھلا اٹھتیں۔ "اری پروین! کہاں بھاگ چلی۔ خدایا اس بوڑھی نے تو میری بچی پر جادو کر دیا ہے۔" ہاں امّی نانی بی نے سچ مچ مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ محبت کا جادو، وہ مجھ سے کتنا پیار کرتی تھیں، میری ننھی پروین، ارے کیا نام ہے تمہارا۔ اونہہ بابا کیسے کیسے نام نکل گئے ہیں اس جمانے میں۔ ہم پرانے جمانے کی بوڑھیاں کیسے بول سکیں۔ یہ جمانا ہی کیا میرا نام بھی بچوں نے کچھ ایسا ہی

کھاہے۔ بھا۔ را۔ جمرہ۔ مجھے کھود بولنے نہیں آتا۔ میں تمہیں شہجادی پکارا کروں گی۔ چھوٹی شہجادی ہاں تم ایک شہزادی کی طرح کھبصورت ہو۔ تو میری چھوٹی شہزادی کو کیا چاہیئے" یہ مٹھائی تم اپنے ہاتھ سے کھاؤ دو نانی بی" میں اپنی مٹھی کھول کر ننھی سی سہیلی پیاری دیتی نانی بی ذرا ذرا سی مٹھائی توڑ توڑ کر مجھے کھلانے لگیں۔ اور یہ معمولی مٹھائی اس وقت کے ہاتھ سے کھاتے ہوئے مجھے ایسا مزہ آتا کہ امی کے پاس بیٹھ کر خوبصورت ننھی طشتریوں میں سجے ہوئے کھاجات برفی۔ لڈو پیڑے اور حلوہ سوہن کھاتے ہوئے کبھی نہ آتا تھا۔

میں نے ایک دن امی سے نانی بی کا نام پوچھا" نانی بی اور کیا" انہوں نے بے پروائی سے جواب دیا" نہیں امی کچھ ایسا نام ہمارا" زہرہ" اور مجھے بڑا ہی تعجب ہوا۔ زہرہ! نانی بی کا نام" زہرہ" ایسا پیارا نام ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی کے نام کا سا! اور امی مجھے پر دیں کہہ کر باتیں تو سب مجھے خاک اچھا نہ لگا۔ اول ——— امی مجھے شہجادی کہو۔ پردیں نہیں" امی سر پیٹ لیتیں" ارے کیا ہو گیا میری بچی کو؟ میرے اللہ اس بوڑھی نے کچھ کھلا دیا ہو" آخر امی کو نانی بی سے اتنی چڑ کیوں تھی؟ شاید اس نفرت کا سبب حسد بھی تھا۔ ان کی اپنی بچی انہیں چھوڑ کر کسی اور سے ایسی چمٹ جائے انہیں کیسا بُرا معلوم ہوتا ہوگا۔ پھر جب نسیم اور نسرین پیدا ہوئے تو امی نے یوں انتقام لینا شروع کیا۔ کہ ساری توجہ ان دونوں پر صرف کر دیتیں۔ ہر بات میں ان کی طرفداری کرتیں اور مجھے جھڑکتی رہتیں۔ جب کبھی امی مجھے جھڑک دیتیں تو جہرے ننھے دل میں بہت دکھ بھر آتا اور میں نانی بی کے سینے سے چمٹ کر زور زور سے سسکیاں لینے لگتی" نانی بی میں تم ... تم ہماری بے ٹی ہوں۔ امی کی نہیں" رونہ میری تھی! میری شہجادی کو کس نے رلایا" وہ اپنے شکنے ہوئے پلے ہونٹ کو اور سامنے لا کر میری توتلی پکڑ کر رونے لگتیں" میری بچی! نہ جانے بیگم کا دل اتنی پیاری بچی کو جھڑکنے کو کیسے چاہتا ہوگا۔ وہ ان دو چھوٹے پھول پر ہی کیوں جان چھڑکتی ہیں؟ وہ میری شہجادی کے سے کھوبصورت بھی تو نہیں"

آخر امی یہ کب تک سہہ سکتی تھیں وہ صرف انتقام کے لئے مجھ سے بے توجہی برتا کرتیں۔ دل میں تو مجھی کو سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ مجھے یوں الگ ہوتی دیکھ کر کئی بار انہوں نے نانی بی کو ہمارے گھر کا کام چھوڑ دینے پر مجبور کرنا چاہا مگر یہ خیال کر کے کہ مجھے بہت ہی دکھ پہنچے گا۔ اور نانی بی اس سلیقے سے سب کام سنبھال لیتی تھیں کہ ان کے کام میں کوئی نقص نکالنا مشکل تھا۔ نئے نوکروں سے ایسے سلیقہ کی امید نہ تھی۔ پھر نانی بی کے جادو کا ڈرا امی پہ بہت ہوا رہتیں۔ مگر آخر یہ ہو کر ہی رہا۔ ایک دن نسرین نے میری سب سے پیاری گڑیا توڑ ڈالی۔ اس پر میں نے اسے ذبحا۔ وہ تھی ہی امی کی لاڈلی۔ منہ بسورتے ہوئے امی کے پاس دوڑی" ارے کیا ہوا میری بچی کو؟" ——— جونہہ ان کی بچی کو بھونے کاٹ کھایا تھا ——— امی کا یہ کہنا تھا کہ نسرین نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا" آپا پردیں نے میرا۔ منہ۔ نوچ لیا۔ خون نکل۔ آیا ہے۔ اول۔ اول۔ اول" اُف ری مکاری گویا سچ مچ خون نکل آیا تھا۔ بس کیا تھا۔ امی نے مجھے گھسیٹ کر طمانچے پر طمانچے لگانے شروع کئے۔ میں نے سسکتے ہوئے کہا" نہیں امی نسرین نے میری گڑیا توڑی ہے" میں نے خیال کیا کہ یہ کہہ کر بچ جاؤں گی۔ مگر امی کہیں سننے والی تھیں۔ میں نانی بی کی بیٹی جو ہوئی" اونہہ! گڑیا توڑ ڈالی تو دوسری منگوا دیں گے۔ گویا تیری مرئی گڑیا میری منی سے زیادہ ہے دیکھ تو میری بچی رو رو کر ہلکان ہوئے جا رہی ہے" اور ساتھ ہی ایک ایسا چانٹا رسید کیا کہ میں مارے درد کے بے حس ہو گئی۔ نانی بی میرے رونے کی آواز سن کر باورچی خانہ سے بھاگی بھاگی آئی تھیں۔ یہ دیکھتے ہی مجھے امی سے چھین لینا چاہا" بیگم آپ کیوں بچی کو مارے دیتی ہو دیکھو کیا کمسلا گیا تھا اس نے ننھی سی جان، ناجوں کی پلی، اتنی مار سہہ سکے گی" امی کی آنکھوں سے گویا آگ برس رہی تھی۔ میں اپنی سسکیوں کو روکے سہمی سہمی کھڑی تھی" دور ہو جاؤ" امی نے مجھے جھٹکتی نانی بی سے الگ کرتے ہوئے گرج کر کہا" تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی؟ کیا حق ہے تمہارا اس بچی پر۔ میں اس کی ماں ہوں جو چاہے کر سکتی ہوں"

"نہیں بی بی، سوچو تو ننھی سی جان ..... غصہ اتر نے پر تمہیں خود رنج ہوگا"

"چلی جاؤ، میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی" دور ہو جاؤ، میری نظروں کے سامنے سے" امی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں دوڑ کر نانی بی سے چمٹ گئی۔ پھر کیا تھا۔ امی آگ بگولہ ہو گئیں۔ مجھے بے تحاشا تڑ تڑ مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ خود مارتی مارتی تھک گئیں" اچھا ہے جاؤ، اس دیوانی کو

نہیں لے جاؤ میرے سامنے سے۔ یہ میری بچی نہیں۔" امّی نے ایک زور کا چانٹا رسید کر کے مجھے دھکیل دیا۔ نانی بی کی مشکوں کی سی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ "میرے اللہ کھدا جانے کیوں کچھ روح سے مُیم کا دل اس بچی سے پھر گیا ہے۔" نانی بی اپنے پلّے آنچل سے آنسو خشک کرتی ہوئی مجھے گود میں لے کر چلی آئیں۔ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک تو یہ حالت رہی گویا مجھے آس پاس کی چیزوں کا احساس ہی نہیں۔ اتنے میں نسرین میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اس کے ایک ہاتھ میں میری ٹوٹی ہوئی گڑیا تھی اور دوسرے میں چاکلیٹ کا ٹوپہ۔ وہ میری طرف شریر نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے وہ گڑیا زور سے صحن میں پھینک دی۔ میرا منہ چڑا چڑا کر بہت سے چاکلیٹ منہ میں بھر لئے اور "نانی بی کی بچی" کہہ کر قہقہہ لگاتی ہوئی زور سے بھاگی۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میری ہی گڑیا ٹوٹے۔ میں خود ہی خوب پٹوں اور پھر نسرین میری ہنسی اڑائے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "نانی بی میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو۔" "تمہارا گھر کہاں ہے، نانی بی؟" میں امّی کے پاس جانے کے لئے کبھی ضد نہ کروں گی۔ تمہاری بچی بن کر رہوں گی۔"

"میری بھولی بچی! میرا گھر کہاں؟ گھر ہوتا تو یہاں تمہارے گھر میں رات دن کیوں پڑی رہتی؟" پھر نانی بی نے مجھے منانے کی بہت کوشش کی۔ مٹھائی لے آئیں ہنسانے والی کہانیاں سنائیں مگر اس دن مجھے اتنا دکھ پہنچا کہ کوئی چیز میرے آنسو کو تھما نہ سکتی تھی۔ میں دن بھر روتی رہی اور رات کو یونہی روتی روتی باورچی خانہ میں ہی نانی بی کے پہلو میں سو گئی۔ دوسری صبح امّی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ امّی دروازے کے کواڑ سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کا منہ سوجا ہوا تھا۔ اور آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید وہ بھی روتی تھیں۔ وہ کچھ بولے بغیر نانی بی کی طرف گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش گویا ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہی نہیں مگر جونہی امّی نے یہ دیکھ لیا کہ میں جاگ رہی ہوں منظر ہی بدل گیا۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے امّی کو تک رہی تھی۔ امّی نے لپک کر مجھے گود میں اٹھا لیا اور چومنے لگیں۔ "میری بچی مجھ سے ڈرتی ہے کیوں ڈرتی ہو تم؟ میں تمہاری ماں نہیں ہوں؟ زہرہ بی! (امّی نے پہلی دفعہ نانی بی کو نام سے پکارا تھا ورنہ ہمیشہ نانی بی ہی کہا کرتیں) تم نے میری بچی کو ڈس لیا ہے۔ تم ناگن ہو۔ تم کرن ہوتی ہو جو میری بچی کو مجھ سے چھیننے والی ہو؟ تم نے میرے اپنے خون کو چھینا ہے۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو چھینا ہے۔ تم ڈائن ہو۔ کہتی ہو میرا دل بچی سے بھر گیا ہے۔ اس کی ذمہ دار تم ہو۔ تمہاری طرف سے میں نے اپنی ممتا کو اتنا ستایا۔ میں حسد کی آگ میں بھن رہی تھی۔ سن رہی ہو اپنے ظلم کی داستان؟"

"بی بی میں کیا کروں بچی کا دل مجھ سے لگ گیا ہے۔"

"بچی کا دل لگ گیا ہے! شرم نہیں آتی بڑے منہ سے جھوٹ بولتے۔ تمہیں اپنے سفید جھوٹ کی لاج نہیں؟ خدا کی قسم تم نے بچی کو کچھ کھلا دیا ہے ورنہ وہ ایسی کریہہ صورت بڑھیا سے مانوس ہو جاتی (میں دل ہی دل میں طاعت کر رہی تھی وہ عفریت میں کیسی کیسی باتیں بنے جا رہی تھیں) میں نے کلیجہ پر پتھر رکھ کر بہت دن تک یہ سہا ہے۔ اب میں ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ہونہہ! برداشت میں ایک موئی ڈکرانی کی خاطر یہ رنج سہوں؟ ہونہہ! میں کتنی دیوانی ہوں! ڈکرانی سے دیوں؟" امّی جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھیں۔ سنتی ہو، کان کھول کر سن لو۔ تم اب ایک لمحہ بھی اب اس گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ چلی جاؤ اسی وقت۔ تمہاری یہ منحوس صورت ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ اٹھو، بوریا بستر باندھو لو..... بیٹھی کیا تک رہی ہو۔ مجھے پٹے پٹھے ویروں سے؟ کیا مجھ پر بھی جادو کرنے کا ارادہ ہے؟"

"بیگم میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں مجھے کبھی کبھی بچی کو آ کر دیکھنے کی اجازت دو۔ اس دکھ بھری دنیا میں یہ ننھی سی جان ہی میرے دل بہلانے کا جریہ (ذریعہ) ہے بی بی۔ اس کو بھی نہ چھین لو۔ خدا واسطے اتنا ظلم (ظلم) نہ کرو۔ اللہ میاں تمہیں برکت دے۔ میں نے بہت دنوں تمہارا نمک کھایا ہے۔"

"بچی کو دیکھنے بچی کو دیکھنے۔ اب تمہارا سایہ بھی اس پر پڑنے نہ دوں گی۔ اگر پھر کبھی تم نے اس گھر میں قدم رکھا۔ اپنی منحوس صورت

دکھائی ا..... میری بچی کو پھر مجھ سے چھینے..... میری ننھی، میں تمہاری ماں نہیں۔" امّی نے مجھے بھینچ لیا۔ اور رونے لگیں۔ اور میں حیرت سے کبھی ادھر دیکھ رہی تھی کبھی ادھر۔ ان دونوں مورتوں میں کتنا فرق تھا! ایک جذبات مجسم دوسری گویا پتھر کی مورت امّی کی خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ تھیں۔ ان کی لانبی گھنی پلکوں پر آنسو تھرتھرا رہے تھے۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پھول کی سی تراش کے ہونٹوں کے کونے کانپ رہے تھے۔ مرمریں گردن اور سینہ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ غم اور حسن کا امتزاج۔

ادھر نانی بی پلٹی پلٹی آنکھوں سے امّی کو تک رہی تھیں۔ خاموش نگاہوں سے۔ اگر ان بھیگی بے نور آنکھوں میں جذبات کے اظہار کی قوت ہوتی تو ان نگاہوں میں یاس اور رنج کی ایک دنیا ہوتی مگر نظاہرہ جذبات سے عاری معلوم ہوتی تھیں۔ پتھرائی ہوئی، وہ بے حس بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے سکتے کا عالم۔ گہرا صدمہ انصاف کرنا چاہتا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ہمدردانہ کی طرفداری کرتا۔ آخر "غمگین حسن" اپنے اندر بہت اثر رکھتا ہے نا۔ مگر مجھ پر نہ تو اس حسن کا کوئی اثر تھا، نہ نانی بی کے جھکے ہوئے گالوں اور پوپلے منہ سے نفرت تھی۔ ہاں مجھے امّی پہ ترس آرہا تھا، مگر اس دل کا کیا حال ہوگا جس سے ایک عزیز چیز چھین لی گئی ہو۔ امّی کے پاس دولت تھی، عزت تھی، ہر طرح کا آرام تھا۔ چاندسے بچے تھے، اس قسمت کی ستائی ہوئی بڑھیا کے پاس کیا رکھا تھا۔ رہنے کے لئے ٹھکانا بھی تو نہیں۔ ہاں امّی کے چہرے سے بہت رنج ظاہر ہو رہا تھا۔ مگر میں اچھی طرح جانتی تھی۔ ان سادہ نگاہوں میں کتنی یاس چھپی ہوئی تھی۔ اور اس سوکھے سینے کے اندر رکا ہوا سیلاب تھا کتنی دبی ہوئی ہلچل تھی۔ کیسا طوفان تھا۔

نسیم کے رونے کی آواز آئی اور انی مجھے گود سے اتار کر آنسو پونچھتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ نانی بی خاموشی سے اپنا بستر اور کپڑے باندھ رہی تھیں۔ امّی کے جاتے ہی میں دوڑی ہوئی ان کے گود میں جا بیٹھی۔ "نانی بی مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ نانی بی نے مجھے گلے لگا لیا۔ بھر کیا تھا۔ جیسے بند ٹوٹ گیا ہو۔ رکا ہوا سیلاب اُمڈ آیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ نانی بی کا دل پگھل کر آنکھوں کے ذریعہ بہہ رہا ہے۔ "میری نچی، میری ننھی شہزادی تمہیں چھوڑ کے کیسے جاؤں۔" "اچھی نانی بی اقرار کرو، تم مجھے دیکھنے کبھی کبھی آیا کرو گی نا؟" "نہیں بیٹی اب اس گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔" "کیوں نانی بی؟ مجھ سے روٹھ تو نہیں گئیں میں تمہارے لئے سب کچھ کروں گی۔ تم جو کچھ کہو وہ سنوں گی نہ روٹھو نانی بی! آتی رہو مجھے دیکھنے۔"

"اچھا میں جو کچھ کہوں وہ سنو گی؟" "ضرور۔" مجھے وہ آئینہ کا ٹکڑا مجھے دو نا اچھی بیٹی۔" نانی بی نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔ میں بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں گئی۔ ایسے چھوٹے ٹرنک میں سے ریشمی بڑھ نکالا۔ اس بڑھے میں میں نے قارون کا خزانہ جمع کر رکھا تھا۔ بہت سی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، رنگین منکے موتی کانچ کے ٹکڑے۔ کڑیوں کے ننھے زیور، نئے ڈھالے ہوئے تانبے کے پیسے، جسے میں "سادرن" کہا کرتی تھی۔ سنہری گھنگھرو، ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، دو تیاں..... اسی میں میں نے نانی بی کا آئینہ رکھا تھا۔ آئینہ کے ٹکڑے پر گوند کی بتی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ چکنائی کے دھبے بھی تھے۔ پھر بھی کیسا پیارا لگتا تھا وہ آئینہ۔ کیسے خوبصورت کنارے ان پر رنگین شیشوں سے تراشے ہوئے خوبصورت پھول تھے۔ سنہری، حنائی، فیروزی، آسمانی۔ اس دن جب میں نے نانی بی سے یہ آئینہ مانگا تھا تو انھوں نے پیار سے چمکار کر کہا "میری اچھی بیٹی تمہیں بہلانے کو اور بھی تو کئی چیزیں مانگوں، اور نانی بی نہ دیں۔ وہ کبھی نہ نہ کرتی تھیں۔ ہونہ ہو اس میں کچھ ہو گا ہی اور میں آئینہ لیتے ہی پھر گئی۔ "ہونہہ میں تو یہ آئینہ ہی لوں گی۔" بچپن کی ضد میں نے ہٹ کر کے، رو رو کے آخر آئینہ چھین ہی لیا۔ آئینہ دیتے ہوئے نانی بی کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے تھے۔ مگر میں تو چھوٹی تھی۔ ان آنسو کے معنی کیسے جان سکتی؟ پھر وہ آئینہ میرے پاس رہا۔

کئی بار نانی بی نے ترسی سوئی التجا بھری آواز میں مجھ سے وہ آئینہ واپس مانگا تھا۔ مگر میں ہر دفعہ رونے لگتی "ہوں وہ غلیظ آئینہ کا ٹکڑا مجھ سے پیارا ہے؟" نانی بی ناچار چپ ہو جاتیں۔ مگر آج جب کہ وہ مجھ سے جدا ہو رہی تھیں مجھے چھوڑ کر چلی جا رہی تھیں میں وہ آئینہ تو کیا سب کچھ دینے کو تیار تھی۔ میں بڑھ لئے نانی بی کے پاس واپس آئی اور سب خزانہ ان کے سامنے انڈیل دیا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طرح کی مسرت محسوس کر رہی تھی گویا میں اپنی پیاری چیزیں نہ دے کر بہت بڑا ایثار کر رہی ہوں۔

"یہ سب کچھ لے لو نانی بی۔ مگر ضرور آتی رہنا۔ نہیں تو میں خوب روؤں گی۔" "اچھی بیٹی اللہ نے مجھے جیتا رکھا تو جب تم اپنا گھر بساؤ گی دیکھ آؤں گی۔"

دل سے تمہاری مکمد مت کروں گی۔ مرتے دم تک وہیں پڑی رہوں گی۔ پھر مجھ پر دو مٹھی خاک ڈال دینا بیٹی" نانی بی نے ایک سرد آہ بھر کر اپنی چادر اوڑھ لی اور اپنے سامنے پھیلی ہوئی چیزوں سے صرف آئینہ اٹھایا۔ اسے آنکھوں سے لگا لیا اور اپنے میلے رومال میں لپیٹ کر کرتے میں چھپا لیا۔ پھر مجھے گود میں لے کر میری بلائیں لیں، گلے سے لگایا۔ پیار کیا۔ اور مجھے آہستہ سے اتار کر اٹھ کھڑی ہوئیں کپڑوں کی گٹھڑی بغل میں دبائی اور سر جھکائے خاموشی سے چل دیں۔ اب میں رو نہیں رہی تھی۔ کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ نانی بی پھر آئیں گی۔ جب تم اپنا گھر بساؤ گی کی شرط کو تو میں سمجھ نہ سکی تھی! میں اپنے بکھرے ہوئے خزانہ کو سمیٹ کر بڑے میں ڈالنے لگی۔ کیسی پیاری چیزیں تھیں نانی بی نے ان سب کو چھوڑ کر اس گرد آلود ٹوٹے پھوٹے آئینہ کو ہی کیوں چن لیا تھا؟ اس وقت میں اس گتھی کو سلجھا نہ سکی۔ اس آئینہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے چند سال اور گذرنے تھے۔ اس کے بعد میں اس آئینہ کی یاد کے بغیر نانی بی کا تصور کر ہی نہ سکتی۔ اب اس وقت کی تمام یادوں میں جب نانی بی کا اور میرا ساتھ تھا اس آئینہ والے واقعہ کا نقش ہی سب سے گہرا ہے ہاں وہ نقش جو کبھی تحت الشعور میں چھپا ہوا تھا۔ اب کتنا صاف ہے! نانی بی کا ایک ایک لفظ ان کی ایک ایک حرکت، اس دن کی جب انہیں آئینہ ملا تھا۔ ان کی وہ آئینہ لینے کے لئے التجائیں وہ آخری بار جب انہوں نے آئینہ کو آنکھوں سے لگا کر سینہ میں چھپا لیا تھا۔ دل کے پاس۔ یہ تصویریں بار بار ابھرتی ہیں۔ یہ یادیں بار بار میرے دماغ میں گھومنے لگتی ہیں۔ اور میں سوچتی ہوں۔ بظاہر اس بے حس مجسمہ میں ایسے جذبات بھی تھے! اس بچے ہوئے دل کی راکھ میں اتنی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں۔ اس سوکھے سینے میں اتنی آگ سلگ رہی تھی۔ ایسی یادیں چھپا کے رہی تھی یہ آئینہ انہیں راستہ میں پڑا ہوا ملا تھا۔ جب ہم ہوا خوری کے لئے جا رہے تھے ہر شام مجھے نانی بی ہوا خوری کے لئے باہر لایا کرتی تھیں۔ ہم گھر سے دور نکل جاتے ایک کھلے میدان کی طرف جہاں بہت سی خودرو گھاس بے ترتیبی سے اگی ہوئی تھی۔ اور دور دور پر کہیں کہیں گھنے درخت تھے۔ شام ہوتے ہی مٹھی بھر بولتی ہوئی چڑیاں ان درختوں پر آ بیٹھتیں۔ ان کے چہچہوں سے ساری فضا شیریں سُروں سے معمور ہو جاتی مجھے یہ جگہ بہت پسند تھی اور میں ہر روز نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس طرف لے جاتی۔ راستہ میں ہمیں ایک چھوٹی سی دوکان ملتی تھی۔ جہاں صرف پان کی بیڑی بکتی تھی۔ نانی بی ہر روز وہاں جاتی تھیں۔ ایک پیسہ کے پان اور سپاری خرید لیتیں۔ وہیں سے ایک پان میں بہت سا چونا بھی مانگ لیتیں۔ دوکان کے سامنے کچھ تختے بچھے ہوئے تھے۔ نانی بی وہیں بیٹھ کر بڑے انہماک سے پان کی نسیں نکالنے لگتیں۔ بوڑھا دکاندار جانتا کہ "پان کوٹنی" لے آنا، اور نانی بی کے سامنے رکھ دیتا دتے ہیں دو چار پوپلے منہ والی بوڑھیاں اور آ جاتیں۔ سب کی سب پان خرید کر "پان کوٹنی" کا انتظار کرتی ہوئی نسیں نکالنے لگتیں۔ ایک بوڑھے میاں بھی چلم لئے آ بیٹھتے۔ اچھی خاصی محفل جم جاتی۔ مجھے اس بوڑھوں کی مجلس سے بڑی دلچسپی تھی۔ اپنی دونوں مٹھیوں میں نانی بی کی چادر تھامے ان سے لگ کر کھڑی ہو جاتی اور ان سب کی عجیب عجیب وضعوں کو غور سے دیکھتی رہتی۔ بوڑھیاں نسیں نکالتی ہوئی پان کوٹتی ہوئی، اور بوڑھے میاں چلم بھر کر کش لگاتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیتے۔ کبھی اپنے بیٹا بیٹی، پوتے پوتوں کی، کبھی محلے والوں کی اور اکثر "ہمارے جمانے" اور "اب کے جمانے کی" "اب کے جمہور بھی کوئی جمہور ہوئے! بابا اب کی چھوکریوں کا دماغ تو آسمان پر چڑھ گیا ہے"۔ ایک بوڑھی منہ پر سے دوسرے ہاتھ مار کر کہتی "پرانے جمہوروں کے نام ہی سے کان پکڑتے ہیں۔ جو نہ ہاتھوں میں دو چوڑیاں لگے ہیں بابو یک سنگل" کانوں کی لو میں ایک "بابو یک" کن پھول یا جھومر اور بیں جلایہ بھی کوئی جمہور ہوئے۔ ہمارے جمانے میں جو پہنتی تھیں کان بھر کر سونے کی بتیاں۔ ہاہا منتظر اوں پر جھومتی ہوئی کیسی بھلی لگتی تھیں"

"اور یہ بھی دیکھا، ناک چھدوانا تو گویا عیب ہی ہو گیا۔ بچی کھچی کیسی بری لگتی ہے ناک"۔ ایک بوڑھیا منتھنے چڑھا کر نفرت ظاہر کرتی۔

"نانا یہ جمانے کی چھوکریاں بھی کیسے بال بناتی ہیں۔ تیل نام کو نہیں۔ روکھے بال سر سے دو انگل اوپر اٹھے ہوئے۔ مرٹی مرٹی نسیں نکلی ہوئیں۔ سر کو اچھا خاصا کوڑے کا ڈھیر بنا لیتی ہیں۔ حشر کسو کو پل صراط پر سے پھسل پھسل گرنا پڑیں تو جب جانیں۔ کیا جمانے بھر گوں نے جھوٹ کہا تھا" بیچ میں سیدھی مانگ نکالی تو پل بھر میں بہہ سے پل صراط طے کر گئی۔ "اب تو اللہ ہی بچائے ان تیڑھی مانگ والوں کو۔ سیدھی مانگ نکالو چہرہ پر کیسا نور جھلکتا ہے۔ تیڑھی مانگ تو کیسی اچھی صورت بگاڑ دیتی ہے۔ اب اس بچی ہی کو دیکھ لو بوا۔ کیسا پھول سا مکھڑا، چاند سی پیشانی سیدھی

مانگ نکالتی تو چہرہ پر کیسی رونق آجاتی اب تو کرسٹان لگتی ہے کرسٹان۔" اور ایک بوڑھی بھویں چڑھا کر نفرت سے منہ پھیر لیتی۔

کوئی اور میرے ریشمی فراک کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی "اماں اب کے کپڑے تو دیکھو کیسے کیسے فیشن۔"

"وہ ہوا، وہ فیشن کی بھی تم نے ایک ہی کہی۔ ذرا دیکھو تو پنڈلیاں ننگی باندھ رکھی ہیں، صنعت بھجو لنگت۔"

اور یہ رنگ تو دیکھو ہوا، کیسا پھیکا پھیکی سی کیا اب کے سب رنگ پھیکے۔ پیچ پھپھو تو اجلے رنگ میں اور ان میں کوئی فرق ہی نہیں۔"

"اونہہ اجلا رنگ! اب کی چھوکریاں اجلے کپڑے پہننے کو عار نہیں سمجھتیں ابھی سے بوڑھیاں بنی پھرتی ہیں۔ بھلا ان بھجی چھوکریاں کو کہیں اجلا رنگ سجتا ہے۔"

"ان بھجی چھوکریاں کا۔ ارے بابا اب تو گجب ہو گیا گجب! سہاگنیں تک اجلے کپڑے بے دھڑک پہن لیتی ہیں، گجب ہو گیا گجب۔ توبہ توبہ کچھ سہاگ کا پاس بھی ہے انہیں؟"

کبھی شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگتیں .....

"ہمارے زمانے کی شادیاں، شادیاں تھیں کئی ہفتے لگتے تھے، کیسی کیسی رسمیں اب دیکھ پیٹ منگنی پٹ بیاہ، اور بیاہ بھی کیسا بیاہ، ادھر نکاح پڑھا گیا، ادھر دلہن کی رخصتی ہوئی۔ نہ کوئی رسم نہ ریت۔"

"اور اب کی دلہنیں تو خالہ! ابا ری چھوریاں، توبہ توبہ آنکھ کا پانی بہ گیا ہے کیسی ہنسی خوشی رخصت ہوتی ہیں۔ اپنے حسم کے گھر کو ہم تھے کہ تین تین روز تک آنکھ کا پانی نہ سوکھتا تھا۔ رو رو کر بے سُدھ ہو جاتے تھے اللہ اللہ کیا زمانہ آیا۔"

"پرسوں میں ایک شادی میں گئی تھی، اماں! کاہے کو بولوں اس دلہن کی بے شرمی" اور سب بوڑھیاں ٹھوڑیوں کو ہاتھ لگائے آنکھیں پھاڑے بڑے غور سے سننے لگتیں۔

"جب اس کی مچھ یاں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں تو ہنس رہی تھی بھری مجلس میں نوشہ کے گھر والے بھی پاس ہی بیٹھے تھے، توبہ توبہ ہم پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ہاں دولہا بھائی نے سویٹ لیا۔ کیا کرتی سمدھنوں کو منہ دکھانے سے دہی۔ جب رخصتی کا وقت آیا تو وہ تیار ہی بیٹھی تھی۔ ادئی، میرے اللہ ایک بوند بھی نہ تھی۔ اس چھوکری کی آنکھوں میں؟ ناباہم سے تو رہا نہ گیا۔ اجو بیٹی والوں کی لاج رکھنی تھی سمدھنوں کے سامنے۔ ہم دو چار بڈھیوں نے مل کر کپڑے برابر کرنے کے بہانے سے اتنے رہورے نوچا کہ اس کے بیچ نکل گئی۔ جب کہیں جا کر دو بوند پانی نکلا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ چھوکری ہم پر پلٹ نہ پڑی۔ ورنہ رہی سہی عزت بھی جاتی رہتی۔"

"اچھا کیا بہت اچھا کیا۔ اس بے رحم کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔" سب یک زبان ہو کر کہتیں۔ اور بوڑھے میاں بھی بڑے زور سے سر ہلا ہلا کر داد دیتے۔ یہ بوڑھے میاں سر کو ہاتھ لگائے بہت تن گوش ہو کر بوڑھیوں کی باتیں سنا کرتے۔ جب کبھی ان کے بات کرنے کی باری آتی تو پگڑی ذرا ہٹا کر (کبھی پگڑی ایک بڑے سے رومال کو سر کے گرد لپیٹ لیا کرتے تھے) اپنے چکتے ہوئے گنجے سر کو زور زور سے کھجلانے لگتے۔ اور بڑی ہی سوچ بچار کے بعد ایک بول نکالتے گویا انہیں کی رائے آخری اور فیصلہ کن ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہوتیں مگر یہاں بھی نانی بی خاموشی سے سب کی باتیں سنتیں "اب کے جانے پر اتنے اعتراضات سن کر بھی کوئی رائے ظاہر نہ کرتی تھیں اور نہ ہی ان کے چہرے سے کوئی جذبہ کا اظہار ہوتا۔ شاید ان باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ ..... پھر جب یہ محفل برخاست ہو جاتی تو میں نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس میدان میں لے جاتی۔

حالانکہ ہم کسی گھنے درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے۔ میں گرے ہوئے سرخ پھولوں سے کھیلنے لگتی۔ پھر انہیں سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لیتی اور نانی بی کی گود میں آ بیٹھتی۔

"ایک اچھی سی کہانی بولو نانی بی۔" "آج کون سی کہانی بولوں" اور ساتھ ہی اپنی منوار کی ڈبیا نکال لیتیں۔ ایک چٹکی بھر کر نتھنوں میں چڑھا لیتیں۔ پھر

ایک میلا سا رومال اپنی سرسی سے "ہیلے" کے نیچے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالتی ہر نئی کہانی شروع کرتیں: "اچھا سنو ایک بادشاہ تھا۔ اس کی سات بیٹیاں تھیں" پھر اس پر پکھتی ہوئی آہستہ آہستہ کہتیں۔ اس نے سب شہزادیوں کو باری باری اپنے دربار میں بلایا۔ پوچھا تمہیں کون پالتا ہے، سب بولیں "آپ" مگر چھوٹی شہزادی بولی "اور نانی بی اس جملے سے دو دل، پھر بنے میں ٹوٹ گئیں۔ اس سے پوچھنے پر بھی گالی گالی وصول کی ایک تہ سی ان کے نخصوں پر جمی رہتی۔ اتنی باتیں ایک ساتھ کہنے سے ان کے پوپلے سے نارون پر پان کی لال لال پیک بہ آتی۔ اور وہ ایک لمحہ نہ پھیر کر پیک کو تھوکتی ہر نئی کہانی کو جاری رکھتیں "چھوٹی شہزادی بولی "ہم سب کو اللہ میاں ہی پالتے ہیں اور مجھ سے آپ کو بھی" اس جواب کو سن کر بادشاہ ..... "

"کیسی چھوٹی شہزادی نانی بی؟" مجھ جیسی "میں بیچ میں کب اٹھتی اور وہ پلک جھپکے میں گود میں اٹھا لیتیں" ہاں بیٹی تمہاری جیسی شہزادی ایسی ہی کھوبصورت شہزادی" میں خوش سے پھول جاتی اور نانی بی کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگتی "بھی کیسا پیارا لگھڑا ہے تمہارا ہاں، چاند کا ٹکڑا" نانی بی میری بلائیں لینے لگتیں۔ ٹٹ ٹٹ، ٹٹ، "دیکھو، سب انگلیاں ٹوٹیں۔ کتنا پیارا ہے مجھے اپنی بچی سے" اور میں اپنی ننھی ننھی باہیں نانی بی کی گردن میں ڈال دیتی۔ اس وقت مجھے ان نخصوں پر بھی راکھ وصول اور پوپلے منہ سے بہتی ہوئی پیک سے بھی نفرت محسوس نہ ہوتی۔

پھر نانی بی اپنی ہتھیلی پر ذرا سا چونا پھیلا کر پھونک پھونک کر خشک کر لیتیں اور اس میں تھوڑی سی نسوار انڈیل کر ملنے لگتیں۔ ساتھ ہی ساتھ آہستہ آہستہ کہانی بولتی جاتی تھیں۔ ناس گھس گھس کر چھوٹی چھوٹی گولیاں بناتیں۔ اور ایک پیاری بڑی سفید وٹیا میں۔ بالکل میرے کریم کی ننھی سی ڈبیا کی سی۔ انہیں ڈالتی جاتی تھیں۔ یہ سب کرتی ہوئی وہ بڑی ہی پیارے کہانی سناتی تھیں۔ ایک ایک جملہ مزے لے لے کر۔ نانی بی کو کہانی سنانے میں بڑا ہی کمال حاصل تھا۔ بار بار کسی نہ کسی بہانے سے ایسی جگہ ٹھہرا دیتیں۔ جہاں میرا اشتیاق بڑھا ہوتا۔ پان کی پیک تھوکنے کے بہانے یا گولیاں بنانے میں بہت ہی مہمک ہو جاتیں بے تاب ہو جاتی۔

"اس کے بعد کیا ہوا نانی بی؟ جلدی جلدی کہو نا"

"نا بیٹی جلدی بولوں تو کھانا مجا آئے گا" اور یہ سچ تھا۔ ان کے یوں بیان کرنے میں کہانی کا دوگنا مزا آتا اور وہ واقعات کو ایسی تفصیل سے اتنی اچھی طرح بیان کرتیں کہ میں اپنے آپ کو اس ماحول میں تصور کرنے لگتی۔ مجھے نانی بی کی ہر کہانی کی "شہزادی" سے محبت ہو جاتی مگر نہ جانے کیوں ان کی ہر شہزادی پر کوئی نہ کوئی مصیبت آپڑتی۔ پھر کہیں سے ایک "شہزادہ" آ ٹپکتا۔ شکار کھیلتے ہوئے یا اور کچھ طریقے سے۔ اور اس شہزادی کو مصیبت سے نجات دلا کر اپنے محل لے جاتا۔ دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگتے۔ نانی بی کی ہر کہانی یوں ہی ختم ہوتی۔ یہ شہزادہ کتنا اچھا ہے۔ چھوٹی شہزادی کو بچانے والا۔ میں سوچا کرتی۔

"میں چھوٹی شہزادی ہوں، نانی بی! مجھے بھی ایک ایسا چھوٹا شہزادہ لے جائے گا" میں نہایت بھولے پن سے پوچھ بیٹھتی۔ اور نانی بی کی بے نور آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے چمک آجاتی۔

"ہاں کیوں نہیں میری ننھی! جب تم بڑی ہو کر انگنہ بھی پڑھو گی۔ کھوب پڑھ کر بی۔ اے پاس ہو جاؤ گی تو..... اس پر تم ہو بھی کھوبصورت تمہیں جرور ایک بڑا آدمی بیاہ لے جائے گا۔ کوئی بہت بڑا بیرسٹر"

"ہوں، ہوں بڑا بیرسٹر نہیں چاہیے۔ چھوٹا شہزادہ" میں مچلنے لگتی

"ہاں ننھی وہ شہزادہ ہی ہوگا۔ میری شہزادی وہ دن کب آئے گا۔ اللہ مجھے اس دکھتے تک بیتار کھے۔ تمہیں دلہن بنی دیکھ لوں۔ تو چین سے مر سکوں گی ..... " آہ نانی بی، شہزادہ تمہاری کو لینے آگیا ہے۔ مگر تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ کاش تم چند ہی دن اور زندہ رہتیں وہ دن بھی دیکھ لیتیں جس کو دیکھنے کی تمہاری آخری آرزو تھی۔ کہ دیکھ کر جذباتی خوشی سے پھولے نہ سماتیں۔ ان کے حسین چہرے کی کتنی ہی بلائیں نہ لیتیں تم ضرور انہیں شہزادہ ہی سمجھتیں .....

ہاں تو یہ ہمارا معمول تھا۔ میں ہر روز نانی بی کے ساتھ اس میدان میں جاتی۔ کچھ دور پر ایک چھوٹا سا گدلے پانی کا تالاب تھا۔ کئی بار میں نانی بی سے کہنا چاہتی تھی کہ اس تالاب تک نہ جائیں، مگر نانی بی کے کہانی بولنے ہی میں اندھیرا ہو جاتا، اور ہم گھر لوٹ آتے۔ ایک دن جب نانی بی نے ابھی کہانی شروع نہیں کی تھی میں نے ایک آدمی کو بندریا ساتھ لئے آتے دیکھا۔ اس کے پیچھے بہت سے بچے شور مچاتے آ رہے تھے۔ تالاب کے پاس آ کر وہ بندر والا الگ دوں بیٹھ گیا اور اس نے تماشہ دکھانا شروع کیا۔ ڈگڈگی بجا کر اس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ چند بے فکرے مرد بھی جمع ہو گئے۔ "میں بندر کا تماشہ دیکھوں گی نانی بی تالاب کے پاس لے چلو۔" نانی بی میری ہر خواہش کو پورا کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے دور لے جا کر ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا کیا۔ جہاں سے میں اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ "یہاں نہیں اور بھی قریب لے چلو نانی بی" "نا بیٹی، یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ اتنے گیرو دے کھڑے ہیں اوئی میرے اللہ" اور نانی بی نے چادر کھینچ کر اپنے چہرہ کو اور زیادہ ڈھانپ لیا۔ "اچھا تم نہیں آؤ گی تو میں بھی یہیں رہوں گی۔" میں نانی کی چادر تھامے تماشہ دیکھنے لگی۔

"اچھا بیٹا اب اپنی ماں کے گھر کا کام کرو۔" بندر والے نے ڈگڈگی بجا کر حکم دیا۔

بندریا نے جلدی سے ایک چھڑی اٹھالی اور اسے سر پر رکھ کر ادھر اُدھر پھرنے لگی۔ "گویا بہت کام کر رہی ہے۔" "اچھا اب ساس کے گھر کا بھی کام کر دو بیٹا۔" بندریا نے زور سے چھڑی زمین پر پھینک دی اور منہ پھلائے ایک طرف جا کر بیٹھ رہی۔

"بندریا نے چھڑی کیوں پھینک دی نانی بی؟" کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے چادر کو ذرا کھینچ کے پھر پوچھا۔ پھر بھی نانی بی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو نانی بی ایک مٹی کے ڈھیر میں کرید کرید کر کوئی چیز نکال رہی تھیں۔

——— انہوں نے میری بات نہ سنی تھی۔ کچھ دیر بعد نانی بی نے وہ چیز نکال لی۔ ایک آئینہ کا ٹکڑا ——— "ایسا آئینہ نانی بی مجھے بھی دکھائیے" نانی بی نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بڑے غور سے آئینہ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں بہت دیر کے بعد انہوں نے دبی آواز میں کہا۔ مجھ سے نہیں اپنے آپ سے۔

"آہ! انہوں نے ایسا ہی آئینہ میرے لئے منگوایا تھا۔"

"ایسا آئینہ کس نے منگوایا تھا نانی بی؟ کیا میرے ہمارے گھر والے، ہمارے آدمی" "تمہارے گھر والے کون نانی بی" وہی بزرگوں نے جن کے ساتھ میرا بیاہ کیا تھا۔" "تو تمہارا بیاہ ہوا تھا نانی بی۔ بابے بجے تھے، تمہارے بیاہ میں؟ اور تم نے اچھے اچھے کپڑے اور زیور پہنے تھے۔ اپنے بیاہ کا قصہ سناؤ نانی بی، آج کہانی کے لئے اصرار نہ کروں گی۔"

"میری بھولی بچی۔ ہاں میں نے اچھے اچھے حریر اور کمخواب کے کپڑے پہنے تھے۔ "غربا" کے معنی یہی نہیں۔ اچھا آج کہانی (کہانی) نہ سنو گی مگر میری زندگی کی کہانی سے کیا کم ہے بیٹی۔ کیا بتاؤں کیسے دھوم دھام سے بڑا تھا میرا بیاہ! کتنے ہی پائیگیر اور کھرچ ہوئے تھے پانچ ہزار! برابر ایک مہینہ لگا تھا، پورا ایک مہینہ۔ کیا کہوں میں تو گہنوں سے گویا لد گئی تھی گلے میں اتنا مال کہ بوجھ سے گردن جھکی پڑتی تھی۔ جھومر ماتھے میں موتی، پیشانی پر ٹیکا جھومتا ہوا، ہاتھوں میں کنگن، پہنچیاں، گوٹ اور گوٹوں کے بیچ میں ہاتھ بھر کی ہری ریشم کی چوڑیاں، اتنی بڑی کی نتھ۔ پاؤں میں چاندی کے جھومر، کان بھر کے سونے کی بالیاں۔ اور مجھے کیسا سنوارا گیا تھا۔ بال پیشانی پر اتار کر ایسے صاف کئے گئے تھے ایسے صاف کہ اپنی صورت دیکھ لو۔ مند پر چھوٹا ہوا ریشمی پھلکیاں پھریرہ سندی، کاجل سی سے سولہ سنگار، اور میں ایسی کاہے کو تھی بیٹی ——— نانی بی نے پکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر آئینہ میں دیکھتے ہوئے کہا "گول صورت، پھولے پھولے گال، کیسی رونکھ تھی چہرہ پر۔ اب کیا دیکھتی ہو بیٹی ہڈ چڑا ہو کر رہ گئی ہوں۔ اس جانے میں کیسی بھاری جوان تھی میں۔ ایک ایک باجو یہ موٹا دو واجے میں نہ سماتی تھی"..... اور کپڑوں کی بھڑک کا کیا کہنا لال دامنی یہ بڑے بڑے ملائی بوٹوں والی" نانی بی نے بوٹوں کی پوٹائی بتانے کے لئے اپنی ہتھیلی پھیلا دی۔ "ہرا بناری بنگا اور اطلس کا کرتہ کیسی بن سنور کر بیٹھی تھی میں" میں نانی بی کے قصہ کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی اور تصور میں نانی بی کو دلہن بنی بنی دیکھ رہی تھی چمکے ہوئے نہیں "پھولے پھولے گالوں

دائی" نانی بی کو۔

"میں ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھی۔ اور ہم تھے ہی کتنے، ایک بھائی، ایک بہن، بابا نے میرے بیاہ پر جی کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ "ان کے ماں باپ تو ہم سے بھی زیادہ مال والے تھے۔ کیا مجال میرا دل کوئی چیز مانگے اور وہ نہ ملے بات ابھی جبان پر بھی نہیں آتی تھی وہ چیز میرے کھدموں میں۔ کیا کہوں بیٹی میرے بیاہ کے بعد چند سال کیسے سکھ سے گزرے۔ ان کے بابا مجھ پر جان چھڑکتے تھے اور میں ساس کی آنکھوں کا تارا تھی۔ کیسے ارمانوں سے بہو کو بیاہ کر لائی تھیں آنکھ ایک پی تو بیٹا تھا۔ جگر کا ٹکڑا۔ میں بچوں پر بیٹھی رہتی۔ کام کرنے کی بھی ایک بات تھی۔ میں تو ادھر کا تنکا ادھر اٹھا کر نہ رکھتی تھی اور وہ مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے "مجھے گھڑی پاچھا جاوتی" کہا کرتے تھے، مجھ سے پوچھے بنا کوئی کام نہ کرتے ہر وقت کوئی نہ کوئی اچھی چیز میرے لئے لے آتے، کیسے کیسے پیار کے ڈھنگ آتے تھے انہیں۔ نہ جانے کہاں سے سیکھ آئے تھے۔ ایک دن سہری پر بیٹھی اپنے داس میں گوٹا ٹانک رہی تھی یہ پیچھے سے آکر میری آنکھیں بند کر دیں۔" پھر جلدی کچھ شرماتے ہوئے نانی بی نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی "بچی بھی کیسی باتیں کر رہی ہوں بچی کے سامنے۔ کبیر تم تو بڑی ہی بھولی بچی ہو۔ ان باتوں کو کیا سمجھو گی۔ ہاں آنکھیں بند کر دیں۔ اور جب میرے کانوں میں پہنا کر ہاتھ ہٹا لیا۔ ارے میرے اللہ میں تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ انہوں نے دوسرے ہاتھ سے آئینہ میرے چہرے کے سامنے پکڑ رکھا تھا۔ کہنے لگے دیکھو کیسے بھلے لگتے ہیں۔ جھومر تمہارے کانوں میں" میں نے جلدی سے جھومر نکال ڈالے۔ مجھے تو بڑے بڑے لگتے تھے۔ اتنے لانبے لانبے لٹکتے ہوئے، نا بابا مجھے تو کھاک اچھے نہیں لگتے۔ وہ ہنس کر بولے "تم تو پرانے ڈھرے پر چلتی ہو۔ آخر دن رات جاروں داری میں بند رہتی رہنا۔ تم کیا جانو۔ زمانہ کیسے بدل رہا ہے۔ ارے بھئی یہ نیا فیشن ہے نیا فیشن دیش گیا جانوں مجھے تو انہیں پہنتے شرم لگتی ہے" کچھ جانے دو یہ آئینہ تو تمہیں پسند ہے۔ دیکھو اسے بھی نہ کہنا۔ بڑی دور سے منگوایا ہے، چھتر روپے لگے ہیں چھتر روپے۔ ہاں آئینہ، آئینہ کیا کہوں۔ کیسا پیارا تھا۔ کبیر یہ تو ایک ٹکڑا ہے۔ اس سے اس کی کھوٹ صورتی کی کیا کبر ہے۔ کناروں پر کیسے کیسے رنگا رنگ پھول گویا ہیرے جواہرات جڑے تھے۔ دل میں تو بہت کھوس تھی گر یونہی گوارا کرنے لگی۔ ارے بھلے آدمی کاہے کو اتنا روپیہ خرچ کرتے ہو مجھ پر۔ انہیں تو پیسوں کی کھدر ہی نہیں۔ کیا ٹھیکریاں ہو گئی ہیں تمہاری نجر میں۔ چھتر روپے بابا" اور وہ میری طرف کیسے پیار سے دیکھ کر بولے تھے "جہرہ تمہیں یوں کھوس دیکھ کر کھیمت دیرت سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ تمہاری کھوسی پر چھتر روپیہ تو کیا سب کچھ سدقے ہیں" آہ! ان کی کونسی کونسی بات یاد کروں۔ ان باتوں کو یاد کروں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے" نانی بی نے آنسو پونچھے اور دبی آواز میں کہنے لگیں "آہ اس زمانے میں وہ مجھے کتنا چاہتے تھے۔ چھتر روپیہ کے، اتنی دور سے، پرائے ملک سے میرے لئے آئینہ منگائے تھے۔ اللہ اللہ یہ آئینہ تو ان کی یادگار محبت ہے" اور انہوں نے اس آئینہ کے ٹکڑے کو آنکھوں سے لگا لیا۔" اور میں کیسے پگڑے وہ آئینہ اپنی ہمسیلوں کو دکھاتی پھرتی تھی۔ وہ کہتیں "ہاری جہرہ تو بڑے بھاگ والی ہے۔ کیسا اچھا میاں ملا ہے تجھے.....

آہ کسی کے بھاگ ہمیشہ ایک سے ہوتے ہیں یہ آسمان کا چکر! یہ جانا کسی کو سکھی نہیں دیکھ سکتا اپنا دکھڑا کیا سناؤں بیٹی۔ میرا ستارہ بھی گردش میں آگیا۔ میری صحت ایسی بھوٹی ایسی پھوٹی خدا دوسرے دشمن کو بھی نہ دکھائے۔" نانی بی پھر رونے لگیں میرے سسر جاتے رہے۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔" نانی بی نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر اپنا آنچل پھیلا دیا "میرے باپ سے بھی جیادہ تھے۔ اللہ کا دیا اتنا دھن دولت تھا۔ باپ کے مرنے پر انہیں کے ہاتھ آئی۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی۔ پیسہ ہاتھ لگا اور ان کا ہر کوئی دوست اور ہمدرد بن گیا۔ اتنے دوست پیدا ہو گئے ہر وقت انہیں گھیرے رہتے۔ وہ وہ تار پھولوں کے پل باندھتے اور یہ تھے سیدھے سادے آدمی۔ بھولے نہ سماتے اپنی تعریف سن کر سب کو بچے دوست جان کر کھوب کھا طر کرتے۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی کہ اچھے بُرے کی تمیز کرتے اور پھر کھدا نے انہیں ایسا نرم دل دیا تھا۔ کسی کو اپنے دروازے سے دھتکار کر نکالنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ تم جانو بہت سے لچے لفنگے گنڈے بھی جمع ہونے شروع ہو گئے۔ بری صوبت (صحبت) سے اللہ ہر ایک کو بچائے۔ جب پیمبر کا بیٹا تک کھراب ہو گیا تھا تو ہم جیسوں کی کیا بساط۔ پیسہ تو ہر ایک کو کھراب کرتا

ہی ہے۔ پھر بھری جوانی۔ ان شہدوں نے اپنی جیبیں بھرنے کے لئے ان کو شراب اور جوئے کا چسکہ لگا دیا۔ خدا ان سب کو غارت کرے۔ میرے بھرے ایسے اُجڑی کہ کھراب کیا۔ پھر کیا تھا بیٹی! باپ کی اتنی محبت سے کمائی ہوئی پونجی مہینوں میں اڑ گئی۔ پھر میرے جہیز کی چیزیں بھی ایک ایک کر کے بک گئیں۔ یہاں تک تو کیر تھی جب کچھ نہ رہا، تو کیا کہوں بیٹی! نانی بی زور زور سے سسکیاں لینے لگیں..... "تو میرے گنے مانگنے لگے۔ شراب کے نشہ میں چور آدھی آدھی رات کو آتے اور ہیورنے لئے کھاجا کرتے۔ کبھی ہاتھ روک لیتی تو بس میری شامت ہی آجاتی۔ اتنا مارتے، اتنا مارتے، لاتوں سے، گھونسوں سے، ہڈی کہیں دیکھ پاتے تو اس سے بھی بے دھڑک پیٹتے۔ میرے ہاتھ پاؤں سوج جاتے اور ان پر نیلے نیلے نشان ابھر آتے۔ سارے جیور کپڑے برتن سب ٹھکانے لگ گئے یہاں تک کہ میرے بدن پر ایک رانگی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ پھاکوں پہ پھاکے گمار کے میرے دیدے اندر دھس گئے۔ کلوں میں گڑھے پڑ گئے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ ایک رات انہوں نے خوب شراب پی لی تھی۔ لڑکھڑاتے گرتے پڑتے آئے اور باہر دریچہ سے پکارا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ مگر وہ اندر نہیں آئے۔ مجھے وہیں پر بلا لیا۔ گئی، تو کیا کہوں بیٹی! نہیں برابر ہوش بھی نہ تھا۔ رہا سہا کپڑا بھی کھینچنے لگے، یا اللہ میں کیا کرتی۔ پوری طاقت لگائی بہت روئی بھی، مگر انہوں نے دانتی کھینچ ہی لی۔ وہ دانتی تھی ریشم کی۔ یوں چنبیلیوں کی امید میں مجھے ننگ دھڑنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اس رات کیا سوتی بدن پر ایک کپڑا نہیں، ٹھنڈ سے ٹھٹھری مرتی، ایک کونے میں دبکی بیٹھی رہی۔ رات بھر اپنی پھوٹی قسمت پر رویا کی۔ صبح روئی میں اِدھر اُدھر سے کچھ کوئے جمع کر کے انہیں سلگا کر چولہے کے پاس بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ ایسے میں کیا دیکھتی ہوں۔ میرا بھائی آکھڑا ہوا ہے، کھدایا مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جبین میں گڑ جاتی ایسی حالت میں مادر جاد ننگی، کھدایا جبین سکھ (ستی) ہو جاتی اور میں گڑ جاتی۔ آہ! ہم جیسی گھناگاروں کی دعا کہاں مقبول ہوتی ہے۔ وہ تو اگلی پنک بی بیوں کا ہی کچھ تھا۔ ادھر دعا ہونٹ سے نکلی اور جبین سکھ ہو گئی۔ کھیر کیا کرتی، ادھر اُدھر دیکھا تو ہانڈیاں پکڑنے کا کالکھ سے بھرا کپڑا پڑا تھا۔ تن ڈھانکنے کو وہ بھی غنیمت تھا۔ جلدی سے اوڑھ کر کونے میں سمٹ کر بیٹھ رہی۔ بھائی بھٹی بھٹی حیران نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ جہاں سے ایک لفظ نہ بولا۔ میرے میکے والوں کو کچھ کھبر نہ تھی کہ مجھ پر یہاں کیا گزر رہی ہے۔ ہاں ایک دو پیسے میرا بھائی دیا تھا مگر میں ان کے کھلا پیہ کیسے جان کھوتی۔ اب میرا بھائی چند دنوں کے لئے مجھے میکے لے جانے آیا تھا۔ پچھلی دپہے کہہ گیا تھا جو رہ کتنے دن ہو گئے نہیں میکے آئے۔ بچاری اماں بہت یاد کرتی ہیں۔ اب میں نوکری کی خاطر پرائی بستی جا رہا ہوں۔ وہاں سے لوٹ آؤں گا تو اب کی دپہے تمہیں ضرور بلا کر جاؤں گا۔ اور بیٹی جب وہ آیا تو میں ایسے حال میں تھی۔ ایسی لاچار ایسی بے بس اسے کتنا دکھ پہنچا ہو گا؟ آنکھ کھول سے کھول لگا تھا۔" اس کے بعد دیر تک نانی بی کچھ بول نہ سکیں۔ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ کیسی بری حالت ہو رہی تھی ان کی۔ آواز ہی رندھ گئی تھی۔ ٹھکا ہُوا پچلا ہونٹ اور زیادہ خشک آتا اور آنسو ابل ابل آتے۔ نانی بی کو اس حالت میں دیکھ کر میرا تحفظ دل بھر آیا، گو میں ان کی کہانی کو پورے طور پر سمجھ نہ سکی تھی۔ پھر بھی نانی بی کو یوں روتی دیکھ کر میں بھی رونے لگی۔ انہوں نے بہت مشکل سے اپنی حالت سنبھالی۔ آنسو پونچھے۔ اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ "نہ بٹیا، تم کاہے کو روتی ہو تمہی شجاعتی۔ اتنا دوہے میرا بچی کو۔"

"اچھی نانی بی، تمہیں کہانی سنانے سے اتنا دکھ ہوتا ہے تو نہ سناؤ۔ میں اچھی بچی ہوں۔ ضد نہیں کرتی۔ چلو مگر چلیں۔"

"نہیں بیٹی، تمہیں اپنی دکھ بھری کہانی سنا کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے اب تک میں کسی سے نہ بولی تھی۔ کس سے بولتی۔ اس کھوٹے گجی (خود غرض) دنیا میں میرا کوئی درد پہچاننے والا نہیں، مگر تم بیٹی نیخی ہو۔ پر کیسا درد بھرا دل رکھتی ہو۔ اب تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتیں۔ جب بڑی ہو گی تو سمجھو گی۔ نانی بی کی یاد کے ساتھ تمہیں آج کی باتیں یاد آئیں گی..... اور دکھ سکھ کا کہنا ہی کیا وہ اس جنم گی میں لگا ہی رہتا ہے۔ پھر میں اتنا سکھ نہیں پاتی تو اتنا دکھ کاہے کو اٹھاتی۔ کچھ تو تمہیں باقی بھی کہانی بھی سنائے دیتی ہوں۔ کم سے کم دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے۔"

"یہ تمہارا کیا حال ہوا ہے چہرہ؟" میرے بھائی نے پوچھا۔ میں پھر بھی کچھ نہ بولی کھڑا ہا چہرا تھا۔ ان کے خلاف میری زبان نہ کھلی۔ مگر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میرا بھائی روتا ہوا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا۔ ایک گٹھڑی پھینک کے وہ بولا "یہ چہرہ پہن لو" اور آپ دوسری طرف منہ پھیر کر توشہ دان میں سے کچھ کھانے کی چیزیں نکالنے لگا۔ میں نے گٹھڑی کھولی کپڑے پہنے اور ہم دونوں کھانے پر بیٹھے، کھاتے ہوئے اس نے کوئی بات نہ کی۔

بچیاں بچ گئے بیٹھا رہا۔ کھا پینے کے بعد آہستہ سے دبی آواز میں بولا اجلو جہرا گھر چلو لجھے اس بدماس کے سب کرتوت معلوم ہو چکے ہیں۔ کھدا کی قسم میں تمہیں پھر اس نالائق کے گھر بھیجوں۔ اس حالم کو اپنے گھر میں کھدم رکھنے دوں تو میں ایک باپ کی اولاد نہیں پھر بھی اس بے گیرت (بے غیرت) نے کھدم رکھا تو محلہ بھر میں بیٹھتی (فضیحت) کراؤں گا" چہرہ کچھ نہ بولا۔ کھاموسی سے مجھے گاڑی میں بٹھا کر لے آیا۔ میں تبھی کچھ گونگی تھی کہ وہ ایسا ستر ور کیسے گا۔ آہ! میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ مجھے اُن سے پھرنے نہ دے گا۔ نانی بیاہت زور سے سسکیاں بھر کر رونے لگیں۔ وہ گھستہ میں یہ باتیں کہتا تو اور بات تھی۔ گھستہ اتر ہی جاتا اور مجھے کچھ آس ہوتی۔ لیکن یہ کہتے وقت اس کے چہرہ پر کیسا سکون تھا۔ گھستہ نام کو نہیں۔۔۔۔۔ میں تبھی جان گئی کہ اس کا ارادہ پکا ہے" نانی بی نے سرد آہ بھری" میرا گمان صحیح نکلا۔ کچھ دن بعد وہ آئے۔ آؤ بیٹی بیٹی" میں قبب سے تکنے لگی۔ نانی بی کے سینے میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ پچھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ "آہ! کیا کہوں ۔۔۔۔ بے ۔۔۔۔ ٹی ۔۔۔۔۔۔ ان کے چہرہ پر بچھتاوا تھا۔ اداسی تھی۔ وہ جو رلانے کئے پر رنجیدہ تھے اور بیٹی ان کے ہاتھ میں ایک نئی ساری بھی تھی۔ میں دروازا کھولتے بھاگی۔ بہت جلد بھاگی۔ پھر بھی میرا بھائی آ ہی گیا۔۔۔۔۔۔ آ ہی گیا۔ مجھے جو سے دھکیل کر آگے بڑھا۔ انہیں ایسی ایسی باتیں سنائیں انہیں شہدا، لفنگا، بدماس کہا۔ بے گیرت کہا میرے اللہ! نہیں، کبھی نہیں، وہ بے گیرت نہیں تھے۔ ان میں سرپھروں کا خون تھا، میں بھائی کے پاؤں پر گر پڑی" اللہ واسطے ایسا نہ کہو بھائی" اس نے مجھے بھی بے گیرت کہا۔ اللہ اللہ یہ سن کر بھی وہ کھامو س کھڑے تھے۔ صرف اتنا بولے "میں تمہارے گھر پڑے رہنے نہیں چہرو کو لینے آیا ہوں" ایسے اس کام سے کوئی تعلق نہیں" شرم نہیں آتی اسے اتنا ستا کر" میرا بھائی دانت پیس کر برس پڑا" کیا میری بہن اتنی سستی ہے ہمارے پاس دو ٹکڑے روٹی بھی نہیں کہ اسے پال سکیں؟ کھدا کی قسم اگر میری بہن جو کوں مرے۔ پرائے، تم جیسے حالم کے پاس نہ بھیجوں گا۔ مار ہی تو دیا اسے" میرے بھائی نے ان کے ہاتھ سے ساری کھینچ کر نالی میں پھینک دی۔

"مجھے چہرہ سے تو پوچھ لینے دو۔ اگر وہ نہ کہے تو میں ضرور چلا جاؤں گا۔ اگر راجی ہے تو تمہارا کوئی حکم نہیں اس پر وہ میری بیوی ہے میں اسے ضرور لے جاؤں گا" "ہونہہ! کیوں نہ کہے گی؟ پھر آجائے گی تمہارے ساتھ اپنا مردہ نکلوانے" اور میں پیچھے سے رو رو کر التجا کر رہی تھی" بھائی میں جاؤں گی۔ بھائی مجھے جانے دو" اور بھائی نے مجھے آگ برساتی نظروں سے دیکھا۔ جیسے بے گیرت کہیں کی"

"نہیں میں چہرہ ہی سے پوچھوں گا۔ انہوں نے دہلیز پر کھدم رکھتے ہوئے کہا کھریب تھا، میرا بھائی انہیں دھکا دے کر باہر نکال دے" بے سرم اندر کھدم رکھتا ہے؟ ویسا بے سرم نہ ہوتا تو عورت جات کے گنے پیٹتا۔ کیا پوچھتا ہے چہرہ سے۔ وہ تو رو رو کر کہہ رہی ہے ہمیں اس حالم کے ساتھ نہ جاؤں گی" آہ بھائی نے کیسا جھوٹ بولا۔ کیسا جھوٹ بولا" اگر تجھ میں جرا بھی گیرت ہے تو جا فوراً یہاں سے چلا جا پھر کبھی ادھر نہ پھٹکنا" پھر میرے بھائی نے اتنے زور سے کواڑ بند کیا۔ کچھ پر بعد میں نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے جا کر دیکھا۔ وہ ہمارے گھر سے کچھ دور پر کھڑے تھے۔ آہ بیٹی میں نے اچھی طرح دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پانی کھڑا تھا۔۔۔۔۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر وہ چلے گئے۔ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ وہ بڑے گیرت والے تھے۔ بیٹی۔ اتنا ہونے کے بعد پھر اس گھر پر آتے؟۔۔۔۔۔ آہ میرے بھائی نے مجھے کیوں جانے نہ دیا؟ نہ جانے دیا تو کیا بگڑا۔ میں موقعا پاکر وہاں سے چلی آتی۔ وہاں سے نکل کر انہیں بہت ڈھونڈا بھی مگر کہاں ملتے۔ میرے ایسے نصیب کہاں۔ وہاں سے جو نکلی، بیٹی، تو نوکری کے لئے ماری ماری پھری۔ مگر پھر اس گھر میں کھدم نہ رکھا۔۔۔۔۔ میں ماں کے ہاں چین سے رہ سکتی تھی۔ مگر میری گیرت کیسے گھبولتی کہ وہاں پڑی رہوں مجھے کسی کے گھر کی نوکری تو کیا کوئی مجوری کرنا منجور تھا۔ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا، بھیک مانگنا منجور تھا۔ مگر اس دروازے پر جانا منجور نہ تھا۔ جوان پر بند ہوا تھا۔۔۔۔ اگر ہمارے بابا اس وقت پر جندہ ہوتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔ مجھے جہز دے بھیجتے۔ انہیں بیٹی کا لاکھ دکھ سہی۔ وہ میاں کا درجہ پہچانتے تھے۔ کہا کرتے۔ عورت کا مقام سوہر کا گھر ہی ہے۔ بھائی نے جوش میں یہ نہ پہچانا۔ بابا ہوتے تو مزہ دیتے۔۔۔۔ بھی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ان کی تو بھری جوانی تھی۔ بعد میں سنبھل ہی جاتے اور مجھے تو ایسا معلوم پڑتا کہ وہ تبھی ڈیڑھ دو مہینوں میں ہی بہت سنبھل گئے تھے پھر میری زندگی کیسے گھسے گجرتی! ایک دو

دن تکلیف سہہ ہی لیتی۔ اور پھر وہ مارتے تھے تو کیا کچھ جان کر مارا کرتے تھے۔ شراب پی کر انہیں ہوش تھوڑا ہی رہتا تھا۔ صبح جب ان کی حالت اچھی رہتی تو ان نیلے سوجے ہوئے حصّوں پر ہاتھ نہ پھیرا کرتے۔ پھر ایک دو دپہے تو انہوں نے گرم پانی میں روئی بھگو کر سینکا بھی تھا۔ ان دنوں بھی کبھی کبھی کیسی پیار بھری نظروں سے دیکھ لیا کرتے تھے۔ میں سب کچھ بھول جاتی اور کہتا یا! کہدیا! ان کی ایسی ایک نظر ہی بس تھی ..... ایک نظر ہی بس تھی" نانی بی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ میں تو ڈر ہی گئی ان کا سوکھا جسم ایسے ہل رہا تھا گویا اس کے اندر بھونچال آگیا ہو۔ کچھ دیر تک نانی بی خاموش ہو گئیں۔ پھر جب طوفان آہستہ آہستہ تھمنے لگیں۔

"اور ان میں کوئی ایسی ویسی بات بھی نہ تھی۔ شراب جوئے کا کیا کہنا اگر یہ لت پیشوں کو بھی پڑے تو چھوٹے۔ مگر کسی کی کیا مجال کہ دوسری باتوں میں ان کی طرف انگلی اٹھائے۔ ایسے تھے وہ۔ کبھی عورت کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ اور بیٹی! جب مرد میں یہ گن ہو یہ بات ہو تو عورت کیا کچھ نہیں سہہ لیتی"۔

نانی بی کی طویل کہانی ختم ہو لی۔ مگر اس کہانی کی بہت سی باتیں میرے دماغ کے کسی کونے میں جاگ سی گئیں۔ صرف ایک بات مجھے اہم معلوم ہو رہی تھی "نانی بی کا آدمی انہیں مار کر ان کے زیور چھین لیا کرتا تھا"۔ اور میں بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی کہ نانی بی اپنی کہانی ختم کریں۔ تو اپنی ننھی زبان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ہمدردی ظاہر کر کے انہیں تسلی دوں۔ جب نانی بی نے رونا بند کیا اور آنسو پونچھ لئے تو میں بڑی ہمدرد صورت بنائے بولی۔

"نانی بی! تم سچ مچ کتنا دکھ اٹھائی ہو۔ کیسا خراب تھا تمہارا آدمی۔ تمہیں یوں مار کر تمہارے اچھے اچھے زیور چھین لیتا تھا۔ کیسا خراب آدمی تھا۔ تمہیں اس کی صورت دیکھ کر نفرت ہوتی تھی نا؟"

"پھر بیٹی! اس کی صورت سے نفرت" کیا بتاؤں تمہیں وہ کیسا تھا کیسا ہنس مکھ کیسا بانکا سجیلا جوان! اٹھتا ہوا بدن، چوڑا سینہ۔ اور صورت کا تو کیا کہنا۔ چوڑی صورت، اونچی ناک، چوڑی پیشانی، موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ میں تو گھنٹوں بیٹی اس صورت کو تکا کرتی۔ پھر بھی جی نہ بھرتا، جب اجلے اجلے کپڑے پہنے لال کشمیری رومال کندھوں پر ڈالے باہر نکلتا تو دیکھتے ہی رہ جاتے۔ میں جلدی جلدی لال پیلا پانی لے آتی اور ڈیوڑھی کے باہر کھڑے رکھتے ہی اتار پھینکتی کہ کہیں چاند سے مکھڑے کو نظر لگ جائے۔ اس کی صورت سے نصرت بیٹی! وہ تو ہا اچھا ہوں کا ہا اچھا تھا۔ شجاعوں کا شجاعو!"

"کیا کر رہی ہو پروین؟ اگر تم نے اپنی سہیلیوں کے نام چٹھیاں لکھ دی ہیں تو لاؤ انہیں رحیم کے ہاتھ بھجوا دوں سب سامان آگیا ہے، تم آپا نصرت بی کی کچھ مدد کرو۔ بیچاری اکیلی اتنی چیزیں کیسے تیار کر سکے گی۔ دو ایک تم کر لو۔ تم دیکھتی ہو تسنیم تو میری گود چھوٹتا ہی نہیں"۔

"نہیں امّی آج پارٹی نہیں دوں گی"۔

"کیوں بیٹی؟ تم بھی عجیب ہو۔ آج خوشی کا دن ہے۔ جی بھر کے خوشیاں مناؤ"۔

"اس دنیا میں تو صرف خوشی ہی نہیں ہے امّی! اس کے ساتھ غم بھی تو لگا ہوا ہے"۔

"ہونہہ"۔ امّی زور سے ہنس پڑیں۔ ابھی سے فلسفی ہوتی جا رہی ہو۔ اپنی زندگی کے سب سے رنگین زمانے میں ہی"۔

"امّی! شاید آپ کو معلوم نہیں۔ کل نانی بی انتقال کر گئیں"۔ میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پھوپی نانی بی! سچ مچ اس بڑھی نے تم پر جادو کر دیا تھا"۔

امّی تم اب بھی نانی بی کو نہ سمجھ سکیں۔

ابراہیم جلیس

زرد چہرے

آصف کی بہن جوان تھی اور پانچ سال سے اپنے دولھا کا انتظار کر رہی تھی۔ نہ جانے اس کا دولھا کون تھا۔ کیسا تھا۔ کہاں کا رہنے والا تھا اور کب آنے والا تھا ——— ؟ آصف کو کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ جب تک اس کی بہن کے رخساروں پر گیندے کے پیلے پیلے پھول کھلے ہیں۔ اس کا دولھا کبھی نہ آئیگا۔ کیونکہ دولھے گیندے کے پھولوں کو مطلق پسند نہیں کرتے وہ تو گلاب کے سُرخ سُرخ پھولوں پر جان دیتے ہیں۔ اس کی سہیلیوں ہاجرہ پروفنا، زہرہ، شیلا اور سعیدہ کے گالوں میں کتنے بڑے بڑے سُرخ گلاب تھے۔ اور ان کے دولھے کتنی جلدی، کتنے اضطراب اور کتنی بے تابی سے آ آ کر ان سُرخ سُرخ پھولوں کو توڑ توڑ کر لے گئے۔ اب سارے محلے میں صرف ایک ہی پھول رہ گیا تھا ——— گیندے کا پیلا پیلا پھول ——— اس کی بہن جو پورے پانچ سال سے خوابوں میں، تصور میں، خلاؤں میں اپنے دُولھا کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن ہے خوابوں میں اس کا دُولھا دکھائی دیتا ہو۔ تصور میں چلا آتا ہو اور خلاؤں میں اس کی طرف بڑھتا ہو ——— لیکن وہ تو دھرتی پر رہتی تھی۔ خوابوں، خلاؤں اور تصور میں آنے والے دُولھے دھرتی پر کیسے اتر سکتے ہیں۔ وہ تو خوابوں کی نرم نرم سطح پر ہی چل پھر سکتے ہیں۔ دھرتی تو ان کے لئے بڑی سخت کھردری اور پتھریلی ہوتی ہے۔

سارے محلے میں مشہور تھا کہ اس کی بہن کو دق ہو گئی ہے۔ لیکن شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ دق وق کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک مرض ہے ——— طویل کنوارپن۔ جو بہت ممکن ہے۔ طویل ہوتے ہوتے دق کے گلے میں بانہیں ڈال دے۔ جُوں جُوں اس کی بہن کا کنوارپن لمبا ہوتا جاتا تھا۔ وہ بھی اس کی فکر میں گھُل گھُل کر سوکھ کر سوکھ کر لمبا ہوتا جا رہا تھا ——— ہڈیوں کا لمبا ہی لمبا ڈھانچہ۔

بہن کی مانگ میں افشاں چننے کے لئے اُس نے کیا کیا کچھ نہ کیا۔ جب باپ بغیر کسی بیماری کے اچانک مر گیا تو اس نے قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر تیس روپیہ ماہوار کی کلرکی جیسی اور نے غلامی بھی چار و ناچار قبول کر لی۔ اگر اس کی بہن نہ ہوتی، یا بہن نہ ہوتی یا وہ مفلس نہ ہوتا تو اپنے مشہور قوم پرست باپ کی طرح وکالت یا کوئی دوسرا آزاد پیشہ اختیار کرتا۔ دفتری غلامی کبھی نہ کرتا۔ اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے آزاد منش باپ کے لہو کی توہین نہ کرتا۔ ممکن طرح خود بھی حکومت سے ٹکریں لیتا رہتا۔ لیکن جس کا باپ مر گیا ہو۔ جس کی آمدنی تیس روپیہ ماہوار ہو۔ جس کی بہن کنواری ہو۔ اور جس کے بہن کے رخساروں پر گیندے کے زرد زرد پھول کھلے ہوں وہ کیا حکومت سے ٹکرا سکتا ہے۔ وہ کیا وقت سے جیت سکتا ہے۔

مگر اس کی بہن تو ابھی عورت بننے سے پہلے معمر بن گئی تھی۔ وہ بے چارا تو اس کے لئے صبح سے شام تک دفتر کی میز پر جھکا رہتا۔ صاحبوں کی پھٹکاریں سنتا اور مہینے کے مہینے تیس روپے اپنی بہن کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ اور اس کے باوجود اس کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تک نہ آتی۔ اس کے پیلے پیلے گالوں میں ابھی ایک مدھم سی دھار ——— ایک ہلکی سی شہابی رو تک نہ رینگتی۔ اسی بات پر وہ جھلا اٹھتا اور بات بے بات اسکو جھڑک دیتا۔ لیکن جب پیلے پیلے پھولوں پر شبنم کی بوندیں رینگنے لگتیں تو وہ ان بھیگے ہوئے پھولوں کو اپنے میلے دبیز کوٹ کے لمبے لمبے کالروں میں چھپا کر خود بھی رونے لگتا ——— کیونکہ شبنم کی بوندوں سے دُھل کر ان پھولوں کی زردی خطرناک حد تک نکھر جاتی۔

مگر وہ مایوس نہیں تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی بہن کے دولھا کو خوابوں، تصورات اور خلاؤں سے گھسیٹ کر اسی دھرتی پر لے آئیگا ——— کیونکہ دولھے بڑے لالچی ہوتے ہیں پھول خواہ کتنا ہی معمولی اور پیلا کیوں نہ ہو۔ اگر اس کو سونے اور چاندی کے گلدان میں رکھ کر پیش کر دو تو دولھا آنکھ بند کر کے وہ گلدان لے لیتے ہیں ..... اسی لئے وہ کلرکی کے علاوہ اخباروں اور رسالوں کے دفاتر میں بھی آدھی آدھی رات تک کام کرنے لگا۔ اس کی آمدنی بڑھنے لگی۔ پچاس روپیہ۔ ساٹھ روپیہ۔ ستر روپیہ۔

صبح بالوں میں کنگھا کرتے وقت وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھتا کہ آدھی آدھی رات تک کام کرنے سے اس کے اپنے گالوں کے سُرخ ڈورے دھندلا پڑ رہے ہیں۔ لیکن اب اس کو ان سُرخ ڈوروں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ یہی سُرخ ڈورے اس کی بہن کے رخساروں میں داخل ہو جائیں۔ اور بس ——— اور اگر یہ نہیں ہو سکا۔ تو وہ اپنی بہن کو سونے اور چاندی کے جگمگ جگمگ کرتے زیوروں سے ایسا سجائے گا کہ اجرا، چوتھا، زہرہ، شیلا اور سعیدہ کے دولھوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ وہ اپنے بے معنی فضول مسکرانے والے سُرخ گالوں سے متنفر ہو جائیں گے۔ اور جب شہر کی سڑکوں پر سے دولھا اس کی بہن کے گلے میں پڑے ہوئے جڑاؤ ہار کو پکڑے اسکو باجوں ڈھولوں اور تاشوں کے شور اور گیس لیمپوں کی سپید چمک دار روشنی میں فاتحانہ انداز میں کھینچے لئے جائے گا تو وہ ہاتھ مل مل کر اپنی جلد بازی، اپنی بیوقوفی اور اپنی حماقت پر پچھتاتے رہیں گے۔

جس مہینے اس کی آمدنی پچاسی روپے ہو گئی۔ اس کے گالوں کے شفق بالکل ہی ڈوب گئی۔ اب اس کے چہرے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی زرد رنگ کے شیشوں والی کھڑکی سے منعکس ہوتی ہوئی روشنی میں کھڑا ہے۔ اس کے دوست احباب جب اس کے پیلے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتے تو کڑوا کڑوا مذاق کرتے۔

"علاج کرا ڈالو اپنا۔ کوئی لڑکی تم سے شادی کرنا پسند نہ کرے گی"۔

"جوانی سارے عورت بغیر ہی گذر جائے گی"۔

وہ مسکرا دیتا۔ اب اُس کے ہونٹ بہت مسکرانے لگے تھے۔ بار بار مسکراتے تھے۔ ایک مہینے میں اس کو پچاسی روپے ملتے تھے اور وہ پچاسی دفعہ مسکراتا تھا۔

"ارے کوئی لڑکی شادی نہ کرے۔ اس کی بلا سے۔ جوانی صرف عورت کے آغوش میں گزار دینے کے لئے تو نہیں ہے۔ جوانی مجلۂ عروسی اور عورت کی خلوتوں میں بسر کرنے کے لئے تو عطا نہیں ہوئی۔ جوانی تو الف لیلیٰ کے سوداگروں کی طرح اتال پتال چھاننے کے لئے ہے"۔

اور پھر یہ جملے وہ اپنے دل ہی دل میں چپکے چپکے کہتا۔

"جوانی، زندگی سے لڑنے کے لئے ہے۔ اپنی جوان بہنوں کی مانگ میں سہاگ کی افشاں بھرنے کے لئے ہے۔ ان کے شرمیلے، لالچی رنگ و بو پہ جان دینے والے دولھوں کو

آسمان سے دھرتی پر گھسیٹ لانے کے لئے ہے ——— میں جو اپنی بہن کا مجلہ عروسی بناؤں گا - وہ تاج محل سے زیادہ شاندار ہوگا "

چند ہی مہینوں بعد وہ صوم و صلوٰۃ سے روپے ایک مہینے میں کمانے لگا۔ صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی - جان عزیز نہ رہی تھی لیکن وہ اندھا دھند دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے میں روپوں کے پیچھے دوڑتا رہا۔ اپنی نیند میں، اپنے تصور کے جزیرے اپنے پہلے اور اپنی جوانی ——— یعنی برمیں جہاں کو بھی بھول گیا۔ اس کی برمیں جہاں۔ جس سے اس کو ایک دبی دبی ڈھکی چھپی اور چور محبت تھی ——— جس کی بڑی بڑی آنکھوں سے نکلے ہوئے تیروں نے اس کے ننھے سے دل میں بیشمار آنکھیں پیدا کر دی تھیں۔

ایک دن وہ بہت تھکا ہارا گھر لوٹا - اور چارپائی پر گر کر بری طرح کھانسنے لگا۔ اس کی بہن نے اس کے جوتے کے قسمے کھولے اس کا میلا دبیز کوٹ اتارا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر نیلگری کے تیل سے اس کے سینے کی مالش کرنے لگی۔ اس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اپنی بے زبان محبوبہ بہن کے پیلے پیلے، افسردگی سے کملائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری اچھی گڑیا ——— باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو کیا ہوا میں اب اپنے سائے میں تیرے ہاتھوں کو ایسی لال لال مہندی سے رنگ دوں گا۔ کہ تو ..... ہاں تو جا اسی بات پر میرے لئے اچھی سی چائے بنا لا "

بہن ایک حزن بھری مسکراہٹ سے منہ چھپا کر چلی گئی۔ اپنے بھائی کی یہ حالت دیکھ کر اپنے ہاتھوں کو مہندی سے رنگنے دیکھنے سے بالکل ہی مایوس ہو گئی تھی۔

مسرت کے موقع پر عقل کہاں چلی جاتی ہے! وہ اپنے سائے کا اپنے باپ کے سائے سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کا باپ تو کھاتے پیتے پرانے ہندوستان کا ایک بھاری بھرکم انسان تھا۔ چھ فٹ لمبا تین فٹ چوڑا۔ اور اس کی آمدنی بیٹے کی آمدنی سے چھ گنی زیادہ تھی۔ اس کے سائے میں تو اٹھارہ انسانوں کا ایک خاندان پل رہا تھا۔ کئی غریب رشتہ دار عورتوں کے آنچل میں سوہاگ کی افشاں چنی گئی تھی ——— اب یہ ڈینگیں مارنے والا پٹڑیوں کا لمبا ہی لمبا ڈھیر۔ میلا دبیز کوٹ آدھ دینے پر اس کا سایہ ٹیلیفون کے کھمبے کی طرح اتنا پتلا اور منحنی تھا۔ کہ ایک ہی دبلی پتلی نرم و نازک بہن جوانی کی دھوپ اور حدت سے نہیں بچتی تھی۔ وہ تو اس دھوپ میں جیسے جل رہی تھی۔ ابل رہی تھی۔ بالکل اس دیگچی کی طرح جس میں پکتے ہوئے چائے کے پانی کو ابال آ رہا ہو ——— ہاں جب وہ روپوں سے پھولی ہوئی جیبوں والا دبیز کوٹ پہنتی تو اس کے بڑے بڑے کالروں میں منہ چھپا کر جوانی، حدت، دھوپ سبھی کچھ بھول جاتی تھی۔

بھائی کی دن بہ دن گرتی ہوئی صحت اور سوکھتے ہوئے جسم کو دیکھ کر بہن نے آخر جی کڑا کر کے شرم کی کینچلی اتار کر پھینکتے ہوئے ایک دن کہہ دیا۔

"بھیا ——— آپ کی زندگی سے میری زندگی ہے۔ آپ پر سے میری جیسی ہزار بہنیں وار کر کے پھینکی جا سکتی ہیں۔ آپ میرے لئے کیوں اپنی زندگی اپنی جوانی اس طرح برباد کر رہے ہیں۔ مجھے آپ جیسے پیارے بھائی کے لئے ..... میں بڑی آرام اور چین کی زندگی حاصل ہے۔ میں کہیں اور جانا نہیں چاہتی۔ میں ..... میں شادی بھی نہیں کرنا چاہتی ——— ہاں آپ شادی کر لیجئے۔ گلاب کے پھول جیسی بھابھی بیاہ لائیے۔ میں آپ دونوں کی خدمت میں ہنستے مسکراتے زندگی گزار دوں گی جبھی آپ دونوں کے ہوتے مجھے شادی کی کیا ضرورت ہے "

اس نے اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں پر محبت کی لطافت سے گرگدایا، تو ایک نرم طمانچہ لگاتے ہوئے کہا۔

"پگلی ——— میں جانتا ہوں کہ تو کتنی پیاری ہے۔ کہ تیرے جسم میں لہو کی بہت معتدبہ بوندیں ہیں۔ ان بوندوں میں کبھی کا طوفان پیدا نہ ہوگا۔ تو چاہے یا نہ چاہے لیکن دنیا اور دنیا والوں کے لئے تیری شادی کی بہت ضرورت ہے۔ ورنہ اگر تو مصلیٰ پر بیٹھ کر بھی قسم کھائے تو بھی کوئی تیری پاکدامنی کا یقین نہ کرے گا "

اُس نے بھی جی کڑا کر کے ترم کو بالائے طاق رکھ کے کہہ دیا۔ اس وقت اس کے جی میں آئی کہ یہ بھی کہہ دے "تو جھوٹی ہے۔ مجھے شادی کی ضرورت ہے میں خود ہر رات تیری چارپائی سے اٹھتی ہوئی دبی دبی سسکیاں سنتا ہوں۔ بیشمار کروٹوں سے چرچراتی ہوئی چارپائی سے تیری پاسی جوانی کی چیخیں سنتا ہوں۔ مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کر۔ تو نے صرف یہ گھر کی چار دیواری دیکھی۔ مگر میں نے تو بہت بڑی دنیا دیکھی ہے۔ اٹھائیسویں برس میں سر میں سپید بال گردن میں جھکاؤ۔ اور آنکھوں میں یاسیت کا دھندلکا ..... یہ کیا ہے؟ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ تو تو صرف چوبیس برس کی ایک کنواری ہے۔"

پھر اس کی زندگی میں ایک بڑا ہی چمکیلا دن طلوع ہوا۔ اپنی بہن کو سر سے پاؤں تک سونے اور چاندی کے زیورات سے جگمگا دیا۔ اس کی مانگ کو کہکشاں سے زیادہ چمکیلا بنا کر سنوارا۔ اس کی ہتھیلیوں میں ایسی سرخ سرخ مہندی لگائی کہ شفق تک شرما کر پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گئی۔ سبز رنگ کی سلمیٰ ستارا ٹنکی ہوئی بنارسی ساڑھی اور سونے کے پیلے پیلے چمکتے زیور ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے سبز رنگ کے گلدان پر پرانے ہندوستان کے کسی مشہور نقاش نے بڑے فن کارانہ انداز سے منبت کاری کی ہو۔ اور اس میں گیندے کا ایک پیلا پیلا پھول شرما رہا ہو ..... اس پھول کی پتیاں شبنم کی لاتعداد بوندوں سے بھیگ رہی تھیں وہ خود بھی روتا ہوا مصنوعی خوشی سے مسکراتے ہوئے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے دلاسا دے رہا تھا۔ "ارے ——— دلہنیں روتی ہیں ——— کہیں روتی ہیں ——؟ ہونہہ"

اور تاشوں، فلیریوں، ڈھولوں کا شور فضاؤں میں بلند ہو ہو کر اس پر ٹھٹھے لگا رہا تھا۔ کہ دیکھو ——— یہ آنسو پونچھنے والا خود بھی تو آنسو بہا رہا ہے۔ ہا ہا ہا ..... ڈھم ڈھم۔ پیں پیں۔ پیں پیں۔ تررر رت۔ تررر تر ....

بہن کے چلے جانے کے بعد اس کی زندگی اس کا گھر سبھی سنسان پڑ گیا تھا۔ اس کی بہن کی چارپائی اب چپ چاپ اکیلی پڑی رہتی۔ وہ اب آہیں نہیں بھرتی تھی۔ اور نہ اس سے کسی پاسی جوانی کی چرچراتی ہوئی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ وہ اب ہوٹلوں میں کھانا کھا رہا تھا۔ کسی دیگچی میں ابال ہی نہ آتا تھا۔ مگر ہاں اس کی گردن اب پھر سے اونچی ہو گئی تھی۔ کتنے سال سے اس کی بہن کی وزنی جوانی اس کے گلے میں بانہیں ڈالے جھول رہی تھی۔ اب تو بوجھ اُتر گیا تھا۔ وہ فخر سے گردن اٹھا کر سڑکوں پر چلتا تھا۔ بات بات پر گردن پیچھے پھینک پھینک کر قہقہے لگاتا تھا۔ کتنے عرصے سے اس کے قہقہے اس کے حلق میں رُکے ہوئے تھے۔ لحافظ تھے۔ اب وہ شاذ و نادر ہی زمین کی طرف دیکھتا۔ اب اس کو زمین کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جتنا سونا چاندی اور روپیہ پیسہ اس کی بہن کی شادی کے لئے ضروری تھا اُس نے زمین کے حلق میں انگلی ڈال کر سب اگلوا لیا تھا۔

اب وہ دن میں ایک بار ضرور اپنی بہن کو دیکھنے اس کی سسرال چلا جاتا۔ اور نہایت مصروف گھر لوٹتا۔ کہ بہن کے گالوں میں گلاب کی سُرخ سُرخ کلیاں نمودار ہو رہی ہیں۔ آج کل یا پھر میں یہ کلیاں کھل کر بڑے بڑے لال لال پھول بن جائیں گی۔ اور اس کا دولھا ان پھولوں کے گرد مست مخمور اور مسرور بھنورے کی طرح منڈلایا کرے گا۔ اس مزیدار خیال سے خوش ہو کر سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے وہ آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا جیسے وہ تنہا فاتح ہے۔ جیسے نہ آسمان شکست دے سکا۔ اور نہ زندگی۔ البتہ اس کو ساری زندگی میں صرف ایک دُکھ تھا کہ وہ بربھیس جہاں کو اپنا نہ بنا سکا۔ اگرچہ بربھیس جہاں ابھی تک کنواری تھی۔ لیکن اس کا کنوارپن ایک بڑی رقم تھا جس کو چکانے کے لئے چند خاص خاص شرائط مقرر تھے۔ آصف نے بربھیس جہاں کے باپ کو اس کے بے تکلف دوستوں اور عزیزوں سے کہلا بھیجا۔ کہ وہ بربھیس سے محبت کرتا ہے۔ بربھیس کے باپ نے جواب دیا کہ شادی کے لئے محبت اتنی اہم نہیں۔ بیوی کو اچھا مکان اچھی غذا، اچھے کپڑے زیادہ ضروری ہیں ——— آصف کے رقیب، نیلام کی بولی لگا رہے تھے۔

"میرے تین مکانات ہیں۔ وہ تینوں بربھیس کے نام لکھ دوں گا۔"

"میری آمدنی چار سو روپیہ ماہانہ ہے۔"

"میری جواہرات کی دوکان ہے۔ برجیس ساری عمر جگمگاتی رہے گی۔"

"میری دو موٹریں ہیں۔ برجیس کو دنیا جہاں کی سیر کراؤں گا۔"

"میری پنشن پندرہ سو روپیہ ماہانہ ہے۔ میں برجیس کو کشمیر کی جنت میں لے جاؤں گا۔"

آصف ہار گیا۔ اسی کے دفتر میں ہیڈ کلرک نے وہ ٹرافی جیت لی۔ آصف کی جان تمنا جیت لی۔

محبوبہ کے چھن جانے کے بعد آصف کو کسی دوسری محبوبہ کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ اس کی جوانی کے خلاء میں اس کو اتنا سناٹا، سکوت اور ڈر محسوس ہوتا کہ اس کا جی چاہتا کہ اس مہیب سناٹے میں دفعتاً کانچ کی چوڑیاں بجنے لگیں۔ پازیب کی میٹھی میٹھی جھنکار پیدا ہو۔ دوپٹے سرسرانے لگیں۔ پھر پھر پھر پھر ——— محبوبہ نہیں سہی کوئی عورت ہی سہی جو اس کی زندگی میں مہمان کی طرح ہی کیوں نہ آ جائے۔

اور جلد ہی ایک عورت اسے مل گئی۔ شہر میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے کے لئے ایک مشن آیا ہوا تھا۔ اس میں بہت سی لال پریاں تھیں۔ ان کے جسم جیسے سپید سپید شمیشوں سے بنائے گئے تھے اور اندر گلرائس رنگ بھر دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے بھورے لوگوں کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنے اپنے ویران راستوں جیسے مذاہب کو چھوڑ کر اس شاہراہ پر چلنے لگے۔ جہاں قدم قدم پر ہوٹلیں اور سرائیں لگی ہوئی تھیں۔ کھانا پینا ——— روپیہ پیسہ عورتیں۔ آصف کو ان نعمتوں میں صرف ایک ہی نعمت چاہئے تھی ..... مس فاکس۔

واللہ کیا عورت تھی مس فاکس! پہلی بار آصف نے اس کو امپریل پوسٹ آفس سے نکلتے دیکھا تھا۔ بھرا بھرا جسم۔ لمبا قد۔ اور اس کے متعدد تے اس کو رنگنے ہیں۔ جیسے سارا گلابی رنگ صرف کر دیا تھا۔ اس کے گالوں پر میٹھے نیبوں کے ہلکے شیڈ کے کیسلے ٹماٹر تھے۔ پوسٹ آفس سے نکلکر جب وہ اپنی سائیکل پر چڑھ رہی تھی تو اس کی پنڈلیوں کی تھرکتی ہوئی لال لال مچھلیوں کو دیکھ کر اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ زندہ ہے۔ وہ مر گیا ہے وہ مر گیا ہے۔ وہ زندہ ہے ....

اس نے قومی تعصب کو دل ہی دل میں دھتکار بتائی اور ایک صاف دل سے اعتراف کرنے لگا کہ واقعی دنیا کے دوسرے ملکوں نے عورت کی اصلی قدر جانی پہچانی ہے۔ یہاں ہندوستان میں تو عورت کی مٹی پلید ہو گئی۔ اس مٹی کو تو صرف گیندے، زعفران، بنفشے اور سورج مکھی کے پھول ہی اچھے آتے ہیں۔

دوسرے تیسرے ہی دن اس نے مس فاکس سے راہ و رسم بڑھائی اور جوانی پھر لوٹ آئی۔ وہ اب اپنی بہن کو بہت کم یاد کرنے لگا۔ گلاب کا پھول سامنے ہو تو گیندا کون یاد آتا ہے؟

ایک دن مس فاکس آرکسٹرا پر ایک المیہ فراق گیت الاپ رہی تھی۔ اور آصف اس شاعر کو جس نے ایسا گیت لکھا۔ دل ہی دل میں کوستا ہوا چپ چاپ سن رہا تھا کہ اچانک اس کو گیندے کا پھول یاد آ گیا ——— کیونکہ دروازے سے اس کی بہن کا لالچی شوہر داخل ہوا۔ اور پھر آصف کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ رکا، جھجکا۔ لیکن جب مس فاکس مسکراتے ہوئے اس کو بلانے لگی۔ تو آصف صوفہ سے اٹھ کھڑا ہوا مس فاکس آصف کے بدلتے تیور دیکھ کر ہنس پڑی۔ یعنی" ..... وہ تو روز یہاں آتا ہے"

اسی شام وہ اپنی بہن کے گھر گیا۔ اس نے اس سے ایک لفظ نہ پوچھا۔ سگریٹ پیتا رہا۔ اور اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ جو بار بار ہلکی سی کپکپاہٹ سے تھم جاتے تھے۔ اس کی جھکی جھکی پلکیں اور پلکوں کی گھنیری چھاؤں میں کانپتے ہوئے تارے دیکھے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے انہی گالوں پر اس نے سرخ سرخ لکیروں کا ایک جال بنتے دیکھا تھا۔ آج وہ جال ..... اوہ! عورت کا رنگ بھی کیسا تغیر پذیر، کیسا بے اعتبار، کیسا ناپائدار اور کیسا عارضی ہوتا ہے۔!

جب وہ گھر پہنچا تو اس کا دماغ ایک دم ساکت ہو گیا تھا۔ اس کو اب کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہنس رہا ہے تو کیوں ہنس رہا ہے۔ رو

رہا ہے تو کیوں رو رہا ہے۔ اب شاید اس احساس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ زندگی نے اس کے ہڈیاں نکلے ہوئے سینے پہ ایسا زبردست گھونسا لگایا تھا کہ وہ تین دن تک چارپائی سے نہ اٹھ سکا۔ کھانستا رہا۔ بال نوچ نوچ کر روتا رہا۔ کبھی ہنستا رہا۔ اور چوتھے دن جانے کیا اس کے جی میں سمائی اپنا پرانا رفیق وہی میلا ویسا کوٹ پہنے باہر نکلا۔ اس کی آنکھوں میں سُرخ سُرخ شعلے لپک رہے تھے جیسے کسی کو بھسم ہی کر دیں گے۔

چینی ریستوران کے چوراہے پہ بکھری ہوئی شام اپنا سفید بھیگا ہوا دوپٹہ پھیلائے کھڑی تھی۔ وہ بس اسٹاپ کے ستون سے کندھا ٹیکے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر توڑ رہا تھا۔ اور ہر آنے جانے والے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا ——————— ایک بھاری بھرکم۔ پنجابی عورت کو اپنے دبلے پتلے منحنی پستہ قد شوہر کے ساتھ جھک جھک کر باتیں کرتا دیکھ کر تو وہ بڑے زور سے ہنس پڑا۔ پنجابی عورت خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے شوہر کا غصہ رفع کرنے لگی ——————— "کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ہُوں" وہ ان کے قریب جا کر کہنے لگا۔

"نہیں نہیں ——————— میں پاگل نہیں ہوں پاگل تو گاندھی ہے۔ نہیں جناح پاگل ہے ——————— نہیں فقیر ایپی پاگل ہے۔ وہ مزدوری کرتا ہے۔ ہُو ہُو ہُو۔

پنجابی عورت چونکا ہے ہو کھڑے ہوئے پولیس مین کو دیکھنے لگی اور اس اثنا میں سامنے سے مس فاکس سائیکل پر آتی دکھائی دی اور آصف نے ٹارلنگ حسینہ۔ تیز انتظار کب سے تھا۔ کہتا ہوا اُس کی طرف بڑھا وہ بھی اس کو دیکھ کہ مسکراتی ہوئی سائیکل پہ سے اتر پڑی۔ پھر جانے کیا ہوا۔۔۔

چینی ریستوران کا سارا چوڑا غضب ناک چیخوں سے گونج رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مار ڈالا۔ ہاں مار ڈالا۔ خون۔ دوڑو پکڑو۔ پکڑو۔ مارو۔ مارو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جب چیخیں مدھم ہو کر بھنبھنانے لگیں تو آسمان کے چھلے ستارے نے دیکھا کہ مس فاکس خون میں لتھڑی سنٹ روڈ پہ پڑی ہوئی تھی۔ اور خون کی دھاریں اس کی مرمریں لمبی تتلی دلآویز گردن سے نکل نکل کر بہہ رہی تھیں۔ آصف کو دو سپاہیوں نے پکڑ رکھا تھا۔ اور وہ اپنا خونی خنجر فضا میں اٹھائے چیخ رہا تھا۔

"دیکھو! سارا چوڑا ہوا خون بہہ رہا ہے۔ اب میری بہن کے رخساروں پر گلابی رنگ کے پھول کبھی نہ کھلیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں اہل وطن۔ سارا چوڑا ہوا خون ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے مس فاکس کو مار ڈالا ہے اپنی ہونی کو مار ڈالا ہے۔ ہاں اہل وطن"

پولیس انسپکٹر آصف کو گرفتاریاں دے رہا تھا۔ اور لوگوں کی چہ چہ ——————— چہ چہ نہ ہائیں چل رہی تھیں۔

"واہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑا بہادر ہے ۔ ۔ ۔ عورت کو مار ڈالا"

"پاگل معلوم ہوتا ہے کوئی"

"رہا ہے رقابت ——— شاید کوئی شاعر بولا۔

"اجی کوئی انقلابی معلوم ہوتا ہے" شاید کوئی کلرک بولا۔

"کہتے ان نکمے انقلابیوں کی وجہ سے ہی ولیس کو آزادی نہیں ملتی" شاید کوئی بنیا بولا۔

پولیس انسپکٹر ہتھکڑی کے رسّے سے کانپتی ہوئی آواز میں اسے گرفتاری دیتے ہوئے بول رہا تھا "بدمعاش۔ ذلیل کمینہ ۔ ۔ ۔ ۔"

آصف چیخ رہا تھا۔

مار ڈالا ہے۔ اپنی برائی کو مار ڈالا ہے۔ سارا چوڑا ہوا خون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مس فاکس کو مار ڈالا ہے"

سپاہی گرفتاری دے دے کر اس کو اسکوٹر ڈاسٹر بیٹ پر دھکیلتے لے جانے لگے۔

"ہاں اہل وطن ۔ ۔ ۔"

قدرت اللہ شہاب

سردار جسونت سنگھ

راجہ بازار کے عقب میں گوردوارہ ردمر صاحب کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اندرونی دالان میں دسویں پادشاہ سری گوروگوبند سنگھ کلغی والے کا گرپرب منانے کے لئے دیوان لگا ہوا تھا' اور بیرونی صحن اور گوردوارہ کے آس پاس ساری کھلی جگہوں میں راولپنڈی اور راولپنڈی کے مضافات کی بیشتر خالصہ آبادی سنگھ سبھا سمنا رہی تھی۔ کہوٹہ، مری، گوجرخان، چکوال اور پنجا ڑنک سے لوگ جوق در جوق آئے ہوئے تھے اور صبح سے راولپنڈی کے کوچہ و بازار چوڑی چھاتیوں والے کڑیل جوانوں اور رنگ برنگ روپٹوں والی خوبصورت، صحت مند عورتوں کی ٹولیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

ہر گاؤں کی اپنی اپنی الگ ٹولی تھی اور برادری کا کوئی بڑا بزرگ اس کی قیادت کر رہا تھا۔ اسی ایک ٹولی میں ماں باپ تھے' میاں بیوی تھے' بھائی بہن تھے، عاشق معشوق تھے ——— اور پھر بچے تھے۔ خوبصورت' صحت مند' چاق و چوبند بچے جو راہ چلتے چوکڑیاں بھرتے تھے' قلابازیاں لگاتے تھے، بگڑے بناتے تھے' بھنگڑا گاتے تھے اور اپنی چھوٹی چھوٹی لاٹھیاں ہوا میں اچھال کر "جو بولے سو نہال ——— ست سری اکال" کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔

جوانوں نے سفید، نسواری اور نیلے لٹھے کے تہ بند پہنے ہوئے تھے' گھٹنوں تک لمبی برسکی کی دھاری دار قمیص۔ اس پر مخملی، ریشمی یا گبرون کی شرخ واسکٹیں، سیپ کے بٹنوں کی قطاریں، جیبوں میں سے دو دو بالشت باہر لٹکتے ہوئے رومال، سر پر رنگ برنگے صافے' آنکھوں میں سُرمہ' ہاتھوں میں لمبی لمبی چمکتی ہوئی سمدار لاٹھیاں' کسی نے تہ بند کی گانٹھ میں چھپائی ہوئی شراب کی بوتل یا ٹھرے کا ادھا۔ عورتوں نے اخروٹ کے چھلکے مل مل کر اپنے ہونٹ کبوتر کے خون کی طرح سُرخ کئے ہوئے تھے' ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی موٹی موٹی لکیریں اور دھوپ میں پاپیادہ چلنے کی وجہ سے گالوں میں تمتماتے ہوئے سُرخ سُرخ انگارے ان کے لباس کی ندرت برق بجلرک کے ساتھ مل کر رنگ اور نور کی پھلجھڑیاں سی پیدا کر رہے تھے۔

گوردوارہ ردمر صاحب کے باہر سنگھ سبھا میں پہنچ کر گاؤں کی ٹولیوں کی وسعت بندی قائم نہیں رہتی تھی۔ جیالے، چنڈول، کشتی کے اکھاڑے

دو پیسے میں بارہ من کی دھوبن اور پنگالے کا جادو دکھانے والے مداری، ایک آنے میں "جوان عاشق حرف بہرام" دکھانے والے تھیٹر، دو آنے میں تین تصویریں کھینچنے والے فوٹوگرافر، چار آنے میں کھڑے ہوئے محبوب سے ملانے والے نجومی ——— کنگھیوں، آئینوں، رومالوں، حلوا ٹکیوں، ہری چڑیوں اور چاٹ والوں کی دکانیں ——— یہ سب اپنی کشش سے گاؤں کی بندھی بندھائی ٹولیوں کو تتر بتر کر دیتے تھے اور کچھ عرصہ کے لئے اس ہجوم میں سے پانی کی ہر پریشان لہر اپنی سطح کو پا لیتی تھی ——— اور پھر رفتہ رفتہ یہ ساری بکھری ہوئی لڑیاں اپنے مرکز پر اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ ہر مرکز گورداوارہ صاحب کے اندرونی دالان میں تھا جہاں ایک زرکار شامیانہ کے نیچے گرنتھ صاحب مخملی غلافوں اور تکیوں کے درمیان رکھا ہوا تھا۔ گرنتھی انوپ سنگھ برابر کبھی دائیں کبھی بائیں ہاتھ سے سفید گھوڑے کی دم سے بنائی ہوئی چوری جھل رہا تھا اور سامنے ایک طرف مرد اور دوسری طرف عورتیں دیوان میں سنگت سجائے بیٹھی تھیں۔

عورتوں کی سنگت میں گاؤں کی بھری بھری، گدری گدری لڑکیاں بھی تھیں جن کے چہرے کچے ناریل کے گودے کی طرح نکھرے ہوئے تھے اور جن کے تن بدن سے سینٹ یا عطر کی جگہ صرف جوانی کی مہکار آتی تھی۔ کالجوں میں پڑھنے والی شہر کی چھوکریاں بھی تھیں جنہوں نے اپنے خوشاوں پر غازے اور پاؤڈر، سرخی اور سرمے کی نوکدار پنسلوں کی مدد سے عجیب و غریب سنگار کئے ہوئے تھے۔ ان کے اجسام سے جوان خون کی جگہ مصنوعی عطریات اور سینٹوں کی خوشبوئیں آ رہی تھیں اور انہوں نے اپنی زلفوں کی سیاہ ناگنیں کڑاکن کی جگہ مشینوں کے کاڑھے ہوئے کنڈل بنوائے ہوئے تھے، اسی شان میں حسن ابدال کی بڑی سردارنی آسند کور گھنٹوں سے لدی بیٹھی تھی۔ اس کے ارد گرد اس کی چاروں لڑکیاں تھیں انہوں نے الگ الگ رنگ کی بنارسی ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کی انگوٹھیاں، کانوں کی بالیاں، کلائی گھڑیوں کی پٹیاں، سینڈل اور ہینڈ بیگ بھی ساڑھیوں کے ہم رنگ تھے۔ رات کے آٹھ بجے بھی انہوں نے آنکھوں پر تازہ فیشن کے سیاہ چشمے آویزاں کئے ہوئے تھے تاکہ کالے نیشنوں کے مقابلے میں ان کے گورے رنگ اور بھی زیادہ نکھرے ہوئے نظر آئیں اور پنڈال میں جگمگاتی ہوئی بجلیوں کی روشنی ان کی نازک آنکھوں پر گراں نہ گزرے۔ جب یہ لڑکیاں لاہور میں ہوں تو انہیں بلا ناغہ گانے، ناچنے، بندوق کا نشانہ لگانے، تیرنے اور پڑھنے لکھنے کے سوا باقی تمام فنون لطیفہ کے مقابلوں میں اول انعام ملا کرتے تھے۔ جب وہ چھٹیاں گزارنے حسن ابدال آتیں تو راولپنڈی کروہ مری اور ایبٹ آباد سے سہیلیوں کو اکٹھا کر کے دیہات سدھار کے پروگرام بنتے تھے۔ کہیں نائٹ سکول کھل رہا ہے، کہیں بچوں کو نہلانے کا دن منایا جا رہا ہے، کہیں صفائی کا ہفتہ، کہیں پھولوں، پھلوں یا سبزیوں کی نمائش ہے، ان گرناگوں مشاغل سے تھک کر کبھی کبھی چاندنی راتوں میں مون لائٹ پک نک ہوتی تھی اور یہ نازک اندام خواتین سیاہ چشمے لگائے، ٹکی پھکی خوبصورت چمڑیاں تان کر اپنے جسم کو چاندنی کی کرنوں سے بچائے چہل قدمی کو نکلا کرتی تھیں ———

گورد وارہ دمدمہ صاحب کے دالان میں نہ تو لاہور کی رقص گاہوں کی نفاست تھی اور نہ ہی چاندنی رات میں حسن ابدال کے مرغزاروں کی پاکیزہ لطافت، بلکہ یہاں تو ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے اجسام سے بہتے ہوئے پسینے کی بو چھائی ہوئی تھی اور اس فضا میں حسن ابدال کی بڑی سردارنی کی چاروں بیٹیوں کا دم بری طرح گھٹ رہا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بڑی سردارنی اپنے سامنے رکھے ہوئے چاندی کے بکس میں سے کبھی الائچی کبھی سپاری، کبھی پیپرمنٹ کی ٹکیاں اور کبھی روح کیوڑہ اور عرق گلاب میں بھگوئے ہوئے منقے نکال کر چاروں بیٹیوں میں تقسیم کرتی تھی۔ لیکن ان مفرح اشیاء سے کوئی چیز بھی ان کو تسکین پہنچانے میں کامیاب نہ ہوتی تھی۔ بڑی سردارنی خود اپنے ہاتھ سے باری باری ان کے چہروں پر صندل کے بنے ہوئے ہلکے پھلکے پنکھے سے ہوا کرتی تھی۔ یہ پنکھا میسور سے اس نے خاص طور پر بنوایا تھا اور اس کی ہر جنبش کے ساتھ فضا میں صندل کی مشام نواز مہک پھیل جاتی تھی۔ لیکن بڑی سردارنی کی نازک اندام بیٹیاں جس تکلیف میں مبتلا تھیں، اس میں صندل کی مسیحائی بھی کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔

عورتیں تو خیر نازک مزاجی کے اس مظاہرے پر ناک بھوں چڑھانے کے علاوہ اور کیا کرتیں لیکن مردوں کے دل اس تکلف کو دیکھ کر بہت بے چین تھے۔ گیانی نرائن سنگھ اور اس کے ساتھی بڑے سوز و گداز سے ایک المناک شبد الاپ رہے تھے جس کا مفہوم یہ تھا کہ اے گرو کے بیٹو! اپنے سارے دکھ مجھے دو اور میرے سارے سکھ تم لے لو۔ اگر تمہیں کانٹا چبھے تو میرے سینے میں تلوار مار دو، اگر تمہیں ٹھوکر لگے تو مجھے زندہ زمین میں گاڑ دو۔ اگر تمہیں ذرا سی آنچ آئے تو مجھے آگ میں پھینک کر جلا ڈالو۔ اے گرو کے صاحبزادو.....؟

عورتوں کی آنکھیں اس شبد کو گاتے گاتے نمناک تھیں۔ ان کے سینے میں عقیدت اور محبوبیت اور قربانی کے جذبات بڑی شدت سے موجزن ہو رہے تھے۔ ایک ہاتھ سے وہ آنچل سے آنسو پونچھتی جا رہی تھیں اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سینے کا تلاطم تھامے بڑی نم ناک لے میں شبد کے بول گا رہی تھیں۔ مردوں پر بھی رقت طاری تھی لیکن ان میں سے اکثر گرو کے بیٹوں کی جگہ حسن ابدال کی بڑی سردارنی کی صاحبزادیوں کے حضور میں اپنی قربانیوں کی بھینٹ چڑھا رہے تھے۔

گاؤں کے لمبے لمبے چوڑے چوڑے کڑیل جوان ان شبدوں کی لے میں اپنے دل پسند "ماہیا" کے روپ گنگنا رہے تھے:

اے حسین و شیرہ!
اگر اس چار دیواری میں نیرا دم گھٹتا ہے
تو میرے ساتھ بھاگ چل
میں تجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کے
بہت دور لے جاؤں گا
کھجوروں کے جھنڈ میں
چنے کے سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے پاس.....
اے نازک اندام و شیرہ!.....
اگر تیرے پیسے کے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہیں
تو رات کے وقت چوری چوری میرے کنوئیں پر آ جا
وہاں میں نے بڑے خوبصورت جال بچھائے ہوئے ہیں
جو جنگلی کبوتر ایک دفعہ زیر دام آیا
وہ پھر واپس نہیں گیا.....

.....

شہر کے نوجوان بھی اپنے دل میں کچھ ایسے ہی ارادے رکھتے تھے لیکن کھجوروں کے جھنڈ، چنے کے سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت اور رات کے وقت چوری چوری جہاں چلتے ہوئے ہٹ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے وہ بڑی سردارنی کی چاروں بیٹیوں کو ڈلہوزی روڈ، لال کرتی یا راجہ بازار کے کسی ریسٹوران میں لے جانے کی آرزو پر ہی قناعت کرتے تھے جہاں بلوری میزوں کے گرد بیٹھ کر وہ پنکھوں کی ہوا میں، لیمونیڈ، آئس کریم، سوڈا، روز اور وہٹو کا آرڈر دیں اور بہاتے ہوئے گلاسوں کا لمس ان خوبصورت ہونٹوں کو تازگی بخش دے، جو اس گرمی میں گلاب کی پتیوں کی طرح خشک ہو کر مرجھائے جا رہے تھے ——— البتہ سردار جسونت سنگھ کو یہ تشویش تھی کہ اس کم بخت شہر راولپنڈی میں ایک بھی ایسا کار ریسٹوران نہیں جس میں انسان لڑکیوں کو بلا پس و پیش لے جائے اور اگر اور نہیں تو کم از کم دو چار ڈانس ہی مار لے۔ ولایت سے آنے کے بعد وہ خالی شربت یا لیمونیڈ یا آئس کریم پر عیش مٹانے

کا قائل نہیں رہا تھا۔ اس معاملہ میں اب وہ ضرورت سے زیادہ نرقی پسند ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب کبھی اس کا کسی لڑکی سے سامنا ہوتا تو اس کے دل میں پہلی امنگ یہ اٹھتی کہ ہاتھ جوڑ کر "ست سری اکال" کہنے کی بجائے وہ اس کے ساتھ مسکرا کر ہاتھ ملائے، سینما لے جا کر شانہ سے شانہ بھڑا کر بیٹھے اور پھر کسی ریسٹوران میں کھانا کھلائے، ڈانس کرے ..... راولپنڈی میں سینما تو تھے لیکن شائقوں کی کمی تھی اور ریسٹوران تو گویا ہوتے ہی نہ تھے کے برابر تھے۔ ابھی چند برس کی بات ہے کہ جنگ کے زمانے میں یہی ریسٹوران پیرس کی نقل کرتے تھے۔ شراب، ڈنر اور قبلا کے کہ پنوں کے ساتھ ڈانس کے پانسز بھی مہیا ہوتے تھے اور ایک ایک کپن کو حاصل کرنے کے لئے گھنٹوں کیو، میں کھڑا ہونا پڑتا تھا لیکن اب چاروں طرف اُلو بول رہا تھا۔ شراب کی جگہ "سری رام مارکہ" لیمونیڈ اور جگا دھر سنگھ کے کارخانے کی بنی ہوئی آئس کریم بک رہی تھی، آرکسٹرا کی جگہ فلمی گانوں کے گھسے ہوئے ریکارڈ بجتے تھے اور ناچ گا تو کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔

اس ذہنی اور اعصابی تشنگی کو بجھانے کی کوشش میں وہ کئی بار پٹتے پٹتے بچا تھا کیونکہ اس کے والد سردار گوردیال سنگھ پرانی وضع کے بزرگ تھے اور کسی حالت میں بھی اس بات کے روادار نہ تھے کہ ان کا بیٹا پرائی لڑکیوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر "ست سری اکال" کہنے اور حیا داری سے آنکھیں جھکا لینے کی جگہ ہاتھ ملانے یا شانہ سے شانہ بھڑانے کی کوشش کرے اور ڈانس تو خیر بہت دور کی بات تھی۔

سردار جسونت سنگھ دل ہی دل میں پریشان ہو رہا تھا کہ ہائے اب کے بھی بہار بے نہج بیت جائے گی! احسن ابدال کی بڑی سرحانی کی چاروں لڑکیاں کوئی ہیر رو، نور اور لاولپنڈی آتی نہیں ہیں تو صد حیف کہ انہیں ایک ڈانس پر بھی نہ لے جا سکے۔ یہ احساس اس کے زخموں پر بڑی شدت سے نمکپاشی کر رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے راولپنڈی اور راولپنڈی کے بے کیف ریسٹورانوں کے مالکوں اور منیجروں کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بڑی بڑی ثقیل گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا۔ غصے میں کبھی کبھا کر وہ اندر ہی اندر گالیاں دیتا تھا اور دایاں ہاتھ زور زور سے اپنی ران پر مارتا جاتا تھا۔

سردار جسونت سنگھ کے والد بزرگوار سردار گوردیال سنگھ قریب ہی بیٹھے شبد الاپ رہے تھے۔ بیٹے کی وارفتگی دیکھ کر ان کا بھی باغ باغ ہو گیا اور دل ہی دل میں انہوں نے واہگورو جی مہاراج کو تعظیم دی کہ ولایت سے ہو آنے کے بعد بھی ان کا فرزند دلبند مذہب کے جذبات سے بدستور سرشار ہے اور گورو کے صاحبزادوں کی شہادت کے شبد پر بھری محفل میں بے اختیار گریہ وزاری کر رہا ہے .....

شبد ختم ہوا تو عورتوں اور مردوں نے اپنے اپنے تصورات کی بھول بھلیوں سے نکل کر زور زور سے ناک صاف کئے اور بلند آواز سے "جو بولے سو نہال ——— ست سری اکال" کا نعرہ لگایا، تب کہیں بعد گورو گرنتھ صاحب اور سب جی کا پاٹھ ہوا۔ پھر ارداس ہوئی۔ ارداس کے بعد لانگری سنتوکھ سنگھ دو نہنگ سیوا کاریوں کے ساتھ نمودار ہوا اور سنگت میں پرشاد تقسیم ہونے لگا۔

نہنگ سیوا کاریوں نے سوجی کے حلوے کی بڑی بڑی بالٹیاں اٹھائی ہوئی تھیں، اور وہ خطِ مستقیم میں لانگری سنتوکھ سنگھ کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ لانگری سنتوکھ سنگھ نے آستینیں چڑھائی ہوئی تھیں اور وہ عزاب سے کہنیوں تک بازو بالٹی میں ڈبو ڈبو کر مٹھی بھر زرد زرد حلوہ برآمد کرتا تھا اور بڑی چابکدستی سے اسے ہوا میں اچھال کر گیند کی صورت بنا بنا کر تقسیم کرتا جاتا تھا۔ اس عمل میں اس کا بازو سرگودھا کے گنے کی طرح لمبا تڑنگا ہو جاتا تھا اور وہ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے بازو پر لگا ہوا گھی اکٹھا کر کے واپس بالٹی میں نچوڑتا جاتا تھا اور پھر وہ اپنی گھنی داڑھی کو انگوچھے کی طرح رگڑ کے اپنے بازو، ہاتھ اور انگلیوں کی صفائی کر لیتا تھا۔ ساٹھا سال سرگودھے کا خالص گھی پی پی کر لانگری سنتوکھ سنگھ کی داڑھی پچاس برس کے سن میں بھی کاجل کی طرح سیاہ، ابرک کی طرح چمکیلی اور پرانے بڑ کے تنے کی طرح گھنی اور چھجے دار تھی۔ داڑھی میں جا بجا بڑے بڑے بیحد کنڈل تھے جیسے تالاب میں بانس گاڑ کر بھنور پیدا کئے گئے ہوں۔ پرشاد بانٹتے وقت لانگری سنتوکھ سنگھ کے ہاتھ اور پاؤں یکساں برق رفتاری سے چلتے تھے۔ ہاتھوں سے تو وہ حلوے کی گولیاں بنا بنا کر تقسیم کرتا تھا لیکن پاؤں کے انگوٹھے کی داب سے وہ ایک دو سرے کے ساتھ جڑ جڑ کر بیٹھے ہوئے انسانوں کے ہجوم میں اپنا راستہ تلاش کرتا تھا۔ اس جستجو میں کبھی اس کے پاؤں کے انگوٹھے کسی کی رانوں میں گدگدی کرتے تھے کبھی ان کا تصادم پنڈلیوں

کے ساتھ ہونا تھا اور کبھی وہ راستہ ٹٹولتے ٹٹولتے ایسی پگڈنڈیوں پر بھی جا بھٹکتے تھے جو شارع عام نہیں ہوتیں، خاص طور پر جب لاہور کی سنتو کہ سنگھ عورتوں کی سنگت میں پرشاد بانٹ رہا ہو تو لہور لینے بھٹکنے کے یہ جاوزات بڑی شدت سے روا ہوا کرتے تھے۔

پرشاد ہو چکا تھا صاحب نے کھڑے ہو کر بڑے جوش و خروش سے "راج کرے گا خالصہ" کا ملی ترانہ گایا اور پھر "ست سری اکال" کے نعروں کے درمیان دیوان برخاست ہوا۔ اس موقع پر ایک بار پھر بڑے زوروں کی ریل پیل ہوئی اور کچھ عرصہ کے لئے نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز۔۔۔ گوردوارہ دربار صاحب کے اندرونی صحن سے بیرونی صحن تک، آتے آتے بہت سے یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا۔ لیکن سردار جسونت سنگھ کھڑے کا کھڑا ہی رہا۔ ولایت میں اس نے "لیڈی فرسٹ" کے آداب بڑی محنت سے سیکھے تھے۔ اب وہ ریل پیل اور دھکم دھکا میں شامل ہو کے عورتوں کی ٹانگوں، چھاتیوں اور کولھوں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنے کلچر کو پراگندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ سیڑھیوں سے ایک طرف کھڑا رہا اور اس کے سامنے سے عورتوں اور مردوں کے ہجوم سمندر کی لہروں کی طرح ایک دوسروں سے ٹکراتے، ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے گذرتے رہے۔ جب بھیڑ چھٹ گئی تو سردار جسونت سنگھ گوردوارہ سے باہر آیا جہاں تین تانگے کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک تانگے میں اس کا باپ، اس کی ماں اور حسن ابدال کی بڑی سردارنی آنند کور سوار تھیں۔ دوسرے تانگے میں سردارنی کی تین بیٹیاں بیٹھی تھیں۔ تیسرے تانگے میں بڑی سردارنی کی چھوٹی بیٹی اور سردار جسونت سنگھ کی بہن کوشلیا تھیں، جسونت سنگھ کے پاس اپنا موٹر سائیکل تھا۔ اس نے سٹارٹر پر زور سے پاؤں مار کر انجن چلایا پہلے تانگے والے نے جو جگرال کا ہمدرد کھتری تھا "دیوی پہرے والی تیری صدا ہی جیئے" کا نعرہ لگا کر گھوڑے کو چابک مارا، دوسرا تانگے والا کوہالے کا مسلمان سید تھا، جواب میں اس نے "پنج نعرے پنج تن کے" ایک نعرہ حیدری ——— یا علی" کی صدا لگائی۔ تیسرا تانگے والا نسبتاً جوان تھا اس لئے وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکیوں میں زیادہ منہمک تھا۔ اپنی بغل والی خالی جگہ دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ سا لوٹ گیا۔ اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے روکا اور کہا:

"ایک بی بی آگے آ جائے۔"

"کیوں جی! ہم ٹھیک ٹھاک بیٹھے ہیں یہاں۔" کوشلیا نے جواب دیا۔

"پیچھے بوجھ زیادہ ہے۔ تانگہ ہلکا رہے گا۔ اس لئے ایک بی بی آگے آ جائے۔"

کوشلیا بڑی جز بز ہوئی لیکن بڑی سردارنی کی چھوٹی لڑکی نے ایک ہاتھ سے کوشلیا اور دوسرے ہاتھ سے تانگے والے کے کندھے کا سہارا لے کر بیٹے بیٹھے جھلانگ لگائی اور اچک کر اگلی سیٹ پر آ بیٹھی۔ "گوری گوری۔ او بانکی چھوری۔ کبھی میری گلی آیا کرو۔ ..... " اب اس تانگے والے کے منہ سے بھی نغمے پھوٹنے لگے اس کا چابک بار بار ہوا میں لہراتا تھا اور وہ حسن و جوانی کے قرب سے سرشار ہو کر گھوڑے کو برسٹ دوڑاتا دوسرے تانگوں سے آگے نکل آیا۔ سڑک پر لوگ ادھر اُدھر بھاگ کر اس کی زد سے بچ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے کہ "پکڑنا، پکڑنا گھوڑا بے قابو ہو رہا ہے" لیکن رحمان تانگے والا اپنے گھوڑے سے واقف تھا۔ یہ اس کا گھوڑا نہیں بلکہ اس کا دل تھا جو بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ کوشلیا دونوں ہاتھوں سے چھت کو پکڑے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ بڑی سردارنی کی چھوٹی بیٹی ڈر کر تانگے والے کے بالکل قریب آ گئی تھی۔ اس کی زلفیں تانگے والے کے شانے کے بالکل قریب لہرا رہی تھیں۔ اس کا نشیلا تنفس تانگے والے کے بائیں بازو پر شغفے سے برسا رہا تھا۔ گھوڑے کی برق رفتاری میں ہر نئی سرعت کے ساتھ وہ مہم کر تانگے والے کے اور بھی قریب آ رہی تھی جو کئی فلمی دھنیں ختم کرنے کے بعد اب گا رہا تھا ———

"ہائے سینے پہ جو رکھ دو تو قرار آ جائے"

خدا خدا کر کے محلہ موہن پورہ آیا اور محلے کے سرے پر سردار گوردیال سنگھ کی حویلی۔ سردار جسونت سنگھ باہر کھڑا تانگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ سب پہنچ گئے تو سردار گوردیال سنگھ نے رحمان کو ڈانٹا "کیوں بے اناڑی گھوڑا انہیں سنبھال سکتے تو ماں کے پاس گھر بیٹھ، تانگہ کیوں ہانکتے ہو؟"

رحمان نے اپنی ترچھی ٹوپی کا زاویہ بدلا "سردار جی یہ گھوڑا بجلی ہے بجلی، کبھی بے قابو نہیں ہوتا۔ جاؤ اپنے بہرے گن لو مرتبیوں کی طرح سنبھال کر لایا ہوں ——— ہاں!"

"مرتبیوں کا بچہ!" سردار گورمیال زیرلب بڑبڑائے۔ وہ اس وقت خواہ مخواہ جھگڑے کو طول دینا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ کھانا کھانے کے بعد حسن ابدال کی بڑی سردارنی اور اس کی بیٹیوں کو لاہور کی ساڑھے بارہ بجے کی گاڑی پکڑنی تھی۔ چنانچہ انہوں نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر چکوال کے ہندو کھتری تانگے والے کو دیا "جاؤ تینوں برابر برابر بانٹ لینا۔"

رحمان نے چکوال کے ہندو کھتری اور کوہاٹ کے مسلمان سید تانگے والوں کو کن انکھیوں سے دیکھا "جاؤ بیٹا دونوں بانٹ لو، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا یاروں نے تو اپنی فیس وصول کر لی ہے ——— چل میرے شیر چھم چھم چھم" اس نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور چشم زدن میں یہ جا وہ جا۔

حویلی پہنچ کر گردوارہ دمدمہ صاحب کے دیوان کی ریل پیل کی صدائے بازگشت ایک بار پھر بلند ہوئی۔ حسن ابدال کی سردارنی کی بڑی لڑکی نے دیکھا کہ اس کے باپ کان کی بالی غائب ہے اور ساتھ والے رخسار پر ایک کھرونچ سی انگلی کا نشان یوں نمودار ہے جیسے قندھاری انار کو تیز ناخن سے چھیل دیا گیا ہو۔ دوسری کی گردن پر چٹکیوں کے سرخ سرخ دھبے خون کی طرح جھلک رہے تھے، تیسری کے پسینے کا بروج عمقا تھا اور چوتھی کا بلاؤز تار تار ہو کر پس پردہ کے مرمریں اور مہتابی رموز کو افشا کر رہا تھا۔ یہ خود بڑی سردارنی پر بھی کوئی من چلا کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ گیا تھا اور اب ان کی کمر میں بڑی شدت کا درد ہو رہا تھا۔ سردار جسونت سنگھ نے دیکھا کہ اس کی بہن کوشلیا کی انگوٹھی بھی موجود نہیں، جو اس نے لندن سے خاص طور پر اس کے لئے بیس پونڈ میں خریدی تھی۔ اگر اس انگوٹھی پر بھیڑیں کوئی جیب کترا ہاتھ صاف کر گیا ہے تو بے شک بڑے فلق کی بات ہوگی لیکن اگر خود کوشلیا نے آج چوری چھپے اپنی انگوٹھی تراوچن سنگھ کی نذر کر دی ہے تو کوئی بات نہیں، سردار جسونت سنگھ کو کوشلیا اور تراوچن سنگھ کے عشق کا حال معلوم تھا۔ وہ دونوں گورڈن کالج راولپنڈی میں تھرڈ ایر میں پڑھتے تھے اور آپس میں شدت سے محبت کرتے تھے۔ اگر دو تین برس پہلے سردار جسونت سنگھ پر یہ راز افشا ہوتا تو وہ گنڈاسا اٹھا کر کوشلیا اور تراوچن سنگھ دونوں کے سر قلم کر دیتا۔ لیکن ولایت سے آ کر وہ کوشلیا کو بہن کے علاوہ ایک ہمدرد اور رفیق کی حیثیت سے بھی چاہنے لگا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کے گہرے ہمراز بن گئے تھے اور جب کبھی سردار جسونت سنگھ کے اعصاب پر راولپنڈی کے بے کیف ریسٹورانوں اور ویران ہوٹلوں کا احساس بری طرح حملہ آور ہوتا تو وہ اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے معربی موسیقی کے بکاؤ ڈسک لگا کر کوشلیا کو رمبا، واٹز اور فاکس ٹروٹ کے ڈانس سکھاتا تھا۔

سردار جسونت سنگھ کا اصرار تھا کہ حسن ابدال کی بڑی سردارنی اور اس کی چاروں بیٹیوں کے کھانے کا انتظام میز کرسی کانٹے اور چھری کے ساتھ ہونا چاہئے۔ کوشلیا نے بھی حسب توفیق اس کی تائید کی لیکن دستور کے مطابق سردار گورمیال سنگھ کی رائے کا پلڑا بھاری رہا، والان میں دری بچھا کر اس پر مرزا پور کے روغنی لیمپ لگائے گئے تھے۔ مہمانوں میں محلہ موہن پورہ کے بہت سے سردار اور سردارنیاں شامل تھیں۔ لانگری سنتوکھ سنگھ بھی موجود تھا ——— گوردوارہ میں پرشاد بانٹ کر اس نے دن بھر کی تکان دور کرنے کے لئے بھنگ کے تین چار گلاس چڑھا لئے تھے اور اب وہ نشے کی ترنگ میں بڑی سردارنی کے گھٹنے کے ساتھ گھٹنا لگائے بیٹھا کلغی والے دسویں پاد شاہ کے شجاعانہ کارناموں پر گورمکھی کے پراثر اشلوک سنا رہا تھا ——— اس کے دو ہنگ سیوا کاری یہاں بھی بڑے بڑے مورچھل پنکھے اٹھائے مہمانوں کے درمیان گھوم رہے تھے اور حتی الوسع کوشش کرتے تھے کہ پنکھے کی ہر جنبش کے ساتھ بڑی سردارنی کی بیٹیوں کے بالوں اور کپڑوں کی ساری مہک ان کے پاس کھنچ کر آ جائے۔

کھانے کے بعد بڑی سردارنی کی بیٹیوں نے یکے بعد دیگرے سردار جسونت سنگھ کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر تیسری بار اپنے چہروں کو

آراستہ کیا۔ جسونت سنگھ اور کوشلیا دونوں انہیں رات کے ساڑھے بارہ بجے والی گاڑی پر سوار کرانے پر مامور رہے۔ گاڑی روانہ ہونے کے بعد سردار جسونت سنگھ نے کوشلیا کو اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر بٹھالیا اور پوچھا:

"کوشلیا! تم نے آج اپنی انگوٹھی نہیں پہنی کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں بھراتا جی! پہنی تو تھی شاید کہیں بھیڑ بھاڑ میں گر گئی ہو۔" کوشلیا نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"گرتی کیسے؟ تمہاری انگلی پہ تو وہ بہت بھدس کے آتی تھی نا؟"

سردار جسونت سنگھ کا منہ سامنے کی طرف تھا اس لئے وہ فرنٹری رنگ کے اس غبار کو نہ دیکھ سکا جو شفقِ شام کی طرح کوشلیا کی آنکھوں، ہونٹوں اور رخساروں پر چھایا جا رہا تھا۔

"بھراتا جی!" کوشلیا کی آواز کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا، جیسے تیز نمک جانے کے بعد کمان اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔

"چلو اس کی طرف چلیں میری بھی ملانات ہو جائے گی۔"

"بھراتا جی؟" کوشلیا حیرت اور احسان کے جذبوں میں گڈمڈ ہو گئی۔

"ذرا میں بھی دیکھوں کہ وہ جانور ہے کس ڈھب کا۔ ولایت میں لڑکیاں اپنے چاہنے والوں کی بڑے فخر سے نمائش کیا کرتی ہیں۔ میں تمہیں مارگریٹ براؤنی کا قصہ سناتا ہوں جو میرے ساتھ ہندوستان آنے پر جان دے رہی تھی۔" سردار جسونت سنگھ یہ کہانی سنانے میں اس وجہ منہمک ہوئے کہ کئی جگہ راہگیروں، ٹھیکڑوں، بلیوں، کتوں اور بجلی کے کھمبوں سے ٹکرانے سے بچے۔ "بھلا سر چڑھ تو کوشلیا اگر میں اسے آتا تو بھائیا جی جوتے مار مار کر ہوش ٹھکانے لگا دیتے دونوں کے۔ معلوم نہیں بیچاری کس حال میں ہو گی۔ کل یاد دلانا میں اسے ضرور خط لکھوں گا۔"

کوشلیا نے نہ تو مارگریٹ براؤنی کے حالِ زار پر کوئی خاص توجہ دی، نہ ہی سردار جسونت سنگھ کے خط لکھنے کی یاد دہانی کرائی۔ کیونکہ اس کے دماغ میں اول تو ترلوچن سنگھ ہی تر نوالہ بسا ہوا تھا اور اب اس کے علاوہ بھائیا جی کے جوتوں کا خیال بھی دوش بدوش اُبھر آیا تھا۔ یوں سردار گوردیال سنگھ بڑے شفیق اور سنگھ باپ تھے لیکن جہاں بچوں کی تعلیم یا تربیت یا چلن میں کسی قسم کا رخنہ نظر آئے وہاں ان کا ہاتھ بے اختیار جوتوں کی طرف لپکتا تھا۔ تنبیہ و سرزنش کا یہ فن انہوں نے اپنے آبائی محکمہ تحصیلداری میں حاصل کیا تھا اور ان کے تجربہ کے مطابق یہ طریق کار بہت مؤثر تھا۔

گورٹن کالج کے ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں پہنچ کر کوشلیا موٹر سائیکل سے اتری اور ایک بجلی کے کھمبے کے پاس جا کر، اس نے ایک پتھر سے کئی بار اپنے مخصوص انداز میں ٹن ٹن کی، جیسے تار گھر کا بابو گرگر گٹ گٹ کے ذریعہ اپنے پیغامات دنیا بھر میں نشر کیا کرتا ہے، ٹن ٹن کی آواز سن کر اوپر والے ایک کمرے میں روشنی ہوئی اور بجھ گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ترلوچن سنگھ کھڑکی میں نمودار ہوا اور قریب لگے ہوئے پانی کے پائپ کو پکڑ کر اس نے ہاتھوں اور گھٹنوں کے سہارے نیچے پھسلنا شروع کیا۔ اس عمل میں اس کے دونوں ہاتھ اور گھٹنے رنگ آلودہ نل سے رگڑ کھا کر بری طرح مشتعل ہو گئے تھے۔ نیچے پہنچ کر وہ لپکا کہ اپنی زخمی ہتھیلیوں کو کوشلیا کی خنک اور شام نواز زلفوں میں چھپا لے لیکن یکایک اس کی نظر سردار جسونت سنگھ پر پڑی جو اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

ترلوچن سنگھ کے قدم من من بھر کے بھاری ہو گئے۔ جہاں تھا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ جیسے کسی نے اچانک اسے منجمد کر دیا ہو۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس کا دایاں ہاتھ اٹھا اور کرتے کے نیچے لگی ہوئی کرپان پر جا کے رُک گیا۔

"ترلوچن آجاؤ۔" کوشلیا نے اس کی ہچکچاہٹ دور کرنے کی کوشش کی۔ "یہ میرے بھراتا جی ہیں۔"

ترلوچن سنگھ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ سردار جسونت سنگھ کوشلیا کے برادر بزرگوار ہیں لیکن جو چیز اس کے دل میں بری طرح کھٹک رہی تھی

وہ اس وقت ان کی یہاں موجودگی تھی۔ کیونکہ ترلوچن سنگھ کے وہم وگمان میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کوئی بھائی رات کے ایک بجے اپنی بہن کو اس کے عاشق سے ملاتا پھرے۔ مزور حال میں کچھ کالا ہے، اس نے سوچا۔ چنانچہ کرپان پر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہوتی گئی۔

"گھبراؤ مت۔" اب سردار جسونت سنگھ نے ترلوچن سنگھ کو مخاطب کیا۔ "اگر تمہارے اس چھ انچ کی کرپان ہے تو میرے پاس ۳۲ بور کا جرمن ریوالور ہے۔ لیکن میں تمہاری طرح بزدل یا گنوار نہیں ہوں۔ تم بے خوف وخطر یہاں آجاؤ۔"

ترلوچن سنگھ آگے بڑھنے لگا لیکن کرپان پر اپنی گرفت نہ چھوڑی۔

سردار جسونت سنگھ نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ "میرا نام جسونت سنگھ ہے، ہاؤ ڈو یو ڈو مسٹر۔"

ترلوچن سنگھ حیرانی، پریشانی اور تذبذب کے جال میں ایسا گرفتار تھا کہ اس وقت اسے ان رسمی تکلفات کا ہوش نہ تھا۔

سردار جسونت سنگھ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں کوشلیا کا بھائی ہوں۔ مجھے دیکھ کر شاید تمہیں پہلے یہ خیال آیا ہو کہ میں تمہارا سر قلم کرنے آیا ہوں۔ اب ہمارے جانے کے بعد شاید تم سوچو گے کہ میں آدھی رات میں بہن کی دلالی کرتا پھر رہا ہوں۔ دونوں خیال اس ملک میں بڑی آسانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ کسی کے بھی ذہنی تانے بانے کو بدل کر رکھ دوں۔ ہاں اگر تم ایک شریف آدمی کی طرح واقعی میری بہن سے محبت کرتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم یہاں چاندنی میں جی کھول کر باتیں کر سکتے ہو۔ میں گیٹ کے باہر انتظار کروں گا۔" سردار جسونت سنگھ موٹر سائیکل کو گھسیٹتا گھسیٹتا باہر لے گیا۔

"ترلوچن!" کوشلیا نے کہا۔

"کوشل!" ترلوچن نے جواب دیا اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

چاندنی بھی چھائی ہوئی تھی اور قریب ہی پیپل کا وہ دانائے راز درخت بھی تھا جس کی کہنہ سال آنکھ نے سال ہا سال نئی کوشلیاؤں اور نت نئے ترلوچنوں کے رومان پروان چڑھتے دیکھے تھے۔ اسی درخت کے سائے میں پیمان بندھتے اور ٹوٹتے تھے۔ یہیں حسن ومحبت کی طلسماتی روایتیں اپنا سحر پھیلاتی تھیں۔ اسی کی چھاؤں میں شاعری جنم لیتی تھی۔ افسانوں کے جال بنتے تھے۔ شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں کو حیات جاودانی نصیب ہوتی تھی ——— لیکن اس وقت کوشلیا اور ترلوچن کوئی اور بات نہ کر سکے۔ انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سکول کے دو روٹھے ہوئے بچوں کو کمرے میں بند کر دیا گیا ہو کہ گھنٹی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے آپس میں صلح کر لو ——— اور دروازے پر ماسٹر صاحب چھڑی لئے منتظر بیٹھے ہوں!

تسنیم سلیم چھتاری

ٹوٹ گیا اِک تارا

سائنس کا گھنٹہ تھا اور اسٹرانومی پڑھائی جا رہی تھی۔ ایک لڑکے نے پروفیسر سے پوچھا "تارے کیوں ٹوٹ جاتے ہیں؟" پروفیسر صاحب اس وقت لیکچر میں گم تھے۔ انہوں نے اس سوال پر دھیان نہیں دیا۔

اسی لڑکے نے پھر یہی سوال کیا اور پروفیسر صاحب نے دوبارہ بھی نہیں سنا تو میرے قریب سے ایک دوسرے لڑکے نے آہستہ سے کہا:

"مجھ سے پوچھو..... جب کسی کی موت آتی ہے تو تارا ٹوٹتا ہے۔"

"جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو آسمان سے ایک چمکتا ہوا تارا ٹوٹ کر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔" اس فقرے سے سب کے کان آشنا تھے۔ یہ بات لاکھ مرتبہ چمکتے تارے کی طرح دل کے آسمان پر طلوع ہوئی تھی اور تکلیف کی اندھیری گہرائیوں میں کھو گئی تھی۔

مجھے اس جواب نے وہ ساری کہانی یاد دلا دی جس میں ایک تارہ نکلا، چمکا اور پھر اپنے پیچھے یادوں کی گہری لکیر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔

پانچ برس پہلے کی بات! مگر کیا پچاس برس کے بعد بھی میں انجم کو بھول سکوں گا؟ نہیں! مگر کاش! ان دنوں میں آٹھویں کلاس میں تھا۔ شوخ و شنگ، کاہلی اور شرارت کا مجسمہ! دنیا بھر کے کھیلوں میں حصہ لیا کرتا تھا اور صبح سے شام تک نت نئی حرکتیں کیا کرتا..... روز کپڑے پھٹتے گھٹنے اور کہنیاں لہولہان رہتیں۔ اماں ابا کی ڈانٹ بھی پڑتی اور چوٹوں کی تکلیف بھی ہوتی، پر اس دکھ میں کیسا خوشی کا ابلہ تھا میں بھیگے ہوئے کپڑے اور مجروح جسم لے کر انجم کے پاس پہنچا۔

"انجم خدا کے لئے..... دیکھئے آج اماں سے ضرور پٹ جاؤں گا۔"

"کیا ہو گیا؟" وہ پوچھتیں۔

"دیکھئے کیسی خراش لگی ہے..... اور یہ قمیص کی آستین مونڈھے پر سے الگ..... اور کرتے کا بٹن ندارد..... اُف

کتنا خوں نکلا ہے؟"

"مدثر پر؟ ایک ہلکا سا تھپڑ میرے بے ترتیب بالوں پر پھسلتا: "چلو اب خالہ کو دکھا کر لاؤں ..... لاڈلے کے ڈھنگ ہیں"

"ارے ارے ..... کیا جو تیاں کھلوائیے گا ..... قسم آپ کی چھپ کر آیا ہوں' اب یہاں منہ ہاتھ دھو کر جاؤں گا ..... اگر انہوں نے دیکھ لیا اس شان میں تو آپ سمجھ لیجئے گیا ہوگا؟"

"اچھا ہے مجھے تو خوشی ہوگی تم مہینے میں چار چھ جوڑے تو پھینڑے کر لیتے ہو! اور یہ جو روز مرہ پٹخیں لگتی ہیں ..... مجھے تو ڈر ہے کسی دن ایک آدھ ہڈی نہ پچ جائے ....."

"میرا کیا بگڑے گا ..... آپ ہی تیمارداری کیجئے گا"

"ہاں جیسے تمہاری نوکر ہوں نا!"

پھر سچ مچ وہ نوکروں کی طرح سے ہاتھ منہ دھلواتیں' کپڑے سیتیں' زخموں پر ان کے پرانے دوپٹوں کی پٹیاں باندھتیں۔ جب میں درست ہو کر چلنے لگتا تو وہ ہنس کر کہتیں: "پرویز میں کہے دیتی ہوں اگر اب تم نے ..... " میں ہنستا ہوا بھاگ آتا اور دوسرے دن پھر اسی حالت میں پہنچتا۔

انجم مجھ سے کئی سال بڑی تھیں۔ پھر کوئی رشتہ ناطہ بھی نہیں ..... میں اپنی شریر طبیعت کے باوجود ان سے کچھ اس طرح کھل گیا تھا جیسے چھوٹے بڑے اور اپنے پرائے کا فرق ہی باقی نہ رہا ہو۔ اپنی دلچسپی کی ساری باتیں ان کو سناتا اور ان کی ساری باتیں بڑے شوق سے سنتا ..... اور کبھی سوچنے لگتا کہ مجھے کشیدہ کاری اور کھانا پکانے کی ترکیبوں سے کیا تعلق! ——— انجم کرکٹ اور فٹ بال سے کیا واسطہ! مگر یہ نہیں کہ ہم باتیں کرتے اکتاتے ہوں ..... ایک کہہ رہا ہے دوسرا محویت سے سن رہا ہے کچھ ایسی باتیں کہ تیسرا آ بیٹھے تو حشر تک نہ سمجھ سکے کہ آخر گفتگو کا موضوع کیا ہے۔

ایک سال میں کیسی کایا پلٹ ہوئی تھی جب شروع میں ہم ان کے یہاں کرایہ دار ہو کر آئے تو مجھے سخت کوفت ہوئی کہ یہ ایک عدد لمبی تڑنگی لڑکی یہاں موجود ہے۔ ان دنوں میں لڑکیوں سے بے حد گھبراتا تھا۔ آج بھی اسی قدر! مگر انجم کو شاید اشرف المخلوقات سے بھی کچھ بڑھ کر پایا اور وہ بہت جلد میرے خیالات اور احساسات کی شریک بن گئیں۔

دنیا ہی کتنی تبدیلیاں ہو رہی تھیں مجھ میں لاکھوں باتیں نئی پیدا ہو گئیں اور پرانی غلیظ ہو گئیں۔ نئے کھیل سیکھے' نئے دوست بنائے' نئی باتیں سوچیں اور نئی باتیں سنیں ..... آنکھوں میں بھی شاید نئے نئے رنگ تیرتے تھے۔ جب ہی تو جدھر نگاہ اٹھتی ہر چیز بدلی ہوئی نظر آتی مگر انجم! کیا اس ایک سال نے رتی بھر فرق بھی پیدا کیا تھا ان میں وہی لبوں کی خفیف سی لرزش پر دھیمی مسکراہٹ کا رقص! وہی ہلکے سے تھرتھراتی ہوئی پلکوں کے درمیان سے ڈالوں کی شعاعیں وہی سیاہ بالوں میں ڈوبتی' ابھرتی لہریں ..... وہی ہاتھوں کی نرمی اور وہی آواز کا رس! وہ کہیں سے ذرہ برابر نہیں بدلیں اور میں اس یک رنگی سے کتنا مالوس ہو گیا تھا ..... کبھی کبھی سوچتا کہ اگر انجم اپنے مخصوص انداز کے بجائے ذرا اکڑ کر چلنا شروع کر دیں خوابیدہ آنکھوں کے بجائے اور لڑکیوں کی طرح دیدے پھاڑ کر باتیں کرنے لگیں تو کیسی عجیب لگیں گی! تجربہ! اور مجھے خیال آتا' وہ ہلکے ہلکے رنگوں کے بجائے گہرے رنگ کے کپڑے پہننا شروع کر دیں یا شلوار قمیص کے بجائے ساڑھی باندھنے لگیں تو کیا میں انہیں ایک نظر پہچان لوں گا! اور کیا تب بھی ان کے چہرے پر یہی دلکشی ہوگی ..... شاید نہیں۔

ان کی باتیں کیسی اچھی اور کتنی مختصر ہوتی تھیں!

میں سونے کے معاملے میں بہت ماہر تھا مگر جب سے انہوں نے بتایا کہ وہ روز صبح کو باغ میں پھول چننے جاتی ہیں اور دیر تک وہاں گھومتی ہیں' تو آپ سے آپ ہی آنکھ صبح سویرے کھل جاتی اور میں سلیپر گھسیٹتا ہوا باغ میں پہنچتا۔ وہ حوض کے کنارے لڑکی لئے مجھے اپنی منتظر ملتیں ..... سفید شلوار کے پنجے سے بھیگے ہوئے پائنچے ..... کسی ہلکے رنگ کے باریک سے دوپٹے میں شگفتہ چہرہ جیسے اوس میں بھیگا ہوا گلاب! اور ایک

مخصوص فقرہ!

"کہو..... کیا حال چال ہے؟"

"رات بھر گھٹنے میں درد رہا..... جانے آپ نے کیا منحوس دوا لگائی تھی؟"

"اب مجھے الزام دیتے ہو..... شرم ... اچھا اب میں پھول جمع کرتی ہوں..... شرط یہ ہے کہ تم کسی پھول کو ہاتھ نہ لگانا۔"

"واہ یہ کیا پابندی ہے؟" میں ہنس جاتا۔

"بھائی پرویز تم مرد ہو..... سنا ہے کہ مردوں کے ہاتھ بہت سخت ہوتے ہیں..... پھول مرجھا جاتا ہے۔"

میں اس دلیل کو روز مان لیتا اور چپ چاپ بیٹھا نہیں تکتا رہتا۔ وہ پھول توڑ کر واپس جانے لگتیں تو میں ان سے ایک پھول مانگ لیتا۔

"میرا حصہ لائیے!"

وہ کوئی اچھا سا پھول لے کر میرے میٹ ٹریس کے کوٹ میں اٹکا دیتیں۔ میں واپس آ کر کپڑے بدلتا اور ناشتہ کر کے اسکول چلا جاتا..... دن بھر دماغ میں میٹھی میٹھی سوچ کی بارش ہوتی رہتی اور جب شام کو کھیل سے واپسی پر سیدھا ان کے یہاں پہنچتا تو وہ پرانے دو پتوں کی پٹیاں بنائے اور مختلف اقسام کے مرہم لئے میری راہ تک رہی ہوتیں۔

زندگی کا یہ دور بھی کتنا مطمئن اور پُرسکون تھا مجھے ہر صبح شام کا انتظار رہتا کہ اپنا زخم خوردہ جسم ان کی تیمارداری کے سپرد کر دوں اور شام گذرنے پر صبح کا رستہ تکتا کہ ان سے باغ میں جا کر ملوں! اسی چکر میں دن بھاگتے چلے گئے۔

رفتہ رفتہ میری یہ کیفیت ہو گئی کہ نہ کسی دوست سے دوستی اور نہ کسی کھیل سے دلچسپی! ہر دم یہی خواہش کہ بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہوں خود بخود یہ بھی خیال آتا کہ وہ مجھ سے گھبرا نہ جائیں یہ نہ پوچھیں کہ بلا ضرورت کیوں آئے ہو..... میں وہاں جانے کو لاکھوں بہانے ڈھونڈتا ایسا بھی ہوا کہ دانستہ ٹھوکر کھائی اور چوٹ مار لی! جان بوجھ کر کپڑے پھاڑے اور پہنچ گیا۔ یہ بھی نہیں تو جا کر منہ بسورنے لگا۔

"خیر تو ہے کیا ہوا؟"

"بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔"

"کیوں دوپہر کو کھانا نہیں ملا تھا؟"

"وہ سب ہضم ہو گیا۔"

"دوپہر؟" گہری مسکراہٹ سے آنکھوں کی لو بھڑک اٹھتی۔

"کچھ کھلائیے بھاوی.....!"

"ایک شرط پر!"

"کہئے!"

"مجھے بازار سے اس رنگ کا اون لا دو گے؟" وہ نمونہ دکھلاتیں۔

"ایک شرط پر! مجھے بھی شرارت سوجھتی۔

"وہ کیا؟"

"اگر آپ اون کے پیسے دیں۔"

ہم دونوں دیر تک ہنستے رہتے وہ مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلاتیں اور میں بازار سے اون لے آتا۔

پھر ایک ایسا احساس جو میرے لئے مجہول بھی تھا اور پریشان کن بھی! میں نے محسوس کیا کہ جب وہ میرے علاوہ کسی اور سے باتیں کرتی ہیں تو مجھے ناگوار ہوتا ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں سے ملنے جاتی ہیں تو میرا جی اُلجھتا ہے' ان سے کوئی ملنے آتا ہے تو مجھے بُرا لگتا ہے ۔ ۔ ۔ خدا جانے کیوں کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں ان کے یہاں پہنچا تو اور دو چار لڑکیوں کو بیٹھے پایا۔ میں لوٹنے لگتا تو انجم مجھے روک لیتیں۔

"ارے بھئی پرویز کہاں بھاگ رہے ہو؟"

میں ٹھہر جاتا تو ۔ ۔ ۔ ۔ "یہ تمہارے لیے ندیدہ نکمے ہیں! کھاؤ نا مزہ کیا تاک رہے ہو۔ ۔ ۔ ارے بھئی ایسی بھی کیا شرم"

ایسے میں ان کی میٹھی میٹھی باتیں بھی کڑوی لگتیں ۔ ۔ ۔ ۔ سب ترجیح ہیں اور میں تماشہ بنا بیٹھا رہوں' یہ کیا زیادتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اٹھنے لگوں گا تو روکا جاؤں گا اور رُک جاؤں گا تو مجھ سے بے فکر ہو کر اِدھر اُدھر باتوں میں لگ جائیں گی! مجھے بھی اتنا غصہ آتا کہ بیان سے باہر ۔ ۔ ۔ مگر ان سے احتراز کرنا ممکن تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ایک نامعلوم سی کشش!

اور ہاں مجھے ایک دُکھ بھی تھا میں انہیں اپنا ساتھی اپنا دوست اپنا فیتن اپنا ہم راز سب کچھ سمجھتا ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ مجھے ایک کمسن اور نادان بچہ! وہ مجھ سے عمر میں یقیناً بہت بڑی تھیں پانچ یا چھ سال! مگر میں نا سمجھ اور نادان بچہ نہیں میں محبت اور نفرت کو سمجھتا ہوں مجھے آنسو اور ہنسی کی حقیقت معلوم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بے تکلفی اور محبت کے علاوہ مجھے ان کے سلوک میں ایک طرح کا بزرگانہ اور ناصحانہ انداز دکھائی دیتا اور میں جھنجھلا سا جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا تو وہ مجھے اپنے برابر کا سمجھیں۔ میری نگاہوں میں کچھ دیکھیں میری باتوں میں کچھ پائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میری کمسنی کا ان کو اسی قدر احساس ہے تو مجھے صحیح معنوں میں بچہ سمجھ لیں ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے دیکھ کر لیٹے سے بیٹھ جاتی ہیں' لپسلا ہوا دوپٹہ گلے میں لپیٹتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے تو وہ کسی نہ کسی بات پر کہہ اٹھتی ہیں "تم نہیں سمجھتے پرویز تم ابھی بچے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ افوہ بچپن سے علیحدگی کا شوق!"

میں چکرا جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر خاموش!

پھر ایک دن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"انجم! انجم! کہاں ہیں آپ؟"

"یہ رہی!" وہ ہمیشہ کی طرح ایک آدھ منٹ میں سوئیٹر سے الجھ رہی تھیں۔

"آج تو ایسی بھوک لگی ہے کہ زندگی میں نہ لگی ہوگی"

"ارے تب تو کسی ثقیل غذا کی ضرورت ہے"

"ہاں بس جلدی کیجئے"

"جلد ہضم ہونے کے نہیں!"

"کیا چاہیے؟" میں نے نان کے ساتھ کہا۔

"دیکھو پرویز! یہ میں اپنی ایک سہیلی کا سوئیٹر بُن رہی ہوں اور بدقسمتی سے اس میں ایک بھی اُون کم پڑے گا"

"میں تو نہیں لاؤں گا" سہیلی کے ذکر سے میں چڑ گیا۔

"کیوں بھئی یہ خفگی کیسی؟"

"جب دیکھو آپ سہیلیوں کے سوئیٹر بُنتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی ہم کو بھی کچھ بُن کر دیا ۔ ۔ ۔ میں تو اب ہرگز ہی اُون لا کر نہ دوں گا"

"اچھا یہ بات ہے ۔ ۔ ۔ ایمان سے کہنا کبھی تم نے فرمائش بھی کی!"

"میں کیوں فرمائش کرتا جب آپ کو خود ہی خیال نہ آیا"

"میں چاہتی تھی کہ تم اپنے منہ سے کہو۔"

"میرا دل تھا کہ آپ کو اپنی طرف سے رحم آجائے۔"

وہ ہنسنے لگیں اور پھر بولیں: "مجھے یہ بات تسلیم ہے مگر دیکھو پرویز اگر تم نے اس کا شکوہ کیا تو یہ ہم دونوں کے لئے خوشی کی بات نہیں ہے؟"

ان کا یہ سوال! کہنے کا انداز!! اور اپنی مسرت کی انتہا مجھے ہمیشہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

ایک ہفتہ بعد جو گیا تو انہوں نے سفید رنگ کا بے حد خوبصورت اور نرم سوئیٹر مجھے پہنا دیا۔

"یہ تو پسند ہے؟"

"سوئیٹر تو پسند ہے مگر آپ کا یہ سوال کرنے کا انداز پسند نہیں آیا۔"

"کیوں؟"

"آپ کا خیال تھا کہ میں اسے ناپسند بھی کر سکتا ہوں؟"

جب اپنی طرف لوٹا تو زمین پر قدم نہیں پڑتے تھے اور آپ سے آپ ہنسنے کو دل چاہتا تھا۔

اماں نے دیکھ کر کہا: "ارے یہ نیا سوئیٹر!"

میں نے کہا: "جی ہاں انجم نے بُن کر دیا ہے۔"

وہ کہنے لگیں: "انجم بہت محبت کرتی ہے تجھ سے..... اگر تیری عمر کی ہوتی تو ہم شادی کر دیتے۔"

اماں نے یہ فقرہ یونہی سرسری طور پر از راہِ مذاق کہا تھا۔ مگر میں اس حد تک حواس باختہ ہوا کہ دیر تک اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

"انجم کی شادی اور میرے ساتھ..... کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر نہیں! میں ایسا خواب بھی دیکھوں تو پھر آنکھ کھولنے کی نوبت نہ آئے! میں انجم سے محبت کرتا ہوں، ان کا احترام کرتا ہوں! وہ کہیں تو جان دینے سے بھی دریغ نہ کروں مگر شادی! ان کی تو محض پرستش کی جا سکتی ہے۔..... اگر کہیں یہ ممکنات سے ہوتا تو بھی میں اس کے لئے تیار نہ ہوتا..... میری نگاہ میں تو یہ ان کی توہین ہے..... اگر وہ سنیں تو شاید پھر مجھ سے بات بھی نہ کریں..... مجھے تو وہ بچہ سمجھتی ہیں..... چھوٹا سا بچہ جو چوٹ کھا کر بسورتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاتا ہے..... جو لبھ کی حالت میں ان کے پاس جاتا ہے اور کچھ کھا کر مطمئن ہو جاتا ہے..... کمسن بچہ جسے ابھی سگرٹ نہیں پینا چاہئے عطر نہیں لگانا چاہئے..... اور شاید وہ یہ بھی سمجھتی ہوں کہ اس دودھ پیتے بچے کو ان سے محبت کرنے کا حق تک حاصل نہیں ہے..... اسی لئے انہوں نے میری حالت کو قابلِ غور نہیں سمجھا اور مجھے ان سے ان لاکھ باتوں میں سے ایک بھی بات کہنے کی جرأت نہیں ہوتی جو میں دن رات سوچا کرتا تھا..... میں انہیں ہر دم دیکھنا، باتیں کرنا، پاس بیٹھنا ضرور چاہتا ہوں مگر شادی! اگر اس کی کوئی صورت ہوتی تو کیا میں اسے برداشت کر لیتا..... میری صرف یہ خواہش ہے کہ میں تا حیات ان کو باغ کے پھل چنتا ہوا دیکھتا رہوں ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنتا رہوں! وہ سر جھکائے میرے ہاتھ پیروں کی چوٹوں کا معالجہ کرتی رہیں اور میں ٹکٹکی باندھے ان کے بالوں میں گھونگر کی لہریں تکتا رہوں۔ وہ بڑے انہماک سے میرے لئے نکوتے تلتی رہیں اور میں پاس بیٹھا ان کے رخساروں پر چمکی ہوئی ہلکی لمبی پلکوں کا سایہ تھرکتا ہوا دیکھتا رہوں..... ایسی ہی ایک موہوم سی لرزش جیسے ان کے سامنے پہنچ کر میرے پیر ڈگمگا جاتے ہیں۔

میں جاؤں تو وہ مسکرا کر پوچھیں: "ہاں تو کیا حال چال ہے؟" میں واپس آنے لگوں تو ہنس کر کہیں: "پرویز میں کہے دیتی ہوں.....؟ شادی تو ان کی جلد ہی کسی نہ کسی کے ساتھ ہو جائے گی۔ کسی ایسے شخص کے ساتھ جو ان سے عمر میں دو چار سال بڑا ہوگا کہیں نوکر ہوگا..... اور پھر جسے وہ پسند کریں گی۔"

مجھے خیال آیا کہ اگر ان کی شادی ہو گئی تو کیا وہ یہاں سے چلی جائیں گی اور میری زندگی کا سہانا خواب بکھر کے رہ جائے گا۔ دل کو زبردست دھچکا لگا ..... کیا اب میں ان سے جدا رہ کر بھی خوش رہ سکتا ہوں ..... وہ میری زندگی کا ایک جزو بن چکی ہیں۔ ان کی مسکراہٹ، ان کی باتیں، ان کی گہری گہری آنکھیں ..... اور میں گہری گہرائیوں میں ڈوب گیا .....

اماں نے کہا۔ "گل جا وہ آ رہا ہے۔"

میری محویت کا تسلسل ٹوٹ گیا ..... چلو اچھا ہے بھائی جان آ رہے ہیں ڈیڑھ سال بعد ان سے ملاقات ہو گی۔ دیکھیں اب کی بار پہلے کی طرح شعور افشا نہ کرتے ہیں یا لڑکی نے کچھ تبدیل کر دیا۔

اُدھر بھائی جان نے اسے کر کے لڑکر ہوسٹے اُدھر ابا جان کا تبادلہ ہوا اور ہم یہاں آ گئے۔ اماں بیچ میں ایک مہینہ کے لئے ان کے پاس ہو آئی تھیں اور ابا جان بھی اکثر دورے کے سلسلے میں ان سے مل لیتے بس میں نے ہی ڈیڑھ سال سے نہ دیکھا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ابا جان کو بھائی جان نے لکھا بھی تھا کہ پرویز کو یہاں بھیج دیجئے۔ میں نیم راضی ہو چلا تھا جو انجم نے کہا کہ "تم ناحق جا رہے ہو گول کر جاؤ۔" میں نے جھٹ سے اماں جان سے انکار کر دیا کہ میں نہ جاؤں گا۔ اب بھائی جان کو ایک مہینہ کی چھٹی ملی تو وہ یہاں خود ہی آ رہے تھے!

میں بھائی جان کو لینے اسٹیشن گیا، وہ حسب توقع خوب صاحب بہادر بنے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔ "کیسی جگہ ہے؟ ایک مہینہ خوب شاندار گزرے گا یا نہیں؟"

میں نے کہا۔ "اب جیسی بھی جگہ ہے آپ خود ہی دیکھ لیجئے گا۔"

"یوں نہیں ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟"

"یہی کہ سوسائٹی کیسی ہے؟ ..... سینما ہاؤس کیسے ہیں؟ کلب کتنے ہیں اور ہوٹل کہاں کہاں ہیں؟ ..... تفریح کا کیا پروگرام رہتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے ہوٹل اور کلب کی تو خوب خبر نہیں! سوسائٹی اچھی خاصی ہے، دو چار سینما ہاؤس بھی ہیں۔"

"انگلش فلم چلتی ہیں؟"

"کبھی کبھی ..."

"لاحول ولا قوۃ۔"

"کیوں؟"

"وقت ضائع ہو گا یہاں اور کیا ..... آخر تم چھٹیوں میں میرے پاس کیوں نہ آ گئے ..... کیا کرتے رہتے ہو دن بھر؟ اسکول اور گھر؟ بس؟"

"ہاں بس اور کیا۔"

"دل نہیں گھبراتا؟ صحت ٹھیک ہے!"

"کمال کرتے ہیں آپ بھائی جان ....."

"بھئی کہ از کم میں تو اس طرح نہیں رہ سکتا ..... سوچتا ہوں کہ مہینہ بھر کے بجائے دس پندرہ دن میں بھاگ جاؤں ..... تم بھی میرے ساتھ چلنا! سمجھے؟ وہیں اسکول میں داخل ہو جانا ..... انسان بن جاؤ گے! سمجھے؟"

اسٹیشن سے گھر تک وہ ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔

اماں سے ملنے کے بعد انہوں نے مجھ سے سوالات کرنے شروع کئے!

"یہ کس کا جھگڑا ہے؟ وہ کس کی کوٹھی ہے؟ اور کون رہتا ہے؟"

میں سب بتاتا رہا۔

"اور یہ برابر کا گھر.....؟"

"انجم!"

"کون انجم؟ یہ کون صاحب ہیں؟"

اور مجھے محسوس ہوا کہ میں نے استہزائی تجاہل قسم کا جواب دیا تھا۔

"ایک وکیل صاحب ہیں وہ مع فیملی رہتے ہیں۔"

"وکیل صاحب کا نام زوردار ہے! انجم!" بھائی جان نے زیر لب کہا۔

میں گھبرا گیا۔ "وکیل صاحب کا نہیں انجم نسواں کی لڑکی کا نام ہے۔"

"اوہ!" بھائی جان نے مجھے سرتاپا گھورا۔ "تو کیا بہت دوستی ہے تم سے؟"

"دوستی کیا..... بس۔" میں سٹپٹا گیا۔

"خوب! گویا کہ آپ بھی؟" انہوں نے معنی خیز طریقے پر ہنسنا شروع کیا۔

"تو پھر تفصیل بتاؤ کیسی لڑکی ہے؟"

"ابھی خاصی ہیں..... آپ کی برابر ہوں گی۔" میں نے ان کا منہ بٹانا چاہا۔

"میری برابر؟ اوہ! یوں کہو! میں تو سمجھا تھا کہ آپ!....."

میں سوچنے لگا کہ جو بات میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں اسے بھائی جان یوں لمحوں میں کیسے سمجھے لے رہے تھے!

بھائی جان کرسی پر لیٹ کر کوئی انگریزی کا ناول پڑھنے لگے اور میں نے سوچا کہ دیر تو ہو گئی ہے مگر لاؤ انجم کے یہاں ہو آؤں..... ان کو بتاؤں گا کہ ہمارے بھائی جان آئے ہیں۔ ..... دفعتہً مجھے دروازے پر ان کی آواز سنائی دی۔ "پرویز!"

میں نے چونک کر کہا۔ "جی!"

"کیا ہوا آج تم....." وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک گئیں۔ بھائی جان بھی سر اٹھا کر گھورنے لگے۔

"یہ میرے بھائی جان ہیں۔" میں نے تعارف کی رسم ضروری سمجھی۔ "اور بھائی جان یہ انجم ہیں۔ .. میں نے آپ کو بتایا تھا نا۔"

بھائی جان نے مسکرا کر ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

انہوں نے عمداً بھائی جان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا اور کھڑکی سے باہر نگاہ جما کر بولیں۔ "معاف کیجئے مجھے انگریزی نہیں آتی۔"

"اوہ!" بھائی جان نے سنبھل کر کہا۔ "کوئی حرج نہیں مجھے تمہارا دو آتی ہے۔"

"اچھا تو میں چلتی ہوں۔" وہ مڑ کر جانے لگیں۔

"انجم ذرا تو بیٹھئے نا۔" میں نے سوچا کہ اب بھائی جان ان کو بداخلاق اور پتہ نہیں کیا کیا کہیں گے اور میرا جی جلے گا۔

"جی ہاں آپ تشریف لائیں تو بیٹھئے نا!" بھائی جان نے بھی کہا۔

"بہت کام ہے..... آج پروین نہیں آئے تو میں سمجھی کہ نہ جانے کیا بات ہوئی..... اچھا آداب عرض" اور وہ چلی گئیں۔

میں نے سہمی سہمی نظروں سے بھائی جان کی طرف دیکھا کہ کیا کہتے ہیں مگر وہ کسی سوچ میں گم تھے۔

دوسرے دن اسکول کی واپسی پر میں نے سوچا کہ اب ان کے یہاں چلنا چاہئے..... اور اٹھا ہی تھا جو بھائی جان نے کہا۔

"کہاں چلے؟"

"کہیں نہیں"

"انجم کے یہاں نہیں جاؤ گے؟"

"سوچ رہا ہوں"

"چلو! ہم بھی چلتے ہیں" وہ اٹھ کر میرے ساتھ چل دیئے۔ میرا دل چاہا کہ کاش وہ میرے ساتھ نہ جاتے میں انجم سے اچھی طرح بات بھی نہ کر سکوں گا اور کل کی سی دہشت پھیلے گی۔

وہاں پہنچے تو انجم کی والدہ سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے بھائی جان کو بہت پیار کیا، دعائیں دیں۔ وکیل صاحب آگئے چائے کا دور چلتا رہا اور میں چپ چاپ بیٹھا انجم کو دیکھتا رہا جو آج بالکل مہر بہ لب تھیں تھوڑی دیر بعد ہم لوٹ آئے! بھائی جان دیر تک اماں سے وکیل صاحب کی تعریف کرتے رہے۔

تیسرے روز میں اسکول کی واپسی پر اپنے معمول کے مطابق سیدھا انجم کے یہاں پہنچا۔ اول گھر جانے میں خطرہ تھا کہ پھر بھائی جان ساتھ چلیں گے اور انجم سے بات چیت نہ ہو سکے گی! میں انہیں یہ بتانے کے لئے مضطرب تھا کہ اس دفعہ مجھے کرکٹ میں کپ ملنے کی امید ہے پہنچا تو دیکھا کہ صوفے پر لیٹی ہوئی آہستہ آہستہ گنگنا رہی ہیں۔ میں چپ چاپ جا کر پیچھے کھڑا ہو گیا اور بصد مشکل یہ شعر سمجھ سکا ؎

نہ جانے آج کیوں دھڑکن مرے دل کی نہیں رکتی
یہ آہٹ آپ کی تو نہیں آپ گزرے تھے ابھی دل سے

کچھ دیر یونہی کھڑا رہا پھر شرارت سوجھی اور پانی کا گلاس میز پر سے اٹھا کر ان کے منہ پر چھینٹا دیا۔

تڑپ کر انہوں نے گردن مروڑی اور مجھے دیکھ کر ہنس دیں "اچھا ٹھہر جاؤ بدلہ نہ لیا ہو تو..... بہت شریر ہوتے جا رہے ہو"

"آہا آپ کتنا اچھا گاتی ہیں..... افوہ!"

"واقعی؟"

"ہاں میں ڈرا تھا کہ کہیں دھوبی گدھے کی تلاش میں ادھر نہ آ نکلے"

"تو ہماری آواز گدھے جیسی ہے؟" انہوں نے میرے منہ پر کشن دے مارا۔

"نہیں توبہ..... معاف کیجئے منہ سے سچی بات نکل گئی"

"ٹھہر جاؤ بدتمیز تمہارے لئے کھانے کی چیزیں رکھی تھیں اب ہرگز نہ دوں گی"

"کھل گئی قسمت..... آپ بھی کتنی اچھی ہیں"

"جی ہاں تب ہی تو یہ قدر ہوتی ہے"

"کہہ تو رہا ہوں بھول کر منہ سے نکل گیا..... اب کھلائیے نا کیا ہے؟..... پہلے آپ کبھی ایسی عمدہ رہتیں..... کیسے

میرا خیال آیا؟"

"جاوید صاحب کے لئے بنائے تھے..... چونکہ تمہاری پسند کے تکونے تھے اس لئے رکھ لئے۔"

"تو کیا بھائی جان یہاں آئے تھے؟"

"ہاں ابھی تو گئے ہیں تمہارے آنے سے دس منٹ پہلے۔"

"آپ سے باتیں ہوئیں؟"

"ظاہر ہے ابا جان بھی یہاں موجود نہ تھے اور اماں کو تم جانتے ہو کہ وہ کتنی کم گو ہیں..... بیچارے جاوید صاحب چپکے ہی بیٹھے رہتے۔"

"کیا کیا باتیں ہوئیں؟" میں یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہو گیا۔

"وہ اپنے دورانِ تعلیم کی کچھ دلچسپ باتیں سناتے رہے۔"

نہ جانے کیوں میرا دل اُداس ہو گیا..... شاید میں یہ چاہتا تھا کہ انجم کو سوائے میرے اور کسی کی باتیں دلچسپ نہ لگیں۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ روز جب میں اسکول کی واپسی پر ان کے پاس جاتا تو وہ مجھے بتاتیں کہ ابھی جاوید صاحب یہاں سے گئے ہیں.... اور یہ بھی کہ ان کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں..... انجم کا میرے ساتھ وہی سلوک تھا اسی طرح باتیں، چوٹوں کا معالجہ، کپڑوں کی درستی، مگر نہ جانے کیوں مجھے لگتا کہ وہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہیں..... کوئی ہمارے درمیان حائل ہو گیا ہے؟ کون؟ بھائی جان! مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے رقیب تو نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ باتیں اب سوچتا ہوں اس وقت تو ایک ہی خیال تھا کہ وہ مجھ سے نہ چھن جائیں..... اور بس!

اتوار کی صبح بھائی جان اور میں دونوں ایک ساتھ ان کے یہاں پہنچے باتوں باتوں میں گانے کا ذکر نکل آیا۔ میں نے کہا "بھائی جان بہت اچھا گاتے ہیں۔" یہ بات سچ بھی تھی! انجم نے کہا کہ جاوید صاحب کو گانا سنانا پڑے گا۔ بھائی جان نے اوّل دو چار دفعہ معذرت کی، پھر تیار ہو گئے!

گانا شروع کیا۔ "کون سا گیت سنو گی انجم؟"

انجم نے کہا۔ "جو آپ سنائیں گے۔"

"کون سا گیت سنو گی انجم؟"

"کوئی سا بھی! گائیے تو آخر!"

"گا تو رہا ہوں۔" بھائی جان نے جواب دیا۔

"واہ یہ کوئی گانا ہے؟"

"ارے اور کیا..... یہ تو جاں نثار اختر کی نظم ہے۔"

"ہم نہیں سنتے..... کوئی ڈھنگ کی چیز سنائیے۔"

بھائی جان نے ایک غزل گائی جس کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے ؎

شروع راہِ محبت ارے معاذ اللہ
یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

انجم ساکت بیٹھی سنتی رہیں۔ بعد میں تعریف کچھ اس طرح سے کی کہ بھائی جان کو بہت سی چیزیں گانی پڑیں۔
انجم کو بھائی جان کی آواز اتنی پسند آئی کہ اب وہ ہر ملاقات میں گانے کی فرمائش کرتیں۔ ان بہت سی ملاقاتوں میں سے جن میں شریک ہونے کا مجھے بہت کم موقعہ ملتا تھا۔

بھائی جان ہمیشہ اسی سے شروع کرتے:

"کون سا گیت سنو گی انجم؟
گونگنا تا سا فسانہ کوئی
یا محبت کا ترانہ کوئی
کیسے بنتا ہے نشانہ کوئی
کون سا گیت سنو گی انجم؟"

اور آخر کار سب ہی طرح کے گیت سنا ڈالتے..... میں کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا..... بھائی جان کو یہاں آئے ایک مہینہ گذر گیا..... پہلے دن ان کا خیال تھا کہ دس پندرہ دن بھی نہ رہ سکیں گے اور اب انہوں نے تیاری کے نام سے ایک مہینے کی چھٹی بڑھوالی۔ حالانکہ یہ بہت چھوٹا شہر تھا جس میں نہ اچھے ہوٹل اور نہ عمدہ کلب اگر بھائی جان خوش تھے اور انجم بھی..... اگر میں رنجیدہ تھا تو اس کی وجہ سے خود بھی باخبر نہ تھا پھر اس کا تذکرہ کس سے کرتا..... ہاں مگر دل پر ہر لمحہ ایک بوجھ سا رہتا اور روح جیسے تھک کر آنکھیں بند کرنا چاہتی ہو۔

وقت کی رفتار کو میں نہ روکنا چاہتا تھا اور پھر مشیت کو ان کھیلوں سے کیا ایسے نامکمل افسانوں کے خاکے بہت سے بکھرے پڑے رہتے ہیں..... اگر آنسو کسی لمحہ بھی نہ تھمیں تو ان کا دل سے احترام ہی جاتا رہتا ہے۔

یونہی چپ چاپ وہ دوسرا مہینہ بھی بیت گیا۔

ابا جان نے کہا: "جاوید تم نوکری پر کب جا رہے ہو؟"

"سمجھ میں نہیں آتا ابا جان۔"

"کیوں؟ چھٹی کس تاریخ سے ختم ہوتی ہے؟"

"مجھے آج وہاں موجود ہونا چاہئے تھا۔"

"تو پھر تم کیوں نہیں گئے؟"

"سوچتا ہوں کہ اب خود جاؤں یا استعفا بھیج دوں۔"

"استعفا!" ابا جان نے چونک کر پوچھا: "اب نوکری کا ارادہ نہیں ہے؟"

"یہ نوکری کچھ ٹھیک نہیں ہے ابا جان..... پھر ہمارا افسر بڑا سخت ہے۔ بس ذرا ذرا سی بات پر..... اور سب سے بڑی مشکل یہ کہ وہاں مجھے اچھا کھانا نہیں ملتا..... آپ نے محسوس کیا کہ یہاں آکر میری صحت کتنی سنبھل گئی ہے۔ اب چاہتا ہوں کچھ دن یہاں رہ کر بے فکری کروں۔"

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جہاں سے بھاگ کر بھائی جان مجھے آدمی بنانا چاہتے تھے وہ جگہ ان کی نظر میں اب کبھی بے رنگ و لو ہو گئی ہے۔ جہاں اچھے اچھے ہوٹل ہیں وہاں کھانا مزا کیوں ملتا ہے۔ جہاں اچھی انگلش فلمیں چلتی ہیں وہاں کیوں دل نہیں لگتا اور جس افسر کی وہ ہمیشہ تعریف

لکھا کرتے تھے وہ اب بڑا کیوں ہو گیا ہے..... میں یہ سب جانتا تھا اور مجھے بھائی جان سے ہمدردی بھی تھی..... وہ میرے رقیب تو نہیں۔ انہوں نے انجم کو میری طرف سے تو نہیں ہٹا ڈالا..... اور پھر وہ کیا جانیں کہ میں اداس رہتا ہوں!

میرے دل میں شدید آرزو پیدا ہوتی کہ کاش انجم کی بھائی جان کے ساتھ شادی ہو جائے! میں انہیں خود کوئی گیت نہ سنا سکا مگر زندگی بھر گیت سننے تو دیکھتا رہوں گا..... اور کیا یہ میرے لئے بہت نہیں!

بھائی جان نے نوکری چھوڑ دی..... انجم سنتی رہتیں میں دیکھتا رہتا اور وہ گاتے رہتے۔

کوئی فطرت کا بہار یں نغمہ ؟ چاند تاروں کا خمار یں نغمہ؟
یا شگوفوں کا نگار یں نغمہ ؟ کون سا گیت سنو گی انجم ؟

نغموں کا ایک تانا بانا سا بن کر ہمارے چاروں طرف پھیل گیا۔ ایک طرف بھائی جان گنگنا رہے تھے..... دوسری طرف میں تھا مجبور! بیچ میں انجم! ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی! ایک کے حال سے غافل اور دوسرے کی باتوں سے باخبر! میں دن رات اس الجھن میں اپنے لئے سکون کی تلاش کرتا رہتا..... مگر میں چاہتا کیا تھا؟ یہ مجھے آج بھی معلوم نہیں ہے۔

ایک صبح جب ابا جان کسی ضروری کام سے ہفتہ بھر کے لئے باہر جا رہے تھے تو چچا جان کی علالت کا تار موصول ہوا..... ابا جان کو انتہائی ضروری کام تھا۔ انہوں نے بھائی جان سے کہا کہ تم آج ہی شام کو اپنے چچا کے پاس لکھنؤ چلے جاؤ اور ہفتہ بھر بعد جب میں وہاں پہنچوں تو تم واپس چلے آنا۔ بھائی جان اس خبر سے مضطرب ہو گئے مگر لاچار تھے۔ اسی شام کو جانا پڑا۔ انجم سے ملنے گئے تو میں عمداً گھر پر رہ گیا۔ میرا دل ہی نہ چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ جاؤں! واپس لوٹے تو کتنے افسردہ تھے۔ مجھے جم آنے لگا..... بھائی جان کو اسٹیشن پہنچا کر میں نے سوچا کہ انجم کے پاس چلتا ہوں، ان سے کہوں گا کہ بھائی جان ایک ہفتہ بعد ضرور آ جائیں گے۔

ان کے یہاں پہنچا وہ اپنے پلنگ پر آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی تھیں۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ ان کو آواز دوں! چپ چاپ لوٹ آیا۔

پھر دوسرے دن صبح کو باغ میں گیا۔ نو بجے کی شروع تانیں تھیں اور صبح کے وقت خاصی ٹھنڈ ہوتی تھی مگر میں صبح کو باغ میں ضرور جاتا تھا اور وہ مجھے وہاں ضرور ملتی تھیں۔ سوچ رہا تھا کہ آج خدا جانے وہ موجود ہوں گی یا نہیں مگر پہلی نظر میں ان کو حوض کے کنارے بیٹھا ہوا دیکھ لیا! حال چال پوچھنے کے بعد انہوں نے پہلا سوال کیا۔

"جاوید! ایک ہفتہ بعد ضرور واپس آ جائیں گے؟"

"ہاں ضرور!"

"اچھا ... پھولوں کو ہاتھ نہ لگانا! سمجھے؟"

"سمجھ گیا۔"

انہوں نے پھول توڑے اور جب ایک گلاب کا پھول میرے کوٹ میں لگا کر واپس چلی گئیں تو میں نے سنگ مرمر کے حوض پر بیٹھ کر محسوس کیا آج بہت دن بعد میری بے چین روح کو کسی نے لوریاں دے کر آرام کی نیند سلا دیا ہے..... اور میں بہت خوش ہوں!

ایک ہفتہ گذر گیا۔

"آج تمہارے بھائی جان کے آنے کا دن ہے؟"

"جی ہاں آج آ جائیں گے!"

"تم اسٹیشن جاؤ گے؟"

"ضرور جاؤں گا۔"

"پھر ان کے ساتھ یہاں آؤ گے؟"

"ضرور آؤں گا۔"

میں شام کو گیا ضرور مگر بھائی جان کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا! انجم کو یہ بتانے کہ چچا کی طبیعت بدستور خراب ہے بھائی جان ایک ہفتہ بعد آئیں گے ——— اور ایک ہفتہ!

یہ دوسرا ہفتہ ان کے چہرہ پر اُداسی کا رنگ مل مل کر گذر گیا مگر بھائی جان پھر بھی نہیں آئے۔ . . چچا کی طبیعت ابھی تک خراب تھی۔

آخر کار ابا جان اماں کو لے کر وہاں چلے گئے اور میں یہاں تنہا رہ گیا۔ زیادہ وقت اسکول کے علاوہ انجم کے پاس گزارنا وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتیں اور ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو امڈ آتے ..... میرا دل ڈوب جاتا .... میں اس آتش بداماں جنت سے بھی باز آیا.. .... بھائی جان لوٹ آئیں تو پھر بلا سے انجم کی یہ اداسی ساری کی ساری زندگی کے لئے مجھ پر مسلط ہو جائے! مگر ان کے آنسو! جیسے یہ پیر اگنا وہ ہو ——

دو ڈھائی مہینے ایسے عجیب گزرے .. .... رُکے رُکے اور پچکے پچکے ..... ابا جان لوٹ آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ چچا جان ابھی طرح سے ہیں اور اب میں جاؤں گا تو تمہاری ماں کو لے آؤں گا جاوید بھی تب ہی آئیں گے۔

میں نے انجم کو جا کر بتایا۔

"آ جائیں تب کی بات ہے۔" انجم نے کہا۔

اور میں نے سوچا کہ آخر کیوں نہیں آئیں گے .... ضرور آئیں گے۔

ابا جان دوبارہ گئے۔ واپسی کا جو دن بتا گئے تھے اس کا میں نے لمحہ لمحہ گن کر انتظار کیا یہ آج بھائی جان ضرور آ جائیں گے۔"

"دیکھو!"

"مذاق نہیں ڈٹ کر ناشتہ کھلانا پڑے گا آپ کو۔"

"اچھا!"

اسٹیشن پہنچا۔ گاڑی لیٹ تھی اور مجھے جھنجھلا آ رہی تھی خدا خدا کر کے بیل آئی تو ابا جان تنہا اُترے۔ میں گھٹ کر رہ گیا۔

"بھائی جان اور اماں کہاں ہیں؟"

"وہیں ہیں!" ابا جان نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں آئے؟"

"بس ہفتہ بھر بعد آنے والے ہیں۔ .... جاوید تو انگلینڈ جا رہا ہے۔"

"اں!" مجھے ابا جان کی بات کا اعتبار نہ آیا۔

"مذاق نہیں ..... سارا انتظام ہو چکا ہفتہ بھر بعد تو یہاں آئے گا اور دو دن ٹھہر کر اپنا سامان لے کر چلا جائے گا۔"

"یہ کیا سوجھا؟"

"اس کو تو ایسی بے تُکی سوجھتی ہے پہلے کہا نوکری کروں گا میں نے کہا تمہاری مرضی پھر استغفارے دیا۔ میں نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ اب بیٹھے بٹھائے تعلیم کا شوق ہوا تو ولایت چل دیئے! مجھ کو تو اب خبر ہوئی جب ان کا پاسپورٹ تک بن چکا ہے۔"

"آپ نے روکا نہیں؟" میں نے ابا جان سے پوچھا۔

"میں کیا روکتا وہ اس قدر خود مختار ہیں ان کو چاہئے تھا کہ اول مجھ سے اجازت لیتے۔ ماں رو رو کر جان کا خون کر رہی تھی مگر ماں صاحب نے قسم کھائی ہے کہ ولایت جا کر پڑھوں گا۔"

میں سکتہ کے عالم میں گھر لوٹ آیا۔ انجم کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ یہ ولایت کا قصہ اگر وہ سنیں گی تو کیا کہیں گی اُف توبہ! میں نے کوشش بھی کی تو وہاں نہ جا سکا۔ صبح کو باغ میں گیا۔

"جاوید نہ آئے تو آپ بھی چھپ گئے۔"

"ابا جان نے کچھ کام بتا دیا تھا۔"

"تمہارے بھائی جان تو پھر اب کیا آئیں گے مگر خالہ جان کیوں نہیں آئیں؟"

"جناب سنا ہے اگر اگلے ہفتہ سب نہ آ جائیں۔"

"بس جاؤ بھی۔" انجم نے ہونٹوں کو دانت سے کاٹتے ہوئے جھکیں نیچی طرف اٹھائیں ... میں سر سے پیر تک لرز گیا۔ اور لاکھ کوشش کی مگر بھائی جان کے ولایت جانے کی بات نہ سنا سکا۔ جس دن پھپھو کے آنے کی خبر تھی اس دن مجھ کو علم تھا کہ وہ ضرور آ جائیں گے۔ مگر اس یقین میں کتنا دکھ اور غم تھا یہ میں جانتا ہوں۔ وہ آئیں گے اور تیسرے دن چلے جائیں گے ..... ایسی جگہ جہاں سے واپسی کے لئے مہینے نہیں گنے جاتے بلکہ برسوں کا شمار ہوتا ہے۔

بھائی جان ریل سے اترے۔

"آپ ولایت جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!"

"کیوں؟"

"پڑھنے!"

"کیا پڑھنے؟"

"بس کچھ ..... محض ایک ولایتی ڈگری چاہئے!" اور وہ ہنسنے لگے۔ مگر آگر انہوں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ مجھ سے انجم کے متعلق ایک بھی سوال نہ کیا اور نہ وہاں گئے۔ میں بھی بم بکوہ بیٹھا رہا۔

اماں بہت دن کے بعد آئی تھیں اس لئے انجم کی والدہ ان سے ملنے کو آئیں۔ اماں نے انہیں بتا دیا کہ جاوید پرسوں ولایت جا رہا ہے۔ میں بوکھلا گیا کہ اب یہ انجم سے جا کر کہہ دیں گی اور پھر نہ جانے کیا ہوگا! مجھے رہ رہ کر بھائی جان پر غصہ آ رہا تھا۔ اس طرح بنتے تھے کہ جیسے ان کو انجم سے بہت محبت ہے اور اب بلا وجہ ولایت جا رہے ہیں تو ان سے ملے تک نہیں ... ان کی زندگی برباد کرنے کے یہ ذمہ دار ہیں۔ ان کا کیا بگڑتا؟ انجم بجھ کر رہ جائے گی اور میری زندگی پھیکی اور بے دس! کیا مجھے انجم سے محبت نہیں؟ اور میں ان کا دکھ خوشی سے برداشت کر سکوں گا؟ اس گہرے سوچ نے دوسرے دن شام تک میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میں ڈر کے مارے انجم کے پاس بھی تو نہ جا سکا۔ نہ جانے ان کی کیا حالت ہوگی۔ بھائی جان کے سامان کی مکمل فہرست بنا کر میں کمرے میں گیا جہاں وہ ادھر اُدھر کی چھوٹی موٹی چیزیں ہینڈ بیگ میں بند کر رہے تھے! ——— دروازے پر پہنچا تو مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی اور پھر کچھ اُلجھے ہوئے سے الفاظ! انجم وہاں موجود تھیں! میرے قدم رُک گئے ——— کچھ دیر بعد بھائی جان کی آواز تھی۔

"زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم۔"

بھائی جان کو اب بھی جاں نثار اختر کی کوئی نظم یاد آگئی تھی۔ مگر انجم اس کا مطلب نہیں سمجھ سکیں۔

"تو پھر زندگی کیا ہے؟"

میں بھائی جان کا جواب سننے سے پہلے وہاں سے لوٹ آیا۔ انجم کے آنسو بھی آگ کی طرح میری رگوں میں گھل کر مجھے جھلسے دے رہے تھے۔

دوسرے دن صبح کو بھائی جان نے مجھ سے کہا کہ اسٹیشن جاکر گاڑی کا صحیح وقت معلوم کر آؤ۔ میں نے بمبئی جانے والی گاڑی کا وقت معلوم کیا جو رات کو ساڑھے دس بجے یہاں سے جاتی تھی اور پھر گھر کی طرف لوٹا تو انجم مجھے اپنے باغ کے پھاٹک پر مل گئیں۔

"پرویز میرا ایک کام کروگے؟"

"کہئے۔" میں نے ان کی محترم آنکھوں اور لٹکتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر بے بسی کے ساتھ کہا۔

"جاوید آج جا رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"کتنے بجے؟"

"رات کو ساڑھے دس بجے!"

"اچھا... تو ان سے کہنا کہ جانے سے پہلے میں ان سے ایک مرتبہ ملنا چاہتی ہوں۔"

"بہت اچھا۔"

"اور دیکھو کہنا کہ سات بجے شام کے بعد سے میں ان کا یہاں باغ میں انتظار کروں گی وہ مجھ سے کھڑے کھڑے مل لیں۔"

"مگر انجم یہاں باغ میں تو رات کو شدید سردی ہوتی ہے۔"

"کوئی حرج نہیں میں ان کو زیادہ دیر نہیں روکوں گی۔"

"لیکن آپ خود؟"

"میری پروا نہ کرو..... تو پرویز تم ان سے کہہ دوگے نا؟"

"ہاں ہاں ضرور!"

میں دیر تک کھڑا ہوا ان کو ڈگمگاتے قدموں سے واپس جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مگر آکر بھائی جان کو ان کا پیغام سنا دیا۔ وہ سن کر چپ ہو گئے اور پھر سے مہمانوں کا تانتا لگ گیا۔ ابا جان کے دوست اور اماں کی سہیلیاں سب جمع ہونے لگیں۔ کوئی امام ضامن لے کر آیا تھا اور کوئی صدقہ اتارتا تھا۔

شام گزری اور رات ہو گئی۔ "بھائی جان آپ انجم سے مل لیجئے۔"

"وہ خود یہاں کیوں نہیں آئیں؟"

"باغ میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں نا!"

"میں کس طرح جاؤں یہاں اتنے لوگ جمع ہیں؟"

"وہ دس پندرہ منٹ کو ہو آتے اب آٹھ بج گئے اور وہ سات بجے سے وہاں آپ کی منتظر ہوں گی۔"

"اچھا دیکھو موقع نکالتا ہوں۔"

نو بج گئے۔

"بھائی جان اب لڑنے جھگڑنے ۔ آپ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں چلے جائیں گے۔"

"ہاں!"

"انجم سے مل لیجئے نا!"

"دیکھو اماں کس قدر رو رہی ہیں۔ یہاں سے اٹھ کر گیا تو وہ کیا سوچیں گی؟"

"میں پانچ منٹ کے لئے۔"

"کوشش کرتا ہوں۔"

"بھائی جان دس بج گئے۔"

"کیا کروں پرویز سمجھ میں نہیں آتا۔"

"ایک لمحے کو ہو آئیے۔"

"کوئی اٹھنے دے تب نا۔"

سوا دس ہوئے تو ابا جان نے کہا۔ "بیٹا جاوید اب تمہاری روانگی کا وقت ہو گیا۔"

"چلتا ہوں ابا جان!"

میں نے مضطرب ہو کر بھائی جان سے کہا۔ "بھائی جان انجم!"

"مجبور ہوں پرویز۔"

اور جب موٹروں میں بیٹھ کر سب اسٹیشن چلنے لگے تو میرے کانوں میں آپ سے آپ انجم کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ کاش بھائی جان ان سے ملحہ بھر کو ہی جا کر مل لیتے وہ اس شدت کی سردی میں دھڑکتے دل سے منتظر ہوں گی۔ اسٹیشن پہنچے تو اماں کی روتے روتے بری حالت ہو رہی تھی بھائی جان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ "خط لکھتے رہنا پرویز۔"

جب ریل نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے آنسو پونچھ کر اماں سے کہا۔ "اب واپس چلئے۔" ابا جان تو بھائی جان کو چھوڑنے بمبئی گئے تھے اور اماں لوٹ کر آئیں اماں کے آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے ورنہ میں اسی وقت جا کر انجم سے ملتا میرے سینے میں آنسوؤں کا طوفان امڈ رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ یہ سارے آنسو میں انجم کے سامنے جا کر بہاؤں ..... ممکن ہے کہ ہم دونوں کو تسکین ہو جائے! رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور سینے میں نامعلوم کیا گھٹن ہوتی رہی۔

صبح کو چھ بجے کے قریب میں بستر سے اٹھ کر برآمدے میں نکل آیا۔ فروری کا شروع تھا اور گذشتہ رات غیر معمولی سردی رہ چکی تھی۔ کہر کے مارے آس پاس کچھ نظر نہ آتا تھا۔ نلکا میں نظر جمائے حالانکہ کھڑا رہا۔ جب سے سردیاں شدت کی ہوئیں تو انجم نے صبح سویرے کے بجائے دن چڑھے باغ میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ میرے اسکول کے اوقات بھی بدل گئے تھے اس لئے میں بھی دیر سے جایا کرتا تھا۔ آج ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ اس کہرے اور ٹھنڈ میں نکل جاؤں اور باغ کا چکر کاٹوں اور کوٹ پہن کر میں باغ میں چلا گیا جہاں اوس سے ہر چیز تر تھی اور ٹھٹھری ہوئی نظر آتی تھی..... چکر لگا کر سنگ مرمر کے حوض تک پہنچا اور دفعتہ ٹھٹک کر رہ گیا..... کوئی بیٹھا ہوا تھا! شاید انجم!

میں دوڑ کر قریب گیا..... وہی تو تھیں!

"انجم..... انجم!" وہ شاید سو رہی تھیں..... وہ اتنے سویرے بغیر کسی گرم کپڑے کے یہاں آ گئی ہیں اور اس برف جیسے سنگ مرمر پر لیٹی ہیں..... میں نے حیران ہو کر ان کا ہاتھ کھینچا۔ "انجم!"

مگر وہ بے حس و حرکت تھیں۔ کپڑے اوس کے اثر سے بالکل بھیگے ہوئے تھے ہاتھ برف سے زیادہ ٹھنڈے اور چہرہ سنگِ مرمر سے زیادہ سفید کیا انہوں نے ساری رات یہاں گزاری ہے! اور یہ حالت!

بجلی کی طرح ایک وحشت ناک خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا اور میں نے ان کو پاگلوں کی طرح جھنجھوڑ دیا۔ "انجم! انجم!"

انہوں نے آنکھیں کھول دیں چونک کر نہیں بلکہ سہم کر!

"پرویز!"

"یہ آپ کیا کر رہی تھیں؟" میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔" انہوں نے گردوپیش پر اپنی ویران نگاہیں دوڑا کر کہا۔

"کب سے یہاں لیٹی ہیں؟"

"کب سے؟ دس بجے تک تو مجھے یاد ہے کہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔"

"تو آپ رات بھر یہاں رہی ہیں؟"

"ہاں!"

"اس شدید ٹھنڈ میں؟"

"نہیں زیادہ ٹھنڈ تو نہ تھی۔"

"واہ رات کو تیامت کی سردی تھی جب ہم اسٹیشن سے لوٹ رہے تھے تو دانت سے دانت بج رہا تھا۔"

"تمہارے بھائی جان گئے؟"

میں اس کا جواب نہ دے سکا۔

"تم نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟"

میں اب بھی خاموش رہا۔

"اچھا یہ تو بتا دو انہوں نے میرے لئے کوئی بات بھی نہیں کہلوائی؟"

میں نے بیتاب ہو کر ان سے کہا۔ "انجم میں آپ سے یہاں بات نہ کروں گا۔ خدا کے لئے اندر چلئے آپ کو احساس نہیں آپ کا کیا حال ہے؟"

"چلو!" وہ چلنے لگیں مگر لڑکھڑا گئیں۔

"ٹھہریئے۔" میں نے ان کے بازو کو سہارا دیا ان کے چہرے پر شبنم کی بوندیں چمک رہی تھیں اور کپڑے تو اس قدر تر تھے کہ نچوڑے جا سکتے تھے۔

میں نے ان کو پکڑ کر ان کے کمرے تک پہنچا دیا اور واپس آتے ہوئے کہا کہ "میں اسکول سے واپسی پر آپ کے پاس آؤں گا۔ آپ جا کر آگ کے پاس بیٹھئے۔ خدا نہ کرے اگر سردی لگ گئی تو غضب ہو جائے گا۔"

اسکول گیا مگر مطلق کام نہ ہو سکا۔ ایسا اضمحلال تھا کہ جس کو بیان ہی نہیں کر سکتا۔ . . . . . واپس لوٹا تو سیدھا ان کے یہاں گیا اور برآمدے میں ہی حیران کھڑا رہ گیا۔ کمرے سے ڈاکٹر نکل رہا تھا وکیل صاحب بھی انتہائی پریشانی کے عالم میں ساتھ تھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے مضطرب ہو کر وکیل صاحب سے پوچھا۔

"انجم کی طبیعت خراب ہے!"

میں سمجھ گیا کہ یہ رات کی سردی کا نتیجہ ہے کمرے میں جا کر دیکھا تو بخار کی تیزی سے بیہوش تھیں اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں! مجھ سے

ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے گھر آ کر اماں کو بتایا اور بستر پر گر پڑا۔

"خدایا اب کیا ہو گا؟"

پھر تھوڑی دیر بعد گیا وہی کیفیت تھی، دیکھتا رہا اور پھر لوٹ آیا۔ صبح کو اسکول سے پہلے گیا پتہ چلا رات بھر طبیعت سخت خراب رہی ہے اور اب بھی بیہوش ہیں۔ . . .

اسکول جانے کی ہمت نہ تھی مگر کہیں بھی سکون بھی نہ ملتا تھا لاچار چلا گیا اور پورے وقت کلاس میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ شام کو دھڑکتے دل سے جا کر دیکھا . . . . . سارے گھر میں مُردنی چھا رہی تھی۔ برآمدے میں ڈاکٹر اور وکیل صاحب باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر کہنے لگا۔ نمونیہ ہو گیا ہے دونوں پھیپھڑوں پر اثر ہے . . . . . پوری احتیاط کیجئے آگے خدا مالک ہے۔"

میں وہیں سے بھاگ آیا اور باغ میں ایک تنے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور دل کو کوئی دونوں ہاتھوں سے مسل رہا تھا۔

"اللہ کرے انجم اچھی ہو جائیں اور ان کے بدلے مجھے موت آ جائے۔"

رات کو گیا دیر تک پلنگ کے پاس کھڑا رہا۔ ان کی طبیعت بدستور خراب تھی اور بیہوش تھیں . . . . میں نے واپس آ کر ساری رات کرسی پر بیٹھے گذار دی . . . . . اور تڑپ تڑپ کر دعا دیں!

ڈاکٹروں نے انجکشن دے دے کر ان کے دونوں بازو چھلنی کر دیئے تھے مگر ان کو احساس نہ تھا۔

بیماری کے چار جان لیوا دن گزرنے کے بعد پانچویں دن صبح کو پتہ چلا کہ ان کی طبیعت بہتر ہے اور ہوش میں ہیں! میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اماں اکثر وہیں رہتی تھیں۔ اس وقت بھی موجود تھیں میں نے کمرے میں جا کر دیکھا تو انجم آنکھیں کھولے ہوئے لیٹی تھیں۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور جواب میں ایک مدھم سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

وکیل صاحب کی بیوی بھی ملنے آئی تھیں انہوں نے اماں سے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

"جاوید میاں کب لوٹیں گے؟"

اماں نے کہا "دو سال کی کہہ گیا ہے۔"

"بہن تم نے ناحق جانے دیا ماشاء اللہ اچھے خاصے پڑھے لکھے تو ہیں۔"

"آج کل کے زمانہ میں اماں باوا کی کون سُنتا ہے جو جی میں آئے کرتے ہیں۔ میں نے تو بہتیرا روکا مگر وہ باز نہ آیا۔"

"پھر بھی آ خر گئے کیوں ہیں؟"

"کیا بتاؤں بہن آج کل کی لڑکیوں میں شرم کا تو نام نہیں۔ دیدہ کا پانی ڈھل گیا ہے۔ . . . . جاوید چچا کی بیماری میں گئے تھے ان کی لڑکی بہت فیشن ایبل ہے۔ بی۔ اے پاس ہے! وہ کہنے لگی کہ میں تو اس سے شادی کروں گی جس کے پاس ولایت کی ڈگری ہو گی! بس جاوید کر چڑ ہو گئی کہ ولایت جاؤں گا . . . . . پھر کس کے کہنے سے رُکتا؟"

"تو چچا کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"اوہ کیا یہی قربانی ہے۔"

وکیل صاحب کی بیوی اور اماں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور میرا دم رُکا جا رہا تھا۔ مجھے خود بھی علم نہ تھا کہ بھائی جان کس وجہ سے دفعتہً ولایت جانے کو تیار ہو گئے ہیں! اب پتہ چلا کہ چچا کی لڑکی نے یہ فرمائش کی تھی! کاش اماں نے یہ سب انجم کے سامنے نہ کہا ہوتا

میں نے انجم کی طرف دیکھا تو انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

کمیل صاحب نے آکر کہا کہ ڈاکٹر نے مریض کے کمرے میں زیادہ بیٹھنے کو منع کر دیا ہے۔ ہم واپس آ گئے۔

اماں کی گفتگو نے مجھے عجب الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ خدا خدا کر کے آج ان کی طبیعت سنبھلی تو یہ خبر سنی اب اللہ جانے اس کا کیا اثر لیں گی۔

شام کو گھر سے نکل ہی رہا تھا جو ان کا نوکر بھاگتا ہوا آیا میں نے گھبرا کر پوچھا "کیا بات ہے؟"

"بیگم صاحبہ کو جلدی بھیجیے انجم بی بی کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔"

میں ان کی بات ختم ہوتے سے پہلے بھاگا اور سیدھا ان کے کمرے میں گیا..... یا اللہ کیا عجب عالم تھا۔ تین چار ڈاکٹر پلنگ کے پاس جمع تھے اور بار بار انجکشن دے رہے تھے! انجم بالکل غافل تھیں اور زور زور سے سانس آ رہا تھا۔ اتنی زور سے کہ باہر برآمدے میں بھی اس کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔

کمیل صاحب روتے ہوئے کہا "اب کیا ہو گا؟"

ڈاکٹر نے مایوس لہجے میں جواب دیا "خدا بہتر جانتا ہے دعا کیجئے۔"

میں تیر کی طرح کمرے سے باہر نکلا اور بے خبری میں بھاگتا ہوا باغ میں پہنچ گیا۔ اسی سنگ مرمر کے چبوترہ پر گر پڑا جس پر انجم نے ایک رات گزاری تھی۔ دماغ میں کوئی خیال تھا نہ دل کو صدمے کا احساس! میں لیٹ لیٹ کر رونا گیا یہاں تک کہ سر چکرانے لگا، ہاتھ پیر ڈھیلے ہوتے گئے..... اور میں بیہوش ہو گیا۔

پھر ہوش آیا رات کا وقت تھا اندھیرا چھا رہا تھا میں چھپکی چاندنی کا بس نہ چل رہا تھا..... وہاں اب کچھ باقی نہیں ہو گیا سب کچھ ختم ہو چکا۔ میرے قدم گھر کی طرف اٹھنے لگے جہاں گہری خاموشی طاری تھی..... یا اللہ اب کیا سنوں گا! میں نے ستون کا سہارا لیتے ہوئے سوچا..... برابر سے ایک ذکر گزرا میں نے مشکل کہا۔ "انجم!"

اس نے کہا۔ "اچھی ہیں!"

"اچھی ہیں!" میں پھر بھاگا اور کمرے کے پاس جا کر رک گیا انجم کی والدہ برآمدے میں بیٹھی تھیں۔

"انجم کیسی ہیں؟"

"خدا کا شکر ہے۔"

"میں جا کر دیکھ لوں؟"

"ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ بات چیت نہ کریں۔"

"میں بات نہ کروں گا۔"

"اچھا تو جا کر دیکھ لو۔"

میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا وہ آنکھیں کھولے ہوئے دروازے کی طرف منہ کئے لیٹی تھیں! مجھے دیکھ لیا۔

"کیا حال چال ہے؟" بے حد نحیف آواز آئی۔

میں بے قرار ہو کر پلنگ کے پاس دوزانو ہو گیا۔

"آپ اچھی ہیں تو میں بھی اچھا ہوں۔

"آنکھیں سوج رہی ہیں! کیا روتے تھے؟"

میں نے بے قابو ہو کر ان کے ہاتھ کو تھام لیا اور کوشش کے باوجود آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بھی آنسو چمک رہے تھے۔

مسرت کے احساس نے مجھے بیخود کر دیا اور اپنے حواس سنبھالنے کو میں کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر تکنے لگا جہاں آسمان پر تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک چمکتا ہوا بڑا سا تارا ٹوٹا اور اندھیرے میں ڈوب گیا۔ میں نے فگر کو انجم کی طرف دیکھا تو وہ بھی آسمان کو تک رہی تھیں۔

"یہ تارے کیوں ٹوٹا کرتے ہیں؟" میں نے موضوع بدلنے کے خیال سے کہا۔

"جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو آسمان سے ایک چمکتا ہوا تارا ٹوٹ کر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔"

"میں نے کہا: واہ یہ آپ نے نرالی منطق نکالی۔"

"نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا خیر ہوگا۔" میں نے چاہا کہ کسی طرح بات کو ٹال دوں۔

"پرویز تم کو میرا نام تو معلوم ہے؟"

"جی ہاں کیوں نہیں۔" میں اس سوال پر حیران ہو گیا۔

"جانتے ہو انجم کسے کہتے ہیں؟"

میں بات کا مطلب سمجھ گیا۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

"تارے کو کہتے ہیں۔"

اس سے قبل کہ میں کچھ کہوں ان کی والدہ کمرے میں داخل ہو گئیں۔

"پرویز تم نے وعدہ کیا تھا کہ بات نہیں کرو گے۔"

"معاف کیجئے..... چلتا ہوں۔" میں انجم کو خدا حافظ کہہ کر اطمینان اور خوشی کے سانس لیتے ہوئے گھر لوٹا۔ اب ان کی طبیعت بہتر ہے خدا نے چاہا تو دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

کئی دن کے بعد رات کو نیند آئی اور میں بے سُدھ ہو کر سو گیا۔

صبح کو آنکھ کھلی، کمرے سے باہر نکلا تو اماں موجود نہ تھیں۔ میں نے نوکر سے پوچھا۔

"اماں کہاں ہیں؟"

"وکیل صاحب کے یہاں!"

میرا جی دھک سے ہو گیا..... پھر سے طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔ ننگے پاؤں نکل کر دوڑا۔

بہت لوگ جمع تھے۔ میں دیوانوں کی طرح سب کے بیچ میں سے گذرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ رونے کی آوازیں چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھیں..... اور جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو میری نگاہیں انجم کے پلنگ سے ٹکرائیں۔ نہ وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ نہ ہنستے ہوئے لب..... صرف ایک سفید چادر..... جس نے ان کا آخری پیغام مجھ تک پہنچا دیا..... "تارہ ٹوٹ چکا تھا!"

مدھو سودن

سمندر اور تین کمرے

اپنے قریب اس کی موجودگی کے ایک شدید احساس کو لئے ہوئے وہ بینچ پر بیٹھی رہی۔ یہاں سے اٹھنا بے تکا معلوم ہوتا تھا۔ اور یہاں بیٹھے رہنا بھی بے ہنگم سا معلوم ہو رہا تھا۔ بینچ پر اس اجنبی نوجوان کے پاس بیٹھے ہوئے اس کے اعصاب میں ایک عجیب سی حرکت پھیل گئی تھی۔ جسے نیم اختیاری طور پر روکنے کی کوشش میں وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اپنی یہ سنجیدگی اسے پسند نہ تھی لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔

سمندر کے کنارے پڑے ہوئے ان بنچوں پر دور دور تک لوگ بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ لیکن خود کو اس نوجوان کے ساتھ تنہا سا محسوس کر رہی تھی جو اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔ اس کے بھاری ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے اور وہ ٹھہر ٹھہر کر ایک پریشان تفکر کے سے انداز میں انگلیوں سے اپنے گھٹنوں پر تھپکی دینے لگتا تھا اور اس کی طرف سے بظاہر بالکل لاپروا سا تھا۔ جیسے اسے سیما یعنی مسز ورمن کی موجودگی کا احساس نہیں ہے۔ سیما کو محسوس ہوا تھا کہ اس کا یہ انداز اکتسابی معلوم ہوتا ہے اور اس سے اسے ایک غیر شعوری تحقیر کا سا احساس ہو رہا تھا لیکن وہ بے توجہی سے سمندر کے افق کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں فاصلے پر بنشکی کا ایک مختصر سا ٹکڑا سمندر میں گھستا چلا گیا تھا اور اس پر ہستادہ بلند واٹر ریزوٹر کے عقب میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ غروب آفتاب کی سرخی کا سایہ سمندر اور آسمان کے سنگم پر ساکن ہو گیا تھا۔ سمندر کی سطح کو چھوتا ہوا یہ سایہ سرمئی ہوتا گیا تھا اور تاریکی کا منبع سمندر کا نیلا پانی معلوم ہوتا تھا۔

سیما کی توجہ لہروں کی طرف منعطف ہو گئی تھی اور لہروں کے شور سے جس کے شعور سے فیڈ ہو گیا تھا وہ پھر سن رہی تھی۔ سمندر آج ساکن نہ تھا، ہوا تیز تھی۔ لہریں گرد و کنار کا شور کرتی ہوئی کنارے کی طرف بھاگی آتی تھیں اور کنارے سے ٹکرا کر پھیل جاتی تھیں۔ اور پھر واپس سمندر میں چلی جاتی تھیں لہروں کو دیکھتے ہوئے سیما ایک لمحے کے لئے اس کی موجودگی سے غافل ہو گئی، وہ یہ چاہتی تھی اور وہ توجہ سے دیکھنے لگی کہ یہ لہریں کہاں سے مؤثر ہوتی ہیں۔ لیکن اسے معلوم نہ ہو سکا۔ سمندر کی وسعت بھرپور سے فاصلے پر آنکھ کو لبھا جاتی تھی۔ اور وہ لہر اپنے آگے ایک اندھیرا سا سایہ لئے کنارے کی طرف دوڑی آتی تھی اور اس کے پیچھے دوسری لہر اور اس سے پہلے کہ پہلی لہر کنارے سے ٹکرا کر واپس جائے دوسری لہر اس سے آ کر ٹکرا جاتی تھی۔ لہروں کے تسلسل سے ایک شور ہوتا تھا جو بیک وقت پھیلا ہوا بھی ہوتا اور گنجان بھی اور مجموعی شور میں مل جاتا تھا جو ایک مسلسل صوتی حرکت معلوم ہوتا تھا۔

وہ اس میں منہمک ہو گئی تھی کہ اچانک سیٹ پر نوجوان نے حرکت کی۔ وہ اپنی صورتِ نشست بدلنے کے لیے ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھ رہا تھا، پھر ایک خفیف سی بے چینی سے اس نے اس ارادے کو ملتوی کر دیا اور پاؤں پھیلا کر بنچ کے سہارے نیچے کو جھک گیا۔ سیما کے دل میں اُسے دیکھنے کا ایک مختصر سا تجسس پیدا ہوا اور اُس نے دیکھ لیا، اس کی پیشانی پر بے چینی کی مختصر شکنیں تھیں اور — اچانک اس نے چہرے کی ایک خفیف سی جنبش سے سیما کو دیکھا اور سیما کی نگاہیں اس کے وجود سے پرے پھسل گئیں۔ لیکن یہ خیال رہ گیا کہ نوجوان نے دیکھنا ہوا دیکھ لیا ہے اور اس خیال سے اُسے اپنے احساس میں ایک عدم آسانی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اٹھنا چاہتی تھی۔ لیکن اٹھی نہیں۔ جسم میں کچھ لہریں سی پیدا ہو رہی تھیں اور یہ لہریں اس کے جسم میں داخل ہو رہی تھیں، اُسے چھوڑ رہی تھیں۔

"میں آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کر رہا ہوں؟" اس نے اچانک کہا۔

"نہیں" سیما نے بغیر سوچے ہوئے جواب دیا، اور یکایک اُس کے جسم میں حرکت کرتی ہوئی لہریں رک گئیں اور اس نے ایک آسانی سی محسوس کی جیسے سیما کی اور اس کی شخصیت کے درمیان سے ایک امر ارسا تفریق ہو گیا ہو۔

"تعجب ہے" اس نے نیم طنزیہ سے لہجے میں کہا۔ "لیکن آپ کو اگر کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ ہو تو میں یہ بنچ چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں آپ بیٹھے رہیں"۔ سیما نے پھر ایک عدم آسانی سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال تھا اس سمندر کے کنارے ایسی کوئی عورت نہ ہو گی جو کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بیٹھنا پسند کرے۔"

سیما نے اس کی طرف دیکھا، یہ بات اُسے پسند نہ آئی لیکن اسے ایک مخصوص سے تعجب نے مس کیا۔

"دہلی میں میرا خیال تھا کہ صرف یہیں کے لوگوں میں ملنساری کی اتنی کمی ہے اور شاید بمبئی میں ایسا نہیں ہو گا، لیکن یہاں ہر شخص کی اپنی الگ زندگی ہے اور وہ اس میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتا۔"

"آپ دہلی سے آئے ہیں؟" سیما نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے پوچھا، اور اُسے اپنا یہ استفسار عجیب معلوم ہوا۔

"ہاں" اُس نے جواب دیا "اور یہاں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دور دراز جزیرہ ہے، جہاں ساتھ دینے کو کوئی نہیں اور انسان یا زمانوں میں بیوقوفوں کی طرح چلتا ہے اور دکانیں بالکل اجنبی معلوم ہوتی ہیں اور سڑکیں پرائی، اور وہ زبان سنائی نہیں دیتی اپنی جسے سننے کی عادت ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا اور سیما کو تعجب ہوا کہ یہ شخص کچھ زیادہ بے تکلفی سے بات کر رہا ہے۔ یہ بے تکلفی اس نے اپنے لئے محسوس نہ کی اس کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا تھا گویا وہ سیما سے زیادہ خود کو مخاطب کر رہا ہو، یا کسی کو بھی نہیں، یا سب کو، بغیر اس بات کی پروا کئے کہ اس کا ردِ عمل کیا ہو گا۔ وہ سفید قمیص اور سفید پتلون پہنے ہوئے تھا اور اس کے سر کے ہلکے بال ماتھے پر سے پیچھے چلے گئے تھے، ماتھے پر خفیف سی شکنیں تھیں، اور ان سے سیما کو ایک پُراسراری دلچسپی ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی گفتگو میں ایک صداقت سی ہے اور وہ اس کے جذبات کے متعلق متجسس ہو گئی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا، اور پھر اچانک اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ بمبئی کی رہنے والی نہیں؟"

"نہیں" سیما نے جواب دیا۔ "لیکن مجھے بمبئی میں تین سال ہو گئے ہیں۔"

"اوہ، تین سال تو بہت ہوتے ہیں" وہ رک گیا، پھر بولا۔ "یہاں میرا اُن لوگوں سے گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے جو بمبئی کے نہیں ہیں، یا جو مجھے بمبئی کے معلوم نہیں ہوتے۔ آپ کو میری گفتگو ناگوار تو نہیں؟"

سیما شاید کہنے لگی تھی۔ کہ نہیں، لیکن اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا

"بمبئی میں آ کر میں نے صرف تین آدمیوں سے بات کی ہے اور ان لوگوں سے اُکتا گیا ہوں انہیں چھوڑ نہیں سکتا اور ان سے نفرت کرنے

لگا ہوں۔"

"آپ، یہاں اکیلے ہیں؟"

ہاں۔" اور پھر ایک مسکراہٹ میں جو مسکراہٹ سے زیادہ کچھ اور تھی، وہ کہنے لگا — تین مہینے کی تنہائی کے بعد اب کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ پاس سے گزرتے ہوئے یا قریب بیٹھے ہوئے کسی آدمی کو مخاطب کر دوں لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا..... یہ بات کہ انسان تنہائی سے اتنا پریشان ہو جاتا ہے کہ راہ چلتے آدمیوں سے تعارف پیدا کرنا چاہے، شاید آپ اسے صحیح نہ سمجھتی ہوں، لیکن یہ صحیح ہے۔ اور کبھی کبھی تعجب ہوتا ہے اور غصہ آتا ہے کہ میں اتنے آدمیوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے کو اکیلا محسوس کرتا ہوں۔"

سیما سمجھ نہ سکی کہ کیا جواب دے اور وہ خاموش رہی۔ اس شخص کی گفتگو اس پر ایک عجیب اثر کر رہی تھی، لیکن اُسے اپنی زبان کے آگے ایک رکاوٹ سی محسوس ہوتی تھی، درمیان میں ایک عجیب سی حائل تھی، دل کے اندر اُسے محسوس ہوتا تھا کہ کچھ کہے لیکن جو کچھ کہنا تھا وہ باہر نہ آتا تھا۔ اور وہ خاموش بیٹھی رہی۔ سمندری افق پر سُرخی غائب ہو چکی تھی اور سُرخی کے سائے پر ایک بڑا سا ستارہ چمک رہا تھا اور روشنی کی ایک طویل لکیر سمندر کی سطح پر پڑ رہی تھی جو سرمئی ہو گئی تھی۔ پانی کی نیلاہٹ میں اندھیرا گھل گیا تھا۔ ہوا میں ایک عجیب سی بسمندری بو پھیل گئی تھی۔ اور وہ یہ جان نہ سکی کہ یہ بو سمندر کی سیپیوں کی ہے یا ریت کی، یا پانی کی یہ بو عجیب تھی، اس میں سمندر کی دلکشی اور ایک شامی پُرشتگی دونوں پائی جاتی تھیں، وہ اس کے متعلق ایک مخصوص احساس کی عادی تھی۔ ہوا ہلکی پڑ گئی تھی اور اس کے سرد پنکھڑیوں کے درختوں کا جوش سرد ہو گیا تھا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ ساحل پر بیٹھے ہوئے لوگ واپس جا رہے تھے، واپس چلے گئے تھے۔ قریب کے بنچ خالی پڑے تھے۔ سیما نے پھر خود کو نوجوان کے ساتھ اکیلا محسوس کیا اور عادتی طور پر اسے خیال آیا کہ اب چلنا چاہئے۔ وہ چلنے کو تیار ہو گئی۔ نوجوان اپنی انگلیوں کو ایک موہوم سی بے چینی میں مسل رہا تھا اور سیما نے اُٹھنے میں ایک تردد سا محسوس کیا۔ وہ ایک کشمکش میں پڑ گئی کہ اُٹھنے سے پہلے اس سے کچھ کہے یا نہیں۔ کہے تو کیا کہے یہ سمجھ میں نہ آتا تھا اور پھر وہ تھوڑی دیر بیٹھی رہی۔ اندر ونی طور پر وہ کچھ کہنے کے لئے محسوس کر رہی تھی لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے اور یہ انتظار کرتی رہی کہ وہ خود ہی کچھ کہے لیکن اُس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی آنکھیں سمندر کی سطح پر روشنی کی لکیر کو دیکھ رہی تھیں۔ سمندر کا کنارا سنسان ہو گیا تھا۔ سیما اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا جیسے اُسے بُرا لگا ہو کہ وہ جا رہی ہے وہ چل گئی۔ اس کی نگاہ میں تعجب اور ناگواری کے اس مبہم سے سیما کو محسوس ہوا کہ اس نے اس کی توہین کی ہے اور آگے جا کر جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر یکبارگی ہی دونوں نے منہ پھیر لیا۔ وہ ساحل پر خالی بنچوں کو دیکھنے لگا اور وہ آگے چلی گئی۔

ہاتھ سے دار جاتی ہوئی بس میں بیٹھی ہوئی وہ سوچتی رہی۔ سیما کو معلوم ہو رہا تھا کہ اُس نے اجنبی کی ہتک کی ہے، نہایت عجیب ڈھنگ سے وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی..... یاد کر رہی تھی کہ جب پیچھے مڑ کر اُس نے دیکھا تھا تو جیسے اُس نے جا ماں کر منہ پھیر لیا تھا، بُرا مان کر اور حقیقت میں وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔ سیما کے دل کی عورت اس کی گفتگو سے متاثر ہوئی تھی اور وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی۔ اس تاثر کا وہ خود سے اعتراف کرنا نہ چاہتی تھی۔ اور اس نے اس احساس قصور کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی کتنی عجیب تھی اس کی یہ بات کہ یوں خواہ مخواہ اس سے باتیں کرنے لگا، اس نے سوچا، اسے یہ امید ہی کیوں تھی کہ وہ اُسے اس طرح جواب دے گی لیکن ——— سیما کے دل میں کوئی چیز اس کی حمایت کر رہی تھی، وہ اس ضدسے لڑنا چاہتی تھی لیکن نوجوان کی سادی شخصیت ایک غیر عمومی تاثر کی شکل میں اس کے ذہن میں مجتمع ہو گئی تھی، یہ شخص ——— اچانک بے ربط طور پر اُسے اپنے شوہر کا خیال آگیا۔ اس نے سوچا وہ اس وقت گھر پر نہ ہوں گے۔ اپنے شوہر کے ساتھ وہ ایک غیر خوشگوار حالت میں رہی تھی۔ وہ دن میں لڑکیوں کو پڑھاتی تھی اور ———

بس رک گئی تھی۔ سیما کے ساتھ والی عورت اُتر گئی اور وہ کھڑکی کے قریب سرک گئی۔ بس اب داور میں داخل ہو رہی تھی۔ مکانوں کے اندھوں تھوں

میں دھیمی روشنیاں نہیں اور بس اندھیرے میں سے گزر رہی تھی۔ بلیک آؤٹ میں دور دور کھمبوں سے چھنتی ہوئی دھندلی روشنیاں تک رہتے تھے اور اُن کے چاروں طرف اندھیرا۔ یہ اندھیرا اب اُس کے لئے اجنبی نہ رہا تھا۔ یہ بلیک آؤٹ اس سے بھی پہلے شروع ہوا تھا جب اُس نے ٹیوٹوریل سکول میں لڑکیوں کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ اور وہ ——— اسے پھر اپنے شوہر کا خیال آگیا اور پھر اس اجنبی کا۔

اب شوہر کے ساتھ وہ خوش نہ تھی، اس شخص کی قربت وہ اب بھی بڑی یگانگت کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ کیوں ——— اور اُس نے اس کے خیال سے دُور ہٹنے کی کوشش کی۔ بس اب اور کے پل سے گزر رہی تھی؛ پانچ منٹ میں وہ گھر پہنچ جائے گی۔ وہ گھر پر نہیں ہوں گے، اپنے شوہر کا وہ اس وقت گھر پر موجود ہونا نہ چاہتی تھی۔

لیکن جب وہ گھر پہنچی تو ورمن موجود تھا۔

"دیر کر آئیں"۔ اس کے لہجے میں ایک طنز تھا۔

"ہاں" سیما نے لاپروائی سے جواب دیا۔ اس نے طنز کو محسوس کیا تھا لیکن اس کی پروا کرنا نہ چاہتی تھی۔ پچھلے دنوں سے وہ خود کو اپنے شوہر کے مقابلے میں مساوی سمجھنے لگی تھی، اور اس طنز کو ایک طنز کی طرح محسوس کر کے اس کی مخالفت کرنا ذلیل سا معلوم ہوتا تھا۔

"مجھے تمہارا یہ چوبیس گھنٹے گھومتے رہنا پسند نہیں"۔

"مجھے معلوم ہے تمہیں پسند نہیں ہوگا"۔ سیما نے جواب دیا۔ "تم چاہتے ہو میں دن بھر ان تین کمروں میں قید رہوں"۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اس طرح سڑکوں کی خاک نہ چھانو"۔

"کون چھانتا ہے سڑکوں کی خاک۔ جب تم رات کو دس دس بجے گھر آتے ہو تو میں شام کو سیر بھی نہیں کر سکتی"۔

ورمن چپ ہو گیا اور وہ کپڑے اتارنے کے لئے اندر کمرے میں چلی گئی۔ سیما جانتی تھی کہ ورمن اس کے ملازمت کرنے سے بھی برگشتہ ہے۔ اب وہ اسے اپنے شوہر کی خود غرضی پر محمول کرتی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ خود کو بڑا آزاد محسوس کرنے لگی تھی۔ اور خود کو اپنے شوہر کا دست نگر نہ سمجھتی تھی، اور اس احساس سے اس کی اپنی خودی کو تقویت مل گئی تھی۔ وہ اب وہی کرنا چاہتی تھی جسے خود ٹھیک سمجھتی ہو۔

کپڑے بدل کر جب وہ باہر آئی تو ورمن کھڑکی میں کھڑا ہوا باہر دیکھ رہا تھا۔

"سیما" اُس نے مڑ کر کہا۔ "میرا خیال ہے تمہارا یہ رویہ ٹھیک نہیں ہے"۔

"کیوں؟" سیما نے استفسار کیا۔

"کیونکہ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا"۔

"کیوں برداشت نہیں کر سکتے، یوں کہو کہ تمہیں میری ذرا سی آزادی دیکھی نہیں جاتی"۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم عورتوں کی طرح رہو"۔ ورمن نے بگڑ کر کہا۔

"میں بالکل عورتوں کی طرح رہتی ہوں۔ لیکن تم چاہتے ہو کہ مجھے اپنے زعم میں رکھو"۔ سیما نے جواب دیا۔

"مجھے تمہارا یہ سکول جانا بھی پسند نہیں۔ یہ میری توہین ہے"۔

"میں تو اُسے توہین نہیں سمجھتی"۔ اُس نے ورمن کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتی ہوں، اور میں اُٹھا سکتی ہوں"۔

ورمن نے غصے میں اس کی طرف دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یہ جھگڑے عموماً اس سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ سیما کہہ چکی تھی کہ تمہیں مجھ پر رعب جمانے کا کوئی حق نہیں ہے، اور ورمن نے اس پر رعب جمانا چھوڑ دیا تھا، اور بات سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی۔

رات بستر پر وہ دیر تک جاگتی رہی کمرے میں وہ اکیلی نہ تھی، درمیان میں چند فٹ کا فاصلہ تھا اور پھر ورمن کا بستر لیٹے ہوئے۔ سیما کو

کہ وہ جاگ رہے ہیں، یعنی ورمن جاگ رہا تھا۔ لیکن وہ سو رہی تھی، ورمن کے سامنے وہ جاگنا نہ چاہتی تھی، آنکھیں بند کئے وہ لیٹی رہی۔

تین سال پہلے سیما کی شادی ورمن سے ہوئی تھی، جیسے شادیاں ہوتی ہیں۔ آگ کے گرد گھوم کر، منتر پڑھ کر، شہنائیوں کی آوازوں کے درمیان۔ اور جب شادی ہوگئی تھی تو سیما نے اس کا برا نہ مانا تھا؛ ورمن ایم۔ اے تھا اور اسسٹنٹ پوسٹ آفیسر اور وہ مندر پستھ گرلز کالج کی گریجویٹ تھی۔ جہاں ان لڑکیوں میں جنسی معاملات پر باتیں کر کر کے اس نے اپنے ذہن میں اپنی دوشیزگی کو کھو دیا تھا، کتنی حسرت تھی اُسے ——— !

ورمن نے یہ حسرت پوری کر دی تھی وہ یہ چاہتی تھی۔ اُن دنوں کئی کئی نصف گھنٹوں تک وہ لیٹے ہوئے ورمن کے پاس بیٹھی رہتی، اس کا بازو ورمن کے اوپر سے ہوتا ہوا فرش کا سہارا لئے رہتا۔ اس کا سینہ ورمن کے سینے سے چھوتا رہتا، اور وہ ورمن کے سینے پر اپنی انگلیوں سے بے معنی لکیریں کھینچتی رہتی اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے۔ یا وہ ورمن کے بازوؤں میں، اس کے گھٹنوں پر بیٹھی رہتی اور اس کی قمیض کے بٹنوں کو کھولتی رہتی، بند کرتی رہتی۔ اور ورمن کے بازو اس کی کمر کے گرد حلقہ کئے رہتے۔ کتنی لذت تھی ایک مرد کے بازوؤں کو اس طرح اپنی کمر کے گرد محسوس کرنے میں، کتنی راحت تھی، اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے اور بوسے اور —— اوہ، کتنا کیف تھا اس میں پہلے جاڑوں کی طویل راتوں میں وہ بستر پر اس کے جسم کی گرمی کو محسوس کرتی کتنی جنسی ہوتی تھی یہ گرمی اور کتنی راحت بخش اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے، اور —— جسمانی ملاپ جن کے متعلق لٹریچر اور دیوداتی اور شیخ اور شیخ اتنے ہیجانی انداز میں باتیں کیا کرتے تھے، اور جن کے متعلق صوچ صوچ کر اُس نے اپنے ذہن میں اپنی دوشیزگی سے ہاتھ دھو لئے تھے۔ بے شک وہ اتنے لذیذ نہ تھے جتنا اس نے تصور کیا تھا۔ لیکن اُس نے خود کو ان بوسوں اور بازوؤں اور حرارت اور ان سب چیزوں کے سپرد کر دیا تھا۔ جذبات کی شدت میں ان دونوں نے ایک دوسرے کی تقصیروں کو نظر انداز کر دیا تھا، اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے تھے اور ایک سال گزر گیا اور محبت کی باتیں گویا ختم ہوتی گئیں، باتیں ہی تو تھیں اور سیما کا انہیں بار بار دہرانے کو جی نہ چاہتا تھا، جی بھی تو تھا!

لیکن وہ جسمانی لمس وہ بوسے، وہ جسمانی ملاپ ——

اور دن گزرتے گئے اور وہ ان کی عادی ہوتی گئی اور اوپر دیکھنے لگی کہ ورمن میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو اُسے پسند نہیں اس میں خود بھی ایسی باتیں تھیں جو ورمن کو پسند نہ تھیں اور سیما کو یہ سخت ناگوار معلوم ہوتا تھا کہ ورمن انہیں دیکھنے لگا ہے لیکن ورمن انہیں دیکھنے لگا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ سیما کو اُن کا احساس کرا دیتا تھا۔ سیما کو یہ بات پسند نہ آئی، پھر وہ اسے بُری لگنے لگی۔ لیکن ورمن باز نہ آیا اور وہ بھی باز نہ آئی اور اُسے ورمن کے نقص اجاگر معلوم ہونے لگے۔ پھر اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے اور ورمن کے خیالات نہیں ملتے، اور کہ ورمن کے ذہن میں ایم۔ اے کرنے کے باوجود بھی وہی روایاتی تنگ نظری ہے۔

"—— لیکن تم اتنی اتنی دیر اس سے باتیں کیوں کرتی رہتی ہو؟"

"باتیں کرنے میں کوئی حرج ہے؟"

"وہ کیوں اتنی اتنی دیر یہاں بیٹھا رہتا ہے مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔"

"تمہیں تو کوئی چیز پسند نہیں۔ اوّل تو باتیں کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ دوسرے وہ بالکل بچہ ہے، تمہیں تو ہر ایک کے متعلق بُری بُری باتیں سوچنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔"

"عادت نہیں، میں ان سب بچوں کو جانتا ہوں، یہ بچہ وہ برس کے ہونے سے پہلے ہی جوان ہو جاتے ہیں۔"

"وہ نہیں ہے۔"

"ہو یا نہ ہو" ورمن نے جھنجھلا کر کہا۔ "لیکن میں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا اپنے گھر تم ایسا کر سکتی تھیں؟"

"اپنے گھر میں آزاد نہ تھی؟"

"آزاد تم اب بھی نہیں ہو۔" ورمن نے گرتی سی آواز میں کہا۔"

"کیا ——؟"

"میں کہتا ہوں تم نے یہ قیمیں میں بٹن کیوں نہیں ٹانکے اگر تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو اس شادی کا کیا ہی کیا ہے؟"

"تم نے مجھ سے بٹن ٹکوانے کے لئے شادی کی ہے" سیما خفگی سے بولی اس نے سچ کہا تھا کہ وہ آزاد نہیں ہے، مندر پرشنھ گرلز کالج کی گریجویٹ آزاد نہیں ہے، یعنی وہ کبھی آزاد نہیں رہے گی، اپنی شادی کے بعد بھی نہیں، تو پھر اس شادی کا سکھ ہی کیا ہے۔ سیما ورمن کی اس بات سے کتنی نفرت تھی، ورمن کی اس بات میں کتنی تنگ نظری تھی۔ اس کے خیالات نے ورمن سے ملنا چھوڑ دیا، اور دن گزرتے گئے۔ اور اپنے خیالات اس کے ساتھ روز بروز متضاد ہوتے گئے۔ اس کے اور ورمن کے درمیان خیالات کا اختلاف آگیا حقیقت میں وہ اپنے اور ورمن کے درمیان اب کچھ چاہتی تھی۔ اور اس نے آسانی سے خیالات کے اختلاف کا سہارا لے لیا۔ اور اپنے خیالات اُسے زیادہ عزیز ہو گئے اور پھر —— یعنی اگر خیالات میں اختلاف ہو تو جنسی ملاپ وہ لذت نہیں بخش سکتے۔ وہ اب پریمی نہ ہو کر میاں بیوی رہ گئے تھے، اور میاں بیوی کی طرح رہتے تھے اور اب سیما کو محسوس ہوتا تھا کہ اس نے آرزو کو کھو دیا ہے، لیکن ایسا نہیں تھا، آرزو موجود تھی۔ لیکن وہ اسی شدت سے پوری نہیں ہوتی تھی، اور وہ اس کے ردعمل کو محسوس کرتی تھی اور اُسے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اُسے کھو دیا ہے۔ ان تعلقات میں اب وہ دلکشی نہ رہی تھی وہ اب ان کی کچھ ایسی خواہش مند نہ تھی اور کبھی کبھی اسے یہ بالکل پیشہ ورانہ سے معلوم ہوتے، اور ورمن اس سے ملنا چاہتا تھا جب وہ اس کی خواہش مند نہ ہوتی تھی۔ کتنی ذلیل بات تھی یہ کتنی ناپسند تھی اُسے۔

سیما نے دراصل محبت ورمن سے کبھی نہیں کی تھی، یہ اس کی جنسیت تھی۔ جس نے ورمن کے مرد سے محبت کی تھی۔ اپنے جذبے کی شدت میں اُس نے خود کو ورمن میں اس شے کے سپرد کر دیا تھا۔ جو اسے تسکین دیتی تھی۔ اس وقت وہ ایسی تسکین چاہتی تھی جو اسے پاگیرا اور دیا دوتی۔ سے باتیں کر کے حاصل نہ ہوتی تھی۔ وہ سچائی نہ چاہتی تھی اور سچائی مل گئی تھی اور اس نے اس سچائی سے محبت کی تھی جس سے سب عورتیں کرتی ہیں۔

سیما کو اپنے احساسات پر اعتبار نہ تھا، اپنے ادراک سے نیچے وہ ان سے ڈرتی تھی اور اسے اب بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ورمن سے محبت کرتی ہے، جیسا سب عورتوں کو معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ محبت نہ تھی، اگر محبت کچھ اور ہوتی ہے، یہ صرف ایک احساس ملکیت تھا، ورمن اس کا شوہر تھا، اور ورمن کے علاوہ اس کا اور کچھ نہ تھا، اس کے لئے صرف وہ سب کچھ تھا اور سیما اُس سے ایک شوہر کے روپ میں محبت کرتی تھی اور وہ دانہ طور پر اپنی روح کے نہاں خانے میں ایک مرد کی حیثیت سے اب اس سے خوش نہ ہوتی تھی۔ یہ جنسی تعلقات ان کے درمیان ایسے ہو گئے تھے جیسے رات کے کھانے کے بعد کبھی تاش کھیلنے کو جی چاہتا ہو یا جیسے انسان کبھی اپنے اوپر سے کچھ اتار پھینکنا چاہتا ہے یہ تجربے ہمیشہ اُسے ایک ناگوار سی حالت میں چھوڑ جاتے تھے اور وہ محسوس کرنا چاہتی تھی اور محسوس کرنے کو کچھ نہ تھا۔ اور ورمن اپنا بوجھ اتارنا چاہتا تھا جب وہ اس کی خواہش مند ہوتی تھی۔ کبھی خواہش ہوتی بھی تھی تو یہ صرف اپنی آرزو ہوتی تھی، دوسرے کی مدد باتی ضرورت نہیں، صرف اپنی خواہش کی تسکین کی آرزو، لیکن وہ پھر بھی خود کو ورمن کے لئے رزرو رکھتی تھی، جس کے ساتھ اس نے آگ کے گرد پھیرے لئے تھے۔ اس رزرویشن سے وہ اپنی روح میں برگشتہ تھی لیکن اپنی ماتحتی کا ایک احساس جس سے وہ تقریباً ناواقف تھی۔ درمیان میں حائل تھا اور اس نے کبھی یہ سوچنے کی جسارت نہ کی تھی۔ خواہش اس کے اندر مردہ ہو گئی تھی۔ اور اکثر ان میں جھگڑے ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کی تصویر دل کو برداشت کرنا انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔

پھر وہ ایک ٹیوٹوریل اسکول میں پڑھانے لگی۔ مندر پرشنھ کالج کی گریجویٹ ورمن نے اس کی مخالفت کی تھی۔ لیکن وہ مانی نہ تھی اور

اُس نے ملازمت کر لی تھی۔ اپنی ماتحتی کو کبھی اس نے اور اکی طور پر محسوس نہیں کیا تھا، لیکن اس آزادی کو اس نے پورے طور سے پہچان لیا۔ وہ آزاد تھی اور ایک داخلی رہائی سی محسوس کرتی تھی۔ خود کو خود ان دونوں کے درمیان اب جھگڑے کم ہو گئے تھے اور دوری بڑھ گئی تھی۔

"سیما ——" بستر پر لیٹے ہوئے اُس نے درمن کی آواز سنی، لیکن وہ بولی نہیں، وہ جاگی نہیں رہی تھی، وہ سو بھی نہیں رہی تھی، وہ جواب دینا نہ چاہتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ درمن کیا کہے گا، وہی جو وہ شام کو کہہ چکا ہے، اور اس سے پہلے کئی بار، مجھے تمہارا یہ رویہ پسند نہیں۔ آخر وہ ایسا کیا کرتی ہے، کیا پسند نہیں ہے انہیں پسند، ان دونوں کی پسند جداجدا، اُن کے خیالات نہیں ملتے —— وہ سوچتی رہی۔ درمن نے کروٹ بدلی اور اُس نے ایک آسانی سی محسوس کی۔ اب وہ اپنے جسم کو حرکت دے سکتی تھی، سوتے میں کیا آدمی ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا اور اس نے اپنا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ مرد چاہتے ہیں کہ ان کی غرض پوری ہوتی رہے، عورتوں کا کوئی خیال نہیں، کیوں، خود غرض مرد، اچانک اُسے سمندر کے کنارے اس اجنبی کا خیال آگیا اور اس نے فوراً ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے برخاست کر دیا، دیر تک وہ لیٹی رہی اور اُس کے اوپر ایک ویرانی کا احساس ابھرنے لگا جس میں چڑچڑے پن کا بڑا جزو شامل تھا۔ اُسے زندگی کی بے رنگی پر ہمیشہ غصہ آتا تھا، لیکن اس ویرانی کے بارے میں اُس نے سوچا کبھی نہ تھا۔

بہت دیر تک وہ جاگتی رہی، بہت دیر بعد وہ سو گئی۔

دوسرے دن۔

دیر تک وہ سمندر کے کنارے گھومتی رہی۔ ساحل پر آج بھیڑ زیادہ تھی۔ لیکن وہ ایک تنہائی سی محسوس کر رہی تھی۔ کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور وہ یہ نہ جانتی تھی کہ یہ کیا ہے۔ سمندر کے کنارے بکھری ہوئی اس بھیڑ سے اُسے ایک علیحدگی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ احساس خلا کا نہ تھا بلکہ جیسے وہ ایک وسیع مجمع میں اکیلی ہے اور مجمع کا مادہ اس کے گرد تنگ ہے۔ سمندر کی وسعت بھی تنگ معلوم ہوتی تھی۔ جیسے بالکل پاس ہی بسیط سمندر کو آسمان نے روک لیا ہو۔ آج مغربی افق پر شفق نہیں پھیلی تھی، دن ڈوب گیا تھا لیکن آسمان ویران تھا اور اس نے سمندر کو روک رکھا تھا۔ کسی چیز کی کمی تھی، یہ بھیڑ اور یہ تنہائی لیکن وہ بھیڑ سے الگ رہنا چاہتی تھی، اکیلی رہنا چاہتی تھی سمندر کے کنارے اکیلی آئی تھی، اور پھر یہ تنہائی، اسے کسی مسرت کا نیم شعوری احساس تھا، کوئی چیز محسوس نہ تھی۔

کنارے پر بکھری ہوئی وہ لہروں کو ساحل کی گیلی ریت پر پھیلتے ہوئے دیکھتی رہی، لوٹتی ہوئی لہر سے ٹکرا کر پانی کنارے پر پھیل جاتا تھا اور ساحل کی ریت اس کے جھاگوں سے چمک اٹھتی تھی اور پھر پانی واپس لوٹ جاتا اور ریت میں جذب ہو جاتا اور ریت کی چمک معدوم ہو جاتی۔ دیر تک وہ تماشا دیکھتی رہی پھر وہ چند قدم آگے بڑھ آئی تھی، اور وہ دیکھتی رہی سمندر کی سطح اُبھر کر پانی کا ایک دھیر بڑھا آتا تھا، جیسے ایک وسیع چادر آب سطح پر پھیلی آ رہی ہو، سمندر کی سطح پر اس سے اونچی ایک اور سطح بہتی جا رہی تھی اور قریب آ رہی تھی، اور —— اور اچانک وہ ٹکرا گئی اور ایک شور میں بکھر گئی، اور پانی سیما کے قدموں میں پھیل گیا۔ سیما نے منہ سے تعجب کی ایک چھوٹی سی آواز نکالی اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ پانی غیر متوقع طور پر اس کے قدموں میں آگیا تھا اس کا شعور اس کے لئے تیار نہ تھا، وہ لہر سے چھو جانا چاہتی تھی لیکن ——

واپس جاتا ہوا پانی اب کنارے میں جذب ہو رہا تھا وہ بڑھی اور خشک ریت پر پاؤں رکھتی ہوئی اور پر بینچوں کی طرف چلی گئی! اوپر بینچوں کی طرف۔ ریت اس کی گیلی سینڈلوں اور پاؤں میں چپٹ گئی تھی۔ اور اپنے قصور میں اُسے اس کے کھرے پن کا احساس ہوتا رہا۔

بینچ کوئی خالی نہ تھا وہ ان کے آگے سے گزرتی گئی، عورتیں اور مرد، اور صرف عورتیں اور صرف مرد۔ بینچوں پر بیٹھے تھے، اور وہ خالی جگہ کی تلاش میں آگے گزرتی گئی ایک پارسی اپنی بوڑھی عورت کے ساتھ کسی نوجوان کی طرح بیٹھا تھا، یہ دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں، ان کے جوڑوں میں جنسبلی کے پھول تھے۔ یہ —— وہ، اس بینچ پر وہی کل والا نوجوان بیٹھا تھا اور اس کے جابر کی دو سیٹیں خالی پڑی تھیں

لیکن وہ گزر گئی، قریب سے گزرتے ہوئے اُس نے سیما کو سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے کہتا ہو کیا تم وہی نہیں ہو جو کل گھنٹہ بھر تک میرے قریب بیٹھی رہی تھیں۔ اب سیما اسے نیچے چھوڑ آئی تھی۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ اس کے قریب بیٹھے، ایک جھجک سی محسوس ہوئی تھی۔ شعور دوئم میں اسے اس بات کا احساس یا شاید ڈر تھا کہ اس کے پاس بیٹھنا خیر اہم نہ ہوگا۔ وہ اس اہمیت سے خوف تھی۔

آخر تک کوئی بینچ خالی نہ تھا اور اب وہ واپس آ رہی تھی کہ آخر ایک خالی سیٹ پر بیٹھنے میں حرج ہی کیا ہے اور اُسے کوئی حرج نظر نہ آ رہا تھا۔ لیکن جب وہ اس کے قریب آئی تو وہاں رکنے میں اُسے پھر ایک جھجک محسوس ہوئی، یہ نوجوان اس کی رُوح میں ایک اہمیت رکھتا تھا۔ اور اس کی نگاہ خالی سیٹوں میں اٹکتی ہوئی آگے بڑھ گئی، وہ پھر آگے جا رہی تھی، وہ نوجوان بینچ پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ بیٹھئے۔" اس نے کہا۔ "میں تو بہت دیر سے بیٹھا ہوا ہوں۔" اور غالباً وہ سیٹ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ بغیر ارادہ کئے ہوئے سیما نے کہا۔

"آپ میری وجہ سے نہ جائیں۔ میں کوئی اور سیٹ تلاش کر لوں گی۔"

"خالی بینچ شاید آپ کو نہ ملے۔"

"لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ کسی کو اٹھا دوں۔"

"اور نہ یہ بہتر ہے کہ کسی کے قریب بیٹھیں۔"

سیما نے اس کی طرف دیکھا، اس کے ہونٹوں پر ایک بڑی نامعلوم سی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں بالکل سنجیدہ تھیں۔

"دیکھئے۔" اس نے کہا، اور پھر ——

"شکریہ"

سیما سیٹ کی طرف بڑھ چکی تھی، وہ بیٹھ گئی۔

چند لمحوں تک خاموش رہی۔ ایک منٹ دو منٹ —— یہ خاموشی سیما کو بے ہنگم سی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا یہ ارادہ نہ تھا کہ اس سے بات کرے، لیکن یہ خاموشی —— اور چند لمحوں تک خاموشی رہی، اور سیما کی توجہ ان حالات پر جمی رہی جن میں وہ خود کو محسوس کر رہی تھی، یکایک اُس نے کہا —— "میں دراصل بڑا ڈھیٹ آدمی ہوں کہ یہاں سے ہٹا نہیں۔ آپ کو شاید امید تو ہوگی کہ میں سیٹ خالی کر دوں گا۔" اس کے ہونٹوں پر سے ایک نامعلوم سی مسکراہٹ گزر گئی۔

"نہیں تو" سیما نے کہا۔

اوہ —— اپنے خشک بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا وہ مسکرایا۔ "میرا خیال ہے عورتوں کو اس بات کی امید ہوتی ہے کہ ہم ان کے لئے جگہ خالی کر دیں۔"

"شاید ——" سیما نے مختصر طور سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہوتی ہے" اُس نے ہے پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ کچھ سراہنے کے قابل بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں جب تک عورتوں کو یہ اُمید رہے گی وہ آزاد نہیں ہو سکتیں۔"

سیما نے اس کی طرف دیکھا، ظاہر تھا کہ وہ گفتگو کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔

"کسی دوسرے آدمی سے کچھ امید کرنا ہمیشہ خود کو بالواسطہ اس کا محکوم بنا دینا ہوتا ہے، اور عورتیں ہمیشہ امید کرتی رہتی ہیں اور خود کوشش نہیں کرتیں۔ ان کے ساتھ صدیوں سے خود کو Passive سمجھنے کی ایک عادت بن گئی ہے۔ اور یہ عادت ان کی فطرت کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے نیچر نے عورتوں کو Parasite بنایا ہے" سیما نے کہا۔

"اوہ نہیں ——" اس نے نہیں کو طول دیتے ہوئے کہا "قدرت اتنی بیوقوف نہیں ہو سکتی ہے بے شک صحیح ہے کہ بعض حالتوں میں عورتوں کا عملی پارٹ بعد میں شروع ہوتا ہے، لیکن قدرت نے عورتوں کو Parasite بنایا ہے یہ غلط ہے۔ عورتوں کی اس حالت کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ بنیادی خواہشات میں سماج نے ایسا لازمی (جو حقیقت میں غیر ضروری ہے) تعلق پیدا کر دیا ہے کہ اس کی تسکین کا انحصار دوسرے پر ہے۔ اور یہ دوسری چیزیں عورتوں کو کرنے نہیں دی جاتیں اور ایک عورت اس وقت تک کسی آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی جب تک وہ اس کی بیوی نہ ہو۔"

سیما نے اس کی طرف دیکھنے لگی، لیکن اس کی توجہ کا مرکز گفتگو تھی، بلکہ گفتگو سے بھی زیادہ اپنی توجہ کا مرکز وہ خود تھی، اس کی بے تکلفی سے وہ ایک مخصوص قسم کا نسوانی حجاب محسوس کرنے لگی، لیکن یہ اُسے ناپسند نہ تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

"بنیادی جذبات کے ساتھ ساتھ اکونومک مسئلہ لگا رہا ہے، اور عورتیں اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک وہ اقتصادی طور پر کسی دوسرے کی دست نگر رہیں گی" اور پھر یکایک رک کر وہ بولا "آپ کو شاید عورتوں کی آزادی سے دلچسپی نہیں"

"جی!"

میں پوچھ رہا تھا کیا آپ عورتوں کی آزادی میں دلچسپی نہیں لیتیں، دراصل آپ کو یہ بڑی عجیب بات معلوم ہوئی ہوگی۔ کہ میں چند منٹ کی ملاقات کے بعد آپ سے عورتوں کی آزادی کے بارے میں بات کرنے لگا ہوں حقیقت یہ ہے اور جس کا میں اقبال کر لینا چاہتا ہوں کہ دراصل میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بمبئی میں پچھلے تین مہینے سے میں نے کسی عورت سے بات نہیں کی اور اب میں اس سے اکتا سا گیا ہوں"

وہ ہنسا، لیکن اس کا قہقہہ مسکراہٹ سے کچھ ہی زیادہ تھا۔

"آپ کو میری بے تکلفی پر تعجب ہوا ہوگا، کم از کم ہونا چاہئے تھا" وہ بولا "لیکن میں نے کہا نا کہ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں اور عورتوں کی آزادی کے سوا اور بات ہی کیا کی جا سکتی ہے"

آپ عورتوں کی آزادی کے بارے میں بڑے پریشان معلوم ہوتے ہیں۔

"ہاں، کیونکہ عورتیں اپنی آزادی کے بارے میں پریشان نہیں ہیں"

سیما مسکرائی، وہ اب اس کی گفتگو میں برابر دلچسپی لے رہی تھی۔ اس نے کہا "لیکن عورتیں کسی کا سہارا چاہتی ہیں"

"واقعی؟" اس نے ایک لمحے سے طنز سے کہا، پھر وہ سنجیدہ ہو گیا "لیکن سوال چاہنے کا آجاتا ہے۔ چاہنا ایک دوسری بات ہے، خواہش ایک مقدس چیز ہے۔ میرا خیال ہے انسان اپنی روح سے جو چاہتا ہے وہ پورا ہونا چاہئے اگر کوئی شخص خود کو کسی دوسرے آدمی کے سپرد کرنا چاہتا ہے تو اس میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے Submission اس آدمی کو خوشی، مسرت اور راحت بخشتی ہے جو خود کو Submit کرتا ہے اور اس آدمی کو آرام اور سکھ پہنچاتی ہے جسے Submit کیا جاتا ہے، یہ صرف Submission ہے جس پر ایک حسین زندگی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور اس کے لئے روح کی آزادی کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے پاس روحیں نہیں ہیں، ہماری روحوں کے دروازوں پر صدیوں کی تہذیب کے تالے پڑے ہوئے ہیں"

اس کی گفتگو سیما کو متاثر کر رہی تھی، وہ اس سے متاثر ہوئی تھی، جیسے اس کے الفاظ سیما کے اپنے ان سوچے خیالات کی گونج ہیں۔ اپنے ہی خیالات کے اظہار کی دلکشی نے اُسے دھندلا دیا تھا، اور اس نے نوجوان کے لئے دل میں ایک خصوص سا محسوس کیا، اور ایک کشش بھی جو واضح نہ تھی، جو اس کے خیالات کی طرف تھی یا اس کی شخصیت کی، یا اس کی آواز کی۔ کشش بالکل عجیب تھی اور اس نے خود کو اس کے تاثر میں محسوس کیا۔

"لیکن موجودہ حالات میں عورتیں سہارا نہیں چاہتیں" وہ کہہ رہا تھا "سہارا چاہنا پڑتا ہے، ہر عورت خود کو Parasite کرنے

پر مجبور ہوتی ہے۔ یہ صرف ایک غرض ہوتی ہے مجبوری جس کی وجہ سے انہیں ایک سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ اس میں سچائی نہیں اور اپنی تہ میں یہ چاہت بڑا کمینہ پن لئے ہوتے ہے۔"

سیما اس بات سے متفق نہ تھی لیکن وہ اس کی مخالفت نہ کر سکی اور بالکل ایک ہپناٹک اثر میں سنتی رہی۔

"اور اس کے لئے عورتیں ذمہ دار نہیں ہیں، مرد بھی نہیں۔ یا شاید اس کے لئے دونوں ہی ذمہ دار ہیں۔"

"یا کوئی بھی نہیں" سیما نے کہا۔

نہیں میرا خیال ہے عورتیں اس کے لئے اتنی ہی مجرم ہیں جتنے مرد، یا شاید مرد زیادہ ہیں کیونکہ ان کے ہاتھ میں طاقت ہے، لیکن انہوں نے طاقت کو ذلیل کر دیا ہے۔ اور اس کی تقدیس کو کھو دیا ہے۔ عورتیں فطرتاً مرد کی حفاظت میں رہنا چاہتی ہیں، لیکن مرد انہیں اپنے قابو میں رکھنے کے لئے ذلیل اور کمینے اور غیر فطری ہتھیار استعمال کرتا ہے، اُسے ہر طرح اپنا دست نگر رکھنا چاہتا ہے، اپنی جاگیر بنا کر، اور اس نے عورت کی روح کو کھو دیا ہے اور اس کے جسم سے مطمئن ہے۔"

وہ تک وہ باتیں کرتا رہا، اور سیما کو محسوس ہوا کہ وہ درمن سے کس قدر مختلف ہے! صرف ایک بار اُسے اس فرق کا ایک بہت مختصر سا احساس ہوا، وہ سنتی رہی۔ وہ زیادہ تر خود ہی بولتا رہا تھا۔ سیما کو کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہ آتا تھا۔ وہ کچھ کہنا بھی نہ چاہتی تھی۔ سننا چاہتی تھی۔ اس کی گفتگو میں ایک مخصوص دلکشی تھی، اور اُسے سنتے ہوئے سیما کو ایک مخصوص سی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا، یہ طمانیت اس کی گفتگو سے سیما کے احساس میں پھیل رہی تھی اور احساس سے نیچے اتر رہی تھی۔ طمانیت کا یہ تاثر ایک ہپناٹک سحر کے مانند تھا اور اس کے شعور پر قابو پا رہا تھا، وہ خود اپنے اوپر اس سحر کا اثر چاہ رہی تھی، یہ اتنا خوبصورت، اتنا ملائم اور پھر اتنا غالب تھا۔

وہ تک وہ باتیں کرتا رہا۔ اور اُس سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی سیما نے اپنے اوپر اس سحر کی طمانیت کو محسوس کیا۔

اور اس کی گفتگو کی دلکشی نے سیما کو مغلوب کر لیا۔ ہر شام وہ سیما کو یہاں مل جاتا تھا اور باتوں کے دوران میں سیما پر ایک ہپناٹک اثر رہتا۔ یہ اثر اس کی آواز میں قدرتی تھا اور سیما کے تصور نے اُسے پُر مبالغہ بنا لیا تھا وہ خود کچھ کہے جاتا تھا اور سیما کے بولنے کا انتظار نہ کرتا تھا، اور وہ ایک نیم مسمریزی حالت میں سنتی تھی۔ گفتگو کے دوران میں وہ خود کو اس سحر کے تاثر کے سپرد کر دیتی تھی اور اس کے سامنے اپنی طاقت کو کھو دیتی۔ اُس کی موجودگی اور خصوصاً اس کی گفتگو سے سیما کو اپنے اندر ہپناٹک لہروں کا ایک تسلسل سا محسوس ہوتا تھا، جو کچھ کہتا تھا اس پر وہ یقین نہ بھی کرتی ہو لیکن پھر بھی وہ خود کو اس کی آواز کے سامنے کمزور محسوس کرتی اور اس کی بات کاٹنا نہ چاہتی تھی۔ اس کے سامنے سیما کو اپنے وجود کا احساس کم رہتا تھا۔ اور اس کا زیادہ۔ اس کی توجہ نہایت عجیب ڈھنگ سے اس کی گفتگو میں مدغم رہتی، بلکہ اس کی گفتگو سے بھی زیادہ کسی اور شے میں، وہ بخوبی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کرتی تھی کہ وہ کیا کہتا ہے۔ کسی دوسری شے کے قابو میں اس کا ذہن صرف اس بات پر منعطف رہتا کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے، یہ اس کی آواز تھی یا اس کے کہنے کا ڈھنگ، یا کچھ اور تھا یہ اُس نے کبھی نہیں پہچانا۔ اس سحر نے اس کے تحت الشعور پر تسلط کر لیا تھا، اس سے دور ہونے پر بھی وہ اُس کے اثر میں آنا چاہتی تھی۔ کبھی اس چاہت کی شکل خواہش کی ہوتی تھی، کبھی محض ایک کشش کی۔ تمام دن وہ شام کا انتظار کرتی اور اُسے کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ وہ انتظار کر رہی ہے، صرف ایک بے چینی، ایک بے کلی سی محسوس ہوتی تھی۔ درمن کی بیوی اس انتظار کو اپنی دانست کے دائرے میں داخل کرنا نہ چاہتی تھی۔

"اب یہ ہر وقت غائب رہنا کیا اختیار کیا ہے تم نے، درمن نے ایک دن سوال کیا۔

"غائب رہنا؟"

"اور کیا، صبح ہوتی ہے سکول چل دیتی ہو، شام کو تمہاری سیر ختم نہیں ہوتی معلوم ہوتا ہے گھر کو سرائے سمجھ رکھا ہے۔"

"میرے باہر جانے سے تمہارا کونسا کام حرج ہوتا ہے؟"

"کام ——" درمن نے چڑ کر کہا۔ "کام تو بہت کرتی ہو تم!"

"تو میں صرف کام کرنے کے لئے ہوں؟" سیمانے لوٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں تم صرف پیار کرنے کے لئے ہو۔"

"تمہیں میرے ذرا سی دیر شام کو باہر جانے سے کیوں جلن ہوتی ہے؟"

"میں پوچھتا ہوں تم یہ جاتی کہاں ہو؟" درمن گستاخی سے بولا۔

"تم کیا سمجھتے ہو؟" سیمانے کہا۔

"مجھے کیا پتہ کہاں ماری پھرتی ہو، کیا جانے کہاں جاتی ہو۔"

"تمہیں مجھ پر کیا شبہ ہے؟" سیمانے جیسے چوٹ کھا کر پوچھا۔

"بحث مت کرو۔" درمن نے کہا۔ "مجھے نہ تم پر شبہ ہے نہ تم پر اعتبار!"

"کیا! ——" سیمانے روتی آواز میں کہا، لیکن درمن کمرے کے باہر چلا گیا تھا۔

ایک لمحے تک سیما ایک عجیب سی ذہنی حالت میں کھڑی رہی۔ اپنے دل کی تہ میں اُسے خود اپنے اوپر اعتبار نہ تھا۔ لیکن وہ اسے جاننا نہ چاہتی تھی اور اس وقت درمن نے اس کی طرف اشارہ کر دیا تھا اور کتنے تحقیر آمیز انداز میں۔ لیکن ان الفاظ کو سیما نے سچا نہیں سمجھا، درمن کے یہ لفظ اسے ذلیل معلوم ہوئے، ذلیل اور کمینے، اور ایک انتقامی سے جذبے میں اس نے سوچا کہ وہ گھر سے باہر نہیں جائے گی، نہیں جائے گی۔

لیکن اس نے سکول جانا نہ چھوڑا، شام کو سیر کرنے جانا چھوڑ دیا، اور تین دن خاموشی میں کٹ گئے نہ وہ درمن سے بولی، نہ درمن اس سے بولا، وہ سوچتی رہی۔

اس نوعمر ناواقف نوجوان کے متعلق بظاہر اس کے ذہن میں پرورشتہ بالکل اخلاطونی قسم کا تھا اس نے کبھی اس کے لئے شعوری طور پر جنسی کشش محسوس نہ کی تھی جو کشش تھی وہ اُسے جنسی نہ سمجھتی تھی، سیما نے کبھی اس نوجوان کو اس قسم کی مخصوص اہمیت نہ دی تھی لیکن حقیقت میں اب یہ نوجوان اس کے تمام احساسات کا ذمہ دار تھا اور سیما کی روح اس ممانعت کے خلاف بغاوت کر رہی تھی۔ وہ اسے ناحق سمجھتی تھی، جیسے درمن کو اس طرح منع کرنے کا ادھیکار نہیں ہے، لیکن درمن کا ادھیکار تھا اور وہ اس امر سے واقف تھی، ذہنی طور پر پہلے بھی تھی اور اب اس ادھیکار کے خلاف بغاوت ہوتی جا رہی تھی۔ یہ تھی کیوں ہے، وہ سوچتی تھی، کیا عورتوں کا جنم گھر کی دیواروں میں پیدا ہو کر وہیں مر جانے کے لئے ہوتا ہے، کیا انہیں دنیا میں کچھ دیکھنے کا حق نہیں، انہیں کیوں زندگی سے محروم رکھا جاتا ہے، کیوں —— اس مخالفت کے بارے میں وہ ایک عمومی ڈھنگ سے سوچتی تھی لیکن حقیقت میں مرکز وہ خود تھی، اُسے درمن کی شخصیت سے ایک رقابت سی ہو گئی، درمن اور وہ —— وہ کیا ہے، وہ کیا ہے؛ وہ خود کو اکتساب لذت کی محض ایک مشین تصور کرنے لگی، جو درمن کو لذت بخشتی تھی، یعنی اس کا مطلب یہ ہے، وہ سوچتی تھی، کہ مرد تو ہر قسم کی آزادی کا لطف لیتے ہوئے اپنا دل خوش کرتا رہے اور عورت، عورت؛

اور تین دن خاموشی میں کٹ گئے، چوتھے دن۔

رات کو درمن نے اُسے منانا چاہا تھا، ایک جسمانی اتصال سے وہ سیما کو اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتا تھا —— لیکن سیما نے کہہ دیا کہ اُن کے درمیان میاں بیوی کا تعلق نہیں ہے! کیا؟ درمن کو یقین نہیں آیا، پھر درمن کو یقین آ گیا۔ اور وہ جیسے ایک جھٹکے اور توہین کو ضبط کر کے اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ ان کے درمیان میاں بیوی کا تعلق نہیں ہے، یعنی، یعنی، تو پھر اس شادی کا مسکہ ہی کیا ہے! لیکن سیما نے

ایک رہائی سی محسوس کی، جیسے اُس نے ورمن سے کوئی چیز لے لی ہے، یا ورمن کو کسی چیز سے محروم کر دیا ہے؛ اُس نے سوچا کہ جب انہیں اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس ہوگی تو علم ہوگا کہ ــــ

خود اس کے لئے میاں بیوی کے اس تعلق میں کوئی دلچسپی نہ تھی، اور نہ وہ یہ نہ کر سکتی، لیکن اب کیوں وہ اُن کی خوشی کا آلہ بنے جب وہ اس کی خوشی کی پروا نہیں کرتے، وہ سوچتی تھی، مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ عورت کی خوشی کا خیال رکھے۔ وہ خوشی چاہتی تھی اور خوش طبع نہ تھی اور وہ ان حالات کو چھوڑ نہ سکتی اور انہیں میں وہ ان سے ایک نسوانی انتقام لے رہی تھی، اور اپنی اقتصادی آزادی کا جذبہ غیر شعوری طور پر اسے سہارا دے رہا تھا۔

اور دن گزرتے گئے، اس نے ورمن کے بستر میں شرکت کرنا چھوڑ دیا تھا، وہ گھر میں [illegible] کی آواز میں گفتگو کرتے، گفتگو جو لازمی ہوتی تھی، وہ اس سے بچنا بھی نہ چاہتی تھی، بلکہ چاہتی تھی کہ ان حالات میں اور جھگڑا نہ بڑھے۔ اور یہ گفتگو بالکل کاروباری قسم کی ہوتی تھی۔

اس نے سمندر کے کنارے جانا چھوڑ دیا تھا۔ اپنی حقیقی خواہشات کو دبایا تھا۔ ورمن نے اس دن وہ الفاظ کہہ کر اُس کے زیر نفسی احساسات پر جنہیں وہ جاننا نہ چاہتی تھی ایک ناگوار روشنی ڈال دی تھی اور اس نے انہیں [illegible] کیا تھا اور سمندر کے کنارے جانا چھوڑ دیا تھا۔

لیکن اب اسے ایک ویرانی سی محسوس ہوتی تھی، ویرانی، ویرانی، ویرانی، وہ اسکول جاتی، لڑکیوں کو پڑھاتی اور ایک اکتاہٹ سی اُس پر امڈی چلی آتی۔ اس کے گرد ہر شے بے خبر ہو گئی تھی، ہر شے نے اپنی دلکشی کھو دی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کے لئے ایک ناگوار مشقت کر رہی ہے۔ وہ گھر میں رہتی اور یہ نہیں کرے اُسے بالکل تنہا معلوم ہوتے، یہ نہیں کرے، ان کے مجسم وجود میں سے کوئی چیز زائل ہو گئی تھی، وہ چیز جو انہیں زندہ رکھتی تھی، وہ چیز جو ان کے اور سیما کے درمیان رشتہ تھی۔ اس کی دلچسپی ان میں سے تفریق ہو گئی تھی۔ ورمن گھر میں ہوتا تو وہ اس سے الگ، الگ رہتی، ورمن کا باہر جانا بھی اُسے پسند نہ آتا اور ورمن سے رغبت بڑھ رہی تھی۔ لیکن اس کا اپنا وجود خود اُس میں اکتاہٹ بیدا کر رہا تھا۔

پچھلے دنوں وہ بے حسی اور بے کلی جو وہ محسوس کیا کرتی تھی، دب گئی تھی، اب وہ پھر اُبھرنے لگی۔ اُسے پھر وہی انتظار کا سا اضطراب ہوتا تھا۔ اپنے جذبات پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ دن طویل ہو گئے تھے اور دن ڈھلنے کے ساعت تھے وہ پھر اپنے تصور میں خود کو اس سحر کے زیر اثر محسوس کرنے لگی تھی۔ نیچے اس کی روح کی تہہ میں خود کو اس سحر کے سپرد کر دینے کی آرزو تھی، وہ اس ویرانی سے اس سحر کے دھندلکے میں پناہ چاہتی تھی ملائم، ڈھکتے ہوئے، غالب دھندلکے۔

اپنے ادراک میں وہ خود اپنے خیالات سے جھگڑنے لگی۔ وہ کیوں ان تین کمروں میں محبوس ہے، تمام دنیا اور زندگی سے منقطع ہو کر ان تین کمروں میں۔ اور اب اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے گھر میں رہنے کا نتیجہ کچھ نہیں۔ اس کے باہر نہ جانے سے ورمن پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جیسے اس کی ورمن کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں اس کی برداشت کا کوئی خیال نہیں، کیوں ــــ ہے وہ اسی کے لئے بنائی گئی ہے وہ عورت ہے۔ مگر عورت اس کے لئے کیوں بنائی گئی ہے۔ یہ مردوں کی خود غرضی ہے، یہ مردوں کی دنیا ہے، وہ گھر سے باہر جانا بند کر دیتی ہے لیکن "ان" پر کوئی اثر نہیں ہوتا، ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، اسے محسوس ہونے لگا کہ اس نے ورمن سے جنسی علیحدگی اختیار کر کے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اُسے اس بات کا اسف نہ تھا۔ لیکن ــــ کتنی غیر اہم ہے وہ، وہ کیا کر سکتی ہے، وہ کچھ نہیں کر سکتی، وہ صرف ایک عورت ہے۔

لیکن اس میں جو عورت تھی وہ ان حالات کے برخلاف ہو گئی۔ وہ کس بات میں اس سے کمتر ہے، اگر ہے بھی تو ورمن کو اسے زندگی سے علیحدہ

رکھنے کا کیا حق ہے، حق! وہ حق پر مصر تھی، ایک عورت کے حق پر، ایک انسان کے حق پر۔

اور اب یہ ویرانی، یہ کسی چیز کی آرزو جو نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے، ہر ایک چیز کی دلکشی مُردہ پڑ چکی ہے، ہر شے ایک Decay میں پڑی ہے، ہر ایک شے پر سے خزاں گزر گئی ہے، اُسے اپنے اندر خزاں کا ایک مادی احساس ہوتا تھا، وہ اسے اپنے دل میں محسوس کرتی تھی، خزاں۔

اور اپنے گرد خزاں کے اس دائرے سے باہر آنا چاہتی تھی۔ وہ باہر آ گئی۔

سمندر آج ساحل سے پیچھے گیا ہوا تھا، دھند لکا ہو چلا تھا، وہ دیر سے آئی تھی۔ سمندر کا شور فاصلے پر سنائی دیتا تھا اور زیادہ صاف اور زیادہ سنسان تھا۔ فضا میں سے دن کی روشنی غائب ہو چلی تھی۔ اور چاندنی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ سیما بنچوں کے سہارے چلتی رہی، سمندر دور چلا گیا تھا، اور کنارے پر ٹہلنا بیکار تھا! اور وہ بینچوں کے قریب ٹھہرتی رہی، اس کونے سے اُس حد تک اِدھر سے اس کونے تک۔ اکثر بینچ خالی پڑے تھے۔ ایک سناٹا سا تھا جسے اس نے ایک مبالغہ آمیز حد تک گہرا محسوس کیا۔ یونہی اسے معمولی سا خیال آیا کہ شاید وہ یہاں پھر مل جائے۔ اپنے دل میں وہ اس سے ملنا چاہتی تھی، اپنی روح میں اُسے ڈھونڈ رہی تھی، لیکن اکثر بینچ خالی پڑے تھے۔ سناٹا گہرا ہو رہا تھا، ہوا بند تھی اور سمندر دور چلا گیا تھا۔ ہر شے غور کو اس سے چھپاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، گھر سے باہر بھی ہر شے خالی تھی، اس نے گرد و پیش سے علیحدہ ہونا چاہا۔ اور وہ بینچ پر بیٹھ گئی۔ دن کی روشنی چاندنی میں جذب ہو گئی تھی۔ اس کے قریب چاندنی روشن تھی لیکن اس سے دُور جاتی ہوئی مدھم ہوتی گئی تھی، ایک سفید سی دھند چھائی ہوئی تھی، سمندر پر، سب جگہ، اندھیرا تھا، نہ روشنی تھی۔ چاند جیسے ایک مُردہ دنیا پر چمک رہا تھا۔ لیکن اس نے چاند کو نہیں دیکھا، اس کی روح پر ایک بار سا تھا، وہ نیچے جا رہی تھی۔ نیچے وہ ایک عجیب سی یاس سے ہم آغوش تھی اور ہر شے پر ایک پرانی چھائی ہوئی تھی۔

دیر تک وہ بینچ پر بیٹھی رہی، ایک خیالی دنیا اسے پن کی سی حالت میں اور غیر متوجہ شعور میں سمندر کا شور سنتی رہی۔ اب فاصلے پر سمندر کی سمت ایک روشنی چمک رہی تھی، سمندر کی موہوم سطح سے اور ایک آدمی کا سلہوت اپنے ہاتھ میں لالٹین لئے اِدھر آ رہا تھا۔ اس نے سلہوت کی موجودگی کو نظر انداز کر دیا۔ اور لالٹین قریب آتی گئی۔ بیرونی تاریکی سے روشنی اس کے شعور میں گھسی آ رہی تھی، بیرونی تاریکی سے روشنی اس کے شعور میں گھستی آئی اور وہ ہوشیار سی ہوتی گئی۔ آنے والا سلہوت اُدھر خشکی پر آ گیا تھا، اُس کے ہاتھ میں لٹکتی ہوئی لالٹین ہل رہی تھی روشنی کا سایہ کنارے کی ریت پر حرکت کر رہا تھا۔ اور وہ روشنی کا وجود ریت پر گزرتا ہوا سڑک پر چلا گیا اور سیما نے جانا کہ وہ یہاں ہے، دھندلکے میں اور اُسے جانا ہے، وہ اٹھ کھڑی ہوئی اُسے جانا ہے، وہ جانے لگی۔

سمندر سے اُبھار جاتی ہوئی سنسان سڑک پر برقی بتیوں کی قطار چلی گئی تھی۔ شیڈ میں روشنیاں منجمد ہو گئی تھیں۔ ساکت، غیر متحرک۔ جامد روشنیاں، سڑک پر لالٹین کے دھبے تھے۔ اور اُن کے گرد تاریکی، اندھیرا روشنی سے زیادہ تھا، روشنی اندھیرے سے کم تھی۔ وہ جا رہی تھی۔ وہ آ رہا تھا۔ اور روشنی کے دو دھبوں کے درمیان اندھیرے میں وہ ایک دوسرے کے پاس سے گزرے۔

"سیما دیوی"

سیما کے سینے میں دل رک گیا، وہ کھڑی تھی۔

اب وہ قریب آ گیا تھا، اس نے پوچھا "آپ واپس جا رہی ہیں؟"

سیما کہہ نہ سکی کہ وہ جا رہی ہے، صرف کہہ نہ سکی۔

جاتے جاتے مجھے شبہ ہوا تھا کہ یہ آپ ہیں۔ آپ تھوڑی دیر ٹھہریں گی نہیں؟"

"چلیے" سیما نے کہا۔ ایک تیسری طاقت کے زیر اثر جو نہ اس کی اپنی تھی نہ اس نوجوان کی، اور وہ واپس ساحل پر گئے۔

سمندر کتنی دور سے آگے گیا ہوا ہے؟" اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے۔ ہم اس خشکی پر سے گذر کر کنارے پر چلے جائیں۔" اور اس نے سیما کے جواب کا انتظار نہ کیا جیسے اُسے معلوم ہو کہ وہ انکار نہیں کر سکتی اور سیما اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ یہ یا اس کی اپنی طاقت کا فقدان تھا یا اس نوجوان کا اثر یا دونوں ہی تھے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔

"جب سے چاند بڑا ہونا شروع ہوا ہے میں اب رات کو آتا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "آپ نے تو اب آنا ہی چھوڑ دیا۔ ایک ہفتے تک مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں روز آپ کا انتظار کرتا ہوں، اور مجھے اپنے اوپر تعجب ہوتا تھا کہ میں یہ انتظار کیوں کرتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید آپ بمبئی میں نہیں ہیں، لیکن پھر بھی مجھے امید تھی کہ آپ یہیں ہیں اور مجھے پھر ملیں گی۔"

مہمت سی سیما اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ وہ کیا کہے۔ اس کے اندر کہنے کو کچھ نہیں تھا، وہ خالی تھی، لیکن وہ کچھ کہتا رہا۔ اس کی متکلم موجودگی کا احساس سیما کو پھر اپنا ٹائر کرتا جا رہا تھا، وہ پھر اپنی طاقت کو کھو کر کمزور ہو رہی تھی، وہی ایک نرمی کا تاثر اس کے ہوشیار شعور کو ڈھک رہا تھا۔

"آج کل میں رات کو دیر تک یہیں بیٹھا رہتا ہوں، گھر میں خود کو اکیلا محسوس کرتا ہوں، لیکن یہاں اس سناٹے میں مجھے تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔ پھیلی ہوئی سی جگہ میں اکیلا ہونے پر بھی وحشت نہیں ہوتی لیکن گھر میں ہمیشہ ایک جلا وطنی سی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے تعجب ہوتا ہے کہ عورتیں کس طرح ساری عمر گھروں میں رہ کر گزار دیتی ہیں۔"

"انہیں گھروں میں رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔" سیما نے آہستہ سے کہا۔

وہ رک گیا اور سیما جیسے خاموشی میں گھٹنے لگی، پھر وہ بولا۔ "اگر انسان کی فطرت میں عادت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ شاید اس وقت زندگی کی شکل ہی بدل جاتی، یا یوں کہئے کہ زندگی کی کوئی شکل ہی نہ ہوتی یا اتنی شکلیں ہوتیں اور وہ اتنی جلدی جلدی بدلتی رہتیں۔ عادت نے زندگی کو بالکل ساکت کر دیا ہے اور نہ زندگی اتنی اکتا دینے والی نہ ہوتی، نہ اتنی یکساں۔ خیال کرو کہ اگر انسان کی فطرت میں عادت نہ ہوتی تو زندگی کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی۔"

وہ ہنس پڑا لیکن بہت آہستہ سے، جیسے یا تو وہ خود اپنی آواز کے سحر میں ہو، یا اس سحر سے واقف ہو اور اس کے دائرے سے باہر نہ جانا چاہتا ہو۔ جیسے اُسے ایک ڈر ہو کہ ایک اُونچا قہقہہ سحر کے دائرے کی قوس کو توڑ دے گا۔ اس کے ہنسنے نے سیما کو متحرک سا کر دیا، جیسے پانی کی سطح پر چند بوندیں پڑ جائیں، لیکن پانی کی سطح پھر ساکن ہو گئی تھی اور وہ چلتی رہی وہ کنارے پر آ گئے تھے۔ یہاں زمین زیادہ نمدار تھی اور نرم زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے اُسے وہی ایک گداز سا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا اور اک پگھل رہا تھا اور گرد و پیش کا احساس ایک ملائمت کی سی کیفیت لے کر دل میں سمایا جا رہا تھا۔ سمندر کا شور گداز اور شفقت آمیز تھا، جیسے اس کا ذہن بہت ملائم ربڑ کا بنا ہوا ہو اور سمندر ریت کے ساحل سے ٹکرا رہا ہو۔ وہ کنارے پر پہنچ گئی۔

یہاں تک آتے آتے وہ خاموش ہو گیا تھا، لیکن اس کی خاموشی عجیب تھی۔ کسی دوسری شے سے حاملہ تھی۔ چپ ہو کر وہ کنارے پر سمندر کے جھاگوں کو پھیلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جن کی سفیدی چاند کی روشنی میں بکھر جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں آگے آگے، ساحل کے کنارے کنارے ان جھاگوں کو دیکھتی رہیں۔ لہر سے ٹکراتی تھی اور کنارے پر جھاگ بکھر جاتی تھی، صرف ان سمندری جھاگوں کو چاندنی نے سفید کر دیا تھا اور باقی ہر شے دھندلی تھی، وہ ان جھاگوں سے الگ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اور سیما اپنی حالت سے ناواقف اس کے قریب کھڑی رہی۔ اس کے پاس تھی اور ہر شے ساکن ہو گئی تھی۔ لیکن اس سکون سے نیچے یا اس سکون کے پار ایک دوسرا متحرک احساس تھا۔ اور اس احساس نے سیما کو ڈھک لیا تھا۔ وہ اس

احساس کے تحت میں کھڑی رہی جیسے عمیق عمیق، روح کی عمیق گہرائی میں وہ کسی چیز کا انتظار کر رہی ہو، وہ کسی چیز کا انتظار کر رہی تھی۔

"آپ بیٹھیں گی؟" اس نے پوچھا اور کنارے سے ہٹ کر گیلی ریت پر اپنا کوٹ بچھا دیا۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے کہا، اس کی آواز میں دور دراز تحکم کی ایک طاقت تھی۔ اور سیما بیٹھ گئی اور وہ خود بھی بیٹھ گیا۔ سیما اپنی آواز سے محروم تھی، وہ کچھ چاہ رہی تھی اور اپنی روح میں اس سے ڈر بھی رہی تھی اور بولنے کی طاقت سے محروم ہو گئی تھی۔ وہ عجیب ڈھنگ سے خاموش تھا، اس کی حالت خاموشی، خاموشی، کائنات میں جو صوتی حرکت تھی وہ سیما کی توجہ کے دائرے سے باہر ہو گئی تھی۔ پھر آہستہ سے اس نے سیما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور سیما نے ایسا ہونے دیا وہ جیسے پیار سے سیما کی ہتھیلی پر اپنی انگلی سے لکیریں سی بنا رہا تھا، صلیب کے سے نشان وہ کچھ کہہ رہا تھا، سیما سن رہی تھی، لیکن وہ سن نہیں رہی تھی، اسے معلوم نہ تھا وہ کیا کہہ رہا تھا، سیما کو صرف اس کی آواز کا احساس تھا بلکہ اس سے بھی آگے صرف اس آواز کے تاثر کا، اور اس میں الفاظ نہیں تھے، الفاظ سے جدا وہ صرف اس سحر کے زیر اثر تھی اور ہاتھ کا یہ لمس ایک منزل تھا، یہ جیسے اس سحر کی ایک مادی صورت تھی جس کے میرو وہ خود کو کر دینا چاہتی تھی، یہ لمس اس سحر اور سیما کے درمیان میں ایک رشتہ تھا۔ پھر اس کا بازو سیما کی کمر کے گرد آ گیا اور سیما نے روکا نہیں، وہ اپنی عمل طاقت سے متعفی ہو گئی اور اس کے بازو کا دباؤ سیما کو قریب لاتا گیا، وہ سحر اسے چھو رہا تھا، سحر اسے اپنے آغوش میں لے رہا تھا، وہ آغوش میں آ گئی اس کے جسم کا ہر عضو ڈھیلا ہوتا گیا۔ اس کے تمام وجود نے خود کو چھوڑ دیا اور سیما اس کے آغوش میں پڑی رہی۔ وہ اگر اسے چھوڑ دیتا تو وہ گر پڑتی۔ لیکن وہ سیما کو اپنے بازوؤں میں لئے رہا اور خاموشی کے لمحے ان Moments میں جذب ہوتے گئے۔ اور سیما نے اس کے ہاتھ کو اپنے سینے پر محسوس کیا۔ جیسے وہ اپنے ہاتھ سے ایک بلی کی ملائم سمور کو برش کر رہا ہو۔ اور اس کے ہاتھ کے نیچے سیما نے خود کو ایک بلی کے مانند محسوس کیا، ایک سمور بلی کی مانند اس کی تمام توجہ اپنے سینے پر سمٹ آئی۔ وہ اپنے آپ سے غافل تھی، اس سے بھی غافل تھی، اُسے اپنے سینے کا احساس تھا، صرف اس لمس کا جو اس کے سینے اور اس سحر کے درمیان تھا، وہ آہستہ آہستہ اس کے سینے پر ہاتھ پھیر رہا تھا: اس کی چھاتی کو اپنی انگلیوں کے نرم دباؤ سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ غافل تھی اور اس کے لب سیما کے لبوں پر رکھے تھے اور وہ غافل تھی، اور ——

جب وہ گھر پہنچی تو اب تک اس سحر کے اثر میں مبتلا تھی۔ اس کی روح کو چھید کر کوئی چیز اس کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ اور اُس نے اُسے لاعمل اور معیوب کر دیا تھا۔ اُس نے اپنے شعور کو اور اپنے عمل کو دوسرے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔ اُن ہاتھوں کی طاقت، ان میں بہت بہت بہت زیادہ کچھ تھا جس کے خلاف وہ کھڑی رہ سکتی تھی۔ اور اس نے خود کو نہیں کر دیا تھا۔ اور ابھی تک اس سحر کے غالب اثر میں مبتلا تھی۔

لیکن اب مکان کا دروازہ بند تھا۔ بند دروازے کے آگے کھڑے ہوئے اُسے محسوس ہوا کہ دیر ہو گئی ہے، دیر ہو گئی تھی، اور دیر کا احساس اُسے پورے شعور کی ذلیل حالت میں لاتا گیا —— گرر گرر ڈ گھنٹی بجا رہی تھی اور گھنٹی کی آواز اُس کی روح کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ ایک تقصیر کا سا احساس لیے ہوئے، خوف زدہ سی۔

گرر گرر، گرر گرر، گرر گرر ——

کوئی آ رہا تھا۔

دروازہ کھل گیا۔ دمن اندر کھڑا تھا۔ وہ دمن کا سامنا نہ کر سکی، بالکل وہ ایک تصور واہ کی طرح اندر آ گئی دمن مڑ گیا تھا اور اندر آ کر سیما نے دروازہ بند کر لیا، بالکل آہستہ سے کہ شور نہ ہو، وہ آواز سے خوف زدہ تھی، اور اچانک کلاک نے گھنٹہ بجایا اور وہ چونک پڑی۔ اور ایک، دو، تین ..... کلاک گیارہ کے گھنٹے بجاتا رہا اور وہ گھنٹوں کی آواز پر قدم رکھتی ہوئی اندر چلی گئی، گیارہ بج گئے تھے۔

"کہاں تھیں؟" دمن نے سنجیدہ درشتی سے پوچھا۔

"سمندر کے کنارے" سیما نے آہستہ سے جواب دیا۔

"وہاں نہیں تھیں تم، میں خود تمہیں وہاں دیکھ آیا ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کہاں تھیں؟"

"وہیں تھی۔" اس کی آواز قصور وار تھی۔

"جھوٹ بولتی ہو۔ مجھے تم پر بالکل یقین نہیں، تمہارے منہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تم ——— کہاں تھیں تم؟ تمہیں اپنی عزت کا خیال ہے نہ میری۔ یہ رات کے گیارہ بجے تم سمندر کے کنارے تھیں۔ شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے۔ کل سے تم نہ سمندر کے کنارے جا سکتی ہو نہ کہیں اور تمہیں جہاں جانا ہے میرے ساتھ جاؤ۔"

"کیوں؟" سیما نے حفاظت نفس کے سے جذبے سے کہا۔

"کیوں کہ میں جانتا ہوں تم کیا کرنا چاہتی ہو اور میں تمہیں اپنے چہرے پر سیاہی نہیں پوتنے دوں گا۔ کل سے تمہارا سکول جانا بھی بند ہے۔ تم کہیں اکیلی نہیں جا سکتیں۔"

"لیکن میں خود اپنے آپ کو سپورٹ کرنا چاہتی ہوں، میں تم سے کچھ نہیں چاہتی، کچھ نہیں چاہتی۔"

"تم میری بیوی ہو۔" ورمن نے زور سے کہا۔

اور الفاظ براہِ راست سیما کے لاشعور سے آئے ———

"لیکن میں اس سے محبت کرتی ہوں، محبت کرتی ہوں، محبت کرتی ہوں" ———

"سیما!"

اور اس نے اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا لیا اور رونے لگی۔

سید رفیق حسین

کلوا

منہ پر پسینہ، گالوں پر سُرخی، کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے۔ قمیص کے دامن اور ہاتھ پر روشنائی کے دھبے۔ اذان دینے پیروں تک لٹکا ہوا، ایک بغل میں کالا بستہ اور دوسری بغل میں کالا کتّا۔ مقن گھر میں داخل ہوا۔ اماں نے چیخ ماری۔ "لے اے ہے میں مر گئی"۔ سنگر مشین نے گنگنانا بند کر دیا۔ ماں کا ایک ہاتھ مشین کے ہینڈل پر تھا دوسرا ماتھے پر۔ اس ساکت بچّے کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ اور گہری محبت نمایاں تھی۔ ملّو کے نے چھوٹے سے گھر میں ایک طرف سے دُوسری طرف گردن گھما کر دیکھا، اور بھاری آواز بنا کر بولا "اماں ہم اسے پالیں گے"۔

ماں نے ماتھے سے ہاتھ ہٹا کر پتّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسے خدا کے لئے گود سے تو پھینک"۔ کچھ خفگی کی آواز میں "سارے کپڑے نجس کر لئے پھینک اسے۔ نہا رے ابا آتے ہوں گے"۔

لڑکے نے بھدی سے پتّے کو زمین پر رکھ دیا۔ پلّا تین انچ کی دُم ہلا ہلا کر مقن کے جوتوں پر لوٹنے لگا۔ ماما نے باورچی خانہ سے گردن باہر نکال کر ناک پر انگلی رکھ کر ہنستے ہوئے کہا "بیوی دیکھئے تو مزا کیسا پیروں میں لوٹ رہا ہے"۔ دو برس کی لڑکی تخت کے پاس سے صحن کی طرف بڑھی۔ ماں چلّائی "لو یہ بھی چلیں، اب گھر بھر گندا ہوگا۔ مقن تم یہ کیا مصیبت لے آئے!"

مقن نے کہا "بوٹ کاٹ کھائے گا ادھر نہ آنا"۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد مقن منہ دھوئے، صاف کپڑے پہنے، اُجلے بنے، چارپائی پر بیٹھے تھے۔ صرف سیدھے ہاتھ کی اُنگلیوں پر ہلکے نیلی روشنائی کے نشان ابھی تھے۔ سامنے فولاد آبادی تھالی میں دو بسکٹ تین جلیبیاں اور ایک پیالی دُودھ تھا۔ جس پر تین مکھیاں مشغول تھیں۔ خود کتّے کی طرف مشغول تھے۔ کتّے کا پلّا صحن کے دروازے کے سامنے کھڑے کے پائے میں رسّی سے بندھا ہوا ایک ہڈّی میں پوری طرح مشغول تھا۔ ماں نے تیوریاں چھیلتے ہوئے کہا "اب ناشتہ کر لو۔ یہی تو بات بُری ہے۔ مکھیاں بھنکا رہے ہو۔ دیکھو دودھ میں مکھی گر جائے گی"۔

"اماں اس سے ہڈّی چھینتی تو ہے نہیں۔ بسکٹ دیدوں"۔ یہ کہا اور لڑکا بسکٹ لیکر اُٹھنے لگا۔

ماں نے کہا "چلے پھر چھوڑنے کو۔ ارے تم کھا تو لو، میں اور....."

گھر میں آہستہ سے مالکِ خانہ داخل ہوئے۔ سیاہ ٹوپی، سیاہ فریم کی عینک۔ سیاہ تکونی داڑھی۔ سیاہ شیروانی۔ سیاہ چھڑی ہاتھ میں اور سیاہ جوتا پیر میں۔ کھونٹے کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ بیوی بچی ہوئی چائے کی تُرے میں سے چائے دان لیکر باورچی خانہ کی طرف چلیں۔ زینہ میں رُک کر بیٹھ گیا۔ سر جُھکا کر دُودھ میں بسکٹ توڑ توڑ کر ڈالنے لگا۔ میاں نے جُھنجلائی ہوئی آواز میں کہا "یہ کیا ہے جی؟ کون لایا اسے؟"

بیوی چائے دان ہاتھ میں لئے باورچی خانے کے سامنے رُک گئیں۔ مُسکرا کر بولیں "لے مُوا ڈیوڑھی میں آگیا تھا۔ کوں کوں کر رہا تھا۔ دیکھ کر ترس آگیا۔ کیسا پیارا ہے۔ میں نے باندھ لیا۔"

میاں نے لاحول کو قرأت سے ادا کر کے کہا "بگے گا تو؟"

"بھگن اُٹھائے گی۔"

"مُوتے گا جو؟"

"تو لوٹے سے دھویا جائیگا۔ آؤ چائے پی لو۔"

"بچے جو چھوئیں گے؟"

بیوی اب باورچی خانہ میں تھیں اس لئے کوئی جواب نہ ملا۔ مُنّن کا سر البتہ پیالے کی طرف اور جُھک گیا۔ میاں نے کمرے میں جا کر اپنے سوا باقی تمام چیزیں ایک ہی کھونٹی پر لٹکا دیں۔ دُوسرا قمیص اور پاجامہ پہن کر منہ دھویا۔ تولیہ سے رگڑ رگڑ کر داڑھی کو پونچھا۔ اور چائے پینے کو بیٹھ گئے۔ بیوی پاس بیٹھ کر مکھیاں جھلنے لگیں اب پھر میاں بولے "کیا نجاست پھیلائی ہے چلکوا دو باہر۔"

بیوی نے بگڑ کر کہا "بس تم کو تو ایک بات کی دھن ہو جاتی ہے۔ ہمارا کیا لیتا ہے۔ پڑا ہے بچے کھیلیں گے!"

"ہاں یہ انہی حضرت کا شوق ہو گا؟"

حضرت تینوں جلیبیاں، آدھا بسکٹ اور تھوڑا سا دُودھ چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے زینے میں گھس چھت پر پہنچ گئے۔

کالا پلّا آٹھ دن اس گھر میں مہمان رہا۔ دونوں صحن میں جہاں دو دفعہ میاں نے گود والی لڑکی کو لئے چھُوتے دیکھا۔ پھر پانچ دن ڈیوڑھی میں، جہاں ایک دفعہ اس کی رسّی پیروں میں پھنسی اور دوسری دفعہ یہ خود انہی کے پیروں میں آگیا۔ آخری یعنی آٹھویں رات اس کو کوٹھے پر بسر کرنی پڑی۔ یہاں اُسکو ماں کی یاد نے ستایا۔ یہ یادِ ماضی پر چیخیں مارتا رہا اور میاں بیوی کو بھنبھوڑتے رہے۔ اوپر اور نیچے دونوں جگہ رت جگا رہا۔

دوسرے دن گیارہ بجے کالا پلّا صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا دماغ کے پیچھے گھسٹتا ہوا نحاس کی چوڑی سڑک پر پہنچ گیا۔ اور سڑک کے سپرد کر دیا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک ٹرنے نہیں۔ نہیں کرنا شروع کی۔ ایک بڑے لڑکے نے ہنستے ہوئے لپک کر اُسے ایسی ٹھوکر ماری کہ یہ گیند کی طرح لڑھکتا ہوا نالی میں جا گرا۔ مڑا ایک دفعہ اور غیں کر کے چل دیا۔ لیکن کالا پلّا عرصے تک ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا رہا۔

نالی میں کیچڑ اور پانی صرف اتنا ہی تھا کہ اس کے بچے ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن نالی اس کے واسطے کافی گہری تھی۔ جس میں سے وہ نکل نہ سکتا تھا۔ اس نے چار چھ زبان کے سڑاپوں سے کچھ پانی پیا۔ اور پھر نالی پر چڑھنے کو اگلے پیر اُٹھا کر نالی کی دیوار پر رکھے۔ تین دفعہ کوں کوں کی اور پھر پیر نیچے کر کے چلیدہ آٹھ قدم چل کر پھر اُس نے وہی کوشش کی اور کوں کوں کر کے پھر چل دیا۔ گلے کی رسّی بیچ بیچ گھسٹ رہی تھی۔ یہ ایسی ہی کوششیں کرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک قصائی کے لڑکے کی اس پر نگاہ پڑی۔ ایک ہاتھ میں بستہ اور بغل میں تختی تھی۔ دُوسرے ہاتھ میں مٹی کی دوات اور بستے کا قلمہ۔ سرپٹ آ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے نکلا پیر لٹکا کر اس کی مدد کرنا شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں پلّا کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ لتھڑے ہوئے کپڑوں کے ورثہ کے اور آ گئے۔ کچھ پرندہ اُسکا تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک نے جُھک کر اس کی رسّی کا سرا پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے اور اس کی رسّی کو نالی سے باہر نکال دیا۔ رسّی پر

لپٹی ہوئی مکڑی کے چھینٹے اڑے۔ ایک کی آنکھیں اور دوسرے کے گھٹے ہوئے ہنستے منہ میں کیچڑ نے اپنا منہ چکھایا۔ چنانچہ تینوں لڑکوں میں آپس میں حال اور بھلوں کے متعلق شستہ گفتگو شروع ہوگئی۔ کالے پتے نے محبت بھری نگاہوں سے اُس لڑکے کو دیکھا جو جھکا ہوا اپنے ہاتھ کی کیچڑ سڑک پر پھینک رہا تھا اور اپنے ساتھی کی گالی کے جواب میں گالی برابر دہرا رہا تھا۔ پلا دُم ہلاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ اب اس نے پتے کو غصہ سے دیکھ کر کہا "شیرا ہے شیرا۔" پھر اس نے رسّی کے سرے کو پیر سے زمین پر رگڑا اور اٹھا لیا۔ "آؤ شیرا آؤ!" کہہ کے رسّی تانی۔ شیرا نے تین چار چھلانگیں اس کی طرف بھریں۔ اب لڑکا بھاگنے لگا۔ دو چار قدم شیرا نے ساتھ دیا پھر گھسٹنے لگا۔ جب پیر چھلنے لگے تو پیں ہیں کہ کے چت ہو کر ہی گھسٹنا بہتر سمجھا۔ باقی دونوں لڑکے اسکے پیچھے پیچھے تھے۔ گلی کے نکڑ پر مونڈا بچھائے پہلوان بیٹھے تھے۔ انہوں نے لونڈوں کو ڈانٹ بتائی: "ارے تمہارا ایسا ویسا لونڈہ کیا کرتے ہو۔ چھوڑو بچے کو۔" لونڈے پتے کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پلا تین ایچ کی دُم ٹانگوں میں دبائے سر زمین سے لگائے پہلوان کی طرف بڑھا۔ پہلوان نے پیر سے دو تین دفعہ اسے لڑھکا کے گلی کے کنارے کر دیا۔ اور خود بے فکر ہو کر پھر مونڈھے پر جا بیٹھے۔ وہیں پر چار دوکانوں میں کہار رہتے تھے۔ ایک کہار کی بیٹھی لڑکے کی کڑھائی مانجھ رہی تھی۔ پلا اس کے پاس اسی حالت سے سر زمین سے ملا، دُم پیروں کے اندر کیں کیں کرتا گیا۔ کہاری نے کہا: "دھو، دھو۔"

ایک تیرہ برس کی دیہاتی کہار کی لونڈیا نے باہر کی دوکان سے چھلانگ ماری اور پلے کو اٹھا لیا۔ لیکن فوراً ہی رام رام کہہ کر زمین پر رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ دیوار پر رگڑ کر دوکان میں گئی۔ ایک لٹیا پانی لائی اور اسے غسل دیا۔ پلے کا یہ پہلا غسل تھا۔ بہت ناپسند آیا۔ ہر طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ ناک میں بھی پانی چلا گیا۔ بُری طرح چھینکیں آئیں۔ جب غسل ہو چکا تو وہ کانپ رہا تھا۔ لڑکی نے اس کا بدن ایک میلے چیتھڑے سے پونچھا۔ مٹھے میں کھجور کی بھرے کی روٹی کھانے کو دی۔ اسی لڑکی نے اس کا نام کلوا رکھا۔ لڑکی کا خود نام چندو تھا۔

کلوا نے ڈھائی مہینے چندو کے ہاتھ اور پیر چاٹے۔ اس کا یہ زمانہ بڑے عیش میں کٹا۔ لیکن اسی قلیل عرصے میں بھورا نامی تعفنائی کے دڑکے نے پلے تو چندو سے نعشق بڑھایا۔ لیکن جب چندو نے ایک دو مرتبہ بُری طرح جھڑک دیا تو پھر اُس نے بُیر بڑھایا۔ اور اب بھی جب بھی نہ پلا تو ایک رات جب یہ لوگ کھلی میں سو رہے تھے تو کلوا کو کھٹیا کے پاس سے اٹھا بھاگ گیا۔ پہلے کلوا نے کوں کوں کی پھر ناراضگی کے دانت دکھائے اور آخر میں جب کاٹنے کی کوشش کی تو بیچارے کی تھوتھنی پکڑ لی گئی۔ بھورا نے اسے بہت دُور مٹچپورہ کے ایک پرانے قبرستان میں لے جا کر قبروں کے بیچ میں ایک بیری سے باندھ دیا۔

کلوا تمام رات سینکڑوں قبروں پر اکیلا فوحانی کرتا رہا۔ صبح کو ایک لونڈا زمین سے صرف چار انچ اونچا کرتا پہنے قبروں میں کچھ ڈھونڈتا ہوا آیا۔ کلوا کو دیکھ کر بڑے زور سے چلایا: "بابا رے یہ دھر لعلا!" بابا، قبرستان کے حکیم دار فقیر مہندی کی قبر ہاتھ میں لئے آئے اور کلوا کی بہن کو یاد کر کے بولے۔ "رات بھر چلایا گیا۔" اور مہندی کی قبر سے کلوا کو ٹھنکا شروع کر دیا۔ لمبے کرتے والا لونڈا کلوا کی واویلا سے بہت محظوظ ہوا۔ ہنسی کے مارے لوٹا جاتا۔ یہاں کلوا کی یہ حالت کہ جب بیٹھے میں برداشت کی طاقت نہ رہی تو چت ہو گیا۔ اور پیروں پر چھپیوں کو دینے لگا۔ خدا خدا کر کے قبر فوتی قوامکی جان بخشی۔

کلوا دن بھر اسی بیری کے نیچے بھوکا پیاسا بندھا ہوا چندو کی یاد میں پڑا رہا۔ دن بھر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ دُور کچھ عورتوں اور بچوں کے بولنے کی آوازیں آیا کیں۔ لیکن اس طرف ایک قبر کے لمبے چوڑے تکیئے نے آڑ کر رکھی تھی۔ شام کو جب اندھیرا ہونے لگا تو اسی طرف سے کلوا کی تیز ناک نے بُھنتے ہوئے گوشت کی خوشبو محسوس کی۔ سر پر چیرہ ہو سکا۔ ایک موٹی اور لمبی چیخ نکل گئی۔ جب تھوڑی دیر بعد ایک عورت اس کے پاس آئی تو کلوا ڈر کے مارے چت لیٹ گیا۔ دُم پیروں میں سکیڑ لی۔ زبان گویا پیاس سے لٹکی پڑتی تھی لیکن جلدی جلدی اندر سمیٹ کر ہلکے ہلکے کوں کوں کرنے لگا۔ عورت نے اسے کھولا اور لے چلی۔ کلوا خاموشی سے ساتھ ہو لیا۔ قبرستان کے دوسرے سرے پر دو مختلف قسم کے مکان تھے۔ ایک کوٹھری اور ایک مقبرہ۔ ان ہی دونوں میں ان لوگوں کی رہائش تھی۔

وہاں ایک بکری بندھی تھی۔ چار کھٹیاں ایک لائن میں پڑی تھیں۔ ایک عورت اور چھ بچے چٹائی پر بیٹھے تھے۔ گیسو دراز فقیر صاحب مقبرہ کے چبوترے پر اکڑوں بیٹھے گانجے کے دم لگا رہے تھے۔ کلوا نے ہانپتی ہوئی زبان اندر کو کھینچی تو شبہ پر عزم کیا۔ غالباً بڑی معلوم ہوئی۔ ناک کی نوک کو ایک دفعہ دائیں اور پھر بائیں طرف جنبش دے کر زبان پھر لٹکا دی اور ہانپنے لگا۔ عورت نے اس کو بڑی اسی کھونٹی سے باندھ دیا جس سے کہ بکری بندھی تھی۔ اُس نے جاتے ہی بکری کے کوٹھڑے میں سے پانی چاٹا۔ بکری کو اس دوہری ہتک عزت پر غصہ آگیا۔ اس نے تین چار دفعہ مکریاں چوڑ کر اور سینگ کی نوکیں کلوا کی طرف کر کے حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن کلوا نے ظاہراً اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اطمینان سے دونوں اگلے پیر آگے پھیلا کر اور پچھلے سمیٹ کر اس چٹائی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا جس پر کھانا ہو رہا تھا۔ بکری کو اس کی ہم کھوٹا بکری نے بھی جگانی شروع کر دی۔ پہلی بوٹی جب کلوا کے پاس آکر گری تو اُس نے اپنی دم کو شکریہ کے واسطے دو دفعہ زمین پر مارا۔ مہذب سے وہیں بیٹھے بیٹھے گردن لمبی کر کے سر ٹیڑھا کر بوٹی کو اٹھا لیا۔ چونکہ مزے دار تھی دو ہی دانت مار کر نگل لی۔ زبان سے ناک اور ہونٹوں کو چاٹ کر صاف کر لیا۔ اور پھر انتظار کرنے لگا۔ دوسری بوٹی ہوا میں اڑی۔ اُس کے پھیلے ہوئے پیروں کے بیچ میں گردن کے نیچے آکر رک گئی۔ دم کو تین جھٹکے شکریہ کے دیکر کلوا کھڑا ہو گیا۔ بوٹی نرم تھی، ویسے ہی نگل گیا۔ پھر جو ایک ہڈی اچھلی تو بکری کے پاس گری، یہ جو اس طرف بڑھا تو بکری چونک پڑی۔ چاہیں نگل کر جگالی کے نئے لقمے کے گرد ان میں سے چل کر منہ میں آنے کے انتظار میں تھی، کوئی بھلا جانور ایسے موقعے پر دخل اندازی پسند نہیں کر سکتا۔ فوراً سر نیچا کر کے سینگوں کی نوکیں پیش کر، کھریاں جوڑ حملہ اور ہوئی۔ معاملہ ہڈی کا تھا۔ معمولی بات نہ تھی۔ کلوا نے بھی جواب دیا۔ "ہڈی" اور پھر "ہم ہم" کر کے دو جھٹکے حملے کئے۔ بکری صاحبہ ڈر گئیں۔ اب جو بھاگیں تو رسّی کو بھی بھول گئیں۔ بس بھاگ پڑیں۔ رسّی تنی۔ جھٹکا کھایا۔ دھم سے زمین پر ڈھیر ہو گئیں۔ کلوا کی جانے بلا۔ ہڈی اٹھا دوسری طرف چل دیئے۔ جب رسّی تن گئی بیٹھ کر مزے لینے لگے۔ گیسو دراز صاحب نے اٹھ کر ایک رسّی کے ٹکڑے سے کلوا کو بڑی مار ماری۔

سات دن کلوا کو قبرستان میں پیٹ بھر ملا اور آدھے پیٹ کھانے پر گذر کرنی پڑی۔ ایک رات خیال آیا کہ اگر دانتوں کو ورزش دی جائے تو کیا حرج ہے۔ چنانچہ ایک گھنٹے کی متواتر محنت کے بعد ایک عجیب نتیجہ ہوا کہ کلوا آزاد تھے۔

غلامی کا نشان صرف فٹ بھر ٹکڑا لٹکے میں باقی تھا۔ اس کی فکر کلوا کو متعلق نہ ہوئی۔ فوراً ایک طرف روانہ ہو گیا۔ چندو کی یاد اور پیٹ کی خواہش، ان دو اثرات کے تابع اس کے قدم اٹھنے لگے۔ نیم کا سایہ، نیم کی جڑ، تین کچی قبریں، دو پکی قبریں۔ ایک بہت اونچی پکی قبر۔ وہی پت جھڑی بیری، دو دھنسی قبریں! ایک چھوٹی قبر۔ اس کے برابر ایک بڑی قبر۔ ایک قبر کا خالی گڑھا، قبرستان کی دیوار کا ایک گرا ہوا حصہ۔ سب کو دم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف کئے ہوئے پار کیا۔ دوسری طرف دیوار سے ملا ایک نیولا کھڑا تھا۔ اس نے اس کو دیکھا اور لپکا۔ اس نے اُسے دیکھا اور بھاگا۔ چار چھلانگوں میں یہ اُس کے پاس پہنچ گیا۔ خولا پلٹ پڑا۔ دم پھول کر جھاڑو ہو گئی۔ پچھلے پیروں پر بیٹھ کر مقابلہ کو تیار ہو گیا۔ کلوا بھی اگلے دونوں پیر جوڑ کر بدن کو نیچے تان کر رک گئے۔ اب غالباً اشاروں میں ایک سے دوسرے نے معافی مانگی۔ وہ اُدھر چل دیا اور یہ ادھر روانہ ہو گئے۔ پھر وہی دم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف۔ چند یا غذا دونوں میں سے ایک جس کی قبول جائے۔

جاتے جاتے پکی سڑک پر ہو لیا۔ عیش باغ کے سامنے پولیس کی چوکی پر پہنچا۔ ایک موٹے کتے نے لیٹے لیٹے غرا کر کہا "ہوں"۔ کلوا نے رم دبائی اور ایک سپاٹا بھرا۔ ایسے ہی چلا جا رہا تھا کہ ایک ہڈی کی بو پائی۔ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ناک زمین پر سُوں سُوں کر کے فوراً ڈھونڈ لی۔ دیکھا تو کچھ حصہ اس میں کام کا تھا۔ کھایا اور پھر چل دیا۔ آر۔ کے۔ دیہلے کی چوکی آگئی۔ ایک بوسیدہ کتے نے لپک کر ان کا راستہ روکا۔ ٹیڑھے ٹیڑھے کھڑے ہو کر کھیسیں دکھا بڑی بڑی سے کھینچ کر کہا۔ "کھیسیں"۔ کلوا نے بھی کچلیاں دکھا کر کہا "کھیسیں"۔ بوڑھے نے اور گہری آواز نکلے سے نکال کر کہا۔ "دیکھیں"۔ کلوا نے دانت نکال کر تین دفعہ جھجکی سے منہ بنا کر کہا۔ "ہیں۔ ہیں۔ ہیں"۔ ایک گتیا اور آگئی۔ اُس نے کلوا کو باری باری دونوں سروں سے سونگھا، اور پھر بے پروا ہی سے لیٹ

چھوڑ کر چل دی۔ جس کے صاف معنی اس کی زبان میں یہ تھے۔ "جانے بھی دو لونڈا ہے"۔ مگر بڑے دل بوچے کو کب گوارا تھا: ہم ہم ہم، کر کے اور چڑھ بیٹھا تا چار کھوانے اطاعت گستبوں کی، چت لیٹ گیا۔

دو مہینے کھوانے بوچا کی اطاعت میں عیش باغ اسٹیشن سے آغامیر کی ڈیوڑھی تک آمد و کے آرلائن کے اوپر چکر لگائے۔ یہی بوچا کے داغتوں اور پنجوں کے زور سے حاصل کردہ جائداد تھی۔ کھوانے بار بار چندو کی یاد میں اس جائداد کو چھوڑ کر دور کے سفر کے قصد کئے۔ لیکن ہر دفعہ اس کو ناکامیاب واپس آنا پڑا۔ کیونکہ زمین کا چپہ چپہ کتوں کی جائدادوں میں تقسیم ہوا پڑا تھا۔ جس پر کہ غیر کا قدم رکھنا کتوں کے قانون میں سخت جرم ہے۔ اگر کبھی بڑی جائداد کے تنہا شخوار مالک سے بچ کر نکل بھی گیا تو دوسری سرحد پر وہاں کے حاکم اور ایک، دو یا تین جتنے بھی شاگرد ہوئے اُن سے تنہا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان ناکامیاب کوششوں سے اُسے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ زخم کھا کھا کر اس کا جسم پکا پڑ گیا۔ اور آداب جنگ کی تمام باریکیوں سے واقف ہو گیا۔

ایک روز بکھوا تنہا آغامیر کی ڈیوڑھی کی طرف سے واپس آ رہے تھے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ریوڑے کو اسنگ سے کچھ دور بوچا اُستاد کی لاش لائن پر کٹی پڑی ہے۔ اُستانی پریشان کھڑی اس کو سونگھ رہی ہے۔ کیا کر سکتے تھے سوائے ہمدردی کے۔ خود بھی سونگھا۔ پاس کھڑے ہو کر اُستانی کا غم غلط کیا۔ وراثتاً جائداد کے مالک تھے۔ اس کا انتظام ہاتھ میں لیا۔ متعینہ غذا جو اس جائداد میں ریل سے گرتی تھی اور جیبوں کے پنجے سے نکلتی تھی۔ اب اس کے کھانے والے تین کی جگہ دو ہی منہ رہ گئے۔ ایک ہی مہینے میں اُستانی چوپہ ہو گئیں۔ اور ان کے بھی ہاتھ پیروں پر وقت آ گئی۔ لیکن اب استانی کو اُن کا تعشق لونڈا سا یا معلوم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دن کھوا کو اکیلا چھوڑ کر ایک کبرے کتے کے پیچھے نکل گئیں۔ اب یہ تنہا رہ گئے۔ اکیلے کھانے والے اور اکیلے جائداد کی حفاظت کرنے والے۔ پیٹ بھر ورزش تھی اور پیٹ بھر خوراک۔ ایک مہینہ ہزار رگندا تو اب کھوا کی شان ہی نرالی تھی۔ سیاہ چمکدار مخملی کوٹ، لہراتی ہوئی لمبی دُم، گٹھا ہوا سارا جسم تھوتھنا، ہاتھ اور پیروں پر ابھرے ہوئے پٹھے۔ بل کھائے ہوئے۔ نذر میں بڑے سے بڑا کتا ان کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چور اور آمادہ گرد کتوں کا ان کو دیکھ کر دم نکلتا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اپنی جائداد کو بھی اور وسعت دے لی تھی۔ آغامیر کی ڈیوڑھی کے پلیٹ فارم کی اپنی طرف کی آدھی لمبائی تک قبضہ جما لیا تھا۔ ایک دن اس پلیٹ فارم پر ایک جگہ ایک بوٹی تھی ..... کھوا کا محبت کا جذبہ کا دل تڑپ گیا یہیں چندو بیٹھی تھی۔

کھوا اس جگہ کو سونگھے اور منہ اُونچا کر کے خاموش کھڑا ہو جائے۔ قدرت نے آنسو نہ دئے تھے کہ جاری ہوتے۔ بہت دیر تک یہی کیا کیا۔ پھر ایک دفعہ دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین پر یہ روانہ ہو گیا۔ سیکڑوں ہزاروں ہر طرح کی بوٹیوں میں چندو کی بو اس کے واسطے الگ تھی۔ بوٹیا بو ہی بو چل دیا۔ سکندر اعظم نے ہندوستان آنے تک اتنی مہموں کا سامنا نہ کیا ہو گا جتنی مصیبتوں اور رکاوٹوں کو اس نے طے چپہ سے تک پہنچنے میں عبور کیا۔ بیسیوں کتوں کو زخمی کر کے خود زخموں سے چور جس وقت وہاں پہنچا رات کا ایک بج چکا تھا۔ گلی وہی تھی، مکان وہی تھا، دوکان وہی تھی مگر بند تھی۔ اب لوگ اس کے اندر سو رہے تھے۔ دروازے سونگھے۔ چندو کے ماں اور باپ دونوں کی بوئیں تازہ تھیں مگر چندو کی بو بہت خفیف تھی۔ کتے آتے اس پر بھونکتے اور چلے جاتے۔ مگر یہ وہیں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد چندو کی بو سونگھتا رہا جو برابر زائل ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ صبح چار بجے چندو کی بو گم ہو گئی۔ اس نے دکان کے سامنے منہ اُٹھا کر رونا شروع کر دیا۔ کاش کوئی انسان اس کو یہ بتا دیتا کہ چندو اپنے دو ٹھکانے کے ساتھ دو لمحوں میں کہ بانس بریلی گئی۔ مگر کون بتاتا۔ چندو کا باپ ہاتھ میں اٹھائے لئے یہ کہتا ہوا نکلا "دو مٹے جات رہے کو کر"۔

قصائیوں کے کتے نہ اس کے ایسے تندرست تھے نہ قد آور۔ لیکن کتے گوشت کے کھانے والے بے انتہا خونخوار۔ کھوا کے بھی دانت کھٹے ہو گئے۔ جہ کہیں جا کر ان کو گلی اور گلی کے پیچھے تھوڑے میدان پر قبضہ ملا۔ دن بدن کا فاقہ زدہ ترجمہ بیچنے کی دکان کے آگے ہی گذارتا۔ جہاں اب اس کا پہچاننے والا کوئی نہ تھا بکوا چندو کے باپ اور ماں دونوں کی مار برابر کھاتا رہا لیکن اس نے دکان کا دامن نہ چھوڑا۔ یہاں کھانے کو کافی اور عمدہ چیزیں مل جایا کرتی تھیں لیکن افسوس دل کی آگ

محبت کے جھمیلوں کی طالب نہ تھی گئی۔ کچھ عرصے بعد اُس نے ان دونوں کے علاوہ غیروں سے بھی اشارے کئے۔ محبت کے لین دین کا خواستگار ہوا۔ مگر دل کا سودا کہیں نہ پڑا۔ ایک برس اسی طرح گذر گیا۔ مگر آخر چندو آ ہی گئی۔

بالکل وہی چندو کچھ بڑھ اور ہو گئی تھی۔ بچے گود میں تھا لیکن کل کا بھولا بھی تھی۔ وہ کھوا سے ڈر گئی۔ انسان کا کلیجہ چھٹ جاتا لیکن کھوا کتا تھا۔ نیچے پر کچھ گیا۔ پیٹ کے بل زبان نکال کر پیر چاٹنے کو آگے بڑھا۔ پیر ہٹے تو زمین چاٹی۔ کہار کی جو بتیاں جب پڑیں لیٹ گیا۔ اسکھیں بند کر لیں۔ کہار نے ڈنڈے جب مارے تو سمٹ سمٹ کر پیٹا لیکن سب لاحاصل۔ اس ہٹنی بچنی کے دونوں پاؤں میں پتھر کم پستے ہیں۔ اور دل زیادہ۔ آٹھویں دن چندو پھر سسرال چلی گئی۔

رنج کا لاکھ غیظ و غضب کی تصویر بنا ہوا آوارہ گرد ہے۔ کتے اس کو دیکھ کر دُم دبتے ہیں۔ سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ سیاہ مُنہ پر آنکھیں لال انگارہ ہیں۔ موٹی گردن پر بال کھڑے ہیں۔ سارا وجود بالکل سیدھی بھیل ہرنی ہے۔

اور رنج ہی وہی پیارا بیٹا منّن، باپ کی بے جا سختی اور ماں کی اندھی محبت کے باعث آوارہ ہے۔ اسکول میں جھڑکیاں اُٹھانے اور مار کھانے کے بجائے آج کے دن اُس نے سُنّی عیدگاہ میں آزادی کی عید منائی ہے۔ اب چار بج چکے تھے منّن عیدگاہ کی چار فٹ اُونچی دیوار پر بیٹھا اس سوچ میں تھا، دن تو گذر گیا، اب کیا کرے۔ گھر جائے یا نہ جائے، وہاں خوفِ رد ہو گئی ہو گی۔ ننھے سے دل میں وحشت کے پنکھے چل رہے تھے۔ واقعہ دل صحرا اور رکھوالا گدا دھرے ہوا۔ اس کی نگاہ نیچے پڑی۔

جس طرح انسانوں کے واسطے رفیق تاریک ہوتی ہیں لیکن کتوں کے لئے ان میں مہیبانی روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کے واسطے صورتیں، آنکھ، ناک، کان اور منہ کا صرف مجموعہ ہوتی ہیں لیکن کتوں کے لئے ان پر خوشی کی چمک، غم کی سیاہی اور محبت کی رعنائی نشاندہی میں بھی حیاں ہوتی ہیں۔ کھانے دیکھا بچہ اداس بیٹھا ہے۔ لیکن وہ اپنی دُھن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ دیوار کے نیچے نیچے جہاں وہ جا رہا تھا بچے کی پوری داں وہاں تھی۔ اس نے اس بوئیں کچھ خصوصیت محسوس کی۔

خیال اور خیالوں کے تحت واقعات کی یادداشت اس کو قدرت نے عطا کی ہی نہ تھی۔ نہ وہ آگیا، گھوم کر بچے کو دیکھنے لگا۔

چاروں طرف آگ کا ایک سمندر موجزن تھا۔ جس میں سے لپلپاتے شعلے تا بہ فلک اُٹھ رہے تھے۔ ٹوکری بھر کے ایک بچے کو اس میں پھینکا گیا۔ تو کیا ہوا؟ پلک جھپکی بھی نہ تھی۔ اور وہاں صحرا میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔ جو خوشبوؤں سے مہکتا تھا۔ اس میں بچہ جیتا کھیل رہا تھا۔ یہ قصہ حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔ اب جن و مانوں میں عقل کی زیادتی ہو گئی ہے اور اس قصے کو صحیح ماننے سے قاصر ہیں، آئیں ادھر آئیں، ہیں اُن کو دکھائے دیتا ہوں کہ یہی ہو سکتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ جو کاری میں بھینسا سکتے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ استقلال میں پتھر کی سِل کتے کے آگے کھس جائے گی۔ خونخواری اور دلیری میں جس وقت کتے سے مقابلہ پڑتا ہے تو شیر بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ لیکن محبت کی ایک چھوٹی سی چٹکی دی میں کتا پیروں پر گر پڑتا ہے۔ اور اس وقت وہ علم، عاجزی، انکساری اور خاکساری ایسی رقیق چیزوں کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔

منّن اور کلو میں ایک دو دفعہ پھر نئے سرے سے دوستی شروع ہوئی۔ اس کی جیب میں بچی ہوئی ایک روٹی نکلی اور تھی وہ چھوٹے چھوٹے نوالوں میں کلو کو پیش کی گئی۔ انڈا نخانہ انڈے کی بو اس پر بھی گئی۔ کلو کو بڑی میٹھی معلوم ہوئی۔ منّن نے ڈرتے ڈرتے کھوا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کھوا نے مُنہ کھول کر محبت کے نشے میں ہاتھوں، کہہ کر انگڑائی لی۔ منّن کھیلنا کھیلنا کتے کو ڈھیلوں کے پیچھے بھگاتا تقدتاً گھر کی طرف آگیا۔ یہ بھی تو امید تھی کہ گھر میں اسکول سے بھاگنے کی خبر نہ پہنچی ہو۔ ڈرتے ڈرتے گھر میں گھسا۔ کھوا باہر ہی رہ گیا۔

محبت کی دیوانی ماں نے مُنہ دھلایا، ناشتہ کھلایا، اکنی کلیجے کے واسطے دی۔ دو پیسے کی برف کی قلفی لے دی۔ دو دفعہ باپ کے بے جا غصّے اور ننھی کے بیچ میں سدِ سکندری بن کے حائل ہو گئی۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ اور منّن سو گیا۔ افسوس ہے جاہل ماں تو نے صبح کو کیا لیکن بچے کے دل کی تھاہ نہ لی۔ بچے کے دل میں بچہ بن کر گھسنا ہوتا ہے۔ وہاں اس کے چھوٹے چھوٹے رنج، ننھی ننھی خوشیاں معصوم گلے اور شکوے ہوتے ہیں۔ اور یہ وقت مائیں اس دنیا کو کس مپرسی میں چھوڑ دیتی ہیں۔

چھ دن کلوا نے استقلال سے بیٹھے بیٹھے اسکول کے سب تماشے دیکھے۔ ساتویں دن ضبط برداشت سے باہر ہو گیا۔ سیاہ پینتیس سیر کا جسم ایک جست سے دروازے سے باہر نکلا اور ماسٹر سے تصادم ہوا۔ ماسٹر زمین پر گر پڑا۔

——— کلوا اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ روتے ہوئے منن نے بھدی بھدی کتابیں اور بستہ سمیٹا اور سیدھا اسکول سے باہر بھاگا۔ سڑک پر جا کر "اُوں اُوں" کی آوازیں لگائیں اور دوڑ پڑا۔ تھوڑی دیر میں خون آلودہ کان کو جھٹکتا ہوا کلوا بھی منن سے آن ملا۔ سر اُٹھا کر منن کا منہ چاٹنا چاہا۔ تو اُس نے سر پر سلیٹ ماری کلوا خوش ہو گیا۔ اچھل کے آگے آگے ہو لیے۔

دُوسرے دن بستہ بغل میں لیکر منن نے پھر عیدگاہ کا رُخ کیا۔ کلوا کو اس سے کیا مطلب تھا۔ جدھر وہ چلا اس کے پیچھے ہو لیا۔ واٹر ورکس کی دیوار کے نیچے پہنچ کر باہر لٹکی ہوئی املی کی شاخوں کے سایہ میں دونوں بیٹھے۔ منن نے کوٹ کی جیبوں میں سے چرائے ہوئے روٹی کے ٹکڑے، بٹیاں اور بوٹیاں کلوا کو کھلائیں۔ اس کے بعد املی پر لگی ہوئی پتنگ پر اینٹ کے ڈھیلے کا لنگر اُچھالنا شروع کیا۔ کلوا بھی ڈھیلے کی ہر اُچھال پر اُچھلتے تھے۔ لیکن فٹ سوا فٹ ان کی حد تھی۔ اس کے بعد عیدگاہ میں بسیار ڈھیلے بازی کے بعد ایک کچا کیتھا اُٹھا کر تال کٹورے کا رُخ کیا۔ راستہ میں منن نے کیتھے کے دو ٹکڑے کئے کہ کلوا کی بھی رال ٹپک پڑی۔ لیکن جب حصّہ ملا تو سُونگھ کر ہی چھوڑ دیا۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند.....

جانوروں کو انسٹنکٹ (instinct) کا مادہ دیا گیا ہے جس میں غلطی کا احتمال ہی نہیں۔ اور ہم کہ عقلِ اجوہر قدم پر ٹھوکر کھاتی ہے۔

تیسرے دن شام کو جب آوارہ گردی کے مکتب سے منن گھر واپس ہوا تو اُس نے دیکھا کہ مکان کے آگے اسکول کے تین لڑکے اور ایک ماسٹر کھڑے ہیں باپ دروازے پر کھڑے اُن سے باتیں کر رہے ہیں۔ سر سے پیر تک کانپ گیا۔ اور فوراً واپس لوٹ پڑا۔ پھر عیدگاہ پہنچا، وہاں پھرتے پھرتے جب شام ہونے لگی تو قدم گھر کی طرف خود بخود اُٹھنے لگے۔ واٹر ورکس کے پاس آکر پھر دل میں نیچے چلنے لگے۔ عقل نے قدم روک دیئے۔ واٹر ورکس کی دیوار پر چڑھا۔ اندر بالکل سنسان تھا۔ تھوڑی دُور پکے تالاب تھے۔ دیوار سے کُود ان کے کنارے پہنچا۔ کلوا بھی کُود پھاند کے ساتھ تھا۔ تالاب کے چاروں طرف پختہ دیوار تھی۔ جس سے ڈیڑھ فٹ نیچے شفاف پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ منن اپنی ٹکٹیں بھول گئے۔ کپڑے اُتار کے اُن کا ایک بیڑا بنا کر مچھلیوں کی سیر میں محو ہو گئے۔ ایک مچھلی دیوار کی پیٹھ تک آگئی۔ منن نے جھک کر اُسے پکڑنا چاہا۔ پُوری جان سے اندر لُڑھک گیا۔ کلوا کچھ دُور تھا۔ اس کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہیں سے اُس نے پانی میں جست ماری۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ پاس پہنچے بچہ پانی کی تہ کی طرف روانہ تھا۔ پانی بہت۔ گہرا تھا۔ کئی منٹ کے بعد بچے نے اُچھالا کھایا۔ کلوا کے دھکا نہ کھانے والے احساس نے اسے بتا دیا کہ بچہ کس جگہ اُبھرے گا۔ وہیں پہ موجود تھا۔ کلوا نے ڈھال کی طرح اپنا جسم بچے کے سینے کے نیچے کر دیا۔ بچے کے پیٹ میں کافی پانی جا چکا تھا۔ وہ قریب قریب بے ہوش تھا۔ لیکن قدرتاً اس کا ایک ہاتھ بچے کی گردن میں اور دُوسرا پچھلے پیروں میں لپٹ گیا۔

اُفق کی سُرخی گہری پڑتے پڑتے سیاہی میں تبدیل ہو گئی۔ سیاہ آسمان پر بھیانک بھیانک کترانے نکل آئے۔ ایک چمگادڑ نے پانی کی سطح پر تڑاتا مارا۔ دو بُوند پانی منہ میں اُٹھاتا ہُوا نکل چلا گیا۔ دور گھنٹے بعد ایک بنجارے نے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر تالاب کو دیکھا اور جمّٹ کر پرماتا ہوا جانوروں میں گھس گیا۔ رات بڑھتی چلی گئی۔ ماہِ نو میں سے ایک تارہ ٹوٹا اور راہ ہی میں غائب ہو گیا۔ اب کلوا کا بھی پیٹ پھُول چکا تھا جسم میں طاقت نہ تھی۔ یا اپنی ناک سے پانی باہر رکھ سکتا تھا یا بچے کی۔ دل میں طاقت وہی باقی تھی۔ مالک کی ناک اُوپر ہی اُوپر رہی اور تھکی ہوئی لرزوں نیچے ڈبک گئی۔ صبح کو کچھ لوگ جمع ہوئے۔ سسکتے ہوئے بچے کو نکال کر میڈیکل کالج کی طرف دوڑے۔ کلوا کی پھُولی ہوئی لاش وہیں چھوڑی۔ جس کو تھوڑی دیر بعد دھنگیوں نے نکال کر احاطہ سے باہر میدان میں پھینک دیا۔

تین گدھ فضائے آسمانی سے سنسناتے اُترے۔ چونچ کے پھیلے بازو سمیٹ کر آہستہ آہستہ اس لاش کی طرف بڑھنے لگے۔

ابوالفضل صدیقی

بازگشت

تمام علاقہ میں سناٹا تھا ـــــ عورتیں خائف خائف نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر ایک آدھ سرگوشی کر کے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتیں، پھر بھی بچے سب کچھ سمجھ کر سہم کر رہ جاتے، مرد الاؤ کے گرد جلوں کے دھوئیں میں چپکے چپکے افواہوں پر تبصرہ کرتے، اور ڈر کے مارے گھٹ گھٹ کر خاموش ہو جاتے اور منٹ، منٹ کی خاموشی کے بعد جب سکوت ٹوٹتا تو باوجود گریز کے بھی وہ کوئی اور موضوع گفتگو تلاش نہ کر پاتے۔ اور پھر یہی سلسلہ جاری ہو جاتا۔ جدید سے جدید تر افواہیں حرکت میں تھیں اور ادھر ادھر سے ہر آنے والا آدمی افواہوں کی زنجیر میں ایک نئی کڑی کا اضافہ کرتا اور افواہوں کی زنجیر کا سلسلہ تمام ضلع کے اندر ملا ہوا تھا اور آئے دن یہ زنجیر مضبوط تر ہوتی جاتی اور ہراس در ہراس میں یہ مخصوص علاقہ لپٹا تھا اور کوآ کھار کے علاقہ کی جانب جاتا تو در کنار نظر اٹھانے کی بھی کسی بڑے دیو ہمادر کی ہمت نہ پڑتی۔ دیہاتی ذہنیتیں یوں بھی بھوت پریت قسم کے خوفوں کو بڑی جلد قبول کرتی ہیں اور پھر یہ کوآ کھار والا بھوت کوئی سنی سنائی چیز تو تھا نہیں، کتنی ہی مرتبہ کا آنکھوں دیکھا ـــــ پھر کڑوا کریلا اور نیم چڑھا، علاقہ بھر میں بھیڑیوں ہی کا ہراس کیا کم تھا۔ اس کے ساتھ بھوت کے خوف نے اچھے اچھوں کے پتے پانی کر دیئے۔

کوآ کھار کا خشک بنجر کاشتہ اونچا نیچا، سخت کنکریلی مٹی کا رقبہ میلوں کے گرد میں پھیلا ہوا تھا۔ پچھلی صدی کے وسط تک یہ ہرا بھرا زرخیز میدان تھا۔ رفتہ رفتہ برسات کے پانی کا رخ شدت کے ساتھ ادھر کو ہوا، اور یہ زرخیز میدان پانی کے بہاؤ نے کاٹ کر چٹیل کر دیا، اور پندرہ بیس میل لمبا اور دس پندرہ میل چوڑا رقبہ اونچی نیچی اور گہری اوتھلی نالیوں کی شکل میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ نشیب بڑھتا گیا۔ دور دراز کا برسات کا پانی ادھر کو جمع ہوتا گیا اور کوآ کھار رفتہ رفتہ پھیلتا گیا۔ ہر سال نئی اراضیات نئے نئے گاؤں کے رقبے برسات کے پانی کے کٹاؤ کی تباہ کاری میں لپٹتے گئے۔ برسات میں پانی کا ریلا بہاؤ کھیتیاں برباد کرتا گیا اور کنکریلے مٹی کے ٹیلوں اور گہری اوتھلی نالیوں کی تشکیل کرتا رہا۔ گاؤں ویران ہوتے رہے اور اس مخصوص علاقے کے سکان کھیتی کرنا بھولتے گئے اور پانی نہ معلوم زمین کی کتنی تہیں اڑاتا رہا اور بھانت بھانت کی ٹیاں ادھر سے ادھر کرتا رہا۔ ہر برسات کے اندر دو بارشوں کے درمیان چند روز دھوپ پڑتے ہی یکدم خشک ہو کر یہ علاقہ سنگلاخ کنکریلی شکل اختیار کر لیتا اور برسات ختم ہونے پر تو یہ اونچے نیچے پیلی مٹی کے ٹیلے اور نالیاں ایسی خشک ہو جاتیں کہ کہیں پر گھاس بھی نظر نہ آتی۔ جگہ جگہ پانی کی

دھارے بچے ہوئے ٹیلوں میں گوگڑو بڑھ بڑھ گزا اونچی جنگلی جھاڑیاں جن کے تخم پانی کبھی کبھی چھوڑ جاتا یا کہیں سرکنڈے کے جھنڈ اُگ آتے جن کی عمر بالعموم اگلی برسات تک ہوتی اور یہ نمو آنے والی برسات کے پانی کی بے تکی رہ میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی۔

اور یہ لق و دق، اونچی نیچی خشک و ادی بھیڑیوں، خرگوشوں، لومڑیوں کا مسکن تھی اور بھاگے ہوئے ہرنوں کی پناہ گاہ۔ جن کے زردی مائل خاکی رنگ میں اس کی مٹی کے مطابق تھے۔ اس علاقے کے تمام گاؤں تقریباً ویران تھے مگر جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی عارضی چھپروں کی جھونپڑیاں نظر آتیں۔ البتہ اس کے ملحقہ گاؤں معمولی گاؤں سے ذرا بڑے تھے۔ ان میں اس ویران علاقے کے کسان جا بسے تھے۔ کولو آکھار کا علاقہ یوں تو سب ہی جانوروں کا مسکن تھا۔ مگر خاص جولانگاہ بھیڑیوں کی تھی۔ اس علاقے اور اس کے ملحقہ دیہات کا مخصوص پیشہ بھیڑ بکریاں پالنا تھا۔ اور بھیڑیئے دن دہاڑے چرتے ہوئے گلوں پر آپڑتے اور بھیڑ بکریوں کو اٹھا کر لے جاتے۔ اچھلتے، کودتے ہرنوں پر وار کرتے اور خرگوشوں، لومڑیوں کو لقمہ بناتے اور رات کو کولو آکھار کے اندر کی جھونپڑیوں اور گوٹھوں پر اور ملحقہ علاقے کے گاؤں پر چھاپے مارتے باڑھوں میں سے بھیڑ بکریاں لے کر ایک جست میں نو فٹ اونچی دیواریں پھاند کر مع بکری کے باہر آپڑتے۔ سوتی ہوئی ماؤں کی بھری گودوں پر وحشیانہ آویز کرتے۔ بھیڑیا، چیتا، آدم خور، بزخور، آہو خور، غرض کہ جو کچھ بھی اس کے منہ میں پڑ جائے وہ سب کچھ خور واقع ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے ہم جنس بھیڑیئے پر بھی بندنیں ہوتا اور ذرا سی کمزوری پر بھیڑیا بھیڑیئے کو چٹ کر جاتا ہے اور آدم خوری کے معاملہ میں آدم خور شیر سے زیادہ بے پناہ اور خطرناک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی آدم خوری بچوں تک محدود ہوتی ہے۔ اور طریقہ چور جیسا ہے۔ یوں تو آدم خور درندہ بڑی خطرناک مخلوق ہے۔ مگر بھیڑیا سب سے زیادہ خطرناک یوں ہے کہ یہ رات کے شروع حصے میں پہلی نیند کے وقت سوتے ہوئے دیہاتیوں کے گھروں کی نیچی نیچی دیواریں پھاند کر یا دروازوں کی ٹٹیوں میں سے کھسک کر چور کی طرح گھر میں گھستا ہے اور بوُلے کر سیدھا خورد سال یا شیر خوار بچوں کی ماؤں کے بستر پر پہنچتا ہے۔ تمام دن کی کام کی تھکی ہاری، سوتی عورتوں کے پہلو سے چمٹے ہوئے بچوں کو لے بھاگتا ہے۔ نیند میں غلطاں ماحول کے اندر بھیڑیئے کا یہ حملہ بڑا کامیاب ہوتا ہے۔ بچے کی چیخ پر بالعموم بدنصیب سوتی ہوئی ماں لوری دیتی ہے۔ اور اگر خطرے کا احساس ہو گیا تو شور مچاتی رہ جاتی ہے۔ بھیڑیا بچہ منہ میں دبا کر ایک جست میں باہر دکھائی دیتا ہے اور مار پیچھے پکار ہوتی رہتی ہے۔ سال میں دو چار حادثے ایسے ہولناک بھی دیکھنے میں آجاتے ہیں کہ بچے کی چیخ پر ماں ہوشیار ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی بچے کی ٹانگیں ماں کے ہاتھ میں رہ جاتی ہیں اور سر اور گردن تو جبلت کے مطابق بھیڑیئے کے جبڑوں میں ہوتی ہی ہے۔ اس رستہ کشی میں سو فیصدی ماں کی جیت ہوتی ہے اور بھیڑیا چبائی ہوئی کھوپڑی اور گردن کا بچہ ماں کے ہاتھ میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ بھیڑیا ہمارے علاقے میں برسات بھر پریشان اور بے گھر سا رہتا ہے۔ برسات شروع ہونے سے پیشتر نئے بچے جوان ہو کر ماں باپ کے ساتھ اور کبھی کبھی تنہا شکار کھیلتے ہیں۔ یہ برسات میں منتشر ہو جاتے ہیں اور برسات ختم ہوتے ہی موقع موقع سے اپنے نئے بھٹ تیار کر لیتے ہیں جو ان کی جاڑے گرمی کی پناہ گاہ اور بچہ دینے کی جگہ کا کام مٹی جون تک دیتے رہتے ہیں۔ ان بھٹوں میں آرامگاہ، مردانہ مکان وغیرہ تقسیم ہوتی ہے۔ اور بچہ دینے کے وقت بھٹ کو گہرا کر کے مادہ علیحدہ جگہ بنا لیتی ہے۔ یہ بھٹ بالعموم ایسی جگہ واقع ہوتے ہیں جہاں برسات کے سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکے۔ ۱۹۳۴ء کی برسات ختم ہوتے ہی یکدم کولو آکھار کے علاقہ میں بھیڑیوں کی وارداتیں بڑھ گئیں۔ یو پی گورنمنٹ کی جانب سے بھیڑیا مارنے پر ہمیشہ سے دس روپیہ انعام ملتا آرہا تھا۔ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء میں حکام ضلع کو ان کے استیصال کے لئے ہتھیار تقسیم کرنا پڑے اور بیسیوں غریب شکاریوں نے اسے پیشے کے طور پر اختیار کر لیا۔ اس کے باوجود وارداتیں بڑھتی گئیں اور ۱۹۳۶ء کے ستمبر میں یکدم تمام علاقے میں یہ خبر بڑے زور سے پھیل گئی کہ کولو آکھار پر بھوتوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

بھیڑیئے کا شکاریوں بھی تیسرے درجے کا اسپورٹ خیال کیا جاتا ہے۔ جس کو تقسیم انعام اور پیشہ ور شکاریوں کے لالچ کے سبب مخصوص طور پر ہمارے علاقے میں اچھے شکاری ذرا حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ ضلع مجسٹریٹ نے انعام دُگنا کر دیا اور مزید ہتھیار تقسیم کئے

مگر جب ان بھیڑیا مار شکاریوں نے بھوت اپنی آنکھ سے دیکھ لیا تو وہ بھی دست کش سے ہو گئے۔ دلیر شبان زادوں نے اپنے ریوڑ کو لوآ کھار کے علاقے میں لے جانا بند کر دیئے۔ یہاں آبادی تو یوں بھی عارضی تھی، البتہ اس لق و دق اونچے نیچے بیابان سے کئی کچے دہاتی راستے گزرتے تھے۔ اب یہ بھی بند ہو گئے۔ اور چھوٹی چھوٹی گوٹیاں اجڑ کر ملحقہ بڑے گاؤں میں جا بسیں اور دیکھتے دیکھتے یہ تمام علاقہ غیر آباد ہو کر بھیڑیوں کی خود مختار ریاست بن گیا۔ بھیڑیے ملحقہ گاؤں سے بھی آگے بڑھ بڑھ کر چھاپے مارنے لگے اور ضلع کے تین چار تھانے ان سے بری طرح متاثر ہوئے۔ اب کوڑھ میں کھاج یہ ہوئی کہ یکدم بھوت والی افواہ تیز تر ہو گئی۔ چاروں طرف پانچ پانچ دس دس میل تک دیہات میں شدید ہراس پھیل گیا۔ مدتوں سے بھیڑیوں کے مارے تمام رات جاگتے گزرتی تھی۔ بھیڑیے گھر گھر، باڑے باڑے جھانکتے، کتے بھونکتے رہ جاتے۔ مائیں مضبوطی کے ساتھ اپنے ننھے ننھے بچوں کو چمٹا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کاٹ دیتیں۔ پھر بھی چیرہ دستی سے جس کا بچہ منہ میں پڑنا چھین کر چمپت ہو جاتے اور لوآ کھار کی گھاٹی میں گھس پڑتے اور ان حدود میں کسی کو جانے کی ہمت نہ پڑتی اور بدنصیب ماں باپ رات کے چبھتے ہوئے بچوں کی ہڈیوں اور کپڑے کے چیتھڑوں کا سراغ لگانے نہ پہنچ سکتے کیونکہ اب وہاں بھوتوں کا قبضہ تھا۔

یہ اندھیر دیکھ کر حاکم ضلع نے انعام کی رقم پچیس روپیہ کر دی۔ جن شکاریوں کو بھیڑیے مارنے کے لئے بندوقیں دی تھیں ان کو تنبیہ کرنی شروع کی مگر پیشہ ور شکاری ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان میں سے اکثر اپنی آنکھوں سے بھوت دیکھ چکے تھے۔ حاکم ضلع نے اب مضافاتِ دیہات اور شہر کے مشہور شکاری جمع کئے اور اس انتظام میں مدد طلب کی۔

ہماری مخصوص چھ آدمیوں کی پارٹی اپنی نوعیت اور طرزِ شکار کے اعتبار سے ایک خاص انفرادیت کی حامل تھی۔ شہر کے شکاری ہمارے ساتھ نہ لگ سکتے تھے۔ سرکاری حکام اور شوقین شکاریوں کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ہمارا ساتھ دے سکیں جب مجسٹریٹ ضلع نے ہم کو بلا کر یہ استدعا کی تو ہماری توجہ ادھر ہوئی ورنہ ہم لوگ اس کو پیشہ پیدا کرنے والے شکاریوں، خانہ بدوش کنجروں اور پاسیوں کا کام سمجھ کر اب تک ذلیل سمجھے ہوئے تھے۔ میں تو خیر شہر کے قریب ترین مضافاتی مقام کا رہنے والا ہوں۔ بقیہ اور سب ساتھی دیہات کے رہنے والے تھے اور تین دن کے اندر میری دعوت پر استاد رضا خاں، سنگھ بابو، عابر خاں اور انوار خاں بھی جمع ہو گئے اور بڑے شوق کے ساتھ اسکیم بن گئی۔ استاد رضا خاں کی رائے ہوئی کہ شکار شروع کرنے اور کوآ کھار کے علاقے میں داخل ہونے سے پیشتر ان پیشہ ور شکاریوں سے بات چیت کی جائے جو اس علاقے میں بھیڑیے مارنے کا کام برسوں سے کر رہے ہیں۔ اور پھر کوآ کھار کے چاروں طرف لگے ہوئے دیہات کا دورہ کر کے معلومات حاصل کی جائیں۔ اس کے بعد اچھی طرح تمام وادی کو پرتالا جائے اور بھیڑیوں کی جولانگاہیں، بھٹ اور ان کے راستے اور نقل و حرکت کا دن میں کھوج لگایا جائے۔ اور پھر بھیڑیے کے مخصوص طریقۂ شکار کے مطابق راتوں میں شکار شروع کیا جائے۔ ویسے یہ علاقہ تھوڑا بہت ہمارا دیکھا بھالا تھا۔ کبھی کبھی زخمی ہرن میدان سے چوٹ کھا کر اس میں پناہ لیتے تھے اور ہم تعاقب کرتے اس میں جا پہنچتے تھے۔ دو چار مرتبہ اس کے بعض ایسے حصوں میں جہاں جھاڑیاں اور جھنڈ تھے تیتروں کا شکار کیا تھا۔ دو ایک مرتبہ خرگوش مارے تھے۔ اور کبھی کبھی اس کے اندر سے جاتے ہوئے راستوں سے گزرے تھے۔

سب سے پہلے ہم نے بھیڑیے مار شکاریوں سے رجوع کیا جو آج کل حکامِ ضلع کے معتوبوں میں تھے۔ غریب رونے سے لگے اور روزگار ہاتھ سے نکل جانے پر پریشانی کا اظہار کیا، ورنہ وہ آنے کے کارتوس میں دس روپے ہاتھ آجایا کرتے تھے اور تین بھیڑیوں میں مہینہ بھر سارے گھر کا پیٹ پلتا تھا۔ ان کی تقریر سن کر ہمیں بھیڑیے کے شکار سے گھن سی آنے لگی، اور پھر ان میں سے بعض نے اپنے چشم دید بھوت کے واقعات بیان کئے۔ باتیں دونوں اچھے شکاریوں کے شایانِ شان نہ تھیں۔ شکار کے معاوضے میں روپیہ پیسہ لینے کا تذکرہ اور پھر بھوت کا حوالہ۔ مشہور بات ہے جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلا کرتا۔ مگر پہلی چیز ہم میں رجعت پیدا کرتی تھی۔

تو دوسری دعوت دیتی تھی کہ یہ شکار جس میں بھوت کا واسطہ لگتا ہے اور جس کے ڈر سے ہر آدمی میدان چھوڑ گیا ہے ضرور کیا جائے۔ ہم چار روز تمام دیہات میں طوفانی دورہ کرتے پھرے اور ہر جگہ بھوت والی روایت نہایت شدت کے ساتھ ذہنوں میں راسخ پائی۔ بھوت پریت کے لئے دیہاتی زمینیتوں کی مٹی پوں بھی بہت زرخیز ہوا کرتی ہے۔ ہم نے آپس میں کہا آدم خور بھیڑیوں اور بھوتوں کے عمل میں بڑی حد تک یکسانیت بھی ہوتی ہے اور ہم مشق سے شکار کے لئے تیار ہو گئے۔ بھیڑیئے کے شکار کا مخصوص اور نہایت آسان طریقہ ہے۔ بھیڑیا رات میں شکار کرتا ہے اور علی الصبح بھٹ میں واپس آجاتا ہے۔ بالعموم رات کے نو دس بجے بھٹ سے برآمد ہوتا ہے اور رات کے متروع حصے ہی میں شکار کر لیتا ہے، ورنہ تمام رات داؤ گھات کرتا پھرتا ہے اور صبح کاذب کے وقت ہالہ مارتا ہے۔ یہ وقت بالعموم گاؤں کے اندر بکریوں کے باڑوں اور آدمی کے بچوں پر چھاپہ مارنے کا ہوتا ہے اور تمام دن بھٹ میں آرام کرتا ہے۔ سیدھے سادے اندھے دھندے شکاری رات کو بھیڑیئے کے نکلنے سے پیشتر بھٹ کے دروازے کے قریب چھپ کر جا بیٹھتے ہیں اور نکلتے ہی ٹھائیں سے مار دیتے ہیں۔ بالعموم بیس گز کے فاصلے سے فیر ہوتا ہے۔ خالی جانے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ چوٹ اتنی کاری پڑتی ہے کہ سانس بھی نہیں لیتا اور جہاں کا تہاں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ہر شکاری سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کے شکار میں اسپورٹ کی کتنی روح ہو سکتی ہے۔ اور کیا لطف آسکتا ہے۔

سب معلومات حاصل کر کے ایک دن دوپہر سے شام تک ہماری چھ آدمیوں کی مختصر سی پارٹی وادی کے اس مخصوص حصے میں گھومتی رہی جس میں بھیڑیوں کی کثرت کے ساتھ بھوتوں کی کارفرمائی بیان کی جاتی تھی۔ تمام گزرگاہیں اور مواقع دیکھ کر ہم اپنی جائے قیام پر واپس آگئے جو کوآ کھار کے عین وسط میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھی۔ تھوڑا سا کھانا کھا کر اور چائے پی کر دس بجے کے قریب ہم اپنی جائے قیام سے نکلے اور اپنی اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ گئے۔ رات تو چاندنی تھی مگر آسمان پر ہلکی ابر کی چادر پھیلی ہوئی تھی جس نے جنگل کے سناٹے کو زیادہ بھیانک بنا دیا تھا۔ ایسے ہی بھیانک سناٹوں میں شکاری کی فطرت جلا پاتی ہے اور لطف دوچند ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنی نشستوں کے لئے تین بھٹ منتخب کئے تھے۔ ایسے بھٹ اور بھی تھے مگر ہم چھ کی مختصر پارٹی اس سے زیادہ گھیر نہ سکتی تھی۔ ایک بھٹ استاد خاخاں اور میں نے پسند کیا تھا، اس سے پورب کی جانب تین سو گز کے فاصلے پر ٹیلوں کی آڑ میں ایک بھٹ پرانور خاں اور صابر خاں تھے اور اوپر ایک ٹیلے کے اس پار تقریباً ایک فرلانگ کی مسافت پر سنگھ بابو اور حشم برادران تھے۔ سنگھ بابو شام ہی کے وقت سے کچھ سست سے ہو گئے تھے اور چپ چپ سے تھے۔ دراصل انہیں دیہات کی افواہوں نے قدرے تشاؤ کر دیا تھا، اور شاید وہ بھوت کے وجود پر پہلے سے بھی کچھ یقین رکھتے ہوں۔ دبی زبان سے ایک آدھ مرتبہ انہوں نے کچھ ایسے الفاظ بھی کھانا کھانے میں ادا کئے تھے جن سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ پروگرام انہیں زیادہ پسند نہیں ہے ——— تمام علاقہ دم بخود تھا کہ چند پٹھان اور ٹھاکر بچے، سر پھرے شکاری آج بھوتوں سے لڑنے کوآ کھار میں گھس پڑے ہیں۔ دیکھئے کیا انجام ہو۔ کہیں کہیں لوگ ڈر رہے تھے کہ مبادا کوئی مصیبت اور مگر بے گاؤں والوں پر آجائے اور کوئی پرانا تجربہ کار بوڑھا یقین کئے بیٹھا تھا کہ ان کا بچ کر آنا مشکل ہے۔ غرض تمام علاقے میں ہمارے اس اقدام کی شہرت تھی اور آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں کہ کیا ہوتا ہے۔

ہر بھٹ کے تین تین دروازے تھے۔ ہم نے اپنی نشستوں کی تقسیم اس طرح کی تھی کہ دو شکاریوں میں سے ایک ایک کی کمان میں ایک ایک دروازہ تھا اور تیسرا دونوں کی کمان میں مشترکہ تھا۔ ہم قریب گیارہ بجے کے اپنی اپنی جگہ پہنچے اور چھپ کر بیٹھ گئے اور بھٹوں کے دروازوں پر ٹکٹکی باندھے انتظار کرنے لگے۔ نومبر کے شروع ہفتے کی ٹھنڈی اونچے نیچے ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔ وادی کے اندر نرم نرم ہوا کے سنسنانے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی اور جگہ جگہ جھینگر نغمہ ریزی سی کر رہے تھے۔ کسی کسی وقت کہیں دور کے گاؤں سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز

آتی اور پھر ہلکی ہلکی سائیں سائیں اور جھینگروں کی آوازیں جلترنگ سا بجانے لگیں۔ ہم چھ کے سوا وادی کے طول و عرض میں کسی انسان کا پتہ نہ تھا۔ آسمان سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی اور کل وادی میں صبح کاذب والی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔

پہنچنے کے گھنٹہ بھر کے اندر ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم بھٹ کے قریب آ گئے ہیں اور بھیڑیئے اس قدر نڈر ہو گئے ہیں کہ اپنی جبلت کے خلاف وقت بے وقت بھٹ میں سے نکل پڑتے ہیں۔ سرِ شام کی وارداتوں کی افواہیں ہم لوگ تمام علاقے میں سن کر آ رہے تھے۔ مگر تمام دیہات میں تو افواہیں ہی افواہیں تھیں اور پھر بھیڑیئے کے حادثے کی ہر حکایت کے ساتھ بھوت کا کہ ارکسی نہ کسی پہلو سے لگا ہوتا اور ہمارے لئے کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنا مشکل تھا مگر اب یقین ہو گیا کہ بھیڑیئے بجائے پہر بھر رات گئے نکلنے کے سرِ شام ہی نکل پڑتے ہیں، کیونکہ ہمارے والا بھٹ بھی خالی تھا اور بقیہ دو بھٹوں سے بھی کوئی آواز دھماکے کی منائی نہ دی۔ استاد رضا محمد خاں مجھ سے تقریباً میں گز کے فاصلے پر داہنی جانب ایک چھوٹے سے مٹی کے ٹیلے کی آڑ میں اپنی نشست لئے ہوئے تھے۔ اور میں ڈھلان سے اترتی ہوئی ایک نالی میں دبکا ہوا تھا۔ استاد رضا محمد خاں نے اشارے ہی اشارے میں مجھ سے کہہ دیا کہ بھٹ خالی ہے اور اب ساری رات بیٹھنا پڑے گا۔ کہیں صبح ہوتے امید ہو سکتی ہے جب بھیڑیئے شکار کر کے پلٹنے لگیں —— ان کا شکار بہت مشکل سے کامیاب رہتا ہے۔ بھیڑیا کھلے میدان میں ہوتا ہے۔ تمام رات شکار کرتے رہنے کے سبب وہ غیر معمولی وکی الحس ہوتا ہے اور بہت دیکھ بھال، جانچ پڑتال کر کے بھٹ کے قریب آتا ہے۔ بھٹ سے نکلتے وقت خواہ کتنا ہی چوکنا ہو کر نکلے پھر بھی تمام دن کا سکون پائے ہوئے ہوتا ہے۔ بہر صورت بھٹ میں سے یکدم باہر کھلے میدان میں آن پڑتا ہے اور دروازے کے ارد گرد چھپے ہوئے آدمی کا باہر نکل کر ہی اندازہ کر سکتا ہے۔ پہلی جھلک پر شکاری یکدم ایک دو تین کر دیتا ہے۔ باہر سے اندر جاتے وقت پہلے تو تمام رات کا تاڑا یوں بھی قدم قدم پھونک پھونک کر دھرتا ہے اور پھر کھلے میدان میں اچھی طرح ناک، کان اور آنکھ سے کام لے کر قریب آتا ہے۔ سب سے بڑی قباحت یہ ہوتی ہے کہ شکاری کو معلوم نہیں ہوتا کہ بھیڑیا اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے کس سمت سے آئے گا۔

خیر ہم نے تھوڑی دیر اطمینان کے ساتھ نشستوں پر پہلو بدلے۔ شروع میں کچھ دیر ڈھیلے ڈھیلے بیٹھے رہے اور سمجھ گئے کہ شکار کا جو نقشہ بنا کر چلے تھے وہ بگڑ گیا۔ نصف شب گزرنے پر آگے پیچھے دائیں بائیں اور اوپر نیچے ہر طرف گہری توجہ شروع کی اور اس حد تک دبک کر بیٹھ گئے کہ مٹی کا تودہ معلوم ہونے لگے۔ اگرچہ اس شکار میں اس سے زیادہ نصف آ رہا تھا جو بھٹ سے نکلتے ہی کتے کی موت مارے کے طریقے میں آتا۔ کم سے کم کچھ کشش و پیچ، کچھ غیر یقینی صورت تو تھی۔ ورنہ وہ بھی کیا شکار کہ ایک سوراخ پر نگاہ جمی ہوئی ہے اور سر نکالتے ہی ٹھائیں سے شکار ختم۔

چاند کی حرکت کے ساتھ بادل کی سفید چادر میں سے چھن چھن کر گرتی ہوئی چاندنی کی کیفیات بدلتی رہیں۔ خنکی اور نمی بڑھتے بڑھتے کل منور رات کی سیں رطوبت ہو کر ٹپکنے سی لگی۔ تمام رات انتظار کے شکار اس سے پہلے بھی بہت کئے تھے مگر بھیڑیئے کے لئے آج پہلی مرتبہ بیٹھے تھے۔ آدھی رات گزرنے پر میں نے غور کیا کہ آغازِ شب سے ہی آج کچھ شکار کا جوش اور جذبہ مشہد پر ابھی طرح طاری نہ ہوا تھا اور اس وقت کچھ طبیعت کند بھی ہو گئی اور ایک مبہم سا اچاٹ پن جو ٹوٹنے پر ایک نامعلوم خوف کی حد تک پہنچتا محسوس ہوتا تھا، میرے دماغ پر آہستہ آہستہ مسلط ہوتا جا رہا تھا جیسے انتظار بار سا معلوم ہو رہا تھا۔ اگرچہ ہر قسم کے انتظاروں میں شکار کا انتظار خوشگوار ہوتا ہے اور شکار کا سا لطف مشکل اور جدوجہد کی سختی میں مضمر ہے۔

دیکھتے دیکھتے جیسے کل فضائے محیط انگڑائی سی لے اٹھی اور اب آلودہ چاندنی کے ساتھ صبح کاذب کا اجالا مل کر عجیب رومانوی قسم کے انتظار سے ماحول کو درخشاں تر کرنے لگا۔ موتیا رنگ کی آبدار بھیگی ہوئی خاموش رات، پرسکوت اونچا نیچا ماحول اور ہمارے جسم اور جا۔ے حیات

سب غنودہ میں غلطاں ہوگئے۔ میں نے بندوق کی نال پر ہاتھ پھیرا۔ سردی میں یخ اور اوس میں بھیگا ہوا فولاد۔ پھر اپنے تر ہاتھ کپڑوں پر پھیر کر منہ پر پھیرے اور نشست پر پہلو بدل کر ایک گہری جماہی لی، پھر ایک لمبی انگڑائی کے ذریعے جیسے تمام رات کا کسل دور کرنے کی کوشش کی اور خیال کیا کہ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی اور نہایت احتیاط کے ساتھ بدن کو پوری طرح چرا کر نالی میں چٹ سا گیا اور میرے دائیں ہاتھ کی جانب سے آہستہ آہستہ چٹ چٹ کی آواز کان میں پڑی۔ اس وقت شکاری کے حواس خمسہ بھی بھیڑیئے سے کم تیز نہیں ہوتے۔ یہ چٹ چٹ بھیڑیئے کے چلنے کی مخصوص آواز تھی جس کو دیہاتی کہا کرتے ہیں کہ چلتے وقت بھیڑیئے کے پاؤں کی نلیاں بجتی ہیں۔ میں نے نہایت فن کارانہ انداز میں بندوق سنبھالی اور اپنی کمان والے دو زانو پر پوری توجہ کے ساتھ ٹکٹکی باندھی۔ مگر تمام رات کے مجرم اور مفرور بھیڑیئے کی شامہ، سامعہ اور باصرہ پوری قوت کے ساتھ بروئے کار تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے میں نے مٹی کے تودے کی طرح بے حس و حرکت پڑے انتظار کیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پلٹ گیا یا اور گرد کسی جھاڑی یا نالی میں دبک کو میرے ہٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا بھٹ کی جانب نہ آنا اس امر کی قوی دلیل تھی کہ اس نے مجھ کو بھانپ لیا ہے۔ میں نے بہت ہی آہستہ سے گردن پھیر کر استاد رضاخاں کی جانب دیکھا جو اپنی نشست پر مجھے نظر آ رہے تھے اور دونوں بالکل ہی پیلی مٹی کا تودہ معلوم ہو رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ استاد کے ہاتھ پر بھی چاپ سنائی پڑی ہے۔ ہمیں مردہ سا پڑے ہوئے آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا ایک آدھ مرتبہ تھوڑی چاپ اور سنائی دی اور پھر سناٹا۔

نومبر کے شروع کی خوشگوار خنکی قدرے تیز سردی میں تبدیل ہو گئی۔ پچھم سے چلتی ہوئی سبک رفتار ٹھنڈی ہوا میں دھار جیسی کاٹ کیفیت پیدا ہو گئی۔ تمام رات کے اوس میں نم کپڑے گیلے گیلے سے معلوم ہونے لگے۔ میری ناک اور کان برف سے ہو گئے۔ سرِ شام کا اُبھرا چاند بادلوں کی سیمیں ردا کے اندر ہی اندر غوطہ زنیاں کرتا افق کی پستیوں میں جا لٹکا اور ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک آسمان پر ایک خط نور بڑھتا چلا گیا۔ اور صبح کاذب کے سفیدے کے ساتھ مکر چاندنی کا نور مل کر تمام فضا کو پگھلی ہوئی چاندی کے آبشاروں میں تبدیل کرنے لگا۔ جگہ جگہ آسمان پر سپیدۂ صبح کی جھلک دکھائی دینے لگی اور نیچے جیسے ساری دنیا یکبارگی چینی سے کچی چاندی میں تبدیل ہونے لگی۔ میں نے وقت کا اندازہ لگانے کے لئے آسمان پر نظر کی۔ بادلوں کی کھڑکیوں سے پھیکی پھیکی چاندنی اور درخشاں سپیدۂ صبح جگہ جگہ افشاں کی پھواریں سی چھوڑ رہا تھا۔ میں ایک لمبی سانس لے کر استاد رضاخاں سے کچھ اشاروں میں بات کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ استاد میری جانب گھور کر دیکھ رہے تھے اور ماتمی تکلم سے تھے۔

استاد نے اشارہ سے کہا کہ آج کا شکار بگڑ گیا۔ میں نے ہفتہ بھر کی محنت یوں رائیگاں جانے پر افسوس کیا۔ کیونکہ ہم لوگ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ آنے والی شب میں شکار پر نہ بیٹھ سکتے تھے۔ آج تمام دن آرام کیا جائے، پھر ساری رات آرام کیا جائے اور پرسوں کے تمام دن۔ تو کہیں جا کر پرسوں شب میں شکار کے قابل ہو سکیں گے۔ دیکھتے دیکھتے موتی جیسی آبدار رات کے ڈانڈے درخشاں صبح سے آملے۔ مغرب سے روشنی کا ایک سیلاب پھٹ پڑا اور مشرقی افق قرمزی درخشانیوں سے چمکنا شروع ہوا۔ جھاڑیوں پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں بھد کیں۔ مٹی میں سے جگہ جگہ ٹڈے اچھلے ایک طیری بار بار ہمارے سروں پر منڈلاتی ادھر سے ادھر اڑنے لگی۔ صبح صادق کے آثار زمین سے آسمان تک نمودار ہو گئے اور ایک مخصوص شور جیسے سناٹے کی آواز سے سارا ماحول سنسنانے لگا۔ اس مخصوص صبح والے سناٹے میں کسی کسی وقت دور سے آتی ہوئی کوّوں کی آوازیں کان میں آئیں۔

ہماری، سنگھ بابو اور مسلم کی نشستوں کے درمیان ایک اونچا خشک کنکریلی پیلی مٹی کا ٹیلا اور ادھر ادھر گہری کٹی ہوئی نالیوں کا ایک جال تھا۔ دوسرا ٹیلا اس سے قدرے نیچا اور اس ٹیلے کے ڈھلان پر وہ بھٹ واقع تھا جس پر یہ لوگ داؤں کئے بیٹھے تھے یعنی ہمارے اور ان کے درمیان دو چوڑی نالیاں اور ایک اونچا ٹیلا حائل تھا۔ دوسرے برابر والے ٹیلے کا چند گز ڈھلان چڑھ کر یہ بھٹ آتا تھا۔ ناامیدی بڑھتی جا رہی تھی اور میرا جی اچاٹ پن اکتاہٹ میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا کہ یکدم سنگھ بابو کی نشست کی جانب سے ایک بھیانک آواز سنائی دی "گھیکھے۔ گھے گھے

گھگھے گھے! ہوہو، ہوہو! بعداوت!" اور باوجود یکہ حلق اور زبان کے بجائے یہ پیٹ سے بلند ہوئی تھی مگر میں نے پہچان لی کہ سنگھ بابو کی آواز ہے۔ اور پھر ہم نے دو منٹ دھماکے کا انتظار کیا مگر بجائے دھماکے کے بت بتاہٹ سنائی دی۔ ہم لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ نہ سکتے تھے کیونکہ یہ قاعدہ کے خلاف تھا۔ چند منٹ اور انتظار کیا۔ اتنے میں سیٹی کی آواز سنائی دی اور پھر صاف صاف بلانے کی سیٹی ان کی جانب سے بھی۔ جس کا جواب عابد اور انوار کی نشست کی جانب سے آیا تو استاد رضا خاں نے بھی جوابی سیٹی بجائی۔ اور سیٹی کی مخصوص آوازوں کے تبادلہ میں طے ہو گیا کہ سنگھ بابو کی جانب چلنا چاہئے۔ ہم نے بندوقیں نیچی کئے تیز تیز نالے کے نشیب و فراز طے کئے اور ٹیلے کے ادھر والے ڈھلان پر چڑھ کر چوٹی پر سے کچھ دیکھنے کی کوشش کی، اور پھر سنگھ بابو کی جانب سے پیم بلانے کی سیٹیوں پر بڑھے۔ دوسرے ڈھلان کی جانب اترے اور پھر تیز تیز ادھر والے نالے کی چھوٹی بڑی اونچی نیچی سطح پر حتیں سی لگاتے اس ٹیلے کی جانب بڑھنے لگے۔ ادھر والا ڈھلان ہم نے تیز تیز چڑھنا شروع کیا، اور جب ہم اس کی چوٹی پر پہنچے تو ہمیں اپنی داہنی جانب سے عابد خاں اور انوار خاں چڑھتے دکھائی دئے اور نیچے ادھر والے ڈھلان کی جانب سے اپنی نشست چھوڑ کر سنگھ بابو آگے آگے اور مسلم پیچھے پیچھے لپکتے دکھائی دیئے۔ چونکہ سب لوگ اتفاق سے براہ راست ہماری جانب بڑھ رہے تھے لہذا ہم وہیں چوٹی کی نوک پر ٹھٹک کر انتظار کرنے لگے۔ اب ہم چھیوں ٹیلے کی نوک پر جمع تھے جس کے ڈھلان پر ادھر والے نالے سے ذرا اوپر ڈھلان پر وہ بھٹ تھا جس پر سنگھ بابو اور مسلم داؤں کئے بیٹھے تھے۔ سنگھ بابو دوڑنے اور چلنے کی درمیانی چال چلتے ہمارے قریب آئے۔ مسلم پیچھے پیچھے لپک رہے تھے۔ میں "کیا ہے بھائی؟" سوال کرنے ہی والا تھا کہ استاد رضا خاں بول پڑے ——

"کیوں ہی، کیا غدر رضا بھائی؟" مگر کنور جی تو بہت بدحواس ہو رہے تھے۔ وہ "وال، بھوت، استاد بھوبھوت!" اور میں نے غور کیا کہ سنگھ بابو کی زبان لکنت کر رہی ہے اور جسم پسینہ پسینہ تھا۔ جب میں نے قریب جا کر ان کے چہرے پر غور کیا تو آنکھوں میں بلا کی دہشت اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ میں نے اور قریب جا کر ہمدردی کے ساتھ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تو اندازہ کیا کہ ان کے نہ صرف ہاتھ میں بلکہ تمام جسم پر رعشہ سا ہے۔ جیسے ان کی رگ رگ بکھری جا رہی ہے۔ سنگھ بابو جیسے پختہ کار اور بہادر راجپوت شکاری کو اس درجہ خائف دیکھ کر میرے شعور میں بھی یک گونہ خوف کا احساس بیدار ہوا۔ اتنے میں عابد خاں اور انوار خاں بھی لپک کر آ گئے۔ اور دونوں نے بے ساختہ ایک منہ ہو کر کہا کہ "کیا ہے بھائی خیر تو ہے؟"

استاد رضا خاں تمسخرانہ سنجیدگی سے بولے "میاں ہوتا کیا، وہی بھوت تھا۔ ہمارے کنور جی کو دبوچ ہی لیا تھا۔ بے چارے بڑی مشکل سے جان بچا کر بندوق لٹکائے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ خیر گزری"

سنگھ بابو ہماری صحبت کا رکن تھا۔ اور ہماری پارٹی کا سب سے زیادہ جیتا جاگتا زندہ دل بھی استاد رضا خاں کا دوست قسم کا شاگرد تھا۔ استاد کے انداز پر ذرا سنبھلے اور نہایت سنجیدگی سے کہا ——

"میاں ہم اپنی آنکھ سے دیکھ کر آ رہے ہیں۔ وہ وال ٹیلے کی آڑ میں سے یک بہ یک پہلے دو ٹانگوں پر کھڑے ہو کر مڑکایا، پھر ایک مرتبہ دبکا، پھر اُچکا اور پھر لنگور کی سی جست لگا کر یک دم غیب سے بھٹ میں گھس گیا" یہ کہتے ہوئے مسلم سے اپنے بیان کی تصدیق چاہی۔

مسلم بھی خائف سے تھے مگر چہرہ سے سنجیدگی ظاہر ہو رہی تھی اور خوف کے آثار محض آنکھوں میں تھوڑے بہت نمایاں تھے۔ انھوں نے بیٹھ کر حلق صاف کیا اور پست آواز میں بولے بھئی وہ ان کے ہاتھ پر آیا تھا۔ جو کچھ بھی تھا۔ اور مجھ سے وہ جگہ بالکل آڑ میں تھی۔ جہاں سے سنگھ بابو اس کا اچکنا اور پھر بھٹ کے اندر کو جست کرنا بیان کرتے ہیں۔ البتہ دھیمی چاندنی میں میں نے ٹیلے کی آڑ سے لمبا سا سایہ اپنی بائیں جانب متحرک ہونے کا احساس کیا۔ تیزی کے ساتھ قدرتی طور پر ادھر کو میری نظر مڑی تو ہر چیز غائب تھی۔ سایہ میں نے یقین کے ساتھ دیکھا بھی نہیں۔ بلکہ یوں سمجھئے کنکھیوں سے کسی سایہ جیسی حرکت کا مبہم سا احساس کیا اور جہاں تک خیال ہے ایک نامانوس سی سرسراہٹ بھی کان میں گئی۔

اور بھئی میں اس سے تو انکار نہیں کر سکتا کہ کوئی چیز نہیں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی چیز تھی ضرور، یہ کیا تھی؟۔ یہ یہ جانیں اور پھر یک دم گھگھیا پڑے "بھوت، بھوت"!

سب نے ایک قہقہہ لگایا مگر سنگھ بابو نے زیادہ درشت ہو کر کہا "دیکھو بھیا مسلم! وہ جو کچھ بھی تھا مگر بھیڑیا نہیں تھا کیونکہ تمہارے کان میں سرسراہٹ کی آواز گئی چٹ چٹ نہیں گئی نا"۔

"ہاں صاحب چٹ چٹ نہیں گئی"۔

"اور بھیڑیئے کی چاپ میں چٹ چٹ بھی ہے"۔ سنگھ بابو نے مسکرا کر کہا

"ہوں"۔ مسلم نے کہا اور استاد رضا خاں بولے "تو بس بھوت تھا۔ اور تم بال بال بچے۔ میاں کنوجی کوئی بھیڑیا ویڑیا ہوگا۔ اور تم پر سفرِ شام ہی سے بھوت کا خوف طاری تھا آج۔ ہم نے اندازہ کر لیا تھا کل ہی سے"۔

استاد کے جملہ پر سنگھ بابو کچھ تلخ سے ہو گئے اور بولے "استاد! بھوت۔ اور بھوت کے سوا کوئی اور چیز ہو تو۔ اور استاد ہم نے کبھی کسی زنانہ میں تو ڈیڑھ بیت بھیڑیئے کے شکار کا شوق کیا ہے اور آپ کی عنایت سے ہر رنگ میں بھیڑیا جنگل کے اندر دیکھا مارا ہے۔ بھٹ کے اندر گھستے بھی دیکھا ہے اور اندر سے نکلتے بھی"۔

"اچھا، تم نے پہلے بھی کبھی بھوت دیکھا ہے؟ استاد نے کہا

"جی مگر آج ضرور بھوت ہی دیکھا، اور گاؤں والے سچے ہیں۔ ضرور اس جنگل میں بھوت رہتے ہیں"۔

"خیر جانے دیجئے، بھیڑیا ممکن ہے۔ بھیڑیا نہ ہو، اور کوئی اور چیز ہو، آخر اسے ہم بھوت ہی کیوں کہیں"۔

"تو کسی اور چیز کا نام آپ مجھے بتا دیجئے کہ کیا ہو سکتی ہے؟ آخر ساری عمر آپ کی بھی شکار میں کٹی ہے اور میں نے بھی آپ جیسے لوگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ آپ اس جنگل کے لحاظ سے کسی ایسی چیز کا تعین کیجئے جو اس حلیہ کی ہو۔ جناب اس کے سر پر بالوں کا گچھا ہے۔ بلکہ مجھ کو تو ہیم پر بھی بال معلوم ہوئے۔ اور جب اس نے اندر کو جست کی تو مجھے اس کے پاؤں بھی ایسے معلوم ہوئے کہ پنجے پیچھے کو پھرے ہوئے ہیں"۔

عابر خاں نے دخل در معقولات کیا "معلوم ہوتا ہے صبح کی نیند میں آنکھ جھپک گئی۔ کئی دن سے گاؤں والوں میں بھوت کی روایت سنے ہوئے تھے۔ کچھ خواب یا نظر بندی کا قصہ ہے بھیا، ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے"۔

سنگھ بابو چڑ سے گئے اور بولے "جی مجھے بذیان ہو گیا تھا، میں پاگل ہوں۔ جاگتے میں خواب دیکھتا ہوں اور بڑاتا ہوں۔ شکار آپ ہی نے کھیلا ہے، اور میں نے تو تیس برس جھاڑ جھنکار کا ہے۔ گویا آپ کے نزدیک میں ایسا گیا گزرا ہوں کہ واؤں پر سو گیا تھا! اور آپ جاگ رہے تھے"۔

عابر غریب قائل سا ہو گیا اور میں نے نیم سنجیدگی کے ساتھ ایک ایک لفظ چن چن کر کہا "جناب! ہم بھوت وُوت نہیں جانتے، ہم تو صرف بندوق جانتے ہیں"۔

"خیر آپ مانیں یا نہ مانیں مگر آپ بھی میری جگہ ہوتے تو پھر بھوت کے سوا اور کچھ نہ کہتے"۔

"جی خیر، مگر شاید ہم کہتے تو جیسے، جیسے دونوں نالیں دے بجاتے، پھر دیکھتے کہ سالا کیسے بچ کر نکل جاتا ہے سامنے سے"۔ عابر نے کہا "چھوڑیئے اڑ جانے"۔

"جی آپ تو ڑے تیس مار خاں ہیں"۔ سنگھ بابو نے خشمگیں انداز میں کہا "کل سے بندوق ہاتھ میں لی ہے، دس پانچ ہرن کبوتر مار کر شکاری بن گئے۔ میاں میں نے کتنے کار توس بھونک دیئے اتنے تیر سے بھی ابھی بندوق کی نال سے نہ نکال پائے ہوں گے۔ خاں صاحب بہادر!"

"خیر تیس مار خاں نہ سہی مگر کنوجی آپ کی طرح گھگھیا بھی نہ پڑتا"۔ عابر خاں نے کچھ دریدہ دہنی سے کہا

"اجی صاحب زادہ صاحب! میں خیر گنگھیا تو پڑا، آپ کے حلق سے تو آواز بھی نہ نکلتی۔ دیکھتے ہی وہیں پر غش آجاتا۔" سنگھ بابو نے کہا

سنگھ بابو نجیب الطرفین جوان راجپوت تھا، اور اپنے وقت کا بڑا بہادر سپاہی قسم کا جوانمرد شکاری، جو جنگلی سور سے ایک برچھا لے کر جا بھڑتا تھا، اور دو تین شیر اور گل دار زمین پر گھڑے ہو کر رائفل سے شکار کر چکا تھا۔ بانکا مضبوط اور چست و قادر انداز اور صابر خاں نوجوان خام کار شکاری تھا۔ مجھے اور استاد رضا خاں کو سنگھ بابو کی آزردگی کا خیال ہوا اور میں نے کہا "بھیا صابر! گنگھیا ہٹ سے یاد گئے اور تم کہتے ہو کہ بندوق چلاتے۔ یہ سب وقت پر ادسان بندھنے والی بات ہے ورنہ سنگھ بابو ہماری پارٹی کا سردار ہے اور ضلع کیا دور دور تک اپنا جواب نہیں رکھتا۔"

استاد سنگھ بابو کا انداز دیکھ کر بولے "ارے مردے آدمیوں میں بحث کیا ہے، اور بھئی تم بھی اُلجھتے ہو یار، سنگھ بابو کل کے لونڈے سے۔ مٹی تو بولی ہوگی ہی۔ وہاں پر بھٹ کے اندر کی نکالی ہوئی، بالکل کنگن کو آرسی کیا۔ چلو جس دروازہ سے تم نے گھستے دیکھا وہاں پر کھوج (نشانات قدم) دیکھ لیں۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ سب روشن ہو جائے گا۔"

ہماری مختصر سی پارٹی ایک اونچے ٹیلے کی نوک پر بیٹھی ہوئی تھی، اور بحث استاد رضا خاں کے اخیر جملہ میں ختم ہو گئی تھی۔ مشرق سے سورج کی دہکتی ہوئی چٹانی چکی اور بے آب و گیاہ خشک کنکریلی زرد مٹی کی اونچی نیچی وادی سنہری خیرگیوں سے منور ہو گئی۔ یوں تو ناکامی، تکان اور جاگنے کا کسل رگ رگ پر سوار تھا۔ مگر بھوت کے کھوج دیکھنے کا اشتیاق ہم سب پر سوار تھا۔ ہم بھٹ پر پہنچے، پہلے ماحول کا جائزہ لیا اور پھر اندر کی نکلی ہوئی نرم مٹی پر سنگھ بابو نے بھوت کے قدموں کے نشان دکھائے۔ یہ مٹی ڈھلوان کی صورت پنجوں سے کھود کر گھر بنانے والے جانوروں کے بھٹوں میں اندر جاتے ہوئے نرم راستہ کی طرح جمع رہتی ہے اور بھیڑیئے کے بھٹوں پر پنجوں کے پھسلنے سے پچاس پچاس گز تک لمبی پتلی سڑک سی بن جاتی ہے جو بھٹ کے اندر کو جاتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے چوہوں کے بلوں پر جمع رہتی ہے۔

دور سے نرم پیلی گہرائی کی نکلی ہوئی مٹی کے اوپر بھوت کے پنجوں کے نہایت واضح نشانات بنے ہوئے اندر کو چلے آرہے تھے جتنا چوڑا پنجہ اتنی ہی چوڑی ایڑی۔ رُخ الٹا پھرا ہوا۔ اور سنگھ بابو بولے "یہ دیکھئے یہ الٹا پنجہ، آپ ہی بتائیے کس کا ہو سکتا ہے؟"

"مگر یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ یہ باہر کو نکلنے کے نشانات نہیں ہیں، اور یہ پنجہ پیچھے کو پھرا ہوا ہے۔" استاد رضا خاں نے سوچ میں پڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ یوں کہ میں سچ بول رہا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" سنگھ بابو نے کہا۔

"مگر آپ ان نشانات کے بارے میں کیا کہیں گے؟" استاد نے چندا ور نشانات کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا جو ان نشانات سے بالکل خلاف رخ میں لگے ہوئے تھے، "اور پھر آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس ٹیلے کی آڑ سے اسے اچکتے ہوئے دیکھا اور اس ٹیلے سے براہ راست آتے ہوئے اس بل کے اندر کو بھی نشانات معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہوں، تعبیر یہ کما حقہ درست ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ میرے پوائنٹ آؤٹ کے نشانات کو بھٹ کے اندر سے نکلنے کے گردانتے ہیں تو آپ سب تجربہ کار لوگ ہیں یہ اندازہ لگائیے کہ ان میں سے تازہ کون سے ہیں۔ یعنی شروع رات کے کون سے اور اخیر کے کون سے؟"

میں نے کہا کہ "اوس تو اب سب پر یکساں ہے اور چند گھنٹہ کے اس بل کے نشانات پر کوئی قطعی محاکمہ کرنا مشکل ہے۔"

"تو آپ یقین کیجئے کہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ وہ انہیں پنجوں اندر گیا ہے۔"

ہم تین میں بات ہو رہی تھی، صابر خاں قائل تھے اور مسلم اور نواب خاں متحیر۔ مسلم نے ہماری گفتگو کے درمیان نہایت سنجیدگی کے ساتھ دخل دیا اور کہا "دیکھئے بات بزرگوں اور استادوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ لیکن آپ حضرات کی اس فنکارانہ بحث کی علت غائی میری

سمجھ میں نہیں آتی کہ پنجے پیچھے کو پھرے ہوئے ہیں یا آگے کو سیدھے ہیں۔ گستاخی معاف قبلہ! میں آپ حضرات سے یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ پنجے بھیڑیے کے ہیں؟"

"نہیں" استاد رمضاخاں اور میرے منہ سے یک دم نکلا۔

"پھر کسی اور ایسے جانور کے ہیں جس کا اس جنگل میں پایا جانا قرین قیاس ہو؟"

"نہیں ہمارے پندار میں یہ کھوج کسی جانور کی جانب منسوب ہی نہیں کئے جا سکتے۔ یہ تو عجیب ہی سے ہیں، اور منگھ بابو کے قول کے مطابق بھوت کے ہی کہنا پڑیں گے۔"

"تو پھر قبلہ معاف کیجئے یہ بے کار بحث کیوں! اگر آپ بھوت کے وجود میں یقین نہیں رکھتے تو میرے اس سوال کا جواب دے دیجئے کہ ان کھوجوں پر کیا چیز اندراج گئی ہے اور کیا چیز نکل نقی۔ اب بحث اس پر نہ کیجئے کہ یہ ہے کیا بلا، بلکہ آپ کو کرنا کیا ہے۔ اس پر سر جوڑ کر غور کیجئے یا پھر چپکے سے اپنے اپنے گھروں کو سرک جائیے اور پھر عمر بھر جنگل میں منہ نہ دکھائیے۔ ایک شکل تو یہ ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ کم از کم اس معمہ کو اس حد تک حل کیجئے کہ یہ کس مخلوق کے نشانات قدم ہیں؟"

"غرض کسی نتیجہ پر پہنچنا تو ضروری ہے ہی، اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسلوں کا کیا ڈر؟ اب میدان چھوڑ کر بھاگیں گے تو نہیں، بھوت نہ سہی بھوت کے ابا سہی۔"

منگھ بابو نے پھر تفصیل کے ساتھ بھوت کے آنے، اچکنے، جست کرنے اور اندر گھسنے کی تمام روئداد جگہ اور موقع کا حوالہ دے دے کر بیان کرنی شروع کر دی اور مسلم نے آہستہ سے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا "میرے اللہ! اٹھا کر جی وہ تو سب سنی، مگر میری عرض یہ ہے کہ اب کرنا کیا چاہئے؟ اس کی بات کیجئے، وہ تو آپ کے قول کی تصدیق میں یہ نشان موجود ہیں۔"

اور یہ سوال بے جواب تھا، ہر شخص گومگو میں تھا، لیکن جائے استاد خالی است! بوڑھے استاد رمضاخاں بول پڑے "اماں کرنا کیا، بھوت رہا ہے کے بھی دو ہاتھ پاؤں ہیں۔" اور پھر تمام بھٹ کے منہ کا اوپر سے اندازہ لگایا، اور آہستہ سے مسکرا کر بولے "بہت بڑا لمبا چوڑا ہے پنا رہینگے، دو تین گھنٹہ بیڑی چلے تو وہ پانی ذرا نیچے ہے، چار پانچ ہفتے اور ٹھنڈیاں لگیں گی۔ پھر نکل ہوئی مٹی پر نظر کی اور بولے بھٹ ذرا گہرا ہے اور جن پر ہم بیٹھے تھے اس سے ذرا لمبا چوڑا بھی۔ خیر بہر حال کچھ دیکھ تو ہیں کرنا ہی ہے۔"

"کیا مطلب استاد؟ آپ اس بھٹ میں پانی بھر کر بھوت کو نکالیں گے؟ کیا بھوت کو پکڑنے کا ارادہ ہے؟" منگھ بابو نے حیرت سے کہا

"اب وہ جو کچھ بھی ہو۔ جب بھوت سالا مٹی پر نشانات قدم چھوڑ سکتا ہے تو ہماری بندوق کی گولی بھی اس کے جسم میں گھس سکتی ہے اور اس کے جسم کو ہم پکڑ بھی سکتے ہیں۔"

"تو کیا یعنی۔ اوں۔ آں۔ گویا آپ بھوت کو بندوق سے ماریں گے؟"

"اجی نقا کر جی آپ نے سنا نہیں کہ مار کے آگے بھوت بھاگتے ہیں۔ ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ ہے کیا بلا؟" استاد رمضاخاں نے کہا۔ اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ پچیس تیس آدمی ایسے فراہم کیجئے جو بیڑی سے نیچے گڈھے میں سے پانی اٹھا کر اس بھٹ میں بھریں۔"

یہ ریزہ زمین رہنے والے جانوروں کے شکار کا بڑا موثر اور پرانا طریقہ ہے، بھٹ میں پانی بھر دیا جاتا ہے، اور جب اندر سے پوری کھنڈال بھر جاتی ہے تو مجبور ہو کر جانور نکل بھاگتے ہیں۔ اور باہر بندوقوں، کتوں، برچھوں اور کبھی کبھی جالوں سے شکار کرتے ہیں۔

مگر اتنی لمبی نک پانی اٹھانا بڑا طول امل تھا۔ حساب لگایا تو بیک وقت پچیس آدمی درکار تھے، مگر بھی "موبرا تھا اور تمام دن پڑا ہوا تھا۔ استاد رمضاخاں کا خیال تھا کہ دو بجے تک بھٹ بہ آسانی لبریز ہو سکتا ہے۔ اور مزدوروں کی فراہمی کے سلسلے میں مجھے اور منگھ بابو کو جانا پڑا کیونکہ

اس خلل کے کنارے ہماری زمینداری کے چند گاؤں لگے ہوئے تھے۔ ہم پہلے اس گونٹے میں پہنچے جس میں ہم خیال کئے ہوئے تھے۔ گڈریوں اور مراثوں کی چھوٹی سی بستی تھی۔ مگر ہماری کوشش کے باوجود خوف کے مارے ایک متنفس بھی ہمارے کام میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ ہوا۔ یہاں سے اپنا بیل تانگا جتوا کر دوسرے گاؤں میں پہنچے مگر یہاں بھی ہر ایک نے بھوت کے خوف سے اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹانے سے انکار کیا تو سنگھ بابو نے کہا چلو پس گنوے چلیں، یہ پاسیوں کا گاؤں تھا اور میری اور سنگھ بابو کی مشترکہ زمینداری تھی۔ راستہ میں سنگھ بابو بار بار اپنی نبض پر ہاتھ لے جاتے اور دو ایک مرتبہ دوران سر کی شکایت کی۔ پس گنوے پہنچتے پہنچتے انہیں خوب اچھی طرح بخار چڑھ آیا تھا۔ اور میں نے کہا۔ وقت کی بات ہے، کتنے کتنے جاڑے پالے میں ہم شکار کو گئے۔ ٹھنڈے پانی اور دلدل میں سارا سارا دن اور پوری پوری راتیں گزاریں مگر یہ رات کی سردی نہیں نقصان کرگئی۔ اور کاتک کی سردی چپکے سے آدبوچتی ہے۔"

"ہاں۔ سر میں بڑا درد ہے۔"

اور جب میں نے غور کیا تو بری طرح جل رہے تھے۔ جتنی دیر میں پچیس تیس پاسیوں کے نوجوان پٹھے فراہم کئے اتنی دیر میں سنگھ بابو ڈیرہ میں پڑی ہوئی چارپائی پر بے ہوش ہوگئے۔ میں نے وہاں دو تین معتبر آدمی ان کی خدمت اور تیمارداری کے لئے مامور کئے اور بیل تانگے میں جو ڈچپا۔ بیڑیاں اور پیچھے پیچھے پچیس تیس آدمی ساتھ لے کر چل پڑا۔ تمام راستہ ان آدمیوں کے دل سے بھوت کا خوف اتارتا گیا اور جو انعام ہمیں گونڈ سے بھیڑیا مارنے پر ملتا اس کو جوں کا توں ان کے اندر تقسیم کر دینے کا لالچ دیتا گیا۔ اس کے علاوہ آج کے دن کی مزدوری کا بھی وعدہ کیا۔

پھر تیلے پاسیوں نے کام پر جت کر ذرا دیر میں نیچے سے اوپر تک نالیاں اور رندھنے تیار کر لئے۔ پانی گڈھے سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی تک اٹھانا تھا۔ جتنی دیر میں میں نے مزدور فراہم کئے اتنی دیر میں استاد رضا خاں اور بقیہ تین ساتھیوں نے بھٹ کے تمام مواقع بغور دیکھ لئے تھے اور جب مجھ کو تنہا واپس آتے دیکھا تو سنگھ بابو کے متعلق سوال کیا۔ میں نے بتایا کہ غریب رات سردی کھا گئے۔ پس گنوے کے ڈیرہ میں تیز بخار میں بھنا بیہوش چھوڑ آیا ہوں۔ اس پر استاد رضا خاں نے افسوس سا کیا مگر صابر اور مسلم یک زبان ہو کر بولے "وہ ہم جانتے تھے اسی وقت جس وقت وہ گئے تھے کہ اب یہ گئے کام سے۔"

"نہیں جی کیا بکتے ہو، بڑا تیز بخار چڑھا۔"

"جی بخار نہیں ان پر بھوت چڑھا ہے۔" صابر نے کہا۔ مگر اس پر کوئی ہنسا نہیں، جیسے بھوت کے خوف سے ہر ایک متاثر تھا۔

اس بھٹ کے تین دروازے یا سوراخ یا خل تھے۔ ایک ڈھال کے اوپری حصہ میں اور دوسرا نیچے نیچے پورے ٹیلے کو اندر ہی اندر کاٹتا ٹیلے کی اس ڈھال پر نکلا تھا جو دوسری سائڈ پر تھا، اور ایک اس ڈھال پر۔ بیڑیوں سے پاسیوں نے پانی چڑھایا اور اوپر والے دروازے سے پانی بڑے زور سے سوراخ کے اندر کو پرنالے کی طرح چلنے لگا۔ سنگھ بابو تو بے چارے بیہوش ہو گئے تھے، اب ہم پانچ تھے۔ نیچے کے دونوں سوراخوں پر استاد رضا خاں اور مسلم، انوار اور صابر جوڑی جوڑی بنا کر اپنی اپنی سائڈ لئے تعینات تھے۔ اور میں سب سے اوپر ٹیلے کی نوک پر کھڑا تینوں سوراخوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ایک جانب سے پانی داخل ہو رہا تھا اور دو سوراخوں پر چار بندوقیں پہرہ دے رہی تھیں۔ پانی بڑے تسلسل اور تیز رفتاری کے ساتھ اوپر چڑھ کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو اوپر کھڑا تماشہ دیکھتا رہا۔ پانی اندر گھستے ہی پہلے اندر سے ہلکی ہلکی گرد سوراخوں میں سے نکلی پھر کچھ کیڑے، ٹڈے بھنڈ کے۔ ہم لوگ مطمئن اور جیسے اس محنت کے حل ہو جانے کے شوق میں سرشار سے تھے۔ بھوت کا خوف تو دلوں سے بالکل ہی نکل گیا۔ شکار سے زیادہ اس تحقیق کا جذبہ کارفرما تھا کہ اس کے اندر کیا چیز ہے۔ ہم لوگ تھوڑی بہت بات چیت بھی کر لیتے، اور میں تینوں سوراخوں پر یکساں نظر ڈال لیتا۔ مدت جس سوراخ سے پانی داخل ہو رہا تھا اس سے ایک سوراخ تو نظر آسکتا تھا اور تیسرا سوراخ ٹیلے کی آڑ میں ہونے کے سبب ان دونوں سوراخوں سے چھپا ہوا تھا۔

ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، تین گھنٹے، چار گھنٹے پانی بھٹ کے اندر جاتے ہو گئے۔ مجھے اشارہ کر کے صابر خاں نے بلایا اور سگریٹ دکھائی۔ سگریٹ دیکھ کر میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں سے وہ سوراخ جس میں سے پانی داخل ہو رہا تھا نظر آتا تھا۔ مگر دھواں سوراخ ٹیلے کی آڑ میں تھا۔ میں نے اس سوراخ پر غور کیا تو تھوڑی دور اندر تک پانی اتنا اوپر کو بڑھ آیا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر کہا بس اب بھر ہی چکا ہے بھٹ۔ اور اپنی بندوق کا سیف چڑھایا۔ استاد رضا خاں نے جو دیکھا کہ میں ٹیلے کی چوٹی خالی چھوڑ کر چلا گیا ہوں تو اپنے والے بھٹ پر صرف مسلم کو چھوڑ کر وہاں آ بیٹھے۔ اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے وہیں رہنے کو کہا۔

پانی اور بھرا۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے اوپر بخوبی نظر آنے لگا۔ متحرک پانی کی سطح پر میں نے چند بلبلے دیکھے۔ اور پھر ایک بھیڑیئے کی ناک پانی سے اوپر دو انچ کے قریب باہر سانس لیتی نظر آئی جو بظاہر ایسی معلوم ہوتی تھی کہ مکوڑا پانی پر تیر رہا ہے۔ میں نے صابر کو اشارے سے دکھانا چاہا مگر وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اول تو سائڈ ہی خالی تھی، پھر میں بلندی پر تھا اور بہت ہی قریب، بڑے اطمینان کے ساتھ بھرپور نشست لے کر گراپ کا نیزہ مارا۔ پانی اور کیچڑ اچھل کر باہر آیا، اور جب اک ذرا دھواں ہٹا تو پانی سرخ ہو رہا تھا۔ ایک آواز پانی کے بلبلوں کے ساتھ بھیڑیئے کی جانکنی جیسی آئی۔ کھوپڑی پاش پاش ہو گئی اور اندر ہی اندر بھیڑیا ختم ہو گیا۔ اتنے میں اس سوراخ کی جانب سے جو ہم سے آڑ میں تھا ایک دم دو دھماکے سنائی پڑے اور اوپر سے استاد رضا خاں للکارے "بہت اچھے، بہت اچھے، واہ یا" دوسرا بھیڑیا ادھر والے سوراخ سے نکل کر بھاگا اور مسلم نے نکلتے ہی مار دیا۔ ابھی ہم اچھی طرح شکاری حادثہ کی رنگینی کا بھی اندازہ نہ کرنے پائے تھے کہ یک دم اوپر والے دروازے سے جس میں سے لگاتار چار گھنٹہ سے پانی داخل ہو رہا تھا ایک عجیب النوع مخلوق برآمد ہوئی جسے دیکھ کر بے ساختہ ہمارے منہ سے نکلا "بھوت بھوت! بھوت!!" اور وہ بھی کلام موضوع کی آواز میں زبان سے نہیں بلکہ سچ مچ سینہ اور پیٹ کی گہرائیوں سے پھاڑتی چیرتی سی چیخ میں!—

—یک دم بھوت نیم ایستادہ ہو کر اپنے سامنے والے پاسی سے دست و گریباں نظر آیا، جو بھٹ کے سامنے پانی کا راستہ اپنے پاؤں سے درست کر رہا تھا۔ پاسی اور بھوت میں بمشکل دو چار ہاتھ کا تبادلہ سا ہوا ہو گا کہ وہ دونوں گتھ گئے اور کیچڑ میں لت پت بھوت نے پاسی کو اور پاسی نے بھوت کو دبوچ لیا۔ بھیڑیئے سے ملتی جلتی دو چار غراہٹیں سنائی دیں۔ اور دب گیا۔ عابد بے ہوش سا ہو کر ایک نقیب میں ہو گیا۔ میں نے بھی بھاڑ کی آڑ پکڑی۔ بھوت اور پاسی میں ایک پکڑ بھی اچھی طرح نہ ہونے پائی تھی کہ کیچڑ میں چکنا بھوت گرفت سے پھسل کر بھاگا۔ سامنے دوسرا پاسی بیلچہ لئے کھڑا تھا۔ بھوت کو ٹڑھتے دیکھ کر اور کوئی راہ فرار نہ پا کر مرنا کیا نہ کرتا، بیلچہ لے کر جھپٹا۔ بھوت پلٹ پڑا۔ اتنی دیر میں بوڑھے استاد رضا خاں اوپر سے شیر کی سی دو تین جستیں لگا کر نیچے آ گرے تھے۔ میرے سامنے تھوڑا سا موقع تھا اور میں نے بھوت پر بندوق سیدھی کی مگر استاد نے بڑے زور سے ڈانٹ کر مجھ کو فیر کرنے سے روکا، ایک جست اور لگائی ادھر بھوت جیسے کچھ راہ فرار کا اندازہ کرنے کے لئے چند سیکنڈ ٹھٹکا سا۔ اتنے میں استاد نے اسے جا لیا۔ بڑی پھرتی سے بٹوٹ باز استاد نے اس کے سامنے اپنی پگڑی سر سے اتار کر پھینکی۔ وہ کچھ پگڑی میں الجھا۔ کچھ لڑنے کا موڈ بنایا۔ اب کی جست میں استاد اس کے پیچھے جا پہنچے اور بڑی دلیری کے ساتھ بندوق پھینک کر اس کے سر پر ہاتھ ڈال دیا اور پیچھے سے بالوں کا گچھا پکڑ لیا۔ بھوت پھر دو پاؤں پر نیم ایستادہ ہو گیا۔ استاد نے اس کا سیدھا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا، اور پھر دوسرا ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر گدی چڑھائی اور جکڑ لیا۔ اور بھوت کو بے بس کر کے قابو میں کر لیا ہمارے دل دہل اٹھے۔ بوڑھا پچاس سالہ تجربہ کار شکاری آج اپنے عیاں لگنی کے فن کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ قادر انداز شکاری بندوق پھینک کر کلائیوں کے بل پر بھوت کو پکڑے ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ بھوت بری طرح خوار ہا تھا۔

اس سنسنی خیز حادثہ میں بھٹ سے نکلنے سے استاد کے گدی چڑھانے تک بمشکل ڈیڑھ دو منٹ لگے ہوں گے، اور ابھی تک ہم حادثہ کی رنگینی اور حیرت آفرینی کا بھی بھرپور اندازہ نہ کرنے پائے تھے کہ استاد نے اپنی مضبوط کلائیوں سے بھوت کا سامنے کا رخ ہماری جانب کو پھیرتے ہوئے مسکرا کر

بھرائی آواز میں کہا "دیکھو تو یہ کیا ہے؟" اب حرکتوں کا کہ بائی تسلسل جو اتنا شدید تھا کہ آنکھ کی شناعتیں بھی تعاقب سے عاجز سی تھیں۔ استاد رضا خاں کے مضبوط ہاتھوں میں بل سے کھا رہا تھا۔ اور یہ ہونق مخلوق ان کے ہاتھوں میں اچھلنے کودنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم سب پر مصیبت کم اور تحیر زیادہ طاری تھا جس وقت گڈی چڑھائے ہی چڑھائے غراتے ہوئے کیچڑ میں لتھڑے بھوت کا سامنے کا رخ ہماری جانب کو ہوا تو اس بھیانک چہرہ اور اس پر بالوں کا گچھا دیکھ کر حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس سے ہمارے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ بھوت غصہ میں غرا رہا تھا۔ بل کھا کھا کر ڈرا بنے دانت نکال رہا تھا۔ الامان والحفیظ! کیسا مسنسی خیز منظر تھا۔ شدتِ خوف سے ہماری آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ دونوں پاسی فرار ہو گئے تھے۔ اور ہم سب جہاں کے تہاں مفلوج سے تھے۔ استاد رضا خاں بھوت کو شکنجے میں کسے مسکرا رہے تھے، اور بولے، ارے بزدلو! تم نے زنخوں کو مات کر دیا! دیکھو تو، ادھر چلو، یہ کیا بلا ہے؟ اور بھوت نے پھر منہ کھا کر دانت چمکائے بری طرح غرایا اور نکلنے کی کوشش کی مگر استاد نے اس کو اس بری طرح جکڑا تھا کہ تم کی طرح کاٹ سا دیا تھا، اور تم بالائے تم پر کر رہے تھے کہ جب وہ کمر جھکاتا تھا تو استاد گھٹنا مار کر کمر کو سیدھا کھڑا کر دیتے تھے۔ جب اس طرح بھوت کی نمائش کرتے ہوئے تقریباً دو تین منٹ ہو گئے اور ہماری رگ رگ پر حیرت نے قبضہ کر لیا تو ہم نے معاملہ پر غور کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ نہ سمجھے۔ البتہ اس دو تین منٹ کے اندر ہم نے عقل کو حیرت و خوف کے جذبات سے جھڑایا اور میرا دماغ ادھر لگا کہ آخر بھوت پکڑنے کے بعد استاد رضا خاں اس قدر مطمئن کیسے ہیں۔ یا اللہ! یہ کیا طلسم ہے میں نے ایک قدم ادھر بڑھایا، اور شاید بقیہ اور ساتھیوں کے شعور بھی حادثہ کے عجوبہ پن سے گلو خلاصی کر کے معاملہ کی اصلیت معلوم کرنے کی جانب رجوع ہوئے۔ انھوں نے بھی چند قدم سیدھی کر کے ایک ایک قدم بڑھایا۔ اتنے میں استاد نے بھوت کو اور بھی زیادہ بے قابو کر کے اس کو اپنی گرفت میں کس لیا۔ میرا دو گنا دو گنا اس ہیبت ناک شکل اور بھیانک سراپا دیکھ کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ میں ٹھٹک گیا اور استاد مسکرا کر بولے "ارے لڑکو! بھوت نہیں یہ آدمی کا بچہ ہے!" مگر اس پر آدمی کے بچہ ہونے کا کسی پہلو سے اطلاق نہ ہوتا تھا۔ کیچڑ میں لتھڑے ہونے کے سبب اس کی ہیئت بھوت کے اس حلیہ سے بھی زیادہ بھیانک تھی جو ہر ایک کے دماغ میں خیالی قسم کی شکل کی مجسم کی بنا کرتی ہے۔ یا جو مخصوص صورت بھوت کی بیان کی جایا کرتی ہے۔

ہم قبنوں استاد کے پاس دوڑ کر پہنچے، ادھر سے شور سن کر مسلم بھی بھاگتا ہوا آیا۔ بھوت کھڑا غرا رہا تھا، بل کھا رہا تھا۔ استاد اپنی قوی کلائیوں میں اسے سختی کے ساتھ جکڑے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ بولے "اب دیکھتے کیا ہو، کم بخت نے میرے کس بل توڑ لئے، زور کو اتے کرا۔ گچھڑی اٹھا کر کس لو۔ سالے کے پنجے بڑے تیز ہیں، اس پاسی کو تو لہو لہان کر دیا۔"

صابر خاں نے گچھڑی اٹھا کر بڑھائی۔ استاد نے کہا پہلے اس میں سے ایک پٹی پھاڑ کر ذرا اس کے منہ پر کس پیچھے کو گرہ تو لگا دو۔ اس کے دانت اور کچلیاں بڑی غضب کی ہیں، اگر کوئی پڑ گیا تو پار چے اڑا دے گا۔ پٹی پھاڑ کر اس کے ہونٹوں پر باندھی اور پیچھے لا کر گرہ لگا دی۔ بقیہ گچھڑی سے پہلے گدی چڑھے ہاتھ جوں کے توں گدی چڑھے چڑھائے مضبوطی کے ساتھ باندھ لئے، اور احتیاطاً دونوں پنڈلیاں بھی کس لیں اور گٹھڑی سی بنا کر پا بدست دگرے دست بدست دگرے لٹکا کر وہاں تک لائے جہاں ہمارا بیل تانگہ کھڑا ہوا تھا۔ پاسی کے بھاگتے ہی مزدوروں میں بھاگڑ پڑ گئی۔ حتیٰ کہ ہمارا گاڑیبان بھی تانگہ اور بیل چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ استاد نے بیل جوتے اور بھوت کی گٹھڑی بنا کر تانگے میں ڈال لی۔ ہم چاروں پیدل ساتھ ہو گئے۔ استاد نے گاڑی بانی کے فرائض انجام دئے اور ہم اپنی جائے قیام کی جانب روانہ ہو گئے۔

جیوں ہی ہم بھیڑیا انسان لے کر گاؤں میں پہنچے بھاگڑ سی پڑ گئی۔ بڑی مشکل سے ہم لوگوں نے گاؤں کے سمجھ دار آدمیوں کو اس بھوت کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ پھر بھی اوباش، بہت وارفتہ ہو چکی تھیں۔ استاد نے بستی کو بلوایا اور دو تین مشک پانی کی دھار سے اس کا غسل کرایا۔ غصہ بھی ٹھنڈا ہوا، اور بھیڑیے انسان کی اصلی شکل بھی مٹی دھل کر نمودار ہوئی۔ حجام بلوا کر اور دو تین آدمی اس کے ساتھ لگا کر اس کے بال کٹوائے۔ سبزۂ آغاز سولہ سترہ سال کی عمر کا نوجوان برآمد ہوا جس کے جسم کی تمام کھال گوہ کے چمڑے کی طرح کھردری اور سیاہی مائل مٹیالی تھی۔ ہاتھ، پاؤں، پیٹ آدمی کے بجائے بندر سے مشابہ تھے۔ کچلیاں معمولی آدمی کی کچلیوں سے زیادہ بڑھی ہوئی اور لوک دار، منہ سے کف جاری اور آنکھوں میں بلا کی وحشت۔ ناخن آگے کو بڑھ کر

اور لوگ دار جو کر مر گئے تھے۔ اور اچھے خاصے درندے کے پنجوں کی تسلی بن گئے تھے جنہیں حجام بڑی مشکل سے تراش پایا۔ استاد نے عقیقہ کرا کر اللہ دیا نام رکھا۔ بھیڑیئے سے ملتی جلتی خول نکالتا تھا۔ جس پر کسی وقت پھر آواز نکالنے پر کلاکار کو ہوا تھا۔ اور گاؤں والے سمجھتے تھے آدمی کی بولی بول رہا ہے۔ شروع میں دو تین روز تو بڑے ہی غیظ میں رہا اور اگر اچھی طرح کس کر نہ بندھا ہوتا تو کود پھاند کر ہاتھ پاؤں توڑ لیتا یا ٹھونگ مار کر سر پھوڑ لیتا۔ تیسرے روز جب چوپال کے نیچے سے بکریوں کا ریوڑ گزرا تو جھپک سا گیا اور اچھل کر حملہ کرنا چاہا۔

اب ہم کو بھیڑیوں کے شکار میں مزہ آنے لگا تھا۔ ایک ایک آدھی رات کو ایک ایک گاؤں والے نوجوان کو ساتھ لے کر بھٹ پر جا بیٹھتا اور بالعموم شروع شب میں ہی ایک دو دو بھیڑیئے مار کر آدھی رات تک پلٹ آتا، اور ہم چھ آدمیوں کی پارٹی آٹھ دس بھیڑیئے مار کر ہر شب پلٹتی۔ تمام دن اللہ دیا سے کھیل کرتے۔ ہفتہ بھر کے اندر اللہ دیا اس حد تک مانوس ہو گیا کہ دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں میں زنجیر ڈال دی گئی اور زنجیر کے اس گول کڑے پر کپڑا لپیٹ دیا گیا جو ہاتھوں اور پاؤں میں رہتا ہے۔ کودنا، اچھلنا، سر پٹخنا بالکل چھوڑ دیا جس کی وجہ سے ہمہ وقت نگرانی کرنی پڑتی تھی اور تمام جسم جکڑ کر رکھنا پڑتا تھا۔ پہلے روز کچھ پوریاں اور ترکاری سامنے رکھی مگر اس سے مکدر ہو کر منہ پھیر لیا اور تین چار دن تک کوئی چیز حتیٰ کہ گوشت بھی نہ کھایا۔ پھر ہم نے ہرن اور خرگوش کا گوشت دیا تو تھوڑا سا کھانا شروع کیا۔

دیہات سے دور دراز کے لوگ تماشہ دیکھنے آتے رہے۔ تین روز گزر گئے مگر ابھی عورتوں کی آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ حتیٰ کہ اس گاؤں کی بھی عورتیں نہ آتی تھیں۔ ہم نے دو روز آرام کیا، ان دو روز میں بھیڑیوں کے شکار کی نئی قسم کی اسکیم بنائی۔ کچھ پیشہ ور شکاری بھی دیکھنے آئے، اور ہماری سکیم میں شریک ہو گئے۔

تیسرے روز گاؤں کی لڑکیاں جمع ہو کر آئیں اور چند قدم کے فاصلہ پر کھڑی ہو گئیں۔ چند منٹ کے بعد حسین چنچل، شوخ و شنگ چمپا جو گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی سمجھی جاتی تھی خول سے نکل کر مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ جب وہ قریب پہنچی تو اللہ دیا نے اوپر نگاہ اٹھائی اور ذرا سمٹ کر پاؤں پر پاؤں رکھا اور ستر پوشی کی، اور منہ پر بار بار ہاتھ پھیرا جیسے اپنا آپا سنبھالا۔ پھر چمپا کی جانب سلونے سلونے تیوروں سے دیکھا، بھیڑیئے انسان کی وحشی آنکھوں میں رس آگیا اور محبت کے مرغولے ناچنے لگے۔ بڑی میٹھی نظروں سے چمپا کو بار بار سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا۔ چمپا کھلکھلا کر ہنستی رہی اور لڑکیاں پیچھے سے مذاق کرتی رہیں۔ جب لڑکیاں چلنے لگیں تو جاتے وقت دور تک پیار بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

دوسرے روز پھر لڑکیاں جمع ہو کر آئیں، اور پھر بھیڑیئے انسان پر رومانی کیفیات طاری ہو گئیں۔ چمپا پھر آگے بڑھی اور دوپٹہ کی آڑ سے دودھ کی بالٹی نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔ بالٹی کی جانب اللہ دیا کھسکا۔ چمپا نے جھک کر بالٹی اور بڑھائی۔ ادھر سے اللہ دیا نے بالٹی کا کنڈا پکڑا اور چمپا کے نرم و نازک گداز ہاتھ سے اس کی کھردری موٹی انگلیاں چھو گئیں، اور جیسے اس کے تمام جسم میں بجلی کی رَو دوڑ گئی۔ آنکھوں میں نشہ سا آگیا۔ اور چمپا پھر کھلکھلا کر ہنسی تو ادھر اللہ دیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی، اور دودھ کی بالٹی اپنے ہاتھ سے سرکا کر غٹا غٹ پی گیا، اور پی کر بڑے محبت بھرے تیوروں سے چمپا کی جانب دیکھا۔

اس کی داخلی کیفیات کا اندازہ کر کے چمپا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اللہ دیا کے تمام وجود کی درشتی اور وحشت ایک عجیب نرمی اور رومانٹک انداز میں بدل گئی۔ پھر بڑے اہتمام کے ساتھ ستر پوشی کے لئے پاؤں پر پاؤں رکھا اور جیسے اپنے ارد گرد دیکھا گویا ستر پوشی کے لئے کپڑا تلاش کر رہا ہے۔

ہم کو بھیڑیوں کے استیصال کی مہم کے سلسلے میں ٹھہرے ہوئے تقریباً چھ ہفتے ہو چکے تھے۔ پیشہ ور شکاری بھی ہمارے ساتھ پوری طرح اشتراک عمل کر رہے تھے، اور مہم پوری تیزی سے جاری تھی۔ قریب دس بارہ بھیڑیئے روزانہ شکار کی اوسط تھی، اور اب تو ہمارا بھی جی لگ گیا تھا۔ تمام دن عورتیں، مرد بچے اللہ دیا سے کھیلتے۔ اور چمپا سے تو اللہ دیا اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اس کی موجودگی میں زنجیریں کھول دی جاتیں مگر ہم کو قاعدہ کے مطابق بھیڑیا انسان کو گورنمنٹ کے حوالے کرنا تھا، چنانچہ ایک روز یہ کرنا پڑا۔

جسم پر اچھی طرح کڑوا تیل مل کر اور اپنے ہاتھوں سے چمپا نے بالوں میں کنگھی کر کے بیل تانگے پر سوار کر کے مجسٹریٹ ضلع کے پاس

بھیج دیا۔ اور مجسٹریٹ ضلع نے اس کو پاگل خانے بھیج دیا۔ اللہ دیا ہفتہ بھر پاگل خانے رہا، اور وہاں ماہرین نے اس کی حیثیت پر غور کرنے کے بعد یہ تجویز کیا کہ اس کی بہترین زیست چمپا جیسی نشان زادی ہی کر سکتی ہے۔ اور پھر گاؤں واپس بھیج دیا۔

چھ مہینے بعد جب ہمارا گزر پھر گنوئے میں ہوا تو اللہ دیا کو دیکھ کر متحیر ہو گئے۔ اللہ دیا اس قدر شائستہ ہو گئے تھے کہ بکریوں کے ریوڑ کو دیکھ کر زقندیں نہ لگاتے تھے۔ اور گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے زنجیر سے آزاد کر دئے جاتے تھے۔ چمپا کا حکم تو اس شان سے مانتے تھے کہ کوئی سرکس کا گھوڑا اپنے رنگ ماسٹر کا حکم بھی اس سے زیادہ قاعدہ کے ساتھ نہ مانتا ہوگا۔ اور اب چمپا نے اللہ دیا کو تھوڑے بہت گھر کے اندر کے کام پر لگا لیا تھا۔ بھینسوں کا تھان صاف کرتے۔ گوبر تھاپتے، کبھی کبھی چکی پیستے اور جب چمپا قہقہہ لگانے تو ہنسنے کی کوشش کرتے، وہ چمپا کی جانب دیکھ کر نشہ میں سرشار ہو جاتے، اور کچھ مبہم سے الفاظ بھی نکالنے کی کوشش کرتے۔ ایک روز جب چمپا نے ایک لنگوٹی لگائی تو چند منٹ تو پہنے رہے، مگر جب چمپا سامنے سے ہٹ گئی تو پھاڑ کر پھینک دی، اور جب وہ پھر آئی تو چیتھڑے پہننے کی کوشش کرنے لگے۔

سال ختم ہوتے ہوتے چمپا نے اسے خوب اچھی طرح سدھا لیا، اور اپنے رومانٹک احساس سے زیادہ کام پر لگا لیا۔ اس طرح چمپا کے گھر والوں کو ایک بے تنخواہ کا ملازم یا بن دام کا غلام مل گیا جو اپنی اجرت اس کی صورت دیکھ کر پوری کر لیا کرتا۔ چمپا اسے ایک فرمانبردار ٹٹو ایک وفادار کتے کی طرح چاہتی تھی۔ اس کے جذبات سے بھرپور فائدہ حاصل کرتی۔ اور اس کو زیادہ سے زیادہ کام پر لگاتی چلی جاتی۔

دیکھتے دیکھتے چمپا نے اللہ دیا کو بولی دی۔ اور پھر دو زبان کی شکل اختیار کرنے لگی۔ ایک سیدھے سادے انسان کی طرح کام پر لگایا، لباس کا شعور دیا۔ دو ٹانگوں پر چلنا سکھایا۔ یہاں تک کہ گنڈاسا لے کر چارہ کاٹنا۔ بیلوں، بھینسوں، گایوں کی خدمت کرنا سکھایا۔ ایسا معلوم ہوا کہ بھیڑیا انسان بڑی تیزی سے ارتقا کے منازل طے کر کے چمپا کے دوش بدوش پہنچ جائے گا۔ اور مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک وقت آئے گا جب چمپا اس کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور ہوگی اور شاید اس وحشی انسان کے رومان کا جواب دینے پر بھی!

مہندر ناتھ

جہاں میں رہتا ہوں

میں دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں کہ تمہیں کیا لکھوں؟ وہ کون سا مضمون ہے جس پر مصنفوں نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ تم نے لکھا ہے کہ میں عورت کی محبت کے متعلق کیوں نہیں لکھتا؟ یہ قصہ بہت پرانا ہو چکا ہے اور میں نے عورت کی محبت کے متعلق اتنا لکھا ہے کہ میرا جی خود ان باتوں سے اُکتا گیا ہے لیکن خدا کے لئے مجھے اس طرف نہ دھکیلو۔ مجھے اپنے متعلق لکھنے دو ——— مجھے اپنی اُداسی، اپنے غم، اپنے دُکھ کے متعلق لکھنے دو۔ شاید تم اس اُداسی، اس غم، اس یاسیت میں ہندوستان کی اُداس روح کی جھلک دیکھ سکو۔

تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ میں کتنی دُور سے چل کر آیا ہوں۔ کشمیر کی حسین وادیوں کا چکّر کاٹ کر، پنجاب کے حُسن سے مرعوب ہو کر، دہلی اور لکھنؤ کا چکّر لگا کر اور پونا کے طربیے سے سیراب ہو کر بمبئی پہنچ گیا ہوں، آخر اتنا لمبا سفر کیوں؟ کیا اتنی پھیلی ہوئی دنیا میں میرے لئے کوئی جگہ نہ تھی کہ میں ہندوستان کے ایک کونے سے چل کر دوسرے کونے تک پہنچ گیا ہوں، لیکن پھر بھی مجھے سکون نہیں ملتا! راحت نصیب نہیں ہوتی، خوشی محسوس نہیں ہوتی ———!

لوگوں نے بمبئی کی عمارتوں کی تعریف کی ہے۔ لوگوں نے سڑکوں، بسوں اور ریلوں کی تعریف کی ہے، مگر میں ان فلک بوس عمارتوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوا۔ مجھے ان ٹراموں اور بسوں میں بیٹھ کر کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ ہاں! جب کبھی سمندر کے کنارے جاتا ہوں تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ یہ پھیلا ہوا وسیع سمندر اور دور ——— بہت دور ——— ایک کشتی لہروں پر ہچکولے کھاتی ہوئی ایک نامعلوم منزل کی طرف رُخ کئے ہوئے چلی جاتی ہے اور پھر سمندر کے کنارے ناریل کے جھنڈ کے جھنڈ ——— ناریل کے درخت کافی لمبے ہوتے ہیں شاید سرو اور پوپلس کے بھی درختوں سے لمبے اور اونچے ——— یہ درخت ہر وقت ہوا میں جھومتے ہیں۔ آپس میں ایک عجیب انداز سے سرگوشیاں کرتے ہیں اور رات کے وقت جب ہوا ان درختوں میں سے ہو کر گزرتی ہے تو ایک عجیب سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ پتے جھومتے ہیں کسی جوان لڑکی کے پریشان بالوں کی طرح ——— چاند شرمائی ہوئی دلہن کی طرح ان درختوں کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔ لیکن چاند کی سیمیں کرنیں سمندر سے ہم آغوش ہوتی ہیں، لہروں کو چومتی ہیں، کھیلتی ہیں، لہریں ہنستی ہیں، کھیلتی ہیں، ریت کے ذرّے بکھرتے ہیں، چمکتے ہیں اور سمندر کی ٹھنڈی تازہ ہوا

ناریل کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی ایک اُداس نغمہ پیما کرتی ہے.....

بمبئی میں مجھے تین چیزیں پسند آئی ہیں۔ سمندر، ناریل کے درخت اور بمبئی کی ایکٹرس ——— اصل میں ان تین چیزوں سے بمبئی زندہ ہے۔ اگر ان تین چیزوں کو بمبئی سے نکال دیا جائے تو بمبئی ——— بمبئی نہ رہے۔ شاید دہلی بن جائے یا لاہور یا ایک ایسا ہی معمولی سا شہر۔ میں یہاں کیوں آیا؟ اس کی وجہ تم جانتے ہو، وہی روزگار کی تلاش، پیٹ کا مسئلہ بہت پرانا مسئلہ ہے مگر افسانوں نے ابھی تک اس مسئلے کا کوئی مکمل پیش نہیں کیا اور جب تک اس مسئلے کو حل نہ کیا جائے گا، یہ جنگ رہے گی، یہ بھوک رہے گی۔ اس وقت میری جیب میں صرف چار آنے ہیں لیکن مجھے روٹی کی اتنی فکر نہیں۔ آخر کھانے کو تو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے، کہیں نہ کہیں تمہارے جیسا دوست مل جاتا ہے اور پھر ہم کسی ہوٹل میں چلے جاتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔ میں کبھی کبھی اپنے دوستوں سے روپے اُدھار لیتا ہوں لیکن یہ روپے کبھی واپس نہیں کرتا۔ کہہ دو یہ کمینگی ہے، ہو گی۔ بھوک ہی کمینگی سکھاتی ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ سرمایہ دار مزدور کی روزی چھین کر عالیشان محل تیار کرتا ہے، کیا یہ کمینگی نہیں؟ جابر کمزور کو مار کر سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے، کیا یہ کمینگی نہیں؟ حاکم محکوم کو کچل کر حکومت کرتا ہے کیا یہ کمینگی نہیں؟ اور اگر میں اپنے مالدار دوستوں سے چند سکے قرض لیتا ہوں اور پھر واپس نہیں کرتا تو میں کمینہ ہو گیا؟ چھوڑو میاں تمہارے سماج کی عجیب قدریں ہیں اور میں ہر گام، ہر قدم، ہر منٹ، ہر سیکنڈ ان قدروں کو توڑنا چاہتا ہوں اور ان قدروں کا مضحکہ اُڑانا چاہتا ہوں، چاہے تم مجھے کمینہ کہو یا غدار۔

پہلے میں چوپاٹی پارک میں رہتا تھا۔ یہ جگہ ایکٹر اور ایکٹرسوں کی محبوب ترین جگہ ہے۔ چوپاٹی پارک کے چوک میں کھڑے ہو کر تم تمام ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھ سکتے ہو۔ سڑک کے ہر کنکریٹ پر، کسی نہ کسی موڑ پر، حلوائی کی دکان پر یا ایرانی کی دکان پر تم ایکٹروں کو دیکھ لو گے۔ یہ لوگ اتنے فاضلانہ انداز سے رہتے ہیں جتنا فرمایا ہے۔ یہاں اگر ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھنے کے لئے دل نہیں چاہتا۔ کیونکہ ہر روز تم انہیں دیکھ سکتے ہو اور جو چیز ہر روز دیکھی جائے اس کی دلکشی جاتی رہتی ہے۔

تم نے یوں پردہ گیتا کی تصویر مانگی ہے۔ ارے بھئی چھوڑو ان ایکٹرسوں کو۔ کیوں دردِ سر مول لیتے ہو، بھاری اب بہت موٹی ہو گئی ہے، کسی اور ایکٹرس کا نام لو۔ کوئی ہو بھی تو ——— شاید مہتاب تمہیں پسند آئے۔ میری نگاہوں میں وہی عورت ہے جسے ہیروئن کہا جا سکتا ہے باقی تو پُتلی کرپا ہوتی ہیں۔ دراصل ہندوستان میں ایکٹرسیں اپنے جسموں کا خیال نہیں رکھتیں۔ ایک بار ایکٹرس بن گئیں اور ہیروئن کا رول مل گیا تو بس لگیں موٹا ہونے۔ نہ کمر ہی نرمک، نہ آنکھوں میں شوخی، چہرے پر گوشت چڑھنے لگا، کولہے اتنے پھیلے کہ ٹانگیں غائب اور آخر پھیلتے پھیلتے مجسم کپا بن گئیں۔ اور اب بتاؤ۔ کیا کرو گے تم ان کا فوٹو لے کر۔ کل ہی میں نے 'METRO' کے سامنے ایک اشتہار دیکھا جس میں مغربی ناچنے والی لڑکیوں کی ٹانگیں دکھائی گئی تھیں۔ اُف! کیا ٹانگیں تھیں۔ کتنی سڈول، جیسے سانچے میں ڈھلی ہوئی ——— کتنی خوبصورت ——— کتنی پُرفریب جیسے نگاہوں میں جذب ہو رہی ہیں۔ سارا ہندوستان چھان ڈالو، ایسی خوبصورت ٹانگیں نہ ملیں گی۔ میاں ان لوگوں سے وہاں سامنا سیکھو۔ ان لوگوں سے پوچھ کر خوبصورتی کس چیز کا نام ہے؟ ان لوگوں سے پوچھ کر خوبصورت ٹانگیں کیسے تیار ہوتی ہیں؟ سڈول بازو کہاں سے ملتے ہیں؟ یہ کرو CULTURE، یہ حسین، جوان، خوبصورت CULTURE جو عورت کی خوبصورتی کی روح ہوتی ہے، کہاں سے آتی ہے؟ کس طرح بنتی ہے؟ اس میں شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ تم کہو گے کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے، ان لوگوں میں اتنی توفیق کہاں جو وہ اپنے جسموں کا خیال رکھیں؟ لیکن ان ایکٹرسوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ یہ تو غریب نہیں یہ تو ہزاروں روپے کماتی ہیں۔ رہا تمہارا یہ کہنا کہ انہیں بھی خوبصورتی کا احساس نہیں، ہماری عورتیں تو پُتلی کرپا ہونا جانتی ہیں اور جب پُتلی کرپا ہو گئیں تو سمجھ لو، نروان، حاصل کر لیا۔

اور جہاں کہیں خوبصورت عورت نظر آتی ہے، وہ اپنے آپ کو، اپنی ٹانگوں کو اتنا چھپا کر رکھتی ہے کہ دنیا والوں کی نظریں اُدھر نہ جا سکیں ہمیں تو زندہ رہنے کی بھی تمیز نہیں۔ جمالیات کا پاس نہیں۔ ہمیں ان لوگوں سے کچھ سیکھنا چاہئے۔

ارے بھائی! پروتیما کا ذکر کرنے میں اِدھر اُدھر بھٹک گیا اور بالی وڈ کی خوبصورت ٹانگوں کا ذکر کرنے لگا۔ اگر تم واقعی ان خوبصورت ایکٹریس سے ملنے کے لئے اتنے جتا رہے ہو تو سیدھے بمبئی چلے آؤ۔ میں بمبئی کی مشہور ایکٹرسوں سے تمہارا تعارف کرا دوں گا۔ یہ لوگ بھی شہرت کے اتنے بھوکے ہیں جتنے ہم ہاتھ۔ یہ بھی ہماری طرح انسان ہیں۔ میں یوں ہی ایکٹرسوں کے جھمیلے میں پھنس گیا۔ کہہ رہا تھا ذکر اپنا، بیچ میں پیاری ایکٹرس آگئی تم نے میرے مکان کا پتہ پوچھا ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کہاں رہتا ہوں؟ میں پہلے شیواجی پارک میں رہتا تھا، وہاں سے کیوں چلا آیا؟ اس کی وجہ بھی بتاتا ہوں۔ میں ایک دوست کے پاس قیام پذیر تھا۔ آج کل کسی کو دوست بنانا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ دشمن ——— میرا دوست جس کا نام تم "R" رکھ لو ایک نہایت ہی پہلوان قسم کا انسان ہے۔ جسم دیکھ کر تو جی پھڑک اٹھے۔ ورزش کا بہت شوقین ——— اکثر وہ دن رات ورزش کرتا ہے۔ ہر وقت جسم کو مضبوط اور توانا بنانے کے خواب دیکھتا ہے۔ دراصل اس کا خواب حقیقت بن چکا ہے۔ ہمارے میں صرف ایک خامی ہے کہ وہ عورت کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتا اور اگر میں کبھی کسی عورت کی طرف دیکھتا ہوں تو اکثر وہ اس فعل کو مجرمانہ سمجھتا ہے کبھی کبھی میں خیال کرتا ہوں کہ میرے دوست کا نظریہ درست ہے۔ آخر یوں ہی اپنے دل و دماغ کو خواب کرنے سے کیا فائدہ؟ ہر وقت عورت کے متعلق سوچنے سے کیا حاصل؟ بہتر یہ ہے کہ ورزش کی جائے، ڈنڈ پیلے جائیں، مگدر روز اٹھایا جائے اور جب انسان پتھر اٹھا اٹھا کر تھک جائے تو سمندر کے کنارے سیر کرنے چلا جائے اور سمندر کی لہروں کو تکتا رہے، جہاں تک نظر جاتی ہے پانی ہی پانی! یا لہریا ہی لہریں ——— دور ——— نظروں سے دور ——— سمندر اور آسمان آپس میں بغل گیر ہوتے ہیں۔ سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر سمندر کو چومتا ہے اور آخر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخی، آسمان پر بھاگتے ہوئے بادل، اور ٹھنڈی، تازہ، زندہ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی، اور ناریل کے درخت اور ان کی سوندھی سوندھی خوشبو ——— ان کو چھوڑ کر عورت کے پیچھے بھاگنا حماقت ہے، سراسر حماقت ہے۔

اگر تم میرے دوست کو دیکھو تو یہی کہو گے کہ کتنا اچھا حسین تراشا ہوا مجسمہ ہے۔ بالکل یونانی مجسمے کی طرح حسین اور خوبصورت۔ اس کی آنکھوں میں سرسبز گھاس کی بنفشہ ہے اور اس کے رخساروں کی رنگت سیبوں کی طرح سُرخ۔ اگر تم اس کے قریب بیٹھو تو اس کے جسم سے ایک ہلکی ہلکی صحت سنبلہ خوشبو نکلتی ہے جو کھٹن ٹھاٹھ دودھ دہی کھانے سے پیدا ہوتی ہے ——— عورتیں میرے دوست کی طرف دیکھتی ہیں، ان کی نگاہوں میں تعریف ہوتی ہے۔ وہ سوچتی ہیں کہ یہ بازو اتنے سڈول کیوں ہیں؟ اس کی آنکھوں میں اتنی چمک کیوں ہے؟ اس کا جسم اتنا متناسب کیوں ہے؟ لیکن میرا دوست عورت کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ نہ جانے اسے عورت سے کیوں چڑ ہے؟ اور جب عورت ایک حقیقت ہے تو حقیقت سے منہ موڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ صرف ورزش کرنا اور گھی کھانا اور ایک خوبصورت جسم بنانا ہی زندگی نہیں ہو سکتا۔

میری طرف دیکھو تو، میں ورزش بھی کرتا ہوں اور صحت مند بھی رہنا چاہتا ہوں، لیکن میں صرف Boxer بننا نہیں چاہتا۔ زندگی میں کچھ اور بھی کرنا چاہتا ہوں۔ مثال کے طور پر میں اسی لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس بالکونی میں کھڑی رہتی ہے، کیا تم نے اس لڑکی کی طرف دیکھا ہے؟ دیکھا ہوگا، ضرور دیکھا ہوگا۔ میں نے تمہیں اکثر دیکھا ہے کہ تم اپنے باغ میں چلے جاتے ہو اور ریشمی شبنمی گھاس پر، ایک سفید چادر بچھا دیتے ہو اور اس چادر پر لیٹ جاتے ہو۔ چاند آکاش پر مسکراتا ہے اور اس کی روپہلی کرنوں میں تم نہاتے ہو، ٹھنڈی اور برفانی کرنیں۔ گھنٹوں تک تم ان کرنوں میں نہاتے رہتے ہو۔ پھولوں کی خوشبو سے اپنے جسم کو بھگو لیتے ہو اور بڑی بڑی گھاس کو چبھتے رہتے ہو۔ یہ تم کیوں کرتے ہو؟ کیا تم نے اس لڑکی کی طرف نہیں دیکھا؟ وہ بھی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ اس کے جسم سے بھی خوشبو نکلتی ہے۔ بہت ہی پیاری اور بھینی بھینی۔ بالکل اس چاند کی طرح خوبصورت اور حسین ——— کیا تمہارے دل میں چاند کو چھونے کی خواہش پیدا ہوئی ہوگی۔ چاند تو خوشی اور مسرت کا منبع اعظم ہے۔ میں بھی اپنے چاند کو چھونا چاہتا ہوں۔ اسی خوشی میں نہانا چاہتا ہوں۔ اس مسرت کو اپنانا چاہتا ہوں، اسی لڑکی کے قریب سے گزرنا چاہتا ہوں تاکہ اسے میرے وجود کا علم

ہو جائے، تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ جو شخص ہر روز اس کی بالکونی کے نیچے سے گذرتا ہے اسے پسند کرتا ہے۔ اس عمل میں برائی کی بات کوئی نہیں یہ تو بالکل ایک ذہنی خواہش ہے۔

اور پھر میرے دوست کو ایک لمبے بالوں والی لڑکی سے سخت نفرت ہے۔ اگر وہ تمہیں پسند کرتی ہے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اور اگر وہ ایک دن تمہیں دیکھنے کے لئے تمہارے کمرے میں چلی آئی تو اس میں غصہ ہونے کی کونسی بات تھی؟ اسے گھر سے نکالنے میں کون سی دانشمندی تھی؟ کیا اس حرکت کی لوگ تعریف کریں گے؟ کیا یہ اخلاق کا بہترین نمونہ ہے؟ تم نے اس قسم کی حرکتیں کر کے اس کی خوابشوں کو کچل ڈالا، خوشی کے سرچشمے کو خشک کر دیا۔ وہ آج کل اداس اور غمگین کیوں نظر آتی ہے؟ اس کے رخسار آج کل کیوں زرد ہیں؟ وہ کیوں کھوئی کھوئی اور مغموم سی رہتی ہے؟ تم نے ورزش کی اور تکیہ گھی کھا کر آرام کی نیند سو گئے لیکن اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی اور بیچاری ٹھوکر کھا کر کانٹا ہو گئی۔ میں اس قسم کی اخلاقی قدروں کو پسند نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں جب تمہیں عورت کی ضرورت پڑتی ہے تو تم کیا کہتے ہو؟ تم ٹھنڈا پانی پیتے ہو اور ٹھنڈے پانی کے ٹب میں نہانے ہو۔ یہ کب تک کہتے رہو گے؟ اور اگر دنیا کے سب لوگ اسی فارمولے پر عمل کرنے لگیں تو زندگی بے کیف اور بے رنگ ہو کر رہ جائے۔

تو ہاں! میرے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ ایک دن ایک لڑکی میرے دوست کے کمرے میں آئی۔ میں بھی وہیں موجود تھا، لڑکی کو دیکھ کر میرے دوست کو غصہ آ گیا۔ اس نے لڑکی کو گالی دی۔ بڑا بھلا کہا ——— کہ وہ طوائف ہے، وہ ایک بدمعاش عورت ہے۔ لڑکی بیچاری ہکا بکی رہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی نے غلط دھندا شروع کیا تھا اور وہ ہم لوگوں سے دوستی کرنے آئی تھی اور چاہتی تھی کہ ہم لوگوں کو وہ اچھی لگے اور پسند آئے۔ اس سے پہلے ایک لونڈے سے محبت کر چکی تھی اور اب وہ میری طرف جھک گئی مگر میرے دوست نے لڑکی کو بے عزتی کی اور گھر سے نکال دیا اور میں دیر تک اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اگر میرا دوست ان پڑھ ہوتا تو شاید میں اسے معاف کر دیتا لیکن چونکہ پڑھا لکھا ہوا اور پھر ایک طوائف کو گالی دے کہ وہ کیوں مشیر کراتی ہے، وہ کیوں اپنے جسم کو بیچتی ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شخص زندگی کے بنیادی مسائل کو نہیں سمجھتا، اور اگر سمجھتا ہے تو اپنے اصولوں کی خاطر ایک ایسی عورت پر وار کرتا ہے جو اکیلی ہے، جس کا وارث کوئی نہیں جس کی بے عزتی کی ذمہ دار سماج ہے، گورنمنٹ ہے، موجودہ سامراج ہے۔

طوائف کا مسئلہ ——— طوائفوں کو گالی دینے سے حل نہ ہوگا۔ بلکہ عورتوں کو تعلیم دینے سے، عورتوں کی بھوک مٹانے سے، عورتوں کو نوکری دینے سے، عورتوں کے لئے کام مہیا کرنے سے، عورتوں کو آزادی دینے سے اور عورت کے اقتصادی مسئلوں کو حل کرنے سے ہوگا۔ جب تک یہ کام حکومت نہ کرے گی طوائفیں رہیں گی۔ اور آج بھی وہ واقعہ مجھے نہیں بھولتا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے اس دن اس لڑکی کی بے عزتی نہیں ہوئی تھی بلکہ میری بہن کی بے عزتی ہوئی تھی۔ اس میرے دوست نے اس لڑکی کی بے عزتی کر کے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ مجھے بھی اس گھر میں نہیں رہنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی ایک دن اسی طرح اس گھر سے نکالا جاؤں۔ اس لڑکی نے جن قہر آلود نظروں سے میرے دوست کی طرف دیکھا، اس سے صاف عیاں تھا کہ اگر وہ مرد ہوتی تو اسے تھپڑ لگا کر اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتی وہ کون شخص ہے جو اچھی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ آخر اس لڑکی کو کیا غرض تھی کہ وہ اپنا جسم راہگیروں کے ہاتھ بیچتی پھرے۔ کیا اس کے سینے کے ایک گوشے میں یہ تمنا نہ تھی کہ اسے ایک ایسا خاوند ملے جو خوبصورت ہو، جو نیک ہو، جو کماتا ہو اور جو اس سے محبت کرتا ہو۔ اور اگر زندگی میں یہ چیزیں میسر نہ ہو سکیں اور بھوک اور فاقوں سے نڈھال ہو کر اپنے آپ کو بیچنا پڑے تو اس لڑکی کا کیا قصور! وہ لڑکی شاید مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ وہ گالیاں ابھی تک میرے ذہن پر مرتسم ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ گالی میرے سینے میں ایک زخم پیدا کر گئی ہے۔ اس دن کے بعد میں اپنے دوست کے گھر سے چلا آیا۔

آجکل ماہم میں رہتا ہوں، سرسٹ کا ماہیم نہیں، نٹو کا ماہیم نہیں بلکہ شیواجی پارک سے ایک سٹیشن آگے۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے۔ اس جگہ نے میری اداسی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ میرے گھر کے سامنے ناریل کے درخت ایستادہ ہیں۔ یہ درخت ہوا میں جھومتے ہیں۔ ہوا ناریل کے

پتوں سے کھیلتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ میں اکثر بالکونی میں کھڑا رہتا ہوں اور ادھر اُدھر دیکھتا رہتا ہوں۔ اکثر لوگ میری طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ یہ لڑکا یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے، کیا یہ پاگل ہے؟ کیا اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہے؟ اور میں ان کی طرف اس طرح دیکھتا ہوں جیسے میں ان کی باتیں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، جیسے میں ان کے دل کی ویرانی، ان کی بے بسی، ان کی لاچاری کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن میں نے انہیں بتانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میرے مکان کے سامنے ایک ایکٹر کا مکان ہے۔ میں اکثر ایک خوبصورت لڑکی کو کمرے میں اِدھر اُدھر پھرتے دیکھتا ہوں، لوگ کہتے ہیں کہ پہلے یہ لڑکی ایکسٹرا EXTRA وغیرہ کا کام کرتی تھی پھر اس ایکٹر کو پسند آگئی اور اب اس نے اسے گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا ہے۔ بمبئی میں عام طور پر لوگ ایکٹرسوں سے ستا رہاں کرتے ہیں اور پھر اپنی بیویوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دیتے ہیں۔ اکثر ان لڑکیوں نے آزاد زندگی بسر کی ہے۔ ایک انتہا سے گزر کر دوسری انتہا تک پہنچ جاتی ہیں۔ کہاں وہ پبلک مقام کھلا ہر مرد سے مل سکتی تھیں لیکن اب وہ کسی غیر مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتیں۔ نتیجہ بے بسی، ایک یاسیت، ایک ذہنی جمود جو ہمیشہ ان کے ارد گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ مبادا ان کا مرد انہیں کسی غیر مرد سے باتیں کرتے نہ دیکھ لے، اور ان کا پھر وہی حشر نہ ہو جائے جس سے اکتا کر انہوں نے اس زندگی کو قبول کیا تھا۔ لیکن ازدواجی زندگی کے چند سال بعد انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زندگی میں اتنا ہی زہر ہے، اتنی ہی تلخی ہے۔ اتنی ہی اُداسی ہے جتنی کہ ان کی زندگی میں پہلے تھی۔ کبھی کبھی سامنے والے ایکٹر کی بیوی میری طرف بھانک کر دیکھتی ہے۔ آنکھوں میں بے پناہ اُداسی ہے، چہرے پر مُردنی کے آثار ہیں اور زندگی میں حسرت اور غم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہوا در و زدن سے چلتی ہے، کھڑکی کے پردے ہلتے ہیں، آنکھیں جھپکتی ہیں، لمحہ بھر کے لئے، اور پھر تاریکی چھا جاتی ہے۔ میرے مکان کے نیچے اکثر گندگی کا انبار لگا رہتا ہے۔ کہتے ہیں بمبئی نہایت صاف جگہ ہے۔ اگر کبھی باہر آؤ تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ باہم لاہور کی طرح گندا سڑا علاقہ ہے۔ مکان کے بائیں طرف دھوبی گھاٹ ہے جہاں دن بھر دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ رسیوں پر طرح طرح کے فراک لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ سُرخ فراک دیکھ لو کسی جوان لڑکی کا ہوگا۔ وہ سفید فراک دیکھ لو، یہ کتنا لمبا فراک ہے کسی بڑھیا کا ہوگا۔ رنگ برنگ کی ساڑھیاں، پاجامے، قمیصیں، دھوتیاں، ٹائیاں، انڈرویر، چادریں جا بجا لٹکی ہوئی نظر آئیں گی۔ گلی کے قریب ہی ناریل کا درخت گرا ہوا ہے۔ چند دن ہوئے ہوا بہت زور سے چلی تھی جس کی وجہ سے ناریل کا درخت گر گیا تھا۔ بالکونی کے سامنے ایک چھوٹا سا سمندر دکھائی دیتا ہے، دراصل یہ سمندر نہیں ہے۔ بمبئی میں بہت کم منہ رہیں۔ یہاں گودی دار ہے اور سمندر کہ دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں گہرے زیادہ نظر آتے ہیں۔ تو ہاں! شاید یہاں کے ہندوؤں کو سمندر کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی تو انہوں نے ایک گڑھا کھود کر اس میں ایک پتھر رکھ دیا ہے اور ارد گرد ٹین کی چادریں لگا دی ہیں۔ عورتیں صبح سویرے آتی ہیں اور پتھر کی پوجا کر جاتی ہیں۔ چند دن ہوئے ناریل کا درخت اس پتھر پر گر پڑا تھا برا سا طلب ہے اس خدا پر لیکن درخت بھاری تھا، خدا کچھ نہ کر سکا، بچارا درخت کے بوجھ تلے دب گیا۔ آج کل جنگ کا زمانہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کھانے پینے کے لئے کافی مل جاتا ہے۔ نہیں تو اس بات پر ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ سنا ہے کہ مسلمانوں نے جان بوجھ کر درخت کو گرایا ہے تاکہ ہندوؤں کے بھگوان کی بے عزتی ہو۔ لیکن آج کل ان مسئلوں کو کون پوچھتا ہے ——— جب پیٹ بھرا ہو تو خدا بھی یاد نہیں آتا۔ مذہب ——— بچارا ———!

انگلیٹ سے کیا فطور پر ہے اس لئے جب کبھی بالکونی میں کھڑا ہوتا ہوں تو ارد گرد کے مکانوں کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ مکان کے دائیں طرف ایک گجراتی بچارا بوڑھا ہے لیکن اس کی بیوی جوان ہے، اگر خوبصورت ہوتی تو میں ضرور اس سے عشق کرتا۔ بچاری نہایت ہی بدصورت ہے۔ کاش اس کے دانت باہر نکلے ہوئے نہ ہوتے تو شاید مجھے پسند آجاتی، اکثر وہ پھولوں کا گچھا اپنے جوڑے کے ارد گرد باندھتی ہے۔ یہاں کی عورتوں کو پھولوں سے بہت رغبت ہے۔ معلوم ہوتا ہے عورت جتنی زیادہ بدصورت ہوتی ہے اتنی ہی اسے پھولوں سے محبت ہوتی ہے۔ یہاں قسم ہر شکل کی، ہر جسامت کی پھولوں سے لدی ہوئی پاؤ گے۔ عورت بیاہی ہوئی ہو یا کنواری لیکن پھول ہر ایک جان ہے۔ بغیر پھولوں کے

تمہیں یہاں کوئی عورت دکھائی نہ دے گی لیکن یہاں کے لوگ بدصورت ہیں، عورتیں اس سے بھی زیادہ بدصورت ہیں۔ بمبئی ہے لیکن چہرے کے خطوط، ان کی چال ڈھال، ان کا رہنا سہنا بالکل عجیب ہے۔ کم از کم مجھے تو بالکل پسند نہیں آیا۔ کاش بمبئی کی عورتیں پھولوں سے کم محبت کرتیں تو شاید ان کی خوبصورتی میں کچھ اضافہ ہو جاتا۔ جب ایک خوبصورت پھول کو دیکھنے کے بعد ایک بدنما چہرے پر نظر پڑتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ دونوں کو سمندر میں غرق کر دیا جائے۔ بہرحال اس گجراتی عورت کو پھولوں سے محبت ہے۔ بوڑھا گجراتی اکثر باہر رہتا ہے اور شام ہونے کے بعد گھر آتا ہے۔ عورت دن بھر چارپائی پر پڑی رہتی ہے، بالکل اوندھی، اور سرہانے پر منہ رکھ کر ٹانگوں کو دن بھر ہلاتی رہتی ہے اور آجکل گجراتی نے ایک نوکر رکھ لیا ہے جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ گجراتی خود نوبار رہتا ہے اور نوکر دن بھر گھر میں رہتا ہے۔ آج میں سنے نوکر کو گجراتن کو چومتے ہوئے دیکھا۔ اس نے گجراتن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بستر پر لٹا لیا اور پھر دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ شام کے وقت گجراتن بھر باہر نکلی آج اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، اس کے جسم میں ناریل کی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہزاروں پھول کھلے ہوئے تھے لیکن یہ خوشی جلد ہی فنا ہو گئی۔ بوڑھے گجراتی کو اس عشق کا علم ہو گیا اور اس نے نوکر کو گھر سے نکال دیا۔ آج پھر گجراتن کے لب سوکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں وہی پیاسی اداسی ہے، اس کی ہنسی میں اداسی ہے، اس کی باتوں میں غم کی جھلک ہے۔ وہ اکثر بستر پر اوندھے منہ لیٹی رہتی ہے اور اس کی ٹانگیں ہلتی رہتی ہیں۔

تم کہتے ہو گے کہ میں پھر محبت کا قصہ لے بیٹھا۔ سچ کہوں تو برا تو نہ مناؤ گے — میں ہر طریقے سے یہ کوشش کرتا ہوں کہ عورت کے متعلق کچھ نہ سوچوں، عورت کے متعلق کچھ نہ لکھوں لیکن ہر بار جب لکھنے بیٹھتا ہوں عورت سامنے آجاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے بغیر افسانہ پھیکا رہے گا۔

لیکن آؤ۔ عورت کی دنیا سے تمہیں دور لے چلتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے دوستوں سے متعارف کراتا ہوں، جس جگہ میں رہتا ہوں، یعنی جس فلیٹ میں رہتا ہوں وہ فلیٹ صرف ایک انسان کے رہنے کے لئے ہے لیکن آج کل اس فلیٹ میں پانچ انسان رہتے ہیں۔

میرے ساتھ ایک بنگالی نوجوان رہتا ہے، اس کا نام چٹرجی ہے، یہ بنگال کے ایک دور افتادہ گاؤں سے چل کر بمبئی آیا ہے تاکہ روزگار مل سکے اور وہ اس اور بیوی کی زندگی بسر کر سکے۔ چٹرجی کا رنگ سیاہ ہے۔ وہ نہایت ہی دبلا اور پتلا ہے۔ اس کی ماں تپ دق سے مر گئی تھی۔ شاید اس کے چھوٹے سے جسم میں تپ دق کے جراثیم موجود ہیں۔ اس کے گال پچکے ہوئے ہیں، اس کی آنکھوں میں پریشانی کی جھلک رہتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ لیکن چٹرجی نہایت چالاک آدمی ہے، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ میں نے اسے کبھی بے کار نہیں دیکھا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ آج تک اسے کوئی کام نہیں ملا۔ وہ بمبئی اس لئے آیا تھا کہ ایک کامیاب کیمرہ مین بن سکے۔ اس کا بھائی فوٹوگرافر ہے اور اس نے فوٹو کھینچنے کا کام بھائی کی دکان پر سیکھا تھا۔ اس کے بعد بمبئی کی طرف رخ کیا۔ وہ اردو اچھی طرح بول سکتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بنگالی ہو کر اردو بول لیتا ہے لیکن وہ ہندی بھی جانتا ہے، ٹوٹی پھوٹی انگلش بھی بول لیتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے لیکن ایک سام گریٹ سے بہتر انگریزی بول سکتا ہے۔ ایک بار اسے فلم میں جگہ ملی، لیکن کام اچھا نہ کرنے کی وجہ سے نکال دیا گیا۔ اب وہ ڈائریکٹر بننا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر بن کر دکھائے گا۔ اس کے پاس کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ اکثر وہ ایک وقت کھانا کھاتا ہے۔ اس لئے اس کی صحت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ایک بار اسے زکام ہو گیا اور ساتھ ہی بخار بھی۔ آگے ہی کیا توانا تھا کہ زکام اور بخار نے اسے اور لاغر کر دیا۔ دو دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا اس کی آنکھیں دھنس گئی ہیں۔ چہرہ زرد ہو چکا ہے اور جب وہ چلتا ہے تو اس کی ٹانگیں کانپتی ہیں۔ باتیں کرتے وقت اس کا سانس پھول جاتا ہے لیکن اس نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری۔ وہ اب بھی کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر ضرور بنے گا۔ وہ ایک دن فلم ضرور ڈائریکٹ کرے گا۔ کہا ہوا کہ اس کے پاس

پیسہ نہیں۔ کیا ہوا وہ دن میں صرف ایک بار کھانا کھا سکتا ہے۔ وہ فاقے کرے گا، وہ زندگی سے لڑے گا، وہ ظلمی دنیا کے ہر شخص سے جنگ کرے گا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لوگ کس طرح پروڈیوسر بن جاتے ہیں۔ بمبئی میں اگر کوئی پروڈیوسر بننا چاہتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ کسی حسین خاتون کو پھانس لے، یا کوئی حسین خاتون اسے پھانس لے۔ بس چند دنوں کے اندر وہ شخص پروڈیوسر بن جائے گا۔ لیکن چترجی خوبصورت نہ ہونے کے باوجود بھی پروڈیوسر بننا چاہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی سمجھدار عورت اس پر عاشق نہیں ہو سکتی۔ اس سے عشق نہیں کر سکتی لیکن وہ اپنی دشمن کا پتا ہے۔ اس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط ہے۔ اکثر وہ بمبئی کے اسٹوڈیو کا چکر لگا کر تھک جاتا ہے اور پھر تھک کر کہتا ہے کہ وہ اس زندگی سے اکتا گیا ہے، وہ کب تک ہاتھ پاؤں مارتا رہے، وہ کب تک جدوجہد کرے، وہ کب تک لوگوں کی ٹھوکریں کھائے۔ اسے لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے، اسے زندگی سے نفرت ہو گئی ہے، وہ خودکشی کرے گا۔ جب کبھی وہ کسی بوجھ کر خودکشی کے متعلق سوچتا ہے تو اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب سی ہنسی ہوتی ہے، وہ ہنسی میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ اس ہنسی میں کتنی تلخیاں پنہاں ہوتی ہیں جو زندہ ہو کر اس کے لبوں پر ناچتی ہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ خاموش ہے، بمبئی کا ہر سیٹھ زندہ ہے، بمبئی کے ہر ہوٹل میں روشنی کے قمقمے روشن ہیں۔ بمبئی کے ہر ہوٹل میں لوگ شراب پیتے ہیں، ڈانس کرتے ہیں، ہزاروں لاکھوں قمقموں کی روشنی پھیلتی ہے اور ہر طرف پھیلتی ہے۔ ٹرامیں، بسیں اور موٹروں کی آوازیں مدھم نہیں پڑتیں لیکن یہ شخص اس بے نور کمرے میں بیٹھ کر کیوں اداس دکھائی دیتا ہے، اس کی آنکھوں میں کیوں مرنے کی تمنا ہے۔ آخر اس اندھی جدوجہد کا کیا مقصد ——— ؟ آج کل وہ کبھی کبھی کہتا ہے، کیا اس کو تپ دق ہو گئی ہے؟ کیا وہ زندگی میں کبھی ڈائریکٹر بن سکے گا؟ کیا اس کی خواہش کبھی پروان چڑھے گی؟

میرے ساتھی اکثر چترجی کو چھیڑتے ہیں، اس سے مذاق کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کب ڈائریکٹر بنو گے، کب پروڈیوسر ہو گے، ہر وہی اس کے ساتھی ہیں جو خود بھی بھوکے مرتے ہیں، لیکن چترجی پر فقرے کسنے سے باز نہیں آتے اور جب زندہ ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے تو سب مل کر چترجی کو گالیاں دیتے ہیں، اسے گھر سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محض اس لئے کہ اس کا کوئی والی وارث نہیں محض اس لئے کہ اس کے پاس اتنے روپے نہیں ہوتے کہ وہ فلیٹ لے کر ایسے میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ وہ اکثر دوسروں کا دست نگر رہتا ہے اور چترجی ان سب کی گالیاں خاموشی سے سنتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اگر وہ یہاں سے نکال دیا جائے تو وہ کہاں رات بسر کرے گا، اس کا اور کوئی ٹھکانا نہیں بن سکتا۔ وہ غصے میں آکر خط لکھنے لگتا ہے۔ کس کو؟ شاید اپنے باپ کو جس نے اسے پیدا کیا۔ شاید اپنی ماں کو جو کب کی مر چکی تھی یا اپنے بھائی کو جو ایک دور افتادہ گاؤں میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ خط لکھو، لکھتے جاؤ۔ دنیا کے ناخداؤں کو خط لکھو، چترجی کو خط لکھو۔ تم جن کو خط لکھو کہ وہ تمہیں روپے بھیجیں، دنیا کے ہر بڑے انسان کو خط لکھو کہ وہ تمہیں اس زندگی سے نجات دلا دے۔ تم دنیا کے ہر بڑے انسان سے پوچھو کہ تم کیوں فاقے کرتے ہو؟ تم کیوں بھوکے مرتے ہو؟ تمہیں کیوں سونے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ لیکن خدا کے لئے خاموش نہ رہو۔ دوستوں کی گالیاں نہ سنو، تم اس ذلت کو برداشت نہ کرو۔ یہ ذلت میرے دل میں آگ لگا دیتی ہے۔ یہ سلوک میں برداشت نہیں کر سکتا اور کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ان سب لوگوں کو بالکونی سے نیچے پھینک دوں۔ دنیا میں ہر شخص خفیہ ہے۔ کمینہ ہے، رذیل ہے۔

دنیا میں ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے ——— ٹھہرو! میں کمیونزم کا پرچار نہیں کرنا چاہتا۔ میں کسی ازم کا پرچار نہیں کرنا چاہتا۔ میں کہانی نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں کہانی لکھنا نہیں جانتا۔ میری کہانی میں نہ پلاٹ ہوتا ہے نہ ماحول۔ میں کردار نگاری کے معجزے نہیں دکھانا چاہتا۔ میں رنگین عبارت نہیں لکھ سکتا، میں اردو ادب کی خدمت نہیں کرنا چاہتا۔ میری تشبیہیں نئی نہیں ہوتیں، میں غلط محاورے لکھتا ہوں، میری نثر میں خوبصورت اسٹائل کا مالک نہیں ہوں۔ میں مولپاساں اور زولا بننا نہیں چاہتا۔ میں شہرت کا قائل نہیں ——— میرے پاس اس وقت صرف یاد آئے ہیں۔ صرف چار آنے۔ لیکن میں جو کچھ بھی کہوں گا سچ سچ کہوں گا۔ میں وہ زبان لکھنا چاہتا ہوں جو ہر شخص کی سمجھ میں آجائے،

میں وہ نظام چاہتا ہوں جس میں ہر شخص کو روٹی ملے۔ کپڑا ملے اور مکان ملے۔ میں انسانیت کا قاتل ہوں۔ میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں اتنی گہما گہمی کس لیے ہے۔ اتنی بے کاری کیوں ہے؟ اتنی بھوک کیوں ہے؟ اس کا جواب تم کیا دو گے، انسانی خداؤں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

خبر ——— ان سے ملو۔ ان کا نام ہری چند ہے۔ یو پی ان کا دیس ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے، ہری چند اپنے مالدار چچا کے ساتھ سٹہ کھیلتا تھا لیکن جوں ہی جنگ شروع ہوئی اس کا چچا سب کچھ سٹے میں ہار گیا اور بچارے ہری چند کو نوکری کی تلاش میں بمبئی آنا پڑا۔ یہاں کچھ عرصہ سرکاری ڈپو میں کام کرتا رہا۔ لیکن ڈپو کی نوکری موافق نہ آئی۔ نوکری چھوڑ دی، کسی نے کہا کہ تم ایکٹر بن سکتے ہو۔ بس پھر کیا تھا ایکٹر بننے کا جنون سر پر سوار ہو گیا۔ بمبئی کی آدھی آبادی ایکٹر بننے کی تمنا کرتے کرتے مر جاتی ہے۔ بچارے ہری کو بھی یہی جنون سوار ہے۔ کاش اسے اصلیت سے آگاہ کر دیا جاتا۔ مگر انسان اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ وہ اصلیت کا کبھی سامنا کرنا نہیں چاہتا۔ آجکل دن بھر میں بیس بار کنگھی کرتا ہے۔ آئینہ ہر وقت اس کے سامنے رہتا ہے۔ غسل خانے میں دو دو گھنٹے صرف کرتا ہے اور جب نہا دھو کر نکلتا ہے تو کمرہ عطر کی آمیخت آتی ہے۔ تقریباً ایک ہفتہ میں AFGHAN SNOW کی ایک شیشی ختم ہو جاتی ہے، وہ ہر روز دو گنی قیمت پہ کپڑے دھلواتا ہے۔ آج کل وہ روپے گھر سے منگوا کر گذارہ کرتا ہے۔ لیکن کب تک ——— ؟ وہ پھر سٹہ کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سرکاری نوکری کر کے کوئی انسان امیر نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک اچھے گھر میں رہنا چاہتا ہے، وہ ریڈیو خریدنا چاہتا ہے، وہ خوبصورت عورتوں سے محبت کرنا چاہتا ہے ——— بتاؤ ان سب باتوں میں کون سی بُری بات ہے؟ ہر عقلمند شخص ان ہی باتوں کی خواہش کرے گا۔ ہری چند جانتا ہے کہ ڈپو کی نوکری کر کے وہ ان چیزوں کو حاصل نہیں کر سکتا اس لئے وہ ایکٹر بننا چاہتا ہے کیونکہ آج کل ایک ایکٹر ہزاروں روپے کماتا ہے۔ وہ سٹہ کھیلنا چاہتا ہے کیونکہ سٹہ کھیلنے سے یا وہ امیر ہو جائے گا یا محض لہو کاری۔ ہری چند زندگی سے جوا کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ جن حالات میں رہتا ہے اس میں اسے رتی بھر خوشی نصیب نہیں ہوتی دن بدن اس کا وزن کم ہو رہا ہے، سر کے بال جھڑ رہے ہیں، آنکھوں میں مایوسی کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا معلوم پڑتا ہے۔ آج وہ طاقت کی دوا خرید کر لایا ہے۔ وہ دوائی کا استعمال کرے گا اور زندگی کی کشمکش جاری رکھے گا۔ دواؤں کے استعمال سے انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ آخر کب تک؟ جس ہوٹل میں وہ کھانا کھاتا ہے، وہاں نہایت ہی خراب خوراک ملتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ان مسلسل مصیبتوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ میں نے اس سے کئی بار کہا ہے کہ وہ پھر سے ڈپو میں نوکر ہو جائے مگر وہ ہمیشہ نفی میں جواب دیتا ہے اور شیشے کو سامنے رکھ کر مسکراتا ہے اور بے جان کھردرے بالوں میں کنگھی کرتا ہے اور زور زور سے چہرے پہ کریم ملتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آہستہ آہستہ مرنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ روز رات کو بخار ہو جاتا ہے اور ہلکی ہلکی کھانسی ہو جاتی ہے لیکن میں ڈپو میں نوکری نہیں کر سکتا۔ وہ باعثِ قید ہے۔ میں اس قید کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دیکھو! اس ٹرنک میں میری نئی ٹوکری ہے۔ اسے کی ٹوکری ہے۔ اگر میں مر گیا تو وہ پھر بکنے ہے ایک کھسیانی ہنسی، جیسے وہ کبھی نہیں مریگا، یہ ٹوکری لکھنؤ یونیورسٹی کو واپس بھیج دینا۔ زیادہ عرصہ اپنے پاس نہ رکھنا ——— ٹوکری کا کافی حصہ دیمک چاٹ گئی ہے اور باقی ——— ہے بھی کیا ———

میں اسے سمجھاتا ہوں کہ بھائی کوئی نوکری کرو لیکن وہ بالکل نہیں سنتا اس دور ابتلا میں عجیب انسانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی ہے اور ہر شخص ایک بہتر زندگی بسر کرنے کی فکر میں ہے۔ مگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں دنیا کی قسمت ہے، وہ چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی ثروت، عزت اور وقار کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں پرانے راستوں پر گامزن ہیں جن پر کئی صدیوں سے ان کے باپ دادا نے حکومت کی تھی۔

اور رگھبیر سے تعارف کرانا تو میں بھول ہی گیا۔ رگھبیر دن بھر باہر رہتا ہے اور رات کے تقریباً بارہ بجے گھر واپس آتا ہے۔ تم پوچھو گے

کہ وہ کیا کام کرتا ہے تو میں اس کا کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس فلیٹ میں جو شخص رہتا ہے اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کام کرتا ہے؛ دراصل اس فلیٹ میں جو لوگ رہتے ہیں وہ کچھ کام نہیں کرتے' ہاں ادتار سنگھ کو چھوڑ کر۔ اس کا ذکر میں پھر کروں گا۔

رگھبیر کو نہ تو میں نے کبھی دیکھا۔ نہایت ہی چھوٹے قد کا انسان ہے' دور سے دیکھو تو ایک کھلونے کی طرح دکھائی دے گا اور جب نزدیک سے دیکھو گے تو شاید تمہیں خوبصورت دکھائی نہ دے۔ اس کے بال بھورے ہیں۔ اس کا رنگ گورا ہے' اسے سفید کپڑے پہننے کا شوق ہے اور عورتیں اسے کھلونا سمجھ کر پیار کرتی ہیں۔ رگھبیر جب کبھی گھر آتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے جس پر وہ شعر لکھتا رہتا ہے پہلے پہل وہ کچھ گنگناتا ہے' پھر شعر لکھتا ہے۔ دراصل وہ شاعر نہیں ہے۔ وہ ایک فلمی شاعر ہے۔ شاعر اور فلمی شاعر میں جتنا فرق ہوتا ہے وہ تمہیں معلوم ہی ہوگا۔ رگھبیر ایک دلچسپ عاشق ہے' وہ ہر عورت سے عشق کر سکتا ہے بلکہ وہ ہر عورت سے عشق کرتا ہے۔ اگر وہ کسی عورت کی طرف دیکھ لے اور اسے پسند آئے تو سمجھ لو رگھبیر کو اس لڑکی سے عشق ہو گیا۔ سڑک پر چلتے پھرتے' ٹرام یا بس میں چڑھتے اترتے' گلی کے موڑ پر' پٹرول پمپ پر' گارڈن ہر جگہ وہ لڑکیوں سے عشق کرتا ہے' وہ صرف لڑکی کی طرف دیکھتا ہے اور گنگناتا ہے' "زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں" آہ بھرتا ہے۔ اپنی محبت کے قصے دوستوں کو سناتا ہے۔ من گھڑت فسانے سنانے میں وہ نہایت کامیاب انسان ہے۔ جس لڑکی سے وہ عشق کرتا ہے اس سے شادی کا وعدہ ضرور کرتا ہے۔ چند دنوں بعد عشق کا ابال سرد پڑ جاتا ہے لیکن رگھبیر کی نگاہیں کسی اور لڑکی کو تلاش کر لیتی ہیں۔ آج کل اسے ایک بنگالن سے عشق ہو گیا ہے۔ رگھبیر کہتا ہے کہ وہ واقعی عشق کر رہا ہے' یہ سُن کر ہم سب ہنس پڑتے ہیں۔ ہم سب اس کی محبت کی گہرائی کو جانتے ہیں۔ آج کل وہ ہر روز اپنی محبوبہ کو خط لکھتا ہے اور رات بھر جاگتا رہتا ہے۔ میں اکثر رگھبیر کی محبت کا مذاق اڑاتا ہوں۔ لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ اس کی ہنسی میں واقعی کچھ یاسیت سی آگئی ہے۔ کیا واقعی رگھبیر بنگالن سے عشق کرتا ہے۔ رگھبیر کہتا ہے کہ بنگالن جس کا نام گیتا ہے شروع میں اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ گیتا ایک رنگی ہے۔ وہ ایک مشہور فلم اسٹار کے ڈروپ میں کام کرتی ہے اور بچارہ رگھبیر اس بار اس ڈروپ میں شامل ہو گیا اور بنگالن کے پیچھے ہندوستان کا چکر لگاتا رہا۔ لیکن جب یہ ڈروپ کلکتہ پہنچا تو اس بنگالن نے صاف جواب دے دیا۔ اس کے چاہنے والوں نے اصرار کیا کہ وہ کیوں ایک غریب آوارہ لونڈے سے عشق کر رہی ہے۔ ہماری طرف دیکھ' ان فلک بوس عمارتوں کو دیکھ' ان کاروں اور تنکتی ہوئی ہیرے کی مالاؤں کو دیکھ' وہ شاعر تمہیں کیا دے گا' فقط چند شعر اور کچھ نہیں۔ اگر تم اس سے شادی کرو گی تو بھوکی مر جاؤ گی' وہ کماتا ہی کیا ہے' وہ خود بھوکا ہے تمہیں کیا کھلائے گا؟ اور وہ پھر بنگالی نہیں ہے' وہ پنجاب کی ایک نام نہاد ریاست کا باشندہ ہے۔ اپنے گھر رہو' اس کلکتہ میں رہو' یہاں ناچو گاؤ' لوگوں کو آرٹ بتاؤ اور زندگی کے دن اس ہنسی خوشی میں بسر کرتی جاؤ۔ اور بچارہ رگھبیر جب سے وہ کلکتہ سے واپس آیا ہے اس کا حلیہ بگڑ گیا ہے' عورت کی بیوفائی نے اسے بُری طرح اُداس کر دیا ہے۔ اب وہ ہر روز شراب پیتا ہے اور رات کے بارہ بجے گھر آتا ہے' وہ اپنے مستقبل کے متعلق بہت پُرامید تھا لیکن آج کل اس کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ اس کے دل کی ویرانی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ آج وہ کہہ رہا تھا کہ وہ بمبئی نہیں رہ سکتا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ شہر کی لڑکیاں اتنی چالاک ہوتی ہیں۔ وہ شملہ کی خوبصورت وادی میں اپنا مسکن بنائے گا' وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہ شملہ کی ایک انجان' الھڑ لڑکی سے شادی کرے گا۔ تیل اور نمک کی دکان کھولے گا۔ اسے فلمی دنیا سے نفرت ہو گئی ہے' اسے شاعری سے نفرت ہو گئی ہے۔ وہ زندگی کو دوبارہ شملہ میں نئے سرے سے جاوید کرے گا۔ وہ شملہ کے پہاڑوں کو بھول نہیں سکتا اور پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دھند کو فراموش نہیں کر سکتا اور اس کے ذہن میں اس الھڑ لڑکی کے نقوش اُبھر آتے ہیں جس نے اسے شہر جانے سے ایک بار روکا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دھند چاروں طرف سے ان کی طرف بڑھ گئی تھی۔ لڑکی کافی عرصہ تک رگھبیر کی طرف دیکھتی رہی اور رگھبیر اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر شہر چلا آیا اور اب وہ پھر واپس جانا چاہتا تھا۔ کیا وہ لڑکی اب بھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ شاید! کون کہہ سکتا ہے۔ کیا اس کی شادی

نہ ہوتی ہوگی کسی زمیندار کے ساتھ، کسی نمبردار کے ساتھ۔ ایسی حسین لڑکی کو کون کنواری رہنے دیتا ہے۔ شہری اور گاؤں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں دونوں میں چہرے، ہر جگہ ظلم ہے، ہر جگہ جہت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور ظلم و استبداد کی پھیلی ہوئی سیاہی انسانوں کے دلوں کو اور سیاہ کر دیتی ہے۔ آج کل رگھبیر روتا ہے، شراب پیتا ہے اور شعر لکھتا ہے۔ ——— بچارہ رگھبیر ———!

اوتار سنگھ بڑی عجیب شخصیت کا مالک ہے۔ یہ ایک سرکاری ڈپو میں نوکر ہے۔ صبح ۶ بجے گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کے ۸ بجے گھر گھر آتا ہے۔ وہ ایک ایسے ڈپو میں نوکر ہے جہاں جتنا زیادہ کام کیا جائے اتنی ہی زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ اور اس لئے اوتار سنگھ زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہتا ہے۔ وہ جناب کے ایک مالدار راجائی کا لڑکا ہے، وہ نہایت اچھا سوٹ پہنتا ہے، اور ہمیشہ ٹائی لگا کر دفتر جاتا ہے۔ اوتار سنگھ کہتا ہے کہ اسے آج کل ترقی ملنے والی ہے اور ترقی ملنے کی وجہ صرف اس کے صاف اور ستھرے کپڑے ہیں خاص کر اس کی نیلی ٹائی جو وہ خاص طور سے پسند کرتا ہے۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ اس سے بہت خوش ہے، اور ہمیشہ باقی کلرکوں کو لعنت ملامت کرتا ہے کہ تم کبھی اس سردار کی طرح کپڑے پہن کر آنا چاہئے۔ اوتار سنگھ کو رشوت لینے پر یقین نہیں ہے، وہ گوردوارے نہیں جاتا اور اکثر شیو سے داڑھی بھی صاف کرتا ہے لیکن اگر سکھوں کے متعلق کوئی مذاق کیا جائے تو وہ اسے بہت برا مانتا ہے۔ وہ سکھوں کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی سخت رجعت پسند ہے۔

آج کل وہ بھی زندگی سے تنگ آ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے ڈپو کی نوکری پسند نہیں، آخر کب تک آدمی دن رات کام کرے، ٹپہ کی کلرکی انسان کو غلام بنا دیتی ہے اور نوکری کتنی ذلیل ہے۔ پھاٹک سے اندر داخل ہونے کے لئے Identification card چاہئے۔ کارڈ دکھا کر اندر جانا پڑتا ہے، حاضری لگانی پڑتی ہے اور اگر کلرک کو ——— اس کی تنخواہ سے پیسے کاٹ لیتے جاتے ہیں۔ یہ زندگی نہیں دولت کی غلامی ہے، موت ہے اور پھر ان لمحوں میں کبھی بھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ کبھی تو انسان ہی بھر جنس سے، کبھی کسی عورت کی طرف مسکرا کر دیکھ لے، یا عورت ہماری طرف ہنس کر دیکھ لے۔ میں کہتا ہوں کہ اس فلیٹ کے رہنے والوں میں اتنی جنسی بھوک ہے کہ تم ان کی باتیں سن کر گھبرا جاؤ اور سوچنے لگو کہ یہ لوگ کس ملک کے باشندے ہیں؟ یہ انسان نہیں جنوں ہیں۔

تم نے بمبئی آنے کے لئے کہا ہے۔ آؤ بڑے شوق سے آؤ اور میرے پاس ٹھہرو۔ اگر برا نہ مانو تو میں تمہیں اپنے گھر کا نقشہ کھینچ دوں تاکہ تمہیں میرے پاس پہنچنے میں کوئی تکلیف نہ ہو اور تم یونہی ادھر اُدھر نہ بھٹکتے پھرو۔ سٹیشن سے اتر کر تو بس میں بیٹھ کر شیواجی پارک کا ٹکٹ لو، اور پھر ہام پوسٹ آفس کے سامنے ایک گلی ہے سیدھے اس گلی کی طرف مارچ کر دو۔ جو دوسرا مکان ہے اس کی طرف نگاہ، اٹھاؤ، تمہارا بلڈنگ کا نام پڑھ لینا، اور جس ہی تم داخل ہو گے تمہیں ایک پاگل آدمی کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ انسان اکثر دروازے کے باہر پڑا رہتا ہے۔ لوگ اسے پاگل کہتے ہیں لیکن میں نے کبھی اسے کوئی ایسی حرکت کرتے نہیں دیکھا جس سے میں یہ سمجھ سکوں کہ یہ شخص پاگل ہے۔ شریر آوارہ پھرتا رہتا ہے ایک پھٹی ہوئی پتلون پہنتا ہے۔ اس کے سر کے بال بکھرے رہتے ہیں اور ان میں مٹی کی تہہ جمی رہتی ہے مسلسل فاقوں کی وجہ سے یہ انسان کافی دبلا پتلا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کبھی بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اکثر چپ چاپ لیٹا رہتا ہے اور جب بیٹھے رہنے سے تنگ آ جاتا ہے تو سر کو جھٹک کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ کبھی نیچے مڑ کر دیکھتا ہے جیسے زندگی کا سرمایہ کہیں بھول آیا ہو۔ اس پاگل کے ساتھ تم ایک کتے کو دیکھو گے۔ کتا تمہیں دیکھ کر بھونکے گا۔ اس کتے سے گھبرانا نہیں۔ یہ کتا ہر نو وارد کو دیکھ کر بھونکتا ہے۔ اس کی تیز آنکھوں میں تم یاسیت کی جھلک پاؤ گے۔ اس کے جسم کو دیکھ کر آشیانہ بلڈنگ کے رہنے والوں کی بھوک کا اندازہ لگا سکو گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس گھر کا کتا بھوکا ہو وہاں کے رہنے والے خود کتنے بھوکے ہوں گے۔ یہ کتا ایک وفادار دیکھ کر تم سے گھل مل جائے گا اور پھر تمہیں دیکھ کر کبھی نہیں غرائے گا۔ پہلی منزل میں ایک یہودی ماسٹر رہتے ہیں، انہوں نے ایک طوائف کو پھانس رکھا ہے۔ میں نے اس لونڈیا کو اکثر روتے ہوئے دیکھا ہے۔ اکثر یہ عورت مسلاخوں والی کھڑکی میں بیٹھ کر ادھر اُدھر جانے والے لوگوں کو پریشان نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے

نقوش ۔۔۔

ہر ایک جوان لڑکی کے جسم سے مس ہو کر پیدا ہوتی ہے، ان سب لڑکیوں کی انگلیں ایک جیسی ہیں، ان کے کام، ان کے چلنے پھرنے کا انداز، ان کے دیکھنے کا انداز ایک ہی سے۔ وہ اکثر تمہاری طرف بار بار دیکھیں گی لیکن ان کی نگاہوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں جوانی میں لذت کا احساس ہو چکا ہے اگر ان لڑکیوں کی تربیت، ان کے ماحول، ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کو ایک نئی ترتیب دی جائے تو ممکن ہو سکتا ہے کہ یہی لڑکیاں آفت کا پرکالہ بن جائیں۔ اس سوتی ہوئی زندگی میں شعلہ بن کر چمکیں۔ گوان کا رنگ سیاہ ہے لیکن کیا ہوا۔ جوانی کو رنگ سے کیا نسبت ہے؟ دور کیوں جاؤ، پاس کے محلّے میں ایک لڑکی رہتی ہے جس کا رنگ ان مدراسنوں سے بالکل ملتا جلتا ہے لیکن اس کے حسن میں کتنی کشش ہے۔ اس کا اندازہ ہم ہی لگا سکتے ہیں یہ لڑکی اکثر سفید ساڑھی پہنتی ہے۔ کالی رنگت والی کو سفید ساڑھی بہت اچھی لگتی ہے۔ کالی رنگت اور سفید ساڑھی۔ سفید ساڑھی اور کالی رنگت۔ لڑکی کو ساڑھی پہننے کا سلیقہ آتا ہے۔ ساڑھی پہننے سے جسم کا ہر نقش ابھر آتا ہے اور ایسا معلوم پڑتا ہے کہ لڑکی ایک مصوّر ہے جو ساڑھی کو مصوّر کے برش کی طرح استعمال کرنا جانتی ہے ——— حسن بدلتا ہے، جوانی بدلتی ہے، ہر چیز بدل جاتی ہے لیکن لڑکی کا حسن اسی طرح قائم رہتا ہے۔

آؤ میرے قریب آؤ۔ وہ لڑکی آ رہی ہے، وہ وہ آ رہی ہے اور آشیانہ بلڈنگ کے سیکنڈ فلور کے رہنے والے بالکونی میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکی کے ہر قدم کی آواز، ان کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو رہی ہے، اور کبوتر ہوا میں پرواز کر رہے ہیں۔ ناریل کے پتّے ہوا میں جھوم رہے ہیں، سورج کی سنہری کرنیں بالکونی پر ناچ رہی ہیں۔ ساڑھی جسم سے چپکی ہوئی ہے، جسم کا ہر خط واضح ہے، پنڈلیوں سے اوپر رانوں سے بڑھ کر کولہوں کا منظر کتنا دلفریب ہے، مصوّر کو داد دو! اس کی انگلیوں کو چوم لو اگرچہ تم نہ سکتے ہو۔ نظر ٹھہر نہیں جاتی ہے، مگر پر زیادہ گوشت نہیں اور سینے کا پھیلاؤ چھاتیوں کا زیر و بم، اور سمندر لہریں مار رہا ہے۔ لہریں آتی ہیں، ساحل سے ٹکراتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں اور اوپر ایک چھوٹا سا خوبصورت چہرہ۔ چھوٹے چھوٹے پتلے ہونٹ اور کبھی کبھی زبان، ان مرمریں ہونٹوں پر پھرتی ہوئی ——— ہونٹ چمکتے ہیں جیسے سبز پتوں پر شبنم کے قطرے، نچلا ہونٹ کچھ کچھ کھلا ہوا، آنکھیں سیاہ، پلکیں جوانی کے بوجھ سے جھکی ہوئیں ——— یہ جانتے ہوئے کہ لوگ دیکھ رہے ہیں، لڑکی شرماتی نہیں۔ آنکھوں میں فتح ہے، کامرانی ہے، لڑکی کو احساس ہے کہ وہ اپنے حسن سے لوگوں کو مسحور کر سکتی ہے۔ وہ آگے بڑھتی ہے۔ ہری چند ایک آہ بھرتا ہے اور پھر کہتا ہے "مار ڈالا، مار ڈالا، ہائے مار ڈالا" اور چٹرجی کی ہنسی ——— جیسے مُردہ زندہ ہو گیا اور اوتار سنگھ کا جھک کر دیکھنا اور رگھبیر کا شعر پڑھنا "زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں" اور پھر سب کا جیسے ہٹ جانا اور کرسیوں پر بیٹھ کر گالیاں بکنا خدا کو، تہذیب کو، سرمایہ داروں کو، گورنمنٹ کو، ماں باپ کو، اور کمرے میں پاگلوں کی طرح چکر لگانا، چٹرجی کا کرسی میں دھنس جانا، اوتار سنگھ کا اپنی پگڑی اتارنا اور جیسے بے بود ہو بالوں میں کنگھی کرنا ——— اور میرا لڑکی کی طرف دیکھتے رہنا ——— حتیٰ کہ حسن آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور شباب کی خوشبو ہوا میں گم ہو جاتی ہے اور صرف گالیوں کی آوازیں مکھیوں کے بھنبھنانے کی طرح دماغ سے ٹکراتی رہتی ہیں "ابے او حرام زادے ماں کے پٹھے ——— تیری ماں کو لے جائیں..... ."

رامانند ساگر

آبِ حیات

"ہیضہ ہوگیا ــــــــــ"

اُدھر پھر قے کرنے کی مسلسل اور پریشان کن آوازیں۔

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ ساتھ والے کمرے سے کئی آوازیں آرہی تھیں۔ جنہیں میں بخوبی پہچان رہا تھا۔ کل سارا دن انہی لوگوں کے ساتھ ایک ہی لاری میں بیٹھ کر سفر کیا تھا۔ اس وقت یہ سب مسافر یہاں کیوں جمع ہو گئے ہیں ــــــــــ "آدھی رات ادھر، آدھی رات اُدھر۔ مکان کی پچھلی طرف واقع ہزاروں فٹ گہری گھاٹی میں سے دو آدھی بھیگی سرد ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی جسے یہاں کے لوگ "ڈھوڈو" کہتے ہیں۔ ہوا کی آمد پر چیل کا جنگل بھیانک آواز میں سیٹیاں بجانے لگ گیا تھا۔ دن کی روشنی میں نظر آنے والا دور نیچے بہتا ہوا دریا اب جنگل کی سیاہی میں گم ہو چکا تھا۔ البتہ پتھروں سے ٹکراتے ہوئے پانی کا مسلسل شور اس کی موجودگی کا ضامن تھا یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کئی ہاتھی ایک ساتھ چنگھاڑ رہے ہوں اور پھر بغل والے کمرے سے قے کرنے کی مسلسل آوازیں .....

میں جلدی سے اُٹھا۔ ماچس کی تیلی جلا کر چارپائی کے ساتھ پڑے ہوئے ٹرنک پر رکھی۔ ادھ جلی موم بتی کو جلایا اور تیلی بجھنے سے پہلے نہایت پھرتی اور کفایت کرتے ہوئے ..... سگریٹ بھی سلگالی۔ کمرے میں روشنی ہو جانے اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لگانے کے بعد اس ماحول کا خوف آور تاثر کسی حد تک دُور ہوا۔

بڑی بڑی منزلیں چھوڑ کر رکھے گئے تختوں کی دیوار کے اس پار سرگوشیوں میں باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"صاف ظاہر ہے کہ ہیضہ ہی ہے"

"کس غریب الوطنی میں موت آئی ہے"

"کشمیر دیکھنے کے ارمان بھی دل ہی میں رہ جائیں گے"

"یہاں کوئی ڈاکٹر ....."

ڈاکٹر کی بات کہنے والے پر مجھے غصہ آیا اور ہنسی بھی۔ یہاں ہجت میں ڈاکٹر ڈھونڈ رہا ہے۔ جہاں گنجی کے چار شکستہ سے مکان کشمیر جانے والی سڑک کے کنارے کھڑے ہوتے ہیں۔ رات کو اگر دو چار لاریاں یہاں پڑاؤ ڈال دیں تو کسبلیوں کے "محلۂ عروسی" کی مانند رات کی رات کے لئے یہ محلہ آباد بس جاتے ہیں۔ لیکن دن کے وقت اپنے مشیبوں اور ماکھیوں کی طرح دھوپ میں اونگھتے ہوئے کشمیر یا مجھوں کی طرف جانے والی موٹروں اور لاریوں کو ارمان بھری نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں اور ان کی خاک پی کر (جسے وہ کافی مقدار میں نہایت فیاضی کے ساتھ مفت میں معلق چھوڑ جاتی ہیں) اپنے دامن میں سمیٹے رہتے ہیں۔ یہاں پہ ڈاکٹر ——— تم لوگ خود ڈاکٹر کیوں نہیں بن جاتے۔

مجھے اچانک کچھ یاد آیا اور میں سامنے کونے میں پڑے ہوئے سامان میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ سامان اس بے ترتیبی سے ایک دوسرے کے اوپر گڈمڈ کیا گیا تھا کہ مجھے کم بخت مزدور پر غصہ آنے لگا۔ میں نے جلدی سے ایک چھوٹی سی صندوقچی اٹھائی اور صحن والے کمرے میں چلا گیا۔

"ہٹو۔ ہٹو۔ ایک طرف ہٹ جاؤ۔ کیوں گھیر رکھا ہے مریض کو"

سب لوگ چھٹ گئے۔ بے ترتیب کپڑوں۔ پریشان بالوں اور ایک ننھی سی صندوقچی کے ساتھ آتا ہوا اس وقت میں کوئی ایمرجنسی کیس کرنے والا ڈاکٹر نظر آ رہا تھا۔

"میں نے کلائی پر ہاتھ رکھا۔ بخار ہو رہا تھا۔

"کتنی مرتبہ قے ہوئی"

"چار دفعہ"

"اور دست"

"یہی کوئی دو تین دفعہ"

"تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ ابھی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ میں نے طفل تسلی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ اور اس صندوقچی میں سے سوم رس نکال کر چند قطرے اسے پلا دئے۔ سن رکھا تھا کہ ہر بیماری میں کارآمد شے ہے اور پھر اس کام کے لئے تھی بھی یہی ایک چیز میرے پاس۔ لمبے سفر اور خصوصاً پہاڑوں پر آتے جاتے وقت یہ صندوقچی ضرور ساتھ رکھنا ہوں جس میں برانڈی۔ پیرٹ۔ آئیوڈین۔ چرن۔ سوم رس وغیرہ چند معمولی دواؤں کی شیشیاں اور پٹی کرنے کی روئی کے گالے دھرے رہتے ہیں۔ کئی مرتبہ میرے دوست اس کا مذاق اڑا چکے ہیں اور اسی لئے کبھی کبھی مجھے ڈاکٹر بھی کہنے لگتے ہیں۔ لیکن اس وقت تو اگر ایک ہزار بار بھی میں اس صندوقچی کو لمبے سفروں پر یونہی بیکار اٹھائے گیا ہوتا تو اس کا صلہ مجھے اس ایک رات میں مل گیا ——— میں نے اسے بچا لیا تھا۔

اس وقت وہ میرے سامنے چارپائی پر قریب قریب بے سدھ پڑی تھی۔ دوسرے تمام مسافروں کو میں نے کمرے سے نکال دیا تھا اور اس کی ماں چارپائی کی پٹی پکڑے پرلی طرف بیٹھی مجھ پر سے صدقے واری ہو رہی تھی۔

"تم نے جو احسان مجھ پر کیا ہے۔ عمر بھر نہ بھولوں گی۔ میں اکیلی عورت ذات اس بیاباں میں کیا کرتی۔ اور پھر صرف ایک مہینہ رہ گیا ہے اس کی شادی کو ——— اس کے سسرال والوں کو کو کیا منہ دکھاتی۔ تم نے میری لاج رکھ لی بیٹا ———"

اور وہ اپنا پورا پروگرام سناتی چلی گئی کہ کس طرح اس نے سوچا تھا کہ "چلو شادی سے پہلے اسے ایک بار کشمیر کی سیر ہی کرا لاؤں ——— ایک مت سے کہہ رہی تھی۔ اور اس طرح لگے ہاتھوں خود بھی امرناتھ کا تیرتھ کر آؤں گی" اور اس نے آپ ہی آپ یہ طے بھی کر لیا کہ اب میں بھی کشمیر میں انہی کے ساتھ رہوں گا۔ وہ اپنی باتیں کئے گئی اور شاید مجھ سے بھی اس نے چند سوال پوچھے۔ جن کے جواب میں میں نے بھی لاشعوری طور پر پریشٹ پشٹ کچھ نہ کچھ کہہ دیا۔ لیکن میرے تو حواس خمسہ کا اجتماع گویا صرف آنکھوں میں ہو گیا تھا..... آنکھیں، جو اس حسن نیم خوابیدہ کے مرمریں مجسمے کو جیسے نگلے جا

رہی تھیں۔

سارا دن ہم لاری میں بیٹھے بیٹھے اس کی طرف نگاہ بھر کر ایک دفعہ بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ اس کی ماں کا ڈر تھا۔ یوں بھی اگر ذرا سی کوئی بات ہو جاتی تو ساتھی مسافر کیا کہتے اور پھر میں اکیلا ——— وہ سب لوگ جو خود اُسے بار بار اس طرح تاک رہے تھے۔ جیسے کچا ہی چبا جائیں گے۔ اور ضرور کے مسافر اُس کو اسے دیکھ دیکھ کر کس طرح انگڑائیاں آ رہی تھیں۔ وہی سب لوگ ذرا سی بات اُٹھنے پر اپنی شرافت و نجابت کا ثبوت دینے کے لئے مجھے کس کس طرح نہ ڈانٹتے۔ اور ——— لیکن لاری ہی میں اس بکل کے کونے نے نہ صرف میری آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ بلکہ ایک مرتبہ جب مجھے احساس ہوا تھا کہ میرے پاؤں کے نیچے کچھ نرم نرم سی شے مسلی جا رہی ہے اور جب میں نے جھک کر دیکھا تھا تو وہ اُسی کا پیر تھا۔ تو اس بکل کی رو میں ایک مرتبہ میری رگ رگ نے ایک زبردست دھچکا پہنچایا تھا ——— اور اس وقت تو اس کے جسم سے چھو جانے پر آنے والی جھرجھری کی لذت کو بار بار محسوس کرنے کیلئے جس گھڑی گھڑی اس کی جنس دیکھ رہا تھا۔ اُسے ہاتھ لگاتے ہی یوں محسوس ہوتا۔ گویا برقی رو کی حد سے کوئی میرے خون کو بلو رہا ہے اس کی ماں ابھی تک پوری طرح شکریہ ادا نہ کر پائی تھی "تمہیں تو شاید بھگوان نے میرے لئے ہی ....."

میں نے ایک مرتبہ پھر صندوقچی کھولی اور سوم رس کے چند قطرے پانی میں ملا کر اسے پلا دیئے۔

دوسرے دن ہم سب لوگ لاری میں بیٹھے ہوئے پہاڑوں اور پر ہول گھاٹیوں کے درمیان چکر کاٹتے چلے جا رہے تھے۔ وہ میرے سامنے والی سیٹ پر اپنی ماں کے ہمراہ بیٹھی ہوئی تھی۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح اس وقت بیٹھی ہوئی ہے۔ لیکن اس روز آپس میں اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی تھی۔ جتنی آج ہے آج تو ..... بس صرف دس دن کا فرق ہے اور ان دس دنوں میں کیا کچھ نہیں ہو گیا۔ اس روز کشمیر جانے والی لاری میں بیٹھی ہوئی ایک جوان لڑکی اپنی جان بچانے والے محسن سے کوئی بات بھی کرتی تھی تو اپنی ماں کو مخاطب کر کے، اور آج ——— واپس جموں آتی ہوئی ایک لاری میں وہی لڑکی ماں کی آنکھ بچا کر کبھی اس کے پہلو لے لیتی ہے۔ کبھی لاری کی کھڑکی میں سے باہر بازو نکال کر اس سے پنجہ ملا لیتی ہے اور کبھی ایک لمحہ بھر کے لئے آنکھوں سے آنکھیں ملا کر مسکراتی ہوئی سر جھکا لیتی ہے۔ ہم کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے ہیں محض دس دن میں .....

"ابھی کتنی دیر میں جموں پہنچیں گے ہم ———؟" اُس نے اچانک سوال کیا۔

"بس ۳۵ میل تو رہ گیا ہے کوئی ایک گھنٹہ لگے گا اور ——— " اور ساتھ ہی اُسے چڑانے کے لئے کہہ دیا ———

"اتنی سی دیر کے لئے اب اداس کیوں ہوئی جا رہی ہو۔ بس آیا ہی سمجھو گھر۔ پھر مل لینا سہیلیوں سے، جتنا جی چاہے ———"

اُس نے منہ موڑ لیا اور توی کی گھاٹی کے اس پار سلیٹ پتھر کے نیلے نیلے سے پہاڑ کو دیکھنے لگ گئی۔ آنکھوں کے کونے بتا رہے تھے کہ کس بُری طرح چوٹ کھائی تھی اس فقرے سے ——— میں بھی باہر کی طرف دیکھنے لگا اور سڑک کے پیچ و خم میں اُلجھ کر میرے خیالات کا سلسلہ پھر سلجھ گیا۔ میں پھر سوچنے لگا۔ آج سے دس دن پہلے بھی قریب قریب یہی وقت تھا۔ جب اُس نے ایسا ہی ایک سوال پوچھا تھا۔

"ابھی کتنی دیر میں کشمیر پہنچیں گے ہم ———؟"

لیکن اس دفعہ یہ سوال اپنی ماں کو مخاطب کر کے پوچھا گیا تھا۔ گو جواب کی توقع مجھی سے تھی اور پھر ..... کشمیر پہنچ کر کس طرح آہستہ آہستہ یہ تکلف و ادبیاں اُٹھ گئیں۔

"آپ کی بیوی نو جبت خوبصورت ہوگی" کس انداز سے پوچھا۔ گویا اس فقرہ میں لپیٹ کر مجھے یہ بات کہی ہو کہ آپ تو کسی کے لئے ریزرو ہو چکے ہیں چنانچہ ہم کو ذرا ایسے پیار سے .....؟ کس نے بتا دیا اس کم بخت کو۔ اس کی ماں نے اس ہیضہ والی رات جانے کیا کیا باتیں مجھ سے کرتے کرتا

لی تھیں اور کیا اسی لئے مجھ سے پوچھی گئی تھیں کہ سب کچھ اسے بتا دے۔ کہاں گئی وہ حرافہ پوچھوں تو ذرا اس سے .....

لیکن وہ تو اس وقت امرناتھ کی باتیں کر رہی تھی۔ اس تسلی بخش خیال سے مطمئن ہو کر کہ لڑکی اور دوسرے بچے نہایت محفوظ اور معتبر ہاتھوں میں چھوڑ آئی ہوں اسے مجھ پر کچھ جلدی یقین ہو گیا تھا ——— جانے وہاں ہیضہ ہوا تھا بھی یا نہیں۔ لیکن اس وقت چند قطرے دوا کے پلا کر میں اس کے لئے بمنزلہ مسیحا کے ہو چکا تھا۔ چنانچہ کیا کیا واسطے دیکر مجھے اپنے ساتھ ہی ٹھہرنے پر مجبور کر لیا گیا تھا۔ چلو، مجھے بھی تو آخر پردیس میں روٹی دودی کی ضرورت تھی ہی۔ غنیمت سمجھا۔ لیکن اب اس پر ستم یہ .....

"تمہیں بتاؤں بیٹا کہ میں اکیلی عورت ذات۔ ان بچوں کو ساتھ لئے ان پہاڑوں میں کہاں ٹکریں مارتی رہوں گی۔ تمہیں بھی جب یہیں ٹھہرنا ہے تو کیا حرج ہے بس چار دن تو مجھے لگیں گے کل ۔"

"اچھا بچے چھوڑ جائیے۔ لیکن جندر و کو تو ساتھ لے جائیے۔ برف کے پہاڑ دیکھ آئے گی ۔" میں نے بھی اسے اسی نام سے بلانا شروع کر دیا تھا جو غالباً اجندر کماری کا مخفف تھا۔

"اوئی بیٹا! تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ میں اکیلی عورت ذات۔ جوان لڑکی ساتھ لے کر کہاں ماری ماری پھروں گی۔ پھر سنا ہے کہ امرناتھ کے راستہ میں ایسی ایسی بوٹیاں بھی ہیں۔ جن کی خوشبو سے کمزور آدمی بیہوش بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر سچ تو یہی خیال تھا کہ ساتھ لے جاؤں گی۔ لیکن جب تم سادھو مل گیا تو خیال بدل گیا۔ اب جان بوجھ کر خطرہ کیوں مول لوں ۔"

عجب عورت تھی۔ جیسے میں دیوتا نظر آ رہا تھا۔ جو اس کی جوان لڑکی کی حفاظت کرے گا اور جس دیوتا کے درشن کرنے وہ جا رہی تھی۔ پھر وہ کیا تھا؟ ہم ہندو لوگ اپنے ویدوں اور پرانوں کی کتھائیں سن کر انہیں سمجھتے کیوں نہیں۔ کیا وہاں صاف نہیں لکھا ہوا کہ اگر انکا جنسی تعلق منظور نہ ہو تو سگے بہن بھائی کو بھی کبھی خلوت میں یکجا نہ ہونے دو۔ ایک روایت کے مطابق تو خود دھرم راج یدھشٹر کا دل اپنی سگی ماں کے خوبصورت بال دیکھ کر میلا ہو گیا تھا ——— اور میں تھا دیوتا ——— !

میری طرف سے جتنا انکار بڑھا۔ اتنا ہی اسکا اصرار بڑھ گیا۔ شاید میرے پہم انکار کے باعث اس کا یقین اور پختہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ میری کوئی پیش نہ گئی ۔

امرناتھ کے جاتریوں کے واپس آنے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا میں نے ہیری والے مذاق کا جواب ڈھونڈ لیا تھا ۔

"تمہارا دولھا ہو گا کوئی بڈھا کھوسٹ۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت ۔ بڑے پوپلے پوپلے منہ سے باتیں کیا کرے گا تم سے ....."

میں اور بھی کتنی ہی باتیں کہتا۔ اور وہ خوب سٹپٹاتی۔ لیکن ارے ——— اس کی آنکھوں میں پانی ڈل ڈل چھلکنے لگا۔ اس سے پیشتر کہ میں کوئی کلمہ حیرت منہ سے نکالوں۔ اس نے جلدی سے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا ۔

"ارے سوئی آنکھوں میں اتر جائے گی ۔"

میں نے گھبرا کر اس کی انگلیوں سے کشیدہ کی سوئی چھیننے کو ہاتھ بڑھایا۔ وہ پرس میں لگا ہوا میز پوش پھینک کر جلدی سے اٹھی اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ یہ ہو گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ سسرال اور دولھا کے متعلق باتیں کرنے سے لڑکیاں شرماتی ہیں ۔ روتی نہیں ۔

میں نے اس کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے اس کی پیٹھ کو تھپتھپایا ۔

"کیا ہوا۔ آخر کچھ بولو بھی ——— بھئی یہ رونا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ کچھ ہو بھی۔ کہ یونہی آدمی بات بے بات روئے جائے ۔ اگر

کوئی غلطی ہوگئی ہو تو بھی معافی مانگ لیتے ہیں۔ ادھر دیکھو۔ ہم ہاتھ جوڑ دیتے ہیں"

اور میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ بڑھایا اور میرے ہاتھوں کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے وہی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا اور پھر بازو سے کھینچ کر اسے سیدھا بٹھا لیا۔

"آخر ہوا کیا ——— کچھ کہو گی بھی ——— کہ بس ———!" میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ———" اُس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ اس کا رنگ اتنی ہی دیر میں سفید ہو گیا تھا اور چہرے پر کچلے ہوئے آنسوؤں کے نشان اس طرح تھے۔ جیسے چنبیلی کا کوئی پھول شبنم کے کسی آوارہ قطرے سے لتھڑ جائے۔ میرے آجانے پر وہ بڑی گھٹی گھٹی سی سسکیاں لے رہی تھی ——— کس بُری طرح وہ طوفان کے سامنے بند لگانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں۔ کچھ تو ہے۔ مجھے تم پرایا سمجھتی ہو۔ تبھی چھپاتی ہو۔ میں آج ہی چلا جاؤں گا اور کہیں ———"

طوفان رُک نہ سکا۔ بند خشخاش کے پہاڑ کی طرح ٹوٹ گیا۔ بے قابو ہو کر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور آنسوؤں کا یہ عالم کہ ایک مسلسل دھار کی صورت میں ڈھلتے ہی چلے آتے تھے۔ آخر میں کہاں تک برداشت کرتا.....

وہ شام بڑی بے چینی سے کٹی۔ بار بار اس کی بیان کردہ کہانی ذہن میں گھوم جاتی اور کہانی ہی کیا تھی۔ اُسے ایک ایسے شخص سے بیاہا جا رہا تھا جس کے بچوں کے آگے بھی بچے تھے۔ ہونے والے خاوند کے نام کا تو اسے علم نہ تھا۔ لیکن وہ رہنے والا میرے شہر سے بیس میل کی دوری پر واقع ایک قصبہ کا تھا۔ مگر اُسے خیال کیا یقین تھا کہ اُسے اس مقام کا پتہ بھی غلط بتایا گیا ہے اور کہ اس کی سسرال کہیں مہذب دنیا سے بہت دُور ہے۔ جہاں دن رات جھلسا دینے والی لُو چلتی ہو گی اور جہاں پیاس بجھانے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہ ہو گا۔ اور.....

اس کی بپتا نے میرے ذہن کو اپنے گھریلو واقعات کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ ہمارے پڑوس میں رہنے والی وہ چتر دل۔ ظالم۔ سوتیلی ماں اور پھر مجھے اپنے پچاس سالہ بڑے بھائی کا خیال آیا۔ جنہوں نے والدین کی موت کے بعد مجھے اپنے لڑکوں کی طرح پالا تھا حتیٰ کہ میں مرنے والی بھابھی کو ماں کہا کرتا تھا اور جو اس وقت جبکہ انہیں میرے اور اپنے بچوں سے دل بہلانا چاہئے تھا۔ کسی نئی لڑکی کی تلاش میں تھے۔ اس لڑکی کے جذبات بھی کیا چنبیلی ہی کے مانند نہ ہوں گے اگر انہیں دُوسری شادی ہی کرنا ہے تو کیوں نہیں وہ اپنی کسی ہم عمر اور بیوہ عورت سے شادی کرتے جن کے دو اڑھی لڑکیوں کے چہروں پر کیوں آنسو کچلے جاتے ہیں اور پھر مجھے اپنے ننھے بھتیجوں کی ہونے والی سوتیلی ماں پر ترس آنے لگا..... لیکن یہ سوتیلی مائیں تو روایتاً ظالم ثابت ہوتی ہیں..... شاید اپنے اوپر کئے گئے ظلم کا انتقام وہ مرنے والی سوتن کے ننھے بچوں سے لیا کرتی ہیں انتقام کا انہیں حق ہے لیکن..... مجھے اپنے پڑوسی کے ننھے ننھے بچوں کے بدن پر چھپکیوں کی مار کے اُبھرے ہوئے نشانات یاد آنے لگے۔ جنہیں میری مرحوم ماں آہستہ آہستہ سہلایا کرتی تھی اور میرے بسکٹ انہیں کھلا دیا کرتی تھی۔ گو ان دنوں میرا بچپن تھا لیکن انہیں دیکھ کر مرحوم کی آنکھوں میں چھلک جانے والے آنسو مجھے ابھی تک یاد ہیں ——— مجھے سوتیلی ماؤں سے نفرت ہے۔ یہ جذبہ، جو آج یوں بلک رہی ہے چند ہی دنوں میں یہ بھی ایک سوتیلی ماں بننے والی ہے ——— وہاں ہی جذبہ کے تئیں نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے لیکن ——— اس کا وہ نئے انتظام لپٹ جانا ——— بدن میں ایک جھرجھری سی سرایت کرتی محسوس ہوئی۔

صبح اس کی ماں کو آنا تھا۔ رات بھر ہم سو نہ سکے اور باتیں تھیں کہ ختم ہی نہ ہو پاتی تھیں۔

لیکن جذبہ۔ ایک بات ہے کہ ہم نے کچھ اچھا نہیں کیا:

"تو کیا ہوگا نہ کس تدبیر سے باکی تھی ——— اور کتنی طمانیت، پشیمانی کا شائبہ تک نہ تھا۔

اور پھر ایک طاقت ور لنگر کی طرح اس کے دل کی ایک ایک بار کی کو فغاں کرنے والی اس کی باتیں.....

"دراصل میں تو یہاں امرت کی تلاش میں آئی تھی۔ وہ امرت جو کسی کی زندگی کے لئے آبِ حیات کا کام دے سکے۔ لیکن اس زندگی کی حسرتوں کے لئے آبِ حیات ہو۔ تاکہ وہ حسرتیں مرنے والی رُوح کے دل میں بھی کانٹا بن کر رہ جائیں ——— اب کے بیاہ کے سلسلہ میں میرے ماں باپ نے جو میرے سسرال والوں سے بہت سے روپے وصول کئے تو سالہا سال کی تنگدستی سے ایک دم کے لئے چھٹکارا ہوا مدت سے سُن رکھا تھا کہ کشمیر جنت نظیر ہے۔ دل نے کہا۔ چند ہی دنوں بعد جہنم میں جانا ہی ہے۔ کیوں نہ ایک مرتبہ جنت کا نظارہ کر لیا جائے! ایسے مقام میں دل پر حسرتوں کے ہر نقش بیٹھیں گے وہ زیادہ گہرے اور پائندہ تر ہوں گے اور ماں بھی امرتا تھ کے درشنوں کے لالچ سے چلی آئی ——— کیا پتہ تھا کہ اس وادی میں تم مجھے وہ آبِ حیات پلاؤ گے ——— اب میں اس اطمینان کے ساتھ تو شادی کی موت کے گھاٹ اُتر سکوں گی۔ کہ ایک رات ہی کے لئے سہی۔ مگر میں نے زندگی پائی تو.....

میرے دل نے چاہا تو تھا کہ اس کے ساتھ ابھی اسی وقت شادی کر لوں اور کہہ دُوں کہ ——— چاہے تو اب نہا بھی لے آبِ حیات سے" پھر اسکا جوبن بھی کیا گدرایا ہُوا ہے اس وقت ——— جوانی کے مارے حسن پھٹا پڑتا ہے۔ لیکن میری بیوی ——— اس کا بھی تو یہی عالم تھا کسی دن۔ تین چار بچے کیا ہوئے کہ بس یوں ہو گئی جیسے ——— اس کے بھی جب بچے ہو جائیں گے تو اس کی بھی وہی حالت نہ ہو جائے گی؟ اور یوں بھی ہمارے سماج میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسی جوبن اور حسن سے مالا مال لڑکیاں ان ادھیڑ رنڈوے کھوسٹوں سے بیاہی جاتی ہیں جو مہذب دنیا سے دُور ان مقامات میں رہتے ہیں جہاں دن رات جھلسا دینے والی لُو ہی چلتی ہے اور جہاں پیاس بجھانے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی میسّر نہیں آتا ——— تو اکیلا میں کس کس کو آبِ حیات پلاتا پھروں ... .

اچانک ایک دھچکے کے ساتھ لاری کھڑی ہو گئی۔ گذشتہ دس دن کے واقعات کا جو فلم میرے ذہن میں چل رہا تھا۔ اس کا جیسے ایک دم سے فیتہ ٹوٹ گیا۔ فلم ٹوٹ جانے پر سینما حال میں جیسا بے ہنگم سا شور مچ جاتا ہے کچھ اسی طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"کوئی محصول والی چیز تو نہیں آپ کے پاس" ——— کسی نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں کوئی نہیں ——— یہ کون سی جگہ ہے" میں نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"جموں کی محصول چنگی ——— اور وہ شخص اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی سواریوں کی طرف متوجہ ہُوا۔

"آپ تو ایسے سوئے ہیں اودھم پور سے کہ بس، یہاں تک تو کچھ ہوش ہی نہیں" جندر و مسکراتی ہوئی کہنے لگی۔ میں نے مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔

اتنے میں چنگی والوں کا ایک سواری سے جھگڑا ہو گیا۔ یہ لوگ محصول چنگی مانگ رہے تھے اور وہ بیچارا کہتا تھا کہ "میں نے اسی لاری میں جموں سے آگے نکل جانا ہے تو یہاں محصول چنگی دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا"

"ہم کچھ نہیں جانتے۔ اگر آپ دوسرے راستہ سے نکلیں گے تو وہاں کے محرر چنگی سے رسید لے آیئے گا۔ ہم محصول واپس کر دینگے"

"میں وہاں لاری چھوڑ کر پھر واپس آؤں۔ یہ کیسا ظلم ہے۔ کیا آپ کا یہی قانون ہے؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے۔ محصول دیجئے جلدی سے" وہ بیچارا مدعا طلب نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"ریاست میں کیا کیا ظلم قانون کی آڑ میں نہیں ہوتے۔ چھوڑیئے اس قصّہ کو۔ یہ جرمانہ تو بھرنا ہی ہو گا" اس کے ساتھی نے کہا۔ اسنے مجبور ہو کر ایک روپیہ ادا کر دیا۔ جو غالباً ریاستی خزانہ کی بجائے محرر کی جیب میں داخل ہو گیا ہو گا۔

لاری پہاڑی علاقہ چھوڑ کر میدان میں داخل ہُوئی۔ حدِ نظر تک پھیلے ہُوئے چپٹے کھیتوں میں ہریاول لہلہا رہی تھی۔ مغرب میں ایک چمکدار

سُرخ رنگ کے بادل کا ٹکڑا ڈوبے ہوئے سورج کا پسماندہ نشان رہ گیا تھا۔ جندرو کی ماں اپنے بچّوں کے کوٹ وغیرہ ٹھیک کرنے لگ گئی تھی اُن کا شہر نزدیک آ رہا تھا۔ وہ کتنی خوش تھی۔ وہ امرناتھ کا تیرتھ کر آئی تھی۔ جہاں بھگوان شنکر نے پاربتی کو امر کتھا سُنائی تھی۔ یعنی ایک طرح کا آبِ حیات پلا دیا تھا جس کے چند چھینٹے دو کبوتروں کے حصّہ میں بھی آ گئے تھے۔ وہ ابھی تک وہاں رہتے ہیں۔ وہ بھی ان کبوتروں کے درشن کر آئی تھی۔ جن پہ آبِ حیات نے اثر کیا تھا اور خود اس کی لڑکی ..... تیرتھ میں تمام گذشتہ گناہوں کے دھل جانے سے اس کی آتما کتنی ہلکی ہو گئی تھی اور اب وہ کس طمانیت قلب سے لڑکی کی شادی کا ثواب حاصل کرنے جا رہی تھی .....

لاری کو ایک اور دھچکہ لگا۔ سیالکوٹ آ گیا تھا ——— میں نے انہیں تانگے میں بٹھا دیا۔ اس کی ماں نے جندرو کی شادی پہ آنے کا جو وعدہ لیا تھا اُسے پھر لپکا کرنے لگی۔

میں انہیں چھوڑ لاری میں قدم رکھنے ہی لگا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"منوہر ———"

مُڑ کر دیکھا تو جندرو تانگے سے اُتر کر میری طرف آ رہی تھی۔

"آپ کا فاؤنٹن پن رہ گیا ہے لیتے جائیے" اُس نے اونچی آواز میں کہا۔

مجھے یاد تھا اپنا قلم۔ میں تو جان بوجھ کر اس کے پاس چھوڑے جا رہا تھا۔ لیکن ——— فاؤنٹن پن کا تو محض بہانہ تھا۔

"شادی پر آنے کا وعدہ پھر لپکا ہے نا ———" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"بالکل لپکا ———"

"میری آنکھوں کی طرف دیکھئے ———" میں نے دیکھا۔

"یہ تب تک راہ میں بچھی رہیں گی ———"

گھر پہنچ کر حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ بیوی میری عدم موجودگی میں محسوس کرتی رہی تھی کہ بھیّا جنہیں میں بابو جی کہا کرتا تھا۔ کسی خاص تیاری میں منہمک ہیں۔ میں نے بھی ٹاٹا۔ غالباً وہ چوری چھپے کہیں شادی کی بات پکّی کر رہے تھے اور یا پھر کر چکے تھے ——— مجھے سخت صدمہ پہنچا اور کوئی بہانہ کر کے اس موقعہ پہ گھر سے چلے جانے کی سوچنے لگا۔ اپنے افسر سے کہا کہ فرنٹیئر میں کہیں تبدیلی کر دو۔ جنگ کے زمانہ میں کوئی کلرک خود ہی فرنٹیئر جانے کے لئے کہے اور پھر فوجی محکمہ ——— افسر کو اور کیا چاہئے تھا۔ ہفتہ بھر کے اندر اندر تبدیلی کا حکم آ گیا۔

اس تبدیلی سے مجھے سب سے بڑا افسوس اس بات کا ہوا کہ میں وعدہ کر کے بھی جندرو کے پاس نہ پہنچ سکا۔ اگر میں اپنے ہی شہر میں ہوتا تو کبھی رفت نکال کر اس کے سسرال ہو آیا کرتا۔ لیکن میں اپنے شہر میں بھی تو نہ رہ سکتا تھا۔ اگر بابو جی کو شادی کرنا ہی تھی تو برات کے موقعہ پہ اپنے بچّوں کی شکل تک دیکھنا اُن کے لئے بدشگونی ہوتا۔ یہ ظلم کون اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔

کوہاٹ میں بھی میں اس روز کا منتظر رہا۔ جب گھر سے کوئی بلاوا آئے تاکہ اسی بہانے جندرو کے قصبہ تک جانے کا موقع ملے پہنچ اس روز صدشکر کیا۔ جب شادی کے عین نو ماہ بعد نئے بھتیجے کی آمد پہ گھر سے بلاوا آیا۔

واپس آتے وقت اپنے سٹیشن پہ گاڑی سے اترنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ صرف ایک ہی سٹیشن آگے ——— اور جندرو کا قصبہ ——— لیکن بچّے جو ساتھ تھے اور پھر نئی بھابھی ——— بابو جی پہلے ہی لکھ چکے تھے کہ ہماری نئی بھابھی کے خیال میں

شادی کے موقع پر گھر بندہ کر میں نے ہی اظہار نفرت کی ابتدا کی تھی.....

جلدی سے آگے بڑھ کر میں نے نئی بھابھی کے پیر چھوئے۔

"خوب وقت پر آئے ———" کتنا کٹیلا اور طعن آمیز تھا فقرہ۔ آخر بوڑھوں کی ان نوجوان بیویوں کے دل اس طرح پتھر کے کیوں بنے ہوتے ہیں۔ پہلے بچوں کے لئے ان کی زبان پر دعا یا شیر باد کا لفظ کس مشکل سے آتا ہے۔ چلو میں شادی کے موقعہ پر کھسک ہی گیا تو کیا اس کے لئے اتنا.....

میں نے نفرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا..... سامنے جندرہ کھڑی تھی۔

اُس کی نگاہیں ——— یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کسی کو ذبح کر کے اس کی لاش کو آب حیات کے تالاب میں ڈال دیا گیا ہو.....

آغا بابر

باجی ولایت

. . . . . عورت اچھی بھلی حالت میں وہ کچھ کر سکتی ہے جو مرد سنے میں بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے جو جو کچھ لاہور میں ہوتے دیکھا ہے زبان پر نہیں لا سکتا۔ اتنی بدحواسی ہے وہاں کہ خدا بچائے۔" یہ الفاظ جیسے نواز کے خون میں سرایت کر گئے تھے۔ خون جب دل کے پاس سے گذرتا تپکے سے یہ الفاظ دل کے کان میں کہہ جاتا اور نواز سوچنے لگتا ــــــ

دفتر والوں نے آج نیا نیا وقت لاہور کی باتیں سننے میں صرف کیا تھا اور ظہیر جو کوئٹہ سے ایک سال کے لئے ڈپوٹیشن پر لاہور بھیجا گیا تھا، لاہور کی باتیں سناتا رہا تھا۔ "وہ تو ایک شہر ستانِ حسن ہے۔ وہاں کی جلوہ افروزی اور نمائش کی فراوانی کا نظارہ کرنے کے بعد آنکھوں میں کوئی اور شہر نہیں بچ سکتا۔ پلے ہوئے گدرائے گداز سانولے بدن، بھاری بھاری زنیتی رنگ کے چہرے، جھکی جھکی آنکھیں اور سینے پر بٹے ہوئے دوپٹے کا چڑا ہوا جھیرا دل کو سینے میں جھکولے لگتا ہے اور پھر خود نمائی اور عریانی کی کئی جھلی جھرکتیں اپنی بے عنانی اور بے تکلفی میں اتنی فزوں تر ہو جاتی ہیں کہ شباب کی للکار سن کر قدم تھم جاتے ہیں۔" اس نے مزے لے لے کر بہت کچھ کہا، احباب نے چٹخارے لے لے کر سنا۔ مگر نواز پریشان باتوں کا چنداں اثر نہ ہوا۔ ہاں ظہیر کچھ باتیں ایسی ضرور کہہ گیا تھا جو اس کے سینے پر بوجھل پتھر بن کر رہ گئی تھیں۔ مثلاً جب اس نے مولانا سے خطاب کر کے کہا تھا، "مولانا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ عورت پر ابھی بندشیں ہیں۔ اس کی راہ میں رکاوٹیں ہیں۔ اسے بچپن سے کہا جاتا ہے سر پر دوپٹہ لو، سینہ ڈھکو، یہ کرو وہ نہ کرو تو یہ عالم ہے۔ اگر یہ بندشیں بھی اٹھ جائیں تو عورت جسے مقدس کہتے کہتے آپ کا منہ سوکھتا ہے آپ کے سامنے ننگی ہو کر ناچے۔" کیا یہ ظہیر کی زیادتی نہ تھی؟ ــــــ نواز کروٹ بدل کر سیدھا لیٹ گیا۔ سیمبل کا تکیہ سر کے نیچے سے کھسکا تو اس نے اسے اٹھا کر کے سر کے نیچے دے دیا۔ اس نرم لمس کے احساس نے جیسے جذبہ سوئی ہوئی یادوں کو جھنجھوڑ دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چھت کی ایک کڑی اس کے سینے پر آن گری ہے جس سے وہاں پڑی ہوئی برف مل مل ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور وہ ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر نیچے رکھتا جا رہا ہے۔ وہ خود بھی تو ایک سنگریزہ ہی تھا۔ کہیں ادھر اُدھر پڑا ہوا۔ جسے جو چاہے اٹھا لے اور جس کو پسند آیا تھا اس نے اٹھا لیا تھا۔ اس کا بچپن ماں باپ کے سایہ میں نہیں بلکہ اپنے بڑے بھائی کے گھر میں گذرا تھا جس نے اپنے دو چھوٹے بھائیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ لڑکوں کی خوشامدیں کر کے انہیں نوکر کرایا اور پھر شادیاں بھی کیں اور

خوب صورت، جوانیاں دولہائیں۔ مہر مادری اور شفقت پدری کی محرومی کا اس کی ذہنی نشوونما پر اثر انداز ہونا ایک لازمی بات تھی۔ وہ بچپن میں اپنے ہمجولیوں سے بہت کم کھیلتا تھا۔ زیادہ تر اپنی بہنوں کے گھٹنوں کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہتا۔ بازار سے سودا سلف لا دیتا یا اپنے بھائی کے بچوں کو کھلاتا رہتا۔ بھائی اور بھاوجہ دونوں اس کی اس برخورداری پر بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ اور بھی پھولتا اور جب بھابی سے ملنے ملانے والیاں آتیں تو وہ سارا سارا دن ان کی خدمت میں بیٹھا رہتا۔ اسے عورتوں کی صحبت اچھی لگتی تھی گھر کی کیا اور باہر کی کیا کسی عورت کو بھی نواز کے سامنے کسی قسم کی بات کرنے میں جھجک نہ ہوتی تھی جیسے ان کو نواز پر ایک اعتماد سا تھا کہ وہ ہمیشہ اسی طرح بھولا بھالا سا رہے گا۔ اس کی اداس اداس آنکھوں میں کبھی تہنیت نہ آئے گی اور اس کے چہرے پر پڑی ہوئی گرتیمی کبھی دور نہ ہوگی۔

نواز پلنگ پر لیٹا ظہیر کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ سہیل کا زم زم تکیہ چھونے پر اس کے دماغ میں اس بیتے ہوئے بچپن کے واقعات دوڑنے بھاگنے لگے جب وہ مزے سے دھیما چھوڑ کر بات کیا کرتا تھا۔ اس کے لب ولہجہ میں ابھی تک تسلیم و رضا اور عاجزی کی وہی آمیزش جماعت والی ملائمت موجود تھی۔ اس وقت عورتوں میں زیادہ بیٹھنے کی وجہ سے اس کی زبان پر عورتوں کے کئی محاورے چڑھ گئے تھے۔ رجو میاں کی شادی پر عورتوں کو اس نے فرنی کی کتنی مٹکیاں لا کر دی تھیں۔ مردانے میں سے چوری چھپے فرنی لانا کوئی آسان کام نہ تھا مگر عورتوں کا کام کہہ کے اسے کتنا اطمینان ہوتا تھا اور جب کوئی عورت اسے دعا دیتی تو اسے کتنی تسکین حاصل ہوتی تھی۔ رجو میاں کی بارات چڑھنے سے پہلے اس کے ہمجولی چھپ چھپ کر سگریٹ پی رہے تھے۔ کئی باہر مردانے میں گاؤ تکیوں پر ناچ رہے تھے کئی پان کی پچکاریاں مار رہے تھے اور وہ اندر عورتوں کو بچوں کے گہرے پٹارا کر ان کی مشکوروں میں ازار بند ڈال کر ڈبوں میں سے نئی نئی گورگابیاں نکال نکال کر ان سے دعائیں لے رہا تھا۔ "ناجی بیٹا! اب ازار تیلا ادھر دے جانا۔" وہ ایک دالان میں سے دوسرے میں جاتا کبھی ازار تیلا اس کے ہاتھ میں ہوتی کبھی پائنہ۔ کسی دالان میں شلوار پہنی جا رہی ہوتی، کسی کوٹھڑی میں قمیص اتر رہی ہوتی۔ اسے اندر دیکھ کر کئی عورتیں پہلے جھجکتیں مگر پھر ناجی کی مانوس صورت دیکھ کر ان کے چہرے کھنے لگتے "اچھا تم تھے ——— کوئی بات نہیں۔" دلہن والوں کے گھر بھی وہ عورتوں میں جا گھستا تھا۔ وہاں بھی کوئی بنی ٹھنی لڑکیوں پر اس کی نظر پڑتی تھی۔ مگر اسے ان میں کوئی جاذبیت نظر نہ آتی تھی۔ بڑی عمر کی عورتوں کے مقابلہ میں وہ گم سم سی نظر آتی تھیں۔ ان کی کٹی گٹی ہنسی، دبی دبی کھلکھلاہٹ اسے قطعاً نہ بھاتی تھی۔ کام کہنے کو وہ ان کا بھی کر دیتا تھا مگر وہ اسے دعائیں نہ دیتی تھیں۔ دلہن والوں کے گھر ایک عورت نے یہ کہہ کر "اچھا ناجی پھپھی جان کا بیٹا ہے؟" کتنے پیار اور محبت سے اسے گلے لگایا تھا اور کتنے پُرخلوص جوش میں دعائیں دی تھیں اور پاس کھڑی ہوئی باجی ولایت کی مسکراہٹ اسے کتنی اچھی لگی تھی۔ اس وقت باجی کے ڈھلے ہوئے سانولے جسم میں سے زندگی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔ باجی ولایت ان عورتوں میں سے تھیں جو نواز کو پسند تھیں اور باجی کی شکل اسے بے انتہا پسند تھی۔ باجی کے پاندانی گال ہمیشہ چمکتے رہتے اور ان کی غلافی آنکھوں کی پلکوں میں سے ایک ساحرانہ گھلاوٹ جھانکتی رہتی۔ نواز کے لئے باجی کی شخصیت میں ایک گرفت تھی اور علاوہ اس کے وہ نواز سے پیار بھی بہت کرتی تھیں اور ان کا کام کر کے نواز کو بے حد خوشی ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ان کا کوئی کام کرتے ہوئے وہ گر پڑا تھا اور اس کی ٹکسیر پھوٹ پڑنے پر جس پیار سے باجی ولایت نے چٹ چٹ اٹھ کر اپنی اوک سے اسے پانی پلایا تھا۔ اس دن سے نواز کو وہ اور بھی اچھی لگنے لگی تھیں۔ نواز کی بھابی کبھی بچوں کو نہلا دھلا کر نواز کے ساتھ باجی ولایت کے گھر بھیج دیتی اور نواز باجی کے قریب بیٹھ کر گھنٹوں مسکول کا کام کرتا رہتا۔ ساتھ ساتھ بچوں کی خبر گیری بھی کرتا، انہیں چاٹی والے سے کچھ لا بھی دیتا اور باجی کبھی کہہ دیتی "نواز پکڑ تو یہ کپڑا ذرا۔ اس کنارے سے۔ کھینچو اپنی طرف ——— اور ——— اور ——— بس نکل گئی پنچھ ——— اب یہ کنارا کھینچو۔" مشین پھر چلنے لگتی اور نواز مسکول کا کام کرنے لگتا۔ باجی ولایت کے بال بادامی تھے۔ نواز کو یہ معلوم تھا کہ وہ ایسڈ وین پرآکسائڈ استعمال کرتی ہے۔ بال ریشم معلوم ہوتے تھے۔ ایک روز باجی کا سر دکھتا تھا۔ ان کی لڑکی کنجی ان کے بالوں میں تیل جھس رہی تھی کہ سالن جلنے کی بو آئی۔ کنجی باورچی خانہ کو بھاگی۔ باجی نے سر دبا کر کہا "ہائے ہائے ——— باجی میں تیل جھس دوں؟" جواب کا انتظار کئے بغیر وہ تیل

جھینے لگا۔ "جیتے رہو تا جی کتنے اچھے ہو تم۔" بس اتنی سی بات سے تا جی پھول گیا تھا۔

اسے ٹھنڈا ٹھنڈا تیل ڈال کر باجی کے بال سہلانے میں کتنا لطف آیا تھا۔ وہ اپنے سر میں بھی تیل لگاتا تھا بھائی کے بچوں کے سر میں بھی مگر باجی کے بادامی بالوں میں تیل لگانے سے اسے ایک عجیب طرح کا لطف آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھی ہوئی مٹھیا سے ابھی اور چٹی رہے۔ سینے پرونے کے دوران میں باجی کو کئی مرتبہ اپنی قمیص اتار کر نئی قمیص سے ماپنے کی ضرورت پیش آئی تھی اور نواز نے قمیص اترتے وقت بنیان کے ذرا تھوڑا اوپر اٹھ جانے سے کئی دفعہ باجی کی کسی ہوئی چھوٹی سی توند کو دیکھا تھا۔ باجی اپنی قمیص آپ بہت کم سیتی تھی زیادہ تر درزی سے سلواتی تھی۔ کہا کرتی تھی درزی قمیص میں جان ڈال دیتا ہے اور یہ بات نواز نے بھی محسوس کی تھی کہ جب باجی قمیص پہن کر سینہ چھپکا نی پھرتی تو اکثر عورتوں کی نظریں باجی کی قمیص پر جم جاتی تھیں اور کئی تو جل بھن کر کہتیں:

"سب ڈھل گئے یہ نہ ڈھلی"

دوسری ناک بھوں چڑھاتی: "ڈھلے کیونکر ——— روئیاں جن کر آرام سے بیٹھ گئی ہے۔"

تیسری کڑھتی: "ہم تو جن جن کر بوڑھی ہو گئیں بڑا۔ ذرا سوچو ولایت مجھ سے دو سال بڑی ہے۔"

"دو سال بڑی؟ تمہاری بیٹی لگتی ہے وہ تو۔"

"وہی تو میں نے کہا۔ بیٹی کیوں نہ لگے۔ نخرا تھوڑا ہے اس کا جیسے نئی جوانی چڑھی ہو۔ کوئی پوچھے خاوند نے تو سیم کر لی ہے۔ وہ اپنے گھر قمیص رکھتا نہیں اور تو یہ کیا بالوں میں آگ لگا کر سیم بن رہی ہے۔"

"میں کہتی ہوں کیا یہ آن بان دکھاتے اس کا جی برا نہیں ہوتا؟"

نواز سوچتا واقعی باجی ولایت میں ایک آن بان تو ضرور ہے۔ عورتوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ آن بان رکھنے کے لئے باجی کو کیا کیا خوشامدیں اٹھانے کو ٹخنے پڑتے تھے۔ مچھلی اور گلاب کی کھلیاں اٹھنے اور کیا کیا اور الا بلا کو ٹخنے چھانے میں نواز کو بھی کئی بار باجی کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ ولیم آنے سے پہلے اس کی بھابی نے اپنی ملنے والیوں سے کہا تھا: "ولایت بچہ میری ایک سہیلی ہیں۔ جیسی باڈی وہ بناتی ہیں کوئی نہیں بنا سکتا۔ کبھی ولیم گئی تو ان سے سلوا کر لاؤں گی۔" نواز نے دن اگر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ باجی ولایت باڈی سینے پر کتنی جان مارتی تھیں۔ کس طرح ادھیڑ سر ہو کر یں کاٹتیں پھر جوڑتیں۔ کئی باڈیاں آگے سے کھلتیں کئی پیچھے سے۔ کسی پر بٹن لگتے تھے کسی پر ڈوریاں اور کئی باڈیوں کو مختلف رنگ کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑوں سے اس طرح جوڑ کر بنایا گیا تھا کہ دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ٹوٹے کے رنگدار پروں سے بنی ہوئی ہیں۔ باجی کو یہ باڈیاں سینے اور پہننے کا شوق تھا۔

ماں تو جب وہ عورت اس کو گلے لگا کر دعائیں دے رہی تھی تو اس کی پیاسی روح کتنی سرشار ہوئی تھی اور پاس کھڑی ہوئی باجی ولایت کی مسکراہٹ اسے کتنی اچھی لگی تھی۔ نواز کے دل نے جیسے کوئی بٹن دبا دیا اور ذہن میں یہ دو ٹرنے بھاگتے واقعات وہیں رک گئے۔

اس نے کہا: "میں نے تو باجی کو مسکراتے سینکڑوں بار پہلے دیکھا تھا مگر وہ مسکراہٹ مجھے کیوں اتنی اچھی لگی؟" ——— شاید اس لئے کہ اس وقت دعاؤں سے میری روح سرشار ہو کر مسکرا رہی تھی اور اس سپنے منظر پر باجی کی مسکراہٹ نہایت موزوں اور مناسب نقش کا کام دے گئی۔ کتنی ہم کاری تھی کتنی مطابقت۔ میری روح مسکرا رہی تھی اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے ——— واقعات پھر دوڑنے لگے ——— باجی کے بدن پر سفید لباس کھلتا تھا اور اسے شاید اس بات کا علم تھا۔ بھی وہ اکثر سفید لباس ہی پہنا کرتی۔ نصرت، باجی ولایت، خالہ نفیسہ اور کتنی اور عورتیں ہر روز یاں کی دلہن کو سنوارنے میں لگی ہوئی تھیں۔ نصرت نے عطر دان تھام رکھا تھا مگر جب وہ کھلکھلا کر ہنسی تو معلوم ہوا کہ عطر دان اب گرا۔ ایک سرخ دوپٹہ پکڑے کھڑی تھی۔ باجی ولایت ہنس ہنس کر دلہن کے ہونٹوں پر سرخی جما رہی تھی۔ خالہ نفیسہ دلہن کی آنکھوں میں

بڑی احتیاط سے سرمے کی دھاریاں کھینچ کر بولی "دلہا کر ذرا مست نگاہوں سے دیکھنا۔" اس پر پھر کھلی بجی۔ دلہن اٹھ کر کھڑی ہوئی تو باجی ولایت نے عطر لگایا۔ ایک نے کہا "چشم بد دور خوب سجی ہے دلہن۔" باجی ولایت نے قمیص کو لنگوں کے نیچے سے کھینچ کر کہا "قمیص ذرا کھلی ہے۔ چھاتیں ٹھیک نہیں آئیں۔"

نصرت نے ہنس کر کہا "تو اپنی دے دو ایک باڈی دلہن کو۔ کیا ہرج ہے؟"

ایک عورت نے ایک پٹاخا ہاتھ میں تولتے ہوئے کہا "اری ولایت دلہن کو ابٹنا ذرا زیادہ دیا ہوتا۔ ہاتھ منہ دھونے میں ہی آدھا رہ گیا ہے۔"

"کہاں تھوڑا ہے بوا۔ اتنا ابٹنا ملنے کے بعد پندرہ دن تک خوشبو نہ پھٹے گی بدن سے۔"

"ٹھیک کہا ہے باجی نے، جس چوکی پر باجی نہاتی ہیں اس میں سے بھی ابٹنے کی خوشبو آتی رہتی ہے۔" قہقہے، ہنسی اور کھلکھلاہٹ کے نقارخانے میں نواز کی آواز ممنمائی۔

"ارے تو میرے ساتھ کب نہایا تھا؟" ہنستی ہنستی نصرت نے اپنی رانیں پیٹ لیں۔

اس ہجوم میں گھسے ہوئے نواز کی طرف بعض عورتوں نے اس طرح دیکھا تھا جیسے اس کی موجودگی کا انہیں اب احساس ہوا ہو حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ ان کے پاس کھڑا تھا۔

ایک عورت نے کہا "ارے ناجی تو کہاں آن گھسا ہے؟"

خالہ نفیسہ نے اپنے ساتھ لپٹا کر کہا "رہنے دو اسے یہ تو سات بیٹیوں جیسا ایک بیٹا ہے۔ ہمیں تو ایسی ایسی چیزیں لا کر دیتا ہے جو ہم کسی سے منگا نہیں سکتیں، کیوں ناجی؟"

اس فقرے کا لہجہ شرارت اور طنز سے بھرا ہوا تھا کہ اسے منہ چھپانے کے لئے اپنا سر خالہ کے پیٹ میں دینا پڑا تھا۔ پھر ہنستی لصلیتی عورتیں دلہن کو لے کر اس کمرے میں پہنچیں جو اس کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ وہاں بھی کچھ عورتیں پہلے سے موجود تھیں۔ کمرے میں سلگتی ہوئی اگربتیوں کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیل رہی تھی۔ ایک تخت پوش پر مصلّے بچھا تھا دوسرے پر کچھ چیزیں ڈھکی پڑی تھیں۔ سرخ لباس پہنی ہوئی دلہن کو چھپر کھٹ پر بٹھا دیا گیا۔ نصرت نے ڈھکی ہوئی چیزوں پر سے کپڑا اٹھا کر کہا تھا "دلہن یہ چیزیں پڑی ہیں، دیکھو لو۔" ایک چنگیر میں پھولوں کے ہار پڑے تھے، ایک میں چھوہارے، ایک ٹوکری مٹھائی سے بھری پڑی تھی۔ ان چیزوں پر تولیہ دے کر نصرت نے پھر انہیں سرخ کپڑے سے ڈھک دیا۔

ہنستی ہوئی عورتیں سر جھکائی دلہن کو چھپر کھٹ پر تنہا چھوڑ کر باہر آ گئیں۔ حویلی کے دوسرے حصے میں میراسنیں گا رہی تھیں۔ عورتوں کا یہ ریلا سیدھا ادھر پہنچا۔ نواز دبک کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ میراسنیں اس وقت کوئی نقل کر رہی تھیں۔ ایک نر پر پگڑی باندھے توے کی سیاہی سے مونچھیں بنائے مردنی ہوئی تھی اور دوسری نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ دونوں ناچتی اور گاتی تھیں۔ پگڑی والی میراسن کبھی کبھی ساڑھی والی کا منہ چومنے کو بڑھتی تو وہ مکر میں لچک ڈال کر علیحدہ ہو جاتی تھی۔ ڈھولک تیز تیز بج رہی تھی۔ گانے کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ کبھی کبھی پگڑی والی میراسن اپنے زیریں حصے کو اس طرح ہلاتی کہ مجلس دیوانہ قہقہہ بن جاتی تھی۔ عورتوں کے چہروں پر شریر مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں۔ نواز کو ان کے چہرے عجیب طرح کے معلوم ہو رہے تھے۔ اسے ہر طرف سے نفس ہی کی برات چڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں ایک اور میراسن اپنی قمیص کے نیچے بہت سے کپڑے ٹھونس کر بڑا سا پیٹ بنائے آ دھمکی اور آتے ہی اپنے پیٹ کو پگڑی والی میراسن کے ساتھ ٹکرا کر اوٹ پٹانگ سی باتیں کرنے لگی۔ نواز کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اس نقل کے دوران میں سو گیا تھا۔ اس کی آنکھ جب کھلی تھی جب کوئی عورت اسے اٹھا رہی تھی۔ اس نے دیکھا تھا مجلس بہت مختصر رہ گئی تھی۔ کوئی عورت اس کا ہاتھ پکڑے ایک بستر میں لٹا گئی۔ اس کا جی ابھی اور جاگنے کو چاہتا تھا۔ اس نے لحاف میں سے منہ نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں دو پلنگ اور بچھے تھے جن پر کوئی لحاف اوڑھے سویا پڑا تھا۔ گانے والے کمرے میں سے ابھی تک ڈھولک کی آواز آ رہی تھی۔

وہ حیران سا ہو گیا کیونکہ میراسنیں اس لچر گیت کے آخری بول گا رہی تھیں جو اس نے بازاری لوگوں کو اکثر گاتے سُنا تھا۔ اس کی بیندچپہ منٹوں کے لئے اڑ گئی۔ ڈھولک پر تھاپ پڑنے کے ساتھ میراسنوں نے ایک اور فحش گانا شروع کر دیا تھا اور وہ حیرت میں ڈوبتا ڈوبتا خلیج کے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ جب اسے اپنی ٹانگیں گھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں تو اس نے آنکھیں کھول دیں ——— "باجی! ——— "ہاں" ہاں سر جا ؤ" باجی نے اسے بھینچ کر کہا۔ اس کی ٹانگیں باجی کی رانوں میں دب رہی تھیں۔ اس نے ہاتھوں کی مدد سے علیحدہ ہونا چاہا مگر اس کا ہاتھ الجھا ہوا تھا۔ باجی نے تو اس کی ٹانگوں کو آزاد کرتے ہوئے مری ہوئی آواز سے کہا "درد ہو رہا ہے۔" جب اس نے نواز کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیٹ پر رکھ دیا تو نواز گھبرا سا گیا مگر اب اس کے لئے سوائے چکنی چکنی توند دبانے کے اور کوئی چارہ نہ تھا اور باجی نواز کا ہاتھ پکڑ کر پیٹ پر ادھر اُدھر رکھتی جا رہی تھی اور ستواجاگتا نواز دبا دبا خواب سا دیکھنے لگا جیسے وہ رجو میاں کی بھولیوں سے بھری موٹر کا ہارن بجا رہا ہے۔ ایکا ایکی ایک نئی حسیت نے اسے بیدار کر دیا اور اس نے آنکھیں کھولتے ہی اپنا ہاتھ کھینچا مگر باجی نے زور سے اس کا سر چوم کر بھینچ لیا تھا۔ اس نے گھبرا کر باجی کی طرف دیکھا۔ سڑک کے سب کی کمرے میں پھیلی ہوئی نیلی نیلی روشنی دم توڑ رہی تھی۔ اس مدھم روشنی میں باجی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کی گہری گہری گرم گرم آنکھوں کے نیچے بوجھل ہو رہے تھے۔ نواز کو ایک نامعلوم ڈر سے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ سمجھا شاید پیٹ کا درد بڑھ رہا ہے۔ اس نے ہمدردی سے کہا "باجی!" مگر لفظ اس کے گلے میں پھنس گیا۔ باجی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ باجی اٹھ کر غسل خانہ میں چلی گئی۔ وہ سوچ ہی رہا تھا ——— باجی کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بستر میں آن گھسی۔ نواز سمٹ کر ایک طرف ہو گیا مگر باجی اب لیٹ کر پھیکے اور بے رونق چہرے سے چھت کی طرف اسی طرح دیکھنے لگی تھی جس طرح اب نواز لیٹا ہوا چھت کی کڑیوں پر نظریں جما کر بچپن کے واقعات یاد کر رہا تھا۔

سیمیل کے تکیے کے نرم لمس نے آج اس کے ذہن میں کیا کیا پرانے قصّے نچانے شروع کر دئے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا جیسے اس کی زندگی اسی ہاتھ میں منجمد ہو گئی تھی یا جیسے اس کی موجودہ زندگی کا ذمہ دار صرف یہی ہاتھ تھا۔ اس نے سگریٹ کے ہائیانہ سے کو انگلیوں میں مسل کر پھینک دیا اور نیا سگریٹ سلگایا۔ یہ سگریٹ پینے کی عادت بھی اسے کالج میں خواہ مخواہ ہی پڑ گئی تھی۔ کالج کے لڑکے کتنے شریر تھے۔ اگر وہ سگریٹ پینے سے انکار کر دیتا تو وہ کہتے "یہ گھوڑے ہے۔ یہ کہتا تھا بھی کتاب ہے" پیتا بھی کتاب ہے۔ ہم نے اس کا نام یونہی تو نہیں رکھا ہوا "نواز گھوڑے" آخر اس نے مجبور ہو کر پیش کئے ہوئے سگریٹ قبول کر لینے میں ہی اپنی خیر سمجھی تھی۔ اس کی واقفیت محدود سے چند لڑکوں سے تھی۔ جب وہ اپنی محبت کے کارنامے بیان کرتے تو وہ حیرت سے سنا کرتا اور جب وہ کسی لڑکی کو چھیڑتے تو وہ تھر تھر کانپنے لگتا۔ ایک کہتا "ارے نواز تم بھی کوئی آپ بیتی سناؤ"

اس سوال پر وہ ہمیشہ خفیف سا ہو جاتا "یہ تو بس گھوڑے گھوڑے" دوسرا کہتا اور بات ٹل جاتی۔ اب جب وہ کالج میں تھا اسے اپنی آپ بیتی کے خاکے میں کچھ جان پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ واقعات نے اس کے الف۔ اے تک پہنچتے پہنچتے ایسی کروٹ لے لی تھی جس کی اسے کبھی توقع بھی نہ ہو سکتی تھی۔ بھائی کو خالق کے لئے باجی ولایت نے نجی کا رشتہ دے دیا تھا اور سب سے بڑے بھائی نے اس پر صاد کیا۔ خالق نواز سے بڑا تھا۔ بی۔ اے پاس نوکر چاکر نجی کو بیاہ کر اپنے گھر لے گیا۔ ایک مدت کے بعد اس شادی پر دلن جانا پڑا تھا۔ باجی کے خاوند کی اگرچہ اس سے آن بن تھی مگر جب تک وہ آیا نہ تھا باجی کتنی اداس اداس نظر آتی تھی اور اس کا اداس چہرہ دیکھ کر نواز کا جی کتنا جلتا تھا۔ اس کو اب باجی ولایت کے ہونٹ بھی اچھے لگنے لگے تھے۔ ہونٹ بھی کیسے تھے۔ جیسے جیسے آگے کو بڑھ کر نیچے کو مڑے ہوئے جیسے ابھری ہوئی گلاب کی پتیاں شروع شروع شاداب سی۔ جب وہ خالق بھائی کو دعائیں دیتی اور اس کے وارے نیارے جاتی تو نواز کو یہ بات بُری سی لگتی جیسے ان دعاؤں پر پہلے اس کا قبضہ تھا اور اب خالق بھائی نے قبضہ جما لیا تھا۔ پھر یہ سوچ کر آپ ہی آپ نادم ہو جاتا کہ وہ اس کا داماد ہے۔ اس کی بلائیں لینے لگی باجی تو اور کس کی لے گی۔ مگر اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے بھی وہ گومگا ہی نہ کر سکتا تھا یہ باتیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے باجی'

اپنے فرض سے کوتاہی کر رہی ہے جیسے اس گھٹنے کو بھرنا باجی کا فرض تھا جو وہ اپنی یتیم روح میں محسوس کر رہا تھا۔ بی۔ اے میں داخل ہوئے ابھی پورا سال بھی نہ ہوا تھا کہ اسے بہنائی کی کوششوں سے ملازمت مل گئی۔ اس بے روزگاری کے زمانہ میں ملازمت کا ملنا معجزہ سے کم نہ تھا۔

اس نے دھڑکتے کلیجہ کو مٹھی میں بھینچ کر سوچا۔ ظہیر نے سچ کہا ہے لاہور کی جلوہ افروزی اور نمائش کی فراوانی دیکھ کر دل تڑپنے لگتا ہے اور شباب کی للکار سن کر واقعی قدم تھم جاتے ہیں۔ شباب۔ شباب بھی کیا بلا ہوتا ہے۔ ان دنوں اسے نامعلوم کیا ہو گیا تھا جیسے اس کی آنکھوں پر عینک لگ گئی تھی جس کے شیشوں میں سے ہر چیز اسے خوبصورت نظر آتی تھی۔ ہر نسوانی چہرہ اسے حسین و جمیل نظر آتا تھا اور کبھی کبھی تو بدصورتی بھی اسے حسن اور دلکشی کا پرتو لئے ہوئے معلوم ہوتی تھی۔ سانولے اور زیتونی چہروں کو چھونے اور سفید چہروں پر سگریٹ کے دھوئیں کی پھنکیں مارنے کی عجیب سی خواہش اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی اور جب وہ کسی مرد اور عورت کو سگرٹ پیتے دیکھتا تو اس کا شدت کے ساتھ جی چاہتا کہ اس کے ساتھ بھی کوئی عورت ہو اور وہ بھی دیا سلائی جلا کر اس کے ہونٹوں تک لے جائے اور پھر عورت کے ہونٹ اس ہلکی سی لکیر میں سرخ سرخ شعلے نظر آئیں۔ سنیما میں کبھی کبھی اس سے ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ اگر قریب بیٹھی ہوئی عورت کے منہ سے نکلا ہوا سگریٹ کا دھواں اس کی طرف آتا تو وہ اپنے سانس کے زور سے اندر کھینچنے لگتا۔ اسے عجیب عجیب بے ہنگم سے خواب آتے تھے مثلاً اسے اپنی ہمسائی جنگل بیابان میں نظر آتی ہے۔ جب وہ اس کی طرف غور سے دیکھتا کہ یہ جنگل میں کیا لینے آئی ہے تو وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی اور اس کے گنگنانے کی بھنبھناہٹ دیر تک اس کے کانوں میں گونجتی رہتی۔ ایک روز اسے کسی کام کے سلسلہ میں ایک رئیس زادے کے ہاں جانا پڑا تھا جس کے بچے ہوئے صاف ستھرے بستر پر چار کیے دیکھ کر اسے تعجب ہوا تھا۔ وہ سرہانے کی طرف پڑے تھے۔ ایک دائیں ایک بائیں۔ اس نے انہیں چھو کر دیکھا۔ ان میں سیمبل بھری تھی اور وہ نرم نرم لمس ایک عجیب طرح سرور انگیز تھا۔ اس نے وہیں تہیہ کر لیا اور وہ تنخواہ پاتے ہی بازار سے سیمبل کے چار تکیے خرید لایا تھا۔ دونوں طرف کروٹ لینے پر وہ نرم نرم تکیوں کو اپنے ساتھ ٹٹولا کرتا۔ اس کی انگلیاں کس طرح ان میں دھنس جاتی تھیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے بیقرار خون کی بڑھتی ہوئی حرارت کسی تسکین کی جویاں تھی۔ جب وہ خالی الذہن ہوتا تو رجو میاں کی شادی والی رات کا واقعہ کسی خفیہ کمین گاہ سے نکل کر اس کے دل پر ٹھوکریں ہی مارنے لگتا تھا اور اسے یقین ہو جاتا کہ وہ واقعہ اس کے ذہن میں گرم لوہے کے داغ کی طرح محفوظ ہو چکا ہے اس کا جی چاہتا کہ باجی اب پھر کسی موقع پر اسے اپنے ساتھ سلا کر اس کی ٹانگوں کو اپنی زندگی بھری رانوں میں دبائے مگر اسے ان خیالوں سے شرم بھی آنے لگتی اور وہ سوچتا باجی اس کے بہنائی کی خوشدامن بن چکی ہے۔ بہنائی کو اگر ان خیالوں کا پتہ چل جائے تو کیا ہو۔ جتنا وہ ان خیالوں سے بچتا اتنا ہی یہ اس کے سر پر تھنبہ بن کر سوار ہو جاتے اور جذبات کی فسوں کاری اسے دم نہ لینے دیتی۔ باجی کے سینے کی کامل گولائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگتیں جیسے باجی نے اس کی جوانی پر کوئی افسوں پھونک دیا تھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ باجی اس کے اندر سے نہیں نکل سکتی وہ تو اس کی پڑیوں میں نفوذ کر گئی تھی، تو اس نے ہتھیار ڈال دئے اور کھلم کھلا اوٹ پٹانگ خیالات کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس لطافت گریز پا کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگا جو اس کے نفس کے دروازے پر بیباک دستک دے کر کہیں فضا میں گم ہو گئی تھی اور جسے نہ پا کر اس کی ترستی ہوئی روح ایک پیاسا اور مصر درد محسوس کرنے لگی تھی۔ باجی کے لچر تیلے بدن کا گرم اور معطر جھاڑ، اس کے کٹے ہوئے چھوٹے سے پیٹ کی چکناہٹ اور اس کی بے باکانہ اور سبیلی حرکات کی یاد اس کی جوانی کا محور تھی۔ اسے خیال آتا اگر باجی اسے کبھی ملی تو وہ اس سے کہہ دے گا۔ باجی تمہیں معلوم نہیں کہ تم میں کتنی طاقت ہے۔ وہ سوچتا باجی کو کیا شاید سب ہی عورتوں کو پتہ نہیں کہ ان میں کتنی طاقت ہے۔ دماغ کی بے بسیوں اور دل کی محکمانیوں سے اس کا چہرہ بھیگا پڑنے لگا تھا۔ مسرت کے دروازے پر سے ترستی ہوئی روح ان دنوں اس کی آنکھوں میں سے جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ جب کی بات ہے جب اسے خالق بھائی کا بمبئی سے خط آیا تھا کہ اگر تمہاری صحت ابھی تک اچھی نہیں ہوئی تو چھٹی لے کر بمبئی آ جاؤ۔ باجی اور ندیمہ بھی آئی ہوئی ہیں۔ یہ خط پا کر اسے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ خالق بھائی نے اگرچہ

پہلے بھی بمبئی آنے کے لئے اسے کئی بار لکھا تھا مگر اب کے تو اس نے ذرا دیر نہ کی اور دو مہینے کی رخصت لے کر بمبئی پہنچ گیا۔

خالق بھائی کے پاس چھوٹا سا فلیٹ تھا صرف دو کمرے اور ایک غسلخانہ' اور رہنے والے پانچ شخص۔ خالق، ان کی بیوی، باجی، ولایت زرینہ اور نواز۔ ایک کمرہ خالق اور بھی کے دو پلنگوں سے ہی بھرا بھرا معلوم ہوتا تھا اور دوسرے میں سنگار میز اور چند کرسیاں بچھی تھیں۔ رات کو زرینہ نے اس کمرے کی کرسیاں تہ کر کے دیوار کے ساتھ لگا دیں اور کونے میں سے لپٹے ہوئے بستر نکال کر بچھانے لگی۔ موٹے موٹے دو گدے ان پر سفید چادریں اور تکیے۔ جب وہ اپنا اور باجی کا بستر بچھا چکی تو نواز کے ہولڈال کی طرف بڑھی "بڑے نفیس تکیے ہیں آپ کے نواز بھائی" اس نے نواز کے بستر پر تکیے رکھتے ہوئے "مگر یہ اس!!! چار تکیے؟" اس نے مذاق اور حیرت کے ملے جلے تبسم سے اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا اور باجی بھی مسکرا دی تھی "یہ سیمل سر کے نیچے سے کھسک جاتی ہے اور مجھے نیچے تکیے پر نیند نہیں آتی ——— "اچھا یہ بات ہے!" جھکی ہوئی زرینہ نے اپنا کھسکتا دوپٹہ سنبھال کر کہا۔ زرینہ اب خاصی جوان ہو چکی تھی۔ اس کی لمبی لمبی چٹیا کتنی موٹی تھی ساری گردن کو ڈھک رکھا تھا اس نے۔

بیچ میں باجی کا بستر تھا۔ دیوار کی طرف زرینہ کا اور دروازے کی طرف نواز کا۔ بستر فرش پر ساتھ ساتھ بچھے تھے۔ نواز لیٹا ہوا تھا اور باجی اس کی طرف پشت کئے سنگار میز کے سامنے کھڑی منہ پر کریم مل رہی تھی۔ اس وقت اس کی پیٹھ کا آبنوسی رنگ خوبصورت لگا تھا نواز کو اور کہنی کے پاس جو ڈمپل پڑ رہا تھا خاکستری رنگ کا۔ اس کا جی چاہتا تھا باجی کی کلائی پر پنجے گاڑ دے اور اس داغ کو چوم لے ——— باجی جب اس کے پاس لیٹ گئی تھی تو وہ اسے اپنے ارمان کی طرح ایک نئی اور تازہ شے معلوم ہو رہی تھی۔

اگلے روز وہ تیار ہو کر سیر کے لئے نکلے تھے۔ باجی کی قمیص پر وہ زری کے کتنی اچھی چنٹیں دے رکھی تھیں جیسے خرگوش کے چھوٹے چھوٹے بچے پھدک رہے ہوں۔

"باجی آپ کو سفید لباس بہت اچھا لگتا ہے" یہ الفاظ اس کے منہ سے آپ ہی آپ نکل گئے۔

"فرخ نے بھی کل یہی کہا تھا، کیوں امی؟" زرینہ نے ٹانگ اڑائی۔

"فرخ کون ہے؟"

باجی بولی "فرخ زرینہ کی سہیلی ہے۔ ہمارے اوپر کے فلیٹ میں بھی کوئی پنجابی رہتے ہیں۔ ان کی بیٹی کا نام فرخ ہے۔ اکیلی اولاد ہے بڑے چاؤ چونچلے ہوتے ہیں اس کے۔ زرینہ سے اس کا بڑا پیار ہو گیا ہے۔ یہ تو کئی کئی راتیں اور دن اس کے پاس گذارتی ہے"

"اس نے ہماری دعوت بھی کی تھی" زرینہ نے کہا تھا مگر نواز نے یہ بات ان سنی کر دی تھی۔

نواز کو چند دنوں کے بعد یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں ایک تکان، ایک اکتاہٹ سی کسی نے ڈیرے ڈال لئے ہوں مگر باجی کی غلافی آنکھوں میں وہی پرانی سا جانہ گہرائی موجود تھی بلکہ اب وہاں پلکوں کی چلمن میں ایک سحر رقیق کبھی اندر چھپتا اور کبھی باہر جھانکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایسی حالتوں میں اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ جب یہ نشے میں لپٹا ہوا جادو پلکوں کی چلمن سے جھانکتا تو وہ اپنی جڑاؤں کو اکٹھا کر رہا ہوتا کہ وہ سحر رقیق پھر چلمن کے پیچھے جا چھپتا اور اسے باجی کی غلافی آنکھیں اسی طرح ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگتیں جس طرح چوپاٹی کا ساحل پانی کا ریلا چلے جانے کے بعد نارمل حالت میں نظر آنے لگتا تھا ——— وہ غسل خانہ میں باجی کو دروازے کی اوٹ میں سے صابن دانی بھی پکڑا چکا تھا۔ باجی اپنے جوڑے پر اس سے بیشتر ہی لگا چکی تھی اور ایک شام جب وہ کریفورڈ مارکٹ کے پاس کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے وہ جا کر مجوڑے پر لگانے والے گجرے لیتے ہوئے پھول لے آیا تھا جو اس نے مرہٹہ عورتوں کو لگائے ہوئے دیکھا تھا۔ باجی نے پھول ہاتھ میں پکڑ کر اس کی طرف پیٹھ موڑ دی تھی۔ جب وہ باجی کے جوڑے پر پھول لگا چکا تھا تو زرینہ نے پھولوں کا دوسرا نصف چکہ باجی سے پکڑ کر خود اپنے

بالوں پہ لگانا چاہا تھا مگر باجی نے پھول نواز کے ہاتھ میں دے کر کہا تھا "جو لایا ہے وہی لگائے گا" چنانچہ زرینہ کو بھی اپنے بالوں پہ پھول نواز سے ہی لگوانے پڑے تھے۔ اس کو باجی کا کام کرکے اب بھی ویسی ہی خوشی ہوتی تھی مگر اس خوشی کے ساتھ اب اسے بے چینی سی بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایک بار جب ان کی ٹرین بوری بندر کے پاس ٹھہری تھی تو نواز نے ایک گھاٹن کی طرف دو تین بار دیکھا تھا۔ اس کے سینے کی گولائیاں باجی کی چھاتیوں کی طرح سڈول تھیں اور باجی نے ایک دم پوچھ لیا تھا "بڑا دیکھ رہے ہو کیا ہے اس عورت میں؟" اس بیباک سوال پر وہ گھبرا سا گیا تھا مگر اس نے ہمت کرکے کہہ دیا تھا "کچھ نہیں، دیکھئے باجی کتنا متناسب بدن ہے اس کا۔" اس پر باجی نے شرارت سے مسکرا کر کہا تھا "کیا تمہیں ایسا بدن پسند ہے؟" یہ غیر متوقع جواب سن کر نواز کے بدن پر چیونٹیاں سی دوڑ گئی تھیں۔ اس نے ڈر کر کنکھیوں سے ادھر دیکھا جدھر زرینہ اور نجمی بیٹھی تھیں مگر وہ دونوں باہر دیکھ رہی تھیں۔ پھر ایک روز باجی کہنے لگی تھیں "زرینہ تیری بہن کی عادت نہ گئی۔ کس طرح سستی ہے رات کو۔ ٹانگیں مار مار کے برا برا حال کر دیتی ہے۔ جوں دھکیلے لگتی ہے مجھے میں باجی بچارے پر جا چڑھتی ہوں۔" اگلی رات نواز کی آنکھ کھلی تو باجی واقعی نواز کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ نواز سوچنے لگا کیا کرے۔ اور آگے کھسکتا تو گدے سے نیچے فرش تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سکیڑ کر کہا "باجی! باجی! دیکھئے آپ کھسک کر کہاں آگئی ہیں" باجی نے نیند بھری آواز میں کہا "مجھے سردی لگ رہی ہے" اور نواز کی روداد میں گھس آئیں ——— چند منٹ کے بعد باجی کے بازو پر نواز کا سر تھا اور اس کے دل میں یہ خیال، باجی کتنی اچھی ماں بن سکتی ہے، عجیب عجیب نئی نئی صورتیں بدل رہا تھا۔

اگلے روز زرینہ کی سہیلی فرخ کا سر کھا رہا تھا اور زرینہ سارا دن اس کے پاتے کے ساتھ لگ کر بیٹھی رہی تھی۔ شام کا کھانا بھی اس نے اوپر ہی کھایا تھا اور اپنی سہیلی کے پاس ہی سوئی تھی۔ اس رات نواز نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ارادوں اور جرأتوں نے ہلکورے کھانے چھوڑ دیئے تھے۔ نئی حوصلہ افزائیاں سنسنیوں کے نئے ریبے پیدا کر رہی تھیں اور وہ باجی کے نرم جسم سے نزاکت اور اس کے کانپتے ہوئے نفس سے نشہ پا رہا تھا۔ کمرے کے گاڑھے اندھیرے میں باجی کی گھٹی گھٹی آوازیں تحلیل ہو رہی تھیں۔ نواز کے خشک ہونٹوں کے راستے اس کے سارے بدن میں رس اتر رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ قوس و قزح کے خوبصورت رنگوں میں سے گذرتا ہوا چاند کے پاس پہنچ رہا تھا۔ پھر ایک خوش آیند غنودگی اس پر چھانے لگی تھی اور وہ خوشبوؤں میں لپٹی ہوئی باجی کو اپنے ساتھ لگا کر سو گیا تھا۔

خالق بھائی تو اپنے کام پر جا کر شام کو لوٹتے تھے۔ نجمی کو ان کے آنے کا انتظار اور پھر گھر کا سونا کام کاج۔ زرینہ کو پیار کرنے والی سہیلی مل گئی تھی اکثر شام کو نواز اور باجی ولایت ہی سیر کرتے جاتے تھے۔ نواز بمبئی اور ولایت دونوں کی سیر کرتا رہا اور ولایت کیسے کیسے عمدہ اور نفیس کپڑے پہن کر اس کے ساتھ پھرتی، بی لمبی گتنا اچھا شہر تھا۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپالو بندر پر گھومتے یا جوہو کی گیلی گیلی ریت پر پھرتے کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ عورت کتنی محفوظ تھی وہاں اور پہلی بار جب دونوں نے جا کر ریستوران میں چائے پی تھی تو نواز نے کتنا اصرار کرکے باجی کو سگریٹ پلایا تھا اور وہ کتنی پیاری لگی تھی۔ اس کے ابھرے ہوئے مڑے مڑے ہونٹوں میں سگریٹ کتنا اچھا لگتا تھا اور ہونٹ سے ہونٹ لگنے پر کس طرح اس کی آنکھوں کی پلکوں کی جھلمن سے محبت قہقہے جھانکنے لگتا تھا اور وہ بے قابو ہو جاتی تھی۔ وہ اس کی ایسی ایسی رگوں اور پٹھوں کو گدگدا تی تھی کہ اسے یوں معلوم ہونے لگتا تھا کہ زمین آسمان کے بیچ میں گدگدی ہی گدگدی بھری پڑی تھی۔ لاہور جا کر وہ کس قدر شدت کے ساتھ چاہتا رہا تھا کہ وہی سنسناہٹ پھر پھر اس کے خون میں دوڑتی چلی جائے۔ دراس کی بھر بریاں اسے پھر بے چین کر دیں مگر اسے اطمینان تھا کہ اب باجی اس کی اپنی تھی اور اپنی ہی رہے گی کیونکہ اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ زرینہ سے شادی کرلے گا اور یہی ایک طریقہ تھا باجی کے ساتھ تعلق استوار رکھنے کا ——— اور جب اسے خالق بھائی نے لکھا تھا کہ تمہارا اس ہستہ کے متعلق کیا خیال ہے تو اس نے جھٹ رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ زرینہ بھی کڑاکے کی بولتی ریڑی ہوگی مگر جب دانتوں تلے آئی تو سیلی ہوئی۔ ماں کا بالکل عکس، سرد اور بے حس۔ مگر بے چاری اپنی نشانی چھوڑ کر خود چل بسی۔ تخیل کی سحر کاری کی ان سختی ہوئی کروٹوں میں نواز نے کروٹ لے کر سانتا کروز والے پلنگ پر نظر ڈالی۔ ڈھائی برس کی ننھی منی بچی

لحاف میں پڑی کڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ نواز پھر سیدھا ہو کر لیٹ گیا مگر اب چھت کی کڑیوں سے اسے خوف سا محسوس ہونے لگا جیسے ان کڑیوں نے اس کے تمام رازوں کو اپنے اندر بھینچ رکھا ہو اور وہ جب چاہیں افشا کر دیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک لمبی جمائی بھر کر نعش کی طرح پھیلے ہوئے کوہ مُردار کی بلندیاں اسے فضائی مٹی مٹی روشنی میں نظر آ رہی تھیں۔ ملازم لڑکا جو نیچے ڈیوڑھی میں اٹنگا کوٹ رہا تھا دفعتاً سے دھماکوں کی آواز ختم کر کے سو چکا تھا۔ اس نے سوچا "بابو محلہ اتنی دور تو نہیں مگر عورتیں جب بیٹھ جائیں تو کب اٹھتی ہیں"۔ وہ اگر پھر لیٹ گیا۔ رازوں سے آگاہ چھت کی کڑیاں اسے پھر گھورنے لگیں جیسے وہ اگل دینا چاہتی تھیں، سب کچھ جو وہ دیکھتی رہی تھیں۔ اس نے کروٹ لے لی۔ سامنے کھونٹی پر دو ہاڈیاں ٹنگی تھیں ان کے پاس ہی تازہ اتری ہوئی سفید قمیصیں لٹکی تھی جس کی سطح پر چھوٹے چھوٹے ابھرے ہوئے شکن پہننے والی کے جسم کے کئی حصوں کی غمازی کر رہے تھے، وہ ہمیشہ بھنچی بھنچی فٹ قمیص پہنتی اور جب اتارتی تو اس پر سے سانپ کی اتری ہوئی کینچلی کی طرح اس کے گٹھیلے بدن کا ایک ایک پٹھا گنا جا سکتا تھا۔ کھونٹ پر علیحدہ علیحدہ کئے دھوبی کے دُھلے کپڑے پڑے تھے جن میں مختلف ڈیزائن کی ہاڈیوں کا ڈھیر ننھی بچی کے کرتوں کے برابر تھا۔ اس نے سوچا خیالوں کا اڑن کھٹولا اسے آج کہاں کہاں لئے پھرا ہے اور جب اسے یاد آیا کہ وہ اڑا کہاں سے تھا تو اس نے سوچا کہ اسے ظہیر کی باتوں کی تائید کرنی چاہئے تھی۔ اس نے دل سے کہا۔ آج تو اس نے کسی پارٹی کا ساتھ نہیں دیا۔ بالکل غیر جانبدار رہا تھا۔ ہاں اگر کل ظہیر نے یہی باتیں دہرائیں کہ عورت اچھی بُری حالت میں وہ کچھ کر سکتی ہے جو مرد نشے میں بھی نہیں کر سکتا..... اور اگر بدنشیں بھی اٹھ جائیں تو عورت جسے مقدس کہتے کہتے آپ کا منہ سوکھتا ہے.....

کمرے میں داخل ہوتے ہی ولایت نے میلاد شریف کی شیرینی کا لفافہ تخت پر رکھتے ہوئے اک انداز سے کہا "ابھی تک آپ جاگ رہے ہیں؟ سیمل کے تکیوں کو سر کے نیچے سمیٹتا ہوا نواز یوں اٹھ بیٹھا گویا بالکل خالی الذہن تھا۔ "تمہارے انتظار میں جاگ رہا تھا"

ولایت کی غلافی آنکھوں میں سے ایک گھلاوٹ نے جھانکا اور وہ مڑ کر آئینے میں اپنا آپ دیکھنے لگی۔

شکیلہ اختر

آنکھ مچولی

وہ بچپن ہی سے بہت شوخ و چنچل اور بڑی ہنس مکھ تھی۔ دیکھنے والے اسے دیکھ کر کہتے "ہنستے ہی ہنستے تو گھر بستے ہیں" اور جب اس کی زندگی کا دوسرا اور سب سے اہم دور شروع ہوا تو اس کے تبسم اور زیادہ رنگین ہو گئے اور ہنسی کی پریاں جھنکاریں ستاروں کی طرح تابناک ہو گئیں۔ اسے تنہائی سے وحشت ہوتی تھی اسی لئے وہ رنگ و بو کی طرح ہر محفل پر چھائی رہتی۔ اس کی بھائی کوٹھی سے ہر گھڑی قہقہے بلند ہوتے رہتے تھے۔ اور احاطے میں سائکلوں کی قطاریں لگ جاتیں لیکن وقت اور بے وقت بھرے بھرے رکشوں اور آتے ہوئے موٹروں سے وہ اکتا گئی تھی۔ ایک ہی طرح کے ہنگاموں سے اب اس کا جی گھبرا گیا تھا۔ دن اور رات کے اکثر حصوں میں لوگوں کی طرح طرح کی ٹولیاں اس کے یہاں آتیں۔ کچھ اس کے بھائی کے دوست آتے جن کے آتے ہی ڈرائنگ روم کے پردے کھچ جاتے، برج کا دور چلنے لگتا۔ مونوپلی اور کیرم کے کھیل کھیلے جاتے۔ پھر اس کے دیور اور دوسرے بھائی کے ساتھی آتے۔ موٹی موٹی لال لال جلد والی کتابیں دبائے، کبھی تو ان کے آتے ہی کمرے بند ہو کر پڑھائی شروع ہو جاتی اور کبھی وہ بیٹے اور گیند لے ٹینس لان پر اچھلنے لگتے۔ اور ہر روز شام ہوتے ہی گیارہ گیارہ بجے رات تک اس کے شوہر فیض کے ملنے والے آتے رہتے۔ ڈرائنگ روم ہر آمدہ اور کبھی کبھی سامنے کا احاطہ کرسیوں سے بھر جاتا۔ پھر تو شاعری اور فن شاعری کے جام چھلکتے اور ادب کی باریکیاں بیان ہوتیں۔ فیض کا ذوق ادب بہت بلند اور اس کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ ایک کامیاب ادیب تمام پہلوؤں کے افسانے، ڈرامے، تنقید اور نظموں میں زندگی کی جاگتی ہوئی لہریں رواں اور دواں رہتی تھیں۔ کبھی زندگی کے اہم اصول اور دنیا کے نظام پر نکتہ چینی ہوتی، کبھی دو ٹوٹا ئی جاتیں اگھرے اور دقیق مسئلوں اور ان کی باریکیوں پر تبصرے ہوتے۔ قہقہے گونجتے۔ ہنسی کی لہریں اٹھتیں۔ اس کی کوٹھی میں زندگی لہراتی رہتی مگر یہ سب کے ہوتے ہوئے بھی وہ گھر کے اندر اپنے کو ایک بے تعلق و سیع خلا میں تنہا محسوس کرتی۔ ایک عرصہ تک انہی قہقہوں اور ہنسی کی انہی موجوں میں اپنے کو فریب دیتی رہی تھی اور دیر دیر تک پردے کے پیچھے کمرے کے دریچے پر بیٹھی ان کی باتیں سنتی، ان کے تماشے دیکھتی۔ اور بیل کے شربت، انڈے کے حلوے، ناشتے اور چائے سے ان کی خاطریں کرتی رہتی تھی۔ پس پردہ، اس نے ان رنگینیوں میں اپنے آپ کو بہلانا چاہا تھا۔ مگر اب اسے اس گھر سے وحشت ہونے لگی تھی۔ یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ زندگی کی شاہراہ پر ایک پُر رونق کلب تھا اور اس کا جی چاہتا کہ اس کا اپنا بھی کوئی گھر ہوتا۔ بارہ سال کا ایک طویل عرصہ وہ اس کلب میں گذار کر اب تھک گئی تھی۔ تاش کے پتے، کیرم کی گٹا کھٹ اور مونوپلی کی اہمیت میں وہ اپنی زندگی کی شکست ہی شکست دیکھ رہی تھی۔ بیٹے اور گیند کی برابر

مذہب نے اس کے دل کو مجروح کر دیا تھا اور دنیا، اور نظامِ حیات کے گہرے گہرے تعصبوں نے اس کی زندگی کے ہر تار و پود کو جھنجھوڑ کر کچل دیا تھا۔ گھر میں اتنے مہنگے مول کے ہوتے ہوئے بھی وہ بخدا ایک احاطہ۔ لیلہ میں ایک اکیلی ٹھٹھ درخت تھی۔ اور ڈرائنگ روم کی حسین آرائش سے وہ اکتا گئی تھی، اپنی تنہائیوں سے پریشان ہو کر وہ دن بھر میں کتنی کتنی دفعہ اپنے ہاتھوں سے گھر کی ایک ایک چیز جھاڑتی رہتی تھی۔ گمان ساری چیزوں سے اب اس کا دل بھر گیا تھا، ایک مدت سے ان لٹکتی ہوئی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھر گئی تھیں۔ آتش دان پر رکھے ہوئے خوبصورت گلدانوں پر مہین مہین گرد سے دیکھ کر بھی اب وہ بے پروا رہتی تھی۔ کارنس پر سجائی ہوئی گڑیاں بارہ سال سے یوں ایک ہی طرح سے بے حس پڑی تھیں۔ رنگ برنگ کی بچکڑے اور مٹی کی گڑیاں، جنگلے کپڑے نمک کی طرح گل کر اب چھٹتے جا رہے تھے اور ان کے چہرے پر جگہ جگہ سے خراشیں پڑ گئی تھیں مگر وہ بے حس و حرکت تھکے ہوئے انداز میں بارہ سال کی طویل مدت سے مسکرائے جا رہی تھیں۔ اس کو محسوس ہوتا جیسے وہ خود بھی مٹی یا کچڑے کی ایک بے جان گڑیا ہے، اس پر بھی ایک جگ بیت گیا تھا اور وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی سرک نہ سکی تھی۔ اس کی روح کی دھجیاں بھی تار تار ہو چکی تھیں، اور مٹی کی گڑیوں کے چہرے سے کہیں زیادہ ..... مگر پھر بھی اس کے دل پر پڑ گئی نہیں۔ انہی کی طرح اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ وہی مُردنی سی بے جس مسکراہٹ، اب تک وہ انجان طور پر ایک بچہ کی طرح ان کھلونوں سے کھیلتی رہی تھی، نقلی جملے نے، اور مٹی کی بے جان گڑیوں سے۔ مگر یک بیک اتنے دنوں کے بعد اب اس کا جی اکتا گیا تھا۔ بے اختیار یہ چاہنے لگا تھا کہ کمرے کے ان ریشمی پردوں سے لپٹ لپٹ کر کوئی جھولنا رہے، اس کی روح کو ایک طوفان کا انتظار تھا اور وہ اس آندھی میں گھر کی ایک ایک چیز کو تہ و بالا دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی لمبا چوڑا جھکڑ چلتا ہوا سارے نفیس تصویروں کو گرا کر چکنا چور کر دے اور اس کا منہ چڑاتی ان مسکراتی ہوئی بے حس گڑیوں کو توڑ توڑ کر کوئی اس کی ٹانگوں سے انہیں دور نہ کر دیتا۔ وہ چاہتی تھی کہ تیز اور کرخت آندھیاں اور دھوپیں اور سنگار دان کے شیشے پر بڑے بڑے دھبے پڑے رہتے، اس صاف ستھری اور جھلملاتی چھوٹی کوٹھی سے اب اس کا جی اکتا گیا تھا۔ وہ کوئی تبدیلی چاہتی تھی۔ ایسی اہم تبدیلی جو گھر کے کونے کونے پر چھا جائے۔ لمبے بانسوں والی ریڈیو کے ایریل دیکھتے ہی جیتا جاگتا اس کا دل چاہتا کہ گھر کے ایک ایک حصے میں وہ رسّی کی بھدی بھدی الگنی تان کر ان پر نہ جانے کتنے بے شمار کپڑے پھیلا دے عجیب عجیب طرح سے بے تکے کپڑے جو کبھی اس گھر میں استعمال نہ ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ اس کو الجھن بے کاری کھلتی رہتی۔ سارا کا سارا دن پڑا رہتا۔ وہ کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتی۔ ایک ہی طرح سے آخر کتنی دیر وہ لکھتی رہتی۔ لکھی ہوئی سطریں جب اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتیں تب وہ اٹھ کر اکیلی کوٹھی میں بے مقصد چکر لگاتی، باورچی خانہ کے در پر کھڑی نوکروں کی باتیں سنتی، ٹاکیہ کی آواز سنتے ہی وہ خود ڈاک لینے چلی جاتی۔ تہ کاری والی دھوبنوں اور دودھ والیوں سے وہ خواہ مخواہ ہی مہمل باتیں دیر دیر تک کرتی رہتی۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے کی خود داری کو ٹھیس لگتی اور وہ تلملا کر رہ جاتی۔ ایسی باتیں اس کی شان کے خلاف تھیں۔ پھر وہ کیا کرتی کچھ وقت تو جیسے تیسے کر کے گزر جاتا تھا۔ مگر آخر کب تک ایک ہی شاہراہ پر کھڑی رہ اپنے کو فریب دے سکتی تھی ——— !

اس کی کوٹھی سے لگی ہوئی دوسری کوٹھی میں گھوش بابو نے خوبصورت ناولک سے، خوش نظر اور خوش سلیقہ، ان کی کوٹھی اور احاطے کا ہر کونا گلزار جنت بنا رہتا، جنہیں پھولوں سے فطری طور پر ایک مجذوبانہ عشق تھا، وہ خود بھی اسی شوق کے ایک شگفتہ سے پھول نظر آتے اور ان کی بیوی اس گلدستے کے سارے پھولوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور حسین پھول تھیں، وہ سچ مچ میں ایک گلدستہ جیسے لگتے۔ شگفتہ، خوبصورت رنگین اور خاموش ——— ایک گہرا سکون ان کی کوٹھی کے ہر وقت چھایا رہتا، مگر جب سے نغمانہ گلاب ان کے درمیان آ گیا تھا تب سے ان کے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی، دبلا پتلا حسین سا بچہ جب خوش خوش نئے بعد اپنے کمرے کے دریچے پر کھڑا ہو کر "ماں" "ماں" کہہ کر شور مچانے لگتا تو ایک دن پروین اپنے دریچے سے پکار کر بولی "گلاب! ماں نہیں امی بولو ای ..... اور یہ اس کا گلاب تھا جس نے بھی اسی سے رٹنا تھا۔ جنہی منہی انگلیوں سے دریچے کے جنگلے کو پکڑے وہ ایک روز تک تو چپ چاپ سے وہ پروین کی امی امی کہتی ہوئی آواز کو سنتا رہا، اس کے بعد ہنسے دریچے کے سفید پردے کے اوٹ سے اچک اچک کر چیخنے لگا "امی! امی! پہلے تو پروین نے سمجھا کہ گلاب بابا صبیح ادکر رہا ہے، مگر جس دن اس نے یہ محسوس کیا کہ سارا سارا دن اور کبھی رات کو بھی امی امی کہہ کر وہ خود اسے پکارنے لگا ہے تو ایک عجیب سی تڑپ اس کے

دل میں پیدا ہوئی ۔"امی ۔ امی" یہی پیاری سی آواز سننے کی دُھن کتنے دنوں سے منتظر تھی ۔ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اس کی رُوح میں پُرخلش انگڑائیاں آنکھ مچولیں کر اس آواز نے اسے ہر لمحہ طور پر بیدار کر دیا تھا ۔ یاقوت کی طرح سُرخ لب اور پھٹی پھٹی سیاہ آنکھوں والا حسین سا بچہ جب اس سے لپٹ لپٹ کر کہتا "امی تو وہ اکیلے میں اس کے سفید گالوں پر اپنے بھیگے ہوئے رخسارے رکھ کر کہتی ۔ "میرا گلاب ۔ میرا گلاب ۔" وہ اس کے سارے گھر میں ایک تتلی کی طرح دوڑتا رہتا ۔ اور جب گھوش بابو کی بیوی گلاب کو پروین کے پاس رکھ کر گھوش بابو کے ساتھ کسی اچھی سی انگریزی فلم دیکھنے چلی جاتیں تو پروین تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جاتی تھی کہ گلاب کسی کا بچہ تھا ——— ! اسی گلاب اور گلاب کی مسلسل پکاروں نے اس کی رُوح میں ایک خلفشار مچا دیا تھا ۔ !

یک بیک بارہ سال کی طویل مدت کے بعد پروین نے اپنے میں ایک مبہم سی تبدیلی محسوس کی اور یکایک اس کا دل نئی نئی کیفیتوں سے ہم آہنگ ہونے لگا ۔ رستے ہوئے جذبات نے ایک دھارے کی طرح اس کی رگ رگ میں ہل چل مچا دی تھی ۔ اور وہ اپنے خواب و خیال کے حسین تصورات میں کھوئی ہوئی سی رہنے لگی ——— "امی ۔ امی" کہتا ہوا گلاب جب اس کی گود میں آنے کو مچلنے لگتا تو وہ اسے آہستہ سے تھپتھپا کر بہلا دیتی "——— گلاب ! تم گلاب ہونا ! اور تمہیں ایک ننھا چنبیلی کا پھول دوں گی لوگے نا ؟" ——— پھر اس کی نگاہیں چنبیلی کے اس حسین ننھے پھول کے تصور پر جم جاتیں ۔ نازک خوبصورت ننھا سا چہرہ ۔ بڑی بڑی معصوم سی آنکھیں ، سر پر اسی کی طرح گھنگریالے بال ، چھوٹی چھوٹی انگلیوں والا مہندی لگا ہوا سا پاؤں کبھی ہنستا کبھی ملکتا ہوا پھول کی پنکھڑیوں جیسا یا قوتی ہونٹ" ——— یہ سب کیا ہو رہا تھا ۔ کیسے ہو رہا تھا ۔ وہ ایک آرٹ کی تخلیق کر رہی تھی ۔ اور اسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسا شاہکار بنا رہی ہے ۔

فیض نے جب یہ خبر سُنی مسرت سے وہ جھوم گیا ۔ پھر اس کی بڑی بڑی خاطریں ہونے لگیں اس کے سونے کے کمرے میں سُرخ شاداب امریکن سیب خوش رنگ تارنگیاں اور بلدرکی طرح چمکتے ہوئے داغوں والے انگور کے خوشے رکھے جانے لگے ۔ فیض حُسن کا پرستار اور شہر ادب کا ایک کامیاب آرٹسٹ تھا ۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ فیذ سے بیدار ہوتی ہوئی پروین کی نگاہوں کا پہلا ٹھہراؤ حسین اور لطیف ہوا اور رنگینیوں اور شادابیوں کی آمیزش وہ پروین کے اس آمٹ میں دیکھنا چاہتا تھا ——— !

پروین اپنے دل و دماغ پر چھائے ہوئے کیف و سُرور سے گھبرا کر کبھی کبھی سوچتی کہ دنیا کی اس پرانی روایت کو وہ اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے ایک ایک گلی میں کتنے کتنے بچے پڑے ہوئے تھے پیسے میں دودھ بیچنے والی گڑکی مٹھائی اور ریوڑیاں بلاتے ہوئے بچوں کی اس دُنیا میں کوئی کمی نہ تھی ۔ اور ایک ہی وقت میں ان دونوں پر کتنی کھیاں بھنبھنا رہی تھیں ۔ شاید خود عرصہ ہی انتظار طویل ہو کر اپنی قدر کرانے لگتا ہے ۔ اور اگر یہ بارہ سال کا ایک جگ نہ بیت جاتا تو چنبیلی کا نازک سا پھول اس کے لئے اتنا خوشبودار نہ ہوتا ۔ اسی لئے بیچارہ گلاب چھوٹے چھوٹے سے قصور پر بھی اکثر پٹ جایا کرتا تھا ۔ پھول کی ایک گلی اور ایک کالے سے لگین توڑ لینے کے جرم میں گھوش بابو نے اسے کئی دفعہ مارا تھا ۔ گلاب کے لئے صرف پروین کی ایک اکیلی گود ہی پُرسکون تھی وہ اپنی سزاؤں کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ کبھی قصور بے قصور بلا کسے سُنے بھی اپنے ہاتھوں سے دونوں کان پکڑے وہ اپنے مخصوص کونہ میں کھڑا ہو جاتا ۔ مگر جب اس کو اکیلے کمرے میں بند ہونے کی سزا دی جاتی تو وہ دریچے پر چڑھ کر زور زور سے پکارتا ——— "امی امی !" اور پروین اپنے سارے کام کو چھوڑ کر اپنے کمرے کے دریچے سے لگ کر گلاب کے سامنے کھڑی ہو جاتی ——— پھر گلاب اپنی زبان میں شکایت شروع کر دیتا ——— "امی ! امی ! ہم کو ماں ۔ بہن نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی پروین کو ایک لطیف انتظار تھا ۔ وہ بیٹی لیڈی سوچتی رہتی اور بہت سے خوبصورت نازک نازک سے معصوم بچے اس کے پاس چکر لگاتے ۔ کبھی نزدیک اور کبھی اس سے بہت دُور ۔ اس کے گرد منڈلاتے ہوئے ننھے ننھے سے کملاتے ہوئے بچے کبھی کبھی اس کی رُوح سے سرگوشیاں کرتے "چنا بنی پھول" اسے ٹیگور کی کہانی یاد آ کر دکھلا دیتے پھر اسے لگتا جیسے برسوں سے چھپے ہوئے اس کے ہونٹ پھول جیسے بچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اب اس سے بہت قریب آ رہے تھے "امی تا !" ——— !! اسے گھر کے کونے کونے سے یہی آواز آتی ہوئی محسوس ہوتی ——— "امی تا" ——— "امی تا" ——— لیکن اس آواز کے ساتھ اس کو فسانہ کی وہ بچی یاد آ جاتی جسے تابوت نہ آتا تھا

اور وہ الماری، شلف اور کواڑوں کے پیچھے چھپ چھپ کر اپنی ماں سے بس یہی ایک کھیل کھیلا کرتی "امی چیکو" ——— "امی چیکو"۔ اور اس کی ماں جان بوجھ کر اسے ڈھونڈ نہ پاتی، مگر اس بچی کی آیا اس منحوس کھیل کھیلنے سے ان کو اکثر منع کرتی تھی اور آخر ایک دن بخار میں مبتلا ہو کر وہ ننھی "امی چیکو" "امی چیکو" کہتی ہوئی وہ بچی اپنی ماں کی ڈھونڈتی ہوئی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے چھپ گئی تھی۔ اور اب یہی تکلیف دہ آوازیں کوٹھی کو سنائی دے رہی تھی۔ سارے لوگ خوش تھے زندگی کی ایک مچلتی ہوئی لہر گھر بھر میں دوڑ گئی تھی ——— وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی لیکن نقاہت کے اس پردے میں اس کی جیالی مسرتیں چھپی ہوئی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں کی طرح اس کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ فیض نے بار بار اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہا مگر پدین کو ڈاکٹر کے نام سے وحشت ہونے لگتی۔ ایک مبہم سا خوف اس کے سارے جسم کو کپکپا دیتا۔ شاید، شاید یہ اس کی روح کا ایک فریب ہو۔ اور اگر یہ صرف ایک خواب تھا تو وہ اسے ہمیشہ اپنی آنکھیں بند کئے دیکھتی رہنے کی آرزومند تھی ——— اس کی سنہری کے چاروں طرف دیوار میں خوبصورت سے فریم میں کئی تصویریں فیض نے لاکر خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے لگائی تھیں کسی کے بال گھنگریالے تھے، کوئی گھونگھریالے بچوں والا بچہ منہ پھاڑے ہوئے ہنس رہا تھا اور کسی کا مسکراتا ہوا پیارا سا چہرہ کوئی جھک کر اس کی گود میں آنے کو مچل رہا تھا اور کسی طرف سے بلکتا ہوا بچہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے پکار رہا تھا ——— پدین کو ان تصویروں سے شدید طور پر محبت ہو گئی تھی۔ یہ سارے بچے اسی کے تھے صرف اسی کے بارہ سال سے چھپے ہوئے یہ ہنستے، بلکتے اور جھکتے ہوئے لاتعداد سارے بچے ایک ہی دفعہ اس کی خالی گود میں آنے کو مچل رہے تھے، پدین انہیں دیکھ کر کبھی کبھی تڑپ سی جاتی۔ وہ ان کے نزدیک جاتی پھر لے پھر لے گالوں اور باتی ہوئی ننھی ننھی انگلیوں کو دیوانہ وار چوم کر کہتی "میرے بچے بھولے لالی میں کیسے تمہیں اپنے کلیجے میں بٹھاؤں" ——— سجے ہوئے کمروں کو دیکھتی ہوئی وہ انتظام مریض ——— تمہاری سفیدیاں میرے دل پر چھا کے لگاتی رہی ہیں، اب یہاں ہر ہر جگہ دھبے نظر آئیں گے، دودھ کی شیشی رہے گی جو لکھن کی بوتلیں رہیں گی اور دکھتی ہوئی انگیٹھی اور ہر طرف اس کی راکھ بکھری پڑی رہے گی وہ اس کو ٹھی کا منہ چڑا کر بہت سی انگلی اٹھائے گی اور ان کمروں پر بھی بہت سے بے ہنگم سے کپڑے پھیلے رہیں گے۔ اس گھر کی ترتیب دار صناعی سے وہ تھک گئی تھی۔ اسی لئے ہر ہر طریقے سے وہ اپنی روح کی اس بیزاری کا اعلان کرے گی ——— گلاب بہت زیادہ نزدیک وہ کراب اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ پدین کی نگاہیں پھولوں کے حسین ڈھیر میں اپنے لئے ایک انوکھے پھول کا انتخاب کر رہی تھیں۔ مگر اس کا وہ لوکھا ہوا پھول اس کے تخیل سے بھی بہت بلند تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکر کاٹتے رہتے کبھی تصویر میں جھیل کی نازک پنکھڑیوں کی طرح ننھے ننھے سے ہاتھوں کو مچلتا بانہ چومنے لگتی اور کوئی "امی! امی" کہتا ہوا اس کے کلیجے سے لپٹ جاتا مگر کبھی یاس کے ہیبت ناک جھولے میں اس کا مضطرب دوڑتا ہوا دل مچل کے کہتا "ہاں" "نہیں" ——— جھولے کی پرانی رسی ہر ایک پینگ لینے پر مچل رہی تھی اور پدین یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ "ہاں" اور "نہیں" کے کس کنارے پر گرے گی۔ کاش یہ پہچاتی ہوئی رسی کبھی نہ ٹوٹے اور وہ "نہیں" سے گزرتی ہوئی بھی "ہاں" کے دلکش کناروں سے ٹکرا کر جھولتی رہے ——!

گلاب کی ایک ٹوٹی ہوئی ننھی سی ٹہنی گھنوش بابو نے گلاب کے ہاتھ میں دیکھی۔ باپ کی نگاہوں کو پہچان کر گلاب سہم گیا۔ گھنوش بابو اپنا غصہ برداشت نہ کر سکے وہ زور سے چلائے "نکلو یہاں سے، نکلو یہاں سے" گلاب اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی حسین آنکھوں کو اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے ملتا ہوا وہ اپنے گھر کے پھاٹک سے باہر نکل آیا اور روتا ہوا گلاب دوسرے پھاٹک سے ہو کر سیدھا پدین کے پاس چلا آیا اور اس کی گود میں منہ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگا۔ پدین کی آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں اور وہ فطرت کی اس تقسیم کو اپنے سینے سے لگائے اسے نرمدہ نرمدہ سے بھینچ کر پیار کر رہی تھی۔ گلاب بچہ اپنے کھیل میں لگ گیا۔ وہ کمرے میں دوڑ دوڑ کر چوں چوں کر کے چھوٹتی ہوئی گوریا کو پکڑنے لگا اس نے گوریا کی دم پکڑنی ہی چاہی تھی کہ اس کے ہاتھ کی ٹھوکر سے میز پر رکھا ہوا گلاس چھن سے گر کر چور چور ہو گیا۔ گلاب اپنی جگہ پر سہم گیا۔ ایک بیک اس کے ننھے ننھے ہاتھ اور پاؤں اور وہ ایسے "ماں کو پکڑے کو سنے میں کھڑا ہونے کو جا رہا تھا کہ پدین دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا "میرا بچہ میرا لال آ دیدین کو تو یہ چھن" کی آواز بڑی پیاری لگی تھی اور کاش وہ اس پیاری سی آواز کو ہر وہ سنتی رہتی۔ گلاب کے لئے اس کے قصور پر پدین کا اتنا پیار باندھ

ایک نئی چیز تھی۔ وہ اسے حیرت سے تکتا ہوا اپنا سفید سفید ہاتھ پروین کے گلے میں ڈال کر محبت بھری خوشامد سے کہنے لگا: "امی! امی!"

پروین کی صحت کی کمزوری سے گھبرا کر آخر فیض نے لیڈی ڈاکٹر کو بلا ہی لیا۔ ذبح ہوتا ہوا بکرا جس طرح قصائی کی چمکتی ہوئی چھری کو دیکھ کر لرز جاتا ہے۔ اسی طرح پروین لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر کانپ گئی۔ امیدوں کے جھولے میں زور زور سے پینگیں پڑنے لگیں اور جھولے کی وہ پرانی مچھاتی ہوئی رسّی اس کے سامنے ٹوٹتی ہوئی سی لگ رہی تھی "ہاں" نہیں" دونوں کناروں سے اس کی رُوح زور زور سے ٹکر کھا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا کہ وہ اپنا آخری انجام نہ دیکھ سکے۔ جھولے کی رسّی ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس کی رُوح میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس کو لگا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا گئے ہیں۔ کوٹھی کے سفید چونے اور کمروں کی سجاوٹیں اس طوفان میں بجلی کی طرح رہ رہ کے چمک رہی تھیں۔ ہنستی، ہلکتی اور ہمکتی ہوئی تصویریں گہری تاریکیوں میں کھینچی جا رہی تھیں۔ ایسے اندھیرے اور ایسی آندھی میں اس کے کانوں میں ایک آواز آئی "امی" تا اور اس کی دیوانہ وار رُوح بیتابانہ طور پر دوڑتی ہوئی لمبے چکر کاٹنا چاہ رہی تھی مگر اس بڑھتے ہوئے طوفان میں آواز کا فاصلہ دُور ہٹتا جا رہا تھا "امی تا" "امی تا" اور پھر ہولناک اندھیرے میں یہ آواز ہلکی ہوتی ہوتی ڈوب کر رہ گئی ——— ! فطرت اتنے دنوں تک پروین سے ایک ہولناک آنکھ مچولی کھیلتی رہی تھی اور پروین کے بے بس ہاتھ "امی تا" کی اس آواز کو نہ پکڑ سکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تکیہ سے لپٹی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "میرے بچے میرے لال"

ہنس راج رہبر

اب اور تب

شہر بتی کا سر ننگا تھا اور بال قدرے بکھرے ہوئے تھے۔ جنھیں وہ بائیں ہاتھ سے گاہے گاہے درست کر لیتی تھی۔ ورنہ اس کی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز تھی۔ ماحول سے بے نیاز وہ رضائیاں پیٹنے میں منہمک تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کون بخت کہ کے وہ جتنی رضائیوں میں دھاگے ڈال دیگی اتنے ہی جیسے اسے مل جائیں گے۔ پہلے روز وہ بمشکل ایک رضائی میں دھاگے ڈال سکی تھی۔ لیکن اب دو میں ڈال لیتی تھی۔ اور اپنے کام کی رفتار اس سے کم ہونے دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اس کا ہاتھ جلدی جلدی چل رہا تھا۔ اسے تن کی سُدھ بھول گئی تھی۔ وہ ایک قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ اور رضائی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوم رہی تھی۔ جہاں بیٹھ کر اس نے کام شروع کیا تھا۔ وہ وہیں زمین پر پڑا رہ گیا تھا۔ جس کی اسے مطلق پروا نہ تھی۔ کیونکہ سر کو ڈھانپنے کی فکر کرنے سے کام میں ہرج واقع ہوتا تھا۔ کام ادھورا رہنے سے ٹھیکیدار آدھی مزدوری کاٹ لیتا تھا۔

سرکار فوج کے لئے رضائیاں تیار کروا رہی تھی۔ کام ٹھیکے پر ہو رہا تھا۔ روئی بھرنے کے بعد انھیں سینا درکار تھا۔ چنانچہ قرول باغ کے معزز کرنے پر جو کئی بستی آباد ہوئی ہے وہاں ایک کھلے میدان میں رضائیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اور سینکڑوں عورتیں ان میں دھاگے ڈالنے کا کام کر رہی تھیں۔ ان میں سے اکثریت مزدور عورتوں کی تھی جو برسوں اور پشتوں سے مزدوری کرتی چلی آ رہی تھیں اس لئے محنت مزدوری کرنا ان کی عادت بن چکی تھی۔ اس کام میں انھیں ذرا بھی جھجک یا شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ اطمینان سے رضائیاں سی رہی تھیں۔ اور ان کے بچے قریب ہی کھیل رہے تھے۔

لیکن ان میں کافی تعداد ایسی عورتوں کی بھی تھی جنھوں نے پہلے پہل اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ محنت کو اُجرت میں تبدیل کرنے کا ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ انھیں اس جگہ تک پہنچنے میں بہت کچھ ذہنی تذبذب اور روحانی کش مکش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور جب آئی تھیں تو ان پر ایک غیر قدرتی احساس طاری تھا۔ سانس بھولی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے کوئی دیوار پھاندنا پڑی ہو بہت سے اصول توڑے ہوں۔

شربتی بھی ایسی ہی عورت تھی اس نے بہت ہی نامساعد حالات میں محنت مزدوری کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور جب پہلے روز اپنے خاوند کرپا رام سے کام پر آنے کی اجازت طلب کی تھی تو اس پر ایک دم سناٹا سا چھا گیا تھا۔ جیسے اس کی رُوح کو بجلی نے چھُو دیا ہو۔ اس پر کافی دیر تک سکتے کا سا عالم طاری رہا۔ جب شربتی نے اپنی بات ایک بار پھر دہرائی تو اس نے بے بس اور مغموم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور چُپ رہ گیا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ جب شربتی چلی گئی تو وہ کافی دیر تک اسی حالت میں بیٹھا نہ معلوم کیا سوچتا رہا۔ اور دل ہی دل میں کُڑھتا اور جھنجلاتا رہا۔

کرپا رام مغربی پنجاب سے اُجڑ کر دہلی آیا تھا۔ کافی دیر تک وہ شرنارتھی کہلاتا رہا۔ لیکن اسے اور اس کے اکثر بھائیوں کو اس نام سے چڑ تھی۔ کیونکہ وہ کسی کی شرن میں نہیں آئے تھے۔ وقت کی ایک طوفانی اور خوفناک لہر نے انھیں یہاں لا پھینکا تھا۔ اس لئے حکومت نے ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے انھیں پُرشارتھی کہنا شروع کر دیا۔ لیکن کرپا رام کو یہ نام بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ نام اور الفاظ کیا ہیں اپنی موجودہ زندگی تک سے کوئی اُنس نہیں تھا۔ وہ صرف کرپا رام تھا۔ اور اسے اکثر اپنا ماضی یاد آتا تھا۔

مغربی ضلع کے ایک گاؤں کلورکوٹ میں اس کی دوکان تھی۔ قصبہ کی آبادی دو ڈھائی ہزار کے لگ بھگ تھی۔ چار پانچ گھر ہندوؤں کے تھے باقی سب مسلمانوں کے لئے۔ کرپا رام کا کاروبار خوب چلتا تھا۔ گھر کے مکان اور مویشی تھے۔ دوکان کے علاوہ بیچ کا چوپار تھا۔ وہ وہاں بیٹھے رہتا تھا۔ یہ سارا کاروبار اُسے اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملا تھا۔ اور وہ ان کی دی ہوئی جائداد میں اضافہ کر رہا تھا۔

گاؤں کے مرکز میں اس کا پکا مکان تھا۔ جس میں متعدد کمرے تھے اور ایک تہہ خانہ تھا جس میں وہ نقد روپیہ اور زیورات چھُپا کر رکھتا تھا۔ زیورات شربتی کے نہیں گاؤں کی عورتوں کے تھے۔ لوگ انھیں اس کے پاس گروی رکھ جاتے تھے۔ لیکن ایک بار اس تہہ خانے میں پہنچکر باہر کم نکلتے تھے۔ اپنے زیور اور قیمتی کپڑے رکھنے کے لئے شربتی کے پاس ایک آہنی صندوق تھا جو دو مضبوط تالوں سے مقفل رہتا تھا۔

کرپا رام کے نزدیک شربتی بذاتِ خود ایک ایسی شے تھی جسے روپے پیسے اور زیوروں کی طرح چھُپا کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ بلکہ روپے اور زیوروں سے کہیں زیادہ۔ کیونکہ اس کے ساتھ خاندان کی عزت منسوب تھی۔ اس لئے کرپا رام نہایت مستعدی سے شربتی کی حفاظت کرتا تھا اور اس کی ہوا تک مکان سے باہر نہیں نکلنے دیتا تھا۔ کیا مجال غیر مرد کا سایہ تک اس پر پڑ جائے۔

جب تک گاؤں میں اسے اپنے مکان کے اندر رہنا نصیب تھا وہ شربتی کی یونہی حفاظت کرتا رہا۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کا کام خاوند کی خدمت کرنا تھا۔ جب سے وہ بیاہی آئی تھی کرپا رام نے کبھی بھی اپنی دھوتی خود نہیں نچوڑی تھی۔ خانہ داری کا سب کام اسے کرنا ہوتا تھا۔ کرپا رام کا فرض اس کے کام کی داد دینا نہیں بلکہ اس میں نقص نکال کر سو طرح برس پڑنا تھا۔

شربتی حسین تھی۔ درمیانہ قد۔ سڈول اور متناسب جسم، گول چہرہ، گورا رنگ اور موٹی موٹی آنکھیں۔ یہ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ اس پر جوانی کب آئی۔ کیونکہ چھوٹی عمر ہی میں اس کی شادی کرپا رام سے ہو گئی تھی جسے کسی طرح بھی قبول صورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا جسم بھاری اور رنگ سیاہ تھا۔ چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اور ہونٹ موٹے تھے اس کے علاوہ اسے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کی کھال بھینسے کی کھال کی طرح سخت اور کھردری ہو۔ اس کے اعضا میں گھلاوٹ اور ملائمیت کا نام تک نہیں تھا۔ روح تک بے حسی کے خول میں لپٹی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اسے اپنی جائداد اور دھن دولت پر ناز تھا۔ اس کے بل بوتے پر وہ آسامیوں پر جبر کرتا تھا۔ اور خود شربتی پر جبر کرتا تھا وہ اپنے کاروبار کو توسیع دے کر بہت بڑا سیٹھ بن جانا چاہتا تھا۔ جس طرح ہر کھاتے پیتے خوشحال مرد کے گھر میں بیوی ہوتی ہے۔ اس کے گھر میں بھی شربتی موجود تھی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس نے کبھی اس کی دلجوئی نہیں کی۔ اس کے حُسن کی تعریف نہیں کی۔ اسے عورت بھی ماں باپ سے وراثت میں ملی تھی۔

لیکن جب ملک تقسیم ہوا تو اسے اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا اور وہ جائداد بھی چھوڑنی پڑی جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ بصد مشکل چند زیور اور کچھ روپیہ بچا کر لا سکا تھا۔ یا پھر شریمتی اس کے ساتھ آ گئی تھی۔ جگہ جگہ کی ٹھوکریں کھاتا ہوا وہ دہلی پہنچ گیا۔ اور آخر وہیں رہنے لگا۔

کچھ دن رفیوجی کیمپ میں گذارے۔ وہاں سرکار کی طرف سے راشن مفت ملتا تھا۔ اور کرایہ وغیرہ بھی نہیں دینا پڑتا تھا۔ اس لئے گانٹھ کا پیسہ محفوظ رہا۔ مگر وہاں ایک مصیبت تھی۔ اور یہ مصیبت اسے اپنے آجڑنے سے بھی زیادہ کھٹکتی تھی۔ یہاں شریمتی کو پردے میں رکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہر کس و ناکس کی نظر اس پر پڑتی تھی اور وہ بھی بے حیائی سے مسٹر مسٹر دوسروں کی طرف دیکھتی رہتی تھی جیسے عجائب گھر میں آ گئی ہو۔ جیسے اس نے جب سے پیدا ہوئی ہے، لوگ نہ دیکھے ہوں۔

سامنے والے کیمپ میں شیو نرائن کا جو ملگھراج رہتا تھا اسے دیکھ کر کرپا رام بہت کڑھتا تھا۔ جی میں آتی تھی کہ اس پر کوئی الزام لگوا کر کیمپ سے نکلوا دے، انڈیمان بھجوا دے۔

ملگھراج کی مردانہ شبیہہ جاذبِ نظر تھی۔ وہ تندرست اور خوبصورت تھا۔ اور پچیس چھبیس سال کا نوجوان تھا۔ ہنس مکھ اور ملنسار واقع ہوا تھا۔ سب کے ساتھ گھل مل کے رہتا تھا۔ ہمدردی سے پیش آتا تھا۔ دوسروں کا چھوٹا موٹا کام کر دینے میں بھی اسے کوئی دریغ نہ تھا۔ کیمپ کے سب لوگ اس کی تعریف کرتے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے اس سے ہنس ہنس کر بولتے تھے۔ لیکن کرپا رام کو وہ چالاک اور حیلہ باز نظر آتا تھا۔ ورنہ کیا مطلب کہ وہ یوں عورتوں سے چہل پہل باتیں کرے اور ہنسے۔ جب وہ شریمتی سے باتیں کرتا تو کرپا رام کی چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا۔ اور آگے سے شریمتی کا مسکرانا تو بہت ہی ناگوار گزرتا۔ اس کے نزدیک بے حیائی کی انتہا تھی۔ وہ اس حرکت کے لئے شریمتی کو کئی مرتبہ سخت سست کہہ چکا تھا۔ لیکن شریمتی کو اس کی مطلق پروا نہ تھی۔ وہ اسے اکثر ملگھراج سے ہنستے اور باتیں کرتے دیکھتا تھا۔

ایک ملگھراج ہی کیا۔ وہ اسے کس کس سے باتیں کرنے سے روکے۔ طرح طرح کے لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔ سبھی مل جل کے رہتے تھے۔ میدان میں کیمپ لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ پھر ایک دوسرے سے دکھ سکھ کہتا ہوتا تھا۔ عام طور پر چولہے چکی کی چیزوں کی بھی کمی تھی۔ جو کچھ برتن بھانڈے بچا کر لا سکے تھے انہیں عورتیں آپس میں لے دے کر استعمال کرتی تھیں۔ شہر کے لوگ ربط ضبط بڑھانے میں خاص طور پر تیز واقع ہوئے تھے۔ بات کرتے ذرا نہیں جھجکتے تھے "بہن جی تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟ سب خیریت سے تو آ گئے؟" وغیرہ وغیرہ قسم کے سینکڑوں سوال پوچھتے اور جواب دینا ہی پڑتا۔ ان کی عورتیں بھی کتنی چرنچال تھیں۔ بھرکی کی طرح اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی تھیں۔ سر ننگے، صرف بلاؤز اور پٹی کوٹ پہنے ہوئے کھلے بندوں سامنے نل پر کپڑے دھوتیں اور مردوں کی طرح صرف ایک کپڑا زیب تن کر کے نہانے لگتیں۔ مرد چاہے تو نگاہ نیچی کر لے۔ مگر ان کی نگاہیں ذرا نہ جھکتیں۔

کرپا رام شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اس دلدل سے دُور بھاگ جائے۔ اس نے ہم کیمپوں سے بارہا شکایت کی تھی کہ عورتوں کو اس بے حیائی سے روکا جائے۔ یہ سب کچھ تہذیب کے خلاف ہے۔ ہم نے بڑوں کی مریادا چھوڑ دی ہے۔ تبھی تو یہاں تک بیتے ہیں۔ لوگ اس کی باتوں پر مطلق دھیان نہ دیتے۔ لیکن وہ رٹ لگائے رکھتا۔ جس کو ذرا ہمدرد پاتا۔ اسی کے پاس اپنا دکھ رو دے بیٹھتا۔ یہاں تک کہ جب رفیوجی ایکسچینج کمیٹی کے رضاکار یہ پرچار کرنے آتے کہ ہم کب تک یوں بیٹھے رہیں گے۔ حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ ہمیں بسانے کا اپنا وعدہ پورا کرے تو کرپا رام انہیں بھی اپنی رام کہانی سنانے لگتا ——— "اور تو سب کچھ پاکستان میں لٹا آئے ہیں ایک عزت بچی ہے وہ بھی محفوظ نہیں۔ کوئی اوٹ نہیں۔ پردہ نہیں۔ بہو بیٹیوں کی آنکھ کا پانی اُترتا جا رہا ہے۔"

شریمتی کو اس کی ہر وقت کی یہ بکل کل اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ کئی مرتبہ اس سے اُلجھ پڑتی۔ اور تنگ کر کہتی ——— "اور کسی کو تو اپنی بہو بیٹی کی فکر نہیں ایک صرف تمہاری ہی عزت لٹی جا رہی ہے۔ بڑے ایسے آئے ہیں کہیں کے، مجھے کھمی بنا کے ڈبی میں بند کر لو۔"

اسے شرتی کی یہ زبان درازی اچھی نہیں لگتی تھی۔ جب وہ گاؤں میں رہتا تھا تو اسے کبھی منہ کھولنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ مگر یہاں دوسروں کو کیا تماشہ دکھائے۔ جب کبھی آپس کی کہا سنی میں ذرا اونچا بولنے کی نوبت آتی تھی تو لوگوں نے شرتی کو لعنت ملامت کرنے کی جگہ خود اسے برا بھلا کہا تھا۔ اور وہ خفیف سا ہو کر رہ گیا تھا۔

شرتی دن بدن بدلی جا رہی تھی۔ دوسری عورتوں کی روش اپنا رہی تھی۔ پہلے پہل وہ مجبور ہو کر کسی غیر مرد سے بات کرتی تھی۔ لیکن اب بات کرنا اپنا حق سمجھتی تھی۔ پہلے وہ کسی کی نظر اپنی طرف اٹھتے دیکھ کر چھاتیوں پر نہایت احتیاط سے کپڑا ڈھک لیتی تھی۔ لیکن اب وہ سمجھتی تھی کہ کوئی دیکھتا ہے تو دیکھتا رہے۔ اس کا کیا چھین لے گا نہ اس کا جسم شہد ہے اور نہ اس کی آنکھیں مکھیاں جو اسے چاٹ جائیں گی۔ وہ نگاہ کی ہوس کاریوں سے بھی بے نیاز ہو گئی تھی۔ اپنے آپ کو جھپا کر رکھنے کے بجائے اسے اپنے ماضی پر غصہ آتا تھا، کہ پارام پر غصہ آتا تھا جو دروازے سے باہر جھانکنے تک سے منع کر دیتا تھا۔ وہ کیوں اس پر اپنی اجارہ داری جتاتا تھا۔ وہ جتنا ہی ان باتوں کو سوچتی تھی اتنا ہی اسے کہ پارام کریہہ اور بدصورت نظر آتا ——— وہ یہاں تک سوچنے لگتی۔ کہ اسے کیوں ناحق اس مرد سے باندھ دیا گیا ؟

جب وہ دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر فساد کی باتیں کرتا مسلمانوں کے فرضی اور حقیقی مظالم بیان کرتا تو اسے وہ مظالم یاد آیا کرتے جو کہ پارام اس پر ڈھایا کرتا تھا۔

کہ پارام دوکان پر کام میں مصروف رہتا۔ اور وہ گھر میں تنہا بیٹھی بیٹھی تنگ آ جاتی ——— گھر میں ساس نند یا جیٹھ تک نہیں تھا۔ جس سے باتیں کر کے دل بہلائے۔ ایک دن وہ یونہی اٹھ کر ڈیوڑھی کے دروازہ پر آ گئی اور کواڑ کی درازمیں سے گلی میں جھانکنے لگی اچانک اس کھڑکی سے جو دوکان میں کھلتی تھی کہ پارام اندر آ گیا۔ شرتی کو باہر جھانکتے دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اسے چٹیا سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا اور فرش پر پٹک کر اِدھر اُدھر سے دو چار لاتیں جما دیں۔

اب اُسے محسوس ہوتا کہ وہ یہ سب مظالم ناحق برداشت کرتی رہی ہے۔ اسی لئے اب کہ پارام اگر ایک بات کہتا تو وہ چار سناتی۔ اور جس حرکت سے وہ ناراض ہوتا اُسے بار بار دہراتی۔ بلکہ اس سے باتیں کرنے میں اُسے ایک گونہ تسکین حاصل ہوتی وہ کہ پارام کو دکھا دکھا کر اس سے بولتی اور مسکراتی تھی۔ اب اُسے کیمپ کے کسی مرد سے بات کرنے میں جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔

کہ پارام نے جب دیکھا کہ شرتی ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ سیدھی بات کہنے سے منہ نوچنے آتی ہے تو اس نے دل پر جبر کر کے کیمپ چھوڑ دیا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسے قرول باغ میں ایک کمرہ کرایہ پر مل گیا۔ اور وہ شرتی کو ساتھ لے کر اس میں رہنے لگا۔

لیکن اب روزی کی فکر سر پر سوار ہوئی دو چار روز ہی میں اسے معلوم ہو گیا کہ پہلے ہی یہ بات کیوں نہ سوچی۔ راشن بازار سے خریدنا پڑتا اور مکان کا بھی پہلے ماہوار کرایہ بھی پیشگی دینا پڑتا تھا۔ اتنا گیا کم تھا کہ بنا پگڑی کے اسے یہ کمرہ تو مل گیا جوں جوں دن گذرتے تھے فکر بڑھتی جاتی تھی۔ پہلے خیال تھا کہ سرکار کچھ مدد کرے گی۔ پاکستان میں وہ جو اتنی جائداد چھوڑ آیا ہے۔ اس کا کچھ معاوضہ ملے گا۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا اس نے اپنا کیس رجسٹرڈ کرا دیا تھا۔ معاوضہ ملنے کی کچھ نہ کچھ اُمید بھی ضرور تھی۔ مگر جب تک کچھ نہیں ملتا اس وقت تک تو خرچ اُسے ہی چلانا پڑے گا۔

کہ پارام نے معاش کی تلاش شروع کی۔ جان پہچان کے کئی آدمیوں نے کام کا چھوٹا موٹا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مثلاً لٹا نیدار ام نے لانڈری کی دوکان کھولی تھی اور لجھ کمتری نے حلوائی کی دوکان، وہ چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ مصالحہ کرے۔ لیکن کوئی رضامند نہ ہوا۔ کام اتنا تھوڑا تھا کہ ان کے اپنے ٹکڑے مشکل سے چلتے تھے۔

آخر اس نے جس خاندانی وقار کو اتنا عرصہ سنبھال سنبھال کر رکھا تھا، خیر باد کہہ دیا۔ اور پھلوں کا خوانچہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک روز صبح

سویرے منڈی گیا سے کیلے سنگترے خرید لایا۔ اور بازار میں بیٹھ کر بیچنے لگا۔

اب کرپارام کے لئے یہ بالکل نیا کام تھا۔ اور یوں بھی بازار میں کیلے سنگترے بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ہزاروں مہاجرین دہلی میں آکر آباد ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر چھوٹے چھوٹے دوکاندار یا خوانچہ فروش تھے انھوں نے بہت پہلے یہ کام شروع کر دیا تھا اور ایسی جگہوں پر قبضہ کر لیا تھا جہاں پیٹ بھرنے لائق بکری ہو جاتی تھی۔

کرپارام ہزار کوشش کرنے کے باوجود آٹھ دس آنے روز لاسے زیادہ نہ کما سکتا تھا۔ جس دن اُسے سوا تیرہ آنے بچت ہوئی اس دن وہ بہت ہی زیادہ خوش ہوا اور رات گئے تک بیٹھا پیسے گنتا رہا۔ کئی بار گن چکا تھا۔ پھر بھی طبیعت نہیں بھرتی تھی۔ جی میں آتی کہ ساری رات گنتا ہی رہے۔ جیسے وہ سوا تیرہ آنے نہیں۔ سوا تیرہ ہزار روپے ہوں۔ گاؤں میں رہتے اس نے ایک دن میں کتنے ہی سوا تیرہ آنے کمائے تھے لیکن اسے اتنی خوشی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

کبھی کبھار بکری کم ہوتی تھی اس لئے ایک دو آنے کا خسارہ رہتا تھا۔ ہاں پھل عموماً بک جاتے تھے۔ ان میں کچھ خاص کیلے ایسے ہوتے تھے جنھیں دوسرے روز اٹھا کر رکھنے میں خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے کرپارام انھیں کھا لینے میں مصلحت سمجھتا۔ جتنے پھل کھاتا۔ اتنی آمدنی یا کفایت ہو جاتی۔ بعض مرتبہ میاں بیوی شام کو روٹی ہی نہیں پکاتے تھے۔

پھل کے طور پر پھل کھانا اچھی بات ہے۔ لیکن مجبور ہو کر روٹی کی جگہ پھل کھانے پڑیں تو آدمی کی طبیعت جلد اُچاٹ ہو جاتی ہے اس لئے کرپارام کو من مار کر پھل کھانے پڑتے۔ اور کئی مرتبہ ضرورت سے زیادہ کھانے پڑتے۔ جس کی وجہ سے بدہضمی کی شکایت رہنے لگی۔ لیکن اس نے پھل کھانا جاری رکھا اور بدہضمی بڑھتی گئی جو آخر پیچش بن گئی۔ پھل بیچنا تو درکنار گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔

کرپارام مرتے مرتے بچا۔ دو مہینے چارپائی پر پڑا رہا۔ قریب ہی ایک ڈاکٹر کی دوکان تھی۔ شریمتی اُسے بُلا لاتی۔ اور اس سے دوائی لے آتی۔ دوائی کے علاوہ ضرورت کی دوسری چیزیں بھی اُسے خود خرید کر لانا پڑتی تھیں۔ کرپارام کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ بازار جائے اور دوکانوں پر گھومتی پھرے مگر کیا کرے بیماری کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اتنا کیا تھوڑا تھا کہ بیوی کی دوا دوش کے کان جان نچ جائے۔

وہ بدستور چارپائی پر پڑا تھا مگر اٹاٹوٹ ہو رہا تھا۔ اس دوران میں اس کے اندر ایک تبدیلی واقع ہوئی تھی کہ اسے اپنا جسم کچھ ہلکا پھلکا معلوم ہونے لگا۔ جیسے بیچش سے اندر کا میل دھل گیا ہو۔ اب شریمتی کو دیکھنے کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ نگاہیں اکثر اس کے چہرے پر گڑی رہتی تھیں۔ اور اس میں خاص جاذبیت تھی۔ ملائمت اور ملاحت تھی۔ اس کا لہجہ بھی پہلے کی طرح کرخت اور حکم آمیز نہیں تھا۔ اس میں نرمی اور شائستگی تھی۔ وہ پیار سے بولتا تھا۔

شریمتی نے بھی اس تبدیلی کو دیکھ لیا تھا۔ اسے بھی اب کرپارام کو دیکھ کر کراہت نہیں ہوتی تھی۔ تندہی اور محنت سے پیش آنے کی بجائے وہ اس کی خدمت کرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگرچہ بیماری دُور ہو گئی ہے لیکن کرپارام ابھی پندرہ بیس روز اور کوئی کام نہ کر سکے گا۔ اس لئے وہ چاہتی تھی کہ خود کوئی کام کرے۔ ایک روز بولی۔

"منگو اور بسنتی رضائیاں سینے جاتی ہیں۔ میں بھی چلی جاؤں؟"

"تم ـــــ تم مزدوری کرنے جاؤ گی؟" کرپارام نخوت پر مبنی حیرانی سے کہہ گیا۔

"جب سب جاتی ہیں تو مجھے کونسا سرخاب کا پَر لگا ہوا ہے؟"

کرپارام چپ ہو گیا۔ اپنی حالت اور گھر کی کیفیت کا دل ہی دل میں جائزہ لیا۔ اور پھر دبی زبان میں کہا۔ "کوئی سُنے گا تو کیا کہے گا؟"

"کہنے کو کون اپنا بیٹھا ہے۔ سبھی پردیسی ہیں۔" شریمتی نے جواب دیا۔ اور مزید کہا۔ "پھر کہنے سُننے کی بات ہی کہاں رہ گئی ہے جس سے جیسے

بن پڑتا ہے۔ پیٹ کا دھندا چلا رہا ہے۔"

اس دن سے شربتی رضائیاں سینے کا کام کر رہی تھی۔ شروع شروع میں وہ مزدور عورتوں سے کتراتی تھی۔ دوسری شرنارتھی عورتوں کے ساتھ ان سے ذرا فاصلہ پر بیٹھتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ تمیز مٹ گئی۔ وہ ان سے ملنے جلنے اور باتیں کرنے لگی۔ ہم پیشہ کی ہم پیشہ سے نفرت کیا۔ وہ بھی تو محنت مزدوری کرتی ہیں۔ کوئی عیب تو نہیں کرتیں۔

کرپارام کی نگاہ اب اور بھی بدل گئی ہے۔ اسے شربتی کے چہرے پر ہمت اور استقلال کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس کے خدوخال مقدس اور مضبوط بنتے جا رہے ہیں۔ اگر کسی کارن ناراض ہو کر وہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آنا بھی چاہے تو نہیں آسکتا۔ اور اس پر کسی قسم کا شک کرنا تو اُسے خود اپنی حماقت نظر آتی ہے۔

صدیقہ بیگم

رُوپ چند

اگر ندی کے پاس سُوکھے درخت کا تنا نہ ہوتا تو لوگ ضرور پُوچھتے کہ آج تک بڑھا رُوپ چند ندی کے کنارے کیسے بیٹھا رہ گیا تھا، یہ تیز و تند ہوا کے جھونکے اس کا کچھ بھی تو نہ بگاڑ سکے تھے، ریت کے ٹیلے بنتے اور بگڑتے رہے مگر وہ درخت نہ تو کبھی ہرا بھرا اور نہ اس پر کبھی پھل پھُول ہی کھلے اور نہ بہت بھڑ میں اس کے نیچے سوکھی پتیاں ہی نظر آئیں ——— وہ بڑھا آج بھی ندی کی لہریں گن رہا تھا۔ جب ندی کے دونوں طرف بستیوں میں خون کی چھوٹی چھوٹی ندیاں بہہ رہی تھیں اور یہ ندی شاید اسی لئے اور بھی کروٹ سے بہہ رہی تھی ——— کہ کہیں یہ ندیاں اس سے آکر نہ مل جائیں ——— اور جب زمین کے شعلے آسمان کی طرف لپک رہے تھے تب بھی رُوپ چند ندی کے کنارے بیٹھا تھا اور کسی نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ وہ کون ہے؟ ہندو یا مسلمان؟ ——— برس بیتے وہ اس ندی کے کنارے آیا تھا اور اس نے سُوکھے پیڑ کا سہارا لے کر اپنی کٹیا بنائی تھی مگر دیکھنے والوں نے ہمیشہ ہی اسے لہریں گنتے ہی پایا۔ گویا وہ لہریں گننے ہی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اور لہریں گنتے گنتے ہی مر جائے گا۔ اس نے کبھی بھولے سے بھی نہ سوچا کہ یہ ندی جو شام کو تاریکی اور روشنی کا سنگم نظر آتی ہے دراصل شہر کے بیچوں بیچ سے بہہ رہی ہے اور کس طرح شہر کو دو حصّوں میں تقسیم کرتی ہوئی چلی جاتی ہے ——— بالکل بے خبر ——— اگر وہ لوہے کا سُرخ پُل نہ ہوتا تو شاید یہ ایک شہر پہلے ہی سے دو ہو چکا ہوتا۔ تاہم یہ تقسیم قدرتی نہ ہوتے ہوئے بھی قدرتی تقسیم کا درجہ رکھتی تھی، اور شہر والوں کے نزدیک اس کی وقعت روز مرّہ کی زندگی میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ حالانکہ وہ بہت چوڑی ندی بھی نہ تھی اور اس کا پُل کوئی بڑا پُل نہ تھا۔ تاہم دریا کا وجود ایسا بھی نہ تھا کہ اُسے نظر انداز کیا جا سکے۔ ویسے تو گھاٹوں پر شہر کی بساط کے مطابق کشتیوں کا بھی بندوبست تھا، مگر تب وقت کے مریضوں نے ان کے نرخ میں کافی اضافہ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک طرف سے دوسری طرف ناؤ سے پار کرنا عیاشی کے مترادف سمجھا جاتا تھا اور پھر جب لوہے کا پُل موجود ہے تو اب ناؤ پر سے جانا تو یقیناً فضول خرچی تھی، اور یہی ایک وجہ تھی جس نے لوگوں کو کشتیوں سے ذرا بدظن کر دیا تھا۔ اور یہ تھا ہندو مسلمانوں کا جھگڑا ——— کیوں کہ ایک عرصہ سے شہر کی فضا میں نفرت گھلتی چلی جا رہی تھی اور اسی لئے یہ شہر روز بروز دو حصّوں میں بٹتا جا رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا دو صفیں منظم ہو رہی ہیں اور پُل کے اس پار صفِ دوم

کی بستی بستے بستے بس گئی تھی۔ کہنے کو تو اس میں کچھ غیر مسلم بھی تھے۔ پتھے چمار، جوڑھے ہی جو کسی گنتی میں نہیں، اس لئے کہ اچھوت تھے ان کو مار کر کون مسلمان اپنے جسم کو ناپاک کرتا۔

دریا کے پاس بسا ہوا پورا شہر کی تاریخ سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے کہ وہ خود بھی تو اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ وہ خود بھی اس کی بستیوں میں کھیلا کرتا تھا اس نے زندگی کی کتنی المناک راتیں اور کتنی طربناک شامیں اس شہر کی نذر کر دی تھیں ——— ایک عرصہ سے وہ دریا کے کنارے آ کر بیٹھ گیا تھا اور اسی لئے وہ شہر کی سیاست سے بے خبر تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ آج شہر کی زندگی میں مذہب سیاست بن چکا ہے اور اگر وہ جانتا تو شاید تھوڑی دیر کے لئے خوش ہو لیتا کہ اچھا ہی ہوا کہ جو وہ ندی کی لہروں کو گن رہا ہے۔

روپ چند اچھی طرح جانتا تھا کہ کس طرح دھرم پور کے بالمقابل اسلام پور کی بستی ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر بسائی تھی اور وہ چمار جوڑے کس طرح وہیں اپنے آبائی گھروں میں رہتے چلے آ رہے تھے، اور ان کے آباؤ اجداد کی ہڈیاں کس طرح راکھ بن کر اس دھرتی کا جزو بن چکی تھیں۔ اور اسی لئے وہ شاید ڈھیڑ بھی تھے۔ یہاں تک کہ شہر میں مشہور ہے کہ جب ۱۹۰۰ء میں ندی میں باڑھ آئی اور چمار ٹولی کے جھونپڑوں کے اوپر سے پانی بہہ رہا تھا تو دور سے صرف درختوں کی پھنگیاں نظر آتی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ صرف یہ نیم کا درخت ہے جو چمار ٹولی کا سب سے اونچا پیڑ تھا۔ وہاں لہرا رہا ہے اور لوگوں کا خیال تھا کہ اب چمار ٹولی کبھی نہ بس سکے گی اور جہاں اس باڑھ سے ہزاروں اور لاکھوں کا نقصان ہوا، وہاں لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب چمار ٹولی تو کبھی نہ بس سکے گی۔ ہمارے شہر کا ناسور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ ہمارے شہر کے درمیان سے یہ چمار ٹولی تو سدا کے لئے نیست و نابود ہو گئی۔

سیٹھ دھنی چند اور ملا دولت حسین دونوں خوش تھے کہ ان کی زمین واپس مل گئی جس کو ان چماروں نے موروثی کہہ کر غصب کر لیا تھا۔ اور اب وہ عالیشان عمارتیں بنا سکیں گے۔ اور اسی لئے وہ خوش تھے کہ بڑی عدالت نے ان کی سن لی اور جھونپڑوں کو زمین سے ملا دیا۔ مگر پھر کیا ہوا یہی ناکہ اس وقت اسی روپ چند نے ملا دولت حسین بھائی کے بیٹے اور بہو کو پانی کے ریلے میں سے نکالا تھا۔ جب آدھی رات گئے پانی ان کے مکان میں چڑھ آیا تھا اور سارا گھر چڑھا بے خبر سو رہا تھا۔ اس وقت نوجوان روپ چند نے چرخ کر سارا گھر اپنے سر پر اٹھا لیا تھا۔ اور پھر جب سب لوگ گھر سے باہر نکل آئے تو بھی ملا دولت حسین کے بیٹے اور بہو اپنے کمرے سے باہر نہ نکل سکے۔ دولت حسین چلاتے رہ گئے اور کوئی سننے والا نہ تھا۔ تب روپ چند نے اندر گھس کر کمرے سے دونوں کو باہر نکالا اور بہت سامان بھی دریا برد ہونے سے بچا لیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ باڑھ کے بعد جب دولت حسین نے خاندانی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے روپ چند سے پوچھا کہ "مانگ کیا مانگتا ہے"۔ تو نوجوان روپ چند کی زبان سے بیساختہ نکلا۔

"حضور ٹولی کو بسا دیجئے، نہیں تو پھر ہم کدھر جائیں گے ——— آپ کی سیوا میں رہنا چاہتے ہیں۔ آپ اور سیٹھ دھنی چند چاہیں تو پانی اترتے ہی چمار ٹولی کو بسا دیں ———"

"ملا دولت حسین بھائی تیار ہو گئے اور سیٹھ دھنی چند بھی کیسے انکار کرتے کیونکہ وہ تو یہی کرنے جو دولت حسین سوچتے تھے اور ان کی اس دوستی کا چرچا بھی شہر کے اندر ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا۔ پھر کیا ہوا یہی ناکہ پانی اترتے ہی مہینہ بھر میں چمار ٹولی بس گئی۔ اور اس بار انھوں نے ایسی کھا پڑھی کی کہ چمار ٹولی پھر موروثی نہ ہو سکے۔ دو نا سور شہر کے سینہ پر بدستور قائم رہا۔ اس لئے کہ وہ چماروں کی ملکیت نہ تھا۔

روپ بھی چمار ٹولی کا ہیرو بن گیا۔ اور مائیں اپنے بچوں کو روپ چند بننے کی ترغیب دینے لگیں ——— آخر روپ چند نے ان سب کو برباد ہونے سے بچا لیا تھا ——— جبکہ وہ چاہتا تو دو چار ہزار روپیہ مانگ لیتا۔ جو دولت حسین کے ہاتھ کا میل تھا۔ لیکن ۱۹۱۶ء کا زمانہ کتنے دن رہتا۔ آخر ایک دن ایسا آیا کہ دولت حسین اس بات کو بھول گئے اور یہ قصہ صرف گاؤں کے بڈھے بوڑھوں کو یاد رہ گیا۔ کیونکہ بیس برس کے بعد جب

روپ چند کی لڑکی جوان ہو گئی تو اس ندی کے کنارے وہ پانی بھرنے آئی اور دولت حسین کے لڑکے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ——— وہ چیختی رہ گئی مگر دریا کی لہروں کو کیا پڑی تھی کہ وہ اس کی مدد کرتیں، وہ تو اُٹھ اُٹھ کر دیکھتی ہی رہیں اور پھر اس کی چیخ بھی فضا میں دب کر رہ گئی اور شہر والوں نے اتنا سُنا کہ دھنی چند نے خود اپنے ہاتھوں سے روپ چند کی لڑکی کو بُرے فعل میں پکڑا۔ چنانچہ اسی بدنامی کے خوف سے وہ ندی میں کود پڑی۔ بھلا اچھا ہی ہُوا جو اسلام پور کے ملّاحے پر کلنک کا ٹیکہ لگنے سے بچ گیا۔ مگر ندی کی لہروں کو بھی اس پہ ترس آگیا اور وہ اس کو بہا کر لے گئیں۔

وہ دن ہے اور آج کا دن کہ روپ چند اسی کنارے پر بیٹھا لہریں گن رہا ہے اور اپنی سرسوتی کو ڈھونڈ رہا ہے جو اس کے سامنے آتی ہوئی شرماتی ہے۔ اس لئے کہ اس نے پاپ کیا ہے اور سیٹھ دھنی چند کی موجودگی میں ان کے دو منعت کے پوتے کی عزت لی ہے۔

لیکن پھر اس کے گیارہ بارہ برس کے بعد شہر کی زندگی میں ایک اور زلزلہ آیا اور روپ نے وہیں ندی کے کنارے بیٹھے بیٹھے دیکھا کہ پُل کے دونوں طرف کے لوگ گھبرائے ہوئے بھاگنے لگے اور دھرم پور اور اسلام پور آہستہ آہستہ الگ ہو گئے ——— کسی ہندو کی مجال نہ تھی جو اسلام پور میں داخل ہو سکے اور اسلام پور کے مسلمان ندی کے پار جاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ شہر کی زندگی میں یہ زہر کچھ اس طرح سرایت کر چکا تھا کہ بچوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ ندی کے پاس دوسرے گھاٹ کے ہندو ملّاح آتے ہیں اور بچوں کو اُٹھا لے جاتے ہیں اور عرصہ تک اس قسم کے قصّے سُننے میں آتے رہے جو اسلام پور میں روایات کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن ابھی تک ندی کے دونوں طرف کوئی فساد نہ ہُوا تھا۔ فساد سے میری مراد ہندو مسلم جھگڑا ہے۔ ورنہ یوں تو بہت سے ایسے واقعات ہو چکے تھے جس سے اسلام پور اور دھرم پور کو کبھی بھی شرمندگی نہ ہوئی تھی یعنی آزاد ہند فوج پر جب لال قلعے میں مقدمہ چل رہا تھا تو ایک مسلمان نوجوان نے دھرم پور کے انگریز جج کو مار ڈالا تھا اور راحت علی کی اس جوانمردی نے دھرم پور کی سطح کو بلند کر دیا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دھرم پور کے پاس بہتی ہوئی ندی کا پانی بھی اُچھل اُچھل کر دھرم پور کے اس نوجوان کو دیکھنا چاہتا تھا اور راحت علی کے نعروں سے شہر کی فضا پھول رہی تھی۔ دھرم پور کے رہنے والے خوش تھے کہ ان کی دھرتی نے ایک ایسے ویر کو جنم دیا جس نے بھارت ماتا کی لاج رکھ لی اور برطانوی عدل و انصاف کو مُنہ توڑ جواب دیا ہے۔ اس وقت لال قلعے کے انصاف پسند جج کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں ——— چنانچہ جب راحت علی کو پھانسی کی سزا سُنائی گئی تو سارے شہر میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی تھی اور اس کے ساتھ دھرم پور کے ہندوؤں نے بھی مل جُل کر جلوس نکالے تھے اور سارا دھرم پور ہل گیا تھا۔ دریا کے دونوں طرف جشن ہو رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اگر کہیں اس روز گولیاں چلتیں تو دھرم پور اور اسلام پور ایک ہو جاتے اور پھر ندی کے پانی کو بھی اپنا رُخ بدلنا پڑتا اور شاید پھر اس خوف سے سرکار کو اپنا حکم واپس لینا پڑتا ——— حکم حاکم مرگ مفاجات نہ بن سکا۔ پھر ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جُل کر اپنے معبودوں کو منایا۔ بھگوان اور خدا کے حضور میں شکر بجا لائے اور بیجا ہے سفید فام آقا مُنہ تکتے رہ گئے اور کم از کم اس وقت تو بدلہ نہ لے سکے مگر یہ خون ایسا تھا جس کو انگریز شاید کبھی نہ معاف کر سکیں، پھر انھوں نے اس کا انتقام لے لیا ——— کیونکہ جب نیا کلکٹر آیا تو شہر میں چراغاں بھی نہ ہُوا اور اس کے بعد بھی کلکٹر صاحب نے عام جلسہ میں وہاں کے لوگوں کی تعریف کی اور اس وقت شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں زمین سے اُٹھتی ہوئی نظر آئیں۔

روپ چند ان تمام کھیل تماشوں کو بیٹھے بیٹھے دیکھتا رہا، اور کئی بار تو اس کے جی میں آیا کہ وہ اپنی لڑکی کے قاتل کو بھول جائے اور اپنی بستی میں جا کر رہے اور ان جلسوں جلوسوں میں حصّہ لے، مگر وہ ایسا نہ کر سکا اور یوں ہی بیٹھا تکتا رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بوڑھا اپنی اکلوتی لڑکی کا اظہار کر رہا ہے، وہ پاگل ہو گیا ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ انھوں نے اسے رات کے سناٹے میں زور زور سے چیختے سُنا ہے، جب وہ اپنے بھگوان سے پرارتھنا کرتا ہے کہ وہ اسے مُلّا دولت حسین اور اس کی سات نسلوں سے انتقام لینے کی شکتی دے، مگر بڈھے کی ہمت دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ داڑھی والا درویش فقیر جو در اصل چمار ٹولی کا رہنے والا ہے اور جس نے کبھی اپنی جوانی میں دولت حسین کے

لڑکے اور بہو کی جان بچائی تھی، دولت حسین سے انتقام لے سکے گا۔ اور اس کی سات نسلوں سے ۔ پنی ٹیکے کے خون کا بدلہ لے گا ——
ہاں تو نئے کلکٹر والی بات رہ گئی۔ وہ نیا کلکٹر جو شہر میں آیا تھا اس نے بڑے صبر و استقلال سے اپنے عہدے کو سنبھالا اور شہر کے عمائدین کا حیال تھا کہ ایسا حاکم اس شہر میں کبھی نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ بوڑھے دولت حسین کا بھی یہی خیال تھا۔ ہاں ہاں انھیں ملا دولت حسین کا۔ جن کی ہچکیاں چھوٹ گئیں تھیں اور بھویں سفید ہو گئی تھیں ——— وہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے ہوش سنبھالتے کوئی حاکم شہر اس مزاج کا نہیں آیا۔ ہوں تو انگریز افسروں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ملکہ کے زمانے سے یہ وقت آگیا ہے اور اتنے انگریز حکام سے اپنا واسطہ پڑا مگر ان جیسا حاکم شہر کبھی آیا نہیں۔ پھر ہندو مسلمان سب کے ساتھ اچھا سلوک اور رواداری بھی غضب کی۔

——— پھر اس کی وجہ بھی تھی۔ ملا دولت حسین کو بلانے کے لئے صاحب کلکٹر اپنی موٹر بھیج دیتے اور بڑے بڑے حکام اس وقت منہ تکتے رہ جاتے تھے۔ آخر یہ بات تو دو چار دن میں بنتی نہیں۔ اس کے لئے کتنا روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے۔ اور سیٹھ دھنی چند بھی ان کو موٹر میں بیٹھ کر جاتے دیکھ کر منہ تکتے رہ جاتے۔ حالانکہ ابھی تک کوئی ایسی بات نہ ہوئی تھی کہ ملا دولت حسین نے سیٹھ دھنی چند کی کوئی بات ٹالی ہو۔ کیونکہ وہ تو ایک جان دو قالب تھے ——

اب جو بات بگڑی تو ایسی کہ ملا دولت حسین اور سیٹھ دھنی چند صاحب کلکٹر کے پاس ایک ساتھ دکھائی نہ دیتے تھے۔ حالانکہ دونوں کا بڑھاپا تھا۔ اور صاحب کلکٹر کے یہاں حاضری ہوتی تھی۔ اور جب پاس پڑوس کے زچوانوں میں اس پر چرچہ ہونے لگیاں شروع ہوئیں اور ملا دولت حسین کے بیٹے نے ان سے کہا کہ آپ کا صاحب کلکٹر کے یہاں روز روز کا جانا لوگوں کو ناگوار گذرتا ہے تو انھوں نے بڑی لاپروائی سے کہا کہ ——

" بیٹا ہمارا کیا ہے، آج مرے کل دوسرا دن، موقت کی بات ہے۔ ہندوؤں کے تیور پہچانو، اگر ایسے وقت میں انگریزوں سے مل کر رہیے تو پھر چار ٹوٹی کے کھمبے ہماری اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے ——— ان چماروں کو کم مت سمجھنا ——— اور پھر آدھی چمار ٹولی تو سیٹھ دھنی چند کے قبضے میں ہے ——— سیٹھ دھنی چند کو بھی کم مت سمجھنا ——— میں تو ان سے اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ملتا ہوں"۔ ملا دولت حسین چمار ٹولی کا ذکر کر رہے تھے تو وہ روپ چند کو بھول گئے تھے، وہ سنہ ۱۶ کو بھول گئے تھے، وہ سرسوتی کو بھول گئے تھے کہ وہ ندی میں ڈوب مری تھی۔ ہاں انھیں کچھ یاد تھا تو یہی کہ چمار ٹولی کے کھمبوں سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ وہ ہماری اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے اور ملا دولت حسین جب ہندوؤں کے تیور پہچان رہے تھے تو وہ بھول گئے تھے کہ ان کے اپنے تیور بھی بدل چکے ہیں ——— آج وہ دھنی چند سے اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ملتے ہیں ——— یہ اور بات ہے کہ سرسوتی کو اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ڈوب مرنا پڑا تھا۔

لیکن اپنے باپ سے یہ جملے سن کر ان کے لڑکے کا بھی ماتھا ٹھنکا تھا کہ اب دن اچھے نہیں بڈھے روپ چند کی لڑکی مرنے کے بعد بھی انتقام کی تیاری کر رہی ہے ——— اور ملا کے چند جملوں نے اس کو سمجھا بجھا لیا۔

ادھر سیٹھ دھنی چند سے جب دھرم پور کے لوگوں نے بوجھا تو انھوں نے دبی زبان سے کہا ——

" صاحب کلکٹر کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ آخر یہ بال دھوپ میں تھوڑا ہی سفید کئے ہیں۔ ایسا ہندوستانی کلکٹر تو اس شہر میں کبھی آیا ہی نہیں۔ میں نے اس کو شیشے میں اتار لیا ہے۔ ملا دولت حسین کتنا ہی اس کے دروازے کے چکر لگائیں مگر سیٹھ دھنی چند کی بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ چار اشارے ہی کافی ہیں۔ سارے اسلام پور کی بستی میرے اشارے پر موت کے گھاٹ اتر سکتی ہے ——— " اور دھرم پور کے وہ لوگ جو سیٹھ دھنی چند کی باتیں سن رہے تھے اس وقت کانپ ہی تو گئے، آخر اسلام پور بھی دھرم پور کا ایک حصہ ہی تو تھا مگر بعد میں ان کو یہ سوچ کر خوشی ہوئی تھی کہ یہ مسلمان تباہ ہو جائیں تو کیا ہوتا ہے۔ پہلے اسلام پور اور دھرم پور کو دو یا نے الگ کر دیا تھا؛ اور اب سیٹھ دھنی چند اور ملا دولت حسین کی ما اتفاقیوں نے ——— اور جو کچھ کسر رہ گئی تھی وہ صاحب کلکٹر نے پہلے ہی پوری کر دی تھی اور نفرت کا ایک

زہر سا گھول دیا تھا، وہ زہر جو دھرم پور اور اسلام پور کی روح میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

بڈھا روپ چند آج کی اس کی سیاست سے بے خبر تھا۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ دھرم پور اور اسلام پور کی بستی کس طرح ایک دوسرے سے الگ ہو گئی تھی اور نئے صاحب کلکٹر نے وہاں کون کون سے جال بچھائے تھے

اور آج جبکہ شہر کی فضا میں اچانک ایک دھماکا ہوا۔ دونوں بستیوں کے دل دہل گئے۔ چاروں طرف سے مار دھاڑ کا شور سنائی دینے لگا اور روپ چند دریا کی لہریں گنتے گنتے چونک پڑا۔ جب گولیوں نے دونوں بستیوں کا سینہ چھلنی کر دیا تھا اور روپ چند کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ گولیاں خود اس کے اپنے سینے پر پڑ رہی ہیں۔ ساری بستی میں آگ لگی ہوئی تھی اور دونوں طرف کی آگ کا عکس دن کی روشنی کے باوجود ندی میں پڑ رہا تھا، شعلے ہوا میں پرواز کر رہے تھے۔ بستی کے ساتھ وہاں کی تہذیب جل رہی تھی، روایات جل رہی تھیں، عورتیں جل رہی تھیں، بچے جل رہے تھے، حال جل رہا تھا، مستقبل جل رہا تھا، اور ندی کا پانی اُٹھ اُٹھ کر دیکھ رہا تھا ——— روپ چند نے کئی بار اُٹھنے کا ارادہ کیا ——— وہ چمار ٹولی کے بارے میں سوچنے لگا کہ نہ جانے چمار ٹولی کا کیا حال ہو ——— مُلّا دولت حسین نے چمار ٹولی کو جلا ڈالا یا اپنی جائداد کو جلنے سے بچا لیا۔ سیٹھ دھنی چند نے نہ جانے اس کے آبائی گھر کے ساتھ کیا سلوک کیا، اور آج بے طرح اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جا کر بوڑھے دولت حسین سے ملے۔ سیٹھ دھنی چند سے جا کر پوچھے کہ دھنی اور دولت کی بستی میں یہ آگ کے شعلے کیسے ——— اس کے کانوں میں عورتوں کی چیخیں کیوں آ رہی ہیں۔ کیا انھیں اس عظیم سانحہ کی خبر ہو چکی ہے ——— مگر فوراً ہی روپ چند کے چہرے پر اطمینان کی لہریں دکھائی دینے لگیں، بالکل ویسی ہی لہریں جیسے اس کے پاس بہتی ہوئی ندی کے سینے پر بہتی جا رہی تھی اور جو آس پاس کے ماحول سے بالکل بے خبر تھیں۔

روپ چند کو یہ نہ معلوم تھا کہ آج شہر کا نیک اور رحمدل نیا آفیسر کس طرح دونوں بستیوں پر گولیاں چلوا رہا ہے۔ شہر کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں اور کتنی لڑکیوں کی عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں ——— وہ ان سب واقعات سے بے خبر تھا۔ لیکن ندی کے پاس بیٹھے بیٹھے روپ چند سوچنے لگا کہ ضرور آج دھرم پور کی آخری شام ہے، آج اسلام پور میں آخری بار چراغاں ہو رہا ہے۔ اس کے بعد یہ بستی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی اور صبح کا سورج ندی کے دونوں طرف صرف راکھ کا ایک ڈھیر دیکھے گا۔ اس کی اپنی چمار ٹولی بھی ختم ہو جائے گی، اور ایک بار پھر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ جلوا اچھا ہی ہوا جو وہ دریا کے کنارے آ کر بس گیا وہ، ان ہزاروں سے اچھا ہے جو شہر کی گھٹی گھٹی فضا میں سانس لیتے ہیں اور جبکہ وہ صبح سے بھوکا ہے کوئی اس کو روٹی دینے والا نہیں آیا ہے وہ اور شدت سے محسوس کرنے لگا کہ ضرور شہر میں کوئی ناشدنی واقعہ ہو گیا ہے۔ اور ابھی شام پورے طور پر نہ ہوئی تھی کہ اس نے دیکھا کہ لوگوں کا غول پُل کے پاس چلا آ رہا ہے اور اتنی دُوری کے باوجود وہ گھبرا گیا، اور جب وہ لوگ روپ چند کی طرف بڑھنے لگے تو اس کی گھبراہٹ اور زیادہ بڑھ گئی مگر پھر اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا اور ندی کی خاموش لہروں کو دیکھنے میں محو ہو گیا، یہ اُٹھتی ہوئی لہریں یہ سانس لیتی ہوئی ندی اور اس میں جھلملاتا ہوا پُل کا عکس اور بکھرے جلتے ہوئے دن میں پُل کا ڈوبتا ہوا سایہ بھی ندی میں جھلملا رہا تھا اور آسمان کی لالی کا عکس بھی ندی میں سمٹتا جا رہا تھا۔ اس جلتے ہوئے شہر کے آدمیوں کو دیکھنے کے بعد وہ کتنی دیر دریا کی بے مقصد لہروں کو دیکھتا رہا۔ مگر اپنی طبیعت کے اس تضاد کو زیادہ دیر برقرار نہ رکھ سکا اور اس بار جب روپ چند کی نظریں اس غول پر پڑیں تو اس نے دیکھا کہ سیٹھ دھنی چند آگے آگے چلے آ رہے تھے اور ان کے پیچھے ایک آدمی نیزے میں سر گڑوئے چلا آ رہا ہے اور روپ چند کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس نے پہچانا کہ وہ سر دولت حسین کا تھا اس کے چہرے کی جھرّیاں خاک گئیں تھیں، جیسے وہ سر اپنے محسن کو تلاش کر رہا تھا اور معاً روپ چند کو اپنی لڑکی کا خیال آ گیا۔ جس کے بعد اس کی نسل ختم ہو گئی تھی اور روپ چند لاوارث مرنے والا تھا۔

ملا دولت حسین کا پوتا ——— وہی پوتا جس نے اس کے خاندان کو تباہ کیا تھا۔ جو ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا جس نے اس کی اکلوتی لڑکی کی نو برس امنگوں کو ختم کیا تھا جس نے اس کی ہنر پرور امنگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا ——— اس کی اپنی سرسوتی کا قاتل ——— اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ملا دولت حسین کا سارا خاندان بموجود تھا ——— عورتیں چھینٹے پہنے چیخ آ رہی تھیں۔ جن کے آنچلوں کو بھی کسی نے آج تک نہ دیکھا تھا۔

"روپ چند لے اپنی لڑکی کا انتقام ان مسلمانوں سے، آج تمہاری لڑکی بڑی ہونے کا دن آ گیا۔"

روپ چند ویرانہ ہو گیا، وہ لوگوں کی طرف جھپٹا، اور لوگ سوچ رہے تھے کہ وہ ملا دولت حسین کے لڑکے کو چبا ڈالے گا ——— راقوں کو چبانے والا روپ چند آج اپنے دشمن کے مدمقابل کھڑا تھا اور اس کا یہ پرانا دشمن بے دست و پا تھا ——— مگر روپ چند نے آگے بڑھ کر ایک چند پر ایک زور کا وار کیا کہ خود وہ گھبرا کر رہ گیا اور لوگوں کے دیکھتے دیکھتے اس کی لاش کو اس نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر ندی کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

"کیسے کہیں کے یدشت اور سیٹھ بنتے ہیں" اس نے نیزہ چھین کر دور پھینک دیا۔ اور ملا دولت حسین کا سر لڑھکتا ہوا ندی کی طرف بڑھ رہا تھا ——— لیکن روپ چند مجمع کی طرف دیکھ کر بدحواسی سے چیخ رہا تھا۔

——— "چھوڑ دو دولت حسین کے پوتوں کو ——— شرم نہیں آتی اپنی بستی کی عورتوں کی بے عزتی کرتے ہوئے" اور مجمع کے لوگ جبراً سے اس کا منہ تک رہے تھے۔

"آخر ہے نہ چمار ٹولی کا، مسلمانوں کا نمک کھاتا ہے۔"

اور بھیڑ میں سے ایک آدمی نے نکل کر روپ چند کے سینے پر خنجر کا ایک وار کیا اور ذرا سی دیر میں روپ چند کی لاش زمین پر پڑی تھی۔ نفرت سے کسی نے اس کو دریا کی آغوش میں پھینک دیا۔ اور وہ لہریں اس کو اسی طرح بہا کر لے گئیں ——— جیسے چند برس پیشتر اسکی سرسوتی کو لے گئیں تھیں۔

پھر دولت حسین کا سارا خاندان ان لہروں میں بہا دیا گیا ——— اور تمام لاشیں یکے بعد دیگرے ندی کی آغوش میں پہنچ چکی تھیں۔ اور تھوڑی دیر بعد پھر وہی سناٹا فضا پر چھا گیا۔

سورج کب کا ڈوب چکا تھا اور اس کا عکس بھی یونہی تاریکی میں مدغم ہو گیا۔ گویا وہ سورج یوں ہی ندی کے نیچے دب گیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ لہریں بالکل ساکن و جامد ہیں جو کبھی سانس نہیں لیتیں، یوں ہی بے حس رہتی ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ڈوبتا سورج اس میں ہولے ہولے اپنا عکس ڈال رہا تھا یہ لہریں جاندار معلوم ہو رہی تھیں گویا وہ آخری بار جی لے رہی تھیں۔ جس نے سارے دریا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اب سورج کے ڈوبتے ہی بالکل بے جان ہو چکی تھیں۔ ایک بے حس و حرکت لاش کی طرح ——— بے بصر آنکھوں میں کوئی جھلک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور ندی بھی یوں ہی ساکت و جامد ہو گئی تھی۔ اس کے دونوں جانب سڑک کے قمقمے جھلملا رہے تھے اور ایک عجیب بے کیفی کے ساتھ جل رہے تھے اور ان کا عکس بڑی مناسبت سے پانی میں جھلک رہا تھا۔ اور اگر ان کا عکس نہ پڑتا تو پھر شاید یہ رات کی تاریکی ندی کو بالکل ہی اپنی آغوش میں لپیٹ لیتی اور راہگیروں کی نظر بھی کرنٹ سے بہتی ہوئی ندی پر نہ پڑتیں لیکن روپ چند کی کٹیا کا عکس ہلکا ہلکا پڑ رہا تھا۔ گویا یہ کٹیا بھی ندی کی گہرائی میں روپ چند کی لاش کو ڈھونڈ رہی تھی۔

عبدالرحمٰن چغتائی

تجاوز

اس کی عمر بہتّر سال سے تجاوز کر گئی تھی اور جب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی عمر بہتّر سال سے تجاوز کر گئی ہے تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس وقت اس کے سُرخ چہرے پر زندگی کا والہانہ پن موجود تھا۔ رگوں میں خون گرما رہا تھا۔ غلافی آنکھیں پپوٹوں سے ڈھکی ہوئی شاہیں کے مانند معلوم دے رہی تھیں۔ آنکھوں کی چمک اور سُرخ ڈوروں سے ظاہر تھا کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے اس کی کچھ حقیقت ہے۔ اسے اپنی تنہائی کا احساس نہ تھا۔ اپنے سے علاوہ بھی ہر چیز متحرک دکھائی دے رہی تھی۔ اِنتشار ابھر رہا تھا، پل کی پل میں بدن شدت سے کانپنے لگتا تھا ——— صبح اس نے بڑے چاؤ سے داڑھی اور مونچھوں پر حنا لگائی تھی۔ حنا کا سیاہی مائل سُرخ رنگ اس تندرست اور دمکتے ہوئے چہرے پر حیات افروز معلوم دے رہا تھا۔ جہاں جہاں اس کی نگاہ اٹھتی تھی ہر چیز اسے اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آتی تھی۔ آئینہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ میری ماں کا کہنا ہے جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو یہ آئینہ جوں کا توں اسی دیوار پر لٹک رہا تھا۔ اٹھ کر آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا بازو پکڑ لیا ہے۔ وہ جھجک رہا۔ آئینے کی سطح کے اندر اسے اپنا اور اپنے بالوں کا سُرخ رنگ شام کی شعاعوں کے مانند بہت گہرا گہرا نظر آیا۔ اس نے کبھی اس آئینہ کی تاریخ پر غور نہ کیا تھا کہ یہ آئینہ کس کس نے دیکھا ہے اور کس کس عمر میں۔ اس نے آئینے کی سطح پر بڑی لجاجت سے ہاتھ پھیرا۔ آئینہ آئینہ ہی تو ہے۔ اس کی آب و تاب میں سرمو فرق نہیں آیا۔ اسے یاد تھا ایک بار اسے اس کی ماں نے بڑے مؤثر طریق پر آئینہ کے سامنے کھڑے ہونے سے روکا تھا جیسے وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا تھا۔ آج اسے خیال آیا وہ شروع شروع میں خود بھی کئی بار گھڑی پل کے لئے اس آئینہ کے سامنے رکی ہو گی کھڑی ہوتی ہو گی۔ آنکھیں کتنی جھجکتی ہیں آئینہ کے سامنے۔ پھر زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ برسوں آئینہ دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ وہ سوچنے لگا۔ جہاں تک یادداشت کا تعلق ہے آج تہتر سال کی آئینہ کی موجودگی کا احساس ہی جاتا رہا تھا اور جب اس نے اسے آئینہ کے سامنے کھڑے ہونے سے روکا تھا۔ وہ آئینے اور زندگی گدگدیاں محسوس کرنے لگا۔ وہ مسکرایا، وہ ہنس پڑا۔ یہاں تک کہ قہقہہ بلند ہوا اور اس نے اپنے قہقہے کے ساتھ ایک اور قہقہہ سُنا۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا جیسے ماں نے بازو سے پکڑ کر اسے آئینہ کے سامنے سے ہٹا دیا ہو۔ وہ پیچھے ہٹتا چلا گیا مگر آنکھیں آئینہ پر لگی رہیں۔ اس کی نگاہوں میں انسان کی عزت دیوتا سے کم نہ تھی ——— کانسی کا کٹورہ پیاس بجھانے کی غرض سے اٹھایا۔ بیشتر اس کے کہ وہ اسے پانی سے بھرے پیاس بجھائے

ت کی بناوٹ پر غور کرنے لگا اور کہنے لگا اس کی آرگنائزیشن بھی انسان سے کم نہیں ہے۔ اس پر میرے دادا کا نام اور دادا کے باپ کا نام کندہ ہے۔ وہ کتنا پختہ اور کتنا خوبصورت ہے۔ گھس گھس کر اس میں رس پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی عمر کا کوئی کیا اندازہ لگائے گا۔ تیوری چڑھا کر بڑے انہماک سے عمر کے سوال پر گفتگو چھیڑنے لگا۔ آخر یہ عمر کا سوال ہے کیا، اور پھر یہ کم بخت لوگ عمر کے سوال کو طول دے کر زندگی آدھی کر دیتے ہیں انسان کی۔ میں بہترسال کا جوان اٹھائی سو سال سے کیا کم بڑھا ہوں گا۔ سانپ کی طرح تن گیا اور انگیٹھی سے کھیلنے لگا جو اس کے باپ دادا کی نشانی تھی۔ اسے گھر میں ہر چیز کی عمر اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آتی تھی۔ خود توانا تھا اور تازہ دم تھا۔

باہر سرائے کی ہوا چل رہی تھی۔ اس کا دل بے قابو ہو کر اچھلنے لگا۔ دہلیز سے اچھل کر باہر نکل گیا جیسے بچہ ہی لڑھکتا ابھی گیند کی طرح پھدکنے لگے گا۔ اور جہاں اس کا من بھائے گا منہ اٹھا کر چل دے گا۔ بظاہر کئی حرکتیں کرتا رہا مگر جو چاہتا تھا یا محسوس کر رہا تھا، ہلنے جلنے، چلنے پھرنے سے پورا تجربہ نظر نہ آتا تھا۔ بدن کے اندر تشنگی سی پیدا ہو رہی تھی۔ چاہتا تھا کوئی قوت راہ میں حائل نہ ہو۔ جیب سے جابیوں کا گچھا نکال کر ایک ایک کا جائزہ لیتا رہا۔ یوں معلوم دیتا تھا جیسے ان کی عمر کا بھی اندازہ لگا رہا ہے۔ جس ہاتھ میں جابیوں کا گچھا پکڑ رکھا تھا اس کی گرفت میں کچھ فرق آ گیا تھا مگر ضرورت کی چابی نگاہ میں تھی۔ اسے انگلیوں میں دبا کر سیف کی طرف بڑھا۔ لوہے کا بھاری اور مضبوط دروازہ ایک ہی جھٹکے سے پرے ہٹا دیا اور قدموں پر کھڑا کھڑا سیف کے اندر دیکھنے لگا۔ کرنسی نوٹ، سونے چاندی کے سکے آنکھوں کے سامنے تھے۔ زندگی کی ہر دھڑکن دولت کو چپ سادھے دیکھ رہا تھا۔ اسے کہیں سے کہیں بہا لے گئی۔ سناٹا اور غنودگی کا عالم طاری تھا۔ پراس کا فولادی پنجہ پھیلتا اور بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جو کچھ بھی اس کی کشادہ مٹھی میں آیا بھینچ لیا۔ کچھ ادھر کچھ اُدھر دونوں جیبیں بھر لیں اور خدا کی بخشش پر ایک زہر آلود طنز سے مسکراتے ہوئے سیف کو پھر مقفل کر دیا۔

مایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں ہوتا ہوا صحن میں آ گیا اور ڈیوڑھی کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ مستعد اور بے فکر۔ نواسے، نواسیوں، پوتے، پوتیوں کا شور، گھر کی گہما گہمی کانوں میں سمائی جا رہی تھی۔ صحن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت موجود تھا۔ اسے اس کی موجودگی کا احساس تھا۔ سب کچھ تھا مگر وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سب کچھ پھاند گیا ——— باہر آیا تو یہ سرد سرد ہوا سے دوچار ہونا پڑا۔ پیشانی پر گرم گرم پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ سانسوں کو جھٹکا اور سر ملنہ ہو کر تن گیا۔ نواسے، نواسیوں، پوتے اور پوتیوں کو، نیم کے درخت کو، اپنی عمر کو کسی کو خاطر میں نہ لایا۔ دشواریوں کی سرخی پیشانی کی چمک دمک، اقبال کا ساتھ سب کچھ تھا۔ بغیر کسی الجھن اور سوچ بچار کے دور نکل آیا تھا۔ اِدھر اُدھر سے کئی آوازیں کانوں میں پڑنے لگی تھیں۔ ایک کھونچے والے نے سامنے سے آواز دی "چچی کا ہے میرا انگور سونے کا کشتہ ہے، تازہ ہے تازہ۔ تازہ دم بناتا ہے۔" ابھی کھونچے والا نظر سے اوجھل بھی ہونے نہ پایا تھا کہ ایکا ایکی اسے بچوں کا شور سنائی دیا۔ جانے پہچانے بچے تھے۔ رلدو بابا! بابا رلدو کہہ کر لپٹ گئے۔ وہ اس سے مسہ چاہتے تھے۔ یہ عادت اس نے خود ہی بچوں کو ڈال رکھی تھی۔ کہتا تھا ایسا کرنے سے اسے زندگی ملتی ہے۔ وہ تازہ دم محسوس کرتا ہے۔ بچوں کے ساتھ بچہ اور ماؤں کے ساتھ دایا۔ رلدو کا ہر وصف دنیا کو اور اسے پسند تھا اور سب سے بڑی بات اس کی دولت اس کا دم مارتی تھی۔ مگر اس وقت بچوں کو دیکھ کر بھی گھڑا نہ ہوا نہ ان سے مخاطب ہوا۔ دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال دیے اور جو ہاتھ آیا نکال کر بچوں کی طرف پھینک دیا۔ کچھ سکے اجی مٹھی میں تھے۔ انہیں ٹٹولتا کھیلتا برابر چلتا رہا۔ موڑ کے قریب پہنچا جہاں ہمیشہ ایک اندھی بھکارن بیٹھی بھیک مانگا کرتی تھی۔ اس کی آواز پر کچھ سکے اس کی طرف بھی پھینک دیے۔ مگر چلنے میں ذرا فرق نہ آیا۔ موڑ مڑا ہی تھا کہ سامنے سے ستا پہلوان مع اپنے دونوں مٹھلوں کے نظر آیا۔ ستا پہلوان ہمیشہ بازار سے بڑے انداز میں گزرتا تھا۔ اس کا یہ انداز ہی تھا جو وہ پہلوان کہلاتا تھا۔ کانوں میں مرکیاں، کلے میں سونے کا کنٹھا، کلائیوں پر جڑاؤ کڑے، سفید چکن کا کرتا، ململ کی بنیعہ، طلائی گلدار جوتا، سر پر ہے پوری مدین ٹوٹی رہتی تھی۔ اس کا ایڑی اٹھا کر چلنا، بھاری بھرکم شانوں کو ہر سانس کے ساتھ جھٹکا یہ ستے پہلوان کے خصوصی نشان تھے۔ شہر بھر میں ستے کا نام تھا۔ اس کے طمطراق اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ ایک بازار سے دوسرے بازار تک جاتے جاتے دن کٹ جاتا تھا پر ملاقاتیوں کا جی نہ بھرتا تھا۔ ستا تھا تو پہلوان مگر اس کی اخلاقی حالت

اچھی لگتی۔ مینڈھے حواس نے پال۔ کھلے کھا کھا کر لے لگام ہو رہے تھے۔ کہتا تھا ان کو سنوارنے اور بنانے میں جتنی ریاضت کی ہے یہ حسّا ہی جانتا ہے۔ ان کی ہنسی ٹھٹھیاں ہلکی ہلکی امریں تھیں اور یہ امریں حسّے کے نزدیک اس کی محنت کا پھل تھا۔ نہایت نفاست سے تراشے ہوئے بال ہر سراٹھیں تھیں، انسار تھا، ذرا سی حرکت پر تھنی اٹھا کر ہوا سونگھنے لگتے تھے۔ باگیروں کے نیچے بھاگتے تھے۔ بچے اکثر ان کے نام سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور وہ جونڈر اور نسراتی کے، مینڈھوں کو چھیڑ، پہلوان کو بھی تنگ کرتے تھے۔ حسّا اس پر ان کو زبردست ڈانٹ بتاتا تھا اور مینڈھوں کا رسا ڈھیلا چھوڑ دیتا تھا۔ پھر اس پر بڑے بڑے عجیب و غریب آوازے کستے تھے اور پہلوان کو بھلا بھلا کہتے الٹا بھاگتے تھے۔ وہ غصے سے کاپتا تھا پر موٹے مرٹے لبوں پر مسکراہٹ دکھائی دیتی تھی۔ حسّے پہلوان کے مینڈھے حسّے کو پہچانتے تھے۔ وہ کسی حالت میں بھی ہوں جب وہ ان پر ہاتھ رکھ دیتا تھا تو وہ ایک اطمینان محسوس کرنے لگتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ اس کی شخصیت پر اترانے لگتے اور جب ایسا ہوتا تھا تو ان کا صحت مند جسم ہچکولے لینے لگتا تھا، اونوں کی مچھلیاں پھڑکنے لگتی تھیں۔ حسّے کی بے کاری کا قصہ سلجھانے سے بھی نہ سلجھتا تھا۔ رلدو نے جب حسّے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو اس نے اس سے آنکھیں ملانے میں دریغ نہ کیا۔ حسّا اس کا پروردہ تھا۔ اس نے رلدو بابا کو دیکھتے ہی بڑے احترام سے کہا۔ آج تو میرا داتا جوشِ جوانی میں حسّے سے بھی بازی لے گیا ہے۔ یہ الفاظ وہ کہہ ہی رہا تھا کہ اس کے مینڈھے رلدو پر پل پڑے۔ رلدو نے بڑی بے پروائی سے دونوں کو پرے دھکیل دیا۔ حسّا بابے رلدو کی اس حرکت پر ششدر سا ہو کر رہ گیا اور مینڈھوں کو دوبارہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس کی طرف جھکتے۔ حسّا پہلوان آگے بہلانے اس وقت رلدو سے چٹکارا چاہتا تھا۔ اسے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ وہ آج غیر معمولی طور پر چڑھا جا رہا ہے۔ جب تک حسّا رلدو بابا کے سامنے کھڑا رہا نہ تو اس نے مینڈھوں کو پکارا اور نہ قصداً کوئی ایسی حرکت کی کہ اسے جواب دینا پڑتا۔

رلدو نے حسّے کی ملاحظات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ ویسے بھی اسے اس کی بے کاری نہ بھاتی تھی اور نہ اس نے اس بات پر غور کیا کہ پہلوان ایسی کی غیر معمولی شخصیت سے متاثر تھا۔ وہ اس کا سرپرست ضرور تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس سے خائف تھا۔ محض اس لئے کہ وہ شہر کا ایک نامی پہلوان تھا۔

بابا رلدو کہیں کا کہیں پہنچ گیا تھا اور حسّا یہ محسوس ہی کرتا رہا کہ اس نے اسے ہٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا رلدو بابا کے الفاظ دہرا رہا تھا ——— بڑے آئے جوان۔ جوانی نام ہی اور جنس کا ہے۔ بچو تم نے اتنا پانی نہیں پیا جتنا ہم نے گھی کھایا ہے۔ حسّا دودھ اور گھی کے چکر میں اتنا الجھا کہ رلدو اسے نامی پہلوان، بڑے پہلوان کہہ کر پکارتا تو وہ پھر بھی نہ سنتا۔ اسے اپنی بے کاری کے احساس کا صدمہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا دولت کس کے پاس نہیں ہوتی۔ خوشیاں کس نے نہیں دیکھیں۔ مگر یہ رلدو بابا کی خوشیاں اور امنگیں رلدو بابا ہی جانے۔ دولت و دولت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

رلدو بابا تھا۔ اس کی عمر بھی ستر سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس کی مصروفیتیں بھی دوسروں سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ تھا وہ تھا سب کچھ تھا۔ پر وہ ہفتہ میں ایک بار حنا ضرور لگاتا تھا۔ ہر دوسرے روز ایک پر تکلف جوڑا بدلتا، عطر لگاتا، فلم دیکھنا اس کا ایک من بھاتا مشغل تھا۔ سیر تماشے، شکار، بندوق اور آئے دن کی مجلسیں ناقابلِ فراموش تھیں۔ اس پر بھی تشنگی بڑھتی رہتی تھی اور وہ اسے کبھی نہ بھرتا تھا۔

ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی۔ جوں جوں وہ بازار کو چیرتا بڑھتا چلا جاتا تھا اسے ٹھنڈی اور تیز ہوا نہایت خوشگوار اور بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ذرا اور اکھڑا قدم تیز ہو گئے۔ جسم تن گیا۔ رگ رگ میں طوفان الٹ کھڑا ہوا۔ بغیر ہچکچاہٹ کے جذبات کی رو میں بہتا گیا۔ جذبات کا تار نہ ٹوٹا۔ اس وقت جب رلدو مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اذان ہو رہی تھی۔ اس کے قدم رک گئے۔ تقدس سے سر جھک گیا۔ ادھر اُدھر مڑ کر آگے پیچھے دیکھا اور سوچ بچار میں بہت دور نکل گیا۔ طبیعت پر بوجھ محسوس ہوا تو واپس لوٹ آیا۔ غلبے کی صورت مسجد کی سیڑھیاں چڑھ گیا جیسے سارا بنا بنایا سنگار اس بدلے کا ہو، تھا۔

بازار میں پہنچا تو پھر ایک سرسراہٹ کہ دھمیں لینے لگی۔ وہی آرزوئیں وہی ارادے سانولے تھے چہرے پر وہی سرد وہی انبساط کے فسان تھے۔ بالکل ان تھک جدوجہد رہا تھا۔ ایک رنگین تجسس اس کا پیچھا کرتا رہا اور وہ ارادتاً اس سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔

چلتے چلتے بے وجہ ایک پان فروش کی دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کبھی پان کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا اور کبھی سگرٹ کی طرف۔ پان کھاتا تھا نہ سگرٹ پیتا تھا۔ کچھ کہنا بھی چاہتا تھا اور جو چاہتا تھا حلق سے باہر نہ نکلتا تھا کہ ایکا ایکی بازار کے سرے پر سے ایک شور اٹھا۔ شور میں چیخنے اور چلانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ایک پھیلا ہوا سانڈ بھاگا آرہا تھا۔ راہ گیر مارے ڈر کے بھاگے جا رہے تھے۔ کیا بوڑھے کیا جوان عورتیں اور بچے دیواروں سے چپٹے کھڑے تھے۔ رلدو اپنے بل لوتے پر سانڈ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ سب کچھ بھول گیا اور چٹان کی طرح ڈٹ گیا۔ اس نے بغیر سوچ بچار اور پچھا ہٹ کے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے سینگوں سے پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں ادھ مرا کر دے گا کہ سڑک کے درمیان اسے چند خوش پوش لڑکیاں بھاگتی، چلاتی اور بے دست و پا نظر آئیں۔ کسی کا پرس گر گیا تھا۔ کسی کی ساڑھی کا پلو الجھ گیا تھا۔ بابا رلدو پوری مردانگی سے بڑھا اور ڈٹ کر سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ ساٹھ سے دو بچا رہا تھا کہ سانڈ راستہ چیر کر نکل گیا۔ اک اور شور بلند ہوا۔ سارے کا سارا بازار رلدو بابا کی یہ جرأت دیکھ کر شششدر رہ گیا۔ لڑکیاں دیر تک اس کے ساتھ لگی کھڑی رہیں۔ انہوں نے جی بھر کر رلدو کا شکریہ ادا کیا۔ رلدو کی سکرسراہٹ میں لڑکیوں کی سی چاشنی نہ ہو لیکن وہ مطمئن تھیں اور کہتی جا رہی تھیں، بپھرے ہوئے سانڈ کا مقابلہ آسان تھوڑا ہے۔

اب وہ گدبازار کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ انبساط سے دیوانہ ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے قرضدار مرلو کو سامنے سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ مرلو رلدو بابا کا قرض دار تو تھا ہی مگر وہ ویسے بھی رلدو بابا سے ٹلتا تھا اور ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ اس کا اور رلدو کا سامنا نہ ہو۔ اگر اتفاقیہ کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو وہ آنکھ بچا کر نکل جاتا تھا۔ آج بے وقت گدبازار میں بابے رلدو کا اسے نظر آنا اس کے لئے تعجب سے خالی نہ تھا اور جبکہ رلدو بابا اس کے چال چلن سے واقف بھی خوب تھا۔ مرلو کو اس افراتفری میں اور تو کچھ نہ سوجھا وہ پاس کے ایک ہیئر کٹنگ سیلون میں داخل ہو گیا اور چھپ کر گدلے سے شیشے کے اندر سے بابے رلدو کو دیکھنے لگا جو ہیئر کٹنگ سیلون کے دروازے سے لگا ہانپ رہا تھا۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ اس نے خیال کیا یہ رلدو آج بے وقت اس جانب اس کی تلاش ہی میں آ نکلا ہے۔

گدبازار کا نام اصل میں کھڈ بازار تھا اور جب سے چھاؤنی والوں کی آمد و رفت اس بازار میں ہوئی ہے اس بازار کا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ مدراسی گورکھے، چھچھی تو دھندے کے لئے آتے ہی تھے مگر جب سے چھاؤنی کا زور بڑھا ہے گورے بھی منہ اٹھائے نجانے تلاش کرنے چلے آتے ہیں اور یہ ان کی زبان دانی کا کمال ہے کہ انہوں نے کھڈ بازار کو گدبازار بنا دیا تھا اور وہ گدبازار کا مفہوم بھی خوب سمجھتے تھے۔ آتے تھے تو اس نام پر پھبتیاں بھی کستے تھے۔

جوں جوں وہ بازار کی رونق میں پہنچتا گیا اس کی آنکھیں پھٹتی گئیں اور وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کی دھڑکنوں کا مزہ لیتا رہا ——— کوئی اس کے شانوں سے شانہ مار کر نکل جاتا تھا اور کوئی نہایت بے تکلفی سے نگاہیں اوپر اٹھائے چوباروں پر بیٹھنے والیوں کو گھور رہا تھا۔ اس ہماہمی میں اگر کوئی اتفاقیہ اس سے ٹکرا بھی جاتا تو اسے کوئی صدمہ نہ ہوتا تھا اور نہ اس کے وقار میں فرق آتا تھا۔

ایک لذت ایک سرسراہٹ اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی۔ اس طرح چلنے اور سینہ تانے کسی نے نہ کیا اس نے خود بھی اپنے تئیں محسوس نہ کیا تھا۔ روشنی کی زیادتی سے ایک چکا چوند سی پھیلی تھی۔ بازار میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھ رہا تھا۔ ہر کوئی انتشار اور جنسی لذتوں سے کھیلتا جا رہا تھا کہ دور روشنیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے کا سر پتلوں سے توڑنے پھوڑنے پر تل گئے تھے۔ ایک کہرام مچ رہا تھا۔ تماشائیوں نے سارا بازار سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ایک مجذوب جنسی لذتوں کا مارا وحشیانہ طور پر بھاگا آرہا تھا۔ وہ پان والے کی دکان سے پان اٹھا لایا تھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے رلدو کے سامنے آ کر رک گیا۔ رلدو نے بھی بڑی بے نیازی سے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور مکئے نکالے اور

بغیر کسی جانچ پڑتال کے مجذوب کی طرف بڑھا دیئے۔ مجذوب نے سکے تو لے لئے مگر بڑی بے پروائی سے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور سکے بکھیر دیئے۔ جب زمین پر سکوں کے گرنے کی مختلف آوازیں پیدا ہوئیں تو ادھر اُدھر بیٹھی ہوئی کسبیوں اور رنڈیوں میں ایک قہقہہ بلند ہوا جسے سب نے مل کر رلدو اور مجذوب دونوں کو داد دی ہو۔ اتنے میں مجذوب رلدو سے چمٹ گیا اور اس نے جی بھر کر رلدو کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ لذتِ ارتعاش سے تھرتھرا رہا تھا اور جب اسے کچھ ہوش آیا تو رلدو کو پکڑ کر گل فروش کے پاس لے گیا اور درخواست کی کہ وہ اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دے۔ رلدو نے وہی کچھ کیا جو وہ چاہتا تھا۔ مجذوب کا دل اُبھر آیا اور وہ جی سے دعائیں دیتا ہوا چل دیا۔

پان سگرٹ بیچنے والے کی دکان کے ایک پہلو میں ایک چھپلی سی رنڈی بیٹھی انگڑائی لے رہی تھی۔ اس نے رلدو کو دور سے تاکا تھا۔ اس نے رلدو کو اشارہ کیا، اس نے ظاہر کیا وہ اس کی منتظر ہے مگر وہ منہ موڑ گیا۔ موڑ پر وہ ایک دوسری سے دوچار ہوا مگر وہ رلدو کی پھیلی آنکھوں کی تاب نہ لا سکی۔ اپنی طرف سے ظاہر کرتی رہی وہ داشتہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو فروخت کرنا چاہتی ہے مگر رلدو اس کی پیشکش کو خاطر میں نہ لایا اور نہایت اطمینان سے اپنے مقصد کا پیچھا کرتا رہا۔

اس نئے چوک میں نئی دنیا تھی۔ سب کچھ دیکھتا بھالتا، مگر توجہ نہ دی۔ اس خیال سے بھی کہ آخر ہر کوئی رلدو تھوڑا ہے ——— گڈ بازار میں رلدو اب ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں گڈ بازار کے بسنے والے اپنے حقیقی رنگ میں بسے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ واقعات کی سرمستیاں جنسی حدود سے بھی تجاوز کر رہی تھیں۔ قرینے سے بیٹھی ہوئی کسبیوں کی سج دھج اور ان کے زرق برق لباس نگاہوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا رک جائے۔ قدم قدم چلنے لگے۔ اپنا آپ بیچنے والیوں کو جی بھر کر دیکھے مگر قدم ایک پل کے لئے بھی نہ رُکے اور نہ وہ تقدس سے جھکا۔ اس کی بائیں جانب ایک کسبی سرِ بازار کھڑی تھی۔ اس نے جرأت کر کے رلدو کو بازو سے پکڑا مگر جب آنکھیں چار ہوئیں تو وہ اس کے جلال و جمال کا مقابلہ نہ کر سکی۔ ایک اور کسبی جس کے گال کچھ پچک گئے تھے مگر آنکھوں میں زندگی تھی، حسن تھا، سب کچھ تھا۔ مگر ذرا سی مایوسی سے راہ گزروں کو اشارے کرنے پر اور بلانے پر اتر آتی تھی۔ اس نے بھی رلدو سے سودا کرنا چاہا مگر رلدو کی گاہکی کا طریقہ ابھی وضع نہ ہوا تھا۔

ایک تنگ سی گلی کے موڑ پر ایک سیاہ فام لڑکی بیٹھی تھی وہ مشکل سے پندرہ سولہ سال کی معلوم دیتی تھی۔ اس کی جلد باوجود سیاہ ہونے کے خون کی سی معلوم دیتی تھی۔ اس میں لطافت کچھ اس طرح نتھر آئی تھی جیسے برسات کے بعد پتے خود بخود چمکنے لگے ہوں۔ بدن سڈول اور تناؤ سے بھرپور۔ وہ خوش وضع تھی۔ شکل و صورت میں لجاجت پائی جاتی تھی۔ غازہ لگانے سے اس کا حسین چہرہ از کھا اور سرخی مائل نیلا نیلا دکھائی دے رہا تھا اور اس نیلے رنگ نے روشنی میں ایک ایسا للچا پیدا کر دیا تھا کہ خواہ مخواہ نگاہ اس پر اٹھتی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ جوانی اور خوبصورتی کے ساتھ اسے غازہ لگانے کا سلیقہ بھی خوب آتا تھا۔ رلدو کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ للچا اٹھا۔ وہ فیصلہ کر بھی نہ پایا تھا کہ کوئی دوسرا جو بڑی جرأت رکھتا تھا بغیر سرپے سمجھے سیاہ ناگن کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کا اپنا رنگ سفید تھا۔ عینک کے اندر سے آنکھوں کی چمک بہت بھلی معلوم دے رہی تھی۔ بارونق چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ بغل میں چند کتابیں تھیں۔ اوپر والی جیب میں فونٹین پن اور پنسل دونوں قرینے سے لگا رکھے تھے۔ اس سیاہ فام چھوٹی کسبی نے اس کا استقبال بڑے سلیقے سے کیا اور اپنی انگنی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بازار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ رلدو کو اس کے جی بھر کر نہ دیکھنے کا صدمہ تھا۔

ایک اور کھلبلی سی بازار میں اِدھر اُدھر پھدکتی پھرتی تھی۔ نظر تو یہی آتا تھا کہ اس نے اپنی بے قدری کر رکھی ہے مگر فطرتاً وہ چالاک تھی اپنے پیشے کی نوعیت کو خوب سمجھتی تھی اور اپنی بُرائی بھلائی کو کبھی نظر انداز نہ کرتی تھی۔ اگر کوئی اس کی بے تکلفی اور بے نیازی کو دیکھ کر اس سے دام پوچھ بیٹھتا تھا تو وہ منہ مانگی قیمت وصول کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ اس نے رلدو کو ایک بے بہا دینے والی شخصیت سمجھ کر اس کے دل کی

دھڑکنیں مچلیں اور دو سروں کی پروا نہ کی جو اس کے گرد دیر سے چکر کاٹ رہے تھے اور اسے ایک روح پرور محجوب سمجھ رہے تھے مگر رلدو اس کی گرفت سے نکل چکا تھا۔

کئی اکی کسیبیوں نے رلدو کا راستہ بھی روکا۔ کئی ایک نے اسے بازوؤں سے پکڑا، اشارے کئے مگر وہ بغیر اپنی رفتار کو کم کئے اپنی ٹوپی میں چھپا کیا۔ اس کا بدن پسینہ سے تر تھا۔ اس کا اضطراب اب دم لینا چاہتا تھا۔ اس نے جرأت والیوں کی دل ہی دل میں داد بھی دی مگر وہ یہ رائے نہ ہار تھا کہ وہ ابھی تک اپنے مقصد سے دور ہے ——— متانت سے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا یہی تو جگہ ہے جہاں نہ چھوٹے بڑے کی تمیز ہے اور نہ اچھے بُرے کی پہچان۔ چند قدم ہی بڑھا ہوگا کہ دو نوجوانوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک نے بڑے اعتماد سے کہا۔ میری نگاہ ہرگز ہرگز دھوکہ نہیں کھا رہی یہ بابا رلدو ہے۔ دوسرا بھی پورے اعتماد سے بولا دماغ تو نہیں پھر گیا تمہارا۔ کہاں یہ گدڑ بازار اور کہاں بابا رلدو۔ دونوں میں شرط تک نوبت پہنچ گئی۔ وہ دونوں اس کا بچھا کرتے رہے مگر رلدو نے بھی اپنے اعتماد کو ہاتھ سے نہ دیا اور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جب وہ اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو وہ بھر بھرچکا سی ہو کر رہ گئی۔ مگر اندرونی طور پر اتنی خوش تھی کہ بازار بھر میں کوئی اس کی اس خوشی کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ آج بن بلائے، بن مانگے رحمت چل کر اس کے پاس آ گئی ہے۔ رلدو روایات کا ولیتا مگن باوقار طریق سے بیٹھا اس کے انگ انگ کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ نہایت احترام سے جھکی چپ چاپ اپنا تعارف کرا رہی تھی۔ اگر اس کی روح میں کوئی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی تو جسم پر بھی نیکی ابھر آئی تھی۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اس کے روئیں روئیں سے کوئی نوا بیدہ قوت بیدار ہو رہی ہے۔ وہ شدتِ ارتعاش سے اٹھ کھڑی ہوئی تقدس سے جھکی جھکی دروازے کے پاس پہنچی تو ملازم نیچے کھڑا آوازیں دے رہا تھا "نازلی بی بی! نازلی بی بی!" اصل میں وہ رلدو کے آنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ نازلی انہی قدموں پر نیچے اتر گئی اور جاتے ہی اس کا گلا دبا دیا اور بڑے نرم سے لہجے میں کہا دوبارہ آواز نہ نکالے۔ خود خوشی میں لڑکھڑاتی پھرلے زینے تک آئی تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے اور پھر تیسرے کمرے میں چلی گئی۔ اول تو جرأت نہ ہوتی تھی کہ رلدو کے سامنے جا کر بیٹھ جاتی۔ دوسرے یہ بھی چاہتی تھی کہ آئی رحمت کو کوئی دیکھ نہ پائے، کوئی سُن نہ پائے۔ بے سوچے سمجھے غسل خانے میں جا پہنچی اور جاتے ہی ہونٹوں کی سُرخی اور رخساروں پر غازے کو دھو ڈالا۔ بال الٹے سیدھے کر کے صورت کو سیدھا سادہ بنا لیا۔ نہ سمجھ سکی اور نہ دیکھ سکی کہ وہ اس سادگی میں اتنے معصومانہ انداز سے کیا کی کیا بن گئی ہے۔

نازلی بازار والیوں سے ویسے بھی کچھ مختلف واقع ہوئی تھی۔ لٹکے ہوئے پردے کے پیچھے آدھی ڈھکی ہوئی اپنا توازن کھو بیٹھی تھی۔ اس نے جلدی جلدی سینے پر سے ساڑی کو نیچے کی طرف سرکا لیا تھا۔ رخساروں پر خوشی کے آنسو اُمڈ آئے تھے۔ اس خواب گاہ کی جہاں وہ اپنے گاہکوں سے ملتی تھی روشنی بجھا دی تھی۔ زندگی کے بارے میں وہ لمحہ بھر کے اندر اندر اتنا کچھ سوچ گئی تھی شاید اس سے پہلے اس نے ساری زندگی میں اتنا نہ سوچا ہوگا۔ وہ تھرتھرا اٹھی۔ کبھی باہر آنے کی کوشش کرتی اور کبھی سامنے والے دریچے سے اِدھر اُدھر جھانکتی اور پھر اندر چلی جاتی اور تخلیہ میں بیٹھ کر اپنے بھاگوں پر غور کرتی اور سوچتی آخر کرے تو کیا کرے ——— اس کے پاس خدا کی رحمت چل کر آ گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ اس کی تاب نہ لا سکی تھی ہمیشہ کی بجائے نہ رہے تھے۔ رلدو اس کی ان حرکات سے بوکھلا اٹھا۔ وہ سارا بازار چھیتا تیرتا اس تک پہنچا تھا۔ وہ جانتا تھا آخر رنڈی ہی تو ہے۔ وہ رنڈی کے پاس آیا ہے۔ اس کے آجانے سے وہ اتنی خوش اور بے قابو کیوں ہوتی جا رہی ہے ——— پر وہ رلدو کی آمد کو قدرت کا کرشمہ اور معجزہ سمجھ رہی تھی اور کہتی تھی وہ انسانیت کا آئینہ دار ہے۔ آج اسے ایک انسان سے واسطہ پڑا ہے۔ جرأت ہوتی تھی اور نہ اسے کہہ سکتی تھی کہ وہ کس طرح اپنا دکھ درد کہنا چاہتی ہے کس طرح اپنی کیفیت کے اظہار کے لئے دل چیر کر سامنے رکھ دینا چاہتی ہے۔ وہ اپنے نازک احساسات اور جذبات کے اظہار کے لئے یہی چاہتی تھی کہ آنے والا خود ہی اس کے جذبات، اس کے احساسات کی ترجمانی کرنے لگے۔ وہ سمجھتی آئی رحمت میری کمزوریوں پر پردہ ڈال دے گی۔ اس کا

جاہ و جلال میرا لازم دار بن جائے گا اور کہے گا وہ اسے اچھی طرح سے سمجھ رہا ہے اور اس کی بخشش اور گناہوں کا کفارہ دینے میں اس کا مددگار رہے۔

رلدو جاہتا تھا وہ نازلی کو حسبِ پہلوان کی طرح ایک جھٹکا دے اور اس سے بے تکلف باتیں کرتا چلا جائے اور اپنے قرض دار مول کی طرح اس کی عزت اتار کر اپنا تھیں دے دے لیکن نازلی کی بے کلی اور گردن کا جھکاؤ دیکھ کر سمٹ سا گیا ——— نازلی آخر ایک کسبی تھی، اسے اپنے اندر کئی طوفان اٹھتے ہوئے محسوس ہوئے ——— کسی ہمسائی کو آواز دی۔ ملازم کو بھیل پھول اور چائے لانے کا اشارہ کیا اور یہ بھی سمجھا دیا کہ جو کچھ بھی وہ کرے بڑے عقیدے سے انجام دے۔ نازلی اپنی دوسری بہنوں سے کچھ زیادہ ہی توہمات کی قائل تھی۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا اور رہ رہ کر وہ سیان اس طرف جاتا تھا کہ سارے بازار کو اپنے گھر لٹنے پر آنے کی دعوت دے اور سب کو زندہ کرامات، رحمت صورت ملدو دکھائے اور رکھے بخشش کے طریق ہمیشہ ہی نرالے ہوتے ہیں۔

دہلیز سے آگے بڑھا ہی تھا تو اس نے یقین کر لیا تھا آنے والا زندگی کا تمام تر بوجھ ہلکا کر دے گا۔ اس کی برکت نازلی کو دنیا پر بھاری بنا دے گی۔ اس کا فراخی چہرہ، فرشتہ صورت، سُرخ داڑھی اسے وہ کچھ دے گی جو آج تک کسی سے کسی کو نہ دیا ہوگا۔ اس کا نامۂ اعمال جو مدتوں سے سیاہ ہو چکا ہے، دھل جائے گا۔ وہ مٹے غالب اونچی روح میں رحل جائے گی۔

اس نے اپنی دولت، حُسن اور شیریں کلامی پر بھروسہ نہ کیا۔ صرف عقیدتمندی سے اپنے پاکیزہ اخلاق کا اظہار کرتی رہی اور سمجھتی رہی آنے والا بھی اس کے غش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا اور وہ دیکھتے رہ گئے دنیا کی ہر نعمت سے بے نیاز ہو جائے گی ——— اس نے بڑھ کر جرأت سے اپنے پورے خلوص سے اس کی گردن میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے اور غور و تقدس سے اتنی جھک گئی کہ اس کا چہرہ بھی صاف طور پر دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے اپنی ہر کمزوری کو انتہائی طور پر چھپانے کی کوشش کی کہ رلدو اس کی معصومیت اور معصیت کے فرق کا اندازہ نہ کر سکا۔ اداسے باندھتا رہا۔ للچائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

آخر کار سایہ دل نازلی اپنے گھر کی زینت بن مانگی رحمت کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایک انمول سی روشنی کھیل رہی تھی اور اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ یقیناً وہ اس وقت ایک عورت معلوم دے رہی تھی جس کے سینے میں گداز دل اور نیک آرزوئیں ناچ رہی ہوں، بار بار ایک ایک آرزو، ایک سوال اس کے ہونٹوں تک آتا مگر وہ رلدو کا جلال، یکہ کہ رُک جاتی اور حیا سے آنکھیں جھکا لیتی۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ نازلی جوں کی توں دونا نو بیٹھی رہی۔ یا زانکی باڈھر میں کچھ فرق محسوس ہو رہا تھا۔ روشنیاں مدھم ہوتی جا رہی تھیں رلدو کہتا تھا۔ دنیا کچھ نہ کہتی تو وہ بہتر سال کا جوان اور اڑھائی سو سال کا بوڑھا ہوتا ——— نازلی کا دل اب دھڑک رہا تھا۔ رلدو اب اور بھی اس کے قریب تھا۔ اس کا بازو ایک اجنبی سی سکسکاہٹ کے ساتھ بڑھا اور اس کی کمر کے گرد حمائل ہو گیا۔ غمزدہ صورت سہم گئی۔ وہ آبدیدہ سی ہو گئی ——— "تم عورتیں اپنی اپنی قیمت کے مطابق محبت کرتی ہو ——— تم چیب ہو ——— شرما گئی ہو؟ میں تمہارے پاس تمہاری قیمت ادا کرنے آیا ہوں۔ بھاری سے بھاری قیمت ہو تم نے کبھی وصول نہ کی ہو۔" اس کا جسم سرد ہو گیا۔ گویا کسی نے اسے کسبی، حرامزادی، گشتی، دو کوڑی کی رنڈی کہہ دیا ہے ——— رلدو نے اسے زور سے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ نازلی کی آنکھوں میں غیر معمولی روشنی موجزن تھی ——— وہ کیا سوچ رہی تھی۔ کیا چاہتی تھی۔ ابھی تک واقعات نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا تھا۔

رلدو نے کھینچ کر نازلی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنے دہکتے ہوئے لب اس کے تھرکتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور جب اس کا مضبوط ترین ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ گیا تو معاً اسے خیال آیا کہ وہ بیچی ہے۔ بکنے کے لئے، بار بار بکنے کے لئے۔ ہر آنے والا اس کا گاہک ہے۔

(۹)

اُردو افسانہ

چوتھا دور

اشفاق احمد

گڈریا

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے میں اپنے گرم گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"کون ہے" میں نے چیخ کر پوچھا۔ اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی "تھانے والوں نے داؤ کو گرفتار کر لیا"

"کیا؟" میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ کو پرے دھکیلنا چاہا "کیا ہے؟"

اور تاریکی کا بھوت بولا "تھانے والوں نے داؤ کو گرفتار کر لیا ——— اس کا فارسی میں ترجمہ کرو"

"داؤ جی کے بچے" میں نے اندھے ہو کر کہا "آدھی آدھی رات تنگ کرتے ہو ——— دفع ہو جاؤ ——— میں نہیں ——— میں نہیں آپ کے گھر رہتا۔ میں نہیں پڑھتا ——— داؤ جی کے بچے ——— کتے!" اور میں رونے لگا۔

داؤ جی نے چمکار کر کہا "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہو گا! پاس نہیں ہو گا تو بڑا آدمی نہ بن سکے گا، پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے؟"

"اللہ کرے سب جائیں۔ آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی ..... اور میں بھی ——— میں بھی ..... میں بھی" اپنی جوانا مرگی پر میں ایسا رویا کہ دو ہی لمحوں میں گھگھی بندھ گئی۔

داؤ جی بڑے پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرے جاتے تھے، اور کہہ رہے تھے "بس اب چپ کر شاباش ——— میرا اچھا بیٹا۔ اس وقت یہ ترجمہ کرنے پھر نہیں جگاؤں گا"

آنسوؤں کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا۔ میں نے جل کر کہا "آج حرامزادے داؤ کو پکڑ کر لے گئے کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ تو....."

"نہیں نہیں" انھوں نے بات کاٹ کر کہا "میرا تیرا وعدہ رہا آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا ——— شاباش اب بتا" تھانے والوں نے داؤ کو گرفتار کر لیا"

میں نے روٹھ کر کہا "مجھے نہیں آتا۔"

"فوراً انہیں کہہ دیتا ہے" انھوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا "کوشش تو کرو۔"

"نہیں کرتا" میں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہنسے اور بولے "کارکنانِ گزمہ خانہ را آذرا تو قیف کر دند ـــــــ کارکنان گزمہ خانہ، تھانے والے۔ بھولا نہیں نیا لفظ ہے۔ نئی ترکیب ہے دس مرتبہ کہو۔"

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں تا چار گزمہ خانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو داؤ جی نے بڑی لجاجت سے کہا اب سارا فقرہ پانچ بار کہو۔ جب پنجگانہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انھوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹانے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا۔

"بھولنا نہیں! صبح اٹھتے ہی پوچھوں گا۔"

پھر وہ جدھر سے آئے تھے اُدھر لوٹ گئے۔

شام کو جب میں تلاجی سے سپارے کا سبق لے کر لوٹتا تو خزانچیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے۔ مگر میں صرف موٹے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب "کدو کرلا ڈھائی آنے" کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا۔ جس کے تین طرف کچے پکے مکانوں کی دیواریں اور سامنے رُخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور خاردار جھاڑیوں کا اونچا جنگلا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا تھا۔ پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ گیرو رنگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پکا مکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا۔ اور قدرے تنگ ہو جاتی پھر جوں جوں اس کی لمبائی بڑھتی توں توں اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی۔ اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بند دن کی نالی میں چلا جا رہا ہوں۔ اور جونہی میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے "ٹھائیں" ہو گا اور میں مر جاؤں گا۔ مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راہگیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید پوش مونچھوں والا لمبا سا آدمی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پہ ململ کی بڑی سی پگڑی۔ ذرا سی خمیدہ کمر پہ خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ۔ کھدر کا تنگ پائجامہ اور پاؤں میں پلیٹ بوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا۔ جس نے عین اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹکے بغیر گردنوں کو ذرا ذرا مروڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن میں اور میرا بھائی ٹھٹھیاں کے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آ رہے تھے تو نہر کے پل پر یہی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا۔ اور اس کی سفید چٹیا میری مرغی کے پَر کی طرح اس کے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گذرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے سلام کہا "داؤ جی سلام۔"

اور داؤ جی نے سر ہلا کر جواب دیا "جیتے رہو۔"

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بے حد خوش ہوا۔ اور تھوڑی دیر بعد اپنی ممنی آواز میں چلایا "داؤ جی سلام"

"جیتے رہو۔ جیتے رہو!" انھوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا اور میرے بھائی نے پٹاخ سے میرے رَتاٹے کا ایک تھپڑ دیا۔

"شیخی خورے، کہتے"، وہ چیخا جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنسانا ہے کمینہ "بھلا کون ہے وہ؟"

"داؤد جی!" میں نے بسور کر کہا۔

"کون داؤد جی؟" میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

"وہ جو بیٹھے ہیں" میں نے آنسو پی کر کہا۔

"بکواس نہ کر" میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا "ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کتا ——— شیخی خورا"

میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داؤد جی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے میرے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت تھی۔ بڑا تھا نا اس لئے ہر بات میں اپنی شیخی گھجارتا تھا۔

داؤد جی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لئے میں کوشش کر کے گلی میں سے اس وقت گذرنے لگا جب وہ نہا رہے ہوں۔ انہیں سلام کر کے بڑا مزہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ وہ جیتے رہو کچھ ایسی محبت سے کہتے کہ زندگی دو چند سی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا ——— سلام کا یہ سلسلہ کئی سال بھر تو نہیں چلتا رہا اور اس اثنا میں مجھے اس قدر معلوم ہو سکا کہ داؤد جی گیرو رنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں۔ اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے ماتھے پر گھڑے گھڑائے دو فقرے ہوتے تھے۔ "تجھے کیا" اور "بکواس نہ کر"۔ "گرو کا شکر ہے میرے تجسس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم۔ بی۔ ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا، تو وہی داؤد جی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤد جی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے زیادہ ہشیار تھا۔ اس کی بیگڈی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی۔ اور چہرہ بلی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اسے بیاؤں کہتے تھے اور باقی بنولا کہہ کر پکارتے تھے۔ مجھ میں داؤد جی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام ہی سے پکارتا تھا۔ اس لئے وہ میرا دوست بن گیا تھا۔ اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر سچے یار بننے کا وعدہ کر لیا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسا دینے والی دوپہر تھی۔ لیکن پتنگ بازی کی کمانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا۔ اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔

امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن۔ پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی۔ آگے مستطیل صحن، سامنے سُرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ، تلسی کے چند پودے اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیرو رنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی سے ملحقہ بیٹھک میں کھلتی تھیں، اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو امی چند نے چلا کر "بے بے نسنے" کہا اور مجھے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھی۔ اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا "بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے"

مشین رُک گئی

"ہاں ہاں" بے بے نے سکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جزدان کی رسی مروڑتا اور ٹیڑھے ٹیڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آ لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" بے بے نے چوکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنا نام بتا دیا۔

"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے"۔ اس لڑکی نے قلعی زمین پر رکھ کر کہا "ہے نا بے بے؟"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا"

"آفتاب کیا؟" اندر سے آواز آئی "آفتاب کیا بیٹا؟"

"آفتاب کا بھائی ہے واہ جی" لڑکی نے رکتے ہوئے کہا "امی چند کے ساتھ آیا ہے"

اندر سے واہ جی برآمد ہوئے۔ انھوں نے گھٹنوں تک اپنا پائجامہ چڑھا رکھا اور کرتہ اُتارا ہوا تھا۔ مگر سر پر پگڑی بدستور تھی پانی کی ہلکی سی بالٹی اُٹھائے وہ برآمدے میں آ گئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے "ہاں بہت شکل ملتی ہے۔ مگر میرا آفتاب بہت دُبلا ہے اور یہ گول مٹول سا ہے" پھر بالٹی فرش پر رکھ کے انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس کا پیڑھا ایک اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے ذہن سے پاؤں اُوپر اُٹھا کر انھوں نے آہستہ سے انھیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دیئے۔

"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انھوں نے بالٹی سے پانی کے چلو بھر بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی" میں نے ہولے سے کہا "پرسوں آیا تھا"

"کیا لکھتا ہے؟"

"پتہ نہیں جی اباجی کو پتہ ہے"

"اچھا" انھوں نے سر ہلا کر کہا "تو اباجی سے پوچھا کرنا ہے ـــــ جو پوچھا نہیں سے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا"

میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انھوں نے ویسے ہی چلو ڈالتے ہوئے پوچھا "کونسا سپارہ پڑھ رہے ہو؟"

"چوتھا" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تمہارے سپارے کا؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی پتہ نہیں" میری آواز پھر ڈوب گئی۔

"تِلْکَ الرُّسُلُ" انھوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے رہے۔ بے بے شین چلاتی رہی۔ وہ لڑکی نعمت خانے سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور میں جزدان کی ڈوری کو کھولتا لپیٹتا رہا۔ امی چند ابھی تک ٹھٹھک کے اندر ہی تھا اور میں ستون کے ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرائیوں میں اُترتا جا رہا تھا، معاً واہ جی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا ـــ

"سورہ فاتحہ سناؤ"

"مجھے نہیں آتی جی" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

انھوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا "الحمد اللہ بھی نہیں جانتے؟"

الحمد اللہ تو جانتا ہوں جی" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے "ایک ہی بات ہے! ایک ہی بات ہے!" پھر انھوں نے سر کے اشارے سے کہا سُناؤ۔ جب میں سُنانے لگا تو انھوں نے اپنا پائجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا۔ اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا۔ اور جب میں نے وَلَا الضَّالِّين کہا تو میرے ساتھ ہی انھوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہُوا کہ وہ ابھی اُٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے۔ کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمد سُنائی تھی تو انھوں نے بھی ایسے ہی آمین کہا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا مگر داؤ جی اسی طرح بیٹھے رہے۔ بلکہ اور بھی ٹھہر ہو گئے۔ اتنے میں امی چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے خلاف آہستہ سے کہا "داؤ جی سلام" اور انھوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہوئے سے جواب دیا "جیتے رہو"

بے بے نے مشین روک کر کہا "کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آجایا کرو۔ . . . . "

"ہاں ہاں آجایا کر" داؤ جی چونک کر بولے "آفتاب بھی آیا کرتا تھا" پھر انھوں نے بالٹی پر جھکتے ہوئے کہا "ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دُور ہو گیا اور فارسی کا شعر سا پڑھنے لگے۔

یہ داؤ جی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی۔ اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤ جی بڑے کنجوس ہیں۔ حد سے زیادہ چُپ سے ہیں اور کچھ لہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤ جی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تلخی سے کہا "تو مجھ سے پوچھ تو لیتا بے شک آفتاب ان سے پڑھتا رہا ہے۔ اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے ابا جی ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا سو اب تک ناراضی چلی آتی ہے۔ اگر انھیں پتہ چل گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا تو وہ خفا ہوں گے" پھر اماں نے ہمدردی کر کے کہا "اپنے ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا"

میں ابا جی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا، مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤ جی کے ہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے معتبری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے میں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے "گو آ گیا" پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے "کوئی گپ سُنا" اور میں اپنی بساط اور اپنی سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھانڈ کے کوئی بات سُناتا تو وہ خوب ہنستے بس یونہی میرے لئے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنے رجسٹر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے لے ایک سوال نکال۔ اس بات سے میری جان جاتی تھی۔ لیکن ان کا وعدہ بڑا سیلا ہوتا تھا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باتیں۔ اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ گپیں۔ چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسے الجھیلے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھتے یہ کیا ہے؟ "چٹائی" میں مُنہ پھاڑ کر جواب دیتا "ہوں ہوں" وہ سر ہلا کر کہتے "فارسی میں بتاؤ" تو میں تنگ کر جواب دیتا "داؤ جی ہمیں کوئی فارسی پڑھنی جاتی ہے" اس پر وہ مچلا کر کہتے "میں جو پڑھاتا ہوں گدھے ——— میں جو سکھاتا ہوں ——— سُنو! فارسی میں ۵۔ یا عربی میں حصیر" میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "بخشو جی بخشو، فارسی بھی اور عربی بھی میں نہیں پڑھتا جی معاف کرو" مگر وہ سُنی اَن سُنی ایک کر کے کہے جاتے فارسی بوریا، عربی حصیر۔ اور پھر کوئی چاہے اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیتا داؤ جی کے الفاظ گھستے چلے جاتے تھے ——— امی چند کتابوں کا کیڑا تھا۔ سارا دن مٹھک میں بیٹھا لکھتا پڑھتا رہتا۔ داؤ جی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے، لیکن ان کے دو، جی جب برابر ہوتے تھے وہ اپنی نشست سے اُٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا داؤ جی نے کتاب سے نگاہیں اُٹھا کر پوچھا، بینا ڈوگا ہو گیا ہے اس نے گلاس کے ساتھ مُنہ لگائے لگائے "ڈیڈ" کہا اور پھر گلاس گھڑونچی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ داؤ جی پھر سے میں

معروف ہوگئے۔ مگر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے اکیلے دادی جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے ہانک لگا کر کہتے "قرۃ بٹیا یہ قینچی تجھ سے کب چھوٹے گی؟" اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی "تم نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے سینے لکھوائے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہوتا شہد تو اچھے نکالنے چاہئیں" اور دادی جی ایک لمبی سانس لے کر کہتے "جاہل اس کا مطلب کیا جانیں" اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو کچھ آتا کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے، پھر بد دعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی رکتی تو دادی جی کہتے "ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برسنے کو، تم انہیں روکو مت، انہیں ٹوکو مت۔ پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب حصیر اٹھا کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بری عادت پڑ گئی اور اس بری عادت نے عجیب گل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبے کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجے سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن باتیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے، جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹوٹکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں معجون کے چند ڈبوں، شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشہ شیشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریر اور حضرت سلیمانؑ کے خاص صدری تعویذوں سے مریض کا علاج کیا کرتے تھے۔ انہی باتوں کے لئے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھنچے چلے آتے اور نبض یاب ہو کر جاتے، ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لئے خالی بوتلیں اور شیشیاں چرا کے لاتا اور اس کے بدلے وہ مجھے داستانِ امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لئے دیا کرتے۔

یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انہیں پڑھا کرتا۔ اور صبح دیر تک سویا رہتا، امّاں میرے اس رویّہ سے سخت نالاں تھیں، ابا جی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا، لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات طلسم ہوشربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی، اور دن کلاس میں بنچ پر کھڑے ہو کر، سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بمشکل پاس ہو گیا اور سالانہ امتحان کے موقعہ پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کے پاس ہو گیا۔ دسویں میں سندباد نامہ، فسانہ آزاد اور الف لیلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے، فسانہ آزاد اور سندباد نامہ گھر پر رکھے تھے، لیکن الف لیلہ سکول کے ڈیسک میں چھپا رہتا۔ آخری پنچ پر جغرافیہ کی کتاب نکلے سندباد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا۔ ..... بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی ہائی سکول پہنچی۔ امی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اوّل آیا تھا۔ مجھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چھوٹوں لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بہد سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے رہٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے اور اب کدھر جانا چاہیئے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمر و عیار کے ہتھکنڈوں اور سندباد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں صوچتا رہا۔ اتنے میں امّاں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ڈھونڈتی ادھر آ گئیں اور ابا جی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی۔ اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا، چنانچہ میں آرام سے امّی کے ساتھ جا کر حسبِ معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا کوڈو اور ولیسو یب یب مسجد کے کھوارٹے ٹال کے پاس بیٹھے مل گئے وہ لاہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ولیسو یب نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بجایا جی اکثر اپنے دوست فتح چند کے ہٹیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خرید لی تھیں، میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو یب یب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہیئے اور اس کے سامنے بڑا سا سائن بورڈ۔ سائن بورڈ دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی نوٹ لے رہا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر وضاحت چاہی تو کوڈو جھک کر بولا "بار ولیسو سب جانتا ہے یہ بنا تو تیار ہے یا نہیں؟"

پھر اس نے پلٹ کر ولیسو سے پوچھا "انارکلی دفتر بنائیں گے نا؟"

ولیسو نے ذرا سوچ کر کہا "انارکلی میں یا شاہ عالی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں۔"

میں نے کہا انارکلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انارکلی لاہور لکھا ہوتا ہے۔"

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں۔

گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بوٹ پالش کر رہا تھا کہ نوکر نے اگر تلاوت سے مسکراتے ہوئے کہا "چھوٹی ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"ہسپتال میں" وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی والا دروازہ کھول کر اباجی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ داؤجی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سہمے سہمے داؤجی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیر کے بعد جیتے رہو کی مانوس دعا سنی۔

"ان کو پہچانتے ہو؟" اباجی نے سختی سے پوچھا۔

"بے شک" میں نے ایک مہذب سیلز مین کی طرح کہا۔

"بے شک کے بچے، حرامزادے، میں تیری یہ سب . . . ."

"نہ نہ ڈاکٹر صاحب" داؤجی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے اس کو تو . . . ."

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تلخی سے کہا "آپ نہیں جانتے منشی جی اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملا دی۔"

"آپ فکر نہ کریں" داؤجی نے مرجھا کے کہا "یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن . . . ."

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آ گیا اور انھوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا "کیسی بات کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا۔"

"کرے گا، کرے گا ——— ڈاکٹر صاحب" داؤجی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "آپ خاطر جمع رکھیں۔"

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "میں سیر کو چلتا ہوں تم بھی میرے ساتھ آؤ راستے میں باتیں کریں گے۔"

اباجی اسی طرح کرسی پر بیٹھے غصے کے عالم میں اپنا سر اوپر اٹھ پلٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جالی والا دروازہ کھولا تو داؤجی نے پیچھے مڑ کر کہا "ڈاکٹر صاحب بھول نہ جائیے ابھی بھجوا دیجئے گا۔"

داؤجی مجھے ادھر ادھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہر کے اسی پل پر لے گئے جہاں پہلے پہل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انھوں نے بگڑی اتار کر گود میں ڈال لی۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انھوں نے آنکھیں

بند کر لیں اور کہا آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اوّل نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوا دونگا۔ میرے ہر ارادے میں خدا، خدا تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا۔ ۔ ۔ "

"مجھ سے پڑھائی نہ ہو گی" میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

"تو اور کیا ہو گا گدھو؟" انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا "میں بزنس کروں گا، روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں آؤں گا پھر دیکھنا۔ ۔ ۔ ۔ "

اب کے دادو جی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا "خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ایک ان پڑھ کی کار میں نہ بیٹھونگا نہ ڈاکٹر صاحب"

میں نے جل کر کہا "مجھے کسی کی پرواہ نہیں ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی ہیں اپنے یہاں خوش"

انھوں نے حیران ہو کر پوچھا "میری بھی پرواہ نہیں؟" میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے "میری بھی پرواہ نہیں؟"

"اوگر تو میری بھی پرواہ نہیں؟"

مجھے ان کے لہجے پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا "آپ کی تو ہے مگر ۔ ۔ ۔ ۔ " مگر انھوں نے میری بات نہ سنی اور کہنے لگے اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی؟ اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " انھوں نے فوراً پگڑی اُٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "میں حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ کتا ہوں حضرت مولانا کی خاکِ پا سے اسے مدتیہ بندہ ہو کر آقا سے یہ کہنا لعنت کا طوق نہ پہننا؟ خاندانِ ابوجہل کا خاندادہ اور آقا کی ایک نظرِ کرم۔ حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے چنتو کو منشی چنت رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی، میں کہتا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کشتہ بردار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لوگ سمجھتے ہیں ۔ ۔ ۔ " دادو جی کبھی ہاتھ جوڑتے، کبھی سر جھکاتے کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان سا ان کا منہ تکنے لگا تو مجھے کہا "آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا دادو جی؟ اور دادو جی "میرے آقا، میرے مولانا، میرے مرشد" کا وظیفہ کئے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہوا تو انگلیاں اوپر اٹھا کر بولے "کیا اچھا موسم ہے دن بھر دھوپ پڑے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے" پھر وہ پُل کی دیوار سے اُٹھے اور بولے "چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سودا خرید نا ہے" میں جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ منفعل اور جل ان کے ساتھ ہو لیا۔ گھسیے پنساری یعنی ولیسو بیب کے باپ کی دوکان سے انھوں نے گھر بلو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اُٹھا کر چل دیئے، میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا۔ مگر ہمت نہ پڑتی ایک عجیب سی سرشرم ایک لذیذ سی ہچکچاہٹ مانع تھی اور اسی تامل اور جھجک میں ڈوبتا اُبھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انھی کے ہاں سویا کرونگا، اور وہیں پڑھا کرونگا۔ کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اور اس کے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہرکین لالٹین بھی رکھی تھی۔

بزنس میں بننا اور پان پان کرتی پیکارڈ اڑانے پھرنا میرے مقدر میں نہ تھا۔ مگر میرے ساتھیوں کی زندگی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انھیں لاہور سے پکڑ لائے۔ لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں ہمارا وفتر پتہ نہیں ترقی کے کونسے شاندار سال میں داخل ہو چکا ہوتا۔

دادو جی نے میری زندگی اجیرن کر دی، مجھے تباہ کر دیا، مجھ پر جینا حرام کر دیا، سارا دن سکون کی بکواس میں گذرتا، اور رات، گرمیوں کی مختصر

رات، ان کے سوالات کا جواب دیتے ہیں، کرتے پر ان کی لھاٹ بھرے بستر کے ساتھ لگی ہے، اور وہ خونک رسولی اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں، مَیں نے بالکل ٹھیک بتا دیا ہے، تو وہ پھر اسی سوال کو دھرا رہے ہیں، میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے، اور انھوں نے پھر انہی نہروں کو آگے لا کھڑا کیا ہے، مَیں بل جاتا اور جھڑک کر کہتا "مجھے نہیں پتہ میں نہیں بتاتا"، تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے، میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی کنکر بن کر پتلیوں میں اُتر جاتی۔

میں آہستہ سے کہتا "داؤجی"

"ہوں" ایک گمبھیر سی آواز آتی۔

"داؤجی کچھ اور پوچھو"

داؤجی نے کہا "بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے ——— اس کی ترکیب نحوی کرو"

میں نے سعادت مندی کے ساتھ کہا "جی یہ تو بہت لمبا فقرہ ہے صبح لکھ کر بتا دونگا کوئی اور پوچھئے"

انھوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائے کہا "میرا گویا بہت اچھا ہے"

میں نے ذرا سوچ کر کہنا شروع کیا بہت اچھا صفت ہے حرفِ ربط ہی کر بنا مسند ... .

اور داؤجی اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے "تو اُٹھا کر بولے جانِ پدر تجھے پہلے بھی کہا ہے مسند ایسے بنایا کر"

میں نے ترکیب نحوی سے جان چھڑانے کے لئے پوچھا "آپ مجھے جانِ پدر کیوں کہتے ہیں جانِ داؤ کیوں نہیں کہتے؟"

"شاباش" وہ خوش ہو کر کہتے "ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ بھاشا کا ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بدن لکھنے بولنے میں سخت غلطی کرتے ہیں، روز بروز کہہ یا دن پر دن اسی طرح سے ... "

اور جب میں سوچتا کہ یہ ترکیب نحوی سے بھی زیادہ خطرناک معاملے میں اُلجھ گیا ہوں تو جمائی لے کر پیار سے کہتا "داؤجی اب تو نیند آ رہی ہے؟"

"اور وہ ترکیب نحوی؟ وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد جاہے مَیں لاکھ بہانے کرتا اِدھر اُدھر کی ہزار باتیں کرتا، مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے ہی بیٹھے رہتے، بلکہ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو کرسی پر رکھی ہوئی بگڑی اُٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا۔ ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

امی چند کالج چلا گیا تو اس کی عینک مجھے مل گئی۔ اور داؤجی کے دل میں اس کی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤجی بہت اچھے لگنے لگے تھے۔ لیکن ان کی باتیں جو اس وقت مجھے بُری لگتی تھیں۔ وہ اب بھی بُری لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے بھی کسی قدر زیادہ، شاید اس لئے کہ اب میں نفسیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور داؤجی پرانے ملّائی مکتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بُری عادت ان کی اُٹھتے بیٹھتے سوالی پوچھتے رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس پڑھاتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دے دے۔ صحتِ جسمانی قائم رکھنے کے لئے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا، لمبی سیر اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً سورج نکلنے سے دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے ٹھیک بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے "اُٹھ گرو موٹا ہو گیا بیٹا"، دُنیا جہان کے والدین صبح جگانے کے لئے کہتے ہیں کہ اٹھو بیٹا صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا مگر وہ "موٹا ہو گیا" کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے، میں منمنا تا، چلّا کر کہتے "بھدا ہو جائے گا بیٹا، گھوڑے پر ضلع کا دورہ کیسے کیا کرے گا!" اور میں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "داؤجی خدا کے لئے مجھے صبح نہ جگاؤ چاہے مجھے قتل کر دو، جاں سے مار ڈالو

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی وہ فوراً میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان دادی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور دادی جی ان سے بہت ڈرتے تھے، وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیا کریں اور دادی جی کو کوسنے دیئے جائیں۔ ان کی اس زبان درازی سے مجھے بڑا غصہ آتا تھا مگر وہ یا میں رہ کر مگر مجھ سے برداشت ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ ناگفتنی گالیوں پر اتر آتیں تو دادی جی میری بھتیجی بن آجاتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر کسی پیڑھی پر بیٹھ جاتے تھوڑی دیر بعد کہتے "غیبت کرنا گناہ ہے لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اس کی سرائے میں، میں، میری قرۃ العین اور تھوڑا تھوڑا تو بھی، ہم نمبر ایک بڑے عاجز مسافر ہیں" اور واقعی بے بے بھٹیارن سی تھی۔ اس کا سخت رنگ کالا تھا اور قامت بے حد سفید، ماتھا محراب دار اور آنکھیں چغلیاں سی۔ چلتی تو لمبی گردن بائی کے ساتھ جیسے زخد مجھے بھی معاف کرے) کئی کنسوئیاں لیتی بھرتی ہے۔ بچاری بی بی کو ایسی ایسی بری باتیں کہتی کہ وہ دنوں دن رو رو کے ہلکان ہوا کرتی۔ ایک امی چند کے ساتھ اس کی منی بھی شاید اس وجہ سے کہ دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے دادی جی سے پیار نہ تھا یوں تو بی بی بے چاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی تھی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں دادی جی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اوپر برساتی سے ایڈھن پینے آئی تو ذرا رک کر مجھے دیکھا پھر منڈیر سے جھانک کر بولی "دادی جی پڑھ نہیں رہا، تنکوں کی چارپائیاں بنا رہا ہے"

میں غصیلے بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا "تجھے کیا، میں پڑھتا، تو کیوں بڑبڑ کرتی ہے ——— آئی بڑی تھانیدارنی"

اور دادی جی نیچے سے ہانک لگا کر کہتے "نہ گل کرو بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے"

اور میں زور سے چلاتا "پڑھ رہا ہوں جی جھوٹ بولتی ہے"

دادی جی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چارپائی دیکھ کر کہتے "قرۃ بیٹا تو اس کو چھڑایا نہ کر۔ یہ جن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر گر گیا تو مشکل سے سنبھلے گا"

بی بی کہتی "کاپی اٹھا کر دیکھ لو دادی جی اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے کھیل رہا تھا"

میں قہر آلود نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ لکڑیاں اٹھا کر نیچے اتر جاتی۔ پھر دادی جی سمجھاتے کہ بی بی سب کچھ تیرے فائدے کے لئے کہتی ہے۔ ورنہ اسے کیا پڑی کہ مجھے بتاتی پھرے۔ تو قبول ہو یا پاس اس کی بلا سے! مگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے تیری بہتری چاہتی ہے" اور دادی جی کی یہ بات ہرگز سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیونکر چاہ سکتی تھی!

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے دادی جی کے ہاں سے چل دیتا گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھیج دیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آ کے اپنی لالٹین تیل سے بھرتا اور دادی جی کے یہاں آجاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی مجھے دادی جی کے گھر پر ہی بھجوا دیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی دادی جی سکول کی گراؤنڈ میں آکر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا اس کی تفصیل پوچھتے، پھر مجھے گھر تک چھوڑ کر خود دیر کر چلے جاتے۔ ہمارے قصبہ میں منصفی کا کام مہینے میں دس دن ہوتا تھا اور بیس دن منصف صاحب بہادر کی کچہری ضلع میں رہتی تھی۔ یہ دس دن دادی جی باقاعدہ کچہری میں گذارتے تھے۔ ایک آدھ عرضی آجاتی تو دو چار روپے کما لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا اس کی کتر بیونت اور سلیوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتی تھی۔ چونکہ کھلے چند ساؤں سے گھر کا بیشتر خرچ اس کی سلائی سے چلتا تھا۔ اس لئے وہ دادی جی پر اور بھی حاوی ہو گئی تھی ——— ایک دن خلاف معمول دادی جی کو لینے میں منصفی چلا گیا۔ اس وقت کچہری بند ہو گئی تھی اور دادی جی نانبائی کے چھپر تلے ایک بنچ پر بیٹھے گڑ کی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ہولے سے جا کر ان کا بستہ اٹھا لیا۔ اور ان کے گلے میں باہیں ڈال کر

چلئے آج میں آپ کو لے آیا ہوں" انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر جائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے ایک آہ جب سے نکال کر نانبائی کے حوالے کیا، اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیئے۔

میں نے شرارت سے ناچ کر کہا "گھر چلئے بے بے کو بتائیں گے کہ آپ چوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں"

داؤ جی جیسے شرمندگی ٹالنے کو مسکرائے اور بولے "اس کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گڑ کی چائے سے تھکن بھی دور ہو جاتی ہے۔ بھر یہ ایک آنہ میں گلاس بھر کے دیتا ہے، تم اپنی بے بے سے نہ کہنا خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کرے گی" پھر انھوں نے خوفزدہ ہو کر کچھ مایوس ہو کر کہا "اسکی تو فطرت ہی ایسی ہے" اس دن مجھے داؤ جی پر بڑا رحم آیا۔ میرا جی ان کے لئے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا۔ اس میں میں نے بے بے سے نہ کہنے کا ہی وعدہ کر کے ان کے لئے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اور کبھی نوکر کی معرفت داؤ جی کے ہاں دودھ، پھل، اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں مگر اس رسد سے داؤ جی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے، عیاشی برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے ایک صبح میں دودھ سے بھرا تاملوٹ ان کے یہاں لے کر آیا تھا اور بے بے گھر پر نہ تھی وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ بابا ساؤن کے جوہڑ میں اشنان کرنے گئی تھی۔ اور گھر میں صرف داؤ جی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤ جی نے کہا "چلو آج تینوں چائے پئیں گے۔ میں دوکان سے گڑ لے آتا ہوں، تم پانی چولھے پر رکھو" بی بی نے جلدی جلدی چولھا سنگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا اور پھر ہم دونوں وہیں چوکے پر پیڑھے کر باتیں کرنے لگے۔ داؤ جی گڑ لے کر آگئے تو انھوں نے کہا "تم دونوں اپنے اپنے کام پر بیٹھو چائے میں بناتا ہوں" چنانچہ بی بی مشین چلانے لگی اور میں ڈائرکٹ ان ڈائرکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ داؤ جی چولھا ابھی جھونکے جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اونچے اونچے بتاتے جاتے تھے گلیلیو نے کہا "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے" گلیلیو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ کھود دینا کہ سورج کے گرد گھومتی تھی، پانی ابل رہا تھا داؤ جی خوش ہو رہے تھے اسی خوشی میں جوش جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا گیت گا رہے تھے۔ اوگورو اوگورو! گلیلیو کی بات مت بھولنا، گلیلیو کی بات مت بھولنا۔ انھوں نے چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولھے پر ہی تھا اور داؤ جی اک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی گل گل بل گل بل کے ساتھ گو لو گلیلیو گو لو گلیلیو کئے جا رہے تھے، میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا، بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے جاتی تھی اور ہم تینوں ایسے جیسے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پروں والی پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر داخل ہوئی۔ داؤ جی نے دروازہ کھلنے کی آواز پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو گیا۔ چکتی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر جائے کے چھوٹے چھوٹے بلبلے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے اور ممنوعہ کھیل رچانے والا بڈھا موقع پر پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولھے کی طرف دیکھا اور داؤ جی نے چوکے سے اٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجہ میں کہا "چائے ہے!"

بے بے نے ایک زوردار داؤ جی کی کمر میں مارا اور کہا "بڈھے پر دھا تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر بہار پھرے تجھے یہ سیٹھ یہ تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں جو گھر میں نہ تھی تو تجھے کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے بھانویں میں کل کی مرتی آج مروں تیرا من راضی ہو۔ تیری آسیں پوری ہوں کس مرنے جوگی نے جنا اودھر کس لیکھے کی رکھا نے میرے پلے باندھ دیا۔ ۔ ۔ ۔ تجھے موت نہیں آتی۔ ۔ ۔ ۔ اوں ہوں تجھے کیوں آئے گی" اسی فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے بھڑ بڑی کی طرح چوکے پر چڑھی کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولھے سے اٹھائی اور زمین پر ڈے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھینٹے داؤ جی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر گرے اور وہ "اوہ تیرا بھلا ہو جائے! اوہ تیرا بھلا ہو جائے" کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور میٹھک میں گھس گئے ان کے اس فرار بلکہ انداز فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنسے بنا نہ رہ سکے اور ہماری ہنسی کی آواز ایک ثانیہ کے لئے چاروں دیواروں سے

مسکرائی۔ میں تو خیر بچ گیا۔ لیکن بے بے نے سر سے جا کر بی بی کی باہوں سے پکڑ لیا اور چیخ کر بولی "میری بات بتا بڈھے سے تیرا کیا ناطہ ہے۔ بتا نہیں تو ابھی پران لیتی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کی کچی کیوں دی؟"

بی بی بچاری پس پس رونے لگی تو میں بھی اُٹھ کر اندر ریشمک میں کھسک آیا۔ داؤ جی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور اپنے پاؤں سہلا رہے تھے پتہ نہیں انھیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدی ہوئی کہ میں الماری کے اندر منہ کر کے ہنسنے لگا۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے "شکر کرو گارگی کہ گرفتارم بہ بیچلیتے نہ کہ معصیتے"

تھوڑی دیر رُک کر پھر کہا "میں اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے سر مطہر پہ کسے کی ایک کم نصیب ٹیڑھی غلاظت بھی کیا کرتی تھی"

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ شیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پر وہ اپنے محبوب کے طفیل نارِ جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیمؑ مجھے جرأت عطا کرے، مولائے ایوبؑ مجھے صبر کی نعمت دے"۔

میں نے کہا "داؤ جی آقائے نامدار کون؟"

تو داؤ جی کو یہ سن کر ذرا تکلیف ہوئی۔ انھوں نے شفقت سے کہا "جانِ پدر یوں نہ پوچھا کہ میرے استاد میرے حضرت کی روح کو مجھ سے بیزار نہ کر، وہ میرے آقا بھی تھے، میرے باپ بھی، اور میرے استاد بھی وہ تیرے دادا اُستاد ہیں۔۔۔ ۔۔۔ دادا اُستاد۔۔۔۔۔" اور انھوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ "آقائے نامدار کا لفظ اور کوتاہ قسمت مجزوہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤ جی سے سُنی۔ یہ واقعہ سُنانے میں انھوں نے کتنی ہی دیر لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے کے بعد فارسی کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے اُستاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔

جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا "داؤ جی آپ کو اپنے اُستاد صاحب اس قدر رچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں اپنے آپ کو ان کا زکر کیوں کہتے ہیں؟"

داؤ جی نے مسکرا کر کہا "جو ملیے کے ایک مگر کو ایسا بنا دے کہ لوگ کہیں یہ فقیر چنت رام جی ہیں وہ سیمانہ ہر آفتابہ ہو تو لعب رکیا ہو؟"

میں چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ پھسل کر بستر میں پہنچ گیا، اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر داؤ جی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پنڈلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد ذرا سا ہنستے اور پھر خاموش ہو جاتے ——— کہنے لگے "میں کیا تھا اور کیا ہو گیا ——— حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا تھی! میری طرف سر مبارک اُٹھا کر فرمایا "چوہال زائے ہمارے پاس آؤ" میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چھتہ پٹھار اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا، اور کسی کو آنکھ اُوپر اُٹھانے کی ہمت نہ تھی ——— میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا، بھئی ہم تم کو روز یہاں کبڑیاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انھیں چرنے بھگنے کے لئے چھوڑ کر ہمارے پاس آجایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو ——— پھر حضور نے میری عرض سنے بغیر پوچھا کہ نام ہے تمھارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا چنتو ——— حضرت مسکرائے ——— تھوڑا سا ہنسے بھی ——— فرمانے لگے پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے چنت رام ہو گا ——— میں نے سر ہلا دیا ——— حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں پھرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے گلے میں کھدر کا لبادہ تھا۔ پائجامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا۔ پاؤں میں ادھوڑی کے موٹے جوتے اور سر پر سُرخ رنگ کا جانگیہ لپیٹا ہوا تھا۔ کبڑیاں میری۔۔۔۔۔

میں نے بات کاٹ کر پوچھا "آپ بکریاں چراتے تھے دادو جی؟"

"ہاں ہاں" وہ فخر سے بولے "میں گڈریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں۔"

حیرانی سے میرا منہ کھلا رہ گیا اور میں نے معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے جلدی سے پوچھا "اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے" دادو جی نے کرسی چارپائی کے قریب کھینچ لی۔ اور اپنے پاؤں ہائے پر رکھ کر بولے "جانِ پدر اس زمانے میں تو شہروں میں بھی سکول نہ ہوتے تھے میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں۔ آج سے چھہتر برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔ بی ہائی سکول کا نام بھی جانتا تھا؟ وہ تو میرے آقا کو پڑھانے کا شوق تھا۔ اِرد گرد کے لوگ اپنے لڑکے چار حرف پڑھنے کو ان کے پاس بھیجا کرتے ——— ان کا سارا خاندان زیورِ تعلیم سے آراستہ اور دینی اور دُنیوی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ والد ان کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم اور چوٹی کے مبلغ تھے۔ جدِ امجد مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ گھر میں علم کے دریا بہتے تھے، فارسی، عربی۔ جبر و مقابلہ۔ اقلیدس حکمت اور علمِ ہیئت ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا۔ لیکن آپ کی زبانی ان کے تبحرِ علمی کی سب داستانیں سنیں، شیفتہ اور حکیم مومن خاں مومن سے ان کے بڑے مراسم تھے۔ اور خود مولانا کی تعلیم دلی میں مفتی انوار الحق مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی۔"

مجھے دادو جی کے بوضوح سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اس لئے میں نے جلدی سے پوچھا "پھر آپ نے حضرت مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا؟"

"ہاں" دادو جی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے "ان کی باتیں ہی ایسی تھیں۔ ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں۔ جس کی طرف توجہ فرماتے تھے بندے سے مولا کر دیتے تھے۔ مٹی کے ذرّے کو اکسیر کی خاصیت دیتے تھے ——— میں تو اپنی لاٹھی زمین پر ڈال کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا، اپنے بھائیوں کے پاس بوریئے پر بیٹھو۔ میں نے کہا جی اٹھارہ برس دھرتی پر بیٹھے گذر گئے اب کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر مسکرا دیئے اپنے چوبی صندوقچے سے حروفِ ابجد کا ایک مقوّا نکالا۔ اور بولے الف۔ بے۔ پے۔ تے ——— سبحان اللہ کیا آواز تھی کس شفقت سے بولے تھے کس لہجہ سے فرما رہے تھے الف، بے، پے، تے" اور دادو جی ان حرفوں کا ورد کرتے مجھے اپنے ماضی میں کھو گئے۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ اُٹھا کر کہا ادھر ہٹ تھا۔ اور اس کے ساتھ مچھلیوں کا حوض۔ پھر انھوں نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا "اور اس طرف مزارعین کے کوٹھے، دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ تھا اور سامنے ان کی عظیم الشان حویلی۔ اسی باغیچے میں ان کا مکتب تھا۔ درسِ فیض کھلا تھا جس کا جی چاہے آئے نہ مذہب کی قید نہ ملک کی پابندی ..."

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد با ادب با ملاحظہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا "حضرت مولانا کا اسمِ گرامی شریف کیا تھا؟" تو پہلے انھوں نے میرا فقرہ مشکوک کیا اور پھر بولے "حضرت اسماعیل چشتی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمیشہ انھیں جانِ جاناں کہہ کر پکارتے تھے کبھی جانِ جاناں کی رعایت سے مظہرِ جانِ جاناں بھی کہہ دیتے تھے۔"

میں ایسی دلچسپ کہانی سننے کا ابھی اور خواہشمند تھا کہ دادو جی اچانک رُک گئے اور بولے "سب سڈی ایری سسٹم کیا تھا؟" ان انگریزوں کا بڑا ہوا ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ وکٹوریہ کا فرمان لے کر سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دیتے ہیں۔ سوائے کے پہاڑے کی طرح میں نے سب سڈی ایری سسٹم کا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انھوں نے میز سے گرائمر اُٹھائی اور بولے "باہر جا کر دیکھ کے آ کہ تیری بے بے کا حقہ کم ہوا یا نہیں" میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو چوکا صاف کرتے پایا۔

دادو جی کی زندگی میں بے بے مالا پہلے بڑا ہی کمزور تھا۔ جب وہ دیکھتے کہ گھر میں مطلع صاف ہے اور بے بے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے، تو وہ پکار کر کہتے "سب ایک ایک شعر سناؤ" پہلے بھی سے تقاضا ہوتا اور میں چھوٹتے ہی کہتا ———

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجانے اور کہتے "اولیں شعر نہ سنوں گا، اُردو کا کم سنوں گا اور مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنوں گا۔"
میں کہتا مجھے سوچنے دیجئے۔ اتنے میں بی بی سنائے "
بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی۔

شنیدم کہ شاپور دم در کشید
چو خسرو بر اسمش قلم در کشید

اس پر دادو جی ایک مرتبہ پھر آرڈر آرڈر پکارتے۔
بی بی قہقہہ لگا کر کہتی۔

"شورے شد و از خواب عدم چشم گشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم ———"

دادو جی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے "بٹیا یہ شعر تو کئی مرتبہ سنا چکی ہے۔"
پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے "بھئی آج تمہاری بے بے بھی ایک سنائے گی" مگر بے بے ایک روکھا سا جواب دیتی "مجھے نہیں آتے شیر کبوت"

اس پر دادو جی کہتے "گھوڑیاں ہی سنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے" اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی اور دادو جی جن عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی امی چند کا اور کبھی ہمارا نام ٹانک دیتے۔ پھر کہتے "میں اپنے اس گرو مونو کی شادی پر سُرخ پگڑی باندھوں گا۔ برات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور نکاح نامے میں شہادت کے دستخط کروں گا۔ میں دستور کے مطابق سہرا کہوں گا۔ پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو یا نچیں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہوگی، ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہوگی۔ اس بدھو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادیان گھوڑیاں ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو فر فر سب کچھ سناتی ہوگی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دوں گا پھر خطِ شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خطِ شکستہ نہیں آئے گا میں تو اپنی بہو کو سکھا دوں گا ——— سن گورا! پھر میں تیرے ہی پاس رہونگا۔ میں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پر بفرمائید بفرمائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منہ دیکھا کرے گا" پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے خیلے خوب خیلے خوب سکتے۔ جانِ پدر چرا ایں قدر زحمت می کشی..... خوب۔ یاد دارم... اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہتے۔ بچارے دادو جی! چٹائی پر اپنی چھوٹی سی دُنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کئے جاتے ——— ایک دن جب چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دُنیا بسا چکے تھے تو ہولے سے مجھے کہنے لگے جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت بیوی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی ہے ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میرے امی چند کو بھی دے۔

اس کے خیالات کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے یہ سوانگ میسنم لیگ یہ ملیچھ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلانا گٹکا کھیلنا سیکھ رہا ہے۔ میری تو وہ کب مانے گا ہاں خدائے بزرگ و برتر اس کو ایک نیک مومن سی بیوی دلائے تو وہ اسے راہِ راست پر لے آئے گی۔

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چپ محض اس لئے ہُوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات

نکلے گی جس سے دادی کو بڑا دُکھ ہوگا ——— میری اور امی چند کی تو خیر باتیں ہی تھیں، لیکن بارہ جنوری کو بی بی کی برات سچ مچ آگئی۔ جیجا جی رام پرتاب کے بارے میں دادی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اجڈ لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انھوں نے جو استخارہ کیا تھا اس پر وہ پورا اُترا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی دادی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سمدھی فارسی کے اُستاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا، بے بے زار و قطار رو رہی ہے، امی چند آنسو بہا رہا ہے۔ اور محلے کی عورتیں پھُس پھُس کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور دادی میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں پکڑ تی۔ میں تو ازن قائم نہیں رکھ سکتا"، جیجا جی کے باپ بولے "منشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے" تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چارپائی پر ڈالا، عورتیں ہوا کرنے لگیں اور دادی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے انھوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اُٹھایا اور کہا "یہ کیا ہوا بیٹا۔ اُٹھو! یہ تو تمھاری نئی اور خود مختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے اسے یوں منحوس نہ بناؤ"۔ بی بی اسی طرح دھاڑیں مارتے ہوئے دادی سے لپٹ گئی انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "قرۃ العین میں تیرا گنہگار رہوں کہ تجھے پڑھا سکا تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید برخوردار رام پرتاب بھی۔ لیکن میں اپنے کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطاکار ہوں اور میرا اجمل میرے سامنے تم ہے" یہ سُنکر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور دادی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا "منشی جی آپ فکر نہ کریں میں بیٹی کو کریما پڑھا دونگا" دادی ادھر بیٹھے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "کریما تو یہ پڑھ چکی ہے، گلستان، بوستان بھی ختم کرا چکا ہوں، لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی"، اس پر وہ ہنس کر بولے "ساری گلستان تو میں نے بھی نہیں پڑھی، جہاں عربی آتی تھی آگے گذر جاتا تھا" ——— دادی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے، بی بی نے گوٹہ لگی سُرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چند اور پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور سکھیوں کے بازوؤں میں ڈولی کی طرف چلدی۔ دادی میرا سہارا لے کر چلے تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ نہ رسے بھینچ کر کہا۔ "دیر بھی لا رہا ہے۔ دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ او گولو۔ ... او مردم دیدہ ... ... تجھے کیا ہو گیا ..... جانِ پدر تو کیوں ... ..."

اس پر ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور اکّوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے امی چند اور میں اور ہمارے درمیان دادی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ ذرا زور سے نکل جاتی تو دادی آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ اُٹھاتے اور کہتے "لاحول پڑھو بیٹا لاحول پڑھو"

اور خود آنکھوں پر رکھے رکھے ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

دادو ہمارے محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا، بدی اور کینہ پروری اس کی جبلیت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اسی کا تھا اس میں بیس تیس بھینسیں اور گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام مانو گلی کے نچلی میاں میں بیٹھ کر بیچا کرتا تھا۔ تقریباً سارے محلے والے اسی سے دودھ بنتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ یونہی شوقیہ لاٹھی زمین پر بجا کر "پنڈتا مے رام جی کی" کہہ کر سلام کیا کرتا۔ دادی نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں معمولی آدمی ہیں کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک بڑے پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا۔ لیکن دادو نہیں مانتا تھا وہ اپنی موکھ کر جواب دیتا "اے بھئی جس کے سر پر جودی (چٹیا) جودھی پنڈت ہوتا ہے" ——— چوروں یاروں سے اس کی آشنائی تھی شام کو اس کے باڑے میں جُوا بھی ہوتا اور گندی اور فحش گالیوں کا مشاعرہ۔ بی بی کے جانے کے ایک دن بعد جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے نخوت سے آنکھ میچ کر کہا "مورنی تو چلی گئی اب تو اس گھر میں رو کر کیا لے گا" میں چپ رہا تو اس نے جھاگ والے دودھ میں ڈبو پھیرتے ہوئے کہا "گھر میں گونگا بہتی تھی سچ بتا کہ خوطہ

لگا یا کہ نہیں" مجھے اس بات پر غصہ آ گیا اور میں نے تاؤ ٹوٹ گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس ضرب شدید سے توتی وغیرہ تو برآمد نہ ہوا۔ لیکن وہ چکرا کر سخت پر گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤجی کو سارا واقعہ سنا کر میں دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا اور اماجی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت رانو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور حوالدار صاحب نے ہلکی سی گوشمالی کے بعد اسے سخت متنبہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے رانو داؤجی پر آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بوری کا اڑایا کرتا تھا۔ اور واقعی داؤجی کے فاضل سر پر وہ چھوٹی سی بوری ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے "یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کر اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چمکاتی تھی" گویں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی بگڑی اتارنے کی جسارت نہیں کی، لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں وہاں سے مڈل میجر ریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا "شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟" تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم سا سعادت مند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے۔ اور ہم سا خوش قسمت استاد بھی خال خال ہوگا۔ جسے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا، میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے، ہنس کر فرمانے لگے چنت رام ہمارے پاؤں نہ چھوا کرو بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے کہا اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی اب کے لئے دوائی نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لئے نذر کروں لیکن میرا بس نہیں چلتا ——— خاموش ہو گئے اور نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے" ——— داؤجی گذرے ایام کی تہہ میں اترتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"میں جمع سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دیتا "خادم آ گیا" مستورات ایک طرف ہو جاتیں تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلاتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوتا اور پھر حکم کا انتظار کرنے لگتا، وہ دعا دیتے میرے والدین کی خیریت پوچھتے گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے "لو بھئی چنت رام ذرا ان گائوں کی گٹھڑی کو اٹھاؤ" میں سعید گی کی طرح انہیں اٹھاتا اور کمر پر لاد کر حویلی سے باہر آ جاتا۔ کبھی فرماتے ہمیں باغ کا چکر دو کبھی حکم ہوتا سیدھے رہٹ کے پاس لے چلو اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے چنت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر نہیں مانے یہی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں وضو کرنے والے چبوترے پر بٹھا کر ان کے ہلکے پھلکے جوتے اتارتا، اور انہیں جھولی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھسٹ کر صف کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ انہیں اس طرح جاتے دیکھا تھا اس کے بعد جرأت نہ ہوئی۔ ان کے جوتے اتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپا لیتا اور پھر اسی وقت سر اٹھاتا جب وہ میرا نام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر میں قصبے کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر حویلی کو لوٹتا۔ تو فرماتے ہم جانتے ہیں چنت رام تم ہماری خوشنودی کے لئے قصبہ کی سیر کراتے ہو لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پر لدا لدا پھرتا ہوں دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں۔ اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطۂ عروج ہے۔ اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لدا لدا پھرتا ہوں اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک تمنا ہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لئے وقف کر دیا ہے ——— جس دن میں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انہیں سنایا۔ اس قدر خوش ہو گئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی۔ دین و دنیا کی ہر دعا سے مجھے مالا مال کیا۔ دست شفقت میرے سر پر پھیرا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا۔ میں نے اسے بجرِ اسود جان کر بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دعائیں دے رہے تھے اور فرما رہے تھے جو کام ہم سے نہ ہو سکا وہ تو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے خدا نے تجھے یہ سعادت نصیب کی۔ چنت رام تیرا سسی چوپاں

کا پیشہ ہے تو شاہ بلا کا پیرو ہے! اس نے خدائے عزوجل تجھے برکت دیتا ہے وہ تجھے اور بھی برکت دے گا تجھے اور کشائش میسر آئے گی . . . .

داؤجی یہ مانیں کہ نہ کرتے گھٹنوں پر سر رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آ رہا تھا اور داؤجی سخت ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے میرے ہر فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ ایک مضمون سے عہدہ برآ ہوتا تھا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے اُٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھے جاتے سنام کے وقت سکول پہنچنے کا انھوں نے وطیرہ بنا لیا تھا۔ ایک دن میں سکول کے ریڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ کی راہ کھسک گیا تو انھوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آ کر چیخنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بدزبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤجی کے نیچے گر یا میرا کہہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو میں انھیں کتے کہنے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اس قدر کہتے "دیکھ لے ڈومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اسے یہی بتاؤں گا کہ جان پدر یہ تیرے بڈھے باپ کو کتا کہتا تھا" میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انھیں زیادہ دکھ ہوتا تو منہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انھیں غصہ آتا تھا نہ دکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انھوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب، برخوردار آفتاب کہہ کر انھیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے۔ جن میں گولو انھیں بہت مرغوب تھا طفیلو اور سرے درجہ پر مسٹر چونچ اور انشش اسکوائر ان سب کے بعد آتے تھے اور ڈومنی صرف غصہ کی حالت میں۔ کبھی کبھی میں ان کو بہت تنگ کرتا۔ وہ اپنی چٹائی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں مجھے الجبرے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سارے جہان کی الجبرا کو مضرب ٹے کر تنگ آ چکا ہوں تو میں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو باؤں سے پرے دھکیل کر اونچے اونچے گانے لگتا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا نے دُکھ تینوں نیتوں دسنا ،

داؤجی حیرانی سے میری طرف دیکھتے تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر دیتا۔ نیتوں نیتوں دسنا۔ تے دُکھ تینوں نیتوں دسنا ——— دسنا دسنا دسنا . . . . . تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گاما رونا رونا رونا سارے گاما رونا رونا ——— تے دُکھ تینوں نیتوں دسنا۔ وہ عینک کے اوپر سے مسکراتے۔ میرے پاس آ کر کاپی اُٹھاتے، صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا چھوٹا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے۔

"سن بیٹا" وہ بڑی محبت سے کہتے "یہ کوئی مشکل سوال ہے!" جونہی وہ سوال سمجھانے کے لئے ہاتھ نیچے کرتے میں پھر تالیاں بجانے لگتا "دیکھ بھرا میں تیرا داؤ نہیں ہوں؟" وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

"نہیں" میں منہ چڑا کر کہتا۔

"تو اور کون ہے؟" وہ مایوس سے ہو جاتے۔

"وہ سچی سرکار" میں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا "وہ سچی سرکار، وہ سب کا پالنے والا ——— بول بکرے سب کا والی کون؟"

وہ میرے پاس سے اُٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا "داؤجی خفا ہو گئے کیا؟"

وہ مسکرانے لگتے "چھوڑ طفیلو! میں تو پانی پینے جا رہا تھا ——— مجھے جانی تو پی آنے دے"

میں جھوٹ موٹ برا مان کر کہتا "بوجی جب مجھے سوال سمجھانا ہوا داؤجی کو پانی یاد آ گیا"

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے "انشش اسکوائر جب تجھے چار ایکس کا مربع نظر آ رہا تھا تو تُو نے تیسرا فارمولا کیوں نہ لگایا اور اگر ایسا نہ بھی کرتا تو . . . . . "

او، اس کے بعد پتہ نہیں داؤجی کتنے دن پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف ہوت ہی کر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ لیکن جیومیٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤجی نے بہت کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انھوں نے کہا کل بادن پاول کرے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انھیں رٹنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن جو پراپوزیشن رات کو یاد کرتا صبح کو بھول جاتی۔ میں دل برداشتہ ہو کر ہمت چھوڑ بیٹھا۔ ایک رات داؤجی مجھ سے جیومیٹری کی شکلیں بنوا کر اور مشقیں کر اُٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹکا تھا اور انھیں بہت کوفت ہوئی تھی مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹا لگاتا رہا۔ مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے داؤجی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا، اور میں باہر صحن میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ کے سچ مچ رونے لگا۔ گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا تو میں نے داؤجی کی عزت بچانے کے لئے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر چپکے سے نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کے لئے سر اوپر اٹھایا تو داؤجی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انھوں نے مجھے رٹے بیمار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤجی نے میرا سر چوم کر کہا "لے بھئی طلبوے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تُو تو بہت ہی کم ہمت نکلا" پھر انھوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا۔ اور بیٹھک میں لے آئے۔ بستر میں بٹھا کر انھوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پائنتی اوڑھ کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انھوں نے کہا "اقلیدس چیز ہی ایسی ہے۔ تو اس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں انھیں میں اچھی طرح پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اتار چکا تھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے الجھن ہوتی۔ میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر پڑا متساوی الساقین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات اُلجھ گئی۔ میں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رُو سے اس کا جواب ٹھیک آتا تھا۔ لیکن علم ہندسہ سے پایۂ ثبوت کو نہ پہنچا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح سے روبا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اپنے دست مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا۔ لیکن جہاں مجھے اُلجھن ہوئی تھی وہیں حضرت مولانا کی طبیعت رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے "چنت رام اب ہم تم کو نہیں پڑھا سکتے۔ جب اُستاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور معلم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے" میں نے جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا۔ لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر شوشہ میرے لئے حکم ربانی سے کم نہیں اس لئے خاموش ہوں بھلا آقائے مغنوی کے سامنے ایاز کی مجال! لیکن حضور مجھے بہت دُکھ ہوا ہے۔ فرمانے لگے تم بیحد باتی آدمی ہو۔ بات تو سن لی ہوتی، میں نے سر جھکا کر کہا ارشاد! فرمایا۔ ہوتی میں حکیم ناصر علی سیستانی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ دیں گے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا اپنی والدہ سے پوچھ لینا اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا ——— والدہ مرحوم سے پوچھا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پا کر انھوں نے بات ہی جاتے میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی لپائی تپائی کر رہا ہوں جب فارغ ہوں گا تو والدہ سے عرض کر دوں گا

خیر۔ یام بڑے، صفدر کی حالت میں گذرے۔ میں دن رات اس شکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب برآمد نہ ہوتا۔ اس لاینحل مسئلہ

سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دلّی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے اجازت مل سکتی تھی نہ رقعہ، وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے۔ اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں ——— ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا۔ تو میں نے اپنی والدہ کی بڑی سے اس کی کل پونجی دو روپے چرائے اور نصف اس کے لئے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سر ان دونوں کے مقدس کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا ——— گاؤں سے نکل کر میں سیدھا کی جویلی کے نیچے ان کے مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ گھنٹوں کے بیٹھ کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا "بدقسمت ہوں اب اجازت جا رہا ہوں۔ لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہوں گا۔ پھر اگر حضور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پر رکھ کر میں وہاں سے چل دیا ——— سن رہا ہے؟"

داؤجی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے بیچ خار پشت بننے میں نے آنکھیں جھپکائیں اور بھولے سے کہا "جی؟"

داؤجی نے پھر کہنا شروع کیا" قدرت نے میری کمال مدد کی۔ اُن دنوں جا کھل جنید پر سہ حصاروالی ریل کی پٹڑی بن رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دلّی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دو دن چلتا۔ اس طرح تائید غیبی کے سہارے سولہ دن میں دلّی پہنچ گیا۔ منزل مقصود تو ہاتھ آگئی تھی۔ لیکن گوہر مقصود کا سُراغ نہ ملتا تھا جس کسی سے پوچھتا حکیم ناصر علی سبزستانی کا دولت خانہ کہاں ہے لفظی میں جواب ملتا۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت یاور تھی صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے لئے نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں کھیس بھینک کر گہری نیند سو جاتا۔ مثل مشہور ہے جو بندہ پابندہ آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی، وہ پتھر چھوڑوں کے محلہ کی ایک تیرہ و تار گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں فروکش تھے۔ اور چند دوستوں سے اونچے اونچے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اُتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا "کون ہے؟" میں نے سلام کر کے کہا "حکیم صاحب سے ملنا ہے" حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں مرجھکائے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے "اسلم گرامی" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "پنجاب سے آیا ہوں اور ..... میں بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ زور سے بولے" اوہو! چنت رام ہو؟ میں کچھ جواب نہ دے سکا فرمانے لگے مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے لکھتا ہے شاید چنت رام تمہارے پاس آئے۔ یہیں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی مرد کرنا۔ میں اسی طرح خاموش کھڑا رہا تو پاٹ دار آواز میں بولے "میاں اندر آؤ کیا چپ کا روزہ رکھا ہے؟" میں ذرا آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی عروس لڑکی کی طرح بیٹھے رہے پھر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا "برخوردار بیٹھ جاؤ میں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا، بھئی ذرا ٹھہرو مجھے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔ پھر حکم ہوا "بتاؤ تمہارے سر کا کونسا مسئلہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انھوں نے اسی طرح کنکھیوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کہ نہ لوں اُوپر کھینچ کیا کہ ان کی کمر تنہ ہو گئی۔ پھر فرمایا" بتاؤ" اپنی اُنگلی سے میری کمر پر ایک مقناطیسی الساقین۔ مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے "میاں جلدی کرو۔ نا بینا ہوں۔ کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکلی کمر پر کانپتی ہوئی اُنگلی سے مقناطیسی الساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے اب اس نقطہ س سے خط ج پر عمود گراؤ۔ ایک تو میں گھبرایا ہوا تھا دوسرے وہاں کچھ نہ آتا تھا۔ یونہی اٹکل سے میں نے ایک مقام پر اُنگلی رکھ کر عمود گرانا چاہا۔ تو تیزی سے بولے

ہے ہے کیا کرتے ہو یہ نقطہ س ہے کیا ؟ پھر خود ہی بولے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے ۔ بائیں کندھے سے کوئی چھ انگل نیچے نقطہ اس ہے وہاں خط کھینچو ——— اللہ اکبر اللہ اکبر کیا علم تھا ۔ کیا آواز تھی اور کیسی تبحر فہم تھی ۔ وہ بول رہے تھے اور میں مبہوت بیٹھا تھا ۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیریں متساوی الساقین بن کر ان کی کمر پر ابھر آئیں گی "پھر داؤ جی دلی کے دنوں میں ڈوب گئے ۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں وہ میری طرف دیکھ رہے تھے ۔ لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے ۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا "پھر کیا ہوا داؤ جی ؟" انھوں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "رات بہت گذر چکی ہے اب تو سو جا پھر بتاؤں گا" میں غصہ کی بچے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا تو انھوں نے کہا "پہلے وعدہ کرو کہ آئندہ مایوس نہیں ہو گا اور ان چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کو پتا شے سمجھے گا" میں نے جواب دیا "بھلا سمجھوں گا آپ فکر نہ کریں" انھوں نے کھڑے کھڑے کمبل بچھاتے ہوئے کہا "بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی خدمت گزاری میں رہا اور اس بھرپور عرصہ سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کوری آنکھوں کو دھویا ۔ واپسی پر میں سیدھا اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پر سر رکھ دیا ۔ فرمانے لگے جنت رام اگر تم میں قوت ہو تو ان پاؤں کو بھینچ لیں ۔ اس پر میں رو دیا تو دستِ مبارک محبت سے میرے سر پر پھیر کر کہنے لگے ، ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے ۔ آئندہ کہیں جانا تو نہیں بھی ساتھ لے جانا ۔ یہ کہتے ہوئے داؤ جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھے اسی طرح گم سم چھوڑ کر جھٹکے سے باہر نکل گئے ۔

انتظار کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھول رہا تھا ۔ داؤ جی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی ۔ اکثر میرے نفس تھتھنے ہاتھ پکڑ کر کہتے ، السپ تازی بن طویلۂ خر نہ بن ۔ مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گذرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام مند کر دیتا ۔ میرے مسلسل موں بدت نے بھی ان پر کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی ۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انھوں نے مجھے آجگایا اور میری مٹھیوں ، خوشامدوں ، گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اٹھا کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا ۔ پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے ۔ مردوں کی طرح کوئی چارۂ کار نہ تھا ۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد ، تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤ جی مجھے اسی طرح سیر کو لے جا رہے تھے ۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے ابھی گراں خوابی ، دور نہیں ہوئی ابھی طنبورا بڑبڑا رہا ہے ۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے کوئی سرنکال طنبورے کسی آہنگ پر نچ یہ کیا کر رہا ہے ، جب ہم ہنستی سے ، ور نکل گئے اور بیچ کی پگ ہمارے نے میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤ جی نے میرا بازو چھوڑ دیا ۔ مردادوں کا ہٹ آیا اور نکل گیا ۔ ندی آئی اور پیچھے رہ گئی ، قبرستان گذر گیا مگر داؤ جی تھے کہ کچھ آیتیں سی پڑھتے چلے جا رہے تھے ۔ جب ٹھٹھہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی ۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گذرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک سُہر غرق ہوا تھا ۔ مرنے والوں کی روحیں اسی ٹیلے پر رہتی تھیں ۔ اور آنے جانے والوں کا کلیجہ چبا جاتی تھیں ۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤ جی نے میرے گلے کے گرد مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا ۔

سامنے ، ان دو کیکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ ، پھر سو لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑ دو ، تب میرے پاس آؤ ۔ میں یہاں بیٹھتا ہوں ۔ میں مقبرہ سے جان بچانے کے لئے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہو گیا ۔ پہلے ایک بڑے سے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا اور ساتھ ہی حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گزر چکا ہو گا ۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح کیکروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب دس بیس چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا ۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے دوسرے بھوتنی پسلی میں بلا کا درد شروع ہو گیا تھا ۔ یہی مناسب سمجھا کہ مقبرہ پر جا کر داؤ جی کو سوئے ہوئے اٹھاؤں اور گھر لے جا کر خوب خاطر کروں ۔ غصہ سے بھرا اور دہشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا ۔ داؤ جی مقبرہ کی ٹھیکریوں پر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سر مار رہے تھے اور آنسو آنچے آنچے اپنا محبوب اشعار گا رہے تھے ۔ ؎

جناکم کن کہ فردا روزِ عشر
بہ پیشِ عاشقاں شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اوپر اٹھا کر انگشتِ شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو اور اس سے کہہ رہے ہوں دیکھ لو، سوچ لو، میں تمہیں . . . . میں تمہیں بتا رہا ہوں . . . . سنا رہا ہوں . . . . ایک دھمکی دیئے جاتے تھے پھر تڑپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور جناکم کن کہتے ہوئے رونے سے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چیخ مار کر بجائے قصبہ کی طرف بھاگنے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤدی ضرور اسمِ اعظم جانتے تھے اور وہ جن قابو کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جن ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلیٰ با تصویر والا جن تھا۔ جب داؤدی کا طلسم اس پر نہ چل سکا تو اس نے انھیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے جناکم کن گمرہ وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا ——— تھوڑی دیر بعد داؤدی ہنسے انھوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا "چل ملنبورے" اور میں ڈرتا ڈرتا ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ میں انھوں نے گلے میں لٹکتی ہوئی کھلی پگڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑ لئے اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔

تیرے لئے دال فریدا ڑیا جا!

اس جادوگر کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ان آنکھوں سے واقعی ان آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا سر تبدیل ہو گیا اس کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولنے لگیں اور اس کا سارا وجود جٹا دھاری ہو گیا ——— اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اڑا دیتا میں ان کے ساتھ سیر کو ہرگز نہ جاتا!

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آکر گرنے لگے۔ بے بے نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بچوں عالی گنیا کی طرح داؤدی سے چمٹ گئی۔ صبح صبح ان سے لپٹ گئی اور انھیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چلا رہی تھی "بڈھے ٹوٹکی یہ سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری خاری ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو اُلٹا ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں۔ اُجاڑ مانگتے ہیں۔ موت چاہتے ہیں" پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی "میں مر گئی، میں جل گئی، لوگو اس بڈھے نے میرے امی جی کی جان لینے کا بندھ کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے۔ میرا انگ انگ توڑ دیا ہے" امی جی تو داؤدی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس کی جان کے دشمن بھلا وہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن چونکہ کی خشت باری انھیں کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ جب میں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داؤدی نے زندگی میں پہلی بار مجھے جھڑک کر کہا "تو احمق ہے اور نہری بے بے، تم اجاہلیں ——— میری ٹیک نصال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو حق بھلوں پر اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا، اے دائے کہ تو نے میری بجائے عورتوں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس ——— صد افسوس" بے بے کو اسی طرح چلانے اور داؤدی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا ——— اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آ رہا تھا تو راستے میں رالو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا "سنا بابو تیرے کوئی اینٹ ڈھیلا تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمہارے ہینڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں"

میں نے اس مذاق کا برا منانا پسند نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤدی مجھ سے میرٹھ کی پالو زلیشہ سنتے ہوئے پوچھنے لگے۔ بیٹا کیا تو سچ مچ ہی ابھوت باپری جڑی کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے "تو ابھی تو بہت بھولا ہے اور میں نے خواہ مخواہ جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح سے اینٹیں پھینک سکتے ہیں ہمارے جو دلی اور پھتے مزدور کو بلا کر بدسلوکی جتائی ہے وہ تیرے کسی جن کو گھر کر نہ لیتے۔ لیکن یہ تو بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے کا کام

ہی کرتے ہیں کہ سائی بھی گر سکتے ہیں" میں نے جواب دیا۔ "جتنے مذاق چاہو کر لو مگر جس دن سر پھٹے گا اس دن پتہ چلے گا داؤ" داؤ جی نے کہا۔ "تیرے جس کی چیس ہوئی بیٹ نے تو قیامت سر نہیں پھٹ سکتا اس لئے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اٹھائی جا سکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے بے کے سر مر گئے گی"

پھر بولے "سن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی خیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی ——— سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا" میں نے چڑ کر کہا۔

ہمارے قصبہ میں ائی سکول ضرور تھا۔ لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لئے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ صبح آ گئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لئے ضلع جا رہی تھی اور لاری کے ارد گرد والدین قسم کے لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ اور اس ہجوم سے داؤ جی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ اور سب لڑکوں کے گھر والے انہیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے۔ اور داؤ جی ہمارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اچھل کر موسم کے تغیر و تبدل پر پہنچ جاتے وہاں سے پلٹتے تو اس کے بعد ایک اور بادشاہ آ یا کہ اپنی وضع سے ہند معلوم ہوتا تھا۔ وہ نقشہ میں چور تھا ایک صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے لے آئی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی" کہہ کر پوچھتے یہ کون تھا؟

"جہانگیر" میں نے جواب دیا۔ اور وہ عورت" "نور جہاں" ہم دونوں ایک ساتھ بولے ——— "صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟"

میں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے مثالیں؟ میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لائن میں بیٹھ گئے۔ اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا۔ تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے۔ بریک ان اور بریک ان ٹوکر فقروں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سٹارٹ ہو چلی تو اس کے ساتھ قدم اٹھا کر بولے طلبورے مادیاں گھوڑی ماکیاں مرغی ..... مادیاں گھوڑی..... ماکیاں ..... مرغی ——— ایک سال بعد خدا خدا کر کے یہ آواز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا۔!

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بھی بڑھ کر تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی اتوار کی صبح کو داؤ جی کا کوئی بیس صفحہ لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں بیٹھ نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سوا میں سے اسی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جونہی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا داؤ جی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا اور "اسی نمبر! اسی نمبر!" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر غلطی سے پوچھا "کون سوال غلط ہو گیا؟" میں نے جھوم کر کہا "جا جا دیواری والا" جھلا کر بولے "تو نے گھڑکیاں اور دروازے منفی نہ کئے ہوں گے" میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بیڑ کی طرح جھلاتے ہوئے کہا "ہاں جی ہاں جی ——— گولی مار کھڑکیوں کو" داؤ جی ڈولتی ہوئی آواز میں بولے "تو نے مجھے برباد کر دیا طلبورے سال کے تین سو پینسٹھ دن میں پکار پکار کر کہتا رہا سلطان کا سوال آنکھیں کھول کر حل کر نا مگر تو نے میری بات نہ مانی۔ تو نے میری بات نہ مانی۔ بیس نمبر ضائع کئے دو سے بیس نمبر۔

اور داؤ جی کا چہرہ دیکھ کر میری اسی فیصدی کامیابی بیس فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے" اگر ممتحن اچھے دل کا ہوا تو دو ایک نمبر تو ضرور دے گا، تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے" اس پرچے کے بعد داؤ جی

امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے ہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آجاتے اور کمرہ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤجی کو یریں چھوڑ دیا مگر یا میری ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سارا دن دوستوں یاروں کے ساتھ گھومتا اور شام کو ناولیں پڑھا کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤجی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا کروں تاکہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لئے بھی تیار کر دیں۔ لیکن میں ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سو بار فیل ہونا گوارا تھا اور ہے لیکن داؤجی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑیئے ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا انھوں نے کہا اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا فرمایا اس کی ترکیب نحوی کرو۔ حوالداروں کی گالی سے اندر گھس آئی۔ میں اسے مکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اندر داؤجی پوچھ رہے ہیں COW ناؤن ہے یا وب۔ اب ہر غسل خانہ اندھا یا کنجی جماعت تک پڑھا جانتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر داؤجی فرما رہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی TO COW کا مطلب ہے ڈرانا۔ دھمکی دینا۔ اور یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا ——— پھر ایک دن بھی آیا جب ہم چند دوست شکار کھیلنے کے لئے نکلے زمیں نے ان سے درخواست کی کہ منصفی کے آگے سے نہ جائیں۔ کیونکہ وہاں داؤجی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار۔ بندوق اور کارتوسوں کے متعلق سوال پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دیتے تو میں کسی بغلی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر رسماً ملنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤجی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر ہاکرتے۔ افسوس آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے میں شرارتاً خیلے نوب خیلے کہہ کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا اور اباجی لڈوؤں کی چھوٹی سی ٹوکری لیکر ان کے گھر گئے۔ داؤجی سر جھکائے اپنے حصیر میں بیٹھے تھے۔ اباجی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اندر سے کرسی اٹھا لائے اور اپنے بوریئے کے پاس ڈال کر بولے "ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی تقسیم کی خوبی سمجھنے میرا خیال تھا کہ اس کی فرسٹ ڈویژن آجائے گی۔ لیکن نہ آسکی۔ بنیادی کمزوری تھی۔ . . . . . "

"ایک ہی تو نمبر کم ہے" میں نے بیچ کر بات کاٹی۔"

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا دل دو نیم ہو گیا ہے خیر میں اسے منجانب اللہ خیال کرتا ہوں"

پھر اباجی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ گپیں لڑانے میں مشغول ہو گیا۔

اوّل اوّل کالج سے میں داؤجی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے توجہی سے لکھنے لگا۔ اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤجی کو بھی سلام کر آتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کرٹ۔ نیلون۔ اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ جاڑا پائی پہنے نہ رہتے۔ اگر مجھے اٹھانے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لے اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے میں جو کتابیں ساتھ لایا کرتا انھیں دیکھنے کی متواضعہ رکتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آکر کتابیں دیکھ جاتے۔ اتنی چیز۔ بوجوہ کالج چھوڑ کر بنک میں ملازم ہو گیا تھا۔ اور دلی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور رہتا۔ داؤجی منصفی جاتے تھے۔ لیکن کچھ نہ لاتے تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی ——— کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤجی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آبوٹاپو کھیلا کرتی تھیں بنت حوا بن گئی تھیں۔ سیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی میں آبوٹاپو میں گزارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے ایبٹ آباد کا طویل سفر زیادہ تسکین دہ اور سہانا بن گیا۔

انہی ایام میں میں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا ایک پیکٹ خریدا تھا۔ اور ان پر ابا جی کو خط لکھے جا سکتے تھے نہ ہی داؤجی کو۔ نہ دسہرے کی چھٹیوں میں داؤجی سے ملاقات ہو سکی۔ نہ کرسمس کی تعطیلات میں۔ ایسے ہی ایسٹر گذر گیا اور یوں ہی ایام گزرتے رہے۔ . . . . . ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بجھے ہوئے پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں، ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوا لیا۔ ہمارے لئے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ بنئے ساہوکار گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ نغوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی! ایک دن ہمارے قصبے میں بھی چند گھروں کو آگ لگی، اور دو ناکوں پر سخت لڑائی ہوئی۔ تھانے والے اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا۔ اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھوڑ کر چل دیئے، دوپہر کو اماں نے مجھے داؤجی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پہچانی گلی میں عجیب و غریب عورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر یعنی داؤجی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھر آ کر بتایا کہ داؤجی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ کہتے ہوئے میرا گلا رندھ گیا۔ اس دن مجھے یوں لگا جیسے داؤجی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے ہیں اور اب لڑ کر نہ آئیں گے۔ داؤجی ایسے بے وفا تھے!

کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کر کے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گزرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ جمع دیکھی۔ مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو چھاڑ کر مرکز میں گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا۔

"سانتہ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گیا۔"

"کونسے گھر میں؟" بزرگ نے پوچھا۔

"رنجکی مہاجروں کے گھر میں" لڑکے نے کہا۔

"پھر کیا انھوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو منہ دو نکلا؟"

اتنے میں بھیڑ میں سے کسی نے چلا کر کہا "اوئے رانو جلدی آ اوئے جلدی آ ——— تیری سامی ——— پنڈت ——— تیری سامی"

رانو بکریوں کا ریوڑ باڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انہیں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا جیسے انھوں نے داؤجی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا۔

یہ بڑا اچھا آدمی ہے بڑا نیک آدمی ہے ——— اسے کچھ مت کہو . . . یہ تو . . . یہ تو" خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گنڈاسی تول کر بولا۔

"بناؤں تجھے بھی ——— آگیا بڑا حمائتی بن کے ——— تیرے سانتہ کچھ ہوا نہیں نا" اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا "انصاف ہوگا شاید"

میں مڑ کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤجی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو داؤجی کی ٹھوڑی، پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا "اب بول بیٹا اب بول" اور داؤجی خاموش کھڑے تھے، ایک لڑکے نے پگڑی اتار کر کہا "پہلے بوری کاٹ لو ذری" اور رانو نے سوا کیں کاٹنے والی دانتی سے داؤجی کی بوری کاٹ دی۔ وہی لڑکا پھر بولا "بلا دیں ہے؟" اور رانو

نے کہا "جانے دو بڈھا ہے میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا" پھر اس نے داؤ جی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "کلمہ پڑھ بڈھا"
اور داؤ جی آہستہ سے بولے۔
"کون؟"
رانو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا "سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں!"
جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا "چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں"
اور ننگے سر داؤ جی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فرید چل رہا ہو!

اے حمید

راون کے دیس میں

ہمارا اسٹیمر بڑی ہموار رفتار کے ساتھ لنکا کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آسمان پر اکا دکا تارے نمودار ہونے لگے تھے اور سمندر کا گہرا سبز رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ آبی پرندے ہمارا ساتھ چھوڑ کر ساحل کی جانب اُڑ گئے تھے مرطوب ہوا میں رچی ہوئی خنکی، ہمارے کپڑوں سے موم بن کر چپک رہی تھی۔ تقریباً اڈھائی گھنٹے کے پُرسکون سمندری سفر کے بعد ہمیں دُور ــــــ لنکا کے ساحل پر روشنی کے مینار کی جلتی بجھتی بتی نظر آئی۔ امی اور چھوٹا بھائی بے تابی سے اس روشنی کو دیکھنے لگے جو جگنو کی مانند پل بھر چمک کر پھر بجھ جاتی تھی۔ ڈیک کے جنگلے کے ساتھ لگے کھڑے اور مسافر بھی اسے اشتیاق بھری نگاہوں سے تک رہے تھے جوں جوں ساحل قریب آ رہا تھا، کئی اور جگہوں پر بھی دھندلی دھندلی روشنیاں اُبھرنے لگی تھیں۔

کھاڑی میں پہنچ کر اسٹیمر نے دو تین بار وسل دیا اور ڈیک پر لگی ہوئی مشین گڑگڑاہٹ کے ساتھ لنگر پھینکنے لگی۔ گودی پر ہاتھ تیار کھڑے ادھ ننگے مزدوروں نے موٹے موٹے رسّے ڈیک کی طرف اُچھالے اور تھوڑی دیر کے بعد ہمارا اسٹیمر بڑے آرام سے کنارے آن لگا۔

یہ لنکا کی شمالی مشرقی بندرگاہ ٹامی بنار تھی۔

گودی پر ایک طرف کولمبو ایکسپریس تیار کھڑی تھی۔ کسٹم والوں سے مشکل تمام چھٹکارا پانے کے بعد جب ہم گاڑی میں سوار ہو گئے تو بائیں طرف ناریل اور سپاری کے درختوں تلے جھوٹے چھوٹے چائے خانوں میں گراموفون ریکارڈ بجنے لگے۔

"ساون کے بادو ــــــ اور دل کے پھپھولے جلتے ہیں"

ہمارے چہرے حیرت اور مسرت کے ملے جلے احساسات سے چمکنے لگے۔ اپنے وطن کے گلی کوچوں میں سُنے ہوئے گیتوں کی ایک ہی لَے نے پرائے دیس کی اجنبیت کو ایک دم زائل کر دیا اور ہمیں یوں معلوم ہونے لگا، گویا ہم کسی طویل سمندری سفر کے بعد اپنے وطن میں داخل ہو رہے ہوں۔

رات بھر کولمبو ایکسپریس برق رفتاری کے ساتھ جزیرہ سنگلدیپ کے عجیب جنگلات اور تاریک غاروں میں سے گذرتی رہی۔ علی الصبح میری آنکھ کھلی تو گاڑی ایک چھوٹی سے پہاڑی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پٹ نیچے گرا کر باہر دیکھا۔

آسمان بھورے بھورے بادلوں کے لطیف نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ بارش ابھی ابھی رکی تھی اور پلیٹ فارم پر بچھی ہوئی سُرخ بجری دھل کر چمک رہی تھی۔ بانس اور صنوبر کے نوکیلے پتے بھیگ کر گہرے سبز ہو گئے تھے اور فضا میں ان کی سوندھی سوندھی مرطوب مہک بسی ہوئی تھی۔ سیلی زدگیاں، سپیدہ طلی کے باریک کُرتوں پر خوب کس کر دھوتیاں باندھے، ننگے پاؤں، بانوں کے جُوڑوں میں رنگ برنگے پھولوں کے گچھے لگائے، پان، سگرٹ، سگار اور اناس کے قتلے بیچ رہی تھیں۔ ان کے رنگ زیادہ تر زرد، قد چھوٹے مگر جسم گٹھے ہوئے، مضبوط اور صحت مند تھے۔ ایک لڑکی اناس کے قتلے لے کر میری کھڑکی کے قریب آئی۔

"پائن ایپل سر ——— ویری سویٹ سر ——— فائیو سینٹ سر"

اس کا جسم بھی ایک چھوٹا سا پائن ایپل تھا، لیکن ابھی ویری سویٹ نہیں تھا، اس کی رنگت زرد و زرد و سنہری مائل تھی اور وہ ابھی پوری طرح پکا نہیں تھا۔ اس نے ابھی سورج کی کرنوں سے رس، پُرسکون ٹھنڈی راتوں سے مٹھاس اور نیلگوں چاندنی سے رنگ حاصل کرنا تھا۔

میں نے ایک قتلے کے پانچ سینٹ ادا کر دیئے۔ سینٹ اپنی انگلیوں میں چھپا کر وہ جلدی سے دوسرے ڈبے کی طرف مُڑ گئی۔ یہ کام اس نے اتنی تیزی سے کیا کہ میں بالکل اندازہ نہ لگا سکا کہ پائن ایپل کتنا پک چکا ہے؟

گاڑی اس مضافاتی اسٹیشن سے چلی تو ایک دم بارش شروع ہو گئی اور دُور دُور تک سرسبز پہاڑیوں کی غیر ہموار چوٹیاں دھندلا گئیں، نشیب کی وادیوں میں جہاں بانس کے گنجان جنگل کھڑے تھے، بارش کی دھواں دھار جھڑی برسنے لگی۔ گاڑی کی رفتار کافی تیز تھی اور وہ پے در پے معمولی اسٹیشن چھوڑے جا رہی تھی۔ ہر بند پھاٹک پر ہمیں ناریلوں سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں، نیم برہنہ عورتیں اور مرد، کیلوں کے گچھے یا پاؤں کی ٹوکریاں اُٹھائے نظر آتے۔ ایک جگہ ایک زرد اور نیلے رنگ کی بس دکھائی دی، جس کی پیشانی پر انگریزی الفاظ میں کولمبو لکھا تھا، اور ہم سامان وغیرہ درست کرنے لگے، کہ کولمبو قریب آ رہا تھا اور دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں اور بانس کے جھنڈوں کا قدرتی سلسلہ ختم ہو رہا تھا۔ ایک پیلی سی کالی جھلکدار سڑک، ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ نمودار ہو گئی تھی اور کہیں کہیں کوٹھی نما کچے مکانات بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ جب کولمبو کا پہلا بڑا جنکشن "مراداننا" آیا تو گاڑی تقریباً آدھی خالی ہو گئی۔ یہاں بھائی جان اور صدیقی صاحب مل گئے۔ ہمیں تین میل پر دوسرے بڑے جنکشن "فورٹ" اُترنا تھا۔ یہ لوگ ہمارے ڈبے میں گھس آئے۔ بھائی جان نے صدیقی صاحب سے میرا تعارف کرایا جو طلبری ریڈلیو پر اُن کے مددگار ناظم تھے۔

فورٹ پر ہم لوگ بھی اُتر پڑے۔

گھنٹہ بھر کے تازہ دم ہونے کے بعد جب ہم صحن میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے تو میں نے دیکھا کہ برسات کی مرطوب ہوا میں ہمارے سامنے والی کوٹھیوں کے عقب میں ناریل اور پام کے چھریرے درخت ہوئے جھوم رہے ہیں اور ایک طرف دیوار پر چڑھی ہوئی گنجان بیل میں سُرخ سُرخ پھول روشن ہیں، ہمارے سروں پر کیلے کے درختوں کے جھاڑ میں قرمزی بور لٹک رہے تھے اور میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے صدیقی صاحب کے بالوں میں سے یارڈلے ہیئر کریم کی مدھم خوشبو اُٹھ رہی تھی۔

دوسرے روز صدیقی صاحب ماؤنٹ لیونیا لے گئے۔ اس مقام تک ریل سمندر کے کنارے کنارے چلی گئی ہے۔ ہم سہ پہر تک وہاں رہے شام کی چائے ہم نے صنوبر کے درختوں میں گھرے ہوئے لیونیا ہوٹل میں پی اور پھر کنارے والی گیلی ریت پر سگریٹ سُلگائے گھومتے رہے۔ ہوا چل رہی تھی۔ اور اس میں مچھلیوں کی بُو تھی، جیسے وہ سمندر کی سطح پر مُنہ نکالے لمبے لمبے سانس لے رہی ہوں، سُبک رفتار لہریں ساحل پر جا بجا بکھری ہوئی بھوسلے رنگ کی چھوٹی چھوٹی چٹانوں تک آتیں اور ان کے گرد حلقے کی صورت میں گھوم کر، جھاگ اُڑاتی، واپس چلی جاتیں۔

لیونیا کلب کے ماہر دو تین انگریز عورتیں نہا رہی تھیں، کھلی ہوئی دھوپ میں ان کے گیلے اور سُرخ و سفید جسم چمک رہے تھے۔ ناریل کے لمبے لمبے، جھومتے ہوئے درختوں کی بے لچھنگی قطاریں کنارے کنارے دُور تک چلی گئی تھیں۔ ان درختوں تلے سانولی عورتیں، مدراسی عورتیں، اینگلو انڈین عورتیں، خوبصورت اور بدصورت عورتیں، اپنے مردوں، غیر مردوں، پکے ہوئے گالوں اور سوکھی ہوئی ٹانگوں والے مردوں کے بازوؤں میں بازو ڈالے اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔ گہرے سبز سمندر کے سینے پر دُور ایک مچھلی پکڑنے والی کشتی کے دو دھیا بادبان ہوا میں پھول رہے تھے۔

ہم سگریٹ پیتے لیونیا اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔

ہمارے قدم سیلی ریت پر نرمی سے پڑ رہے تھے۔ ہماری دائیں جانب چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کا سلسلہ تھا، جہاں اکثر جگہوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا، جھونپڑوں کے باہر سیاہ گھنگھریالے بالوں والے لمبے قد آدمی، جن کے جسم کی کھال کروم لیدر سے ملتی جلتی تھی، میٹھے ناریل کی رسیاں بٹ رہے تھے۔ کروم لیدر کے جوتے بڑے مضبوط ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے جسم بھی بڑے مضبوط تھے، ان کی دُبلی پتلی مگر مختی جسموں والی عورتیں کام میں اُن کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

صدیقی صاحب نے بتایا:۔

"یہ لوگ لنکا کے اصلی باشندے ہیں۔ لیکن شہریوں نے انھیں سمندر کے کنارے پھینک دیا ہے۔"

ان کے قریب سے گذرتے ہوئے ہمارے قدم خود بخود رُک گئے۔ بعض عورتوں کے سیاہی مائل سانولے جسم تنی ہوئی کمانوں ایسے تھے۔ سوائے ایک میلی سُرخ دھوتی کے اُن کے جسموں پر اور کچھ نہ تھا، دھوپ میں ان کے جسم سانپ کی کھال کی مانند چمک رہے تھے، اس چمک اور لیونیا کلب کے باہر نہانے والی انگریز عورتوں کے جسموں کی چمک میں رات دن کا فرق تھا، وہ جسم نیلے نیلے سمندروں کی شفاف جھاگ سے پیدا ہوئے تھے، اور ان جسموں نے کچھ انگلیوں کی سرمائندہ اور تعفن میں جنم لیا تھا، اور اب یہ تعفن اور سرمائندہ بجلی کے ساتھ علاقوں میں پھیل رہی تھی، شاید اسے لیونیا کلب تک پہنچنا تھا۔ لیونیا کلب ——— جہاں ریشمی پردوں والی کھلی کھڑکیوں میں سے نظتی ہوئی ارغنوں کی دلنواز موسیقی، بحرِ ہند اور خلیج بنگالہ کی پروسیلی لہروں کو دُور دُور کھینچ لاتی تھی ——— جس کے بال روم میں ہر ماہ کی آخری رات کو پانچ منٹ کے لئے تمام روشنیاں بجھ جاتی تھیں، پھر رقص کرتے ہوئے نیم عریاں جوڑوں کے قدم خود بخود لڑکھڑانے لگتے اور پانچ منٹ کا مختصر وقفہ اپمیائی کی آخری رات میں تبدیل ہو جاتا، اور جب یہ قلیل عرصہ گزر جاتا اور اپمیائی کی آخری رات ختم ہو جاتی تو کوئی جوالا مکھی نہ پھٹتا۔ کسی طرف سے دہکتے ہوئے لاوے کا مہیب طوفان، لیونیا کلب کو اپنی آغوش لیلیٹ میں نہ لیتا، وہاں ہر ماہ کی آخری رات اپمیائی کی اوّلین رات تھی اور یہاں تاڑ اور ناریل کے درختوں تلے یہ کروم لیدر کے جسم، ناریل کی رسیاں بٹ رہے تھے، اور میلی کچیلی سُرخ دھوتیاں باندھے عورتیں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں، ایک نوعمر لڑکی جس کے بال اس کی پیٹھ سے بھی نیچے تک پہنچ رہے تھے، ایک ہاتھ میں بٹے ہوئے رسّوں کا گچھا سنبھالے ہمارے قریب سے ہو کر گزری، اس کے سیاہ جسم میں سے کچے ناریل کی رسیلی خوشبو اُٹھ رہی تھی، اس نے جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر گردن گھمائی اور ہمیں غور سے دیکھا اور پھر جلدی سے اندر داخل ہو گئی۔

اُس کی قرمزی آنکھوں میں وحشی ہرنیوں ایسا الھڑپن اور معصومیت تھی۔

اُس کا جسم کس قدر کھردرا سا تھا؟

اُس کی آنکھیں کس قدر نرم اور معصوم تھیں؟۔

مجھے اناس کے رسیلے قتلے یاد آ گئے۔ صدیقی صاحب نے گھڑی میں وقت دیکھا، ریڈیو پروگرام کا وقت ہو رہا تھا، ہم تیز تیز قدم اُٹھاتے اسٹیشن

بے۔ وہاں سے فورٹ اور فورٹ سے بس میں بیٹھ کر ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔

ریڈیو اسٹیشن کی دو منزلہ عمارت کولمبو کی بیشتر عمارتوں کی مانند بدھی مندروں سے ملتی جلتی تھی۔ عمارت کے اندر درمیان میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا، جہاں ناریل اور شریفے کے تین چار درخت تھے۔

برٹش سیکشن، ہندی سیکشن کے ساتھ ہی تھا، انگریز اناؤنسرز، جنرل ایڈمنسٹریٹرز اور سکرپٹ رائٹرز، دن بھر خالی نیکریں پہنے گھومتے رہتے تھے۔ ان کے جسموں پر بھورے بھورے بالوں کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، بعض جسموں پر چتکبرے داغ تھے، انھیں دیکھ کر مجھے گلے سڑے ٹماٹروں کا خیال آجاتا تھا اور بڑی کراہت محسوس ہوتی تھی، ان میں دو لیڈی اناؤنسرز بھی تھیں۔ ایک انگریز لڑکی تھی جس کا نام فیلیس ڈکنز تھا اور دوسری مسز کنڈاسوامی جو مدراس کی پیداوار تھی۔ فیلیس ڈکنز کی آواز میں رس اور لوچ تھا اور اس کی سفید رنگت میں ہلکی سبزی کی جھلک تھی۔ کچی خوبانیوں کی مانند ——

اس کے لمبے بالوں کا رنگ بھورا سنہرا تھا، غزال نصیب متوالیا اور اسکی آنکھوں میں نیلے اور سبز رنگ کا دلکش امتزاج تھا۔ یہ رنگ روم کے ساحلی سمندروں کا رنگ تھا اور ان آنکھوں میں بحیرۂ روم کی اتھاہ گہرائیاں چھپی ہوئی تھیں۔

مسز کنڈاسوامی کی آواز کافی اچھی تھی، مگر اس کا جامنی جسم دن بدن موٹا ہو رہا تھا۔ اس کے بال لمبے لمبے تھے جنھیں وہ دو چوٹیوں میں گوندھے رکھتی تھی۔ لیکن اس کا نام ان باتوں سے بھی زیادہ لمبا تھا اور جسے میں کبھی ایک سانس میں ادا نہیں کر سکا تھا۔ وہ ہر تیسرے روز ساڑھی پہن کر آتی۔ اسے اپنی لوچدار آواز پر بڑا ناز تھا۔ اور یہ آواز ریڈیو پر بڑے بڑوں کو دھوکا دے جاتی تھی۔ کاش وہ خود بھی اپنی آواز کی مانند ——— میرے ذہن میں اس کی آواز کا زندہ تصور، فیلیس ڈکنز کا مدور شانوں، ریشمی گالوں اور بھرے بھرے بازوؤں والا جسم تھا اور مجھے ——— مسز کنڈاسوامی کی آواز پر فیلیس کے جسم کا دھوکا ہوتا تھا۔

فیلیس ڈکنز سے میری پہلی ملاقات سٹوڈیو نمبر ۳ میں ہوئی۔

میں اکیلا اندر بیٹھا چند پنجابی ڈسکیں (discs) ٹسٹ کر رہا تھا کہ فیلیس کا نیم سبز آنکھوں والا، نیم سنہری بالوں والا، چہرہ دروازے کے چوکور شیشے پر نمودار ہوا، وہ بالکل کسی فریم میں ہوئی تصویر کی طرح فلیٹ سٹوڈیو آف تھا وہ اندر آگئی، ہلکے آسمانی رنگ کے فلین لباس میں اس کی سپید تمیز کا ابھار کسی دودھیا بادل کے ٹکڑے کی مانند تھا، جو کہر آلود رات کے دھندلے آسمان پر چپ چاپ سو رہا ہو۔

ٹائپ کیا ہوا پروگرام جارٹ، دیوار سے لٹکا کر وہ لاؤڈ سپیکر پر قدرے جھک کر کھڑی ہو گئی اور بڑے غور سے پنجابی موسیقی سننے لگی، طلسم جان جیرگاری تھیں۔

ہیر آکھدی جوگیا جھوٹھ بولیں کون رٹھڑے یار منا وندا ای

ڈسک ختم ہوئی تو وہ میرے قریب آگئی۔

"یہ کیا گا رہی تھی۔؟"

فیلیس میرے اس قدر قریب تھی کہ یونڈری کی خنک مہک میرے دماغ پر ایک خوشگوار کیفیت طاری کر رہی تھی۔

میں نے ڈسک لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا "یہ ہیر گا رہی تھی"

"ہی اُر؟ ——— یہ کیا ہوتا ہے"؟ اس نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ ہوتی ہے میڈم"

"تو یہ کوئی عورت ..... "

[illegible] ہاں عورت ——— یہ شباب کی جو ——— ہیر کی محبت کا گیت تھا اور ہیر چوہدری چوچک کی بیٹی تھی اور چوچک جگ سلار کہ۔
میرا مطلب ہے جہنگ مگھیانہ کا باسندہ تھا، وہ بولے خدا سب سے پوچھا کہ جنت کیا ہوتا ہے؟"
فیلس ہنسنے لگی بے اختیار ہنسنے لگی اس کی ہنسی ایک بچے کی ہنسی تھی جو سوتے میں اپنے آپ مسکرانے لگے معصوم بے لوث، بے داغ۔
اس میں ایک خوابناک سرگوشی تھی، ایک والہانہ موسیقی تھی ——— وہ مجھ پر ذرا جھک کر بولی: "کیا تم شاعر ہو؟"
میں اب پونڈز کی خنک مہک کے علاوہ کچی خوبانیوں کی نیم گرم، نیم ترش خوشبو بھی سونگھ رہا تھا، میں اسے کہنا چاہتا تھا: "مادام میں شاعر نہیں ہوں، مگر کچی خوبانی کے عنوان سے ایک بھرپور نظم لکھ سکتا ہوں، کئی بھرپور نظمیں، کئی مثنویاں اور کئی دیوان لکھ سکتا ہوں۔ لیکن میں نے کہا: "مادام میں شاعر نہیں ہوں۔ ....." BUT I FEEL POETIC اور اچھوتے سیب کا منہ پھر کھل گیا اور انمول، آبدار اور کنوارے موتیوں کی لڑیاں جھلملانے لگیں، وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی اور میں سٹڈی میں بیٹھا وینک کچی خوبانیوں کی نیم گرم، نیم ترش خوشبو سونگھتا رہا۔ جیسے میرے آس پاس ان کے ڈھیر لگے ہوں۔ میں نے برٹش پروگرام سننے کے لئے دوسرے سٹوڈیو کا بٹن دبا دیا۔ مسز کند اسوامی، انگریزی میں خبریں سنا رہی تھی، اس کی آواز میں کس قدر رس اور لوچ تھا ——— فیلس کے جسم کی مانند ——— اس کی آواز کا لوچ اور گداز فیلس کے جسم کی یاد دلانے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں خوبانیوں کے ڈھیروں میں دبا جا رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے سپیکر بند کر دیا اور سٹوڈیو سے باہر نکل آیا۔
ریڈیو گھر میں داخل ہوتے ہی مس گلیٹی کی صورت دیکھنا پڑتی تھی۔
بالیس پینتالیس سال کی ڈھیلے ڈھالے، بدنما جسم والی عورت جس کے سر کے سفید بال خضاب کے مسلسل استعمال کی وجہ سے جامنی رنگ اختیار کر چکے تھے، جس کی ٹیلیفون ایکسچینج کے سیٹ کے پاس بیٹھی تھی اور قریب سے گذرنے والے کو ایک بار اپنے پاس ضرور بلا لیتی تھی، تنگ و خستہ گوروں سے باتیں کرتے ہوئے اس کے بھدے چہرے پر کنواری لڑکیوں ایسا حجاب پھیل جاتا۔ میں اس کے کنواری لڑکیوں ایسے حجاب سے بڑا گھبراتا تھا۔ اس کا نام ہمیشہ مجھے فرانس کی گوئین کی خوفناک یاد دلاتا۔ گلیٹی ——— گلیٹی ..... اس نام میں گلے کی بڑے اطمینان سے کاٹ ڈالنے کی دھمکی تھی۔ اس سے باتیں کرتے وقت میرے جسم رہ رہ سے لیکر پاؤں تک کپکپی کا عالم طاری رہتا، جیسے لوگوں کا ہجوم مجھے گلوٹین کی طرف کھینچے لئے جا رہا ہو، صدیقی صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ کلاکوٹرانے سے بال بال بچ گئے۔ وہ ایک ہاتھ کاؤنٹر پر رکھے مس گلیٹی سے کسی نمبر کی بابت گفتگو کر رہے تھے کہ اس نے صدیقی صاحب کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی دیکھ لی اور اس کا چہرہ کنواری لڑکیوں ایسے حجاب کے نقاب میں پہلے سے زیادہ بھدا ہو گیا۔
نوٹ: انگوٹھی بڑی پسند ہے مسٹر ڈکی نے"
اور مسٹر ڈکی نے گوئین کا تیز پھل اپنی گردن کے بالکل قریب محسوس کیا، انھوں نے آہستہ سے پوچھا: "تمھاری عمر کیا ہو گی میڈم؟"
قریباً بیس سال ....."
"بہتر ہے میڈم" گوئین مسکرانے لگی اور کانچ کے بناوٹی دانتوں کی نیلی لکیر چمک اٹھی اور صدیقی صاحب تیزی سے کنٹرول روم کی طرف

کا مہینے سے پہلے میں نے سونے کی اس سرزمین کے متعلق ایک خواب دیکھا تھا، ایک حسین اور پراسرار خواب ——— میں نے دیکھا کہ فصیلوں سے گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے پرسکون، چپ چاپ، آرام پسند شہر دیکھے تھے جن کے ارد گرد بانس تناڈ، ناریل اور صنوبر کے گھنے جنگلات

کا عجیب سلسلہ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا، جہاں بڑی مندروں کے سنہری کلس ٹکٹکی ہوئی دھوپ میں چمک رہے تھے، اور ان مندروں کے نیم روشن ایوانوں میں، پُر جلال دیوتاؤں کے سنگین مجسموں کے روبرو، کالی آنکھوں والی، سیم تن دیو داسیاں عود و عنبر کے نیلگوں، دھندلکوں میں بخود ہو کر والہانہ انداز میں رقص کر رہی تھیں۔ موہن روشنیوں کی ملائم دھند میں، ان کے نیم عریاں مجسم پُر اسرار دا ہے بن کر اجاگر ہو رہے تھے اور اُن مندروں کے باہر مرمریں سیڑھیوں کے کناروں پر بیٹھی ہوئیں بدھ کی کنواری بیٹیاں، اندر جانے والے عقیدتمندوں کو گلِ صد برگ، چنبیلی اور شبو کے پھول پیش کر رہی تھیں، ان کے سیاہ بال پھولوں میں بسے ہوئے تھے اور کانوں میں مچولے کے مندر لٹک رہے تھے۔

میں نے عظیم الشان عمارات کی مرمریں بارہ دریوں میں شاہی رقاصوں کو اناس کی شراب میں بدمست آسمانی ناچ ناچتے دیکھا۔ ان بارہ دریوں کے جالی دار حجروں میں لچکیلی بیلوں کی پھولوں بھری ڈالیاں داخل ہو رہی تھیں، باغوں میں صنوبر اور آم کے پیڑوں پر رنگین پرندے چہچہا رہے تھے۔ جگہ جگہ کنول کی شکل ایسے دودھیا پتھر کے پیالوں میں چاندی کے فوارے اُبل رہے تھے اور گلاب کے جھاڑوں پر سیاہ بھونروں کی ٹولیاں منڈلا رہی تھیں۔

لیکن لنکا یعنی کولمبو پہنچکر میرا یہ پُر اسرار وحسین خواب جیسے اچانک چھپا کر کہیں گم ہو گیا، مجھ سے روٹھ گیا، منتشر ہو گیا۔

کولمبو میں سوائے ایک دھوبی کے اور کوئی شخص لنکا کے نام سے واقف نہ تھا، اس دھوبی نے اس خبر گیری کے ثبوت میں، اپنی دوکان کی پیشانی پر "لنکا واشنگ ڈیپو" کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ لوہے اور کنکریٹ سے بنے ہوئے اس عظیم الشان شہر کے سنگین ہوٹلوں میں ٹکی اور اور خمیر ٹکی جوڑے شراب کے ہلکے ہلکے سرور میں ڈوب کر بے ربطی سے ناچ رہے تھے اور بدھی مندروں کے ویران ایوانوں میں چمگادڑیں عود کی لگاریاں نہیں، عود و عنبر کی نیلگوں دھندمیں والہانہ رقص کرنے والی سیم تن دیو داسیاں اور مندروں کی سیڑھیوں پر گلِ صد برگ، مولسری، چنبیلی اور شبو کے پھول پیش کرنے والی، سیاہ بالوں اور چمکیلی آنکھوں والی، بدھ کی کنواری بیٹیاں اب کولمبو کی پتھریلی سڑکوں اور کارخانوں کی گھٹی ہوئی فضا میں دن بھر مشقت کرتی تھیں اور رات کو گندے تاڑی خانوں کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر تاڑی پیتی تھیں، لڑتی جھگڑتی تھیں۔ اور نشے میں چُست ہو کر وہیں پڑ رہتی تھیں اور سونے کی لنکا کے بیٹے، راون کے غیور سپاہی، شہر سے باہر نارئل کی رسیاں بٹ رہے تھے۔ شہروں نے انھیں کڑوی شے کی مانند تھوک دیا تھا۔ کرنے کھدروں میں رینگنے والے کیڑے سمجھ کر انھیں دھرتی کے آخری کناروں پر پھینک دیا تھا اور پسند کدیپ کے لال، لنکا کے راج دلارے، سمندر کے کنارے، چمکیلی ریت پر شام کے بعد لاؤڈ روشن کر کے اس کے گرد بیٹھ جاتے اور ناچ گانوں میں مگن ہو جاتے تھے۔ ڈھولک کی تیز ضرب پر صدیوں کا پرُ ناغم، ان کے تاریک سینوں کی تہوں سے لمبی، گہری اور درد انگیز تانوں میں دھل کر بہہ نکلتا۔ لاؤڈ کی تابناک روشنی میں ان کے نیم عریاں سیاہ جسم کسی دانو کے، انجانے کیف میں بھیگ کر اپنے آپ جھومنے لگتے اور ان کے سروں پر ناریل کی ترچھی شاخوں میں چاند چمکنے لگتا۔ دودھیا چاندنی کے نقرئی خلاؤں میں لنکا کے بعد کے ننگے بیٹوں کے گیتوں کا طلسم مرمریں خواب بن کر پھیل جاتا۔ یہ خواب ایک خاموش اور پُرسکون جھیل تھی، جس کی سطح پر ان کے جسم، محبت، اخوت اور آزادی کے کنول بن کر تیر رہے تھے اور شہروں نے انھیں کڑوی اور گندی شے سمجھ کر سمندر کے پاس تھوک دیا تھا اور یہ اپنے وطن، اپنے گھر میں بے وطن، بے گھر اور پردیسی لوگ لالٹین بھڑکتے ہوئے شعلوں کے گرد آگرد بیٹھے کسی نئی تہذیب کا گیت گا رہے تھے۔ شاید وہ نیم خوابیدہ حالت میں منتظر نگاہوں سے اس وقت کی راہ دیکھ رہے تھے جب اس تہذیب کا قافلہ سمندر کے بیکراں سینے پر اپنی کشتیوں کے بادبان پھیلائے اُن کی سمت بڑھتا چلا آئے گا اور وہ آنکھوں میں مسرت کے آنسو لیے اس قافلے میں شامل ہو کر، محبت، خوشحالی اور آزادی کا سنہرا خواب دیکھیں گے۔

ان کی نگاہوں میں انتظار کی بے کلی تھی اور ان کے گیتوں میں پہاڑ کی اونچائیوں سے پھسلنے والی ندیوں ایسا اضطراب ابد و دفعتاً بھڑک اُٹھنے والے شعلوں ایسا ہیجان تھا۔ تڑپ تھی، درد تھا، میٹھا اور عزیز ترین درد، جو سیپ کے پہلی بار منہ کھلنے سے پیدا ہوتا ہے اور جب

سیپ کا منہ کھل جاتا ہے تو فیلس ڈگنز مسکرانے لگتی اور اچھوتے موتیوں کی آبدار لڑیاں جھلملا اُٹھتی ہیں اور یہ تبسم ایک چھوٹے سے آبشار کی مانند فیلس کے سُرخ ہونٹوں سے گلپوش وادیوں میں گرتا ہُوا محسوس ہوتا ہے۔

فیلس ہوٹل گال فیس کے بال روم میں بیٹھی مسکرا رہی تھی اور کوئی خوبصورت چودہا آبشار کی پھُواروں بھری لمبی ڈالیوں کو ہلا رہا تھا اور سپید سپید، نرم نرم، کومل پیتال گھاس پر گر رہی تھیں۔ آج فیلس کی ساگرہ تھی۔ روشنی میں اس کے بھورے بال سونے کے تاروں کی مانند چمک رہے تھے جیسے جنگل میں کسی لکڑی کے جال پر ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعیں بھٹک رہی ہوں۔ شمپین کا سُلگتا ہُوا تھا۔ اس کی آنکھوں کی نیم سبز جھیلوں پر صنوبر کا سایہ بن کر جھکا ہُوا تھا اور جھیلوں کا رنگ گہرا دبیز سا ہو رہا تھا۔

ڈانس پھر موسیقی شروع تھی۔ ایک پھُولے ہوئے سُرخ گالوں والی موٹی سی لڑکی فُوہ امنہ کھولے گا رہی تھی:۔

" O ! NIGHT IN JUNE

IF I WER NEVER TO SEE YOU AGAIN "

اس کی تیز اور کرخت آواز میں بیابانی عقاب ایسی جھپٹ تھی اور یہ عقاب اپنے خوفناک پنجے پھیلائے ہر آدمی کو اپنی طرف بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ لوگ گانا سننے کی بجائے عورتوں سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ میں مشغول تھے، اور عورتوں کی ٹانگیں رانوں تک ننگی تھیں، ان کے بازو شانوں تک کھُلے تھے، اور سینے چھاتیوں تک عریاں تھے، ہال میں گداز اور خمار آلود جسموں کی نرم گرم خوشبو رچی ہوئی تھی اور فیلس اپنی ساگرہ کا پانچواں جام خالی کر رہی تھی اور جھیل کی سطح پر صنوبر کے سائے زیادہ گہرے اور گدلے ہو رہے تھے۔ بائیں جانب بیٹھا، ریڈیو اسٹیشن کا موسیقار وکٹر لُپن دسویں بار اس کے بیٹھی گال چُوم رہا تھا۔ بنوڈانا ڈنسر ہربس، تھوک میں بھیگا ہُوا سگریٹ منہ میں دبائے، شراب میں تر اُنگلیاں اپنی کھوپڑی پر رگڑ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں شراب کے نشے میں گھٹ کر سکڑ گئی تھیں لفٹیننٹ گرفن نے جام ہوا میں لہرایا اور فیلس کی ساگرہ کا بارواں جام بھی خالی ہو گیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتا وہ فیلس پر جھکا اور اپنے شراب آلود لب اس کے نیم عریاں مرمریں سینے پر رکھ دیئے۔ وکٹر بڑبڑاتے ہوئے گلاس میں شمپین انڈیلنے لگا اور ہربس نے اتنے زور سے کش کھینچا کہ گیلا سگریٹ ایک دم سُلگ گیا۔ فیلس کا مخمور جسم ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔ وہ مُسکرا رہی تھی۔ میری پنڈلیوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ ہم ایشیائی طبعاً شریف ہوتے ہیں۔ ہم ایسے مناظر برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم محبت کرنے سے پہلے روشنی بجھا دیتے ہیں۔ ہماری محبت تاریکی اور تنہائی کے غار میں جنم لیتی ہے اور اسی غار میں دم توڑ دیتی ہے۔ ہمیں غاروں سے محبت ہے، محبت کے غار، نفرت کے غار، ذلت کے غار اور شرافت کے غار۔ ہم فطرتاً غار پسند ہیں اور یہاں روشنی ہی روشنی، لوگ ہی لوگ . . . . .

اور لفٹیننٹ گرفن کے شرابی لب فیلس کے پتلے، شہنمی ہونٹوں سے پیوست تھے۔ پھُولے ہوئے سُرخ گالوں والی امریکن لڑکی بدستور چلا رہی تھی:۔

" O ! NIGHT IN JUNE . . . . "

اور بیابانی عقاب اپنے خوفناک پنجے کھولے ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ قریب ہی ایک میز پر کوئی نوعمر ملاح، نیلی اور سفید دھاری دار بلوس، کہنیاں گھٹنوں پر رکھے، ذرا آگے کو جھکا، ایک انگلو انڈین دوشیزہ بے زبان سی لڑکی سے اظہارِ محبت کر رہا تھا اور وہ لڑکی گائے کی زبان کے ٹھنڈے قتلوں پر ٹماٹر کی چٹنی لگائے انہیں چبا چبا کر کھا رہی تھی۔

ایک خالص یورپی ادھیڑ عمر جوڑا بڑے دروازے پر نمودار ہُوا۔ ویٹر نے ہاتھ پھیلا کر ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا۔ عورت کا تھل تھل پل پل بھدا جسم جامنی رنگ کی ساری میں لپٹا تھا۔ اس کے مریل سے خاوند کا مختصر سا منہ بمشکل اپنی بیوی کی گردن تک پہنچ رہا تھا۔ عورت کے ہونٹ سُرخ تھے، گہرے سُرخ۔ خون کے رنگ ایسے ——— گویا وہ ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آ رہی ہو، اس کے بازوؤں پہ کلائیوں پر گلے

میں لیمت ہیرے موتی جھلملا رہے تھے، اس کے خاوند کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور سوکھی گردن اس سے خشک ٹہنی کی مانند باہر نکلی ہوئی تھی۔ سیلونی عورت نے ڈائس پر گاتی امریکن لڑکی کو دیکھا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔

لڑکی نے ایکدم گانا بند کر دیا اور عقاب نے ایسے پنجے سمیٹ لئے اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر دفعتاً ہال کے درمیانی حصے کے سوا ہر طرف روشنیاں گل ہو گئیں اور سازوں پر ہلکے ہلکے سُروں میں کوئی اداس دھن شروع ہو گئی۔ اِدھر اُدھر میزوں پر سے بم برسانے اور مدہوشی میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کنارے پر سے کھسکتی ہوئی کشتیوں کی مانند اُٹھے اور ان کے جسم موسیقی کی پُرسکون لہروں پر اپنے آپ ڈولنے لگے۔ سبز روشنی کے غبار میں اُن کے لہراتے ہوئے جسم خواب ایسا منظر پیش کر رہے تھے۔ ہمارے آس پاس پھیکے پھیکے اندھیرے کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے چہرے بڑے پُراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ نیم گرم سگ گی ہوئی شرابی آنکھیں، مدھم اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ وکٹر اپنے نیچے کو جھکا ہوا اُٹھا اور فیلس کو اپنے لمبے بازوؤں میں تھام کر محو رقص جوڑوں میں شامل ہو گیا۔ لیفٹیننٹ گرفن شراب سے بھرے ہوئے گلاس میں سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر ناک سکیڑ کر بولا: "بدمعاش کو یاد"

ہریس نے پانچوں انگلیاں شراب میں ڈبو کر انھیں اپنی کھوپڑی پر رگڑا، اور کرسی کی پشت سے جا لگا۔ بازو لٹکائے بولا:-

"—— AND TIS IS THE END OF THE NEWS!

گھومتیں، لہراتیں، کبھی آگے بڑھتیں کبھی پیچھے ہٹتیں، سانولی، گندمی، زرد اور سپید سپید عُریاں پنڈلیوں کے ہجوم میں مجھے فیلس کی چمکتی چمکتی پنڈلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وکٹر اسے اپنے ساتھ چپٹائے بڑے بھونڈے انداز میں ناچ رہا تھا اور فیلس کا شرابی جسم اس کے لمبے بازوؤں کی شاخوں پر جھکی ہوئی انجیر کی مانند شاک رہا تھا اور پیر اس بھاری ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں سینک اُتر رہا تھا۔ ادھ گرد میزوں پر اب صرف بوڑھے اور بدصورت چہرے ہی تھے، جھلملاتے، بیش قیمت ہیرے موتیوں والی، بھاری بھرکم سیلونی عورت کا مجھے دور سے خاکہ ہی نظر آ رہا تھا جو اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مریل اور زیادہ پھیکے خاکے پر جھکا ہوا تھا۔ میری آنکھوں میں سُرخ سُرخ ہونٹ پھر گئے۔ گہرے سُرخ ہونٹ اور مجھے یوں لگا جیسے پہلا خاکہ دوسرے خاکے پر جھکا اس کا خون پی رہا ہو۔

گلاسوں کے بوتلوں سے ٹکرانے کی کھنکاریں اور بوڑھے قہقہوں کی بے جان آوازیں، ڈائس کے لمبے لمبے سُروں میں مدغم ہو رہی تھیں اور نیوز اناؤنسر ہر لیس خبریں ختم کرنے کے بعد ٹانگیں پھیلائے مدہوش پڑا تھا۔ لیفٹیننٹ گرفن پی رہا تھا اور ریکارڈوں کی مختلف دھنیں گنگنا رہا تھا۔ کسی وقت وہ اپنی گھٹی ہوئی آنکھیں اُٹھا کر ہچکی روک کر مجھ سے پوچھتا:-

"DO YOU LIKE GYPSY SONGS?

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کوئی اور دھن شروع کر دیتا۔ شیمپین کا جام میرے ہاتھ میں ختم ہو رہا تھا اور فیلس کا جسم وکٹر کے سینے سے چپٹا ہوا تھا اور انجیر اپنی شاخ پر لٹک رہی تھی، وہ پک چکی تھی اور گرنے والی تھی اور اس سے پیشتر کہ وہ اپنی شاخ سے ٹوٹ کر گرے، ہال کی تمام بتیاں ایک ساتھ روشن ہو گئیں، بوڑھے اور بدنصیب چہروں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے رقص کے ٹوٹتے دائروں کو دیکھا اور سرد آہیں بھرنے لگے۔ عورتیں اپنے ڈھیلے بلاؤز درست کرتیں، پریشان بال سنوارتیں، مردوں کے سہارے اپنی اپنی میزوں کی سمت بڑھنے لگیں۔ وکٹر کے بالوں کی ایک لٹ اس کی چوڑی پیشانی پر جھول رہی تھی۔ فیلس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور وکٹر اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ یوں اسے اپنے بازوؤں میں تھام رہا تھا جیسے فیلس کوئی مجسمہ ہو جس کے ہاتھوں سے جھوٹ کھسک گیا ہو، وہ بے قابو ہوئی جا رہی تھی اور بے اختیار ہنسے جا رہی تھی۔ اس کی شراب میں ڈوبی ہوئی نگاہیں کسی جگہ نہ ٹھہرتی تھیں وہ کبھی ہریس کو دیکھتی، کبھی گرفن کو اور کبھی مجھے۔ جیسے ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ لیفٹیننٹ گرفن پرانا شرابی تھا، چنانچہ اس نے اُٹھ کر فیلس کو تھام لیا۔ وکٹر نے ہریس کو

ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا، وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور بلند آواز میں بولا :۔

" HERE IS THE NEWS ! "

ہم سب ایک دوسرے کا سہارا لئے، لڑکھڑاتے، ڈگمگاتے، باہر نکل کر ایک ٹیکسی میں ڈھیر ہو گئے۔ پرائیویٹ ہوسٹل کے احاطے میں آکر کرنے ہیرس اور فیلس کو مشکل برآمدے تک پہنچایا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی فیلس صوفے پر گر پڑی اور لفٹیننٹ گرفن اس کا سر دبانے لگا۔ بیئر کا نشہ جیسے سو کر بالکل ہی اُڑ گیا تھا۔ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے گرفن کو فیلس پر جھکے دیکھا، وہ گالیاں بکتا ہوا اُٹھا اور اندر سے واٹ جن کی ایک اور بوتل لے آیا، وکٹر پول آرام کرسی میں لیٹا، ٹانگیں قالین پر پھیلائے بڑے مزے میں گا رہا تھا :۔

" I KNOW

WHERE YOU SING O SEA ! "

میری آنکھیں جل رہی تھیں اور بند بند ٹوٹ رہا تھا۔ میرے اردگرد ہر شے دھندلا رہی تھی۔ وکٹر پول کے گانے کی نرم آواز جیسے کسی ویران اور اندھیرے کنوئیں میں سے نکل رہی تھی۔ یہ آواز مجھ سے دُور ہوتی جا رہی تھی۔ دُور ——— اور دُور ——— یہاں تک کہ وہ بالکل ڈوب گئی اور میں سو گیا۔

جانے میں کتنی دیر تک سویا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ وکٹر پول مجھے دوسرے کمرے میں کھینچے لئے جا رہا تھا۔ مجھے اندر دھکیل کر اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

" آن جوائے یُو اِیلیفنٹ بوائے "

میں نے بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالا اور آنکھیں ملتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمزور لیمپ کی مدھم روشنی میں فیلس ڈکنز پلنگ پر بھورے رنگ کا ریشمی کمبل اوڑھے بے سُدھ پڑی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ کر آہستہ سے اس پر جھک گیا۔ فیلس کا رنگ زرد ہو رہا تھا، پتلے ہونٹوں پر پسینے کے ننھے ننھے موتی چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بالکل بے سُدھ پڑی تھی۔ میں نے اسے شانے سے پکڑ کر نرمی سے ہلایا : "فیلس، فیلس "

فیلس کی مخمور پلکیں آہستگی سے اُوپر اُٹھیں جن میں شراب کا سُرور دھندلا کر چھایا ہوا تھا، وہ ہولے سے مسکرائی، میں نے اپنے ہونٹ اس کے نیم وا ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ شراب اور پسینے کے نمکین ذائقے نے میرا منہ بدمزہ کر دیا۔ میں نے کمبل منہ پر کر لیا، کیونکہ کمرے میں روشنی تھی اور ہم ایشیائی اندھیرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں روشنی راس نہیں آتی، لیکن کمبل پر منہ کرنے سے ایک عجیب قسم کی بُو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی، جیسے میں نے گندے ٹاٹروں سے بھری ہوئی بوری میں منہ ڈال دیا ہو، یا جیسے میں کسی مچھلی مارکیٹ میں داخل ہو گیا ہوں، وہ خوشبو کہاں گئی تھی، وہ پاؤنڈز کریم کی ٹھنڈی مہک کہاں غائب ہو گئی تھی؟ میرا دماغ پھٹنے لگا، میں نے جلدی سے منہ باہر نکال لیا لیکن باہر بھی روشنی تھی اور ہم ایشیائی . . . . .

میں جلدی سے مچھلی مارکیٹ میں داخل ہو گیا اور تمام رات وہاں لیمپ پوسٹ پر رومال رکھے گھومتا رہا۔ پچھلے پہر جب میں مچھلی مارکیٹ سے باہر نکلا تو ڈائننگ روم میں لفٹیننٹ گرفن، ہیرس اور وکٹر پول تینوں برہنہ حالت میں، قالین پر لیٹے سو رہے تھے۔ میں نے فرش پوش اُٹھا کر ان پر ڈالدیا اور ہوٹل سے باہر نکل آیا، سڑک پر پہنچ کر مجھے فیلس ڈکنز کا خیال آگیا اور یوں محسوس ہوا جیسے کسی نائی نے شیو کے بعد بالوں بھرا جھاگ میرے منہ پر پھینک دیا ہو، میں نے زور سے تھوک دیا۔

ہماری ساتھ والی کوٹھی میں ایک اچھے خاصے بدصورت سیلونی بیرسٹر کی اچھی خاصی بدصورت بیوی رہتی تھی۔ بیرسٹر صاحب کو خوبصورت عورتوں کی تصویریں جمع کرنے کا بیحد شوق تھا، بھائی جان نے مجھے بتایا کہ اس کے ذاتی البم میں دنیا جہان کی حسین ترین عورتوں کی تصویریں موجود ہیں، اور وہ اس البم کو اپنی بیوی سے چھپا کر رکھتا ہے۔ شام کے وقت دونوں میاں بیوی برآمدے میں آرام کرسیوں پر بیٹھ جاتے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہتے۔ وہ ہنستے کم اور مسکراتے زیادہ تھے۔ بیگم صاحبہ کو پیانو سیکھنے کا خبط تھا، رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بیرسٹر اپنے کمرے میں جا کر ذاتی البم کھول لیتا۔ اور اس کی بیوی پیانو پر جا بیٹھتی، پھر ان کے گھر سے پیانو کے، بھدے، کرخت، بے ڈھنگے اور بے ربط سُر سنائی دینے لگتے۔ جیسے وہ اُن سُروں کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال رہی ہو۔ کسی وقت محسوس ہوتا کہ وہ پیانو بجا نہیں رہی بلکہ اس سے جھگڑ رہی ہے اور جب پیانو کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو پردوں پر زور سے اُنگلی مار کر پوچھتی ہے "کیا کہا؟"

کبھی کبھی جی بے اختیار چاہتا کہ اس کے کمرے میں داخل ہو کر، پیانو کے پاس جا کر، زار و قطار رونا شروع کر دوں۔ جب وہ حیران ہو کر وجہ دریافت کرے تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگوں، یہاں تک کہ وہ ڈر کے بھاگ اُٹھے اور میں اطمینان سے آنسو پونچھ کر باہر نکل آؤں۔ وہ ہر رات بلا ناغہ گھنٹہ بھر پیانو سے لڑتی اور۔ اس دوران میں اس کا خاوند بڑی کھول کر اپنے ذاتی البم کا مطالعہ کرتا۔

سامنے والی کوٹھی میں ایک عیسائی انجنیئر کا کنبہ رہتا تھا۔

انجنیئر کی دو لڑکیاں تھیں، ایک کی عمر بارہ سال ہوگی اور دوسری لڑکی سترہ اٹھارہ کے لگ بھگ تھی۔ چھوٹی لڑکی کا رنگ کھلتا ہوا تھا اور آنکھیں بالکل بلی کی مانند۔ اس کی چال لمبی بلی کی طرح سمٹی سمٹائی اور دبی دبی تھی اور ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتی تھی۔ اس کی سیدھی اور چکنی پنڈلیاں بڑی سڈول تھیں۔ اس کے سینے کی گولائیاں ابھی بن رہی تھیں اور ان کی طرف دیکھنے پر کسی وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے قمیص پہننے والی دو پیالیاں قمیص کے اندر اوندھی کر رکھی ہوں۔

بڑی لڑکی کا رنگ زردی مائل گندمی تھا، وہ دبلی پتلی اور بے اختیار لمبی تھی، اس کی بائیں آنکھ ذرا ٹیڑھی تھی اور ناک اس کے قد کا چوتھا حصہ تھی اس کا نام مس ایلی تھا یہ نام سنکر مجھے ہمیشہ کھٹی املی کے درخت یاد آجاتے اور منہ میں پانی بھر آتا تھا اس کی آواز تیز تیکھی اور کرخت تھی وہ بولتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے ریل کے انجن کا کوئی پرزہ لیک کر رہا ہے اور تیز بھاپ سیٹی بجاتی خارج ہو رہی ہے، اُسے اپنے مریل کتے سے بڑا پیار تھا اور وہ ہر شام کو ٹھیوں کے درمیان والی سڑک پر اسے ساتھ لئے ٹہلا کرتی تھی۔

چوک میں کسی بدھی جگشو کی خانقاہ تھی، جہاں ہفتے میں کئی بار میلہ ہوا کرتا، اس روز عورتیں، بچے، مرد، زردہ روٹ والے بھکشو خانقاہ میں جمع ہو کر دن بھر ڈھمی گیت گاتے رہتے، یہاں اکثر دلیسی عطروں کی تیز خوشبو پھیلی رہتی تھی۔

اس خانقاہ کے عقب میں شہر کے غریب، واڑے تھے، لکڑی اور گھاس پھوس سے بنے ہوئے ڈربہ نما مکانوں کے بیچوں بیچ ایک خستہ حال سڑک چلی گئی تھی، اس سڑک کا نام میل روڈ تھا یہاں رات کو عموماً اندھیرا چھایا رہتا، ورمکانوں کے اندر مرغ سرخ سبز سبز بتیاں ٹمٹماتی رہتیں، یہاں بجلی کے کھمبے ضرور تھے مگر بلب کسی ایک پر بھی سلامت نہ تھا۔ ایک جگہ تاریل کے درختوں تلے تاڑی خانہ تھا، جہاں صبح و شام مزدور عورتیں اور مرد تاڑی پیتے، شور مچاتے اور لڑتے جھگڑتے رہتے۔ اس جگہ، اٹنی ڈربہ نما مکانوں میں، چوری چھپے جسم بیچنے والیوں کے دلال رہتے تھے، ٹیل روڈ در اصل قحبہ روڈ تھی یہ کسی مندر کی طرف نہیں بلکہ کوٹھی خانوں کی طرف جاتی تھی۔ شام ہوتے ہی جب اندھیرا پھیلنے لگتا تو رنڈیوں کے دلال تاڑی کے نشے میں مگن، کٹے ہوئے پتنگوں کی طرح ٹیل روڈ پر منڈلانے لگتے کسی وقت وہ تاڑی کے درختوں تلے یا بجلی کے کھمبوں کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاتے اور بیڑی پینے، اپنی خطرناک چمکیلی آنکھوں سے ہر راہ گیر کو گھورنے لگتے، پھر وہ ایکا ایکی لپکتے اور کسی نہ کسی عاجتمند پر حملہ کر دیتے۔

"مرغی صاحب؟" — "کیا ہم "اچھا والا" صاحب ہے؟"

"اچھا والا" سے اس کی مراد ایسی عورت سے ہوتی تھی جو پیشہ ور نہ ہو، بلکہ عطائی ہو۔

ایک رات میں میں بیک "اچھا والا" کے پاس چلا گیا۔

اس رات ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں، ہوا برساتی اوڑھے فٹ پاتھ پر درختوں کے نیچے سے ہو کر گذر رہا تھا، فضا میں درختوں کے گیلے تنوں کی مرطوب خوشبو رچی ہوئی تھی۔ سڑک پر کبھی کبھی کوئی موٹر روشنی کا سیلاب لئے گذر جاتی تو گرتی بارش کی لڑیاں، کانچ کے ریزوں کی مانند چمک اٹھتیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ کھائی میں بھینگر، ہنڈک اور پیپے چوک میں بنگلہ میں ٹمپل روڈ کی طرف گھوم گیا، سڑک پر حسب معمول اندھیرا تھا کہیں کہیں مکانوں اور "اڈی خانوں میں سے روشنی جھانک رہی تھی، ایک جگہ اچانک مجھ پر حملہ کر دیا گیا:۔

"مرغی صاحب ——؟"

اور اس کے "اچھا والا" کہنے سے پیشتر ہی میں اس کے ساتھ ہو لیا، جیسے سودا چلے ہی سے طے تھا، اپنی فوری کامیابی پر وہ بیحد قدر دلال اینٹھ اینٹھ کر میرے آگے چلنے لگا، کچھ دور چل کر ہم ایک تنگ گلی میں گھوم گئے، یہاں کچے ٹاریلوں اور سڑے بسے پیازوں کی بو پھیلی ہوئی تھی، دلال نے دھوتی میں اٹسی ہوئی ٹارچ جلائی اور اس کی کمزور روشنی میں مجھے ایک مکان میں لے گیا، مکان بالکل ڈربہ معلوم ہو رہا تھا، مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے واقعی میں وہاں مرغیاں خریدنے آیا ہوں۔ ایک کمرے میں پھیکی سی روشنی ہو رہی تھی اور کھڑکیوں پر زرد رنگ کے پرانے پردے کھچے ہوئے تھے، وہ مجھے اس کمرہ میں چھوڑ کر چلا گیا، کمرہ اگرچہ چھوٹا تھا مگر سلیقے سے سجا ہوا تھا، فرش پر ایک مٹیالی دری بچھی تھی اور قریب ہی تپائی پر کانسی کے تھالی میں مہاتما بدھ کی سیاہ پتھر کی مورتی رکھی تھی جس کے تلوؤں میں کچھ سپید پھول مرجھا رہے تھے، فضا میں ایک مانوس قسم کی گھریلو کیفیت تھی، مجھے وہاں کی ہر شے پیاری اور خوبصورت لگ رہی تھی، میں نے برساتی ایک طرف رکھ کر سگریٹ سلگایا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ ابھی میرا سر دیوار سے لگا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک پتلی دبلی لڑکی اندر داخل ہوئی اور مسکراتی ہوئی میرے قریب ہی پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بال اس کی لمبی پلکوں والی آنکھوں کی مانند گہرے سیاہ تھے، جنہیں اکٹھا کر کے جوڑے کی شکل میں اس نے گردن پر باندھ رکھا تھا۔ جوڑے میں نقلی زرد کلیوں کا گچھا لگا ہوا تھا۔ اس کا رنگ مونگرو کی کلی ایسا زردی مائل سپید اور کومل تھا۔ وہ مکئی عنابی رنگ کی ساری میں ملبوس تھی اور اس کے آدھے ننگے بازو گداز اور گول تھے، پیشانی پر سرخ بندی خون کا داغ معلوم ہو رہی تھی۔ میری نظروں میں ایکا ایکی وہ مقدس معبد پھر گئے جن کے نیم روشن تہہ خانوں میں کالی کالی آنکھوں والی دیوداسیاں، عود و عنبر کی نیلگوں دھند میں والہانہ رقص کیا کرتی ہیں۔ وہ مجھے اپنی روشن اور چمکیلی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ میں بھی اپنے آپ مسکرا رہا تھا اور مجھے خواہ مخواہ اپنے ہمسائے —— بیرسٹر صاحب اور اسکی بیوی کا خیال آ رہا تھا۔

"آپ ذرا کھل کے بیٹھ جائیں"، اس نے بڑی صاف انگریزی میں کہا۔ اس کی آواز نرم اور خواب آلود تھی۔

"تم انگریزی جانتی ہو؟"

"کیوں نہیں، ہمیں سیکھنا ہی پڑتی ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں، سیلون میں عیسائی زیادہ ہیں"

"ہاں، ہاں، ٹھیک ہے"

وہ ہنس پڑی اور اس کے گدرائے ہوئے گالوں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے، میں نے سگریٹ راکھ دان میں بجھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پیار سے دبانے لگا۔ اور دیوداسی کی سیاہ آنکھوں میں پُر نور اجالا جھلکنے لگا، وہ جلدی سے اٹھ کر گوتم بدھ کی مورتی کے پاس گئی اور کانسی کے تھال میں اپنے جوڑے کی زردکلیاں رکھ کر واپس چلی آئی، اب اس کے لمبے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے، پلنگ پر بیٹھ کر

اس ــ اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ اس کے سیاہ بال میرے بازوؤں پر بکھر گئے اور مجھے غالب کا مشہور شعر یاد آ گیا، میں نے ان بالوں کو بھینی بھینی خوشبو سونگھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ میرا ہاتھ نرمی سے سہلاتے ہوئے خواب آلود آواز میں بولی "لیشودھرا! ــــ اور تمہارا نام؟"

میں اُن آنکھوں کی سیاہ جھیلوں پر جھک گیا: "صدھارتھ"

وہ چونک اُٹھی: "صدھارتھ؟"

"ہاں!"

"یہ تو ہمارے مقدس بدھا کا نام تھا"

"ہاں؟"

"اور لیشودھرا اس کی بیوی تھی"

"ہاں!"

"کیا تم بدھ ہو؟"

"ہاں!"

اور اس نے کسی پُراسرار طاقت سے مغلوب ہو کر اپنے بھنورسی بال و میری گردن میں حمائل کر دیئے اور مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ مجھے اپنا جسم لطیف ہو کر کسی آفاقی رقص میں ڈھلتا محسوس ہو رہا تھا، جیسے طلا کی طرف سے آتے والی شرقی ہواؤں کے مہربان جھونکے مجھے ان صندلوں میں اُڑائے لئے گئے ہوں جو کے دھندلے نہ خانوں میں نیم عریاں دیو داسیاں، بدھ کی کنواری بیٹیاں، بگھرے پہنے، عنبر و لوبان کی خوشبوؤں میں مقدس بدھا کے روبرو تھرک تھرک کر رقص کر رہی ہوں۔ دھیمی روشنی میں ان کے اجسام اعضاً دمک رہے ہوں۔ رقص نتھے، گل صدبرگ، مونگرہ کلی، چمپا کلی، گوشتی، انومندی اور لیشودھرا ــــ صندلیں، نیم عریاں، کنوارے جسم اور سیاہ بالوں والی لیشودھرا ــــ حسین ساکیہ شہزادی!

اور لیشودھرا کا جسم کانپ رہا تھا، لرز رہا تھا، کسے ہوئے تار کی طرح، جسے زور سے جھنجھنا دیا گیا ہو۔

لیشودھرا نے دراز پلکیں اُٹھا کر مجھے دیکھا، ان آنکھوں میں دن کا اُجالا، شفق کا زرّیں سونا گھل رہا تھا، صبح ہو رہی تھی، شام ہو رہی تھی۔ اس کے جسم کے ہر ہر مسام سے شہریں مہک کی لہریں اُمڈ رہی تھیں، اس کے ہونٹوں میں شراب اور پسینے کے کسیلے ذائقے کی بجائے، صندل گلاب کے جزیرے کے جنگلی شہد ایسی مٹھاس تھی۔ اس کے گداز جسم کی ریشمی سطح پر ایک کنواری اور لذیذ تھرتھراہٹ تھی جیسے وہ اپنی دوشیزگی کا سرمایہ پہلی بار کسی کو سونپ رہی ہو۔

یہ ایک شرمیلی دلہن کا اچھوتا اور بے داغ جسم تھا۔

اس میں نرمل خون کی حدت اور پاکیزگی تھی۔

"تم صدھارتھ ہو، میں لیشودھرا ہوں۔ ساکیہ شہزادی، میں تمہاری بیوی ہوں، میرے جسم کی سیج پر تم زندگی کے آخری لمحے تک آرام کر سکتے۔ اس سیج کے پھول تمہارے انتظار میں سوکھ رہے تھے، تم کہاں تھے؟ کدھر تھے؟"

لیشودھرا جیسے خواب میں بول رہی تھی، اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں، اس کے بازوؤں کی گرفت میری گردن میں زیادہ ہنسوا

ہو رہی تھی، مجھے ایک طرح کا خوف سا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے میں کوئی شرمیلی دلہن ہوں اور کسی اکھڑ مرد کا کھردرا ہاتھ میری طرف بڑھ رہا ہو۔

میرے دل پر ہاتھ رکھ دو میرے شہزادے، مجھے اپنے سینے سے لگا لو، تاکہ میری سانس تمہاری سانس میں ڈوب جائے اور میرا دل تمہارے دل کی تال پر دھڑکنے لگے، اور قریب آجاؤ ساکیہ ——— میرے ساتھ لگ جاؤ، آج میں تمہیں ان سرحدوں تک لے جاؤں گی جہاں پہنچ کر عورت کی مکتی ختم ہو جاتی ہے، میرے ساتھ رہنا میرے سدھارتھ، ہم زمین کی نچلی تہوں میں اُتر رہے ہیں۔ نیچے نیچے، اور نیچے، یہاں تک کہ زمین اپنی ٹھنڈک کھو بیٹھے گی اور گرم سے گرم تر ہوتی جائے گی، ہم ایک انجانے خلا میں پہنچ جائیں گے۔ غیر مرئی، فوق انی، اَن دیکھا، اَن دیکھا، نیم روشن، نیم تاریک، جہاں بے شمار چاند ستارے چکر لگا رہے ہوں گے اور ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے، سینہ بسینہ بڑھتے چلے جائیں گے، آگے ہی آگے ——

یشودھرا کی آواز بتدریج جیسے کسی تاریک غار میں ڈوب گئی، اور ہماری سانس ایک دوسرے سے مل گئی اور ہمارے دل ایک ہی تال پر دھڑکنے لگے زمین کی تہیں ہمارے قدموں تلے سرکتی چلی گئیں اور ہم نیم روشن، نیم تاریک گہرائیوں میں اُترتے چلے گئے۔ نیچے، نیچے اور نیچے ——— یہاں تک کہ زمین اپنی ٹھنڈک کھو بیٹھی، وہ گرم سے گرم تر ہوتی چلی گئی اور پھر ———

پھر ——— جب ہمارے دل اپنی اپنی تال پر دھڑکنے لگے اور ہم ایک بار پھر زمین کی اصلی سطح پر آگئے تو میں نے برساتی کا نذرانہ پرکھی، بال درست کئے، سگریٹ سلگایا اور بستر پر بے سدھ پڑی ہوئی، اپنی رات بھر کی بیوی، ساکیہ شہزادی کو جھک کر دیکھنے لگا۔ بجلی کی ہلکی روشنی میں اس کا چور چور جسم یوں نڈھال پڑا تھا جیسے یکے بعد دیگرے اس نے کئی بچوں کو جنم دیا ہو، اس کی آنکھیں بند تھیں اور پیشانی پر سرخ بندی کا خون پسینے میں گھل مل رہا تھا، ہونٹ ذرا سے کھلے تھے اور ہموار دانتوں کی سپید لکیر چمک رہی تھی، نفس کے ساتھ اس کا سینہ آہستہ آہستہ ڈوب اُبھر رہا تھا، سیاہ لانبے بال گول گول مدور چھاتیوں کی محنبیں ڈھلوانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

یہ صندل کے سایوں میں سجے ہوئے بدھی مندروں کے دودھیا گنبد، یہ آنند بھرا بش کے نیلے نیلے تالوں میں کھلنے والے کنول کے پھول ——— انہی گنبدوں کے مقدس سایوں میں بیٹھ کر گوتما بدھ نے شنکنتلا لکھی تھی اور یہی وہ کنول کے پھول تھے جن کی کومل پنکھڑیوں پر شکنتلا نے راجہ دشنت کو اپنا پریم سندیسہ لکھ کر بھیجا تھا۔

یہ عورت اور کچلا ہوا غلیظ جسم نہیں تھا۔ یہ تو مہل روڈ کی بازاری عورت نہیں تھی۔

یہ مجورا، رامیشورم اور ملایا کے معبدوں کی سیڑھیوں پر عظیم ستونوں کے سایوں میں بیٹھ کر پھول بیچنے والی دوشیزہ تھی ——— میس ایلی گلیٹی اور فیلس ڈکنز نہیں تھی ——— یہ سیتا تھی۔ رام کی سیتا۔ جسے بھوک، غریبی اور افلاس کا راون اس کے وطن سے اُٹھا کر یہاں لے آیا تھا، اور جسے کسی رام اور لچھمن کا انتظار تھا۔

یہ یشودھرا تھی، ساکیہ شہزادی، جس نے جنوبی ہند کے نیلے پانیوں کے جھاگ سے جنم لیا تھا۔

یہ سندگلدیپ کی فراڈ ڈیٹی تھی، یہ لنکا کی لاڈلی تھی۔

یہ لچھمن مارکیٹ نہ تھی، پھول مارکیٹ تھی، لوگ اس کے قریب سے ہو کر گذرتے تھے۔ یہ پاؤنڈ کی نقلی مہک نہ تھی، بلکہ جنگلی پھول کی قدرتی خوشبو تھی یہ دھوپ میں چمکنے والا سنہری کلس تھا۔

یہ لنکا تھی، زندہ لنکا ——— سیتا کی لنکا، سونے کی لنکا۔

میں نے سونے کی لنکا پہ الوداعی نظر ڈالی، جیسے شہزادہ سدھارتھ، تتاگری کے عجیب جنگلوں میں نکل جانے سے پیشتر، اپنی بیوی یشودھرا کو آخری مرتبہ دیکھ رہا ہو، اور باہر نکل آیا ——— باہر چوک والی خانقاہ میں بچھلے پہر کا گجر بج رہا تھا، اور اس کے چمکیلے کلس کے اوپر ایک بڑا سا نیلا ستارہ پھٹتی سحر کی نوری جھلکیوں میں ماند پڑ رہا تھا۔

میں یوں مطمئن اور پُرسکون تھا، جیسے میں سچ مچ گوتم بدھ ہوں، اور مجھے ابھی ابھی گیان حاصل ہوا ہے۔

شوکت صدیقی

تیسرا آدمی

دونوں ٹرک سنسان سڑک پر تیزی سے گزرتے رہے!

چترپور روڈ مشرق کی طرف مڑتے ہی ایک دم سے نشیب میں چلی گئی ہے۔ اور جھکے ہوئے ٹیلوں کے درمیان کسی زخمی پرندے کی طرح ہانپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ رات اب گہری ہو چکی ہے اور آغازِ سرما کی بھیگی ہوئی ہوائیں چل رہی ہیں۔ دونوں ٹرک ڈھلوانوں پر کھڑکھڑاتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ان کا بے ہنگم شور پتھریلی چٹانوں میں دھڑک رہا ہے۔ ایکا ایکی اندھیرے میں سے کسی نے چیخ کر کہا——

"اے، کون جا رہا ہے ٹرک روک لو!"

رات کے سناٹے میں یہ آواز بڑی پُراسرار معلوم ہوئی۔ لیکن ٹرکوں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی، وہ اسی طرح بیٹھے رہے اور دونوں ٹرک جھکی ہوئی چٹانوں کی گہرائی میں تیزی سے گزرتے رہے۔ اس دفعہ زیادہ زور سے آواز سنائی دی——

"روکو، روک لو ٹرکوں کو!" اور اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی گڑگڑاہٹ اُبھرنے لگی۔ اس کی تیز روشنی کبھی کبھی دھوپ چھاؤں کی طرح ٹرکوں کے پچھلے حصوں پر لہرا جاتی رہی ہے۔ لیکن ٹرک رک نہیں سکتے، اس لئے کہ یہ خطرے کا الارم ہے۔ ان کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ سڑک بالکل ویران ہے۔ اور دونوں ڈرائیور بڑے اکسپرٹ ہیں۔

موٹر سائیکل کی روشنی قریب ہوتی جا رہی ہے، اور قریب! اور قریب!! اور اس کا شور ٹرکوں کے نزدیک ہی دھڑکنے لگا ہے۔ ان کی رفتار اب زیادہ نہیں بڑھ سکتی ہے، اس لئے کہ ڈھلان پر ٹرکوں کے بے قابو ہو جانے کا پورا اندیشہ ہے۔ دونوں ڈرائیوروں کے سہمے ہوئے چہرے خوف زدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن نیلی آنکھوں والا اونچا خاموشی سے بیٹھا ہوا سگرٹ پیتا رہا اور برابر سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ پھر ایک مارگی کوہستانی ٹیلوں کی گہرائی میں ریوالور چلنے کی آواز بڑے بھیانک انداز سے گرجنے لگی اور گولی ٹرک کے پچھلے پہیوں کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ ایک بار پھر کسی نے اونچی آواز میں کہا——

"روک لو ٹرک کو ورنہ میں ٹائر برسٹ کر دوں گا یہ

اور اس وارننگ کے ساتھ ہی دونوں ٹرک فٹر گئے۔ ٹرک کے اندر سے نرف واچو اُتر کر نیچے آیا۔ باہر برف جھڑ کی مشورہ سرہوائیں چل رہی تھیں۔ اور ان کی تیز خنکی جسم میں چبھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ واچو نے اپنے لمبے اوور کوٹ کے کالروں کو درست کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا موٹر سائیکل کے قریب پہنچ گیا پھر اس نے جلتی ہوئی سگریٹ کو جھنجلاہٹ کے سے انداز میں سڑک پر پھینک کر جوتے سے مسل ڈالا اور بڑے تیکھے لہجہ میں پوچھنے لگا

"اس طرح ٹرکس کو روک لینے کا مطلب کیا چاہتے ہیں آپ؟"

لیکن موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر واچو کے اس انداز سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا بلکہ بڑی بے نیازی سے کہنے لگا "میں انٹی کرپشن کا انسپکٹر ہوں اور دونوں ٹرکوں کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔"

واچو نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا کرخت معلوم ہو رہا تھا۔ اور ریوالور ابھی تک اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ واچو نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر پوری طرح دہشت زدہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس نے جھٹ سے کاروباری پینترا بدلا اور ذرا سے تلخی سے کہنے لگا "اچھا تو آپ ہیں۔" اور پھر وہ مسکرا دیا۔ "اگر آپ آفشل پوچھنے ہیں تو دیکھئے دونوں ٹرکوں پر آلو کے بورے لدے ہوئے ہیں۔ یہیں ثبوت میں ڈسٹرکٹ آکٹرائے آفس کی رسید پیش کر سکتا ہوں۔ چونگی کا یہ محصول ابھی پچھلے ہی ناکہ پر ادا کیا ہے۔ اور جو کچھ اصلیت ہے وہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے اس لئے کہ آئل شیٹ کو اس طرح لے جانے کا یہ کوئی پہلا اتفاق تو ہے نہیں یہ سلسلہ تو ایک مدت سے چل رہا ہے۔"

انسپکٹر گردن ہلا کر بولا۔

"جی ہاں سنا تو کچھ میں نے بھی یہی ہے اور اسی لئے کئی گھنٹوں سے اس سڑک پر پتیا کر رہا تھا۔"

واچو ہنسنے لگا "یہ پتیا تو آپ نے خواہ مخواہ اپنے سر مول لی۔ میں نے آپ کو دو مرتبہ ٹیلیفون کیا۔ اگر آپ دفتر میں مل جاتے تو آپ کو اس طرح کیوں پریشانی اٹھانا پڑتی اور خود مجھے بھی یہاں سردی میں نہ آنا پڑتا۔ مگر چلئے یہ بھی ٹھیک ہی رہا۔ اس بہانے آپ کے درشن تو ہو گئے!"

اور وہ تین سو روپے جو احمد پور کے اس ٹرب میں وہ بچا لینا چاہتا تھا آخر اس نے ان کرنسی نوٹوں کو اندرونی جیب میں سے نکالا اور انسپکٹر کی طرف ان کو بڑھا کر کہنے لگا۔

"آپ سے پہلی بار ملاقات ہوئی ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ نذرانہ تو دینا ہی پڑے گا۔ لیجئے ان کو رکھ لیجئے۔ فرمائیے اور کیا سیوا کی جائے!"

انٹی کرپشن کا انسپکٹر دیکھے بن سے بولا۔

"اس مہربانی کا شکریہ! اب اتنی اور مہربانی کیجئے کہ ان کو اپنے ہی پاس رہنے دیجئے۔"

واچو ذرا سنجیدہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے رہے۔ اور کوہستانی چٹانوں میں پت جھڑ کی بھری ہوئی ہوائیں چیخ رہیں۔ آگے کھڑے ہوئے ٹرکوں کے اندر سرگوشیوں کی دبی دبی آوازیں بھنبھنا رہی تھیں۔

واچو غور کرنے لگا کہ یہ آسانی سے ماننے والی آسامی نہیں ہے۔ اس سالے کو ابھی کچھ اور بھی دکشنا دینا پڑے گی۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ ہر کامیاب جرم کی سازش پہلے پولیس اسٹیشن کے اندر ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ سود البعد میں بھی ملے ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب مایا کے کھیل ہیں اور مایا کے روپ نیارے ہیں۔ اسی لئے جرائم کی نوعیتیں جداگانہ ہیں۔ جیب کاٹنے والا زیادہ سے زیادہ مسٹری شیٹر بن سکتا ہے۔ اور کارپائے نمایاں انجام دینے والا سرمایہ دار ہو جاتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ مسٹری شیٹر بننے کے لئے پولیس کی سرپرستی درکار ہوتی ہے اور سرمایہ داری کے لئے گورنمنٹ سے ساز باز کئے بغیر کام نہیں چلتا۔ واچو نے جیب کے اندر سے کچھ اور کرنسی نوٹ نکالے اور آہستہ سے کہنے لگا

"انسپکٹر نیاری جب تک اس سرکل میں تعینات رہے ہماری انڈسٹری کی طرف سے ان کا حسابی حساب سے ان کا حق برابر پہنچتا رہا۔" پھر خوشامد کے سے انداز میں وہ مسکرا کر بولا "لیکن آپ کے اس طرح جاڑے پالے میں آکر پریشان ہونا پڑا ہے، اب اس پریشانی کا بھی کچھ خیال کرنا پڑے گا۔ لیجئے یہ

دو سو اور میں۔ دیکھئے اب کچھ نہ کہئے گا اور اپنا یہ ریوالور تو آپ اب اندر رکھ لیجئے۔ خواہ مخواہ آپ سے خوف معلوم ہو رہا ہے۔"

مگر بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر اسی طرح ناراضگی کے سے انداز میں بولا ــــ

"دیکھئے آپ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں ان دونوں ٹرکوں کو پولیس اسٹیشن لے جائے بغیر باز نہ آؤں گا۔ آپ خواہ مخواہ میرا بھی وقت خراب کر رہے ہیں اور خود بھی پریشانی اٹھا رہے ہیں۔" اور وہ موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے لگا۔

اس دفعہ وانچو کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔ اس نے بڑی تیکھی نظروں سے انسپکٹر کو گھور کر دیکھا۔ اس عرصہ میں پہلی بار اس کو خطرے کی نوعیت کا احساس ہوا تھا۔ اس لئے کہ دونوں ٹرک کسی طرح بھی پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتے تھے۔ کمپنی کا یہی حکم تھا یہی ہدایت تھی۔ اور اس ذمہ داری کے لئے کمپنی سے اس کو نو سو روپے ماہوار تنخواہ کے علاوہ مینجنگ ڈائرکٹر کی طرف سے چھ سو روپے اکسٹرا الاؤنس بھی ملتا تھا۔ وانچو کئی ماہ سے اپنی اس ڈیوٹی کو بڑی مستعدی سے انجام دے رہا تھا۔ کمپنی اس کی کارگزاریوں کو سراہتی رہی ہے۔ اور بورڈ آف ڈائرکٹرز کی میٹنگ میں بہت سی باتوں کے لئے اس کو جواب دہ بھی ہونا پڑتا ہے۔ اور اکثر ایسے بے تکے سوالوں سے اس کی سابقہ پڑتا کہ وہ بدحواس سا ہو جاتا۔ اس لئے وہ بانچھو روپے سے زیادہ دو ٹرکوں کے لئے رشوت نہیں دے سکتا۔ ورنہ آئندہ میٹنگ میں اگر کوئی ڈائرکٹر اُلجھ گیا تو بہت ممکن ہے کہ اُلٹا رقم اس کو اپنی تنخواہ سے ادا کرنا پڑے۔ اور بات بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ دراصل الھی نگ فیکٹری کی تعمیر کے لئے کمپنی اپنے پاس سے صرف روپیہ ہی لگا رہی ہے۔ شوگر پلانٹ کی تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ البتہ کمپنی کے وہ خادم جن میں ایکھ کی کاشت ہوگی ان میں ٹریکٹر چلنے لگے ہیں اور آلو کی فصلیں تیار کی جا رہی ہیں۔ اور یہ آلو گنی میں بھر کر قصباتی بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے بھیج دئے جاتے ہیں۔ آلوؤں کے ساتھ سیمنٹ کی بوریاں اور آئرن شیٹس بھی ٹرکوں میں لاد کر پوشیدہ طور پر بلیک مارکیٹ میں جاتے ہیں۔ کمپنی کو اپنی انڈسٹری کی تعمیر کے لئے سیمنٹ اور آئرن کا بہت بڑا سرپلس کوٹا مل گیا ہے جس کی سمگلنگ سنسان راتوں میں بڑے پُراسرار طریقے پر ہوتی ہے، اور اس سازش میں پولیس کے علاوہ دوسرے محکمے بھی کمپنی کے شریک ہیں۔

وانچو غور کرنے کے سے انداز میں خاموش کھڑا رہا۔ اس کی گھنی بھنویں آنکھوں پر جھکی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں۔ اور چہرے کے تیکھے نقوش مجسموں کی طرح ٹھوس نظر آ رہے ہیں۔ پھر ایک بارگی اس نے طے کر لیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ انہیں دہشت ناک موتیوں کے لئے وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جو کچھ کرنا ہے اس کے فیصلے کے لئے منٹ بھر کا عرصہ بہت ہے۔ اور جو لوگ صرف انجام ہی پر غور کرتے ہیں وہ کبھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ اور پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا وہ آگے والے ٹرک کے پاس پہنچ گیا اور سرگوشی کے سے انداز میں آہستہ آہستہ پکارنے لگا ــــ

"نیل کنٹھ، اے نیل کنٹھ مہاراج!"

اور ٹرک کے اندر سے مضبوط پٹھوں والا نیل کنٹھ دھنسی ہوئی آواز میں بولا ــــ

"کیا ہے سکٹری صاب؟"

پھر وہ اُتر کر نیچے آ گیا۔ اس کا آبنوسی جسم رات کے گہرے اندھیرے میں پرچھائیوں کی طرح دھندلا نظر آ رہا تھا۔

وانچو کہنے لگا "سنو نیل کنٹھ یہ سالا انسپکٹر تو مانتا ہی نہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ دونوں ٹرک تھانے پر بھی نہیں جا سکتے۔"

وہ سینہ تان کر بولا

"تو جو حکم ہو!"

گہری نیلی آنکھوں والے وانچو نے اس کو جبر بھری نظروں سے دیکھا اور پھر سازش کرنے کے سے انداز میں اس نے ایک آنکھ دبا کر آہستہ سے کہا "بھر کو نو مور لائن کلیئر کی ضرورت ہے زیادہ جھنجھٹ نہیں چاہئے۔" پھر مڑتے ہوئے اتنا اور کہا میں جاکر اس سے باتیں کرتا ہوں۔ تم ٹرکوں پشت پر سے گھوم کر آ جانا۔ سمجھ گئے نا!"

اور نیل کنٹھ جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ اُس کی آنکھیں جرائم پیشہ لوگوں کی طرح خونخوار نظر آنے لگیں۔ وانچو وہاں سے سیدھا اسٹیشن کے انسپکٹر کے پاس چلا گیا۔ وہ اس کو آتے ہوئے دیکھ کر تیزی سے بولا

"آپ نے لڑکوں کو سٹارٹ نہیں کروایا، بلا وجہ دیر ہو رہی ہے۔"

وانچو بڑی سنجیدگی سے بولا "آپ تلاشی لیں گے یا ٹرکس اسی طرح چلیں گے؟"

وہ کہنے لگا "بظاہر تو اب کوئی ایسی ضرورت نہیں، یوں جیسے آپ کی مرضی!"

وانچو ایک بار پھر کاروباری انداز سے مسکرایا "انسپکٹر صاحب مرضی ہماری کہاں، مرضی تو آپ کی ہے۔ ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر آپ کی ناراضگی ختم ہی نہیں ہوتی۔"

وہ بے نیازی سے بولا "دیکھئے ان بے کار باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو آپ تھانے پر چل کر کہہ لیجئے گا۔"

وانچو سنجیدہ ہو گیا "بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اتنا میں آپ کو ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ آٹومن ٹیشس اور سمبنٹ کا سرپلس کوٹا لے سکتے ہیں۔ اور جو اس کو سمگل بھی کرا سکتے ہیں وہ اپنے بچاؤ کے طریقے بھی جانتے ہی ہوں گے۔ جو چوری کرنے جاتا ہے تو باہر نکلنے کا رستہ بھی پہلے دیکھ لیتا ہے۔"

اور اس میں شک نہیں کہ وانچو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس لئے کہ "یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ" کے وہ ڈائرکٹر ایم۔ ایل۔ اے ہیں اور ان میں سے ایک تو ریونیو منسٹر کا داماد بھی ہے۔ اور اسی لئے سرکاری محکموں میں کمپنی کا اثر بھی ہے اور زور بھی ہے۔ لیکن بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر ان نہاتے سر رستہ کو نہیں جانتا۔ اس سرکل میں ابھی اس کا نیا نیا ٹرانسفر ہوا ہے۔ اس لئے پورے علاقہ میں وہ اپنی دھاک بٹھا دینا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے ایک آدھ بڑا کیس بنائے بغیر بات نہیں بنتی۔ اور پولیس کی ٹکنیک کے مطابق ایک بار جہاں ہوا بندھ گئی پھر تو لکشمی آ کر خود قدم چومتی ہے۔ اور اسی لئے وہ کسی طرح باز نہیں آ سکتا۔ وانچو کی باتوں پر جھنجھلا کر اس نے جواب دیا ——

"ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ ابھی تو آپ چل کر ذرا سوالات میں ٹھہریئے۔ پھر دیکھیں گے کہ آپ لوگ اپنے بچاؤ کا کون سا طریقہ جانتے ہیں۔"

اس دفعہ وانچو بھی بھر گیا۔ اس نے تیزی سے کہا

"انسپکٹر صاحب مجھے کیلاش ناتھ وانچو کہتے ہیں۔ میں تھانہ تک جانے سے پہلے بات کو یہاں بھی طے کر سکتا ہوں۔ آپ کے ایسے انٹی کرپشن کے انسپکٹروں سے یہاں اکثر سابقہ پڑا کرتا ہے۔ اگر ان میں سے آپ کو کوئی مل گیا ہوتا تو اس طرح مونچھ اونچی کر کے آپ کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔"

انسپکٹر کے چہرے پر اور بھی خشونت آ گئی۔ وہ اس کو بڑی تیکھی نظروں سے گھورنے لگا۔ اور اسی وقت آبنوسی جسم والے نیل کنٹھ نے اس کے سر پر "اہنی راڈ" اٹھا کر زور سے دے مارا۔ انسپکٹر نے دبی ہوئی کراہ کے ساتھ ہائے کر کے بیٹھی ہوئی بھیانک آواز نکالی، اور لڑکھڑا کر سڑک پہ گر پڑا۔ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا ریوالور ابھی تک کانپ رہا تھا۔ وانچو نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ کو اپنے بوجھل جوتے سے رگڑ دیا۔ اور ریوالور کو چھین کر جھاڑیوں کی طرف پھینک دیا، اور اس کی پیٹھ کی ہڈی پر ایک بھرپور لات مار کر بڑبڑانے لگا ——

"معصت تیرے کی، سالا کسی طرح مانتا ہی نہ تھا" اور پھر وہ نیل کنٹھ سے کہنے لگا "مہاراج ڈال دو سالے کو ادھر کنارے کی طرف۔ اور پھر اطمینان سے ایک سگریٹ سلگا کر پوچھنے لگا "ہاں یہ دیکھ لو کہ زخم گہرا تو نہیں، ورنہ بلا وجہ بات اور بڑھ جائے گی۔"

نیل کنٹھ کہنے لگا "ہاتھ بھرپور نہیں پڑا ہے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔"

پھر نیل کنٹھ نے سڑک پہ سیدھے پڑے ہوئے بھاری بھرکم جسم والے انسپکٹر کا بازو پکڑا اور اس کو گھسیٹتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس کا رخت چہرا خون میں ڈوب کر بڑا بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ اور سانس سہمی ہوئی سی چل رہی تھی۔ وہ اسی طرح جھکے ہوئے کوہستانی جھاڑیوں کے دامن میں کسی لاش

کی طرح بے جان پڑا رہا۔ اور آغاز سرما کی تھکی ہوائیں پتھریلی چٹانوں میں ہانپتی رہیں۔ اور ایک بارگی کہیں نزدیک ہی گیدڑوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

دونوں ٹرکوں کے اسٹارٹ ہونے کی گڑگڑاہٹ سنسان رات میں اُبھرنے لگی۔ اور وہ موٹر سائیکل کو بُری طرح روندتے ہوئے مترک پر پھر چلنے لگے۔ لیکن احمد پور جانے کے بجائے اب وہ جنوبی ٹیلوں کی طرف مڑ رہے تھے۔ اور کوئی سترہ میل کا چکر کاٹنے کے بعد دونوں ٹرک پھر اسی چوراہے پر پہنچ گئے جہاں لوہے کے کھمبے پر لگے ہوئے بورڈوں پر لکھا تھا:۔

بلیر گھاٹ اکیاون میل۔
سمجھوان کلاں، اٹھارہ میل
شیام ہاڑہ، چوراسی میل
احمد پور ایک سو باون میل

قریب ہی ڈسٹرکٹ آگزائلری ٹیکس آفس تھا جس کے جھکے ہوئے سائبان کے نیچے ایک دھندلا سا لیمپ جل رہا تھا۔ اور بوڑھا محرر رجسٹروں کو کھولے ہوئے کھانس رہا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل یہاں پر دونوں ٹرکوں کی چونگی کا محصول ادا کیا گیا تھا۔ وانچو ٹرک پر سے اُترا اور سیدھا سائبان کے نیچے چلا گیا اور سرگوشی کے لہجہ میں آہستہ سے بولا۔

"منشی جی میرے خیال میں آپ کے رجسٹروں میں ٹائم تو درج نہ ہونا ہوگا" اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور تیس روپے کے کرنسی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دئے۔ "لیجئے ان کو رکھ لیجئے، اگر کوئی دریافت کرنے آئے تو کہہ دیجئے گا کہ دونوں ٹرکس کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب یہاں آئے تھے۔ سمجھ گئے نہ آپ؟"

اور بوڑھے محرر نے اپنی گردن ہلا دی "ایسا ہی ہو جائے گا۔ پر کوئی گھبرانے کی بات تو نہیں؟"

وانچو ڈرامائی انداز میں قہقہہ لگا کر کہنے لگا

"جب تک ہم موجود ہیں اس وقت تک بھلا آپ پر کوئی آنچ آسکتی ہے؟"

وہ بھی ہنسنے لگا" سو تو ہے۔ یہ بات اتنی ہے سرکار کہ اب زمانہ بڑا خراب لگ گیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر سر کے بال کی کھال نکالتے ہیں۔"

اور پھر چونگی کے بوڑھے محرر کو مطمئن کر کے وہ مسکراتا ہوا ٹرک کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ٹرک پھر روانہ ہو گئے۔ سامنے تیمر پور روڈ اندھیرے میں بل کھاتی ہوئی چلی گئی ہے۔ مگر دونوں ٹرک پھر اس پر جانے کی بجائے راہیل روڈ کی طرف مڑ گئے۔ وانچو نے گھڑی میں وقت دیکھا، اب ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اور پھر دو بجنے سے پہلے ہی دونوں ٹرک ایک بڑھ پولیس سٹیشن کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔ وانچو تھانہ کے اندر چلا گیا۔ اور ڈیوٹی انسپکٹر کو ڈیڑھ سو روپے دے کر اس نے ایک ٹرک کا چالان کرا دیا۔ روزنامچہ میں درج کر دیا گیا۔

"ٹرک نمبر ۲۱۳۶، نو بجے شب کو راہیل روڈ پر سے گزرتے ہوئے بغیر ہیڈ لائٹس کے پایا گیا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی بیٹری خراب تھی۔ ٹرک مذکور یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی ملکیت ہے۔ اور اس میں آلو کے بورے لدے تھے۔"

اور اسی طرح تھیم پور گنج تھانہ پر مزید ڈیڑھ سو روپے رشوت دے کر دوسرے ٹرک کا بھی چالان کرا دیا گیا۔ اور ہیڈ کانسٹیبل سرکاری روزنامچہ میں اندراج کرنے لگا۔

"پونے دس بجے شب کو ٹرک نمبر ۶۲۲۸ راہیل روڈ پر اتنی تیز رفتار سے گزر رہا تھا کہ کسی حادثہ

کے ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ڈپوٹی انسپکٹر ہرنام سنگھ نے اس کو ذرا کرید کر تحقیقات کی تو یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈرائیور ممی نذر محمد کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود نہ تھا۔

اس کے بعد دونوں ٹرک پھر ریل روڈ پر نیتری سے گزرنے لگے اور صبح کاذب کی گہری دھند میں دونوں ٹرک بلیر گھاٹ پہنچ گئے۔ پھر چھ بجے سے پیشتر ہی وانچو بھارت انجینئرنگ ورکس کی نئی اسٹوڈی بیکر پر واپس لوٹ پڑا۔ اور ابھی دھوپ اچھی طرح پھیلے بھی نہ پائی تھی کہ اس کی کار فیکٹری کے پھاٹک کے اندر داخل ہو گئی۔

وانچو اپنے دفتر میں جا کر حسب معمول کمپنی کے کاموں میں الجھ گیا اور رات کے حادثہ کی اہمیت سینچر کے روز ہونے والے اس ڈیلیٹ سے زیادہ نہ رہی، جس میں ریلوے کی ایک بنکر ج فیکٹری کے یارڈ کے اندر ڈیچ ہو گئی تھی۔ اور اس نقصان کے لئے ریلوے نے کوئی چار ہزار روپے کا کلیم کیا تھا۔ اور عدالتی کارروائیوں کے لئے میسرز پرشاد ایڈووکیٹ کمپنی کے مشیر قانونی موجود ہی تھے۔

پولیس تحقیقات کرتی رہی، تفتیش برابر ہوتی رہی اور انٹی کرپشن کا بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر ہسپتال میں پڑا کراہتا رہا۔ اور مضبوط پٹھوں والا نیل کنٹھ جھنگ چڑھا کر ٹھاٹھ سے گالیاں بکتا اور اپنے کوارٹر کے اندر لیٹا ہوا رات گئے تک اونچی آواز میں آلہا گاتا رہا۔

"اور اگر تمہاری بات نہ مانی جائے تو؟"

"پھر تو کنور صاحب اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلے گا۔"

"لیکن دلیپ چند تمہیں معلوم ہے کہ میں کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوں!"

کمرے کے اندر اسی طرح تیز لہجے میں باتیں ہوتی رہیں۔ آفشان میں کوئلے چٹخ رہے تھے۔ دہکتے ہوئے سرخ انگاروں کی روشنی میں وانچو کا گنجا سر چمکنے لگا تھا۔ مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا اپنا بھدا سا پائپ پیتا رہا۔ دریچے سے ہوا کے یخ بستہ جھونکے اندر آ رہے تھے اور فیکٹری کے ورکشاپ میں دھڑکتی ہوئی لوہے کی جھنکاروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی پھواروں کے لچھے منڈلا رہے تھے، اور اس دھند میں لپٹی ہوئی مینجنگ ڈائریکٹر کی خوبصورت کوٹھی اداسی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، جس کے باہری برانڈے میں نیل کنٹھ دیوار سے پیٹھ لگائے چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ برانڈے میں بالکل اندھیرا تھا اور اس گہری تاریکی میں نیل کنٹھ کا سیاہ آبنوسی جسم آسیب زدہ سایہ کی طرح ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔

نیل کنٹھ اس طرح اندھیرے میں خاموش بیٹھا رہا اور جب کبھی دلیپ چند تیزی سے بولتا تو وہ چونک کر کمرے کے دروازے کی طرف گھور کر دیکھتا جیسے اب کچھ نہ کچھ ہونے ہی والا ہے۔ لیکن دلیپ چند اندر بیٹھا ہوا اطمینان سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر ٹیبل لیمپ کے "شیڈ" کی پرچھائیں پڑ رہی ہے۔ اور اس دھندلی روشنی میں اس کا ٹھگنی جسم ناٹک کے کسی مسخرے کی طرح حقیر نظر آ رہا ہے۔ مگر دلیپ چند کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہے۔ کمپنی کی غیر قانونی سازشوں میں اس کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ بات نیلی آنکھوں والا وانچو بھی جانتا ہے اور اس کی اہمیت مینجنگ ڈائریکٹر کو بھی معلوم ہے، جس کو فیکٹری کے اندر سب لوگ کنور صاحب کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ رانی بازار کے علاقہ کا جاگیردار ہے۔ وہ کاروباری تکنیک سے زیادہ گھوڑوں کی نسلوں اور عورتوں کی مختلف قسموں کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے زندگی کا بہتر حصہ گھوڑے دوڑانے میں۔ اور عورت کے جسم پر کسی کیمیاگر کی طرح کوک شاستری تجربے کئے ہیں۔ اور جب سے جاگیرداری پر زوال آنے کی افواہیں سرکاری حلقوں میں گشت کرنے لگی ہیں اس نے بھی اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے لئے کسی انڈسٹری میں داخل ہو جانا ہی اپنے حق میں بہتر سمجھا۔ اور اس دوراندیشی نے اس کو کنور رنجیت راج سنگھ سے ایکبارگی یونائیٹڈ انڈسٹریز کا مینجنگ ڈائریکٹر بنا دیا ہے۔ لیکن کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ اس کی باتوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے رائی بے نیازی سے کہہ دیا ———

"اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہوں۔ سارے رجسٹر میرے ہی پاس رہتے ہیں۔"

مینجنگ ڈائریکٹر یک بارگی برافروختہ ہو کر بولا ——

"ٹھیک ہے کہ تمام رجسٹر تمہاری نگرانی میں رہتے ہیں۔ مگر اس بات سے تمہارا مطلب؟"

وہ کہنے لگا "چوٹ کھایا ہوا انسان بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ کنور صاحب آپ میرے ساتھ حق تلفی کریں گے تو میں بھی سارے رجسٹروں کو کل ڈائریکٹروں کی میٹنگ میں پیش کر سکتا ہوں۔"

مینجنگ ڈائریکٹر کے سانس کی رفتار ایک دم سے تیز ہو گئی اور وہ محنتی جسم والے دیپ چند کو عقابی نظروں سے گھورنے لگا لیکن دیپ چند بیٹھا ہوا مزے سے اپنی کمپنی سجھاتا رہا۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مینجنگ ڈائریکٹر اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ پوری طرح اس کے قابو میں ہے۔

دیپ چند اس کی سازش کے اتنے بڑے راز کا محافظ ہے کہ وہ جس وقت بھی چاہے اس کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ سیمنٹ اور آئرن جن دنوں میں چور بازار میں فروخت ہوتا ہے کمپنی کے رجسٹروں میں اس کی قیمت بہت کم درج کی جاتی ہے۔ اور اس طرح اب تک مینجنگ ڈائریکٹر نے بوشیدہ طور پر کئی دو لاکھ روپیہ غبن کر لیا ہے۔ لیکن دیپ چند کو اپنے اعتماد میں رکھنے کے لئے اس نے دس فیصد کا شرکت دار بنا لیا تھا اور اس طرح ہر ماہ ہزار روپے کی ادائیگی کے لئے اس کی نیت بدل گئی اور دیپ چند کے اکثر توجہ دلانے پر بھی وہ برابر ٹالتا رہا۔ لیکن دیپ چند نے طے کر کے آیا تھا کہ آج وہ کچھ نہ کچھ فیصلہ کر کے جائے گا۔ اس لئے کہ اس کی بڑی لڑکی کہ شادی کے بیاہ کی بات ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے لڑکے سے طے پا چکی ہے، گھر اچھا ہے اس کے لئے کوئی نشچہ گھڑی دیکھ کر لگن ہو جانا چاہئے۔ لیکن اس کے لئے کاسمٹھوں کے رواج کے مطابق ابھی اس کو دس ہزار روپیہ نقد میں دینا ہے۔ ورنہ یہ سگائی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مینجنگ ڈائریکٹر چاہتا ہے کہ بورڈ آف ڈائریکٹرز سے سفارش کر کے اس کی تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہانہ سے ساڑھے تین سو کروا دے۔ مگر دیپ چند کو یہ رشوت منظور نہیں ہے۔ اسے بیس ہزار روپیہ چاہئے —— اس لئے کہ وہ اپنی لڑکی کا بیاہ جلد ہی کر دینا چاہتا ہے۔

مینجنگ ڈائریکٹر کا چہرہ جھنجھلاہٹ کے اثر سے برابر غضبناک ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کاروباری زندگی پر جاگیرداری کا روپ برابر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ پھر یک بارگی وہ کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر سے صرف رانی بازار کے علاقہ کا گنوار شیوراج سنگھ رہ گیا۔ اس نے میز پر زور سے گھونسہ مار کر کہا

"تم میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ" اور پھر وہ چیخ کر زور سے بولا "جاؤ جو تمہارے جی میں آئے کرو۔"

اور محنتی جسم والا مالک کا مسخرہ مسکین سی شکل بنائے ہوئے خاموشی سے اٹھ کر دروازے سے باہر چلا گیا۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے کوئلے کبھی کبھی چٹخنے لگتے ہیں اور باہر لان میں دیپ چند کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ پھر دا پنچو نے اپنا ہاتھ میز پر رکھ دیا اور مینجنگ ڈائریکٹر سے کہنے لگا ——

"کنور صاحب یہ آپ نے کیا کر دیا؟"

"کچھ نہیں سب ٹھیک ہے۔ کل سویرے ہی اس کو نوٹس دے کر نوکری سے علیحدہ کر دو۔"

دا پنچو گھبرا کر بولا

لیکن اس طرح سے کام تو نہیں چلے گا۔ بلکہ اب تو وہ اور بھی آسانی سے ہم کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پاس ہمارے خلاف بہت سے ڈاکومینٹری ثبوت موجود ہیں۔"

کنور رشید راج سنگھ گہری خاموشی میں کھو گیا، اور خود کو بڑا بے بس محسوس کرنے لگا۔ پھر اس نے بڑی بے چارگی سے کہا ——

"اچھا تو اب کچھ تم ہی کرو۔"

وانچو کہنے لگا "آپ ذرا اندر کوٹھی میں تشریف لے جائیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا آپ پر کوئی حرف آ سکتا ہے"۔

کنور ستیو راج سنگھ نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کرسی پر سے اٹھ کر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد وانچو نے نیل کنٹھ کو اندر کمرے میں بلایا اور اس سے کہنے لگا ——

"نیل کنٹھ مہاراج" دیکھو دیپ چند ابھی زیادہ دور نہ گیا ہوگا۔ تم جا کر اس کو بلا لاؤ، کہنا کہ سیکرٹری صاحب نے بلایا ہے" اور نیل کنٹھ تیز تیز قدموں سے کوٹھی کے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ہمراہ دیپ چند بھی تھا۔ نیل کنٹھ پھر جا کر برانڈے میں ٹھہر گیا اور وانچو دیپ چند سے کہنے لگا

"اکاؤنٹنٹ صاحب آپ بھی خوب آدمی ہیں بوڑھے ہونے کو آ گئے مگر مزاج پہچانتا آپ کو ابھی تک نہیں آیا۔ بھلا اس طرح بھی کوئی بات طے ہوتی ہے"۔

لیکن دیپ چند بھی کم سیانا نہ تھا۔ وہ پہلے ہی بھانپ گیا تھا کہ اس کا "ترپ" ٹھیک پڑا ہے۔ اور اب وہ اس کے قابو سے نکل کر جا نہیں سکتے۔ اس دفعہ وہ بھی ذرا نرمی سے بولا ——

مگر سیکرٹری صاحب یہ تو دیکھئے کہ کنور صاحب تو میرا گلا کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ میں کرتا بھی کیا؟"

وانچو اپنے خاص انداز میں ہنسنے لگا۔

"کمال کر دیا آپ نے، آتا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ زندگی میں پہلی بار وہ اس کاروباری بکھیڑے میں آ کر پھنسے ہیں۔ انہوں نے تو ہمیشہ حکم چلائے ہیں اور اپنی جاگیر میں من مانی حکومت کی ہے۔ دیکھئے رئیسوں سے بات کرنے کا اور ہی گُر ہوتا ہے۔ ان کے سامنے تو ہر بات پر بس ہاں کرتے جائیے پھر جو کام جی چاہے ان سے کرا لیجئے"۔

اور دیپ چند نے جیسے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ ذرا پشیمانی کے سے انداز میں کہنے لگا

"اب کیا عرض کروں سیکرٹری صاحب مجھے بھی اس وقت نا معلوم کیا سوجھی کہ ان کے سامنے ذرا تیزی سے بات کرنے لگا۔ دراصل میں اپنی لڑکی کی سگائی کے سلسلے میں ادھر بڑا پریشان ہوں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں بواسیر کا پرانا مریض ہوں۔ روز بروز تندرستی گرتی جا رہی ہے۔ اپنی زندگی میں ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دوں، بس اب تو یہی لگن ہے"۔

وانچو ہمدردی کرنے لگا

"جی ہاں لڑکی کا ہونا بھی اس سوسائٹی میں اچھی خاصی مصیبت ہی ہے۔ لیکن بات کے اسی پہلو پر آپ نے زور دیا ہوتا تو بھلا کنور صاحب انکار کر سکتے تھے۔ انہوں نے لاکھوں روپیہ ریس بازی پر تباہ کیا ہے۔ کیا اس کنیا دان کے لئے وہ کچھ نہ کریں گے"۔

"اچھا تو آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں؟"

وانچو کہنے لگا "کہئے گا کیا! کنور صاحب نے جب آپ سے وعدہ کیا ہے تو آپ کو اپنا روپیہ ملے گا"۔

سخی جسم والے دیپ چند کے روکھے چہرے پر یک بارگی زندگی کی رمق ہویدا ہو گئی۔ وہ مسکرا کر بولا "تو پھر اس کام کو اب کرا ہی دیجئے سیکرٹری صاحب! آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا"۔

وانچو جلدی سے بولا ——

"آپ خواہ مخواہ مجھ کو شرمندہ کر رہے ہیں"۔ پھر اس نے میز کی دراز سے کچھ نکالی اور دیپ چند کے سامنے اس کو ڈال کر کہنے لگا "لیجئے ذرا سیف میں سے چیک بک نکال لیجئے۔ میں آپ کے لئے ابھی چیک تیار کئے دیتا ہوں۔ اس وقت تو کنور صاحب کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ سویرے آفس پہنچنے سے پہلے ہی میں ان سے دستخط کرا کے آپ کو چیک دے دوں گا۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں"۔

اور دیپ چند جیسے واقعی مطمئن ہوگیا۔ اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اور چپ چاپ گھبرائے ہوئے انداز میں کنجی اٹھائی اور دیوار کے پاس کھڑے ہوئے آہنی سیف کے پاس پہنچ گیا۔ پھر دیپ چند نے اس کے اوپر لگے ہوئے گہرے بھورے مائل چھوٹے سے بلب کو دیکھا جو اپنی ایک آنکھ سے اس کی طرف گھور رہا تھا۔ گویا خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے تالے کو کھول کر دروازے کو باہر کی طرف کھینچ لیا۔ آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آنے لگا۔ اور وانچو گردن موڑے ہوئے محرمانہ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اور جیسے ہی دیپ چند نے آہنی سیف کے نچلے خانے کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ کر اس کو کھولنا چاہا اسی وقت وانچو نے دیوار میں لگے ہوئے سوئچ کو دبا دیا۔ دیپ چند ایکا ایکی بڑی بھیانک آواز سے چیخا۔ پھر اس کے کراہنے کی دبی دبی آوازیں گہری خاموشی میں ہانپنے لگیں۔ اور وانچو نے جھٹ سے کمرے کے اندر اندھیرا کر دیا۔ آتش دان کی گہری سُرخ روشنی میں اس کا بے ہنگم سایہ سامنے والی دیوار پر بڑا مہیب نظر آنے لگا۔ دیپ چند کے حلق کے اندر سے طبلوں کے غرّانے کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور باہر فیکٹری کے ورکشاپ میں لوہے کے ٹکرانے کی جھنکاریں دھڑک رہی تھیں۔ ہر طرف کہرا سا دھندلکا چھایا ہوا تھا اور کمرے کی آسیب زدہ تاریکی میں کھڑا ہوا وانچو بڑا پُراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور اس کے گنجے سر پر پسینہ کی نئی آگئی تھی۔ پھر وہ خواب میں چلنے والے سایوں کی طرح آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا آہنی سیف کے قریب جا کر ٹھہر گیا اور ذرا دیر تک بالکل ساکت کھڑے رہنے کے بعد اس نے دیپ چند کی طرف دیکھا جس کا ہاتھ ابھی تک ہینڈل سے الجھا ہوا تھا۔ اور وہ فرش پر خاموش پڑا ہوا تھا۔ دھندلی روشنی میں اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں بڑی ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن وانچو خونخوار نگاہوں سے کھڑا ہوا اس کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نیل کنٹھ کو آواز دی۔ اور نیل کنٹھ سہمی ہوئی آواز میں بولا ——

"کیا حکم ہے سیکرٹری صاحب؟"

وانچو کہنے لگا "جاؤ دوا نڈے میں لگے ہوئے مین سوئچ کو آف کر دو۔ اور اس کے بعد کمرے کے اندر چلے آنا۔"

باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر آہنی سیف پر جلتا ہوا سرخ رنگ کا چھوٹا سا بلب بھی کچھ گیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی دیپ چند کا ہاتھ ہینڈل پر سے چھوٹ گیا اور اس کا بے جان جسم فرش پر ایک طرف لڑھک گیا۔ پھر ذرا دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور نیل کنٹھ اندر آگیا۔ وانچو اسی سے کہنے لگا ——

"اس کو اٹھا کر باہر لان میں لے جاؤ۔ میں ابھی ذرا دیر میں آتا ہوں۔" اس کی آواز میں دبی ہوئی تھرتھراہٹ تھی۔

نیل کنٹھ نے ایک بار بھرپور نظروں سے وانچو کو دیکھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہو کہ کیا یہ مر گیا؟ پھر اس نے دیپ چند کی لاش کو اٹھا کر اپنی چوڑی چکلی پیٹھ پر لاد لیا اور کسی کبڑے کی طرح کمر کو خمیدہ کائے ہوئے منجمل منجمل کر قدم رکھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ وانچو نے دیوار پر لگے ہوئے آہنی سیف کے سوئچ کو احتیاطاً دبا کر آف کر دیا اور پھر اپنی کوٹ کی جیب میں سے ٹارچ نکال کر اس کو روشن کیا۔ اس تیز روشنی میں وہ سیف کے پاس پہنچا اور اس کی پشت پر لگے ہوئے نکسن ایبل وائر کو علیحدہ کر دیا اور دیوار پر لگے ہوئے برہنہ الیکٹرک وائر پر لڈ شیٹ چڑھا کر دونوں اسکرو اچھی طرح کس دئے۔ لیکن ابھی تک آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ اور جب وہ اس کے دروازے کو بند کرنے لگا تو یک بارگی اس کو دیپ چند کی پھٹی ہوئی آنکھیں یاد آگئیں۔ اس کا سارا جسم لرز اٹھا اور آتشدان کے اندر دہکتے ہوئے انگارے کسی جلتی ہوئی چتا کی طرح چٹخنے لگے۔ وانچو کی سانس اب تیزی سے چلنے لگی اور بدحواس سا کمرے کے باہر چلا گیا۔ کوٹھی کے اندر بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے مین سوئچ آن کر دیا اور ایک دم سے دریچوں پر روشنی کی ہلکی ہلکی لہریں جھلملانے لگیں۔ اس وقت کوٹھی کے اندر سے کنور صاحب کے کھانسنے کی آواز سنائی دی مگر اس نے ادھر کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے برآمدے کی سیڑھیوں پر سے اترتا ہوا باہر لان میں چلا گیا جہاں نیل کنٹھ کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وانچو نے سرگوشی کے سے انداز میں اس کو دھیرے سے آواز دی۔ اور وہ نوراگیری دھندلی میں کھوئے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ ان کے

قدموں کی دبی دبی آہٹ سنسان راستہ پر دور تک سنائی دیتی رہی ——!!

رات گئے جب نیل کنٹھ اپنے کوارٹر پر واپس آیا تو دھندلی روشنی میں اس نے ایک دُبلے پتلے بچے کو دیکھا جو سردی سے سکڑا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ دیپ چند اکاؤنٹنٹ کا لڑکا منّا تھا اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں بوڑھے چوکیدار کو پکار رہا تھا۔

"پربھو بابا، اے پربھو بابا" اور پھر پربھو بابا اندر سے کھانستا ہوا باہر نکلا اور اس کو دیکھتے ہی حیرت سے بولا

"ارے تم اس سمے کہاں نکل پڑے، ہائے رام کتنے زوروں کا جاڑا پڑ رہا ہے"

سردی سے سکڑا ہوا منّا کہنے لگا ——

"بابو جی ابھی تک گھر نہیں گئے۔ ماں جی گھبراتی ہیں۔ سو انہوں نے مجھ کو پوچھنے کے لئے بھیجا ہے۔ اور کہہ دیا تو رات کو نکلنا ہی نہیں"

بوڑھا چوکیدار کہنے لگا کہ "وہ کنور صاحب کی کوٹھی پہ گئے ہوں گے۔ میں ابھی جاکر ان سے کہہ دوں گا۔ چلو پہلے تم کو کوارٹر تک چھوڑ آؤں"۔ اور وہ لڑکے کو اپنے ہمراہ لے کر چل دیا۔ نیل کنٹھ اندھیرے میں کھڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر یک بارگی اس نے سنا کہ منّا ٹھہر کر کہنے لگا تھا۔

"پربھو دادا تم جاکہ بابو جی کو لے آؤ" میں کوارٹر چلا جاؤں گا۔ تم جلدی سے آجانا۔ وہ ننھی جلد ہے نا بابو جی کے بنا اس کو نیند نہیں آتی۔ خوب زور زور سے روتی ہے"

اور جیسے نیل کنٹھ کے کان کے پاس کوئی سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگا "جاؤ منّا اب تمہارے بابو جی کبھی نہیں آئیں گے۔ اور ننھی جلو روتے روتے اُن کے بغیر ہی سو جائے گی۔ وہ فیکٹری کے پاور ہاؤس کے اندر چپ چاپ پڑے ہیں۔ نہ کچھ بولتے ہیں نہ کسی کی کچھ سن سکتے ہیں۔ تمہاری آواز اب ان تک نہیں پہنچ سکتی"۔

اور نیل کنٹھ محسوس کرنے لگا کہ جیسے وہ بہت تھک گیا ہے۔ اس کا مضبوط پٹھوں والا جسم موم بتی کی طرح پگھلنے لگا ہے۔ اور اس کے چاروں طرف جیسے دبی دبی سسکیاں و ہچکی رہی ہیں۔ پھر وہ خواب کے سے عالم میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کوارٹر کے دروازے پر پہنچا اور اس کو کھٹکھٹانے لگا۔ لیکن اس شور سے وہ اچانک چونک پڑا اور اس کو یاد آگیا کہ دروازہ تو اندر سے بند ہے۔ پھر کوارٹر کی پشت پر جاکر صحن کی پچھلی دیوار کو پھاند کر وہ اندر آگیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ ڈسٹرکٹ جیل کی پتھروں والی اونچی دیوار کو پھاند کر رات کے سناٹے میں فرار ہوا تھا۔ اس کے پیچھے گشت کرنے والے پہرے داروں کی بھیانک سیٹیاں دیر تک گونجتی رہیں۔ اور پھر اپنے کمرے کے اندر لیٹا ہوا وہ بڑی رات تک نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں سوچتا رہا۔

دوسرے دن فیکٹری کے تمام ڈیپارٹمنٹ بند رہے۔ اس لئے کہ چیف اکاؤنٹنٹ دیپ چند کی اچانک موت ہوگئی تھی۔ اس کی لاش پاور ہاؤس کے اندر پائی گئی۔ اس نے الیکٹرک جنریٹر کے سوئچ "بار" کو غلطی سے چھو لیا تھا۔ اور اس حادثہ سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

اس اطلاع کے ساتھ ہی فیکٹری کے یارڈ میں یہ بھی سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ دیپ چند نے خود کشی کر لی ہے۔ اور اس کی وجہ جاننے کے لئے کتنی ہی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن سہ پہر کو پروگرام کے مطابق ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہوئی اور کنور شیو راج سنگھ کی سفارش پر دیپ چند کے بے سہارا خاندان کے لئے پانچ ہزار کی رقم گزارے کے لئے منظور کر دی گئی۔

فیکٹری کی تعمیر ایکا ایکی سست پڑتی جا رہی ہے ——!

پھاگن کی مہکتی ہوئی ہوائیں چلنے لگی ہیں اور ان تیز ہواؤں میں سرسوں کے گہرے زرد پھولوں کی ڈالیاں جھومنے لگی ہیں۔ اور کھیتوں میں جیسے سنہلی آنچل لہرا جاتے ہیں۔ کھیتوں میں رات گئے تک ڈھولک اور جھانکیں بجا کرتی ہیں اور ہولی کے راگ اونچے سروں میں گائے جاتے ہیں۔ پھر

گاؤں کے اندر بڑے بڑے الاؤ دہکنے لگیں گے اور عبیر و گلال اڑنے لگے گا۔ پھاگن کی ہوائیں چیخ پکار رہی ہیں کہ ہولی آ رہی ہے۔ ہولی آ رہی ہے۔ پھگنیوں کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں کٹنا شروع ہو جائیں گی اور دور کے شہروں میں کام کرنے والے گاؤں کے لوگ موسم سرما میں جھیلوں پر اکٹھے ہونے والے آبی پرندوں کی طرح اپنی بستیوں میں آنا شروع ہو جائیں گے۔ یونائٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی فیکٹری کے یارڈ میں مزدوروں کا شور روز بروز مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ فصلوں کی کٹائی کرنے کے لئے کمپنی کے سارے قلی دھیرے دھیرے فیکٹری کا کام چھوڑ کر بھاگنے لگے ہیں۔ کمپنی نے گھبرا کر ان کی کئی ہفتہ کی مزدوری روک لی ہے۔ اس بات سے قلیوں کے روکھے چہرے پر ہر وقت جھنجلاہٹ چھائی رہتی ہے۔ وہ تائم کیپر آفس میں اکٹھے ہو کر زور زور سے چلاتے ہیں ——

"یہ مزدوری کیوں نہیں ملتی، ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

"یہ سب کیا ہے؟ ہولی کا تہوار آ رہا ہے۔ ہم کو پیسہ چاہئے ہے۔"

"ہاں، ہم کو اپنی مزدوری چاہئے ہے۔ ہم کو اپنی مزدوری چاہئے ہے۔"

لیکن مزدوری ابھی نہیں مل سکتی، اس لئے کہ کمپنی چاہتی ہے کہ شوگر کا پلانٹ جلد ہی تعمیر ہو جائے۔ نہیں تو کمپنی کا بہت نقصان ہو جائے گا۔ مگر مزدور لوگ اس کے باوجود بھی نہیں ٹھہرتے۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہیں۔ سب کو گالیاں دیتے ہیں۔ پھر کسی روز تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر اپنی بستی کو چل دیتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ایک جنرل میٹنگ بلائی گئی اور یہ طے ہوا کہ قلی لوگوں کا ریٹ بڑھا دیا جائے۔ اس لئے کہ فیکٹری کی تعمیر میں کسی قسم کی تاخیر نہیں ہونا چاہئے۔ پھر اس کے بعد مزدوری کے ریٹ بڑھنا شروع ہو گئے ——

ایک روپیہ چھ آنے یومیہ!

ایک روپیہ دس آنے یومیہ!

ایک روپیہ چودہ آنے یومیہ!

مگر ان تین ہفتوں میں ریٹ بڑھانے کا تجربہ بھی کچھ کارگر ثابت نہ ہوا۔ بلکہ ہولی کا الاؤ دہکتے ہی مزدوروں نے اور بھی تیزی سے کام پر سے فرار ہونا شروع کر دیا۔ ہر روز تائم کیپر جب تر لے کر مینجنگ ڈائریکٹر کے آفس میں جاتا اور سہمی ہوئی سی آواز میں رپورٹ سناتا۔ مینجنگ ڈائریکٹر جھنجلا کر مزدوروں کے ساتھ سہمے ہوئے تائم کیپر کو بھی گالیاں دینے لگتا۔ پھر ایک روز اس نے وانچو کو اپنے دفتر میں بلایا اور پریشانی کے عالم میں اس کو کہنے لگا ——

"مسٹر وانچو آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ ریٹ اس طرح کب تک بڑھایا جائے گا؟"

مگر وانچو بھی کچھ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا ——

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کنور صاحب، بات یہ ہے کہ یہ ترائی کا علاقہ ہے، یہاں کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ اس دفعہ یہی سن رہا ہوں کہ فصلیں بہت اچھی رہی ہیں۔ راشن کا زمانہ ہے کسانوں کے ٹھاٹھ ہو گئے ہیں۔ اب انہیں یہ فیکٹری کی نوکری کیا اچھی لگے گی۔ اور یہ زمینداری ابالیشن کی خبروں نے تو ان کا اور بھی دماغ خراب کر دیا ہے۔"

وہ اور بھی پریشان ہو کر بولا ——

"تم نے تو بڑی کتھا سنانا شروع کر دی۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔ یہ بتاؤ کہ لیبر کا کیسے بندوبست ہو۔"

وانچو ذرا دیر تک مینجنگ ڈائریکٹر کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ بڑے اعتماد سے بولا

"میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے۔ لیکن اس میں خطرہ بھی ہے اور روپیہ بھی اچھا خاصا خرچ ہو گا۔"

مینجنگ ڈائریکٹر جلدی جلدی کہنے لگا

"ذرا اپنے کو بچا کر کام کرنا، اور روپیہ کی تم فکر نہ کرو۔ میں ڈائریکٹروں سے نپٹ لوں گا۔ اور یوں بھی کچھ کم خرچ نہیں ہو رہا ہے۔ اگر آئندہ سیزن تک فیکٹری اسٹارٹ نہ ہوئی تو یہ سمجھ لو کمپنی دیوالیہ ہو جائے گی۔"

وانچو پوچھنے لگا "آپ کے خیال میں یہ بنگالی کیمسٹ سانیال کیسا آدمی ہے، اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟"

وہ گردن ہلا کر بولا

"میں سمجھتا ہوں کہ آدمی تو وہ کام کا ہے۔ انارکسٹ پارٹی میں کئی سال تک رہ چکا ہے۔ انہی دنوں پولیس نے ایک بار گرفتار کر لیا تھا۔ بہت بُری طرح اس کو مار پیٹ کیا مگر اس نے ذرا سا بھی سُراغ نہ دیا تم اس پر اعتبار کر سکتے ہو۔"

پھر وانچو نے چپڑاسی کو آواز دی اور اس کو سانیال کے بلانے کے لئے بھیج دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بھدے چہرے والا کیمسٹ دفتر کے اندر آگیا۔ وانچو نے خاموشی کے ساتھ اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور پھر پوچھنے لگا

"مسٹر سانیال۔ نومبر کے مہینے میں آپ کمپنی کے کام سے بمبئی گئے تھے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہاں آپ نے گورنمنٹ لیبارٹری سے بھی کچھ مشورہ کیا تھا۔ وہاں کوئی آپ کا جاننے والا تو نہیں ہے؟"

بھدے چہرے والا سانیال ذرا دیر تک غور کرنے کے بعد بولا۔

"جی ہاں۔ میری وائف کے ایک رشتہ دار اس میں کام کر رہے ہیں جن کے فلیٹ میں میں دو روز تک ٹھہرا بھی تھا۔"

اور وانچو کا گھبرایا ہوا چہرہ یک بارگی جیسے چمک اُٹھا۔ وہ چٹکی بجا کر بولا "پھر تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ دیکھئے آج رات کی گاڑی سے آپ دہلی چلے جائیں اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے بمبئی پہنچ جائیے۔ آپ کو گورنمنٹ لیبارٹری کے ذریعے ایک بڑا اہم کام کرنا ہے۔"

اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے ٹیلیفون اٹھا کر دہلی کے واسطے سیٹ کی ریزرویشن کے لئے اسٹیشن ماسٹر سے گفتگو کی اور سہ پہر تک دس ہزار روپے کا ڈرافٹ بنوا کر اس کو دے دیا۔ پھر شام کے وقت مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی پر سانیال وانچو کے ساتھ بند کمرے کے اندر دیر تک رازدارانہ باتیں کرتا رہا، اور پروگرام کے مطابق شب کی ٹرین سے دہلی روانہ ہو گیا۔

پانچویں دن فیکٹری میں سانیال کا بمبئی سے ٹیلیگرام آیا، لکھا تھا

"ہارڈ ویئر کا بازار بہت خراب ہے۔ کرشنگ سلنڈر ابھی تک نہیں ملا۔"

وانچو نے تار کو کئی بار پڑھا اور اپنے دفتر میں خاموش بیٹھا ہوا اس کوڈ نیوز پر غور کرتا رہا۔

پھر کئی روز اور گزر گئے کوئی اطلاع نہ آئی اور وانچو کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس پریشانی میں اس کے رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں اور بدنما معلوم ہونے لگی تھیں۔ پھر ایک روز فیکٹری کا کیمسٹ سراسیمگی کے عالم میں اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کے بھدے نقوش گھبراہٹ سے دھندلے معلوم ہو رہے تھے۔

وانچو کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے پوچھا

"کیا خیر لائے ہو؟"

"کام تو بن گیا۔"

وانچو مسکرانے لگا "تو پھر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

سانیال دروازے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کے قریب جھک کر کہنے لگا۔

مجھے ایک شخص پر شبہ ہوا ہے کہ وہ بمبئی سے میرا پیچھا کر رہا ہے۔"

وانچو لمحہ بھر کے لئے گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا

"اچھا آپ جا کر ذرا نہا دھو کر آرام کیجئے۔ اس قدر گھبرانے کی کوئی بات نہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

سانیال ذرا دیر تک خاموش کھڑا رہا، پھر دفتر سے باہر چلا گیا، اور وانچو آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ بھدے چہرے والا کیمسٹ فیکٹری کے پھاٹک سے نکل کر اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔

وانچو چپ چاپ کھڑا ہوا اس کو دیکھتا رہا، اور جب ایک موڑ پر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ پھر اپنی میز پر آ گیا اور ٹیلیفون اٹھا کر مینجنگ ڈائریکٹر کو رنگ کیا۔ وہ کوٹھی پر موجود تھا۔ وانچو نے بنگالی کیمسٹ کے آنے کی اس کو اطلاع دی، اور خود بھی دفتر سے نکل کر کنور صاحب کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔

اور جب رات ذرا ڈھل گئی اور گہرے سناٹے میں ہواؤں کا شور تیز ہو گیا تو وانچو نے فیکٹری کی جیپ اسٹارٹ کی۔ جس کی پچھلی سیٹ پر آبنوسی جسم والا نیل کنٹھ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ فیکٹری کے احاطے سے نکل کر جیپ روشن نگر روڈ کی طرف مڑ گئی۔ تیرہ میل تک پختہ سڑک ہے، اس لئے جیپ سنسناتی ہوئی تیزی کے ساتھ گزرتی رہی۔ مگر جب ناہموار پتھریلی سڑک آ گئی تو جیپ کو جھٹکے لگنے اور وہ کھڑکھڑانے لگی۔ لیکن وانچو خاموشی سے بیٹھا ہوا اس کو ڈرائیو کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر پراسرار سکوت چھایا ہوا تھا، اور نیل کنٹھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ جھٹکوں سے اس کا سر بوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ باہر بھاگ کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ بھاگ کی ہوائیں جو ہولی کا سندیسہ لاتی ہیں، اور ہولی جو اب ختم ہو چکی ہے۔ اب تو گیہوں کی فصلیں کٹ رہی ہیں اور ہنسیا کی تیز باڑھ سے نہلاتی ہوئی گیہوں کی بالیاں گٹھریوں میں ڈھیر ہو جاتی ہیں جانے اشیر گڑھ کے خوبصورت گاؤں میں اب بھی نیل کنٹھ مہاراج کو کوئی یاد کرتا ہے جس کی کٹائی کا چوپال پر بڑا چرچا کرتا تھا۔ اور ایکا ایکی بانجھ کی نے پر جھومنے والے ناگ کی طرح وہ بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

"میں ایک کسان ہوں، ہاں میں کسان ہوں۔"

پھر کسی نے فوراً ہی اس کا گلا دبوچ لیا، نہیں تو مجرم ہے تو مجرم ہے۔ پولیس تیرا وارنٹ لئے ابھی تک تلاش کر رہی ہے۔

نیل کنٹھ نے چونک کر دیکھا۔ سامنے وانچو اطمینان سے اسٹیرنگ پر بیٹھا ہوا تھا اور جیپ پتھریلی سڑک پر ہچکولے کھا ہی تھی اور ستاروں کی مدھم روشنی میں کوہستانی چٹانیں سایوں کی طرح کوسوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر یک بارگی وانچو نے جیپ کو نیچے ڈھلوان پر گھما دیا۔ نیل کنٹھ گھبرا کر اپنی سیٹ سے چمٹ گیا۔ لیکن جیپ ڈگمگاتی ہوئی آہستہ آہستہ گنجان درختوں کے نیچے کچھ دور تک چلتی رہی اور پھر گہرے اندھیرے میں جا کر ٹھہر گئی۔ اور دونوں اتر کر نیچے آ گئے۔

وانچو نے اگلے والی سیٹ کے نیچے سے ڈائنامیٹ کے بھاری کیس کو باہر نکالا۔ یہ ڈائنامیٹ جس کو فیکٹری کا کیمسٹ بمبئی سے اپنے ہمراہ لایا تھا، جس کو گورنمنٹ لیبارٹری سے سمگل کیا گیا تھا، اور جس پر کمپنی کا نو ہزار سے زائد روپیہ خرچ ہوا تھا۔ پھر نیل کنٹھ نے اسے اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال لیا اور دونوں اندھیرے میں چلنے لگے۔ ان کے قدموں کے نیچے خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ اور درختوں سے الجھتی ہوئی کوہستانی ہوائیں ہانپتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اندھیرا بہت گہرا تھا، اور پتھریلی چٹانوں میں بہنے والی کیلانی کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ دونوں اسی طرح کئی فرلانگ تک چلتے رہے۔ پھر ایک جھکے ہوئے ٹیلے پر سے گزر کر جب وہ نشیب میں پہنچے تو پتھروں سے ٹکراتا ہوا دریا کا شور بڑا ہیبت ناک معلوم ہونے لگا تھا۔ اس وادی میں کیلانی کا بہاؤ بہت تیز ہے۔ دونوں طرف سر بلند کوہسار ہیں۔ اور جہاں پر دریا کا دھارا بہت تیز ہو گیا ہے۔ اس مقام پر سرکاری ڈیم بنا ہوا ہے۔ گورنمنٹ نے ہائیڈرو الیکٹرک پیدا کرنے کے لئے اس کو تعمیر کروایا ہے۔ اس باندھ کے پار پانی گرجتا ہوا اونچائی سے گرتا ہے اور قریب ہی میں پتھروں کی بنی ہوئی چھوٹی سی عمارت ہے۔ جس کے سامنے دو پہرے دار سنگینوں کو

سنبھالے ہوئے مستعدی سے کھڑے رہتے ہیں۔

پھر واچو کی ہدایات کے مطابق نیل کنٹھ ڈائنامیٹ کو سنبھالے ہوئے آہستہ آہستہ بکھرے ہوئے پتھروں پر چلنے لگا۔ اور پھر واچو اس کے وائر کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے پتھریلی چٹانوں کے اندھیرے میں بیٹھا رہا۔ اس کی تجسس نظریں سامنے پتھروں پر جاتے ہوئے نیل کنٹھ کا پیچھا کرتی رہیں۔ ڈیم کے پاس پہنچ کر اچانک وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اور دریائے کویلا کا تیز دھارا ڈیم کے نیچے گر جتا رہا۔ اور عجیب شور میں پھاگن کی ہوائیں جیسے سو گئی تھیں اور سر بلند کوہساروں میں ڈھکے ہوئے سلوم ہو رہے تھے۔ پھر یکایک ڈیم کے اوپر دھندلی روشنی میں ایک انسانی سایہ لہرایا اور اسی وقت پتھریلی عمارت کے نزدیک کھڑے ہوئے پہرے دار نے چیخ کر کہا۔۔۔

"ہالٹ!"

"کوئی ہے۔ ٹھہر جاؤ۔"

اور اس کے ساتھ ہی بندوق کی تیز آواز وادی کے اندر دھڑکنے لگی۔ لیکن نیل کنٹھ آہنی گاڑ سے چپٹا ہوا ڈائنامیٹ کو فٹ کرتا رہا۔ گولی اس کی کنپٹی کے پاس سے ایک بار زن سے گزر گئی۔ واچو اندھیرے میں بیٹھا ہوا سہمی ہوئی نظروں سے ڈیم کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک دفعہ پھر بندوق کی آواز کوہستانی چٹانوں میں گونجنے لگی۔ اور اس کی دھڑکن کو ہساروں کی گہرائی میں دیر تک ہانپتی رہی۔ واچو کا جسم تھر تھرا کر رہ گیا۔ پھر ایک دم سے ڈائنامیٹ کا وائر زور زور سے ہلنے لگا۔ گویا اسے اب اپنا کام شروع کر دینا چاہیئے۔ مگر نیل کنٹھ ابھی تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

کوئی ایک منٹ اس کے انتظار میں گزر گیا۔

پھر کئی منٹ بڑی بے چینی کے عالم میں گزر گئے!!

واچو نے یک بارگی جھنجھلا کر سوچا کہ وہ ڈیم کو اڑا دے۔ اس لئے کہ اب زیادہ تاخیر کرنا بہت خطرناک تھا۔ لیکن خطرے کے شدید احساس کے باوجود بھی وہ کچھ طے نہ کر سکا۔ اس لئے کہ اگر نیل کنٹھ ڈیم کی تباہی کے ساتھ وہیں مر گیا اور بعد میں اس کی لاش شناخت کر لی گئی۔ تب تو بہت خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور یہی سوچ کر وہ بڑے اذیت ناک لمحوں سے گزرتا رہا اور سامنے ڈیم کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر رات کی مدھم روشنی میں نیل کنٹھ کا کبڑا جسم نظر آیا۔ وہ پتھروں پر جھکا ہوا آہستہ آہستہ آ رہا تھا جب وہ بالکل قریب آ گیا تو واچو نے آہستہ سے صرف اس قدر پوچھا۔ "سب ٹھیک ہے؟" اور نیل کنٹھ نے اثبات میں اپنی گردن ہلا دی۔ واچو نے مزید تاخیر کئے بغیر یک بارگی ڈائنامیٹ کو "آن" کر دیا۔ اور پھر کوہستانی وادی میں بڑی ہیبت ناک گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی اور خوابوں میں ڈھکی ہوئی سر بلند پہاڑیاں لرزنے لگیں۔ سرکاری ڈیم پتھروں کی طرح بکھر کر رہ گیا اور دریائے کویلا کا دھارا بڑی تیزی کے ساتھ نشیب میں بہنے لگا۔

نیلی آنکھوں والا واچو، نیل کنٹھ کو اپنے ہمراہ لے کر درختوں کے گہرے اندھیرے میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ مگر نیل کنٹھ ہر قدم پر لڑکھڑا جاتا۔ اس کے کندھے پر سے برابر خون بہہ رہا تھا جو گولی سے بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ اور جب وہ جیپ کے پاس پہنچا تو اس کے پیر بالکل بے قابو ہو چکے تھے۔ وہ ڈگمگاتا ہوا بے جان ہو کر پچھلی سیٹ پر گر پڑا اور جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔ راستہ بھر وہ کراہتا رہا اور اس کے رقم سے خون بہتا رہا۔ جیپ ہچکولے کھاتی تیزی سے گزرتی رہی۔ اور جب وہ فیکٹری کے اندر پہنچی تو نیل کنٹھ بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کا آبنوسی جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل ہو گیا تھا، اور اسی لئے کوارٹر پر لے جانے کی بجائے اسے مینیجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی پر ٹھہرا دیا گیا۔

دریائے کویلا پر بنے ہوئے ڈیم کے اس طرح تباہ ہو جانے پر ترائی کے علاقہ میں بڑی سنسنی پھیل گئی ہے اور سرکاری حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا ہے۔ اس لئے کہ اس باندھ کی تعمیر پر گورنمنٹ کا کئی کروڑ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ تحقیقات کرنے کے لئے تمام سرکاری افسروں نے بڑی دوڑ دھوپ شروع کر دی ہے۔ ڈاک بنگلہ کی مرمت ہو رہی تھی، اس لئے فیکٹری کے "گیسٹ ہاؤس" میں مشتبہ آدمی کو حراست میں لے کر

پولیس بُری طرح "ٹارچر" کر رہی ہے۔ اور انہیں دنوں اچانک ریونیو منسٹر کا داماد زائن دلبھ فیکٹری میں آ گیا۔ وہ کمپنی کا سب سے اہم ڈائریکٹر ہے۔ رات کو میجنگ ڈائریکٹر کے پرائیویٹ کمرے میں جب وہ اس کے پاس پہنچا تو ایک دم سے اس پر برس پڑا۔

"کنور صاحب یہ آپ نے سب کیا کر کے رکھ دیا ہے۔ مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ یہ فیکٹری اب برباد ہونے والی ہے"

میجنگ ڈائریکٹر پہلے ہی سرکاری افسروں کی آمد سے بوکھلایا ہوا تھا۔ زائن دلبھ کی باتوں پر وہ اور بھی بدحواس ہو گیا۔ آہستہ سے بولا "بھئی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔ میں تو یہاں سے بڑا عاجز آ گیا ہوں"

مگر وہ کہتا ہی رہا "اب تو آپ ایسا کہیں گے ہی۔ مگر آپ کو کم سے کم یہ تو سوچنا چاہئے تھا کہ گورنمنٹ کا اینٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ اتنا احمق تو نہیں کہ اتنی بڑی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہوم سیکرٹری کے پاس جو رپورٹ پہنچی ہے اس میں فیکٹری پر بھی شبہ ظاہر کیا گیا ہے، اس لئے کہ ادھر جو لیبر کی بالکل کمی پڑ گئی تھی اور جس طرح یہ مشکل خود بخود ختم ہو گئی ہے اس بات پر کون نہیں شبہ کر سکتا ہے۔ دراصل ہوا بھی ایسا ہی ہے، اس لئے کہ اب کمپنی کو قلیوں کی تلاش میں اپنے ایجنٹ گرد و نواح کی بستیوں میں نہیں بھیجنا پڑتے۔ بلکہ اب تو فیکٹری کے بڑے پھاٹک کے سامنے آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ کمپنی کا لیبر آفیسر مرد و سویرے صرف پچاس آدمیوں کو اندر بلاتا ہے، اور وہ اس کے سامنے قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر ایک کا جسم ٹٹول کر گوشت کے مضبوط یا پٹھوں کا اندازہ لگاتا ہے۔ اور جس آدمی کو وہ فٹ سمجھتا ہے اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر کھڑیا سے سفید نشان بنا دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب اس فیکٹری میں کام مل گیا ہے اور چودہ آنے روز مزدوری ملے گی۔ اس کا نام اور پتہ ٹائم کیپر کے رجسٹر میں درج کر دیا جاتا ہے۔ پھاٹک سے باہر کھڑے ہوئے لوگ جانوروں کی طرح گردن اٹھا اٹھا کر یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور سہمے ہوئے لہجے میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں۔!!

میجنگ ڈائریکٹر اور بھی گھبرا گیا۔ وہ بڑے شکست خوردہ لہجہ میں کہنے لگا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ وانچو تو مجھے یہی کہتا رہا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"

اس طرح وانچو پر سارا الزام رکھ کر جیسے وہ کسی قدر مطمئن ہو گیا اور اس کی بات کا اثر بھی ٹھیک ہی ہوا۔ یوں بھی کمپنی کا میجنگ ڈائریکٹر ہونے کے علاوہ وہ مالی باتوں کے سلسلہ کا جاگیردار بھی تھا۔ اس لئے زائن دلبھ ایک دم سے وانچو پر گرجنے لگا۔

"وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ وانچو مجھ کو بڑا خطرناک آدمی معلوم پڑتا ہے۔ آپ اس کی سازشوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ دیکھئے اب یہی بہتر طریقہ ہے کہ وانچو کو اسی اشو پر فیکٹری سے فوراً علیحدہ کر دیا جائے۔ ورنہ جب تک وہ یہاں موجود ہے ہر وقت خطرہ سامنے ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا"

میجنگ ڈائریکٹر گہری خاموشی میں کھو گیا اس لئے کہ وہ کسی طرح یہ نہیں چاہتا تھا کہ وانچو اس کے خلاف ہو جائے۔ وہ اس کے ہر خطرناک راز کو جانتا ہے۔ اس طرح لڑکی سے برطرف ہو جانے پر اس کے برگشتہ ہو جانے کا پورا خوف تھا۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح چپ رہنے کے بعد وہ کہنے لگا۔

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس بات پر اگر وہ کمپنی کا مخالف ہو گیا تو سرکاری گواہ بن کر بہت بڑی مصیبت بن سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی اور طریقہ سے اس کو یہاں سے ابھی ہٹا دیا جائے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔" اور یہ بات زائن دلبھ ایم۔ ایل۔ اے کی سمجھ میں بھی آ گئی اور پھر دونوں کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے دیر تک کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

اور جب زائن دلبھ کمرے سے باہر چلا گیا تو کنور صاحب نے وانچو کو بلوا لیا اور ساری باتیں اس کو بتا دیں۔ پھر یہ طے ہوا کہ وہ نیپال کی راجدھانی کھٹمنڈو چلا جائے۔ یہ حد کو پار کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو گی۔ اس لئے کہ رانا ولیر جنگ جو ریاست کے ایک اہم رکن تھے وہ کنور صاحب

کی شکار گاہوں میں اکثر شکار کھیل چکے تھے۔ اور دونوں کے آپس میں اچھے مراسم تھے، اور جب تک وہ کمشنر رہے گا اس کو برابر ایک ہزار روپیہ مینجنگ ڈائرکٹر کی طرف سے ملتا رہے گا۔ پھر ایک روز فیکٹری کی کار میں بیٹھ کر وہ اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ دفتر میں کام کرنے والے صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ کمپنی کے کسی ضروری کام کے سلسلے میں کلکتہ جا رہا ہے۔ اور وائیو کار میں خاموش بیٹھا ہوا دور ہوتی ہوئی فیکٹری کی عمارت کو دیکھتا رہا، جس کی تعمیر کے لئے اس نے خطرناک سازشیں کی تھیں۔ اور وہ فیکٹری اس کی آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی، اس کی گہری نیلی آنکھیں ٹھنڈی پُر سرار معلوم ہوتی تھیں۔

سرکاری ڈیم کے تباہ ہو جانے سے گوکیلا ندی میں بڑا بھیانک طوفان آگیا ہے۔ بھیری ہوئی لہریں تباہی کے میدانی علاقوں میں شب خون مارنے والے علیم کی طرح پھیلتی جا رہی ہیں۔ گیہوں کی لہلہاتی ہوئی فصلیں پانی کے بہاؤ میں بہہ گئی ہیں۔ ساری بستیاں ویران ہوتی جا رہی ہیں اور تباہ حال کسان لمبے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ اور ریل روڈ پر مرہل انسانوں کے قافلے گزرا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ سیلاب زدگان کے لئے امیر گڑھ میں سرکار نے ریلیف کیمپ بنا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں گورنمنٹ کا جو پریس نوٹ شائع ہوا ہے اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ اس تباہی میں کمیونسٹوں کی دہشت پسندی کو دخل ہے جو اپنے سیاسی مفاد کے لئے ملک میں بے اطمینانی اور ہیجان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی لئے پولیس نے کسان سبھا کے دفتر پر چھاپہ مار کر کتنے ہی کسان ورکروں کو حراست میں لے لیا ہے۔

نیل کنٹھ کنور صاحب کی کوٹھی کے ایک مختصر سے کمرے میں لیٹا ہوا آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔ اس کے کندھے پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ اور اس کا مضبوط پٹھوں والا آبنوسی جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل ہو گیا ہے۔ خون کے زیادہ بہہ جانے سے اس پر بار بار غشی کے دورے پڑتے ہیں اور کنور صاحب نے کمپنی کی طرف سے کمشنر کے اعزاز میں اپنی خوبصورت کوٹھی پر ایک شاندار ڈنر کا انتظام کیا ہے۔ جس کا ہنگامہ رات گئے تک فیکٹری کے اندر گونجتا رہا۔

انظار حسین

اجودھیا

وہ آج بھی چلتے چلاتے روٹی کی ریڑیاں خرید لایا تھا۔ کتے کی دم اور انسان کی عادت یہ دو چیزیں تو ایسی ہیں جیسی ہو گئیں۔ بدلتی بدلائی نہیں ہیں۔ وہ لاچلا بچھا بچھو کو بینک بچھو بنک کے پتا ہے لیکن اسے تو اتنے پیسے پھر گننے کے بعد بھی عقل نہ آئی تھی۔ کسی خوانچہ والے کے پاس اُبلی ریڑیاں نظر آئیں اور وہ پھسلا۔ لیکن جب خریدکر وہ ایک ریڑی منہ میں ڈالتا تھا تو اس کی صورت اس خان کی سی بن جاتی تھی جس نے صابون کے چکر میں صابون خرید لیا تھا لیکن اگر ایمان کی پھپھو تو اس بے چارے کی بھی بڑی مشکل تھی۔ وہ نہ تو شراب پیتا تھا اور نہ سگریٹ۔ وہ تو ریڑیوں سے ہی اک گونہ بے خودی پیدا کرنے کا عادی تھا۔ مگر جس چیز میں بھی وہ چھ پیسے منہ کو لگتی ہے کہ پیچھے کا نام نہیں لیتی۔ اب یہ دیکھ کر اسے گھر چھوڑے ہوئے ایک ڈیڑھ سال تو ہو ہی گیا ہوگا لیکن وہی منہ کی ایک ٹانگ والی بات تھی۔ وہ جب انارکلی بازار سے گزرتا تھا تو بدا کر چار چھ پیسے کی ریڑیاں خرید ڈالتا تھا اور ہر مرتبہ انہیں منہ میں ڈالتے ہی اس پر وہی ایک قسم کی کیفیت گزرتی تھی۔ آج وہ خوانچہ میں سجے ہوئے رنگین چنگیا کا غذوں پر ٹوٹ ہو گیا تھا۔ ان کی تڑک بھڑک کو دیکھ کر اسے یہ امید نہ بندھی کہ ریڑیاں کچھ اچھی ہوں گی لیکن جب اس نے ایک ریڑی منہ میں ڈالی تو حسب معمول وہی تباکو میں بسا ہوا سا گڑ منہ میں گھل گیا۔ اس کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی شاید اگر خوانچہ والا اس وقت سامنے ہوتا تو وہ انہیں اس کے منہ پر دے مارتا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اس وقت تو وہ لحاف میں لپٹا لپٹایا تھا اور پھر کسی دشمنی بہانے منہ چلانا بھی ضروری تھا۔ یوں بھی وہ صابون خریدنے والے خان کے اصول کا قائل تھا بلکہ شاید اس سے چار قدم آگے ہی تھا کیونکہ پٹھان نے ایک دفعہ ہی اپنا پیسہ کھایا تھا لیکن وہ بار بار ریوڑی خریدتا تھا اور پیسہ کھاتا تھا۔ اس نے ہاتھ روکا تو نہیں۔ ہاں یہ سوچ کر اس کا خون ضرور کھولتا رہا کہ یہاں والوں کو ریڑیاں بنانی بھی نہیں آتیں۔ اس نے سوچا یار یہ تو کچھ نہ ہوا۔ ریش سے ریڑیوں کی فرمائش کرنی چاہئے۔ اس میں شرم کی بات بھی نہیں ہے۔ مٹھے تحائف کا سلسلہ چلتا ہی ہے۔ آموں کی ہی مثال لے لو۔ لوگ منہ سے کہہ کہہ کر آموں کی فصل میں آموں کے تحفے قریب و دور سے منگاتے ہیں۔ چچا غالب کی یہی عادت تھی۔ دنیا بھر سے فرمائش کرتے تھے۔ برسات میں جس کو خط لکھا آموں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور خوردنیوں کے سلسلے میں یہی پکڑ چلتا ہے۔ رامچندی ریوڑی والے کے زیادہ

گاہک تو تحفہ تحائف بھیجنے والے ہی ہوتے تھے۔ تو اگر دیش بھی اسے تھوڑی سی ریوڑیاں تحفتاً بھیج دے گا تو ایسا غضب تو نہ ہو جائے گا۔ لیکن پھر اس کی قومی غیرت نے یکایک جوش مارا۔ نہیں بھئی گولی مارو۔ دیش سے گا کہ سالا بڑا گیا تھا پاکستان۔ روٹی کپڑا الگ رہا، ریوڑی کے واسطے تک کو محتاج ہو گیا۔ ابھی دیکھا کیا ہے۔ ابھی تو معلوم پڑے گی۔ بیٹا کی طبیعت ہری ہو جائے گی اور اس خیال نے اسے جوانی پیدا کرنے کی کوشش پر مائل کر دیا ——— آخر ریوڑی بنانا ایسے کون سے کمال کی بات ہے۔ یوں کہو کہ یار لوگوں نے ہاتھ پیر ڈال رکھے تھے اور ہندو مٹھ حلوائیوں سے ساری چیزیں خرید تے تھے۔ کیا اگر وہ دال پر دھر لیں تو اچھی ریوڑیاں نہیں بنا سکتے۔ اور پھر وہاں یہی اور سب جگہ کون سی کمال کی ریوڑیاں بنتی تھیں۔ بس ایک میرٹھ ہی تو تھا۔ رہا لکھنؤ اور علی گڑھ کا معاملہ تو وہاں والوں نے خواہ مخواہ جھک مارا ہے۔ لکھنؤ تو عیاشیوں میں نفاست کی ٹانگ توڑتا ہے اور اسی میں مارا جاتا ہے۔ ہر چیز اپنی معذاب ہی اچھی ہوتی ہے۔ جیسے حسن کہتے ہیں وہ نام ہی تناسب کا ہے اور یہ علی گڑھ کے حلوائی تو خواہ مخواہ منہ چڑاتے تھے۔ ریوڑیاں تھوڑا ہی بناتے تھے کھیاں مارتے تھے۔ مختصر یہ کہ ریوڑیاں اگر کہیں بنتی تھیں تو میرٹھ میں بنتی تھیں۔ باقی سب جھک جھگڑا تھا۔

رمچندی ریوڑی والے کی دکان ——— اس کے ذہن میں ایک تصویر ابھرنے لگی ——— جاڑوں میں کیسی رونق بنتی تھی اس پر۔ شیشے کے صاف شفاف مرتبانوں میں ریوڑیاں اور مختلف قسم کی گزک دکھی رہتی تھی۔ پیتل کی دھلی منجھی تھالوں میں حلوا سوہن اور تل لبھا رکھا رہتا تھا۔ کبھی کبھی لڑاس دکان پر اتنی بھیڑ ہوتی کہ کھڑے کھڑے پاؤں دکھ جاتے اور باری نہیں آتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ بی۔ اے کا امتحان تو اس نے رمچندی کی ریوڑیوں کے بل پر ہی دیا تھا ورنہ ایک ڈیڑھ بجے رات تک کتابوں سے مغز پچی کرنا کس کے بس کا تھا۔ ایک دفعہ تو وہ کوئی بارہ بجے رات کو اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کی دکان پر جا پہنچا۔ اس کی دکان پر بالکل دن پھیل رہا تھا اور وہ ڈھائی من کی لاش رمچندی گاہکوں کے بھیڑ بھڑکے کو نبٹا کر اب ذرا اطمینان کا سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ رمچندی کی دکان کی ساری ریوڑیاں باندھ لاتا اور پاکستان کی ہر ریوڑی کی دکان کو رمچندی ریوڑی والے کی دکان بنا دیتا۔ لیکن اسے بھلا کون ایسا کرنے دیتا اور پھر اس وقت اتنی فرصت اسے تھی ہی کہاں۔ ورنہ چلتے ہوئے کیا جیسے اس نے گیارہ آنے کے سنترے اور سات آنے کے کیلے خریدے تھے، بارہ چودہ آنے کی وہ ریوڑیاں نہ خرید سکتا تھا۔ شاید اسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ہندوستان سے پاکستان آنے کے معنے کیا ہوتے ہیں، اس نے معنے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ وہ تو بس دھرا سا اٹھ کھڑا ہوا تھا اپنے ایک بستر سے اور صندوق کے ساتھ اسٹیشن پر دھرا تھا۔ اسٹیشن ——— اس کی آنکھوں میں پھر وہی سارا نقشہ بھر گیا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نقشہ کو وہ اس نقشہ سے کیسے الگ رکھے جو اس نے بچپن میں مذہبی کتابوں میں حشر محشر کے متعلق پڑھ رکھا تھا۔ یہ وہی اسٹیشن تھا جہاں عام طور پر سناٹا سا چھایا رہتا تھا۔ بھلا کنٹونمنٹ اسٹیشن کا کون رخ کرتا تھا۔ کوئی مارا پڑا سا مسافر پہنچ گیا تو پہنچ گیا۔ ورنہ وہاں تو ہمیشہ خاک ہی اڑی لیکن اس روز وہاں آدمی ہی پٹا پڑا تھا۔ ایسے ایسے وضعدار آدمی بھی وہاں نظر آتے تھے جن کا تصور ان کی ڈیوڑھی یا گلی کو نظر انداز کر کے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ آج اپنی ڈیوڑھیوں اور گلیوں سے رستہ تڑا کر نکل بھاگے تھے اور ایسے لگتے تھے جیسے کوئی شرعی قسم کا آدمی بڑھاپے میں بھانگ ایک دن اپنی داڑھی منڈا ڈالے۔ ہر طرف سامان کے اٹنگ کے اٹنگ لگے ہوئے تھے اور اسٹیشن کے گیٹ اور ٹکٹ گھر پر کیفیت یہ تھی کہ آدمی پہ آدمی گرتا تھا ایک دفعہ تو کوتوال کو بھی غصہ آ ہی گیا اور اس نے ٹکٹ گھر پر کھڑے ہو کر ہنٹر برسا دیا۔۔۔۔۔۔ ایک کھدر پوش داڑھی والے صاحب نے مجمع لگا رکھا تھا اور فرما رہے تھے "مسلمانوں کا یہ پرامتحشر مسلم لیگ نے کرایا۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں یہ لوگ جنت سمجھ کر جا رہے ہیں وہ جہنم ہے" ——— "اور جسے جہنم سمجھ کر چھوڑ رہے ہیں وہ جنت ہے" کسی صاحب نے پیچھے سے فقرہ کسا اور توفیق نے اسے یکایک پیچھے سے آ کر جھنجھوڑا تھا کہ "ابے مسخرے باتیں بنا رہا ہے ذرا سامان پہ لگ" اور وہ ہڑبڑا کر ——— مگر خیالات کی زنجیر الجھ کر ٹوٹ گئی اور اسے یاد آیا کہ وہ ریوڑیاں کھانا تو بھول ہی گیا ہے۔

اس نے جیب میں سے چھ سات ریوڑیاں ایک ساتھ نکال لیں اور چبانے لگا۔ ریوڑی کا گڑ بار بار دانتوں کے درمیان چپک کر رہ جاتا۔ وہ سوچنے لگا

عجب قسم قسم کی ریوڑیاں ہیں۔ یہ سالے ریگل کے سامنے والے خوانچہ والے تو آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔ انارکلی میں کم از کم اس سے بہتر ریوڑیاں ہوتی ہیں ——— یہ انارکلی بھی خوب بازار ہے ——— بچھڑے ہوؤں کے ملنے کی جگہ ——— ایک زمانہ میں تو اچھا خاصا جماعتوں کے ملنے کا اڈا بن گئی تھی۔ رشید صاحب اسے ایک روز نہیں تو ملے تھے۔ دیکھتے ہی لپٹ گئے تھے "ارے بھئی کب آئے۔ میں کہتا ہوں تم نے بہت اچھا کیا کہ چلے آئے۔ اجی یہاں کچھ نہ سہی مگر میں کہتا ہوں صاحب کہ ایمان تو محفوظ رہے گا ———" اس کی بیشانی پر پسینہ آگیا تھا۔ شاید رشید صاحب طنز کر رہے تھے۔ لیکن اس نے ذرا کا چہرہ بڑے غور سے دیکھا تھا۔ ان کے تیور دن سے تو بڑا خلوص ٹپک رہا تھا۔ تاہم اگر یہ طنز نہیں تھا تو کیا تھا۔ وہ تو اپنا ایمان بچا لایا مگر ——— اچانک ایک کتابی قنوطیت کی روائی اور اسے بہا کر ایک اور ہی طرف لے گئی ——— یہ ایمان کیا ہوتا ہے کچھ بھی نہیں محض ایک واہمہ ہے۔ بے ایمانی بھی تو ایک طرح سے ایمان ہی ہوتی ہے۔ نہ ٹوٹنے والا کفر سب سے زیادہ پختہ ایمان ہوتا ہے اور پھر ایمان کو ہجرت سے کیا ناطہ ہے یہ ہجرت کا لفظ اس کے حلق سے اتر نہ سکا پھر وہ کرن ہے ——— مہاجر، مغفور، بھگوڑا، پناہ گزین ہے اسے ہلکا پھلکا سیدھا سچا لفظ بھگوڑا بہت پسند آیا ویسے بھی وہ ٹھیٹھ اردو لفظ تھا لیکن ان مترادفات میں بھٹکتے بھٹکتے اس کا ذہن ایک اور لفظ کی طرف جا پھسلا ——— بن باس! اس لفظ میں اسے بڑی مٹھاس معلوم ہوئی تو وہ بن باسی ہے۔ اپنے وقت کا راجہ رامچندر ——— وہ پھر اپنے فعل کو آدرشی جامہ پہنا رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ جرمن اپنے وطن کو باپ تصور کرتے ہیں لیکن اس نے ان کی تقلید کرنا مناسب نہ سمجھی۔ ماں بھی تو آخر بن باس دے سکتی ہے۔ راجہ دسرتھ نے سوتیلی ماں کے کہنے سے راجہ رام چندر جی کو بن باس دے دیا۔ اس کی ماں نے اسے اس کے سوتیلے بھائی کے بہکانے میں آکر بن باس دے دیا۔ یہ بھائی کا رشتہ بھی خوب ہے۔ اس نے ہمیشہ فساد پیدا کیا۔ اسے برادران یوسف کا قصہ یاد آیا اور پھر وہ سوچنے لگا کہ یہ سارا فساد ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے کا پیدا کیا ہوا ہے۔ آج کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ بھائی نے بھائی کا ہمیشہ یہی حشر کیا ہابیل قابیل کے وقت سے یہی ہوتا چلا آیا ہے لیکن رام چندر جی کے بھی تو بھائی تھے ——— اور یہاں آکر اس کا ذہن دوسرے رستہ پر پڑ گیا۔ رام لیلا کے بہت سے مناظر اس کی نگاہوں میں پھر گئے۔ اجودھیا رام چندر جی کے جانے کے بعد کیسا ویران ہو گیا تھا۔ ساری رونق تو راجہ رام چندر کے ساتھ تھی۔ راجہ دسرتھ خود انہی کو دیکھ دیکھ کے جیتے تھے۔ رام چندر جی بن کو سدھارے۔ راجہ دسرتھ دنیا سے چل بسے۔ وہ تو من کا سانپ تھے من پہ نا مانہ ڈھک دو سانپ اندھا ہو جائے گا اور مانند سے ٹکریں مار مار کے مر جائے گا۔ دسرتھ جی اکیلے ڈھنڈورچی ٹکریں مار مار کے مر گئے۔ اس کے اجودھیا میں بھی اب خاک اڑتی ہو گی اور من کا سانپ نانند سے ٹکرا ٹکرا کے دم توڑ چکا ہو گا۔ من بھی کیا چیز ہوتا ہے جب رات کو من کا سانپ نکلتا ہے تو سارے جنگل میں اجالا ہو جاتا ہے۔ من اگر کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو اس کے تو بس وارے کے نیارے ہیں۔ وہ سالا منتی سنار گپ ہانکا کرتا تھا کہ اسے من مل گیا تھا۔ لیکن ایک چٹا اسے چوٹ دے گیا۔ وہ بھی بے بہکی اڑاتا تھا۔ ویسے ایک بات ہے۔ آدمی خوب تھا۔ اس کی دکان پہ ہر وقت چوکڑی جمی رہتی تھی اور وہ آلھا اودل کا بھی موقعہ رکھتا تھا۔ دوپہر ہوئی اور وہ بھنگ چارپائی دوکان کے نیچے نالی کے قریب بچھ گئی۔ گھنٹوں گذر جاتے تھے اور آلھا اودل گھستی رہتی تھی۔ اس کے دل میں اک گدگدی سی اٹھی کہ وہ آلھا اودل کے شعر گنگنائے۔ وہ شعر یاد کرنے لگا لیکن اس کے حافظہ کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ کسی مصرعہ کا کوئی ٹکڑا یاد آتا تھا اور اٹک کے رہ جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے ایک مصرع یاد آیا ؎

آلھا اودل بڑے لڑیا!

اس نے بہت زور مارا لیکن دوسرا مصرع اسے یاد ہی نہیں آیا۔ اسے پسینہ آگیا۔ وہ یادوں کے سہارے جیون بتانا چاہتا تھا اور یادیں دھندلی پڑتی جا رہی تھیں، ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ اسے محسوس ہوا گویا اس کے پیروں تلے کی زمین کھسکتی جا رہی ہے اور اب تھوڑی دیر میں وہ خلا میں گر پڑے گا۔ وہ

بہت دیر تک چپکا پڑا رہا۔ اس چپکے پن میں ایک مبہم خوف کی بھی جھلک تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا ذہن پھر اپنے کام سے لگ گیا۔ اسے خیال آیا کہ آلھا اودل کے پڑھے جانے کا زمانہ برسات کا ہوا کرتا تھا اور برسات کے خیال کے ساتھ ساتھ اس کے کانوں میں ایک سُریلی آواز گونجنے لگی ——— باغ میں پپیہا بولا، میں جانوں میرا بھیا بولا۔ پپیہا کو وہ ہمیشہ پپیا کہتی تھی اور خود بھی وہ کچھ پپیا سی ہی تھی جب دیکھو پٹ پٹ کرتی رہتی تھی۔ اس روز جب وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ پپیا بجانے میں مصروف تھی تو اس نے پیچھے سے آ کے چپت جما دی تھی "کیوں ری تو نے میرا پپیا کیوں توڑا ہے؟" ..... وہ آم کی گٹھلیاں کتنی محنت اور خلوص سے جمع کرتا تھا۔ ان پر راکھ ڈالتا تھا۔ انہیں روز پانی دیتا تھا۔ پھر ان میں سُرخ زرد کپڑے پہناتے تھے۔ پھر ہلکے عنابی پتوں کی ایک شاداب بھتری سی بن جاتی تھی۔ کس کی مجال تھی کہ اس کے پپیوں کو ہاتھ لگا جائے لیکن وہ خبیس بھی نہیں تھا۔ ترنگ میں جب وہ آجاتا تھا تو ایک چھوٹی کوٹھی پیسے وہ لڑکوں کو بخش ڈالتا تھا۔ جب بادل گھر گھر کر آ رہے ہوتے تھے اور ننھی ننھی بوندیاں پڑنے لگتی تھیں تو پیسے کی پیں پیں کبھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ برسات بھی خوب موسم ہوتا ہے۔ چیزوں کا رنگ روپ ہی بدل جاتا ہے۔ پھر روز سر پر ایک تیوہار رکھڑا رہتا ہے۔ آج چھڑیوں کا میلہ ہے کل رکھشا بندھن ہے۔ پرسوں جنم اشٹمی ہے اور ہر تیوہار پہ بارش ہونی ضروری۔ جنم اشٹمی پر اگر مینہ نہ برسا کرتا تو کنہیا جی کے پرتڑے کیسے دھلا کرتے۔ اور رکھشا بندھن پر مینہ پڑے اور پھر پڑے۔ خواہ ایک بوند ہی پڑے۔ رکھشا بندھن کے ساتھ ساتھ اسے پھر رمیش کا خیال آگیا۔ رکھشا بندھن پر وہ رمیش کو ضرور ڈیڑھ دو روپے سے کھڑا دیا کرتا تھا۔ رمیش ذات کا برہمن تھا لیکن دل کا بنیا تھا۔ اس لئے بات اٹھنی سے شروع کرتا تھا لیکن جب وہ ایک دفعہ حلوائی کی دکان پر آجاتا تھا تو پھر وہ رمیش کو ایسے اڑنگے پہ لاکے مارتا تھا کہ ڈیڑھ دو روپے پہ بھی مشکل سے ہی چھوڑتا تھا۔ جب وہ اس کے گھر پہنچتا تھا تو بلا اس کی کلائی میں راکھی باندھ دیا کرتی تھی۔ ویسے راکھی ہوتی ہی کیا ہے۔ چند ریشمی دھاگے اور سنہری پنیاں۔ لیکن جب وہ کلائی پر بندھ جاتی ہے تو پھر دیکھو آدمی کیسے کیا بن جاتا ہے۔ اس نے اس رکھشا بندھن والے دن کا تصور کیا۔ جب وہ گاڑی سے اتر کر سیدھا رمیش کے گھر پہنچا تھا۔ بلا نے اس کے راکھی باندھی تھی۔ پھر وہ اور رمیش شام تک سجے ہوئے بازاروں اور گلیوں کے چکر کاٹتے رہے اور مختلف دکانوں پر رک رک کے مٹھائی بھی اڑائی تھی لیکن وہ اس دن کا کوئی چمکتا ہوا تصور قائم نہ کر سکا۔ اسے وہ دن خواب آلود دھندلکوں میں لپٹا ہوا سا دکھائی دیا۔ اسے ایسا محسوس ہو گویا وہ کوئی شیریں خواب ہے جسے وہ ہزار کوشش کے باوجود بھولا چلا جا رہا ہے یا پچھلے جنم کے کسی واقعہ کا ایک خیال ہے جس کی خوشبو اڑتی جا رہی ہے۔ اس کی زندگی کا سہارا لے دے کے چند ایک یادیں رہ گئی تھیں اور یہ یادیں چپ چاپ ایک ایک کر کے کھسکتی جا رہی تھیں۔ شاید اسے واضح طور پہ یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ میرٹھ کی ریوڑیوں کا مزا کیسا ہوتا ہے۔ بس ایک خیال سا تھا۔ اس خیال کے بل پر وہ اظہار خیال کرتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ خود اس کے قصبے کے حلوائی تو علی گڑھ اسکول کے حلقۂ اثر میں تھے۔ وہی علی گڑھ کی طرز کی چھوٹی چھوٹی گول گول بھربھری ریوڑیاں بناتے تھے۔ لیکن وہ خود میرٹھ کی ریوڑیوں کا رسیا تھا اور اس اسکول کے سب سے بڑے نمائندے رمچندی کی ریوڑیوں پہ جان دیتا تھا۔ ان ریوڑیوں سے رمیش کی نہ معلوم کتنی یادیں وابستہ تھیں ——— وہ، رمیش، ریوڑیاں ——— لیکن اب یہ تکیٹ بکھر گئی تھی۔ اس سے رمیش اور ریوڑیاں دونوں چھٹ گئے تھے۔ رمیش کے پاس ریوڑیاں رہ گئی تھیں اور وہ الگ ہو گیا تھا۔ اب وہ ریوڑیاں نہیں کھاتا اپنا پیسہ کھاتا ہے۔ رمیش اب ریوڑیاں کھٹتا نہیں ہو گا، زہر مار کرتا ہو گا۔ رمیش کے ساتھ مل کر وہ بھی کبھی عجیب عجیب حرکتیں کر ڈالتا تھا۔ ویسے تو ہمیشہ اس کی رائی صورت بنی رہتی تھی۔ لیکن جب رمیش ایک دن کی چھٹی لے کر دلی سے آجاتا تھا تو وہ بالکل کینچلی بدل لیتا تھا۔ اس کے ساتھ تو وہ اس روز ریوڑیاں کھلتا ہوا تاتا محلہ میں سے گذرا تھا۔ ایک لڑکی کوٹھے میں کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک ریوڑی

اسے دیکھا کر گپ سے منہ میں ڈال لی تھی ——— اس کے سٹ پٹا کر بھاگ جانے کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی اور وہ بے ساختہ ٹھٹھا مار کے ہنس پڑا۔ پھر یہ ہنسی رفتہ رفتہ ایک اداسی کی کیفیت میں بدل گئی۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی ——— وہ سوچنے لگا ——— اب وہ دن کاہے کو لوٹ کر آئیں گے۔ یہ زمانہ بھی عجیب بے ہنگم قسم کی چیز ہے۔ اس کا سر پیر تو ہے ہی نہیں۔ اسے تو بس بے پیندی کا لوٹا سمجھو۔ کسی طرف بھی لڑھک جاتا ہے اور ساتھ میں ساری چیزوں کو بھی لڑھکاتے جاتا ہے۔ گزری ہوئی باتیں خواب و خیال بن کر رہ جاتی ہیں۔

رمیش کی باتیں سوچتے سوچتے اسے محسوس ہوا کہ گویا وہ کسی بادشاہ کی بھولی بسری کہانی ہے جو اس نے بچپن میں نانی اماں سے سُنی تھی اور جسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی زمانہ میں ایک بادشاہ تھا۔ اس بادشاہ کے دو شہزادے تھے۔ ایک دفعہ وہ شکار کو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہرن چوکڑیاں بھرتا ہوا جا رہا ہے۔ بڑے شہزادے نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ دوسرا شہزادہ بھی پیچھے چلا لیکن وہ کسی اور راستہ پر نکل گیا۔ وہ دونوں راستہ بھول گئے اور ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے ..... یہاں آ کر اس کے حافظہ نے دم دے دیا۔ اسے اتنا تو یاد تھا کہ بہت سی مصیبتوں کے بعد وہ بالآخر کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں اور اندھے راجہ کی آنکھوں میں نور آ جاتا ہے لیکن کب ملے، کیسے ملے یہ اسے بالکل یاد نہیں آیا۔ اسے کہانی کا آغاز یاد تھا انجام وہ بھول گیا تھا۔ انجام یاد رکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے ——— وہ سوچنے لگا ——— آج کل کہانیوں کا انجام بھی نرالا ہوتا ہے۔ اب شہزادے بچھڑ جاتے ہیں ملتے نہیں ہیں۔ پہلے بادشاہ روتے۔ روتے اندھے ہو جایا کرتے تھے اور پھر ان کے کھوئے ہوئے لال مل جایا کرتے تھے اور ان کی آنکھوں میں نور آ جایا کرتا تھا۔ اب شہزادے گھر سے نکل جاتے ہیں اور بادشاہ روتے روتے اندھے ہو جاتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں اور شہزادے نہیں پلٹتے اور محل کھنڈر بن جاتے ہیں اور کھنڈروں میں جن بھوت رہنے لگتے ہیں ——— اور پھر رام چندر جی کی کہانی یاد آ گئی۔ اس کا ذہن عجیب اینڈی بینڈی پگڈنڈیوں پر بھٹکنے لگا۔ اسے ایسے لگا گویا اجودھیا پر ویران ہو گیا ہے۔ رام چندر جی بن کو نکل گئے ہیں اور راجہ سمرتھ اس غم میں دنیا سے سدھار گئے ہیں اور سارے اجودھیا میں اندھیرا پڑا ہے۔ لیکن ——— اس کے خیال نے پٹڑی بدلی ——— اجودھیا کے باسی چودہ برس بعد پھر سے تھے اور اب ..... اس کا تصور دھندلا گیا۔ گویا ایک لاری تیزی سے اس کے پاس سے گذر گئی اور وہ گرد میں اس بُری طرح اَٹ گیا کہ سارے ایک مٹیالے بن کے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس کا ہاتھ پھر ریوڑیوں کی طرف بڑھنا چاہتا تھا لیکن جنبش نہ کر سکا۔ اس کا ہاتھ ایک جگہ رکھے رکھے سو گیا تھا۔ اس نے ایک تھوڑی سی کوشش سے اسے جنبش دی اور ایک میٹھی میٹھی گدگدی پیدا کر دینے والی سرسراہٹ اس کی رگوں نسوں میں تیرنے لگی۔ سوچتے سوچتے وہ کچھ تھک سا گیا تھا۔ اس نے ٹانگوں کو سیدھا کر کے اکڑا لیا اور پھر کروٹ لیتے ہوئے ایک ہمی سی جمائی لی۔ اس کی زندگی میں ——— اس نے سوچا ——— اب رہ ہی کیا گیا ہے ——— یادیں اور جمائیاں۔ یادیں دھندلی پڑتی جا رہی ہیں اور جمائیاں طویل ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے دل میں وہ جو ایک بوند امرت کی نظر آتی تھی وہ سکڑ رہی تھی، معدوم ہو رہی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کا مستقبل ایک طویل بے کیف جمائی ہے۔ اس احساس سے سہم کر اس نے پھر ایک بار اپنے حافظہ کو جھنجھوڑا۔ کئی تصویریں ایک ساتھ ابھریں اور آپس میں متصادم ہو کر گڈمڈ ہو گئیں۔ اس نے کسی شام کا تصور کرنا چاہا جو اس نے رمیش کے ساتھ گذاری ہو۔ لیکن یہ شامیں ایک تو تھیں بہت کثیر تعداد میں اور پھر پتنگ کے مانجھے کو سلجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ تو بے طرح اُلجھا ہوا تھا اور تار و خود رمیش کے چہرے کے خطوط اب اس کے تصور میں ایسے بہت واضح نہیں رہے تھے۔ اسے یہ وسوسہ ستانے لگا کہ رمیش اب اس سے چپ چاپ دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پہلے وہ کتنی جلدی جلدی خط لکھتا تھا اور بعض دفعہ تو وہ خطوں کی ریل گاڑی چھوڑ دیتا

تھا۔ لیکن اب تو اس کے پاس کوئی ڈیڑھ دو مہینہ سے اس کا خط نہیں آیا تھا۔ شروع میں وہ اپنے خطوں میں اس پر کس بُری طرح برستا تھا لیکن اب تو اس کا لہجہ بہت دھیما پڑ گیا تھا۔ یہ دھیما پن کسی دوری کی علامت تو نہیں ہے ——— اس کے دل میں ایک سوال دھیرے سے اُبھرا اور مبہم سی تکلیف پیدا کر کے ڈوب گیا۔ اسے رمیش کا وہ پاکستان آنے پر پہلا خط یاد آ گیا جس میں اس نے اسے بڑی جلی کٹی سنائی تھیں۔ اسے بھی خاصا ہوش آ گیا تھا اور تیر کا جواب تلوار سے دینے کی نیت سے اس نے قلم اٹھا کر بے تکان لکھنا شروع کر دیا تھا۔

"تم پوچھتے ہو کہ یہ تیرا دامن سیاست میں کیسے سن گیا۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے کہ کسی شہر میں زوروں کا طاعون پھیل جائے اور کوئی شخص طاعون کے کسی مریض کے پاس پہنچے اور کہے کہ یہاں تم تو اپنی تندرستی کی بڑی بڑائیاں کیا کرتے تھے۔ یہ تمہارے گلٹی کیسے نکل آئی۔ رہا تمہارا یہ پی چھوڑ دینے کا طعنہ تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ یو۔پی کہاں ہے، کدھر ہے؟ اسے تو میں مٹی دے کر آیا ہوں ..... " اور یہاں آ کے اس کا قلم رُک گیا تھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس قسم کے طعن آمیز فقرے وہ اور نہیں لکھ سکتا تھا۔ مانگ تانگ کر وہ ایک وقت کی ہنڈیا کا تو انتظام کر ہی سکتا تھا۔ لیکن وہ کسی بات پر جم کب سکتا تھا وہ تو ذرا ٹھالی کا بینگن تھا۔ لیکن وہ جواز پیش کرنے میں تو بہت مرد تھا ——— آدمی ہے ہی ٹھالی کا بینگن۔ ہوگی زمین گول، ویسے وہ دکھائی تو ٹھالی کی طرح چپٹی ہی پڑتی ہے۔ کوئی ایک بات پکڑ لینا اور اسے عقیدہ بنا لینا تو ذہنی جمود کی نشانی ہے۔ یہ تو گیا زمین کی گردش سے کنسٹم کشتا کرنا ہے لیکن ——— ایک مخالف لہر اُبھری ——— یہ بات بھی تو ایک عقیدہ ہی ہوئی۔ اس کا ذہن مناظرہ کا میدان بنتا جا رہا تھا۔ لیکن وہ رسہ تڑا کر بھاگ چھٹا۔ اس نے ہٹ دھرمی کے انداز میں سوچا کہ مار دو گولی۔ جو لوگ لٹھے کر کھڑا کیا کھڑا ہے قسم کی چیز بننا چاہتے ہیں شیئ سے بنیں۔ مٹھ چھوڑ متقطب مینار نہیں اس کی بلا سے۔ وہ تو ٹھالی کا بینگن ہے۔ عقیدہ والوں کو عقیدہ کی دم مبارک۔ وہ تو لنڈورا ہی بھلا ہے اور اس بحث سے چھٹکارا پا کے اس نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ آخر بات کہاں سے چلی تھی اور یہ ٹھالی کا بینگن بیچ میں کیسے لڑھک آیا۔ سوچتے سوچتے اسے یاد آیا کہ بات کچھ رمیش کے متعلق تھی۔ لیکن رمیش کا ٹھالی کے بینگن سے کیا واسطہ۔ یہ تو وہ بات ہوئی کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ کوئی تُک بھی ہے۔ رمیش، ٹھالی کا بینگن ——— آخر کیا ربط ہے ان دونوں باتوں میں ..... اسے یکایک خیال آیا کہ وہ جو خود ٹھالی کا بینگن ہے اس لئے رمیش کا ٹھالی کے بینگن سے تعلق ہوا ——— اور اب اسے یاد آیا کہ وہ درحقیقت اسی تعلق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رمیش سے اس کا کیا تعلق رہ گیا ہے۔ رمیش اب مہینوں خط کے پُرزے سے بھی یاد نہیں کرتا، اور خود اسے اب رمیش کی صورت بھی شاید اچھی طرح یاد نہیں رہی ہے۔ غلط ——— اس نے فٹونی لگایا ——— اور کوئی ہوتا تو ——— خیر مان بھی لیا جاتا لیکن رمیش کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ آخر کون سی بات ہے جو اسے یاد نہیں ہے اور اپنی بات کی جگہ میں وہ ایک دفعہ پھر اپنے حافظہ سے کنسٹم کشتا کرنے لگا۔ دھند میں لپٹی ہوئی کئی تصویریں اس کی نگاہوں کے سامنے آئیں اور گم ہو گئیں۔ اس کی کیفیت تو کچھ ایسی ہو رہی تھی گویا کوئی بل میں اُدھ گھسے سانپ کی دم پکڑے اور وہ دم پھسل کر سڑاک سے غائب ہو جائے۔ اس پر پھر افسردگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

آخر یادوں کا کیا اعتبار وقت پڑنے پر تو ایسی سوکھتی ہیں کہ دور دور تک ان کی صورت نظر نہیں آتی۔ یادیں تو چاردن کی چاندنی ہوتی ہیں پھر اندھیرا پکھ ہو جاتی ہیں۔ آدمی کا پھر اپنی روح کی اس بھائیں بھائیں کرتی ہوئی اندھیری رات سے پالا پڑتا ہے۔ رام چندر جی بن کو سدھارتے ہیں اور ادھیا میں ماتم برپا ہو جاتا ہے۔ آدمی کی روح تو اجودھیا ہوتی ہے۔ اس کی رونق تو دوسرے کے ہاتھ ہے اور یہ دوسرے وفا نہیں کرتے ——— اجودھیا کی تقریب سے اسے رام لیلا کے دن یاد آ گئے۔ اس کا ذہن اس دسہرے کی طرف منتقل ہو گیا جو اس نے آخری بار رمیش کے ساتھ گذارا تھا۔ وہ دسہرہ بھی ——— اس کے ذہن میں پوری تصویر اُبھر آئی تھی ——— عجب رنگ کا آیا تھا اس کا طور بے طور۔ ساری فضا میں ایک وحشت ایک ڈراؤنے پن کی

کیفیت بسی ہوتی تھی دیسے آدمی اس مرتبہ بھی کچھ کم نہ تھے۔ بازار سے نے کر میلہ تک تانگوں، بگھیوں اور چھڑوں کی لین ڈوری لگی ہوئی تھی لیکن پھر بھی کھچیوں کے اس اونچے رجحان میں گھستے ہوئے اس نے واضح طور پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ وہ پچھلے سال والا میلہ نہیں ہے اس میں سے کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ میلہ کا ایک چکر کاٹنے کے بعد اسے اس بات کا بھی پتہ چل گیا تھا کہ پورے میلے میں وہ اکیلا اس کھوئی ہوئی چیز کی نمائندگی کر رہا ہے۔ چکر کاٹتے کاٹتے دیش بکا یک چونک پڑا تھا۔ "کشن کہاں گیا؟" اور پھر وہ اسے تماشیانہ کے نیچے کھڑا کے ڈھونڈھتا ڈھونڈھتا معلوم کر ہر نکل گیا تھا۔ وہ وہاں کافی دیر تک کھڑا رہا تھا۔ دور کھچیوں کے فین دیوتا مست ڈھانچے کھڑے تھے۔ گردن تک کالے سیاہ کانوں میں بڑے بڑے پنی میں منڈھے ہوئے بال۔ کالی لمبی لمبی مونچھیں، ایک ہاتھ میں تلوار دوسرے میں ڈھال۔ یہ وہی رسمی قسم کے ڈھانچے تھے جنہیں وہ بچپن سے دیکھتا چلا آیا تھا اور جنہیں دیکھ کر اس کا تخیل ماضی کی پراسرار خواب میں ڈوبی ہوئی پگڈنڈیوں پر بہک نکلتا تھا لیکن آج خوف کی ایک مبہم سنسنی لہر اس کے دل میں سرسراہٹ لیتی تھی بھیڑ اتنی تھی کہ کئی چکر کاٹنے کے باوجود انہیں وہ زرد پوش زرد رو زندہ مشعلیں نظر نہ آئیں جو ان بھیانک ڈھانچوں سے پیدا ہونے والے تاثر کو اپنی حدوں سے آگے نہیں بڑھنے دیتیں اور یہاں کھڑے کھڑے جب اسے کشن کے کھو جانے کا خیال آیا تو وہ سوچنے لگا کہ اگر یہ بھیڑ اسے بھی نگل جائے تو... اور اتنے میں رمنی آ گیا تھا۔ چل لمبی کشن تو ملا نہیں ——— وہ خاموش سر نیوڑھائے گھر پہنچے تھے لیکن گھر پہ کشن موجود تھا اور اپنے تاؤ کی گود میں بیٹھا پوچھ رہا تھا "تاؤ جی راجہ نے شہاوے کی آنکھوں سے رومال چھوایا تو اس میں کیا تھا جو راجہ کو دیکھنے لگا؟" اور اب وہ غور سوچ رہا تھا کہ اس رومال میں کیا تھا۔ یہ سوال اس کے خیالات کی زنجیر میں کچھ اس طریقہ سے اٹکا کہ وہ زنجیر ہی ٹوٹ گئی وہ سوچتے سوچتے اب تقریباً با ——— سو گیا تھا۔ اس کا ہاتھ سر کے نیچے رکھے رکھے پھر سو گیا تھا اور جب اس نے ہاتھ کو جنبش دی تو پھر وہی سنسنی لہریں اس کی رگوں نسوں میں تیرنے لگیں۔ اس کا دماغ خالی ہو گیا تھا۔ شاید سوچنے کے لئے فی الحال اس کے پاس کچھ باقی نہ رہا تھا۔ لیکن ایک خیال دھندلکی پرچھائیں کی طرح اب بھی اس کے ذہن پر منڈلائے جا رہا تھا۔ گویا رام چندر جی بن کو چلے گئے ہیں، اجودھیا میں اندھیرا پڑا ہے اور راجہ دسرتھ اس غم میں دنیا سے سدھار گئے ہیں۔

پرکاش پنڈت

سمجھوتہ

وہ چھت سے نیچے اتر آئی اور چوبارے میں بچھے ہوئے پلنگ پر آ لیٹی لیکن خیالات کا وہ لامتناہی طوفان بدستور اس کے ذہن میں مدوجزر بپا رہا۔ رفتہ رفتہ وہی مہمل سے خیالات نئے سرے سے اس کے ذہن میں اجاگر ہونے لگے کہ جن کی وجہ سے وہ تمام رات ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سو سکی تھی۔ رت جگے کے سبب اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور چہرے پر خاص قسم کی تھکن کے آثار ابھر آئے تھے۔

وہ اس قسم کی ذہنی الجھنوں اور بے قراریوں سے بخوبی واقف تھی۔ ایک مدت ہی سے تو اس کا دل اس قسم کی سوچ بچار میں پنپ رہا تھا۔ وہ بے ہنگم غیر واضح سے خیالات تو جیسے اس کی زندگی کا ایک اہم ترین جزو بن کر رہ گئے تھے لیکن آج نہ جانے کیوں اسے کچھ یہ محسوس ہو رہا تھا گویا زندگی میں پہلی بار اس کے احساسات درد کی تہوں میں الجھ رہے ہوں اور جیسے پہلی ہی مرتبہ اس کا دل اس قسم کے دکھوں کی وحشت سے آشنا ہو رہا ہو۔

اس کی آنکھوں کے ڈورے ورم آلود ہو آئے تھے اور ڈلوں سے کچھ ایسے ہی پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہوا سیاہ و سپید لاوے کی قسم کا مادہ ان کے کونوں پر پپڑی خاکستری رنگ میں جم چکا تھا۔ ہونٹوں پر گل کی مستی کے چمکیلے رنگ نے بھی ادھر اُدھر سے سمٹ کر پپڑیوں کی صورت اختیار کر لی تھی اور جگہ بہ جگہ ان پپڑیوں کے اکھڑ جانے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نہایت شدت سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی تھی۔

اس کی عمر یہی پندرہ برس کی تھی۔ شہروں کی تنگ اور غلیظ گلیوں میں بسنے والی عام لڑکیوں کی طرح دبلی پتلی اور زرد رو لیکن کھٹی میٹھی چیزیں، چٹنی، اچار وغیرہ کی دلدادہ ہونے سے جو شے شاید اس میں دو برس بعد پیدا ہوتی اس نے قبل از وقت ہی اپنا رنگ نکھار دیا تھا۔ اس عمر میں جو بھولپن کسی بھی کنواری کے چہرے سے جھلک سکتا ہے وہ گویا کسی نے بُری طرح سے کھرچ لیا تھا۔ اس کی ہنسی میں عجب قسم کی درشتی اور تلخی گھلی رہتی جیسے ہنسنے پر اس کی روح کھلکھلانے کے بجائے مرجھا جاتی ہو۔ جیسے وہ ہنسنا تو چاہتی ہے لیکن کسی نامعلوم طاقت نے اس سے یہ حق چھین لیا ہے۔

اس کا دل ہر وقت ایک ناقابلِ برداشت بوجھ تلے دبا رہتا تھا۔ عرصے سے ایک غیر معمولی خلا ہر وقت اس کے ذہن میں پھیلتا سمٹتا پلا رہا تھا

ہر سے اسے شدید تنہائی کا احساس ہوتا۔ ایک طرح کی بھوک اس کی آنکھوں میں بلبلاتی۔ یہ غیر معمولی خلا کس طرح پُر ہو۔ یہ خیال آٹھوں پہر اسے مضطرب رکھتا جسے اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود وہ ذہن کی گہرائیوں میں غلط ملط کر سکنے کے ناقابل ہو چکی تھی۔ وہ آتشیں جذبہ کسی نہ کسی طور اُبھر ہی آتا کہ اس کے انگ انگ میں ایک تیزابی کیفیت برپا ہو جاتی۔

اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی بے باکی، خلوص اور التجا ایک ساتھ بھری رہتی۔ ہر جذبہ دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی کرتا۔ کبھی کوئی طاقت عود کر آتی، کبھی کوئی جذبہ غالب آ جاتا۔ اس کش مکش کے ردِ عمل سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ناممکن تھا کہ دراصل ان آنکھوں میں کیا ہے؟ وہ نگاہیں کیا کہنا چاہتی ہیں؟ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا گویا التجا کا جذبہ دوسرے سب جذبوں کو پچھاڑ کر کے نمایاں صورت اختیار کر گیا ہے اور نہایت ہی دردمندانہ انداز میں گڑگڑا رہا ہے ——— "کچھ ہو، واضح غیر واضح بس کچھ نظر آ جائے"۔

اسے کائنات کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ اپنے آپ سے، اپنے ان غیر اختیاری اضطراری کیفیات برپا کرنے والے اوٹ پٹانگ خیالوں سے، اپنی سہیلیوں سے جو بڑی چترائی اور دل جمعی سے اپنی محبت کے قصے سُنا سُنا کر اس کے دل میں بھی کچھ اسی طرح اترانے اور فخر سے باتیں بنانے کا احساس پیدا کرتی تھیں۔ گھر کے کام کاج سے، کیا وہ اسی لئے پیدا ہوئی ہے کہ صبح سے شام تک کولھو کے بیل کی طرح گھر کے کام میں جُتی رہے لیے اپنے ماں باپ کے اس جھوٹے پیار سے بھی بے نیاز نفرت تھی جو خواہ مخواہ اس کے تئیں جتایا جاتا تھا۔ ماں باپ کی میٹھی میٹھی باتیں بھی اسے بالکل ہی بے سروپا معلوم ہوتیں۔ بلکہ اسے غصہ آتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ان کے لاڈ پیار میں محبت کی نہیں، ہمدردی کی آمیزش ہے۔ ہمدردی جو کسی بھی بیگانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ رات کے دس بجتے ہی وہ چار بچوں کو اس کے سپرد کر کے علیحدہ کمرے میں سونے کو چل دیتے تھے اور بچے آدھی آدھی رات تک ریں ریں کرتے ہوئے اس کے لئے وبالِ جان بنے رہتے تھے۔ پھر وہ طویل، بھیانک اور تاریک راتیں، وہ تو ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ ایک ایک رات میں وہ کئی کئی بار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی اور گم سم لیٹی ہوئی پہروں کمرے کی تاریک فضا میں اِدھر اُدھر آنکھیں بھٹکاتی رہتی۔ کبھی کبھی انتہائی کوشش کے باوجود سونہ سکنے سے وہ کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر آسمان کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگ جاتی جیسے کسی آسمانی طاقت کی راہ دیکھ رہی ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے ٹھٹھاتے ہوئے ستارے اس کا مذاق اڑانے لگتے۔ خاموش فضا، وحشیانہ قہقہے لگا کر اسے چڑانا شروع کر دیتی کروٹ جھنجھلا اٹھتی۔ کچھ پاگل دیوانوں کی طرح اس کا دل چیخنے چلّانے کو چاہتا۔ یہ ستارے مجھے کیوں اچھے نہیں لگتے۔ یہ چاند کیوں چاندنی بکھیر رہا ہے۔ یہ رات کا سا سکوت کیوں؟ یہ سب کیا ہے، یہ سب کیوں ہے؟ لیکن کوئی پھانس اس کے حلق میں پھنس کر رہ جاتی اور وہ پھر اپنے تئیں چارپائی پر گرا دیتی ———

دن تو کسی نہ کسی جھمیلے کٹ ہی جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں، گھر کے کام کاج میں اور اسے اس قسم کے خیالات سے تدریجاً نجات مل ہی رہتی لیکن جونہی شام ہونے کو آتی اس کا دل پھر بیٹھنے لگتا۔ اس وقت اسے کچھ اچھا نہ لگتا۔ ساری رات یونہی خیالات میں غلطاں و پیچاں رہنے کے احساس سے ایک جان لیوا سی افسردگی اس کے چہرے پر دھرا دے بیٹھتی اور اُداس مضمحل سی وہ یہاں وہاں گرنے پڑنے لگتی۔ یہ دن کب ختم ہوں گے یہ راتیں کب ختم ہوں گی؟ اسے یقین ہو چکا تھا کہ جو وہ چاہتی تھی ایک آرزوئے ناتمام ہی تھی۔

اس ذہنی انتشار اور اس قسم کی بیقراریوں کو اندر ہی اندر دباتے دباتے اس کا ذہن ایک طرح کی دلدل بن چکا تھا جس میں کئی طرح کی اُمنگیں، امیدیں اور تشنہ کامیاں اور حسرتیں دفن کر دی گئی تھیں۔ ہر لحظہ وہ کئی کئی دھندلکوں سے اُبھر اُبھر پڑتیں اور تڑپ تڑپ کر اس کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لیتیں ——— سوچ ہمارے لئے، ہماری رہائی کے لئے کچھ سوچ ———

مگر وہ سوچ سوچ کر عاجز آ چکی تھی۔

بسا اوقات سوچنے ہی سے وہ اپنے خیالوں کی زندگی کو بھی پالتی تھی گویا گوں مسرتوں سے لبریز زندگی۔ زندگی کہ جس میں اسے سوچنا نہ ہوگا۔ اس وقت

اس کا ذہن کئی قسم کے ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگتا۔ اسے اپنے چاروں طرف سینکڑوں پیار بھری نگاہیں سرگوشیانہ انداز میں کچھ کہتی ہوئی دکھائی دینے لگتیں۔ اس احساس سے معاً پیاری پیاری لہریں اس کے جسم میں سرسرا اٹھتیں۔ اس کی رگوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑنے لگتی جیسے وہ کسی نئے ولولے کسی نئی امنگ سے آشنا ہو رہی ہو۔ اس کا دل کسی نامعلوم خواہش کے زیر اثر جگمگا سا اٹھتا اور خواہ مخواہ اس کا جی چاہتا کہ وہ ایک اٹوٹ قہقہہ فضا میں بکھیر دے، کہ اسے گرد و پیش کی ہر شے ہنستی ہوئی نظر آنے لگے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے بجلی کے کوندے کی سی تیزی کے ساتھ کوئی دل شکن احساس اس کے قلب کی گہرائیوں سے ابھر آتا اور کہرے کی صورت میں ہر گوشے پر چھا جاتا۔ اس پر ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی ——— پھر وہی بھیانک طویل راتوں کی گرانیاں، پھیکے اداس دن ——— جھٹپٹاہٹ اور وہی اس کا وجود۔

کسی رات اسے کوئی سہانا سنہرا خواب بھی دکھائی دے جاتا جو لمحہ میں کئی کئی دن تک اس کے دل میں لذت انگیز کسک پیدا کرتا رہتا۔ پھر وہ ہر رات اسی قسم کے کسی خواب کی توقع میں اپنے دل میں رنگینی لانے کی کوشش کرتی۔ بارہا اسے محسوس ہوتا کہ کمرے کی فضا میں میٹھے سپنے منڈلا رہے ہیں لیکن وہ ان تک کیونکر پہنچے۔ پوری کوشش کے باوجود بھی وہ انہیں پا سکنے میں کامیاب نہ ہوتی ———

سورج کافی اونچا اٹھ چکا تھا اور پچھواڑے کی جانب کھلنے والی کھڑکی میں لٹکتی ہوئی بھاری بھرکم کائی کانسے کی چق سے ہلکی ہلکی دھوپ کی اداس اداس لہریں فرش پر جال سا بن رہی تھیں۔ اس جال پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر اس نے بیٹے بیٹے پورے زور سے ایک انگڑائی لی۔ اس کا انگ انگ چٹخ اٹھا۔ اسی دوران میں اس کی ماں نے رسوئی گھر سے اسے نیچے آنے کو آواز دی لیکن وہ ان سنی سی کر کے اسی طرح لیٹی رہی۔ اس کا ذہن ایک ماہ پہلے کی طرف پلٹ رہا تھا۔ وہ عجیب سی بات ابھی تک اس کے ذہن پر مرتسم تھی اور اکثر وہ بات اسے یاد آجاتی تھی، اس وقت بھی اپنے دل میں اسے دہرانے سے وہ طنزاً ہلکا سا مسکرا دی۔ وہ بھاری بھرکم کائی کانسے کی چق خود اسی نے ماں سے یہ کہہ کر یہاں لٹکوائی تھی کہ وہ موٹا درزی یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھتا ہے ——— بھینگا کلموہا ——— طنزیہ حقارت سے وہ بڑبڑائی "یوں دیدے مٹکا مٹکا کر دیکھتا تھا گویا اسے اپنی آنکھ کے پھوٹنے کا احساس ہی نہ ہو ——— بڑا ہیجلا بنتا ہے۔ اونہہ! کوئی اس سے کہے کہ نہیں تو کوئی بھڑیل بھی دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی۔"

جب کبھی وہ کھڑکی میں جاتی۔ درزی یوں تیزی سے مشین چلانے لگتا گویا دکھانا چاہتا ہو میں دن بھر اسی رفتار سے مشین چلاتا ہوں اور میری باہوں کے پٹھے تھکتے نہیں ——— یونہی اسے خیال آیا کہ وہ ذرا اٹھ کر دیکھے کہ کیا وہ دوکان کھول چکا ہے۔ لیکن پھر نہ جانے کس خیال سے وہ اسی طرح لیٹی رہی ——— وہ ایک اور ہی حیران کن بات سوچنے لگی ——— آخر وہ کیوں اس شدت سے میری طرف تاکتا ہے جبکہ اسے اچھی طرح علم ہے کہ میں لنگڑی ہوں۔

وہ لنگڑی تھی۔ یہی غم اسے گھن کی طرح کھائے جاتا تھا اس کی ماں کے کہنے کے مطابق بچپن میں کہیں وہ گھر کی سیڑھیوں سے لڑھک پڑی تھی جس سے دائیں ٹانگ کا ٹخنہ اتر گیا تھا۔ بہتیرے حیلے کئے گئے مگر اصلی حالت پر نہ ٹک سکا۔ یہ قصہ اکثر اس کی ماں سائے ڈھلے گلی کی عورتوں میں بیٹھ کر چھٹی سے ظہر لوزے تر لوزے کے بیچ نکالتی ہوئی رہبراتی اور جب وہ سب عورتیں اس کے بُرے نصیب پر تبصرہ کرنے لگتیں تو اس کے دل میں کئی قسم کے اضطراری شعلے ایک ساتھ بھڑک اٹھتے۔ اس وقت اس کا جی چاہتا کہ وہ جا کر ایک بار پھر سیڑھیوں پر سے لڑھک پڑے اور اپنی دوسری ٹانگ کو بھی ناکارہ کر لے کہ وہ چل پھر تو نہ سکے گی۔ نہ کوئی اسے دیکھے گا نہ اس کی حالت زار پر افسوس کرے گا اس کے وقار کی میٹی تو نہ ہوگی۔

یوں وہ ہاؤ سنگھار کی بڑی دلدادہ تھی۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے کنگھی لئے وہ بال سنوارتی رہتی۔ اس کے بال گو چھوٹے اور چھدرے تھے لیکن وہ ایک ایک لٹ کو چن کر اس طرح جما لیتی کہ ان میں ایک عجیب قسم کی پھبن پیدا ہو اٹھتی۔ وہ اپنے ابروؤں کے بال بڑی محنت کے ساتھ

سوچنے سے تراشتی کہ قدرتی بے ترتیبی ناپید ہو کر سہانا تناؤ آ سکے۔ آنکھوں کی پلکوں پر کریم مل مل کر وہ انہیں دہرا کرتی اور کاجل سرمہ کی سلائیوں کو اس ہنرمندی سے آنکھوں میں پھیرتی کہ چھوٹی ہونے کے باوجود آنکھیں کنپٹیوں تک لانبی دکھائی دینے لگتیں۔ پھر دل ہونٹوں پر مٹی گھستی رہتی جس سے ہونٹوں میں غضب کی دل آویزی اور رسیلی چمک پیدا ہو اٹھتی تھی۔

کپڑے پہننے میں بھی وہ بڑی احتیاط برتتی۔ کس چمپئی کے ساتھ کون سی شلوار کا میل ہے۔ چنری کے کون سے رنگ میں وہ زیادہ جاذبِ نظر دکھائی دے گی۔ آئینہ کس طرح ہمارے کس ڈھنگ اور ڑھنے سے لہریے زیادہ چمک سکتے ہیں۔ ان سب باتوں میں اسے کمال حاصل تھا لیکن یہ سبھی جادو تو جیسے کسی بہت بڑے آسیب کے زیرِ اثر ہر دم روتے ہی رہتے۔ وہ بے خبر مطمئن تھی۔ وہ یہ نہ چاہتی تھی کہ کوئی اسے دیکھ کر اس کی حالتِ زار پر افسوس کرنا شروع کر دے، اس سے ہمدردی جتانے لگے۔ بلکہ وہ تو کچھ اور ہی چاہتی تھی۔ اس کی تسکین کا محض ایک ہی ذریعہ تھا کہ کوئی بھی نوجوان اسے کسی اور ہی جذبے کے زیرِ اثر دیکھے ——— وہ سحر طراز جانا پہچانا جذبہ جو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں کی طرح لڑکوں سے چھپ چھپ کر ملنا بھی نہیں چاہتی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ کسی خوبرو نوجوان کے ساتھ پہروں بیٹھی پیار و محبت کی باتیں کرتی رہے، کوئی اس کی تعریفوں کے پل باندھے۔ وہ تو صرف یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے ان نگاہوں سے دیکھے جن نگاہوں کا تصور ایک مدت سے اس کے خیالوں میں رچ چکا ہے۔

دھوپ لمحہ بہ لمحہ گرمی پکڑ رہی تھی۔ اس کی ماں نے نیچے سے ایک اور آواز دی لیکن اس نے کروٹ بدل لی۔ سامنے گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سرمئی رنگ کا پھولدار پردہ ہوا کے دوش پر لہرا رہا تھا اس کی طرف نظر جاتے ہی یک لخت نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ وہ پردہ پھینتی آمیز قہقہے لگاتا ہوا اس پر نہایت ذلیل فقرے کس رہا ہے، وہ چھٹپٹا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا سانس قدرے زور سے چلنے لگا۔ ایک بار اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ لپک کر اس پردے کو کھینچ لے اور پھینٹر اپھینٹر کر کے ہوا میں اچھال دے لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اس پردے سے ایک طرح کی وحشت آنے لگی گویا سچ مچ ہی وہ اس سے مخاطب ہو ——— "سنہری سپنوں کا جال ٹوٹ چکا۔ مجھے ہی نہیں تم نے اپنے آپ کو بھی دھوکا دیا ہے۔ اب تڑپو، تلملاؤ کہ یہی انصاف ہے ———"

اس پھولدار سرمئی رنگ کے پردے سے اس کی کس قدر رنگین اور پیاری گھڑیاں سمٹی ہوئی تھیں۔ ایک ہی ہفتہ پہلے اس نے خود اپنے ہاتھوں اپنی ذرا سی پھٹی ہوئی ساڑھی پھاڑ کر کے یہ پردہ یہاں لٹکایا تھا گو اس میں اس کی ماں کا بھی ہاتھ تھا۔ تاہم اس پردے کے ساتھ ایک اور بھی پردہ پڑا رہے گا، اس نے اپنی ذرا سی پھٹی ہوئی ساڑھی پھاڑ دی تھی ——— ایک ہفتہ ——— یعنی کل سات دن ——— وہ سوچنے لگی۔ کتنا مختصر وقت ہے لیکن اس نے اس دوران میں کیا کچھ نہیں پایا ——— اس سنہری دور کا وہ پہلا دن جب اس نے مہندر کو سامنے کے مکان کے چھجے پر آرام کرسی پر لیٹے پڑھتے دیکھا تھا۔ صبح ہی صبح جب وہ چوبارے کی اس کھڑکی میں آ کر کھڑی ہوئی تو ایک دم جیسے اس کا دل بول اٹھا تھا، ہاں اسی کی تلاش میں تم برسوں سے سرگرداں ہو آج وہی تمہارے سامنے اسی وجود میں ہے۔ یہ مہربان تمہارے دل کے تاروں پر وجد آور نغمے گائے گا ——— یہ سچا تمہاری صدیوں کی تڑپ ہرنے آیا ہے، اور واقعی مہندر کی ایک ہی میٹھی نظر نے اس کی تڑپ ہر لی۔ صدیوں کا روگ مٹ گیا۔ اسے دنیا کی ہر شے مسکراتی اور خوشی سے ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

مہندر اٹھ کر اندر چلا گیا لیکن وہ کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑی رہی تھی۔ کس قدر تعجب کی بات ہے، اس نے سوچا گھر کے بالکل مقابل کے مکان کو اس سے پہلے اس نے غور سے نہیں دیکھا ——— وہ تو جب بھی اپنی کسی نئی سہیلی کو اپنے مکان کا پتہ بتایا کرتی تھی تو محض اتنا ہی کہ فلاں گلی میں ہے۔ دائیں ہاتھ کے تین چار مکانوں کے بعد پیلے رنگ کے چھجے والے مکان کے ٹھیک سامنے ہی اس کا گھر ہے۔ بھلا وہ یوں کیوں نہ کہتی تھی کہ اس پیلے مکان کے چھجے کے جنگلے میں انیس سلاخیں ہیں جن میں سے تیرہ سلاخیں تو شاید دھوپ اور بارش میں رہنے کے سبب زنگ آ

ہو چکی ہیں لیکن باقی چھپر پر لگا ہوا تار کول ابھی اپنی پوری آب پر ہے اس مکان کے دروازوں پر نہایت ہی چمکیلا سبز روغن کیا ہوا ہے لیکن آتے جاتے لمحوں کو چھوتے رہنے سے ان کے درمیانی حصے کی کچھ جگہ مٹیلی بھی ہو گئی ہے یا یہ کہ چھجہ کافی کھلا ہے اور وہاں بڑی آسانی سے آرام کرسی بچھا کر کوئی پڑھ سکتا ہے۔

اس واقعہ نے اسے یکسر بدل دیا۔ اس کے قلب کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی دردو کرب کی چیخیں جانے کہاں دفن ہو گئیں اور اس کی بجائے نہایت لطیف تسکین دہ احساسات نے ہمگر پالی جیسے کسی لق و دق صحرا میں بھٹکتی ہوئی بکا ایک دم کسی سرسبز پُرسکون وادی میں پہنچ گئی ہو۔ ایسی وادی جو اس کے خیالوں کی وادی سے بھی کہیں زیادہ خوشنما تھی جہاں کسل کسل کرتے ہوئے ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے اس کی تڑپ اور تشنگی مٹانے کو محوِ انتظار تھے۔ اس میں ایک غیر معمولی پھرتی آگئی۔ گھر کے کام کاج میں بھی وہ بڑی مستعدی دکھانے لگی۔ اس سے پہلے برتن مانجھنے سے وہ اکثر کنی کترا جاتی تھی اور اس وجہ سے اسے ماں کے طعنوں کو سننے پڑتے تھے لیکن اب وہ خود بخود ہی چٹکیوں میں برتن چمکا کر الماری میں جو ڈوبی اور منٹوں میں دوسرے رسوئی کے کاموں سے بھی نمٹ جاتی۔ اپنے بہن بھائیوں اور ماں کے تئیں بھی وہ بڑی محبت جتانے لگ گئی تھی۔

لیکن اس کی ماں بڑی جہاں دیدہ عورت تھی۔ پہلے ایک دو دن تو اس نے اس اچانک تبدیلی کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ عمر کا تقاضا سمجھ کر درگذر کرتی رہی لیکن جب پانی سر سے گذرتا ہوا دکھائی دیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ سامنے کے مکان میں آکر بسے ہوئے نئے کرایہ دار کے لڑکے مہندر کو بھی وہ اکثر چھجے پر بیٹھے اور اوپر کھڑکی کی طرف بار بار دیکھتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ لہٰذا کسی قسم کی انگشت نمائی کے ڈر سے اس نے کھلے طور پر تو کوئی قدم نہ اٹھایا۔ صرف اپنی لڑکی کو طرح طرح کی نصیحتیں دے کر اور باتوں باتوں میں بات لگا کر سمجھانے کی کوشش کی اور اسی کے کہنے پر ہی کھڑکی میں یہ پردہ لٹکایا گیا تھا لیکن وہ ماں کی آنکھ بچا کر دن میں بیسیوں مرتبہ کھڑکی میں چلی آتی تھی۔

چوبارے کی یہ کھڑکی سامنے کے چھجے سے قدرے اونچائی پر تھی۔ اس طرح چھجے پر سے کھڑکی میں کھڑے کسی شخص کی کمر تک ہی کا حصہ دکھائی دے سکتا تھا۔ پھر بھی وہ وہاں کھڑی ہو کر پردے کو اس انداز سے سرکائے رکھتی کہ مہندر صرف اس کا سر یا زیادہ سے زیادہ چھاتیاں ہی دیکھ سکے۔

دن کو تو زیادہ تر ماں اسے نیچے اپنے پاس بٹھائے رکھتی تھی لیکن رات کو کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہونے سے وہ اپنے بہن بھائیوں کو بچا کھچا کھلا کر کھڑکی میں چلی جاتی۔ گو اس کی ماں ایک بار سونے کے لئے جا چکنے کے بعد پھر کبھی اس کے پاس نہ آتی تھی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر وہ چوبارے کی بجلی بجھائے ہی رکھتی۔

چھجے کے اندر کی طرف دروازہ مہندر کے کمرے میں کھلتا تھا جسے شاید وہ ہوا آنے کی غرض سے کھولے رکھتا تھا۔ کھڑکی میں سے وہ بخوبی اسے پڑھتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ پھر دل وہ اندھیرے میں کھڑی سے تاکے جاتی۔ مہندر کو شاید اس بات کا علم نہ تھا وہ بے خبر اپنی پڑھائی میں مگن رہتا اور جونہی گھڑیاں بارہ بجاتیں اس کے کمرے کی بجلی بجھ جاتی۔ کئی بار اس کے دل نے بغاوت بھی کی کہ وہ کسی طرح اسے اپنی موجودگی کا احساس دلائے اور التجا کرے کہ خدارا کچھ دیر تک لئے اور وہ جاؤ ——— تم اتنی جلدی کس طرح سو جاتے ہو ——— لیکن وہ بے دلی سے کھڑکی سے ہٹ جاتی۔

لیکن تیسرے دن کے بعد مہندر نے بھی کمرے میں بیٹھنے کے بجائے باہر چھجے پر آکر ٹہلنا اپنا معمول بنا لیا۔ کبھی کبھی وہ سیدھا کھڑا ہو کر اس کی طرف ٹکٹکی بھی باندھ لیتا۔ کوئی اشارہ یا بات تو نہ ہوتی لیکن اس دن کے بعد دونوں ہی اس دھن میں رہنے لگے کہ ایک دوسرے سے پہلے مخصوص جگہ پر پہنچ جائیں۔ اسے گھر کے کام کاج میں اکثر دیر ہو جاتی۔ ماں کوئی بیگا ڈوال دیتی یا بچے ہی سونے کا نام نہ لیتے تو وہ جھنجھلا جھنجھلا کر اس اونچی آواز میں انہیں ڈانٹتی کہ مہندر اگر چھجے پر پہنچ چکا ہے تو اس کی آواز اس تک پہنچ سکے یا اگر ماں جاگ رہی ہے تو اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو اور جونہی سب صحیح ٹھیک دیکھ کر وہ کھڑکی میں آکر مہندر کا انتظار کرتا ہوا پاتی تو اس کا رواں رواں خوشی سے کھل اٹھتا۔

اب اس کی سہیلیاں جب اسے ملنے آتیں اور حسبِ معمول اپنے کسی محبت کے قصے کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتیں تو خلافِ معمول وہ ان میں

زیادہ دلچسپی لینے لگتی۔ بات بات پر وہ کھلکھلا اٹھتی گویا ان کی محبت کا مذاق اڑا رہی ہو ——— "اچھا کل اس نے تمہاری گلی میں بارہ چکر لگائے" اور یہ کہتے ہوئے وہ قہقہے لگا کر ہنسنا شروع کر دیتی۔ ہنستے ہنستے اسے اوکھو آنے لگتا۔ کئی بار اسے بھی خیال آیا کہ وہ ان سے کہے آخر میں بھی تو محبت کرتی ہوں، ہماری طرف دیکھو۔ وہ میری بابت سوچتی ہیں اس کی بابت سوچتی ہوں اور بس، اور یہ جو نم گلیوں کے چکر کاٹنے والی باتیں سننا رہی ہو یہ سب لغویات ہیں ——— فضول ——— واہیات ———

مگر وہ اپنے تصور کی کل یکسوئی کے باوجود کچھ بھی کہنا پسند نہ کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی سہیلیاں اس کا مذاق اڑانے لگیں گی۔ ایسے ایسے دل شکن فقرے دہرائیں گی کہ اس کی روح کا ہر ذرہ رو اٹھے گا۔ کسی کو بھی اس کی باتوں پر یقین نہ آئے گا۔ وہ سب تو شاید یہی سمجھے بیٹھی ہیں کہ دنیا بھر کے کسی بھی شخص کی دلچسپیوں کا مرکز اگر کوئی ہو سکتا ہے تو محض انہی کی ذات۔ ہونہہ! وہ سوچتی "یہ خود اعتمادی دراصل کس قدر بے وقعت ہے" اسے بانو تھکا دی شانتی کا چاہنے والا جس کے متعلق وہ بڑی بڑی ڈینگیں مارا کرتی تھی اور جس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے تک ملاتے نہ چوکتی تھی، پچھلے دنوں گھر کی ڈکرانی کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔

سرمئی رنگ کا پھولدار پردہ بدستور ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا اور کان کاٹنے کی بوجھل، گم سم چپ سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ کمرے میں گرمی بھر رہی تھی ——— پردے کی طرف دیکھنے سے پھر اس کے سینے میں کسک سی ہوئی اور اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما اٹھا کہ بغیر معلوم خواہش کے زیر اثر ایک دم اس کے ذہن میں خیالی ابھرا کہ وہ ایک لمحہ کے لئے پردے کی اوٹ میں جا کر کھڑی ہو جائے۔ یونہی ——— لیکن فوراً ہی بعد پھر اسے اپنے اس احساس سے بھی وحشت سی ہونے لگی۔ پردہ جیسے پھر کچھ کہنے کو دکھائی دیا ———

وہ تن کر سیدھی بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں اور اس کا ذہن کسی فیصلہ کن راہ پر چلنے کے بجائے ادھر ادھر بھٹکنے سے جواب دینے لگا۔ نڈھال سی ہو کر وہ چھت کی کڑیاں گننے لگی لیکن اس سمت بھی اس کا دھیان زیادہ دیر نہ جم سکا۔ سینے کی آگ اور زور سے بھڑکنے لگی۔ آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

ماضی کی اس کے تئیں سرد مہری اور مستقبل میں بھی روشنی کی کسی چمکی سی کرن کے لئے ناامیدی سے اس کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی ——— یاہ ——— یکایک یہ خیال نہ جانے اس کے ذہن کے کس گوشے سے اُمڈا اور تھوڑی دیر کے لئے اس خیال نے اسے ذرا سی قوت بخشی۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے لیکن پھر جب وہ اپنی گذشتہ زندگی کا تجزیہ کرنے لگی تو اسے یہ خیال بھی محض دل بہلاوے ہی کا ایک سامان معلوم ہونے لگا۔ کئی بار اس کی سگائی کا چرچا اٹھا تھا۔ جس دن لڑکے والوں کی طرف سے کسی عورت کی آمد آمد ہوتی وہ لگاتار کئی کئی گھنٹے لگ پلک درست کرنے میں گذار دیتی لیکن جونہی اس عورت کا سامنا ہوتا ساری سحر انگیزی ٹوٹ جاتی۔ خود نمائی کا جادو اپنے ہی سر پر سوار ہو کر بول اٹھتا۔ اسے انتہائی یقین ہو چکا تھا کہ کسی بھی حالت میں وہ شادی کے قابل نہیں سمجھی جا سکتی۔ کبھی کبھی اسے یہ خیال بھی گذرتا کہ یہ جو چہروں پر چیچک کے بدنما داغ، پھلبہری کے نشان چھٹے موٹی، بھدی، کالی، بھینگی، سینکڑوں عورتیں گھروں کی رانیاں بنی بیٹھی ہیں، یہ بھلا کیونکر قبول کی گئی ہوں گی؟ اور اس خیال سے اس کے دل کو ذرا دیر کے لئے ڈھارس بندھ جاتی کہ شاید۔ شاید۔ لیکن جونہی یہ پرزور لگتا کہ ممکن ہے یہ سب کچھ شادی کے بعد ظہور میں آیا ہو تو وہ اپنی ہی قسمت پر لعنت ملامت کر کے نڈھال ہو جاتی۔ کاش کہ قدرت نے اسے لنگڑی نہ کیا ہوتا۔ شادی ہو جانے کے بعد چاہے اس کے کل جسم کو فالج مار جاتا ——— دو کوڑھی ہو جاتی ———

نیچے سے ماں کی ایک زوردار آواز نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑا۔ اسے خیال آیا کہ اٹھ کر نیچے چلی جائے۔ ماں جانے اس کے متعلق کس واہمے میں مبتلا ہو گی۔ لیکن پھر اسے اپنی ماں پر بھی غصہ آنے لگا۔ وہ سوچنے لگی آخر یہ سب اسی کی تو لگائی ہوئی ہے۔ اگر وہ کل پڑوسن کے ہاں نہ گئی ہوتی تو.....

کل کے واقعے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آتے ہی اس کی آنکھیں پھر نمناک ہو اٹھیں۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ماں پڑوسن کے یہاں

گئی ہوئی تھی کہ موج ہاتھ آتے ہی وہ بھی کھڑکی سے جا لگی۔ سامنے مہندر بھی کرسی بچھائے پڑھ رہا تھا۔ آج پہلی مرتبہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے ـــ وہ کس قدر چالاکی سے کتاب کو منہ تک سرکائے بغیر ہر پڑھنے میں منہمک نظر آتا تھا مگر اس کی آنکھوں کی آسیبی چمک میز کے سامنے رکھے ہوئے آئینے کے نظارے کی طرح اس کی آنکھوں میں پیوست ہوئی جا رہی تھی۔ اف! آنکھوں میں کیا کچھ نہیں ـــــ؟ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ یکایک پڑوس کی لڑکی نے جو اس کی سہیلی بھی تھی اسے نیچے گلی سے پکارا۔ انہی کے ہاں سے ماں نے اس کو بلانے کے لئے اسے بھیجا تھا۔ دفعتہً بجلی کے جھٹکے سے جس طرح کوئی سر سے پاؤں تک لرز اٹھتا ہے ویسی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ وہ کیونکر گلی میں جائے گی؟ یہ خیال اسے کسی غیر معمولی طوفان کا پرتو معلوم ہونے لگا۔ اس کے جسم کے ہر حصے میں ایک ہیجان انگیز اینٹھ پڑا۔ اسے محسوس ہوا گویا ماں اس سے پچھلے جنم کا انتقام لینا چاہتی ہے۔

اس کی سہیلی اب اوپر اس کے پاس آ چکی تھی اور ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے سر درد کا بہانہ کیا پھر پیٹ درد جتایا کہ ہر درد گنوا ڈالا۔ کئی اور بھی بہانے بنائے مگر اس نے ایک نہ سنی اور آخر اسے کھینچتی ہوئی نیچے لے ہی گئی۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر ایک بار اسے خیال آیا کہ وہ ذرا سی دیر میں آنے کو کہہ کر اوپر کھڑکی میں چلی جائے اور بے باکانہ انداز میں گرگٹ کی مندر سے التجا کرے کہ اے میری روح کے ذرے! میرے مسیحا! آج تک میں نے تجھ سے بات تک نہیں کی۔ چاہت بھری نگاہوں کی دین کے علاوہ کچھ نہیں چاہا۔ آج میں جھولی پھیلا کر تجھ سے ایک بھیک مانگتی ہوں۔ خدارا تھوڑی دیر کے لئے اندر کمرے میں چلے آؤ۔ مگر وہ ابھی تک پوری طرح یہ سب سوچ بھی نہ پائی تھی کہ اس کی سہیلی گھسیٹ کر اسے باہر لے گئی۔

اس پر غنودگی کا سا عالم طاری تھا۔ کل جسم سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ کاش اس وقت زمین پھٹ سکتی کہ وہ اس میں سما جاتی۔ اپنی سہیلی کا کندھا تھامے رہنے اور ٹانگ کو پوری قوت سے اکڑانے کے باوجود اس کا پاؤں گھوم کر لوٹ کھڑا ہی جاتا۔ ہر قدم پر اسے محسوس ہوتا گویا سینکڑوں بچھو ایک ساتھ اس کے جسم پر ڈنک چلا رہے ہوں۔

ماں کی باتوں پر وہ پوری طرح سے توجہ نہ دے سکی۔ ہر لحظہ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ صرف اتنی ہی بات اس کی سمجھ میں آ سکی کہ تمہارے چاچی کے آنے کا وقت ہو گیا ہے چہ لیجے پر چائے کے لئے پانی رکھ دو اور نیچے اپنے بہن بھائیوں کے پاس بیٹھو۔

وہ جلد ہی واپس لوٹ آئی۔ آتے ہوئے اس نے اوپر پیچھے کی طرف دیکھا۔ مہندر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گرتی پڑتی سیڑھیاں طے کر کے جب وہ چوبارے کی کھڑکی میں پہنچی تو مہندر پیچھے پر موجود نہ تھا۔ پیچھے اور کمرے کو ملانے والا دروازہ بھی بند ہو چکا تھا۔

شام تک وہ کھڑکی سے نہ ہٹی۔ ماں نے جب اوپر آ کر چوٹی سے پکڑ کر کھینچا، گالیوں اور وصلی دھپوں کی بوچھاڑ کی تب کہیں وہ نیچے اتری۔ باپ الگ خفا ہو رہا تھا لیکن اسے تو اب جیسے کسی کی پروا ہی نہ تھی۔ جیسے وہ کچھ سن ہی نہ رہی تھی۔

رات بھی وہ آدھی رات تک کھڑکی میں کھڑی رہی لیکن اس کے دل کی طرح سامنے کا چھجہ بھی ویران ہی رہا۔

وہ جانتی تھی کہ اب وہ دروازہ کبھی نہ کھلے گا۔ پھر جانے اس خیال سے وہ وہاں جمی رہی کہ گذشتہ سات دنوں کی اس زندگی کو وہاں سے کھرچ کر اپنے دل میں سنبھال کر رکھ لے۔ ماضی کی طرح پھر جب خیالات کا تصادم ہو گا تو اسے اپنی اس زندگی سے تھوڑی بہت تو تسکین مل سکے گی۔

چھجے کے دروازے کی درزوں میں سے تیز بیمار کٹاریوں کی صورت میں اس کے کلیجے کو چھلنی کرتی ہوئی بجلی کی روشنی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ پڑھ رہا تھا۔ "یقیناً وہ پڑھ رہا ہو گا۔" اس نے سوچا، اسے تو کچھ بھی نہیں ہوا اتنے بڑے انقلاب کا اثر کائنات کی کسی بھی چیز پر تو نہیں ہوا۔ ستارے اسی طرح جھلملا رہے ہیں۔ چاند چاندنی بکھیر رہا ہے۔ لوگ نیند میں گھوک سو رہے ہیں..... یہ خوفناک طویل بھیانک رات۔ یہ تنہائی۔ یہ خلا ـــــ

اس کی حالت پیاس سے مرتے ہوئے اس انسان کی سی تھی جس کے ہاتھوں میں ٹھنڈے پانی سے لبالب پیالہ دے کر پھر اسی دم چھین لیا گیا ہو۔ جس نے صدیوں کی تشنگی کو دبا کر اس ساعتِ خوش کن کا انتظار کیا ہو اور جو ناکام ہونے کی صورت میں بجھتے ہوئے دیئے کی لو کی مانند بھڑک اٹھے۔

اس کا دھیان پھر پردے کی طرف گھوم گیا۔ ہوا کے زور سے پردہ بدستور پھڑپھڑا رہا تھا ——— ان تھک زبان سے کہے جانے والے وہ فقرے اس کی روح کو تڑپانے لگے ——— سنہری سپنوں کا جال ٹوٹ چکا۔ مجھے ہی نہیں تم نے اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔ اب تڑپو، تلملاؤ کہ یہی انصاف ہے۔ کسی غم یا غصے کے بجائے وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی گویا گردوپیش کی ہر شے سے پوچھ رہی ہو: "کیا سچ مچ یہ انصاف ہی ہے؟"

پھر غیر ارادی طور پر اس کی آنکھیں چپ چاپ تھکتی ہوئی گائی کانے کی بوجھل چق کی طرف اٹھ گئیں اور ایسے ہی وہ سوچنے بھی لگی۔ اکثر اس چق پر ہوا کے جھونکے کیوں اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ کیوں خاموش ہے؟ ——— کہ یکایک اس چق پر تیز تیز لاٹھنوں سے مشین چلاتا ہوا وردی اُبھر آیا اور جیسے اس کی آواز بھی واضح طور پر سنائی دینے لگی "میں سب انقلابوں سے بے نیاز ہوں ——— میں سب انقلابوں سے بے نیاز ہوں۔"

وہ دونوں کھڑکیوں کے درمیانی فاصلے کا جائزہ لینے لگی۔ صرف ایک ثانیہ کے لئے اس کے ذہن کے کسی گوشے سے کوئی جذبہ پکارا ——— ایک خلیج ہی تو ہے "گہری، ناقابلِ عبور" ——— لیکن دوسرے ہی لمحے کسی خوفناک عزم کے دبدبے سے گویا وہ جذبہ پھر ذہن کی گہرائیوں میں اٹھک گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

چند ہی لمحوں کے بعد گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کانے کی بوجھل چق سے ڈھک گئی اور پچھواڑے کی کھڑکی میں پھولدار پردہ ہوا کی لہروں پر ناچنے لگا۔

سرلا دیوی

چاند بجھ گیا

جب سے ڈاکٹر ہو کر گیا تھا گھر میں ایک منحوس سی خاموشی چھا گئی تھی۔ سب غیر معمولی طور پر چپ ہو گئے تھے۔ ان کے ہونٹوں سے ہنسی یکسر غائب ہو گئی تھی۔ وہ چل پھر رہے تھے، مگر سایوں کی طرح خاموش۔ ان کے چہرے ایک سانحہ بیتے بیتے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کی سفیدی ضرورت سے زیادہ نمایاں ہو گئی تھی اور چیزوں کو پٹختے اور اٹھاتے وقت ان کی انگلیاں کانپ جاتی تھیں۔ گھر کے لوگوں میں اس تبدیلی کو موہنی نے بخوبی محسوس کیا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ کمرے میں جو شخص بھی داخل ہوتا ہے، اُس سے آنکھیں نہیں ملاتا بلکہ جلد سے جلد باہر چلے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس نے ایک دو بار دریافت بھی کیا کہ ڈاکٹر کیا مرض بتا گیا ہے۔ مگر کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا تھا۔ سب لوگ اس سے کچھ چھپانا چاہتے تھے۔ وہ اس کی آواز سُن کر چونک پڑتے تھے اور ایک بار آنکھیں ملا کر فوراً نظریں چرا جاتے تھے موہنی کو کسی نے کچھ نہ بتایا لیکن وہ سب کچھ جان گئی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ نہ تھا۔ اس قسم کے تجربہ سے وہ پہلے بھی ایک بار دو چار ہو چکی تھی۔

لیکن پہلے تجربہ میں اور دوسرے تجربہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اُس دفعہ موہنی چارپائی پر نہیں پڑی تھی۔ اُن دنوں وہ تندرست تھی، خوبصورت تھی۔ اس کے رخساروں کی رنگت گلابی اور ہونٹوں کی سُرخی تازہ تھی۔ چارپائی پر اس کے پتا پڑے تھے۔ بخار نے ان کا خون اور گوشت گھلا ڈالا تھا۔ اور ہڈیاں پیلی مردہ کھال کے نیچے بے ڈھنگے سے انداز میں پڑی رہ گئی تھیں۔ وہ چارپائی سے بیار تھے۔ پہلے ڈاکٹروں نے معمولی بخار بتایا۔ پھر ملیریا، ٹائیفائڈ اور پھر ایک دن سارے گھر میں آج کی طرح سناٹا چھا گیا۔ خوف و ہراس سے سب کانپ اٹھے۔ ہمت اور حوصلہ جواب دے گیا۔ گھر میں موت کے سیاہ پروں کا سایہ پھیلتا دکھائی دیا۔ ڈاکٹروں نے اس کے پتا کو تپ دق کا مریض قرار دے دیا تھا۔ آج پھر موہنی کی آنکھوں کے آگے اس کے بیمار پتا کی تصویر گھومنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد یہ تصویر دھندلی پڑنے لگی اور اس میں سے ایک نئی تصویر اُبھرنے لگی ——— یہ دوسری تصویر موہنی کی تھی ——— موہنی کو سمجھنے میں کچھ دیر نہ لگی کہ اس نے اپنے پتا کی چارپائی سنبھال لی ہے۔

دق۔ ٹی بی ——— موہنی کی چھاتی میں برچھیاں سی اُتر گئیں۔ وہ لرز اُٹھی۔ اس کا سارا بدن پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ کیا اسے واقعی دق ہو گئی ہے؟ کیا اس کی زندگی میں ساتھی لگن لگ گیا ہے؟ موت!

موت کا خیال آتے ہی موہنی کا سر جھک گیا۔ موت کے خوف نے اس کی روح کو جکڑ لیا ——— لیکن دوسرے لمحے یہ خوف کافور ہو گیا۔ اس کی جگہ جلتا نے لے لی۔ میں مر جاؤں گی تو میرے بعد میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ میری سویٹ کا اور میرے اس مُنّے کا جس کا میں ابھی نام بھی نہ رکھ پائی ہوں، اور گو۔ موہنی کے لئے زندگی اور موت کے تمام مسائل سمٹ کر اس مسئلہ میں سما گئے ——— 'میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا؟'

اس کا تخیل تصویر پیش کرنے لگا ——— 'وہ موت کا شکار ہو گئی ہے ——— مر گئی ہے۔ اس کے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ کسی نے ان کے بالوں کو نہیں سنوارا۔ کسی نے ان کے کپڑے نہیں بدلے۔ کسی نے ان کے ماتھوں پر نظر سے بچنے کے ٹیکے نہیں لگائے۔ یکایک اس کا پتی ایک غیر عورت کو لے کر گھر میں آیا۔ وہ عورت بہت خوبصورت ہے۔ اُس نے اُس کے کپڑے اور زیور پہنے ہوئے ہیں۔ لیکن جونہی وہ اس کے بچوں کو دیکھتی ہے اس کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ چہرے کے خطوط بگڑ جاتے ہیں۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں۔ اور پھر ——— پھر وہ بچوں سے دن بھر گھر کا کام کراتی ہے اور شام کو ان کی جھوٹی جھوٹی شکایتیں کر کے اپنے شوہر سے پٹواتی ہے اور رات کے تاریک سناٹے میں بچے اپنی ماں کو یاد کر کر کے روتے رہتے ہیں۔ بلکتے رہتے ہیں اور پھر تھک کر سو جاتے ہیں۔' کیا میرے بعد میرے بچوں کا یہ حال ہوگا؟ ——— موہنی پریشان ہو اٹھی۔ نہیں، نہیں میں جیوں گی میں اپنے بچوں کی خاطر مرض سے لڑوں گی۔ مرض کو شکست دوں گی۔

موہنی زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اس نے سدا زندوں کی طرح رہنا چاہا تھا۔ اس نے غریب شیکھر سے اپنی ماں کی مرضی کے خلاف صرف اس لئے شادی کی تھی کہ شیکھر سے جدا رہ کر وہ جیتے جی مر جاتی۔ مُردوں کی طرح جینا اسے پسند نہ تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ غریب ہوتے ہوئے بھی اس کے لئے اچھے گھرانوں کے رشتے آئے تھے۔ وہ اگر چاہتی تو کسی امیر گھرانے میں شادی کر کے زندگی عیش سے گزارتی۔ لیکن اس نے ہر قسم کے بوجھ اور لالچ کو تیاگ کر شیکھر سے پریم وواہ کر لیا ——— شیکھر جو ۱۲۵ روپیہ ماہوار کا کلرک تھا۔

شادی کے بعد ایک سال انہوں نے بڑے سکھ اور شانتی میں بتایا تھا۔ جیون سکراہٹوں اور قہقہوں کی لڑی بن گیا تھا۔ ان کی صبحیں روشن، شامیں سلونی اور راتیں گجاری تھیں۔ گھر میں فرنیچر نہ تھا، ٹرنک میں رنگین کپڑوں کے ڈھیر نہ تھے۔ محل ڈھیروں میں زیور نہ تھے۔ سیر کے لئے کار، اور تفریح کے لئے روپے نہ تھے۔ مگر محبت تھی، خوشی تھی، شانتی تھی۔ گھر میں دو پرانی تھے۔ جو تنخواہ ملتی اس میں گزر کر لیتے اور زندگی کی دوسری آسائشوں کی کمی کو ان خوابوں سے پورا کرتے جو دونوں مل کر اس وقت دیکھا کرتے جب رات کا کاجل رچ جاتا۔ ستارے بڑے بڑے ہیروں کی طرح آسمان کی گہری نیلی مخمل پر جگ مگ کرنے لگتے اور چاند آسمان کی پیشانی پر جھومر کی طرح جھلکنے لگتا۔ وہ خواب دیکھا کرتے ——— 'ہمارے بچہ ہوگا ہم اُسے بڑے پیار سے پالیں گے۔ پڑھائیں گے، لکھائیں گے۔ وہ بڑا ہو کر ایک خوبصورت جوان نکلے گا اور ہم بوڑھے ہو کر آرام کی زندگی گزاریں گے، سچا سادہ معصوم سنجوگ۔ زندگی سے اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے بچے کے لئے ایک درخشاں مستقبل کی آس۔ جس دن ان کو اپنے اس خواب کے پورا ہونے کی آس بندھی، وہ کس قدر خوش تھے۔ ان کی آنکھوں میں تارے ناچ رہے تھے اور ان کے کانوں میں اُن کے ہونے والے بچے کی شکایاں گونج رہی تھیں۔ انہوں نے بڑے شوق اور بے قراری سے اُس دن کا انتظار کرنا شروع کیا جب ان کا بچہ ان کی گود میں آئے گا۔

لیکن موہنی کو جوں جوں دن چڑھنے لگے، یہ شوق، یہ بے قراری مرجھاتی گئی۔ موہنی کی صحت کو کیا ہونے لگی۔ وہ نقلی مکی سی رہنے لگی۔ اس کے گالوں کا گلابی پن اور ہونٹوں کی سُرخی غائب ہونے لگی۔ ناخنی بوٹی پیلیوں پر نقلی ہوئی ملکیں پڑی رہنے لگیں۔ شیکھر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور بتایا کہ جسم میں خون کی بہت کمی ہے۔ اسے وٹامن چاہئیں، پروٹین، کیلشیم، مکھن، گھی، دودھ، پھل زیادہ ملنے چاہئیں۔ وہ پورا آرام دیا جائے۔ وہ دونوں وہاں سے لوٹ آئے لیکن اب ان کے درمیان ایک پیارا سندر بالک ہی نہ تھا۔ ان کے درمیان دوائیں، پھل، دودھ گھی اور ایک نوکر بھی تھا۔ موہنی سوچ رہی تھی کہ بناسپتی کی بجائے اسے اصلی گھی کھانا چاہئے۔ صحت اچھی ہونے پر ہی بچہ تندرست پیدا ہو سکے گا۔ مگر ان سب چیزوں کے لئے روپیہ چاہئے، روپیہ۔ اور پہلی بار اس کی زندگی میں روپے کی اہمیت اُبھر کر سامنے آئی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ شیکھر

کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ پہلی بار اسے خواہش پیدا ہوئی کہ شیکھر کے پاس بہت سی دولت ہو، اس کی تنخواہ زیادہ ہو ——— عیش کرنے کے لئے نہیں بلکہ ایک صحت مند زندگی گزارنے کے لئے۔ ایک صحت مند بچے کی ماں بننے کے لئے، ایک جیوآتما کو جنم دینے کے لئے۔

لیکن شیکھر ایک کلرک تھا۔ اس کی تنخواہ بندھی ہوئی تھی اور بندھی ہوئی آمدنی میں بنا سبزی گھی اور چائے کے بھورے پانی کے علاوہ کسی اور چیز کی آشا کرنا پاگل پن تھا۔ موہنی کا چہرہ مرجھا گیا۔

اب ہر لمحہ اور ہر قدم پر موہنی کے سامنے تلخ حقیقت آ کھڑی ہوتی۔ زندگی کے متعلق جو رومان انگیز تصور اس نے باندھے تھے وہ اب منہ چڑاتے ہوئے بھاگنے لگے۔ موہنی کو محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے کو دھوکا دے رہی تھی۔ وہ ایک خیالی دنیا میں رہ رہی تھی جس چیزوں کی ضرورت کو اس نے شیکھر کی محبت میں فراموش کر دیا تھا وہ اب کانٹوں کی طرح اس کی زندگی کے راستے میں آن کھڑی ہوئی ہیں۔ اب موہنی کے دن شیکھر کے دفتر سے آنے کی آس میں، اور راتیں چاند تاروں کے رومان کی تلاش میں گزرنے کی بجائے اُلجھنوں، تشنگیوں اور محرومیوں کے لمحہ بہ لمحہ گہرے ہوتے ہوئے احساس میں بیتنے لگیں۔ ہر لمحہ ایک نئی محرومی کا احساس ہوتا ——— اور یہ احساس اس کے اور شیکھر کے درمیان جھنجھلاہٹ کی ایک دیوار کھڑی کرنے لگا۔ لیکن یہ سب کچھ صرف ایسے لمحوں میں ہوتا جب موہنی تھکی ہوتی۔ اس کی طبیعت گری ہوتی۔ کوئی کام کرنے کو جی نہ کرتا اور کام کا اونچا پہاڑ اس کے سامنے ہوتا۔ موہنی کے لئے کچھ ملائمت کی دوائیاں لانے، اور دودھ وغیرہ منگانے کی وجہ سے تنخواہ ضرورت سے زیادہ ناکافی معلوم ہونے لگی ——— اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ دوائیں پیتے وقت یا غذا کھاتے وقت موہنی کے ذہن میں حساب کی گرد ان سی ہوتی رہتی ——— یہ چار روپے کی ٹامن کی گولیاں ہیں۔ لور اکسٹریکٹ کی گولیاں، گیارہ روپے کی آتی ہیں۔ اور دودھ کا بل اب کے نیس روپے آئے گا۔ اور اسے محسوس ہوتا ہے جیسے اگلے مہینے گھر کی گاڑی کسی صورت میں نہ چل سکے گی۔ اور کھایا پیا اُسے کچھ نہ لگتا۔ تکان، کمزوری، پریشانی، جھنجھلاہٹ ——— اور جیسے موہنی کے مزاج میں ایک غیر معمولی تبدیلی آنے لگی ——— ہونٹ بھنچے رہتے اور ماتھے پر ایک شکن ہر وقت پڑی رہتی۔ مگر ایسے لمحے بھی آتے جب ایک لمحے کے لئے گھٹائیں چھٹ جاتیں اور چاند اپنی پوری آب و تاب سے نکل آتا۔ انہیں حالات میں موہنی نے ایک بچی کو جنم دیا۔

بچی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا گورا گول مٹول معصوم چہرہ دیکھ کر دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی۔ وہ اُسے گود میں لے کر کھلاتے تو ان کے ماتھے سے پریشانی اور تردد کی لکیریں تھوڑی دیر کے لئے مٹ جاتیں۔ وہ غیر شعوری کشیدگی جو موہنی اور شیکھر کے درمیان پچھلے چار پانچ مہینے میں پیدا ہو گئی تھی ایک حد تک دور ہو جاتی۔

اب ان کی زندگی میں پھر ایک ایسی چیز آ گئی تھی جسے وہ مشترک طور پر پیار کر سکتے تھے۔ جس کے متعلق ہم آہنگی سے باتیں کر سکتے اور جس میں دونوں اپنے غموں کو بھلا سکتے تھے۔ ماحول کی کثیدگی کم ہو گئی تھی۔ مگر یہ سب کچھ جذبات کی سطح پر تھا۔ حقیقت کی سطح پر حالات زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ بچی کے ہونے سے ہر طرح کے خرچ بڑھ گئے تھے۔ آمدنی کسی طرح نہ بڑھی تھی۔ تنخواہ آتی اور پچھلے مہینے کا حساب چکانے چکاتے ختم ہو جاتی اور پورے اکتیس دن کاٹنے کے لئے صرف پندرہ روپے ہاتھ میں رہ جاتے۔ وہ تمام خواہشیں اور وہ تمام منصوبے جو وہ اگلے مہینے پورا کرنے کی امید سے باندھتے خاک میں مل جاتے۔ اور پھر تنگی اور کفایت شعاری اور من مارنے کا دور شروع ہو جاتا۔ اس تنگ حالی کے نشانات گھر میں بھی دکھائی دینے لگے۔ کالروں، تولیوں، ساڑیوں اور پلنگ کی چادروں میں بڑے اور بھدے رفو آنے لگے۔ جو گلاس یا پیالے ٹوٹ جانے ان کی جگہ نئے نہ آ پاتے۔ بچی کے کپڑے بنانے کی آرزو پرانی ساڑیوں کو پھاڑ کر اور ان میں سے بنا بنائے کپڑے نکال کر پوری کی جاتی۔ آئے دن کے خرچ پر ماں بیوی میں کھینچا تانی ہوتی۔ سینما اور ریسرکنا یکسر بند ہو گئے۔ پیسے پیسے کا حساب رکھا جانے لگا۔ دونوں میں سے جس کا رشتہ داریا مہمان آ جاتا اس کی گویا شامت آ جاتی ——— دونوں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کو دوڑتے۔ بدمزاجی اور چڑچڑاپن ان کے سبھاؤ میں رچ گیا ——— ہر وقت گھر میں پیسہ مٹاتی دیتا ——— کھانا ضائع نہ کرو، کپڑے نہ بگاڑو، کپڑے ہاتھ سے دھوؤ۔ کوئلہ کم خرچ کرو۔ غرض کہ فضول خرچی کی ہر چیز پر روک ٹوک شروع ہو گئی۔ اب جب کبھی وہ ساتھ ساتھ بازار جاتے تو ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے اور ایک دوسرے میں مگن رہنے کی بجائے ان کی آنکھوں میں دوسرے مرد عورتوں کے سوٹ، ساڑیاں، بلاؤز، اوور کوٹ، زیور، بالوں کے جوڑے کھٹکتے۔ زندگی کا سکون

غائب ہو گیا۔ محرومی کا احساس ہر لمحہ زیادہ شدید اور گہرا ہونے لگا۔ اور پیار کی وہ دنیا جس میں شادی کے بعد ایک سال تک وہ مسکراہٹ اور پیار کے دن گزارتے رہے تھے اب مکمل طور پر برباد ہو گئی تھی۔

شاید اس حد تک بھی موہنی زندگی کے مقابلے میں ڈٹی رہ سکتی تھی۔ لیکن زندگی نے اس کی صحت کو بھی کھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت تھکی تھکی رہتی۔ اس کی کمر اور گھٹنوں میں جان نہ رہی۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی آنکھوں کے آگے سیاہی کے دائرے سے پھیلتے اور سمٹتے۔ اس کی جلد کی سفیدی میں سرخی کے بجائے ہلدی جیسی زردی جھلکنے لگی۔ رخسار جو کبھی مسکراہٹ کی وجہ سے سرخ رہتے تھے، اب مرجھائے مرجھائے رہتے اور ہونٹ کنیر کی باسی کلیوں کی طرح بے رنگ ہو گئے۔

شیکھر کو موہنی کی گرتی ہوئی صحت کا احساس تھا۔ وہ جب دیکھتا کہ بلاؤز جو کبھی موہنی کے انگ انگ کو اُجاگر کر دیتے تھے، اب ڈھیلے ڈھیلے لٹکتے رہتے ہیں اور چوڑیاں جو کبھی موہنی کی کلائیوں میں چندن کی ریکھاؤں کی طرح نظر آتی تھیں اب پہنچیوں میں پڑی رہتی ہیں تو اس کی چھاتی میں گھونسا سا لگتا۔ وہ اس کو آرام پہنچانے کا پورا خیال رکھتا۔ وہ اپنا پیٹ کاٹ کے اور من مار کے اس کے لئے کچھ نہ کچھ لاتا رہتا۔ مگر مہنگائی اسے مات پہ مات دے رہی تھی۔ تنگی کر کے وہ جتنا خرچ کم کرتا تھا اتنا ہی چیزوں کے مہنگا ہو جانے سے بڑھ جاتا تھا۔ اب وہ ہاتھ باؤں سے بھی موہنی کی مدد کرتا اور اسے زیادہ سے زیادہ آرام دیتا۔ کپڑے خود دھوتا بستر خود بچھاتا۔ دفتر سے آ کر بچی کو کھلاتا اور جب کبھی موہنی کی کمر یا اس کے سر میں درد ہوتا تو اپنی تھکن بھول کر گھنٹوں اس کا سر دباتا ——— لیکن اس کے قدموں کے نیچے کی زمین سرکتی جا رہی تھی۔ گھر کی حالت سنبھلنے میں نہ آتی تھی اور موہنی کے جسم کی ہڈیاں نمایاں ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

اسی طرح آرام اور خوشی کے لئے چھینا جھپٹی کرتے کرتے زندگی کے دو سال گزر گئے۔ اب ان کی حالت اس قدر تنگ ہو گئی تھی کہ کھانے میں تنگی کرنے کی نوبت آ گئی۔ گوشت کی بجائے اب ان کے ہاں دونوں وقت دال پکنے لگی۔ کوئی مہمان آ جاتا یا کچھ لینا دینا پڑ جاتا تو فرض سر پہ سوا ہو جاتا ——— زندگی کی چکی میں پستے پستے ان کے جذبات بھی مر و پڑ گئے۔ اب کئی کئی دن تک وہ ایک دوسرے سے بات نہ کرتے۔ انہیں خیال بھی نہ ہوتا کہ انہوں نے کئی دنوں سے ایک دوسرے سے باتیں نہیں کی ہیں۔ موہنی اپنے حلقہ میں گھومتی رہتی، شیکھر اپنے دائرہ میں گردش کرتا رہتا ——— رات کو دونوں اپنے اپنے جوتے سے لکھتی پاکر نیم جان سے چارپائی پر پڑ رہتے۔ پیار کرنے کو، جاڑے باتیں کرنے کو، دیکھ کر مسکرانے کو، زندگی میں کچھ نہ رہا تھا۔ چاند ان کے لئے بجھ گیا تھا اور تارے ان کے لئے چمک کے سوکھے ہوئے دانے بن گئے تھے۔ اب ان کے دل میں ایک دوسرے کے لئے کوئی جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ جب چاپ گھر میں چلتے پھرتے، کام کرتے۔ پڑ کر سو جاتے کبھی ایک آدھ لقمہ منہ سے نکل جاتا چونک کر نگاہیں مل جاتیں مگر راکھ کی چنگاری کی طرح صرف ایک لمحہ کے لئے ——— پھر وہی غیریت ——— بے حسی ——— مٹیالی مُردنی۔

اسی غیریت، بے حسی، مٹیالی مُردنی کے سائے میں موہنی دوبارہ حاملہ ہو گئی ——— زندگی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔ موہنی کے جسم میں جوں جوں پرورش پانے لگا موہنی کے ہونٹوں کی خشکی، آنکھوں کا پھیکا پن اور رگوں کا نیلا پن زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ جسم نے اس دوسری جان کو کھینچنے سے انکار کر دیا۔ موہنی نے کھاٹ پکڑ لی۔ بچہ ہونے سے پہلے ہی حرارت رہنے لگی۔ بچہ ہوا تو بخار نے آ دبوچا۔ بخار ٹیٹر پکڑ گیا۔ اور موہنی کی زندگی کی جڑ کھوکھلی ہو گئی۔ اور ایک دن ڈاکٹر نے کہہ ہی دیا "موہنی کو دق ہو گئی ہے"۔

موہنی کمرے میں پڑی تھی۔ شیکھر اور اس کی بہن جو تیمارداری کے لئے آئی ہوئی تھیں نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ کمرے ہی میں نہیں بلکہ سارے گھر میں سناٹا تھا۔ یاس بھی پالنے میں مچل پڑا سو رہا تھا ——— "میرا لال، میرا چاند ——— کیا میں اپنے چاند کو اپنی گود میں لے کر نہ کھلا سکوں گی، جس کو میں نے اپنے خون سے سینچا ہے، کیا اسے بے سہارا چھوڑ کر چلی جاؤں گی، نہیں نہیں! میں نہیں مروں گی میں جیوں گی! ——— میں نے اس دنیا میں ایک نئی زندگی کو جنم دیا ہے۔ کیا دنیا اس کے بدلے مجھے میری زندگی کا دان نہیں دے گی؟ مجھے میری زندگی کا دان دیا جا سکتا ہے۔ برا علاج کر کے مجھے اچھی غذا دیکھ، جما اور روشنی دیکھ یہ میرا حق ہے۔ میرا حق مجھے ملنا چاہئے۔ ——— میرا حق مجھے ملنا چاہئے! اس کی آتما پکار اٹھی۔

لیکن اس کی آتما کی پکار کسی نے نہ سُنی کیونکہ کمرے میں کوئی نہ تھا اور کھڑکیاں اور روشندان بند تھے۔

جیلانی بانو

موم کی مریم

آج بھی اندھیرے کمرے میں بیٹھا میں خیالی پیولوں سے کھیل رہا تھا۔

اور جب بھی اندھیرا چھا جاتا ہے تم نہ جانے کہاں سے نکل آتی ہو جیسے تم نے تاریکی کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہو، اور مجبوراً مجھے جلے ہوئے سگریٹ کی راکھ کی طرح تمہیں بھی زمین پر جھٹک دینا پڑتا ہے۔

میں نے کبھی تمہارے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ کبھی تمہارے اور نظمیں نہیں لکھیں۔ کبھی تمہاری یاد میں تارے نہیں گنے۔ پھر کیوں میں تمہیں یاد کئے جاؤں ——— ؟

زندگی میں تم سے اتنی دور رہا کہ کبھی اسی رنگ و بو کے سیلاب میں غرق نہ ہو سکا جو تمہارے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے بیچ میں جھوٹی عقیدت اور مضحکہ خیز احترام کی خلیج حائل رہی۔ پھر آج تم اپنی آہوں اور سسکیوں سے کون سے مرنے ہوئے جذبے جگانا چاہتی ہو ——؟

آج صبح عائشہ کے خط سے مجھے تمہاری موت کی خبر مل چکی ہے۔ مگر میں اس موت پر انتہا یا افسوس نہ کر سکا۔ روز نہ جانے باہر سے کتنے بادل گذر جاتے ہیں۔ کتنے نغمے ساز کے اندر ہی دم توڑ دیتے ہیں، کتنے انسان ایک لمحہ کی خوشی ڈھونڈتے ڈھونڈتے مر جاتے ہیں۔ پھر تمہاری موت تو میرے سامنے کتنی ہی بار ہو چکی ہے، اگر پہ ہ دی طور پر تم سیلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے آج میرے کمرے میں آ بیٹھی ہو۔

جب سے میں نے عائشہ کا خط پڑھا ہے میرے خیالات کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتے پھرتے ہیں اور نہ جانے کیوں بہت سی دھندلی دھندلی یادیں جھلانے لگی ہیں اور اس اندھیرے اجالے میں بہت سے چہرے خلط ملط ہو گئے ہیں۔

مگر میں اس وقت تمہارے خیالی وجود سے باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ کیونکہ تمہاری جانی پہچانی سسکیاں مجھے تمہاری موجودگی کا یقین دلا رہی ہیں، تو میں اے واہمہ کیسے تصور کر سکتا ہوں ——— ؟

تمہارا اور اندھیرے کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔ تم زندگی بھر جہاں جہاں بھی گئیں چراغ گل ہوتے گئے۔ تاریکی کے حلقے تمہیں اپنے گھیرے میں اسیر کئے رہے۔ جس طرح مریم کی تصویر کے گرد مصور نے نور کا ہالہ کھینچ دیا ہے۔ عصمت، تقدس اور معصومیت کی لکیریں، جن کے اندر باکرہ مریم کی روح کو

محصور کر دیا گیا ہے۔

اس وقت بھی جب تمہارے مستقبل کی طرح کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ تمہارے آنسوؤں چمک رہے ہیں جیسے پر امید بحرین نے دیا کی سطح پر چراغوں کی قطار چھوڑ دی ہو۔ میرے کمرے میں تمہارے آنسوؤں نے اُجالے کی امید قائم رکھی ہے ——— ہم مشرق کے مرد صدیوں سے اپنی بیش گاہوں میں تمہارے اشکوں سے جشنِ چراغاں مناتے آئے ہیں ———

تمہارے متعلق لوگوں نے کہانیاں مشہور کر رکھی ہیں وہ بالکل سطحی تھیں اور اسی لئے میں نے حقیقت کی سطح پر اُتر کر تمہیں سمجھنا چاہا تھا۔ تم کیا تھیں! اماوس کی رات کو ٹوٹنے والا ایک ستارہ جو اپنی آخری جھلک سے بہت سے دلوں میں امید کی کرن چمکا کر غائب ہو جائے ——— ایک تند لہر جو اپنے زعم میں ساحل کے پرخچے اڑا دینے کے ساتھ خود بھی مٹ گئی ہو۔

آج جب تم اپنے گواہوں کی لمبی فہرست خود ہی میرے کمرے میں آ گئی ہو تو مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ تم ایک عام سی لڑکی ہو۔ سنے کے باوجود دوسروں سے اس قدر مختلف تھیں۔ تم ایک مسحور کرنے والا جادو بن گئی تھیں جو کتنے ہی خریداروں کو کھینچ لایا۔ مگر سونگھا ہوا پھول سمجھ کر سب واپس چلے گئے۔

دوکاندار کے نزدیک وہ چیز کتنی حقیر ہو جاتی ہے جسے گاہک الٹ پلٹ کر پھر دکان پر رکھ جائے ——— شیشے کے کیس میں بند رہنے والی گڑیا ——— آج تم اتنی صاف صاف باتیں کر کے حیران ہو رہی ہو۔ جبکہ تم نے اپنے آس پاس کے شیش محل چکنا چور کر ڈالے تھے اور سماج کی کھینچی ہوئی لکیروں پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک بار تم سب لڑکیوں کو آگ میں دھما چوکڑی مچاتے دیکھ کر امی نے کہا تھا۔

"اونھہ مت روکو نگوڑی ماریوں کو ——— کنواری لڑکیاں برساتی چڑیاں ہوتی ہیں۔ کون جانے کل کس کا ڈولا دروازے پر کھڑا ہوگا۔" اس وقت اخبار پڑھتے پڑھتے میں نے تمہاری زندگی کا پورا فلم دیکھ ڈالا تھا۔

جب تم کسی ناصر یا شاہد کھڑک سے بیاہی جاؤ گی اور آنسو پونچھتے ڈولے میں سوار کرائی جاؤ گی۔ پھر ہر سال ایک ننھے منے کی پیدائش میں اضافہ ہوتا رہے گا اور ساتویں یا آٹھویں ننھے کی پیدائش پر تپ دق کا شکار ہو کر مر جاؤ گی۔ ہر لڑکی انہی لکیروں پر دوڑتی آئی ہے۔ مگر تم نے اپنی انفرادیت سے ایک دوسرا راستہ ڈھونڈھنا چاہا جس کی سزا میں موت و زندگی تم پر حرام ہو گئی۔

تم منجھلے چچا کی دسویں یا گیارھویں اولاد تھیں ——— پھر نام اور لڑکی ——— اونہہ لڑکی ہے تو کیا ہوا۔ نصیب اچھے ہوں ——— لڑکے کون سا فیض پہنچاتے ہیں ——— ماں باپ کی موت پر آنسو بہانے والی تو بیٹی ہوتی ہے۔"

اور اپنی موت کی نوحہ گر کے پیدا ہوتے ہی کسی نے تمہیں خوش آمدید نہ کہا۔

اپنے اردگرد کے ماحول نے تمہیں زیادہ حساس بنا دیا۔ حقارت کی نظروں نے خودی کا احساس بیدار کیا اور تم نے کچھ کرنے اور کچھ پانے کی قسم کھالی۔ تمہارے متعلق بدنامیاں اور سرگوشیاں بڑھتی گئیں۔ جاہل، بد دماغ، بدصورت اور مغرور ——— دن بھر تمہیں ان ہی خطابوں سے یاد کیا جاتا مگر تم ایک ننھی سی چڑیا کی طرح اِترا اِترا کر کہتی رہیں ——— جو میرے پاس ہے وہ رانی کے محل میں بھی نہیں۔

اسی انانیت پسندی سے تم ایک ایسا شعر بن گئی جس کے غالب کے شارحین کی طرح ہر ایک نے الگ معنی نکالنا چاہے مگر پھر بھی بہت کم حقیقت کی تہ تک پہنچ سکے۔

اور میں نے بہت دور ہو کر بھی تمہیں سمجھنا چاہا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے دوسرے مردوں کی طرح تمہاری دوشیزگی کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا کبھی اس قدر نزدیک نہیں آیا کہ تمہارے تنفس کی رفتار سے کوئی راز پا سکوں۔ پھر بھی میں نے اس شعر پر کافی ریسرچ کی، دماغ کی لیبارٹری میں مہینوں تک تجربے کئے مگر کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

ایک بار مجھے اپنی جانب جھکتے دیکھ کر تم نے کہا تھا:

"احمد بھائی! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں، اور یہ نہیں چاہتی کہ کوٹھوں کی دلالی میں آپ بھی اپنے ہاتھ کالے کر بیٹھیں ——" مگر یہ کہتا بڑا حریفانہ ہے کہ تم نے بہت سوں کو کوٹھوں کی دلالی سے بچانے کی خاطر اپنے منہ پر کالک مل لی تھی تاکہ ان کے سفید دامن سیاہی سے بچ رہیں ——— تم میری بہت عزت کرتی تھیں ——— ایک نوجوان مرد کی ——— جو تمہارے ذرا سے سہارے پر آگے بڑھنا چاہتا تھا ——— جس نے تمہاری اٹھارہ سال کی زندگی میں مسلسل فریب دیئے تھے، جس نے تمہیں منزل کے قریب لاکر بھٹکا دیا تھا۔ بدنامی کی کہ کھٹڑی میں دھکیل کر ہر دروازہ بند کر دیا تھا۔ پھر تم نے اپنی رہی سہی عزت کی دھجیاں بکھیر ڈالیں اور بیچ چوراہے اپنے سب ظاہری لباس اتار ڈالے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ تم میری عزت کرتی رہیں اور میں تمہیں سمجھنے میں اتنا منہمک ہو گیا کہ جذبات کے انگیخت قطعی بے اثر ہو گئے ورنہ ممکن تھا ایک دن میری خودداری اور عزت تمہارے قدموں میں پڑی بخشش کی طلبگار ہوتی اور تم اطہر کی طرح مجھے ایک چٹان پر چھوڑ کر کہتیں:

"میں نے تمہیں پانے کے لئے بہت سی ٹھوکریں کھائیں مگر تمہارے چھونے سے پہلے اتنی بلندی پر پہنچ گئی کہ جب تم وہاں پہنچے میں سراب بن چکی تھی۔"

گھبراؤ نہیں۔ تم نے یہ الفاظ اطہر یا آتش سے تو نہیں کہے مگر آج تک تم نے کون کون سی باتیں زبان سے کی ہیں تم تو اس گونگی کی طرح ہو جسے اپنا مفہوم ہمیشہ عملی طور پر سمجھانا پڑتا ہے۔

صرف اٹھارہ سال کی زندگی میں تم نے اتنی ساری باتیں کیسے کہہ لیں۔

بظاہر تم کتنی معمولی تھیں ——— چھوٹے چھوٹے کاندھوں تک لہراتے ہوئے بال جن کی باریک باریک آوارہ لٹیں چہرے کے گرد ہالہ سا بنائے کانپتی رہتیں۔ معمولی ساقد ——— دبلا پتلا، دھان پان جسم جیسے تیز ہوا کے جھونکے بھی تمہیں اڑا کر لے جائیں گے جیسے تمہاری جانب ہاتھ بھی بڑھایا تو چھوئی موئی کی طرح کملا جاؤ گی ——— ایک واہمہ سی ——— ایک ادھورا خاکہ ——— کتنے ہلکے ہلکے سے تھے تمہارے نقوش خال خال پتلے پتلے ہونٹ جو ہمیشہ سرخ لہری سے بند رہتے، ہر چیز کو تجسس سے دیکھنے والی ہمدرد آنکھیں جو اپنے سارے گناہ آشکار کرنے کو تیار نہیں، ورنہ اسی خیال سے بات کرتے وقت بار بار بند ہو جاتیں، تاکہ ان کی گہرائیوں کا کوئی پتہ نہ لگا سکے۔ اور ہر لمحہ بدلنے والا رنگ، جو کبھی شعلے کی طرح دہکنے لگتا، کبھی راکھ کی طرح میلا پڑ جاتا۔

اور جب باتیں کرتیں تو تمہارے خدوخال میں کوئی تبدیلی نہ آتی۔ کتنی مشکل بات تھی تمہارے چہرے سے کسی بات کا اندازہ لگانا۔

اس معمولی سی شکل وصورت ہی نے تمہیں گھر میں ایک ناقابل التفات چیز بنا دیا تھا۔ اپنی غیر صورت ساعت مند بہنوں کے مقابلے میں تمہاری کوئی قدر وقیمت نہ تھی۔ خرید وفروخت کے اس بازار میں صرف اچھی صورت والی لڑکی ہی فائدہ اٹھاتی ہے ——— اور یہ خیال بچپا اور بچی کے لئے سوہان روح تھا۔

مجھے آج سے تین سال پہلے والی جاڑوں کی ایک صبح یاد آ رہی ہے۔

تم اس وقت نہا کر آئی تھیں۔ نسرین اور عائشہ کے ساتھ صحن میں بیٹھی، سویٹر کا ایک فرنہ بنا جا رہی تھیں۔ نومبر کی لطیف دھوپ آنگن میں بکھری ہوئی تھی۔ چچی نیچے بیٹھی نئے لحافوں میں روئی بھر رہی تھی۔ اس وقت تمہارے گلابی دوپٹے، لمبیلے بال اور نکھرے ہوئے رنگ کو دیکھ کر بھی مجھے کوئی شعر یاد نہیں آیا۔ کوئی تشبیہ دماغ میں نہیں ابھری۔ عائشہ، نسرین اور فرزانہ کے فروزاں حسن نے وہاں تمہارے چراغ کو ٹمٹانے نہیں دیا ——— کتنی کمتر تھیں تم اپنی سنولائی رو اور اپنے حسن پر نوحہ کرنے والی بہنوں کے مقابلے میں ——— اس وقت میں نے سوچا تھا کہ حسن کے اس جگمگاہٹ میں تمہاری کہانی کتنی مختصر اور پھیکی ہو گی۔

ان ہی دنوں مسلسل بیکاری نے مجھے نئی مہموں کا واقف کر دیا تھا اور گھر سے بہت دور ایک ہنگامی کے سلسلے میں گرفتار رہا تھا تو عائشہ کا خط پڑھ کر پہلی بار تمہاری جانب متوجہ ہوا تھا ——— تم لڑکیوں کو خط لکھنے کو بھی تو کوئی بات نہیں ملتی۔ عائشہ کے خط بھی اسی کی طرح خوبصورت اور معصوم ہوتے ہیں جن میں وہ ابا کی ناراضگی سے لے کر خاندان کی اہم تقریبوں میں آنے والی عورتوں کے کپڑے، زیوروں کے ڈیزائن اور اسکول کی سہیلیوں کے رومان تک ——— سب کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا۔ ساتھ ہی وہ مجھے بھی ایسا ہی مزے دار لمبا خط لکھنے کی ہدایت کرتی ——— میری بے وقوف بہن نہیں جانتی تھی کہ میں روبانوں، سرگوشیوں اور رنگینیوں کی دنیا سے کتنی دور تھا مگر وہ میری مسلسل خاموشی کے باوجود ایک ہنگامہ پرور گھر کے کمرے میں بیٹھی بار بار منہ پر جھک آنے والی لٹوں کو پیچھے جھٹک کر لکھتی رہی ——— "آپ نے ایک اور خبر سنی بھائی جان؟ قدسیہ کے یہاں چھوٹی خالہ امجد بھائی کا پیغام لے کر گئیں تو قدسیہ نے خود آگے آن سے کہہ دیا کہ وہ امجد سے شادی نہیں کرے گی۔

سنا ہے چچا ابا زہر کھانے والے ہیں اور سارے خاندان میں تھوتھو ہو رہی ہے۔"

اس دن بہت دنوں کے بعد میں جیل کی تنہا کوٹھڑی میں مسکرا سکا۔ اس دلیرانہ جرأت پر میں نے غائبانہ طور پر تمہاری پیٹھ ٹھونکی تھی اور محسوس کیا تھا کہ جس خول میں ہم اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے ہیں وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا ہے۔ جی چاہا کہ فوراً چچا ابا کو زہر کی ایک شیشی بھیج دوں تاکہ وہ صرف ارادہ کر کے ہی نہ رہ جائیں۔ تم پھر ایک بار میرے سامنے آئی تھیں۔ جھنجھلا کر سگریٹ ادھیڑتی ہوئی۔

پھر میں اس واقعے کو بھول گیا۔ عائشہ اپنے خطوں میں لکھتی رہی کہ تمہارا اور ریاض کا رومان چل رہا ہے ——— اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے محبت کو کامیاب بنانے کی کتنی کوشش کی۔ لیکن ریاض تمہارے ہاں کالے بانک تھا۔ تمہارے دسترخوان کے جھوٹے ٹکڑوں پر پلا تھا۔ پھر چچا ابا کو اس کی سن گن ملی تو ریاض گھر ہی سے نہیں شہر ہی سے نکال دیا گیا اور تم نے بڑے تحمل سے محبت کی اس لاش کو دل کے قبرستان میں دفن کر دینا چاہا ——— لیکن شاید ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ مردار کھانے والے گدھ جو ایسے موقعوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں، اس لاش کو باہر کھینچ لائے، جی بھر کے اس سے لطف اٹھایا اور پھر اسے جہیز کے ساتھ پھینک دیا۔ تمہاری بیماری کو بڑے خوفناک معنی پہنا دیے گئے۔ یعنی یہ سب ریاض کی امانت کو ٹھکانے لگانے کے بہانے ہیں اور تم اپنے کمرے ہی میں نہیں پڑی رہتیں بلکہ ریاض کے ساتھ فرار ہو گئی ہو۔

یہ باتیں میں نے بہت دور بیٹھ کر سنیں اور یہ بات کو یقین کے خانے میں ڈالتا گیا۔ یہ کوئی ناقابلِ یقین بات بھی تو نہ تھی۔ بقول عائشہ کے تم اپنی اہمیت کا احساس دلانے کا فیصلہ کر چکی تھیں اور تم نے ساری دنیا کو ٹھکرا کے اپنی من مانی کرنے کا عزم کر لیا تھا ——— پھر تم جیسی محبت کی ماری لڑکیاں اس سے زیادہ اپنی اہمیت کا کیا ثبوت دے سکتی ہیں ——؟

اس کے بعد جب میں رہا ہو کر گھر آیا تو تم وقت کا ایک اہم موضوع بن چکی تھیں یا عائشہ کے الفاظ میں کچھ کر دکھانے کی دھن میں اپنا رہا سہا وقار بھی کھو بیٹھی تھیں۔

اس دوران میں تم اپنے ماسٹر سے بھی محبت کر چکی تھیں جو تمہیں پڑھانے آتا تھا۔ ایک سیدھا سادہ، خطرناک حد تک شریف انسان، جو اپنی مظلومی اور بے چارگی ظاہر کر کے دوسروں سے رحم کی بھیک مانگتا تھا۔

پہلے اس نے تمہیں شرافت اور عزت کے سبق پڑھائے۔ اپنی بے چارگی اور دکھ کے افسانے سنائے، اس کی مجبوری نے اسے دھوکا دیا تھا محض غربت کی وجہ سے ٹھکرا دیا تھا۔ یہ محبوباؤں کے دھوکا دینے کا دکھڑا بھی کتنا فرسودہ ہو چکا ہے؟ پھر اس کی پیاسی دنیا میں تم نے اپنی ہمدردی کے چند قطرے برسانا چاہے۔ اپنے طرزِ عمل سے اس کا دکھ کم کرنا چاہا، اپنے غم کی کہانی بھی اسے سنا ڈالی ——— پھر کورس کی کتابوں کو ایک جانب سمیٹ کر تسلی اور تسکین کے سبق پڑھائے جانے لگے۔

پھر تمہارا ماسٹر بیمار ہو گیا اور چچا ابّا نے دوسرا ماسٹر رکھنا چاہا تو تم نے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ تم اسی ماسٹر سے پڑھنا چاہتی تھیں اور اس کی مزاج پرسی کے لئے اس کے گھر جانے پر مُصر تھیں۔

یہ ساری باتیں گھر کے چھوٹے بچوں تک نے مجھے سُنائیں۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تمہیں اس ماسٹر سے محبت نہیں تھی، صرف ہمدردی تھی۔ یہ انسانیت، جذبہ ہی تھا جو تمہیں ایک رات چپکے سے اٹھا کر ماسٹر کے گھر لے گیا اور جب تم ابھی دروازہ ہی کھٹکھٹا رہی تھیں کہ چچا ابّا کے ڈنڈے کی ضرب سے بے ہوش ہو گئیں۔

پھر مہینوں گھر والے تمہارے سائے سے اچھوتوں کی طرح بچتے پھرے۔ گھر کی لمبی لمبی ناک والی عورتوں نے خاندان میں نکلنا چھوڑ دیا۔ چچا ابّا نے وقت سے پہلے پنشن لے لی اور سارے خاندان کے ماتھے پر تم کلنک کا جھومر بن کر لہرانے لگیں اور بیچ آنگن میں کھڑی ہو کر تم نے اپنی اماں سے کہا کہ امّی جو میرا جی چاہے گا کروں گی یا پھر آپ لوگ مجھے مار ڈالئے۔ پھر سب نے دوسری بات پر اتفاق کر لیا۔ یعنی تم مار ڈالی گئیں۔ سب نے تم پر فاتحہ پڑھا۔ لیکن شمیم ماموں اس فاتحہ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ دوسرا زخم بھی بھرنے لگا تھا پھر شمیم ماموں کی ناز برداریوں نے اسے مٹا ڈالا تھا ——— وہ تم پر بہت مہربان تھے۔ عائشہ کہتی تھی،

"شمیم ماموں کی عذرا تو قدسیہ کی کلاس فیلو ہے جیسی ان کی لڑکی ویسی قدسیہ، پھر کیسے ایک لڑکی کو گھل گھل کر مر جانے دیں۔" شمیم ماموں، عدالتوں سے اپنی بیوی بچوں سے قطع تعلق کر کے اکیلی زندگی گذار رہے تھے۔ صرف اتنی سی بات پر کہ ان کی بیوی کبھی اچھی ساڑھی نہ باندھ سکیں۔ ایک بار مجھے عائشہ نے لکھا تھا کہ تم بہترین ساری باندھنے پر اسکول سے انعام لے چکی ہو۔ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر تمہیں سیر کرانے لے جاتے تمہارے چہرے میں سارا گھر مینیا دیکھتا، پکنک پر جاتا۔ تم کوئی اعلیٰ ڈگری لینا چاہتی تھیں اور چچا ابّا تمہیں تنہا ہوسٹل میں چھوڑنے پر تیار نہ تھے اس لئے بچارے شمیم ماموں، اپنی وکالت کے بے شمار اہم کام چھوڑ کے، بارہ بارہ بجے رات تک فارسی اور اردو شاعروں کا کلام پڑھاتے اور عشق و تصوف میں ڈوبے ہوئے اشعار کا مطلب تم سے پوچھتے۔

سب کے لڑکے جانے سے پہلے تم خود ہی کسی سے بات کرنا پسند نہ کرتی تھیں۔ دن بھر پلنگ پر اوندھی پڑی نہ جانے کیا سوچا کرتیں۔ کوئی بات نہ کرتا تو شکایت نہ کرتیں۔ شمیم ماموں سر پر ہاتھ پھیرتے تو منع نہ کرتیں۔ ہاتھ پکڑ کے مروڑیں بٹھا دیتے تو بیٹھ جاتیں۔ ممکن ہے تم سے ان کی ویران زندگی دیکھی نہ گئی ہو اور انسانیت کے تقاضے نے مجبور کر دیا ہو۔ مگر تمہاری روش کتنی تعجب خیز تھی۔ ممانی کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا اور سب کی سوالیہ نگاہیں پھر تمہارے چہرے پر گڑ گئیں ——— ایک رات جب شمیم ماموں تمہیں پڑھا رہے تھے۔ کمرے میں کچھ شور سا ہوا۔ پھر تم بغیر دوپٹے کے لجاتی ہوئی کمرے میں آئیں اور پلنگ پر گر کے رونے لگیں۔

پیچھے پیچھے گھر کے سب لوگوں کی لمبی قطار تھی۔ میں بڑی دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھنے لگا۔

چچی نے تمہارے کمزور جسم پر اپنی دانست میں بڑے زوردار دھما کے رسید کئے اور بہت سی مرغیاں کڑکڑانے لگیں۔ جواب میں سسکیاں روک کے تم نے بڑی مشکل سے کہا:

"میں جدھر بھی جاؤں سب مجھی کو بُرا کہتے ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ اتنا کمینہ ہے"

اور مجھے ہنسی آ گئی ——— کوئی مرد ماموں نہیں ہوتا، ماسٹر نہیں ہوتا، شریف نہیں ہوتا، صرف کمینہ ہوتا ہے جو عورت سے سب کچھ لینے کے بعد بھی اسے جھلملاتے آنسوؤں کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتا۔

شمیم ماموں نے سوچا ہوگا کہ اگر ریاض یا ماسٹر نہیں کوئی امانت نہ دے سکا تو وہ کیوں نہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیں۔ جبکہ وہ کسی نظلے بٹھے سے تمہارے فرضی ماموں بنے ہوئے تھے۔

پھر تو ان کی بیوی نے شہر بھر میں یہ خبر عام کر دی کہ تم چاہو تو بیوی بچوں والے بوڑھے مردوں کو بھی بھٹکا سکتی ہو۔ پھر کسی ہیرو نیم ہیرو کی رکھی ہوئی لاکھوں سال پرانی ممی کی طرح تم ایک فائنس کی چیز بن گئیں۔ لمبی لمبی چیتوں کو پھلانگتی ہوئی یہ بات سارے شہر کا گشت لگا کر تمہارے ماتھے پر چپک گئی۔ عورتیں اور بچیاں دور دور سے بچے کھلوں پر ٹکٹکی باندھ کر انگلیاں رکھے تمہیں دیکھنے کو آتیں، مردوں کی محفلوں میں بلند قہقہوں اور فحش گالیوں کے درمیان تمہارا نام آجاتا تو خود بھی اس کھلنے والے باغ میں جانے کو طبیعت مچل اٹھتی۔

الطہر اسی مالِ غنیمت کی امید میں آیا تھا۔

میرا چھوٹا بھائی جو اپنی آوارگی کے سبب حوالات تک ہو آیا تھا، کالج سے نکال دیا گیا تھا اور مستقل طور پر بے ہو گیا تھا کہ اسے کوئی اپنی بیٹی نہ دے گا۔ متوسط طبقے کا ایک بیکار نوجوان جس سے سب لوگ مایوس ہو گئے تھے۔

باہر کی تفریحوں کے علاوہ اور بھی کئی لڑکیوں کو جھانسا دے چکا تھا بلکہ راحت کے متعلق تو مشہور ہے کہ صرف الطہر کی وجہ سے اس کے شوہر نے چھوڑ دیا ہے اور وہ میکے میں دن گذار رہی ہے۔

مگر اتنے سیاہ کارناموں کے باوجود وہ تمہاری جانب سے مایوس نہ لوٹا۔

ساری دنیا سے دھتکارا ہوا بے رحم، منہ پھٹ، چیخ چیخ کر باتیں کرنے والا الطہر جسے آبا روز گھر سے نکال دیتے، امی کوسنے دیتیں اور عائشہ اپنی قسمت پر صبر کر کے بیٹھ جاتی ——— اگر بہنوں کے بھائی قابلِ فخر نہ ہوں تو وہ کتنی بدنصیب نظر آتی ہیں۔ خوبصورت کماؤ بھائیوں۔۔۔ ہیرو پر ہی تو وہ کتنی ہی ناکوں کو اپنے سامنے رگڑوا سکتی ہیں اور عائشہ کی ساری توجہ مجھ پر مرکوز ہو گئی تھی۔ لڑکیوں کے لئے میری خشک اور بے لچک زندگی میں بھی کوئی کشش نہ تھی۔ مگر پھر بھی میری شخصیت کو گھر میں کافی اہمیت دی جاتی تھی۔

تمہاری بارگاہ میں الطہر کو کیسے شرفِ نیاز بخشا گیا یہ بات سب کے لئے حیران کن تھی۔ وہ تو صرف اپنے خوبصورت جسم اور بے باک لہجے سے معرکے سر کرتا تھا اور تم نے ہمیشہ بجھے ہوئے دل اور بیمار ذہن تلاش کئے تھے۔

یہاں پر مجھے اپنی پچھلی ریسرچ بیکار معلوم ہوئی اور اسے اٹھا کر پھینکنے سے پہلے میں نے تم سے راہ و رسم بڑھانا چاہی۔ مجھے گھر میں رہنے کا تعاقب بہت کم ہوتا خصوصاً تم سے تو کبھی بے تکلفی سے بات بھی نہ کر سکا تھا۔ اس لئے ایک گھر میں رہنے کے باوجود ہم بہت دور رہتے۔ تم ہمیشہ مجھ سے چھپنا چاہتیں۔ کیونکہ پہلے دن ہماری ملاقات نے بڑی تلخ فضا پیدا کر دی تھی۔ اس دن ہماری ملاقات باغ کی میز پر ہوئی تھی۔ تم شاید میری سنجیدگی کی وجہ سے عائشہ سے پہلے ہی سن چکی تھیں اور مجذوب اپنے کارنامے پہنچانے سے گریز کر رہی تھیں۔ احتیاط سے سر پر پلو ڈالے نظریں جھکائے یوں بیٹھی تھیں جیسے کسی پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے آئی ہو۔ عائشہ نے میری جانب بڑی بامعنی نظروں سے دیکھ کر کہا تھا:

"بھائی جان! دیکھئے یہ ہیں قدسیہ"۔ ——— عائشہ کی طنزیہ نظروں کو تم نے بیچ میں سے ہی پکڑ لیا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر شکستہ لہجے میں کہا ——— "تو احمد بھائی بھی مجھے پہلے سے جانتے ہیں؟"

اور تم چائے کی پیالی رکھ کر اٹھ گئی تھیں۔

پھر برسات کی ایک شام کو ہلکی ہلکی رم جھم نے موسم بڑا پرکیف بنا دیا تھا۔ بہت دیر تک فیقی کی مرتعش فریادی "پپیہا" کے بعد میں جب بارش کے دھوئیں سے خیالی ہیولے بنا رہا تھا۔

عائشہ، پروین، چھوٹی بھابی اور فرزانہ قریب بیٹھی کیرم کھیل رہی تھیں اور کسی فلم پر زور و بحث کر رہی تھیں جس میں ایک ہیرو دو لڑکیوں سے محبت کرتا ہے اور ٹریجڈی پر ہار اس محبت کو سچی محبت بنانے پر مصر ہے۔ عائشہ کے خیال میں یہ محبت کی توہین تھی یا ہیرو کی بدنصیبی۔

تم ان کے قریب والی کرسی پر بیٹھی سیاہ ساٹن کے ایک ٹکڑے پر ننھے ننھے آئینے ٹانک رہی تھیں جن کی بہت سی شعاعوں نے مل کر تمہارے چہرے پر

مشعلیں سی جلا دی تھیں۔

اپنی رائے کو زیادہ وزنی بنانے کے لئے عائشہ نے مجھ سے پوچھا:

"آپ بتائیے بھائی جان! کیا محبت ایک بار سے زیادہ کی جا سکتی ہے؟"

اور میں نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا "قدسیہ سے پوچھو۔"

تمہارے ہاتھ کام کرتے کرتے رک گئے۔ چہرے پر جلتی ہوئی مشعلیں بجھ گئیں اور تم گہری شکایت آمیز نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ بھابھی اور پروین آہستہ آہستہ ہنسنے لگیں، فرزانہ بات ٹالنے کو گنگنانے لگی اور عائشہ نے داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر میں نے اس خوبصورت شام کا زرتار لباس نوچ کر پھینک دیا۔ رم جھم کا شور مچانے والی بوندیں آنسوؤں کے دھارے بن گئیں۔ فیضؔ کے دو شعر ہاتھ ملا کر مجھ سے ہمدردی کرنے اور کمرے میں اندھیرا بڑھنے لگا۔

"آج موسم کتنا خوشگوار ہو رہا ہے!"

"ہونہہ!"

"جی چاہ رہا ہے کہیں باہر گھومنے جاؤں۔"

"تو جائیے۔" تم حسب عادت مختصر جواب دے رہی تھیں۔

"مگر کوئی ساتھ چلنے والا جو نہیں۔ اطہر نے وعدہ کیا تھا مگر نہیں آیا۔ کتنا غیر ذمہ دار اور جھوٹا ہو گیا ہے یہ لڑکا ——"

جان بوجھ کر اطہر کی برائی کر کے میں نے تمہارے چہرے پر کچھ ڈھونڈا۔ تمہاری آنکھیں سامنے کھلی ہوئی کتاب پر تھیں اور ہاتھ ٹیبل کلاتھ کی شکنیں درست کرنے میں مصروف۔ پھر بڑے طنز سے تم نے کہا:

"اتنے سہانے موسم میں تو وہ کسی بار میں بے ہوش پڑے ہوں گے۔ آپ لوگ تو انہیں اچھی طرح جانتے ہیں نا۔"

یہ تم کہہ رہی تھیں وہ تم جس کے متعلق مشہور تھا کہ سارے خاندان کی عزت ہونے کی ناک پر اچھال کر تم اطہر سے شادی کرو گی۔ سب سے چھپا کر اسے روپے دیتی ہو۔ وہ شراب پی کر آتا ہے تو اس کی پردہ پوشی کرتی ہو۔ اتنے بڑے انسان پر تمہاری یہ عنایتیں کیوں تھیں جبکہ پچھلی زندگی میں کئی قابلِ اعتبار مرد تمہیں دھوکا دے چکے تھے۔

تمہارے متعلق پھیلی ہوئی بدنامیوں کے درمیان مجھے اپنی اچھی رائے بڑی مضحکہ خیز لگی۔ اسے میں نے اپنے دماغ سے کھرچ دیا۔ تم سب کے لئے ناقابلِ فہم بن گئی تھیں۔ بھول بھلیوں کے پیچیدہ راستوں کی طرح تم نے اپنے مکر و فریب کے جو جال بچھا رکھے تھے انہیں دیکھ کر مجھے تم سے نفرت ہو گئی۔ پھر ایک دن بڑی سوچ بچار کے بعد میں کچھ جھجکتا ہوا سا تمہارے کمرے میں آیا۔

"میں تمہارے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہوں قدسیہ! اگر تم مجھے اجازت دو تو ——" اپنی گھبراہٹ پر میں خود متعجب تھا۔ اس دن تمہارے چہرے پر میں نے پہلی بار ڈر کی پرچھائیاں دیکھیں جن پر حیرانی غالب تھی۔ تم یوں کھڑی ہو گئیں جیسے مجسم ماموں تم پر جھپٹنا چاہتے ہیں۔ تم نے دوپٹے کو سینے پر سنبھال کے کہا:

"آپ بھی مجھے جاننا چاہتے ہیں احمد بھائی! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ پھر آپ کیوں کوٹھوں کی دلالی میں اپنے ہاتھ کالے کرنا چاہتے ہیں؟"

اور تم مجھے دیکھے بغیر باہر بھاگ گئی تھیں۔

ان ہی دنوں اتفاق سے مجھے تمہارا ایک خط ہاتھ لگا جو تم نے ریاض کو لکھا تھا مگر اسے بھیج نہ سکی تھیں، یا شاید اسے بھیجنے کو لکھا ہی نہ ہو کیونکہ یہ صرف تمہاری روح کی پکار تھی جس کو ریاض جیسا بے وقوف انسان کبھی نہ سمجھ سکتا۔ اس کی محبت میں تمہاری برتری اور پرستش کا جذبہ غالب تھا اور

اسے روح کی بلندی کبھی نہ دے سکتی تھیں۔ بارش بہت زور کی ہو رہی تھی اور درختوں سے نیچے گرنے والے قطروں کو بچے ہاتھوں میں روک کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ اتنے میں بھائی کا چھوٹا بچہ راشد ٹاؤن سے کوئی کاغذ لے کر آیا۔ یہ نیلے کاغذ پر لکھا ہوا ایک لمبا چوڑا خط تھا۔ نیچے تمہارے بہت ہی بگڑے ہوئے دستخط۔ وہ خط راشد تمہاری اچکن سے نکال کر لایا تھا۔ اپنی شرافت کا ثبوت دینے کے لئے میں نے اسے واپس رکھوانا چاہا مگر ایک بار پڑھنے سے باز نہ رہ سکا۔

میری جانب ملامت آمیز نظروں سے نہ دیکھو۔ ان دنوں میں تم پر ریسرچ کر رہا تھا۔ بیسویں صدی کا ایک مکمل انٹلکچوئل ——— تمہارا یہ خط بہت سی ڈھکی چھپی باتوں کو سامنے لے آیا اور میری رائے پھر ڈگمگانے لگی۔

اس خط میں ریاض کو لکھا تھا کہ بچپن سے تم نے ہر دل میں اپنے لئے حقارت اور نفرت پائی اور صرف کسی کی نظر میں برتری حاصل کرنے کا یہ جذبہ ہی تمہیں ریاض کی جانب لے گیا جو تمہاری طرح سب کی جانب سے دھتکارا ہوا دوسرا فرد تھا۔ ریاض کی نیازمندی اور احساس کمتری نے اسے اور نگہار کر دیا، اور گھر والوں کی مخالفت نے اسے جنگل میں لگی ہوئی آگ کی طرح بھڑکا دیا۔ پھر تم نے ہر قیمت ادا کر کے ریاض کو پانے کا تہیہ کر لیا مگر ریاض کے قدم اس دشوار راستے پر لڑکھڑا گئے۔ آپا کی ایک ڈانٹ پر محبت اچھل کر دور جا پڑی اور وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر بھاگ گیا۔

خط کے آخر میں تم نے اسے خوب ذلیل کیا تھا ——— بزدل تو سمجھتا ہے اس طرح تو نے اپنی محبت کو رسوائی سے بچا کر میری لاج رکھ لی۔ مگر ابھی ہماری محبت شروع ہی کہاں ہوئی تھی۔ پہلے ہی میری عزت کون سے جھنڈے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ میں تجھے وہ دے ہی نہ سکی جو میری زندگی کا بلند آدرش ہے ——— کاش میں تجھے اس بلندی پر پہنچا سکتی، جہاں تک خود میرا ہاتھ بھی نہ جا سکتا۔ اب میری روح اس وسیع سمندر میں اس تنکے کو تلاش کرتی پھرے گی۔

تو اب تم اس تنکے کی تلاش میں خوفناک چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ تم ——— جو موم کی مورتی کی طرح اپنے خالق کے تخیل کی گرمی سے پگھل سکتی تھیں۔ کسی کی تیز نگاہوں سے سُلگ سکتی تھیں۔ پھر اپنے چاروں طرف چھائی ہوئی اس بھیانک آگ میں تمہارے قدم کیسے نہیں ڈگمگاتے ——— ؟

دوسرے دن میں نے اطہر کو تمہارے سامنے خوب ڈانٹا۔

"کل تم مجھ سے وعدہ کرنے کے بعد کیوں نہیں آئے؟ کبھی تو تمہیں اپنے وعدے کا خیال کرنا چاہئے۔ میں یہاں انتظار میں بیٹھا رہا اور بقول آپ کے جناب کسی بار میں پڑے رہے۔"

اطہر کے بے ساختہ قہقہے رُک گئے اور وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے میں نے اسے پھانسی کا حکم سُنایا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بڑا پشیمان میرے پاس آیا۔

"اور اس نے میرے متعلق کیا کہا ——— ؟ اسے میری عادتوں کی خبر ہے؟ کیا اس نے میری شکایت کی تھی۔ وہ بہت رنجیدہ ہو گئی ——— ؟ زندگی میں آج پہلی بار میں نے اطہر کو شرمندہ دیکھا تھا۔ وہ بھی کسی کی شکایت سُننے کو تیار تھا، اس سے متاثر ہو سکتا تھا۔

"یہ تو نئی بات ہے۔ جبکہ تم ہمیشہ سے فریب دیتے آئے ہو اور قدسیہ ہمیشہ فریب کھاتی آئی ہے۔"

"آپ بھی اسے ایسا سمجھتے ہیں بھائی جان!" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"قدسیہ کے بگڑنے پر، اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بڑی بدنصیب لڑکی ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر اسے کچھ دے نہ سکوں تو اس کی پریشانیوں میں اضافے کا سبب بھی نہ بنوں۔ میں سچ مچ بہت بُرا ہوں اور قدسیہ کو فریب دے کر بھی نقصان ہی میں رہوں گا۔"

وہ باہر چلا گیا اور ایک بار پھر تم میرے سامنے نئی گتھیاں لئے آ گئیں اطہر کو فسانہ راستہ اختیار کر رہا تھا!

وہ بے رحم انسان جو اپنے" اور کے آگے کسی پر رحم نہ کر سکتا تھا ——— تم مجھے ایک کسوٹی نظر آئیں جس پر سونا اور پیتل دونوں واضح شکل میں

چمک اٹھتے ہیں۔

"گناہوں کے اتصال سے اتنا پاک جذبہ بھی وجود میں آتا ہے؟"

پھر تمہاری کہانی کا باقی حصہ میں خود نہ دیکھ سکا۔ میری مصروفیتیں مجھے گھسیٹ کر لے گئیں اور وہاں سے مجھے آندھرا کے علاقوں میں جانا پڑا اور آندھرا کی بیدار زندگی اور پُرجوش سرگرمیوں نے تمہاری محبت کی نیم مردہ رنگینی ہوئی کہانی بھلا دی اور گھر میں ہونے والے پچھ ٹے چھوٹے حادثے ذہن کے کسی کونے میں تھک کر سو گئے۔

ایک بار عائشہ نے لکھا کہ اطہر کی مسلسل نافرمانیوں کے سبب اباّ نے اسے عاق کر دیا ہے اور وہ گھر سے چلا گیا ہے اور معلوم ہوا کہ تم اچانک گھر سے غائب ہو گئیں اور کسی نے ایک بار مجھے بتایا کہ تم دونوں اب لکھنؤ میں رہتے ہو۔ چچا ابا اب تمہیں گھر بلانے پر تیار نہیں ہیں۔

اس سے آگے کی کہانی مجھے کسی نے نہیں سنائی مگر میں اس بات کا منتظر رہا کہ اب اطہر اپنا آرسیہ حاصل کرنے کو تمہیں بمبئی لے جائے گا۔ جہاں کئی برس تک ٹھوکریں کھانے کے بعد میں تمہیں ایک دن کسی فلم میں دیکھوں گا۔ ہیروئن کے پیچھے، ایکسٹراؤں میں کولہے مٹکاتے ہوئے کوئی آوارہ سا گیت تمہارے لبوں پر ہوگا، جو تمہارے مصنوعی چہرے، اچھائیوں، پینڈلیوں اور کمر کی نمائش کرے گا۔ تم ایک جھوٹ کا خول ہوگی، سولائیڈ کی گڑیا، جس کی ہر جنبش دوسروں کی تابع ہوتی ہے، اور تم اپنی خودداری کی لاش پر ناچ رہی ہوگی۔

ایک حد سے زیادہ جذباتی لڑکی کے تخیل کی اڑان ہمیشہ یوں ہی کھائیوں میں گر کے دم توڑ دیتی ہے ——— مجھے تم دونوں کے نام سے نفرت ہو گئی۔ عائشہ نے ایک بار لکھا تھا کہ قدسیہ وہاں کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکر ہو گئی ہے، اطہر بیمار ہے اور وہ دونوں بڑی تکلیف کے دن گذار رہے ہیں۔

لیکن میں نے بڑی سختی سے اسے لکھ دیا کہ میں اب قدسیہ کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اطہر کی یہ تبدیلی جتنی نفرت انگیز تھی اتنی ہی تعجب خیز بھی تھی۔ وہ کسی کی شادی کی خبر سن کر بھی مذاق اڑایا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ایک ہی راگ مسلسل لوگ کیسے سنے جاتے ہیں۔ میں تو دو ہی دن میں پاگل ہو جاؤں۔"

پھر اس نے دو سال تک اس راگ کو کیسے سنا؟

امی اپنی قسمت کو رو کر بیٹھ رہیں، ان کی زندگی کے دونوں کھڑوے کھل گئے۔ میں تو خیر اپنی خطرناک زندگی سے انہیں کوئی مخلص نہ پہنچا سکتا تھا مگر ابا یہ بھی برداشت نہ کر سکے کہ اطہر کی قسمت اچانک پلٹا کھائے، وہ کوئی اچھی ملازمت حاصل کر لے۔

پھوپھی کے آنسوؤں نے ابا سے خط لکھوا دیے جس میں اطہر کو اپنی خاندانی عزت اور بے شمار دولت کا واسطہ دیا گیا تھا اور تمہیں اطہر کی محبت کا۔ اور آج عائشہ نے لکھا ہے ——— "بھائی جان! آپ قدسیہ سے نفرت کرتے رہئے کیونکہ آئندہ اس کے متعلق کوئی بات نہیں ہوگی جو میں آپ کو سناؤں گی۔ آج اطہر بھائی کو ابا تنہا گھر لے آئے ہیں، قدسیہ کسی معمولی سی بیماری سے مر چکی ہے۔"

تم زندگی بھر میری عزت کرتی رہیں اور میں تم سے نفرت کرتا رہا۔ یہ ہم دونوں کی اپنی اپنی ذہنیت کا قصور ہے، ادھر منہ کرو ——— تمہاری آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو کیا کہہ رہے ہیں؟

کیا سچ مچ تم کسی معمولی سی بیماری سے مر گئیں! اس چھوٹی سی بیماری کو اپنے نازک جسم پر نہ سہہ سکیں اور اس بیماری کا علاج کسی سے نہ ہو سکا ——— اطہر سے بھی نہیں۔ مجھ سے بھی نہیں جو تم سے نفرت کرتا رہا۔

تمہیں اپنی شکست پر آنسو نہیں بہانا چاہئیں کیونکہ تم نے اطہر کو وہ تحفہ دے دیا جس کے لئے تم زندگی بھر سرگرداں رہیں اور چپ چاپ اندھیرے میں کھو گئیں۔ اب تمہاری روندی ہوئی خواہشیں اور جھلملاتے آنسو ہی مجھے تمہاری موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

تم آج گھٹی گھٹی آہوں اور پیتے ہوئے آنسوؤں سے اس کمرے میں میرے لئے اپنی عزت کا تحفہ لے کر آئی ہو مگر میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا کہ جلتے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں پھینک کر، تمہارے خیال کو بھی ذہن سے جھٹک دوں۔

انورِ عظیم

لڑھکتی چٹان

رات بھر بادلوں کے گرجنے کی آواز آتی رہی۔ جیسے اونچی اونچی پہاڑی چوٹیوں سے مسلسل بڑی بڑی چٹانیں پھسل رہی ہوں، لڑھک رہی ہوں۔

تنگ کمرہ بالکل تاریک تھا۔ اس اندھیرے میں تمام رات چمگادڑ پھڑپھڑاتے اور دیواروں سے سر ٹکراتے رہے تھے۔ شاہد اپنی بیوی کے لچھے دار نرم بالوں میں اپنا منہ لپیٹے پڑا تھا۔ بالوں سے تیل کی ناگوار خوشبو نکل کر اس کے نتھنوں سے ہوتی ہوئی اس کی بے خواب کھلائی ہوئی روح میں تیرتی، گھستی اور رچتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی ناک سے چھوٹتی ہوئی زہریلی سانسیں بالوں کے گھونسلے میں گرمی بھر رہی تھیں۔ اور اس کا تمتماتا ہوا چہرہ اس گھونسلے میں ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح چھپا ہوا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اور جب پہلی بار اس کی نظریں دریچے کے کھلے ہوئے جنگلے سے باہر گئیں تو اندھیرے کا رنگ پھیکا ہوتا ہوا نظر آیا۔ مدھم مدھم، جیسے ہر چیز دھواں دھواں ہو رہی ہو۔ کمرے نے دیواروں میں اٹھتی ہوئی بھاپ کا طوفان سا اٹھا رکھا تھا۔ اسے ہر چیز خواب میں کھوئی ہوئی، ڈوبی ڈوبی معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ اس کے حلق میں کھٹی کھٹی کوئی چیز رقیق سی لیسدار ہوئی محسوس ہوئی۔ جیسے وہ جلے ہوئے پیاز اور مرکے کو چاٹ رہا ہو۔ اس کی طبیعت میں مالش سی ہوئی۔ اس نے اپنا ذہن دوسری طرف پھیرنا چاہا۔ لحاف کے اندر سے گھسیٹ کر اس نے ایک کروٹ کے سے عالم میں ثروت کے بالوں میں چھپے ہوئے چہرے کو اپنے چہرے سے قریب کیا اور اس کے ٹھنڈے لبوں کو چوس کر آہستہ سے بولا ــــ جیسے نشے میں ہو، جیسے اس کا تیزابی نشہ ٹوٹ رہا ہو۔

"میری جان، میری ثروت، صبح ہو رہی ہے آخر صبح ہو ہی گئی۔ آخر صبح ہو ہی جاتی ہے۔ یار خاں کا باپ بھی صبح کو نہیں روک سکتا ..... میری ثروت، میری جان ....."

ثروت کے ہونٹ شاہد کے تھوک سے گیلے ہو گئے تھے۔ اور وہ شبنم میں نہائے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح ٹھنڈے تھے۔ زندگی اور سپردگی کی آگ سے خالی، شاہد کے لب ..... جن سے سڑے ہوئے مرکے اور جلے ہوئے پیاز کی بو آ رہی تھی، بے طرح جل رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور بند آنکھوں میں بجھتے ہوئے انگاروں کی راکھ کسمسا رہی تھی۔ ثروت کا جسم گرم تھا۔ پالتو بلی کے جسم کی طرح نرم۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ پھر بھی شل تھے شاہد کو محسوس ہوا کہ وہ شعلوں کے دریا میں بہتے بہتے ڈوبنے لگا ہے شعلوں کا دریا جم کر برف بن گیا ہے۔ اور اس کے منہ میں برف کی دو ٹانگیں ایک

دوسرے میں چمکی ہوئی، چھپی ہوئی تھیں۔ کیا وہ ثروت ہی کے ہونٹ تھے۔ پھر ان میں وہ آگ کیوں نہ تھی جس میں اُس نے اپنی ساری زندگی کو، زندگی کے سارے رس کو، شعور کے تمام آدرشوں کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔

مٹی جاگ پڑی۔ ثروت نے اُس کی طرف کروٹ لے لی اور مٹی کے پوپلے منہ میں اپنی ٹھنڈی چھاتی ڈال کر اُسے چھکنے لگی۔

شاہد کو اپنی بیوی کا یہ دخل در معقولات بہت بُرا معلوم ہوا۔ اس کو اپنی تنہائی اور محرومی کے احساس نے آدبوچا۔ نیم عنودگی کے عالم میں وہ ایک خواب کے۔ پیلے سے گزر گیا، ٹائپ رائٹروں کی آواز، سپرنٹنڈنٹ کی منحوس کھنکتی ہوئی ڈانٹیں، عینک کے شیشے کو توڑ کر جھپٹتی ہوئی آنکھیں، آنکھوں کی کمین گاہ میں چھپے ہوئے کتے کُدھ، کتی چیلیں، دوسری طرف ہیڈ اسسٹنٹ کا رعب، اس کے مڑے ہوئے دانت، اٹھی ہوئی بدبودار مسکراہٹ، مسکراہٹ کی جھریوں میں کلبلاتا ہوا رحم، جھجھ، ابن، زیم برتری ——— "تم اب تک دفتر کا کام نہیں سمجھ سکے۔ ان فائلوں کو دیکھ کر ریکارڈ تھنک کو لاؤ۔ ہاں! میٹر استعفوں کے دو پیٹے اور سرکاری کام میں بڑا فرق ہے۔ نوکری ہے۔ وعوت کی میز پر رکھا ہوا کیک مکھن کیک نہیں ہے۔ ملائی، ملائی، اوں، اوں ——— ہو ہو ہو ——— "سپرنٹنڈنٹ اسے اسی طرح دھمکایا کرتا تھا۔ اور وہ اپنی سانسیں پھیپھڑوں میں یکجا کر دیتے پر سے اُترتے ہوئے اپنے آفس کے کمرے میں پہنچتے پہنچتے دانت پیس کر کہتا، "معشوق کا بچہ، دو پیٹے کی اولاد، کیک کا سالا ——— اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ وہ بے بسی سے اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی فائلوں کو دیکھتا۔ ان پر رینگتے ہوئے اعداد کے کیچوؤں کو دیکھتا جو خرگوش سے بازی لگا کر تیرتے چلے جا رہے تھے۔ ٹائپ رائٹروں کے مقبروں سے کھٹ کھٹ کا نغمہ پھوٹتا رہتا اور اس کی روح کے پرخچے اڑتے رہتے۔

گذشتہ شام کو ہی سپرنٹنڈنٹ نے اس سے کہا تھا: "مسٹر تم دیکھنے میں آدمی انٹیلی جنٹ معلوم ہوتے ہو لیکن تمہارے کام سے ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ تم ٹیپریری کلرک ہو۔ اگر تم نے کام اچھا نہیں کیا تو تم ہی بتاؤ ——— "

وہ پوری بات بنے بغیر بھنا تا ہوا نکل آیا تھا۔ فائلوں کو میز پر ٹپک کر اور صراحی سے ایک گلاس پانی انڈیل کر کھڑا کھڑا مٹر مٹر اگیا تھا۔ روز روز کی دھمکی، روز کی دھونس، نوکری کی ایسی تیسی۔ چپراسی اُسے گھور رہا تھا۔ اور مسکرا رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آیا: "بابو جی یہ کمالا صاحب بڑا کمائیاں ہے۔ بہتیرا مانگتا ہے مچھلی اکھلے، مٹھائیاں "

شاہد نے بڈھے چپراسی کا منہ دیکھا۔ دو تین بار اپنے پچھے ہوئے گرم کوٹ اور ویک کھائے ہوئے مفلر کو مٹھیوں میں بھینچا اور سکریٹریٹ کی اُداس زرد عمارت سے نکل کر باہر چلا آیا۔

ابھی بس سٹرک پر ہی پہنچا تھا اور بڑے پھاٹک سے باہر نکلنے: الا تھا کہ ایک وزیر کی فاسی کار پھر پھراتی ہوئی نکل گئی۔ یکہ رُکا اور اس میں سے قربان ہوٹل کا مالک نکل پڑا۔

"کہئے شاہد صاحب! آپ نے تو نہ ملنے کی قسم کھا رکھی ہے "

شاہد کا دم گھٹنے لگا۔ یہ بجلی کہاں سے گر پڑی۔ "آخر آپ کا ارادہ کیا ہے۔ کب تک میں یکے کا کرایہ بھرتا رہوں گا۔ "

"بس اب کے ضرور دے دوں گا۔ میں تو خود ہی آپ کے یہاں آنے والا تھا۔ اور کہئے سب خیریت ہے نا؟"

"آپ کی دعا ہے۔ مگر دیکھئے اب کے وعدہ خلافی "

"توبہ کیجئے ——— " اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے اپنے مفلر کو سنبھالتا رہا۔ اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی موت سے ہاتھ ملا رہا ہے۔

اس سے جان چھوٹی تو اس کے ماتھے پر پسینہ تھا۔ وہ کئی مہینے سے اس ہوٹل والے کو جُل دے رہا تھا۔ اُس نے اس سڑک پر چلنا چھوڑ دیا تھا جس پر وہ ہوٹل تھا۔ اسی لئے وہ بس سے نہیں جاتا تھا۔ میں ہوٹل کے سامنے رُکتی تھی۔ اور وہ خطرے کے منہ میں سے گزرنا اس جیسے مرد میدان کا کام نہ تھا۔

وہ پرانے شہر سے لیبر سے روانہ ہوتا اور وقت سے کافی پہلے روانہ ہوتا اور یہاں آکر اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا۔ اس کی اس مصیبت کی وجہ سے اس کی ..... بیوی کو سویرے سویرے اس کا کھانا پکانا پڑتا۔ وہ اسے بار بار کہتی تم بس سے کیوں نہیں جاتے۔ لیکن وہ اس کے مشورے کی اہمیت کو حسب معمول بہت ہی مرعوب کرنے والی باتیں کر کے دبا دیتا تھا۔ بس کیا ٹھکانا تھا۔ اکثر پٹڑی ختم ہو جاتا ہے! اور بس راستے میں بچہ جننے لگتی ہے۔ اب ایسے میں ——— خیر چھوڑو۔ بات یہ ہے کہ آفس میں میری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ میں کام بڑا اچھا کرتا ہوں اور اب کے چانس ہے۔ سپرنٹنڈنٹ ہونے کا۔ میں کسی طرح آفس دیر سے پہنچ کر بدنام ہونا نہیں چاہتا۔ اچھا ذرا کبھی کبھار پودینے کی چٹنی تو بنا لیا کرو ——— بڑا روکھا کھلاتی ہو ——— ثروت کا ذہن بس سے ہٹ کر روکھے کھانے اور پودینے کی چٹنی کی طرف چل دیتا۔

ہوٹل کا قرض تو اس پر اخبار کی نوکری کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ اخبار کی نوکری بھی خوب تھی۔ ایڈیٹر نے ایک وزیر کے اشتہار کا ٹھیکہ لے رکھا تھا وہ روپے دیتا تھا۔ زیادہ بڑا حصہ تو خود ایڈیٹر کے پیٹ میں چلا جاتا تھا۔ تھوڑے سے حصے میں کاتب، چپراسی، کلرک اور شاید جیسے مترجموں کی روٹی کا انتظام ہوتا تھا۔ ایک کا پیٹ بھرتا تو دوسرے کا خالی رہتا۔ اور پھر شاید پراپیڈیٹر کا احسان ہی تھا۔ وہ تو کہتا تھا محض مروت میں اس سے اس جیسے ہونہار نوجوان کی فاقہ کشی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اور اسی لئے ترجمہ اور اداریہ سے لے کر کاپی جوڑنے کا کام تک اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ اپنی میلی قمیص اور بوسیدہ پاجامے میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا۔ ریڈیو سے چیریں اڑاتا، ترجمے کرتا، اور کالمی انچوں کالمی سرخیاں لگاتا جاتا۔ ناراض کاتبوں کی خوشامدیں کرتا جاتا اور جب رات کے دو بجے آخری کاپی جوڑ کر پریس بھیجتا تو اسے محسوس ہوتا کہ اس کا دماغ پگھلے مذر کی طرح شرائے اگلتا ہوا باہر آ رہا ہے۔ وہ چکرا کر دری پر گر جاتا جس پر سطر اخبار، گوند اور دوائیں بکھری ہوتیں۔ وہ کئی کئی دن نہ نہا پاتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی پپڑی سی تہیں جمی رہتی تھیں جب لوگ اس سے نہانے کا مطالبہ کرتے تو وہ جھلا کر کہتا ——— سالے نہانے کو سب کہتے ہیں۔ مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ نہانے کا مطلب ہوتا ہے کپڑا، صابن، تیل ———

اسے جو کچھ بھی پیسہ چھین جھپٹ میں ہاتھ لگ جاتا ثروت کو بھیج دیتا۔ اس نے اپنی بیوی کو اپنے ڈاکٹر ہم زلف کے یہاں بھیج دیا تھا۔ وہ ان دنوں پاکستان میں تھی۔ وہ اسے پیسے بھجوانے کے لئے بے قرار رہتا تھا۔ ملکتے میں اپنے ایک دوست کے ذریعے پاکستانی سکوں میں ہندوستانی سکے تبدیل کروا لیتا۔ اور اس طرح اس کی بیوی کا ہر ماہ ایک شکریہ کا خط آ جاتا۔ اور اس کی جان میں جان آ جاتی۔ ثروت اس کی قربانیوں کو سمجھتی ہے۔ اس کی مصیبت کو سمجھتی ہے۔ ثروت اس سے بے حد محبت کرتی ہے۔

وہ لکھتا ——— میری پیاری ثروت، زندگی کا یہ اندھیرا دور ہونے والا ہے۔ بہت جلد میں ایڈیٹر ہو جاؤں گا۔ میرا ایڈیٹر ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ ایران جانے والا ہے۔ اس کے بعد میں بھی کہیں باہر چلا جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ ہو گی۔ پھر سمندر ہو گا۔ سمندر سے نکلتا ہوا نیا سورج ہو گا۔ سروں پر گاتے ہوئے پرندے ہوں گے ——— گھبراؤ نہیں گھبراؤ نہیں ——— یہ دن ہمیشہ ایسے ہی نہیں رہیں گے ——— کبھی کے دن بڑے ہوتے ہیں۔ کبھی کی راتیں۔ نہیں سمجھیں ——— جاڑے کی راتیں بڑی ہوتی ہیں اور گرمی کے دن۔ یہی حال زندگی کا ہے ——— جاڑے کی راتیں بھی آئیں اور گرمی کے دن بھی۔ لیکن اس کے دن جیسے لمحے ویسے ہی رہے۔ اس کی زندگی گھٹتی گئی بڑھتی گئی۔ اس کے کپڑے میلے ہوتے گئے۔ ہوٹل کا قرض بڑھتا گیا۔ ہوٹل والے نے تو انتظار سے گھبرا کر اب کیریٹیٹ کا پھیرا لگانا شروع کر دیا تھا۔ دو مہینے وہ ٹال گیا تھا۔ لیکن اب کے ٹالنا مشکل تھا۔ اب کے تو اس نے حلق میں انگلی ڈال کر قے کر ڈالنے کا عہد کر رکھا تھا۔

سبزی منڈی کے پاس ہی پہنچا تھا کہ زوروں کی بارش ہونے لگی۔ سامنے پیرٹلم میں موبل آئل کے کنستروں پر اولے برسنے لگے۔ اور چھوٹے سے جنگلے کے سبز پارک میں برف روئی کی طرح بچھ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف روئی دھن دھن کر اڑ رہی ہے۔ اس کی جیب میں پیسے بہت کم تھے۔ مشکل سے دو روپے کا ٹکٹ خرید سکتا تھا۔ اگر وہ تھوڑی دیر اور وہاں پر کھڑا رہتا تو یقیناً بھیگ جاتا۔ اس نے دوڑ کر سامنے کے

پیراڈائز بار میں پناہ لی۔ وہاں یار خاں، اس کے مکان کا مالک کھڑا تھا۔ اس کی تیلی تیلی مونچھیں پھڑک رہی تھیں۔ اور وہ سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ شاہد وہاں سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں مکان کے کرائے کا تقاضا نہ کر دے۔ کہیں کیا یہ تو یقین تھا۔

"کہاں شاہد صاحب! دفتر سے آ رہے ہیں کیا؟" اس کے ایک ہاتھ میں بنڈل تھا جس میں ایک ریشمی ساڑھی چمک رہی تھی۔

"آداب عرض ہے۔ جی ہاں! اُف کتنی خوفناک بارش ہو رہی ہے میں تو پانی سے بچنے کے لئے یہاں چلا آیا۔"

"آئیے اندر آ جائیے۔ باہر کب تک کھڑے رہیں گے؟"

وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ دروازہ خود بخود اسپرنگ سے بند ہو گیا۔ اندر جتنے چہرے تھے۔ اس کے چہرے سے مختلف تھے۔ اس کے چہرے کی سی تھکن، انحطاط، شکست اور گھبراہٹ کسی کے چہرے پر نہ تھی۔

ایک طرف کونے میں ایک سُرخ میز خالی تھی۔ باہر بجلی چمکتی تھی تو شیشے کا رنگین دریچہ جھلک اٹھتا تھا۔ بسکٹ، سگریٹ اور پائپ کے دھوئیں سے اندر کی نم آلود فضا بسی ہوئی تھی۔

میز پر بیٹھتے ہی یار خاں کا لہجہ بہت دوستانہ ہو گیا۔ وہ ایک ہی جست میں آپ سے تم پر چلا آیا۔ "کہو تم کیا پسند کرو گے؟"

"جی؟"

"کیا پیو گے؟" اور اس کی آنکھوں میں ایسی عیاش اور مکار چمک پیدا ہوئی کہ اس کی آنکھیں لومڑی کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں۔

"میں نہیں پیتا۔" شاہد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"بکواس" جب بیرا اس کے سامنے آ کر جھکا تو اُس نے کہا: "سولن وسکی، ایک بوتل۔"

بیرا نے پہلے سولن کی بوتل کھولی پھر دو گلاس لا کر رکھے۔ اور دو پلیٹ میں کباب۔ سوڈے کی بوتلیں پھک سے کھلیں اور بیرے دوسری طرف چلے گئے۔

یار خاں نے ہنستے ہوئے کہا: "تم بہت تکلف کرتے ہو بھئی پینے کے لئے ایک ساتھ بیٹھے ہیں تو فرق کیسا ہے۔ پینے والوں کی ایک ذات ہوتی ہے۔"

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا اندر چلا آیا۔ شاہد کا پورا بدن جھرجھرا گیا۔ کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ بجلی چمکی اور اولے برسے۔ ایک کھدر پوش تنومند باوجی اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک اینگلو انڈین عورت تھی۔ اونٹ کے پیچھے ایک بڑا سا بھورے رنگ کا کتا تھا۔ جسے وہ عورت "ہلو ٹائیگر، ٹائیگر——" کہتی ہوئی چمکاتی رہی۔ وہ کھدر پوش باوجی کے ساتھ کیبن میں داخل ہو گئی۔ اور کتا اپنی دم پر بیٹھ کر کاؤنٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں آئینے کے سامنے منظر میں ایک بلند شیلف میں طرح طرح کی شراب کی بوتلیں چمک رہی تھیں۔ دُلہنوں کی طرح۔

یار خاں نے سنہری شراب گلاسوں میں انڈیلی۔ ماچس سے دونوں کی مقدار کا اندازہ لگایا۔ اپنی نیلی ٹائی کی گانٹھ کو چھو کر دیکھا۔ دور بیٹھی ہوئی چھوکریوں کے پاس بیٹھے ہوئے دو تین کالج کے لڑکوں کو دیکھا جو بڑے لوگوں کے سپوت تھے اور فضا کی رنگینی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اس نے شاہد کو گلاس اٹھانے کا اشارہ کیا۔ شاہد نے گلاس اٹھا لیا۔ اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ شراب لرز رہی تھی۔ سوڈا کی وجہ سے اس کا رنگ ہلکا ہو گیا تھا۔ یار خاں نے اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرایا—— "سرما کی اس حسین شام کے نام" شاہد نے شراب کا گھونٹ پیٹ میں انڈیل لیا۔ اس کے جسم میں ایک تلخ سی حدت دوڑ گئی۔ وہ اپنے لب چبھتے ہوئے یار خاں کو دیکھنے لگا۔ جو اپنے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال رہا تھا۔

شاہد نے اس کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ اُس کی میخواری کا بڑا چرچا تھا۔ وہ روز شام کے بعد کسی نہ کسی بار میں پہنچ جاتا تھا اور کسی نہ کسی نئے آدمی کو پھانس لیتا تھا۔ اور اُسے اپنی جیب سے شراب پلاتا تھا۔ جب میر ہو جاتا تھا تو نشے میں اُسے چھوڑ کر روانہ ہو جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ کہ نئے آدمی کو نشے میں گالیاں دینے اور اس کی زندگی کا حال سننے اور سنانے میں بڑا مزا آتا ہے۔ پرانے لوگوں کے ساتھ شراب پینے سے شراب بھی پرانی ہو جاتی ہے۔

دو تین گھونٹ حلق میں اُترنے کے بعد شاہد کی مردانگی مٹنے لگی۔ اُس نے اپنی ہتھیلیاں ملیں۔ آنکھیں جلدی جلدی جھپکیں۔ جیسے اب کسی پرندے پر بندوق سے نشانہ باندھنے کا ارادہ کر رہا ہو۔ "لاؤ آج اس خاص مالکِ مکان کو بھی جھیل لوں۔ اور اس طرح جھیلوں کہ یہ سالا بھی کیا یاد کرے گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم ایک شریف آدمی ہو۔ کئی بار میرے منشی نے تمہاری شکایت کی کہ تم وقت پر کرایہ نہیں دیتے۔ خیر یہ تو ایسی بات ہے جسے بار میں چھیڑنا غلط ہے۔ کیوں؟"

"آپ کا خیال درست ہے۔" شاہد نے جھلا کر اور ایک حد تک بیزار ہو کر کہا۔

"ہا ہا ہا۔ تمہاری بچی بہت شور مچاتی ہے معلوم ہوتا ہے اسے دودھ نہیں ملتا۔ تم ماما کیوں نہیں رکھ لیتے لیکن جب تم کرایہ وقت پر نہیں دے سکتے تو پھر ——— خیر چھوڑو۔"

شاہد کے کان جل اٹھے اور اُس نے اپنے مغز کو اتنی سختی سے مروڑنا شروع کیا کہ وہ اس کے لئے پھانسی کا پھندا بن گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ صور مجھے چھیڑنا چاہتا ہے۔ سننا چاہتا ہے۔ سمجھتا ہے اس طرح کچھ کہہ کے لگا کر اپنا کرایہ وصول کر لے گا۔ بڑا خبیث ہے۔ ذلیل کرتا ہے۔ حالانکہ اب میں جس منزل پر ہوں وہاں ذلت اور عزت ایک ہی انڈے کے چھلکے ہیں زردی اور سفیدی کی طرح جذب ہو جاتی ہے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے گلاس اٹھایا اور ایک بڑا سا جلتا ہوا شراب کا گھونٹ مزا لے لے کر حلق کے پار اتار دیا۔ گلاس کو ہاتھ میں پکڑے گھورتا رہا۔ پھر مسکرایا اور پھر ایک گھونٹ حلق میں انڈیل لیا۔ یہاں تک کہ گلاس خالی ہو گیا۔ اُس نے جھٹکے سے گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ اتنے زور سے کہ یار خاں چونک گیا۔ اور قریب کی میزوں پر بیٹھے ہوئے کچھ لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔

"شاہد تم آدمی کچھ دار معلوم ہوتے ہو۔"

"یہ تو واقعہ ہے۔"

"بہت خوب۔"

شاہد نے چیچ مین کے ٹین سے ایک سگریٹ نکالی، سُلگائی اور رسیانہ ٹھاٹھ سے دھواں پھینکنے لگا۔ اور پھر اس خود پرست نظر سے اُس نے یار خاں کو دیکھا کہ وہ بھی گھبرا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود یار خاں اُس کی میز پر بیٹھا اس کی بھلائی ہوئی شراب پی رہا ہو۔

"اچھا بتاؤ تم کتنے اسٹیشن تک چلتے ہو؟"

"میں یہاں سے دہلی تک جا سکتا ہوں۔ یہاں سے لندن تک کتنے اسٹیشن ہیں۔ تم ہی بتاؤ، بتاؤ، ہاں بتاؤ، بڑے آدمی بنتے ہو بنگلے میں رہتے ہو ——— ہو ہو ہا ہا ہا۔" وہ پورا گلاس پی گیا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اور ان میں نشاط انگیز چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"میرا مطلب ہے تم کتنے پیگ پی سکتے ہو؟" یار خاں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں پوچھا۔

"تو پھر سیدھی طرح کیوں نہیں پوچھتے، کتنے اسٹیشن، کتنے اسٹیشن ——— تم پیگ کو اسٹیشن کہتے ہو۔ کچھ لوگ ایک پیگ کو ایک زینہ کہتے ہیں۔ اب پوچھو گے تم کتنے زینے چڑھ سکتے ہو۔ میں قطب مینار پر چڑھ سکتا ہوں ——— تمہارے سر پر چڑھ سکتا ہوں۔" وہ ایک پیگ اور چڑھا گیا۔ اب وہ خود ہی پیگ پیگ بنا رہا تھا۔ اور یار خاں کو پیچھے چھوڑتا ہوا پیتا چلا جا رہا تھا۔

یار خاں کا منہ لال ہو گیا۔ اُس نے اپنے ہونٹ چباتے اور ارد گرد نظر دوڑائی۔ کبھی کبھی لوگ ان کی میز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ بغل میں ایک میز پر ایک حسین سی سکھ عورت فرکا لانگ کوٹ پہنے مینجر پر سپ کر رہی تھی۔ اور سردار جی موج میں آکر قہقہہ لگاتے اور ایک آدھ دھول جڑے پیار سے اس کے کندھے پر جماتے۔ اس کا موٹا ہاتھ بلی کے روئیں کی طرح نرم کوٹ میں چھپ جاتا۔ پھر دونوں قہقہہ لگاتے۔

شاہد کو زور سے ہچکی آئی۔

"تم بہت پی گئے ہو۔ اب تم گھر چلے جاؤ۔"

"تم گھر جاؤ۔ میں تو ابھی اور پیوں گا۔ میں دہلی اسٹیشن تک جاؤں گا۔" شاہد نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"بیکار بات ہے۔ اب مت پیو۔ میں سمجھتا تھا۔ تم ڈھنگ کے آدمی ہو۔ تم شراب ہضم بھی نہیں کر سکتے۔"

"کیا کہا ——؟" اُس نے اپنے کان پکڑتے ہوئے "لو معافی مانگتا ہوں۔ اب گستاخی نہیں کروں گا۔ بس پینے دو مجھے —— بس پینے دو مجھے۔"

اُس نے گانے کی سی آواز میں ایک ایک لفظ کو کھینچ کر ادا کیا۔

تھوڑی دیر شاہد بڑی متانت سے بیٹھا رہا۔ وہ خرگوش کی آنکھوں کی طرح اپنی سُرخ آنکھوں کو ادھر اُدھر گھماتا رہا۔ دھوئیں سے بھرا ہوا ہال ٹھنڈا تھا۔ برف کے سے قہقہے، برف کے سے گلاس، برف کے سے سفید بیروں کے سائے۔ کھدر پوش یا بو کا برف کی طرح خاموش ٹائیگر۔ سب کچھ برف تھا۔ شراب برف، تولیں برف، مسکراہٹیں برف، اٹھائیں برف۔ برف حیات، برف موت —— صرف اسے اپنا وجود آتشیں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ہنسا اور گویا اس کی روح کا منہ توڑ کر لاوے پھوٹ رہے تھے۔ لیکن برف ہال کے باہر برس رہی تھی۔ اور برف ہال کے اندر جم رہی تھی۔

اب یار خاں سرور میں آگیا تھا۔ یکایک اُس کی گنگناہٹ ختم ہو گئی۔ اس کی آنکھیں مونچھوں کے اوپر سُلگ اٹھی تھیں۔ اور باہر نکل آئی تھیں، اس نے بھی پورا گلاس حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"اب گلپ کا وقت آگیا ہے۔ رات پُراسرار ہو گئی ہے۔ خون چیخ رہا ہے۔ کیا چیخ رہا ہے —— بتاؤ —— بتاؤں —— بتاؤں —— عورت، عورت" —— اُس نے بوتل کی تہ میں چمکتی ہوئی زیتون کے رنگ کی شراب اپنے گلاس میں انڈیل لی اور بغیر سوڈا ملائے اسے اپنے منہ سے لگا لیا۔

"شاہد تم سے ملاقات ہو گئی اچھا ہوا۔ میں اکیلا نہیں پیتا۔ یہ میری شان کے خلاف ہے۔ لیکن عام طور پر مجھے اونچے درجے کے لوگ مل جاتے ہیں۔ تم ذلیل آدمی ہو۔ تمہارا الیاس بھی ذلیل ہے۔ تم میرے مکان میں رہتے ہو۔ مجھے کرایہ بھی نہیں دیتے۔ تمہاری تنخواہ کے میرے ملازم ہیں۔ تمہاری بیوی عشق لڑاتی ہے تو تمہاری روٹی چلتی ہے۔"

"چپ سؤر کے بچے۔ چپ۔ چپ۔ چپ" شاہد کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ اُس نے گلاس کو دبوچ لیا۔ یار خاں چپ ہو گیا۔ "تم نے مجھے شراب پلائی ہے تو کیا تم گالیاں بکو گے؟"

یار خاں نے بیرے کو بلا کر دو گلاس رم کے منگائے اور شاہد سے کہا "پی لو" شاہد پی گیا۔ شاہد کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

جانتے ہو شاہد، میرا بھتیجا ہی میرا منشی ہے۔ میں اس کی پرورش کر رہا ہوں۔ جاہل ہے، آوارہ ہے۔ خاندان کا شریف ہے جیسے تم خاندان کے شریف ہو۔ پہلے تمہاری شکایت کرتا تھا۔ اب وہ شکایت نہیں کرتا۔ اور یہ بری بات ہے۔ سوال کرنے کا ہے۔"

"یار خاں تمہارا کرایہ تمہیں مل جائے گا۔ مگر مجھے گالی نہ دو۔ میری فرزوت بہت پیاری عورت ہے۔ وہ گالی ہے وہ شہد ہے ——

اور اب میں جاتا ہوں تم اپنے بھائی کو امریکہ بھیجنا چاہتے ہو بھیجو۔ تم تیسری جنگ کا انتظار کر رہے ہو کرو۔ تم نفع کمانا چاہتے ہو کماؤ۔ مجھے گالی نہ دو۔"

"بیٹھو بیٹھو ——— یہ سب میرے بھتیجے نے بتایا ہوگا۔ اکو کا بیٹا بہت حرامی ہے۔ لیکن اس میں حرج بھی کیا ہے۔ پچھلی لڑائی میں کتنے رئیس بن گئے۔ میں بھی ———"

"میں اب جاتا ہوں۔" شاہد کھڑا ہو گیا۔

جب وہ بھیگتا ہوا بس سے اترکر گھر پہنچا تو اس کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ اس نے آواز دے کر دروازہ کھلوایا۔ ثروت کی آنکھیں خواب سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ شاہد نے اپنی نشہ سے بھری ہوئی آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا۔ "ثروت یار خاں بہت برا آدمی ہے۔ وہ خبیث ہے۔ اس نے مجھے شراب پلائی ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے معاف کر دو۔" اس نے اپنا منہ ثروت کی گود میں ڈال دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دیر تک چارپائی میں ثروت کے پاس سویا ہوا وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ثروت کے لیے ہی اپنی زندگی کی بلندی سے کود پڑا تھا۔ اس کے دوست، اس کے ساتھی، اس کی عملی سیاسی زندگی اس سے چھوٹ گئی تھی۔ وہ بڑا خطرناک زمانہ تھا۔ اس کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ وہ ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند تھا۔ اسے مچھر کاٹے کھا رہے تھے۔ وہ بار بار موم بتی جلاتا تھا۔ اور کوئی ہوا کا تیز جھونکا آتا تھا۔ اور موم بتی بجھ جاتی تھی۔ پولیس مزدوروں کے علاقے میں دورے لگا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے اور اس وقت اسے اپنی بیوی کے خیال نے آ جھپٹا تھا۔ ثروت کی بڑی بڑی بیتاب پلکیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ابھی چند دن پہلے ہی جب وہ اس سے ملا تھا تو اس نے اس کے کان میں کہا تھا۔ "آپ کچھ نہیں سمجھتے۔ آپ کچھ تو سمجھئے۔"

"کیا، کچھ کہو بھی تو۔ تم کہتیں تو کچھ نہیں اور مجھے کند ذہن کہتی ہو۔"

"کچھ پیسے جمع کر رکھئے۔ ہم تین ہونے والے ہیں۔"

شاہد کی سانسیں رُک گئیں۔ اس نے ثروت کے گھنے بالوں کو اس کے چہرے پر بکھیر دیا تھا۔ اور بڑی سرگوشی کے سے انداز میں بولا تھا۔ "ہو جائے گا سب ہو جائے گا۔"

شاہد کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ اس کا وہ جھوٹ تھا جو وہ ثروت کے سامنے ایک خوبصورت زندگی کا عین نقشہ کھینچتا چلا جاتا تھا۔ اس میں اس کی کبھی ہمت ہی نہ ہوتی۔ کہ وہ اسے ان تمام تلخ حقیقتوں سے آگاہ کر دے۔ بتا دے کہ اس کے گھر کی چھتیں کبھی مرمت نہیں ہوں گی۔ یہ چھتیں گر جائیں گی۔ کمرے برسات میں مٹی کے گھڑے کی طرح پگھل کر بہہ جائیں گے۔ چھتوں کی مرمت اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک کہ ایک نئی زندگی، کھیتوں میں، اگاؤں میں، شہروں میں جنم نہ لے۔ اور ابھی اس میں دیر تھی۔ ابھی ہزاروں چھتیں اور بیٹھنا تھیں۔ ابھی ہزاروں دل اور خون ہونا تھے۔ یہ سب اس کی زبان سے کبھی نہ نکلا۔ وہ ثروت کے گھر کے کھلے، روایتی اور بے رنگ جاگیردارانہ ماحول میں اپنے آپ کو بے بس پاتا تھا۔ اس کا سارا شعور باہر کے لئے وقف تھا۔ وہ ثروت کے پاس پہنچ کر تیزی سے جھکتا تھا اور جھکتا چلا جاتا تھا۔

"آپ جب بڑی تنخواہ پانے لگیں گے تو بڑا اچھا رہے گا۔ ایک چھوٹا سا سفید مکان بنوائیں گے۔ باورچی خانے کا حصہ الگ ہوگا جس کی چمنی سفید رنگ کی ہوگی۔ باغ میں جوہی، بیلا اور موتیا لگائیں گے۔"

"ضرور لگائیں گے اور میں پھول توڑ کر تمہارے بالوں میں لگاؤں گا۔ ایں؟" وہ چاندنی میں چمکتے، اونگھتے کمانوں کے جھونپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہتا۔ الاؤ کی چمک اس کی سسرال کی پچھلی دیوار تک پہنچتی تھی۔

"ریڈیو کتنے کا ہوتا ہے؟"

"ریڈیو ——— لاحول ولا ——— ریڈیو کی فکر نہ کرو۔ وہ آج کے ہر شریف گھر میں ہوگا۔ میں کوئی معمولی آدمی ہوں۔ میں بڑا اٹھکیلوں ہوں۔ لیکن تم اٹھکیلوں کے معنی نہیں جانتیں؟"

ثروت بتشکل سے خط لکھ سکتی تھی۔ وہ البتہ متوسط گفتی ضرور جانتی تھی۔ اس کا سارا جادو اس کی آنکھوں میں تھا۔ اس کے ہونٹوں کی خواب آلود مسکراہٹوں میں تھا۔ جیسے کسی شاخِ گل پر کوئی دو پہلی چڑیا پر تول رہی ہو۔ جیسے بہار کی صبح گا رہی ہو۔ اس کی بے خودی نے شاہد کو ایسی تمناؤں کا شکار بنا دیا تھا۔ جو اس کی موجودہ زندگی کبھی پوری نہیں کر سکتی تھیں۔

شاہد اس جھونپڑی میں بیٹھا اپنے تمام وعدوں کو یاد کر رہا تھا جو اس نے شہد کے بلبلوں کی طرح ثروت کے کانوں میں اس کے خون میں اتار دئے تھے۔ جب دوبارہ موم بتی جلی تو اسے گپتا کی تیز تیز کی طرح چبھتی ہوئی آنکھوں ——— سے بڑا ڈر معلوم ہوا۔ یہ کامریڈ اس طرح کیوں گھور رہا ہے۔

"کامریڈ تم بہت گھبرا گئے ہو۔ روپوشی کا پہلا تجربہ ہے نا؟"

"ہاں!"

"ڈٹے رہو سب خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی ہتھکڑی اور پھانسی کی بہت منزلیں آئینگی۔ اس موڑ سے گزرنا مشکل ہے۔ لیکن گزر جاؤ گے تم۔ مجھے یقین ہے۔"

"آخر تم مجھے اتنی نصیحت کیوں کر رہے ہو؟"

"یونہی۔ اس لئے کہ میں اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"

وہ رات بھر نہیں سویا تھا۔ کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ ثروت کی آنکھیں اسے پکارتی رہی تھیں۔ وہ اس کا کون تھا جو اس کے شوہر نے اپنے آقا کو زہر دے کر حاصل کیا تھا اور خود اس کی بیوی کو بیاہ لیا تھا۔ پھر بڑی خاصی زمینداری اس کی ہو گئی تھی۔ اس کے زمیندار سسر کے چہرے پر ہمیشہ محرم کی دسویں تاریخ لکھی رہتی تھی۔ اور یہ کیلنڈر کبھی نہیں بدلتا تھا۔ وہ ثروت کو اپنی قہر بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوگا۔ ثروت اس پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کٹیا میں بند تھا۔ اس کے پرانے مکان کی چھت پر ثروت بال کھولے کھڑی تھی۔ چاند بادلوں میں تیر رہا تھا۔ اور اس کے پیٹ میں خون ایک زندگی کی گردش کھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اور وہ اسے پکار رہی تھی۔ اور وہ اس اندھیری کٹیا میں بند تھا۔ جہاں موم بتی جلتی تھی اور بجھ جاتی تھی۔ جہاں گپتا اسے نصیحت کر رہا تھا اور اس کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ لیکن اس کی ہمت تنکے کی طرح ثروت کے آنسوؤں میں بہتی چلی جا رہی تھی۔

شاہد صبح سویرے کٹیا سے غائب ہو گیا۔ گپتا گرفتار ہو گیا اور اس کے گھر پر جاسوسوں کی آمد و رفت بے تکلف شروع ہو گئی۔ اس کا رشتہ، اس کے پیارے اصولوں سے قربانیوں سے، ساتھیوں سے کٹ گیا۔ اور وہ زندگی سے بھاگ کر ثروت کی آغوش میں چھپ گیا۔

اس رات کو جب یار خاں کے پاس سے شراب پی کر آیا اور ثروت کے پاس سو گیا تو وہ دیر تک نیند سے محروم رہا۔ زندگی کے واقعات اس کے سینے میں چبھتے رہے اور اسے اب لگا کہ اس کے سینے سے ثروت نہیں لگی ہوئی تھی۔ بلکہ اس کی شکست کا کانٹا تھا۔ جو اندر اور اندر چبھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ثروت بھی اس کی وحشت سے ڈر رہی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم ڈر رہی ہو۔ آج یار خاں نے مجھے گالی دی ہے۔ میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گا۔"

"تم سو رہو، تم نے بہت پی لی ہے۔"

"ہاں میں سو رہوں گا۔ تم بھی سو رہو۔ منّی بھی سو رہے گی۔ ساری دنیا سو رہے گی۔ بھلا یار خاں جاگتا رہے گا۔ اُس نے مجھے شراب دی ——— اُس نے مجھے گالی دی۔ اُس کی ایسی تیسی ——— تمہاری ایسی تیسی۔" تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بڑبڑاتا رہا اور پھر سو گیا۔

جب اس کی آنکھیں دوبارہ کھلیں تو دور میل کی چھنگ پر میلی دھوپ اپنے اجلے پرکھاتی ہوئی نظر آئی۔ اُس کے منہ میں ابھی تک جلے ہوئے پیاز اور سڑے ہوئے سرکے کا مزا باقی تھا۔ اس نے اپنا منہ بگاڑ کر ایک انگڑائی لی۔ کمرے کے باہر سے کسی کے بات کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ثروت کا قہقہہ آہستہ سے گونجا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ سلاخوں سے بھری ہوئی چھت کی طرف دیکھا۔ چولھے سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔ کبھی آنچ بھڑک کر نکلتی تھی۔ دھوئیں کے مچھوں میں سونا سا گھلتا ہوا نظر آتا تھا۔

ثروت چولھے کے پاس سے اٹھی اور رات کا بھیگا ہوا شاہد کا پاجامہ نچوڑنے لگی۔ اس کی آستین اوپر چڑھی ہوئی تھی۔ اور اس کی پتلی کلائی میں چوڑیاں چھنک رہی تھیں۔ چوڑیاں دھانی رنگ کی تھیں اور نئی ہونے کی وجہ سے چمک رہی تھیں۔ جب دوبارہ کسی کے بولنے کی آواز آئی تو شاہد باہر نکل آیا۔ یار خاں کا منشی اسٹول پر بیٹھا کش لگا رہا تھا۔

"کیوں شاہد صاحب کب تک کرائے کا انتظار کرائیں گے آپ؟"

"اب زیادہ انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ اطمینان رکھئے۔"

"یار خاں نے آج صبح ہی صبح ڈاکا تو میں چلا آیا۔ مجھ سے آپ کی بیوی کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔"

"تکلیف وکلیف چھوڑیئے۔ آج ہی تنخواہ ملے گی۔ اور آج ہی آپ کا حساب صاف ہو جائے گا۔ کہہ دیجئے گا یار خاں سے۔ ہاں ——— اچھا تو یہ بات ہے۔ بڑے زور پر ہے مزاج۔ اچھا بھائی یہی سہی۔" جاتے جاتے منشی نے ایک خاص نظر سے اپنے کالروں کو اوپر کھینچتے ہوئے اور پتلون کی کریز سیدھی کرتے ہوئے ثروت کی طرف دیکھا۔

جب منشی چلا گیا تو ثروت نے طیش میں آ کر کہا: "آپ کرائے کے پیسے بھی ادا نہیں کرتے اور اوپر سے رعب گانٹھتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ منّی کو لے کر میں سڑک پہ مادی مادی پھروں۔"

"کیا مطلب؟ ——— اچھا تو یہ بات ہے؟"

اب جو اس نے اپنا حلیہ دیکھا تو نشہ اتر گیا۔ وہ اپنی بیوی کا پیٹی کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ رات اسے کچھ خبر ہی نہ تھی۔ وہ جلدی سے کمرے میں گیا۔ اور سوٹ کیس میں اپنے کپڑے تلاش کرنے لگا۔ اس کا پھٹا ہوا پاجامہ نکل آیا۔ ساتھ ہی اس کے ایک نیا دوپٹہ، ایک خوبصورت سی ریشمی شلوار اور جمپر بھی سلا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پاجامہ گر گیا۔ وہ ان اجنبی کپڑوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے دریچے سے باہر بھیگی ہوئی دیواروں کو دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے غریب اور گھٹے ہوئے مکانوں کو، اور اس کے آگے یار خاں کے بڑے سے مکان کو جس کی کھڑکیوں پر نیلے دھاری دار پردے ہل رہے تھے۔ اور اس کے باغ میں پھولوں کے نہ جانے کتنے کنول جل اُٹھے تھے۔

وہ خاموشی سے اپنے کمرے سے نکلا۔ سر جھکائے ہوئے اُس نے کھانا کھایا۔ جب جانے لگا تو ثروت نے کہا: "آج آلو اور چاول ختم ہے۔ تنخواہ کے روپے میں سے منّی کا گرم کپڑا ضرور لیتے آیئے گا۔"

"کہاں سے آنا چاہئے گرم کپڑا؟"

"بازار اور کہاں سے؟"

"اور کرایہ کہاں سے دیا جائے گا؟"

"کرائے کا بعد میں دیکھا جائے گا۔ ہماری بچی سردی میں ——— خدانہ کرے کچھ ہو گیا تو؟"

وہ جب اپنی سڑک کے موڑ پر پہنچا۔ تو اس کی ملاقات گپتا سے ہوگئی۔ وہ بہت دبلا اور کالا ہو گیا تھا، وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔ وہ بیڑی پیتے جا رہا تھا۔

"کیوں شاہ صاحب اب تم کیسے ہو؟ تمہارے بارے میں مَیں نے بہت بُری بُری خبریں سُنی ہیں۔"

شاہد کی آنکھیں جھکی جا رہی تھیں۔ اور صرف کھسیانی سی ہنسی ہنسے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گپتا کسان سبھا کے دفتر میں چلا گیا جاتے ہوئے اس نے شاہد کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہتا گیا ــــ "شاہد انسان کمزور ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم ہار گئے۔ میں جیل سے ہو آیا۔ زندہ ہوں۔ تم جیل سے باہر ہو ــــ میں نہیں جانتا تم اپنے آپ کو زندہ محسوس کرتے ہو۔ کیا تمہارے مسئلے حل ہو گئے ہیں؟ تم خوش ہو؟ اچھے ہو؟"

شاہد ایک مجرم کی طرح سر جھکائے ہوئے آگے چلا گیا۔ اس دن بار بار اس کے ذہن میں گپتا کا کالا، طنز کرتا ہوا، بیڑی کا دھواں پھینکتا ہوا چہرہ اُبھرتا ڈوبتا رہا۔

شام کے وقت اسے تنخواہ ملی۔ اس کے ساتھ ہی اُسے سپرنٹنڈنٹ کا وارننگ لیٹر ملا۔ "ایک مہینہ اور موقع دیا جاتا ہے۔ اگر کام میں ترقی نہیں ہو سکی تو تمہارا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو چھانٹی کی فہرست میں ہیں۔"

ہوٹل کا مالک بھوت کی طرح آموجود ہوا۔ اس نے بہت جُل دینا چاہا۔ لیکن وہ پیچھے لگا رہا۔ یہاں تک کہ وہ آخر پچھلے دروازے سے ہو کر نکل بھاگا۔ دوڑ کر رکشے پر بیٹھا اور اسٹیشن کی راہ لی۔ گاڑی چلنے ہی والی تھی۔ کہ ہوٹل کا مالک ڈبے میں داخل ہو گیا اور اسے کھینچ کر باہر نکال لایا۔

"شرافت سے روپے دے دو۔ چور کا دیتے ہو۔ شریف بنتے ہو۔ آج میں چھٹی کا دودھ اُگلوا دُوں گا۔"

اور جب شاہد نے اپنی جیب سے چالیس روپے نکال کر اس کی ہتھیلی میں رکھے تو واقعی اُسے محسوس ہوا کہ اس نے چھٹی کا دودھ اُگل دیا ہے اس کی آنکھوں میں تیزاب سا بھر گیا تھا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے ڈبے میں واپس آیا۔ تماشائیوں کی آنکھیں اُسے ملامت کرتی ہوئی نظر آئیں۔ آنکھیں اس کے چاروں طرف ناچ رہی تھیں۔ لیکن ایک آنکھ سے بھی ہمدردی کا نور نہیں چھن رہا تھا۔ انسان انسان کی ذلتوں، غلاظتوں اور پستیوں سے اپنے لئے کتنی تسکین پیدا کر لیتا ہے۔ وہ گھبرا کر ڈبے سے اُتر گیا۔ گاڑی چل دی۔ چھک چھک۔ اور اُسے معلوم ہوا کہ اس کے ہاتھوں سے دس دس کے نوٹ اڑے چلے جا رہے تھے۔ چھک چھک۔ اور مسافر چوچلے گئے تھے۔ وہ بھی کھینے تھے۔ شام ہو گئی تھی۔ اس کے دل سے غم اور اداسی کے سیاہ سونے پھوٹ رہے تھے۔ جیسے رات کا میل اس کی آنکھوں میں جل رہا ہو۔ اس کی روح میں ٹپک رہا ہو۔

جب اندھیرا ہو گیا تو پھر گذشتہ تمام کی طرح اسی بار میں گھس گیا ــــ پیراڈائیز بار جس کے دروازے پر اردلی بیٹھا ہوا تھا اور جس کے لمبے سفید کوٹ میں پیتل کے بٹن چمک رہے تھے۔

اُس نے اپنی جیب سے روپے نکالے۔ ترسٹھ روپے۔ اُس نے اداس نظریں نچائیں بار بھرا ہوا تھا۔ کھچا کھچ۔ فضا صاف تھی۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اور آسمان ننگا نظر آ رہا تھا۔ ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ کاریں گذر رہی تھیں۔ اور دور امپیریل بنک کی عالی شان عمارت کے پیچھے چاند سونے کی روٹی کی طرح تھرتھرا رہا تھا۔ اور ایر وڈرم سے فلیش لائٹ کی شعاعیں گندھک کی جھاڑو کی طرح آسمان کا منہ جھاڑنے کے لئے اُٹھتی تھیں۔ لپکتی تھیں اور ناچتی تھیں۔

"میرا آج میں سب سے قیمتی شراب پیوں گا۔ اسکاچ ہے؟"

بیرے نے سر ہلاتے ہوئے اپنے دانت نکال دیئے۔

اس نے اسکاچ کو گلاس میں انڈیلا۔ سوڈا ملایا۔ چاروں طرف دیکھا۔ دل میں زور سے چیخا۔ "دیکھو یار خاں کے بچے، عیش کرنے والے کہ طرح عیش کرتے ہیں۔" اور جب شراب کا سونا طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں کی طرح اس کے پیٹ میں اتر گیا تو اس نے بیرے کو قریب بلایا "انڈے لاؤ۔ ہاف فرائیڈ ——"

جب بیرا انڈے لے کر آیا تو وہ اپنا گلاس خالی کر چکا تھا۔ اس نے دل میں کہا۔ "اسکاچ شراب صبح کی طرح سبک، عورت کے سینے کی طرح گرم اور حسین ہوتی ہے۔"

"بھئی مجھے لوہے کا پرمٹ مل گیا ہے۔"

"تمہاری گیتا تو غضب کرتی ہے۔ ٹینس میں اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"یار میں ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔"

"ڈارلنگ کشمیر کب چلیں گے۔ دہلی سے ایرلفٹ اچھا رہے گا۔"

"دیکھو وہ لونڈیا کی کمر ہے یا بید مجنوں۔"

"تم گھاس کھا گئے ہو۔ ارے یہ تو مصنوعی کمر ہے۔ اصلی کمر تو وہ گھر چھوڑ آئی ہے۔"

"اور تم اپنی عقل نیلام گھر میں چھوڑ آئے ہو بیٹا۔"

"دیکھو مالا کیا پھٹے حال میں ہے۔ چہرے پر پھٹکار ہے مگر اسکاچ سپ کر رہا ہے۔ ہو گا یار کوئی پاکٹ مار۔"

وہ ان جملوں کی آندھی میں تار در خت کی طرح جھومتا رہا۔ گلاس پر گلاس خالی ہوتے رہے۔ "بیرا یار خاں آئے تو اسے دھکے دے کر نکال دو۔ اس سے کہو اس کا باپ آج اسکاچ پی رہا ہے۔ کل اس نے مجھے گالی دی تھی۔ آج میں اسے ٹھیک کروں گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میز پر کھڑا ہو گیا۔ ڈر کر اور دوسرے لوگوں نے اپنے گلاسوں کو ہاتھ میں لے لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اسے اس کو نکالو۔ اس کو روکو۔ بھگاؤ۔"

"مجھے کوئی نہیں بھگا سکتا۔ موجھے کانی نائی بھگا سکتا —— سیاں بھئے کوتوال" وہ گانے لگا۔

ایک لڑکی نے اپنے عاشق کے کان میں کہا —— "سنک"

بیروں نے اسے آ کر بجھایا۔ لیکن وہ ممکن تھا۔ اس کی مکو اس جاری تھی۔ "میں یار خاں سے انتقام لوں گا۔ میں پیٹرنڈنٹ کو زمین پر پھینکوں گا۔ میں کرایہ نہیں دوں گا۔ میں ثبوت کو —— میں ثبوت" اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور منہ سے کف نکلنے لگا۔

بیروں نے اسے بار سے باہر کر دیا۔ اس کی جیب سے پیسے نکال کر اپنے بل کا حساب چکایا۔ اور اسے رکشے پر بٹھا کر چلتا کیا۔ شاہد کی جیبیں بھاری تھیں اور وہ بھیگے جا رہا تھا۔

"لے لو سب لے لو۔ میری ساری دولت لے لو۔ ہوٹل والے کی ایسی تیسی، یار خاں کی ایسی تیسی۔ اس کے منشی کی ایسی تیسی ——"

جب وہ نشے کے عالم میں گرتا پڑتا کیچڑ میں لتھڑا اپنی گلی کے موڑ پر پہنچا تو اس کی ملاقات ایک سائیکل سے ہو گئی۔ اور وہ گر گیا۔ کسان بھائی آفس سے نکل کر گیتا نے اسے اٹھایا ——

—— اس نے لیمپ کی روشنی میں ایک آنکھ مشکل سے کھول کر گیتا کو دیکھا —— اس کے دماغ میں بم سے پھٹنے لگے اور اس سے اپنے آپ کو چھڑا کر وہ اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ "گیتا تم زندہ ہو۔ میں مر گیا ہوں۔ میں مر گیا ہوں۔ مجھے اب کوئی نہیں بچا سکتا ——"

وہ اندھیری گلی میں گرتا پڑتا لڑکھڑاتا ڈگمگاتا اپنے مکان سے قریب ہو رہا تھا۔ گپتا کا دبلا پتلا چہرہ اس کی آنکھوں میں انگارے کی طرح جل رہا تھا۔ "میں نے تمہیں جیل بھجوا دیا۔ میں نے اپنے ضمیر کو مار ڈالا۔ میں۔ میں۔"

"ارے شاہد میاں ——— یہ کیا حال ہے۔ میں تو کرایہ لینے آیا تھا۔ اور تمہارا منہ تو بھٹی کی طرح دہک رہا ہے ——— جاؤ جاؤ ثروت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" منشی جلدی جلدی ناک پر رومال ملتا ہوا یار خاں کے مکان کی طرف چلا گیا۔

وہ ہانپتا ہوا زینے پر چڑھا۔ اوپر کمرے کے دروازے پر کھڑا رہا۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ہوائی اڈے کی طرف فلیش لائٹ چمک رہی تھی۔ ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ چاند سونے کی روٹی معلوم ہوتا تھا۔

ثروت لیمپ کی دھیمی روشنی میں آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ لیمپ کی ٹوٹی ہوئی چمنی سے دھوئیں کا ایک تار اوپر اٹھ رہا تھا۔ کروسن نیل کی بُو کمرے میں بسی ہوئی تھی۔

"کتنا بھیانک کمرہ ہے یہ" شاہد زور سے گرجا۔ کونے کے پاس تھرتھراتے ہوئے جالے والی دیوار سے چمگادڑ زور سے ٹکرایا۔ شاہد نے زور سے ہاتھ بڑھایا۔ لحاف کھینچ لیا۔ منی صرف بنیان پہنے سوئی ہوئی تھی۔ ثروت صرف پیٹی کوٹ پہنے پڑی ہوئی تھی۔ اس نے پھر بھی اپنی آنکھیں کھولیں۔ شاہد کو اس کے گھلتے ہوئے جسم پر بہت رحم آیا۔ اس کا جسم کبھی کتنا تندرست تھا۔ اس کے ہونٹ کیسے صحت مند تھے۔ سنگترے کی قاش کی طرح۔ اور آج ——— اسی کے لئے اس نے کیا نہیں کیا تھا۔ اسے اچانک یار خاں یاد آیا۔ منشی اور پھر گپتا کا مسکراتا ہوا چہرہ رحم اور طنز سے بھرا ہوا۔

"ثروت ——" وہ اتنے زور سے چیخا کہ کمرہ گونج اٹھا۔

ثروت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آج پھر شراب پی ہے کیا؟"

"ہاں پی ہے۔ اپنی پی ہے۔ تمہارے باپ کی نہیں پی ہے۔" ثروت سہم گئی۔ "ڈرو نہیں میں آج بے حد خوش ہوں۔ آج پہلی بار میں تمہیں سچ بتاؤں گا۔ دیکھو میں تمہیں ریڈیو نہیں دے سکتا۔ میں تمہیں سلکن سوٹ نہیں دے سکتا ——!!! ——— میں تو تمہیں اس ماہ کی تنخواہ بھی نہیں دے سکتا۔" ہچکی لیتے ہوئے اس نے چند آنے پیسے اس کی گود میں پھینک دیئے۔

"آپ نے کیا کیا؟ اب ہمارا کیا ہوگا؟"

"رونا نہیں۔ میں وحشی نہیں ہوں۔ میں تمہاری گردن نہیں دباؤں گا۔ اسی گردن کے لئے تو ———" اس نے اپنی انگلی سے اس کی گردن کو چھوا۔ اور ایک خباثت سے بھری ہوئی ہنسی ہنسا۔

"خدا کے لئے۔" ثروت گڑگڑائی۔

"خدا تمہارا دیکھو اس بڑے مکان میں رہتا ہے۔ ہے نا؟ وہ اس وقت کسی رنڈی کے ساتھ سویا ہوا ہوگا۔ ہے نا؟"

اسے زور سے ہچکی آئی اور ایک زبردست ابکائی کے ساتھ اس نے سب کچھ ثروت کی گود میں اگلنا شروع کر دیا۔ ثروت بُت بنی بیٹھی رہی۔ اس کا تو جیسے دم ہی نکل گیا تھا۔

"تم سمجھتی ہو میں نشے میں ہوں۔ بالکل نہیں۔" وہ چارپائی پر پڑی ہوئی منی کو دیکھتے ہوئے بولا "میں اب کچھ نہیں کہوں گا۔ اب میں شراب پیوں گا۔ تم اپنے راستے پر چلتی رہو۔ منشی سالا کبھی کرایہ نہیں مانگے گا ———"

"کہاں طلب؟"

"طلب ——— تم پرسوں صبح کے شو میں ریشمی سوٹ پہن کر گئی تھیں یا نہیں۔ وہاں سے تم دریا کی سیر کو گئی تھیں ——— غلط، ڈرو نہیں ——— میں تم سے کچھ نہ کرنے کو تیار ہوں ———"

وہ چپ ہو گیا اور چھوٹا رہا۔" گپتا نے ٹھیک کہا تھا۔ چٹان جب ایک بار پہاڑ کی چوٹی سے پھسلتی ہے تو کوئی نہیں جانتا ——!

ثروت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ نکلے گی۔ شاہد نے سوٹ کیس سے ریشمی شلوار اور جمپر نکال کر زمین پر پھینک دیا۔ اور دوپٹہ خود اوڑھ کر ناچنے لگا۔ ناچتے ناچتے رکا۔ ثروت کو اپنے سینے سے چمٹا لیا —— اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے ——

"ثروت، میری جان —— چٹان کو لڑھکنے دو۔ مجھے کمبوتر پسند ہے ——"

اتنا کہہ کر وہ آندھی میں اکھڑے ہوئے درخت کی طرح چارپائی پر گر پڑا۔ منی جاگ پڑی اور زور زور سے رونے لگی۔

(۱۰)

مضامین

وقار عظیم

داستان سے افسانے تک

کہانی سے انسان کی پہلی اور اس مسئلے سے اس کا لگاؤ، اس کی اجتماعی زندگی کی ایسی حقیقت ہے جسے تاریخ کی سنجیدگی اور اس کے فکر کی منطق نے بھی پورے وثوق کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ انسان اپنی حیاتِ اجتماعی کے بالکل ابتدائی دور میں فطرت کی جن قوتوں سے نبرد آزما اور برسرِ پیکار تھا اس پیکار اور کشمکش میں اسے مختلف کی جن منزلوں سے گزر کر فتح و ظفر کا روئے تاباں دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی تھی اس کی روداد میں اس کے لئے غیر مکرر کی چاشنی تھی۔ کام و دہن کو اسی چاشنی سے آشنا کرنے کی خواہش نے اسے آپ بیتی دہرانے کا عادی بنایا۔ یہی کہانی کہنے یا داستان سرائی کا آغاز ہے۔ تھکے ہارے انسان کو اپنے سارے دن کی تھکن دور کرنے کے لئے فطرتاً کسی ایسے مشغلے کی جستجو ہوئی تھی جو اس کے فطری احساسِ برتری کو بھی تسکین دے سکے اور اس پر عارضی طور پر ایسی خود فراموشی بھی طاری کر سکے کہ اس ماحول میں حقائق کی سختیاں اور تلخیاں اسے نہ ستائیں۔ انسانی زندگی میں یہی رومان کی لذتوں کی ابتدا ہے۔ اپنی ان کشمکشوں کو دہرانے اور رومان کی لذتوں میں گم ہونے کے علاوہ اس مشغلہ میں ایک اور بڑی بات یہ تھی کہ یہ ساری کہانیاں ایک دوسرے کو سمجھنے اور اس طرح ایک دوسرے سے قریب آنے کا بھی وسیلہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی وہ زندگی جس کا پس منظر کوہ و بیاباں کی سنگینیاں اور پہنائیاں ہیں اس کی داستان سرائیوں سے گونج رہی ہے ——— اس کی ساری رنگینیاں اور اس کا سارا رومان انہیں کہانیوں اور داستانوں کی بدولت ہے۔

انسان نے کوہ و بیاباں سے نکل کر، اور سنگ و خار کی سختیوں سے اپنا رشتہ توڑ کر، اپنائیت کی کھیتیوں سے اپنا ناطہ جوڑا اور اس ناطے کے ساتھ اس کے جسم کو راحت و آسائش میں زیادہ لطف محسوس ہونے لگا تو اس کی کہانیوں کا انداز و زاویہ بدلا لیکن اس بدلے ہوئے انداز میں بھی کہانی کے وہ بنیادی محرکات قائم رہے جو انسان کی حیاتِ اجتماعی کے ابتدائی دور کی خصوصیت تھے ——— وہ اب بھی کہانیوں میں اپنے کارناموں کی روداد سن کر خوش ہوتا تھا، اب بھی کہانیاں اس کے جذبۂ برتری کی تسکین کا باعث تھیں اور اب بھی کہانیوں میں اسے حقیقت سے الگ ہٹ کر رومان، تصور اور تخیل کی ایک ایسی دنیا نظر آتی تھی جس میں اسے حقیقت کی آزمائشوں سے مکمل نجات حاصل ہو جاتی تھی۔ انسانی زندگی کی مدنیت کی پیچیدگیوں اور تہذیب کی آسائشگیوں نے بھی کہانی کی کشش میں کوئی کمی نہیں ہونے دی۔ یہاں تک کہ جب اس نے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کو ضبطِ تحریر میں لانا شروع کیا

تو کہانی کے ساتھ بھی ابتدائی تصورات وابستہ رکھے ——— کہانی دلچسپی کا ایک مشغلہ ہے، کہانی انسان کے ان کارناموں کی روداد ہے جس میں اس نے اپنے ماحول کی کسی متصادم قوت کے مقابل آکر اس پر فتح حاصل کی ہے، کہانی انسان کے احساسِ برتری کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ کہانی حقائق کی دنیا سے دور، تخیل، تصور اور رومان کے ایک جہانِ تازہ کی تصویر ہے ——— کہانی کا یہی تصور ہماری داستانوں کا بنیادی تصور ہے۔

ہماری داستانوں کی تاریخ انیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوتی ہے[1] اور جن تصانیف کو ہم باقاعدہ داستان کہہ سکتے ہیں ان میں سب سے پہلی تحسین کی نوطرز مرصع ہے[2]۔ اس کے چند ہی سال بعد فورٹ ولیم کالج کا دور شروع ہو جاتا ہے اور رزین کی نوطرز مرصع یا باغ و بہار (تالیف ۱۸۰۱ء) اور انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" (تصنیف ۱۸۰۳ء) کو چھوڑ کر بیسویں صدی میں جتنی داستانیں لکھی گئیں وہ سب کی سب فورٹ ولیم کے منصوبہ کے ماتحت لکھی گئیں۔ اس دور کی داستانوں میں باغ و بہار (میر امن) حیدر بخش حیدری کی آرائشِ محفل اور طوطا کہانی، خلیل علی خاں اشک کی داستانِ امیر حمزہ، بہار علی حسینی کی نثرِ بے نظیر، مظہر علی ولا اور للّو لال کی بیتال پچیسی، کاظم علی جوان اور للّو لال کوی کی سنگھاسن بتیسی زیادہ معروف و مقبول ہیں اور ۱۸۰۱ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان لکھی گئیں۔ فورٹ ولیم کالج کے دور کے بعد انیسویں صدی کے آخر تک جو بے شمار داستانیں تصنیف ہوئیں ان میں محمد بخش مہجور کی نورتن (۱۸۴۴ء) سرور کی فسانۂ عجائب، نیم چند کشمیری کی گل صنوبر (۱۸۳۷ء) الف لیلہ (۱۸۴۲ء، ۱۸۴۴ء) بوستانِ خیال، طلسمِ ہوش ربا[3]، سحر دہلوی کی سرورِ سخن (۱۸۶۰ء) شیدن کی طلسمِ حیرت (۱۸۷۲ء) اور الف لیلہ (مرزا حیرت اور رتن ناتھ سرشار) زیادہ مشہور ہوئیں۔ ان مشہور و معروف داستانوں کے علاوہ جن کا حجم کئی ہزار صفحے ہے، اسی دوران میں سینکڑوں داستانیں لکھی گئیں۔ ان میں سے بہت سی چھپیں اور بہت سی اب بھی کتب خانوں میں غیر مطبوعہ کتب کے ذخیروں میں شامل ہیں۔

ان سب داستانوں کے مطالعہ کے بعد پڑھنے والا (ایسا پڑھنے والا جو کتابوں کو طالب علم کی طرح پڑھتا ہے) بڑی آسانی سے کچھ ایسی باتیں تلاش کر لیتا ہے جن سے یہ سب تصانیف ایک خاص صنف کے دائرے میں آجاتی ہیں۔ ان سب داستانوں میں بوستانِ خیال اور داستانِ امیر حمزہ اور طلسمِ ہوش ربا جیسی ضخیم و عجیم اور ضخیم داستانیں بھی شامل ہیں اور بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، طوطا کہانی اور انشائے نورتن میں چھپی ہوئی ایک ایک دو دو صفحوں کی کہانیاں بھی، اور ان دونوں کے بیچ میں الف لیلہ کے نسبتاً بڑے اور رانی کیتکی کی کہانی جیسے متوسط قد و قامت کے قصے بھی۔ لیکن ضخامت اور حجم سے قطع نظر ان سب میں کچھ مشترک باتیں ایسی ہیں جو انہیں ترتیب، ساخت اور اس سے بھی بڑھ کر دلچسپی کے نقطۂ نظر سے ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بناتی ہیں۔ ایک خاص قسم کا تاثر، ان کی تفصیلات کے فرق کے باوجود ان سب میں ایک ہی قسم کی دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ ایک ہی طرح کا تاثر قبول کرتا ہے اور ایک ہی قسم کے ردِ عمل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ سب داستانیں پڑھنے والوں کے لئے ایسی تفریح، دلچسپی اور ذہنی انبساط کا سرمایہ مہیا کرتی ہیں جس میں منطق اور استدلال کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ان سب داستانوں اور کہانیوں کا مقصد بنیادی طور پر صرف یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کی دلچسپی کا ذریعہ بن سکیں۔ اس دلچسپی کے حصول کے لئے لکھنے والوں نے عموماً ایک ہی سے نسخے استعمال کئے ہیں۔

ان چھوٹی بڑی سب داستانوں میں دلچسپی پیدا کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ قصہ کو جہاں تک ممکن ہو طول دیا جائے تاکہ پڑھنے والا زیادہ

---

[1] میں نے وجہی کی سب رس، کو جو بعض نقادوں کے نزدیک اردو کی پہلی داستان ہے اس خیال سے اپنے بیان کا جز نہیں بنایا کہ وہاں مصنف کا مقصود کہانی سنانا نہیں۔

[2] نوطرز مرصع کا سنہ تصنیف (یا تالیف) ۱۷۷۵ء اور ۱۸۰۱ء کے درمیان ہے۔

[3] و [4] ان دو کتابوں کے ساتھ میں نے مصنفوں کے نام اور کتابوں کے سنہ تصنیف اس لئے نہیں لکھے کہ ان کتابوں کے حصے مختلف مصنفوں نے مختلف سنوں میں دہلی اور لکھنؤ میں تالیف کئے۔

سے زیادہ عرصہ تک حقیقت کی دنیا کو بھول کر رومان اور تخیل کی دنیا کی سیر کر سکے۔ کہانی کو طویل بنانے کے لئے ہمارے داستان نویسوں نے عموماً یہ انداز اختیار کیا ہے کہ وہ اصل قصہ کے ساتھ ضمنی قصے بڑھا کر پڑھنے والے کی توجہ اور انہماک کے لئے نئی نئی راہیں نکالتے رہتے ہیں۔ باغ و بہار جیسی متوازن اور خسانۂ عجائب جیسی ادبی داستان میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے اور سنگھاسن بتیسی بیتال پچیسی اور طوطا کہانی جیسی کہانی نما داستانوں میں بھی ایک کہانی سے دوسری کہانی پیدا ہوتی ہے، آرائش محفل، بوستان خیال اور طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ کی تو یہ یوں بھی امتیازی خصوصیت ہے۔ اردو کی سب داستانوں میں رانی کیتکی کی کہانی اور انشائے فورٹ صرف دو مستثنیات ہیں۔ اصل کہانی میں ضمنی کہانیوں کا اضافہ کر کے انہیں طول دینے کی کوشش میں کہانی کی وحدت، اس کے تناسب و توازن اور مجموعی تاثر میں جو کمی آتی ہے اور جسے اب کہانی کے فن کا ایک ناگزیر عنصر سمجھا جاتا ہے) اس کا احساس ہمارے داستان گویوں کو بالکل نہیں تھا۔ کہانی کی ابتدا کے بعد اس منزل کا آنا جب مسئلہ ایک واضح شکل اختیار کرتا ہے اور کہانی ایک خاص راستہ پر چل کر ارتقا کے مختلف مرحلے طے کر کے نقطۂ عروج اور خاتمہ تک پہنچتی ہے، داستان کے فن کی روایت میں شامل نہیں تھا (کہانی میں اٹھان بھی کوئی چیز ہے، اس کا تصور سید انشا نے رانی کیتکی میں البتہ پیش کیا ہے[1]) کہانی میں جس چیز کو SUSPENSE کہتے ہیں اور جو کہانی کی دلچسپی کا لازمی عنصر ہے داستانوں میں ہے ضرور، لیکن عموماً اس پر ایک طرح کا تصنع غالب ہے۔ اسی مصنوعی تصنع کی وجہ سے داستان پڑھنے والے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے سے قاصر رہتی ہے ——— لیکن داستان گو کے پاس داستان میں دلچسپی پیدا کرنے اور قاری کو اپنا ہم نوا بنانے کے اور بہت سے وسیلے ہیں۔

ان بہت سے وسیلوں میں ایک وسیلہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کی دنیا سے الگ، پڑھنے والے کے لئے رومان کا ایک جہان دلکش آباد کرتا ہے۔ اس دنیا میں ان لوگوں کی کثرت و فراوانی ہے جنہیں خدا نے تاج داری و جہاں بانی کا شرف بخشا ہے۔ بادشاہ، وزیر، امیر، تاجر سے اس دنیا کی رونق اور آبادی ہے۔ بادشاہوں، وزیروں، امیروں اور تاجروں کی اس دنیا کی رونق، اس کے شان و شکوہ، اس کی شان جلال و جمال میں ہی قاری کے لئے وہ کشش ہے جس سے وہ اپنی سیدھی سادی حقیقت کی دنیا میں محروم رہتا ہے۔ اس رنگین، حسین و جمیل اور پرشکوہ دنیا کی تشکیل و تعمیر داستان گو کے فن کی روایت کا حصہ ہے اور اپنی روایت کی اس بخشش سے وہ قاری کے دل کو موہتا ہے۔

بادشاہوں، وزیروں، امیروں کی اس دنیا پر پریوں کا سایہ بھی ہے۔ پریاں، جن، دیو، ساحر اور نجومی رومان کی اس عجیب و غریب دنیا کے باسیوں کے مسرت و غم میں ان کے شریک ہیں اور اس لئے پڑھنے والے کو اس دنیا میں ایسی ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو عقل و فہم کی رسائی سے باہر ہیں۔ ان غیر معمولی اور مافوق الفطرت باتوں کو عقل کسی صورت میں بھی قبول نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ انسانی تجربہ اور مشاہدہ کے لئے یہ سب کچھ انوکھا اور نرالا ہے۔ لیکن داستان گو کا دائرۂ عمل دنیائے حقائق کے بجائے عالم محو اور جہان نظر کے بجائے عالم تخیل و تصور ہے اس لئے داستان کا قاری اسی دنیا کی سیر سے مطمئن و مسرور ہوتا ہے اور یوں داستان گو کے اس فنی منصب کی تکمیل ہو جاتی ہے کہ وہ قاری کے لئے سرور و انبساط کا سرمایہ مہیا کرے۔

تخیل و تصور کی اس دنیا کے باشندے یوں دیکھنے میں ہماری دنیا کے انسانوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں لیکن اپنے غیر معمولی عمل اور قوتوں کی بنا پر ان کی سیرت اور شخصیت مثالی بن جاتی ہے ——— جو نیک ہے وہ نیکیوں کی ان سب خصوصیات کا حامل ہے جو انسان کے تصور میں آ سکتی ہیں، جو بد ہے وہ بدی کا ایسا مجسمہ ہے کہ شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ہے۔ نیکی اور بدی کی قوتوں کے حامل اور علم بردار ان مثالی کرداروں کی شناسائی

---

[1] انشا نے اسے ابھار کے لفظ سے ظاہر کیا ہے۔ تمہید کے بعد رانی کیتکی کی کہانی میں یہ عنوان ہے:
"کہانی کا ابھار اور چال چلن کی دو اس کا سنگار"

پڑھنے والوں کو اس لئے مطمئن کرنی ہے کہ یہاں انہیں وہ اہم اقدار برسرِ عمل دکھائی دیتی ہیں جن کا حقیقت کی دنیا میں وہ صرف تصور کر سکتے ہیں۔ وہ بدی جو اسے زندگی میں مہیب سختیوں اور آزمائشوں میں مبتلا رکھتی ہے، یہاں نیکی سے متصادم ہوتی ہے تو ہمیشہ شکست کھاتی ہے اور یہی چیز اس کی خوشی کا سرچشمہ ہے۔ داستان گو نے اپنی داستانوں کے ذریعہ انسان کو یہی خوشی دی ہے اس لئے عمل و منطق سے عاری ہونے پر بھی وہ اس کی دلچسپی کا وسیلہ ہے۔

داستانوں نے انسان کے لئے عملی زندگی کا ایک ایسا ضابطہ مرتب کیا ہے جس میں عیش و عشرت کی فراوانی ہے، جرأت، ہمت، شجاعت اور مردانگی کے بدلے ابدی سکون و راحت کا انعام ہے، مروّت، محبت اور دردمندی کے بدلے جاہ و ثروت ہے۔ عارضی سخت کوشی کے بدلے دائمی راحت ہے۔ یہ دنیا مشاہدہ اور فکر نے نہیں تصوّر و تخیل نے آباد کی ہے اور اس کی تزئین میں ادبیت و شعریت نے اپنی پوری قوتیں صرف کی ہیں اس لئے ہر طرف حُسن و جمال کے جلوے ہیں اور یہی بات نا۔ی کے لئے کشش کی ہے۔

ہماری داستانوں نے کہانی میں دلچسپی و دل فریبی کی، تخیل و تصوّر کی، کشمکش اور جد و جہد کی اور پھر شادمانی و مسرت کی، سکون و راحت کی، باطل پر حق کی فتح کی، انسان اور فطرت کے تصادم اور ہم آہنگی کی، مادہ، روح اور سحر و افسوں کی نیرنگیٔ عمل کی فضا بنائی اور اس طرح ایک ایسی دنیا بسائی جو کبھی بھی حقیقت کی دنیا سے بھی زیادہ دلچسپ اور قابلِ یقین نظر آتی ہے۔ جو کچھ فطری نہیں وہ یہاں فطری اور جو ناقابلِ یقین ہے وہ یقینی اور قابلِ قبول بن جاتا ہے۔ یہاں فن کی ساری روایت دل کے تقاضوں پر قائم ہے کہ اسی تقاضے کی منطق وہ واحد منطق ہے جس میں مخاطب کی دلچسپی اور اس کی خوشنودی کا مقام سب سے پہلا بھی ہے اور سب سے اونچا بھی۔

ابھی اُردو میں داستان گوئی کا عہدِ شباب ختم نہیں ہوا تھا[1] کہ کہانی کی ایک نئی صنف نے جنم لیا اور اس طرح کہانی کی روایت نے ایک دوسری طرف رُخ موڑا۔ نذیر احمد کے ناولوں نے کہانی کو تخیل اور تصوّر کی دنیا بسانے کے بجائے حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنا سکھایا۔ کہانی کو محض دلچسپی اور تفریح کی چیز سمجھنے کے بجائے اسے معاشرتی زندگی کے مقاصد کا حامل اور علم بردار بنانے کی تعلیم دی۔ رومانیت کو کہانی کے لئے جنسِ غریب قرار دے کر حقیقت کو اس کی بنیاد بنایا۔ خیر اور حق کے عالمگیر تصورات کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص معاشرے کے مسائل کو کہانی کے رگ و پے میں جذب و سرایت کیا۔ اور بیان میں شعریت، ادبیت اور رنگینی کو مقصود بالذات سمجھ لینے کے بجائے اسے زندگی کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور تکلف و تصنع کی جگہ سادگی کو (ایسی سادگی کو جس پر تصنع کا سایہ نہ پڑا ہو) حُسنِ بیان کا زیور جانا اور سادگیٔ بیان کی معنوی وسعتیں اور اس کے امکانات واضح کئے، پھر بھی داستان کی قائم کی ہوئی اس روایت کو اپنا رہنما بنایا کہ کہانی کے کردار حقیقی سے زیادہ مثالی ہوں اور ان سے ایسے غیر معمولی افعال و اعمال وجود میں آئیں کہ دنیا محوِ حیرت رہ جائے۔ وہ نیکی کے جس راستے پر گامزن ہوں وہی راستہ زندگی کا سب سے پسندیدہ راستہ معلوم ہو اور اس راستے پر چلنے والے کو ہر صعوبت کا سامنا و کامران دکھایا جائے اس لئے کہ ناظر کی خوشنودی اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ نیکی کے ساتھ داستان گویوں کو جو جذباتی اُپج مبالغہ کی حد تک غیر منطقی لگاؤ ہوتا تھا اسے نذیر احمد نے بھی اسی طرح قائم رکھا اور اس کی خاطر فن کی ہر نزاکت و لطافت کی قربانی دی۔ ابتدائی دور کے ناول نگاروں میں شرر اور سرشار نے بھی داستان کی روایت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح اپنا رشتہ قائم رکھا۔ سرشار کی ٹھوس حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ فسانۂ آزاد میں واقعہ نگاری کی رنگینی، طرزِ بیان کی صنعت گری اور کرداروں کے عمل میں حد درجہ کی سنجیدگی کے ساتھ مبالغہ اور مضحکہ کا امتزاج اور قدم قدم پر

---

[1] اردو کا پہلا ناول مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں تصنیف ہوا اور ذیل کی داستانیں اس سنہ کے بعد تصنیف، تالیف و ترجمہ ہوئیں:
داستانِ امیر حمزہ ——— سید محمد عبداللہ بلگرامی (۱۸۷۱ء) طلسمِ حیرت ——— جعفر علی شیون (۱۸۷۲ء) بوستانِ خیال ——— محمد عسکری و آغا حجو (۱۸۸۲ء تا ۱۸۹۱ء) داستانِ امیر حمزہ ——— تصدق حسین، محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر (۱۸۸۳ء تا ۱۹۰۱ء) ہزار داستان ——— حامد علی خان (۱۸۸۹ء) شبستانِ حیرت ——— مرزا حیرت دہلوی (۱۸۹۲ء) الف لیلہ ——— رتن ناتھ سرشار (۱۹۰۱ء)

معمولی سے عمل کو مہم کا رنگ دینے کا رجحان داستان کی روایت کے باقیات الصالحات ہیں۔ اسی طرح شرر کے ناولوں میں (خصوصاً تاریخی ناولوں میں) بہادری اور جاں بازی کے مبالغہ آمیز کارناموں کی کثرت، ہیرو کی تاریخی شخصیت کی صداقت میں تخیل کی رنگ آمیزی، مناظرِ فطرت کے بیان میں واقعہ نگاری کے بجائے شاعرانہ تصور آفرینی کا غلبہ اور منطق کے احساس کو بھلا کر کہانی کو طرب انگیز انجام دینے کی کوشش اور ان سب باتوں میں فن کے مطالبات کی پیروی کے بجائے قاری کی خوشنودیٔ مزاج کی حسین کا خیال داستان کی روایت کے عناصر ہیں۔ ناول اپنے ابتدائی دور میں، یا یوں کہنا چاہئے کہ نذیر احمد، شرر اور سرشار کے ہاتھوں حقیقت کی زندگی کا مصور، ترجمان، مفسر، نقاد اور خدمت گذار بن کر بھی اپنے آپ کو تخیل، تصور اور شعریت کی ان قدروں سے جدا نہیں کر سکا جن کی مدد سے داستان نے ایک جہانِ نو بنانے کی روش کو اپنا شیوہ بنایا تھا۔ نذیر احمد، شرر اور سرشار نے داستان کی روایت کو عزیز رکھتے ہوئے بھی کہانی کو حقیقت نگاری اور احترامِ فن کا جو انداز سکھایا تھا اسے ان کے بعد آنے والوں نے تکمیل کی راہ دکھائی۔ ہماری ناول نگاری کا دوسرا دور تکمیل راہ کی مختلف منزلوں کی نشان دہی کرتا ہے۔

اس دور کے لکھنے والوں میں سجاد حسین کے علاوہ مرزا رسوا اور مرزا محمد سعید کے ناول بعض حیثیتوں سے کہانی کے فن کے ارتقا میں ایسے مدارج طے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن کے طے کئے بغیر فن کے نصب العین تک رسائی ناممکن ہے۔

سجاد حسین نے لکھنوی معاشرے کو اپنے ناولوں کا پس منظر بنا کر مرقع کشی اور اصلاحِ معاشرت کے جو مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی ہے اس میں ان کے سامنے ہمیشہ یہ بات بھی رہی ہے کہ قاری اصلاحی مقصد میں ان کا ہم نوا ہونے کے ساتھ ساتھ کہانی میں دلچسپی بھی محسوس کرے کہانی میں دلچسپی کے عناصر کا وجود کہانی کی روایت کے تسلسل کا مظہر ہے اور روایت کے اس پہلو کو ہمارے کہانی کہنے والوں نے (جن میں ناول نگار اور افسانہ نگار بھی شامل ہیں) اکثر یاد رکھا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا رسوا اور مرزا محمد سعید بھی، جو فلسفیانہ فکر، منطقی ترتیب اور نفسیاتی تجزیہ کو ناول کے ضروری اجزا سمجھتے ہیں۔ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتے کہ فلسفہ، منطق اور نفسیات میں جب تک ایسے عناصر شامل نہ کئے جائیں کہ وہ قاری کے لئے قابلِ قبول بن سکیں، کہانی میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ اس طرح کہانی نے جو سفر داستان کی رنگین، رومانی اور تخیلی سرزمینوں میں شروع کیا تھا اور پھر نذیر احمد کی رہنمائی میں محض تخیل و تصور کو چھوڑ کر حقیقت کی سادہ دنیا میں قدم رکھا تھا۔ رسوا اور مرزا محمد سعید کی رہبری نے اسے نفسیات کی پُرپیچ وادیوں سے آشنا کیا۔

نذیر احمد نے کہانی کو محض نشر یا خاطر کا ایک ذریعہ سمجھنے کے بجائے اس سے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کا اہم کام لیا۔ شرر نے اصلاح کے اس مقصد و نصب کو اور زیادہ واضح شکل دے کر اسے وسیع تر قومی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ سرشار نے بھی، گو ایک مصنوعی انداز میں سہی، زمانہ کی روش سے متاثر ہو کر اپنے ناولوں میں رنگین اخلاق کی طرف اشارے کئے۔ رسوا اور مرزا محمد سعید کے ناولوں (امراؤ جان ادا اور خواب ہستی) میں مقصدیت کی بنیادیں اور زیادہ مضبوط اور اس کی جڑیں اور زیادہ گہری ہو گئیں۔ نذیر احمد کے یہاں زندگی کے پس منظر کے باوجود مصنف کی اصلاح کا جذبہ اور مقصدیت قاری کی خوشنودی کے احساس پر غالب ہے۔ شرر کے یہاں کہ تاریخ اور سرشار کے یہاں نسبتاً زیادہ قاری کو اپنے آپ سے قریب لانے کا احساس نمایاں ہے۔ لیکن اس احساس کو شرر اور سرشار دونوں نے جو عملی شکل دی ہے اس میں ہر جگہ تصنع نمایاں ہے کہیں مناظرِ فطرت نگاری کی شکل میں، کہیں سنسنے اور جذباتی رومان کے پیرایہ میں، کہیں جوشیلے اور ولولہ انگیز واقعات کے ذکر میں اور کہیں کہانی کے ایسے انجام میں جو کہانی کے اٹھان، ارتقا اور نقطۂ عروج کے ساتھ منطقی مطابقت نہیں رکھتا بلکہ قاری کے تصورات کی ہم نوائی کو اپنا مقصد جانتا ہے۔

مرزا محمد سعید اور مرزا رسوا کے ناولوں میں قاری کی خوشنودی کے یہ مصنوعی اور جذباتی وسیلے اعتدال و توازن کا قرب حاصل کرتے ہیں اور کھنے دلے فکر، تخیل اور مقصدیت میں مناسب امتزاج پیدا کر کے فن کی اس روش کا آغاز کرتے ہیں جو واضح طور پر ناول کے فن کی روش ہے۔ کہانی کے مختلف اصناف میں، اس رشتہ کی بنا پر کہ انسان کی یہ فطرت اس کی محرک ہے کہ وہ انسانی زندگی کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے و اس کے

احساس برتری کو زیادہ سے زیادہ تسکین کا سامان میسر آئے۔ ایک خاص طرح کا ربط اور تسلسل ہے اور اس لئے داستان اور ناول کی بنیادوں میں یہ مشترک محرکات ملتے اور تڑپتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان مشترک عناصر کے علاوہ جنہیں فنی تسلسل کا لازمی اور منطقی تقاضا کہنا چاہئے، ناول نے ایک منفرد صنفِ ادب کی طرح جنم لیا اور اس کے باوجود کہ دیکھنے والی نظر فن کے پردوں کو اٹھا کر داستان اور ناول کے ادبی رشتے کو آسانی سے محسوس کر لیتی ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ناول کا ایک علیحدہ فن ہے۔ اس فن کی ابتدا نذیر احمد سے ہوئی۔ شرر اور سرشار نے اس فن میں بعض چیزوں کا اضافہ کیا لیکن داستان اور ناول کو ایک دوسرے سے پوری طرح الگ نہ کر سکے۔ یہ صورت سب سے پہلے امراؤ جان ادا اور خواب ہستی میں پیدا ہوئی۔ اس کے بعد تقلید کا ایک ایسا دور آیا جس میں محمد علی طبیب اور راشد الخیری نے بنی بنائی روشوں کی تزئین و ترتیب کی اور پھر ناول کا فن ایک ایسی منزل پر پہنچا جسے پریم چند کی منزل کہنا چاہئے۔

پریم چند کی ناول نگاری کئی حیثیتوں سے اردو میں ناول نگاری کے فن کی تکمیل کی منزل ہے۔ پریم چند کے معاشرتی اور سیاسی زندگی کے گہرے مشاہدے، اس مشاہدے کے ساتھ فرد اور جماعت کی زندگی کے اہم مسائل کے مطالعے، اس مشاہدے اور مطالعے کے بعد فکر، تخیل اور جذبات کی صحیح آمیزش اور پھر ان سب چیزوں کو فن کے سانچے میں ڈھالنے کے واضح احساس اور احساس کو پوری ذمہ داری کے ساتھ عملی شکل دینے کی کوشش نے پریم چند کے ناولوں کو اردو ناول نگاری میں فن کا معیار بنایا ہے۔ پریم چند کے ناولوں کا قائم کیا ہوا معیار واقعہ نگاری کی تفصیلات و جزئیات، کردار نگاری کی جذباتی و نفسیاتی بنیاد اور فن کی ترتیب و توازن کی کسوٹی بھی ہے اور ایک سوچنے اور محسوس کرنے والے انسان کے تجربات و محسوسات کی ایسی تصویر بھی جس میں زندگی کی صداقتوں اور فن کی نزاکتوں کا یکساں احترام کیا گیا ہے۔ پریم چند کی ناول نگاری کا ابتدائی دور تو یقیناً ایک شدید قسم کی جذباتی اصلاح پسندی کا دور ہے لیکن اس کے آخری ایام یقیناً زندگی اور فن کے امتزاج کا بے حد دلکش نمونہ ہیں۔ اس نمونے کو کہیں کہیں مغرب کے بلند ترین معیاروں کا ہمسر تسلیم کرنے میں ضرور تامل ہوتا ہے لیکن اس میں یقیناً کوئی شبہ نہیں کہ اردو میں ناول نگاری کے فن کی معراج وہی ہے جہاں پریم چند نے اسے پہنچایا تھا۔ گئودان اور میدانِ عمل پریم چند کے ایسے ناول ہیں جن میں کہانی کی روایت کے بہترین عناصر مجتمع ہیں۔ ہماری داستان نے کہانی کو حسنِ تہذیب کا نقش، رنگینیٔ رومان و تخیل کا مرقع اور جذباتی اور ذہنی تسکین و لطف اندوزی کا وسیلہ بنا کر کہانی کے فن میں ایک مخصوص صنف کا اضافہ کیا، اسے ہمارے ناول نے پوری طرح اپنے اندر سمو کر کہانی کو ایک صنف دی جس میں بھرپور زندگی بھی ہے اور بھرپور فن بھی، ایک کا پھیلاؤ، دوسرے کی گہرائی، ایک کی پیچیدگیاں، دوسرے کی نزاکتیں، ایک کا حسن و جمال اور دوسرے کی اثر انگیزی۔

لیکن جس طرح زندگی ایک جگہ نہیں ٹھہرتی فن بھی اس کی بے چینی اور بے قراری کا ساتھ دیتا رہتا ہے۔ زندگی آگے بڑھتی ہے، فن بھی آگے بڑھتا ہے، اس لئے کہ زندگی فن سے اسی بات کی طالب اور تقاضی ہے اور فن زندگی کی اس طلب اور تقاضے کا ساتھ نہ دے سکے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔

زمانے نے ادیب اور فن کار سے کہانی کی ایک ایسی صنف کا تقاضا کیا تھا جو رومان کی رنگینیوں کے بجائے زندگی کی سادہ و پیچیدہ حقیقتوں کی حامل ہو ——— ایک ایسی صنف جس میں فن کار کے تخیل اور تصور کی جدت پسندی نہیں بلکہ تفکر کی گہرائی شامل ہو، جس میں انسان زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر ایک اَن دیکھی دنیا کی سیر کرنے کی جگہ اس کی کشمکشوں سے دوچار اور نبرد آزما ہو، جہاں اسے زندگی سے فرار کی نہیں اس سے اُلجھنے اور اس کی اُلجھنوں کو سلجھانے کی تعلیم ملے ——— جہاں فن کار محض مصور نہیں، مبصر، نقاد اور معلم کے فرائض اور منصب پورے کرنے کی خدمت انجام دے، جہاں جذبات اور احساسات پر فن کی منطق حاوی اور غالب نظر آئے۔ زمانے کی اسی طلب اور تقاضے نے ناول کی تخلیق کی اور آہستہ آہستہ اس نے داستان کی جگہ لے لی۔

ناول شروع ہوا، اس نے ارتقا کے مختلف مدارج و مراحل طے کیے لیکن زمانہ بدلا تو اس کے تغیر پسند مزاج نے ایک دوسری طرح کی کہانی کا مطالبہ کیا، ایسی کہانی جو زندگی کی ساری وسعتوں پر حاوی اور اس کی گہرائیوں کی ترجمان ہوتے ہوئے بھی ایک ایسے فن کی علم بردار ہو جہاں ایجاز و اختصار کی حکمرانی ہو۔ جاگیردارانہ نظام اور عشرت پسند تہذیب کے تقاضوں نے داستان جیسی صنف کی تخلیق کی تھی۔ حقائق کے تلخ احساس اور زندگی کے مسائل کو کہانی کے ذریعہ حل کرنے کی خواہش نے ناول کو جنم دیا۔ لیکن وقت میں پہلا سا پھیلاؤ باقی نہیں رہا اور انسان کو اپنے تفریحی مشاغل میں کتر بیونت اور کانٹ چھانٹ کرنی پڑی تو اس کا وہ مزاج جسے کہانی سننے کا چسکا ہمیشہ سے ہے افسانہ کی ایک ایسی صنف کا طلبگار رہا جو زندگی اور فن کو اس طرح سمیٹے کہ انسان کو اس سے ذہنی سرور و مسرت کا سرمایہ بھی ہاتھ لگے، زندگی کے مسائل کو حل کرنے اور اپنے ماحول کو حسین تر بنانے کی آرزو بھی پوری ہو اور اس کے باوجود اتنی مختصر ہو کہ وقت پر اس کی گرفت مضبوط رہے، وہ اپنے بے شمار مشاغل میں سے بھی کہانی پڑھنے کا وقت نکال سکے، زمانے کے یہ سب تقاضے اور انسان کی یہ سب ضرورتیں مختصر افسانہ کی تخلیق کی بنیاد بنیں۔

اردو میں جس طرح ناول کی ابتدا ہو جانے کے بعد بھی داستان پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رہی۔ اسی طرح ناول کے عین فنی عروج کے زمانہ میں مختصر افسانہ پیدا ہوا اور پروان چڑھنا شروع ہوا۔ افسانہ کی پیدائش کے دن وہ ہیں جب ہمارا ناول آہستہ آہستہ فلسفہ، منطق اور نفسیات کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ امراؤ جان ادا اور خواب ہستی کی تخلیق کا دور افسانہ کی پیدائش کا زمانہ ہے ——— پھر ایک بات اور بھی ہے کہ ناول کہانی کی ایک منفرد اور ممتاز صنف ہونے کے باوجود مدتوں اپنے آپ کو داستان کے سحر و افسوں سے آزاد نہ کر سکا اور ہمارے ابتدائی ناول نگاروں میں سے ہر ایک کے یہاں داستان کے رنگ کی جھلکیاں اور اس کے نور کی کرنیں برابر اپنا جلوہ دکھاتی رہیں۔ یہی صورت مختصر افسانہ کے ساتھ پیش آئی۔ ہمارے مختصر افسانہ کے ابتدائی دور میں واضح طور پر داستان کی دل کش روایت کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

اردو کے سب سے پہلے افسانہ نگار پریم چند کے مختصر افسانوں کے کئی ابتدائی مجموعے، سوز وطن، پریم پچیسی، پریم بتیسی اور ان میں بھی نمایاں طور پر سوز وطن، ان کے ہم عصروں میں سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں خارستان و گلستان، سلطان حیدر جوش کے اکثر اصلاحی افسانے اور نیاز فتح پوری کے افسانوں کا مجموعہ نگارستان اور اس میں بھی بالخصوص کیپٹا اور سائکی اور الحمرا کا کلاب وغیرہ اس رنگین روایت کی نشانیاں اور یادگاریں ہیں۔

سوز وطن کے افسانوں میں "دنیا کا سب سے انمول رتن" اور "شیخ مخمور" کی فضا اور ماحول سراسر رومانی ہے، اس رنگین اور جان انگیز فضا میں کرداروں کا مزاج، ان کا جذباتی انداز فکر و نظر، گفتگو کا شاعرانہ اور پر تصنع اسلوب، افسانے کے انجام میں حق کی اقدار کی فتح یہ سب داستانی رنگ کی باقیات ہیں۔ اسی طرح پریم پچیسی اور پریم بتیسی کی کہانیوں میں تاریخ و روایت کا افسانوی اسلوب، کرداروں کی دلیرانہ اور حق پرستانہ سیرت، ان کے افعال و کردار پر غیر فطری جوش کا غلبہ، حق کی حمایت میں عمل کے جذباتی اور بعض صورتوں میں غیر منطقی حدود ——— یہ سب کچھ بھی افسانہ نے داستان کی روایت سے حاصل کیا اور اسے برقرار رکھا ہے۔ یلدرم کے افسانوں میں افسانوی فن کے مزاج اور اس کی فطرت کے احترام اور انہیں فکر و عمل کے منطقی حدود میں رکھنے کی عام روش کے ساتھ ساتھ مناظر فطرت کی رنگینیوں اور بہار آفرینیوں کو جاذبہ محبت اور رومان کا پس منظر بنانے اور انسانی جذبات اور حسن فطرت میں باہمی ربط و ہم آہنگی پیدا کرنے کا رجحان داستانی فن کی روایات سے لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ نیاز فتح پوری کے افسانوں میں موضوع سے لے کر اس کی ہیجان انگیز و نشاط آفریں ترتیب و تشکیل اور کرداروں کے پر جوش رومانی عمل اور ردعمل تک ساری چیزیں داستانوں کے تخیلی اور نشاط انگیز اسلوب سے مستعار ہیں۔ ان افسانوں کے

واقعات اور کرداروں میں حقیقت کی رنگ آمیزی کے باوجود رومانی جذباتیت اور فکری ترتیب کے باوجود شاعرانہ حسن بیان کا غلبہ بھی داستان کی قدیم روایت کی پیروی ہے اور پھر سلطان حیدر جوش کے معاشرتی اور اصلاحی افسانوں میں ایک خاص وضع اور انداز کے سوچنے والوں اور اخلاق کی بعض مخصوص اقدار کو پسندیدہ سمجھنے والوں کو مسرور و مطمئن کرنے کی کوشش بھی داستان کی اس روایت کا عکس ہے جس میں قاری کی خوشنودی کو فن کی سب سے اہم قدر سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے ابتدائی دور کے ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں مختلف حیثیتوں سے داستان کی قائم کی ہوئی فنی روایت کا جو گہرا عکس ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ سب تخلیقات کہانی کی ایک نئی صنف کے نقش اول بھی ہیں ——— ایسا نقش جس سے زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل بھی ہوتی ہے اور افسانوی فن کی روایت میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ بھی ہوتا ہے۔ افسانہ نگاروں نے کہانی سنانے، پڑھنے اور سامع کی دلچسپی کا سامان مہیا کرنے کی قدیم روش پر قائم رہ کر بھی کہانی کو فن کی حیثیت سے بعض نئی چیزیں دیں۔ داستان اور ناول میں اب تک تخیل اور تصور کی پیدا کی ہوئی عالم وامکان کی پہنائیاں اور مشاہدے اور تجربہ کی دی ہوئی دنیائے حقیقت کی پیچیدگیاں اور گہرائیاں کہانی کا پس منظر بنتی تھیں اور اس پس منظر میں واقعات، کردار، زندگی کے مسائل کی کثرت و فراوانی اور فطرت اور اس کے حسن کی رنگینی اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ و وابستہ ہوتی تھی کہ پڑھنے اور سننے والے کے لئے (داستان کی روایت میں پڑھنے اور سننے کی جگہ ایک سی ہے) ایک چیز کو دوسری سے الگ کرنا ناممکن تھا۔ افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت کا مظہر بنا۔ کسی ایک واقعے، ایک جذبے، ایک احساس، ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک رومانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو، افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا ہے۔ مختصر افسانہ میں اختصار اور ایجاز کی دوسری امتیازی خصوصیت نے اس کے فن میں سادگی، حسن ترتیب و توازن کی ضرورت پیدا کی اور یہ سب چیزیں ہمیں پریم چند، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے ان افسانوں کے ذریعہ ملیں جنہوں نے داستان کی روایت کو بھی زندہ رکھا اور کہانی کی ایک نئی صنف کی بنیاد بھی ڈالی۔

پریم چند، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کی رکھی ہوئی بنیاد پر اگلے ۲۰، ۲۵ برسوں میں علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی، ل۔ احمد اکبرآبادی، حامد اللہ افسر، محشر عابدی، مسعود علی زوقی، طالب باغپتی، کوثر چاندپوری اور فضل حق قرشی نے افسانوی فن کی ایک ایسی عمارت کی تعمیر کی، جس میں زندگی کی حقیقتیں اور فن کی رعنائیاں دست بدست ایک دوسرے کو سہارا دیتی دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارے ابتدائی افسانہ نگاروں نے افسانہ کو حقیقت و شعریت، صداقت و تخیل اور زندگی و فن کے امتزاج کا جو نقش اول بنایا تھا۔ اسے ان افسانہ نگاروں نے زیادہ ابھارا، چمکایا اور رنگین بنایا۔ ان سب نے تخیل کے بجائے مشاہدہ کو اور شعریت کی جگہ خود فکر کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر نے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لینے کو کافی جانا ہے۔ بحر جذبات میں کود کر اس کے تلاطم کا مقابلہ کرنے کی عادت ان میں ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ زندگی کے ایوان میں داخل ہو کر اس کے رازہائے دروں سے واقف ہونے کی خواہش اور طلب انہیں بے چین اور بے قرار نہیں کرتی اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں زندگی کا رنگ نسبتاً زیادہ شوخ ہونے پر بھی اتنا تیکھا نہیں کہ دیکھنے والے کی نظر کو مجبور کر سکے۔ ان میں فن کی ترتیب پہلے کے مقابلہ میں زیادہ متوازن ہونے کے باوجود اب بھی اتنی منطقی نہیں کہ کہانی کا انجام، اس کے گزرے ہوئے اجزاء کا منطقی، لازمی اور ناگزیر نتیجہ معلوم ہو۔ اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر افسانہ قاری کے نقطۂ نظر سے دل خوش کن انجام اب بھی عموماً ان کا فنی مطمح نظر اور نصب العین ہے ——— اب بھی اتفاقات کو، ایسے اتفاقات کو جو پیچیدہ سے پیچیدہ صورت حال کو مصنف اور اس طرح قاری کی پسند کے سانچے میں ڈھال سکیں ان افسانوں کے فن میں خاصا دخل ہے۔ اب بھی جذباتیت اور شاعرانہ فن کے توازن و اعتدال کے راستہ میں حائل ہیں۔

۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے بعد سے البتہ افسانوں میں زندگی کے نقش نسبتاً زیادہ گہرے ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس زمانہ کے شدید معاشی اور سیاسی

ہیجان و اضطراب نے ہر حساس انسان کے دل میں انسان اور انسانیت کی خدمت کا جو جذبہ پیدا کیا تھا اسے ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنا فنی منصب سمجھنے کی طرف پہلی مرتبہ قدم بڑھایا۔ پریم چند نے اس معاملہ میں اپنے ہم عصروں کی رہنمائی کی اور زندگی کے گھمسان میں کود کر ایک سپاہی کی طرح ان قوتوں کو مٹانے کا تہیہ کیا جن کے ہاتھوں انسانیت دردمیں مبتلا تھی۔ یہ خدمت فن کار اس وقت تک انجام نہیں دے سکتا جب تک زندگی اور اس کے مسائل پر اس کی گرفت پوری طرح مضبوط نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک ہمیں افسانہ نگاری ایک ایسے دور سے گزرتی دکھائی دیتی ہے جس میں افسانہ نگاروں نے زندگی کے صرف ان پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جن پر وہ پوری طرح حاوی ہیں افسانہ نگاروں نے زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے اور اس کے بھیدوں سے پوری طرح واقف ہونے کو اپنے فنی نصب العین کی پہلی منزل بنایا ہے۔ پریم چند کے علاوہ علی عباس حسینی، اعظم کریوی، مجنوں گورکھپوری، سدرشن، ل۔ احمد اکبرآبادی، راشد الخیری، نظیر بیگ چغتائی ——— سب کے افسانے صرف اس ماحول کے مصور ہیں جس پر ان کی نظر گہری ہے، اور صرف اس مقصد کے ترجمان جس سے انہیں پورا جذباتی لگاؤ ہے زندگی سے اس قرب کے ساتھ فن کا احساس بھی ان سب افسانہ نگاروں کے یہاں اب تیز تر ہے۔

اسی فنی احساس کی ایک دوسری نمایاں صورت یہ ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے دوسری زبانوں کے ادب سے اردو میں منتقل کر کے اردو افسانہ کو فن کی ان نزاکتوں اور لطافتوں سے روشناس کرایا جن تک ہنوز اس کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ ایسے ترجمہ کرنے والوں میں محمد مجیب، خواجہ منظور، منصور احمد اور جمیل نقوی کے نام اہم ہیں۔ ان ترجمہ کرنے والوں کے ساتھ لکھنے والوں کا ایک گروہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے جس نے مغربی شاہکاروں سے متاثر ہو کر ایسے طبع زاد افسانے لکھے جو زندگی اور فن کے امتزاج کے موثر اور دلکش نمونے ہیں ——— حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، احمد علی اور فیاض محمود اس گروہ کے ایسے نمائندے ہیں جنہیں مختصر افسانے کے فن کی تاریخ میں اس لئے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ ان کی تخلیقات نے افسانے کو مغرب کے بلند ترین معیاروں سے قریب لانے کی مہم کو آسان بنایا۔

مختصر افسانے کی تاریخ میں ۱۹۳۵ء کا سال ایک اہم سنگ میل ہے۔ اوّل تو اس لئے کہ اس سال تک مختصر افسانے نے فنی ارتقا کی جتنی منزلیں طے کیں ان کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ جس کا آغاز اردو میں ایک ایسی صنف کی طرح ہوا جس پر فن اور اسلوب کے اعتبار سے داستان کا خاصا گہرا اثر تھا سادگی اور رنگینی کی اس فضا سے نکل کر ایسی ایسی راہوں سے گزرا جن پر اسے زندگی کے قرب اور فن کے احساس نے برابر نئی نئی چیزوں سے آشنا کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء تک پہنچتے پہنچتے اس نے فن کے بے شمار مراحل طے کر کے ایسی صورت اختیار کی، جس میں تکمیل فن کے سُراغ مرجوہ ہیں۔ پھر یہ کہ اس منزل پر پہنچ کر ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے ایسے افسانے لکھے جو ایک طرف تو اس لئے اہم ہیں کہ ان میں مشرقی زندگی کی روایتوں اور فن کی نزاکتوں کی بڑی لطیف آمیزش ہے اور دوسرے اس لئے کہ مغرب کا جو فن آہستہ آہستہ ہمارے مختصر افسانے کے اسلوب کو متاثر کرتا اور اسے تکمیل کی راہیں دکھاتا رہا تھا وہ ان افسانوں کے ذریعہ ایک باغیانہ انداز میں اردو افسانے کی روایت میں داخل ہوا۔ پہلی قسم کے افسانوں کی سب سے نمایاں مثال پریم چند کا افسانہ 'کفن' ہے اور دوسری طرح کے افسانوں کا نمونہ افسانوں کا وہ بدنام مجموعہ 'انگارے' کے نام سے چھپا۔ کفن زندگی کے گہرے اور ہمدردانہ مشاہدے اور مطالعے، تخیل اور فکر کی متوازن آمیزش اور فن کے مخلصانہ احساس کے ربط و آہنگ کا شاہکار نمونہ ہے اور انگارے کے افسانے اس ذہنی اور باغیانہ روش کے علم بردار جس کے بغیر فن میں نئی راہوں کا کھلنا بند ہو جاتا ہے اور اس لئے فن کے لئے ہر ترقی کے دعاوی مسدود و ممنوع ٹھہرتے ہیں۔ 'کفن' اور 'انگارے' کے بعد اور اسی کے ساتھ وجود میں آنے والی ترقی پسندی کی تحریک نے مختصر افسانے کو بڑی تیزی سے ایسا بننے میں مدد دی کہ اگلے دس برس کے اندر اس کی بعض تخلیقات دنیا کی بہترین افسانوی تخلیقات کی ہمسری کے قابل ہو گئیں۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ہمارے مختصر افسانوں کی زندگی کے شباب اور اس کے فنی عروج کا بہترین زمانہ ہے۔ افسانہ کے اس عروج و شباب

کے آغاز تک داستان اپنی زندگی پوری کر چکی تھی اور میر باقر علی داستان گو کی وفات نے اس بزم کی آخری شمع کو گل کر دیا تھا۔ ناول نے البتہ اس کی تیزی کے ساتھ ساتھ ارتقا کے بہت سے مراحل طے کئے اور پریم چند کی وفات کے وقت تک (انہی کے ہاتھوں) ناول اس بامِ عروج تک پہنچ چکا تھا جس سے اونچا پریم چند کے پیشرو اسے نہیں لے جا سکے اور اس طرح گویا ۱۹۳۶ء تک فن کی حیثیت سے داستان کا وجود باقی نہیں رہا اور ناول کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکا اور اس طرح اب افسانوی ادب کی صرف ایک صنف (یعنی مختصر افسانہ) پر یہ ذمہ داری آپڑی کہ وہ زندگی کی خدمت گذاری اور فن کی نازبرداری کے دوہرے منصب کو پورا کرے اور اس میں شبہ نہیں کہ ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہمارے مختصر افسانے نے یہ دونوں منصب اس طرح پورے کئے کہ زندگی اور فن دونوں کے لئے باعث ناز و افتخار ہیں۔

اس دور کے افسانہ نگاروں میں علی عباس حسینی، کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک، احمد علی، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، اختر انصاری، حیات اللہ انصاری، منٹو، حجاب، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور ان کے ذرا بعد غلام عباس، دیوندر ستیارتھی، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری، بلونت سنگھ، ممتاز مفتی، ابراہیم جلیس، حمانہ زبیری، ہاجرہ مسرور، شفیق الرحمٰن، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور تسنیم سلیم چھتاری اس دور کے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے پڑھنے والوں کے ایک وسیع حلقے میں مقبولیت بھی حاصل کی اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں افسانے کے فن کو کوئی نہ کوئی نئی چیز بھی دی۔ اس دور کی افسانہ نگاری میں مجموعی حیثیت سے تین خصوصیتیں نمایاں ہیں۔ پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ ان میں سے ہر افسانہ نگار نے اس چیز کے شدید احساس کے ساتھ کہ افسانہ اور زندگی کی حقیقتوں میں بڑا گہرا اور ناگزیر ربط ہے اپنے افسانوں کے لئے زندگی کے اس مخصوص پہلو کا انتخاب کیا ہے جس کی جزئیات کا علم اسے سب سے زیادہ ہے۔ اسی لئے علی عباس حسینی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی اور دیوندر ستیارتھی کے افسانے دیہاتی زندگی کے افسانے ہونے کے باوجود ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے الگ الگ دیہاتیوں کے مصور اور ترجمان ہیں۔ اشک، بیدی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، غلام عباس، عصمت، ممتاز مفتی، ہاجرہ، خدیجہ، قرۃ العین حیدر، حسن عسکری وغیرہ شہری زندگی کے افسانہ نگار رہتے ہوئے بھی زندگی کے ایسے پہلوؤں کو اپنا موضوع بناتے ہیں جو ان کے مشاہدہ سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ کرشن چندر نے بہت کچھ لکھا ہے پھر بھی کشمیر کے متعلق سب سے زیادہ لکھا ہے۔ منٹو کی نظر سینکڑوں چیزوں پر ہے پھر بھی بمبئی ان کا سب سے عزیز موضوع ہے۔ ان چند مثالوں سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ مشاہدہ اور مطالعہ میں زندگی کے کسی خاص پہلو کی تخصیص کو اس دور کے افسانہ نگاروں نے اپنی خصوصیت بنایا ہے۔

اس دور کے افسانوں کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ لکھنے والوں کے مزاج اور شخصیت کا بہت گہرا پرتو ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے جس موضوع پر بھی افسانہ لکھا ہے اس پر اپنے انداز فکر، اپنے طرز تخیل اور اپنے جذبات و احساس کی بڑی گہری چھاپ ثبت کی ہے اور اس طرح ماحول کی تخصیص کے ساتھ ساتھ مصنفوں کی انفرادی شخصیتوں کی گوناگونی نے اس دور کے افسانے کو ہزار رنگ دے دیے ہیں۔

اور پھر تیسری بات یہ کہ اس دور کے افسانہ نگار اسلوب اور فن میں نئے تجربے کرنے سے نہیں گھبراتے۔ ان میں دوسروں کی اچھی چیزوں کو اپنا لینے کا حوصلہ بھی ہے اور نئے اسلوب تلاش کرنے اور انہیں بے جھجک سامنے لانے کی جرأت بھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ماحول کے مختلف تنوع اور شخصیتوں اور مزاجوں کے رنگا رنگ فرق نے ہمارے افسانے کو جو نئے سے نئے انداز دیئے تھے ان میں نئے تجربوں کی شوخی اور جرأت نے اور چار چاند لگائے اور اس طرح اس نئے دور کا افسانہ موضوع کے تنوع کے اعتبار سے، اسلوب کے نئے پن کے لحاظ سے اور فکر، تخیل اور احساس کی گوناگونی کے نقطۂ نظر سے پچھلے دور کے افسانوں سے بہت مختلف نظر آتا ہے۔ اس میں جدت اور روایت کا بڑا شیریں اور لطیف امتزاج ہے اس میں ایک خاص عہد کی سیاسی زندگی اور اس سیاسی زندگی کے پیدا کئے ہوئے معاشی

اور معاشرتی نتائج کی بڑی واضح اور مکمل تصویریں ہیں اور خارجی حقائق کی تصویروں کے ساتھ ساتھ انسان کے جذبات، احساسات، افکار اور نفسیاتی ردِ عمل کا بڑا صحیح عکس بھی۔ اجتماعی زندگی کے مسائل فرد کے ذہن اور اعصاب پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کا مطالعہ اس دور کے افسانہ نگاروں نے بڑی باریک بینی سے کیا ہے اور اپنے اپنے دائرہ عمل میں فرد کے فکری اور جذباتی ردِ عمل کی جو صورتیں دیکھی ہیں انہیں ملے جلے علمی اور فنی انداز میں اپنے افسانہ میں جگہ دی ہے اور مشاہدہ کی اس وسعت اور وقتِ نظر نے اسے جو نئے نئے موضوع دیئے، ان کے اظہار کے لئے اس نے فن کے نئے نئے تجربے کرنے کی طرف قدم بڑھایا اور اس طرح اس دور کے افسانوں میں زندگی کی پوری گہما گہمی اور فن کے نئے سے نئے اسالیب نے ایک دوسرے کو آگے بڑھانے میں مدد دی ہے۔ فن زندگی کا خدمت گزار اور معاون ہے اور اس کے بدلے میں زندگی فن کو نئی راہیں سجھاتی اور اس خدمت گزاری کا حق ادا کرتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی زندگی میں ایک زبردست سیاسی اور معاشرتی انقلاب رونما ہوا۔ اس انقلاب کے ظاہر ہونے سے پہلے ہمارا افسانہ فن کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں زندگی کے حقائق، فن کار کی شخصیت اور فن کا حسن ایک دوسرے میں جذب اور مدغم ہو جاتے ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد خاصے عرصے تک معاشرتی اور اخلاقی زندگی پر انتشار اور اضطراب کی کیفیت طاری رہی۔ انسان ایک ناقابلِ بیان بحران میں مبتلا رہا اور اس کے جذبات، احساسات اور افکار، اعتدال و توازن کی اقدار سے عاری و بیگانہ ہو گئے اور اس طرح فن کار کے لئے متوازن فنی تخلیق کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ ان حالات میں اکثر افسانہ نگاروں نے کچھ نہیں لکھا اور پھر جب آہستہ آہستہ انہوں نے لکھنا شروع کیا تو ان کے افسانوں کا موضوع یہ زبردست انقلاب اور اس انقلاب کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی شاخسانے تھے۔ ان موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت اکثر لکھنے والے اپنے آپ کو جذباتی ہیجان سے محفوظ نہیں رکھ سکے اور جنہوں نے اپنے جذبات و اعصاب پر قابو پا کر کوئی متوازن افسانہ لکھا اس میں واقعات کی عکاسی اور اصلاح پسندی کا رجحان اس درجہ غالب ہے کہ فنی اقدار کو پوری طرح ابھرنے کا موقع بہت ہی کم ملا ہے۔

تقسیم سے پہلے جن افسانہ نگاروں نے اس فن میں رہنمائی کا شرف حاصل کیا تھا یا جنہوں نے زندگی اور فن پر پوری گرفت حاصل کر کے اپنے لئے کوئی امتیازی جگہ بنائی تھی انہوں نے بھی تقسیم کے بعد کے زمانہ میں جو کچھ لکھا اس میں فن کا شعلہ کچھ بجھا بجھا سا دکھائی دیتا ہے ——— کم از کم علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی، اپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور حیات اللہ انصاری کا یہی حال ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے اسلوبِ خاص کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں کہیں کہیں ضرور نظر آ جاتی ہیں۔ کرشن چندر اور منٹو نے تقسیم کے بعد بھی حسبِ معمول کثرت سے لکھا اور میر کی طرح کبھی بہت اچھا اور کبھی بہت برا لکھنے کی روش قائم رکھی۔ فن تو ان دونوں فن کاروں کے ہاتھوں انحطاط اور زوال سے زیادہ آشنا ہوا ——— ترقی کا رویہ زیبا اسے کم دیکھنا نصیب ہوا۔ لیکن اس دور کے جن افسانوں کو "حسن و زیبائی" کی سند ملی ہے ان میں موضوع، شخصیت اور فن کا رچاؤ موجود ہے۔ یہ رچاؤ، نظمہ آفریدی اور استقلال احمد صدیقی، بلونت سنگھ اور غلام عباس کے اکثر افسانوں میں نمایاں ہے اور ہاجرہ مسرور، خواجہ احمد عباس، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، مہندر ناتھ، دیوندر ستیارتھی، نسیم سلیم، قدرت اللہ شہاب اور شفیق الرحمٰن کی جستہ جستہ کہانیوں میں۔ ایک چیز التباس سب لکھنے والوں کی یہاں صاف نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا وہ اسلوبِ فن جس کی تخلیق میں ان کے مخصوص ماحول، ان کے منفرد اندازِ فکر و تخیل، ان کے جذباتی میلان اور شخصیت کے مختلف ابعاد نے یوں حصہ لیا تھا اب بھی قائم ہے اور اس اسلوب کی بدولت ہر ایک کا افسانہ دوسرے سے الگ ایک ایسے رنگ کا حامل نظر آتا ہے جس میں ایک مخصوص دلکشی اور تاثیر ہے۔

ان افسانہ نگاروں کی ان اکّا دُکّا فنی تخلیقات کے علاوہ جن میں فن کا رچاؤ موجود ہے یا ان دو چار افسانہ نگاروں کے علاوہ جن کا ابھی ذکر آیا (ندیم، غلام عباس، بلونت سنگھ اور کبھی کبھی منٹو اور کرشن چندر) اس دور کے پورے فن پر انحطاط کی اقدار کا سایہ ہے۔ فن کار جیسے بانجھ ہو گیا ہے یا سیاسی اور اقتصادی حالات کے بوجھ نے اس کی ساری تخلیقی قوتیں سلب کر لی ہیں یا ماحول میں اسے ایسے محرکات میسّر نہیں ہیں جن میں ادب اور فن پوری آزادی سے پروان چڑھتے ہیں۔

یہ حال تو پرانے لکھنے والوں کا ہے ——— لیکن ان پرانے لکھنے والوں کے علاوہ تقسیم کے بعد بعض نئے لکھنے والے افسانوی ادب اور فن کے ایوان میں داخل ہونے اور پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے ——— ان نئے آنے والوں میں انتظار حسین، اے حمید، دیویندر اسّر، انور عظیم، انور خیر الدین، خلیل احمد، ابن الحسن اور اشفاق احمد کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ان نئے لکھنے والوں میں سے ہر ایک نے موضوع کے انتخاب اور اسے پیش کرنے کے فنی اسلوب میں اپنے ذہنی و جذباتی رجحانات کو دخل دیا ہے اور اس لئے ہر ایک کے افسانے ماحول کے بعض مشترک تاثرات و رجحانات کے حامل ہونے کے باوجود اس کے مخصوص فکری، تخیلی اور جذباتی میلانات کا عکس ہیں۔

ان نئے افسانہ نگاروں نے عموماً اپنے مشاہدہ کے لئے ایک خاص میدان منتخب کر کے اسے اپنی کہانی کا پس منظر بنایا ہے، اس مخصوص اور محدود ماحول سے الگ ان سب نے عموماً بین الاقوامی سیاست اور معیشت کے بدلتے ہوئے حالات پر بھی نظر رکھی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہیں ماحول اور فرد کے رشتے کا پوری شدّت سے احساس ہے اور اس لئے ان سب نئے لکھنے والوں کی کہانیاں ایک مخصوص اور محدود ماحول کی کہانیاں ہوتے ہوئے بھی بین الاقوامی زندگی کے رجحانات کا عکس اور فرد کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیتوں کی آئینہ دار ہیں۔

موضوع کے ان مشترک پہلوؤں سے قطع نظر، اندازِ بیان میں بھی ان سب لکھنے والوں نے تفصیل و تشریح کے بجائے ایجاز و اختصار اور اشاریت و ایمائیت کو اپنے مقصد کے لئے زیادہ پسندیدہ جانا ہے۔ ان لکھنے والوں نے ادبیت و شعریت، طنز و مزاح، اور بیان کی جدّتوں کو اظہار کا موثر وسیلہ سمجھ کر اپنے اسالیب میں انہیں پوری آزادی سے جگہ دی ہے ——— اور پھر ان وسائل سے کام لے کر افسانوں میں صرف اس موضوع کو جگہ دی ہے جو ان کی پسند اور مزاج سے مطابقت رکھتا ہے ——— مثلاً خلیل احمد کے افسانے انسان کی اس ذہنی کیفیت کی مصوّری کرتے ہیں جو زندگی اور ماحول سے بیزاری کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے ——— ابن الحسن کی کہانیاں عموماً ایسے کرداروں کی کہانیاں ہیں جنہیں ماحول کا رنگ اتنا پختہ کرتا ہے کہ کوئی طوفان، کوئی انقلاب اسے ہلکا اور پھیکا نہیں کر سکتا۔ خیر الدین نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ انسان کے ظاہری عمل اور باطنی کیفیت کے ربط و تعلق کی وضاحت کی ہے۔ انور عظیم کے افسانے بھی ذرا نیچے انداز میں کرداروں کے ماحول اور مزاج کے اسی رشتہ کی تصویریں کھینچتے ہیں ——— شرکت حسد یعنی کے افسانوں میں ایسے کردار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جنہیں ماحول کی ستم ظریفیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ماضی کی یادوں میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ دیویندر اسّر نے تصوّر و تخیّل کی دنیا میں پناہ لینے کے بجائے آزادی کے نغمے گانے اور حقیقت کی ایک ایسی دنیا آباد کرنے کو اپنا مطمحِ نظر بنایا ہے جس میں زندگی دکھوں سے آزاد ہو سکے ——— اے حمید کے افسانوں کا پسندیدہ موضوع زندگی کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ حسین مناظرِ فطرت ہیں ——— انتظار حسین کی کہانیاں ایک مخصوص معاشرے اور اس معاشرے کے کرداروں کی کہانیاں ہیں اور اشفاق احمد کی کہانیاں کسی مخصوص ماحول کی پابندی کے بغیر ہی سچی محبت کی کہانیاں ہیں جس کا نور ہر دل میں موجود ہے۔

موضوع کی ندرت کی یہ راہیں افسانہ نگاروں کو ان کے مخصوص مزاج اور ذاتی پسند و ناپسندیدگی نے دکھائی ہیں اور ان راہوں پر چل کر ان نئے لکھنے والوں نے کبھی کبھی ایسی کہانیاں لکھی ہیں کہ وہ فنی انحطاط کے اس دور میں بھی ہمیں مایوسی کے احساس سے بچاتی ہیں لیکن یہ احساس اب بھی ہر ایک کے دل میں کھٹک پیدا کرتا ہے کہ یہ کارنامے اس سطح تک کبھی نہیں پہنچتے جس تک وہ اپنے دو بڑے (یعنی کرشن چندر، بیدی، عصمت، منٹو وغیرہ کا عہد) میں پہنچتے تھے۔ لیکن اس کھٹک اور خلش کے ساتھ ایک بات تسکین کی بھی ہے اور وہ یہ کہ ان نئے لکھنے والوں میں سے اکثر میں وہ صلاحیتیں موجود ہیں جن سے فن کو عظمت ملتی ہے ——— شرط صرف یہی ہے کہ فن کار فکر، تخیل اور احساس کی گہرائیوں میں جذب ہو کر اپنے کام کو پورے خلوص، پوری دیانت اور پوری مشقت سے انجام دینے کے عادی بنیں کہ افسانہ نگاری کی جوئے شیر بھی کوہ کنی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

مختصر افسانے کا فن

مختصر افسانہ وہ افسانہ ہی نہیں ہوتا جو صرف مختصر ہو۔ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے ——— اختصار اس کی بنیادی خصوصیت ضرور ہے لیکن اس اختصار کے ساتھ ساتھ جب تک اس میں دوسری خصوصیات موجود نہ ہوں، اس کو مختصر افسانہ نہیں کہا جا سکتا ——— مختصر افسانہ تو ایک فن ہے جس کے اپنے جمالیاتی اصول اور فنی مقتضیات ہیں ——— افسانہ جب تک ان اصول اور مقتضیات کو پورا نہیں کرتا، اس وقت تک اس کو مختصر افسانے سے تعبیر کرنا مشکل ہے۔ ایسے افسانے جن میں محض اختصار ہوتا ہے اور جو ان جمالیاتی اصول اور فنی مقتضیات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے وہ تو ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک "پریم کے مختلف ادوار میں برابر تخلیق کئے جاتے رہے ہیں لیکن ان جمالیاتی اور فنی مقتضیات نے مختصر افسانے کو جو مخصوص شکل دی ہے وہ دورِ جدید کی پیداوار ہے ——— ویسے کہیں کہیں ان اصول اور مقتضیات کی جھلک ان افسانوں میں بھی جگہ جگہ نظر آجاتی ہے جن میں محض اختصار ہے اور جو ہر ملک اور ہر قوم کی زندگی میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں ——— مختلف ملکوں کے علم الاصنام اور دیومالا میں ان کہانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ اخبار اور دوسری مدتیں کتابوں میں ایسی بے شمار کہانیاں موجود ہیں ——— ان کہانیوں اور داستانوں کو مختصر افسانہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان میں کہیں کہیں مختصر افسانے کی سی بات پیدا ضرور ہو جاتی ہے اس لئے مختصر افسانے کی روایت یوں زندگی اور ادب میں بہت پرانی ہے لیکن اس نے ایک مستقل فن کی صورت موجودہ دور ہی میں اختیار کی ہے اور اس کی بنیاد جدید دور کے جمالیاتی تقاضوں پر استوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ افسانہ جو صرف مختصر ہو مختصر افسانہ نہیں ہے بلکہ مختصر افسانہ وہ صنفِ ادب ہے جس کے فن کی اپنی ایک دنیا ہے، اور اس دنیا کے اپنے اصول ہیں، اپنی قدریں ہیں، اپنے معیار ہیں، اپنے قواعد و ضوابط ہیں ——— مختصر افسانہ انہی اصولوں، قدروں اور معیاروں سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ انہی سے عبارت ہے۔

یہ اصول، قدریں اور معیار کیا ہیں؟ ان کا وجود کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ کون سے حالات تھے جن میں ان کی تخلیق ہوئی؟ اور وہ کون لوگ تھے جنہوں نے ان کو برتا، پروان چڑھایا اور اس طرح ان کو فروغ دینے کا باعث بنے؟ ——— یہ سوالات مختصر افسانے کے فن کو سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ——— اور ان سوالات کو حل کرنے ہی میں مختصر افسانے کے فن کو سمجھنے کا راز مضمر ہے۔

مختصر افسانے کا فن انیسویں صدی کے دورِ آخر کی پیداوار ہے۔ اس سے قبل یہ فن کسی مستقل صورت میں نظر نہیں آتا۔ ویسے اس سے قبل بھی افسانے لکھے ضرور جاتے تھے۔ ان افسانوں میں اختصار بھی ہوتا تھا لیکن اس اختصار کے باوجود وہ داستانوں اور ناول سے زیادہ قریب تھے ان میں ایک پھیلاؤ ہوتا تھا، ایک وسعت ہوتی تھی۔ پلاٹ کی پیچیدگی اور کرداروں کی رنگارنگی کے سہارے وہ آگے بڑھتے تھے۔ اسی لئے مجموعی طور پر ان کا میدان رکنیوس بھی وسیع ہوتا تھا۔ وحدت اور ہم آہنگی کی طرف ان میں بہت کم توجہ دی جاتی تھی ——— بیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہر زبان میں ایسے افسانوں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ انگریزی میں ڈکنس نے ایسے بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ فرانس میں بالزاک ایسے افسانے لکھنے میں پیش پیش رہا ہے۔ روس میں ٹالسٹائی کے یہاں اس قسم کے افسانے موجود ہیں ——— اردو میں سرشار، شرر، ندیم، راشد الخیری وغیرہ کے یہاں ایسے افسانوں کی فراوانی نظر آتی ہے ——— غرض مختصر افسانے کی تخلیق سے قبل کوئی ملک بھی ایسے افسانوں سے خالی نہیں رہا ——— لیکن یہ افسانے فنی اعتبار سے اپنے اندر کوئی انفرادی شان پیدا نہ کر سکے ——— اور اسی لئے ان افسانوں کی کوئی فنی اور جمالیاتی اہمیت نہیں ہے۔ صرف کہانی کا نشیب و فراز انہیں دلچسپ بناتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان افسانوں میں دلچسپی کا محور ہیئت اور فن کے مقابلے میں موضوع اور مواد زیادہ ہوتا تھا اور اسی کے سہارے وہ زندہ رہتے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر میں مختصر افسانے کے جس فن کا آغاز ہوا اس کو ان افسانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ وہ تو ان افسانوں سے موضوع اور مواد فن اور ہیئت دونوں اعتبار سے مختلف تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے حالات بڑی حد تک بدل چکے تھے۔ زندگی ایک نئے موڑ پر آگئی تھی اور اس کے نتیجے میں معاملات و مسائل میں تغیر ہوا تھا۔ افراد کے مذاق میں تبدیلی ہوئی تھی۔ ان کے فنی شعور نے نیا رخ اختیار کر لیا تھا اس لئے ان کے جمالیاتی تقاضے بھی کچھ اور تھے ——— مختصر افسانے کو اسی بدلتے ہوئے فنی شعور اور نئے جمالیاتی تقاضوں نے پیدا کیا ——— ایک عام خیال یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب کے زیر اثر انسانی زندگی کو جس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا اس نے مختصر افسانے کی تخلیق کی۔ اس خیال کو بنیاد بنا کر بعض نے اس رائے کا اظہار کیا کہ انیسویں صدی تک آتے آتے چونکہ انسان بہت مصروف ہو چکا تھا۔ اس کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ بڑی تخلیقات سے دلچسپی لے سکے۔ اس لئے اس نے ناول کی جگہ مختصر افسانے کو پیدا کیا ——— اس خیال میں ایک حد تک تو صداقت ضرور ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس میں بڑی ہی سطحیت کا احساس ہوتا ہے ——— یہ بات تو صحیح ہے اور اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ انیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے انسان صنعتی انقلاب کے باعث خاصا مصروف ہو گیا تھا اس کے پاس فرصت کے لمحات بہت کم رہ گئے تھے اس لئے وہ اپنی جمالیاتی تسکین کی خاطر ادب اور فن کی ایسی اصناف کو تخلیق کرنا چاہتا تھا جن سے دلچسپی لینے میں زیادہ وقت صرف نہ ہو۔ اسی صورتِ حال نے مختصر افسانے کی بنیاد رکھی لیکن اس سے کہیں زیادہ صحیح یہ بات ہے کہ صنعتی انقلاب نے جو حالات پیدا کئے تھے۔ انہوں نے انسانی مزاج کو تبدیل کیا تھا۔ ان کے مذاق میں ایک بدلی ہوئی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ ہر چیز کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے لگے تھے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اپنی جمالیاتی تسکین کے لئے نئے اصناف کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ انہوں نے ادب کے ہر قسم میں نئے اصناف کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا۔ شاعری میں ہیئت اور اسالیب کے نئے تجربے کئے۔ ناول کو نئے سانچوں میں ڈھالا ——— مختصر افسانہ بھی بدلے ہوئے حالات کے زیر اثر نئے تجربات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس مختصر افسانے نے ایک نئی صنعت ادب کی حیثیت سے موجودہ دور میں ان گنت افراد کی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم کیا ہے اور موجودہ دور میں اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔ لیکن اس کی بنیاد نام نہاد مختصر افسانے کے اختصار ہی پر نہیں ہے ——— اگر ایسا ہوتا تو مختصر افسانے کے ساتھ ساتھ ناول کے فن کا ارتقائی تسلسل جاری نہ رہتا اور مختصر افسانے کے فن میں طویل مختصر افسانے کے تو نئے نئے تجربے نہ ہوتے۔ ناول کا فن مختصر افسانے کے ساتھ ساتھ ترقی کر رہا ہے لیکن نئے جمالیاتی احساس نے اس میں نئے تجربے کئے ہیں اور اس طرح اس کی ہیئت بھی بدلی ہے۔ بہت سے نئے ناول نگاروں کے یہاں اس صورتِ حال کا

احساس ہوتا ہے ——— اور ناول کے ان تجربات میں بڑی حد تک ان ایمائی، اشاراتی اور کنایاتی پہلوؤں کو دخل ہے جو موجودہ دور کے تمام اصنافِ ادب میں نمایاں نظر آتے ہیں اور اس کا احساس نہ صرف ان ناولوں میں ہوتا ہے جن کو نئے تجربات نے مختصر کر دیا ہے بلکہ طویل ناولوں میں بھی یہ خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے ——— وہ ناول جو اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں ان میں ورجینیا وولف کے بعض ناول خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر (THE LIGT HOUSE) اور THE WAVES مختصر ناولوں کے ان تجربات کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ ان میں اشاراتی اور کنایاتی انداز کے ساتھ ساتھ ایک غنائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے جس نے انہیں شاعری اور نظم سے زیادہ قریب کر دیا ہے ——— اور طویل ناولوں میں جیمس جوائس کا ناول یولائی سیز (ULYSSES) اس کی بہت اچھی مثال ہے ——— ہر چند کہ اس ناول میں تفصیل اور جزئیات کا بیان ہے لیکن اس تفصیل اور جزئیات میں بھی مجموعی طور پر جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کا اشاراتی اور کنایاتی پہلو ہے ——— بلکہ جیمس جوائس کے فن کا کمال ہی یہ ہے کہ اس نے ان دونوں کا ایک سنگم بنایا ہے ——— اور ورجینیا وولف اور جیمس جوائس ہی پر منحصر نہیں جدید دور کے ہر اچھے ناول نگار کے یہاں اس قسم کے تجربات نظر آتے ہیں ——— اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ نئے دور کا انسان بڑی حد تک بدلا ہے ——— بدلتے ہوئے حالات نے اس کے مزاج اور اس کے جمالیاتی احساس میں بڑی تبدیلیاں کی ہیں اور ناول میں ہیئت کے یہ تجربے جن میں اشاراتی اور کنایاتی انداز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، درحقیقت اسی بدلتے ہوئے جمالیاتی احساس کا نتیجہ ہیں ——— صنعتی انقلاب کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ہیں انھوں نے زندگی کو زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے اور زندگی کی اس پیچیدگی سے افراد کچھ اتنوں سے بھر گئے ہیں۔ انہوں نے اس کے ساتھ کچھ مطابقت سی پیدا کر لی ہے۔ چنانچہ سیدھی سادی باتوں میں انہیں لطف نہیں آتا ——— سامنے کی باتوں سے ان کی تسکین نہیں ہوتی۔ ان کا ذہن تو زندگی کی تہوں کو کھولنا چاہتا ہے اس لئے وہ زندگی کے ساتھ ساتھ فن میں بھی تہوں کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کے بغیر ان کی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم نہیں ہوتا ——— جدید دور کے پیچیدہ ماحول نے افراد کے ذہنوں کو تیز کیا ہے، ان کے احساس میں شدت پیدا کی ہے اور ان کے تخیل کو بلند پرواز بنایا ہے ——— یہ سب باتیں اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ موجودہ دور کے افراد فن میں اشاراتی اور کنایاتی انداز سے دلچسپی لیں کیونکہ اس طرح اشاروں اور کنایوں کی تہوں کو کھولنے کا موقع ملتا ہے اور وہ اس طرح اپنی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں ——— ان کے نزدیک اسی اشاراتی اور کنایاتی انداز سے فن میں حسن کی قدر پیدا ہوتی ہے ——— مختصر افسانہ موجودہ دور کی اسی بدلتی ہوئی صورتِ حال کی پیداوار ہے۔ اس کے پیچھے اس نئے جمالیاتی احساس کے تقاضے ہیں جو اس بدلتی ہوئی صورتِ حال کے زیرِ اثر ایک نیا روپ اختیار کر رہا تھا اور جس نے ادب اور فن کی اقدار میں بعض اہم تبدیلیاں رونما کر دی تھیں۔ مختصر افسانے کا فن ان تبدیلیوں کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے۔

ناول اور مختصر افسانہ یوں بظاہر دیکھنے میں ایک دوسرے سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصنافِ ادب کی حیثیت سے ان کا ایک دوسرے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ ناول ہر حال ناول ہے اور مختصر افسانہ ہر حال مختصر افسانہ ہے۔ موجودہ دور میں مختصر افسانے کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نے ناول کی جگہ لے لی ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مختصر افسانہ ناول کی کوئی ارتقائی صورت ہے۔ ناول اور افسانہ چونکہ دو مختلف اصناف ہیں اس لئے ان میں کسی آویزش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ جدید دور میں افسانے کے ساتھ ناول کے فن میں بھی ایک ارتقائی کیفیت نظر آتی ہے ——— مختلف زبانوں میں بہت اچھے افسانوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے ناول بھی لکھے گئے ہیں اور اپنی اپنی جگہ ان دونوں کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے ——— وجہ اس کی یہ ہے کہ ناول اور مختصر افسانہ دونوں کے میدان مختلف ہیں۔ ناول زندگی کی وسعت اور اس کے پھیلاؤ کی عکاسی کرتا ہے اور مختصر افسانے کے پیشِ نظر زندگی کے ایسے پہلو ہوتے ہیں جن کا وسعت اور پھیلاؤ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مختصر افسانہ تو زندگی کی کسی وقتی اور لمحاتی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لئے اس میں کسی قسم کی وسعت اور کسی طرح کے پھیلاؤ کی ترجمانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ناول میں انسان کی زندگی کے سارے

نشیب و فراز کی تصویر یوں ہوتی ہیں بچپن سے لے کر مرتے دم تک افراد کو جو واقعات پیش آتے ہیں، جن معاملات و مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ سب ناول کے فن کا موضوع بنتے ہیں۔ اسی لئے ناول میں تفصیل و جزئیات ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے مختصر افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کو پیش کرتا ہے، کسی ایک فروگزاشت ہوا کوئی ایک واقعہ، اس کی کوئی ایک مخصوص وقتی کیفیت، کوئی ایک ذہنی اُلجھن افسانے کا موضوع بن سکتی ہے۔ ظاہر ہے کسی وقتی کیفیت کو پیش کرتے ہوئے تفصیل و جزئیات سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ اسی لئے مختصر افسانے میں اختصار اور اجمال ہوتا ہے ——— لیکن مختصر افسانے کا فن کار اس اجمال و اختصار میں بھی معنویت کی دنیائیں سمو دیتا ہے ——— کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہنا اس کے فن کی بنیادی خصوصیت ہے ——— لیکن افسانہ نگار کے اس اظہار میں انتشار نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے اس اظہار کے لئے ایک محور ضروری ہے۔ یہ محور خیال کی وحدت کے سہارے پیدا ہوتا ہے اور اس خیال کی وحدت سے تاثر کی وحدت پیدا ہوتی ہے ——— اس وحدتِ خیال اور وحدتِ تاثر کے بغیر مختصر افسانے کو فنی طور پر مختصر افسانہ نہیں کہہ سکتے۔

ویسے ناول کی طرح مختصر افسانے میں بھی ان عناصر کا ہونا ضروری ہے جن کے بغیر اس کو افسانے کے تحت شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے بھی پلاٹ ضروری ہے، کردار یا کردار کا کوئی پہلو ضروری ہے، کوئی نقطۂ نظر یا نظریۂ حیات ضروری ہے، ایک مخصوص اسلوب اور انداز بیان ضروری ہے ——— ان کے بغیر نہ تو اس میں وہ ایمائی اور اشاراتی انداز پیدا ہو سکتا ہے، نہ وحدتِ خیال اور وحدتِ تاثر! ——— کیونکہ ان سب پہلوؤں کو برتنے ہی کی صورت میں یہ خصوصیات پیدا ہو سکتی ہیں ——— ان کی بنیاد تو وہی افسانے کے بنیادی عناصر ہیں جن سے اس کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

مختصر افسانے میں آج کل جو نئے تجربات ہوئے ہیں انہوں نے اس کو بہت سی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے ——— چنانچہ بعض ایسے افسانے بھی موجودہ دور میں لکھے گئے ہیں جن میں پلاٹ نہیں ہے حالانکہ پلاٹ افسانے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے ——— پلاٹ کہانی کی ترتیب کا نام ہے اور اس ترتیب کے بغیر افسانے میں افسانویت نہیں رہتی ——— اس لئے مختصر افسانے میں پلاٹ کا وجود لازمی ہے۔ کیونکہ مختصر افسانہ سب سے پہلے افسانہ ہوتا ہے ——— اور افسانہ ہونے کے لئے اس میں کسی نہ کسی حد تک کہانی کے عنصر کا ہونا ضروری ہے ——— اس عنصر کی اہمیت کا احساس ہی پلاٹ کا وجود بخشتا ہے، اور اس پلاٹ کو مختصر افسانے میں بڑی اہمیت حاصل ہے ——— ناول میں بھی پلاٹ کی وہ اہمیت نہیں جو مختصر افسانے میں ہے۔ ناول میں تو کردار بڑا کام کرتے ہیں لیکن مختصر افسانے میں کرداروں کی ارتقائی کیفیت کی تفصیل نہیں ہوتی ——— اس لئے ظاہر ہے اس میں پلاٹ کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہونا چاہئے ——— ناول میں تو اس پلاٹ کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے اور کرداروں کے فطری ارتقاء کے ساتھ اس کی ارتقائی رفتار بھی ہم آہنگ ہوتی ہے۔ لیکن مختصر افسانے میں ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں کرداروں کی ارتقائی کیفیت پیش نہیں کی جاتی۔ اس لئے کہانی اور پلاٹ سے اس کے ہم آہنگ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——— برخلاف اس کے مختصر افسانے میں ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی ایک معمولی سا واقعہ ہی پلاٹ کی صورت اختیار کر لیتا ہے ——— اس واقعے میں چونکہ بظاہر کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی اس لئے اس کے بیان میں کسی پیچیدہ اور پیچ انداز کو دخل نہیں ہوتا ——— اس واقعے کے بیان میں ناول کی سی تفصیل ممکن نہیں کیونکہ یہ واقعہ بذاتِ خود زندگی کے کسی ایک لمحے سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس واقعے سے مختصر افسانے میں پلاٹ کی جو ترتیب عمل میں آتی ہے اس میں سادگی کا احساس ہوتا ہے ——— لیکن اس سادگی میں پرکاری کا رنگ، وہ رمزیت اور ایمائیت ہوتی ہے جس کو مختصر افسانے کا فن کار کسی حال میں بھی اپنے آپ سے جدا نہیں کرتا۔ اس سے پلاٹ میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ پلاٹ کو پیش کرنے کا یہ رمزیاتی اور ایمائی انداز مختصر افسانے کو سپاٹ ہونے سے بچا لیتا ہے۔ کیونکہ پڑھنے والے کے تخیل تقاضے اس سے پورے ہوتے ہیں ——— ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ سے اس کی تخیل کو تحریک ہوتی ہے اور وہ خود اس میں اس تفصیل کو تلاش کر لیتا ہے جو ان الفاظ اور فقروں کے پردوں میں چھپی ہوتی ہے ——— اس مختصر اور سادہ پلاٹ کی بنیاد حقیقت اور صداقت پر

استوار ہونا یقینی ہے کیونکہ وہ واقعہ ذہن پر کسی گہرے اثر کے نتیجے میں مختصر افسانے کے فن کار کو متوجہ کرتا ہے اور پھر چونکہ اس کے حدود وسیع نہیں ہوتے اس لئے اس میں غیر فطری باتوں کے راہ پانے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہی ہوتا ہے ——— پلاٹ کے محدود ہونے کے باعث اس کے تشبیب و فراز پر فن کار کی توجہ زیادہ رہتی ہے ——— اس لئے وہ اس کی اہمیت کو ذہن نشین کرانے کے خیال کو پس پشت نہیں ڈالتا ——— یہی اس کا تخلیقی عمل ہے جو مختصر افسانے کے پلاٹ کو ان خصوصیات سے مالا مال کرتا ہے جو اس کے لئے گویا ناول اور کیا مختصر افسانہ ہر جگہ ضروری ہوتی ہیں ——— پلاٹ میں وحدت اور تسلسل ایک بنیادی چیز ہے۔ مختصر افسانے کے پلاٹ میں یہ وحدت اور تسلسل کی خصوصیت کچھ اور بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ موضوع اور مواد محدود ہوتا ہے اور دوسرے ایک بات یہ بھی ہے کہ سادگی اور اختصار اس کو پیش کرنے کی بنیاد ہوتا ہے ——— ان حالات میں وحدت اور تسلسل کا باقی رکھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اسی لئے مختصر افسانے کے پلاٹ کی تشکیل میں فن کار سے اس کے تقاضے زیادہ ہوتے ہیں ——— بظاہر مختصر افسانے کے پلاٹ میں اس SUSPENSE کی گنجائش نسبتاً کم ہوتی ہے جو ناول کے پلاٹ میں واقعات یا کرداروں کے حرکات و سکنات سے پیدا ہوتا ہے۔ مختصر افسانے کے پلاٹ میں نہ تو واقعات زیادہ ہوتے ہیں اور نہ کرداروں کے حرکات و سکنات ہی کا ایسا کچھ زیادہ پتہ چلتا ہے۔ ناول کے برخلاف مختصر افسانے کے سارے پلاٹ ہی میں ایک SUSPENSE کی کیفیت ہوتی ہے ——— وہ SUSPENSE سے شروع ہو کر SUSPENSE ہی پر ختم ہوتا ہے ——— اور یہی مختصر افسانے کے پلاٹ کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔

اس پلاٹ میں کردار نمایاں نہیں ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ کردار کا کوئی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ کسی کردار کی کوئی حرکت نمایاں ہوتی ہے ——— اسی لئے مختصر افسانے کے فن میں کردار نگاری کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے ——— بات یہ ہے کہ مختصر افسانے میں کردار تو محض چند لمحوں کے لئے منظر عام پر آتے ہیں۔ اس لئے ان کی صرف ایک جھلک دکھائی دیتی ہے ——— لیکن اس جھلک سے بھی ان کو پہچانا جا سکتا ہے۔ ان کے بارے میں ایک رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کردار میں کونسی خصوصیات ہیں ——— لیکن ظاہر ہے اس کی ساری تفصیل مختصر افسانے میں نہیں سما سکتی۔ اسی لئے مختصر افسانے میں کردار تو ملتے ہیں۔ ان کے کردار کی بنیادی خصوصیات کی وضاحت بھی ہوتی ہے لیکن ان کی ترجمانی میں بھی پلاٹ کی طرح تفصیل اور جزئیات کو دخل نہیں ہوتا ——— یہاں بھی کردار کی طرف کچھ اشارے ہوتے ہیں ——— ان اشاروں ہی کے سہارے کردار کی تصویر سامنے آتی ہے ——— یہاں تک کہ بعض ان افسانوں میں بھی جن کا موضوع ہی کوئی ایک مخصوص کردار یا اس کردار کی کوئی مخصوص ذہنی کیفیت ہوتی ہے، یہی اشاراتی کیفیت نمایاں نظر آتی ہے ——— یہی وجہ ہے کہ مختصر افسانے میں کردار نگاری کا انداز ناول سے بالکل مختلف ہے ——— ناول میں اشاراتی انداز کے بجائے توضیحی انداز ہوتا ہے جس سے کردار کی بہت واضح اور نمایاں تصویر ابھرتی ہے ——— مختصر افسانے میں ایسا نہیں ہوتا ——— وہاں تصویر ابھرتی نہیں ——— وہ سامنے آتے کے باوجود نظروں سے اوجھل رہتی ہے ——— ویسے جہاں بھی مختصر افسانے میں کرداروں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جاتی ہے وہاں کچھ ڈرامائی سا انداز ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور کردار کی بنیادی خصوصیت کی طرف توجہ کو مرکوز کرنے کے لئے اس ڈرامائی انداز کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اس سے تحریک ہو اور اس طرح کردار کی وہ خصوصیات جو نظر سے اوجھل ہیں، سامنے آسکیں ——— بہرحال مختصر افسانے میں کردار نگاری مقصد نہیں ذریعہ ہے ——— مختصر افسانے کا فن کار اپنے بنیادی خیال کی وضاحت کے لئے ان کو ذریعہ بناتا ہے ——— یہ حرکت افسانے کا بنیادی موضوع بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کا مقصد کردار نگاری نہیں ہوتا۔ اسی لئے مختصر افسانوں میں ایسی کردار نگاری نظر نہیں آتی جس کی بنیاد تفصیل اور جزئیات ہو ——— لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کردار کے افسانے لکھے ہی نہیں گئے ہیں ——— ایسا نہیں ہے ——— ہر چند مختصر افسانے میں ناول کی طرح کردار نگاری کو کوئی بنیادی حیثیت نہ رہی ہو لیکن ایسے افسانے

مرحوم دور میں ضرور لکھے گئے ہیں جن کی بنیاد بعض کرداروں کے مطالعے پر قائم ہے۔ محمد حسن عسکری کا افسانہ 'چائے کی پیالی'، منٹو کا 'مرد ریل' اور ممتاز مفتی کے بیشتر افسانے اس قسم کے افسانوں کے بہت اچھے نمونے ہیں ——— یہ افسانے اور ایسے ہی بہت سے دوسرے افسانے کرداروں کے نفسیاتی مطالعے پر مبنی ضرور ہیں۔ لیکن ان میں جن ان کرداروں کی زندگی کی ساری تفصیل نہیں ہوتی۔ صرف زندگی کے کسی ایک پہلو کا بیان ہوتا ہے جس سے ان پر روشنی پڑتی ہے ——— یا ان کی زندگی کے کچھ معاملات ان کے کردار کی بنیادی خصوصیات کو واضح کرتے ہیں ——— افسانے کا فن کار ان کو پیش کرتے ہوئے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا ——— ان کرداروں کی زندگی کا جو پہلو پیش کیا جاتا ہے وہ خود انہیں بے نقاب کر دیتا ہے ——— جس بات کی طرف اشارے کئے جاتے ہیں وہ انہیں سامنے لاکر کھڑا کر دیتی ہے ——— اس لئے مختصر افسانے میں کردار نگاری کا بھی ایک مخصوص انداز ہے جس میں تمثیلی انداز اور اشاراتی زاویۂ نظر بنیادی حیثیت رکھتا ہے ——— مرحوم دور کے بڑھتے ہوئے نفسیاتی شعور نے اس انداز کو مختصر افسانے کے فن میں کچھ اور بھی نکھارا ہے ——— اور آج جو مختصر افسانے کے فن میں کرداروں کی تصویر کشی نیا سے نیا انداز اختیار کر رہی ہے وہ اسی کا بنیادی نتیجہ ہے۔

پلاٹ اور کردار مختصر افسانے میں اپنی اپنی جگہ تو ایک حیثیت رکھتے ہیں لیکن ویسے ان دونوں کی کوئی بڑی فنی اہمیت نہیں ہے ——— ان کی بنیاد کسی نہ کسی مرکزی خیال پر استوار ہوتی ہے ——— یہ کسی نہ کسی بنیادی نقطۂ نظر کے گرد گھومتے ہیں ——— بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مختصر افسانے کے فن کار کا نقطۂ نظر ہی پلاٹ اور کردار کی عمارتوں کو کھڑا کرتا ہے ——— اسی لئے مختصر افسانے کے فن میں نقطۂ نظر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نقطۂ نظر ہی دراصل افسانے کا موضوع ہوتا ہے ——— پلاٹ اور کردار وغیرہ کی حیثیت تو اس میں ضمنی ہوتی ہے ——— زندگی میں آن گنت واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں لیکن افسانے کا فن کار ان میں سے ہر ایک کو اپنے فن کا موضوع نہیں بناتا۔ وہ تو اسی واقعے کو اپنا موضوع بناتا ہے جس کو اس کے بنیادی نقطۂ نظر کے ساتھ مطابقت ہوتی ہے، جو اس کے نظریۂ حیات کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے ——— اس کا سبب یہ ہے کہ پلاٹ اور کرداروں میں بذاتِ خود اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ——— کیونکہ اس کا فن اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتا ——— اس کا فن تو اپنے محدود ہونے کے پیشِ نظر اس سے صرف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ زندگی کے کسی اہم پہلو کی طرف متوجہ ہو اور اہم پہلو اس کے نزدیک اپنے بنیادی خیال، نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات سے زیادہ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مختصر افسانے کو اسی نقطے سے اپنے فن کا ارتقائی سفر شروع کرنا پڑتا ہے اور یہی اس کے سفر کی آخری منزل بھی ہوتی ہے ——— ناول کے فن کار کی طرح مختصر افسانے کے فن کار کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ کرداروں کے ذریعے یا کہانی کے نشیب و فراز کے ترسط سے اپنے مقصد کی وضاحت کرے کیونکہ اس محدود میدان میں اس کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اپنے نقطۂ نظر کی طرف سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور یہی سبب ہے کہ اس کے ہر فقرے اور ہر لفظ میں ایسی تہیں ہوتی ہیں جن میں سے اس کا نقطۂ نظر اپنے آپ کو رونما کرتا رہتا ہے ——— ناول میں نقطۂ نظر کی وضاحت مختلف طریقوں سے ہو جاتی ہے ——— کہیں کردار اس کو واضح کر دیتے ہیں، کہیں خود ناول کا فن کار اس پر اظہارِ خیال کرنے لگتا ہے۔ مختصر افسانے کے فن کار کے لئے اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں نقطۂ نظر پر بحث نہیں ہو سکتی ——— اس پر وعظ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس پہلو کی طرف جگہ جگہ اشارے ہوتے ہیں ——— اور ان اشاروں کا سلسلہ شروع سے آخر تک جاری رہتا ہے ——— مختصر افسانہ اسی لئے تو کچھ نہ کہنے کے باوجود بہت کچھ کہتا ہے اور اس سے دلچسپی لینے والے کچھ نہ سمجھنے کے باوجود بہت کچھ سمجھتے ہیں۔

مختصر افسانے میں بظاہر تو فضا اور ماحول کا بیان بہت ہی کم ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس میں یہ انداز اختیار کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ جس بنیادی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اس کی تخلیق کی جاتی ہے وہ کسی نہ کوئی پس منظر ضرور رکھتا ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور ہوتی ہے ——— اور انہی کے سہارے اس میں فضا اور ماحول کے نقوش ابھرتے ہیں ——— اس فضا اور ماحول سے وہ جو ہمہ گیر فضا پیدا کرتا اور پڑھنے والے کے لئے ان کو قابلِ قبول بناتا فن کار کا ایک بہت ہی اہم کام ہے ——— مختصر افسانے کے فن نے اس کام کو انجام تو دیا ہے لیکن چونکہ ناول کے مقابلے میں اس کا

میدان محدود ہے اس لئے فضا اور ماحول کی ترجمانی میں ناول کی سی بات افسانے میں پیدا نہیں ہو پاتی ——— ویسے مختصر افسانے کا فن کار اپنے مخصوص انداز سے فضا اور ماحول کا احساس ضرور دلاتا ہے، اس کی طرف مترجم ضرور کرتا ہے ——— یہاں بھی چونکہ اس کے پاس تفصیل اور جزئیات کی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے وہ صرف اشاروں کے ذریعے فضا اور ماحول کی تصویر کشی کرتا ہے لیکن یہ تصویر کشی بڑی ہی موثر ہوتی ہے ——— کیونکہ پڑھنے والے کا ذہن اور شعور برابر اس سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن مختصر افسانے میں اس فضا اور ماحول کی ترجمانی بذات خود اہمیت نہیں رکھتی ——— کیونکہ وہ تو فن کار کے بنیادی نقطۂ نظر کو اُبھارتی ہے۔ اس کے نقوش کو نمایاں کرتی ہے۔ اس لئے خود اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا ——— چنانچہ مختصر افسانوں میں جہاں جہاں فضا اور ماحول کی ترجمانی ملتی ہے وہاں فن کار بعض بنیادی خیالات کو اشاروں میں واضح کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ——— لیکن یہ فضا اور ماحول ناول کی طرح مختصر افسانے کا بنیادی جزو نہیں ہوتے ——— یہ بھی کہ داروں کی طرح ایک ذریعہ ہیں ——— ویسے موجودہ دور میں ایسے مختصر افسانے لکھے ضرور گئے ہیں جن میں ماحول کی ترجمانی اور فضا کی عکاسی نمایاں نظر آتی ہے ——— لیکن ان میں بھی فن کار کے پیش نظر کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے ——— کسی نہ کسی بنیادی خیال کی ترجمانی ضرور ہوتی ہے ——— بہر حال مختصر افسانے میں فضا اور ماحول کی ترجمانی سے احساس اور تاثر میں اضافہ ہوتا ہے ——— اور اس طرح پلاٹ، کردار اور نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ یہ ترجمانی بھی مختصر افسانے کے فن کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

پلاٹ، کردار، نقطۂ نظر، فضا اور ماحول، ان تمام عناصر کی اہمیت مختصر افسانے کے فن میں مسلم ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں سارا کھیل اسلوب، انداز بیان اور طرز ادا کا ہوتا ہے ——— یوں تو ہر صنف ادب میں اسلوب، انداز بیان اور طرز ادا کو نمایاں جگہ حاصل ہے لیکن مختصر افسانے کے فن میں اس پہلو کو کچھ زیادہ ہی اہمیت حاصل ہے ——— بات یہ ہے کہ مختصر افسانے کا میدان بہت محدود ہوتا ہے اس لئے اس سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر فن کار کو ایک ایسا انداز بیان اختیار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے جو اس اختصار سے مطابقت رکھتا ہو لیکن جس سے اظہار و ابلاغ میں کسی قسم کی اُلجھن پیدا نہ ہو۔ گویا مختصر افسانے کا فن کار ایک ایسے اسلوب کی تشکیل کرتا ہے جس میں محدود ہونے کے باوجود ایک وسعت ہو۔ اسی لئے مختصر افسانے میں شاعری کی طرح الفاظ کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے ——— ایک ایک لفظ اور اس کے استعمال سے مختصر افسانے کا فن کار بڑے بڑے کام لیتا ہے ——— بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ صرف ایک لفظ ہی پر سارے افسانے کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر ایسا ایک لفظ کو ہٹا دیا جائے تو افسانے کا وجود ہی قائم نہیں رہتا ——— کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ افسانے میں اپنا اصل مفہوم بدل دیتے ہیں اور فن کار کا سحر کار قلم اس میں نئی معنویت پیدا کر دیتا ہے ——— یہی حال جملوں کی ساخت اور فقروں کی دروبست کا ہوتا ہے ——— اس کی بھی مختلف صورتیں مختصر افسانے میں نظر آتی ہیں ——— فن کار ان سب سے اپنے مقصد کے پیش نظر کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لئے زبان و بیان پر پوری قدرت مختصر افسانے کے فن کار کے لئے از بس ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ساری تکنیک اس سے متاثر ہوتی ہے ——— لیکن مختصر افسانے میں زبان و بیان کی اس قدرت کا مطلب محض انشا پردازی کا خیال ہی نہیں ہوتا، کیونکہ مختصر افسانے کے فن میں انشا پردازی کی گنجائش نسبتاً کم ہوتی ہے۔ وہاں تو ہر لفظ خیال سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر فقرے کو موضوع کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے۔ ہر جملہ مراد کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے ——— اسی لئے تو مختصر افسانے میں ایک لفظ بھی بیکار استعمال نہیں ہوتا ——— صرف انشا پردازی کے خیال سے اگر کوئی فن کار ایک لفظ بھی زیادہ استعمال کرنے لگے تو وہ افسانے میں بُری طرح کھٹکتا ہے ——— چنانچہ مختصر افسانے میں شاعری کی طرح الفاظ اپنی بہترین ترتیب کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں ——— ان الفاظ میں تہیں ہوتی ہیں ——— یہ پہلو دار ہوتے ہیں ——— ان میں جب تک ہیرے کی سی ترشی ہوئی کیفیت نہ ہو، یہ خاطر خواہ اثر نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ مختصر افسانے کے فن کار کو ایسا کرنے میں بڑی ہی جانکاہی سے کام لینا پڑتا ہے ——— لیکن اس میں کسی کاوش کو دخل نہیں ہوتا ——— اس کی یہ کوشش شعوری نہیں ہوتی ——— موضوع کی مناسبت سے اس کا فن کارانہ شعور اس صورت حال کو پیدا کر لیتا ہے ——— موضوع اور مراد کی بنیادی خصوصیات مختصر افسانے میں اسلوب اور انداز بیان کو پیدا کرتی ہیں ——— اور اسی لئے وہ افسانے کے ہر فن کار کے یہاں ایک مخصوص سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔

ان تمام عناصر کی بنیادی خصوصیات جب یکجا ہوتی ہیں تب مختصر افسانے کے فن کی تشکیل ہوتی ہے اور وہ ایک مخصوص ہیئت اختیار کرتا ہے۔ اس ہیئت میں بنیادی تو وہی اختصار ہے جو مختصر افسانے کے ساتھ مخصوص ہے اور جس کی وجہ سے پلاٹ، کردار اور اسلوب سب کے سب اس میں ایک نیا روپ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ——— یہ نیا روپ اس فن میں ایک انفرادیت کو پیدا کرتا ہے ——— اس انفرادیت کے سہارے وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا ہے اور اسے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی ——— بقول ایک مختصر افسانے کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے اور اس کے لئے یہ ضروری بھی ہے کہ وہ اپنی ایک دنیا پیدا کرے" ——— چنانچہ وہ اپنی دنیا پیدا کرتا ہے اور بذات خود ایک دنیا بن جاتا ہے۔

مختصر افسانے کی اس دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کے تاثر کی وحدت ہے۔ اس کی ہیئت چونکہ فروعی یا ضمنی باتوں کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی اس لئے صرف مرکزی خیال کو پیش نظر رکھنا اور مختلف زاویوں سے اس پر روشنی ڈالنا اس کے پیش نظر ہوتا ہے اور یہ مرکزی خیال بھی پیچیدہ نہیں ہوتا۔ اس میں بھی وسعت اور ہمہ گیری نہیں ہوتی اس لئے مختصر افسانہ اس محدود دائرے سے باہر نہیں نکلتا۔ فن کار اسی بنیادی خیال پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے ——— چونکہ خیال ایک سے زیادہ نہیں ہوتا اس لئے اس میں بذات خود بھی ایک وحدت ہوتی ہے۔ اور جب فن کار اس کو ایک وحدت سمجھ کر اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو خود اس کے اظہار میں بھی ایک وحدت کی خصوصیت نمایاں ہونے لگتی ہے ——— بلکہ شعوری طور پر وہ اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے کہ یہ وحدت پڑھنے والے پر خاطر خواہ اثر کرے۔ چنانچہ تاثر کی یہ وحدت مختصر افسانے کا بڑا اہم جزو بن جاتی ہے ——— مختصر افسانے کے تمام نقاد اس خیال پر متفق ہیں کہ اس میں شروع سے آخر تک تاثر کی یہ وحدت کارفرما ہونی چاہئے ——— اڈگر ایلن پو جو مختصر افسانے کا نقاد بھی تھا اور جس نے خود بھی مختصر افسانے میں تجربے کئے ہیں۔ اس نے تو اس حد تک کہہ دیا ہے کہ مختصر افسانے میں سب سے زیادہ جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ تاثر کی وحدت ہے ——— اور اس کا یہ خیال ایسا کچھ غلط نہیں ہے ——— کیونکہ تاثر کی اس وحدت کے بغیر اس کا مقصد پورا نہیں ہوتا ——— اس کے بغیر اس کی ہیئت خاطر خواہ اثر نہیں کرتی۔ چنانچہ اگر یہ خصوصیت مختصر افسانے کے فن میں نہ ہو تو وہ مختصر افسانے کے فنی حدود سے باہر نکل جاتا ہے ——— اور جمالیاتی احساس کی تسکین کا باعث نہیں بنتا ——— لیکن مختصر افسانہ چونکہ کسی ایک واحد مقصد کو سامنے رکھ کر تخلیق کیا جاتا ہے ——— اس لئے اس مقصد کی وحدت اس میں تاثر کی وحدت کو خود بخود پیدا کر دیتی ہے ——— یہی وجہ ہے کہ تاثر کی اس وحدت کا خیال شعوری نہیں ہوتا ——— وہ موضوع اور صورت، مراد اور ہیئت کی ہم آہنگی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

تاثر کی اس وحدت کے ساتھ ساتھ مختصر افسانے کے فن میں اس کی رمزیت اور ایمائیت بھی کچھ کم اہم نہیں ہوتی۔ ابتدا سے لے کر آخر تک اس میں ایک ایمائی انداز کا ہونا ضروری ہے ——— اس کا آغاز کسی ایسے واقعے سے ہوتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہوتا ہے لیکن جس کو زندگی کے درمیان سے لے لیا جاتا ہے اور پھر اس پر جس طرح روشنی ڈالی جاتی ہے وہ شروع سے آخر تک اس کو پوری طرح واضح نہیں ہونے دیتا ——— فن کار اس کو واضح کرنے کے لئے صرف اشاروں سے کام لیتا ہے ——— اور جانے پر یہ پراسرار ایمائی کیفیت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے اور پڑھنے والا سوچتا رہ جاتا ہے ——— بے شمار پہلو غور کرنے کے لئے اس کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں ——— اگر افسانے میں یہ خصوصیت نہ ہو تو اس کو فنی اعتبار سے مختصر افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ انگریزی کے مشہور افسانہ نگار اور افشا پرداز اسٹیونسن نے اس کو بڑی خوبی سے اپنے ایک خط میں واضح کیا ہے ——— سر سٹنی کالون نے اس کے ایک افسانے پر یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اس کا اختتام ٹھیک نہیں ہے اس لئے اس کو بدل دینا چاہئے ——— اس کے جواب میں اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے کہ:

"میں اس طرح نہیں لکھتا۔ میرے لکھنے کا یہ انداز نہیں ہے کہ ہر بات کو پوری طرح واضح کر دوں ——— میں تو کہانی میں ایک اثر سے بہت سے اثرات پیدا کرتا ہوں ——— اگر میں اپنے اس افسانے کے خاتمے کو تبدیل کر دوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ از سر نو اس کا آغاز کر دوں ——— افسانہ تو

ایک مستقل وحدت ہوتا ہے ——— اس لئے مجھے تو اس کا خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ میں اس کے اختتام میں کوئی تبدیلی کر دوں گا ——— کیونکہ میرے خیال میں تو افسانے کی ابتدا اور اس کے خاتمے میں وہی تعلق ہے جو گردن اور ہڈی میں ہوتا ہے ——— اس لئے ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ——— اس کے ساتھ ہی سالڈاسی خط میں اس نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ افسانے کو مجموعی طور پر بہت واضح نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں تو ایک رمز و ایما کی کیفیت سب سے زیادہ ضروری ہے ——— اور یہ خیال صحیح ہے کیونکہ جب تک افسانے میں یہ ایمائی کیفیت نہ ہو وہ اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا۔ اس ایمائی انداز سے ایک طرف تو دلچسپی برقرار رہتی ہے اور دوسرے افسانے کے معنوی پہلوؤں میں وسعت کا احساس بڑھتا ہے ——— لیکن اس رمز و ایمائیت میں جو پہلو سب سے زیادہ اہم ہے وہ جمالیاتی ہے ——— ہر فن میں کسی نہ کسی حد تک یہ ایمائی انداز احساس جمال کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ مختصر افسانے کے فن میں بھی اس کا مقصد یہی ہے ——— اسی لئے تو مختصر افسانے کے فن میں اس کو اس درجہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ایک مصنف نے تو اپنی کتاب میں مختصر افسانے کے اختصار کا سبب اسی ایمائی اور رمزیاتی کیفیت کو بتایا ہے ——— اس کے خیال میں وہ مختصر افسانہ جو واقعی فن کاری کا اعلیٰ نمونہ ہو اس میں تو یہ خصوصیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے ——— اس خصوصیت کو VERY CURIOUS HUNTING AND SUGGESTIVE QUALITY سے تعبیر کرتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کا یہ خیال صداقت پر مبنی ہے۔

اس ایمائی کیفیت اور رمزیاتی انداز کا اثر مختصر افسانے میں یہ ہوتا ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک ایک احساس تحیر کی لہر سی دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے ——— اور یہ احساس تحیر مختصر افسانے کے فن کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے پڑھنے والا اس کی طرف پوری طرح متوجہ رہتا ہے ——— اور ساتھ ہی افسانے میں اس کی دلچسپی قائم رہتی ہے ——— یہ احساس تحیر پڑھنے والے کے شعور میں تحریک پیدا کرتا ہے اس کے تخیل کی رو اس سے تیز ہوتی ہے ——— اور وہ افسانے میں زیادہ دلچسپی لیتا اور اس سے زیادہ متاثر ہوتا ہے ——— اس طرح یہ احساس تحیر ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے جو مختصر افسانے کے فن کار کو اپنے پڑھنے والوں سے ہوتے ہیں ——— یہی وجہ ہے کہ افسانے کے پہلے جملے سے یہ تحیر کا احساس پڑھنے والے پر چھانے لگتا ہے اور جیسے جیسے افسانے میں ارتقائی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے یہ احساس تحیر تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے ——— اور اس کا منتہا افسانے کا اختتام ہوتا ہے ——— گویا افسانہ احساس تحیر سے شروع ہو کر احساس تحیر ہی پر ختم ہوتا ہے ——— اور آخر تک پہنچتے پہنچتے اس میں حد درجہ شدت پیدا ہو جاتی ہے ——— لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مختصر افسانے کی تکنیک اس میں پیش کئے ہوئے کسی مسئلے کو حل نہیں ہونے دیتی اور ہر بات کو زیادہ سے زیادہ الجھا دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مختصر افسانہ تکمیل پر پہنچے بغیر نہیں ہٹتا۔ جو مسائل اس کا موضوع ہوتے ہیں وہ پڑھنے والے کے ذہن میں حل ہوتے ہیں ——— اس کا تخیل انہیں حل کرتا ہے ——— ان کو حل کرنے ہی کے لئے تو اس میں احساس تحیر کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے ——— ایک نقاد نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ مختصر افسانے کا فن کار اپنی طرف سے بہت کم دیتا ہے لیکن اپنے پڑھنے والوں سے بہت زیادہ کا تقاضا کرتا ہے۔

یہ عناصر جب تک مربوط نہ ہوں مختصر افسانہ فن کے حدود میں داخل نہیں ہوتا ——— یہی عناصر تو اس فن کی بنیاد ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مختصر افسانے کا فن جامد اور غیر متحرک ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ——— بس ان عناصر کو یک جا کر دینے ہی سے اس کی فنی تشکیل عمل میں آجاتی ہے ——— یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ مختصر افسانے کے فن کی مختصر سی تاریخ بتاتی ہے کہ اس میں شروع ہی سے تغیرات کا ایک سلسلہ جاری رہا ہے اور اس نے وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر نئے نئے رنگ بدلے ہیں ——— وہ اس طرح کہ اس فن میں ہمیشہ سے رنگا رنگ تجربات کا سلسلہ جاری رہا ہے ——— اپنی محدود دنیا میں رہ کر اس نے

ان تجربات نے اپنے دامن میں جگہ دی ہے ۔ لیکن ان تجربات نے اس کی بنیادی فنی خصوصیات پر پانی نہیں پھیرا ہے ——— ان کو ختم نہیں کیا بلکہ اس فن میں نئے نئے گل کھلائے ہیں اور اس کے نتیجے میں یہ فن تنوع کے نئے امکانات سے آشنا ہوا ہے ۔ مختصر افسانہ جو اوّل اوّل صرف کسی واقعہ در نسی حاص حنہ ہے کا بیان ہوتا تھا ' وہ وقت کے ساتھ ساتھ اس طرح بدلا کہ اس میں کردار کی طرف بھی توجہ کی جانے لگی ۔ کسی حد تک تفصیل ، جزئیات کو بھی دخل ہونے لگا ——— اور اس کے نتیجے میں مختصر افسانے نے کہیں کہیں طویل مختصر افسانے کی صورت بھی پیدا کر لی ۔ کہیں کہیں ، وہ خصوصیت کردار کا ایک خاکہ بھی بن کر رہ گیا ——— کہیں کہیں واقعات کے فن کارانہ بیان نے اسے "پورتاژ" بھی بنا دیا ۔ اور یوں یہ بدلتی زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کے اظہار نے اسے مضمون اور انشائیہ کی شکل بھی دے دی ——— غرض یہ کہ بدلتے ہوئے حالات سے ربط و ضبط نے بہت سی شکلیں بدلیں لیکن اس کے باوجود وہ مختصر افسانہ رہا ۔ کیونکہ ان تجربات کے باوجود اس نے اپنی خصوصیات کو تیاگ نہیں دیا جو مختصر افسانے کے فن کا بنیادی حصہ ہوتی ہیں ——— اس میں وہ تمام عناصر ان حالات میں بھی برقرار رہے جب وہ مختصر افسانے سے بڑھ کر طویل مختصر افسانہ " ہو گیا تب بھی وحدت تاثر باقی رہی ، رمزیاتی اور ایمائی انداز باقی رہا ۔ جب اس نے خاکے کی صورت اختیار کر لی تب بھی ۔ عناصر اس کے رگ رگ کے ساتھ رہے اور جب وہ " رپورتاژ " ہو گیا تب بھی ان عناصر کو اس نے نظر انداز نہیں کیا ——— اسی لئے اس میں فنی اعتبار سے کوئی ایسی انقلابی تبدیلی نہیں ہوئی جو اس فن کی صورت ہی کو بدل دیتی ——— تجربات کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کی فنی اقدار کو ان سے ٹھیس نہیں لگی ——— اور یہ فن ان تجربات کے باوجود ترقی کی راہوں پر گامزن رہا ۔

مختصر افسانے کے فن کی بنیادی خصوصیات جو تجربات کے ہوتے ہوئے بھی اس کے رگ رگ کے ساتھ رہتی ہیں ان کو سمجھنے اور ان کی جانب کو محسوس کرنے کے لئے ایک مخصوص ذہنی تربیت کی ضرورت ہے اور یہ ذہنی تربیت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک نئے حالات سے مطابقت پیدا نہ کی جائے ——— نئے حالات سے مطابقت نئے جمالیاتی احساس کا شعور عام کرنے سے ——— بدلتی ہوئی قدروں کی پاسداری سکھاتی ہے اور مختصر افسانے کا فن ان سب کا تقاضا کرتا ہے ——— وہی لوگ اس سے دلچسپی لے سکتے ہیں جن کے پاس بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر بدلتے ہوئے مذاق کا شعور ہے ——— جو یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی آج حد درجہ پیچیدہ ہو گئی ہے ۔ اس کو سمجھنے اور بسر کرنے کے لئے بلند تخیل کی ضرورت ہے تاکہ اس کے تشبیب و فراز کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے ——— جن کے پاس وہ حقیقت ہو کہ موجودہ دور کے پیچیدہ ماحول میں پیامیہ انداز سے کہیں زیادہ اشاروں اور کنایوں کی ضرورت ہے ——— مختصر افسانے کا فن ایسے ہی افراد کا متقاضی ہے اور موجودہ چونکہ ایسے ہی افراد کا دور ہے اس لئے اس دور کو مختصر افسانے سے خاص مناسبت ہے ——— زندگی کا آج جو عام انداز ہے اس میں اس صورت حال کے بدلنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ——— یہی وجہ ہے کہ مختصر افسانے کے لئے ترقی کی بہت سی راہیں کھلی ہوئی نظر آتی ہیں ——— مختصر افسانے کے فن کو آج حس حساس ذہن اور تیز بڑھنے والے کی ضرورت ہے موجودہ زندگی میں اس کی فراوانی ہے ——— اور اسی لئے اس کا مستقبل روشن اور تاب ناک ہے ۔

اس مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے میں ان فن کاروں کا ہاتھ بھی کچھ کم نہیں ہے جنہوں نے مختصر افسانے کے اس فن کو پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ لیا ہے اور جن کی تخلیقات نے افسانے کے ان فنی اصول اور مقتضیات کو برت کر اس سے دلچسپی لینے کی ایک فضا قائم کی ہے ——— ان فن کاروں میں گوگل ' ایڈگر ایلن پو ' موپاساں ' برٹ ہارٹے ' او ہنری ' چیخوف ' موپاساں ' ٹالسٹائی ' گورکی ' کیتھرین مینسفیلڈ وغیرہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ——— روس میں گوگل اور امریکہ میں ایڈگر ایلن پو سے مختصر افسانے کے اس فن کا آغاز ہوتا ہے ۔ گورکی نے یہ بات غلط نہیں کہی ہے کہ ہم سب روسی مختصر افسانے کے فنکار گوگل ہی سے پیدا ہیں (WE ALL SPRING FROM GOGOL'S OVER)

COAT ——— گوگل نے افسانے کے فن کو آسمان سے اتارا اور اس کی بنیاد زمین پر رکھی ——— اسی لئے اس کے یہاں مختصر افسانے کے مخصوص انداز میں عمومی زندگی کی تصویریں ملتی ہیں ——— ایڈگر ایلن پو نے اس فن کو عوامی زندگی سے قریب تر نہیں کیا لیکن افسانے کے فن کو لوک پلاٹ سے درست کرنے کی کوشش ضرور کی ——— اور اس میں شک نہیں کہ اس کی یہ کوشش مختصر افسانے کے فن کے لئے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے ——— امریکہ میں اس کے بعد جو افسانے لکھے گئے ہیں ان سب پر اس کا اثر ہے ——— امریکی زندگی اس عرصے میں بدلی ہے اور اس میں تیزی پیدا ہوئی ہے ——— اس بدلتی ہوئی کیفیت نے وہاں ایڈگر ایلن پو کے بعد بہت سے افسانہ نگاروں کو پیدا کیا اور اس طرح فن کی روایت ملویل، ہٹ ہارٹ اور اوہنری وغیرہ کے ہاتھوں میں نئی سے نئی شکلیں اختیار کر کے ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ پھر روس میں چیخوف نے اور فرانس میں موپاساں نے مختصر افسانے کی نئی روایت کو اپنی تخلیقی کاوشوں سے چار چاند لگا دئے ——— مختصر افسانے کے فن میں چیخوف اور موپاساں کے سے بلند مرتبہ فن کار زر اشکل ہی سے مل سکتے ہیں ——— چیخوف نے روسی عوام کی زندگی کو افسانے کا موضوع بنایا ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی ایک ایسے انداز میں کی ہے جو بظاہر تو سیدھا سادہ ہے لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو اس میں بہت سی تہیں نظر آتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کہانیوں کے پیچھے چیخوف کی اپنی شخصیت زیادہ کام کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ——— موپاساں کو اس کی فکر نہیں ہوتی ——— وہ تو جو کچھ دیکھتا ہے اسی کو بیان کرتا ہے ——— اسے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کے کردار کیا کر رہے ہیں اور اس کے واقعات کا رخ کس طرف ہے ——— وہ جس طرف بھی جانا چاہتے ہیں وہ انہیں جانے دیتا ہے ——— اس لئے انسانی نفسیات کے ایسے اسرار و رموز اس کے افسانوں میں بغیر کسی کاوش کے کھلتے ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ——— بہر حال چیخوف اور موپاساں نے ان پہلوؤں کو اس طرح افسانے میں سمویا ہے کہ اس سے فن کے لئے نئی راہیں نکلی ہیں ——— روس میں چیخوف کے بعد یہ فن ٹالسٹائی، تیرجنیف اور گورکی کے ہاتھوں میں پہنچا ہے ——— اور فرانس میں موپاساں کے بعد فلابیر، داؤدے اور اناطول فرانس وغیرہ فن کی اس روایت کو آگے بڑھاتے ہیں ——— ان سب میں اکثر اول نگاہ ہیں لیکن ان میں سے بیشتر نے فنی اعتبار سے مختصر افسانے میں بھی اضافہ کیا ہے ——— گورکی ان سب میں سب سے بڑا فن کار ہے ——— وہ انقلابی تھا اور اس کی زندگی کے انقلابی انداز نے اس کے فن میں بھی انقلابی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ گورکی کے مختصر افسانوں کا کمال یہ ہے کہ مجموعی طور پر تو وہ زندگی کے اہم پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں لیکن ویسے اس کے افسانوں کا ایک ایک لفظ منہ سے بولتا ہوا نظر آتا ہے ——— اس کے فقروں کی ایک ایک بندش کچھ کہتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ——— انگلستان میں مختصر افسانے کو ایسا کچھ زیادہ فروغ نصیب نہیں ہوا لیکن انگریزی زبان میں ایک افسانہ نگار ایسی ضرور پیدا ہوئی ہے جس کو چیخوف کا معنوی شاگرد کہا جا سکتا ہے ——— انگریزی افسانے میں نیوزی لینڈ کی کیتھرین مینسفیلڈ کی وہ اپنی ایک انفرادی حیثیت ہے لیکن اس کا مزاج چیخوف کے فن سے مناسبت رکھتا ہے اس لئے اس کے یہاں چیخوف کے فن کے سے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ——— غرض افسانے کے فن نے ان فن کاروں کے ہاتھوں ترقی کی ان گنت منزلیں طے کی ہیں اور ان کے بعد ایسے ہی بہت سے فن کاروں نے اس کو ترقی سے ہم کنار کرنے میں بڑا کام کیا ہے ——— ہر ملک کے ادب میں ایسے فن کاروں کے سلسلے ملتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک فن کار کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح مختصر افسانے کے ان فن کاروں سے ضرور ملتا ہے جو صحیح معنوں میں اس فن کے معمار ہیں ——— مختصر افسانے کے فن کار، چاہے وہ کسی نظریے سے تعلق رکھتے ہوں، ان فن کاروں میں سے ہر ایک کو مختصر افسانے کے فن کا امام تسلیم کرتے ہیں ——— اس لئے افسانے کا ہر فن کار، خواہ وہ کسی ملک کا کیوں نہ ہو، ان سے اکتساب فیض کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہے ——— یہی وجہ ہے کہ ان کے فنوں نے مختصر افسانے کے فن پر جو اثرات چھوڑے ہیں ان میں ایک ہمہ گیری ہے۔ کوئی شعوری طور پر چاہے بھی تو ان اثرات سے دامن نہیں بچا سکتا ———

یہ دور مختصر افسانے کا دور ہے کیونکہ آج کل کی زندگی کے حالات اس فن سے مطابقت رکھتے ہیں ——— بدلتے ہوئے ماحول کی رفتار اس فن سے پوری طرح ہم آہنگ ہے ——— اس لئے مختصر افسانے کا فن، اور جن فن کاروں نے اس فن کو صحیح معنوں میں فن بنایا، نئی تہذیب میں نئی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں کہ تہذیب، معاشرت، ادب اور فن، فلسفہ اور جمالیات سے دلچسپی رکھنے والا کسی حال میں بھی ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتا ——— کیونکہ مختصر افسانے کا فن بہر صورت ایک نئی تہذیب اور معاشرت کا نقیب، ادب اور فن کے نئے میلانات کا عکاس اور فلسفہ و جمالیات کی نئی قدروں کا ترجمان ہے ——— اور اس فن کو اسی زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہے ورنہ اس کے خط و خال کا صحیح اندازہ جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں!

مغربی افسانہ کا اثر اُردو افسانہ پر

ممتاز شیریں

چیخوف اور موپاساں ——— مغربی افسانہ کے ذکر کے ساتھ فوراً یہ دو بڑے نام ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ یہ دو نام جو آج بھی مختصر افسانہ کی تاریخ میں سب سے اہم مانے جاتے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو صحیح معنوں میں جدید مختصر افسانہ کا آغاز چیخوف اور موپاساں ہی سے ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے ٹولسٹائے نے ایک مرتبہ چیخوف کو داد دیتے ہوئے کہا تھا:

"چیخوف روسی موپاساں ہے"

ٹولسٹائے نے تو یہ لقب روا تحسین عطا کیا تھا۔ لیکن آج نصف صدی بعد دونوں فن کاروں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ان کی ادبی حیثیت کو جانچا جائے، تو بہت ممکن ہے ہمیں یہ شبہ ہو کہ آیا چیخوف کے لئے روسی موپاساں کو خطاب باعث تحسین ہے یا موپاساں کے لئے یہ زیادہ باعث فخر ہوگا۔ کہ موپاساں کو فرانسیسی چیخوف کہا جائے۔

بہرحال، وقت کے اعتبار سے موپاساں کو چیخوف پر تھوڑی سی اولیت حاصل ہے۔ اور نہ چیخوف کو موپاساں اور موپاساں کی حقیقت نگاری پسند تھی۔ اپنے ایک افسانے "A WOMAN'S KINGDOM" میں انہوں نے موپاساں کا ذکر یوں کیا ہے۔ اس افسانے کا ایک کردار ایک دوسری کردار آنیا سے کہتا ہے:

"موپاساں، عزیز من، موپاساں کو پڑھو۔ اس کے ایک ایک صفحے میں روسے زمین کی ساری دولت سے زیادہ تحمل ہے۔ اس کی ہر سطر میں ایک نیا افق ہے .... نرم و نازک روحانی محسوسیت کے ساتھ ساتھ شدید طوفانی سنسنی خیز جذبات۔ شیطانی شہوت ..... نازک ریشوں کا جال ..... "

اور آنیا اس لفاظی کی دھند کے پرے صرف ایک چیز دیکھ رہی تھی "زندگی! زندگی، زندگی، زندگی موپاساں کے ان زندگی ہے زندگی موپاساں کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی ہے۔"

FAGNET نے یہ بات موپاساں کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہی ہے۔ اور ان معنوں میں کہ زندگی اور حقیقت کو جیسی کچھ وہ نظر آتی ہے، بالکل اسی طرح پیش کر دینا سہل انگاری ہے۔ اور موپاساں کا اپنا کوئی فلسفہ، کوئی تصور حیات نہیں تھا، جو حقیقت میں اور معنی پیدا کر سکے۔ لیکن اسی بات کو ہم تعریفی معنوں میں بھی لے سکتے ہیں کہ زندگی موپاساں کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی تھی۔

"چیخوف زندگی سے بھی بڑھ کر ہے"[1]

موپاساں براہ راست بات کہنے کا عادی ہے۔ صاف سیدھے تیز انداز میں موپاساں نے یوں افسانے تخلیق کئے جیسے صفائی سے زندگی کے ٹکڑے کاٹ لئے جائیں۔ چیخوف نے جیسے زندگی سے پرے ہٹ کر، کہیں دُور سے، ایک ترچھے زاویے سے زندگی کو دیکھا۔ یونہی بظاہر بے خیالی میں، غیر اہم، سیدھے سادے واقعات سمیٹ لئے اور انہیں بغیر کسی شعوری قرینے اور ترتیب کے اپنے افسانوں میں پیش کر دیا لیکن ان افسانوں میں زندگی یوں سمٹ آئی، جیسے ان میں زندگی کا عطر نچوڑ لیا گیا ہو۔

موپاساں کے افسانوں میں تیز بھڑکیلے خدوخال ہیں، عمل ہے، تیزی ہے۔ آگ ہے۔ چیخوف کے افسانے ایک مدھر نشیلی فضا میں ملفوف ہوتے ہیں۔ ان میں عمل کے ساتھ ساتھ کیفیات اور احساسات ہیں۔ نازک گہرا احساس اور سارے افسانے پر کہرے کی طرح چھایا ہوا دھیما دھیما غم اور لطیف مایوسی۔

موپاساں کے پاس جسم ہے۔ چیخوف کے پاس "رُوح"۔ یعنی موپاساں کے ہاں وہ فطری ہیجانی جذبات اور PASSIONS ہیں جن کا تعلق جسم سے ہے۔ اور چیخوف کے ہاں انسانی رُوح کی ٹیسیں۔

موپاساں کے ہاں حقیقت سخت ٹھوس شکل میں ملتی ہے۔ چیخوف کے ہاں یہ ایک روشن، سیال بہتی ہوئی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

موپاساں نے گویا تیز گاڑھے رنگوں میں زندگی کی مصوری کی، چیخوف کے رنگ، ہلکے، نرم اور لطیف ہوتے ہیں۔ SUBTILITY چیخوف کے فن کا کمال ہے۔

چیخوف اور موپاساں ایک رُوسی دوسرا فرانسیسی، یہ دو بڑی قوتیں ہیں جو مغربی افسانے پر لہٰذا ہمارے افسانے پر بھی اثر انداز ہوئیں۔ دونوں برابر کے قد کے تھے۔ اگر ایک طرف چیخوف کے اچھے افسانوں، WARD NO.6 ' THE STEPPE ——— کو رکھا جائے اور دوسری طرف موپاساں کے اچھے افسانوں مثلاً THE PARTY ' THE DARLING اور THE SCHOOL MISTRESS ' DONLE DE SAIF MAISON TELLER MADEMOISELLE FIFI وغیرہ کو رکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کس کا پلڑا بھاری ہے۔ دونوں افسانہ نویسی میں نئے اور نرالے طرز کے بانی اور موجد تھے۔ بڑا فرق کے افسانوی ادب پر دونوں کا اثر برابر کا تھا مگر دونوں کا اپنی نوعیت میں امتیاز نہیں، مختلف بلکہ بڑی حد تک متضاد تھا کیونکہ دونوں صاحب طرز ادیب تھے، اور مختلف طرز کے ادیب۔

چیخوف اور موپاساں کا ہمارے افسانوی ادب پر بھی زبردست اثر پڑا ہے۔ افسانے کے یہ دونوں طرز، جن کے یہ دو استاد ان فن موجد تھے، اور جنہیں انہوں نے تکمیل تک پہنچایا بھی تھا، شروع ہی سے ہمارے افسانوی ادب میں رواج پاتے، بلکہ ان دو مختلف طرز کے افسانوں کے مروجہ صورت نظر دوڑائیے۔ تو ہمیں اپنے ادب میں بھی ایک موپاساں اور ایک چیخوف کو ڈھونڈھ نکالیں گے۔

موپاساں کو پہچاننے میں تو ہمیں چنداں دقت نہ ہوگی کیونکہ بھلا موپاساں کے طرز کا افسانہ نگار ہمارے ہاں منٹو کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟

چیخوف کی ابتدا جھلکیاں کئی ایک ادیبوں میں ملتی ہیں۔ مثلاً بیدی، احیات اللہ انصاری، محمد حسن عسکری، غلام عباس بحیثیت مجموعی چیخوف کے افسانوں کی فضا، رنگ اور لہجہ (TONE) بیدی کے ہاں پائے جاتے ہیں۔

منٹو اور بیدی جو ہمارے دو صف اوّل کے افسانہ نگار ہیں، ان دونوں کی تحریروں میں ہم وہ فرق واضح پائیں گے جو چیخوف اور موپاساں کا فرق ہے۔ شخصیت کا اظہار ہے موپاساں اور چیخوف (اسی طرح منٹو اور بیدی) انسان کی حیثیت سے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ چنانچہ فنکار چیخوف اور

---

[1] ولیم جرارڈی: "چیخوف"۔

فن کار موپاساں کا فرق، اسی فرق کا پرتو ہے۔

منٹو اور بیدی کا فرق چیخوف اور موپاساں کی طرح رویہ کا فرق ہے۔ منٹو کا رویہ اگر سنکی نہیں تو اپنے دور سے دور کے افسانوں میں منٹو کو انسان کی انسانیت پر مکمل اعتماد رکھنا وہ سنکی بالکل نہیں رہا) ایک حد تک سادی ضرور ہے۔ زندگی اور انسان کو اور انسان کے وحشیانہ ہیجانی جذبات عریاں کرنے میں اور اپنی تحریروں میں شوک (SHOCK) پہنچانے میں منٹو کا رویہ موپاساں کی طرح تقریباً سادی ہے۔ اس کے برخلاف بیدی کا نہایت ہی ہمدردانہ اور مشفقانہ جیسے چیخوف کا۔

گو چیخوف کی نظر میں بھی زندگی میں اتنی بے قطعیت ہے کہ کوئی ادب قطعیت میں زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چیخوف نے کہا تھا:۔

"NO LITERATURE COULD OUTDO REAL LIFE IN CYNICISM"

لیکن چیخوف کی نظر ایک معالج کی نظر تھی۔ ایک معالج کے لئے دنیا میں کوئی چیز گندی نہیں۔ ایک ادیب کو چاہئے کہ اپنے داخلی ذاتی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر ایک معالج کی سی معروضیت بنے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ کوڑے کے ڈھیر بھی لینڈ سکیپ میں اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں اور انسان کے بڑے وحشی، ہیجانی جذبات بھی اتنے ہی فطری ہیں جتنے اچھے اور نیک جذبات"

موپاساں کی نظر زندگی اور انسانی سیرت کو جانچنے میں بہت تیز تھی لیکن موپاساں کی پیش کش میں خارجیت، علیحدگی اور معروضیت ہے۔ ایک فن کار کی علیحدگی اور معروضیت چیخوف میں بھی تھی۔ وہ لکھتے ہوئے اپنے موضوع میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ اپنے کرداروں کے جذبات و احساسات اور کیفیات کو اپنے آپ پر اس طرح طاری کر سکتا تھا جیسے وہ خود اسی تجربہ سے گزر رہا ہو۔ انسان کی حیثیت سے وہ اپنے کرداروں میں گھل مل جاتا تھا لیکن ایک فن کار کی حیثیت میں وہ علیحدگی برابر قائم رکھتا تھا جو ایک بڑے فن کار میں ہونی چاہئے۔ معالج کے رویہ میں ہمدردی کے ساتھ وہ سائنٹیفک معروضیت بھی درکار ہے جو اسے مرض کا صحیح تجزیہ کرنے اور اس کے علاج کرنے میں مدد دیتی ہے۔ چیخوف کی سچی ہمدردی نے کبھی رقت اور جذباتیت کی شکل اختیار نہیں کی۔ چیخوف اور موپاساں میں وہ دونوں باتیں ایک ساتھ موجود تھیں جو اسی۔ ایم فارسٹر کی رائے میں ایک ادیب میں ایک ساتھ ہونی چاہئیں۔ یعنی (جذبہ) (PASSION) اور علیحدگی اور معروضیت (DETATCHMENT)۔

زندگی کو دونوں نے سمجھا تھا۔ انسانی زندگی اور انسانی سیرت کی پیچیدگی، تنوع اور رنگا رنگی دونوں کے حیطۂ نظر میں تھی۔

چیخوف نے زندگی کو بڑی آگہی سے سمجھا۔ ان میں انسانوں کو سمجھنے کی بے پایاں صلاحیت تھی، انسانی مسرت کا عکس اتارنے کی نادر قدرت اور ہمدردی اور رحم کا بے پناہ جذبہ۔

موپاساں کو پڑھنے کے بعد بھی مجموعی طور پر انسان کی یہ تصویر مرتب ہوتی ہے کہ انسان میں بدی ہے، بدصورتی ہے، غلاظت اور حیوانیت ہے، لیکن انسانیت پھر بھی خوبصورت ہے۔

منٹو کے ہاں بھی مختصر جنس سے منٹو، دوسرے دور کے افسانوں میں، انسان کی یہی تصویر مرتب ہوتی ہے۔

منٹو کے موضوعات بھی موپاساں کی طرح انسان کے وحشیانہ، ہیجانی جذبات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنس، شہوانیت، ظلم، ایذا دہی قتل و خون، تیز ہیجانی جذبات، غیر معمولی واقعات۔ غیر معمولی، انوکھے کرداروں کے ساتھ منٹو نے چونکا دینے والے افسانے تخلیق کئے۔ بیدی کے ہاں تیز جذبات، غیر معمولی واقعات طوفانی حادثات شاذ ہی ملتے ہیں۔ روزمرہ معمولی سے معمولی واقعات، عام جذبات و احساسات اور سیدھی سادھی حقیقت کو نرمی، لطافت اور پاکیزگی سے پیش کرنے کا ان میں چیخوف کا سا سلیقہ ہے۔ اور ان کے افسانوں کو یہ سیدھی سادھی حقیقت ہی لطیف اور دلکش بنا دیتی ہے۔

چنانچہ ان کے مشہور افسانے "گرہن" کو لیجئے۔ اس افسانہ کے متعلق یہ افواہ پھیلائی گئی کہ یہ گوگول کے "اوورکوٹ" کا چربہ ہے۔ مجھے تو اس میں گوگول والی کوئی بات نظر آئی، البتہ نچلے متوسط طبقے کے ایک معمولی گھرانہ کے افراد کی، ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، محبتوں، دکھ درد اور مصیبتوں کی یہ سچی، نرم لطیف

تہمد و انہ پیش کش میں چیخوف کا رنگ چھایا نظر آتا ہے۔

یا پھر لاجونتی میں عورت کی شبیہہ دیکھئے۔ اس افسانہ میں جو فسادات سے متعلق اپنے انداز کا یکتا افسانہ ہے، عورت کی روح کے نازک تاروں کو کس طرح چھیڑا گیا ہے۔ لاجونتی کا تصور ہر ایک سیدک ہے اور اغوا شدہ عورتوں کو واپس لے آنے اور ان کے رشتہ داروں سے اچھا سلوک کروانے کی مہم اٹھائی ہے۔ انسانی ہمدردی سے اس کا دل معمور ہے، وہ دل جو خود چوٹ کھایا ہوا ہے کیونکہ اس کی بیوی بھی اغوا کر لی گئی ہے۔ وہ جب اسے واپس مل جاتی ہے وہ اس سے اتنا زخم صدمہ کرتا ہے جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی ہو اور ٹوٹ نہ جائے جیسے وہ لاجونتی ہو۔ اس کے پہلے ہی چوٹ کھائے ہوئے دل کو ٹھیس نہ پہنچے اور اس کی زخمی روح تڑپ نہ اٹھے۔ اس کے واپس ملنے کے بعد وہ اپنی بیوی کو دیوی بنا لیتا ہے اور دیوی ہی سمجھتا ہے۔ اور لاجونتی چاہتی ہے وہ اسے دیوی نہ سمجھے ایک کمزور عورت ہی سمجھے۔ اغوا کے دوران میں اس پر جو کچھ بیتی تھی اسے سننے سے یوں گریز نہ کرے۔ اسے سچ کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرے اور اس کی زخمی روح پر مرہم رکھے۔

بیدی کے لاجونتی میں مجھے وہی چیخوفی کیفیت پائی جاتی ہے۔ چیخوف کا فن ایک طرح سے انسانی نفسیات کا فن ہے، لیکن نفسیاتی ان معنوں میں نہیں جن میں پروست کا فن نفسیاتی کہا جاتا ہے۔ بلکہ روح پر چھایا ہوا ہلکا سا غبار، درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں، وہ ناقابل عبور خلیج جو انسان انسان کے درمیان حائل ہے۔ ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ دوری وہ بیگانگی، وہ ناقابل بیان تنہائی جو انسان اپنے وجود اپنی روح میں محسوس کرتا ہے۔

لاجونتی بھی یہی تنہائی اپنی روح میں محسوس کرتی ہے۔

بیدی کے ہاں عورت یا لاجونتی ہے یا گرم کوٹ کی محبت کرنے والی بیوی ستی یا "گرہن" کی ستائی ہوئی ہندو ستانی عورت ہوگی۔

منٹو کے ہاں وہ سوگندھی ہے، نیلم ہے، کھرنت کور ہے، موذیل ہے۔ اپنے نیز جذبات کے ساتھ جاندار پھڑکتی ہوئی، جس کے بیان میں وہی موپاساں والی کیفیت پائی جاتی ہے کہ اس تحریر کا کاغذ تک جس پر اس کا ذکر ہوا، تازہ و گرم گوشت کی طرح پھڑکنے لگتا ہے:

"بلنکٹ" کی سوگندھی میں منٹو نے بھی طوائف کے اندر چھپی ہوئی عورت کو پایا ہے اور اس کی روح کو چھوا ہے۔ لیکن سوگندھی بھی ایک فطری عورت ہے۔ تیز جذبات والی جو سیٹھ کی "او ظہر" کی توہین کا بدلہ ماں بہن کی توہین کر کے لیتی ہے۔ اپنے جذبات کا بخار اس پر نکالتی ہے۔ اور آخر میں سارے مردوں سے نفرت کے اظہار کے طور پر اپنے خارش زدہ کتے کو پہلو میں لپٹائے سو جاتی ہے۔

منٹو کے ایک تازہ افسانے "سڑک کے کنارے" میں البتہ عورت کی روح ہی روح ہے۔ ایک عورت اور ایک ماں کی زخمی تڑپتی ہوئی روح! لیکن منٹو نے اس افسانے میں بھی ایسا SITUATION پیدا کیا ہے کہ اس روح میں ایک طوفان ہے ایک ہلچل بھی ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف لاجونتی کی روح میں کہی ہلکی ٹیسیں ہیں جنہیں وہ خاموشی سے چپ چاپ برداشت کر لیتی ہے۔

چیخوف کی ڈارلنگ بھی منٹو کے ہاں جا کر سگندھی بن جاتی ہے۔

اور نچلے طبقے کا وہ سیدھا سادا کردار جو بیدی کے "رحمٰن کے جوتے" میں ہے، منٹو کے ہاں نیا قانون کا اُستاد منگو بن جاتا ہے۔

موضوع اور بنیادی رویہ کے فرق کے علاوہ انداز پیش کش اور افسانے کی تکنیک میں بھی موپاساں اور چیخوف کے طرز الگ الگ ہیں۔

موپاساں کے افسانے زندگی سے کاٹے ہوئے ایسے ٹکڑے ہیں جو بذات خود مکمل ہیں، ان میں ایک پلاٹ ہوتا ہے، ایک آغاز ایک وسط، ایک منتہا، ایک ایسا منتہا جو افسانے کو واقعی اختتام تک پہنچائے یا ایک ایسا چونکا دینے والا موڑ جس سے ایک ضرب کے ساتھ داستان کے ٹوٹ جانے کا احساس ہو۔ موپاساں کا افسانہ مناسب تراش خراش، تعمیر اور فنش کے ساتھ مکمل مختصر افسانہ ہے۔

چیخوف کی حقیقت نگاری جیسا کہ ولیم جرارڈی نے لکھا ہے، گوگول، ترگنیف، دستاوسکی اور ٹولسٹائے کی حقیقت نگاری کی ارتقائی صورت ہے۔ حقیقت نگاری دراصل زندگی کے خاص خاص اور نمایاں خدوخال کو اخذ کرنے سے عبارت ہے۔ وردزورتھ کے فوکس کے باہر زندگی ایک بیکراں سمندر ہے۔ مبہم، دھندلی، بغیر کسی شکل بغیر کسی ہیئت کے ایک بے پایاں وسعت۔ چیخوف کے افسانوں میں زندگی ایک خاص ہیئت کی قید و بند میں

جکڑی نہیں جاتی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ چیخوف کے افسانے تکنیک اور ہیئت سے بالکل بے نیاز ہوتے ہیں بلکہ یہ کہ ان میں ہیئت ہوتے ہوئے بھی محسوس نہیں کی جا سکتی۔

چیخوف کا فن اشارہ (IMPLICATION) کا فن ہے۔ چیخوف کے افسانوں کے اختتام کسی بات کو انجام تک نہیں پہنچاتے۔ افسانے کے آخر میں چیخوف جیسے کچھ کہتے کہتے رک جاتا ہے اور ہمیں حیران چھوڑ کر ہم سے رخصت ہو جاتا ہے۔ جانے ادھوری دیکھ کر پہلے تو ہم کچھ سمجھ نہیں پاتے لیکن پھر ہمیں کوئی اہم معنی خیز اشارہ، کوئی گہری حقیقت چھپی ہوئی مل جاتی ہے۔ جس سے افسانے کا انجام خود بخود ہمارے ذہن میں تشکیل پا جاتا ہے چیخوف کے افسانوں میں یہ ادھورے رہ جانے اور تکمیل نہ پانے کا احساس ہمیں ایک اور شدید احساس دلاتا ہے کہ یہ خارجی واقعات جو پیش آتے ہیں، دراصل بہت معمولی، غیر اہم اور چھوٹے چھوٹے ذرّیاتی ہیں اور اس حقیقت کا حصہ زندگی کہتے ہیں محض ایک چھوٹا سا جزو ہیں۔ کوئی چیز بذات خود مکمل نہیں۔

چیخوف کے افسانوں میں شعریت بلکہ تغزل کی سی کیفیت پائی جاتی ہے، اور چیخوف کے افسانوں میں ترتیب اور تشکیل کا انداز موسیقی کا سا ہے۔

موپاساں کا افسانہ ہمارے ادب میں اپنی مکمل ارتقائی صورت میں (اسی طرز کا، افسانہ اور ہنری جیسے افسانہ نگاروں کے ہاں اپنی خام معمولی صورت میں ملتا ہے منٹو کا افسانہ ہے۔ ہمارے ہاں منٹو کے سوا کسی اور ادیب نے موپاساں کے طرز کو اس کامیابی سے نہیں اپنایا ہے۔

نہیں معلوم منٹو نے موپاساں کے اثر کو شعوری طور پر قبول کیا ہے یا نہیں۔ منٹو کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ منٹو کو بذات خود موپاساں یا کسی بھی مغربی ادیب کے، اثر سے انکار تھا۔ یہ منٹو کی "انا" تھی اور یہ "انا" منٹو کو بتاتی جی تھی، جو کسی کے اثر سے سراسر منکر تھی۔ ورنہ یہ قرین قیاس ہے کہ منٹو نے پہلے پہل رسالوں کے روسی اور فرانسیسی نمبر مرتب کرتے ہوئے مغربی افسانہ کے اثر کو قبول کیا ہوگا۔ چنانچہ منٹو کے ایک آدھ افسانے میں گورکی کا اثر بھی ملتا ہے۔ دیوندر ستیارتھی نے اپنے منٹو پر طنزیہ افسانے "سنے دیوتا" میں یہ ظاہر کیا ہے کہ منٹو پر سامرسٹ ماہم کا بہت زیادہ اثر تھا۔ بلکہ ماہم سے زبردست ادبی عقیدت تھی۔ ممکن ہے موپاساں کا اثر بالواسطہ ماہم کے ذریعہ پڑا ہو کیونکہ سامرسٹ ماہم موپاساں کے عقیدتمندوں اور معتقدوں میں سے ہیں، بہرحال منٹو پر موپاساں کا اثر شعوری ہو یا غیر شعوری، براہ راست یا بالواسطہ منٹو موپاساں کے اس قدر قریب پہنچ گیا، جہاں تک سامرسٹ ماہم کی بھی رسائی نہ ہو سکی۔

منٹو نے بھی موپاساں کی طرح زندگی کا زہر اس طرح چکھا تھا کہ اس کی تلخی کام و دہن سے اتر کر قلب و روح تک پہنچ گئی۔ لیکن پھر بھی منٹو نے موپاساں کی طرح ہمیں یہ احساس دلایا کہ انسان میں بدی ہے، بدصورتی ہے، گندگی ہے، حیوانیت ہے، لیکن انسانیت پھر بھی خوبصورت ہے۔

منٹو کو پڑھتے ہوئے بھی ہمیں وہی احساس ہوتا ہے جیسے موپاساں کے متعلق چیخوف کے ایک کردار کو ہوا تھا (جسے "اب صرف ایک ہی چیز دیکھ رہی تھی)

زندگی، زندگی، زندگی، منٹو کے ہاں زندگی ہے!
زندگی منٹو کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی ہے!

چیخوف کا اثر بھی ہمارے افسانہ نگاروں نے شعوری طور پر قبول کیا ہے یا نہیں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ چیخوف کا اثر سارے مغربی افسانہ پر اتنا زبردست تھا کہ JAMES T. FARREL اپنے مضمون THE LEAGUE OF FRIGHTENED PHILISTINE میں لکھتے ہیں کہ چیخوف کی کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ مختصر افسانے کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی ایک واحد اور زبردست اثر امریکہ، انگلستان اور سارے براعظم کے افسانوی ادب پر پڑا ہے تو وہ چیخوف کا اثر ہے۔ ہمارے ہاں چیخوف کا اثر نمایاں اور واضح طور پر کسی ایک افسانہ نگار میں ظاہر نہیں ہوا جیسا کہ موپاساں کا منٹو میں، لیکن یہ زیادہ وسیع اور گہرا ہے۔ اور ایک UNDERCURRENT کی طرح بہتا ہے۔

بیدی کے افسانوں کا رنگ اور لب و لہجہ چیخوف کا سا ہے۔ خواہ یہ اثر شعوری ہو یا غیر شعوری۔ اور محمد حسن عسکری نے جو ہمارے ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے مغربی ادب کو پوری آگاہی سے سمجھا ہے، چیخوف کے شعوری اثر کا اعتراف کیا ہے۔

حسن عسکری اپنے مجموعے "جزیرے" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"ایک چیز کے حسن کو میں نے واقعی اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے اور اتنے شدید طور پر کہ اس احساس کی لرزش جب چاہوں اپنے اندر پا سکتا ہوں اور وہ چیز ہے کا افسانہ "اسکول ماسٹر" ہے۔ یہ خالص موسیقی ہے۔ اور میں اس کوشش میں رہا ہوں کہ یہی نغمگی اپنے افسانوں میں پیدا کر سکوں۔ میرا افسانہ "حرامجادی" چیخوف کے اسی افسانہ سے متاثر ہے۔ اگر اس میں کچھ ہے تو اسے جمالیاتی نشہ کا عکس ہی سمجھئے۔ اور اسی طرح "چاند کی پیالی" کا خیال بھی مجھے چیخوف کے "اسٹیپ" سے پیدا ہوا تھا..... لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسن معنوی ہو یا حسن صوری سب روح کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔

یوں تو کرشن چندر کا "حسن و حیوان" بھی چیخوف کے THE STEPPE کی طرز پر لکھا گیا ہے اور کافی کامیاب کوشش ہے۔ اس زمانے میں جب کرشن چندر نے پہلے پہل لکھنا شروع کیا تھا، اور جو ہمارے نئے ادب کا اور افسانہ کا ابتدائی زمانہ تھا، کرشن چندر نے مغربی افسانہ سے متاثر ہو کر کئی ایک نئے تجربے کئے۔ بلکہ ان کا ہر افسانہ ایک نیا تجربہ ہوتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں کرشن چندر نے بعض بہت اچھے افسانے لکھے۔ چنانچہ "حسن و حیوان"۔ "پورب دیس ہے دلی"۔ "دو فرلانگ لمبی سڑک"۔ "زندگی کے موڑ پر"۔ "گرجن کی ایک شام"۔ "اَن داتا"۔ "بالکونی" اور سچ پوچھئے تو آج بھی کرشن چندر کے یہی بہترین افسانے ہیں۔

کرشن چندر کے پاس ذہانت تھی کسی چیز کا فوری اثر قبول کر لینے والا مزاج، ایک زود نویس، تیز رفتار قلم، چلتی ہوئی رنگین زبان۔ جس سے انہیں اظہار میں کوئی مشکل نہ ہوتی تھی۔ لہٰذا وہ جس مغربی افسانے سے بھی متاثر ہوئے اسی طرز کے افسانے کو فوراً اردو میں منتقل کیا۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ کرشن چندر کے افسانے مغربی افسانوں کے چربے ہوتے تھے۔ بلکہ یہ کہ ان میں یہ صلاحیت تھی کہ مختلف طرز کے مغربی افسانوں سے بہ یک وقت اثر قبول کریں اور فوری طور پر انہیں "دو میں تخلیق کریں۔ اور یہی وجہ تھی کہ شروع شروع میں ہر افسانہ ایک نئے طرز کا لکھ کر انہوں نے فوراً پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ لیکن کرشن چندر کا رویہ ان دنوں بھی جب انہوں نے اپنے آپ کو کسی مخصوص سیاسی آئیڈیالوجی سے وابستہ نہیں کر لیا تھا ہمیشہ ایک صحافی کا سا رہا ہے۔ وہ کسی چیز کا اثر فوری لیکن وقتی طور پر قبول کرتے ہیں۔ فوری اظہار بھی ان کے لئے آسان ہے۔ چنانچہ کرشن چندر سے یہ شاذ ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی چیز کی تخلیق کرتے ہوئے اس کرب سے گزرے ہوں گے جسے CREATIVE AGONY کہتے ہیں۔ یا انہوں نے جس معنی کی تخلیق کی ہے وہ روح کے سانچے میں ڈھلا ہے، گو یہ حسیات (SENSES) اور جذبات (SENTIMINTS) کو ضرور متاثر کرتا ہے۔

کرشن چندر نے کسی ایک مغربی ادیب یا کسی خاص تحریر کا اثر یوں قبول نہیں کیا کہ وہ ان کی روح کی گہرائیوں میں پیوست ہو۔ بلکہ انہوں نے وقتی طور پر مختلف طرز تحریر اور مختلف مغربی رجحانات سے دلچسپی لی۔ حتیٰ کہ کوئی نیا تکنیکی یا کسی اور طرح کا تجربہ کر نا ان کے لئے کھیل سا ہو گیا۔ اور انہوں نے ایک سرریل تصویر (SURREALISTIC) بھی کھینچی اور ایک افسانہ میں الفاظ بدل کر نئی زبان بنانے کا صوتی تجربہ بھی کیا۔ یہ نہیں کہ ہم میں کوئی جیمس جوائس ہو گا جو ایرول کر (EARWICKER) کے خواب میں آفاقی اور کائناتی اصولوں کی تحلیل کرے گا۔ اور کسی FINNEGANS WAKE کے لئے ایک نئی زبان کی تخلیق کرے گا۔ لیکن کرشن چندر کی یہ کوشش تو بس ایک مذاق کی بات تھی۔ اور یہ اپنی جگہ کوئی مضحکہ کوشش ہی نہیں تھی۔ اسی طرح انہوں نے "غالیچہ" میں ایک پراسرار سی رمزیت پیدا کرنے کی کوشش کی، جس میں کچھ تو ایڈگر ایلن پو کے پراسرار افسانوں مثلاً PIT AND THE PENDULUM کی سی ذہنی اذیت کی پیش کش تھی اور کچھ کافکا کے انداز کو اپنانے کی کوشش۔ کافکا کی گہری رمزیت اور کافکا کا انداز اگر ہمارے ان کسی ادیب میں ہے تو وہ احمد علی میں ہے۔ ممکن ہے احمد علی کافکا سے شعوری طور پر

متاثر نہ ہوتے ہوں، اور اظہار کی مطابقت ادبی مزاج کی مطابقت کا نتیجہ ہو۔ چنانچہ ابھی ایک نئے فرانسیسی ادیب کی تخلیق AMINDAB کا کافکا کی تخلیقات سے موازنہ کرتے ہوئے ژاں پال سارتر نے لکھا ہے کہ مصنف کو خود کافکا کے اثر سے انکار ہے۔ بلکہ اس کا یہ کہنا ہے کہ جن دنوں یہ تحریر ہوئی اس نے کافکا کو پڑھا تک نہیں تھا۔ تو پھر ژاں پال سارتر کی رائے میں یہ مطابقت اور بھی حیرت انگیز ہے[1]۔

کافکا کی جنیس کچھ ایسی غیر معمولی اور یکتا UNIQUE تھی کہ وہ ایک MYTH ہی بنا رہا۔ عام ادیبوں کی رسائی سے بہت دُور، ایک پیہم کشش اور ترغیب ——— ژاں پال سارتر کے الفاظ میں ———

"HE REMAINED ON THE HORIZON A PERPETUAL TEMPTATION. KAFKA COULD NOT BE IMITATED."

لہٰذا کافکا کی فکر سے مناسبت اور کافکا کا سا رمزی طریقۂ اظہار خواہ وہ شعوری ہو یا غیر شعوری، بہت بڑی بات ہے اور ایک مشابہ جنیس کا تقاضا کرتی ہے۔

ہمارے افسانہ نگاروں میں احمد علی کی جنیس غیر معمولی ہے اور وہ ہمارے وقیع ترین (SIGNIFICANT) افسانہ نگار ہیں گو وہ منٹو یا کرشن چندر کی طرح مقبول عام نہیں۔ منٹو کی تحریروں کی اپیل خاص و عام کے لئے یکساں تھی۔ لیکن احمد علی کی تحریریں اپنی نوعیت میں ESOTERIC ہیں۔ جنہیں معدودے چند ادب کا صحیح ذوق رکھنے والے ہی APPRECIATE کر سکتے ہیں۔

احمد علی کی رمزی تحریروں کے علاوہ دوسری تحریریں بھی ایک خاص پایہ اور مقام رکھتی ہیں (چنانچہ "ہماری گلی" "استاد شمو خاں" اور "مارچ کی ایک رات" وغیرہ لیکن احمد علی کا مخصوص لب و لہجہ اور رنگ رمزی اور فلسفیانہ ہے۔ رمزیت کو انہوں نے شروع ہی سے اپنایا تھا۔ نئے ادب کی سب سے پہلی کتاب "انگارے" میں بھی ان کے افسانے سررئیلزم اور آزاد تلازم خیال کے مظہر تھے۔ "پریم کہانی" میں انہوں نے محبت کا فلسفہ پیش کیا۔ "قلعہ" میں سیاست کو بھی فلسفیانہ رنگ دیا۔ گزرے دنوں کی یاد" میں انہیں وقت کی، ماضی کی، پراسرار حیران کن آواز آئی۔ یہ افسانے سب کے سب بڑی شدت (INTENSITY) اور گہرائیوں کے حامل ہیں۔

احمد علی کی جن تحریروں میں خاص طور پر کافکا کی رمزیت اور طریقۂ اظہار پایا جاتا ہے وہ "قید خانہ" "تیسرا کمرہ" اور موت سے پہلے" ہیں) جن میں کافکا کے افسانوں سے نہیں بلکہ "THE CASKE" اور "THE TRIAL" سے مناسبت پائی جاتی ہے۔ بوجھکش میں رمزیت کے پیشرو ہیں۔ اگرچہ امریکی کلاسیکی ناول نگار ہرمن میلول میں (موبی ڈک) جن کے نزدیک ساری دنیا ہی ایک سمبل تھی۔ لیکن جدید رمزیت کا سرچشمہ کافکا ہی سے پھوٹا ہے۔ کافکا میں ایک حقیقت نگار کے مشاہدہ کی گہرائی اور باریک بینی بھی ہے اور ایک شاعر کی قوت تخیل بھی۔ وہ اشاریت کو ایک طرح کی الہامی بے خودی (DELIRIUM) کی حد تک لے جاتا ہے جس میں تصورات ایسے ہوتے ہیں جو ظاہری حقیقت سے دُور ہوتے ہوئے بھی ان چیزوں کی اندرونی تہوں اور ان کی اصلی فطرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں ہمیں سطحی نہیں بلکہ عمیق گہری حقیقت ملتی ہے۔

"کاسل" (CASTLE) تک سفر کائنات کے اسرار و رموز کی کرب ناک جستجو بن جاتا ہے، ایک وجودِ مطلق کی جستجو، خدا اور انسان کے درمیان ایک صحیح رشتہ کی جستجو، ایک صحیح طرزِ زندگی کی جستجو۔ کافکا کے ان تلاش کی راہیں بظاہر آسان ہونے کے باوجود اتنی دشوار گزار ہیں کہ انسان جیسے بھول بھلیوں میں گم کردہ جاتا ہے۔

احمد علی کے "قید خانہ" میں ایک انسانی رُوح جکڑی ہوئی ہے۔ ایک قید کے اندر دوسری قید، دائرے تنگ ہوتے جاتے ہیں۔ گھٹن بڑھتی

---

[1] JEAN PAUL SARTRE : LITERARY AND PHILOSOPHICAL ESSAYS.

[2] SYMBOLISM.

جاتی ہے۔ حتیٰ کہ انسان کا جسمانی وجود ہی ایک قید ہے۔ "قید خانہ" میں احساس مجسم ہو گیا ہے۔ اس افسانہ کا مرکزی کردار ہی ایک احساس "دمی" کا ذہن ہے احساس کے زیر اثر نہ صرف ذہن سوچتا ہے اور آنکھ دیکھتی ہے بلکہ احساس جسم کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ ذہن جسم و روح سب اس کرب، گھٹن اور قید میں جکڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور "موت سے پہلے" ایک طرح کا بھیانک رمزیہ خواب SYMBOLIC NIGHTMARE ہے۔ اس میں "THE TRIAL" کی کیفیت ہے۔

کافکا کا ایک "ماورائے ادراک حقیقت" TRANSCENDENTAL REALITY پر ایمان تھا۔ یہ حقیقت جس کی جستجو میں انسانی ذہن و روح بھٹکتے ہیں، لیکن جو انسان کی رسائی سے بہت دور ہے۔

اس حقیقت کی تلاش میں فیتوں نے بحر بیکراں کی وسعتوں میں سفر کیا اور جمیز، دسیلیو وعرفی سمندر کر گنج معانی اور راز ہائے سربستہ کا سبل بنایا جن کی تلاش میں انسانی عقل بھٹکتی پھرتی ہے۔ موبی ڈک کے کپتان اہب کو اس بحر بیکراں میں اتنی دور جانے کی سوجھی جہاں کسی اور سیاح کی رسائی نہ ہو۔ اور وہ ایک ناقابل شکست، ناقابل فہم ایک UNSCRUTIBILITY اور ہیز سفیدی (جس کی سفید و صیل مجھی ہمیل ہے) سے ٹکرا کر فنا ہو گیا۔ میل ول کی PROPHECY ایک حقیقت مطلق کی جستجو اور زندگی کے معانی پانے کی کوشش، انسان کی فنا تک لے جاتی ہے۔

اسی FATALITY کا احساس کافکا کے ہاں بھی ہے۔

جہاں احمد علی کے ادبی مزاج نے کافکا کی گہری رمزیت میں یگانگت محسوس کی، وہاں عزیز احمد نے ایمل زولا کی نیچریت (NATURALISM) اور غیر مشروط حقیقت نگاری میں کشش پائی۔ لیکن زولا کی یہ نیچریت اور "ریئزم" "NANA" میں کچھ اور ہے "EARTH" میں کچھ اور۔ جب زولا نے NANA کے لئے ایک ایسی موت تجویز کی جس سے اس کے شفاف، بے داغ حسن پر اس کے گناہ کی گندگی اور باطن کی سڑاند اُبل پڑے تو زولا نے ایک سپیشلسٹ کے پاس سے چیچک کی کیس ہسٹری منگائی اور ایک ایسے کیس کا خصوصیت سے بغور مطالعہ کیا جس میں بدترین قسم کی چیچک سے موت واقع ہوئی تھی اور اس کیس کی ساری تفصیلات سے نانا کی موت کی تصویر کھینچی۔ ظاہر ہے کہ جب حقیقت نگاری اس حد تک STUDIED ہو تو اس میں فطرت کی وہ بے پناہ، خیر ارادی سی بے ساختگی کہاں پائی جا سکتی ہے؟ لیکن زولا کے EARTH میں فطرت نگاری اس بلا کی ہے کہ اس میں زندگی دھڑکتی، زرخیز دھرتی FECUND EARTH کی گود سے پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

عزیز احمد فطرت نگاری کے قائل ہیں۔ واقعات اور کردار زندگی میں جیسے ہیں، جیسے گزرے ہیں، انہیں اسی طرح پیش کرنے کی انہوں نے کوشش کی ہے۔ وقت کے سلسلے، واقعات کے تسلسل اور افسانے کی تعمیر میں بھی ان کا انداز فطری ہے۔ گو کبھی کبھی ان کی یہ حقیقت نگاری STUDIED معلوم ہوتی ہے۔

عزیز احمد کا اپنا کہنا ہے کہ وہ آلڈس ہکسلی سے بھی متاثر ہیں۔

ہکسلی ..... سائنسی علوم سے واقف، ذہین، سنجیدہ اور انٹلکچوئل ..... ہکسلی کا رویہ ایک فن کار سے زیادہ ایک انٹلکچوئل کا ہے۔ فکشن ان کے لئے بعض خاص IDEAS اور اصولوں کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ ان کی تحریریں بالکل ALLEGORIES ہیں جیسے "BRAVE NEW WORLD" یا ان کے ناول "APE AND ESSENCE" کے تحت آتے ہیں اور ان کے کردار مختلف خیالات اور تصورات (CONCEPTIONS) کے مظہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے "پرائٹ کارنر پوائنٹ" میں مارکس رابسپیئر اور فلپ کوارلس خود مصنف کی شخصیت کے دو رُخ ہیں، جو مجسم کر دیئے گئے ہیں۔ ان کی مقسوم انا (DIVIDED EGO) کے دو مظاہر ——— ALTER-EGO، دو اصلی کردار دل میں اتنی تفاوت نہیں ہوتی، دو کردار

ایک دوسرے سے اتنے آزاد نہیں ہوتے، اتنے مکمل طور پر ایک دوسرے کی ضد نہیں ہو سکتے۔ جیسے کہ فلپ کوارلس اور مارکس ریمپٹن ہیں۔ یہاں دو مختلف اور متضاد میلانات کو بڑھا چڑھا کر انہیں مجسم کر دیا گیا ہے۔ فلپ کوارلس کی عقلیت اور منطق حد سے تجاوز کر گئی ہے حتیٰ کہ اس کے فطری جذبات اور حسیں بھی عقل و دماغ کے تابع ہیں اس کے برخلاف ریمپٹن آزاد فطری جبلتوں اور بے لگام ہیجانی جذبات کا نمائندہ ہے۔

اپنے تازہ ترین ناول THE GENIUS AND THE GODESS میں لکھسلی نے اسی SPLIT CHARACTOR کی تھیم کو ایک اور ہی پس منظر میں پیش کیا ہے "INTELLECT" اور "INSTINCT" کی وہی تکرار اور تضاد ALTER EGOS ہے۔ لیکن یہاں "عقلیت" کا نمائندہ مرد ہے اور "جبلت" کی نمائندہ عورت۔ یعنی "پوائنٹ کاونٹر پوائنٹ" کی وہ محبت کی پیاسی بلینچ جو اپنے مشہر کی جذبات سے عاری نری عقلیت اور منطق سے تنگ آ گئی تھی اب محض SENSUALITY کی نمائندہ ہے جا دی گئی ہے۔ یہاں جینیس ایک PHYSICIST ہے اور "GODESS" اس کی حسین بیوی، جو اس کی جینیس کے لئے وجدان کی محرک ہے۔ یہ دونوں ایک نوجوان، معصوم، آئیڈیلسٹک رومانی لڑکے کے زاویۂ نظر سے دکھائے گئے ہیں جو مرد کو اپنی INTELLCT کے ساتھ ایک جینیس اور ہیرو سمجھتا ہے اور عورت کو اپنے حسن کے ساتھ ایک دیوی یا دہ PHYSICIST کی "ہیرو ورشپ" کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی خوبصورت بیوی کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں کی ایک ساتھ پرستش کرتا ہے لیکن آخر میں اُسے دونوں سے ڈزالوژن ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں نامکمل تھے۔

آلڈس ہکسلی نے ان دو حدوں "INTELLECT" اور "INSTINCT" کو مجسم پیش کر کے گویا دونوں قسم کی افراط و تفریط میں اعتدال اور توازن کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ عزیز احمد نے اسی طرح دو حدوں کے درمیان اعتدال اور توازن کی ضرورت کو "اور لسبتی نہیں یہ ....." میں ALTER-EGOS اور SPLIT CHAPACTOR کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اور ہکسلی کی طرز پر ایک تجربہ کیا ہے۔ چنانچہ اس افسانہ میں الف خاں اور بے خاں دو الگ الگ میلانات کے مجسم مظہر ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی پوری ضد تو نہیں، لیکن ایک ہی کردار کے دو رُخ ضرور ہیں۔ ایک میں جبلت کی بے لگام تیزی اور افراط ہے، دوسرے میں اعتدال اور توازن، اکثر کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اور ذہنی اور قلبی کشمکش میں دو آوازیں حصہ لیتی ہیں۔ ب خاں، الف خاں کی دوسری آواز ہے۔ چنانچہ الف خاں گویا "جبلت ہے" (INSTINCT) اور بے خاں ضمیر (CONSCIENCE)۔

ہکسلی کے ہاں تو خیر بڑے کھلے طریقے پر ایک کردار کو دو کرداروں میں بانٹا گیا ہے۔ ورنہ یوں دیکھا جائے تو واقعی بڑے سے بڑے ادیب میں کئی ایسی متضاد میلانیں ملتی ہیں جن میں یہ فرق ایک نسبتی حقیقت ہے۔ اور ایک کردار دراصل ایک پیچیدہ مکمل اور بڑے کردار کی دو ایک جزو ہوتا ہے۔ چنانچہ پروجیکٹیو اور انٹروجیکٹیو دراصل ایک ہی ہیں یہ دونوں ایک ہی بڑی شخصیت کے INTROVERT اور EXTRAVERT پہلو ہیں۔ (JUNG) میفسٹوفلیس دراصل فاوسٹ ہی کی شخصیت کا دوسرا یعنی "EVIL" رُخ ہے جو اس پر حاوی ہو جاتا ہے اور یہ اوتھیلو کی نفسی ضعیفت ہی تو ہے جو IAGO بن کر اُسے اکساتی ہے اور اس کی آتش رقابت کو بھڑکاتی ہے!

ہکسلی کے شعوری اثر کے تحت اس خاص تجربہ کے علاوہ عزیز احمد ہکسلی سے یوں بھی متاثر ہیں کہ ان کے ناول اور افسانوں کے STRUCTURE بھی "IDEAS" کے گرد کھڑے کئے جاتے ہیں۔ جو کبھی کرداروں کی بحث کے ذریعہ پیش ہوتے ہیں یا کبھی کسی اور طریقہ

اوپر میں نے چند ایسے انفرادی اثرات کا جائزہ لیا ہے، جس میں بعض خاص خاص مغربی ادیبوں کا اثر ہمارے افسانہ نگاروں پر انفرادی طور پر پڑا ہے۔ لیکن ہمارے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں بعض ایسے ہیں جن میں کسی خاص مغربی ادیب یا کسی خاص معربی رجحان یا کسی خاص تجربہ کا اثر واضح طور پر نمایاں نہیں ہے لیکن ان کے افسانے پڑھ کر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مغربی ادب کو سمجھ کر پڑھا ہے اور اسے غیر محسوس طور پر اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ چنانچہ غلام عباس کے افسانوں میں کسی کا واضح اثر نظر نہیں آئے گا۔ لیکن ان کا ہر افسانہ پڑھتے ہوئے ہمیں

یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی بہت اچھا مغربی افسانہ پڑھ رہے ہیں۔ "آنندی" "تمام میں" "ہمسائے" "جواری" اور "سایہ" جیسے افسانے کسی بھی مغربی ملک کے افسانوی ادب کی بہترین کوششوں کے ساتھ شمار ہو سکتے ہیں۔

مغربی ادب کا اثر ہمارے افسانے پر دو طرح سے ہوا ہے۔ ایک تو انفرادی اثر یعنی بعض انفرادی مغربی ادیبوں کا اثر ہمارے خاص خاص لکھنے والوں پر، دوسرا مجموعی اثر یعنی مجموعی طور پر مغرب کے ادبی مزاج، مغرب میں نئے نئے رجحانات اور نئی نئی تحریکوں کا اثر۔

افسانہ مغرب میں بھی سب سے نئی اور کم عمر صنفِ ادب ہے۔ اردو افسانے کی عمر تو مشکل سے بیس پچیس برس کی ہوگی۔ ہمارے ہاں افسانہ کی پیدائش بھی اُس وقت ہوئی جب ہمارے ادیب مغربی ادب کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے اور اس سے مستفیض ہونے لگے تھے۔ اور یہ مغربی ادب کا مطالعہ، نیا شعور اور آگاہی سب سے زیادہ اسی صنف یعنی افسانہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ مغربی ادب سے نئی نئی تحریکوں، رجحانوں، تکنیکوں اور نئے نئے طرز اپنانے کا شعور افسانے کے ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوا اور ہمارے افسانے نے بھی مغربی افسانے کے دوش بدوش ہی ترقی کی منزلیں طے کیں۔

افسانے کے لئے ہمارے اپنے ادب میں کوئی روایات نہ تھے۔ افسانہ کا ازلی ماخذ روایتیں اور حکایتیں ہیں جو سب سے پہلے عبرانی (HEBREW) عربی اور یونانی میں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح کی الف لیلوی حکایتیں ہمارے ہاں "قصہ چہار درویش" اور "حاتم طائی" کے سے حکایاتی (EPISODIC) اور PICAREQUE قسم کی کتابوں میں نمودار ہوئیں۔ لیکن یہ الگ الگ مختصر کہانیوں کی بجائے سفرناموں اور ناولوں کی صورت میں پیش ہوتی تھیں۔

افسانہ یوں پریم چند سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن پریم چند اور ان کے سکول کے افسانہ نگاروں مثلاً سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی وغیرہ کے ہاں ناول اور افسانہ کا فرق ابھی واضح نہیں ہوا تھا۔ اور ان دو صنفوں کے درمیان حد فاصل قائم نہیں ہوئی تھی۔ فرق صرف طوالت کا تھا یعنی افسانہ ناول کے مقابلے میں مختصر کہانی ہوتا تھا، لیکن ایسی ہی بھرپور کہانی۔

پرانی صنف ناول اور نئی صنف افسانہ کا یہ درمیانی وقفہ (TRANSITIONAL STAGE) دوسرے ملکوں کے ادب میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان دونوں افسانے، مختصر افسانے (SHORT STORIES) نہیں کہانیاں (TALS) کہلائے جاتے تھے۔ چنانچہ امریکی ادب ہی کی مثال لیجئے۔ میلول نے اپنی کہانیوں کے مجموعے کو PIAZZA TALES کا نام دیا اور ہاتھورن کی کہانیاں "دہرائی گئی کہانیاں" "TWICE TOLD TALES" کے نام سے مشہور ہوئیں

پریم چند کے آخری دور کے بعض افسانوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں جدید مختصر افسانے کی تکنیک اور مواد سے پوری آگاہی تھی۔ چنانچہ ان کا مشہور افسانہ "کفن" جدید افسانے کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ یا شکوہ شکایت جو سارا ایک "مانولاگ" ہے۔

لیکن صحیح معنوں میں مختصر افسانے کا آغاز نئے ادب کی تحریک کے ساتھ ہی ہوا اور اسی تحریک کے ساتھ ایک خاص آرٹ فارم کی حیثیت سے مختصر افسانے نے عروج پایا۔ نئے ادب کی سب سے پہلی ضبط شدہ کتاب "انگارے" گویا روایت سے بغاوت تھی۔ رشید جہاں نے اس میں عورت کی آزادی اور عورت کے حقوق کی پاسبانی کا مسئلہ پیش کیا۔ احمد علی نے آزاد خیال کو سرریلزم کے ذریعہ پیش کیا۔ یعنی خیال اپنی اصلی شکل میں، جب کہ وہ کسی عقلی یا جمالیاتی یا اخلاقی پابندی یا رکاوٹ کے بغیر انسانی دماغ میں اپنا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ چنانچہ سرریلزم کی اس تحریک سے جو مغرب میں ۱۹۱۹ء میں شروع ہوئی تھی، اردو افسانہ کے آغاز ہی میں احمد علی نے روشناس کرایا۔

اردو افسانہ پر گو کئی مختلف مغربی تحریکیں اور ادبی رجحانات بہ یک وقت اثر انداز ہوئے، نئے ادب کی یعنی ۱۹۳۵ء کی تحریک میں "سوشل ریلزم" سماجی حقیقت نگاری سب سے نمایاں رجحان بن کر آئی۔ اس دور کی حقیقت نگاری میں معاشرتی مسائل کے علاوہ سیاسی

مسائل کو بھی ہمایاں دخل تھا۔ کیونکہ ہمارے ہاں کی ترقی پسند تحریک بھی اسی کا حصّہ تھی جو ایک آفاقی تحریک بن چکی تھی۔

سیاست اس دَور میں زندگی کا ایک بہت بڑا حصّہ بن چکی تھی۔ یہ دو عظیم جنگوں کا درمیانی وقفہ تھا، ایک طرف فاشیت سر اٹھا رہی تھی دوسری طرف ادیبوں کے سامنے روس کا انقلاب اور نیا نظام تھا جس کے متعلق انہیں یہ الوژن تھا۔

BLISS WAS IT IN THAT DAWN TO BE ALIVE
AND TO BE YOUNG WAS VERY HEAVEN !

"POPULAR FRONT" بن چکا تھا۔ سپین کی خانہ جنگی میں ادیب بہ نفسِ نفیس حصّہ لے کر جمہوریوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ژید کے پایہ کے ادیب بھی سیاست کا ساتھ دینے پر تیار تھے!

ترقی پسند تحریک کے لئے وجدان کا سرچشمہ روس اور روسی ادب تھا۔ لیکن ہمارے ادیبوں نے عام طور پر ٹولسٹائے، ترگینیف، دستاوسکی یا چیخوف کی بجائے گورکی اور گورکی کے بعد کے ادیبوں سے زیادہ اثر لیا۔ ان دنوں ہمارے افسانہ نگار خصوصیت سے ۳۵ء کے انگریزی ادیبوں کے نیورائلنگ والے، یعنی آڈن، سینڈر، اشروڈ، جارج آرول، پریچٹ گروپ سے بھی متاثر تھے۔ ۳۵ء کے یہ ادیب جوئس، لارنس اور ورجینیا وولف کے ردِ عمل میں "خارجی" حقیقت نگاری کی تحریک لے کر آئے تھے۔ ہمارے ہاں نئے ادب کی حقیقت نگاری بھی ایک طرح سے نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھ پوری وغیرہ کی رومانی نگاری کا ردِ عمل تھی۔ نیاز فتحپوری گروپ کے رومانی رجحان کا اس وسیع تحریک سے کوئی خاص اور گہرا تعلق نہ تھا، جسے مغربی ادب میں ROMANTICISM کہتے ہیں۔ چنانچہ انگریزی ادب میں انیسویں صدی کی رومانٹزم یا فرانسیسی ادب میں CHVALRY کا رومان۔

نئے ادب (۳۶-۱۹۳۵ء) کی تحریک کے ساتھ ادب برائے زندگی اور "ادب اور انقلاب" کی آواز اٹھی۔ یہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری جیسے نگاروں کی بھی آواز تھی اور زندگی کو اپنی ساری حقیقتوں میں پیش کرنے کا رجحان اردو افسانہ پر اس طرح چھایا رہا کہ ہمارے بہت سے اچھے افسانہ نگاروں کو "REALISTS" کے اسی گروہ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ منٹو، بیدی، حیات اللہ انصاری، رشید جہاں، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، قدرت اللہ شہاب، انور، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور..... ابو الفضل صدیقی شوکت صدیقی..... یوں یہ طویل فہرست کبھی ختم نہ ہوگی۔

اپنے دَور کے سیاسی اور سماجی مسائل کے علاوہ سماجی حقیقت نگاری کے جس خاص جزو پر ہمارے ادیبوں نے توجہ دی وہ جنسی حقیقت نگاری تھی۔ ہمارے بعض اچھے اچھے افسانہ نگار جنسی حقیقت نگاری ("SEX REALISM") سے اس طرح وابستہ ہو گئے کہ جنس کا موضوع ان کے لئے ایک OBSESSION بن گیا۔ چنانچہ منٹو۔ عصمت چغتائی۔ ممتاز مفتی۔ عزیز احمد وغیرہ

عزیز احمد کی رائے میں ترقی پسند ادب ہمارے جنس نگار ڈی، ایچ لارنس سے متاثر ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ کہ ان کی جنس نگاری ڈی ایچ لارنس کو ہضم نہ کر کے ایک کھٹے ڈکار کی صورت میں نمودار ہوئی ہے۔ مجھے عزیز احمد کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ یہ نہیں کہ ہمارے ادیبوں نے ڈی۔ ایچ لارنس کو پڑھ کر ہضم نہیں کیا بلکہ ہمارے ادیبوں کا ردِ عمل ڈی۔ ایچ لارنس سے قطعی مختلف تھا۔ ہمارے ادیبوں نے سماج کو یوں عریاں کرنا چاہا کہ ساری ڈھکی چھپی گندگی باہر آئے۔ ان کی تحریریں سماج کی اخلاقی قدروں اور پابندیوں اور ان سے متنج سماج کی گرتی ہوئی جنسی حالت پر بھرپور طنز تھیں۔

ڈی ایچ لارنس نے بھی سماج کی اخلاقی قدروں پر حملہ کیا تھا اور انہیں ان بے جا پابندیوں اور مصنوعی قدروں اور سماجی انسان کی ریاکاریوں کی بے پناہ نفرت تھی وہ ان کی گمراہ وردی پر تنقید سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن لارنس کا مقصد جنسی بے راہ روی اور گناہ کی زندگی پر تنقید نہیں تھی، بلکہ

ایک صحت مند جنسی تعلق کی تبلیغ۔ لارنس کی جنسی تحریروں میں جسمانی مظاہروں کے ساتھ ساتھ، لطیف سے لطیف، نازک سے نازک احساس کی جھلک ہے اور "جنس کی پیش کش میں، جمالی نظر میں" زندگی کی قوت" ہے۔ لارنس جسمانی لذت کے ساتھ حسن، مسرت، روشنی، قوت اور امن کا احساس دلاتے ہیں۔ لارنس نے جنس کو ایک فلسفہ بنا لیا تھا، بلکہ ایک مذہب کا درجہ دیدیا تھا۔ انہوں نے خود کو اس کا پیغامبر گردانا اور آخر میں اس کے، جیسا کہ مڈلٹن مرے نے اپنی کتاب SONE OF WUMAN میں لکھا ہے۔

"اس کے صلیب زدہ شہید ہوئے۔"

فطری جبلت اور فطری زندگی کے PURITAN PROPHET کی حیثیت سے شاید لارنس اور منٹو میں تھوڑی سی مماثلت ہو اپنے آخری ڈرامے "اس مجذوم سے ہیں" میں منٹو نے لارنس کی لیڈی چیٹرلیس لور والی تھیم کا استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں بھی منٹو کا رویہ اور پیشکش لارنس سے مختلف ہے۔

عزیز احمد کی جنس نگاری فرانسیسی جنس نگاروں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ ممتاز مفتی نے مغرب کے جنسی ادب سے اثر نہیں لیا بلکہ وہ براہ راست جنسی نفسیات کی طرف رجوع ہوئے۔ فرائڈ کی علم نفسیات میں جنسی تحلیلیں، ہیولاک ایلس، کرافٹ ایبنگ، سٹیکل وغیرہ نے جو مثالی واقعات (CASE HISTORIES) دئے ہیں جنسی نفسیات کے ایسے ہی (CASES) سے ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں کے لئے مواد حاصل کیا اس طرح کا خالص نفسیاتی افسانہ ہمارے ادب میں ایک انفرادی رجحان تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ممتاز مفتی نے بعض کامیاب نفسیاتی افسانے لکھے اور تحت الشعور کی بہت سی ڈھکی چھپی، ان کہی حقیقتیں اُجاگر کیں۔ لیکن ان کے بعض افسانوں خصوصیت سے بعد کے افسانوں میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ افسانہ ایک نفسیاتی کیس کے گرد بُنا گیا ہے۔ ان کے بہترین افسانے وہی ہیں جن میں نفسیات ایک زیریں حقیقت ہے اور جن میں ہلکے ہلکے نفسیاتی ٹچس کے ساتھ ہماری معاشرتی زندگی کی نازک اور سچی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ چنانچہ "آپا" "ماتھے کا تل"۔ "مورا"۔ "یہ دیوی"۔

یوں انسانی نفسیات کی پیش کش ہمارے کئی ایک افسانوں میں ہوئی ہے اور جنسی نفسیات کو منٹو اور عصمت چغتائی نے بھی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ منٹو کے افسانوں میں "دھواں" "بادشاہت" "ٹھنڈا گوشت" وغیرہ جنسی نفسیات کی کامیاب مثالیں ہیں۔ اور عورت کے جنسی جذبہ، جنسی ہیجان اور ارتقاء نفسیات کو جو عصمت چغتائی سے بہتر کوئی ترجمان شاید ہی مل سکے عصمت نے بے باکانہ جرأت سے عورت کو پہلی دفعہ اصلی روپ میں پیش کیا تھا۔ اور اس لئے عصمت کو ہمارے ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

عصمت پر کسی مغربی ادیب کا اثر پڑا ہے یا نہیں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ غالباً بیٹرس یا مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے کہ عصمت اپنے ڈراموں میں برنارڈ شا سے بہت متاثر ہیں اور اسی طرح کا WITTY طنزیہ ڈائالاگ انہوں نے استعمال بھی کیا ہے۔ لیکن جہاں تک ان کے افسانوں کا تعلق ہے، اور عصمت سب سے پہلے افسانہ نگار ہیں، کسی خاص شخص کا ان میں اثر نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مغربی ادب میں جنسی حقیقت نگاری سے مجموعی طور پر متاثر ہوئی ہیں۔

آگے چل کر ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے بھی عصمت کی طرز اختیار کی، اور گو ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور اور قرۃ العین حیدر کا ادبی پایہ عصمت چغتائی کے برابر نہیں ہے۔ لیکن ان دونوں بہنوں نے عصمت کی طرز کے افسانوں میں بہت سے اضافے کئے اور جنسی حقیقت نگاری سے ہٹ کر بھی انہوں نے اپنے موضوعات کو وسعت دی اور معاشرتی حقیقت نگاری کے اور پہلوؤں کی بھی اپنے افسانوں میں ترجمانی کی۔

جس طرح ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے عصمت چغتائی کی طرز اختیار کی۔ قرۃ العین حیدر نے حجاب امتیاز علی سے مطابقت محسوس کی۔ اور پہلے پہل انہوں نے حجاب امتیاز علی کے رنگ میں افسانے لکھنے شروع کئے۔ حجاب امتیاز علی کے افسانے کچھ GOTHIC قسم کے پراسرار رومان

ہوا کرتے تھے، اور فینٹیسیاں، یعنی FANTASY کا عنصر اب بھی قرۃ العین کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں انھوں نے درجنیا وولف کا انداز اختیار کر لیا ہے۔ (چونکہ یہ بات کہ قرۃ العین کا انداز درجنیا وولف کا ہے سب سے پہلے میں نے ہی کہی تھی، میں یہاں واضح کر دوں کہ یہاں قرۃ العین کا درجنیا وولف یا درجنیا وولف کی ادبی حیثیت سے تقابل مقصود نہیں۔ اور نہ یہ مناسبت ان معنوں میں لی گئی ہے جیسے منٹو کے متعلق کہا جائے کہ منٹو موپاساں ہے یا احمد علی کے متعلق کہ ان کے ہاں کافکا کی سی گہری رمزیت پائی جاتی ہے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ قرۃ العین نے شعوری طور پر درجنیا وولف کا اثر قبول کیا ہے)

ظاہری فارم کی حد تک قرۃ العین کی درجنیا وولف سے مناسبت ہے، "مافیہ" کی نہیں۔ درجنیا وولف کے نزدیک زندگی کی قدریں کچھ اور ہیں۔ اور درجنیا وولف میں وہ "ادبی قابو" اور توازن بدرجۂ اتم موجود ہے جو وقت اور جگہ اور ہیئت کی پابندیوں کو توڑنے کے بعد لازمی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں یہ مکمل ادبی قابو اور توازن نہیں ہے۔

ای ایم فارسٹر نے کہا ہے کہ زندگی نگشن میں دو سطحوں میں پیش ہوتی ہے ایک LIFE IN TIME دوسری LIFE IN VALUES حب وقت کے تسلسل کو توڑا جائے تو VALUES بڑے اور وزنی ہونے چاہئیں۔ جیمس جوائس نے جب وقت اور زمانے کی حدیں توڑ دی تھیں تو کئی علوم اور کائناتی اصول اپنی تخلیقات میں سمیٹ لئے تھے۔ قدیم کلاسیکی ادب اور قدیم تہذیبوں کی MYTHOLOGY کو موجودہ زمانے میں ڈھالا تھا۔ پروست نے اپنے کھوئے ہوئے اور بھر پائے ہوئے وقت میں موجودہ زمانے کا شعور MODERN CONCSIOUS-NESS سمیٹ لیا۔ اور درجنیا وولف نے وقت کے ایک ایک لمحے کو بقعت اور تکمیل بخشی۔

قرۃ العین کے ہاں زندگی کی بڑی حقیقتوں اور اقدار کا اور زمانے کا کوئی گہرا شعور نہیں ہے۔ بلکہ ایک ADOLESCENCE کی سی رومانی آئیڈیلزم اور اس سے منتج ڈز الوژن اور رومانی شکست خوردگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین کی اگر کسی نے نقل کی تو وہ عموماً جاذباتی قسم کی ADOLESCENT لڑکیوں نے جنھوں نے قرۃ العین کی طرز تحریر کی بعض خاص خوبیوں کو چھوڑ کر قرۃ العین کے افسانے کو اپنی بالکل BARE شکل میں اپنایا جس میں ایک ہی طرح کے رومانی ماحول میں ازلی رومانی تثلیث ہوتی ہے۔ (سوائے جیلانی بانو کے جو آہمل کی کھنے والیوں میں ایک ہی ہیں جو ایک اچھی افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھری ہیں، اور جنھوں نے ایک افسانہ اس طرز میں انتہائی اچھا لکھا ہے جتنا کہ قرۃ العین کا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس افسانے میں بھی جیلانی بانو کا رویہ قرۃ العین کے برخلاف ترقی پسند ہے اور جیلانی بانو اپنی دوسری تحریروں میں اجوہ مسرور اور خدیجہ مستور سے زیادہ قریب ہیں)

قرۃ العین کا طرز گو مغربی ادب سے مستعار تھا، لیکن اردو کے لئے نیا تھا اور اس نئے انداز میں ایک شگفتگی اور جاذبیت تھی۔ لیکن اس انداز کے اردو افسانہ میں ارتقا کے جو امکانات تھے انھیں یا تو بعض نئی لکھنے والیوں کی اس سستی تقلید نے ختم کر دیا۔ لیکن اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ قرۃ العین خود ایک سطح پر آکر رک گئیں اور اپنے آپ کو بار بار دہرانے لگیں کہ ان کے بیشتر افسانے اور ناول بھی ایک دوسرے کے REBASH معلوم ہونے لگے۔ ایک ہی سی فضا، ایک ہی سا ماحول۔ ایک ہی سے کردار جو ایک ہی طرح کی باتیں کرتے اور ایک ہی انداز میں سوچتے بھی ہیں۔ درجنیا وولف کے ہاں یہ ہمیشہ کی یکسانیت کا احساس نہیں ہے۔ وہ اپنے کرداروں کا فرق احساسات اور موڈس کے نازک فرق کے ذریعہ واضح کر دیتی ہیں۔ درجنیا وولف کا اسلوب ایک ایسا شفاف اور ذی حس ادبی آئینہ ہے جو جس کے ہلکے سے ہلکے ارتعاش کو پکڑ سکتا ہے۔ اسی طرح ان کی تخلیقات میں بھی تنوع ہے۔ چنانچہ ان کی دو بہترین اور فائنہ تخلیقات کا واضح فرق دیکھئے "THE WAVES" "THE LIGHT HOUSE" سے بالکل الگ چیز ہے۔

بہرحال اردو افسانہ میں ایک نیا طرز لے آنا بجائے خود قابل قدر ہے اور قرۃ العین کے طرز کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ گروہ خود

ایک محدود دائرے میں گھری رہ کر اس کی وسعت اور امکانات کا پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکی ہیں اور کوئی بڑی تعمیم انھوں نے پیش نہیں کی ہے۔ انھوں نے دوسروں کے آگے ایک نئی راہ کھول دی ہے۔ اور ممکن ہے کوئی زیادہ پڑھا لکھا اور جس نے بڑے ادب اور کلاسکس کو پوری آگاہی سے سمجھا ہو اور اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہو اور جس کی INTELLECT زیادہ پختہ MATURE اور گہری ہو، اس طرز میں کوئی بڑی تخلیق پیش کر سکے۔

گو مغرب کے کئی ادبی رجحان اور تحریکیں ہمارے نئے ادب اور خصوصیت سے افسانے پر اثر انداز ہوئیں، لیکن ہمارے ادب میں یہ مختلف رجحان الگ الگ مجموعی تحریکوں کے طور پر نہیں اُبھرے بلکہ ہمارے چند منفرد شعوری فنکاروں نے انھیں اپنانے کی کوشش کی۔ یا کم از کم ان رجحانوں کے زیر اثر چند تجربے کئے۔ یہ بات خصوصیت سے داخلی رجحانات کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ چنانچہ "رمزیت" SYMBOLISM ہمارے ہاں کوئی مجموعی تحریک نہیں بنی اور اس کے واحد اور وقیع نمائندہ احمد علی ہی رہے۔ شعور کی رو FLOW OF CONCIOUSNESS عسکری ہی سے وابستہ ہو گئی۔ اور "سرریلزم" میں احمد علی کی پہلی کوششوں کے بعد شاہد ہی کسی نے کوئی تجربہ کیا۔

"اظہاریت" EXPRESSIONISM میں البتہ دو تین ادیبوں نے خاصے تجربے کئے۔ "ایکسپریشنزم" ——— اظہاریت یا باطن نگاری ایک قسم کی ذہنی کیفیات اور تصورات کا اظہار ہے۔ یہ جوائس یا پروست کے شعوری تسلسل STREAM OF CONCIOUSNESS سے مختلف چیز ہے۔ "اظہاریت" میں ذہن خاص قسم کے تصورات دیکھتا ہے جو دیکھنے والے کو دنیا کے حقائق سے دور لے جاتے ہیں۔ اس سکول کا نظریہ رہا ہے کہ فن کار کو اپنے انفرادی محسوسات کا اظہار کسی ظاہری وسیلے سے کرنا چاہیئے۔ اطالوی مصنف لوئی جی پیرانڈیلو اس سکول کا سب سے بڑا نمائندہ ہے۔ اس سکول کے مقلد کہتے ہیں کہ کروچے کے اصول اور نظریے ان کے آرٹ کی صحیح تشریح کرتے ہیں۔ لیکن کروچے نے "ایکسپریشنزم" کا لفظ الگ معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کروچے کے لئے ایکسپریشن فن کار کے ذہن میں آمد ہے۔ آرٹسٹ کی نظر جب کسی چیز یا واقعہ کو دیکھتی ہے تو اس کا تاثر ذہن میں قائم ہو جاتا ہے۔ اس تاثر کو احساس، وجدان اور تخیل ذہن ہی میں ایک خوبصورت شکل دے دیتے ہیں۔ اور یہی "اندرونی اظہار" ہے۔ لیکن خود فن کار تو اس خوبصورت ذہنی تخلیق کو جسمانی شکل دے کر دائمی بنانا چاہتا ہے۔

"ایکسپریشنزم" ایک غیر معمولی ذہنی کیفیت کی عکاسی ہے۔ جس میں ذہن ایسی عجیب تصویریں دیکھتا ہے جو حقیقت میں موجود نہ ہوں بلکہ اسے ایک خواب سحر DAY-DREAMING میں نظر آتی ہوں۔ چنانچہ عزیز احمد کے "جھوٹا خواب" میں اظہاریت ہے، نفسیاتی تجزیہ میں خواب بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ خواب ایک خالص نفسی کیفیت ہے جس میں ہمارے تحت الشعور کو بیدار کر کے واقعات دکھائے جاتے ہیں، ایسے واقعات جو بیداری میں دکھائی نہیں دیتے۔ عزیز احمد کے جھوٹے خواب کے علاوہ فسادات پر ان کے افسانے "کالی رات" میں شدید بیماری کی حالت میں ایک ہزیانی تصور یہ اور HALUCINATION ہے جس کے ذریعہ انسان کی افتاد دکھائی گئی ہے۔ منٹو کے ایک تازہ افسانے "فرشتہ" میں شدید بھوک، ذہنی پریشانیوں اور بیماری کے دوران میں جب وہ موت سے قریب پہنچ جاتا ہے ایک بھیانک" ذہنی تصور یہ" ہے۔ ایک

حیات اللہ انصاری نے جنھوں نے "حقیقت نگاری" میں آخری کوشش کا ساتھ ہر کا رپیش کیا تھا، اپنی دو ایک تازہ تحریروں میں علامتی اور رمزی طرز اختیار کیا ہے۔ چنانچہ "ماں بیٹا" "آبشکر گذار آنکھیں" میں "ماں بیٹا" میں تو خارجی حقیقت نگاری کے ذریعہ ہی ایک رمزی SYMBOLIC SIGNIFICANCE پیدا کی گئی ہے۔ لیکن "شکر گذار آنکھیں" میں ایک شدید باطنی انفعالی کیفیت ہے جس میں ایک خیالی ہیں کی طرف اُٹھتی ہوئی دو شکر گذار آنکھوں کو اپنے جسم اور گوشت پوست

بے شمار زخم ہیں کہ اُسے اذیت دیتی ہیں۔ اپنے سینے پہ یہ زخم کاڑھ کر اور اپنے آپ پر کاری ضربیں لگا کر وہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرتا ہے۔ یہ "مُرخ نشان" اس کی رُوح میں اسی طرح گڑ گئے ہیں جیسے "ہاتھورن" کے "سکارلٹ لیٹر" کے پادری کی رُوح میں۔ اور ان زخموں سے اس کی رُوح کو ایک سکون ملتا ہے۔

ہمارے ہاں اظہاریت کی سب سے کامیاب پیش کش جاوید اقبال کے تمثیلوں میں ہوئی ہے۔ خصوصیت سے "پنجبر" میں معصوم گناہ اور گناہ کے امکان اور ترغیب کے باوجود انسان کی ازلی معصومیت اور ملائکانہ پاکیزگی کی بڑی مکمل اظہاری تصویر ہے۔

"خود وجودیت" EXISTENTIALISTS مابعد جنگ کی سب سے تہلکہ مچا دینے والی تحریک ثابت ہوئی، گو یہ فرانسیسی ادیبوں تک ہی محدود رہی۔ اس تحریک کا منبع بھی فلسفہ تھا۔ کیرکے گارڈ کے فلسفہ سے شروع ہو کر وہ ادب میں سارتر کے ذریعہ آئی لیکن سارتر کا خود بھی فلسفہ اور ادب دونوں سے تعلق تھا، لہٰذا انھوں نے بڑی کامیابی سے اس فلسفہ کو ادب میں پیش کیا۔ خصوصیت سے اپنے ڈراموں میں۔ جہاں تک فکشن کا سوال ہے، میرے خیال میں دوسرے EXISTENTIALISM مثلاً کامو CAMUS اور سمون دبوار نے خود وجودیت کے فلسفہ کو کہیں زیادہ بہتر طریقہ پر اپنے ناولوں میں سمویا ہے۔

ہمارے ہاں ژاں پال سارتر اور ادب میں ان کے فلسفۂ "خود وجودیت" پر تنقید میں تو خوب نظریاتی بحث چلی، لیکن تخلیقی ادب پر اس تحریک کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ انتظار حسین نے البتہ "چاند گہن" میں ایک ایسی انفعالی کیفیت کی عکاسی کی ہے، جو سارتر کے NAUSEA سے بہت مشابہ ہے۔ LA NAUSEA اب بھی سارتر کا بہترین ناول تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس انفعالی کیفیت سے نکل کر ایک "نیا وجود" کیسے اپنے آپ کو ASSERT کرتا ہے، یہ اس ناول میں اتنا واضح نہیں ہے جتنا کہ سارتر کے ڈراموں میں، مثلاً ان کے شاندار ڈرامے THE FLIES میں جس کی تھیم مشہور یونانی اوریسٹس والی تھیم ہے سارتر کا اوریسٹس ORESTES ایک نرم طبیعت، نازک، اخلاقی پابندیوں کے ماحول میں پلا بڑھا ہے، (یہ گویا اس کا ESSENCE ہے) لیکن جب وہ ایک "عزم" کر لیتا ہے تو ایک دوسری ہی ہستی بن جاتا ہے۔ اور صحیح معنوں میں اس کا وجود (EXISTENCE) اس وقت قائم ہوتا ہے۔ اوریسٹس کا نیا وجود وہ ہے جسے دیکھ کر خود زیوس ZEUS پکار اُٹھتا ہے۔

"ایک وقت کے پُورا ہونے کے بعد ایک انسان آنے والا ہے، ایک ایسا انسان جو میری (یعنی خدا کی) اُفتاد کا اعلان کرتا اور تم اوریسٹس، ایسا معلوم ہوتا ہے، تم وہ انسان ہو۔"

"چاند گہن" کا مرکزی کردار LA NAUSEA کے کردار کی طرح آخر تک بھی انفعالیت کے بوجھ تلے دبا رہتا ہے۔ اس کے سامنے ایسا کوئی واضح CHOICE نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو کچھ اور بنا سکے۔ ایک مثبت، نیا وجود بن جانے۔ اور موجودہ دور کے انسان کے لئے جس کے سامنے ابہام، شکوک و شبہات اور UNCERTAINITIES کے سوا کچھ نہیں، کوئی واضح انتخاب شاید ممکن بھی نہیں۔

انتظار حسین کی "بن لکھی رزمیہ" بھی جو تقسیم کے بعد لکھی گئی ساری چیزوں میں ایک خاصی وقیع تخلیق کی حیثیت رکھتی ہے، انسانی شخصیت کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش ہے۔ یہاں انتظار حسین آندرے ژید سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک اور طرح کا افسانہ جو کسی تحریک یا رجحان کے تحت نہیں آتا لیکن جو افسانہ کی ترقی یافتہ اور بالکل نئی شکل ہے تینوں بُعد کا (THREE DIMENSIONAL) افسانہ ہے۔ اس طرز کے چند ہی افسانے لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ "ان داتا" (رگھوشن چندر) "مدن سینما اور صدیاں" "زرین تاج" (عزیز احمد) "دیپک راگ" اور "میگھ ملہار" (ممتاز شیریں)۔ تینوں بُعد کے معنی ہیں لمبائی،

چوڑائی اور گہرائی لیعنی وہ بات جو بڑے سے بڑے کینوس پر تصویر میں بھی پیدا نہیں ہو سکتی، ایک ایسی تراشیدہ مثلیہ کے ذریعہ ظاہر ہو سکتی ہے جسے کئی زاویوں سے دیکھا جا سکے۔ چنانچہ کرشن چندر کے "ان داتا" میں ایک موضوع یعنی بنگال کے قحط پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک غیر ملکی سفیر کی اس المیہ سے بے اعتنائی، طوفان سے دور ساحل پر کھڑے طبقوں کی جھوٹی ہمدردی اور آخر میں خود اس انسان کا المیہ جو اس طوفان سے گذر رہا ہے سارے پہلوؤں کو مکمل طور پر EXHAUSTIVE بنانا تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ ہر پہلو سے کوئی اور پہلو نکل آتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات کہ ایک ہمہ گیر اور وسیع سے وسیع تر دائرے میں ایک مسئلہ کو گھیرا جا سکتا ہے "ویپک راگ" میں جنس و محبت سے متعلق کئی مختلف رویے (ATTITUDES) ہیں، جو متوازی بھی ہیں اور متضاد بھی۔ اور یہ رویے اتنے ہی مختلف اور متنوع ہو سکتے ہیں جتنی کہ انسانی فطرت پیچیدہ ہے۔ "ان داتا" اور "ویپک راگ" میں زاویے مختلف ہیں لیکن زمانہ ایک ہے۔ "زریں تاج" میں زمانے مختلف ہیں، جن میں ایرانی عورت کو مختلف شبیہوں میں پیش کیا گیا ہے، لیکن مکان ایک ہے۔ "مدن سینا اور صدیاں" اور "میگھ ملہار" میں زمان اور مکاں دونوں کی وسعتوں کو سمیٹنے کی کوشش ہے۔ قدیم سے قدیم زمانے سے لے کر موجودہ زمانے تک یعنی صدیوں کا فاصلہ۔ اور دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں اور بڑی بڑی قدیم تہذیبوں اور مذہبوں کے مشترکہ اور متضاد عناصر کو یکجا کرنے کی سعی۔

عزیز احمد کے افسانے میں "مدن سینا اور صدیاں" جس کی مرکزی تھیم "عاشق، معشوق اور رقیب" کی تثلیث ہے اور دیتال کا وہ ازلی سوال "ان تینوں میں فیاض کون ہے؟" اس میں مختلف ملکوں کی پرانی مشہور داستانیں ہیں، ہندوستانی، یونانی، ایرانی، مدن سینا، شیریں فرہاد، ڈوری گن آرے بس وغیرہ اور داستان گوئی کے ساتھ اس میں تاریخ اور تحقیق کا امتزاج ہے۔

"میگھ ملہار" کی، جس کی مرکزی تھیم موسیقی کا سحر اور فن کار کی حیاتِ جاودانی ہے، بنیاد دنیا کی قدیم تہذیبوں کی MYTHOLOGY پر رکھی گئی ہے۔ ہندو دیومالا اور یونانی اساطیر جن میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ اور جہاں MYTHOLOGY سے تھوڑا سا گریز کیا ہے وہاں میں نے انجیلی، عیسائی رمزیت CHRISTIAN SYMBOLISM اور ہومر، ورجل، ملٹن کے ہلکے سے ٹچز دیئے ہیں جن کی داستان سے مناسبت ہے۔ اور آخر میں آرفیس، یوریڈیس اور نار سائیس کی یونانی MYTH! ایک ایرانی رومان میں دہرائی گئی ہے جو اسی زمانے کا ہے، لیکن افسانے کے دوسرے حصوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اسے بھی اسطوری MYTHICAL ٹون دیا ہے۔

روایاتی تصور کے مطابق اسطوری حقیقت مادی حقیقت سے کہیں گہری ہوتی ہے گو یہ مبہم ہوتی ہے اور MYTH میں ہمیشہ کوئی گہرے معانی پوشیدہ ہوتے ہیں، اور بظاہر سادہ اور حسین LEGENDS کسی آفاقی UNIVERSAL حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہمارے افسانے کی ہیئت ہر لحاظ سے وسیع ہے۔ تکنیک، رجحان، موضوع و مواد، ہر اعتبار سے ہمارا افسانہ متنوع اور متنوع ہے۔ چنانچہ اگر معاشرتی حقیقت نگاری میں "آخری کوشش" (حیات اللہ انصاری) "کلیاں اور کانٹے" (اختر اورینوی) اور "زندگی کے موڑ پر" (کرشن چندر) کے سے شاہکار ہیں تو "رمزیت" میں "قید خانہ" (احمد علی) کا سا نہایت گہرا اور مکمل افسانہ۔ ایک طرف "بارگرپی نائنہ" (منٹو) اور "حرا مجادی" (عسکری) کے سے انفرادی افسانے ہیں تو دوسری طرف "آندی" (غلام عباس) کا سا اجتماعی افسانہ ایک طرف بلونت سنگھ کے "رنگ" کا سا ہلکا پھلکا نازک افسانہ ہے، جس میں محض رنگوں کے امتزاج اور تبدیلی کے ذریعہ مختلف چھوٹے چھوٹے تاثرات یکجا کئے گئے ہیں یا قدرت اللہ شہاب کا "تلاش" جس میں صرف ایک "موڈ" کی گرفت ہے، یہ نازک، مرصع زیورات کے سے ترشے ہوئے افسانے، تو دوسری طرف یہ تینوں بُعد THRE DIMENSIONAL کے افسانے "ان داتا" "مدن سینا اور صدیاں" "میگھ ملہار" جو ایک وسعت و گیرائی، عظمت و شان، اور ایک COLASSUS کا احساس دلاتے ہیں۔

ان افسانوں کو پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارا افسانہ کسی بھی لحاظ سے مغربی افسانہ سے پیچھے رہ گیا ہے ؟

امریکہ کے اس دور کی ایک بہت ذہین اور ہونہار افسانہ نگار یوڈورا ویلٹی افسانہ پر اپنے ذاتی انفرادی تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہر افسانہ میں ایک "جستجو" ہوتی ہے ۔ ہر افسانہ کی اپنی ایک "فضا" ہوتی ہے ۔ افسانے آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کی طرح ہیں جن پر اپنے وزن کو الگ الگ مرکوز کیا جائے تو ہمیں یہ احساس ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی ایک الگ دنیا ہے ۔ اور ہر ایک کی اپنی ایک الگ روشنی ۔ ان میں سے بعض ستاروں کی طرح ساکت و جامد ہوتے ہیں ، بعض سیاروں کی طرح اپنے اپنے دائروں میں گھومتے ہیں ۔ بعض شہاب ثاقب کی طرح اچانک شعلہ زن ہوتے ہیں اور اپنے پیچھے روشنی کی ایک لکیر چھوڑ کر غائب ہو جاتے ہیں اور بعض دمدار سیاروں کی طرح ہیں جو اصل ستارے کی مرکزی روشنی کے علاوہ ایک اور ہی کہانی اپنے جلو میں لئے ہوتے ہیں جو دمدار سیارے کی دم کی طرح بہت پیچھے تک اپنی روشنی چھوڑتی ہے ۔

ہمارے افسانوں میں بھی یہی تنوع ہے ۔ ہمارا افسانہ مغربی ادب سے ضرور متاثر ہوا ہے لیکن ہمارے افسانے نے نہ صرف مغربی افسانہ کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے بلکہ اپنی انچ اور انفرادیت کا بھی مظہر ہے ۔ یہ ہماری اپنی قومی زندگی کا نمائندہ ہے ۔ اس میں ہمارے اپنے مسائل پیش ہوئے ہیں خواہ وہ معاشرتی ہوں یا معاشی یا جنسی یا سیاسی مسائل ۔ اور آج ہمارا افسانہ اتنا ترقی یافتہ ہے کہ وہ مجموعی طور پر کسی بھی مغربی ملک کے افسانوی ادب کے مقابلے میں فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے ۔

محمد حسن عسکری

اُردو افسانے کا مستقبل

ہمارے ادب پر جمود طاری ہے یا نہیں؟ ہمارے ادیبوں کی تخلیقات میں کمی واقع ہوئی ہے یا نہیں؟ پچھلے پانچ سال میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی ادبی حیثیت کیا ہے؟ اس کا کتنا حصّہ قابلِ قدر ہے؟ ان سوالوں کے مختلف جواب ہو سکتے ہیں بعض لوگ ممکن ہے ضرورت سے زیادہ مایوس ہوں اور بعض ممکن ہے ابھی تک خوش فہمی میں مبتلا ہوں۔ بہرصورت ادبی قدر و قیمت کے سوال سے الگ ہٹ کر بھی پچھلے پانچ سال کے ادب پر غور کیا جا سکتا ہے اور اسکی بحث سے بعض ایسے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں جنکا تعلق صرف ادب ہی سے نہیں بلکہ پورے معاشرے کی حالت اور خصوصاً ملک کی ذہنی فضا سے بھی ہوگا۔ اسکے ساتھ موجودہ ادب کی نوعیت بھی کسی نہ کسی حد تک متعین ہو سکیگی۔ فی الحال میں اپنی بحث کو محض افسانوی ادب تک محدود رکھنا چاہتا ہوں بخصوصیت کیساتھ ان افسانوں تک جو پچھلے ڈھائی تین سال میں ہمارے سامنے آئے ہیں یعنی مجھے دیکھنا یہ ہے کہ جب فسادات سے متعلق افسانوں کا زور کم ہو گیا تو پھر افسانہ نگاروں نے اپنا مواد زندگی کے کن سرچشموں سے حاصل کیا اور اپنے موضوع کے بارے میں انکا رویہ کیا رہا۔ اس عرصے میں جتنے افسانے لکھے گئے ہیں، میں نے سب کے سب نہیں پڑھے نہ مجھے اس وقت اس سارے افسانوی ادب کا جائزہ لینا ہے۔ جو رجحانات پچھلے پندرہ سال سے ہمارے ادب میں حاوی ہیں، وہ تو بہرحال اپنی جگہ ہیں ہی، مجھے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ پچھلے تین سال میں کوئی نئے رجحانات نظر آتے ہیں یا نہیں۔ وہ رجحانات کس قسم کے ہیں اور اُن کا مجموعی سماجی حالات سے کیا تعلق ہے؟ یہاں بھی میں اپنی تنقید کا دائرہ محدود رکھوں گا۔ نئے ادب کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ اس تحریک نے سیاست اور جنس کے بارے میں بہت صاف گوئی سے کام لیا۔ فی الحال میں یہ دیکھوں گا کہ آج کل کے افسانوں میں جنس کے بارے میں کیا نیا رویہ پیدا ہوا ہے۔ اور ملک کی سیاسی حالت سے اس رویے کا کتنا تعلق ہے۔ یہ بات واضح کر دینا بہتر ہے کہ انفرادی حیثیت سے میں کسی افسانہ نگار پر بحث نہیں کر رہا ہوں اور نہ ان افسانوں کی ادبی حیثیت پر کچھ مقصود ہے بلکہ دراصل اس وقت میرا موضوع بحث افسانوی ادب سے زیادہ ملک کی ذہنی فضا ہے۔ جو افسانوں میں جھلکتی ہے۔

اردو افسانوں کے جنسی رویے پر کچھ کہنے سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ ادب میں جنسی موضوعات کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ کچھ ذہنوں سے ایک بڑی خوفناک اصطلاح چل چکی ہے جو ظاہر ہے تو بے ضرر سی ہے لیکن اسکے مبہم استعمال سے ادبی بحثیں اور اُلجھ جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ادب کو صحت مند ہونا چاہئے۔ دراصل یہ فوصیفی فقرہ بالکل غیر ضروری ہے۔ اگر کوئی تحریر ادب کی حدود میں آتی ہے تو اپنے آپ سے اپنے آپ صحت مند ہوگی۔ کیونکہ ادب کی تخلیق جذبات خوبصورتی اور جذباتی توازن کی کوشش ہے۔ عام طور سے اس فقرے کا مطلب لوگ یہ لیتے ہیں کہ ادب میں جنسی کج روی اور جنس کے تخریبی پہلوؤں کا ذکر نہیں ہونا چاہئے

لیکن اگر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں تو دنیا کے ادب کا بہت بڑا حصہ قربان کر دینا پڑے گا۔ سمرسٹ مگیم نکل جائیگا۔ راسین نکل جائیگا۔ مارلو نکل جائیگا اور شیکسپیر کے بہت سے حصے خارج کرنے پڑینگے۔ اس طرح ادب کے نقصان کے باوجود اگر اس میں عوام الناس کی بھلائی ہو تو چلئے یہ بھی سہی لیکن اجتماعی زندگی کی صحت کیلئے لازمی ہے کہ جنسی تخریبات براہ راست اور وسیع پیمانے پر برسرِ کار نہ آئیں بلکہ ادب اور فن میں ان کا اظہار کر کے ان پر قابو پا لیا جائے مثلاً ہیولاک ایلس کے خیال میں ہر قدیم یونانی اپنے اندر ایک ای۔ ڈی لپس لئے پھرتا ہے۔ اور واقعی ای۔ ڈی۔ پس بن جانے سے بچنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ تھیٹر میں یہ سارا قصہ دیکھ لیا جائے چنانچہ یہ ناٹک محض تماشا نہیں تھا بلکہ پوری یونانی قوم کا ایک ذہنی علاج تھا۔ اگر جنس کے تخریبی پہلوؤں کو ادب سے بالکل خارج کر دیا جائے اور انہیں شعور میں آنے سے پہلے بالکل روک دیا جائے تو اس سے سماج کا ذہنی توازن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے یہ کلیہ تو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا کہ ادب میں صرف غیر صحت مندانہ افعال اور جذبات کا بیان ہو۔ جس طرح یہ ضروری ہے کہ جو غیر صحت مندانہ عناصر افراد میں اور سماج میں موجود ہیں۔ وہ ادب اور فن کے ذریعے شعور میں آجائیں اور یوں کسی حد تک ان کا ازالہ ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ متوازن اور تندرست شخصیت کی جسمانی اور نفسیاتی ضرورتوں کو بھی اظہار کا موقع ملتا رہے۔ غیر صحت مندانہ عناصر کے ادب میں ظاہر ہو جانے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ سماج میں غیر شعوری طور پر کس قسم کے رجحان پرورش پا رہے ہیں مثلاً پچھلے سو سال کا مغربی ادب اور آرٹ دیکھ کر دو بڑی جنگوں سے پہلے ہی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی کہ یورپ میں کس قسم کے ہولناک واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ اسی طرح ہمارے برصغیر میں فسادات کے دوران میں جو کچھ ہوا اسکا پرتو پچھلے پندرہ برس کے ادب میں موجود ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری ادب اور آرٹ پر ہے۔ بعض لوگ چند سیاسی اور اجتماعی نظریات کے ماتحت اس قسم کے نتیجے نکالتے ہیں مگر وہ یہ بات نظر انداز کر جاتے ہیں کہ فن تو بذاتِ خود ایسے تخریبی رجحانات سے نبرد آزمائی کرنے کا ایک ذریعہ ہے بلکہ زیادہ خطرے کی بات تو یہ ہے کہ ادب میں تخریبات کا ذکر آنے ہی نہ پائے اور ادب سہانے خوابوں اور نیک ارادوں کا مجموعہ بن کر رہ جائے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ سماج کے لاشعور میں تخریبی رجحانات اندر ہی اندر پل رہے ہیں اور ایسی جڑ پکڑ گئے ہیں کہ انہیں شعور میں لانا بھی مشکل ہے۔ لہٰذا تخریبات کے بیان سے گھبرانا اور اس پر پابندیاں عائد کرنا جسمانی اور ذہنی تندرستی کی ہرگز دلیل نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر صحت مند اور پختہ شخصیت کی ضرورتیں ادب میں بالکل ظاہر ہی نہ ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ سماجی شخصیت اندرونی ہم آہنگی اور توازن حاصل کرنے کے لئے پوری جدوجہد نہیں کر رہی۔ مختصر یہ کہ ادب کو جنسی کج روی اور اس قبیل کے موضوعات اختیار کرنے سے ڈرنا تو نہیں چاہئے کیونکہ ادب انسانی وجود کی حقیقتوں سے چھپ جائے تو وہ ادب ہی کیا ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ متوازن اجتماعی زندگی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ادب صحت مندی کی تلاش سے خالی نہ ہو۔

اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ جنس کے معاملے میں صحت مند اور پختہ شخصیت کے مطالبات کیا ہوتے ہیں۔ جنس کی اعلیٰ ترین اقدار کیا ہیں۔ اور ادب میں کہاں کہاں ملتی ہیں؟ یہ بحث تو فی الحال چھوڑ دیجئے۔ جہاں تک عام انسانوں کا تعلق ہے۔ انکی صحیح جنسی تسکین کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو خالص جسمانی تسکین ہے جس میں انسان اور حیوان برابر کے شریک ہیں۔ اس جبلت کی شرکت کے بغیر محبت میں قوت اور گیرائی آ ہی نہیں سکتی لیکن اس حیوانی خواہش کی تسکین انسان کیلئے کافی نہیں ہے۔ اس میں ان لطیف جذبات کی آمیزش بھی ہونی چاہئے جو انسان نے اپنی انفرادی اور اجتماعی نشوونما کے دوران میں پیدا کئے ہیں۔ جنسی خواہش کی شدت اور انسانی جذبات کی نرمی ان دو کے بغیر صحت مندانہ اور متوازن جنسی رویہ مکمل نہیں ہو سکتا ہم اس رویے کو معیار سمجھ کر ادب کا انسانوی ادب کا جائزہ لیں گے۔

سنہ ۱۹۳۰ء سے پہلے اردو میں وہ صنف بہت مقبول تھی جسے رومانی افسانہ کہتے ہیں۔ ان افسانوں میں محبت کے جنسی اور جبلی پہلو کا اعتراف قطعاً نہیں ہوتا تھا۔ لیکن محبت کو روحانیت بننے سے بھی گریز کیا جاتا تھا۔ اس دور میں محبت ہلکے سے جذباتی تلاطم کا نام تھا۔ یعنی اس دور کے ادیبوں کی ذہنیت پندرہ سولہ سال کے لڑکوں کی سی تھی۔ جب جنس مخالف کی طرف کشش تو ہونے لگتی ہے مگر اس کشش کی جنسی نوعیت کو تسلیم کرنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے اس لئے آدمی اس جذباتی ہیجان کی اصلیت پر غور نہیں کرتا، کیونکہ ڈر یہ ہوتا ہے کہ اگر ان جذبات کی جنسی آمدگی کو قبول کر لیا تو یہ جذبات قابل قبول نہیں رہیں گے۔ جو ادب کسی جذبے کی تہ تک پہنچنے سے گھبرائے اس میں ہلکا پن اور سطحیت ہونی ہی چاہئے۔ ان رومانی افسانوں کے ساتھ ساتھ تیگوری نثر بھی خوب چلتی تھی۔ وہ بھی بلوغت کی

زندگی کا ایک نمونہ ہے۔ اس عمر میں انسان جنسی خواہش محسوس بھی کرتا ہے اور اسے گندی چیز سمجھ کر اس سے بھاگتا بھی ہے۔ چنانچہ جنسی جذبہ بڑی آسانی سے عبودیت اور مذہبیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یونگ نے بھی مذہبیت کی تعریف یوں کی ہے کہ آدمی شعوری طور پر جانتا ہو کہ میں اپنی فطرت کے کن فاسد عناصر کو تابو میں رکھنے کے لئے مذہب کا اخلاقی نظام مستعمل کر رہا ہوں اور جھوٹی مذہبیت یہ ہے کہ آدمی ان فاسد عناصر کا اعتراف کئے بغیر کسی اخلاقی نظام میں پناہ لینا چاہے۔ یہ جھوٹی مذہبیت بلوغت کے زمانے میں ہر لڑکے اور لڑکی کو اپنی پناہ میں لینے کے لئے موجود رہتی ہے۔ وہی اس زمانے میں ہمارے ادیبوں نے اختیار کر رکھی تھی۔ پھر ایک تیسری چیز تھی۔ نیا نہ فتح پوری اور ان کے ساتھیوں کی جمال پرستی۔ ان لوگوں کو دعویٰ تھا کہ ہم میں ذرا ریاکاری نہیں ہے۔ اپنی خواہش کا اظہار بے لاگ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی مزعومہ لذت پرستی میں یہ تھی کہ عورتوں کے اعضا کا نام بار بار چٹخارے کے ساتھ لیتے تھے۔ یہ بھی بلوغت کے اس دور کی خصوصیت ہے جب جنسی حس تو بیدار ہو گئی ہو مگر عملاً اس کی تکمیل کی اہلیت نہ آئی ہو اور آدمی کی ساری جنسی لذت دوسروں کو یہ جتانے پر منحصر ہو کہ لو، خبر سے ہم بھی جوان ہو گئے ہیں۔ ..... غرض اُردو ادب کے اس دور میں جنسیات کا ہر اظہار کھلا اور بے تکا تھا۔ پھر اس قسم کے ادب کو زاویہ وسیع پس منظر میں دیکھئے۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک مسلمانوں کی حالت بھی ایسی تھی جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ انہیں ملک کی سیاست میں اپنی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ زندگی کی ذمہ داریاں اور فرائض سے انہوں نے اپنے آپ کو الگ کر لیا تھا۔ اجتماعی حیثیت سے ان کے لئے کوئی کشمکش اور جدوجہد باقی نہ رہی تھی۔ ان کا ایمان یہ رہ گیا تھا کہ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟ ..... انفرادی حیثیت سے ایک عام مسلمان کا مطمح نظر اتنا تھا کہ کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھولا جا، جو کچھ کمائے اس زمانے میں مسلمانوں کی سیاست میں تھا، وہی ادب میں بھی تھا۔ ..... پھر ایک قابل غور بات یہ ہے کہ افسانوں میں زن مریدوں کے کردار کتنے عام ہو گئے تھے۔ غرض مسلمانوں پر ایک عجب مجہولیت اور مفعولیت طاری تھی۔ وہی رویہ جنس کے متعلق افسانوں میں بھی ملتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں نئے ادب کی تحریک شروع ہوئی جس کے ساتھ سیاست کے متعلق زیادہ وہ لیرانہ رویہ اور جنس کے بارے میں زیادہ حقیقت پر مستند رویہ ابھرا ..... لیکن ۱۹۳۶ء سے لیکر ۱۹۳۹ء تک افسانوں میں جنس کے متعلق جو انداز نظر ملتا ہے۔ اُسے بھی متذکرہ بالا معیار کے مطابق مکمل طور پر صحت مندانہ اور متوازن نہیں کہہ سکتے۔ ۱۹۳۶ء سے پہلے حقیقی افسانوں میں محض جذباتی گداز اور نرمی ہی تھی، جسمانی پیار کا اعتراف نہ تھا۔ اب وہ نرمی غائب ہو گئی، محض جسمانی بلکہ حیوانی پہلو پر زور دیا گیا۔ یہ رجحان اس دور کی نمائندگی کرتا ہے جب لوگ جنسی تفتیش کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس وقت جذبات کا سوز و گداز اس کے لئے کوئی معنے نہیں رکھتا اور وہ ہر جنسی مظہر کو خالص جسمانی معاملہ سمجھتا ہے۔ اس عمر میں لڑکے کے لئے یہ انداز فکر انتہائی حقیقت پر مستند ہوتا ہے، اور وہ اس پر فخر بھی کرتا ہے پھر جنسی جذبات کو خالص جسمانیت تک محدود کر دینے کے بعد لڑکے میں جنس اور جسم سے بیزاری پیدا ہو جاتی ہے اور گھن آنے لگتی ہے۔ چنانچہ اس دور کے افسانوں میں ہی جنسی حصہ ناقص ملتے ہیں۔ لیکن یہ ذہنیت متوازن اور پختہ نہ تھی، مریضانہ ہر گز نہیں ہے۔ یہ جنسی تفتیش ہر قسم کے علمی اور روحانی تجسس کی بنیاد بن سکتی ہے۔ یہ رویہ اختیار کر کے ہمارے افسانوی ادب نے کم سے کم آنکھ تو کھولی تھی، خواب خرگوش سے تو بیدار ہوا تھا۔ اب سے سات آٹھ سال پہلے بعض حضرات نے نئے ادیبوں کو بلوغت ہاتھی کا طعنہ دیا تھا۔ یہ طعنہ بالکل درست ہے، لیکن اسی بلوغت ہاتھی کے طفیل ادیبوں میں اتنی جان آئی تھی کہ زندگی کے ہر پہلو سے دلچسپی لیں، خوش آئند خواب نہ دیکھیں۔ بلکہ ہر چیز کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کریں، سیاست میں دلیری اور جرأت سے کام لیں، اپنے سیاسی مسائل کو دنیا کے معاشی اور سیاسی پس منظر میں دیکھیں۔ اس بلوغت ہاتھی نے ہمارے ادیبوں کو دو بڑی باتیں سکھائیں، حقیقت بینی اور صاف گوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے ان سے کام کتنا لیا۔ بہرحال یہ دور رجحانات ایسے پیدا تو ہوئے جن کے بغیر جاندار ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ پھر اجتماعی زندگی میں بھی ایسی تحریکات پیدا ہوئیں جو ان رجحانات کو تقویت پہنچا رہی تھیں۔ مسلمانوں نے بھی مجہولیت چھوڑ کر ایک واضح رویہ اختیار کر لیا۔ یہ رویہ غلط ہو یا صحیح، بہرصورت مسلمانوں نے بعض حقیقتوں کو بالکل حتمی طور پر مستبرد کر لیا، اور ان کے بارے میں پوری صاف گوئی سے کام لیا جو نئی قوت مسلمان قوم میں نظر آتی ہے وہی اس دور کے ادب و ادب میں دکھائی دیتی ہے مگر سیاسی اور ادبی تحریکیں دونوں کی دونوں نرمی سے خالی ہیں۔ اگر ادیب اپنے ادبی فرائض کے بارے میں واقعی سنجیدہ ہوتے تو ہمیں لگن تھا کہ پختہ شخصیت کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت ان میں آجاتی، اور وہ جنس کے جسمانی پہلو اور انسانی محبت کے سوز و گداز کو سمو سکتے۔ لیکن بہت سے اسباب ایسے پیدا ہوئے جن کی

وجہ سے ادیبوں کی صحیح نشوونما نہ ہو سکی۔

بنگال کے قحط اور فسادات کے دوران میں ادب حقیقت بینی چھوڑ کر نیک نیتی پر آ رہا ہے۔ اس نیک نیتی کے پیچھے کتنی اذیت پسندی چھپی ہوئی تھی اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ ادیب زندگی کی حقیقتوں سے کترا رہا ہوں گے۔ اب تو وہ خود اپنی حقیقت سے آنکھیں چار کرتے گھبراتے ہیں۔ بہرصورت نیک نیتی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حقائق کو تسلیم نہ کیا جائے۔ لیکن حقائق سے بچنے کے لئے بعض فاحی انتظامات بھی کرنے پڑتے ہیں۔ ان کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا غرض حقیقت بینی کے بعد نیک نیتی آئی اور اس کے بعد خواب آور گی۔ یہ ہے ۱۹۳۶ء سے لیکر اب تک ہمارے افسانوی ادب کی داستان۔

اگر ہمارا ادب صحیح معنوں میں ترقی کرتا تو جنس کے متعلق اتنی حقیقت بیانی کے بعد یہ ہونا چاہئے تھا کہ انسانی تہذیب میں جنسی اقدار نے جو نشوونما حاصل کی ہے ادیب اُسے سمجھنے کی کوشش کرتے، اور اپنے جنسی رویے میں قوت، توانائی، نرمی، ملائمت، نفاست، عظمت کے عناصر لاتے۔ لیکن ہمارے افسانے نے ایک بالکل دوسرا رُخ اختیار کیا ہے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک عام طور پر جو افسانے لکھے گئے ہیں انہیں عشقیہ نہیں کہا جا سکتا، گو ان میں جنسی معاملات کا ذکر فیاضی حیثیت رکھتا ہے لیکن اب پچھلے دو ڈھائی سال سے عشقیہ افسانے پھر نمودار ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ عشقیہ سے مراد وہی رومانوں والا دھیما سا جذباتی ہیجان ہے جس میں اس ہیجان کی جنسی نوعیت کا اقرار کرنے سے پہلو بچایا جاتا ہے۔ یعنی نئے ادب کی تحریک افسانے کو جہاں تک لے آئی وہاں سے آگے بڑھنے کے بجائے ہمارا افسانہ پھر پیچھے کی طرف لوٹ رہا ہے مگر ۱۹۳۶ء سے پہلے کے جذبات پرستی تو لڑکوں کی سی تھی، آج کل افسانے اس طرح کے لکھے جا رہے ہیں جیسے چودہ پندرہ سال کی لڑکیاں بیداری میں خواب دیکھتی ہیں۔ ہمارے بیشتر افسانے نہ صرف معاشرے کی حقیقت سے دُور ہوتے جا رہے ہیں بلکہ جنسی حقائق سے بھی گریز کرتے ہیں جو افسانے ترقی پسندانہ اثرات کے ماتحت لکھے جاتے ہیں ان کی ادبی حیثیت کچھ بھی سہی، اُن میں حقیقت کو کچلنا ہی مسیح کیوں نہ کیا گیا ہو۔ بہرحال ان میں زندگی کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے اور زندگی میں چند تبدیلیاں پیدا کرنے کی دعوت تو ہوتی ہے۔ ترقی پسند افسانے کم سے کم حقیقت سے ٹکر لینے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر یہ نئے عشقیہ افسانہ نگار نہ سیاسی، سماجی، نفسیاتی، جنسی، ہر قسم کی حقیقت سے آنکھیں چراتے ہیں۔ اگر ترقی پسند افسانہ ادب نہیں ہے تو یہ افسانہ بھی ادب نہیں ہے۔ ترقی پسند افسانہ کم سے کم اس بات میں بہتر ہے کہ اتنی مجہول انفعالیت تو پیدا نہیں کرتا۔ ان عشقیہ افسانوں میں جنس کی گندگی سے گھبرا کر رومانیت میں پناہ لینے والی لڑکیوں کے تخیلات میں کتنی مماثلت ہے اس کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ ان کہانیوں کا پس منظر عموماً کوئی غیر ملک ہوتا ہے اور یہ عشق عجیب و غریب ناموں والے درختوں کے سائے میں یا امریکی گاؤں کی ٹال پر پروان چڑھتا ہے۔ انجام ہمیشہ عشق کی شکست اور آنسوؤں پر ہوتا ہے۔ یہ ذہنیت سو فی صدی اسکول کی لڑکیوں کی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھئے کہ ہمارے ادب میں یا ہمارے مزاج میں نرمی اور نفاست بڑھتی جا رہی ہے۔ کوئی سماجی مظہر اپنی جگہ اکیلا نہیں ہوتا، اس کا تعلق دوسرے مظاہر سے بھی ہوتا ہے۔ اور انہی کے ساتھ مل کر اس میں پورے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو افسانوں میں یہ رونا دھونا اور رسوز و گداز ہے۔ دُوسری طرف جو فلمیں مقبول ہو رہی ہیں ان کی کیفیت ہی اور ہے۔ ایسی فلمیں لڑکوں کو بہت پسند آتی ہیں جن میں ہیرو ہیروئن سے بدسلوکی کرے اور اُسے اپنا غلام بنا کر رکھے۔ بلکہ بعض فلموں کا اشتہار تو اس طرح دیا جاتا ہے کہ اس میں ہیرو ہیروئن کو پیٹتا ہے۔ ان فلموں اور مذکورہ بالا افسانوں سے اثر لینے والے تقریباً ایک ہی ہیں۔ ان دو چیزوں کو ساتھ ملا کر دیکھئے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے متوسط طبقے میں فاعلی اور مفعولی دونوں قسم کی ایذا پرستی بڑھ رہی ہے، لیکن وہ اس سے واقف نہیں ہونا چاہتا۔ یہ عشقیہ افسانے اس ایذا پرستی پر پردے کا کام دیتے ہیں۔ لیکن ایسے خطرناک رجحانات اندھیرے میں اور تیزی سے پلتے ہیں۔ اگر ہمارے ادب میں پہلے کی طرح حقیقت بینی اور صاف گوئی کا مادہ ہوتا تو کم سے کم ہمارا شعور ان رجحانات سے واقف تو ہو سکتا۔ اب یہ زہر اندر ہی اندر پک رہا ہے اور خدا جانے ہمارے معاشرے کے لئے اس سے کیا نتیجے نکلیں گے۔ اگر اور کچھ نہ ہوا تو بھی یہ کیا کم ہے کہ ایسے ادب کے زیر اثر آنے والا طبقہ صحیح قسم کی جنسی تسکین کا تصور اپنے ادب سے اخذ نہ کر سکے، اور یا تو لڑکپن کی جذبات پرستی میں پڑا رہے یا جنسی اذیت پسندی کی طرف مائل ہو جائے

ہمارے افسانے میں یہ ترقی مسکوس کیوں ہو رہی ہے؟ ہماری شخصیت میں پختگی آنے کی بجائے لڑکپن کیوں آتا جا رہا ہے؟ اس کی نفسیاتی وجوہ

تو بہت کچھ ہوں کی مگمان کی تفتیش کی اہلیت مجھ میں نہیں۔ بہ صورت سماجی اسباب کا سمجھنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ ہم نے ابھی آزادی حاصل کی ہے، بلکہ ایک نیا ملک اور نئی قوم بنائی ہے۔ ایسی صورت میں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہماری ذہنی دلچسپیاں اور سنجیدہ تفکر کی عادت بڑھتے، ہم اپنے معاشرے کو معاشی انصاف اور سماجی مساوات کی بنیادوں پر تشکیل دینے کی تجویزیں سوچیں لیکن ہوا یہ ہے کہ ہم نے آزاد ملک کے باشندوں کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ سری طرف حکومت کو یہ پسند نہیں کہ عام آدمی رموز مملکت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ملک کی سیاسی حالت کے متعلق رائے قائم کرتے ہی آدمی کمیونسٹ بن جاتا ہے آئینی طور پر ملک میں آزادی رائے ہو یا نہ ہو، عملی اعتبار سے عموماً لوگ اس جمہوری حق کو استعمال کرتے ہوئے گھبرانے لگتے ہیں کیونکہ ہمارے یہاں حب الوطنی کی ایسی شدت ہے کہ غداری کی بو دور سے آجاتی ہے۔ جب سماجی حقیقتوں کے سمجھنے سمجھانے میں ایسی دشواریاں ہوں تو ذہن جنسی تصورات میں پناہ لیتا ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ حال ہے کہ ذرا کسی جنسی فعل کا ذکر کر دیجئے اور فحاشی کے جرم میں کھنچے کھنچے پھریئے۔ غرض دسیاست کے متعلق صاف گوئی سے کام لے سکتے ہیں نہ جنس کے متعلق۔ بالغ نظر کے افسانوں کی جتنی دلچسپیاں ہیں ان سب کو ڈر کے مارے ادب سے خارج کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ادیب بے چارے سکڑ سمٹ کے اسکول کی لڑکیاں نہ بنتے چلے جائیں تو اور کیا ہو۔۔۔۔۔ لیکن کیا بالغ انسان اطمینان کے ساتھ لڑکیاں بنے رہ سکتے ہیں؟ اگر وہ اس پر قانع نہیں رہ سکتے تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہ بسورڈ پرم کا معاملہ ہے۔ بہر حال اگر اس میں نفسیاتی رجعت کا نتیجہ ناخوشگوار نہ نکلے تب بھی یہ سوچنے کی بات ہے کہ ایک نئے آزاد اور جمہوری ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کا اس طرح بچوں کی سطح پر اترنا ملک کے لئے اور اس کے مستقبل کے لئے کس حد تک فائدہ مند ہے؟ ایک ادبی بحث ہمیں اس جگہ لے آئی ہے۔ جہاں بات ادب سے بہت دور نکل گئی ایک معمولی مضمون نگار اتنے بڑے سوال کا کیا جواب دے۔ یہ تو ان لوگوں کے سوچنے کی بات ہے جو ملک اور قوم کے مستقبل کے لئے خاکے تیار کرتے ہیں۔

(نقوش ۲۵، ۲۶)

اُردو افسانے میں روایت اور تجربے

(سمپوزیم)

حصہ لینے والے:

سعادت حسن منٹو احمد ندیم قاسمی سید وقار عظیم ڈاکٹر عبادت بریلوی

ہاجرہ مسرور خدیجہ مستور انتظار حسین شوکت تھانوی حمید اختر۔

یہ سمپوزیم اس سے پہلے بھی نقوش کے ایک افسانہ نمبر میں چھپ چکا ہے۔ اس نمبر میں اسے دوبارہ پیش کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ اس نمبر میں اس کی مقبولیت بعض کوتاہیوں کے باوجود ناگزیر تھی۔

آخر میں تین چار افسانہ نگاروں پر ندے تفصیلی تبصرہ ایڈ کر دیا گیا ہے۔

مدیر نقوش نے کہا۔۔۔ آج کی نشست کا مقصد یہ ہے کہ ہم اردو افسانہ میں روایت اور تجربے کے عنوان کے ماتحت گفتگو کریں۔

احمد ندیم قاسمی ۔ پہلے وہ صاحب بولیں جنہیں اس کا تجربہ ہو۔

سعادت حسن منٹو ۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ کو افسانے سے بحث ہے یا افسانہ نگار سے؟ دوسری بات یہ کہ افسانے کی روایت کو زیادہ تر دور سے TRACE کرنا پڑے گا۔

عبادت بریلوی ۔ ہم ان افسانوں کی روایت سے بحث کریں گے جو اردو میں لکھے گئے۔

ندیم ۔ منٹو صاحب کا یہ کہنا کہ ہر افسانہ نگار کی ایک روایت ہے، صحیح ہے لیکن یہی روایت آگے چل کر افسانے کی روایت بن جاتی ہے۔ بر بنائے وہ دور کے افسانوں سے پہلے جو اردو افسانے لکھے گئے ہیں ان کی ہیئت کے اعتبار سے جو صورت مرتب ہوتی ہے ہم اسی کو بنیاد بنا کر بحث کریں گے۔ ذاتی اسٹائل کو بھی اسلوب اور روایت کہہ سکتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ بنیادی طور پر ہر صنف ادب کے کچھ فنی لوازم ہوتے ہیں۔ یہی لوازم اس صنف اور دوسری اصناف میں فرق و امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ یہی صورت افسانے کی ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ جب ہمارے پہلے افسانہ نگار نے افسانہ لکھا تو کن چیزوں کو بنیاد بنایا اور پھر آگے چل کر نئے تجربوں کے ذریعہ اس میں کیا اضافے ہوئے؟

منٹو ۔ لیکن پرانے زمانے میں جو لوگ افسانے لکھتے تھے کیا وہ ان روایات پر قائم رہتے تھے۔۔۔ میرے خیال میں تو ان کے درمیان حد فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔

وقار عظیم ۔ ہر تجربہ آگے چل کر روایت کا جزو بن جاتا ہے اور جب وہ روایت بن جاتا ہے تو آگے آنے والے وقت کے تقاضوں کی بنا پر نئے تجربے کرتے ہیں اور بنتے ہوتے یہ بھی روایت کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ندیم ۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اردو افسانے کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور کیا اردو افسانے کی روایت اتنی وسیع ہے کہ ہم اس پر بحث کر سکیں۔ غالباً اردو افسانے کی ابتدا اسی صدی میں ہوئی ہے اور ہمارے ابتدائی افسانہ نگاروں میں سلطان حیدر جوش، پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری شامل ہیں۔۔۔ اور ہمیں ان کے ساتھ آج کے افسانہ نگاروں کا تعلق قائم کرنا ہے۔

وقار عظیم ۔ اس طرح بات یہاں آکر ٹھہری کہ ہمارے ابتدائی افسانہ نگار سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری ہیں۔۔۔

منٹو ۔ سجاد حیدر کو میں افسانہ نگار نہیں مانتا کیونکہ وہ سب ترجمے کرتے رہے ہیں۔

وقار عظیم ۔ انہوں نے ترجمے ضرور کئے ہیں لیکن طلسم اور افسانے بھی لکھے ہیں۔

ندیم ۔ تو سب سے پہلے ہمیں یہ تعین کر لینا چاہئے کہ اردو افسانے کی روایت وہیں سے شروع ہوتی ہے یا اس سے بھی پہلے۔

منٹو۔ افسانے کی روایت تو وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے کہانی کہانیاں شروع ہوتیں۔

وقار عظیم۔ لیکن ہماری بحث کا تعلق اردو افسانے سے اور خاص کر مختصر افسانے سے ہے۔

منٹو۔ پہلے یہ جاننا چاہوں گا کہ افسانہ ہوتا کیا ہے؟

انتظار حسین۔ خانہ پریم چند سے۔ افسانے کی باقاعدہ روایت قائم ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کے زمانے میں افسانے کا کیا تصور تھا۔ اور پھر اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ بعد کے لکھنے والوں نے اس سے کیا انحراف کیا۔

عبادت۔ یوں تو افسانہ ہر کہانی کو کہتے ہیں لیکن مختصر افسانے کے چند فنی لوازم ہوتے ہیں۔ مثلاً وحدت تاثر، وحدت ہیئت اور مواد کی فنکارانہ ترتیب وغیرہ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ افسانے کی یہ روایت کب سے قائم ہوئی۔ پریم چند سے یا اس سے پہلے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ مختصر افسانہ خود یورپ میں بھی بہت بعد کی پیداوار ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے درمیان سے پہلے اس کا وجود باقاعدہ ایک صنف کی صورت میں نہیں ملتا۔ البتہ اس کی روایات دوسری اصناف ادب میں نظر آتی ہیں — مثال کے طور پر انگریزی شاعری میں BALLAD کی جو صنف ہے اس میں مختصر افسانے کا سا انداز مل جاتا ہے۔ اسی طرح اردو میں جو داستانیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی جگہ جگہ ایسے حصے ہیں جن میں مختصر افسانے کی روایات تلاش کی جا سکتی ہیں مثلاً سرشار کے فسانۂ آزاد میں 'در میر حسن کی باغ و بہار میں یہ چیز ضرور موجود تھی۔ بعد میں اس پر مغرب کا اثر بڑا ہونے کی وجہ سے مختصر افسانے نے تیزی سے ترقی کی اور موجودہ ہیئت تک پہنچ گیا۔ اس عرصے میں مختصر افسانہ بیسیوں تجربات کی منزلوں سے گزرتا گیا اور اس طرح اس میں روایات صورت پذیر ہوتی گئیں۔ آج بھی روایات اور مختصر افسانے کا مطلب ہیں — اگر کہا جائے کہ کر میرے اندازہ لگائے ہیں کہ مختصر افسانہ کیا ہے اور اس کی بنیادی کن اصولوں پر قائم ہیں؟

منٹو۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مختصر افسانہ کے رولز کس اصول کے تحت ہیں؟

وقار عظیم۔ ہمارے افسانے نے موجودہ ہیئت مغرب کے اثر کے تحت حاصل کی لیکن اس میں ہماری قدیم کہانیوں اور داستانوں کی خصوصیات بھی شامل ہیں اور ان دونوں کے امتزاج سے ہمارا افسانہ بنا ہے۔ مغرب کا افسانہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ افسانہ میں ایک چیز کے متعلق کوئی بات کہی جائے اور اس کا ایسا اثر ہو کہ اس میں اختصار، ربط، یہ چیزیں ہم نے مغرب سے لی ہے۔ ایک واحد تاثر یا مقصد افسانہ کا اصل موضوع ہے۔

منٹو۔ ایک تاثر کو خواہ وہ کسی کا ہو اپنے اوپر مسلط کرنے کے لئے اس انداز سے بیان کر دینا کہ وہ سننے والے پر بھی وہی اثر کرے، یہ افسانہ ہے۔

وقار عظیم۔ جی ہاں! — جب افسانے کی ایک تعریف متعین ہو گئی تو اسے سامنے رکھ کر یہ دیکھنا ہے کہ ابتدائی افسانہ نگار کس حد تک اس معیاری بات کو پورا کرتے ہیں اور کس حد تک داستانوں سے متاثر ہیں۔

عبادت۔ پریم چند کے یہاں افسانے کی جو روایت ملتی ہے اس میں بنیادی داستانوں کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ پریم پچیسی، پریم بتیسی اور پریم پچاسی کے بیشتر افسانے اسی انداز میں کہے گئے ہیں اور مختصر افسانے کی تکنیک کے معیاری اصولوں کا پوری طرح لحاظ نہ رکھنا انہی داستانوں کی تکنیک سے متاثر ہونے کا ثبوت ہے۔ ان کے بعد کے افسانوں میں یہ بات نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ مختصر افسانے کی خصوصیات کو برتنے لگتے ہیں۔

وقار عظیم۔ لیکن پریم پچیسی اور پریم بتیسی کے افسانے پریم چند کے ابتدائی افسانے نہیں۔ حقیقت میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" نہ صرف ان کی افسانہ نگاری کی بلکہ ہمارے افسانے کی بنیاد ہے۔ اس میں پانچ افسانے ہیں جو تمام کے تمام داستانوں کے رنگ میں نگری مقصدیت کے حامل ہیں۔ کرداروں کے نام تک میں یہی رنگ موجود ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کا وہی تصور ہے جو داستانوں میں تھا۔ انداز بیان شروع سے آخر تک شاعرانہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کے ہر افسانے میں ایک واحد مقصد ہے جسے بڑی کامیابی سے داستانی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ پس منظر بالکل داستانوں کا سا ہے۔ افسانہ نگار کے پیش نظر ایک خاص مقصد ہے جسے وہ ناظر تک پہنچانا چاہتا ہے وہ بار بار اس کی تکرار کرتا ہے۔ کبھی یہ اعادہ بُرا معلوم ہوتا ہے اور کبھی اس میں لطف آجاتا ہے لیکن افسانہ نگار کو اپنا مقصد اتنا عزیز ہے کہ وہ تکرار کے برا ہونے کو محسوس بھی نہیں کرتا۔

عبادت۔ لیکن یہ بات تو یقینی ہے کہ پریم چند کی یہ مقصدیت جو "سوز وطن" کے افسانوں میں ملتی ہے وہ مغرب کے اثرات کا نتیجہ نہیں تھی اس میں ایک انفرادیت ہے۔ بہرحال ان افسانوں کی تکنیک پہلی داستانوں کا سا تک غالب نظر آتا ہے۔

ندیم۔ میرے خیال میں اگر وہ افسانہ جو داستانوں سے الگ ہوا ہے تو اس میں افسانہ نگاروں کے دو گروہ تھے — ایک وہ جو یورپی اور ہندوستانی ماحول کو پیش کرتے تھے۔ دوسرے وہ جو پریم چند کی طرح سوسائٹی کی خرابی کی طرف اشارہ کرتے اور ان کے اصلاحی پہلو پیش کرتے تھے۔ ہمیں اس اصلاحی پہلو کو ہی پیش نظر رکھنا چاہئے کیونکہ یہ اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا نتیجہ تھے۔

وقار عظیم ۔ سلطان حیدر جوش اور پریم چند دونوں کا سیاسی ماحول ایک سا تھا لیکن مسلمانوں پر سرسید کی تحریک کا ردِ عمل یہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم اور مغربی معاشرت سے متنفر نظر آتے تھے اور ہندوؤں کا زاویۂ نظر خالص سیاسی تھا۔ مثلاً پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" اسی سیاسی رجحان کا حامل ہے۔ اس افسانہ کی ابتدا، خاتمے اور اس کے دوسرے حصوں کا انداز بالکل داستانوں کا سا ہے یہی رنگ اس مجموعہ کے دوسرے افسانوں کا ہے ———

اس کے برعکس سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں مسلمان تعلیم یافتہ لڑکیوں اور مغرب زدہ نوجوانوں کی معاشرتی اور اخلاقی زبوں حالی کا کوئی نہ کوئی پہلو پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند اور سلطان حیدر جوش دونوں کے افسانے مقصدی ہیں لیکن دونوں میں یہی بنیادی فرق ہے۔

عبادت ۔ اب ایک سوال یہ ہے کہ پریم چند نے جو روایت قائم کی اس میں انہوں نے مغرب سے اثر لیا ہے یا نہیں۔

وقار عظیم ۔ پریم چند نے خود بھی لکھا ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں میں داستانوں کا رنگ ہے ——— وہ بچپن میں چھپ چھپ کر طلسم ہوشربا پڑھتے تھے۔ بڑے ہو کر ٹالسٹائی کا مطالعہ کیا اور اس کی سادگی اور سلاست کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ دوسروں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے زیادہ تر قیاس آرائی پر مبنی ہے۔

عبادت ۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔

منٹو ۔ کیا طلسم ہوشربا میں مقصدیت اور افادیت نہیں تھی؟

وقار عظیم ۔ ضرور تھی۔

منٹو ۔ ایچ۔ جی۔ ویلز اور طلسم ہوشربا میں کیا فرق ہے؟

عبادت یہ الگ سوال ہے۔

منٹو ۔ ہم مقصدیت پر زور دیتے ہیں اور دوسری چیزوں کو مکھن کہتے ہیں لیکن ایچ۔ جی۔ ویلز نے سائنس کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس کا جھوٹ تخلیقی جھوٹ تھا اور افسانے سے جھوٹ نکالا نہیں جا سکتا۔

ندیم ۔ ایچ۔ جی۔ ویلز اور طلسم ہوشربا میں FANTASY ایک قدر مشترک ہے صرف دور کا فرق ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ بحث تو بڑی دلچسپ لیکن ہمارے دائرہ گفتگو سے باہر ہے میں نے جو طلسم ہوشربا کا نام لیا وہ محض اس لئے کیا کہ پریم چند نے اس سے اثر قبول کیا۔

ندیم ۔ اب یہیں پریم چند کے "سوزِ وطن" سے افسانے "کفن" تک یہ طے کرنا ہے کہ اس سے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

وقار عظیم ۔ پہلے مقصد اصلاحی تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سے انحراف کس نے کیا اور اس کے کیا اثرات ہوئے اور مقصدیت کے نقطۂ نظر سے سجاد حیدر یلدرم، حجاب امتیاز علی اور پریم چند میں کچھ فرق ہے یا نہیں۔

ندیم ۔ سجاد حیدر ان سے الگ ہیں۔

عبادت ۔ خود پریم چند کے افسانوں میں یہ بات ہے کہ وہ خالص مقصدیت کے حامل نہیں بلکہ ان کے ہر دور کے افسانوں میں زندگی کو سمجھنے اس کو برتنے اور اس کو بہتر بنانے کا خیال بھی ملتا ہے خصوصاً ان کے بعد کے افسانوں میں یہ سماجی اور اصلاحی پہلو کچھ اور بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ یہ چیز بعد کے افسانوں میں آتی ہے۔

عبادت ۔ البتہ انسانی زندگی کے بنیادی تقاضوں کو سب سے پہلے سجاد حیدر یلدرم نے پیش کیا ہے۔ مثلاً "نیلستان" کے بعض افسانوں میں یہ بات ملتی ہے۔ خارا اور نسرین نوش کی کہانی اگرچہ ایک رومانی فضا لئے ہے لیکن اس کا موضوع انسانی زندگی کی ایک نفسیاتی حقیقت ہے ——— یعنی مرد اور عورت کا جذباتی اور جسمانی رشتہ!

وقار عظیم ۔ سجاد حیدر پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ خیال عام کیا کہ اصلاحی مقصد افسانے کے فن کو مجروح کرتا ہے۔ آگے چل کر پریم چند نے بھی مقصدیت اور اصلاح کے ساتھ فن پر بھی توجہ دی۔

عبادت ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کے افسانے انقلاب سے قبل کے ترکی افسانے کے زیر اثر لکھے گئے ہیں۔ اس دور کے ترکی ادب اور خصوصاً افسانے پر جذباتیت اور رومانیت کا غلبہ تھا۔ یہ رومانیت یلدرم کے یہاں بھی ملتی ہے۔ لیکن بیشتر افسانے میں انہوں نے ایک رومانی فضا قائم کی ہے جو ان کی تکنیک کا ایک بنیادی جزو بن گئی ہے ——— اس کو نکال لیجئے تو سجاد حیدر یلدرم کے یہاں کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

وقار عظیم ۔ کیا نیاز فتح پوری اور یلدرم کی رومانیت میں کوئی مماثلت ہے؟

ندیم ۔ یلدرم نے افسانے کی ہیئت میں بڑی تبدیلی کی ہے۔ اس وقت تک افسانے میں پلاٹ کا التزام تھا لیکن انہوں نے کردار نگاری کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھایا اور ایسے SKETCHES لکھے جن میں صرف ایک کردار ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ صحیح ہے ——— موضوع کے اعتبار سے جو سب سے اہم بات ہے وہ یہ کہ سلطان حیدر جوش اور پریم چند نے معاشرتی اور سیاسی پہلو لئے ہیں لیکن یلدرم نے ایسے موضوع اپنائے جو زندگی سے تعلق رکھتے تھے

اس طرح موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے نئے تجربے کئے۔

انتظار حسین۔ بہر حال ان میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ زندگی کے تسلسل کے قائل تھے اور موجودہ مختصر افسانے کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے تسلسل کی منکر ہے۔ اس میں ایک الگ حادثہ ہے جسے زندگی سے کوئی ربط نہیں۔

عبادت۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو روایت یلدرم نے قائم کی اس کے بعد نیاز فتحپوری اور ل احمد نے اس میں کوئی اضافہ کیا یا نہیں؟

وقار عظیم۔ نہیں ——— ان لوگوں نے اور مجنوں گورکھپوری نے افسانہ کسی مقصد کی خاطر نہیں بلکہ اسے کہانی سمجھ کر لکھا۔

ندیم۔ لیکن اس سے پہلے پریم چند کے آخری افسانے کا میاب تکنیک پر کیسے پہنچے میرے خیال میں انہوں نے مغربی افسانوں سے اثر قبول کیا۔

عبادت۔ پریم چند کی کہانی 'کفن' میں ان کے ابتدائی افسانوں کی تکنیک سے بڑا انحراف ہے اور اس میں مغربی افسانوں کی تکنیک کا اثر پایا جاتا ہے۔

وقار عظیم۔ 'کفن' افسانہ نگار کے مخصوص رجحانات کے ذہنی ارتقا کی ایک شکل ہے اس لئے ہمیں اس کے بعد کے افسانوں پر غور کرنا چاہئے۔

عبادت۔ "انگارے" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی ہے اور اس میں شامل ہونے والے افسانہ نگاروں پر بھی پریم چند کا خاصا اثر معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک خود پریم چند جہاں تک تکنیک کا تعلق ہے بڑی حد تک بدل چکے تھے۔

ندیم۔ اثر کہیں نہ ہو ——— اگر ہم اس سے انکار کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کہیں روایت کے تسلسل سے انکار ہے۔

انتظار حسین۔ ہمیں یہ نہیں دیکھنا ہے کہ انہوں نے پریم چند سے کتنا اثر قبول کیا بلکہ یہ کہ اس سے انحراف کس طرح کیا۔

وقار عظیم۔ "انگارے" کے افسانوں میں ہندوستانی زندگی کی مسلمہ قدروں کو توڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ چیز پریم چند کے یہاں نہیں۔

عبادت۔ "انگارے" کے افسانوں میں جو شدت ہے وہ انقلابی ہے لیکن اس میں کسی نہ کسی حد تک پریم چند کا اثر ضرور ہے۔ ویسے ایک بات یہ بھی ہے کہ 'انگارے' کے افسانہ نگار نوجوان تھے۔ ان کے خون میں گرم لہو تھا۔ بغاوت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنے فن میں ایک شدت کو پیدا کیا ——— لیکن ان کی اس انتہا پسندی نے فن کو ٹھیس پہنچائی۔

وقار عظیم۔ لیکن یہ ایک تجربہ تھا اور خود اس کے مصنف آگے چل کر بہت کچھ سنبھل گئے۔

ندیم۔ جی ہاں! بعض تو بالکل ہی بدل گئے۔

وقار عظیم۔ پھر بھی "انگارے" کے ان مصنفوں نے جہاں جہاں روایت سے شدت کے ساتھ انحراف کیا وہ آگے چل کر فن کے لئے مضر ثابت ہوئی۔

عبادت۔ لیکن یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ "انگارے" کے لکھنے والوں نے اردو کے افسانہ نگاروں کو بے جھجک نشتر زنی کا انداز سکھایا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ بعد کے افسانہ نگاروں نے اپنے فن میں شدت اور بے باکی پیدا کی۔ شاید ہی سوسائٹی کا کوئی ایسا پہلو ہو جس پر انہوں نے شدت اور بے باکی کے ساتھ قلم نہ اٹھایا ہو۔ مثال کے طور پر ہم اس سلسلے میں رعایت حسن فٹواور عصمت چغتائی کو پیش کر سکتے ہیں۔

وقار عظیم۔ لیکن منٹو 'انگارے' کی شدت سے متاثر نہیں ہوئے۔

منٹو۔ میں نے 'انگارے' پڑھی بھی نہیں۔

انتظار حسین۔ 'انگارے' نے ایک غلط روایت کی طرح ڈالی۔ بعد میں آنے والوں نے یہ سمجھا کہ افسانہ میں سنسنی کی ضرورت ہے۔

عبادت۔ بات یہ ہے کہ وہ زمانہ سیاسی دہشت پسندی کا زمانہ تھا اور ان افسانوں میں جو شدت پیدا ہوئی اس میں ماحول کی اس کیفیت کا بھی اثر ہے۔ ویسے ہر تجربے میں شروع شروع شدت اور انتہا پسندی ہوتی ہے ——— بعد کے لکھنے والوں نے اس شدت اور انتہا پسندی میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ندیم۔ میرے خیال میں انگارے کی سنسنی کی روایت غلط ہے کیونکہ بعد میں لکھنے والوں نے اسے روایت کا جزو نہیں بنایا اور اس سے انکار کیا۔ ممکن ہے انگارے کا مثالیں مل جائیں لیکن بہ حیثیت مجموعی نہیں۔ عصمت، منٹو وغیرہ کسی نے بھی شعوری طور پر یہ کوشش نہیں کی۔

انتظار حسین۔ لیکن ہم افسانے میں آج بھی شدت INTENSITY ڈھونڈتے ہیں جو مختصر افسانے کی خوبی نہیں۔

منٹو۔ شدت کس چیز کی؟

وقار عظیم۔ شدت احساس کی۔

منٹو۔ یہ تو افسانے کی بنیادی چیز ہے۔

عبادت۔ غالباً انتظار صاحب کا مقصد یہ ہے کہ "انگارے" میں سماجی موضوعات پر جارحانہ انداز میں جو روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کو پیش کرتے ہوئے طنز اور نشتر زنی کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ جی ہاں ——— یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کن باتوں کا ذکر ضروری ہے اور کن کا نہیں ——— مثلاً جنس کے بارے میں خاصی بے اعتدالی کا ثبوت دیا گیا ہے۔

منٹو۔ جنس کے بارے میں تو اس سے پہلے بھی کافی کچھ لکھا جا چکا تھا مثلاً داستانوں میں۔

عبادت۔ لیکن داستانوں میں جن جنسی موضوعات کا تذکرہ ہے ان کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں تو وہ ایک طرح کی لذت پرستی اور تعیش پسندی کا نتیجہ ہیں۔ "انگارے" کے افسانوں میں یہ بات نہیں۔ ان میں جنسی موضوعات کا ذکر زیادہ ہے لیکن "انگارے" کے افسانوں کے موضوعات صرف اسی حد تک محدود نہیں ہیں۔ ان میں سماجی زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے آگے چل کر تنوع کے اس رجحان کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

وقار عظیم۔ ایک طرف 'کفن' دوسری طرف 'انگارے' ——— دونوں کو سامنے رکھ کر ہمیں آگے بڑھنا ہے ——— پریم چند نے ہمیں یہ بتایا کہ ہمیں زندگی کے متعلق کس طرح لکھنا چاہئے حیثیت کے اعتبار سے اس مجموعہ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر نئی راہوں کو اپنانا چاہئے اور یہ کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر بڑے سے بڑا افسانہ لکھا جا سکتا ہے، اس طرح ہم ۱۹۳۵ء تک پہنچ چکے ہیں۔ بعد میں یہی رجحان منٹو کرشن چندر اور ندیم میں پیدا ہوا کہ وہ جس معاشرے میں رہتے بستے ہیں اسی کے متعلق لکھیں۔

ندیم۔ روایت کی بحث یہاں ختم تو نہیں ہو جاتی۔

وقار عظیم۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

عبادت۔ نئے لکھنے والوں نے خاصے تجربے کئے ہیں بیشتر اور موضوع دونوں کے اعتبار سے نئے لکھنے والوں نے اپنے ہنروں میں کشادگی پیدا کی ہے اور زندگی کی کشمکش کو نئے زاویوں سے دیکھا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی انہوں نے تکنیک کو نکھار دیا ہے اور یہ چیز پڑھنے والوں پر زیادہ اثر کرتی ہے۔ "انگارے" کا کنوئیں زیادہ وسیع نہیں اور اس میں ایک قسم کی جھجھاہٹ پائی جاتی ہے بعد میں آنے والوں نے "انگارے" کے افسانوں کے مقابلے میں اپنے ماحول کی زیادہ وسیع اور باشعور ترجمانی کی ہے۔ جذباتی رومانیت کی تحریک نے جو رجحان پیدا کیا تھا وہ اور زندگی کی باشعور ترجمانی کا رجحان دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ رومانیت کی اہمیت سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے خصوصیت کے ساتھ جب یہ رومانیت ہمارے یہاں جذباتیت کی حدود سے باہر نکلتی ہے تب تو اس کی اہمیت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانے رومانیت کے اس تیور کو پیش کرتے ہیں۔

ندیم۔ اردو افسانہ ۱۹۳۵ء تک جو تھا اس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان میں دو لکھنے والے بہت نمایاں ہیں عصمت اور منٹو۔

وقار عظیم۔ اس میں احمد علی، حیات اللہ انصاری، بیدی اور ندیم بھی شامل ہیں۔

ندیم۔ ان پر اگر ایک نظر ڈال لی جائے تو یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس دور تک افسانہ کہاں پہنچ چکا ہے۔

عبادت۔ حیات اللہ انصاری اور احمد علی کے ہاں ایک خاص قسم کی واقعیت اور حقیقت نگاری REALISM ہے۔

وقار عظیم۔ یہ رجحان تو ہر افسانہ نگار کے ہاں ہے کہ وہ زندگی کو ایک خاص قسم کی حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھتا ہے ——— مثلاً کرشن چندر کے افسانے کشمیر اور بمبئی سے متعلق ہیں ——— منٹو بمبئی کے متعلق لکھتے ہیں ——— ندیم پنجاب کی عکاسی کرتے ہیں۔ بیدی کے افسانوں کے کردار لاہور میں سانس لیتے ہیں۔

انتظار حسین۔ اس طرح دو گروہ پیدا ہو جاتے ہیں کرشن، ندیم، جن کا انداز تحریر شاعرانہ ہے۔ دوسرے احمد علی، منٹو۔

ندیم۔ مجھے احمد علی اور منٹو میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ مثلاً احمد علی کے "ہماری گلی" اور "قید خانہ" میں بڑی حد تک قسم کی انفرادیت ہے

وقار عظیم۔ لیکن ان سب نے ایک محدود دائرے میں رہ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ بین الاقوامی حالات کا اثر ہمارے ماحول پر کیا ہے خصوصاً منٹو اور کرشن نے ——— یہ بات پہلے نہیں تھی۔

عبادت۔ احمد علی اور حیات اللہ انصاری کی حقیقت نگاری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

وقار عظیم۔ وہ ایک خاص ماحول سے باہر نہیں نکلتے۔ عصمت بھی ایک خاص ماحول کی عکاسی کرتی ہیں ——— وہ ماحول جس کی تفصیلات کا انہیں اچھی طرح علم ہے۔

عبادت۔ لیکن منٹو اور ندیم کے ابتدائی افسانوں میں بین الاقوامی حالات اور سیاسی شعور کا کوئی گہرا اثر نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ یہ ممکن ہے۔ ندیم کے انداز بیان میں شعریت گھلی ملی ہے اور وہ دیہاتی فضا کو سیدھے سادے رنگ میں پیش کرتے ہیں لیکن جہاں وہ سیاہی کا ذکر کرتے ہیں وہاں اسیر جنگ کے اثرات ضرور واضح ہیں۔

ندیم۔ سوال یہ ہے کہ منٹو کے ابتدائی افسانوں میں بھی جو وسعت اور بین الاقوامیت کی فضا ہے اس کا وجود کیسے ہوا۔ ان کے فن کے ابتدائی زمانہ میں موضوع اور مواد کے اعتبار سے وسعت کیسے پیدا ہوئی؟

منٹو۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو افسانہ نگار سمجھا ہے۔ میں نے بہت سے تجربے کئے ہیں جن میں سے کچھ میں تو ناکام رہا ہوں اور کچھ میں کامیاب ———

ندیم۔ میرے خیال میں اس کے کچھ مادی وجوہ بھی ہیں۔ مثلاً مطالعہ ——— مغربی افسانوں کے تراجم ——— وغیرہ۔

عبادت۔ اصل بات تو یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے متنوع پہلوؤں سے فوری تعلق بھی رکھا ہے اور ان میں گھل مل کر انہیں سمجھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی زندگی سے قرب ہے اور اس کی ترجمانی کا سبب بھی یہی ہو سکتا ہے۔

منٹو۔ لیکن میں زندگی کو جیسے دیکھتا ہوں اس کا ویسا اظہار نہیں کرتا بلکہ میں زندگی کو جیسے دیکھنا چاہتا ہوں اس کا اظہار کرتا ہوں ——— اور یہی آرٹسٹ کا نقطۂ نظر ہونا چاہئے۔ میں نے اپنے افسانے "خونیا" میں ایک لکھ پتی کی کہانی لکھی ہے۔ کسی نے کہا لکھ پتی ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔ لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد ہر لکھ پتی بن جاؤ ——— یا یہ بھی ممکن ہے کہ لکھ پتی میں ہی ہوں ———

افسانہ نگار کا کام یہ ہے کہ وہ ایک چیز لکھے اور وہی آپ کو زندگی میں بھی مل جائے ——— وہ ہر کمی کو ۱۱۴۷ء کرتا چلا جاتا ہے ———

وقار عظیم۔ اب تک ہم نے اپنے افسانہ کے ارتقا کی ان ابتدائی منازل کا جائزہ لیا ہے جن سے اردو افسانہ گذرا ہے اس وقت تک بعض رجحانات واضح طور پر نمایاں ہو چکے تھے مثلاً واقعیت کی طرف توجہ، اور یہ چیز سب سے پہلے پریم چند نے شروع کی۔ پریم چند کے اثر سے لکھنے والوں نے اس اسلوب کو اپنایا ——— اس کی مثالیں ہمیں اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور پھر احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانوں میں نمایاں طور پر ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ انہی میں کچھ لوگ ایسے ہوئے جنہوں نے دیہات کو چھوڑ کر شہروں کو اپنا موضوع بنایا۔ مثلاً حامد اللہ افسر اور راشد الخیری وغیرہ لیکن ان میں سب سے نمایاں نام عظیم بیگ چغتائی کا ہے۔ ان سب افسانہ نگاروں کے یہاں ہمیں زندگی سے گہرا رابطہ نظر آتا ہے۔

دوسرا گروہ مجاز، حمید، رشید، رشید جہاں اور ان کے متبعین کا ہے، ان کے افسانے زندگی سے متعلق ضرور ہیں لیکن زیادہ تر رومانی کیفیات کے ترجمان ہیں ——— مثلاً حجاب امتیاز علی اور ل۔ احمد اکبرآبادی۔ یہ زندگی اور رومان دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

بعض لوگ ان دونوں گروہوں سے متاثر ہوئے۔ مثلاً سدرسن کے ہاں پریم چند اور نیاز دونوں کا اثر ہے۔

تیسرا گروہ جہاں سے الگ ہے، نتیجہ کرنے والوں کا ہے ان لوگوں نے رومانی رجحان کو دور کرنے کی کوشش کی یہ زندگی کو رنگین کے ساتھ لے چلنے کے قائل تھے مثلاً خواجہ منظور (ان کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا) اس اثر کے تحت بعض لوگوں نے سوپسان کے اور بعض نے جیمس افسانوں کے ترجمے کئے ——— ان میں ملا رموزی، علی، منٹو، حامد علی خاں، منصور احمد جیسے لوگ شامل ہیں۔

اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ موجودہ روایت پر پریم چند کی روایت، نیاز حمید کی روایت اور ترجمے کرنے والوں کا انداز مجموعی طور پر اثر انداز ہوا۔

پریم چند اور نیاز حمید کے بعد والے دور میں اعظم کریوی اور علی عباس حسینی کے نام بہت نمایاں ہیں اس لئے ہمیں انہی سے بحث

کا تذکرہ نا چاہئے۔

عبادت ۔ علی عباس حسینی اور اعظم کریوی نے پریم چند کے انداز کو اپنایا ہے۔ لیکن حسینی کے افسانوں میں انسانی نفسیات کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ پریم چند اور حسینی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پریم چند کا نقطۂ نظر سیاسی تھا۔ حسینی کی راہ اس سے مختلف ہے۔

عبادت ۔ اسی طرح اعظم کریوی کے ہاں زندگی کی ترجمانی میں نفسیات کی گہرائی شامل نہیں۔ ان کے پاس ایک سیدھا سادا بیان ہے۔

حمید اختر ۔ پریم چند کا انداز نگار ایک خاص قسم کا تھا۔ حسینی کے یہاں بعض ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں مثلاً محبت کی FRUSTRATION اور ازدواجی زندگی کی ناکامی۔

عبادت ۔ حسینی نے وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات کا بڑا ساتھ دیا ہے۔ موجودہ دور میں بھی وہ افسانے لکھ رہے ہیں اور آج کے مسائل کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں خالص رومانی نقطۂ نظر کے علاوہ واقعیت اور حقیقت نگاری کے رجحان نمایاں ہیں۔ ان کے افسانوں میں جو شدت ہے وہ گریز بعد میں پیدا ہوئی ہے، سیاسی نہیں لیکن اس میں سماجی درد اور کسک ضرور ہے۔

وقار عظیم ۔ ایک چیز اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پریم چند نے اپنے فن کے ارتقا میں راہ نما کی حیثیت قائم رکھی۔ علی عباس حسینی ایسا نہیں کر سکے لیکن یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ وہ برابر لکھ کا ساتھ دیتے رہے۔

عبادت ۔ ایک بات اور علی عباس حسینی کے ہاں یہ محسوس ہوتی ہے کہ ان کے پاس زندگی کے بارے میں کوئی بہت واضح اور قطعی نقطۂ نظر نہیں ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک طرح کے سائنٹیفک HUMANIST اور انسان دوست ہیں۔

وقار عظیم ۔ اصل میں ان کی نظر ان مسائل پر ہے جو بالکل ان سے قریب تر ہیں۔ وہ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ ان حالات کے پیچھے کیا حقائق کام کر رہے ہیں۔

عبادت ۔ حسینی صاحب کو میں ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں۔ وہ چونکہ سرکاری ملازمت رہے ہیں اس لئے کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکے جو قابلِ گرفت ہو۔ شاید اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں وہ شدت نظر نہیں آتی اور وہ جارحانہ انداز نہیں ملتا جس کی تخلیقی انفعالی شور کے ہاتھوں بنتی ہے۔

حمید اختر ۔ حسینی اور پریم چند میں فنی اعتبار سے بڑا فرق موجود ہے حسینی کے پاس قاری کو ساتھ لے کر چلنے کی اپیل نہیں ہے پریم چند کے ہاں یہ بات بڑی حد تک پائی جاتی ہے۔

عبادت ۔ حسینی صاحب کے بعض افسانے اہمیت اور تکنیک کے اعتبار سے بڑے مکمل ہیں مثلاً "انسپکٹر کی عید" بڑا نمائندہ افسانہ ہے اور اس طرز کے بہت سے افسانے انہوں نے لکھے ہیں۔

حمید ۔ یہی بات "عید گھر میں" ہے۔

وقار عظیم ۔ ایک اور افسانہ "رقیب" بھی مجھے پسند ہے۔ غالباً اردو میں جاسوسی کے ۔ سے میں یہ غالباً پہلی چیز ہے اس میں "جان" اور محبت اور شخصیت ہے ——— اس کے بعد میں پریم چند فن کے تمام تر شعور کے باوجود اس جوڑ تک نہیں پہنچ سکے۔ پھر انہیں یہاں پر بھی وہ قدرت نہیں تھی۔ اس معاملے میں علی عباس ان سے بہت آگے ہیں۔

عبادت ۔ حسینی صاحب کو ہیئت پر بڑی قدرت ہے۔ وہ تکنیک اور دوسرے فنی لوازمات کو سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں خیال میں تو وہ ایک باشعور لکھنے والے ہیں۔ شاید اس کی وجہ ان کا مغربی مطالعہ ہے۔ اسی مطالعہ نے انہیں افسانے کا انداز بھی بتایا ہے ——— مغربی افسانے کی روایات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اس کا اثر ان کے افسانوں کی تکنیک میں بھی جھلکتا ہے۔

وقار عظیم ۔ حسینی صاحب کو ہر زمانے سے محبت ہے اور انہوں نے ہر زمانے کے آداب اور آپس کے تعلقات کو افسانوں میں بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔

عبادت ۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ان کی تکنیک کو سمجھنے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مراحل ۔ کی بات سمجھنے اور ماننے میں تکنیک کے تنوع کا جو شعور ان کے ہاں ملتا ہے وہ اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے۔

وقار عظیم ۔ اس وقت فن کار واضح نقطۂ نظر رکھنے والوں میں پیدا ہو گیا تھا اور اس وقت افراد کی طرف توجہ شروع ہو گئی تھی۔

عبادت ۔ حسینی صاحب کے ساتھ ہی دوسرا نام اعظم کریوی کا آتا ہے میں ان کے فن کا بھی جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

وقار عظیم ۔ ان کے افسانوں میں رومانی کیفیت زیادہ غالب ہے ۔ اکثر وہ ہیجان کے تعلق لکھتے ہیں تو انہیں زیادہ کشش اسی چیز میں معلوم ہوتی ہے کہ سادوں میں عورتیں کیا لباس

[illegible] ۔ کون سے گنوائے گئے ہیں وغیرہ۔

ندیم ۔ انہیں سے کچھ کہانیاں بھی چن لیں۔

وقار عظیم ۔ اس کی وجہ پریم چند کا اثر ہے۔

عبادت ۔ عظیم کریوی کے ہاں فن کے ارتقار کا پتہ نہیں چلتا ۔۔۔ وہ زندگی کو جس طرح دیکھتے ہیں اسی طرح بیان کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک حد تک NATURALIST کے مماثل ہیں۔

حمید اختر ۔ ۔۔۔ کے بارے میں پریم چند کا جو نقطۂ نظر ہے وہ حسینی کے پاس ہے نہ عظیم کریوی کے پاس۔ پریم چند اکثر وقائع القلابی مضمون کی طرح لکھتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ اور یہ چیز نئے لکھنے والوں کو روایت کی طرح ورثہ میں ملی ہے۔ پرانے لکھنے والوں کا مزاج ادب سے بڑا تعلق ہے۔ مثلاً احمد علی کو۔ کنہیا لال کپور کے افسانوں میں نثر فی۔ روایت اور مغربی ادب دونوں کی نمایاں اثر نظر آتا ہے۔

عبادت ۔ اس دور کے لکھنے والوں میں ہم نے ابھی تک عظیم بیگ چغتائی کا مزہ متعین نہیں کیا۔ حالانکہ اردو افسانے کو جذباتی رومانیت سے نکلنے و حقیقت و واقعیت سے ہم کنار کرنے میں وہ بہت نمایاں ہے ہیں۔

حمید اختر ۔ چغتائی نے افسانوں میں سے رومانیت پسندی کو ختم کیا ہے۔

وقار عظیم ۔ ایک خاص بات جو طرز بیاں سے متعلق ہے۔ ہمارے ہاں ہمیشہ سے بڑی اہم روایت ہی رہی ہے، یہ ہے کہ کہانی کو کہانی کی طرح سمجھنا چاہئے۔ اس روایت کو نئے دور میں عظیم بیگ نے زندہ کیا ہے۔

عبادت ۔ مجموعی طور پر ان کے پاس مختصر افسانہ کے فنی لوازم پوری طرح نہیں ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے بہت واضح ہیں۔ ان میں وحدت تاثر کا احساس بھی کم ہوتا ہے لیکن سماجی حالات کی ترجمانی میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز سے جو ایک جارحانہ فضا پیدا کی ہے وہ بالکل نئی ہے اور اس نے اردو افسانے میں نئی راہیں کھولی ہیں۔

وقار عظیم ۔ ٹھیک ہے ہم انہیں فن کار کی حیثیت سے بڑا افسانہ نگار نہیں سمجھتے لیکن عظیم بیگ کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے لکھنے والوں کو محض اصلاح کے راستے سے ہٹا کر نئے طریقے سے سوچنے کا اسلوب دیا۔ بعد کے افسانہ نگاروں کے ہاں نراخت اور طرح کا جو عنصر ہے وہ چغتائی کے اثر کا نتیجہ ہے۔

عبادت ۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ عظیم بیگ کے اثرات براہ راست یا نا دانستہ طور پر ہمارے نئے لکھنے والوں پر نمایاں ہیں ۔۔۔ عظیم بیگ کے بعد جو نئے افسانہ نگار آئے وہ سب کے سب کسی نہ کسی حد تک چغتائی کی فن کاری کے جارحانہ انداز سے متاثر نظر آتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ اب رہیں بات کر آگے بڑھانا چاہئے۔

عبادت ۔ جی ہاں۔ اب تو ہمیں منٹو، عصمت، بیدی، اشک، کرشن چندر، احمد علی اور حجاب اللہ انصاری ہیں سے ہر ایک کی خصوصیات کے ساتھ یہ دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے نئے تجربوں سے ہماری روایت میں کیا اضافے کئے۔ مثلاً سب سے پہلے منٹو کو لیجئے۔ ان کے یہاں موضوعات میں تنوع ہے لیکن اس کے باوجود وہ صرف دو تین موضوعات پر پوری طرح حاوی ہیں۔ دوسرے موضوعات میں وہ شدت نہیں۔

مثلاً طوائف کی زندگی کی انہوں نے ایسی جزئیات پیش کی ہیں جن سے گمان آتی ہے اور یہ ایک سماجی خدمت ہے لیکن بعض جگہ جنسی موضوعات پر لکھتے لکھتے وہ بھٹک گئے ہیں۔ مثلاً ٹھنڈا گوشت ——

وقار عظیم ۔ یہ بعد کا ہے اس لئے ابھی اس کا ذکر بے محل ہے۔

ندیم ۔ میرے خیال میں ان کی تخلیقات اتنی ہیں کہ انہیں بھی دور ادوار میں تقسیم کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

حمید اختر ۔ اختر حسین رائے پوری کس دور میں آتے ہیں؟

وقار عظیم ۔ وہ عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

عبادت ۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا کوئی بڑا مرتبہ نہیں۔ ان کے بیشتر افسانے یا تو ترجمے ہیں یا مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں ایک رومانی سی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے قبل بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے اس میں کوئی جدت نہیں کی۔

ہاجرہ مسرور ۔ پھر ادیب کس دور میں رکھے جائیں گے؟

وقار عظیم ۔ ان کا انداز طیور دم اور حجاب امتیاز علی کا ہے۔ ان میں ایسی رومانیت ہے جو کھلی ہے بلکہ اس رومانیت کو بھی آگے لے جانے کی بجائے پیچھے لے گئے ہیں۔

ہاجرہ مسرور ۔ کرشن چندر کے کون سے افسانے ہیں جن میں رومانی لہر نہیں ہے؟

عبادت۔ ابھی ہم ان کا ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

انتظار حسین۔ میرے خیال میں منٹو صاحب اور فاسی صاحب کے تقسیم کے بعد کے افسانوں پر بھی الگ بحث کرنی ہوگی۔

ندیم۔ انتظار صاحب کی بات ٹھیک ہے۔ تقسیم کے بعد لکھنے والوں میں بعض بڑی نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس لئے پہلے یہ متعین کر لینا چاہئے کہ ۱۹۴۷ء تک افسانے میں کیا تجربے ہوئے اور اس وقت روایت نے کیا شکل اختیار کی تھی۔

عبادت۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جو کچھ ہوا اس کا جائزہ بعد میں لیں گے۔ اس وقت تو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان اردو افسانہ کن منزلوں سے گزرا اور اس میں کون کون سے تجربے ہوئے؟ (ہاجرہ مسرور سے مخاطب ہو کر) آپ کی منٹو کے بارے میں کیا رائے ہے؟

ہاجرہ مسرور۔ آپ حضرات فرمائیں۔ مجھے تو ان کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

وقار عظیم۔ مجھے منٹو کی تکنیک میں جو چیز شروع سے کھٹکتی ہے وہ یہ کہ وہ ہمارے سیاسی اور سماجی عقائد اور ہماری اخلاقی قدروں کے خلاف ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جو پڑھنے والے کو SHOCK دے۔ وہ نئی بات کے بجائے غیر متوقع بات کہتے ہیں اور چونکہ آدمی ذہین ہیں اس لئے وہ بات پیدا بھی کر لیتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ بات اتنی غیر متوقع ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اس سے بغاوت کرتا ہے۔

انتظار حسین۔ ان کی تخلیق کا تصور یہ ہے کہ جو چیز ہے اسے کہا جائے کہ نہیں ہے ——— یہ رویہ تخلیق کے لئے بہت مہلک ہے چیزوں سے انکار کرنے سے بات نہیں بنتی۔

ندیم۔ FANTASY اور جھوٹ دونوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔

حمید اختر۔ یہاں تک کہ اب ان کا مقصد صرف چٹخارہ گیا ہے شروع کے افسانوں میں یہ بات نہیں ہے۔ پہلے انہوں نے بڑے پیارے رومانی افسانے بھی لکھے ہیں۔ یہ چیز انہوں نے آہستہ آہستہ DEVELOP کی ہے۔

وقار عظیم۔ یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ——— ایک دن منٹو اور الف اپنے اپنے فن پر بحث کر رہے تھے۔ ایک صاحب ثالث بنے اور انہوں نے بتایا کہ یوں تو دونوں میں برابر کی ہی ریا سلائی کے متعلق لکھتے ہیں لیکن الف کی نظر ریا سلائی پر سیدھی جاتی ہے اور منٹو میز کے نیچے سے نظر گھما کر ریا سلائی کو دیکھتا اور اس پر لکھتا ہے۔

اصل میں منٹو پڑھنے والے کو حیرت زدہ کرنا چاہتا ہے۔

حمید اختر۔ یہ بات کبھی بہت بڑی ہو جاتی ہے اور کبھی کچھ نہیں رہتی۔

عبادت۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ منٹو کے ہاں زندگی کی کشمکش کا کوئی صحیح اور واضح شعور نہیں۔

ندیم۔ میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ شدید قسم کے انفرادیت پسند ہیں اور اسے شخص میں عقیدہ ضد اور جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ضد میں لکھا ہے اور مقدمے چلائے جانے کی وجہ سے لکھا ہے اور کہتے ہیں کہ تم اگر "کالی شلوار" سے چڑتے ہو تو میں تمہیں "دھواں" لکھ کر پریشان کروں گا۔

وقار عظیم۔ انہوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ زندگی طرح طرح کی الجھنوں میں پھنسی ہوتی ہے؟ انہیں گرد و پیش کی زندگی کا صحیح احساس نہیں ہے، وہ فرد سے آگے بڑھ کر سوچنا نہیں چاہتے۔

عبادت۔ ان کے افسانوں میں دو چیزیں خاص طور سے نمایاں ہیں۔ ایک تو افراد کی مصوری دوسرے سماج کے بعض خاص پہلوؤں کا ذکر۔ لیکن ایسے نقطۂ نظر سے جس کے اندر زندگی کا کوئی طبقاتی اور تجزیاتی شعور نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں ایک ایسی حقیقت نگاری ملتی ہے جس میں فوٹو گرافی نظر آتی ہے مصوری نہیں۔

وقار عظیم۔ یہ رجحان اس دور میں عام ہے کہ کردار کی ذہنی کیفیت اور جزئیات کے ذریعے فضا پیدا کی جائے مثلاً الف خاص تفصیل سے لکھتے ہیں اور افسانے کو خوبی کے ساتھ ختم کر دیتے ہیں۔ منٹو ماحول سے پوری طرح واقف ہیں اور ان جزئیات سے وہ خاص چیزیں نکال لیتے ہیں جو قاری کو متاثر کرتی ہیں۔

ہاجرہ مسرور۔ آخر وہ قاری کو متاثر کیا رہتے ہیں؟

عبادت۔ انسانی زندگی کی ہر حالی اور سماجی مذہبات کا تاثر، ان کے افسانوں میں بڑا گہرا اثر ہوتا ہے ——— مثلاً طوائف کی زندگی کا دو سرا رخ ——— اس سے قبل تو طوائف کو صرف تعیش کے زاویے سے دیکھا جاتا تھا۔ منٹو اس کے انسانی پہلو کو ہمیں کہتے ہیں اور اس سے پڑھنے والے کو نفرت نہیں پیدا ہوتی۔

انتظار حسین۔ اس کے لہجے کی آہنگی بہت متاثر کرتی ہے۔ منٹو کا افسانہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نقارہ بج رہا ہے۔ بیدی کے افسانے میں عام آہنگ کم ہے اور مجھے ہر سطح پر داخلی زندگی کی ضرورت زیادہ ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ یہ عجیب بات ہے کہ بیدی سے زیادہ مقبولیت کرشن چندر نے حاصل کی۔

خدیجہ مستور۔ یوں تو ہم سب کرشن چندر سے زیادہ مقبول ہیں۔

انتظار حسین۔ کرشن چندر اور منٹو کا انداز ایک سا ہے وہ عام قاری کو زیادہ متاثر کر سکتے ہیں۔

عبادت۔ بیدی کے مقابلے میں کرشن چندر کی مقبولیت کا سبب اور بھی ہے۔ اگرچہ بیدی کا انداز اور لہجہ کی آہنگی سچی ہے لیکن گہرے سماجی روابط کا شعور بیدی کو کم ہے۔ ان کے ہاں زندگی کی عکاسی ضرور ہے لیکن زندگی کی تنقید کم۔ کرشن چندر کے یہاں باوجود رومانیت کے یہ شعور زیادہ ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ سوال یہ ہے کہ کیا عنصر افسانہ زندگی پر تنقید ہے؟

خدیجہ مستور۔ ایک چیز اور بھی ہے کہ کرشن چندر اور منٹو نے بیدی سے بہت زیادہ لکھا ہے۔

عبادت۔ یہ تو ایم اسلم کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔

انتظار حسین۔ "یہ سماجی روابط کے شعور" کا ذکر تو ذرا گراں گزرے گا۔ بیدی کے یہاں سماجی روابط کا تانا بانا زیادہ معلوم ہوتے ہے۔

حمید اختر۔ کرشن چندر واضح بات کرتا ہے جس سے تھوڑا پڑھے ہوئے لوگ متاثر ہو جاتے ہیں اس طرح اس کے قارئین کا حلقہ بڑھ جاتا ہے اعلیٰ ادبی ذوق والے کم ہیں جو بیدی سے متاثر ہو سکیں۔

عبادت۔ بیدی کے ہاں انداز بیان میں الجھن ہے اور ان کے افسانوں میں زیادہ حرکت نہیں ہے بلکہ ایک سست روی ہے۔ یہ حرکت کرشن چندر کے یہاں بہت زیادہ ہے اس لئے اس کے افسانوں کا اثر بیدی کے مقابلے میں گہرا ہوتا ہے

انتظار حسین۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی ——— اور بیدی بڑا سادہ نگار ہے تصنع نہیں ہے۔ لیکن تصنع زیادہ بڑا فن کار ہے۔

عبادت۔ پختگی اور رومانی تاثر کو گہرا کہتے ہے۔ بیدی کے افسانوں کی مغربیت میں پختگی اور رومانی کی یہ کمی حائل نظر آتی ہے۔

وقار عظیم۔ اس کے بجائے بیان کی قدرت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

انتظار حسین۔ کرشن چندر کے ہاں صحافتی انداز پیدا ہو گیا ہے اس لئے وہ قاری کے ذہن کو جلدی گرفت میں لے لیتا ہے۔

عبادت۔ یہ بات غلط ہے۔ کرشن چندر کے پاس بڑا خوب صورت انداز بیان ہے۔ اس اعتبار سے وہ علی عباس حسینی کو پچھاڑ کر اردو کے باقی تمام افسانہ نگاروں سے آگے ہے۔ اس کے پاس صحافت کو بھی ادب بنا دینے کا جادو ہے۔

وقار عظیم۔ بیدی کے موضوع اتنے متنوع نہیں جتنے کہ کرشن چندر کے ہیں۔ لیکن جتنا کچھ انہوں نے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس مشاہدہ کی گہرائی ضرور ہے۔ کرشن چندر کی مقبولیت میں ان کے طرز بیان اور طرز بیان کی شاعری کو بڑا دخل ہے۔ اس سے قطع نظر بیدی بڑا افسانہ نگار ہے۔

عبادت۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بیدی محدود ہو کر سوچتے ہیں ان کے یہاں احساس کی شدت ہوتی ہے لیکن گہرائی نہیں ہوتی۔ وہ جن مسائل کے بارے میں لکھتے ہیں ان کے افسانوں میں ان کا کوئی حل نہیں ملتا۔

وقار عظیم۔ کرشن چندر باتیں زیادہ کہتے ہیں۔ بیدی کہتے ہیں۔ گہرائی تو پریم چند کے پاس ہے البتہ وسعت نہیں۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش کی زندگی کو دیکھا ہے اور اسی کو اتنا کافی سمجھا ہے کہ وہ اور چیزوں کے محتاج نہیں۔ کرشن چندر جس چیز کو سماجی شعور کہتے ہیں وہ کہیں کہیں پروپیگنڈہ بن گئی ہے۔

انتظار حسین۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک خاص تحریک کی طرف سے اپنے اوپر ایک فرض عائد کر لیا ہے۔

ندیم۔ یوں تو ہر افسانہ نگار نے اپنے اوپر کچھ نہ کچھ فرائض عائد کر لئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ آواز اس کے دل کی آواز ہے یا خارجی تحریک کا اثر۔

عبادت۔ کرشن چندر کا خلوص اس سے ظاہر ہے کہ وہ رومانی ہے اگر پراپیگنڈسٹ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا

انتظار حسین۔ یہ بحث ختم کیسے ہوگی؟

شوکت تھانوی۔ مزید بحث سے پہلے مجھے اجازت دیجئے۔

عبادت۔ کچھ اشتک کے بارے میں۔

وقار عظیم۔ وہ پریم چند کے مقلد ہیں۔ تفصیلات اور جزئیات میں زیادہ جاتے ہیں۔

خدیجہ مستور۔ ان کے افسانوں میں بڑی ناپختگی ہے۔

وقار عظیم - انہیں یہ اندازہ نہیں کہ تفصیلات میں سے کون سی چیزیں منتخب ٹکڑے کے کام میں لانی چاہئیں۔ ONE ACT PLAYS وہ اچھے لکھتے ہیں۔

محمد طفیل - اتنے اچھے کہ اردو کا کوئی بڑے سے بڑا افسانہ نگار بھی ان کے مقابل کھڑا ہونے سے ہچکچائے گا۔

عبادت - اس دور کے لکھنے والوں میں تیسرا نام عصمت چغتائی کا ہے ان کے افسانوں میں دو رجحان ملتے ہیں۔ ایک تو جنسی زندگی کے ایسے پہلو جن کی کوئی سماجی اہمیت نہیں مثلاً نوجوان لڑکیوں کے ایسے مسائل جو ذہنی الجھنوں کے پیدا کردہ ہیں اور جن کو پیش کرتے ہوئے کہیں کہیں خالص رومانی اور جذباتی سی فضا بھی پیدا کرتی ہیں ——— دوسرے وہ افسانے جن میں انہوں نے متوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کے جنسی اور جذباتی مسائل کو موضوع بنانے کی کوشش کی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں رجحانات نے اردو افسانے میں کیا اضافے کئے ہیں۔

وقار عظیم - عصمت کا فن اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ صرف ایک عورت ہی اسے پیش کر سکتی ہے۔ عصمت کا بڑا اضافہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں بتایا کہ عورت کے بھی اپنے مسائل ہیں دوسری بڑی بات سماجی شعور ہے۔ انہوں نے دیہاتی کے متوسط طبقے کے خاندانوں کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور اس پر جو پیچیدگی اور گھٹن ہے اسے بڑے تیز اور دلنشین فن کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

عبادت - لیکن انہوں نے اپنے افسانوں میں کبھی کبھی ایسی کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں ایک سستی قسم کی رومانیت پیدا ہو گئی ہے۔

وقار عظیم - اس کی وجہ کچھ یہ بھی ہے کہ ان کے مزاج میں تسہل کا رنگ ہے۔

عبادت - اس میں ان کا اپنا مذاق اور خواہش بھی شریک دکھائی دیتی ہے اور یہ اس عناصر کا تسخر معلوم ہوتا ہے جس نے انہیں گھٹن اور مجبوری میں رکھا لیکن ان باتوں کو موضوع بنانے میں کیا ان پر رسمی جہاں کے افسانوں کا اثر نہیں ہے؟

وقار عظیم - رشید جہاں اور عصمت میں بڑا فرق یہ ہے کہ رشید جہاں نے ماحول کی عکاسی زیادہ نہیں کی۔

انتظار حسین - قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ افسانہ نگار خواتین کا گروپ تیزی کے ساتھ ٹوٹ کر یو۔پی میں پیدا ہوا اور یہ بغاوت یو۔پی میں ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ انہیں اپنے معاشرتی ماحول کا پورا احساس ہے۔ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور قرۃ العین اسی کڑی میں آتی ہیں۔

عبادت - قرۃ العین حیدر کا مزاج ان سب سے الگ ہے ان کا نام ان کے ساتھ نہ لیجئے۔

انتظار حسین - ہاں ان کی کچھ دوسری شکل ہے۔

محمد طفیل - بھیا تم کس پھیر میں پڑ گئے یہاں بات ٹکڑوں کی نہیں افسانوی تخلیقات کی ہو رہی ہے۔

(قہقہہ)

عبادت - عصمت چغتائی نے مختصر افسانے کی تکنیک کو بھی سمجھا اور اسے توازن اور ہم آہنگی سے پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کا اندازِ بیان خاصے کی چیز ہے۔ انہیں زبان پر بڑی قدرت ہے۔ بے ساختگی اور روانی نے ان کی تکنیک پر بڑا اچھا اثر ڈالا ہے۔ وہ تصویریں جو انہوں نے پیش کی ہیں بڑی واضح ہیں۔ ان میں معنویت اور مقصدیت بھی ہے اور وہ بڑی دل آویز اور دل نشیں بھی ہیں۔

وقار عظیم - ایک اور بات یہ کہ وہ بڑی بے جھجک ہیں۔ انہیں کسی کے عتاب تعزیر کا خوف نہیں۔

عبادت - لیکن ان کی یہ شدت، تیزی، جا۔ حانہ کیفیت اور بیباکی کہیں کہیں حد سے گذر جاتی ہے اور متوازن قسم کے انسان پر اچھا اثر نہیں کرتی۔

وقار عظیم - یہ تو عمر کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ سنجیدگی کی کمی توازن کی کمی کا سبب بن جاتی ہے۔

ہاجرہ مسرور - عبادت صاحب نے جو حد سے گذرنے کی بات کہی ہے تو میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ حد ہے کیا؟

وقار عظیم - حدود تو کوئی نہیں لیکن لکھنے والے کے پاس ایک مقصد ہوتا ہے۔ اب اگر وہ بیان میں اتنی شدت پیدا کر دے کہ مہذب دنیا کے بجائے جھٹکا سا پیدا کر دے تو ٹھیک نہیں۔

انتظار حسین - غالباً عبادت صاحب کے ذہن میں یو۔پی کا ماحول ہے۔

ندیم - میرے خیال میں عبادت صاحب کا مطلب یہ ہے کہ مڈل کلاس اور ملک میں جذباتی خدریں ہوتی ہیں جن کا توڑنا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

ہاجرہ مسرور - میں نے یہ بات اس لئے کی کہ ہم نے پہلے غلط پر بحث کی تھی۔ ان کا انداز کہیں زیادہ خطرناک اور پھسلواں ہے۔

عبادت - منٹو کا انداز مختلف ہے۔ سماجی مذمات کے بیان میں ان کی اپنی ذہنی کیفیت شامل نہیں لیکن عصمت کے ہاں ان کی اپنی

کیفیت شامل ہو جاتی ہے عصمت کے فن کا ہر مجموعی تصور ہمارے سامنے ہے اس میں اگر یہ زندگی کی بڑی اچھی عکاسی ہے لیکن کہیں کہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ راستہ سے ہٹ کر ایک والہانہ جوش اور جذبے میں انہوں نے جگہ جگہ ایسی باتیں کہہ دی ہیں جس سے فن کے کار گر سنہ گرنی کو ٹھیس لگتی ہے۔ شاید اس کی وجہ ان کی نوجوانی اور نوجوانی کی زندگی جذباتی کیفیات میں جن کو ایک مخصوص ماحول نے دبا کر گھرنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔

انتظار حسین ۔ یہ بات تو کرشن چندر اور اس دور کے دوسرے لکھنے والوں پر بھی عائد ہو سکتی ہے۔

وقار عظیم ۔ بچہ فطری طور پر شرارت پسند ہوتا ہے آپ اسے روکئے ٹوکئے تو وہ اور راستے ڈھونڈھ لیتا ہے۔ بچے سے منع کئے جانے پر وہ دیواریں سیاہ کرنے لگتا ہے۔

عبادت ۔ عصمت باشعور انقلابی نہیں ہیں۔ ان کے یہاں ایک باغی کی جھنجھلاہٹ ہے۔ یہ شخصیت ان کے ہر افسانے میں جھلکتی ہے۔

وقار عظیم ۔ بہرحال آپ انہیں رد کرتے ہیں تو وہ شکایتیں جینے لگتی ہیں۔

ندیم ۔ میں کہ مغلب یہ ہے کہ وہ اردو افسانہ کی جوش بلخ آبادی ہیں۔

(قہقہہ)

ہاجرہ مسرور ۔ عصمت خفائی نے جن مسائل پر لکھا ہے ان کے لئے یہ اندازہ ہی ہے۔ غالباً انہوں نے مردوں کے انہیں کمپلیکس کو نگر کیا ہے۔ اب اس کے لئے وہ اور کیا لکھ سکتی ہیں اور یہ بات تہذیب کے دائرے میں کس طرح لائی جا سکتی ہے۔

عبادت ۔ اسے جانے دیجئے اور ان کی فقرہ بازی اور چھیڑے اچھالنے کو پیش نظر رکھئے۔

وقار عظیم ۔ ان کی فقرہ بازی میں بھی تنقید محسوس ہوتی ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ اس سلسلے میں "لحاف" کا ذکر ضرور ہونا چاہئے۔ عصمت نے اس میں غیر ضروری تفصیل سے کام لیا ہے۔ اسے بچے کی زبان سے بیان کرایا ہے اسی لئے وہ الجھاؤ سا ہو گیا ہے۔ اندازِ بیان غلط نہیں لیکن موضوع ضرور غلط تھا۔

عبادت ۔ اس کا مجموعی تاثر فن کار کی ذہنی الجھن اس معاملے میں ضرور ظاہر کرتا ہے اور یہ اس افسانے کی سب سے بڑی خامی ہے اور اس کا جنازہ ہی غصہ اس طرح فوت ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین ۔ میرے خیال میں ڈ عصمت نے صحیح انداز اختیار کیا۔ NARRATOR بالغ ہوتا تو یہ بات زیادہ گھناؤنی ہوتی یہ IN DIRECT ہے۔ بچے کے بیان سے یہ بات ہم تک پہنچ گئی اور اس میں عریانی نہیں رہی۔

عبادت ۔ عریانی بالکل نہ سہی لیکن مجموعی تاثر میں مذموم کیفیت کا اظہار نہیں ہو سکا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والا اس میں خود لذت محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ خصوصیت اس افسانے کو خاصا خطرناک بنا دیتی ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ اس میں لذت نہیں محسوس ہوتی۔

ندیم ۔ قاری لذت محسوس کرتا ہے ۔ اگر وہ بچے کے بجائے بالغ NARRATOR کے ذریعے پیش کریں تو افسانہ کامیاب ہوتا۔

خدیجہ مستور ۔ اور جس عورت کے ساتھ یہ واقعات ہو رہے ہیں اس سے ہمیں ہمدردی نہیں ہوتی افسانے میں چٹخارا ہے ۔ یقین نہیں آتا کہ "چوتھی کا جوڑا" کا افسانہ نگار ایسا افسانہ بھی لکھ سکتا ہے ۔

ہاجرہ مسرور ۔ میں نے تو موضوع سے بحث کی تھی۔

عبادت ۔ اس افسانے کے موضوع کی اہمیت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ خرابی ہمارے سماج میں موجود ہے کاش عصمت اس اہم موضوع کو اس طرح پیش کرتیں کہ اس کا اثر اس سے نفرت کی صورت میں نمایاں ہوتا لیکن اس افسانے نے تو اس موضوع سے دلچسپی لینے کی ترغیب دی ہے عصمت کا وار اس طرح خالی جاتا ہے۔ وہ خود اس کا شکار ہو جاتی ہیں۔

انتظار حسین ۔ احمد ندیم قاسمی کے ذریعے اردو افسانے میں ایک نئی چیز آئی اب تک یوپی کے علاقے کی ترجمانی ہوتی تھی لیکن اُردو دان حلقہ پنجاب کے کرداروں سے واقف نہیں تھا۔ اب یہ بات اور ہے کہ ندیم صاحب نے اسے DEAL کیسے کیا۔ ان میں خامی یہ ہے کہ وہ پنجاب کی فضا پر شاعری کا پردہ ڈال دیتے ہیں۔ وہ حقائق کو رنگین عینک سے دیکھتے ہیں۔

عبادت ۔ جس چیز کو انتظار صاحب خامی کہتے ہیں میں اسے ان کے فن کا ضروری جزو سمجھتا ہوں۔ یوپی اور پنجاب کی فضا میں یہی فرق ہے۔ پنجاب کے دیہات کی فضا رومانی ہے۔ یہاں کے پہاڑوں میں رومان ہے۔ دریاؤں میں رومان ہے۔ کھیتوں میں رومان ہے۔ غرض یہ کہ سارا فضا رومانی کیفیت

چھائی ہوئی ہے ندیم صاحب جب اس فضا کو پیش کرتے ہیں تو رومان کا رنگین پردہ از خود ان کے فن پر پڑ جاتا ہے۔ یہ شعوری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکھڑی اکھڑی سی نہیں معلوم ہوتی۔ اس رومانی فضا میں تو وہ پنجاب کی روح کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کی یہ رومانیت فن کو حقیقت سے قریب کرتی ہے۔

انتظار حسین ۔ لیکن خود ندیم صاحب کے بعض افسانے ایسے ہیں جن میں یہ پردہ نہیں ہے۔ بلونت سنگھ کے افسانے بھی ایسے ہیں اور اس پردہ کے بغیر ہم چیزوں کو زیادہ قریب دیکھ سکتے ہیں۔

عبادت ۔ ابتدائی دور میں ان کے افسانوں کی خاصی تعداد ایسی ہے جن کا نقطۂ نظر تمام تر رومانی ہے۔ شاید ان کی نوجوانی نے اس خصوصیت کو پیدا کیا ہے، بعد میں حقیقت نگاری کی طرف ان کا رجحان بڑھنے لگتا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ ابتدائی دور سے آپ کی کیا مراد ہے۔ ان کے مجموعے "بگولے" کے افسانے "نغمۂ بینے" میں تو کوئی رومان نہیں۔

محمد طفیل ۔ یہ افسانہ "بگولے" میں نہیں "آنچل" میں ہے۔

عبادت ۔ ان کا پہلا مجموعہ "چوپال" ہے۔ اس کے بیشتر افسانوں میں رومانی فضا ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ دوری نقابت نگاری اور رومانی اوراد کے بین بین ہے اس وقت یہ دونوں چیزیں ہمارے روایت کا جزو بن چکی ہیں بعد میں ندیم صاحب کے افسانوں میں واقعیت رومان پر غالب آگئی ہے۔ وہ ایک خاص حد تک اس فضا کا ذکر کرتے ہیں اس کے بعد نہیں۔

عبادت ۔ ان کے شعور میں ارتقائی کیفیت ہے۔ اب ان کے پاس حقیقت نگاری REALISM کا بڑا رچا ہوا انداز ہے۔ جس کو ان کے پختہ ہوتے سماجی شعور نے پیدا کیا ہے۔

وقار عظیم ۔ لیکن اس سماجی زعیت کے باوجود وہ اس رومانی فضا کو نظر انداز نہیں کرتے۔

عبادت ۔ آج سے سات آٹھ سال پہلے وہ یہ فضا قائم کرتے تو ان کے یہ افسانے اجڑے اجڑے سے نظر آتے۔ اس فضا نے ان کے فن میں بڑی جان پیدا کی ہے۔ اس فضا نے ان کے افسانوں کو واقعیت سے قریب کیا ہے۔

انتظار حسین ۔ لیکن احمد علی نے، جو زمانے میں اور قسم کے رنگ میں افسانے لکھے ہیں۔

محمد طفیل ۔ کیا ہم اسے خرابی کے بجائے ایک اسلوب کا درجہ نہیں دے سکتے؟

ندیم ۔ اس سلسلے میں میں انتظار صاحب اور وقار صاحب سے متفق ہوں۔ ابتدا میں رومانیت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ واقعیت دب گئی ہے۔

وقار عظیم ۔ اس میں لطف ضرور آتا ہے لیکن مجموعی تاثر دب گیا ہے۔ وہ رشتے لکھنے والوں نے زندگی سے گہرا ربط ضرور رکھا ہے لیکن فن سے شاید نہیں ۔۔۔ ندیم صاحب اس دور کے واحد افسانہ نگار ہیں جنہوں نے فن اور زندگی کو ساتھ ساتھ چلایا ہے۔

عبادت ۔ ان کے ہاں بڑا توازن اور مسلسل ارتقائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ کہیں بھٹکے نہیں ہیں۔ انہوں نے زندگی اور فن کے امتزاج کی ایک صحت مند روایت قائم کی ہے۔

ندیم ۔ اردو افسانے کی ساری روایت مجموعہ پر بیت چکی ہے۔ میں نے ابتدا داستانوں سے کی ہے۔ فنی حیثیت متعین کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔

انتظار حسین ۔ فاطمی صاحب کے فسادات کے بارے میں افسانوں میں خامی یہ ہے کہ وہ بڑے جذباتی ہو گئے ہیں۔

وقار عظیم ۔ یہ بات تو فسادات کے بارے میں جتنے لوگوں نے لکھا ہے سب میں موجود ہے۔ وقت گذرنے پر ہی اس میں اعتدال پیدا ہو سکا۔ یہ خرابی کرشن چندر، بیدی، عصمت اور حیات اللہ انصاری میں بھی ہے۔

عبادت ۔ ندیم صاحب نے تفصیل اور جزئیات کو مختصر افسانے میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ اس سے ایک فضا بھی پیدا ہوئی ہے۔ ایک ماحول بھی وجود میں آیا ہے۔ ندیم صاحب اسی فضا اور ماحول کے افسانہ نگار ہیں۔

وقار عظیم ۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ افسانہ نگار کو قدرت ہے کہ وہ بس جملوں کی بات کو ایک جملے میں ادا کر سکتا ہے۔

محمد طفیل ۔ اور یہ بھی کہ ایک جملے کی بات کو دس جملوں میں بھی ادا کر سکتا ہے۔

وقار عظیم ۔ خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور دونوں کے ابتدائی دور میں عصمت چغتائی کا اثر ضرور ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر۔ یہ شاید احساس کمتری کا نتیجہ ہے لیکن عصمت کا ماڈل ان سے مختلف ہے۔

عصمت کا ماحول علی گڑھ کے آس پاس ہے اور ان کے پاس لکھنؤ کا ماحول ہے عصمت میں یہ انتقام کا جذبہ ہے وہ ان کے یہاں نہیں ہے۔

عبادت - ابتدائی دور کے افسانوں میں ان کے یہاں ایک طرح کا احساس شکست بھی ہے اور اس میں عصمت والی بلندی نہیں ہے۔

وقار عظیم - اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ عصمت نے اپنے آپ کو گھریلو شکنجوں سے نکال لیا تھا انہیں ایسا نہیں کر سکی تھیں۔

ہاجرہ مسرور - میرے خیال میں اگر ہم دونوں بہنوں پر صرف اس لئے ایک ساتھ بات کی جاتی ہے کہ ہم بہنیں ہیں تو بڑی زیادتی ہے۔

ندیم - ان دونوں کے فن میں بھی بڑا فرق ہے، خدیجہ کے افسانوں میں آہستہ روی اور صحیح صحیح قدم رکھنے کا انداز ہے: ہاجرہ کے افسانوں میں عصمت کی تیزی اور شوخی بھی ہے۔

وقار عظیم - یہ تو مزاجوں کا فرق ہے۔

انتظار حسین - خدیجہ کے یہاں مرثیہ کی فضا ہے لیکن ہاجرہ کے یہاں طنز ہے۔

عبادت - ان دونوں کو زبان پر بڑی قدرت ہے۔ ان کے بیان کی روانی اور طرز ادا کی بے باکی نے ان کے افسانوں میں زندگی پیدا کی ہے۔

وقار عظیم - قرۃ العین میں اور ان میں یہ فرق ہے کہ اس نے مسرور ہی میں زبان سیکھی ہے اور انہوں نے لکھنؤ میں۔

انتظار حسین - قرۃ العین کے پاس امام باڑے کی زبان نہیں بلکہ نئے لکھنؤ اور وہ بھی کافی ہاؤس کی زبان ہے۔

عبادت - لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہاجرہ اور خدیجہ کے پاس مرضوعات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے انداز میں بھی اب وہ شگفتگی نہیں رہی۔

ندیم - میرے خیال میں موجودہ دور میں ان کا فن زیادہ وسیع اور بلند ہو گیا ہے۔

عبادت - میں بالکل ابتدائی دور سے مقابلہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ کچھ عرصہ پہلے کی بات کر رہا ہوں۔

وقار عظیم - بیان وغیرہ کی حد تک تو آپ کی بات ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن زندگی کی باشعور ترجمانی تو اب ہی ہے۔ ایک کمی ضرور ہے کہ پہلے بیان کا انداز بے ساختہ تھا اب اسے بنانے سنوارنے کی کوشش میں روانی میں کمی آ گئی ہے اور ذرا سا تصنع پیدا ہو گیا ہے۔

عبادت - میرے خیال میں اب ان کے یہاں لکھنے کی URGE اس شدت کے ساتھ نہیں ہے۔ زندگی کا شعور ضرور ہے لیکن جب URGE ہی نہیں ہو گی تو شعور تخلیق میں کس طرح معاونت کر سکے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے موضوعات ختم ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

انتظار حسین - ہر دور میں ایک مزاج ہوتا ہے، پہلے INNER URGE کے تحت لکھتی تھیں اب ایک خاص تحریک کے ماتحت لکھتی ہیں تو وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔

ندیم - ہاجرہ مسرور کے دو افسانے "صدمہ" اور "بھالو" تازہ ترین اور بڑے کامیاب افسانے ہیں۔

عبادت - انتظار صاحب نے یہ بات ایک تعصب کے تحت کہی ہے۔ کسی تحریک کے ماتحت ہو کر لکھنا تو بڑی اچھی بات ہے بشرطیکہ اس تحریک کا ذہن و شعور پر ناظر خواہ اثر ہو۔

ندیم - خدیجہ مستور کا افسانہ "مینوں لے چلے بابلا" مختصر اور بڑے DISPASSIONATE انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں کی تخلیق کی رفتار میں کمی آ گئی اور شاید اسی کے باعث خامیاں پیدا ہو گئیں۔

عبادت - میرا خیال یہ ہے کہ زندگی میں اگر فن کار کو سکون مل جائے تو تخلیقی صلاحیتیں سونے لگتی ہیں ——— ہاجرہ اور خدیجہ آج اسی سکون سے دوچار ہیں۔ ان کے موضوعات ختم ہو گئے ہیں اسی لئے ان کے افسانوں میں جان نظر نہیں آتی۔ اب ان کے فن کو زندہ کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ وہ بچوں کے بارے میں لکھیں۔ کیونکہ آج وہ زندگی کی انہی منزلوں سے دوچار ہیں۔

ہاجرہ مسرور - صاحب بڑی مشکل یہ ہے کہ آپ لوگ ہماری گھریلو زندگی دیکھ لیتے ہیں اور پھر نسخہ تجویز کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔

وقار عظیم - اس سے پہلے جو نام ہم نے لئے ہیں ان میں دیوندر ستیارتھی اور خواجہ احمد عباس کے نام رہ گئے ہیں۔ میں ایک نظر ان پر بھی ڈال لینی چاہئے۔ دیوندر ستیارتھی میں ایک بات ہے جو کسی افسانہ نگار میں نہیں۔ وہ ہے افسانہ نگار فضا سے متاثر ہیں یا انہوں نے پریم چند کی پیروی کی ہے لیکن ستیارتھی نے لوک گیتوں کے

سلسلے میں سارے ہندستان کا دورہ کیا اور ان گنتیوں کے تانے بانے سے کہانیاں تیار کی ہیں اس طرح ان کی کہانیوں میں بڑی رنگا رنگی ملتی ہے۔ انہوں نے اس رنگینی کو بڑے تنوع کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا موضوع افسانے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ البتہ انہوں نے فنی لوازمات کا زیادہ خیال نہیں رکھا ہے۔

عبادت ۔ "لال دھرتی" افسانہ انہوں نے کافی چابکدستی سے لکھا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ میرے خیال میں تو اس میں بڑا تصنع ہے انہوں نے خواہ مخواہ لال رنگ سے لڑکی کی جلوہ گری کو تعبیر کیا ہے۔ یہ چیز غیر قدرتی سی لگتی ہے۔ فنی حیثیت سے یہ کامیاب افسانہ نہیں ہے۔

وقار عظیم ۔ جی ہاں فنی نقطۂ نظر سے ان کا انداز عموماً بڑا اناڑی پن ہوتا ہے۔

عبادت ۔ وہ جس پس منظر کے متعلق لکھ رہے ہیں شاید اسے ہم یہاں بیٹھ کر اچھی طرح محسوس نہیں کر سکتے لیکن انہوں نے جس ماحول کے بارے میں لکھا ہے اس پس منظر میں وہ خاصا موثر نظر آتا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ لیکن وہ اسے کسی اور انداز سے بیان کر سکتے تھے انہوں نے ایک جگہ لڑکی کے کھڑاؤں پر گھوم جانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات بڑی مصنوعی ہے۔

عبادت ۔ یہ اصل میں اس بات کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ماحول سے یہ ماحول قدرے مختلف ہے۔

انتظار حسین ۔ لیکن ہم ایسے افسانے بھی تو پڑھتے ہیں جن کا ماحول ہم نے نہیں دیکھا لیکن افسانہ نگار ہمیں پوری طرح CONVINCE ضرور کرتا ہے مثلاً ڈی۔ ایچ لارنس کے میکسیکو کے بارے میں افسانے۔

عبادت ۔ مجھے اس سے اختلاف نہیں لیکن یہاں بات فن کی نہیں رہ جاتی یہ تو ماحول کی عکاسی کی بات ہے۔ ستیارتھی اس عکاسی میں کامیاب ہیں۔

وقار عظیم ۔ لکھنے والے کا کمال یہی ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کرے کہ پڑھنے والا اجنبیت محسوس نہ کرے اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو یہ اس کی کمزوری ہے۔ ہاں یہ ستیارتھی کی خصوصیت ہے کہ انہوں نے مختلف دیہات کی فضا کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے میں رنگوں کی بڑی اہمیت ہے۔ جہاں کہیں انہوں نے بسنت میں یا پی کے دیہات کا ذکر کیا ہے تو زردی کا ذکر ضرور فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے اور رنگ ہی سے پس منظر بنایا ہے۔

ان کے انداز بیان اور سوچنے پر ٹیگور کا گہرا اثر ہے اور وہ اپنے کرداروں سے بڑی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں ہر ایک کو اپنانے کی خواہش بدرجۂ اتم ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں مجھے بڑا تصنع محسوس ہوتا ہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں انداز بدلتا رہتا ہے مثلاً کرشن چندر پہلے رومانی تھے پھر بدل گئے لیکن احمد عباس کا زندگی کے متعلق ایک خاص قسم کا نقطۂ نظر ہے جو سیاسی ہے وہ ایک خاص قسم کی قومیت کے حامی ہیں اور اس طرح وہ جو فضا بناتے ہیں اس میں تصنع کا احساس ہوتا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ قومی احساس بری بات نہیں ہاں اسے پیش کرنے میں خامی رہ سکتی ہے۔

وقار عظیم ۔ فن کا اصل مقصد یہ نہیں کہ آپ اس کے محاسن سے لطف اندوز ہوں۔ فن کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارا احساس دوسرے کا احساس بن جائے۔ اگر یہ تصنع معلوم ہونے لگے تو مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

عبادت ۔ خواجہ احمد عباس اپنے افسانوں میں زیادہ حقیقت نگار ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم شاید اسے محسوس کرتے ہیں کہ وہ کافی ہیں کہ انہوں نے افسانے کے بنیادی اصولوں کا کہ خیال رکھا ہے ——— شاید اس لئے بھی کہ وہ صحافی ہیں اور ان کی تحریروں پر صحافت کا خاصا اثر ہے۔ اسے ہم تصنع نہیں کہہ سکتے جان گرے کہہ سکتے ہیں "میا کی کہہ گئے ہیں" سیدھا سادا انداز کہہ سکتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ ہم کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے ایک نقطۂ قائم کرتے ہیں جب تک یہ بات نہ ہو ہماری بات سے کوئی نتائج نہ ہوگا۔ افسانہ کی منطق اس سے کچھ مختلف ہے جو چیز زندگی میں حقیقت ہے وہ افسانے میں تصنع بن جاتی ہے۔ افسانوی حقیقت کے لئے ہمیں بڑے جوڑ توڑ کرنے پڑتے ہیں۔ احمد عباس اس میں پورے نہیں اترتے شاید اس لئے کہ صحافی ہیں۔

محمد طفیل ۔ ان کا صحافی ہونا کوئی عیب نہیں ہونا چاہئے بعض افسانہ نگار صحافی نہیں ہیں لیکن ان کی تحریروں میں صحافتی رنگ جھلکتا ہے ——— اس سلسلے میں کسی حد تک کرشن چندر کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ مجھے ان کا ایک افسانہ یاد آتا ہے۔ ایک آدمی یادداشت کھو چکا ہے اور ریل میں سفر کر رہا ہے ہندو اس سے پوچھتے ہیں کہ وہ کون ہے مسلمان بھی یہی پوچھتے ہیں ——— یہ بڑا مصنوعی لگتا ہے

کیونکہ اس زمانے میں لوگوں نے قومیت اور مذہب معلوم کرنے کے بڑے انوکھے ڈھنگ ایجاد کر رکھے تھے۔

وقار عظیم ۔ اصل میں اس وقت یہ رجحان تھا کہ فسادات کے بارے میں جو کچھ لکھا جائے اس میں ہندو اور مسلمان دونوں کے ساتھ پورا انصاف کیا جائے۔ کرشن چندر نے بھی ایسا کیا ہے لیکن ان کے بیان کا لوچ اس پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

محمد طفیل ۔ میرے خیال میں اس موقع پر اختر اورینوی کا بھی ذکر ہونا چاہیئے۔

عبادت ۔ ان کے ساتھ اختر انصاری کا بھی۔

وقار عظیم ۔ ان کا ذکر شروع میں ہونا چاہیئے تھا۔ یہ دونوں افسانہ نگار مظلوموں کی حمایت کرتے ہیں۔ اختر اورینوی کے ہاں کسانوں اور مزدوروں کے متعلق افسانے ہیں۔ یہ افسانے انہوں نے ایسے دور میں لکھے ہیں جب لوگ فیشن کے طور پر ان کا ذکر کرتے تھے۔ ان کے پاس صحیح ہمدردی اور محبت ہے۔

عبادت ۔ اختر انصاری کے افسانوں کو بڑے غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے افسانے اردو میں نفسیاتی تجزیے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک فضا کا قیام اور ایک سماں بندی ملتی ہے ان کے پاس جو امر ہے ہمدردی کا عنصر تو نہیں ہے البتہ متوسط طبقہ کی ذہنی الجھنوں کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اس سے جو نتائج نکل سکتے ہیں اس کو انہوں نے بڑی مہارت سے لکھا ہے۔

وقار عظیم ۔ اختر انصاری نے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جن میں افراد کی ذہنی کیفیتوں کی عکاسی ہے (مثلاً ان کے مجموعے "نازو" میں) انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حالات سے ان پر کیا اثر پڑتا ہے اور اس کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ یہ بات اس دور کے لکھنے والوں میں نہیں تھی۔

عبادت ۔ ان کے کردار پریشان، سراسیمہ اور کٹھ پتلیوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں کے ہاتھوں وہ ایک فضا خلق کرتے ہیں لیکن یہ فضا پڑھنے والے پر کس انداز میں اثر انداز ہوتی ہے کہ اس کا بھی اندازہ ہوتا۔ ان کی قائم کی ہوئی فضا، اور ہنستی ہوئی نظر آتی ہے اور اس بات کا احساس وہ اتنی شدت سے دلاتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں پھنس جاتا ہے۔

وقار عظیم ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سے انہوں نے زندگی کی گہما گہمی میں قدم رکھا ہے FRUSTRATED رہے ہیں۔ چونکہ انہوں نے اپنی زندگی میں مایوسی ہے اس لئے وہی مایوسی ان کے کرداروں پر حاوی ہے۔ وہ کسی مصیبت سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتے ہاں اس طرح کی زندگی میں انسان کو جن کیفیتوں سے سابقہ پڑتا ہے ان کی عکاسی بڑی صفائی سے کرتے ہیں۔

ندیم ۔ اردو افسانے کی بُنگ میں اختر انصاری کی CONTRIBUTION اتنی ہے کہ ان کا نثر لکھنے کا انداز بڑا خوبصورت، سلجھا اور سادہ ہے فٹز کے مقابلے میں ان کا انداز بیان بڑا دلکش ہے۔ ان کے چند افسانے (مجموعہ نازو) خاصے مشہور اور کامیاب ہیں لیکن ان کا کوئی اسلوب DEVELOP نہیں ہو سکا اور مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف متوسط طبقے کے نوجوان کی زندگی ہی پیش نہیں کرتے، بلکہ ایسے موضوعات پر لکھتے ہیں جن کے بارے میں انہیں علم نہیں ہوتا۔ البتہ کرشن چندر نے بھی کیا ہے۔

عبادت ۔ جس تنگ پسندی کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے وہ اصل میں ان کا مزاج نہیں ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ بعد کا دور ہے ترقی پسندی کا CRAZE اس کی وجہ ہے۔

عبادت ۔ ان کے افسانہ "دریا کی لہر" میں کئی کرداروں کا ذکر ہے انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور یہ ان کا مخصوص انداز ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پریم چند کا اثر بہت گہرا ہے حتیٰ کہ حسینی بھی اس سے متاثر ہیں۔ اس زمانے میں اختر انصاری نے انفرادیت پسندی کا ثبوت دیا اور اپنا رنگ الگ رکھا۔

عبادت ۔ ہر چند کہ ان کا نقطۂ نظر صحت مندانہ نہیں ہے لیکن انہوں نے ایک نئے انداز کی بنیاد ضرور رکھی ہے۔ اختر اورینوی نے زندگی اور معاشی کشمکش پر بڑے عمدہ افسانے لکھے ہیں مثلاً "کوچہ اور کانٹے"۔ لیکن یہ بات نہ ہے کہ وہ نتیجہ کوئی نہیں نکال پاتے، اس معاملہ میں اگر اسی دور کے دوسرے افسانہ نگاروں کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں لیکن اختر اورینوی جس فلسفۂ حیات کے قائل ہیں وہ انہیں آگے بڑھنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ ان پر بلا مقصد مذہب کا اثر ہے۔

ندیم ۔ اختر اورینوی کے افسانوں میں حقیقت پسندی اور تصنع کا بڑا عجیب امتزاج ہے۔

عبادت ۔ جب تک انسان کے پاس زندگی کی کشمکش کا صحیح شعور نہ ہو وہ اسی طرح بھٹکتا ہے۔ اختر اورینوی اس سے محروم نہیں۔

اگر طبقاتی آویزش کا شعور ان کے پاس ہوتا تو ان کے فن میں یہ خامی نہ باقی رہتی۔

وقار عظیم ۔ لیکن اس کے باوجود طویل مختصر افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے میں اختراع پسندی کا بڑا حصہ ہے۔

عبادت ۔ اب ہم اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں یہ پتہ لگانے کی ضرورت ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے کن کن سے نئے تجربے کئے اور کن کن سی نئی روایات قائم کیں۔

نئے افسانہ نگار یہ چند سے کچھ آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری انفرادی رجحان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا شعور بھی بڑھا ہے۔ اس میں ترقی پسند تحریک کا اثر بھی شامل ہے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے حقیقت نگاری اور واقعیت کے اس رجحان کے ساتھ ساتھ اپنے افسانوں میں حقیقت و رومان کا ایک سنگم بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس کی بہترین مثالیں کرشن چندر کا فن ہے۔ کرشن چندر نے اپنے تقریباً تمام افسانوں میں حقیقت و رومان کا یہ سنگم بنایا ہے اور اس طرح اس نے جنت اور جہنم کو یکجا کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ منفرد ہے۔

ندیم ۔ یہ چند کے زمانے میں افسانہ زیادہ تر مکمل حیات تک محدود رہتا ہے لیکن اب مکمل حیات میں تنقید حیات بھی شامل ہو جاتی ہے۔ محبت کے بارے میں بھی جو کہانیاں لکھی گئی ہیں ان میں بھی سماجی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

عبادت ۔ یہ چند کے یہاں محبت کا جو تصور ہے وہ خدمت، قربانی، ایثار ہے۔ بلند مقصد اور نصب العین کو محبت کا مجسمہ بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن موجودہ دور میں محبت کی نفسیاتی نوعیت کو پیش کرنے کا رجحان عام ہے۔ اس تناظر کی تکمیل میں محبت کا کیا مرتع ہو سکتا ہے ان چیزوں کے متعلق بھی افسانے لکھے گئے ہیں اس طرح گویا محبت کو وسیع منظر میں پیش کیا گیا ہے جو پہلے جنت مذہبی یا اصلاحی تھی اب اس کا ایک پس منظر ہے جو اس کا محرک بنتا ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ بات صرف محبت کے لئے مخصوص نہیں بلکہ حقیقت میں اب ہر دور انداز جان جذباتی نہیں رہا اور افسانہ نگار کسی مسئلے کو زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔

ندیم ۔ محبت ہمارے شعر اور افسانوی ادب کا بہت بڑا موضوع رہا ہے، اس لئے اس میں تبدیلی بھی واضح ہے۔ تیسری چیز جو اردو افسانوں میں موجود ہے بین الاقوامیت ہے۔

وقار عظیم ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں ہمارے افسانہ نگاروں کی نظر ساری دنیا کے ادب پر ہے۔

عبادت ۔ بین الاقوامیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر ہے جس کو ایک رومانٹیک تجربے کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تجربہ ہمیں بین الاقوامیت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے قیام سے ایک خاص بات یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اب ہم چیزوں کو تاریخی شعور کے تحت دیکھتے ہیں۔ یہ شعور جذباتی نہیں۔ اس میں زندگی سے دلچسپی اور اس کا گہرا احساس ہے اس سے پہلے انسانیت پرستی یا انسان دوستی (HUMANISM) کے جو تصورات تھے اس میں چیزوں کو ایک محدود دائرے میں رہ کر دیکھا اور سمجھا جاتا تھا لیکن اب ایک عالمگیر انسانی برادری کا خیال پیدا ہوا ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارے افسانے میں یہ کرشن چندر کا پیدا کردہ ہے۔ اس معاملہ میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

ندیم ۔ بین الاقوامیت اور آفاقیت دو الگ الگ چیزیں ہیں انہیں ملانا نہیں چاہئے۔

عبادت ۔ بین الاقوامیت کی بنیاد آفاقیت پر ہے۔

وقار عظیم ۔ سمجھنے کا یہ انداز اس وجہ سے ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے مسائل کا تجزیہ کر کے ان کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں اور جب ان چھوٹے چھوٹے مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ چلتا ہے کہ ان کے پیچھے بین الاقوامی مسائل ہیں۔

عبادت ۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کے بارے میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں بھی آج کے افسانہ نگاروں کا تصور بدل گیا ہے۔ زندگی کے ان پہلوؤں کو جو پہلے قابل توجہ نہیں سمجھے جاتے تھے ان میں بھی دلچسپی اور اس دلچسپی کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ پہلے ان مسائل کو پیش کرنے کے لئے ماحول سے جو بیزاری پیدا ہو جاتی تھی۔ اب اس میں اس زندگی کی دلکشی کا خیال شامل ہو گیا ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ چیز ایک خاص نقطۂ نظر میں ہم چند کے ہاں بھی موجود ہے۔

ندیم ۔ اس زمانے میں سماجی اب REALISTIC ہے۔

عبادت ۔ زیر بحث دور کے لکھنے والوں کی جو ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان لوگوں نے تکنیک اور فن کے اعتبار سے بھی اضافے کئے ہیں

دور افسانے کی روایت کو بعض نئے پہلوؤں سے آشنا کیا ہے۔ انہوں نے اظہار و بیان، سماں بندی، کردار نگاری اور نفسیاتی تجربے کے نئے میدان تلاش کئے ہیں۔ اس لحاظ سے میں کرشن چندر کو بہت بڑا صناع سمجھتا ہوں۔ انہوں نے شعوری طور پر اردو مختصر افسانے کی تکنیک کو فن کی نئی راہوں سے آشنا کیا ہے۔ مثلاً "ان داتا" کو لے لیجئے۔ اس میں فن کا انداز ہی بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اس سے پہلے ہم افسانے میں اس طرح کی ہیئت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

وقار عظیم ۔ لیکن کرشن چندر کے ہاں ایسے نمونے بھی ہیں، جنہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ افسانے کو پیچھے لے گئے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر اس کی ناکامیاں کم ہیں اور نیا لکھنے والا ان سے بچ سکتا ہے۔

عبادت ۔ ہر تجربہ اپنے اندر شدت اور کسی حد تک انتہا پسندی ضرور رکھتا ہے، پھر تجربے فن کے لئے بڑی کٹھن ہوتی ہیں۔ اس لئے خامیاں اور فروگزاشتیں اس دور کے فن کاروں میں بھی موجود ہیں۔ کرشن چندر اور بیدی تک ان سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں۔

ایک اور بات۔ اس زمانے میں بابو مختصر افسانے کی تکنیک کا تجربہ بھی کیا جاتا ہے۔ ندیم، کرشن اور اختر انصاری نے اس کی بنیاد ڈالی ہے۔ پھر دوسرے لوگ بھی میدان میں آئے جنہوں نے اسے آگے بڑھایا۔

ندیم ۔ اس بحث کو سمیٹنے سے پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ کوئی بات رہ تو نہیں گئی۔

وقار عظیم ۔ ناول کی طرح کینوس کی وسعت اور وہ بھی اس طرح کہ بوجھل نہ بن جائے اس دور کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ یہ لوگ تفصیلات کو زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کرتے ہیں کردار کا تعمق گہرا کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کینوس کے پھیلاؤ کے باوجود وحدتِ تاثر قائم رہتی ہے۔ حیات اللہ انصاری کا افسانہ "آخری کوشش" اس دور میں اس کی نمایاں مثال ہے۔ اس کے پیچھے ایک وسیع دنیا ہے۔ اس کی ساری ہنگامہ آرائیاں ہیں جو پڑھنے والے پر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔

ندیم ۔ ان لکھنے والوں کا ایک CONTRIBUTION یہ بھی ہے کہ انہوں نے FANTASY کے انداز کو نکھارا ہے مثلاً غلام عباس کا افسانہ "آنندی"۔

انتظار حسین ۔ یہ بعد کی بات ہے ابھی ہم وہاں تک نہیں پہنچے۔

عبادت ۔ میں سمجھتا ہوں کہ داستانوں کا اثر بتدریج کم ہوتا گیا۔

وقار عظیم ۔ حقیقت نگاری کے رجحان کے پھیلنے کے بعد کمی لازمی تھی اب شاعرانہ ماحول اور فضا سے مدد ضرور لی جاتی ہے لیکن محض تخیل اور تصور ہی پر افسانہ کی بنیاد نہیں رکھی جاتی۔

انتظار حسین ۔ عبادت صاحب نے داستانوں کے اثر کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ داستانوں میں صرف FANTASY ہی نہیں بلکہ جہاں کہیں ان میں حقیقت پسندی کا اظہار ہوا ہے وہ آج کل کے افسانوں سے بہت قریب ہے "قصہ چہار درویش" میں جہاں کھانے، لباس اور دوسری چیزوں کی تفصیل ہے وہ بالکل آج کے سے افسانوں کی ہے۔

عبادت ۔ اس سے مجھے اتفاق ہے، لیکن رومانی فضا جو داستانوں نے دی ہے اس کو ان لوگوں نے اس انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ ان کا انداز اس کی نفی کرتا ہے ——— پریم چند کے ہاں جو بات ہے وہ آج کے افسانوں میں نہیں ملتی۔ اب افسانہ نگار رومانی فضا بھی قائم کرتے ہیں تو اس میں نرمی جذباتیت نہیں ہوتی ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ رنگ تو خود پریم چند کے آخری افسانوں میں بھی نہیں ملتا۔ لیکن داستانوں کے اثر سے انکار ممکن نہیں۔ یہ اصل میں مشرقی مزاج کی ایک کیفیت ہے۔

عبادت ۔ غالباً کرشن چندر پر مغربی رومانیت کا اثر زیادہ ہے۔

وقار عظیم ۔ اگر غور کیجئے تو یہ انداز داستانوں میں مغرب کے رنگ سے بھی زیادہ ہے۔

عبادت ۔ لیکن داستانوں میں جو رومانیت ہے اس میں تصنع کی فضا قائم رہتی ہے لیکن نئے افسانہ نگاروں کے رومانی انداز میں ہماری زندگی کا احساس ہوتا ہے اسی لئے اس میں زیادہ جان ہے

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اب تک جو روایات قائم ہوئی ہیں ان کی روشنی میں نئے لکھنے والوں نے کیا کیا تجربے کئے۔ حسن عسکری، بلونت سنگھ، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں وغیرہ اس دور میں آتے ہیں۔

حسن عسکری نے اردو افسانے کو بعض نئی چیزیں اس اعتبار سے دی ہیں کہ انہوں نے نفسیاتی تجربے کے رجحان پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے علاوہ افسانے کی تکنیک میں اسکیچ کا تجربہ بھی کیا ہے مثلاً "کالج سے گھر تک" وغیرہ وغیرہ۔

نفسیاتی تجزیے کے رجحان کو ان کا افسانہ "چائے کی پیالی" بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔

وقار عظیم ۔ اس طرح کا سب سے پہلا افسانہ "دو فرلانگ لمبی سڑک" کرشن چندر نے لکھا ہے۔

عبادت ۔ یہ تو ماخوذ ہے جس کا حوالہ نہیں دیا گیا اور اس طرح انہوں نے ادبی دیانت داری کا خیال پوری طرح نہیں رکھا۔

وقار عظیم ۔ یہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اعتراف نہ کر کے ایک اخلاقی غلطی کی ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جس نے اُردو میں لکھا ہے اس سے افسانہ کی روایت میں ایک اضافہ ضرور ہوا۔

انتظار حسین ۔ اس نقطۂ نظر سے یہ اعتراض تو بیجا ہی پر بھی کیا جا سکتا ہے ان کا افسانہ "گریسوکوٹ" غیر زبان سے لیا گیا ہے۔

عبادت ۔ حوالہ دیے بغیر ایسا کرنا ایک معیوب بات ہے۔

وقار عظیم ۔ میں اخلاقی پہلو سے آپ سے بھی زیادہ اس کی مذمت کرتا ہوں لیکن اس سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ اس نے ہم سے ہماری افسانوی روایت میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے۔

عبادت ۔ عسکری کے افسانے "کانچ سے گھر تک" میں ایک کانچ ہے۔ اس میں سماجی شعور بھی ملتا ہے۔ یہاں وہ اپنی یا فرد کی ذات میں گم ہونے کی کوشش نہیں کرتے دوسری چیزوں کے افسانوں میں نیچے کہ وہ سماں یا فضا پیدا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ "چائے کی پیالی" خوبصورت افسانہ ہے۔ یہ رجحان ان کے یہاں روسی ناولوں سے آیا ہے۔ جو اُس اور پروست کا ان پر اثر ہے۔ انہوں نے ان دونوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے انداز کو برتنے کی کوشش کی ہے۔

تیسری چیز عسکری کے ہاں وہ ہے جو "پسلن" میں ہے۔ یہ عصمت کے "لحاف" کی ایک دوسری شکل ہے۔ اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ خواہ مخواہ لکھا گیا ہے۔

وقار عظیم ۔ تجربے کے سلسلے میں جو چیز عسکری کی خصوصیت ہے اس کا اندازہ ان کے مجموعے "جزیرے" کے عنوان سے ہوتا ہے۔ اس میں ایک الگ دنیا آباد کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ ہر شخص اپنی ذات کو فکر کا محور و مرکز سمجھتا ہے۔ یہ رجحان اس روش کا ترجمان ہے کہ جب افسانہ نگار کو اجتماعی زندگی میں مرکوز نہیں ملتے تو وہ فرد کو افسانہ کا مرکز بناتا ہے اور اس کی ذہنی کیفیت کی مصوری کرتا ہے ——— اس رجحان کی بدولت "شعور کی رو" کی تکنیک بھی افسانہ میں داخل ہوئی۔

ندیم ۔ جب "چائے کی پیالی" اور "حرام جادی" جیسے نو بعض سنجیدہ حلقوں کی طرف سے یہ کہا گیا تھا کہ یہ مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔

انتظار حسین ۔ یہ بات تو عسکری صاحب نے "جزیرے" کے دیباچہ میں لکھی ہے کہ انہوں نے کون کون سا افسانہ کس کس افسانہ سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

عبادت ۔ اس کے باوجود عسکری کے فن میں بڑی انفرادیت ہے انہوں نے زیادہ سے زیادہ دس بارہ افسانے لکھے ہیں لیکن اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ ان کی بڑائی تو اس میں ہے کہ انہوں نے مغربی اثرات کے باوجود اپنے فن میں ایک اُپج پیدا کی ہے۔ ان کے ہر افسانے میں ایک اچھوتا پن نظر آتا ہے۔

وقار عظیم ۔ حسن عسکری نے جس خاص ماحول کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنایا ہے وہ بھی ان کے لئے مخصوص ہے۔

عبادت ۔ اور وہ اس تمام زندگی میں گھلے ملے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زندگی کا کتنا گہرا احساس ان کے فن میں نظر آتا ہے۔

انتظار حسین ۔ وہ بلند شہر کے علاقے کی زندگی کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ فن کے نقطۂ نظر سے یہ بات بڑی اہم ہے کہ افسانہ نگار جس ماحول سے پوری طرح واقف ہو اسی کی عکاسی کرے۔

انتظار حسین ۔ حقیقت میں حسن عسکری اور اس طرح کے دوسرے لوگ افسانہ نگار نہیں تھے، مختصر افسانے کی مکمل تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسا واقعہ یا تاثر پیش کیا جائے جو فرد کی زندگی پر پوری طرح سے اثر انداز نہ ہو لیکن حسن عسکری کے افسانوں میں مسلسل واقعات ملتے ہیں وہ DETERMINING FACTOR ہوتے ہیں۔ ان کا انداز طویل مختصر افسانوں کا سا ہے۔

عبادت ۔ عسکری صاحب نے طویل مختصر افسانے لکھنے کا بہت بڑا تجربہ کیا ہے لیکن یہ کہنا کہ انہوں نے مختصر افسانے نہیں لکھے ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے بعض بڑے اچھے مختصر افسانے بھی لکھے ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان کے جو ہر طویل مختصر افسانے ہی میں کھلتے ہیں۔ شاید یہ مزاج اور ہیئت کی ہم آہنگی کے شعور کا نتیجہ ہے

انتظار حسین ۔ میرا کہنا یہ ہے کہ مختصر افسانے کی تکنیک اس کی مکمل نہیں ہو سکتی کہ آپ تفصیل تلاش کریں۔

عبادت ۔ آپ "چائے کی پیالی" کو لے لیجئے۔ اس میں وہ نمام واقعات کو بڑی خوبی سے یکجا کرتے ہیں۔ اس میں ایک شخص کی ذہنی کیفیت کی ساری تفصیل موجود ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس افسانے میں ایک مکمل وحدت نظر آتی ہے اور یہ مختصر افسانے کی تکنیک ہے۔

انتظار حسین ۔ مختصر افسانے کے تصور میں صرف وحدت شامل نہیں ان کے افسانوں میں بہت سے واقعات کو ملا کر ایک مکمل مرتب ہوتی ہے جو فرد کی شکل کو بدل دیتی ہے۔

وقار عظیم ۔ مختصر افسانہ کی جو تعریف آپ نے کی وہ بہت محدود ہے۔ افسانہ کے فن میں جو بے شمار نئے نئے تجربے ہوتے ہیں ان میں نے افسانہ کی ہیئت ہی بدل دی ہے اور اب جس چیز میں آپ کو اجنبیت محسوس ہوتی ہے وہ جدیدت میں فن کی روایت بن چکی ہے افسانہ کے نئے فن میں بڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ ہمارا مرکزی تصور اب واقعات کے بجائے کرداروں کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

عبادت ۔ ساری دنیا میں مختصر افسانہ میں تجربے کا تسلسل نظر آتا ہے تکنیک کا تنوع اس صنف ادب میں مثالے شاید ہی کسی صنف میں ملے۔ اگر وہیں عسکری نے اس تسلسل کو باقی رکھا ہے اور اسی وجہ سے یہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے ہمارے مختصر افسانے کی تکنیک میں بڑی لچک پیدا کی ہے۔ البتہ ایک بات ہے وہ یہ کہ عسکری صاحب ان نفسیاتی گتھیوں کے ساتھ سماجی شعور کا اضافہ بھی کرتے تو افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا اس کمی نے ان کے یہاں ایک اجنبیت سی پیدا کر دی ہے۔

وقار عظیم ۔ لیکن جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کو معاصرانہ چشمک سے کیسے نیا فی ہے۔

عبادت ۔ لیکن مرنے زندگی کی جو سچائی ہیں تو عظمت نہیں ہے عظمت تو زندگی کے مسائل کی گہرائی تک پہنچنے میں ہے۔ ہم ذاتی یا انفرادی طور پر اس کا تقاضا نہیں کرتے جو زندگی کی تقاضا ہے۔

وقار عظیم ۔ مگر جب کوئی فن کار صرف عکاسی کو اپنا مطمح نظر بنا لیتا ہے تو آپ اس کو مسلک کیسے بدل سکتے ہیں۔ لیکن اس کی بلا جو عسکری نے فن کی جہت سے افسانہ کو آگے بڑھانے میں ادا کیا ہے۔

ندیم ۔ عسکری صاحب کے افسانے ایک فرد کے تاثرات کی عکاسی کرتے ہیں لیکن انہوں نے ایک فرد کے اتنے بہت سے تاثرات کو یکجا کر دیتے ہیں کہ مختصر افسانہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

عبادت ۔ مجھے اس سے اختلاف ہے، میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ سے اختصار زیادہ گہرا ہوتا ہے اور بات زیادہ دلکشی سے ذہن نشین ہوتی ہے عسکری صاحب نے یہی تکنیک استعمال کی ہے اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

وقار عظیم ۔ ایک بات البتہ ہے کہ اس طرح کہانی بن باقی نہیں رہتا۔

عبادت ۔ ان کا نقطۂ نظر صرف فضا کو پیش کرنا ہے مختصر افسانے کی تکنیک میں یہ لچک ہے وہ اس کی اجازت دیتی ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ صحیح ہے لیکن اس کے باوجود فن کے ارتقاء کا جب ذکر آئے گا تو عسکری کا نام نمایاں طور پر لیا جائے گا۔

عبادت ۔ عسکری صاحب کا نقطۂ نظر انفرادی ہے۔ جمنا مختلف کا نقطۂ نظر بھی انفرادی ہے لیکن وہ تحت الشعور اور تحلیل نفسی کی گہرائیوں میں چلے جاتے ہیں۔ "آہا" اور "بڑھا" ان کے بڑے اچھے افسانے ہیں جو مختصر افسانے کی تکنیک کو بڑی اچھی طرح سے پیش کرتے ہیں لیکن عسکری صاحب کی طرح وہ بھی ایک بیحسی فضا پیدا کرتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ انہوں نے جنس کو محض لذت کی خاطر نہیں بلکہ علمی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔

عبادت ۔ مجھے اس میں شبہ ہے۔ ان کے سارے کردار بیمار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سب لاشعور کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے ہیں اور خارجی اثرات کا احساس نہیں رکھتے۔ سماجی محرکات کا ان کے یہاں کوئی شعور نہیں اس لئے جو شخص ان کے فریب رہتا ہے وہ بھی بیمار ہو جاتا ہے۔ لاشعور کی دنیا میں رہنے والا انسان آخر کب تک ذہنی و جذباتی طور پر صحت مند رہ سکتا ہے۔

ندیم ۔ لیکن یہ ان کا ابتدائی دور ہو سکتا ہے۔ وہ خارجی حقیقت کے قائل ہی نہیں۔

عبادت ۔ لیکن افسانے تو جانتے ہیں ہم اس کے اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ منٹو نے اپنے آپ کو بہت محدود کر رکھا ہے ان کے افسانوں میں جو گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ قاری کو ایک ایسی جگہ پہنچا دیتا ہے جہاں دنیا کی ہر گہری اور روشنی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں اور اعصاب معطل محسوس ہوتے ہیں۔

ندیم ۔ اس نقطۂ نظر میں بے لچکی تو قدرتی ہے ۔ وہ خارجی حسن کا احساس نہیں رکھتے اور میرے خیال میں وہ محض اس لئے اپنے لاشعور کی عکاسی کرتے ہیں کہ خود خارجی دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور اب تو ان کے افسانوں میں تکرار یا تھکن کا احساس بھی ہونے لگا ہے ۔

عبادت ۔ وہ فرائڈ کو اپنا امام مانتے ہیں اسی لئے ان کے افسانوں میں یکسانیت اور تھکن پیدا ہو گئی ہے ۔۔۔ فرائڈ کے سہارے انسان آخر کب تک چل سکتا ہے ؟

ندیم ۔ لاشعور کی تمام گہرائیوں اور بھول بھلیوں کا جائزہ لینے پر بے فن کار کو زبان پر پورا عبور ہونا چاہئے ۔ یہ قدرت مغربی میں نہیں ہے ۔

عبادت ۔ فرائڈ کے لٹریچر پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ادبی مطالعہ بہت وسیع ہے لیکن ممتاز مفتی کے بارے میں یہ بات کبھی نہیں ۔ انہوں نے فرائڈ کو ضرور پڑھا ہے لیکن اس کے بعد اس سلسلے میں جو کام ہوا ہے اسے نہیں دیکھا ۔۔۔ شاید اسی وجہ سے وہ ان موضوعات پر بھی مفصل نہیں لکھ سکتے ۔

ندیم ۔ اب تو وہ خارجی حقیقتوں کے بھی سرے سے قائل نہیں ۔

عبادت ۔ ان کے علاوہ اس دور کے دو اور افسانہ نگار اہم ہیں ۔ بلونت سنگھ اور غلام عباس ۔

بلونت سنگھ نے ہمیں بہت سی نئی چیزیں دی ہیں ۔ بطور خاص وہ دیہات کے ترجمان ہیں لیکن وہ اس ترجمانی سے آگے بڑھ کر دیہاتی زندگی میں جو حسن اور توانائی ہے اس کو بھی محسوس کرتے ہیں ۔ مولانا صلاح الدین نے انہیں "پنجاب نگار" کہا ہے میں انہیں "حیات نگار" کہتا ہوں ۔ وہ پنجاب پر اس لئے نہیں لکھتے کہ پنجابی ہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں پنجاب میں زندگی نظر آتی ہے ۔ اس زندگی میں جو حسن اور توانائی ہے اس نے بلونت سنگھ کو متاثر کیا ہے وہ اس زندگی میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ انہیں اس زندگی سے ایک والہانہ دلچسپی ہے ۔۔۔ جو افسانے انہوں نے فسادات پر لکھے ہیں ان میں بھی اسی زندگی کا احساس ہے ۔ مثلاً "کالے کوس" میں یہ بات نظر آتی ہے یہ ایک بڑی معرکۃ الآرا کہانی ہے تقسیم پر بڑی ہیجان انگیز چیزیں لکھی گئیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ ہیجان انگیز چیزیں ہی لکھی گئی ہیں ۔ بلونت سنگھ نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ تقسیم کے وقت لوگ کس طرح محسوس کر رہے تھے ۔ کس طرح زندگی بسر کر رہے تھے ۔ ہجرت کے بارے میں ان کا کیا خیال تھا ۔

"کالے کوس" میں ایک ماں اداس کا جتھا مسلمانوں نے پنجاب سے ہجرت کی غرض سے پاکستان کی طرف چل دیتے ہیں اور چلتے چلتے جب منزل پر پہنچتے ہیں تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہم پہنچ گئے ۔ یہاں بھی زندگی ویسی ہے جیسی کہ وہاں تھی ۔ وہی سبزہ ہے ویسی کھیتیں ہیں ، ہر چیز ویسی ہی ہے ۔۔۔ اس سے یہ چلتا ہے کہ بلونت سنگھ ہر موضوع پر لکھتے ہوئے انسانی زندگی کی دلکشی اور دلآویزی کو اپنے پیش نظر رکھتے ہیں ۔ وہ اسی کے افسانہ نگار ہیں ۔

انتظار حسین ۔ ان کے وہ افسانے جو پنجاب کے فسادات کے بارے میں لکھے گئے ہیں مختصر افسانے کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں ۔ ان کے افسانوں میں ایک ایسا ربط ہے جو یکسانی کی حد تک پہنچ جاتا ہے ، یہ تکنیک ناول کی ہے ۔

عبادت ۔ جس چیز کی طرف انتظار صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ بلونت سنگھ کی خامی نہیں ہے ۔ بلکہ یہ تو ان کی خوبی ہے ۔ ان کے ایسے افسانے فنی اعتبار سے مربوط ہیں ۔۔۔ ان میں وحدت ہے ، تسلسل ہے ۔۔۔ اور یہ وحدت اور تسلسل درحقیقت زندگی کے تسلسل احساس کا نتیجہ ہے ۔ ناول کی تکنیک اس میں نہیں ہے ۔۔۔ ان افسانوں میں تفصیل ضرور ہے لیکن اس کے باوجود وہ COMPACT ہیں اور یہی ان کی خوبی ہے ۔

وقار عظیم ۔ یہ بات ہر اس افسانہ نگار میں ہوتی ہے جو زندگی کو جامد نہیں سمجھتا اور اس کے تسلسل کا قائل ہوتا ہے ۔

انتظار حسین ۔ ایسے لوگوں کے افسانے ناول اور طویل مختصر افسانے کے تحت آتے ہیں ۔ یہ ان کی کاہلی ہے کہ مختصر افسانے لکھتے ہیں ۔

ندیم ۔ میرے خیال میں یہ بحث تکنیک کی ہے ۔

عبادت ۔ مختصر افسانے کی تکنیک کو اتنا محدود نہیں کیا جا سکتا کہ جس افسانے میں تفصیل ہو اس کو افسانہ ہی نہ کہا جائے ۔ یہ تفصیل اور پھیلاؤ اگر وحدت کے روپ میں سامنے آئے تو اس کو مختصر افسانہ کیوں نہ کہا جائے ۔۔۔ پھر افسانے کی تکنیک اس وقت تجربے کے دور سے گزر رہی ہے ۔ طویل مختصر افسانہ ، مختصر افسانے کی تکنیک میں ایک اہم تجربہ ہے ۔ بلونت سنگھ نے بھی ایسا ہی ایک تجربہ کیا ہے ۔

وقار عظیم ۔ اس دور میں سوائے منٹو کے تمام اچھے لکھنے والوں کے یہاں افسانے نے آخری حقہ نکلی کی طرف مائل کرتا ہے ۔ اس سے قبل یہ عجیب ہو سکتا تھا ۔ لیکن اب عجیب نہیں رہا ۔

انتظار حسین ۔ بلونت سنگھ اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ انہوں نے پنجاب کی

زندگی ہیں سکھوں کے طبقے کی ترجمانی کی، ندیم صاحب نے پنجاب کے دیہات کی ترجمانی کی تھی لیکن سکھوں کو پیش نظر نہیں رکھا تھا۔

عبادت ۔ بلونت سنگھ ہی کی طرح اس دور میں ایک اور چابکدست فنکار غلام عباس نظر آتے ہیں۔ غلام عباس بڑے ہوشیار افسانہ نگار ہیں وہ افسانہ نگاری کے فن اور اس کی تکنیک کا بڑا گہرا تصور رکھتے ہیں ——— فن کی لطافتوں اور نزاکتوں کا احساس ایک لمحے کو بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ ان کے موضوعات مختلف ہیں لیکن ان موضوعات میں جو چیز سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ موضوع کی تہ تک پہنچتے ہیں، اس کی تمام باریکیوں کو تلاش کرتے ہیں اور ان تمام پہلوؤں پر ان کی نظر بڑی گہری پڑتی ہے۔ انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی جس لطیف انداز میں انہوں نے کی ہے، اور وہ افسانے میں اس کی صرف چند مثالیں مل سکتی ہیں ——— البتہ وہ ان تمام باتوں کو تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کرتے۔ ان کے اندر میں رمزیت ہے ——— اور یہ رمزیت ان کے افسانوں میں بڑی گہرائی اور گیرائی پیدا کر دیتی ہے ——— مختصر افسانے کی یہی خصوصیت ہے۔ غلام عباس نے اپنے فن میں اس کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔

وقار عظیم ۔ غلام عباس نے فن سے بڑی وفاداری برتی ہے۔ ان کے فن میں تصنع نظر آتی ہے۔ اکثر افسانہ نگار کہل انگاری رکھتے ہیں اور یہ بات افسانہ نگاری کے فن کو بڑا نقصان پہنچاتی ہے غلام عباس کہل انگار نہیں ہیں۔ وہ دس سطروں کے افسانوں میں ناول کی سی بھجکاوی کرتے ہیں۔ ایک ایک لفظ پر غور کرنا، چل پر چل بچانا اور سوچنا، فن کے لوازم ہیں اور یہ لوازم غلام عباس کے پاس موجود ہیں۔

انتظار حسین ۔ راجندر سنگھ بیدی نے افسانے کو جہاں چھوڑا تھا۔ غلام عباس افسانے کو اس سے آگے لے گئے ہیں۔ ان کا اسٹائل بڑا انجھا ہوا ہے۔ لفظوں کی دروبست اور لفظوں کی ہیئت جو مختصر افسانے کے لئے ضروری ہے وہ غلام عباس کے اس موجود ہے۔ وہ افسانے کا POINT OF VIEW متعین رکھتے ہیں۔ نقارہ نہیں بجاتے۔

عبادت ۔ ان کے فن کی یہ آہستہ روی اور متوازن گفت و شنید ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ وہ بڑے دھیمے آدمی ہیں۔ ان کی شخصیت میں بڑا توازن ہے اور یہی چیز ان کے فن پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ندیم ۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خاصے معمر ہیں اور انہوں نے بہت بعد میں افسانے لکھنے شروع کئے ہیں۔

وقار عظیم ۔ شروع میں انہوں نے بچوں کے لئے بھی کہانیاں لکھی ہیں جن کے لئے بڑی احتیاط اور مسلسل ہوش کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے اس چیز نے بھی ان کے فن کو متاثر کیا ہے۔

محمد طفیل ۔ یہاں فرحۃ العین اور شفیق الرحمٰن کا ذکر کرنا چاہئے۔

عبادت ۔ شفیق الرحمٰن اور قرۃ العین حیدر نے اونچے طبقے کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شفیق الرحمٰن کے یہاں کوئی سنجیدہ فضا نہیں ہے۔ وہ زندگی کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کو دیکھتے ہیں۔ ان کا فن ایک خوش وقتی کے احساس کی پیداوار ہے۔ زندگی ان کے نزدیک ایک سہرا خواب ہے جس میں قہقہے ہیں، شوخیاں ہیں، اٹکھیلیاں ہیں، ہلچلیں ہیں ——— ظاہر ہے زندگی کے ان پہلوؤں میں گہرائی اور گیرائی نہیں ہے لیکن یہ زندگی کے کچھ پہلو ہیں ضرور۔ یہی وجہ ہے کہ شفیق الرحمٰن کو لوگ دل خوش کرنے کے لئے پڑھتے ہیں ——— ان کا تاثر گہرا نہیں ہوتا ——— لیکن قرۃ العین اس زندگی کو نسبتاً زیادہ قریب سے دیکھتی ہیں ——— ان کے یہاں زندگی صرف ایک سنہرا خواب ہی نہیں ہے ——— وہ مسرتوں کے ساتھ اونچے طبقے کی تلخیوں کو بھی شدت کے ساتھ محسوس کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں قہقہوں کے ساتھ آنسو بھی ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مسرتوں کے ساتھ غموں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ مسرور اور نیلی تال کی فضاؤں میں زندگی کی تلخیاں محسوس ہوتی ہیں اور وہ ان سب کی بڑی فن کارانہ تصویر پیش کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے۔ وہ شفیق الرحمٰن کے مقابلے میں بڑی فن کار ہیں۔

انتظار حسین ۔ شفیق الرحمٰن گڑگڑ نہیں دیتے "گڑگڑ" کی سی بات کر دیتے ہیں ——— قرۃ العین تھوڑا سا گڑگڑ بھی دے دیتی ہیں۔

وقار عظیم ۔ دونوں نے زندگی کے ایک ہی طبقے کی عکاسی کی ہے لیکن شفیق الرحمٰن کے مقابلے میں قرۃ العین کے یہاں اس طبقے کی زندگی کا شعور زیادہ ہے۔

عبادت ۔ قرۃ العین کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اونچے طبقے کی ساری تفصیل پیش کرتی ہیں اور اگرچہ ان کی قائم کی ہوئی فضا قدرے رومانی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ افسانے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ رومانی فضا میں اس زندگی کا کھوکھلا پن کچھ زیادہ ہی واضح

ہوتا ہے ——— اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں ایک ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اس طبقے کی زندگی کے گھناؤنے پن پر پردہ نہیں ڈالتیں، بلکہ اس کو اجاگر کرتی ہیں۔

ندیم ۔ انہوں نے زندگی کی خوبیاں اور خامیاں بغیر کسی تعصب کے پیش کر دی ہیں۔ البتہ ان کے پاس سماجی رشتوں کا شعور نہیں ہے لیکن جہاں ان کے افسانوں میں دوسرے طبقوں کا ذکر آیا ہے وہاں ان کے ساتھ ایک ہمدردی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

عبادت ۔ قرۃ العین کے فن میں سب سے زیادہ جو چیز اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان کی تخیل ہے ——— وہ اس تخیل کے سہارے بہت اونچا اڑتی ہیں ——— یہ پرواز تمام رومانی ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ اڑنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ لیکن اس اڑان میں کبھی کبھی ایسی ٹھوکریں بھی آتی ہیں جہاں ان کے ساتھ اڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ان کا پڑھنے والا ایک لمحے میں زمین پر آجاتا ہے ——— اسی جگہ جہاں سے اس نے اڑنا شروع کیا تھا۔

وقار عظیم ۔ جس طرح عصمت نے بعض افسانہ نگار خواتین کو متاثر کیا ہے اسی طرح قرۃ العین حجاب امتیاز علی سے ایک حد تک متاثر ہوئی ہیں ——— البتہ حجاب کی طرح ان کے یہاں زندگی سے بے تعلقی باقی نہیں رہتی۔

عبادت ۔ لیکن اس کے باوجود ان کی رومانی پرواز انہیں زندگی سے کسی حد تک دور ضرور لے جاتی ہے۔ بعض اوقات قوتِ ان کی یہ رومانی پرواز اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ ہم ان کا ساتھ نہیں دے سکتے اور وہ ہمیں مبہم معلوم ہونے لگتی ہیں ——— یہ ابہام ان کی تکنیک میں بہت واضح ہے ——— درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخیل کو پوری طرح اپنے قابو میں رکھنے پر قادر نہیں ہیں۔ تخیل کی یہ گرفت جس جگہ بھی ان کے یہاں ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ ان کا فن ایسی اُن جان گھاٹیوں میں بہہ نکلتا ہے جہاں ہم اجنبی ہو جاتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ ان کی فطرت میں مشرقیت اور مغربیت کا اتنا میل ہے کہ ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے والدین سے مشرقی روایت کا احترام اور مغربیت کا اثر بھی لیا اور یہ دونوں ان کی تحریر میں بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ کبھی اُردو میں سوچتی ہیں اور کبھی انگریزی میں، اور اس طرح ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔

ندیم ۔ قرۃ العین نے منظر نگاری کے سلسلے میں کرشن چندر کی طرح بڑے گہرے مشاہدے کا ثبوت دیا ہے۔

عبادت ۔ قرۃ العین کے یہاں مناظر کا بڑا شدید احساس ہے اس کا بیان وہ دل نشیں انداز میں کرتی ہیں لیکن کرشن چندر کا احساس ان سے کہیں زیادہ شدید اور اس کا مشاہدہ کہیں زیادہ تیز ہے اس کا انداز بھی پختہ ہے۔ اس لئے وہ بڑا فن کار ہے۔

انتظار حسین ۔ بہر حال قرۃ العین نے اُردو افسانے میں کچھ نہ کچھ اضافے ضرور کئے ہیں۔

عبادت ۔ ایک اور بات جو اس دور کے لکھنے والوں میں نئی ہے وہ یہ کہ اس زمانے میں گھریلو ماحول کی عکاسی کا شعور بھی خصوصاً بعض خواتین افسانہ نگاروں میں پیدا ہوا ہے۔ گھریلو ماحول میں جو دلکشی ہوتی ہے اس کو ہماری افسانہ نگار خواتین نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس زمانے میں ممتاز شیریں نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اس سے قبل افسانہ نگار خواتین کے موضوعات ایک FRUSTRATION سے تعلق رکھتے تھے یہ افسانہ نگار خواتین نارمل نہیں تھیں۔ انہیں گھریلو ماحول کی دلکشی نصیب ہی نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ اس کو موضوع کس طرح بناتیں۔ ان کا موضوع تو چند نامسعود خواہشات کے سوا اور کچھ نہیں تھا ——— ممتاز شیریں نے ان کے برخلاف گھریلو ماحول کی ترجمانی بڑی کامیابی سے کی۔ ان کے مجموعے "اپنی نگریا" میں اس موضوع پر اچھے افسانے ملتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ ممتاز شیریں نے جنوبی ہند کی زبانوں کے افسانوں سے اثر قبول کیا ہے۔ ان زبانوں کے افسانوں میں فن اور زندگی کا جو امتزاج ہے اس سے بعض اچھی باتیں لی ہیں۔ انہوں نے ان زبانوں سے بعض افسانوں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔

عبادت ۔ ممتاز شیریں کے افسانوں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ان کے پاس مخصوص افسانے کی تکنیک کا بڑا گہرا شعور ہے افسانے میں تکنیک کا جو تنوع ہے اس کو انہوں نے بڑی خوبی سے برتا ہے لیکن تنوع کا یہ شعور ان کے یہاں تکنیک کے ایک SYNTHESIS کی صورت میں نمایاں ہے۔ ان کی شخصیت میں یہ شعور رچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

انتظار حسین ۔ خواتین افسانہ نگاروں نے جو روایت قائم کی تھی،

اس کو کسی حد تک ممتاز شیریں نے اپنایا ہے، کسی حد تک تو ملتا ہے۔

عبادت ۔ میرے خیال میں ممتاز شیریں نے ہماری دوسری خواتین افسانہ نگار کی کے مقابلے میں زندگی کے صحت مندانہ پہلوؤں کی ترجمانی کی۔ دوسری افسانہ نگار خواتین نے ان صحت مندانہ پہلوؤں کو نظر انداز کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان پہلوؤں سے انہیں تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ تو ایک گھٹن کی پیداوار تھیں۔ ممتاز شیریں کے حالات مختلف تھے اس لئے وہ اس ڈگر کو چھوڑ چل سکیں جو ان سے قبل کی افسانہ نگار خواتین نے بنائی تھی۔

بہرحال ممتاز شیریں کے ہاں دوسری خواتین افسانہ نگاروں سے ایک انحراف ملتا ہے۔

انتظار حسین ۔ اس میں صحت مند اور غیر صحت مند ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے عصمت وغیرہ زندگی کو ایک اور زاویے سے دیکھتی ہیں اور ممتاز شیریں کا زاویہ نظر مختلف ہے۔

عبادت ۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ عصمت کے ابتدائی دور کے افسانوں میں وہ آسودگی کا احساس نہیں جو ممتاز شیریں کے یہاں ملتا ہے ——— عصمت وغیرہ کے یہاں ایک تشنج کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ میں ان کے فن کی صداقت و واقعیت سے انکار نہیں کرتا۔ زبان کے فن کو کم مرتبہ سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں ایک نارمل کیفیت کم ہے۔

انتظار حسین ۔ تعجب ہے عبادت صاحب کو یہ احساس کیسے ہوا؟ ہاجرہ اور خدیجہ کے افسانوں میں بھی تو زندگی ہنستی کھیلتی نظر آتی ہے۔ ہاجرہ، خدیجہ اور عصمت نے ہندوستان کی عورتوں کی اکثریت کی ترجمانی کی ہے اور شیریں نے آسودہ طبقے کی۔

عبادت ۔ یہ شاید صحیح نہیں، ممتاز شیریں نے ایک خاصے بڑے طبقے کی نمائندگی کی ہے۔ پھر انہوں نے ترسے طبقے کی گھریلو زندگی پیش کی ہے جس کو خواتین افسانہ نگار نے اس سے قبل اہمیت نہیں دی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری خواتین افسانہ نگار کو اس سے قبل گھریلو زندگی کا صحیح احساس ہی نہیں تھا۔ ممتاز شیریں نے اس کی ابتدا کی۔

وقار عظیم ۔ اصل میں دونوں کے ماحول کا فرق ہے۔ آجرہ اور عصمت وغیرہ نے یوپی کی مسلمان عورت کو دیکھا ہے جہاں تعلیم کا ہیضہ پھیلا ہوا ہے اور وہاں ماحول سے بغاوت زیادہ نمایاں ہے۔ بمبئی کے افسانوں کی عورت ان محرکوں سے گزر گئی ہے۔ اس نے اپنے ماحول سے پوری طرح مطابقت پیدا کر لی ہے۔ اس نے آزاد ہو کر بھی گھر کی جنت سمجھنا سیکھا ہے

عبادت ۔ آزاد ہونے کے باوجود گھریلو زندگی کا احساس تو ابھی تک ہے

اس میں ایک صحت مندانہ کیفیت ہے۔ ہماری افسانہ نگار خواتین نے اس کو اہمیت نہیں دی۔

وقار عظیم ۔ یقیناً حقیقت نگاری دونوں طرح کی لکھنے والیوں کے یہاں ہے عصمت، شیریں کے ماحول میں ہوتیں تو غالباً اس سے زیادہ اچھے افسانے لکھتیں اور شیریں لکھنؤ میں ہوتیں تو شاید اس سے کہیں تلخ لکھتیں۔

انتظار حسین ۔ غالباً اب تقسیم کی لائن آگئی ہے۔

عبادت ۔ تقسیم کے بعد افسانے میں ایک طرح کا انحطاط پیدا ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ اس وقت تک لکھنے والوں میں سے بیشتر اپنا کام کر چکے تھے، تقسیم کے بعد ان کے موضوعات ختم ہو گئے ——— بات یہ ہے کہ جن راہوں پر یہ چل رہے تھے وہ سب تاریکی میں گم ہو گئیں۔ انہوں نے جو کچھ چاہا حاصل نہ ہو سکا۔ جس چیز کی تمنا تھی وہ نہ ملی۔ اس لئے ایک احساس شکست FRUSTRATION عام ہوا۔ ان پر ایک مایوسی طاری ہو گئی۔ مایوسی کبھی کبھی اثبات پسند بھی بنا دیتی ہے مثال کے طور پر کرشن چندر جو بہت بڑا فن کار ہے اسے تقسیم نے بڑا نقصان پہنچایا۔ اسے اپنے مقام کا احساس تک نہیں رہا۔ مثلاً اس نے اپنے اوپر مقصدیت اور افادیت کو اتنا طاری کر لیا ہے اور ایک تحریک کے ساتھ ایسی جذباتی وابستگی کا اظہار کیا ہے کہ کہیں کہیں اس کا فن لڑکھڑا جاتا ہے۔

ندیم ۔ یہ کیفیت تو تقسیم کے بعد دونوں قسم کے افسانہ نگاروں کے ہاں ہوئی ہے ترقی پسند وغیرہ ترقی پسند ترقی پسند اگر زوال پر آتے ہیں تو داخلیت پسند بھی اچھا ادب نہیں پیش کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی پسند کچھ اور توقعات رکھتے تھے لیکن FRUSTRATION ہونے کی وجہ سے وہ فن کو سنبھال نہ سکے۔ دوسرے افسانہ نگاروں نے ان حالات سے فرار کا راستہ اپنایا اور موجودہ حالات کا ذکر کرنے میں ہی بڑائی سمجھنے لگے۔ اکثر اوقات انہوں نے انسانیت کا مذاق اڑایا۔ اس طرح دونوں افراط و تفریط کا شکار ہوئے۔

انتظار حسین ۔ یہ گروہ ایک خاص سیاسی ماحول میں پیدا ہوا تھا جب تقسیم ہوتی ہے تو ایک بریک سا آجاتا ہے، یاد ہے آپ نے وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ اب کیا ہوا اور چیزوں کو کس انداز سے لکھا جائے؟

عبادت ۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے جو نقطۂ نظر قائم کیا تھا بڑا باشعور تھا۔ وہ انگریز کے خلاف صرف جذباتی رد عمل نہیں تھا بلکہ اس میں طبقاتی آویزش اور سماجی شعور کا بھی احساس

بھی تھا اور یہ شور تقسیم کے بعد بھی قائم رہا ہے۔ انگریز چلا گیا تو ہمارے افسانہ نگاروں نے سمجھا کہ ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہے۔ یہ احساس زیادہ بڑھا، یہاں تک کہ لوگ اسے پیش کرنے میں انتہا پسند ہو گئے اور اس طرح فن کا خون ہوا۔

ندیم ۔ ڈاکٹر نامیر نے بھی یہی بات کہی تھی جو انتظار صاحب نے ابھی بیان کی ہے کہ ترقی پسند تحریک کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا جو تقسیم کے ساتھ ختم ہو گیا۔ یہ تحریک BRITISH IMERIALISM کی تمازت کے خلاف ایک جھلاتے کی حیثیت رکھتی تھی۔ انگریز چلا گیا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی، میں نے انہیں بتایا کہ یہ تحریک بہتر زمین کی تلاش تھی اس لئے نقطۂ نظر اب بھی پوری شدت سے قائم ہے۔ ہاں یہ صورت سے کہ ترقی کے مطابق نتیجہ نہیں نکلا اور لیڈروں نے اسے جس طریقے سے نظر انداز کیا ہے اس سے لکھنے والے کچھ بہت سے ہو گئے ہیں۔

انتظار حسین ۔ تقسیم کا اثر ہمارے ذہنوں پر بہت گہرا پڑا ہے، سماجی فضا اور سیاسی ماحول یکلخت بدل گیا۔ انگریزوں کا اثر ضرور رہا لیکن انگریز حاکم سامنے سے ہٹ گئے۔ ادھر ہمیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب قومی حکومت ہے۔ اس طرح ہم اپنے طریق کار متعین نہیں کر پائے پہلے ہندو، سکھ اور مسلمان اکٹھے تھے۔ سماجی تانا بانا تھا، اشتراک تھا زندگی میں تسلسل تھا۔ اب یہ لوگ بٹ گئے اور ایک طرح کا SOCIAL DISINIEGRATION کا دور آ گیا اور ان نئے حالات میں لکھنے والوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔

عبادت ۔ یہ بات بڑے پتے کی کہی ہے۔ بلقانی کشمکش میں کوئی فرق نہیں پڑا لیکن سماجی انتشار کا اثر ذہنوں پر بہت گہرا ہے اس سے ہماری جو روایت تھی اور جس کا ہم نے تجزیہ کیا ہے اس پر اس رد و بدل کا اثر یقیناً ضرور ہوا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں کا ماحول کیسر بدل گیا۔ ان کے لئے یہ دشواری پیدا ہو گئی ہے کہ برسوں سے وہ جس ماحول کا گہرا اثر لکھتے تھے اب اس کے متعلق وہ صرف تصور سے کام لیتے ہیں، اس طرح بہت سوں نے تو لکھنا ہی چھوڑ دیا، مثلاً حسن عسکری۔ انہوں نے پاکستان آنے کے بعد یہ کہا کہ اب میں آخر کس چیز کے بارے میں لکھوں۔ میرا ماحول جس سے میں جذباتی رابطہ رکھتا تھا اب پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں نے لکھنا ترک کر دیا ہے۔

وقار عظیم ۔ تخصیص خاص طرح کے سوچنے والے کی نہیں ہے۔

انتظار حسین ۔ خاص ماحول میں پرورش پانے والے کی ضرور ہے۔ آپ تصور کیجئے دلی کے کوچہ چیلان میں ایک لڑکی رسم و رواج کی کتنی پابند ہوتی تھی، لیکن وہ کراچی پہنچنے کے بعد ضابطہ اخلاق اور روایات کو توڑ دیتی ہے تو احمد علی، جو اسے کوچہ چیلان میں جانتے تھے، اب اس کے متعلق کیا لکھیں، کیسے لکھیں۔

عبادت ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جو اتنی بڑی رقعہ بیلی پیدا ہے اس کے متعلق ہمارے افسانہ نگاروں نے کیوں کم سوچا ہے۔ اس پر تو بڑی EPIC لکھی جا سکتی ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا کتنا بڑا سانحہ ہے۔

ندیم ۔ اس کی وجہ وہی ہے جو انتظار صاحب نے بتائی کہ وہاں کے لکھنے والے نئے حالات سے ناواقف ہیں اور یہاں کے رہنے والے ان سے اجنبی ہیں۔

عبادت ۔ تو ہمارے لکھنے والے ان VALUES کو تسلیم کیوں نہیں کرتے شاید یہ وجہ ہے کہ یہ ایک بحرانی دور ہے اور ابھی اتنا فاصلہ پیدا نہیں ہوا کہ اس پر سوچا جا سکے۔ ہمارے انتظار حسین کے کسی دوسرا افسانہ نگار نے اس موضوع پر توجہ نہیں کی، حالانکہ یہ تمام کیفیات اکثر پر بیت چکی ہیں۔

انتظار حسین ۔ سب پر متعین کر لیجئے کہ اس کے متعلق کون لکھے۔

وقار عظیم ۔ ہمیں تو اس وقت ان نئے حالات میں افسانہ نگاری شروع کرنے والوں کا جائزہ لینا ہے اور دیکھنا ہے کہ اس کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے۔

عبادت ۔ پرانے لکھنے والوں میں بھی بعض ایسے ہیں جنہوں نے اس دور میں بہت اچھے افسانے لکھے ہیں مثلاً ندیم اور ان میں بڑا حسن ہے زاویۂ نظر ہے لیکن اب چونکہ CONCENTRATION نہیں اس لئے اچھی تخلیقات نہیں ہو سکیں، اس سے ہم جمود کا مذاق نہیں لگا سکتے، ہاں یہ دیکھنا ہے کہ تقسیم کے بعد جو افسانہ نگار سامنے آئے ہیں انہوں نے کونسے نئے تجربے کئے ہیں جن سے افسانے کی روایت آگے بڑھتی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے انتظار حسین کے افسانوں کو میں خاص اہمیت دیتا ہوں، انہوں نے زندگی کی مترنم انداز اور تقسیم کے المیہ کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے۔ اس میں ایک انسانی نقطۂ نظر ملتا ہے انہوں نے زندگی کے منتشر پہلوؤں کو بڑی اچھی طرح پیش کیا ہے۔

محمد طفیل ۔ ان کے افسانوں کی یکسانیت عجب بن گئی ہے۔

عبادت ۔ اس یکسانیت کو میں ان کی خوبی سمجھتا ہوں، ان پر روسی حقیقت پسندی کا بڑا گہرا اثر ہے خصوصاً ٹالسٹائی اور چیخوف کا۔ یہ یکسانیت اصل میں تکنیک کا وصف ہے۔ یہ زندگی کو ایک خاص طرح سے محسوس کرنے کا انداز ہے۔

ندیم ۔ میرے خیال میں انہوں نے موضوع کی تخصیص کر لی ہے جو ہر بڑے افسانہ نگار کو کر لینی چاہئے۔ انہوں نے جس خاص ماحول اور خاص طبقے

کر رکھا ہے اسی کی عکاسی کی ہے۔

عبادت۔ طبقے کی وضاحت کیجئے۔

ندیم۔ نچلا درمیانی طبقہ، چھوٹے دکاندار، ملازمت پیشہ لوگ وغیرہ۔ ان کے ہاں ایک عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ سماجی شعور تو ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے بھرپور اظہار سے کترا کر نکلنا چاہتے ہیں۔

عبادت۔ طبقے کے بارے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صرف معمولی دکانداروں کی نہیں بلکہ لوئر مڈل کے خاص اضلاع کے متوسط طبقے کی ترجمانی کی ہے یعنی بلند شہر کے آس پاس کا علاقہ۔ انتظار کے ہاں درحقیقت دو قسم کے ماحول ہیں، ایک تو وہ جو وہاں موجود تھا۔ دوسرا اس تبدیلی کے بعد جسے وہ سوچ سکتے ہیں۔ رہا سماجی شعور تو وہ اس کے قائل نہیں۔ ان کا تعلق درحقیقت اسی سکول سے ہے جس کے تحت ہم نے بیدی اور غلام عباس کو رکھا ہے۔ بالکل صحیح ہے کہ انہوں نے اپنے موضوع کی تخصیص کر لی ہے، ان کے پاس ماحول کے ایلبے کا انبار زیادہ ہے اور ان مسائل پر ان سے اچھے افسانے کسی نے نہیں لکھے۔

ندیم۔ ان کا نام بیدی اور غلام عباس کے ساتھ لینا زیادتی ہے لیکن ایک چیز انتظار کے بارے میں اور ہے وہ یہ کہ یہ چیخوف کی طرح جزئیات کو پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں لیکن کفایتی طور پر ان کے افسانوں میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ پلاٹ کو ہائی ٹائی ٹینشن دی گئی ہے۔

وقار عظیم۔ اس حد تک اس دور کے کسی افسانہ نگار نے اس اصول کی پابندی نہیں کی۔ ہی موضوع کی تخصیص جس سے تکرار کا احساس ہوتا ہے تو اس کا احساس انہیں خود ہوا ہے۔ اب وہ اپنے مانوس کردار کو نئے ماحول میں چھوڑ دیتے ہیں اور اس بدلے ہوئے ماحول میں اس کے احساس کی شدت کو بیان کرتے ہیں اس طرح ان کے تکرار کا احساس کم ہو گیا ہے۔ یہ چیز آگے بڑھی تو ان کے افسانوں میں یقیناً وسعت پیدا ہو گی۔ اس طرح یہ ایک نئی راہ ہے جو انہوں نے نئے لکھنے والوں کو سجھائی ہے۔

عبادت۔ اس نے ان کی تکنیک اور انداز بیان میں شدت پیدا کی ہے یا اسے شدت کہنے کے بجائے صحیح طور پر خلوص کے ساتھ پیش کرنا کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً "سائیکل بھی چوری گئی" میں ایک شخص پاکستان سے ہندوستان واپس جاتا ہے تو ریل میں جہاں کے پل پر سے گزرتے ہوئے جب وہ ہندوؤں کو پیسے پھینکتے نہیں دیکھتا تو خود بے اختیار ہو کر پیسے پھینکنے لگتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے بھرپور بیان سے ان کے افسانوں میں بڑا گہرا اور مستقل تاثر پیدا ہوتا ہے۔

ندیم۔ فسادات کے بعد جو افسانے لکھے گئے ہیں ان میں سے اکثر ناکام ہیں۔ موجودہ تبدیلیوں کے بارے میں سب سے پہلے انتظار حسین نے لکھا ہے اور ان کے افسانے کافی اچھے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ پلاٹ اور کردار کی روایتی ہم آہنگی سے انہوں نے بڑا انحراف کیا ہے۔

عبادت۔ انہیں معاشرت کی اہمیت کا احساس زیادہ ہے اور یہ چیز قارئین پر اسی طرح زیادہ واضح کی جا سکتی ہے۔ اگر کردار کے مدوجزر، حرکات و سکنات سے واضح کئے جا سکیں تو یہ کامیابی کی دلیل ہے۔

وقار عظیم۔ اس پورے ماحول میں صرف نچلے طبقے کی عکاسی نہیں بلکہ متوسط طبقے کی بھی ہے۔ ان چیزوں سے انتظار کو بڑا گہرا لگاؤ ہے۔ لیکن اس میں جب کوئی خامی نظر آتی ہے تو وہ اتنی تلخی سے اس کا ذکر کرنے میں کہ ماحول سے الگ معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ کہیں کہیں تو ایک بڑے cynic کا سا انداز ہو جاتا ہے۔ نیشتر کی کیفیت معلوم نہیں کس وجہ سے ہے۔

ندیم۔ انتظار حسین نئے لکھنے والوں میں نمایاں ترین ہیں۔

عبادت۔ ان کی تمام چیزوں میں وہی کیفیت ہے جو بلیزٹ مسگھ کے یہاں ہے، وہی حیات نگاری ہے، ان کو پڑھنے کے بعد اس زمانے کی زندگی کا بڑا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس معاشرت کے ساتھ ان کا انداز بیان پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ محاوروں اور لہجے کا استعمال کرداروں کی ذہنی سطح کے مطابق ہونا بڑی خوبی ہے۔ ان کے یہاں محاورہ ڈیڈی نذیر احمد کی طرح ٹھونسا ہوا نہیں ہے۔ وہ خیال کی روانی کے ساتھ آتا ہے۔ ماحول کی وضاحت میں بھی اس سے مدد ملتی ہے لیکن انہیں یہ بھی محسوس کرنا چاہئے کہ اس زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے جس سے، نہیں اتنی دلچسپی ہے، اب کون سی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ انہیں لہجے کے دھیمے پن میں ذرا سی شدت پیدا کرنی چاہئے۔

وقار عظیم۔ میں اس سے متفق نہیں۔ اس میں مزاج کو دخل ہے اور اگر اس سلسلے میں کوئی شعوری کوشش کی گئی تو تصنع پیدا ہو جائے گا۔

محمد طفیل۔ اگر یہ بقدر ضرورت پلاٹ پر بھی توجہ دینے لگیں تو ان کے افسانے زیادہ جاندار ہو جائیں گے۔ پھر ان کے افسانوں میں محاوروں کی

جو ابھر آتی ہے وہ بڑی طرح کھلتی ہے۔

وقار عظیم ۔ ان کے افسانوں میں جو محاورے آتے ہیں وہ ضرورت کے تحت آتے ہیں۔ چنانچہ ان کے حال کے افسانوں میں محاورے نہیں ہیں۔

محمد طفیل ۔ اگر ان کے حال کے افسانوں میں محاورے نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں انہوں نے ضرورت نہیں سمجھی بلکہ یہ کہ ان کے ہاں محاوروں کا اسٹاک ختم ہو گیا ہے۔

عبادت ۔ اب نئے لکھنے والوں میں اشفاق احمد رہ جاتے ہیں۔ یہ بہت ذہین افسانہ نگار ہیں اور اسی سکول کے مانندہ ہیں جس سے بلونت سنگھ اور انتظار حسین متعلق ہیں۔

وقار عظیم ۔ مجھے اس سے اختلاف ہے، بلونت سنگھ اور انتظار حسین نے ضرور کی تخصیص کر لی ہے لیکن اشفاق احمد نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے کئی افسانے بچوں کے متعلق ہیں جن میں انہوں نے ان کے نرم و نازک احساسات کی جو فن کارانہ ترجمانی کی ہے۔ بعض افسانوں میں وہ رومان پیش کرتے ہیں، ان کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو کو بڑی شگفتگی سے پیش کرتے ہیں۔ بچوں کے لئے ان کے دل میں بڑی محبت ہے اور وہ انہیں انسانیت کے مستقبل کی امانت سمجھتے ہیں۔ ان کا احترام کرتے ہیں اور یہ پوری انسانیت کی خدمت ہے۔ ہمارے اور کسی افسانہ نگار کے یہاں یہ بات نہیں۔

ندیم ۔ اشفاق کے نام افسانوں کا ایک فنی معیار ہوتا ہے، وہ باشعور افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی ثقافتی بنیادوں پر بھی کہانی لکھی ہے۔

وقار عظیم ۔ ان کی نظر ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔ لیکن جہاں ٹھہرتی ہے وہاں تمام جزئیات کا جائزہ لیتی ہے۔ انہوں نے پرانے ادب اور شعر کو بڑے حسن سے اپنے افسانوں میں رچایا ہے۔ غالب، حافظ اور میر درد ان سب کا کلام ان کے سامنے ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باقی طرز بیان میں بھی اس کی مطابقت کا خیال رکھنا پڑتا ہے جس سے ان کے افسانوں میں بڑی ہمواری اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مخلص فن کار ہیں اور ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

انتظار حسین ۔ پنجاب کے افسانہ نگار رمانسیہ طور پر پنجابی الفاظ لاتے ہیں لیکن اشفاق احمد اس امر کی شعوری کوشش اور اہتمام کرتے ہیں۔ اس سے تاثر کہیں بڑھ جاتا ہے۔

عبادت ۔ اس سے انتظار حسین، بلونت سنگھ اور اشفاق سب کام لیتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ ایک فرق البتہ ہے۔ انتظار حسین کو اس خاص طرح کے انداز سے فطری لگاؤ ہے۔ اشفاق اور بلونت سنگھ کے یہاں ہر جگہ اس کا انداز شعوری ہے۔ اس سے بعض اوقات خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے لیکن اشفاق احمد کی اس شعوری کوشش میں ہر جگہ یہ احساس موجود ہے کہ بیان کو فنی تخلیقات کے حسن و نادر میں بڑا دخل ہے اور اس لئے وہ ہمیشہ اس کے بنانے سنوارنے پر پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔

محمد طفیل ۔ انہوں نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کے بارے میں بھی کئی کامیاب افسانے لکھے ہیں۔

وقار عظیم ۔ وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک خاص قسم کے افسانے لکھنے کے لئے نہیں چنا۔

عبادت ۔ نئے لکھنے والوں میں اے حمید کا نام بھی رہ گیا۔

وقار عظیم ۔ نام تو کئی اور ہیں، مثلاً دیویندر اسر کا ذکر ضرور ہونا چاہیئے کیونکہ ہماری موجودہ زندگی میں جو انتشار پیدا ہو رہا ہے، اس کا ذکر نہ افسانہ نگاروں نے کیا ہے لیکن اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔ اس کے اظہار میں عموماً جھجک محسوس ہوتی ہے۔ اسر نے عام انداز کے خلاف اس معاملہ میں پوری جرأت کے ساتھ اس کی ذمہ داری ارباب سیاست پر رکھی ہے۔

عبادت ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے متعلق ایک واضح نقطہ نظر رکھتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ ایک وجہ یہ ہے اور دوسری یہ کہ جس ماحول میں اسر رہتے ہیں وہاں اظہار پر اتنی پابندیاں نہیں ہیں۔ ہمارے لکھنے والوں کو غالباً یہ اندیشہ بھی ہے کہ پڑھنے والے اتنے جذباتی ہیں کہ وہ لکھنے والے کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

——— جی ہاں، میں دیویندر اسر کا ذکر کر رہا تھا اور بتانا یہ مقصود یہ تھا کہ نئے لکھنے والوں میں صرف دو ہی نام نہیں بلکہ کئی نام ذہن کے مستحق ہیں لیکن ابھی ان کے کارناموں پر انفرادی حیثیت سے گفتگو شاید قبل از وقت ہے اس لئے بہتر ہے کہ ہم ان لکھنے والوں کی ایسی خصوصیات کا ذکر کر لیں جو سب میں مشترک ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض چیزیں نمایاں ہیں مثلاً ایک عام رجحان یہ ملتا ہے کہ کسی افسانہ نگار نے اپنے آپ کو فسادات کے موضوع سے ملوث کرنے

کی کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ غالباً ان لکھنے والوں کے نزدیک یہ بھی کہ آزاد اپنے لئے جگہ پیدا کرنی ہے تو نئے موضوع تلاش کرنے چاہئیں۔ پھر یہ کہ سب نئے لکھنے والے فن کی روایات کی پابندیوں کو بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس انتشار کے دور میں بھی روایت کو ٹھیس نہیں پہنچی اور نہ وہ پیچھے کی طرف گئی۔ موجودہ حالات میں یہ بھی فن کی بڑی خدمت تھی۔ دوسری چیز جو ان سب افسانہ نگاروں میں مشترک ہے، وہ زندگی کا احساس ہے۔ ہر ایک نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی خاص زندگی سے وابستہ کیا ہے اور اسی کو موضوع بنایا ہے مثلاً شوکت صدیقی کے وہ افسانے زیادہ کامیاب ہیں جن میں انہوں نے لکھنؤ کے نوابوں اور بیگموں وغیرہ کی زندگی کی مصوری کی ہے ——— نئے لکھنے والوں میں صرف انہی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اسے ایک نئے رنگ سے پیش کیا ہے۔ ان کے اس طرح کے افسانوں میں زندگی کے مسائل کا احساس نچلے طبقے کے لوگوں کو بھی ہے اور نوابوں اور بیگموں کو بھی۔

ندیم ۔ شوکت صدیقی بالکل نئے لکھنے والے نہیں ہیں۔ وہ کافی عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ شروع میں معمولی درجے کے افسانے لکھے ہیں لیکن اس دور میں اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔

عبادت ۔ نئے افسانہ نگاروں نے جو روایت قائم کی ہے اس میں ان افسانہ نگاروں کی کوششوں کے علاوہ اس روایت کی عظمت کو بھی بڑا دخل ہے، ہمارے افسانے نے بڑی عظیم روایت قائم کی ہے، اسے برقرار رکھنا ان لوگوں کے لئے ضروری تھا۔ نئے لکھنے والوں میں کوئی بھی ایسے CALIBR کا نہیں ہے جیسے ان کے پیش رو تھے۔ ان کی سطح اپنے پیش روؤں سے بہت نیچی ہے۔ ان کے احساس میں بھی وہ شدت نہیں جو پہلے افسانہ نگاروں میں تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کو نسبتاً کم دیکھا ہے۔ ان کے احساس میں شدت بھی نہیں ہے شعور میں پختگی بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں وہ عظمت نہیں ہے جو ان کے پیشروؤں کے فن میں نمایاں نظر آتی ہے۔

وقار عظیم ۔ ابھی یہ افسانہ نگار اپنی تخلیقی زندگی کی اس منزل تک نہیں پہنچے کہ ہم ان کے کارناموں پر کوئی قطعی حکم لگا سکیں لیکن ان کی تحریروں میں اس عظیم روایت کی موجودگی اور اس کی پابندی کا احترام ایسی چیزیں ہیں جنہیں مستقبل کے لئے نیک فال کہا جا سکتا ہے۔

عبادت ۔ ان سب کے یہاں اس رجحان کا احساس بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر رومانیت بلکہ کہیں کہیں سستی جذباتیت کی طرف مائل ہیں۔

وقار عظیم ۔ یہ صحیح ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہمارے پڑھنے والوں میں وہ ہمواری پیدا نہیں ہوئی کہ کسی چھوٹے سے واقعے کو موضوع بنا کر اس پر کچھ لکھا جا سکے، اور اس لئے یہ لکھنے والے رومانیت کے سہارے ہی آگے بڑھ رہے ہیں۔

عبادت ۔ ان میں سے بیشتر کے مزاجوں میں ایک فراری کیفیت ہے زندگی کا کوئی بہت واضح نقطۂ نظر بھی ان کے یہاں نہیں ہے اور جب تک کوئی واضح نقطۂ نظر سامنے نہ ہو فن پر بھی جھٹکا ہے۔ اس کو منزل سے ہمکنار ہونا نصیب ہوتا۔ ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں سے بیشتر کے فن کا یہی حال ہے۔

وقار عظیم ۔ اس فرار کی ایک شکل بعض لکھنے والوں کے ہاں نمایاں ہے اور وہ اس طرح کہ ان کے تقریباً آدھے افسانے ایسے ہیں جن میں زنانہ خانوں کا ماحول ہے۔ یہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے آنکھ چراتے ہیں۔ ان میں اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں اور اس لئے تخیلوں سے بھاگ کر ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں وہ چھپ کر تخیلوں کا مذاق اڑا سکیں۔

عبادت ۔ اے حمید ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں یہ رجحان ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کی جذباتی اور رومانی فضا اس کو ظاہر کرتی ہے۔ انہیں زندگی کی تلخیوں کا احساس ضرور ہے لیکن وہ ان تلخیوں کو برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے اگر یہ سکت ان کے ہاں ہوتی تو ان کے فن میں بڑی توانائی پیدا ہو سکتی تھی۔

وقار عظیم ۔ ایک وجہ اور بھی ہے کہ ان لوگوں نے (اتفاق اور انتظار کو الگ کر کے) جہاں زندگی کا مشاہدہ نہیں کیا وہاں دوسری طرف ادب اور فلسفہ کا بھی مطالعہ نہیں کیا کہ خیال میں وسعت پیدا ہوتی۔

عبادت ۔ لیکن اے حمید کے ہاں ایک چیز ہے یعنی زندگی کے مظاہر سے دلچسپی ——— ہر چند کہ اس دلچسپی میں بچپن کی سادگی اور معصومیت کا دخل ہے لیکن یہی ان کے فن کی جان ہے ——— زندگی کی سنگین حقیقتوں سے دامن بچا کر چلنے کے باوجود ان کے ہاں زندگی سے دلچسپی کا رجحان ضرور ملتا ہے جس کا اظہار وہ موسموں، پہاڑوں اور دریاؤں کے بیان میں کرتے ہیں۔

فنی پور کے افسانہ نگاروں میں اسے حمید کا فن اس اعتبار سے نفرد حیثیت رکھتا ہے۔

ندیم - لیکن خرابی یہ ہے کہ وہ اس میں توازن قائم نہیں رکھتے۔ بجائے اس کے کہ وہ حقیقت پسندی کی راہ پر چلتے انہوں نے رومانیت کا سہارا لیا۔

انتظار حسین - اصل میں ان کے ہاں COMMON MAN کا زاویہ نظر ملتا ہے۔ مصنف عام آدمی سے الگ نہیں دکھائی دیتا۔

عبادت - ان کے یہاں مطالعہ کا فقدان اور شعور کی سطحیت ہے اس لئے وہ ہر چیز کو رومان کی عینک سے ضرور دیکھتے ہیں لیکن ان کی خفت میں جو سادگی اور معصومیت ہے وہ اپنے انداز بیان کی دلکشی رکھتی ہے۔

محمد طفیل - اب حضرات ذکرہ ختم کر چکے لیکن میری ناچیز رائے ہے کہ اگر ہم تین چار افسانہ نگاروں کا ذکر اور کر لیتے تو اچھا تھا میری مراد چودھری محمد علی ردولوی، قدرت اللہ شہاب، نسیم اور ابوالفضل صدیقی سے ہے۔

عبادت - اس میں شبہ نہیں کہ ہم نے اپنی گفتگو میں بے شمار نام لئے ہیں لیکن یہ نام محض اس لئے نہیں لئے گئے کہ ہم انفرادی طور پر ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرنا چاہتے تھے۔ اصل مقصود یہ تھا کہ ہم ناموں کے ساتھ ساتھ یہ دیکھتے چلیں کہ ان کے انفرادی فن نے ہمارے افسانہ کی روایت کو آگے بڑھانے میں کیا حصہ لیا ہے۔

وقار عظیم - عبادت صاحب کا خیال بالکل صحیح ہے لیکن غالباً صاحب کا مقصد بھی غالباً یہی ہے کہ ان افسانہ نگار۔ دل نے بھی ہمارے افسانہ کی روایت کو کوئی نہ کوئی چیز دی ہے اس لئے روایت اور جدت کے تسلسل کے تذکرہ میں ان کا ذکر آنا ضروری ہے۔

محمد طفیل - جی ہاں! میرا بھی خیال ہے۔

وقار عظیم - تو پھر آیئے ان افسانہ نگاروں کے فن کے ان پہلوؤں پر گفتگو کر لیں جن کی بدولت ہماری افسانوی روایت کسی نہ کسی حد تک سے آشنا ہوئی ہے۔ سب سے پہلے چودھری صاحب کے افسانوں کو لیجئے۔

عبادت - چودھری صاحب خاصے پرانے افسانہ نگار ہیں اور بڑی مدت سے خاموشی کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور اسی خاموشی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جو خدمت ہمارے افسانے کی انہوں نے کی، اس کی داد بلند میں آنے والوں کو ملی۔

وقار عظیم - آپ کا اشارہ شاید ان خاص طرح کے افسانوں کی طرف ہے جن میں چودھری صاحب نے جنسی مسائل کو بڑے لطیف اور نازک فنی انداز میں پیش کیا ہے۔

عبادت - جی ہاں! بالکل انہی افسانوں کی طرف۔ جنسی مسائل کو افسانہ کا موضوع بنانے کی جو روش متوسط درجہ کے لکھنے والوں میں نظر آتی ہے اور جس کی مختلف صورتیں ہمیں منٹو، عصمت اور ممتاز مفتی کے افسانوں میں نظر آتی ہیں اس کی ایک نکھری ہوئی شکل چودھری محمد علی کے افسانوں میں ہے۔

وقار عظیم - جزبات ممتاز مفتی کا ذکر کرتے وقت ندیم صاحب نے فرمائی تھی وہ اس وقت یاد آ رہی ہے۔

ندیم - مجھے یاد نہیں رہی وہ بات۔

وقار عظیم - آپ نے فرمایا تھا کہ جنسی مسائل اور خاص کر ان مسائل کے نفسیاتی پہلو کی عکاسی کرنے کے لئے جس پر جس قدرت کی ضرورت ہے وہ مفتی کو میسر نہیں ــــ چودھری محمد علی کا امتیاز بیان کی یہی قدرت ہے۔

ندیم - اور اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کے ماحول اور اس کے کرداروں سے پوری طرح واقفیت اور بے تکلفی۔

وقار عظیم - چودھری صاحب کے بعض افسانے پڑھ کر تو مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ موضوع سے پوری واقفیت اور بیان پر پوری قدرت ہو تو سیدھی سادی کہانی میں بھی ایک طلسم کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین - یوں اس طرح کے طلسم کو قدرت اللہ شہاب نے بھی بہت باندھے ہیں۔

وقار عظیم - آپ کی اجازت سے میں آپ کے بیان میں تھوڑی سی ترمیم کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ قدرت اللہ شہاب نے طلسم باندھنے کی کوشش تو ضرور کی ہے لیکن طلسم باندھنے میں انہیں کامیابی ذرا کم ہی ہوئی ہے۔

انتظار حسین - مجھے اس معاملہ میں آپ سے اتفاق نہیں "یاخدا" ایک مکمل طلسم ہے۔

وقار عظیم - "یاخدا" کی حد تک تو سب آپ سے متفق ہوں گے لیکن یہاں ذکر مختصر افسانوں کا ہے اور شہاب کے مختصر افسانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ جب جنسی پہلو کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو ایک پست قسم کی لذتیت اور کے پورے افسانے پر چھا جاتی ہے۔

محمد طفیل - لیکن انہوں نے سارے افسانے جنسی پہلوؤں ہی پر تو نہیں

لکھے۔ پھر ان کے ہاں اظہار کی جرأت بھی ہے۔ جرأت کے بجائے شاید ہٹ دھرمی کا لفظ مناسب ہے۔ بعض اوقات تو حیرانی ہوتی ہے کہ ایک گریجویٹ آفیسر اس طرح بھی سوچ سکتا ہے۔

وقار عظیم ۔ جی ہاں! یہ صحیح ہے۔ شہاب کے موضوع متنوع ہیں اور ان متنوع موضوعات میں نفس مضمون اور طرز بیان کے اعتبار سے دو چیزیں مشترک ہیں۔ نفس مضمون کے اعتبار سے تو یہ کہ وہ ہماری معاشرتی زندگی کے کسی ایسے پہلو کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں اور اس میں ان کے جنسی افسانے بھی شامل ہیں، جس میں بھرپور طنز اور ہمدردانہ تعلق کی گنجائش ہو اور اظہار کے نقطۂ نظر سے یہ کہ اس بات کو وہ پوری دلیری سے بیان کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں بیہودگی یا سوقیت کے پیدا ہو جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔

عبادت ۔ اور اس طرح وہ توازن قائم ہو جاتا ہے جسے ہم فن اور تاثیر سے تعبیر کرتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ اس کے باوجود ہمارے افسانہ میں جرأت اظہار کی روایت بہت عام نہیں ہے اور عصمت، منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ بہت کم کہیں یہ دکھائی دیتی ہے اسے شہاب نے ایک نئی شکل دے کر اس روایت کو وسعت دی ہے اور یہ ان کی خدمت ہے۔

محمد طفیل ۔ تسنیم صاحب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

وقار عظیم ۔ یہ بات پہلے ندیم صاحب بتائیں گے۔

ندیم ۔ صاحب! میں تسنیم کو کئی حیثیتوں سے مکمل افسانہ نگار سمجھتا ہوں ——— پہلی تو یہ کہ وہ موضوع کے انتخاب کے لئے ادھر اُدھر کبھی نہیں بھٹکی۔ اب اس کا بس کی زندگی میں اس نے ایسے بے شمار موضوع تلاش کر لئے ہیں جن میں اچھا افسانہ بننے کی صلاحیت ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ تسنیم کا کوئی افسانہ پڑھ کر پڑھنے والا اپنے ذہن پر کسی طرح کا بار محسوس نہیں کرتا، بلکہ سیدھی سادی شگفتہ فضا ہے اور اسے ہلکے پھلکے سیدھے سادے شگفتہ انداز میں پیش کر دیا گیا ہے ——— کہیں افسانہ کی فضا میں بوجھل پن ہے نہ اس کے طرز بیان میں۔

عبادت ۔ لیکن اس کی وجہ آخر کیا ہے؟

وقار عظیم ۔ صاحب! مجھے تو ان ساری باتوں کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہماری دوسری افسانہ نگار خواتین کی طرح تسنیم کسی طرح کے COMPLEX میں مبتلا نہیں ہیں۔ عصمت، ہاجرہ، خدیجہ، قرۃ العین حیدر سب کے ذہن بظاہر کسی نہ کسی نفسیاتی الجھن میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان الجھنوں سے ان کے فن میں جا بجا صاف گرہیں پڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تسنیم کا ذہن ان الجھنوں سے خالی ہے اور اس لئے اس کا فن ہموار اور صاف ہے ——— اس کے ہاں زندگی کے مسائل آتے ضرور ہیں لیکن وہ پڑھنے والے کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر نہیں بیٹھ رہتے اور اس طرح ہمیں ان گرہوں سے فن کا ایک بڑا اچھا سبق یہ ملتا ہے کہ افسانہ نگار کچھ بھی لکھے، اگر وہ خلوص اور سادگی سے لکھتا ہے تو اس میں تاثیر ضرور ہوگی۔

ندیم ۔ تسنیم کو اپنے ماحول اور کرداروں سے جو لگاؤ ہے اس نے بھی افسانوں میں بے تکلف روانی کی سی فضا پیدا کی ہے۔

محمد طفیل ۔ ان کے ہاں جتنا خلوص ہے وہ کسی افسانہ نگار میں نہیں ہے وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں قاری پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وقار عظیم ۔ ہاں صاحب یہ تو حقیقت ہے ہماری افسانہ نگاری کا ایک اہم رجحان بن گیا ہے کہ ہمارے اکثر افسانہ نگار اپنے ماحول اور انہی کرداروں کے متعلق لکھتے ہیں جن سے وہ اچھی طرح مانوس ہیں۔

محمد طفیل ۔ اور اس لحاظ سے مجھے ابوالفضل صدیقی میں جو بات نظر آتی ہے کسی اور میں نہیں دکھائی دیتی۔ جس خاص طرح کے ماحول کی حکایتی اس نے اپنے افسانوں میں کی ہے کسی اور افسانہ نگار نے نہیں کی۔ اس کی زبان اور بیان بھی ایسا ہے۔ جس سے اس ماحول کی جزئیات کا اتنا علم ہے اور وہ اس علم کو اس سلیقے اور انداز میں اس بے تکلفی اور خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر خاصا طویل افسانہ لکھ سکتا ہے۔

عبادت ۔ اور اس طرح پڑھنے والوں کو دلچسپی کر سکتا ہے۔

وقار عظیم ۔ طوالت اور بوریت میں ایک قریبی تعلق ہے اور اس لئے اگر ابوالفضل صدیقی کسی طرح اپنے آپ کو اختصار اور اعتدال کی طرف مائل کر سکیں تو ان کی وہ خوبیاں جن کا طفیل صاحب نے ذکر کیا، انہیں بڑا کامیاب افسانہ نگار بنا دیں۔

محمد طفیل ۔ ہم نے بزعم خود تمام افسانہ نگاروں کا ذکر کر لیا، پھر بھی کئی ایک افسانہ نگار چھوٹے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کم از کم آدرش اور ہیلیس کا ذکر یہاں ضرور رہنا چاہئے۔

عبادت ۔ ابراہیم جلیس کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ انہوں نے

افسانے میں کوئی خاص تجربہ نہیں کیا۔ کم و بیش انہی موضوعات پر انہوں نے افسانے لکھے ہیں جن پر اس دور کے بیشتر افسانہ نگار لکھتے رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے متوسط طبقے کے افراد کی زندگی، ان کی معاشی اُلجھنیں، ان کی اقتصادی پریشانیاں ——— جلیس نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ طبقاتی سماج پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا وہ گہرا شعور رکھتے ہیں ——— اسی کیفیت کے مختلف پہلوؤں کو انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جلیس کی تکنیک میں ویسے کوئی ایسی بات نہیں جس کو اہم تجربہ کہا جا سکے۔ لیکن انہیں واقعات کو کہانی کا روپ دینے کا گُر آتا ہے اور وہ اس کو خوبی کے ساتھ برتتے ہیں ——— البتہ خاکے کی طرف انہوں نے خاص طور پر توجہ کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض بہت اچھے خاکے انہوں نے لکھے ہیں۔

وقار عظیم ۔ انہیں زندگی کا شدید احساس ہے اور اس شدید احساس ہی کا یہ اثر ہے کہ انہوں نے بعض اچھے افسانے لکھے ہیں۔

محمد طفیل ۔ ان پر کرشن چندر کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

عبادت ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کرشن چندر جو کچھ اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں اور جس طرح پیش کرتے ہیں اس میں ہمارے نوجوانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کی ترجمانی ہوتی ہے اس لئے اس کے فن کا رنگ نوجوان افسانہ نگاروں پر بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔ جلیس کرشن چندر کے انداز میں سوچتے ہیں اور اس لئے اسی طرح اس کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ندیم ۔ ان کے اندازِ بیان میں خاصی روانی پائی جاتی ہے اور اس خصوصیت نے ان کے افسانوں میں دلآویزی پیدا کی ہے۔

عبادت ۔ ابراہیم جلیس کی طرح انور نے بھی افسانے میں کوئی اہم تجربہ نہیں کیا۔ لیکن زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احساس ان کے یہاں بھی شدید ہے۔ اسی لئے وہ ڈوب کر لکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات متنوع ہیں لیکن ان متنوع موضوعات میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ ان سب پر ایک مخصوص زاویۂ نظر سے روشنی ڈال رہے ہیں۔ اس زاویۂ نظر کی نوعیت سماجی ہے، البتہ اس میں بڑی گہرائی نہیں ہے۔

محمد طفیل ۔ انور کے یہاں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کی توجہ پوری طرح اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔

عبادت ۔ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں وہ ڈوب کر لکھتے ہیں۔ ان کے فن میں موضوع کے ساتھ ایک خلوص نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے فن میں احساسِ تاثر کی شدت ہے جو خلوص ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

محمد طفیل ۔ اب وہ آئٹم آ گئی ہے کہ ہم اپنی ساری گفتگو کا ایک جائزہ لے سکیں کہ اب تک کے افسانہ نگاروں نے کہاں تک روایت کا ساتھ دیا اور کیا کیا نئے تجربے کئے۔ اب اگر وقار صاحب اس ساری گفتگو کا ماحصل بیان فرما دیں تو یہ گفتگو مکمل ہو جائے۔

وقار عظیم ۔ ہم نے روایت اور جدت کے موضوع پر خاصی طویل گفتگو کی اور اس طویل گفتگو میں ایک خاص نقطۂ نظر سے اپنے مختصر افسانہ کی تقریباً پچاس برس کی تاریخ کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس جائزہ کے سلسلے میں اُردو کے بے شمار افسانہ نگاروں کی فنی تخلیقات اور ان کی اہم خصوصیات کا تذکرہ آیا۔ بعض لکھنے والوں کا تذکرہ بار بار کیا گیا اور خاصی تفصیل سے کیا گیا، بعض کا ذکر محض سرسری انداز سے ہوا۔ بعض لکھنے والے شاید ایسے بھی ہوں جن کا ذکر بالکل نہیں آیا۔ لیکن چونکہ فرداً فرداً سب افسانہ نگاروں کے فنی مرتبہ اور حیثیت کا تعین اس گفتگو کا مقصد نہیں تھا اس لئے کسی نام کا ہونا یا نہ ہونا اس کے بڑے یا چھوٹے ہونے کی دلیل ہرگز نہیں گفتگو کا مقصد تو صرف یہ دیکھنا تھا کہ جب ہمارا افسانہ شروع ہوا تو اس کی اساس کون کون سی ایسی چیزیں تھیں جنہیں ہم اس کی روایت کہہ سکیں۔ اس اساس میں وقت کے ساتھ ساتھ کیا اضافے ہوئے اور کس طرح افسانہ کی روایت ایک سیدھی سادی روایت سے بڑھ کر اس بلند مقام تک پہنچی جہاں ہم اسے آج دیکھ رہے ہیں (یا اسے چند برس پہلے دیکھ چکے ہیں)

افسانوی روایت کے ارتقا کی اس تاریخ میں بعض ناموں کی اہمیت یقیناً دوسروں سے زیادہ ہے ——— کچھ کی اس لئے کہ انہوں نے افسانہ کو اس کی اساسی حیثیت بخشی، کچھ کی اس لئے کہ انہوں نے اس اساس پر بلند تعمیریں کیں اور کچھ کی اس لئے کہ انہوں نے کبھی کبھی ایسے مشکل حالات میں جب بڑی سے بڑی اور پختہ سے پختہ روایت کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں اس عمارت کو گرنے اور مسمار ہونے سے بچایا

روایت کے بانی ہیں، دوسرے اس لئے کہ اپنی افسانہ نگاری کے تیس برس کی عمر میں انہوں نے اس روایت میں طرح طرح کی جدتوں اور تجربوں سے بے شمار اضافے کئے۔ افسانہ اپنی زندگی کے ابتدائی تیس برسوں میں روایت اور تجربہ کی جن جن منزلوں سے گزرا ہے وہ ساری منزلیں ہمیں پریم چند کے افسانوں میں نظر آتی ہیں اور اس طرح "دنیا کا سب سے انمول رتن" سے "کفن" تک افسانہ کی روایت کی ابتدا، ارتقا اور عروج کی ساری داستان درج ہے۔ روایت نے ابتدا سے عروج تک پہنچتے پہنچتے جو راہیں طے کی ہیں ان سب راہوں میں پریم چند کی حیثیت محض رہبر کی نہیں رہنما کی ہے اور یہ چیز ان کی اہمیت کا تیسرا زاویہ ہے۔

پریم چند کا افسانہ روایت اور تجربہ کی جن مختلف منزلوں سے گزرا ہے انہیں چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ابتدا تو وہ ہے جب ان کے "سوزِ وطن" کے افسانوں میں ہمیں گہری مقصدیت، تند یہ قسم کی جذباتیت اور فضا اور طرزِ بیان پر داستانوں کی شعریت، رنگینی اور فوق الفطرت مبالغہ آرائی مچلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" کے تاریخی، نیم تاریخی اور روایتی افسانوں میں مقصدیت اور جذباتیت تو موجود ہے لیکن داستانوں کا فوق الفطرت بہت کم ہو گیا ہے۔ ذرا اور آگے چل کر تاریخ کے بجائے زندگی افسانوں کا موضوع بن گئی ہے۔ مقصدیت میں پھیلاؤ پیدا ہو گیا ہے اور اس نے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح پسندی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بیان میں داستانی عناصر اب بالکل نہیں ہے لیکن شعریت اور خطابت اب بھی ہے۔ اس سے اگلے دور میں ماحول اور مسائل کی تخصیص پیدا ہو گئی ہے۔ بیان کی شعریت میں اب بھی ہمیشہ ہے۔ پانچویں دور میں ماحول کی تخصیص کے ساتھ نقطۂ نظر میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اب نظر سماجی اور اخلاقی مسائل سے بڑھ کر سیاست پر بھی جاتی ہے اور باتوں کو دھیمے انداز میں کہنے کی طرف پوری توجہ ہے۔ آخری دور وہ ہے کہ افسانہ نگار واقعہ سے زیادہ اشخاص کو اپنے افسانہ کا موضوع بناتا ہے، اس کے خارجی ماحول سے زیادہ اس کی داخلی کیفیتوں کی عکاسی کرتا ہے، اس نے اس دور میں حقیقت اور فن کا مکمل امتزاج بھی کیا ہے اور اپنے فن کو اپنی شخصیت کا مکمل مظہر بھی بنایا ہے۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کے یہ مختلف دور حقیقت میں اُردو افسانہ کی روایت کے ارتقا کی مختلف منزلیں ہیں۔ ان مختلف منزلوں میں پریم چند نے ایک تنہا مسافر کی طرح کبھی سفر نہیں کیا۔ ہر دور میں ان کے ساتھ ایسے لکھنے والوں کا ایک کارواں رہا ہے جس کے ہر فرد نے ان کی بنائی ہوئی دو اتوں کو اختیار کر کے ان کی پیروی کی ہے۔ پہلے اور دوسرے دور میں مدرشن ان کے ساتھ ہیں، تیسرے دور میں علی عباس حسینی اور اعظم کریوی ہیں، چوتھے اور پانچویں دور میں بے شمار لکھنے والے ان کے رنگ میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حامد اللہ افسر، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، اختر انصاری، ان میں سے چند ہیں۔

پریم چند نے افسانہ کے بالکل ابتدائی دور میں اسے مقصدیت اور داستانی رنگ کی روایت دی۔ تقریباً اسی زمانہ میں سلطان حیدر جوش نے ایک خاص ماحول کی زندگی کے پس منظر میں اصلاحی مقصد سے افسانے لکھے اور اس طرح داستانی رنگ سے نکل کر حقیقت نگاری اور مقصد نگاری کے امتزاج کی روایت شروع کی۔ تقریباً اسی زمانہ میں سجاد حیدر یلدرم نے افسانہ کو رومانیت کی روایت سے آشنا کیا اور اس طرح اساس کی حیثیت سے روایت کے تین پہلو افسانہ کا جزو خاص بنے ——— مقصدیت اور داستانی رنگ، مقصدیت اور حقیقت نگاری، رومانیت اور فنی لطافت کا احساس آنے والے ہر دور میں افسانہ کی روایت انہیں تین راستوں پر چل کر موجودہ دور تک پہنچی ہے۔ حقیقت نگاری کی روایت کو پریم چند کے علاوہ حسینی، حامد اللہ افسر، عظیم بیگ چغتائی، نظم، بیدی، حیات اللہ انصاری، احمد علی، اختر انصاری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ، غلام عباس، ہاجرہ مسرور اور انتظار حسین نے زندہ رکھا، ترقی کی نئی راہیں دکھائیں اور فن کی بلندیوں تک پہنچایا۔ رومانیت کی روایت سجاد حیدر کے علاوہ نیاز فتح پوری، ل احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھ پوری، مجاب امتیاز علی کے ہاتھوں پلی، بڑھی اور پروان چڑھی۔ مدرشن، اعظم کریوی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور قرۃ العین حیدر نے حقیقت اور رومانیت کے امتزاج سے اس روایت کو چار چاند لگائے۔

فن کے جس رجحان کا احساس سجاد حیدر یلدرم کے ترجموں سے پیدا کیا تھا اسے خواجہ منظور، شیر الدین، منصور احمد، جلیل قدوائی کے روسی افسانوں کے ترجموں اور محمد مجیب کے روسی انداز کے افسانوں نے جلا دی ——— یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۶ء تک ہمارے افسانہ میں حقیقت، رومانیت اور فنی احساس نے ایک عظیم المرتبہ روایت کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ پریم چند کے فن، ترقی پسندی کی تحریک اور "انگارے" کے باغیانہ انداز نے تجربوں کی بے شمار راہیں کھول دیں اور تقسیم سے بہت پہلے علی عباس حسینی، کرشن چندر، بیدی، حیات اللہ انصاری، عصمت، اختر انصاری، احمد علی، اور اختر اورینوی نے اور اس کے ذرا بعد حسن عسکری، بلونت سنگھ، غلام عباس، ممتاز مفتی، تسلیم سلیم، دیوندر ستیارتھی، ہاجرہ مسرور، قدرت اللہ شہاب

نے جو کچھ لکھا اس سے حقیقت نگاری میں نئے نئے باب کھلے ——— انسانہ کے لئے کسی خاص ماحول کی تخصیص، ایک محدود ماحول کی زندگی میں بین الاقوامی حالات کا عکس، زندگی کے پھیلے ہوئے رشتوں کا احساس، وسیع انسانیت کا تصور، واقعات کے بجائے کرداروں پر اہمیت، زندگی کے خارجی مظاہر کے ساتھ ساتھ انسان کی داخلی زندگی کا مطالعہ، فرد کے جذبات کے علاوہ اس کی لاشعوری کیفیتوں کا تجزیہ، ذہنی گتھیاں اور تحلیل نفسی، زندگی سے متعلق کسی مخصوص زاویۂ نظر کی موجودگی، اس کے مسائل کا اجتماعی شعور ——— یہ سب کچھ حقیقت نگاری کے زمرہ میں شامل ہو گیا اور یہ ساری چیزیں مختلف لکھنے والوں کی شخصیتوں کا جزو بن کر افسانہ میں اس طرح گھل مل گئیں کہ نہ اس میں موضوعات کی کمی رہی اور نہ اس کی وسعتوں کا انکار۔ ہو رومانیت کبھی محض ایک شاعرانہ یا جذباتی کیفیت تھی۔ آہستہ آہستہ اپنے سارے خارجی حسن و مظاہر اور داخلی و نفسیاتی لوازم کے ساتھ حقیقت میں شیر و شکر ہو گئی اور اس نے فرد کی بیزاری کا لباس پہن کر فن کو نئی سے نئی شکلیں دیں۔ اظہار و بیان میں بھی نت نئے تجربے ہوئے، کچھ رومی حقیقت نگاروں کے اثر، کچھ فرانسیسی رومانیت کے اثر کے ماتحت اور کچھ فرانس اور انگلستان کے لکھنے والوں کے نئے نفسیاتی فن کی بدولت یہاں تک کہ تقسیم تک ہمارے افسانہ میں وہ سب کچھ آگیا جو مغرب میں افسانہ کی روایت کا بہترین عنصر سمجھا جاتا ہے۔ لکھنے والوں نے اسے کبھی کبھی جوں کا توں اختیار کر کے اور کبھی مشرقی مزاج کے رنگ میں سمو کر اپنے افسانہ کی روایت کو مالا مال کیا اور تقسیم کے بعد لکھنے والوں نے ایک ایسے دور میں جب ہر چیز انتشار کی سخت زد میں تھی اس عظیم روایت کو اپنا کر اسے زندہ و برقرار رکھا۔ وہ اب تک بظاہر اس میں کوئی اضافہ نہ کر سکے لیکن جس دشوار دور میں انہوں نے اس کی حفاظت کی ہے وہ اس لئے بہت اہم اور غنیمت ہے کہ اس طرح روایت کا تسلسل درہم برہم نہیں ہوا۔ ایک سیدھی سادی روایت کو بے شمار فنکاروں نے نئے نئے تجربوں نے، ان کی ذہنی کاوشوں نے، ان کے خونِ جگر نے جو تھوڑا بہت سنگار دی تھی وہ بگڑنے نہیں پائی۔ حالات ساز گار ہوں گے تو یقین ہے کہ اس کے بننے سنورنے کی صورت بھی پیدا ہو گی ——— اور نئے تجربے ہماری عظیم روایت کو عظیم تر بنائیں گے۔

تصریحات

نامور افسانہ نگاروں اور نقادوں کے درمیان "اردو افسانے میں روایت اور تجربے" کے بارے میں جو گفتگو ہوئی اس کے متعلق مجھے بھر اس کے کچھ نہیں کہنا ہے کہ یہ گفتگو بڑی کاوش اور افسانوی ادب کے مخلصانہ مطالعہ کا نتیجہ ہے لیکن روداد کی گفتگو میں جن اچھے افسانہ نگاروں کا ذکر ایک آدھ ہی فقرے میں ہوا ہے میں چاہتا ہوں ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ عرض کر دوں تاکہ صرف فیصلوں کو جھٹلانا نہیں ہے، اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے۔

میں نے اس سمپوزیم کی پہلی اشاعت پر بھی عرض کیا تھا کہ "اس بحث میں جن دو ستوں کی ضرورت سے زیادہ تعریف ہو گئی ہے یا جن کی تعریف ضرورتاً بھی نہیں ہوئی ان سے مجھے بحث میں حصہ لینے والے احباب کے خلوصِ نیت کی خاطر معذرت کرنا ہے۔"

ان تمام باتوں کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو کم از کم اختر حسین رائے پوری، میرزا ادیب، اوپندر ناتھ اشک اور شفیق الرحمٰن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دوں۔

ہر دور میں دو تین خواہ کسی صنفِ ادب کا ہو، دو ایک ہی بڑے لکھنے والے ہوتے ہیں لیکن ہر دور میں ایسے لکھنے والے بھی ہوتے ہیں جن کے دم قدم سے ادب میں بہار رہتی ہے۔ مندرجہ بالا افسانہ نگاروں کا میرے نزدیک یہی درجہ ہے۔

اس ساری بحث میں اختر حسین رائے پوری کا ذکر صرف اسی ایک فقرے میں آیا ہے کہ "افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا کوئی بڑا مرتبہ نہیں ان کے بیشتر افسانے یا تو ترجمہ ہیں یا مغربی افسانوں سے ماخوذ۔"

انہوں نے جس دور میں افسانے لکھے، اس دور کی تمام افسانوی تخلیقات پر رومان ہی رومان چھایا ہوا تھا۔ وہ اس سے الگ ہو کر سوچ ہی نہیں سکتے تھے اور یہ بھی کہ اس وقت مغربی افسانوں کا ایک ایسا طلسم بندھا ہوا تھا جس نے ہمارے بڑے افسانوی ادب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور ساتھ ہی سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری کا نوجوان افسانہ نگاروں پر بڑا اثر تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے رفتہ رفتہ میں ہی کئی ایک مسائل کو بڑے ترقی پسندانہ انداز میں پیش کیا اور اپنی سابقہ روش کو جس میں محض رومان ہی رومان تھا، ترک کر دیا اور کئی ایک ترقی پسند افسانہ نگاروں کی تخریروں سے متاثر بھی ہوئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے اس ڈھب کی چیزیں کم لکھیں۔ اگر ان کا قلم رواں رہتا اور وہ ایک سرکاری منصب پر فائز نہ ہوتے تو ہمیں امید تھی کہ ایک بہت اچھے

لکھنے والے گروپ کو برابر متاثر کرتے رہتے۔ بہرحال ان کا جتنا بھی انسانی سرمایہ موجود ہے وہ قطعی طور پر نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے۔ انھوں نے روایت سے اپنا ناطہ جوڑ کر کچھ نہ کچھ تجربے بھی کیے ہیں جو میرے نزدیک قابل احترام ہیں۔

آگے چل کر میرزا ادیب کی بیس سالہ ادبی زندگی کو ایک ہی فقرے میں چلتا کیا ہے وہ یوں کہ "ان کا انداز یکدم اور حجاب امتیاز علی کا سا ہے اور ان میں ایسی رومانیت ہے جو کھلی ہے بلکہ اس رومانیت کو آگے لے جانے کی بجائے پیچھے لے گئے ہیں۔"

میرزا ادیب کی ابتدائی تحریروں میں رومانیت کا غلبہ ضرور ہے اگر ہم ذرا سا اس رومانیت کو پیش نظر رکھیں تو ان کا زیادہ تصور بھی نہیں ہے جیسے جیسے ان کا شعور پختہ ہوتا گیا۔ ان کے ہاں رومانیت بھی بتدریج کم ہوتی گئی۔ اگر کم نہ بھی ہوئی تو کیا رومان نگار ہونا عیب میں شامل ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہمارا کلاسیکل لٹریچر سارے کا سارا نہیں تو آدھے سے زیادہ بیکار ہو جاتا ہے۔ دیکھنا تو یہ چاہئے تھا کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں کوئی نئی بات کہی ہے یا نہیں۔ اگر ہم ان کی صرف انسانی چیزوں کو پیش نظر رکھیں تو ان کا ایک منفرد رنگ تھا جس کے یہ واحد مالک تھے اور موجودہ دور کے افسانوں میں بھی وہ تمام چیزیں مل جاتی ہیں جن کی ہم ایک اچھے افسانہ نگار سے توقع رکھ سکتے ہیں۔ اب میرزا صاحب کے افسانوں میں زندگی کے عام مسائل کا فنکارانہ تجزیہ ملتا ہے۔ معاشرت کی اچھائیوں اور برائیوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے افسانے اب ایک تماشائی کی روداد نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک سچے افسانہ نگار کا بھرپور اخلوص اور ایک اچھے فن کار کی جھلک بھی موجود ہے۔

میرزا ادیب بیک وقت افسانہ نگار بھی ہیں اور ڈرامہ نگار بھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ خود کو ڈرامہ نویس کی حیثیت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ادیندر ناتھ اشک کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ "وہ ڈرامے اچھے لکھتے ہیں اور افسانے میں اس چیز کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ تفصیلات میں سے کون کون سی چیزیں منتخب کر کے کام میں لانی چاہئیں۔"

اشک صاحب عموماً اوریجنیلٹی (ORIGINALITY) میں مارے جاتے ہیں۔ ان کے تمام افسانے اور ان کے افسانوں کے تمام کردار اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کا افسانہ جدا افسانہ بننے نہ بننے کی کہیں بھی غیر فطری اور خواہ مخواہ کی کشمکش پیدا کرنے والی بات راہ نہیں پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں منٹو کے افسانوں پر یہ اعتراض ہے کہ وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے بعض غیر ضروری باتوں کو لا کر بھی خواہ مخواہ حیرت ناک قسم کا تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم افسانے کے فن اور اس کی نازک سی جزئیات کا پورا پورا احترام کریں تو اشک کے افسانے (خواہ وہ بڑے افسانے نہ ہوں) ایک بڑے فنکار کی تخلیقات کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ اشک کی بدقسمتی ہے یا خوش قسمتی کہ ان کے فن پر بھی ڈرامہ کچھ اس طرح چھا کر رہ گیا ہے کہ اردو افسانے کے ضمن میں ان سے پورا پورا انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بات بھی کچھ کم ہی سمجھ میں آتی ہے کہ جو ڈرامہ لکھتے وقت ڈرامے کی ذرا ذرا سی جزئیات کو پیش نظر رکھتا ہو اور اس کی کوئی بھی چال ڈھیلی نہ ہونے دیتا ہو۔ وہ افسانے میں غیر ضروری باتیں لکھ دے۔ میرے خیال میں تو وہ تمام ضروری ہی باتیں لکھتے ہیں اور غیر ضروری بات لکھتے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کی کہانی افسانہ نہیں بنتی۔ پھر بھی پچاس ساٹھ افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر ان کی افسانوی تخلیقات کو بلا تامل پیش کیا جا سکتا ہے۔

فنکار کی حیثیت سے شفیق الرحمٰن اور قرۃ العین حیدر کی راہیں بالکل الگ الگ ہیں۔ ان دونوں کے فن کا مقابلہ کرنا یا ان کے بارے میں ایک ہی انداز میں سوچنا مناسب نہیں ہے۔ اگر ان دونوں نے اپنے طبقے کی زندگی کو پیش کیا ہے تو کیا ان تمام افسانہ نگاروں کے فن کے بارے میں ایک سا نہ سوچا جائے گا جنہوں نے نچلے طبقے سے متعلق افسانے لکھے ہیں۔ اگر یوں سوچنا صحیح نہیں ہے تو شفیق الرحمٰن کے فن کا تجزیہ کرتے وقت کچھ مختلف انداز میں سوچنا ہوگا۔

شفیق الرحمٰن نے دو طرح کی چیزیں لکھی ہیں۔ ایک تو خالصتاً رومانی افسانے، دوسرے ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین، اور یہ ان دونوں قسم کی تحریروں میں بڑے کامیاب ہیں جن میں ان کا اپنا ایک اسٹائل ہے۔ یہ اسٹائل اپنے مدکشش اور مستحسن رکھا ہے۔ نہ ان کے رومانی افسانے محض ذہنی تعیش کے نمونہ ہیں اور نہ ان کی مزاحیہ تحریریں محض تفریح ہی فراہم کرتی ہیں بلکہ ان میں پڑھنے والے کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت ہے، لطافت ہے، ادب ہے اور اپنا ایک منفرد رنگ۔

اب رہا یہ سوال کہ ان کا ادب کس درجے کا ہے، تو یہ بات سوچنے والی ضرور ہے مگر کوئی فیصلہ رد و دی میں نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کسی رومانی افسانوں میں ایک منفرد اسٹائل اور شگفتہ نگاری کی بنا پر میں شفیق الرحمٰن کی تحریروں پر غور کرے گا تو انہیں ایک بڑا فن کار ماننا پڑے گا۔

میں نے ان چند سطروں میں بات کو طول پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ نہ ہی مثالوں سے بھاری بھرکم بنانے پر راضی ہوا۔ یہ تو صرف اس حقیقت کا اظہار ہے کہ میں آپ سے اتنا عرض کر سکوں کہ ان حضرات نے بھی افسانوی ادب میں اپنے اپنے رنگ میں کچھ خدمت ہی کی ہے۔

محمد طفیل